سیرت
امیر المومنین
حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام
حصہ اول
تالیف
علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرتِ امیر المومنین

حضرت علی ابن ابی طالبؑ

(حصّہ اوّل)

تالیف

علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

ناشر۔ اِمامیہ پبلیکیشنز

۳۵۔ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7119027

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللھم صل علی محمد وآل محمد وعجل فرجھم

نام کتاب ——— سیرت امیر المومنینؑ حضرت علی ابن ابی طالبؑ

تالیف ——— علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

ناشر ——— امامیہ پبلیکیشنز لاہور

مطبع ——— معراج دین پرنٹرز، لاہور

ایڈیشن (بار سوم) صفر المظفر ۱۴۱۷ھ

تعداد ——— ۱۱۰۰

ہدیہ ———

کتابت ——— محمد یوسف خوشنویس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ ناشر

علامہ مفتی جعفر حسین اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے زورِ قلم کا ایک اور شاہکار "سیرتِ امیرالمومنین علیہ السلام" آپ کے سامنے ہے، مفتی صاحب قبلہ بلاشبہ جہانِ علم و دانش کی ایک مستند شخصیت تھے آپ کو قدرت نے عقلِ رسا، فکرِ فلک پیما اور زبانِ ادب آشنا کی دولتوں سے مالا مال کیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب سے پہلے مفتی صاحب قبلہ نے زبان سے خزینۂ علم و حکمت اور گنجینۂ فصاحت و بلاغت (امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے کلام پر مشتمل کتاب) نہج البلاغہ (جسے ہم آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں) کو اُردو زبان میں اس مہارت و کمال کے ساتھ منتقل کیا کہ سیّد العلماء علامہ سیّد علی نقی (لکھنوی) اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے اُسے دیکھ کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ نہج البلاغہ کے اس شایانِ شان ترجمے کے بعد زبورِ آلِ محمدؐ صحیفۂ کاملہ کا ترجمہ بھی وہی کریں چنانچہ مفتی صاحب قبلہ نے خالق و مالک کی بارگاہ میں امام علی زین العابدینؑ کی مودت و محبتِ حق سے سرشار اور عرفانِ معبود سے لبریز گفتگو کو اُردو زبان میں منتقل کر کے جہاں اہلِ علم و فن سے بے پناہ داد لی وہاں

گرچہ کتاب کا ہر جملہ آپ کی امیرالمومنین علیہ السلام سے عقیدت کا آئینہ دار ہے لیکن یہ وہ عقیدت نہیں جو دلیل، روایت اور درایت کی ہم سفر نہ ہو اور زیرِ نظر کتاب کی یہی وہ عظیم خوبی ہے کہ اس میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کی ذاتِ والا صفات کی سیرت اِس شان سے پیش کی گئی ہے کہ عقیدت کا یہ سفر تحقیق کی وادیوں سے گزر کر اپنی منزل کو پہنچتا ہے، تحقیق کے مراحل میں بیان بوجھل اور سنگین نہیں ہونے پاتا اور زبان و بیان کی لطافت ہر دم برقرار رہتی ہے۔

سیرتِ امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کی تالیف سے ابلاغِ حق کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب مرحوم نے اُردو کے خزانے میں فصاحت و بلاغت کے اس شہ پارے کا اضافہ کر کے جہاں اُردو زبان پر احسان فرمایا ہے وہیں آلِ محمدؐ کی نگاہِ لطف و کرم کے مزید مستحق قرار پائے۔

علّامہ مفتی صاحب قبلہ مرحوم آلِ محمدؐ کی سیرت و کردار کو عام کرنا یہ کر عینِ عبادت سمجھتے تھے بلکہ وہ اہلِ بیت علیہم السلام کی سیرتِ طیبہ کو عام کئے بغیر اسلام کے حقیقی پیغام کو عامۃ الناس تک پہنچانا ناممکن سمجھتے تھے۔ اپنی

رحلت سے چند روز قبل میو ہسپتال میں اپنے عزیز و اقارب کے درمیان نیم بے ہوشی کے عالم میں آپ کے لبوں سے یہ جملے جاری تھے۔ "حضرات! آج میں قرآن و اہل بیت علیہم السلام کا تعلق واضح کرنا چاہتا ہوں"۔ پھر تھوڑے وقفے سے فرمایا۔ "حقیقت یہ ہے کہ اگر اہل بیت علیہم السلام نہ ہوتے تو ہمیں پتہ ہی نہ چل سکتا کہ قرآن مقدس کا عملی مفہوم کیا ہے"۔

مذکورہ بالا جملہ آپ کے عقیدے اور اہل بیت علیہم السلام سے محبت و عقیدت کی اُس کیفیت کا اظہار ہے جو آپ کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ "سیرتِ امیر المومنین علیہ السلام" آپ کے اِسی صادق جذبے، اِسی کیفیتِ باطنی اور محکم عقیدے کا لوحِ قرطاس پر انعکاس ہے۔

یہ کتاب زبان و بیان کا وہ رواں دھارا ہے کہ جس کے مطالعے سے قاری ہر دم نئی تازگی محسوس کرتے ہوئے اِسے اوّل تا آخر پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا، یقیناً یہ علاّمہ مُفتی صاحب قبلہ کا اعجاز ہے کہ انھوں نے تمام جہاتِ کمال میں کامل شخصیتؑ کی زندگی پر قلم اٹھایا، زبان و بیان کی لطافتیں، تاریخی واقعات کی تحقیق، مختلف فیہ امور میں روایات کی چھان پھٹک ہر چیز اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے۔ مراحلِ تحقیق سے گزر کر وہ نتیجے تک اِس شان سے پہنچتے ہیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی، قاری خود اپنی آنکھوں سے ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔

علاّمہ مُفتی جعفر حسینؒ اعلیٰ اللہ مقامہ کی دختر اور ان کے داماد جناب ملک فیض بخش صاحب کے دستِ تعاون کے لئے ہم مشکور و ممنون ہیں اور دُعا گو ہیں کہ خدائے رَبِّ جلیل ان کی توفیقات دینی میں مزید اضافہ فرمائے۔

(ادارہ)

فہرست مندرجات

افتتاحیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام اس معمورۂ عالم کی وہ عظیم اور منفرد شخصیت ہیں جن کی عظمت و بلندی جامعیت و ہمہ گیری اور عالمی و آفاقی برتری کے اپنے، بیگانے، دوست دشمن سب ہی معترف ہیں اور کسی کو ان کے بلند امتیازات اور نمایاں خصوصیات سے انکار نہیں ہے۔ آپ قریش کے ایک ممتاز ترین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سرزمین حرم میں خانہ کعبہ کے اندر ولادت کا شرف حاصل کیا۔ نبوت کی تجلیوں میں آنکھیں کھولیں۔ رسالت کی فضاؤں میں پلے بڑھے، پیغمبر اسلامؐ کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھے، انہی کے نقش قدم پر قدم رکھ کے بچپنے سے چلے پھرے، سفر و حضر میں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہے، خلوت و جلوت میں ان کے فیضان صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ انہی کے مکتب رشد و ہدایت میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں اور انہیں کے عمل و کردار کے نقوش کو قلب و نظر میں جگہ دی اور صفائے طینت و کمال تربیت کے نتیجہ میں اوج و عروج کے اس نقطۂ بلند تک پہنچے کہ مہر و پروین کی بلندیاں بھی ان کی گزرگاہ میں گرد راہ ہو کر رہ گئیں۔

یہ ایک عمومی تاثر ہے اور ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ گرد و پیش کی اچھی یا بُری فضا انسان کے ذہن و نفسیات پر اثرانداز ہوتی ہے مگر دنیا میں ایسے بلند نظر و روشن فکر افراد بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو عوامی عقائد و توہمات اور گرد و پیش کے غلط نظریات سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے اور ان کا اندازِ فکر جُدا، طرز عمل علیحدہ اور راہ و روش دوسروں سے کلیتہً مختلف ہوتی ہے۔ علی ابن ابی طالب بھی انہی افراد میں ایک نمایاں فرد تھے جو ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول پر اثرانداز ہوتے ہیں اور اپنی بصیرت، قوت فہم اور تائید ربانی سے حق و باطل میں امتیازی حدود قائم کر کے ایک نئی تہذیب اور نئے طرز فکر کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور دوسروں کی راہ پر چلنے کی بجائے راہروانِ منزل کے لئے اپنے نشانِ قدم چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کفر پرور دور میں جہاں بت پرستی شعار عام تھی آپ معبود حقیقی کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکاتے اور اس تاریک معاشرہ میں اپنی تابندہ و تابناک پیشانی کو صنم پرستی سے آلودہ نہیں ہونے دیتے اور فکر و عمل میں انہی خطوط پر گامزن رہتے ہیں جو پیغمبر اکرمؐ نے ان کے لئے متعین کر دیئے تھے۔ اسی فکری و عملی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زبان سے اعلانِ رسالت سنتے ہی ایمان کا اقرار کرتے اور ان کے ساتھ نمازوں میں شریک ہو کر حق پسندی و حق پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

آپ اوائل عمر ہی میں اسلام کی عالمی تحریک کو پروان چڑھانے کی خاطر پیغمبرؐ کے معین و معاون اور مخالف

طاقتوں کے مقابلہ میں ان کے دست و بازو بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ دعوت عشیرہ میں جب کہ قریش کے مجمع پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور تمام رؤسائے مکہ حق کی آواز کو دبانے کی فکر میں تھے آپ بزرگان قریش کی قہر آلودہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بے جھجک رسالت کی تصدیق کرتے کھلے بندوں آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت کا یقین دلاتے اور کٹھن سے کٹھن مرحلوں میں اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مکہ کی پُر آشوب زندگی میں جب کہ کفار قریش کی دل آزاری و ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی تھی اور پہاڑ کی ایک کھائی کے علاوہ کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ رہی تھی، آپ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ان سے علیحدگی گوارا نہ کی۔ سخت سے سخت آزمائشوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ نہ ابتلاؤں کے ہجوم سے گھبرائے نہ دشمن کی دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بلکہ مصائب کے زلزلوں میں ثبات قدم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور خطرات کے امنڈے ہوئے طوفانوں میں فداکاری و جاں سپاری کا جذبہ اُبھرتا اور عزم و استقامت کا حسن نکھرتا رہا۔ خطروں کو اس طرح پھاندہ کہ ماتھے پر شکن نہ پڑی۔ اور مصیبتوں کو اس طرح جھیلا کہ تیوریوں پر بل نہ آئے اور مدنی زندگی میں جب کہ عرب کے باہم دست و گریباں قبائل اپنے باہمی اختلافات ختم کرکے پیغمبرِ اسلام کی دشمنی پر متحد ہو چکے تھے اور مشرکین قریش نیزوں، تلواروں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مقابلہ پر اتر آئے تھے آپ آہنی دیوار بن کر میدان حرب و ضرب میں کھڑے ہو گئے اور غیر معمولی استقلال و جرأت کے ساتھ دشمنان دین کی یلغاروں کو روکتے، سرکشان قریش کے غرور و طنطنہ کو خاک میں ملاتے اور کفر و شرک کے فلک بوس گنبدوں پر صاعقہ بن کر گرتے رہے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو بزعم خویش قصرِ رسالت کے گرانے اور اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے درپے تھے خود ہی اس طرح گرے کہ سنبھل نہ سکے۔ اور جو سنبھلے وہ ہتھیار ڈالنے اور اسلام کی کھلی مخالفت کے بعد اسلام کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد اگرچہ فضا آپؑ کے لئے سازگار نہ رہی۔ شوق جہاں بانی نے مرکزِ اقتدار بدل دیا خلافت الٰہیہ مادی حکومت کے سانچے میں ڈھل گئی اور حالات نے آپؑ کو عزلت گزینی و گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا مگر جب بھی اسلامی مفاد کے تحفظ کا سوال پیدا ہوتا ہے احساس فرض کے ماتحت غزوات اور ملکی مہمات کے سلسلہ میں مشورے دیتے، دینی و معاشرتی گتھیاں سلجھاتے، اسلامی علوم و معارف کی آبیاری کرتے رہے اور جذبات کے دباؤ سے آزاد رہ کر شخصی حقوق پر نوعی مفاد کو ترجیح دیتے اور امکانی حد تک وحدت و اجتماعیت کے سانچوں کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھتے اور جب اٹھاون برس کی ادھیڑ عمر میں مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ غیر ملکی تاخت و تاراج اور دولت کی ریل پیل کے نتیجہ میں عرب کا قومی مزاج بدل چکا تھا۔ طرز بود و ماند میں فقر پسندی و سادگی کے بجائے ثروت پسندی و جاہ طلبی کے عناصر کارفرما ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان

حالات میں طبائع کا رخ سابقہ اخلاقی و تہذیبی قدروں کی طرف موڑنا آسان کام نہ تھا مگر آپ ان نامساعد حالات میں بھی مفاسد کی راہ روکنے میں پوری تندہی و جانفشانی سے کوشاں رہے اور شورش پسندوں کے شور و شر اور باطل قوتوں کے ٹکراؤ کے باوجود اسلام اور اس کے اخلاقی، تہذیبی اور فکری نظریات کی حفاظت کرتے رہے جس کا ثبوت ان حقائق و معارف کی صورت میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو آپ کے حکمت آگیں کلمات و خطبات سے مستنبط ہیں۔ غرض آپ کا پورا دورِ حیات ادائے فرض کی تکمیل، دین اسلام کے احیاء اور اس کے تحفظ و استحکام میں گزرا۔

اس سلسلہ میں آپ کی خدمات اور بے لوث مجاہدات اپنی عظمت و افادیت کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا ایک گرانبہا سرمایہ ہیں۔ آپ نے رزم و بزم میں یکساں نصرتِ اسلام و ہدایت خلق کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کے فروغ و ارتقاء کے سلسلہ میں ایک مثالی و دوامی کردار ادا کیا۔ چنانچہ دعوت عشیرہ ہو یا تبلیغ برأت۔ فتح مکہ ہو یا تطہیر کعبہ، غزوہ بدر ہو یا احد، معرکہ خندق ہو یا خیبر، ہر مورد پر آپ کی خدمات ایک نمایاں اور انفرادی خصوصیت رکھتی ہیں، اور اسلام کی تعمیر و ترقی اور اس کے تحفظ و بقاء میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں جنہیں کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر ان خدمات کا تذکرہ تاریخ اسلام سے الگ کر دیا جائے تو اسلامی تاریخ کا ہر واقعہ ادھورا اور ہر نقش دھندلا نظر آئے گا۔ کیونکہ آپ کے یہ عظیم کارنامے تاریخ اسلام کا ناگزیر تکملہ اور اس کے ترکیبی عناصر میں عنصر غالب کا درجہ رکھتے ہیں اور تاریخ اسلام میں اس طرح رچے بسے اور سموئے ہوئے ہیں کہ اگر کتر بیونت کرکے انہیں صفحاتِ تاریخ سے چھانٹ دیا جائے تو واقعات کے ربط و تسلسل کے بغیر نہ حقائق اپنی اصل صورت میں سامنے آ سکتے ہیں اور نہ تاریخ کے پس منظر اور اس کے اسباب و محرکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہر دور میں معاندین آپ کی خدمات اور ذاتی اوصاف پر پردے ڈالتے رہے اور اس سلسلہ میں سلطنت و حکومت کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل رہی مگر دشمنی و عناد کا اڑتا ہوا غبار آپ کے کارہائے نمایاں کو چھپا نہ سکا اور آخر ان کے علمی و عملی آثار اس طرح زندہ و پائندہ اور افق اسلام پر درخشندہ و تابندہ رہے کہ شپرہ چشم بھی انہیں دیکھنے پر مجبور ہے۔

امیر المومنینؑ نے ایک طرف علم کی سرپرستی سے نوع انسانی کے کارواں کو آگے بڑھایا اور دوسری طرف عمل کے وہ روشن نمونے پیش کئے جو ہر منزل میں چراغ راہ کا کام دیتے اور زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرتے ہیں، ضرورت ہے کہ آپ کی زندگی اور اس کے روشن آثار کی پیروی کی جائے، آپؑ کے افکار و نظریات سے روشنی لی جائے اور آپ کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کی راہیں متعین کی جائیں اور مادہ پرست ذہنیت کی شکست اخلاقی و روحانی قدروں کے ارتقاء اور اسلامی تصورات کے احیاء کے لئے اس مصلح اعظم کی تابناک زندگی کے نقوش کو مشعل راہ بنایا جائے اور ان کے اصول زندگی کی غیر متزلزل بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کی جائے۔ تاکہ

انفرادی و اجتماعی زندگی دینی تقاضوں سے ہم آہنگ اور اخلاقی رفعتوں سے ہمکنار ہو سکے۔

اسی مقصد کے پیش نظر آپ کی سیرت و زندگی کے یہ تحریری نقوش پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں نہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے نہ مبالغہ آفرینی سے، نہ ان میں ناروا عصبیت کارفرما ہے اور نہ بیجا جنبہ داری بلکہ حقائق و واقعات اور تاریخی مسلّمات کی روشنی میں انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ آپ کی زندگی و سیرت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے۔ تاریخی واقعات کو تاریخ ہی کی زبان میں دہرایا گیا ہے اور انہیں غلط رنگ دینے یا مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور اختلافی مسائل کو صرف تجزیہ تاریخ و نقد روایت تک محدود رکھا ہے۔ اور حتی الامکان باہم آویزیوں سے بچ کر رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ عصبیت و تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑ کر آزادانہ تحقیق و جستجو کا ولولہ پیدا کرنے اور آپ کی بلند شخصیت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں معین ثابت ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ وبہ استعین ہ

جعفر حسین عفی اللہ عنہ

مولد ومنشا

"خطۂ عرب" براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے اس کے شمال میں مملکت شام واقعہ ہے اور مغرب میں بحر احمر، مشرق میں بحر عمان و خلیج فارس اور جنوب میں بحر ہند کی نیلگوں موجیں متلاطم ہیں۔ بحر احمر کا ساحلی علاقہ بنجر اور شور ہے اور ساحل سے ہٹ کر خشک پہاڑوں ریتلے ٹیلوں اور کف دست ریگستانوں کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ریگستانی وصحرائی خطہ حجاز کہلاتا ہے۔ اس خطہ میں نہ زراعت وکاشتکاری کی کوئی صورت تھی اور نہ سیرابی کا کوئی سامان تھا۔ اگر بارش ہوئی تو پہاڑوں میں پیچ وخم کھاتی ہوئی وادیوں میں پانی بہہ نکلا یا کسی سیرابی حصہ میں گڑھوں کے اندر جمع ہو گیا۔ ورنہ میلوں تک کہیں پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ ایسے خشک اور بے گیاہ علاقہ میں جہاں ہر طرف شور ویرانہ بنجر اور بیہڑ زمین اور دھوپ میں تپتے ہوئے پہاڑ ہوں جہاں نہ پانی ہو اور نہ زندگی ومعیشت کا کوئی سامان وہاں کسی آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ حدودِ حرم کے باہر عمالقہ صحرائی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان صحرا نوردوں کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ ہوتا تھا بلکہ گھاس اور پانی کی تلاش میں بادِ سموم کے جھلسا دینے والے جھونکوں سے ٹکراتے ہوئے صحراؤں میں سرگرداں رہتے تھے اور جہاں پانی اور تھوڑی بہت سرسبزی وشادابی نظر آتی وہاں اتر پڑتے اور جب پانی اور چوپاؤں کے چرنے کا چارا ختم ہو جاتا تو آب وگیاہ کی تلاش میں آگے بڑھ جاتے۔

اس وسیع ریگستان کی وادیٔ بطحا میں مستقل آبادی کی ابتدا، ذریت ابراہیمی سے ہوئی۔ حضرت ابراہیم طوفانِ نوح سے ۱۰۸۱ برس بعد سرزمین بابل میں پیدا ہوئے باپ کا انتقال بچپنے میں ہو گیا۔ چچا نے تربیت کی جو آوار کہلاتا تھا۔ آوار کے معنی صنم کدہ کے نگرانِ اعلیٰ کے ہیں اور اسی لفظ نے بعد میں آزر کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت ابراہیم جو آذر کے ہاں رہتے سہتے تھے ایک ایسے معاشرہ میں پلے بڑھے جس میں بت تراشے جاتے اور پوجے جاتے تھے اور سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش ہوتی تھی اور حاکمِ وقت، معبود کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھا۔ مگر اس صنم پرستی وصنم تراشی کے مرکز میں رہتے ہوئے آپ بچپن سے بت پرستی کے خلاف اور مشرکانہ راہ ورسم سے بیزار تھے۔ آپ نے اپنی قوم کی راہ وروش پر کڑی نکتہ چینی کی اور اصنام پرستی کی مذمت کرتے ہوئے انہیں خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی مگر کسی نے ان کی آواز پر لبیک نہ کہی بلکہ بتوں ہی کو اپنا کرتا دھرتا سمجھتے اور انہی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم نے انہیں بت پرستی سے کنارہ کش ہوتے نہ دیکھا تو چاہا کہ بتوں کی بے بسی ودرماندگی کا عملاً ثبوت پیش کر کے انہیں سمجھائیں کہ اصنام پرستش کے قابل ہرگز نہیں ہیں۔ آپ اس

کے لئے موقع کی تلاش میں تھے کہ انہی دنوں میں اہل شہر مراسم عید بجالانے کے لئے صحرا میں جمع ہوئے۔ آپ نے شہر کو خالی پایا تو صنم کدہ کا رُخ کیا اور ایک بڑے بت کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا اور جس تبر سے بت توڑے تھے اسے بڑے بت کی گردن میں آویزاں کرکے باہر نکل آئے۔ جب اہل شہر پلٹ کر آئے تو دیکھا کہ بت خانہ کا نقشہ بگڑا ہوا ہے اور بتوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے مستفسرانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا کہ ہو نہ ہو یہ ابراہیمؑ کی کارستانی ہے جو برابر ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بلایا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ آپ نے کہا:

بل فعلہ کبیرھم ھذا فسئلوھم ان کانوا ینطقون ○ "یہ حرکت ان بتوں کے بڑے کی ہے اگر یہ بول سکتے ہوں تو انہی سے پوچھ لو"

انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے انہونی بات سنی تو کہنے لگے کہ اے ابراہیمؑ کیا بت بھی بولا کرتے ہیں؟ فرمایا کہ جو نہ زبان ہلا سکیں اور نہ اپنا بچاؤ کر سکیں وہ کسی اور کے کیا کام آسکتے ہیں کہ تم انہیں معبود قرار دے کر ان کے آگے جھولیاں پھیلاتے اور انہیں سجدے کرتے ہو۔ ان بت پرستوں کا عقیدہ تو یہ تھا کہ بارش برسائیں تو بت، کھیتیاں اگائیں تو بت، رزق و روزی کا سامان کریں تو بت اور مصیبت و آفت سے بچائیں تو بت۔ اور ادھر اُن کی بے بسی و بیچارگی کا یہ عالم کہ نہ حملہ آور کا ہاتھ روک سکے اور نہ زبان سے کچھ بول ہی سکے اگر ان صنم پرستوں میں عقل و شعور ہوتا تو وہ حضرت ابراہیمؑ کے اس حسی و مشاہداتی استدلال پر غور کرتے مگر غور و فکر کے بجائے وہ غم و غصہ میں پیچ و تاب کھانے لگے اور انہیں بت شکنی کے جرم میں نمرود کے سامنے پیش کیا۔ اس نے جواب طلبی کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں بتوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیونکر ہوئی اور پھر تمہارے سر میں ہوائے تکبر اتنی بھر گئی ہے کہ تمہیں میری الوہی اقتدار سے بھی انکار ہے فرمایا کہ تمہارے بت ہیں ہی کیا۔ انسانی ہاتھوں کے ترشے ہوئے، ضعیف سے ضعیف مخلوق سے بھی ضعیف تر اور پھر تمہیں خدا کیونکر تسلیم کر لوں جب کہ تم اپنی موت و زیست پر بھی قادر نہیں ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس بیباکانہ رویہ کو دیکھ کر نمرود کے تیور بدلے، شہنشاہیت کا دبدبہ، حکومت کا شکوہ اور عوام کا زور حق کی آواز کو دبانے کے لئے حرکت میں آگیا اور انہی کے چچا نے انہیں پتھروں سے کچل دینے کی دھمکی دی اور نمرود نے حکم دیا کہ انہیں زندہ جلا کر خاکستر کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں جلا دینے کے لئے بڑے پیمانہ پر آگ روشن کی گئی۔ جب انگارے بھڑک اٹھے اور شعلے بلندیوں کو چھونے لگے تو انہیں آگ میں جھونک دیا گیا۔ مگر ان کا ایک بال بھی بیکا نہ ہو سکا۔ گویا آگ نہ تھی کھلا ہوا لالہ زار اور لہلہاتا ہوا گلزار تھا۔ اس اعجاز کو دیکھ کر نمرود دم بخود رہ گیا مگر اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے مال مویشی ضبط کرکے انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ شاہی فرمان سنا تو نمرود سے کہا کہ تمہیں میرے مال مویشی چھین لینے کا کوئی حق

نہیں ہے کہا کہ یہ چیزیں تم نے ہماری مملکت میں رہ کر پیدا کی ہیں۔ فرمایا کہ پھر میں نے جتنی عمر تمہارے شہر میں صرف کی ہے وہ مجھے واپس پلٹا دو اور یہ مال لے لو۔ نمرود سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کہا کہ ان کا مال انہی کے پاس رہے اور انہیں شہر بدر کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ اپنی اہلیہ جناب سارہ اور اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو لے کر سرزمین بابل سے نکل کھڑے ہوئے اور حلب و دمشق سے ہوتے ہوئے فلسطین میں چلے آئے جو اس دور میں کنعان کہلاتا تھا۔ فلسطین میں آپ کا مسکن یروشلم سے گیارہ کے میل کے فاصلہ پر مقام حبرون تھا۔ آپ نے کچھ عرصہ یہاں گزارا پھر دعوتِ توحید کے لئے مصر تشریف لے گئے۔ شاہِ مصر رقیون نے آپ کے ہمراہ جناب سارہ کو دیکھا تو اس کی نیت میں فتور پیدا ہوا۔ اس نے دست درازی کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ شل ہو کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، معافی مانگی اور اس جرم کی تلافی کے لئے کچھ تحائف پیش کئے جن میں ایک کنیز ہاجرہ نامی بھی شامل تھی جو بعد میں خلیلِ خدا کے حرم میں داخل ہوئیں اور ان پرستارانِ توحید کی مقدس جماعت میں ایک فردِ خاندان کی حیثیت سے شامل ہو گئیں۔ مؤرخ طبری نے لکھا ہے کہ ہاجرہ، فرعونِ مصر علوان ابن سنان کی بیٹی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے مصر سے واپسی کے بعد حبرون کو اپنا مستقل مسکن قرار دے لیا اور اپنے پروردگار سے اولاد کی دعا کی تاکہ مقصد کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹا سکے۔ قدرت نے اُن کی دعا قبول کی اور چھیاسی برس کی عمر میں ہاجرہ کے بطن سے پہلا بیٹا اسمٰعیلؑ عطا کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جناب سارہ کے بطن سے جو اولاد سے مایوس ہو چکی تھیں، اسحاقؑ پیدا ہوئے۔

جب جناب سارہ کی گود ہری ہوئی تو انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ آپ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو کہیں اور منتقل کر دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر آمادگی ظاہر کی اور ان دونوں کو لے کر نکل کھڑے ہوئے قدرت کی رہنمائی اور مشیت کی کارفرمائی انہیں صحرائے حجاز کے ایک ویران گوشے میں لے آئی۔ اگرچہ یہ ویرانہ انسانی آبادی اور زندگی کے سروسامان سے یکسر خالی تھا مگر کارفرمائے قدرت نے روزِ ازل سے یہ طے کر رکھا تھا کہ اسے آبادی سے بیگانہ نہ رہنے دے گا بلکہ اُسے ام القریٰ (آبادیوں کا سرچشمہ) قرار دے گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں آبادی کا نقش اُبھرا اور آپ نے جناب ہاجرہؑ اور اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو وہاں پر ٹھہرا دیا اور اس طرح قدرت نے اس بنجر اور خشک وادی کو آبادی سے روشناس کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فلسطین سے نکلتے وقت جناب سارہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان دونوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر فوراً واپس ہوں گے۔ چنانچہ خلیلِ خدا ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر واپسی کے ارادہ سے پلٹے لیکن فرمانبردار و وفاشعار بیوی اور نورِ نظر کی جدائی دل کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ جب کوہِ کدار کے موڑ پر پہنچے تو پلٹ کر ہاجرہؑ و اسمٰعیلؑ کی طرف دیکھا۔ ان کی تنہائی و بے سروسامانی پر نظر کی اور گڑگڑا

کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون ٥

پروردگارا! میں نے تیرے مقدس گھر کے پاس ایسی سرزمین پر جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوتی اپنی کچھ ذریت کو لا بسایا ہے لے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز قائم کریں تو لوگوں کے دلوں کو انکی طرف جھکا دے اور ان کیلئے پھلوں کی روزی کا سامان کرتا کہ وہ تیرے شکر گزار ہوں"

خلیل خدا کو قدرت کی کارسازی پر اطمینان تو تھا ہی پھر بھی اس دعا نے قلب مطمئن میں اطمینان کی لہر دوڑا دی اور آپ جدھر سے آئے تھے ادھر روانہ ہو گئے۔ جناب ہاجرہ نے چادر تان کر سایہ کیا اور اسمٰعیلؑ کو لے کر اس کے نیچے بیٹھ گئیں۔ اگرچہ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا مگر یہ بلند ہمت خاتون ذرا ہراساں نہ ہوئیں اور اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس صحرائی زندگی کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کر لیا۔ نہ ماتھے پر شکن ڈالی نہ دل میں تشویش کو راہ دی۔ اس صحرائے لق و دق میں پانی کی ایک چھاگل آپ کے ہمراہ تھی جو ایک آدھ دن کے بعد خالی ہو گئی۔ اب پانی کی فکر ہوئی۔ کچھ دیر صبر و ضبط سے کام لیا مگر جوں جوں سورج کی تپش بڑھنے لگی۔ پیاس کی شدت بھی بڑھنے لگی۔ بچے کے سنولائے ہوئے چہرے پر نظر پڑتے ہی جناب ہاجرہؑ بے تاب ہو گئیں اور اس خیال سے کہ شاید کسی سمت پانی نظر آجائے، اٹھ کھڑی ہوئیں۔ صفا و مروہ کی چوٹیوں پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور ان پہاڑیوں کے درمیان سات چکر کاٹے لیکن اس دوڑ دھوپ کے باوجود کسی سمت پانی نظر نہ آیا۔ جب پیاس اور تھکن سے بے حال ہو کر واپس آئیں تو دیکھا کہ سنگریزوں سے ڈھکی ہوئی زمین سے پانی رس رہا ہے۔ کنکروں پتھروں کو ہٹایا تو تپتے ہوئے ریگستان کے سینہ سے سرد و شیریں پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ یہ دیکھ کر مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور بیساختہ زبان سے لفظ زم زم نکلا جس کے معنی عبرانی زبان میں "رُک جا" کے ہیں اور اسی لفظ نے بعد میں نام کی حیثیت اختیار کر لی اور وہ چشمہ زمزم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جناب ہاجرہؑ نے اس سرد و شیریں پانی سے اپنی اور اپنے بچے کی پیاس بجھائی اور پتھروں کو جمع کر کے اس کے چاروں طرف ایک منڈیر بنا دی تاکہ پانی اس میں جمع ہوتا رہے اور ضائع نہ ہونے پائے۔ پانی کو دیکھ کر فضا میں اڑتے والے پرندے سمٹ آئے اور چشمہ کے گرد منڈلانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے خشک پہاڑوں اور سرزمینوں اور مردہ ریگزاروں میں زندگی کے آثار ابھر آئے۔

اسی زمانہ میں بنی جرہم کا ایک قافلہ یمن سے شام جاتے ہوئے پہاڑیوں کے اوپر سے گذرا۔ اس نے وادی میں پرندوں کے جھنڈ دیکھے تو حیرت میں کھو گیا کیونکہ اس سے پہلے یہاں پرندوں کو پرواز کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا اور بھلا) نہ پانی ہو اور نہ سبزہ وہاں" پرندوں کا کیا کام۔ بڑھتا ہوا قافلہ رک گیا اور پہاڑ کی بلندیوں سے نیچے اترا۔

دیکھا کہ ایک خاتون ایک بچے کے ہمراہ سر جھکائے بیٹھی ہیں اور پاس ہی پانی کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ چشمہ کو دیکھ کر انہوں نے جناب ہاجرہؑ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے اڑوس پڑوس میں آباد ہو جائیں۔ جناب ہاجرہ تو چاہتی ہی تھیں کہ یہ ویرانہ آباد ہو جائے، کہا کہ مجھے اپنے شوہر خلیل خدا سے پوچھے بغیر کسی کو یہاں بسانے کا اختیار تو نہیں ہے مگر کچھ دن توقف کرو جب وہ آئیں گے تو ان سے پوچھ کر تمہیں اجازت دے دی جائے گی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے معمول کے مطابق آئے تو جناب ہاجرہ نے اُن سے دریافت کر کے انہیں قرب و جوار میں آباد ہونے کی اجازت دے دی اور چند جھونپڑیاں اور خیموں کی ایک مختصر سی آبادی قائم ہو گئی اور دنیا کے نقشہ پر ایک متبرک ترین شہر کے ابتدائی خطوط اُبھر آئے۔

حضرت ابراہیم نے حسب فرمان قدرت اسی گوشہ ویران میں خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ حضرت اسمٰعیلؑ بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ وہ اپنے کندھوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے اور حضرت ابراہیمؑ پتھروں کو چن کر دیواریں کھڑی کرتے اور اس طرح دونوں باپ بیٹوں نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کو تکمیل تک پہنچایا۔ حسن نیت و خلوص عمل کا کرشمہ تھا کہ بہت جلد اسے تمام عرب میں مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس گھر کے تعلق سے ہر گوشہ اور ہر سمت سے لوگ کھنچ کھنچ کر آنے لگے رفتہ رفتہ آبادی بڑھتی گئی اور قلب جزیرۃ العرب میں ایک پر رونق بستی آباد ہو گئی جو بکہ کے نام سے موسوم ہوئی اور یہی اس کا اصلی اور قدیمی نام ہے چنانچہ زبور میں اسے وادیٔ بکہ ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں بھی تعمیر کعبہ کے وقت اسے بکہ ہی کہا گیا ہے:

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین

"پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ بکہ میں تھا جو بابرکت اور سارے جہانوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے۔"

بکہ کا دوسرا عام اور زبان زد خلائق نام مکہ ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ بکہ کی میم کو با سے بدل دیا گیا ہے اور یہ ایک ہی مقام کے دو نام ہیں اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ پر خانہ کعبہ تعمیر ہوا ہے اس کا نام بکہ ہے اور جہاں شہر آباد ہے اس کا نام مکہ ہے۔ ان دونوں ناموں کی وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال بیان کئے گئے ہیں مگر جس کی تائید ارشاد آئمہ طاہرین سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بکہ بکا، بمعنی گریہ سے ماخوذ ہے اور یہ نام اس بنا پر تجویز ہوا کہ جب اطراف عرب کے لوگ یہاں حج و زیارت کے لئے جمع ہوتے تھے تو خانہ کعبہ کے گرد نالہ و بکا کرتے تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

سمیت مکۃ بکۃ لان الناس کانوا یتباکون فیھا (علل الشرائع)

"مکہ کا نام بکہ اس بنا پر ہوا کہ وہاں پر لوگ جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے تھے۔"

اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

انما سمیت بکۃ لان الناس یبتاکون فیھا الرجال والنساء (درمنثور ج ۱ ص ۱۳۵) | مکہ کو بکہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہاں پر زن و مرد جمع ہو کر روتے چلاتے تھے"

اور مکہ مکار سے مشتق ہے اور مکار کے معنی چیخنے چلانے اور سیٹی بجانے کے ہیں۔ اسے مکہ اس لئے کہا گیا کہ یہاں حج کے زمانہ میں لوگ شور و غل مچاتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔ چنانچہ امام رضا علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

سمیت مکۃ مکۃ لان الناس کانوا یمکون بھا۔ (علل الشرائع) | مکہ کو مکہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہاں پر لوگ چیختے چلاتے تھے"

یہ چیخ و پکار اور شور و غل بھی ان کے نزدیک عبادت میں داخل اور جزو نماز تھا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

وما کان صلوٰتھم عند البیت الا مکاء وتصدیۃ۔ | خانہ کعبہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا تھا"

قرآن مجید میں مکہ کو ام القریٰ کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ام کے معنی اصل و بنیاد کے ہیں اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو اساسی و بنیادی حیثیت رکھتی ہو۔ اسے ام القریٰ (آبادیوں کی اصل و بنیاد) کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے انسانی سیلاب کا سرچشمہ امنڈا جو ویران خطوں اور افتادہ زمینوں سے گزرتا ہوا اطرافِ عالم میں پھیل گیا۔ چنانچہ جب حضرت اسمٰعیلؑ نے قبیلہ بنی جرہم کے سردار مضاض ابن عمرو کی دختر سے شادی کی تو اس سے ان کی اولاد پھولی پھلی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تہامہ نجد اور حجاز سے لے کر فلسطین و یمن تک پھیل گئی اور عرب عاربہ کے قدیم باشندوں کے مقابلہ میں عرب کے مستعربہ کے نام سے موسوم ہوئی اور نو آبادیوں کے سلسلے قائم کرتی ہوئی دنیا کے گوشہ گوشہ میں بس گئی۔ یہ سرزمین حرم آبادیوں کی اصل و بنیاد ہونے کے علاوہ دین و ہدایت کا بھی مرکز ہے اسی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر تعمیر ہوا اسی مقام سے اسلام کی عالمی دعوت نشر ہوئی، توحید کا آوازہ بلند ہوا اور اللہ تعالیٰ کے آخری دین کی بنیاد پڑی۔ اسی خطہ میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ اور ہدایت کی کرنیں پھوٹیں اور اسی کے افق سے وہ آفتاب نبوت طلوع ہوا جس کی ضو پاش کرنوں سے نہ صرف ریگزار عرب کے ذرات لو دینے لگے بلکہ اس کی شعاعیں تاریک سے تاریک گوشوں کو منور کرتی ہوئی ایشیا کے مرغزاروں سے لے کر افریقہ کے ریگزاروں تک پہنچ گئیں۔ اور اسی سرزمین کو مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہے یہیں پر آپ کا بچپن اور اوائل شباب کا زمانہ گزرا یہیں کے در و دیوار سے پہلے پہل مانوس ہوئے اسی کے ریگزاروں اور خشک پہاڑوں میں چلے پھرے اور اسی کے کوہ و صحرا کے وسیع دامنوں میں نشو و نما پائی اور یہیں سے یثرب کی جانب ہجرت فرما ہوئے۔

یہ چیز تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ زمین کی مختلف خطے اپنی آب ہوا، ہیئت و ساخت اور جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے مختلف اثرات کے حامل ہوتے ہیں چنانچہ جو چیز ایک سرزمین پر اور ایک آب و ہوا میں پروان چڑھتی ہے وہ دوسری زمین اور دوسری آب ہوا میں پھلتی پھولتی نہیں ہے۔ حالی مرحوم نے کہا ہے ؎

جا کے کابل میں آم کا پودا کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آ کے کابل سے یہاں بہی انار ہو نہیں سکتے بار ور زنہار

اسی طرح ایک ہی قطعہ زمین کے مختلف ٹکڑے سخت یا نرم، بنجر یا زرخیز ہونے کی صورت میں مختلف اثرات رکھتے ہیں۔ چنانچہ زرخیز زمین میں کوئی چیز کاشت کی جائے تو وہ پوری طرح نشوونما پائے گی اور بنجر زمین میں کوئی چیز بوئی جائے تو وہ زمین کے اندر ہی گل سڑ جائے گی۔ اسی طرح سخت اور نرم زمین کے نباتات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ نرم زمین میں اُگنے والے پودے کمزور ہوتے ہیں اور سخت اور پتھریلی زمین میں اگنے والی جھاڑیاں قوی و مضبوط ہوتی ہیں۔ کیونکہ صحرائی جھاڑیوں کو دھوپ، تیز روشنی اور گرم و خشک موسم کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی جڑوں کو زمینی رطوبت کے جذب کرنے کے لئے زمین کی گہرائیوں میں اترنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے قدرت نے اُن میں فطرۃً اتنی طاقت ودیعت فرمادی ہے کہ وہ سنگلاخ زمین میں جگہ پیدا کرتے اور بڑھنے میں زمین کی سنگینی کا مقابلہ کر سکیں اور اس کی سختی و صلابت سے ٹکرا کر اُس کے اندر اپنے ریشوں کا جال پھیلا سکیں۔ امیرالمومنین نے بھی صحرائی زمین کی اس خاصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

الا ان الشجرة البرية اصلب عودا	یاد رکھو کہ جنگل کے درخت کی لکڑی مضبوط ہوتی
والروائع الخضرة ارق جلودا	ہے اور تر و تازہ پیڑوں کی چھال کمزور اور پتلی ہوتی
والنباتات البدوية اقوى وقودا	ہے۔ اور صحرائی جھاڑیوں کا ایندھن زیادہ بھڑکتا
وابطأ خمودا۔ (نہج البلاغہ)	ہے اور دیر میں بجھتا ہے۔"

اس طرح زمین، آب و ہوا اور طبعی ماحول کا اثر انسانوں کی ذہنی اور جسمانی ساخت اور ان کے اخلاق و کردار پر بھی پڑتا ہے۔ اور جو جس سرزمین پر پیدا ہوتا ہے وہاں کی فضا اس کے اخلاق و عادات پر اثر انداز ہوتی ہے چنانچہ وحشی و صحرائی قبائل میں صحرائی فضا کے زیر اثر سختی، تندخوئی اور وحشت و بربریت ہوتی ہے اور شہری باشندوں میں نرم روی، شگفتہ مزاجی اور امن پسندی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور جب ماحول میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور صحرائی باشندے غیر متمدن ماحول کو چھوڑ کر شہری فضا کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں تو رفتہ

رفتہ اسی شہری ماحول میں ڈھل جاتے ہیں اور اُن کی خشونت نرمی سے اور وحشیانہ زندگی متمدن زندگی سے بدل جاتی ہے۔ یونہی مختلف خطوں اور اقلیموں کے رہنے والوں کو ایک خاص مزاج اور ایک خاص افتادِ طبع ہوتی ہے اور ان خطوں کا جائزہ لینے کے بعد وہاں کے باشندوں کی مقامی صفات و خصوصیات سے بڑی حد تک آگاہ ہوا جاسکتا ہے۔

اس ارضی خاصیت کی روشنی میں پتھریلے اور گرم مقامات کے باشندوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ نرم و ہموار زمین کے رہنے والوں کی بہ نسبت زیادہ قناعت پسند، باہمت، پُرزور اور جفاکش ثابت ہوں گے کیونکہ گرم و خشک اور ریگستانی علاقہ میں قدم قدم پر نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ان میں طبعاً ابھر آتی ہے۔ اور وہ بآسانی حوادث و شدائد جھیل جاتے ہیں۔

امیرالمومنینؑ میں قوت و توانائی اور تحمل شدائد کا جوہر خداداد تو تھا ہی مگر جذبۂ بشری کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس قوت و توانائی کے نمو و نمود میں صحرائے عرب کی تعب افروز و مشقت آموز زندگی کو بھی ایک حد تک معاون و سازگار سمجھا جاسکتا ہے۔

نسب و خاندان

یہ قانونِ فطرت ناقابلِ انکار ہے کہ اصل کے خصوصیات فرع کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور ہر انسان آبائی موثرات کی پیداوار اور اپنے اسلاف کی شکل و شمائل کا ورثہ دار ہوتا ہے چنانچہ ہر فرد کے خد و خال میں اس کے آباؤ اجداد کے خطوط و نقوش کی جھلک کم و بیش پائی جاتی ہے۔ اگرچہ عام نگاہیں خط و خال کی باریکیاں نہیں دیکھ سکتیں مگر قیافہ شناس نگاہیں جسم کی ساخت، چہرہ کے خطوط، اندازِ تکلم اور حرکات و سکنات کے آئینہ میں بہت سی حقیقتیں دیکھ لیتی اور انہیں کسی کے آباؤ اجداد اور قوم و قبیلہ کی تشخص میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ خصوصاً سرزمین عرب کے بعض قبائل ژرف نگاہی و باریک بینی میں نمایاں امتیاز اور قیافہ شناسی میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور پہلی ہی نظر میں بھانپ لیتے تھے کہ کون کس باپ کا بیٹا اور کس خاندان کی فرد ہے۔ چنانچہ قبیلۂ بنی لہب و بنی مدلج کی قیافہ شناسی کے سلسلہ میں صاحب مستطرف نے تحریر کیا ہے کہ اگر کسی بچے کے بارے میں شبہ ہوتا تو اسے بنی مدلج کی کسی فرد کے سامنے پیش کیا جاتا وہ ایک نظر بچے پر اور ایک نظر متعدد آدمیوں پر ڈال کر فوراً بتا دیتا کہ فلاں اس بچے کا باپ ہے اور دونوں کے خاندانی علامات اور مشترکہ خطوط کی نشاندہی کر دیتا۔ ایک مرتبہ ایک تاجر زادہ اونٹ پر سوار ہو کر اس قبیلہ کی طرف سے گزرا۔ اس قبیلہ کے ایک شخص نے اسے اور اس کے غلام کو جو آگے آگے چل رہا تھا دیکھا تو کہا کہ یہ سوار اس غلام سے کس قدر مشابہ ہے۔ اس سوار نے یہ الفاظ سنے تو اپنے متعلق شبہ میں پڑ گیا اور دل میں ایک خلش لئے گھر پہنچا اور اپنی

ماں سے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے تحقیق حال کی تو معلوم ہوا کہ اس باپ کا بیٹا نہیں ہے جس کی طرف منسوب ہے بلکہ اسی غلام کا بیٹا ہے اور اس کی ماں کی خیانت نے اسے جنم دیا ہے۔ یونہی زید اور ان کے فرزند اسامہ مسجد نبویؐ میں سر منہ ڈھانپے لیٹے ہوئے تھے کہ مجزز ابن اعور مدلجی کا ادھر سے گزر ہوا اس نے ان دونوں کے کھلے ہوئے پیروں کو دیکھ کر کہا یہ باپ کے پیر ہیں اور یہ بیٹے کے۔ حالانکہ وہ ان دونوں کی شخصیت اور ان کے باہمی رشتہ سے بے خبر تھا۔ صرف پیروں کو دیکھ کر معلوم کر لیا کہ ان میں ایک باپ ہے اور ایک بیٹا۔

یہ قانونِ فطرت صرف انسانوں ہی میں کارفرما نہیں ہے بلکہ نباتات و حیوانات میں بھی جاری و ساری ہے چنانچہ آسٹریلیا کے ایک پادری مینڈل نے نبات و حیوان پر تجربات کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے مٹر کے لمبے اور چھوٹے قد والے پودوں کے زردانوں کو ملا کر بیج تیار کیا اور جب انہیں بویا تو یہ دیکھا کہ سو میں پچھتر لمبے اور پچیس چھوٹے قد والے پودے اُگ آئے ہیں۔ اسی طرح اس نے جانوروں پر بھی تجربہ کیا اور ایک سفید مرغ کو جس پر خال نما سیاہ دھبے تھے ایک سیاہ رنگ کی مرغی سے ملایا اور اس کے انڈے سے بچہ نکلوایا وہ بچہ نیلے رنگ کا مرغ نکلا۔ پھر اس نیلے رنگ والے مرغ کو دوسری مرغی سے ملا کر انڈے حاصل کئے۔ ان انڈوں میں سے جو بچے نکلے ان میں سے دو نیلے رنگ کے مرغ تھے ایک سیاہ رنگ کی مرغی اور ایک سفید مرغ تھا جس پر ویسے ہی خال نما سیاہ دھبے تھے جیسے پہلے مرغ پر تھے۔ اس نباتی و حیوانی تجربہ سے اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ نسلی خصوصیت ایک نسل میں دب بھی جائے تو اگلی نسل میں ضرور ابھر آتی ہے۔

یہ مماثلت صرف شکل و صورت، نک سک اور نوک پلک ہی میں نہیں ہوتی بلکہ اولاد خو خصلت اور افتاد و نہاد کے لحاظ سے بھی اپنے اسلاف کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ان کے طبعی خصائل و شمائل اس کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ علوم جدیدہ نے تجزیہ و تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ عورت و مرد کے تخم امتزاج سے بننے والا خلیہ دار جسم اور اس کے ذرات لونیہ جن سے دوسرے خلیوں کی تخلیق ہوتی ہے آباؤ اجداد کے طبعی خصائص و اوصاف ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ان خلیوں میں سے ہر خلیہ کے اندر چھیالیس ہزار کروموسومز ہوتے ہیں جو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انہیں عام خوردبینوں سے دیکھا نہیں جا سکتا اس چھوٹے سے کروموسوم کے اندر کم از کم تیس ہزار جینز ہوتے ہیں اور یہی جینز آبائی و خاندانی اثرات کو اولاد کی طرف منتقل کرتے ہیں اس اعتبار سے شکم مادر ہی میں آبائی خط و خال کے ساتھ آبائی خصوصیات کے نقوش بھی ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور جب نومولود دنیا میں آتا ہے تو وہ نہ صرف جسمانی لحاظ سے بلکہ ذہنی ساخت کے اعتبار سے بھی اپنے والدین اور اسلاف سے مشابہ ہوتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے ہاتھ پیر کی حرکتیں اسی ذہنی قوت کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہیں جسے وہ ماں باپ سے ورثہ میں لے کر آتا ہے یہ واضح رہے کہ جو صفات کسب

تحصیل سے تعلق رکھتے ہیں جیسے علوم وفنون اور حرفت وصنعت کاری وغیرہ وہ اولاد کو وراثت میں نہیں ملتے بلکہ صرف فطری وطبعی خصائص وصفات کی تکمیل مناسب ماحول اور مناسب تربیت کے زیر اثر ہوتی ہے اور مناسب ماحول یا طبعی استعداد ہی نہ ہو تو وہ صفات دب جاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھ کر پوتوں پڑپوتوں یا ان کی اولاد میں کہیں نہ کہیں ضرور ابھر آتے ہیں بشرطیکہ ماحول اور گردوپیش کے نامناسب حالات نے آباؤ اجداد کی طرف سے منتقل ہونے والی قوت واستعداد کو بیگانگی وبے تعلقی کی حد تک ختم نہ کر دیا ہو۔

اس توارث صفات کی بنا پر اگر کسی کے آباؤ اجداد مذموم وناپسندیدہ صفات کے حامل ہوتے ہیں تو اولاد بھی بُرے اثرات سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اور اگر کسی کے اسلاف بلند ملکات واعلیٰ صفات کے مالک ہوتے ہیں تو اولاد کی شخصیت کے تعمیری عناصر میں ان صفات کی اثراندازی وکارفرمائی بھی ضروری ہے لہذا کسی شخصیت کو پرکھنے اور جانچنے میں اس کے اسلاف کے صفات وخصائل کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ انہی کے خصائص وصفات کی روشنی میں اس کے ذہنی وفکری رجحان کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اور جس شخص کا آبائی سلسلہ اندھیرے میں ہو اس کی فطری صلاحیت اور طبعی رجحان کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ من لم یعرف النسب لم یعرف الناس جو نسب سے واقف نہیں ہے وہ انسان کے صحیح خدوخال نہیں پہچان سکتا۔

امیرالمومنین کی شخصیت اور ان کی نسبی وخاندانی رفعت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے ان اسلاف پر بھی ایک نظر کی جائے کہ جن کی پشتوں میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہیں تاکہ نسلی خصوصیات اور ان خصائص وصفات کا اندازہ ہو سکے جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے بتقاضائے بشریت ورثہ میں ملے اور ان کی عظیم شخصیت کی تعمیر میں ایک مناسب وسازگار عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہے۔

حضرت کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔ علی ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب ابن ہاشم ابن عبدمناف ابن قصی ابن کلاب ابن مرہ ابن کعب ابن لوی ابن غالب ابن فہر ابن مالک ابن نضر ابن کنانہ ابن خزیمہ ابن مدرکہ ابن الیاس ابن مضر ابن نزار ابن معد ابن عدنان۔

تاریخ عرب شاہد ہے کہ اس سلسلہ جلیلہ کی تمام فردیں اپنے اپنے عہد میں دنیا کی بڑی اور عظیم شخصیتیں تھیں اور ان میں کا ہر فرد اپنے آداب وطرز معاشرت میں ایک تہذیب خاص کا حامل مسلک ابراہیمی کا پیرو اصلاح وتجدید کا پیغامبر، ذہنی وعملی انقلاب کا داعی اور بے داغ کردار کا مالک تھا۔ انہوں نے کفرستان عرب کی تاریکی وتیرگی میں دین حنیف کی شمعیں بلند رکھیں۔ وحشت، جہالت اور اخلاق زبوں حالی کے دور میں اخلاقی اقدار کی حفاظت کی اور اپنے عمل وکردار سے عظمتِ انسانی کے نقوش روشن کئے۔ تہذیب وشائستگی کے فروغ معاشرہ کی اصلاح وترقی اور عمرانی واجتماعی عدل اور انسانی حقوق کے تحفظ کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دیا۔

شر و فساد کے عناصر کو کچلنے ۔ انسانیت، اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے میں اپنے مساعی کو سرگرم عمل رکھا۔ تفرقہ بندیوں کو ختم کرنے کے لئے جماعتی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ تجارت کو فروغ دے کر معاشی فلاح و بہبود کا سامان کیا۔ مظلوموں کی حمایت و حق رسی کا بیڑا اٹھایا اور دور و دراز سے آنے والے حاجیوں کی مہمانداری اور مسافروں اور بے نواؤں کی خدمت و اعانت کا ذمہ لیا۔ یہی وہ امتیازات تھے جن کی وجہ سے عوام کے دلوں میں شایانِ شان مقام حاصل کیا اور غیر معمولی عظمت و توقیر کی نظروں سے دیکھے گئے۔

ذیل میں ان عظیم اور تاریخ ساز شخصیتوں کے حالاتِ زندگی مختلف تاریخی کتب سے اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی بلند سیرتوں اور قابلِ فخر کارناموں پر روشنی پڑ سکے۔

عدنان ابن ادد:۔ آپ حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزند قیدار کی اولاد میں ایک نمایاں شخصیت تھے۔ قیدار کی اولاد حجاز ہی میں سکونت پذیر رہی اور آپ بھی حجاز میں پیدا ہوئے۔ بنی اسمٰعیلؑ کے مشہور قبائل انہی کے نسل سے ہیں۔ اسی بنا پر انہیں آلِ عدنان اور آلِ مضر کہا جاتا ہے۔ آپ وجیہہ خوش صورت اور بچپن ہی سے عمدہ و پاکیزہ اخلاق کے مالک تھے۔ چہرے سے فطانت و ذہانت کے آثار جھلکتے تھے اور پیشانی سے اقبال و ہوشمندی کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ ماتھے کی چمک اور چہرے کی تابندگی غمازی کرتی تھی کہ ان کی نسل سے ایک نورِ قدسی کا ظہور ہوگا جو اپنے رُخِ روشن کی چھوٹ سے عالم کو منور و تاباں کرے گا۔

آپ اس دور کے باوقار و پُر تمکنت سردار مشہور ترین شجاع تلوار کے دھنی اور میدان جنگ کے یکہ تاز شہسوار تھے اپنی شجاعت و دلیری کی وجہ سے ایک نمایاں مقام حاصل کیا اور عرب کے ریاست و سربراہی کے بلند عہدہ پر فائز ہوئے۔ بطحا و یثرب کے باشندوں کے علاوہ صحرائی قبائل نے بھی ان کی ریاست و سیادت کو تسلیم کیا۔ اور ان کے پرچم اقتدار کے نیچے جمع ہو گئے۔ آپ نے خانہ کعبہ کی عظمت و توقیر کے پیشِ نظر ایک پردہ تیار کروایا اور اسے کعبہ پر آویزاں کرنے کا شرف حاصل کیا۔ بلاذری نے لکھا ہے :۔

اول من کسا الکعبۃ عدنان — عدنان نے سب سے پہلے خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا"

(انساب ۔ ج ا ۔ ص۱۵)

جب کلدانی فرمانروا بخت نصر، بیت المقدس فتح کرنے کے بعد بلادِ عرب کی طرف تاخت و تاراج کے لئے بڑھا اور سرزمین حجاز پر حملہ آور ہوا تو آپ نے امکانی حد تک اس کا مقابلہ کیا مگر آپ کے ہمراہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ اکیلے یا چند آدمیوں کے ساتھ دشمن کی افواج قاہرہ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ آپ نے حجاز چھوڑنے ہی میں مصلحت سمجھی اور اپنے بیٹوں کو لے کر یمن چلے آئے اور یہیں پر طرحِ اقامت ڈالی اور یہیں پر وفات پائی۔ آپ نے دس فرزند چھوڑے جن میں سب سے زیادہ نامور اور

بلند مرتبت معد ہیں۔

معد ابن عدنان :- آپ کی والدہ کا نام مہدد بنت اللہم تھا جو قبیلہ بنی جرہم سے تھیں۔ آپ اپنے والد کے ہمراہ یمن میں سکونت پذیر تھے وہیں پر پلے بڑھے اور وہیں پر تعلیم و تربیت پائی۔ جب بخت نصر دنیا سے چل بسا اور عرب کی فضا پر سکون ہوئی تو قبائل عرب نے انہیں حجاز واپس آنے کی دعوت دی اور ایک شخص کو خصوصی طور پر ان کے لانے کیلئے بھیجا اور آپ اس کے ہمراہ حجاز چلے آئے اور ایک روایت یہ ہے کہ جب بخت نصر نے عرب پر اقتدار حاصل کر لیا تو حضرت ارمیاء انہیں اپنے ساتھ شام لے گئے اور وہیں پر رہتے سہتے رہے۔ جب بخت نصر کے مرنے سے فتنے تھمے تو آپ حجاز چلے آئے اور عرب کی ریاست و سرداری کے منصب پر فائز ہوئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ اولادِ اسمٰعیلؑ میں کوئی فرد عزت و شرف کے لحاظ سے ان کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکی۔ اپنی حق گوئی، راست بیانی اور خوش اطواری کی بدولت ایک بلند مقام حاصل کیا اور عرب میں انتہائی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے گئے آپ بھی اپنے والد گرامی کی طرح شجاع، نبرد آزما اور فنونِ جنگ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ نہ کبھی دشمن کو پیٹھ دکھائی اور نہ کبھی شکست سے دوچار ہوتے بلکہ ہمیشہ حریف کے مقابلہ میں فاتح و غالب رہے۔ صاحب تاریخ خمیس نے لکھا ہے :-

لم یحارب احدا الارجع بالنصر و الظفر (تاریخ خمیس ج ۱ صفحہ ۱۴۷)	جس سے جنگ کی اس کے مقابلہ میں فتح و کامرانی کے ساتھ پلٹے۔"

آپ نے سب سے پہلے اونٹوں پر کجاوہ رکھنے اور اسے تنگ سے باندھنے کا رواج دیا اور سرزمین حرم کے حدود پر پتھر نصب کر کے ہمیشہ کے لئے اس کی حد بندی کر دی۔

آپ کے چار فرزند تھے قضاعہ، نزار، قنص اور ایاد۔ قضاعہ بڑا بیٹا تھا۔ اسی کے نام پر ان کی کنیت ابو قضاعہ قرار پائی۔ ان بیٹوں میں نزار شرف خصوصی کے حامل ہوئے۔

نزار ابنِ معد :- آپ کی والدہ کا نام معانہ بنت جوشم تھا جو قبیلہ بنی جرہم سے تھیں۔ نزار کی ولادت انتہائی مسرت و شادمانی کے جلو میں ہوئی کیونکہ معد آپ کی تابندہ و تابناک پیشانی کو دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ یہی بچہ حامل نبوت و در نہ دار امانت خلیل ہے۔ انہوں نے اس ولادت کی خوشی میں ہزار اونٹ ذبح کئے اور بڑے پیمانہ پر قبائل عرب کی دعوت کی اور مولود سے مخاطب ہو کر کہا :-

لقد استقللت لك هذا القربان و انه نزر قليل (تاریخ خمیس ج ۱ صفحہ ۱۴۷)	تمہارے مرتبہ کو دیکھتے ہوئے میں اس قربانی کو کم سمجھتا ہوں اور یہ ہے بھی بہت کم۔

اور چونکہ نزار کے معنی تھوڑے اور کم کے ہیں اس لئے بچے کا نام ہی نزار پڑ گیا۔ آپ حسن صورت اور عقل و دانش

کے اعتبار سے اپنی مثل و نظیر نہ رکھتے تھے۔ دیار بکری نے کہا ہے :۔

خرج اجمل اهل زمانه واکثرهم عقلاً۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ صـ۱۴۵)	آپ اپنے دور میں حسن و جمال اور عقل و دانش میں سب سے بڑھے ہوئے تھے"

معد کے انتقال کے بعد قبائل عرب کی قیادت و سرداری انہی سے متعلق ہوئی اور آپ اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کرتے رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے عربی تحریر کی ابتدا کی اور عربی رسم الخط ایجاد کیا۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹوں سمیت صحرا میں مقیم تھے۔ جب موت کے آثار دیکھے تو وہاں سے اٹھ کر مکہ میں چلے آئے اور وہیں پر انتقال کیا۔ صاحب تاریخ خمیس نے لکھا ہے کہ آپ مکہ کے قریب ذات الجیش میں دفن ہوئے۔ آپ نے چار فرزند چھوڑے۔ ربیعہ، انمار، مضر اور ایاد۔ ان میں مضر اس سلسلہ جلیلہ کی ایک کڑی ہیں۔

مضر ابن نزار :۔ آپ کی والدہ کا نام سودہ بنت عک تھا۔ آپ ملت ابراہیمی سے وابستہ اور دینِ حنیف کے پیرو تھے اور دوسروں کو بھی دینِ حنیف کی پیروی کی تلقین کرتے تھے۔ اس دین حنیف سے وابستگی کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے :۔

انهما کانا علی دین ابراهیم (تاریخ یعقوبی ج ۱ صـ۲۲۶)	ربیعہ اور مضر دونوں ابراہیمؑ کے دین پر تھے"

اور ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا :۔

لا تسبو مضر فانه کان قد اسلم۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ صـ۵۸)	مضر کو برا نہ کہو اس لئے کہ وہ مسلمان تھے"

مضر جود و کرم اور عقل و فہم میں یگانہ اور ہر لحاظ سے اپنے بھائیوں میں ممتاز تھے۔ اگرچہ نزار کے چاروں بیٹے عقل و دانش اور فہم و فراست میں مانے ہوئے تھے مگر مضر میں معاملہ فہمی، حقیقت رسی اور مردم شناسی کا خصوصی جوہر تھا۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے کہ جب نزار کا انتقال ہو گیا تو ربیعہ اور مضر نے فرمانروائے وقت کے ہاں جانے کا ارادہ کیا تاکہ وہ قبیلہ کی سرداری ان دونوں میں سے کسی ایک کے پائے نام کرے۔ ادھر مضر سامانِ سفر کی فراہمی میں مصروف ہوئے۔ اُدھر ربیعہ چپکے سے نکل کھڑا ہوا اور بادشاہ کے ہاں پہنچ گیا اور اس سے اچھی خاصی راہ و رسم پیدا کر لی۔ اور اس کے جلد روانہ ہونے کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ بادشاہ سے مراسم پیدا کر کے اسے اپنی طرف مائل کرے اور زیادہ سے زیادہ انعام و اکرام حاصل کرے۔ چند دن کے بعد مضر بھی سامانِ سفر کی تکمیل کے بعد پہنچ گئے مگر اپنی خودداری کی بنا پر بادشاہ سے اس حد تک راہ و رسم پیدا نہ کر سکے جس حد تک ربیعہ پیدا کر چکا تھا۔ جب ان دونوں کی واپسی کا وقت قریب آیا تو بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم

اپنے ضروریات بتاؤ تاکہ انہیں پورا کر دیا جائے۔ مضر سمجھ رہے تھے کہ ربیعہ کو ان پر ترجیح تو دی ہی جائے گی کہا کہ آپ جو مجھے دیں اس سے دوگنا زائد ربیعہ کو دیں کیونکہ وہ سن و سال میں مجھ سے بڑے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنے ضروریات بیان کرو۔ کہا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری ایک آنکھ پھوڑ دی جائے۔ بادشاہ پہلے تو ان کی بات سن کر حیران ہوا اور پھر ان کے مقصد کو سمجھ کر مسکرایا اور کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں دونوں سے یکساں برتاؤ کروں گا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دوں گا یہ تھی مضر کی فراست کہ پہلے تو وہ بات کہی جو بادشاہ کے دل کو لگی تھی اور پھر ایسی بات کہہ دی کہ وہ ان دونوں میں انصاف کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس طرح انہوں نے نہ اپنے حصہ میں کمی ہونے دی اور نہ اپنی قدر و منزلت میں۔

اس فہم و فراست کے علاوہ آپ بڑے خوش گلو اور خوش آواز تھے یہاں تک کہ حیوان بھی ان کی خوش آوازی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ اونٹ سے گر پڑے جس سے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی اور پُر سوز لے میں زبان سے نکلا یایداہ یایداہ (ہائے میرا ہاتھ ہائے میرا ہاتھ) اس آواز کو سن کر آس پاس کے چرنے والے اونٹ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ جب ہاتھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو اونٹ پر سوار ہونے کے بعد اپنی زبان کو نغمہ ریز رکھتے جس سے اونٹ جھومنے لگتا اور اس کے قدموں میں تیزی آجاتی اسی سے عرب میں حدی خوانی کا رواج ہوا اور اسے رجز کا نام دیا گیا۔ ان رجزیہ اشعار کے وزن میں اور اونٹ کی چال میں پوری مطابقت و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور یہی ہم آہنگی تیز رفتاری کی محرک ہوتی ہے اور بعض حدی خوانوں نے تو مضر کے الفاظ کو حدی کا جزو قرار دیدیا۔ چنانچہ ایک حدی خواں کہتا ہے:۔

یاهادیا یاهادیا   ویایداه یایداه

محمد ابن عبداللہ الازرقی نے "اخبار مکہ" میں لکھا ہے کہ بنی جرہم کے بعد آپ نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی۔ نیکی و ہدایت کے سلسلہ میں اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

من یزرع شرا یحصد ندامۃ خیر الخیر اعجله فاحملوا انفسکم علی مکروهها فیما اصلحکم واصرفوها عن هواها فیما افسدکم فلیس بین الصلاح والفساد الا صبر وقایۃ	جو شر کا بیج بوتا ہے وہ ندامت و شرمندگی سمیٹتا ہے۔ عمدہ بھلائی وہ ہے جو فوراً ہو اپنے نفسوں کو اُن ناگوار چیزوں پر اُبھارو جو تمہاری اصلاح و درستی کریں اور ان پسندیدہ چیزوں سے روکو جو خرابی کا باعث ہوں اسلئے کہ صبر اور ضبط نفس ہی وہ چیز ہے جو صلاح اور فساد کے درمیان حدِ فاصل ہے۔"

(تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۲۶)

آپ نے دو فرزند چھوڑے ایک عیلان اور دوسرے الیاس۔

الیاس ابن مضر۔ آپ کا اصل نام حبیب تھا اور جب پیدا ہوئے تھے تو مضر پر ضعیفی و یاس کا عالم طاری تھا۔ اس بنا پر الیاس کے نام سے موسوم ہو گئے۔ والدہ کا نام رباب بنت حیدہ تھا۔ مضر کے بعد قبائل عرب کے رئیس و سردار قرار پائے اور کبیر القوم اور سید العشیرہ کے لقب سے یاد کیے گئے ان کی زندگی پر ملت ابراہیمی کا گہرا سایہ تھا اور ایک ایک عمل دین حنیف کا آئینہ دار تھا۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ایمان کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا:۔

لا تسبوا الیاس فانہ کان مومنا	الیاس کو برا نہ کہو اس لئے کہ وہ صاحب ایمان تھے"

(سیرۃ حلبیہ۔ ج ۱ صہ ۱۷)

اپنے حسن خدمات کے نتیجہ میں جتنی توقیر و عظمت اور عزت و شہرت انہوں نے حاصل کی اس کی مثال اس دور میں کہیں نظر نہیں آتی دیار بکری نے تحریر کیا ہے:۔

لم تزل العرب تعظم الیاس	عرب الیاس ابن مضر کی اسی طرح تعظیم کرتے تھے
ابن مضر تعظیم اہل الحکمۃ	جس طرح لقمان اور ان کے پایہ کے دوسرے حکماء
کلقمان واشباھہ (تاریخ خمیس ج ۱ صہ ۱۴۹)	اور دانشمندوں کی"

قبائل عرب ان کی سوجھ بوجھ اور اصابت رائے پر مکمل اعتماد رکھتے تھے اور قبائلی معاملات اور دوسرے نزاعی امور انہی کی صوابدید سے طے ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا درخشاں کارنامہ یہ ہے کہ اس تاریک دور میں جب کہ دین ابراہیمی میں سے جو آثار رہ گئے تھے وہ مٹتے اور ختم ہوتے جا رہے تھے نظر و فکر کی روشنی پیدا کی اور ملت ابراہیمی کی تجدید کر کے اولاد اسمٰعیل کو اس کا پابند بنایا اور اس طرح دین حنیف کی حفاظت اور ملت ابراہیمی کے تحفظ کا فریضہ ادا کیا یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

کان اول من انکر علیٰ بنی اسمٰعیل	الیاس پہلی فرد ہے جس نے بنی اسمٰعیل کی اس
ما غیروا من سنن اباءھم و	روش پر نکتہ چینی کی کہ انہوں نے سنت آبائی کو بدل
ظہرت منہ امور جمیلۃ حتی رضوا	ڈالا ہے اور ایسے اچھے کام انجام دیئے کہ تمام لوگ
بہ رضالم یرضوہ باحد من	اس سے اتنا خوش ہوئے کہ ادد کے بعد اولاد اسمٰعیل
ولد اسمٰعیل بعد ادد فردھم	میں سے کسی سے اتنا خوش نہ ہوئے تھے۔ اس نے
الی سنن اباءھم حتی رجعت	اولاد اسمٰعیل کو آبائی سنت کی طرف پلٹایا، یہاں
السنۃ تامۃ علیٰ اولھا۔	تک کہ تمام سنن و احکام، سابقہ شکل و صورت میں
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۱۔ صہ ۲۲۷)	عود کر آئے"

الیاس مرضِ سل میں مبتلا تھے۔ ان کی اہلیہ لیلیٰ بنت حلوان نے جو خندف کے لقب سے مشہور تھیں یہ قسم کھائی کہ اگر الیاس کو اس مرض سے شفا نہ ہوئی اور وہ وفات پا گئے تو اپنی بیوگی کا زمانہ جنگلوں اور صحراؤں میں گزاریں گی اور کسی چھت یا سایہ کے نیچے نہ بیٹھیں گی۔ جب الیاس مرض سے جانبر نہ ہو سکے تو لیلیٰ صحرا و بیابان کی طرف نکل گئیں اور وہیں رونے دھونے میں اپنا رنڈاپا کاٹا خصوصاً پنجشنبہ کے دن طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک نوحہ وزاری میں گزارتی تھیں۔ کیونکہ پنجشنبہ کے دن الیاس فوت ہوئے تھے آخر اسی غم واندوہ اور قلق واضطراب میں اپنی زندگی کے دن گذار دیئے۔

الیاس نے اپنے بعد تین فرزند چھوڑے۔ عمرو، عامر اور عمیر۔ یہ تینوں بالترتیب مدرکہ، طابخہ اور قمعہ کے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ الیاس کے بیٹے اور ان کی طرف منسوب ہونے والے قبائل بنی خندف کہلاتے ہیں۔

مدرکہ ابن الیاس :- ان کا اصلی نام عمرو اور کنیت ابوالہذیل تھی اور والدہ کا نام لیلیٰ بنت حلوان قضاعیہ تھا۔ مدرکہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے والد الیاس بال بچوں کو لے کر صحرا کی طرف گئے۔ جب وہاں پر منزل کی تو اونٹوں کی قطار میں ایک خرگوش گھس آیا اور اونٹ بدکنے لگے۔ عمرو نے اس خرگوش کا پیچھا کیا اور اسے پا لیا۔ اس لئے ان کا نام مدرکہ (پا لینے والا) رکھ دیا گیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ نام اس بنا پر تجویز ہوا کہ انھوں نے اپنے اجداد کے تمام محاسن و کمالات کو پا لیا تھا۔ چنانچہ دیار بکری لکھتے ہیں :-

انما سمی مدرکۃ لانہ ادرک کل عز کان فی ابائہ (تاریخ خمیس ج۱ صہ ۱۵۱)	ان کا نام مدرکہ اس لئے ہوا کہ انھوں نے اپنے باپ دادا کی تمام عزتوں کو حاصل کر لیا تھا۔

آپ اپنے بلند پایہ اجداد کی عظمتوں کے امین اور ان کی رفعتوں کے وارث تھے اور اس شرف و امتیاز کی وجہ سے عرب کی سیادت و ریاست کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے :-

کان مدرکۃ ابن الیاس سید ولد نزار قد بان فضلہ وظہر مجدہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۱۔ صہ ۲۲۹)	مدرکہ ابن الیاس اولاد نزار کے سردار تھے اور ان کی فضیلت عیاں اور بزرگی نمایاں ہے۔

آپ نے اپنے بعد دو فرزند چھوڑے :- ہذیل اور خزیمہ۔

خزیمہ ابن مدرکہ :- ان کی کنیت ابوالاسد اور والدہ کا نام سلمیٰ بنت اسلم قضاعیہ تھا۔ دین حنیف کی پابندی اس سلسلہ عالیہ کا شعار تھا۔ آپ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح مسلکِ ابراہیمی پر گامزن رہے۔ عرب میں قبائلی حکومت کا رواج تھا اور پشتوں سے یہ حکومت اس خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ آپ بھی قبائل

عرب کی سرداری و سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ آپ عرب کے فرمانرواؤں میں ایک ممتاز فرمانروا اور بزرگی و فضیلت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ عرب ان کے کمال فضیلت کے معترف اور ان کی رفعت و سربلندی کے سامنے سرنیاز خم کئے ہوئے تھے۔

آپ نے تین فرزند چھوڑے۔ اسد، ہون اور کنانہ۔

کنانہ ابن خزیمہ:۔ آپ کی کنیت ابو نضر اور والدہ کا نام عوانہ بنت سعد تھا۔ خزیمہ کے بعد قبائل عرب کی سرداری ان کے پائے نام ہوئی۔ اس سرداری و ریاست کے ساتھ محاسن و مکارم میں بھی اپنی مثل و نظیر نہ رکھتے تھے اور اتنی خوبیوں کے مالک تھے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ عرب ان کے علم و فضل اور جود و سخا کی وجہ سے انہیں انتہائی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے تھے۔ علامہ حلبی نے لکھا ہے:۔

کان شیخا حسنا عظیم القدار	کنانہ بلند کردار و بلند منزلت بزرگ تھے اور اپنے
تحج الیہ العرب لعلمہ وفضلہ	علم و فضل کی وجہ سے مرجع عرب تھے۔"

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص۱۶)

مورخین نے ان کے جود و کرم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے تھے۔ بلکہ کسی نہ کسی کو اپنا مہمان بناتے اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ اور اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ملتا تو ایک لقمہ خود کھاتے اور ایک لقمہ کسی پتھر کو مہمان تصور کرتے ہوئے اس کے آگے ڈالتے جاتے اور یوں بقول شاعر، "وللارض من کاس الکرام نصیب" اپنے تقاضائے کرم کو پورا فرماتے۔

ان کے حکیمانہ کلمات میں سے چند کلمے یہ ہیں:۔

رب صورۃ تخالف المخبرۃ وقد	بہت سی صورتیں اپنے ظاہری جمال سے فریب دیتی
غرت بجمالھا واختبر قبح	ہیں حالانکہ ان کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔
فعالھا واحذر الصور واطلب	برے افعال کو جانچو۔ ظاہری صورت پر نہ جاؤ اور
الخبر۔ (سیرۃ حلبیہ۔ ج ۱۔ ص۱۶)	سیرت پر نظر رکھو۔"

آپ کی متعدد اولادیں تھیں جن میں سے نضر نورِ نبوت کے حامل و امین قرار پائے۔

نضر ابن کنانہ:۔ آپ کا اصل نام تو قیس تھا۔ مگر حسن و جمال اور چہرے کی رونق و شادابی کی وجہ سے نضر (خوشرو) کے نام سے مشہور ہوئے۔ کنیت ابو یخلد اور والدہ کا نام برہ بنت مر تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ پہلے پہل انہی کا لقب قریش قرار پایا۔ اور آپ ہی کی نسل جو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم ہوئی۔

قریش کہلاتی ہے۔ انہیں قریش کے لقب سے یاد کئے جانے کے چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ آپ کے قبیلہ و خاندان کے افراد صبح و شام آپ کے وسیع دسترخوان پر جمع ہوتے تھے اس اجتماع کی وجہ سے آپ کا لقب قریش ہوا۔ اس لئے کہ تقرش کے معنی یکجا ہونے کے ہیں۔ اور ایک وجہ یہ ہے کہ آپ فقراء و مساکین کی ضروریات کا ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھوج لگاتے اور پھر انہیں پورا کرتے تھے اس بنا پر ان کا لقب قریش پڑ گیا کیونکہ تقریش کے معنی تلاش و تفحص کے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ کشتی پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے کہ آپ کے ہمراہیوں نے ایک بہت بڑے دریائی جانور کو جسے قریش کہا جاتا تھا دیکھا آپ نے تلوار سے حملہ کر کے اُسے مار ڈالا۔ لوگ اسے اٹھا کر مکہ میں لے آئے اور کوہ ابو قبیس کی چوٹی پر رکھ دیا جو اسے دیکھتا حیرت سے کہتا قتل النضر قریشاً۔ نضر نے قریش کو مار ڈالا۔ اس بنا پر خود انہی کا نام قریش پڑ گیا۔ چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے :۔

وقریش هی التی تسکن البحر　　بها سمیت قریش قریشا

(ترجمہ) قریش ایک حیوان ہے جو سمندر میں رہتا ہے اور اسی کے نام پر قریش کا نام قریش ہوا"

ابو حنیفہ دینوری نے اخبار الطوال میں لکھا ہے کہ جب سکندر اپنے فتوحات کے سلسلہ میں یمن سے مکہ معظمہ میں وارد ہوا تو نضر ابن کنانہ سے ملاقات کی۔ اس وقت بنی خزاعہ مکہ کے اقتدار پر قابض تھے۔ سکندر نے بنی خزاعہ کو حکم دیا کہ وہ مکہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور مکہ کا نظم و نسق اور حرم کی نگہداشت نضر اور ان کے بھائیوں سے متعلق کی اور معد ابن عدنان کی اولاد کو ہدایا و انعامات سے نوازا۔

نضر نے حکومت و ریاست پر فائز ہونے کے بعد اخلاقی و معاشی اصلاح پر توجہ دی۔ بے راہرویوں پر کڑی نظر رکھی، ظلم و استبداد کو مٹایا اور عظمت و بزرگی میں بڑا نام پیدا کیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قتل پر سو اونٹوں کی دیت کا نفاذ انہی نے کیا تھا۔

آپ نے اپنے بعد دو فرزند چھوڑے۔ مالک اور یخلد۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک فرزند اور بھی تھا جس کا نام صلت تھا۔

مالک ابن نضر:۔ آپ کی کنیت ابو الحارث اور والدہ کا نام عاتکہ بنت عدوان تھا بعض مورخین نے ماں کا نام عکرشہ لکھا ہے اور بعض نے یہ وضاحت کی ہے کہ عاتکہ نام ہے اور عکرشہ لقب ہے۔ آپ اپنے والد نضر کے بعد عرب کے با اثر اور ممتاز حکمران تسلیم کئے گئے۔ دیار بکری نے لکھا ہے :۔

انما سمی مالکا لانه ملک العرب　　"آپ کا نام مالک اسی بنار پر تھا کہ آپ اقتدار عرب کے مالک تھے"

(تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ ص ۱۵۲)

آپ دینِ ابراہیمی کے پیرو اور اپنے اسلاف کی راہ پر گامزن تھے۔ اپنے بعد تین فرزند چھوڑے حارث شیبان اور فہر۔

فہر ابنِ مالک :- آپ کی کنیت ابو غالب اور والدہ کا نام جندلہ بنت حارث جرہمیہ تھا۔ بعض مورخین کے نزدیک فہر لقب اور اصل نام قریش تھا۔ اور انہی پر سلسلہ قریش منتہی ہوتا ہے اور انہی کی اولاد قریش ہے۔ ابن عبدربہ نے تحریر کیا ہے :-

اما قبائل قریش فانما تنتهی الی فہر ابن مالک لا تجاوزہ۔	قبائل قریش فہر ابن مالک پر منتہی ہوتے ہیں اور ان سے آگے نہیں بڑھتے۔"

(عقد الفرید ج ۱۔ ص۲۰۹)

آپ فضل و کمال کے جوہر سے آراستہ اور اپنے والد کی زندگی ہی میں اپنی عظیم شخصیت کی تعمیر کر چکے تھے۔ والد کی رحلت کے بعد ان کے قائم مقام قرار پائے اور عرب کی ریاست و امارت پر فائز ہوئے۔ علم و فضل میں نام پیدا کیا اور شجاعت و بسالت میں شہرہ آفاق ہوئے۔ انہی کے دور حکومت میں حاکم یمن حسان ابن عبد کلال، حمیریوں اور یمنیوں پر مشتمل ایک لشکر گراں لے کر مکہ پر حملہ آور ہوا تاکہ خانہ کعبہ کو مسمار کر کے اس کے پتھر وغیرہ یمن منتقل کر دے اور وہیں پر خانہ کعبہ تعمیر کرے۔ اور اس طرح مکہ کی تقدیس و مرکزیت کو ختم کر کے یمن کو ادائے حج کا مقام قرار دے۔ جب فہر کو یمنی لشکر کے ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے قبائل عرب کو جمع کر کے ایک لشکر ترتیب دیا اور اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتر آئے۔ دونوں فریق میں بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں فہر کا ایک بیٹا حارث بھی کام آگیا۔ آخر یمنیوں کو شکست فاش ہوئی۔ حسان گرفتار کر لیا گیا اور تین سال قید و بند میں رہنے کے بعد فدیہ دے کر آزاد ہوا اور یمن جاتے ہوئے راستہ میں مرکھپ گیا۔ اور اس طرح قدرت نے دشمن کعبہ کو تباہ و برباد اور اس کے لشکر کو تتر بتر کر کے نگہبان کعبہ کی سطوت و ہیبت کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

آپ کے حکیمانہ کلمات میں سے ایک کلمہ یہ ہے جو اپنے فرزند غالب کو درسِ قناعت دیتے ہوئے فرمایا :-

قلیل ما فی یدیك اغنی لك من کثیر اخلق وجهك وان صار الیك۔ (سیرۃ حلبیہ ج ۱۔ ص۱۶)	تمہارے ہاتھوں میں جو تھوڑا سا مال ہے وہ اس مال فراواں سے کہیں بہتر ہے جس سے تمہاری آبرو میں فرق آئے۔"

فہر کی چار اولادیں تھیں۔ غالب [illegible]، حارث اور اسد۔

غالب ابن فہر :- آپ کی کنیت ابو تیم اور والدہ کا نام لیلیٰ بنت حارث تھا۔ اپنے والد فہر کے

بعد قبائل عرب کی حکومت پر فائز ہوئے اور شرف و عزت کے اعتبار سے اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ آسمانِ عزّو جاہ کے نیرِ تاباں بن گئے آپ کے دو بیٹے تھے۔ تیم اور لوی۔

لوی ابن غالب:۔ لوی لای کی تصغیر ہے جس کے معنی نور و درخشندگی کے ہیں۔ آپ کی کنیت ابو کعب اور والدہ کا نام عاتکہ بنت یخلد تھا۔ اپنے والد کے بعد قبائل عرب کے سربراہ منتخب ہوئے اور فضل و کمال میں نمایاں امتیاز اور عزو شرف میں بلند مقام حاصل کیا۔ حرم کے باہر ایک کنواں کھودا جو الیسیرہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس سے مقامی و غیر مقامی سب سیراب ہوتے تھے۔

آپ کے چار بیٹے تھے۔ کعب، عامر، سامہ اور عوف۔

کعب ابن لوی:۔ آپ کی کنیت ابو حصیص اور والدہ کا نام مادیہ بنت کعب خزاعیہ تھا۔ آپ کے اخلاق و اطوار پاکیزہ اور کردار انتہائی بلند تھا۔ مظلوموں کی دادرسی کرتے، کمزوروں اور مصیبت زدوں کی دستگیری فرماتے۔ عرب کے مسلم الثبوت سردارانِ قریش کی عظمتوں کے مرکز اور اپنے خانوادہ میں سب سے بڑھ کر ذی شرف و بلند مرتبت تھے۔ ان کی عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ ان کی وفات سے سنہ کا اجرا ہوا جو عام الفیل تک باقی رہا۔ اور عرب سنہ کا اجرا کسی عظیم شخصیت کے اٹھ جانے یا کسی غیر معمولی حادثہ کے رونما ہونے سے کرتے تھے۔ یہ سنہ ۵۲۰ برس تک رائج رہا اور یہی آپ کی وفات اور واقعہ فیل کا درمیانی عرصہ ہے۔ آپ سے قبل عرب روزِ جمعہ کو عروبہ کہا کرتے تھے۔ آپ نے عروبہ کا نام جمعہ تجویز کیا، اور اس میں اجتماعات کی بنیاد ڈالی۔ ان اجتماعات میں خطبہ دیتے اور خطبہ میں "اما بعد" سب سے پہلے آپ ہی نے استعمال کیا۔ البتہ خطوط و مکاتیب میں قس ابن ساعدہ ایادی نے اسے لکھنا شروع کیا۔ بہر حال آپ اپنے دور کے ایک سحر بیان خطیب تھے۔ جمعہ کے خطبوں کے علاوہ ایام حج میں جب اطراف و جوانب سے لوگ سمٹ کر مکہ میں جمع ہوتے تھے آپ کے خطبات فضائے بطحا میں گونجا کرتے تھے۔ ان خطبوں میں وفائے عہد، صلۂ رحم، حسنِ سلوک اور بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کی تلقین کرتے اور پیغمبر آخر الزمان کی آمد کی نوید سناتے۔ چنانچہ ایک خطبہ میں فرمایا:۔

صلوا ارحامکم و احفظوا اصہارکم	صلۂ رحمی کرو، سببی قرابتوں کا لحاظ رکھو، وعدہ پورا کرو
داوفوبعہدکم وثمروا اموالکم	اور اپنے مال کو تجارت سے بڑھاؤ اس لئے کہ مال ہی
فانہا قوام مروآتکم ولا تصونوہا	سے ثروت و حسنِ سلوک کو باقی رکھا جا سکتا ہے جہاں
عما یجب علیکم واعظموا ھٰذا	مال صرف کرنے کی ضرورت ہو وہاں صرف کرنے میں
الحرم وتمسکوا بہ نبأ وسیبعث منہ	دریغ نہ کرو۔ اس حرم کی عظمت کو پہچانو اس سے

خاتم الانبیاء بذلك جاء موسیٰ وعیسیٰ — !
(انساب الاشراف - ج ۱ - ص ۴۱)

وابستہ رہو۔ عنقریب اس سے ایک عظیم خبر ظاہر ہوگی اور اسی مقام سے خاتم الانبیاء مبعوث ہوں گے۔ اور یہی خبر موسیٰ و عیسیٰ لے کر آئے تھے۔"

آپ کے تین فرزند تھے۔ مرہ، عدی اور ہصیص۔

مرہ ابن کعب :- آپ کی کنیت ابو یقظہ اور والدہ کا نام مخشیہ بنت شیبان تھا۔ عرب کے بلند پایہ سردار اور نامور قائد تھے۔ آپ نے عرفہ کے قریب ایک کنواں کھودا جسے الردا کہا جاتا تھا اور اہل مکہ اور اُدھر سے گزرنے والوں کو سیراب کرتا تھا۔

آپ کے تین فرزند تھے۔ کلاب، یقظہ اور تیم۔

کلاب ابن مرہ :- آپ کا اصلی نام حکیم کنیت ابو زہرہ اور والدہ کا نام ہند بنت سریر تھا۔ کلاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ اکثر کلاب (کتوں) کے ساتھ شکار کھیلا کرتے تھے۔ قبائل عرب میں ان کی شخصیت بلند اور اہم تھی۔ آبائی شرف کے ساتھ مادری نسبت سے بھی شرف و امتیاز رکھتے تھے۔ فہم و فراست اور تدبر و اصابت رائے میں مشہور تھے عرب اپنے اختلافات مٹانے کے لئے انہی کی طرف رجوع ہوتے اور انہی کے مشوروں پر عمل کرتے۔ آپ نے رفاہ عامہ کے لئے مکہ کے باہر تین کنوئیں خم، رم اور حفر کھودے۔

آپ کے دو فرزند تھے۔ زہرہ اور قصی۔

قصی ابن کلاب :- آپ کا اصلی نام زید۔ کنیت ابو مغیرہ اور والدہ کا نام فاطمہ بنت سعد تھا۔ کلاب ابن مرہ کی وفات کے بعد فاطمہ بنت سعد نے ربیعہ ابن حرام عذری سے عقد ثانی کر لیا اور اپنے شوہر کے ہمراہ بنی عذرہ کی بستیوں کی طرف چلی گئیں۔ کلاب کا بڑا بیٹا زہرہ جوان تھا وہ مکہ ہی میں رہا اور قصی کمسن ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ چلے گئے اور چونکہ اپنے افراد خاندان سے جُدا اور مکہ سے دور ہو گئے تھے اس لئے قصی (دور افتادہ) کے نام سے یاد کئے جانے لگے اور اسی نام سے شہرت عام حاصل کی۔ قصی بنی عذرہ ہی میں پلے بڑھے اور اسی قبیلہ کی ایک فرد شمار ہوتے رہے ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے کسی بات پر نزاع ہو گئی اس نے طنز آمیز لہجہ میں کہا کہ تم ہمارے قبیلہ میں آشامل ہوئے ہو ورنہ اس قوم و قبیلہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قصی نے کہا کہ پھر کس قبیلہ سے ہوں؟ کہا کہ یہ اپنی ماں سے دریافت کرو قصی کبیدہ خاطر ہو کر اپنی والدہ کے پاس آئے اور واقعہ بیان کر کے ان سے اپنے قوم و قبیلہ اور حسب و نسب کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا :-

یا بنی انت اکرم منہ نفساً و

اے بیٹے تم ذاتی جوہر کے لحاظ سے اور باپ کے اعتبار

ابا۔ انت ابن کلاب ابن مرۃ و	سے اس عذری سے کہیں زیادہ شریف تر اور باوقار ہو
قومك بمكة عند البيت الحرام	تم کلاب ابن مرہ کے بیٹے ہو اور تمہارا قبیلہ مکہ میں
(تاریخ کامل۔ج ۲۔ ص۱۱)	خانہ کعبہ کے پاس آباد ہے۔"

قصی کو جب معلوم ہوا کہ ان کا آبائی وطن مکہ ہے تو انہوں نے وہاں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ فاطمہ بنت سعد نے کہا میں تمہیں روکنا نہیں چاہتی بلکہ تمہیں وہاں جانا ہی چاہیئے۔ وہیں تمہارے بھائی بند اور عزیز و اقارب ہیں کچھ دن انتظار کرو۔ جب بنی قضاعہ کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہو گا تو تمہیں ان کے ہمراہ بھیج دیا جائے گا۔ جب حج کا زمانہ قریب آیا تو قصی اپنے سوتیلے بھائی زراج ابن ربیعہ کے ہمراہ بنی قضاعہ کے قافلہ میں شریک ہو کر مکہ آ گئے اور اپنے بھائی زہرہ ابن کلاب کے ہاں مقیم ہوئے۔ اس وقت مکہ بنی خزاعہ کے زیر اقتدار تھا اور حلیل ابن حبیسہ خزاعی مسندِ فرمانروائی پر متمکن تھا۔ قصی نے مکہ میں قیام کرنے کے بعد حلیل سے اس کی بیٹی حبی کا رشتہ طلب کیا۔ حلیل ان کی ذاتی و خاندانی شرافت سے متاثر تو تھا ہی۔ اس نے فوراً رشتہ کو قبول کر لیا۔ اور مراسم نکاح کے بعد اپنی بیٹی کو رخصت کر دیا۔ حبی کے بطن سے قصی کے چار فرزند پیدا ہوئے جو عبد مناف عبد العزیٰ، عبد القصی اور عبد الدار کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ جب یہ بچے جوان ہوئے تو حلیل نے کہا کہ قصی کے بیٹے میرے بیٹے ہیں کیونکہ وہ میری دختر کے فرزند ہیں لہذا آئندہ وہی خانہ کعبہ کے متولی اور مکہ کے حکمران ہوں گے چنانچہ قصی کو اپنا وصی و جانشین قرار دیا۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

فاوصی بولاية البيت والقيام	حلیل نے وصیت کی کہ خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی
بامر مكة الى قصى وقال انت	امارت قصی سے متعلق ہو گی اور ان سے کہا کہ تم ہی
احق به۔ (طبقات۔ج ا۔ ص۹)	اس کے حقدار ہو۔"

کتب تاریخ میں یہ روایت بھی درج ہے کہ جب حلیل کا وقت آخر قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ خانہ کعبہ کی تولیت اس کی بیٹی حبّی سے متعلق ہو گی اور ابو غبشان الملکانی اس منصب میں اس کا شریک ہو گا چنانچہ خانہ کعبہ کا دروازہ ایک دن ابو غبشان کھولتا اور ایک دن حبّی کی طرف سے قصی۔ جب اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا تو قصی نے حبّی سے کہا کہ تولیت کعبہ کی صحیح حقدار اولادِ اسمٰعیل ہے لہذا یہ منصب عبد الدار کے حوالہ کر دینا چاہیئے تاکہ تولیت کعبہ اولادِ اسمٰعیل ہی کے ہاتھوں میں رہے۔ حبّی نے کہا کہ عبد الدار میرا بیٹا ہے میرا اس سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس منصب میں ابو غبشان میرا برابر کا شریک ہے اور اس کا رضامند ہونا مشکل ہے۔ قصی نے کہا کہ اس کی رضامندی و نارضامندی کو مجھ پر چھوڑ دیجیے میں اس سے نمٹ لوں گا۔ جب حبّی اپنے بیٹے کے حق میں تولیت سے دستبردار ہونے پر رضامند ہو گئیں تو قصی نے

طائف کا رخ کیا۔ جہاں ابوغبشان ٹھہرا ہوا تھا۔ طائف میں وارد ہونے کے بعد ایک رات اس کے ہاں گئے، دیکھا کہ محفل ناؤ نوش گرم ہے، شراب کا دور چل رہا ہے اور ابوغبشان نشہ میں بدمست پڑا ہے۔ آپ نے اُسے جھنجھوڑا اور تولیت کعبہ کے سلسلہ میں اس سے بات چیت کی اور کچھ مول تول کے بعد ایک اونٹنی اور ایک مشکیزہ شراب کے عوض خانہ کعبہ کی تولیت اس سے خرید لی۔ جب نشے سے اسے ہوش آیا تو اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تولیت اس کے ہاتھوں سے جاتی رہی اور کچھ بنائے بنی نظر نہ آتی تھی قصی اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آ گئے۔ اور بھرے مجمع میں خانہ کعبہ کی کلید عبدالدار کے سپرد کر دی۔ جب بنی خزاعہ و بنی بکر نے یہ دیکھا کہ ابوغبشان کی حماقت و بدمستی کے نتیجہ میں خانہ کعبہ کی تولیت ان کے ہاتھوں سے جاتی رہی ہے اور قصی حسن حیل سے کامیاب ہو گئے ہیں تو وہ تولیت کعبہ کی واپسی پر مصر ہوئے اور لڑنے مرنے پر اُتر آئے۔ قصی بھی ان کے مقابلہ میں ہٹنے نہ تھے انہوں نے بھی جنگ کی ٹھان لی۔ قریش اور بنی کنانہ تو ان کے ساتھ تھے ہی زراح ابن ربیعہ اور اس کے بھائی بھی بنی قضاعہ کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی مدد کو پہنچ گئے۔ فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں طرف کے اچھے خاصے آدمی مارے گئے تو کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور یہ طے پایا کہ فریقین کی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کیا جائے اور اُس کے فیصلہ پر عملدرآمد کیا جائے۔ چنانچہ یعمر ابن عوف کو ثالث قرار دیا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی امارت پر قصی کا حق فائق ہے ان کے ساتھیوں میں سے جو آدمی مارے گئے ہیں ان کا خون بہا ادا کیا جائے اور بنی خزاعہ و بنی بکر میں سے جو قتل ہوئے ہیں ان کا خون رائیگاں تصور ہو۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد ہوا اور قصی بلا شرکت غیرے حرم کے عہدوں پر فائز ہوئے اور مکہ کے خود مختار حکمران تسلیم کیے گئے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں:۔

ولی قصی البیت وامر مکۃ و جمع قومہ من منازلھم الی مکۃ وتملک علی قومہ واھل مکۃ فملکوہ فکان قصی اول بنی کعب اصاب ملکا اطاع لہ بہ قومہ فکانت الیہ الحجابۃ والسقایۃ والرفادۃ والندوۃ واللواء فحاز شرف مکۃ کلہ۔	"قصی خانہ کعبہ کے متولی اور مکہ کے حکمران ہوئے انہوں نے اپنے قوم و قبیلہ کو مختلف جگہوں سے مکہ میں جمع کیا اور اپنی قوم اور مکہ والوں پر اقتدار حاصل کیا اور سب نے ان کے اقتدار کو تسلیم کیا۔ کعب کی اولاد میں قصی پہلے حکمران ہیں جن کے سامنے ان کی قوم نے سر اطاعت خم کیا، کلیدداری حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے کی خدمت مجلس کی صدارت اور لشکر کی علمبرداری ان سے متعلق ہوئی۔ غرض وہ سارے عہدے حاصل کیے جو مکہ میں شرف و امتیاز کا باعث تھے۔"
(تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ ص ۱۵۵)	

خانہ کعبہ کی تولیت اولادِ اسمٰعیل ہی کے پاس ئے نام تھی۔ چنانچہ اسمٰعیل کے بعد ان کے فرزند نابت خانہ کعبہ کے متولی و نگران قرار پائے۔ لیکن نابت کے بعد یہ تولیت بنی اسمٰعیل کے ہاتھوں سے نکل گئی اور نابت کے ننھیال بنی جرہم کی طرف منتقل ہو گئی۔ بنی جرہم اقتدار کے نشہ میں کھو کر ظلم و ستم پر اتر آئے اور جوں جوں اُن کے اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں اُن کے مظالم بڑھتے گئے۔ ان کے ہاتھوں نہ لوگوں کی عزت محفوظ تھی اور نہ ان کے املاک و اموال۔ آخر دوسری صدی عیسوی میں جب یمن سیلاب کی زد میں آیا تو خزاعہ نامی ایک شخص یمن سے مکہ چلا آیا۔ اس نے رفتہ رفتہ اتنی قوت و طاقت بہم پہنچائی کہ وہ مکہ کے اقتدار پر قابض ہو گیا اور اس طرح بنی خزاعہ کی سلطنت کی بنیاد پڑی جو تقریباً دو سو برس تک قائم رہی۔ خزاعہ نے مکہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں کو باہر نکال دیا اور اولادِ فہر کو بھی اطراف و جوانب میں دھکیل دیا۔ جب بنی خزاعہ سے اقتدار قصی کی طرف منتقل ہوا تو انہوں نے اولادِ فہر کو جو پہاڑوں کے دامنوں اور صحراؤں میں بکھری ہوئی تھی اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتی تھی جمع کر کے مکہ کے مختلف حصوں میں آباد کیا اور اُن میں اتحاد و یکجہتی پیدا کی۔ اسی جمع آوری کی وجہ سے مجمع (جمع کنندہ) کے لقب سے یاد کئے گئے۔ چنانچہ حذافہ ابن غانم نے اپنے اس شعر میں اس کا تذکرہ کیا ہے :ـ

ابوکم قصی کان یدعی مجمعاً　　　به جمع الله القبائل من فهر

"تمہارے باپ قصی وہ ہیں جو مجمع کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور انہی کے ذریعہ اللہ نے فہر کی مختلف شاخوں کو ایک جگہ جمع کیا۔"

اس جمع آوری کی وجہ سے آپ کا لقب قریش پڑ گیا۔ کیونکہ قریش تقریش سے ماخوذ ہے اور تقریش کے معنی جمع اور یکجا کرنے کے ہیں۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ نام کس سے چلا اور پہلے پہل کون اس لقب سے یاد کیا گیا۔ بعض تاریخ نگاروں کا نظریہ یہ ہے کہ مضر کی اولاد قریش ہے اور بعض کا خیال ہے کہ الیاس کی اولاد قریش ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ لقب پہلے پہل نضر ابن کنانہ کو ملا اور ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ لقب فہر ابن مالک کو ملا۔ لیکن اربابِ تحقیق کا نظریہ یہی ہے کہ یہ لقب سب سے پہلے قصی کو ملا اور انہی کی اولاد قریش کہلا سکتی ہے۔ چنانچہ علامہ طبری نے لکھا ہے :ـ

لما نزل قصی الحرم و غلب	جب قصی حرم میں وارد ہوئے اور اقتدار حاصل کیا
علیه فعل افعالا جمیلة فقیل	تو عمدہ کارنامے انجام دیئے۔ اس وجہ سے انہیں
له القرشی فهو اول من سمی	قرشی کہا جانے لگا اور سب سے پہلے انہی کا نام
به۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۲۳۳)	قرشی قرار پایا۔"

عبدالملک ابن مروان نے محمد ابن جبیر سے دریافت کیا کہ قریش کو کب سے قریش کہا جاتا ہے؟ کہا کہ جب سے وہ حرم میں آباد ہوئے قریش ہی کہلاتے رہے۔ اس لئے کہ قریش تقرش سے ماخوذ ہے اور تقرش کے معنی یکجا ہونے کے ہیں۔ عبدالملک نے کہا:۔

ماسمعت هذا ولكن سمعت ان قصيا كان يقال له القرشي ولم تسم قريش قبله (طبقات ابن سعد ج ۱ ص۷۱)	میں نے تو ایسا نہیں سنا۔ بلکہ میرے سننے میں یہ آیا ہے کہ قصی کو قرشی کہا جاتا تھا اور اس سے پہلے کسی کو اس نام سے یاد نہیں کیا گیا۔"

خود ابن سعد کی بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

بقصي سميت قريش قريشا وكان يقال لهم قبل ذلك بنو النضر۔ (طبقات۔ ج ۱ ص۷۱)	قصی کی وجہ سے قریش کو قریش کہا جاتا ہے ورنہ ان سے پہلے وہ بنو نضر کہلاتے تھے۔"

بہرحال قصی نے اولادِ فہر کو خانہ کعبہ کے جوار میں بسا کر ان کی عظمت رفتہ کو پھر سے زندہ کیا اور انہیں متمدن زندگی سے ہمکنار کر کے قدر و منزلت کی انتہائی رفعتوں پر پہنچا دیا۔ اسی بنا پر اولادِ فہر اور دوسرے قبائل انہیں عظمت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے اور اُن کے ہر حکم کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم کرتے جس طرح دینی و مذہبی احکام کے آگے سر جھکایا جاتا ہے۔ بلاذری نے لکھا ہے:۔

كان امر قصي عند قريش دينا يعملون به ولا يخالفونه۔ (انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص۵۲)	قریش کے نزدیک قصی کا ہر حکم دین و مذہب کے حکم کا درجہ رکھتا تھا جس پر وہ عمل پیرا ہوتے اور سرِ مُو اس کی مخالفت نہ کرتے۔"

اولادِ فہر کو بسانے اور یکجا کرنے کے علاوہ آپ نے اپنے دورِ اقتدار میں سقایہ و رفادہ کے عہدے قائم کئے تاکہ زائرانِ بیت اللہ کو کھانا، پانی اور دوسری آسائشیں مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اہل مکہ کے اشتراکِ عمل سے دور دراز سے آنے والے حاجیوں کو کھانا کھلاتے، پانی پلاتے اور اُن کے دوسرے ضروریات و حوائج کا خیال رکھتے اور اہل مکہ کو حجاج کی خدمت و اعانت پر آمادہ کرتے ہوئے اپنے خطبات میں فرماتے:۔

انكم جيران الله واهل بيته وان الحاج ضيف الله وزوار بيته وهم احق الضيف بالكرامة فاجعلوا لهم طعاما وشرابا ايام	تم لوگ اللہ کے ہمسائے اور اس کے حرم میں بسنے والے ہو یہ حجاج اللہ کے مہمان اور اس گھر کے زائر ہیں اور سب مہمانوں سے بڑھ کر عزت و تکریم کے مستحق؛ لہذا حج کے دنوں میں ان کے کھانے اور

الحج۔ (تاریخ کامل۔ج ۲۔ص۱۸) پہننے کا سروسامان کرو۔"

آپ نے اپنی متحرک و باعمل زندگی میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی عمارت کو گروا کر از سرنو تعمیر کروایا اور اس پر کھجور کی لکڑیوں کی چھت ڈلوائی۔ عرفات و منیٰ کے درمیان ایک عمارت تعمیر کی اور اسے مشعر الحرام کے نام سے موسوم کیا۔ ایام حج میں اس پر چراغ جلائے جاتے تھے۔ تاکہ حجاج کو وہاں تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ ابن عبدربہ نے تحریر کیا ہے:۔

هو الذی بنی المشعر الحرام کان یسرج علیه ایام الحج۔	"قصی نے مشعر الحرام تعمیر کیا جس پر حج کے دنوں میں چراغ جلائے جاتے تھے۔"

(عقد الفرید۔ج ۲۔ص۳۰۹)

مزدلفہ میں رات کے وقت آگ کے روشن کرنے کا انتظام کیا تاکہ عرفات سے آنے والے حاجیوں کے قافلے منزل سے بھٹکنے نہ پائیں۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

وقصی اول من احداث وقود النار بالمزدلفه وکانت توقد علی عهد رسول الله ومن بعده۔ (تاریخ کامل۔ج ۲۔ص۱۸)	"قصی نے سب سے پہلے مزدلفہ میں آگ جلانے کا انتظام کیا اور پھر رسول اللہؐ کے زمانہ میں اور اُن کے بعد بھی روشن کی جاتی رہی۔"

آپ سے پہلے حدودِ مکہ میں مکانات تعمیر نہیں کئے جاتے تھے بلکہ لوگ جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے آپ نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کے قریب ایک گھر تعمیر کیا جس کا دروازہ خانہ کعبہ کی طرف کھلتا تھا۔ یہ گھر "دارالندوہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:

بنی دار بمکة وهی اول دار بنیت بمکة وهی دار الندوة (تاریخ یعقوبی ج۱ص۲۳۹)	"قصی نے اپنا گھر مکہ میں تعمیر کیا اور یہ پہلا گھر تھا جو مکہ میں تعمیر ہوا اور "دارالندوہ" کہلایا۔"

قریش اس گھر کو بڑی عزت و تقدیس کی نظروں سے دیکھتے تھے اور تبرکاً شادی بیاہ کے رسوم اسی گھر میں انجام دیتے اور قومی و ملی معاملات طے کرتے اور آپس کے جھگڑے چکانے کے لئے یہیں پر جمع ہوتے اور جنگ کے لئے نکلتے تو لوائے جنگ یہیں آراستہ کرتے۔ قصی کے وارد مکہ ہونے سے پہلے اہل مکہ لوی ابن غالب کے کنوئیں یسیرہ اور مرہ ابن کعب کے کنوئیں الروا اور ان جوہڑوں سے پانی حاصل کرتے تھے جن میں بارشوں کا پانی جمع ہوتا تھا۔ آپ نے اہل مکہ کی ضرورت کے پیش نظر حدود مکہ کے اندر ایک کنواں کھدوایا جسے عجول کہا جاتا تھا۔ یہ کنواں اس مقام پر تھا جہاں ام ہانی بنت ابی طالب کا مکان تھا۔ غرض خانہ کعبہ اور دیگر مشاعر کی تعمیر اولادِ فہر کی آبادکاری

اور ان کے سود و بہبود کے سلسلہ میں جو کارنامے انجام دیئے وہ ان کی عظمت اور غیر معمولی کارکردگی کی روشن مثال ہیں جب تک ان کے قائم کردہ آثار باقی ہیں ان کا نام بھی زندہ و پائندہ ہے۔

ان تعمیری یادگاروں کے علاوہ ان کے کلمات کو بھی سرمایہ و حکمت و دانش سمجھ کر محفوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کلمات صرف دوسروں ہی کو روشنی نہیں دکھاتے بلکہ ان کے آئینہ میں خود ان کے اخلاق و عادات اور طرز زندگی کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے حکیمانہ کلمات میں سے چند کلمے یہ ہیں:۔

من اشرك لئيما اشركه فی لومه	جو کسی ذلیل و کمینہ آدمی کا ہمنوا ہوگا وہ اس کے کمینہ
ومن استحسن قبيحا نزل الی قبحه	پن میں شریک ہوگا۔ جو برائی کو اچھی نظروں سے دیکھے
ومن لم تصلحه الكرامة اصلحه	گا وہ برائی میں مبتلا ہوگا۔ جس کی احترام و اکرام سے
الهوان ومن طلب فوق قدره	اصلاح نہ ہو اس کی درستی تذلیل و تحقیر ہی کے ذریعہ ہو
استحق الحرمان والحسود العدو	گی۔ جو اپنی حیثیت سے زیادہ کا طلبگار ہوتا ہے وہ محرومی
الخفی۔ (سیرت حلبیہ ج ۱ ص۱۳)	کا حقدار قرار پاتا ہے۔ حاسد چھپا ہوا دشمن ہے۔"

زندگی کے آخری لمحوں میں اپنی اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

اجتنبوا الخمرة فانها تصلح الا	شراب سے پرہیز کرنا۔ اگرچہ اس سے جسموں کی
بدان وتفسد الاذهان (سیرت حلبیہ ج ۱ ص۱۳)	اصلاح ہوتی ہے مگر عقل و شعور کو تباہ کر دیتی ہے"

آپ نے ۴۸۰ء میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور کوہ حجون کے دامن میں دفن ہوئے۔ عرب نے اپنے محبوب فرمانروا اور عظیم محسن کا بڑا سوگ منایا اور اُن کی قبر کی زیارت کرکے اظہار عقیدت کرتے۔ بلاذری نے لکھا ہے:۔

لما مات دفن بالحجون فكانوا	جب انہوں نے وفات پائی تو کوہ حجون میں دفن ہوئے
يزورون قبره و يعظمونه۔	لوگ اُن کی قبر کی زیارت کو آتے اور ان کی عظمت
(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص۱۵۲)	کا اعتراف کرتے۔"

عبد مناف ابن قصی:۔ آپ کا اصل نام مغیرہ اور کنیت ابو عبد شمس تھی۔ حسن صورت کی وجہ سے قمر البطحا، جود و سخا کی وجہ سے فیاض اور عظمت و شرف کی وجہ سے السیّد کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی کلیدداری کے عہدہ پر اگرچہ قصی کا بڑا بیٹا عبدالدار فائز تھا مگر قریش کی سربراہی عبد مناف کے پائے نام ہوئی بلکہ وہ اپنے حسن عمل اور بلند اخلاق کی بدولت اپنے والد قصی کی زندگی ہی میں قومی قیادت کے منصب پر فائز اور سیادت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ دیار بکری نے لکھا ہے:۔

ساد عبد مناف فی حياة ابيه	عبد مناف اپنے باپ کی زندگی ہی میں امارت پر

وکان مطاعاً فی قریش۔ فائز ہو چکے تھے اور قریش میں ان کا ہر حکم مانا
(تاریخ خمیس۔ج ۱۔ص ۱۵۶) جاتا تھا۔"

آپ اپنے نامور باپ کے طور طریقوں پر گامزن رہے اور ان کے قائم کردہ رفاہی اداروں کو باقی و برقرار رکھا۔ آپ نے چار فرزند چھوڑے۔ ہاشم، مطلب، عبدشمس اور نوفل۔ ہاشم اور مطلب کو "البدران" (دو چاند) کہا جاتا تھا۔

ہاشم ابن عبد مناف:۔ آپ کا اصل نام عمرو تھا اور علو مرتبت کی وجہ سے عمرو العلا کہا جاتا تھا۔ کنیت ابو نضلہ، لقب سید البطحاء اور ابو البطحاء اور والدہ کا نام عاتکہ تھا۔ نام اور کنیت کے بجائے ہاشم کے لقب سے مشہور و متعارف ہوئے۔ اس لقب سے یاد کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ قحط سالی کے دنوں میں بڑی تعداد میں روٹیاں پکوائیں اور انہیں اونٹوں پر لاد کر شام سے مکہ میں لائے۔ ان اونٹوں کو ذبح کیا اور روٹیاں توڑ کر شوربے کے بڑے بڑے پیالوں میں بھگوئیں اور اہل مکہ اور مکہ میں آنے والوں کو شکم سیر کھلائیں اس وقت سے ہاشم کے لقب سے یاد کئے جانے لگے کیونکہ ہشم کے معنی توڑنے کے ہیں۔

ہاشم اور عبدشمس جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ ایک کا پنجہ دوسرے کی پیشانی سے پیوست تھا دونوں تلوار سے کاٹ کر جدا کئے گئے۔ اس موقع پر یہ پیشین گوئی کی گئی کہ ان دونوں کی اولاد میں تلوار چلے گی اور ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان دونوں کی اولادوں میں ہمیشہ ان بن اور باہمی نزاع رہی اور انہی دونوں سے دو متحارب خاندان بنی ہاشم و بنی امیہ وجود میں آئے جو کیا بلحاظ سیرت و اخلاق اور کیا بلحاظ افکار و نظریات ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پہلا ٹکراؤ ہاشم اور عبدشمس کے بیٹے امیہ میں ہوا پھر عبدالمطلب ابن ہاشم اور حرب بن امیہ میں تصادم رہا۔ حرب کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان پیغمبرؐ اسلام کے مقابلہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور مختلف محاذوں پر جنگ کے شعلے بھڑکاتا رہا۔ ابوسفیان کے بعد اس کا بیٹا معاویہ حضرت علیؑ سے نبرد آزما ہوا اور کئی خونریز جنگیں لڑیں۔ اور پھر یزید ابن معاویہ نے حضرت حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے افراد خاندان اور رفقاء و انصار پر ہر قسم کے مظالم توڑے اور اس دشمنی و عناد کو آخری حدوں تک پہنچا دیا۔ غرض بنو امیہ اور بنو ہاشم کی باہمی عداوت پشت در پشت چلتی رہی اور مصلحتاً اسلام لانے کے بعد بھی بنو امیہ کی کینہ توز طبیعتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی اور وہ ہمیشہ بنی ہاشم کی بیخ کنی کی فکر میں لگے رہے۔

ہاشم اور عبدشمس اگرچہ ایک ہی باپ دادا کی اولاد تھے مگر ان میں اتنا ہی تفاوت تھا جتنا ایک ہی شاخ میں کھلنے والے پھول اور اگنے والے کانٹے میں ہوتا ہے۔ حضرت ہاشم بلند کردار اور انتہائی اہم شخصیت تھے۔ عالی ظرفی و کریم النفسی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ مظلوموں اور بے نواؤں کا ان کے گرد جھرمٹ رہتا تھا۔ وہ مظلوموں

کی دادرسی کرتے بے نواؤں کی طرف دستِ تعاون بڑھاتے، اپنے قبیلہ کے ناداروں کی اعانت فرماتے اور اُن کی معاشی اصلاح کی بھی فکر و تدبیر کرتے۔ چنانچہ قریش کی اقتصادی برتری اور معاشی بلندی بڑی حد تک اُن کی مساعی کا نتیجہ ہے، انہوں نے قریش کے ذہنوں میں تجارت کی خوبیوں کو بٹھا کر انہیں ترقی و بہبود کی راہ پر لگایا۔ حضرت ہاشم سے پہلے بھی قریش کا ذریعہ معیشت تجارت تھا۔ اور ایک قول کی بنا پر انہیں قریش کہا جاتا تھا۔ تو اس لئے کہ یہ لفظ قرش سے ماخوذ ہے اور تقرش کے معنی کاروکسب اور تجارت کے ہیں مگر ان کی تجارت صرف مکہ اور اس کی مضافاتی بستیوں تک محدود تھی۔ آپ نے تجارت کو ترقی دی اور اپنا کاروبار شام و حبشہ تک پھیلا دیا۔ اور ساتھ ہی قریش کو بھی حرکت و عمل کی دعوت اور جاڑوں میں یمن و حبشہ کی طرف اور گرمیوں میں شام بلکہ غزہ و انقرہ تک قریش کے تجارتی قافلے لے جانے لگے۔ قیصرِ رُوم ان کا انتہائی احترام کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر قیصر سے یہ لکھوا لیا کہ قریش کے مالِ تجارت پر محصول عائد نہیں کیا جائے گا، آمد و رفت کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی اور تجارتی گذرگاہوں میں حفاظت کا سامان کر کے انہیں بے خطر بنایا جائے گا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش پوری دلجمعی کے ساتھ تجارت کی طرف لگ گئے ان کی اقتصادی حالت کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور آسودگی و مرفہ حالی سے ہمکنار ہو گئے۔

قصی کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کا متولی اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو قرار دیا تھا مگر وہ اس اہم منصب کا اپنے کو اہل ثابت نہ کر سکا اور نہ اس کی اولاد میں سے کوئی اس تولیت کی ذمہ داری نباہ سکا۔ دن بدن حالات بگڑتے گئے اور ہر شعبہ میں ابتری محسوس کی جانے لگی۔ ہاشم نے جب دیکھا کہ بنو عبدالدار سے یہ کام نہیں سنبھل سکتا تو انہوں نے اپنے بھائیوں مطلب، نوفل اور عبد شمس سے مشورہ کیا اور سب نے باتفاق رائے یہ طے کیا کہ حرم کے عہدے اولاد عبدالدار کے ہاتھ سے لے لئے جائیں اور انہیں معزول و برطرف کر دیا جائے کیونکہ جب تک وہ ان عہدوں پر قابض رہیں گے حالات سلجھنے کے بجائے اُلجھتے چلے جائیں گے۔ جب اولاد عبدالدار کو علم ہوا کہ انہیں تولیت سے بے دخل کیا جا رہا ہے تو وہ مسلح تصادم پر اُتر آئے ادھر اولاد عبد مناف بھی ٹکراؤ پر آمادہ ہو گئی۔ قبائل عرب بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ بنی اسد، بنی زہرہ، بنی تیم اور بنی حارث اولاد عبد مناف کے طرفدار بن گئے۔ اور بنی مخزوم، بنی سہم اور بنی عدی اولاد عبدالدار کے ہمنوا ہو گئے۔ بنو عبد مناف اور ان کے حامی قبائل مطیبین کہلائے اور بنو عبدالدار اور ان کے ہمنوا قبائل احلاف کے نام سے موسوم ہوئے۔ قریب تھا کہ مطیبین اور احلاف میں جنگ چھڑ جائے کہ کچھ امن پسند اور صلح جو افراد بیچ میں پڑے اور کہا کہ بہتر یہ ہے کہ باہمی گفت و شنید سے فیصلہ کر لیا جائے اور اگر جنگ چھڑ گئی تو اس کے نتائج بڑے ہولناک ہوں گے۔ چنانچہ اس امر پر فریقین میں تصفیہ ہو گیا کہ سقایہ و رفادہ کے

عہدے اولادِ عبد مناف کے سپرد کر دیے جائیں اور ندوہ حجاب اور لوا کے عہدے اولادِ عبدالدار کے پاس بدستور رہیں۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو اولادِ عبد مناف نے رفادہ و سقایہ کے لئے آپس میں قرعہ ڈالا۔ قرعہ ہاشم کے نام پر نکلا اور یہ دونوں منصب ان کے سپرد کر دیئے گئے۔

حضرت ہاشم نے ان عہدوں کو سنبھالنے کے بعد نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کیا، رفادہ و سقایہ کو وسعت دی، حاجیوں کے کھانے پینے کے انتظامات کئے۔ سجلہ اور بذر دو کنوئیں کھدوائے اور اپنے دادا قصی کے کاموں کو فروغ دے کر منتہائے کمال تک پہنچایا۔ جب حج کا زمانہ قریب آتا تو قریش کو خانہ کعبہ پاس جمع کرتے اور انہیں حاجیوں کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرماتے:۔

یا معشر قریش انکم جیران اللہ واھل بیتہ وانہ یاتیکم فی موسمکم ھذا زوار اللہ تبارک ذکرہ یعظمون حرمۃ بیتہ وھم اضیافہ واحق الناس بالکرامۃ فاکرموا اضیافہ وزوار کعبۃ۔

(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ صفحہ ۶)

"اے جماعت قریش تم اللہ تعالیٰ کے پڑوس میں بسنے والے اور اس گھر کے رہنے سہنے والے ہو۔ وہ زمانہ آگیا ہے کہ اللہ کے گھر کے زائر مراسم تعظیم بجالانے کے لئے تمہارے ہاں جمع ہوں وہ سب کے سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے مہمان ہیں اور سب سے بڑھ کر عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مہمانوں اور خانہ کعبہ کے زائروں کا اکرام و احترام کرو۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر سرمایہ فراہم کرتے۔ کچھ قریش سے لیتے اور زیادہ تر اپنے پاس سے دیتے۔ اور دور دراز سے آنے والے حاجیوں کے کھانے پینے کا سیر چشمی سے سر و سامان کرتے۔ مکہ و منیٰ میں دسترخوان چن دیے جاتے۔ چمڑے کے حوضوں میں پانی بھر دیا جاتا اور واردانِ حرم ان کے وسیع دسترخوان سے شکم سیر ہو کر کھاتے اور سرد و شیریں پانی سے سیراب ہوتے۔

اسود ابن شعر کلبی نے اس عمومی دعوت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میں جب اپنے قبیلہ کی ایک مالدار خاتون کا کارندہ تھا تو مال تجارت لے کر مختلف مقامات پر آیا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میرا گزر حج کے دنوں میں منیٰ و عرفات کی طرف ہوا۔ رات کا وقت تھا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا میں نے ایک جگہ رات بسر کی۔ جب صبح ہوئی تو میں نے کچھ فاصلے پر دیکھا کہ طائف کے چمڑے کے اونچے اونچے خیمے نصب ہیں آگے بڑھا تو دیکھا کہ دیگیں کھنک رہی ہیں چولہوں میں آگ جل رہی ہے کچھ جانوروں کو ذبح کیا جا چکا ہے اور کچھ جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے لایا جا رہا ہے۔ نوکر چاکر چل پھر کر مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور وسیع انتظامات دیکھ کر میں حیرت میں کھو گیا۔ اور

میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس قبیلہ کے سردار کو دیکھوں جس نے اس بڑے پیمانہ پر دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ میں ابھی خاموش کھڑا تھا کہ ایک شخص نے میرے ارادہ کو بھانپ کر مجھے آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک بلند و بالا اور آراستہ شامیانے کے نیچے فرش بچھا ہوا ہے اور اس پر رؤساء قریش و سرداران عرب حلقہ باندھے خاموش بیٹھے ہیں اور ان کے وسط میں ایک پر وقار شخصیت مسند پر جلوہ افروز ہے۔ چہرے پر عظمت و شرافت کا جلال برس رہا ہے اور پیشانی کی درخشندگی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ستارۂ شعریٰ اپنے افق سے طلوع ہو رہا ہے۔ ہاتھ میں عصا سر پر سیاہ عمامہ اور عمامہ کے نیچے سے لانبی کاکلیں شانوں پر لہرا رہی ہیں۔ میں اس منظر کی تابانیوں میں کھو گیا۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک شخص بلند آواز سے پکار رہا ہے: اے اللہ کے گھر میں آنے والو کھانے کے لئے آؤ۔ اور دوسری سمت دو شخص پکار کر کہہ رہے ہیں: جو شخص دوپہر کا کھانا کھا چکا ہے وہ جائے اور رات کے کھانے پر پھر آئے۔" اسود کہتا ہے کہ میں نے علمائے یہود سے سن رکھا تھا کہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں نبی اُمّی کا ظہور ہوگا۔ میں اس عظیم شان و شکوہ اور فیاضانہ دعوت کو دیکھ کر یہ خیال کرنے لگا کہ کہیں آنے والا نبی یہی تو نہیں ہے میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ مسند نشین سردار کون ہے؟ اس نے کہا کیا تم نہیں پہچانتے۔ یہ ابو نضلہ ہاشم ابن عبد مناف ہیں۔ میں نے یہ سن کر کہا:

هذا و الله المجد لا مجد آل جفنة   خدا کی قسم عظمت و بزرگی اسے کہتے ہیں نہ آل جفنہ (شاہان شام) کی بزرگی کو۔"

(تاریخ یعقوبی ج ۱۔ صفحہ ۲۴۲)

ہاشم کی اس فیاضی و بلند ہمتی نے ان کی عظمت و اجلال کا سکہ قبائل عرب کے دلوں پر بٹھا دیا اور فضائے عرب میں ان کی نیک نامی و شہرت کے پھریرے لہرانے لگے۔ امیہ ابن عبد شمس جو پست فطرت اور چھچھوری طبیعت کا تھا اس کی نظروں میں ہاشم کی یہ شہرت و ہر دلعزیزی خار بن کر کھٹکنے لگی اور احساس کمتری نے اسے بُری طرح حسد میں مبتلا کر دیا۔ اس نے چاہا کہ ہاشم کو عوام کی نظروں سے گرائے اور خود قوم و قبیلہ میں وہ مقام حاصل کرے جو ہاشم کو نصیب ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی دولت و ثروت کا سہارا لے کر عمومی دعوتوں کا سامان کیا۔ مگر طبعی جذبۂ کرم اور ہے اور دوسرے کو نیچا دکھانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے مظاہرۂ جود و سخا اور ہے۔ اس نے لاکھ دریا دلی دکھائی مگر ہاشم کی سی بات کہاں۔ آخر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ایک آدھ دعوت کا اہتمام کر کے ہمت ہار بیٹھا۔ یہ بات اس کے لئے ذلت و رسوائی کا باعث ہوئی اور وہ "نہ کردن یک" کے طعنے سے بچنے کو "کردن صد" کے پھندے میں پھنس گیا۔ لوگوں نے آوازے کسے مضحکہ اڑایا اور اس کی دعوتوں میں سو عیب نکالے۔ امیہ پہلے ہی سے جلا بھنا بیٹھا تھا۔ لوگوں کی طنزیہ باتوں سے سیخ پا ہوا اور طیش میں آ کر ہاشم کی شان میں گستاخی کی اور ایسے الفاظ تک کہے جو تہذیب و شائستگی کے

خلاف تھے اور اس زمانہ کے رسم و دستور کے مطابق منافرہ کی دعوت دی یعنی کسی ثالث سے فیصلہ کرایا جائے کہ ان دونوں میں عظیم اور فخریہ کارناموں کے لحاظ سے کس کا پایہ بلند ہے۔ ہاشم کی شخصیت بلند تر تھی کہ وہ اپنی بلندی و برتری کے ثبوت کے لئے ایسی چیزوں کا سہارا لیتے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ مگر قریش نے انتہائی اصرار کر کے انہیں آمادہ کر لیا۔ ہاشم آمادہ تو ہو گئے مگر اس کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی کہ جس کے خلاف فیصلہ ہو وہ پچاس سیاہ چشم اونٹنیاں دوسرے کو دے اور دس برس کے لئے مکہ سے ترک کر کے کہیں اور چلا جائے۔ امیہ اس شرط پر بھی راضی ہو گیا اور دونوں نے کاہن خزاعی کو ثالث قرار دیا۔ جب دونوں نے اس کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا تو اس نے سنتے ہی ہاشم کی بلندی و برتری کا فیصلہ دے دیا۔ ہاشم نے حسب معاہدہ امیہ سے پچاس اونٹنیاں لیں اور انہیں ذبح کر کے اہلِ مکہ کی بڑے پیمانہ پر دعوت کی۔ اور اُمیہ مکہ چھوڑ کر اردن کے علاقہ میں صفوریہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں اس نے دس سال جلا وطنی میں گزارے۔ اس واقعہ سے دونوں خاندانوں میں دشمنی و عناد پڑ گئی اور افتراق و اختلاف کی وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ بلاذری نے لکھا ہے :۔

فكان اول عداوة وقعت بين هاشم و امية۔ (انساب الاشراف ج ۱ ص ۶۱)

"یہ دشمنی و عناد کا پہلا شاخسانہ تھا جو ہاشم اور اُمیہ میں رونما ہوا۔"

بہر حال حضرت ہاشم اپنے دور کی وہ عظیم ترین شخصیت ہیں جن کی ذاتی عظمت نسبی رفعت اور بلند نفسی و بلند نظری اپنے مقام پر ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ انہوں نے نہ صرف حجاز میں بلکہ بیرون حجاز بھی اپنے جود و ایثار اور رفاہی کارناموں کی بدولت شہرت حاصل کی۔ اور عوام تو عوام شاہانِ وقت تک انہیں انتہائی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور شاہِ روم اور نجاشی حبشہ تو انہیں اپنی لڑکیوں کا رشتہ دینے کے خواہشمند تھے مگر انہوں نے حجاز کے باہر رشتہ جوڑنا گوارا نہ کیا اور عرب ہی کے قبائل میں مختلف اوقات میں شادیاں کیں۔ ان شادیوں میں بقائے نسل و ظہورِ نورِ نبوت کے لحاظ سے سب سے اہم شادی وہ تھی جو قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنی نجار میں کی۔ حضرت ہاشم عرصہ سے محسوس کر رہے تھے کہ قدرت نے جس نورِ رسالت کا انہیں امین قرار دیا ہے وہ نور ان سے ابھی جدا نہیں ہوا۔ اسی فکر میں تھے کہ انہیں خواب میں سلمٰی بنت عمرو سے جو یثرب میں مقیم تھیں عقد کرنے کی بشارت ہوئی۔ یہ خاتون پاکیزہ سیرت اور نجابت و شرافت کے اعتبار سے بلند پایہ تھیں۔ دیار بکری نے لکھا ہے :۔

كانت في زمانها كخديجة في زمانها لها عقل وحلم۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ ص ۱۵۵)

"سلمٰی عقل و حلم سے آراستہ اور اپنے زمانہ میں اسی پایہ کی خاتون تھیں جس پایہ کی خاتون اپنے دور میں حضرت خدیجہ تھیں۔"

ہاشم یہ خواب دیکھنے کے بعد اپنے چند عزیزوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہوگئے اور عمرو ابن زید کے ہاں اترے۔ اس نے ان معزز مہمانوں کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور لوازم مہمانداری بجالایا اور تشریف آوری کی وجہ پوچھی۔ جب اس کو مقصد سے آگاہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ مجھے رشتہ دینے سے انکار نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ اگر سلمٰی کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو وہ یثرب ہی میں قیام کریں گی۔ ہاشم نے اس شرط کو منظور کر لیا اور ابتدائی مراحل کی تکمیل کے بعد عقد ہو گیا۔ اس تقریب کے بعد ہاشم اپنے کاروبار کے سلسلہ میں شام چلے گئے۔ جب شام سے پلٹ کر آئے تو سلمٰی کو یثرب سے مکہ لے آئے۔ کچھ عرصہ کے بعد سلمٰی اُمید سے ہوئیں تو ہاشم شام جاتے ہوئے سلمٰی کو یثرب میں چھوڑ گئے اور خود شام چلے گئے۔ ہاشم کا یہ سفر تجارت سفر آخرت ثابت ہوا اور پھر انہیں وطن کی جانب پلٹنا نصیب نہ ہُوا۔ وہیں پر چند دن صاحبِ فراش رہنے کے بعد ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں آنکھیں بند کر لیں۔ اور عسقلان سے چھ میل کے فاصلہ پر مقام غزہ میں پیوند خاک ہوئے۔

جب ہاشم کے شرکا سفر ہاشم کی خبر مرگ لے کر واپس پلٹے تو مکہ و یثرب کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص رنجیدہ و سوگوار نظر آتا تھا اور ہر زبان پر ان کی مہمان نوازی، غربا پروری اور ہمدردی و مواسات کے تذکرے تھے۔ سلمٰی نے یہ اندوہناک خبر سنی تو دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ زندگی پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ دنیا تیرہ و تار ہو گئی اور خزاں دیدہ چمن میں بہار کی آمد کی توقع نہ رہی۔ مگر دنیا میں حزن و مسرت توأم ہیں۔ کبھی رنج و غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور کبھی مسرت و شادمانی کے مسکراتے سحاب سایہ فگن ہوتے ہیں۔ سلمٰی کا دل اگرچہ بجھ چکا تھا مگر بجھے ہوئے دل کو روشنی کی کرن نظر آئی اور گود مولودِ نو کی آمد سے آباد ہو گئی۔ یہ مولود تو عبدالمطلب کے نام سے موسوم ہو کر ہاشمی تاج کا آویزہ اور اُن کے جمال و کمال کا آئینہ ثابت ہوا۔

حضرت ہاشم کے متعدد بیٹے تھے مگر ان میں سے دو بیٹوں کے ہاں اولادیں ہوئیں ایک اسد اور دوسرے عبدالمطلب۔ اسد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہُوا جس کا نام حنین تھا مگر اس کی نسل آگے نہیں چلی۔ اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جن کا نام فاطمہ تھا۔ یہ حضرت ابوطالب کے عقد میں آئیں اور ان سے حضرت علیؑ اور ان کے دوسرے بھائی پیدا ہوئے۔ البتہ عبدالمطلب کا سلسلۂ اولاد آگے بڑھا اور انہی سے ہاشمی نسل کا سلسلہ دنیا میں قائم ہوا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے:۔

لیس فی الارض ھاشمی الامن	روئے زمین پر جو ہاشمی ہے وہ عبدالمطلب ہی کی
ولد عبد المطلب۔ (المعارف۔ صؔ۳۶)	اولاد ہے۔"

عبدالمطلب ابن ہاشم:۔ آپ کا اصل نام عامر اور کنیت ابوالحارث تھی۔ جب پیدا ہوئے تھے تو وسطِ سر میں کچھ سفید بال تھے۔ اور بالوں کی سفیدی کو شیب کہتے ہیں اس لئے شیبہ اور شیبۃ الحمد کے نام

سے پکارے جاتے تھے۔ آپ کے والد حضرت ہاشم عالمِ غربت و مسافرت میں دنیا سے چل بسے اور آپ پدری محبت و شفقت سے ناآشنا ہی رہے۔ اپنے ننھیال مدینہ میں ماں کی آغوشِ شفقت میں پلے بڑھے اور سات آٹھ برس کی عمر تک وہیں رہے۔

عرب میں شہسواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی تربیت کا لازمی جزو تھے اور شروع ہی سے بچوں میں ان چیزوں کا مذاق پیدا کر دیا جاتا تھا۔ شیبہ بھی بچپنے میں تیر اندازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یثرب کے کھلے میدان میں بچوں کے ساتھ مل کر تیر اندازی کر رہے تھے اور جب تیر نشانہ پر لگتا تو بے ساختہ پکار اٹھتے انا ابن سید البطحاء "میں سردار مکہ کا بیٹا ہوں"۔ بنو حارث کا ایک شخص ادھر سے گزرا۔ اس نے یہ الفاظ سنے تو پوچھا کہ تم کون ہو اور کس کے بیٹے ہو؟ کہا میرا نام شیبۃ الحمد ہے اور میں ہاشم ابن عبد مناف کا بیٹا ہوں۔ وہ شخص مکہ میں واپس آیا اور شیبہ کے چچا مطلب سے یہ سارا واقعہ بیان کیا۔ مطلب نے کہا کہ مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی کہ میں نے اب تک اپنے یتیم بھتیجے کی خبر لی اور نہ اسے دیکھنے یثرب گیا۔ اب میں سیدھا یثرب جاؤں گا اور شیبہ کو اپنے ساتھ لاؤں گا۔ چنانچہ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور یثرب پہنچ کر بنی نجار کے محلہ میں گئے وہاں چند بچوں کو کھیلتے دیکھا جن میں شیبہ بھی تھے۔ آپ نے شیبہ کو فوراً پہچان لیا اور بنی نجار کے چند لوگوں سے پوچھا کہ کیا ہاشم کا بیٹا یہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ اتنے میں ان لوگوں نے بھی پہچان لیا کہ یہ شیبہ کے چچا مطلب ہیں۔ پوچھا کہ کیا شیبہ کو آپ لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمایا ہاں۔ کہا کہ پھر یہیں سے لے جائیے ہم آپ کو روکیں گے نہیں۔ اور اگر شیبہ کی والدہ کو خبر ہو گئی اور اس نے نہ چاہا تو پھر ہمارا فرض ہو جائے گا کہ آپ کو روکیں اور شیبہ کو لے جانے سے مانع ہوں۔ آپ نے اپنا ناقہ بٹھایا اور شیبہ سے کہا کہ میں تمہارا چچا ہوں آؤ میرے ساتھ اس ناقہ پر بیٹھ جاؤ۔ شیبہ بغیر کسی حیل و حجت کے اونٹنی پر بیٹھ گئے اور مطلب انہیں مکہ میں لے آئے۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو قریش نے آپ کے ہمراہ ایک بچے کو دیکھا تو کہا: ھذا عبد المطلب "یہ مطلب کا غلام ہے"۔ مطلب نے کہا کہ یہ میرا غلام نہیں ہے بلکہ ہاشم کا بیٹا اور میرا بھتیجا ہے۔ مگر یہ نام زبانوں پر چڑھ گیا اور شیبہ کے بجائے عبد المطلب کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔

اس دور میں تعلیم و تربیت کے لئے نہ کوئی مکتب تھا نہ مدرسہ اور نہ لکھنے پڑھنے کا رواج۔ دو چار آدمیوں سے زیادہ لکھے پڑھے ہوئے آدمی نہ تھے۔ عبد المطلب نے باوجودیکہ سر پر باپ کا سایہ نہ تھا خود ہی دوسرے فنونِ عرب کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا جس پر ان کی بعض تحریریں شاہد ہیں۔ چنانچہ ابن ندیم نے لکھا ہے:۔

كان في خزانة مامون كتاب بخط عبد المطلب ابن هاشم في جلد ادم

مامون کے خزانہ میں ایک چرمی جلد پر عبد المطلب ابن ہاشم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویز تھی جس

فیہ ذکر حق عبد المطلب ابن ھاشم من اھل مکۃ علی فلان ابن فلان الحمیری۔ (فہرست ابن ندیم۔ صـ۱۳۱)	میں ایک حمیری پر آپ کے ایک مطالبہ کا تذکرہ تھا"

اس ملکہ نوشت و خواند اور فنون مروجہ میں مہارت کے علاوہ ظاہری اعتبار سے بھی وجیہہ صورت، کشیدہ قامت اور جذاب و پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں:۔

اطول الناس قامۃ و احسنہم وجھا ما راٰہ احد قط الا احبہ (تاریخ اسلام ذہبی۔ صـ۳۷)	میں نے اپنے والد کو کہتے سنا ہے کہ عبدالمطلب دراز قامت اور سب سے زیادہ وجیہہ اور خوبصورت تھے جو انہیں دیکھتا ان کا گرویدہ ہو جاتا"

حضرت ہاشم کے بعد ان کے حسب وصیت مُطلب قریش کی امارت اور حرم کے عہدوں پر فائز تھے۔ مطلب نے چاہا کہ اپنی زندگی ہی میں یہ عہدے عبدالمطلب کے سپرد کر دیں اور خود ان عہدوں سے دستبردار ہو جائیں جب انہوں نے یمن جانے کا ارادہ کیا تو عبدالمطلب سے کہا کہ تم اپنے باپ کے وارث و جانشین ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ ان عہدوں کو سنبھال سکو۔ لہذا یہ منصب تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ مطلب قریش کی امارت اور حرم کے عہدے عبدالمطلب کے سپرد کر کے یمن چلے گئے اور وہیں پر مقام ردمان میں وفات پا گئے۔

عبدالمطلب میں امارت و قیادت اور عوام کی رہنمائی کے تمام جوہر موجود تھے۔ انہوں نے حرم کے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد ملکی و معاشرتی خامیوں کی اصلاح کی، رفادہ و سقایہ کو ترقی دے کر حاجیوں کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کی طرف توجہ فرمائی اور چاہِ زمزم جو صدیوں سے زمین کے نیچے دب کر بے نشان ہو چکا تھا اس کا کھوج نکالا اور اسے کھود کر استفادہ کے قابل بنایا۔ زمزم اس قدر ناپید ہو چکا تھا کہ عرب میں اس کا نام ہی تکتم پڑ گیا تھا جس کے معنی خفا و پوشیدگی کے ہیں۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے تکتم کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:۔

لانھا کانت مکتومۃ قد اندفنت بعد ایام جرھم حتی اظھرھا عبدالمطلب۔ (فائق۔ ج ۱۔ صـ۱۴۶)	بنی جرہم کے بعد چاہِ زمزم زمین میں گم ہو کر رہ گیا تھا، یہاں تک کہ عبدالمطلب نے اسے ظاہر کیا"

اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ جب مکہ کے سابقہ فرمانروا بنی جرہم، بنی خزاعہ سے مغلوب ہو کر مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو ان کے سردار عمرو ابن حارث جرہمی نے سونے کے دو ہرن جو اسفندیار ابن گشتاسب نے بطور نذرانہ بھیجے تھے اور خانہ کعبہ کے چڑھاوے کی سات تلواریں اور پانچ زرہیں چاہِ زمزم میں پھینک کر اسے مٹی

پتھر سے اس طرح بھر دیا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ اور خود بنی جرہم کے ساتھ یمن چلا گیا۔ سالہا سال تک کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اور بعد کے آنے والوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ زمزم کہاں پر واقع تھا عبدالمطلب کو خواب میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی۔ آپ نے ان نشانات کی روشنی میں محل وقوع کا کھوج لگایا اور اپنے فرزند حارث کو ساتھ ملا کر کھدائی شروع کی۔ تین دن کی محنت شاقہ کے بعد کنوئیں کے آثار دکھائی دیئے۔ آپ نے ان آثار کو دیکھ کر اللہ کی عظمت کا نعرہ لگایا۔ اور تھوڑی سی کھدائی کے بعد پانی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اس کنوئیں میں سے عمرو ابن حارث کی پھینکی ہوئی تلواریں، زرہیں اور سونے کے ہرن بھی برآمد ہو گئے۔

قریش جو اب تک اس کام کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے اور نہ اس محنت و کاوش میں شریک تھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر عبدالمطلب کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ چیزیں ہمارے آباؤ اجداد کی ملکیت تھیں لہٰذا انہیں آدھوں آدھ تقسیم ہونا چاہیئے۔ آدھا آپ لیں اور آدھا ہمیں دیں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ میری محنت و ریاضت کا ثمرہ ہے اور تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ پھر بھی تم چاہو تو قرعہ پر فیصلہ کر لو۔ قریش اس پر راضی ہو گئے اور قرعہ خانہ کعبہ، قریش اور عبدالمطلب کے نام پر ڈالا گیا۔ سونے کے ہرن خانہ کعبہ کے نام پر اور زرہیں اور تلواریں عبدالمطلب کے نام پر نکلیں اور قریش منہ تکتے رہ گئے۔ عبدالمطلب نے زرہیں اور تلواریں فروخت کر دیں اور خانہ کعبہ کا دروازہ تعمیر کرایا اور طلائی ہرنوں کو پتروں کی صورت میں ڈھلوا کر خانہ کعبہ پر جڑوا دیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

فکان اول ذھب حلیۃ بہ الکعبۃ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۶)   یہ خانہ کعبہ پر پہلی طلا کاری تھی۔"

قریش کو جب ان چیزوں کے حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کنوئیں کے متعلق دعویٰ کیا کہ ہمیں اس میں مالکانہ حیثیت سے شامل کیا جائے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ میری سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اور اللہ نے صرف مجھے عطا کیا ہے۔ تم جب چاہو اس سے پانی لے سکتے ہو مگر ملکیت کے کوئی معنی نہیں ہیں مگر قریش اپنے دعویٰ پر بضد ہوئے اور آخر یہ طے پایا کہ شام جا کر بنی سعد کی کاہنہ کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ جو فیصلہ کرے فریقین اُسے تسلیم کریں۔ عبدالمطلب اس پر رضامند ہو گئے اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ قریش کے قافلہ میں شریک ہو کر شام روانہ ہو گئے۔ ابھی راستہ میں تھے کہ عبدالمطلب اور ان کے ہمراہیوں کے مشکیزے خالی ہو گئے انہوں نے قریش سے پانی طلب کیا۔ قریش کے پاس پانی تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمارے پاس پانی کا ذخیرہ کم ہے اگر اس میں سے تمہیں دے دیں تو ہمیں اپنی جانوں کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے۔ جب اس تپتے ہوئے صحرا میں عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں پر پیاس کی شدت

انتہا کو پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی قبر کھود ے تاکہ ہم میں سے جو
مرجائے اسے دوسرے دفن کردیں۔ آخر میں ایک باقی رہ جائے گا تو ایک کا بے گوروکفن رہنا سب کے بے گور
رہنے بہتر ہے۔ ان تشنہ کاموں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودلیں اور موت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔
ابھی بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ عبدالمطلب نے کہا کہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا بزدلی ہے۔ ابھی
نہ ہمارے ہاتھ پیروں نے ہمارا ساتھ چھوڑا ہے اور نہ ہماری طاقت نے جواب دیا ہے۔ اللہ کی رحمت بے پایاں
پر بھروسا کر کے اٹھو۔ ہمت مردانہ سے کام لو اور پانی تلاش کرو۔ شاید کسی سمت پانی نظر آجائے اور ہم اس
بے کسی کی موت سے بچ جائیں یہ کہہ کر جستجوئے آب کے لئے اونٹنی پر سوار ہوئے۔ ابھی اونٹنی نے قدم اٹھایا تھا
کہ اس کے پیروں کے نیچے سے شیریں وشفاف پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ چشمہ کو دیکھ کر عبدالمطلب کے ساتھی اچھل
پڑے۔ پانی پینے کے بعد اپنے مشکیزے بھرے اور قریش سے کہا کہ آؤ تم بھی پانی پیو اور اپنے خالی مشکیزے
بھرلو۔ قریش نے جب یہ ابلتا ہوا چشمہ دیکھا تو عبدالمطلب سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جھگڑا نمٹا دیا ہے جس
نے اس صحرائے بے آب میں آپ کے لئے پانی کا سروسامان کردیا ہے اسی نے آپ کو چاہِ زمزم عطا کیا ہے۔
اب ہمیں کاہنہ کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اٹھیے مکہ واپس چلیے۔ چنانچہ دونوں فریق وہیں سے مکہ واپس
آگئے نزاع ختم ہوگئی۔ اور زمزم پر عبدالمطلب کا قبضہ مسلم ہوگیا۔ چاہِ زمزم کی بنیاد اگرچہ حضرت اسمٰعیلؑ سے
قائم ہوئی تھی مگر اس کی تجدید عبدالمطلب کے ہاتھوں ہوئی۔ عبدالمطلب کے دور میں مکہ میں اور کنوئیں
بھی کھد چکے تھے مگر جو بات زمزم میں تھی وہ کسی میں نہ تھی۔ اہل مکہ اور باہر سے آنے والے حجاج اسے متبرک
وبابرکت سمجھتے ہوئے زیادہ تر اسی سے پانی حاصل کرتے اور اسی سے سیراب ہوتے۔ اسی بنار پر اسے شباعہ بھی
کہا جاتا تھا کیونکہ اسے پینے والا سیر وسیراب ہوجاتا تھا۔ اور شباعہ کے معنی سیری کے ہیں۔ اور اب بھی ہزاروں
لاکھوں کی تعداد میں مکہ جانے والے حجاج اس سے سیراب ہوتے اور تبرکاً اس کا پانی اپنے اپنے شہر اور قریہ
میں لے جاتے ہیں۔ اگر یہ ایک اعتبار سے حضرت اسمٰعیلؑ کی نشانی ہے تو ایک حیثیت سے عبدالمطلب کی بھی
یادگار ہے۔

ابن واضح اور دوسرے مورخین نے طائف کے کنوئیں کے متعلق بھی اسی طرح کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ
کنواں ذوالہرام کے نام سے موسوم تھا جسے عبدالمطلب نے بڑی کدوکاوش سے کھودا تھا۔ آپ کبھی کبھار وہاں
جاتے اور چند دن ٹھہرتے۔ ایک مرتبہ آئے تو دیکھا کہ بنی کلاب و بنی رباب کے کچھ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں آپ
نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کس لئے یہاں فروکش ہو؟ کہا کہ ہم اس کنوئیں کے مالک بنی کلاب و بنی رباب
ہیں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ کنواں میرا ہے۔ تم یہاں ٹھہر سکتے ہو تو میری اجازت سے۔ انہوں نے اپنی ملکیت

کے دعویٰ کو دہرایا اور دونوں طرف بات بڑھنے لگی۔ آخر عبدالمطلب نے بات ختم کرنے کے لئے کہا کہ تم جسے چاہو اسے حکم ٹھہرالو میں اس کا فیصلہ تسلیم کرلوں گا، انہوں نے سطیح غسانی کا نام لیا جو عرب کا مشہور کاہن تھا۔ دونوں فریق میں یہ شرط طے پائی کہ سطیح غسانی جس کے خلاف فیصلہ دے گا اسے دوسرے فریق کو سو اونٹ اور سطیح کو بیس اونٹ دینا ہوں گے۔ اس قرارداد کے بعد وہ لوگ اور عبدالمطلب اپنے دس ہمراہیوں سمیت سطیح غسانی کی طرف چل دیے۔ اس سفر میں بھی یہ اتفاق پیش آیا کہ عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں کا پانی ختم ہوگیا۔ آپ نے قبیلہ بنو کلاب و بنو رباب سے پانی مانگا۔ انہوں نے کہا کہ پانی ہی پر تو ہمارا جھگڑا ہے۔ ہم ہرگز پانی نہیں دیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میں گوارا نہیں کرسکتا کہ میرے ساتھیوں کی جانیں پیاس ضائع ہوں۔ اگر تمہیں پانی دینے سے انکار ہے تو میں پانی تلاش کروں گا خواہ اس کی تلاش میں میری جان جاتی رہے۔ یہ کہہ کر آپ ناقہ پر سوار ہوئے اور ایک سمت چل دیے۔ جب کچھ فاصلہ پر پہنچے تو ان کی اونٹنی ایک دم گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اونٹنی کے اس طرح بیٹھنے سے کچھ لوگ یہ سمجھے کہ عبدالمطلب چل بسے۔ مگر ان کے ساتھیوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی جانیں بچانے کے لئے تگ و دو کریں اور اللہ انہیں بے کسی کی موت سلادے۔ جب لوگ دیکھ بھال کے لئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اونٹنی ٹھنڈی ریت پر سینہ ٹیکے بیٹھی ہے اور پاس ہی پانی کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ پانی دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ بنو کلاب و بنو رباب نے بھی پانی لنڈھا کر مشکیزے خالی کر لئے تاکہ ٹھنڈا اور تازہ پانی بھریں۔ عبدالمطلب کے ساتھیوں نے دیکھا تو وہ پانی لینے سے مانع ہوئے اور کہا کہ تم نے ہمیں پانی دینے سے انکار کیا تھا اب ہم بھی تمہیں پانی لینے نہیں دیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا انہیں پانی لینے دو پانی سے کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔ عبدالمطلب کی عالی ظرفی و فراخ دلی سے متاثر تو ہوئے مگر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونے اور جھگڑا ختم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب سطیح کے ہاں پہنچے تو مختلف طریقوں سے اسے آزمانے کے بعد کہا کہ یہ بتائیے کہ ہمارے درمیان جھگڑا کس چیز پر ہے اور پھر اُس کا فیصلہ کیجئے۔ کہا کہ تم طائف کے کنوئیں کے بارے میں جسے ذوالہرام کہا جاتا ہے فیصلہ چاہتے ہو۔ وہ کنواں عبدالمطلب کا ہے اور تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے لہٰذا سو اونٹ عبدالمطلب کے حوالے کرو اور بیس اونٹ مجھے دو۔ انہوں نے اونٹ دونوں کے حوالے کئے اور کنوئیں سے بے دخلی کا اعلان کرکے واپس چلے گئے۔

جب عبدالمطلب پلٹ کر مکہ میں وارد ہوئے تو اعلان کیا کہ اے اہل مکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں نے یہ نیت کی تھی کہ اگر میرے خلاف فیصلہ ہوا اور مجھے اونٹ دینے پڑے تو مجھے کچھ اونٹ دے کر تاوان میں میرا ہاتھ بٹائیں گے، وہ آئیں اور جتنے جتنے اونٹ مجھے دینے کا ارادہ کیا تھا اتنے اونٹ لے جائیں۔ چنانچہ کچھ لوگ آئے اور کوئی ایک، کوئی دو اور کوئی تین اونٹ لے گیا۔ پھر بھی کچھ اونٹ بچ رہے۔ آپ نے

اپنے فرزند ابوطالب سے کہا کہ ان اونٹوں کو لے جاؤ اور انہیں نحر کر کے کوہ ابو قبیس کی چوٹیوں پر ڈال دو تاکہ صحرائی جانور بھی اپنا پیٹ بھر لیں۔ ابوطالب نے ایسا ہی کیا اور اس موقع پر یہ شعر کہا:

ونطعم حتی یاکل الطیر فضلنا　　اذا جعلت ایدی المفیضین ترعد

"ہم دوسروں کو کھلاتے ہیں یہاں تک کہ پرندے بھی ہمارے بچے ہوئے میں سے کھاتے ہیں جب کہ برتنوں کو پُر کرنے والوں کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔"

عبدالمطلب کا دستور تھا کہ دسترخوان پر سے جو کھانا بچ رہتا تھا وہ گھر میں واپس جانے کے بجائے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ڈال دیا جاتا تھا۔ تاکہ صحرائی پرندے بھی کھائیں اور اپنا پیٹ بھریں۔ اسی دستور کی بنا پر انہیں مطعم الطیر (پرندوں کو دانہ پانی دینے والا) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس ہمہ گیر جود وسخا کے ساتھ مصیبت زدوں کی مصیبت میں کام آنا اپنا اخلاقی و منصبی فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی مصیبت کا مارا ان سے پناہ طلب کرتا یا ان کے پاس فریاد لے کر آتا تو فوراً اس کی امداد پر کمربستہ ہو جاتے اور اسے مصیبت سے چھٹکارا دلا کر دم لیتے۔ ایک مرتبہ قبیلۂ حزام کے کچھ لوگ مکہ میں حج کے لئے آئے۔ جب پلٹنے لگے تو ان کا ایک آدمی قتل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آدمی کے عوض حذافہ ابن غانم عدوی کو پکڑ لیا۔ حذافہ نے راستہ میں عبدالمطلب کو جو طائف سے پلٹ رہے تھے دیکھا اور ان سے فریاد کی۔ عبدالمطلب نے اپنی سواری کو روکا اور واقعہ پر مطلع ہونے کے بعد ان لوگوں سے کہا کہ تم حذافہ کو چھوڑ دو۔ اور میں اس کے عوض بیس اوقیہ (۵۵ تولہ) سونا، دس اونٹ اور ایک گھوڑا دوں گا۔ اور اس مال کی ادائیگی تک میری چادر[1] رہن رکھ لو۔ انہوں نے چادر رکھ لی اور

---

[1] ایک معمولی چادر کی ضمانت پر حذافہ کو چھوڑ دینا عبدالمطلب کی شخصیت اور ان کے ایفائے عہد کی شہرت کی بنا پر تھا۔ اور دوسرے اس میں عرب کا یہ دستور بھی کارفرما تھا کہ وہ جس طرح بن پڑتا اپنی رہن رکھی ہوئی چیز کو ضرور چھڑاتے خواہ وہ کتنی حقیر و بے قیمت کیوں نہ ہوتی۔ اسی دستور کی بنا پر کسریٰ نے حاجب ابن زرارہ کی کمان بطور ضمانت رکھ کر اس سے پُرامن رہنے کا عہد لیا تھا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب بنی تمیم اپنے ہاں کی پیہم خشک سالیوں سے تنگ آ کر عراق کی چراگاہوں کی طرف گئے تو ان کا سردار حاجب ابن زرارہ کسریٰ کے دربار میں پہنچا اور اس سے کہا کہ ہمیں کچھ عرصہ کے لئے اونٹوں کے چرانے کی اجازت دی جائے۔ کسریٰ نے کہا کہ تم لوگ بدعہد اور شرپسند ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور کھڑا کرو گے، اور میری رعایا کو نقصان پہنچاؤ گے۔ حاجب نے کہا کہ میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ میرے قبیلہ کی کوئی فرد شرانگیزی نہیں کرے گی۔ کسریٰ نے کہا کہ تمہارے اس قول و قرار کی ضمانت کیا ہے؟ کہا کہ میری یہ کمان رہن رکھ لیجیے۔ اس پر کسریٰ اور اُس کے درباری ہنسنے لگے اور اس بات کی کوئی وزن نہ دیا۔ انہی درباریوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اس کی کمان (باقی صفحہ ۸۰ پر)

حذافہ کو چھوڑ دیا۔ آپ اسے اپنے اونٹ پر بٹھا کر مکہ لائے اور ان لوگوں سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا اور چادر واپس لے لی۔

مکہ میں اذنیہ نامی ایک یہودی تاجر تھا جو مالِ تجارت لے کر شہر اور اس کے مضافات میں پھیری لگاتا تھا۔ اس نے آپ سے پناہ طلب کی۔ آپ نے اسے پناہ دے کر اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ حرب بن امیہ اس کے درپے ایذا ہوا اور قریش کے چند اوباشوں کو بھڑکایا جنہوں نے اُسے قتل کر کے اس کا مال واسباب لوٹ لیا۔ عبدالمطلب کو معلوم ہوا تو انہیں قاتلوں کی فکر ہوئی۔ آخر ٹوہ لگاتے ہوئے قاتلوں کا سراغ مل گیا۔ اور یہ ثابت ہو گیا کہ حرب ابن امیہ کی انگیخت پر عامر ابن عبد مناف ابن عبدالدار اور صخر ابن عمرو نے اسے قتل کیا ہے اور اب وہ اسی کے ہاں چھپے ہوئے ہیں۔ آپ نے حرب سے مطالبہ کیا کہ قاتلوں کو ان کے حوالے کیا جائے۔ اس نے قاتلوں کو پیش کرنے سے انکار کیا اور سخت کلامی پر اُتر آیا۔ ان دونوں میں خاندانی کشیدگی تو پہلے ہی سے تھی، اب رنجش اور بڑھ گئی۔ حرب کو اپنی طاقت اور مالی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس نے آپ کو منافرہ (باہمی تقابل) کی دعوت دی۔ عبدالمطلب پہلے تو اس کی شوخ چشمی پر حیران ہوئے اور پھر اس کی دعوت قبول کر لی۔ اور یہ طے پایا کہ شاہِ حبشہ کو ثالث قرار دیا جائے مگر شاہِ حبشہ نے ثالث بننے سے انکار کر دیا۔ آخر نفیل ابن عبدالعزیٰ کو حَکَم بنایا گیا۔ اس نے عبدالمطلب کی فوقیت و برتری کا اعتراف کرتے ہوئے

(بقیہ از صفحہ ۴۹) کو رہن رکھ لینا چاہیے۔ اس لئے کہ عرب اپنا عہد پورا کرنے کے لئے اگر کسی چیز کو رہن رکھتے ہیں تو اسے ضرور پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کمان رہن رکھ لی گئی اور انہیں اونٹ چرانے کی اجازت دے دی گئی۔ جب خشک سالی جاتی رہی اور بنی تمیم کی زمینیں سرسبز و شاداب ہو گئیں تو انہوں نے واپسی کی تیاری کی اس عرصہ میں حاجب دنیا سے چل بسا تھا۔ اور اس کا بیٹا عطارد موجود تھا۔ وہ کسریٰ کے پاس آیا اور کہا کہ ہم نے اپنا عہد پورا کیا ہے اور کسی فتنہ انگیزی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ لہذا میرے باپ کی کمان واپس دی جائے۔ کسریٰ نے کہا کہ تم نے تو کوئی چیز میرے سپرد نہیں کی تھی۔ کہا کہ میرے باپ نے کمان رہن رکھی تھی اور میں اپنے باپ کا وارث ہوں۔ اگر آپ نے وہ کمان مجھے واپس نہ دی تو میں تمام عرب میں رسوا ہو جاؤں گا اور اس سے بڑھ کر ذلت و رسوائی ہو بھی کیا سکتی ہے کہ رہن رکھی ہوئی چیز چھڑائی نہ جائے۔ کسریٰ اس کے احساس ذمہ داری سے خوش ہوا اور کمان بھی واپس دی اور اس کے ساتھ ایک خلعت بھی دیا۔

بعض جرائد میں دیکھا ہے کہ برٹش کولمبیا کے لوگوں میں اب بھی دستور ہے کہ جب وہ بڑی مقدار میں قرضہ لیتے ہیں تو اپنا نام گروی رکھ دیتے ہیں اور جب تک قرضہ ادا نہیں کرتے کہیں بھی اپنا نام استعمال نہیں کرتے اور جب قرضہ اتار دیتے ہیں تو پھر اپنا نام استعمال کرنے کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ ۱۲

ان کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ حرب اس فیصلہ پر بہت تلملایا اور طیش میں آکر نفیل کو برا بھلا کہا اور عبدالمطلب کے خلاف لب کشائی کی اور پوچ حربوں پر اتر آیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح انہیں مرعوب کر کے قاتلوں کے مطالبہ سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دے۔ مگر عبدالمطلب آسانی سے دبنے والے نہ تھے۔ انہوں نے کسی طرح ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور اس سے سو اونٹ دیت کے لے کر مقتول کے وارثوں کو دیئے اور مقتول کے مال کا بیشتر حصہ بھی نکلوا لیا اور جو نہ مل سکا اس کی قیمت اپنے پاس سے ادا کر کے عدل و انصاف اور پناہ دہندگی کے تقاضے کو پورا کیا۔

آپ ہی کے زمانہ ریاست میں نجاشی حبشہ کے سپہ سالار اور والیٔ یمن ابرہہ ابن اشرم نے کوہ پیکر ہاتھیوں اور خود سر فوجیوں کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی اور خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا۔ اہل مکہ کے لئے یہ انتہائی خطرناک لمحات تھے۔ ایک طرف ہتھیاروں میں ڈوبی ہوئی فوجیں اور دوسری طرف نہ لڑنے کی طاقت اور نہ بڑھتے ہوئے سیلاب عساکر کو روکنے کی قوت۔ جب یمنی فوجوں نے مکہ کے قریب پڑاؤ ڈالا تو دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ مکہ والوں کے قدم اکھڑ گئے اور اپنے اہل و عیال کو لے کر پہاڑوں کے دروں اور صحراؤں میں منتشر ہو گئے۔ اس موقع پر عبدالمطلب نے جس ثبات قدم کا مظاہرہ کیا اس کی مثال تاریخ قبل اسلام میں کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ نہ حملہ آوروں کو دیکھ کر ہراساں ہوئے اور نہ گھر بار چھوڑنے پر آمادہ۔ کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بھی مکہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ مگر آپ نے پوری عزیمت و خود اعتمادی کے ساتھ فرمایا:۔

لا ابرح من حرم الله ولا اعوذ بغیر الله۔ (تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۵۲)

"میں اللہ تعالیٰ کے حرم کو نہیں چھوڑوں گا اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے پناہ مانگوں گا۔"

اس اثنا میں ابرہہ نے چند آدمی لوٹ مار کے لئے ادھر ادھر بھیجے جنہوں نے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ جو صحرا میں چر رہے تھے پکڑ لئے۔ عبدالمطلب کو معلوم ہوا تو وہ ابرہہ کے پاس آئے۔ ابرہہ ان کی پرجاہت و پر عظمت شخصیت کو دیکھ کر ان کی تعظیم کئے بغیر نہ رہ سکا۔ تخت سے نیچے اتر کر انہیں اپنے قریب بٹھایا اور پوچھا کہ اے سردار قریش کیسے آنا ہوا؟ فرمایا کہ تمہاری فوج کے کچھ لوگ میرے اونٹ ہنکا لائے ہیں وہ اونٹ مجھے واپس کئے جائیں۔ ابرہہ نے یہ سنا تو پیشانی پر بل پڑا اور کہا کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ خانہ کعبہ کے بارے میں کچھ کہیں گے جو قریش کی عزت و عظمت کا مرکز ہے۔ مگر آپ نے خانہ کعبہ کے تحفظ کی سفارش کے بجائے اپنے چند اونٹوں کا مطالبہ کر دیا۔ فرمایا:۔

انا رب الاباعر فاطلبها وللبیت رب یمنعه۔ (تاریخ ابو الفداء۔ ج ۱۔ ص ۱۰۹)

"میں ان اونٹوں کا مالک ہوں اس بنا پر انہیں طلب کرتا ہوں۔ اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔"

ابرہہ اس بیباکانہ جواب پر بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ عبد المطلب کے اونٹ انہیں واپس کردیئے جائیں۔ عبد المطلب اپنے اونٹوں کو ہنکا کر مکہ میں لائے اور ان پر وقف بیت اللہ کی علامت لگا کر انہیں حرم میں چھوڑ دیا اس خیال سے کہ اب اونٹوں کو کوئی گزند پہنچایا ان میں سے کوئی دشمن کے ہاتھ سے زخمی ہوا تو حملہ آور عذاب خداوندی کی قاہرانہ گرفت سے بچ کر نہ جا سکیں گے۔

عبد المطلب نے جو اس موقعہ پر جو کردار ادا کیا وہ ان کے اعتماد علی اللہ کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے جس سے شرف انسانی مجروح نہیں ہوتا۔ لیکن خانہ کعبہ کے متعلق کچھ کہنے سننے کا مطلب یہ تھا کہ انہیں قدرت کی کارفرمائی پر یقین و اعتماد نہیں ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر ایک متکبر و خودسر کے آگے جھولی پھیلاتے اور اس کے زیر بار احسان ہونے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس سے نہ صرف ان کے یقین کو ٹھیس لگتی بلکہ ان کی حمیت و خودداری پر بھی حرف آتا۔

عبد المطلب کی اس گفتگو سے ابرہہ کے دل پر مبہم سا خوف چھا گیا اور وہ قدم آگے بڑھانے اور خانہ کعبہ پر حملہ کرنے سے ہچکچانے لگا۔ مشیروں اور حاشیہ برداروں نے ہمت بندھائی اور وہ ان کے کہنے سننے سے مکہ کی جانب بڑھا۔ ادھر کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ ایک عبد المطلب تھے جو خانہ کعبہ کے در پر کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے کہ پروردگارا! یہ تیرا گھر ہے۔ اور تو ہی اس گھر کا محافظ و پاسبان ہے۔ اُدھر ابرہہ کا لشکر خانہ کعبہ کو گرانے کے ارادہ سے بڑھا۔ ادھر مغرب کی طرف سے سیاہی اٹھی۔ خیال گزرا کہ بادل منڈلا رہے ہیں جب غور سے دیکھا تو پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ فضا پر چھائے ہوئے نظر آئے جو چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لئے ہوئے تھے۔ قدرت کی یہ مسلح فوج ابرہہ کی فوج کے مقابلہ میں صف بستہ ہوگئی۔ اور انہی کنکریوں کے سہارے حملہ آور ہوئی۔ اور اس طرح تاک تاک کر کنکریاں ماریں کہ کوئی بے جرم زد میں نہ آیا اور کوئی مجرم جان بچا کر بھاگ نہ سکا۔ ان کنکریوں کے مقابلہ میں نہ آہنی خود اور زرہیں آڑے آئیں نہ چمکتی ہوئی تلواریں اور چلکتے ہوئے نیزے کارآمد ثابت ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا لشکر پس کر رہ گیا۔ ابرہہ اپنی جان بچا کر بھاگا اور یمن جاتے ہوئے راستہ میں مرگیا۔

یہ دور وہ تھا کہ عوام کے دل و دماغ پر بتوں کی جھوٹی عظمت کا کہر چھایا ہوا تھا۔ ہر مصیبت و آفت کے وقت انہی کو پکارا جاتا اور انہی کے آگے گڑگڑایا جاتا۔ مگر عبد المطلب کی زبان سے نہ لات و ہبل کا نام نکلتا ہے اور نہ منات و عزیٰ کا۔ بلکہ لو لگاتے ہیں تو اللہ سے اور بھروسا کرتے ہیں تو اس کی کارسازی پر۔ اور اسی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے اللہ تو ہی اس گھر کا مالک اور تو ہی اس کا محافظ و نگہبان ہے" اور پھر ایسے خطرناک موقع پہ جب کہ ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور مکہ کے عوام و خواص

پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے یا پتھروں کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ آپ نہ اللہ کا گھر چھوڑتے ہیں نہ اس کا در۔ اور اسی پر اعتماد کرتے ہوئے پورے سکون قلب کے ساتھ یوں ثابت قدم رہتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ یہ عبد المطلب کے ثبات قدم ہی کا تاثر تھا کہ جب پیغمبرؐ اکرم جنگِ حنین میں گنتی کے چند آدمیوں کے ساتھ ڈٹے رہے تو عبدالمطلب کی طرف اپنی فرزندی کی نسبت دیتے ہوئے فرمایا:-

انا النبیؐ لا کذب انا ابن عبد المطلب

میں نبی ہوں جس میں جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔"

مطلب یہ تھا کہ جس طرح میرے دادا عبدالمطلب نے اصحاب فیل کے مقابلہ میں ثبات قدم دکھایا تھا اور ان کے قدم نہیں اکھڑے تھے اسی طرح میرے قدم بھی اکھڑ نہیں سکتے اس لئے کہ میں انہی کا بیٹا ہوں۔ اس ارشاد نبویؐ سے نہ صرف عبدالمطلب کی شجاعت و ثبات قدمی ظاہر ہوتی ہے بلکہ ان کے موحد و خدا پرست ہونے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ کافر و مشرک ہوتے تو پیغمبرؐ اکرم کفار حنین کے مقابلہ میں ان سے نسبی وابستگی کی بنا پر فخر نہ کرتے اور نہ کفار کے مقابلہ میں ایک کافر سے انتساب پر تفاخر زیب دیتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں نہ کبھی بتوں کی پرستش کی، نہ بتوں کے نام کا ذبیحہ کھایا اور نہ کبھی مشرکانہ رسم و راہ اختیار کی۔ بلکہ خدا کی وحدانیت کے قائل اور حشر و نشر کے معتقد تھے۔ چنانچہ علامہ حلبی نے لکھا ہے کہ آپ کے دور میں شام کا ایک ظالم و خونخوار شخص دنیا میں ظلم کی سزا بھگتے بغیر مر گیا۔ لوگوں نے عبدالمطلب سے کہا کہ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اسے ظلم کی سزا مل نہیں جاتی۔ فرمایا:-

واللہ ان وراء ھذہ الدار دارا یجزی فیھا المحسن باحسانہ و یعاقب المسئ باساءتہ (سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۴)	خدا کی قسم اس دار دنیا کے بعد ایک دارِ آخرت بھی ہے جہاں نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی سزا ملے گی۔"

مسعودی نے لکھا ہے:-

کان عبد المطلب یوصی ولدہ بصلۃ الارحام واطعام الطعام ویرغبہم فعل من یراعی فی المتعقب معاد او بعثا ونشورا۔ (مروج الذہب ج ۲ ص ۱۲۳)	عبدالمطلب اپنی اولاد کو صلہ رحمی کی تعلیم دیتے (بھوکوں) کو) کھانا کھلانے کی ہدایت کرتے اور اس شخص کے مانند ان چیزوں پر زور دیتے جو انجام کار پر نظر رکھتا اور قیامت اور حشر و نشر کا قائل ہو۔"

اس عقیدۂ مبدأ و معاد کے ساتھ آپ دین ابراہیم کے پابند اور ان کی شریع پر کاربند تھے اکثر اوقات

طواف خانہ کعبہ میں مصروف رہتے۔ خلوت وجلوت میں اللہ سے لو لگاتے، ذکر وفکر میں کھوئے رہتے اور رمضان کے مہینہ میں دنیا و مافیہا سے بے پرواہ اور سارے جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر غار حرا میں قیام کرتے اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کے جلال وعظمت کی اتھاہ گہرائیوں میں غور وفکر کرتے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

هو اول من تحنث بحرا فكان
اذا دخل شهر رمضان صعد
حراء اطعم المساكين جميعه
(التہوش۔ تاریخ کامل ج ۲ ص ۹)

"آپ ہی نے سب سے پہلے کوہِ حرا میں اللہ کی عبادت میں راتیں گزاریں۔ جب ماہِ رمضان شروع ہوتا تو آپ کوہِ حرا پر چڑھ جاتے اور سارا مہینہ مسکینوں کو کھانا دیتے۔"

آپ نے صرف اپنی ہی زندگی کو حسنِ عمل کے جوہر سے آراستہ نہیں کیا بلکہ ایک انقلاب آفریں مصلح کی طرح اجتماعی زندگی کو بھی صحیح خطوط پر تعمیر کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے رہے اور اصلاح معاشرہ وتربیتِ اخلاق کے لئے ایسے اصلاحات نافذ کئے جو اپنی قدر وقیمت اور افادیت کی بنا پر اسلامی احکام کا جزو قرار دیدیئے گئے اور اس طرح انہیں ابدی وآفاقی حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ علامہ حلبی تحریر کرتے ہیں:۔

وتؤثر عنه سنن جاء القرآن
باكثرها وجاءت السنة بها۔
(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۲)

"آپ سے ایسے اصلاحات وارد ہوئے ہیں جن میں سے اکثر قرآن میں بیان ہوئے اور سنتِ رسولؐ میں درج ہوئے۔"

علامہ مجلسی اور دوسرے سیرت نگاروں نے تحریر کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ عبد المطلب نے زمانۂ قبلِ اسلام میں ایسی پانچ چیزوں کا اجراء کیا جنہیں اسلام نے جوں کا توں باقی و برقرار رکھا۔ انہوں نے باپ کی بیویوں کو اولاد پر حرام قرار دیا اور خداوند عالم نے اسے برقرار رکھتے ہوئے فرمایا:۔ ولا تنکحوا ما نکح اباءکم (جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہو تم ان سے نکاح نہ کرو) انہوں نے ایک خزانہ کے دستیاب ہونے پر اس کا پانچواں حصہ الگ کر کے فقراء و مساکین پر تقسیم کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ (تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو مال تمہیں بطور غنیمت حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے) انہوں نے چاہِ زمزم کھودا تو اسے سقایۃ الحاج سے تعبیر کیا۔ اور قدرت نے فرمایا:۔ اجعلتم سقایۃ الحاج " انہوں نے قتل کی دیت سو اونٹ قرار دی اور اسلام نے اسی تعداد کو برقرار رکھا۔ قریش کے ہاں طواف کے چکروں کی تعداد مقرر نہ تھی۔ آپ نے طواف کے سات چکر قرار دیئے اور اسلام نے بھی اسے برقرار رکھتے ہوئے طواف کے سات چکر معین کئے۔ علامہ مجلسی نے اس

ارشاد نبویؐ کے ذیل میں لکھا ہے:۔

فعل هٰذه الامور بالالهام من الله تعالیٰ وکانت فی ملة ابراهیم فترکتها قریش فاجراها فیهم۔
(بحارالانوار۔ ج ۶ ۔ ص ۳۵)

عبدالمطلب نے ان امور کا اجرا الہامِ خداوندی سے کیا یا یہ کہ یہ چیزیں ملت ابراہیمی میں موجود تھیں اور قریش نے انہیں پس پشت ڈال دیا تھا۔ اور آپ نے انہیں از سرِ نو جاری کیا۔"

ان امور کے علاوہ اخلاقی و معاشرتی اصلاح کے لئے ایسے قوانین نافذ کئے جن کی اہمیت و افادیت ناقابلِ انکار ہے۔ ابن واضح یعقوبی نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب نے وفا نذر قطع ید سارق قرعہ اور مباہلہ کا اجرا اور قتل پر سو اونٹوں کی دیت کا نفاذ کیا۔ مہمان نوازی، کسب حلال اور محترم مہینوں کے احترام پر زور دیا۔ دختر کشی اور محارم سے نکاح کی ممانعت کی۔ فواحش، منکرات کا انسداد کیا۔ شراب نوشی اور زنا کاری پر سزا تجویز کی اور حجاج کو ترغیب دی کہ وہ پاک و پاکیزہ اور حلال کمائی سے حج کریں۔ عرب کا دستور تھا کہ طواف سے پہلے کپڑے اتار کر ایک جگہ رکھ دیتے اور برہنہ طواف کرتے۔ اگر قریش کسی کو تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا دے دیتے تو وہ پہن لیتا ورنہ عریاں ہی طواف کرنا پڑتا آپ نے اس اخلاق سوز رسم کو بند کیا اور حکم دیا کہ کپڑے پہن کر طواف کیا جائے اور یہی اسلام نے ہدایت کی۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

خذوا زینتکم عند کل مسجد — عبادت کے ہر موقع پر کپڑے پہن لیا کرو۔"

اسی طرح عرب میں مرسوم تھا کہ وہ حج کے بعد گھروں میں دروازوں کے بجائے پچھواڑے سے داخل ہوتے آپ نے انہیں ہدایت کی کہ وہ گھروں میں پچھواڑے کے بجائے دروازوں سے آئیں اور اسلام نے بھی یہی تعلیم دی:۔

واتوا البیوت من ابوابها — گھروں میں آؤ تو دروازوں سے آؤ۔"

یہ ہدایت افروز تعلیمات ایسے ہی بلند نظر مصلح کے شایانِ شان ہو سکتے ہیں جو گزشتہ انبیاء کے تعلیمات سے آگاہ اور ان کے سنن و احکام اور اوامر و نواہی سے واقف ہو۔ اگرچہ آپ نبی نہ تھے مگر ان بلند پایہ تعلیمات اور پیغمبرانہ اصلاحات کی بناء پر انہیں بڑی عظمت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور ابراہیم الثانی کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔

آپ کئی جہات سے اپنے جد حضرت ابراہیمؑ سے مماثلت رکھتے تھے۔ سن و سال اور اولاد کی تعداد میں قریب قریب یکسانیت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تیرہ فرزند تھے اور عبدالمطلب کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ عادات و اطوار میں بھی بہت سے پہلو مشترک تھے۔ غریبوں کی دستگیری کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا،

مہمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لینا دونوں کا دستور تھا۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ کو ابوالاضیاف اور عبدالمطلب کو فیاض اور مطعم الطیر کہا جاتا تھا۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مصر و شام کی شاہراہ پر چاہ شبع کھودا اسی طرح آپ نے وادیٔ غیر ذی زرع (مکہ) میں چاہ زمزم کھود کر مسافروں اور راہ نوردوں کی سیرابی کا سامان کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے شیب (بالوں کی سفیدی) کو دیکھا اور آپ پیدا ہوتے کے بعد شیبہ کے نام سے یاد کئے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ جامعیت و ہمہ گیری کے لحاظ سے پوری ایک امت تھے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے :۔ ان ابراهیم کان امة (ابراہیم تنہا ایک امت تھے) اسی طرح آپ اپنی متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے اعتبار سے امت کہے گئے۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے :۔

ان الله يبعث جدي عبد المطلب امة واحدة في هيئة الانبياء وزي الملوك ۔ تاريخ يعقوبي ۔ ج ۲ ۔ ص۱۴)	خداوند عالم میرے دادا عبدالمطلب کو نبیوں کی ہیئت اور بادشاہوں کی وضع قطع میں اس طرح اٹھائے گا کہ وہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے ایک امت شمار ہوں گے۔"

دونوں مستجاب الدعوات، صبر و عزیمت میں ممتاز اور جذبۂ فداکاری میں نمایاں تھے۔ چنانچہ جس عزم و ارادہ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کی قربانی پر کمربستہ ہوئے اسی عزم و ارادہ کے ساتھ آپ اپنے محبوب ترین فرزند عبداللہ کی قربانی پر آمادہ ہوئے۔ چنانچہ امام رضا علیہ السلام کا ارشاد ہے :۔

ان عزم على ذبح ابنه عبد الله شبيه بعزم ابراهيم على ذبح ابنه اسمٰعيل ۔ (بحار الانوار ۔ ج ۶ ۔ ص۳۹)	جس عزم مستحکم کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے پر تیار ہوئے، اسی عزم مصمم کے ساتھ عبدالمطلب اپنے فرزند عبداللہ کی قربانی پر آمادہ ہوئے۔"

اس قربانی کی مختصر روداد یہ ہے کہ زمزم کی کھدائی کے موقع پر عبدالمطلب کا صرف ایک بیٹا ہی تھا جو اس کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکا۔ اور کوئی دوسرا معاون و مددگار نہ تھا۔ آپ نے اس موقع پر منت مانی کہ اگر خدا مجھے دس بیٹے دے گا تو میں ایک بیٹا اس کی راہ میں قربان کروں گا۔ قدرت نے ان کی دعا قبول کی اور دس بیٹے دیے جن کے نام یہ تھے : عبداللہ، زبیر، ابوطالب، عباس، ضرار، حمزہ، مقوم، ابولہب، حارث اور غیداق۔" آپ نے چاہا کہ اپنی منت ادا کریں۔ چنانچہ اپنے دسوں بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ مجھے دس بیٹے دے گا تو میں ایک بیٹے کو قربان کروں گا۔ خدا نے میری دعا سن لی ہے اب مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔ لہٰذا تم میں کون ہے جو بخوشی ذبح ہونے کے لئے تیار ہو۔ پہلے تو ان سبھوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا، پھر سر اطاعت خم کرتے ہوئے کہا کہ ہم حاضر

ہیں آپ جسے چاہیں ذبح کے لئے منتخب کرلیں۔ جب انہوں نے اپنے بیٹوں کو آمادہ پایا تو خانہ کعبہ کے پاس آئے اور ان دسوں بیٹوں پر قرعہ ڈالا۔ قرعہ سب سے چھوٹے فرزند عبداللہ کے نام پر نکلا۔ عبداللہ گھر والوں کی آنکھ کا تارا اور خاندان بھر میں ہر دلعزیز تھے۔ سب ہی ان کے ذبح سے مانع ہوئے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میرے لئے ایفائے عہد ضروری ہے اگرچہ اپنے ہاتھوں اپنے جگر بند کو ذبح کرنا آسان نہیں ہے۔ فرزندانِ عبدالمطلب اور اکابر قریش نے کہا کہ ایک بار پھر قرعہ ڈالئے شاید کسی اور کا نام نکل آئے۔ دوسری بار قرعہ ڈالا گیا وہ بھی عبداللہ کے نام نکلا۔ اب عبدالمطلب اپنے پارۂ جگر کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ عکرمہ ابنِ عامر نے کہا اے سردار قریش! اگر آپ نے اپنے بیٹے کو ذبح کر ڈالا تو پھر بیٹوں کو ذبح کرنے کی رسم چل نکلے گی۔ اور اس رسم کے بانی آپ ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہو جائیں اور کسی کاہن سے مشورہ کریں۔ سب نے کہا کہ عکرمہ کی رائے صحیح ہے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک کاہنہ کی طرف رجوع کیا گیا۔ اس نے واقعہ پر مطلع ہونے کے بعد پوچھا کہ تمہارے ہاں ایک آدمی کا خونبہا کیا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ دس اونٹ۔ کہا کہ پھر دس اونٹوں اور عبداللہ پر قرعہ ڈالو۔ اگر قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلے تو دس دس اونٹوں کا اضافہ کرکے قرعہ ڈالتے جاؤ۔ اگر سو اونٹوں کے مقابلہ میں بھی قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلے تو پھر اُسے ذبح کر دینا۔ چنانچہ پہلے دس اونٹوں پر قرعہ ڈالا گیا، قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلا پھر دس دس اونٹوں کا اضافہ ہوتا رہا اور قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلتا رہا۔ اور جب اونٹوں کی تعداد سو تک پہنچی تو قرعہ اونٹوں پر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر سب کے دلوں میں اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ مگر عبدالمطلب مطمئن نہ ہوئے۔ فرمایا کہ دوبارہ قرعہ ڈالا جائے۔ دوسری بار بھی قرعہ اونٹوں پر نکلا۔ فرمایا مزید اطمینان کے لئے ایک مرتبہ اور قرعہ ڈالا جائے۔ جب تیسری مرتبہ بھی قرعہ اونٹوں پر نکلا تو اطمینانِ قلب حاصل ہوا۔ اور اسی وقت سو اونٹ نحر کرکے تقسیم کر دیئے اور خود انہوں نے ان کے بیٹوں نے اس گوشت کو نہ کھایا نہ چکھا ابن سعد نے لکھا ہے:۔

لم یاکل منھا ھو ولا احد من ولدہ شیئاً۔ (طبقات ج ۱۔ صہ ۸۹)	عبدالمطلب اور ان کے کسی بیٹے نے ان اونٹوں کے گوشت میں سے نہیں کھایا۔

اس قربانی نے جہاں انسانی جان کی قدر و قیمت میں دس گنا اضافہ کر دیا وہاں عزم و ثبات، ایفائے عہد، ایفائے نذر، جاں سپاری و وفاداری اور اطاعت و سرافگندگی کی انمٹ مثال بھی قائم کر دی۔ عبدالمطلب نے جس بلند حوصلگی اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا اس کی مثال سابقین میں کہیں نظر آتی ہے تو خلیلِ خدا حضرت ابراہیمؑ میں۔ اور جناب عبداللہ نے اطاعت و سرافگندگی کا جو کردار پیش کیا اس کی جھلک ماضی کے آئینہ میں

کہیں دکھائی دیتی ہے تو حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ دونوں اس ابتلاؤ آزمائش کے موقع پر صغیر السن تھے۔ جناب اسمٰعیلؑ کا سن تیرہ برس تھا اور عبداللہ کا سن گیارہ برس۔ دونوں انتہائے صبر کا جوہر دکھاتے ہیں۔ نہ تہ خنجر سر رکھنے سے ہچکچاتے ہیں اور نہ رشتۂ حیات کے قطع ہونے سے ڈرتے ہیں اور باپ کے حکم کے سامنے سر جھکا کر تسلیم و رضا اور ایثار و قربانی اور ثبات و استقلال کا فقید المثال کردار پیش کرتے ہیں۔ آخر دونوں اس قربانی کے صلہ میں ذبیح کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:۔ انا ابن الذبیحین (میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں) ایک ذبیح سے مراد آنحضرتؐ کے جد حضرت اسمٰعیلؑ ہیں اور دوسرے ذبیح سے مراد آپؐ کے پدر بزرگوار حضرت عبداللہ ہیں۔

جناب عبداللہ کو قدرت کی طرف سے یہ شرف و امتیاز حاصل ہوا کہ ان کے صلب سے تاجدارِ رسل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پیدا ہوئے۔ مگر اس گل سرسبد رسالت کو دیکھنا نصیب نہ ہوا اور واقعہ فیل کے کچھ دنوں بعد شام سے پلٹتے ہوئے مدینہ میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ عبدالمطلب اس حادثہ جانکاہ سے بہت متاثر ہوئے اور ہر وقت رنجیدہ و دل گرفتہ رہنے لگے۔ مگر چند دنوں کے بعد جب یہ مژدۂ جانفزا سنا کہ عبداللہ کے گھر میں بیٹا ہوا ہے تو افسردہ چہرے پر بہار آ گئی۔ اپنے بیٹے کی اکلوتی نشانی کو دیکھ کر مرجھائی ہوئی کلی کھل گئی۔ محبت بھری نگاہوں نے مولودِ نو کا طواف کیا۔ نظروں میں کھُب جانے والے خدوخال کا جائزہ لیا۔ امانتِ الٰہیہ کو ہاتھوں میں اٹھا کر خانہ کعبہ کے پاس لائے۔ اللہ سے اس کے پھلنے پھولنے کی دعا مانگی اور ساتویں دن عقیقہ کر کے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) نام تجویز کیا۔

آنحضرتؐ کے سر سے باپ کا سایہ تو اُٹھ ہی چکا تھا ماں کا کنارِ عاطفت بھی زیادہ عرصہ تک نصیب نہ ہوا۔ چھ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کہ آپ کی والدۂ گرامی جناب آمنہؑ بھی دنیا سے رحلت فرما گئیں۔ اب یتیم عبداللہ براہِ راست عبدالمطلب کی کفالت و تربیت میں آ گئے۔ عبدالمطلب نے اس طرح محبت و شفقت سے پالا پوسا کہ زندگی کے لمحات ان کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دیئے۔ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور کسی لمحہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے اور یہ معمول قرار دے لیا کہ جب تک وہ کھانے میں شریک نہ ہوتے کسی کو کھانے کی اجازت نہ دیتے اور خود نہ کھاتے۔

آنحضرت کے طور طریقے اتنے شستہ و پاکیزہ تھے کہ دلوں کو موہ لیتے اور ان کی عظیم شخصیت کا پتہ دیتے تھے۔ عبدالمطلب بھی ان کی عادات و اطوار کو دیکھ کر سمجھ چکے تھے کہ اُن کا مستقبل درخشاں اور زندگی عظمت کا کوہِ گراں ثابت ہو گی۔ اور ان کا یہ ذہنی تصور لفظوں میں ڈھل کر ان کی زبان پر بھی آ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عبدالمطلب کے لئے حسبِ معمول خانہ کعبہ کے پاس مسند بچھائی گئی۔ عبدالمطلب کے

آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ عمائد قریش اور ان کے بیٹے مسند کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھے تھے۔ آنحضرت اُدھر نکل آئے اور بے جھجک آگے بڑھ کر دادا کی مسند پر بیٹھ گئے حالانکہ ان کی مسند پر کسی کو خواہ وہ ان کا بیٹا ہو یا کوئی رئیس قریش، قدم رکھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ اتنے میں عبدالمطلب بھی آ گئے۔ کچھ لوگوں نے فرزند عبداللہ کو وہاں سے اٹھا کر مسند کو خالی کرنا چاہا۔ عبدالمطلب نے تہدید آمیز لہجے میں کہا:۔

ردوا ابنی الی مجلسی فانہ تحدثہ — "میرے بیٹے کو میری مسند پر بیٹھا رہنے دو اس کے دل

نفسہ بملک عظیم وسیکون — دماغ میں ایک عظیم سلطنت پر فائز ہونے کا ولولہ موجزن

لہ شان۔ (سیرت حلبیہ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۹) — ہے عنقریب اس کی خاص شان ہو گی۔"

آنحضرت کے حرکات و سکنات میں آثار عظمت کے ساتھ روحانیت و تقدس کی جھلک بھی نمایاں تھی اس پاکیزگی و تقدس کی بنا پر عبدالمطلب ہر مصیبت و ابتلا کے موقع پر انہی کو اپنا دعاؤں کا وسیلہ بناتے اور انہی کے نورانی پیکر کا واسطہ دے کر بارش طلب کرتے۔ چنانچہ ایک سال مکہ میں بارش نہ ہونے سے قحط پڑ گیا لوگ سراسیمہ و پریشان حال ہو گئے۔ انہوں نے عبدالمطلب سے التجا کی کہ وہ بارش کے لئے دعا مانگیں تاکہ قحط کی سختیوں سے نجات ملے۔ عبدالمطلب نے آنحضرتؐ کو جن کا سن سات برس کا ہو چکا تھا اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور کوہ ابوقبیس پر چڑھ کر اور اس سراپا رحمت کا واسطہ دے کر باران رحمت کی دعا کی۔ ابھی پلٹ کر خانہ کعبہ تک نہ پہنچے تھے کہ فضا پر بادل چھا گئے اور اس طرح جھوم جھوم کر برسے کہ وادیاں چھلک اٹھیں اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ اس موقعہ پر رقیقہ بنت صیفی نے چند اشعار کہے ان میں کا ایک شعر یہ ہے ؎

بشیبۃ الحمد اسقی اللہ بلدتنا — لما فقدنا الحیا و اجلوذ المطر

"اللہ تعالیٰ نے شیبۃ الحمد کی دعا سے ہمارے شہر کو سیراب کر دیا جب کہ ہم بادلوں سے محروم تھے اور مدت سے بارشوں کا سلسلہ رُکا ہوا تھا۔"

یتیم عبداللہ سے عبدالمطلب کی محبت و شیفتگی اس بنا پر تو تھی ہی کہ وہ اُن کے فرزند کی اکلوتی یادگار ہیں مگر اس محبت و عقیدت کا اصل سرچشمہ یہ تھا کہ آپ عالموں اور مذہبی پیشواؤں سے یہ سنتے آ رہے تھے کہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں نبی خاتمؐ کا ظہور ہو گا۔ اور اس نبیؐ کے جو اوصاف و شمائل اور عادات و خصائل عالموں سے سنے اور آسمانی صحیفوں میں دیکھے وہ تمام کے تمام فرزند عبداللہ میں دیکھتے تھے۔ اور یہ علم و یقین حاصل کر چکے تھے کہ یتیم عبداللہ ہی مستقبل کے نبی اور سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ چنانچہ شاہ یمن سیف ابن ذی یزن سے ملاقات کے موقع پر اپنے اس یقین کا اظہار بھی کر دیا۔ اس ملاقات کا تذکرہ قریب قریب ہر مؤرخ اور سیرت

نگار نے کیا ہے۔ یہ ملاقات اس موقع پر ہوئی جب ملک یمن شاہِ حبشہ کے قبضہ سے نکل گیا اور سیف ابن ذی یزن نے اہلِ حبشہ کو مغلوب کر کے یمن پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ مکہ میں جب اس انتقالِ اقتدار کی خبر پہنچی تو عبدالمطلب نے رؤسائے قریش سے کہا کہ سیف کے ہاں ہمارا ایک تہنیتی وفد جانا چاہیئے۔ سب نے اس پر اتفاق کیا اور آپ کی زیرِ قیادت ستائیس افراد کا ایک وفد ترتیب دیا گیا۔ اس وفد میں امیہ ابن عبدشمس، اسد ابن عبدالعزیٰ، عبداللہ ابن جدعان، وہب ابن عبد مناف اور قصی ابن عبدالدار بھی شریک تھے۔ جب یہ وفد اس کے ہاں قصرِ غمدان میں پہنچا تو عبدالمطلب نے قائدِ وفد کی حیثیت سے کلماتِ تہنیت پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ سیف نے کہا کہ اگر یہ سمجھتے ہو کہ تم اس مرتبہ و حیثیت کے مالک ہو کہ شاہوں کے سامنے لب کشائی کر سکو اور انہیں تہنیت دے سکو تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔ عبدالمطلب نے تہنیت کے چند کلمات کہے اور اس کی کامیابی و کامرانی پر اس خوش اسلوبی سے اپنے تأثرات کا اظہار کیا کہ سیف جھوم اٹھا اور اُن کے پُرشکوہ لب و لہجہ، قریشی زورِ خطابت اور ہاشمی اندازِ تکلم سے متاثر ہو کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہا میں عبدالمطلب ابن ہاشم ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی مسند پر بٹھایا اور کہا کہ آپ تو میرے بھانجے ہوتے ہیں۔[1] فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

سیف نے عبدالمطلب کا انتہائی اعزاز و اکرام کیا اور دوسرے ارکانِ وفد کو بھی احترام سے مہمان خانہ میں ٹھہرایا۔ اسی دورانِ قیام میں سیف نے ایک دن عبدالمطلب کو تنہائی میں بلایا اور اُن سے کہا کہ میں ایک ایسے امرِ عظیم پر اطلاع رکھتا ہوں جو آپ کے لئے اور آپ کے خاندان کے لئے سرمایہ صد افتخار ہے۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو اس سے آگاہ کر دوں۔ پوچھا کہ وہ عظیم بات کیا ہے جو میرے لئے باعثِ افتخار اور وجہِ شرف ہے؟ کہا کہ تہامہ میں ایک بچہ پیدا ہو گا جس کے دونوں شانوں کے درمیان نبوت کا نشان ہو گا۔ اس کا نام بھی رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور اس کی شریعت بھی قیامِ قیامت تک قائم رہے گی۔

---

[1] عبدالمطلب کی والدہ سلمیٰ بنت عمرو آلِ قحطان سے تھیں اور سیف بھی آلِ قحطان میں سے تھا۔ اسی بنا پر اس نے عبدالمطلب کو بھانجا کہا اور عرب اپنے قبیلہ و خاندان کی ہر عورت کو بہن اور اس کی اولاد کو بھانجا کہہ کر یاد کرتے تھے۔ چنانچہ جب شمر ابن ذی الجوشن وارد کربلا ہوا تو اس نے حضرت عباس ابن علی اور ان کے بھائیوں کو اس طرح مخاطب کیا "انتم یا بنی اختی آمنون" (اے میرے بھانجو تم امان میں ہو) اس سے بعض سطحی نظر رکھنے والوں نے یہ سمجھ لیا کہ شمر عباس ابن علیؑ اور ان کے بھائیوں کا ماموں ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ خطاب اس بنا پر تھا کہ وہ اسی قبیلہ سے تھا جس قبیلہ سے حضرت عباسؑ کی والدۂ گرامی ام البنین تھیں۔ دونوں کا تعلق قبیلہ کلاب سے تھا۔ ۱۲

اور یہی زمانہ اس کے پیدا ہونے کا ہے اور ممکن ہے کہ وہ پیدا ہو چکا ہو یا پیدا ہونے والا ہو۔ اس کے خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بچپن میں اس کے ماں باپ وفات پا جائیں گے اور اس کا دادا اور چچا اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی ان کے دادا اور مربی ہیں۔ عبدالمطلب جو پیشین گوئیوں اور آسمانی صحیفوں کے ذریعہ سب کچھ جانتے تھے سیف کی زبان سے یہ نوید سن کر سجدۂ خالق میں جھک گئے اور اس نعمتِ عظمیٰ پر اظہار تشکر کے بعد سیف سے کہا کہ تمہاری اس اطلاع سے میرے علم و یقین پر جلاء ہوئی ہے۔ وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے اور جن علامتوں کا تم نے ذکر کیا ہے وہ سب اس کے اندر موجود ہیں۔ اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور میں اور اس کا ایک چچا اس کے مربی و کفیل ہیں۔ سیف نے کہا کہ پھر یہود سے اس کی حفاظت کیجئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اُسے گزند پہنچائیں یا اس کی ہلاکت کے درپے ہوں۔

جب وفد کی واپسی کا وقت قریب آیا تو سیف نے سب کو غلام، کنیزیں، سونا، چاندی، عنبر، اونٹ اور خلعت دیئے اور دوسروں سے دس گنا زائد عبدالمطلب کو دیا۔ عبدالمطلب کے ہمراہیوں نے آپ کے حاصل کردہ انعام کو رشک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ آپ نے فرمایا اے گروہِ قریش! تمہیں اس انعام و اکرام پر رشک نہ کرنا چاہیئے۔ یہ چیزیں تو فنا ہو جانے والی ہیں البتہ اس چیز پر رشک کرو جس کی شہرت چار دانگ عالم میں ہو گی اور میری آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کریں گی۔ پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا:۔

سیظھر بعد حین۔	تھوڑے وقفہ کے بعد تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔"
(عقد الفرید۔ ج ۱ ص۱۴۱)	

عرب کے قیافہ شناسوں نے بھی عبدالمطلب کو آنحضرتؐ کا چہرہ مہرہ، خدوخال اور نقش قدم دیکھ کر اُن کی غیر معمولی عظمت و شہرت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر بنی مدلج کے چند افراد نے ان سے کہا:۔

احفظ به فانا لم نر قدما اشبه بالقدم التی فی المقام منه	آپ اس بچے کی پوری حفاظت کیجئے اس لئے کہ اس کے قدموں سے بڑھ کر کسی کے قدم مقامِ ابراہیم کے نشانِ قدم سے مشابہ دیکھنے میں نہیں آتے۔"
(طبقات ابن سعد۔ ج ۱ ص۱۱۹)	

عبدالمطلب نے یہ الفاظ سنے تو ابوطالب کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور فرمایا: اسمع ما یقول هؤلاء۔ ان کی بات سن لو۔" ابوطالب کو ادھر توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ انہیں یہ نظر آ رہا تھا کہ ان کے بعد آنحضرتؐ کی دیکھ بھال اور تربیت و پرورش کرنے والے یہی ہوں گے لہٰذا ان کی عظمت و علو مرتبت سے باخبر رہیں اور تربیت و نگہداشت میں اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ وہ صرف اُن کے حقیقی بھائی کی یادگار اور عزیز ترین بھتیجے ہی نہیں ہیں بلکہ مستقبل کی ایک عظمت بکنار شخصیت ہیں اور اُن کے قدم ہی قدمِ خلیل کے مظہر

نہیں بلکہ سرتاپا آئینہ دار جمال و کمالِ خلیلؑ ہیں۔

عبدالمطلب ایک صدی سے زیادہ زندگی کی بہاریں دیکھ چکے تھے مگر بڑھاپے میں بھی چہرے پر شکوہ و جلال کے آثار نمایاں تھے۔ بالوں کے سفید ہو جانے کی وجہ سے خضاب لگاتے تھے۔ کمر سیدھی تھی اور اس میں ذرا جھکاؤ نہ تھا۔ البتہ آخر عمر میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ مگر چلنے پھرنے میں عصا کا سہارا لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کسی کا دھکا لگا۔ پوچھا کون تھا؟ بتایا گیا کہ بنی بکر کا ایک شخص تھا۔ فرمایا کہ میں تو آنکھوں سے معذور تھا اور وہ تو دیکھ سکتا تھا۔ اب مجھے سنبھلنے کے لئے عصا کی ضرورت پڑے گی پھر خود ہی فرمایا کہ اگر طویل عصا ہاتھ میں رکھتا ہوں تو اس کا اٹھانا مجھے گراں گزرے گا۔ اور اگر چھوٹا عصا رکھتا ہوں تو اس کے لئے مجھے اپنی کمر جھکانا پڑے گی اور یہ جھکاؤ ذلت ہے۔ ان کے بیٹوں نے یہ سنا تو کہا کہ آیندہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت آپ کے پاس موجود رہا کرے گا۔ آپ اس کا سہارا لے کر جہاں جانا چاہیں چلے جایا کریں۔ چنانچہ اس کے بعد اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے کاموں میں آتے جاتے تھے۔

جب امتدادِ زمانہ نے اعضاء و جوارح مضمحل کر دیئے تو اس اضمحلال نے علالت کی صورت اختیار کر لی اور صاحبِ فراش ہو گئے۔ اس عالم میں اگر کوئی فکر تھی تو یہ کہ یتیم عبداللہ کا زمانۂ یتیمی کیسے گزرے گا اور کون ان کی دیکھ بھال کرے گا۔ چنانچہ آخری لمحوں میں بسترِ بیماری پر کروٹیں بدلتے ہوئے پوچھا کہ ابو طالب کہاں ہیں۔ ابو طالب آگے بڑھے۔ فرمایا میں تمہیں یتیم عبداللہ کے بارے میں خصوصی طور پر وصیت کرتا ہوں۔ دیکھنا ان کی تربیت و کفالت میں سہل انگاری سے کام نہ لینا۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے:۔

لما حضرت عبد المطلب الوفاة	جب عبدالمطلب کا وقتِ وفات قریب آیا تو انہوں
اوصى اباطالب بحفظ رسول الله	نے ابو طالب کو آنحضرتؐ کی حفاظت و نگہداشت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحياطته	کے بارے میں وصیت فرمائی۔"

(طبقات۔ ج ۱۔ ص ۱۱۸)

جب ابو طالب کو تربیت کی ذمہ داری سونپ کر اپنا ذہنی بار ہلکا کر چکے تو آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ آپ کی رحلت سے فضائے مکہ سوگوار ہو گئی۔ یوں تو آپ کی وفات سے ہر آنکھ پُرنم اور ہر دل افسردہ و سوگوار تھا مگر یتیم عبداللہ کو جو ابھی آٹھ ہی برس کے تھے انتہائی رنج و قلق ہوا۔ انہیں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت دادا ہی سے ملی تھی میت کو دیکھ کر ضبطِ گریہ نہ کر سکے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور جب جنازہ کو آبِ خالص و آبِ کافور سے غسل دے کر اور یمن کی قیمتی چادروں کا کفن پہنا کر دفن کے لئے لیچلے

تو آپ بھی آنسو بہاتے ہوئے جنازہ کے ساتھ ساتھ رہے اور جب کوہ حجون کے دامن میں انہیں سپردِ لحد کر چکے تو واپس ہوئے۔

اہل مکہ نے اپنے محسن و سردار کی وفات کا بڑا غم منایا۔ شعراء نے دردناک مرثیئے لکھے اور مکہ میں کئی دن کاروبار بند رہا۔ علامہ حلبی نے لکھا ہے:۔

لم یبك احد بعد موته ما بکی	کسی مرنے والے پر اتنا گریہ و بکا نہیں ہوا جتنا عبدالمطلب
عبدالمطلب بعد موته ولم یقم	کے مرنے پر ہوا۔ اور ان کی رحلت پر بہت دنوں
لموته بمکة سوق ایاما کثیرة۔	تک مکہ کے بازار بند رہے۔"

(سیرت حلبیہ۔ ج ۱ ص۱۸۶)

آپ کی وفات ایک سو بیس برس کی عمر میں واقعہ فیل کے آٹھ سال کے بعد مکہ معظمہ میں ہوئی۔

اس سلسلۂ جلیلہ کی ایک ایک فرد اپنے دور میں اگرچہ امتیازی حیثیت کی مالک اور قومی قیادت کی حامل رہی ہے مگر جو شرف و امتیاز ہاشم و عبدالمطلب کو حاصل ہوا وہ کسی ایک کو حاصل نہ ہو سکا۔ ان کی شخصیتیں اتنی بلند و بالا اور قد آور تھیں کہ ان کی طرف انتساب عزت و شرف کا معیار قرار پا گیا اور عرب کے خود سر قبائل جن کی ذہنیتیں کسی کی سربلندی و سرفرازی کو قبول نہ کرتی تھیں ان کے آگے سر بخم ہو گئے۔ صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبرِ اسلام حضرت علی اور ابو بکر کے ہمراہ قبائل عرب کی طرف جاتے ہوئے ایک بستی کے قریب سے گزرے۔ حضرت ابو بکر نے آگے بڑھ کر ان بستی والوں سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے ہو؟ انہوں نے کہا قبیلۂ ربیعہ سے۔ ابو بکر نے کہا کہ قبیلہ ربیعہ کی کس شاخ سے؟ کہا ذہل اکبر سے۔ پوچھا کیا عوف ابن محلم تم میں سے تھا؟ کہا نہیں۔ پوچھا کیا جساس ابن مرہ تم میں سے تھا؟ کہا نہیں۔ غرض اس طرح کی کئی باتوں کے جواب میں جب انہوں نے 'نہیں' کہا تو ابو بکر نے کہا کہ پھر تم ذہل اکبر نہیں بلکہ ذہل اصغر ہو۔ یہ سن کر اس قبیلہ کا ایک لڑکا (دغفل ابن حنظلہ) کھڑا ہو گیا اور حضرت ابو بکر سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے ہو کہا قبیلہ قریش سے۔ پوچھا قبیلہ قریش کی کس شاخ سے؟ کہا تیم ابن مرہ کی اولاد سے۔ پوچھا کیا قصی ابن کلاب تم میں سے تھے جنہوں نے بکھرے ہوئے لوگوں کو یکجا کر کے مکہ میں آباد کیا؟ کہا نہیں۔ پوچھا ہاشم تم میں سے تھے جن کے بارے میں ایک شاعر (مطرود ابن کعب خزاعی) نے کہا ہے:۔

عمرو العلا ھشم الثرید لقومه ورجال مکة مسنتون عجاف

"وہ بلند مرتبہ عمرو (ہاشم) جنہوں نے شوربے میں روٹیاں بھگو کر اپنی قوم کو کھانا کھلایا جب کہ اہل مکہ تباہ حال اور قحط سالی سے نڈھال تھے۔"

کہا نہیں۔ پوچھا کیا عبد المطلب تم میں سے تھے ؟ جن کے دسترخوان پر اڑنے والے پرندے بھی مہمان ہوتے تھے اور جن کا چہرہ یوں چمکتا تھا جیسے اندھیاریوں میں چراغ۔ کہا نہیں۔ کہا کیا تم اُن لوگوں کی اولاد ہو جو حاجیوں کو مزدلفہ سے جانے کی اجازت دیتے تھے ؟ کہا نہیں۔ پوچھا کیا ان کی اولاد ہو جو حاجیوں کو پانی پلانے کا فریضہ ادا کرتے تھے ؟ کہا نہیں۔ ابھی وہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ حضرت ابوبکر گفتگو کو ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پلٹ کر رسول اللہ کے سامنے ساری گفتگو دہرائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں دلچسپی سے سنیں اور مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ قبائل عرب میں اسی سلسلہ کو اہمیت دی جاتی تھی جس میں قصی، ہاشم اور عبد المطلب کے نام منسلک ہوتے تھے اور جن سلسلوں میں ان کا نام نہ آتا تھا وہ چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھے جاتے تھے بلکہ جن شاخوں میں قصی کا نام تو آجاتا ہے مگر ہاشم و عبد المطلب کے ناموں سے خالی ہیں وہ شاخیں بھی عام قبائل کی سطح سے بلند نہ ہو سکیں۔ غرض قدرت نے جو امتیاز ہاشمی و مطلبی نسل کو دیا وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکا اور نہ بلند اوصاف میں کوئی ان کی برابری کا دعویٰ کر سکا۔ یہی وہ سلسلۂ جلیلہ ہے جو نسلی آلودگیوں سے مبرا اور شرف و برگزیدگی کے تاج ونگیں سے آراستہ رہا۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراھیم	خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے اسمٰعیل
اسمٰعیل واصطفیٰ من ولد اسمٰعیل	کو اور اسمٰعیل کی اولاد سے بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ
بنی کنانہ واصطفیٰ من بنی کنانہ	سے قریش کو اور قریش سے بنی ہاشم کو اور بنی
قریشا واصطفیٰ من قریش بنی ھاشم	ہاشم میں سے مجھے منتخب کیا۔"
واصطفانی من بنی ھاشم۔ (ترمذی۔ ج ۲۔ ص[۲۱])	

اس اصطفاء و برگزیدگی میں حضرت علیؑ بھی شریک ہیں اس لئے کہ آنحضرتؐ اور آپ دونوں ہم نسب اور دونوں کے آباؤ اجداد ایک ہیں۔ دونوں ایک ہی سلسلہ کے اصلاب و ارحام سے منتقل ہوئے حضرت ہاشم تک اور پھر عبد المطلب تک منتہی ہوتے ہیں۔ حضرت عبد المطلب کے مختلف ازواج سے دس فرزند تھے ان فرزندوں میں عبد اللہ اور ابو طالب حقیقی بھائی تھے۔ دونوں کی والدہ فاطمہ بنت عمرو مخزومیہ تھیں۔ عبد اللہ سے رسولِ خدا پیدا ہوئے اور ابو طالب سے حضرت علیؑ، جو اپنے دادا عبد المطلب پر رسولِ خدا سے مل جاتے ہیں۔ اس بنا پر دونوں مطلبی دونوں ہاشمی دونوں قرشی اور دونوں ایک ہی معدن کے گوہر شاہوار اور ایک ہی شجر کے برگ و بار تھے:۔

ہیں اس طرح نسب میں نبیؐ و علی بہم | دو نام گو ہیں ایک ہے پر کعبہ و حرم

غرض حضرت علیؑ کے حصہ میں نسل و خاندان کی ہر وہ فضیلت آئی جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے نام تھی اور آنحضرتؐ سے اتحادِ نسل کے اعتبار سے اور سلسلۂ آباؤ اجداد کے لحاظ سے اور شیخ البطحا ابو طالب کے ذریعہ جو شرف و امتیاز انہیں حاصل ہے وہ جلالت نسبی کے ماتھے کا جھومر اور شرافتِ حسبی کے کلاہ کا طرۂ درخشاں ہے۔

ابو طالب ابنِ عبد المطلب

حضرت ابو طالب کا اصلی نام اپنے جدّ اعلیٰ کے نام پر عبد مناف تھا۔ اور بعض تذکرہ نگاروں نے عمران لکھا ہے اور اکثر متقدمین کے نزدیک ابو طالب ہی کنیت تھی اور ابو طالب ہی نام تھا۔ آپ پیغمبر اکرمؐ سے پینتیس ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے۔ آنحضرت عام الفیل میں پیدا ہوئے اور آپ واقعہ فیل سے پینتیس سال قبل مکہ معظمہ میں متولد ہوئے۔ تینتالیس برس حضرت عبد المطلب ایسی عظیم شخصیت کے زیر سایہ رہے۔ انہی سے حکمت و اخلاق کے سبق لئے اور علم و ادب کے درس پائے۔ اور اس تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں علمی و ادبی رفعتوں کے نقطۂ کمال پر فائز ہوئے اور اپنے دور میں ایک بلند پایہ ادیب، ممتاز سخن طراز، عظیم مفکر اور بالغ النظر قائد تسلیم کئے گئے۔ اس علمی، ادبی اور فکری کمال کے ساتھ وجیہہ صورت، کشیدہ قامت، بھاری بھرکم، پُر عزم و پُر وقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے مہرے سے ہاشمی اور خدو خال سے قریشی سطوت جھلکتی تھی۔ زبان سے فصاحت و بلاغت کے سوتے پھوٹتے اور علم و حکمت کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اپنے اسلاف کے اعلیٰ کردار و بلند اوصاف کے درثہ دار اور اولادِ عبد المطلب میں سب سے زیادہ عادات و اطوار میں اپنے پدر بزرگوار سے مشابہ تھے۔

حضرت عبد المطلب کے بعد حرم کے عہدے رفادہ و سقایہ انہی سے متعلق ہوئے اور شیخ ابطح سید بطحا اور رئیس مکہ ایسے وقیع القاب سے یاد کئے گئے۔ دیار بکری لکھتے ہیں:۔

وکان عبد المطلب بعد هاشم	ہاشم کے بعد حاجیوں کو کھانا دینے کی خدمت
یلی الرفادہ فلما توفی قام بذالك	عبد المطلب سے متعلق ہوئی اور عبد المطلب کی
ابو طالب فی کل موسم حتی جاءَ	وفات کے بعد ظہور اسلام تک ہر سال یہ خدمت
الاسلام۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۵۷)	ابو طالب انجام دیتے رہے :۔

دنیا میں حصولِ منصب کے لئے دولت ایک بڑا ذریعہ ہے۔ مگر آپ کی قیادت و سربراہی اور منصبی

سربلندی دولت کی رہین منت نہ تھی بلکہ ان کی فرض شناسی، حسن عمل اور کردار کی انفرادیت نے انہیں عزت عظمت اور سرداری کے بام تک پہنچایا۔ حضرت علی فرماتے ہیں:۔

ابی ساد فقیرا وما ساد فقیر قبلہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۱۱)

"میرے والد نادار ہوتے ہوئے سردار قرار پائے حالانکہ ان سے پہلے کوئی نادار سردار نہیں ہوا۔"

اگرچہ ابو طالب کی مالی کمزور حالت اور اُن کے وسیع حوصلوں کا ساتھ نہ دے سکتی تھی پھر بھی جس طرح بن پڑتا محتاجوں اور ناداروں کی اعانت کرتے، حاجیوں کے لئے بڑی نفاست سے کھانے پکواتے، پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں کھجوریں اور کشمش ڈلوا دیتے تاکہ اللہ کے مہمانوں کو خوش ذائقہ و خوش مزہ پانی پینے کو ملے۔ ایک سال آپ معمول سے زیادہ تنگ دست تھے اور دور و دراز سے آنے والے حاجیوں کے خورد و نوش کے انتظامات سے قاصر، آپ نے اپنے بھائی عباس ابن عبد المطلب سے دس ہزار درہم قرض لئے اور وہ ساری رقم حاجیوں کے کھانے پینے میں صرف کر دی۔ اگلے سال پھر یہی صورت پیش آئی کہ نہ کھانے پینے کا سامان مہیا کر سکے اور نہ قرضہ ہی اتار سکے۔ آپ نے دوبارہ عباس سے چودہ ہزار درہم طلب کئے تاکہ سرزمین حرم کے مہمانوں کی خاطر داری و ضیافت کر سکیں۔ عباس اس شرط پر قرضہ دینے کے لئے آمادہ ہوئے کہ اگر سال آئندہ تک یہ تمام قرضہ ادا نہ ہوا تو یہ منصب ان سے لے لیا جائے گا۔ ابو طالب سال آئندہ تک بھی اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکے اور یہ منصب عباس کے سپرد کر دیا۔ جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ آپ نے منصب سے دست کش ہونا گوارا کر لیا مگر یہ گوارا نہ کیا کہ مکہ میں آنے والے حجاج بھوکے پیاسے رہیں یا سادہ و بدمزہ پانی پئیں۔

ابو طالب اپنے پہلو میں ایک درد مند اور حساس دل رکھتے تھے جو دوسروں کے دلوں کی دھڑکنیں سنتا اور مصیبت زدوں کی مصیبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اسی جذبۂ ہمدردی و انسان دوستی کو دیکھتے ہوئے پریشان حال انسانوں کے قافلے ان کے حریم امن کے گرد چکر لگاتے اور وہ دل و جان سے اُن کی مدد کرتے اور اُن کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ مظلوم و ستم رسیدہ اُن کے دامن میں پناہ مانگتے اور وہ اُن کے سینہ سپر بن کر کھڑے ہو جاتے اور انہیں پناہ دے کر اُن کی حفاظت کا ذمہ لے لیتے۔ چنانچہ ابو سلمہ مخزومی جب حبشہ سے پلٹ کر مکہ آیا اور بنی مخزوم اسلام کی بنا پر اس کے درپے ایذا ہوئے تو ابو سلمہ آپ سے پناہ کا طلبگار ہوا آپ نے اسے پناہ دے کر اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ بنی مخزوم کو معلوم ہوا تو وہ ابو طالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے اپنے بھتیجے محمدؐ کو بھی پناہ دے رکھی ہے اور اب ابو سلمہ کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کیجئے۔ فرمایا کہ وہ میرا بھانجا[1] ہے۔ جب اس نے مجھ سے پناہ طلب کی

---

[1] ابو سلمہ برہ بنت عبد المطلب کے بطن سے عبد الاسد کا بیٹا اور ابو طالب کا حقیقی بھانجا تھا۔

تو میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اسے پناہ میں لینے سے انکار کر دوں۔ اگر میں اپنے بھانجے کو پناہ نہ دوں گا، تو اپنے بھتیجے کو بھی پناہ نہ دے سکوں گا۔ اب اسے پناہ میں لینے کے بعد اس کی حمایت سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ یہ صاف جواب سن کر بنی مخزوم خاموش ہو گئے اور مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس تاریک معاشرہ میں جب کہ انسانیت کی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور اخلاق پستی کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے آپ نے اخلاقی رذائل سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ اور جب کہ جگہ جگہ جوا کھیلا جاتا تھا اور گھر گھر شراب پی جاتی تھی آپ نے نہ کبھی قماربازی کی طرف رخ کیا اور نہ کبھی شراب کو منہ لگایا۔ احمد ابن زینی دحلان نے تحریر کیا ہے:۔

کان ابوطالب ممن حرم الخمر علیٰ نفسه فی الجاهلية كابيه عبدالمطلب۔ (سیرت نبویہ۔ ص۳۵)	ابوطالب نے اپنے باپ عبدالمطلب کی طرح زمانۂ جاہلیت میں بھی شراب اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔

ابوطالب خود ہی فواحش و منکرات سے گریزاں نہ تھے بلکہ جہاں تک بن پڑتا دوسروں کو بھی عیوب و قبائح سے اجتناب کی تلقین کرتے۔ معاشرہ کی اصلاح اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتے۔ تجارت اور کسبِ حلال پر زور دیتے۔ خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو کے وقت انہی نے قریش کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ وہ اس کی تعمیر پر مالِ حرام و مشتبہ نہ لگائیں بلکہ جائز و حلال مال صرف کریں۔ چنانچہ قبلِ اسلام جب خانہ کعبہ کی دیواریں سیلاب سے متاثر ہو کر بیٹھنے لگیں اور اس کے منہدم ہونے کا خطرہ لاحق ہوا تو قریش نے چاہا کہ اسے منہدم کر کے از سرِ نو تعمیر کریں۔ جب اس کی دیواریں گرائی گئیں تو بنیادوں کے قریب ایک پھنکارتا ہوا اژدہا نظر آیا۔ لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور کام وہیں کا وہیں رک گیا۔ قریش کوئی ترکیب سوچ ہی رہے تھے کہ ابوطالب نے کہا:۔

ان هذا لا يصلح ان ينفق فيه الا من طيب المكاسب فلا تدخلوا فيه من ظلم وعدوان۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۱۹)	یہ تعمیر اس لائق ہے کہ اس پر صرف پاک و پاکیزہ اور حلال کمائی لگائی جائے۔ لہٰذا وہ مال نہ لگاؤ جو ظلم و زیادتی سے حاصل کیا گیا ہے۔

ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور کسبِ حلال سے کمایا ہوا سرمایہ تعمیر کے لئے مخصوص کر دیا۔ اب جو کعبہ کے قریب آئے تو دیکھا کہ ایک پرندہ اس اژدہے پر جھپٹا اور اسے اپنے پنجوں میں جکڑ کر بلندی کی طرف پرواز کر گیا اور تعمیر کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

ابو طالب اپنے معاشرہ میں ایسا نظام بروئے کار لانا چاہتے تھے جس کی اساس عدل و انصاف پر استوار ہو۔ نہ کسی کی حق تلفی ہو اور نہ کسی پر بیجا زیادتی۔ چنانچہ اسی جذبہ کے پیش نظر انہوں نے علقمہ کے خون کے بارے میں قسامت[1] کا طریقہ جاری کیا۔ اسلام نے بھی اس طریق کار کی افادیت کے پیش نظر اسے برقرار رکھا۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے :۔

و ابو طالب اول من سن القسامه فی الجاهلیة فی دم عمرو ابن علقمة ثم اثبتتها السنة فی الاسلام۔ (شرح ابن الحدید ج ۳ ص ۴۶۶)	زمانۂ جاہلیت میں ابو طالب نے عمرو ابن علقمہ کے خون کے بارے میں پہلے پہل قسامت کا طریقہ رائج کیا۔ پھر اسلام نے بھی اسے اپنے احکام میں جگہ دے دی۔"

ابو طالب دوستی ہو یا دشمنی کسی موقع پر حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور عام حالات ہی میں ظلم و زیادتی کے خلاف نہ تھے بلکہ جنگ کی معرکہ آرائیوں میں بھی غیر ضروری کشت و خون اور ناروا خونریزی کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ قبل اسلام قریش اور قبیلہ قیس میں ایک جنگ لڑی گئی جو حرب فجار کے نام سے موسوم ہے۔ اس جنگ میں قریش کے ساتھ بنی ہاشم بھی شریک ہوئے۔ پیغمبر اکرم ابھی کمسن تھے وہ بھی اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ آتے مگر نہ جنگ میں حصہ لیتے اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھاتے۔ جس دن ابو طالب آتے، قریش کا پلہ بھاری رہتا۔ قریش ان کی شمولیت کو وجہ کامرانی سمجھتے ہوئے کہتے کہ آپ لڑیں یا نہ لڑیں صرف ہمارے پاس موجود رہا کریں اس لئے کہ آپ کی موجودگی میں، ہمیں ڈھارس رہتی ہے اور فتح و ظفر کے آثار نظر آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا :۔

اجتنبوا الظلم والعدوان و القطیعة والبهتان فانی لا	تم ظلم، بے جا زیادتی، قطع رحمی اور الزام تراشی سے بچ کر رہو گے تو میں تمہاری نظروں سے اوجھل

---

[1] قسامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی فرد قتل ہو جائے اور اس کے ورثہ میں سے کوئی دعویٰ کرے کہ فلاں اس کا قاتل ہے اور اثبات دعوے کے لئے دو عادل گواہ نہ پیش کر سکے۔ مگر ایسے قرائن و شواہد موجود ہوں جن سے مدعی کے دعوی کی تائید ہوتی ہو تو مدعی اور اس کے قبیلہ والوں سے پچاس قسمیں لی جائیں گی کہ فلاں قاتل ہے اور اگر قسم کھانے والوں کی گنتی پچاس سے کم ہو تو ان سے کئی بار قسمیں لے کر پچاس کا عدد پورا کیا جائے گا۔ مثلاً پچیس افراد ہوں تو ہر ایک سے دو دو بار قسم لے کر پچاس کی گنتی پوری کی جائے گی اور مدعا علیہ کو قاتل قرار دے دیا جائے گا اور اس طرح مقتول کا خون رائیگاں نہ جانے پائے گا۔ ۱۲

اغیب عنکم (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صفحہ) نہیں ہوگا۔"

یہ تھی حضرت ابوطالب کی بلند نظری کہ جنگ و قتال کے پُر جوش ہنگاموں میں انتقامی اور دفاعی اقدامات کے حدود میں فرق و فاصلہ برقرار رکھے ہوئے ظلم و زیادتی کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں اور صرف اسی حد تک جنگ کے روادار رہتے ہیں جہاں تک جنگ اصولِ حرب و ضرب کے حدود کے اندر رہ کر لڑی جائے اور اسے دہشت و بربریت اور درندگی و خونخواری سے تعبیر نہ کیا جا سکے۔

ابوطالب اعتدال پسندی، انصاف پروری اور حلم و برد باری کے جوہر سے آراستہ تھے اور عرب کے نامور حکماء و دانشمند اُن سے استفادہ کرتے اور اُن سے اخلاق فاضلہ کے درس لیتے تھے۔ چنانچہ احنف ابن قیس سے جو عرب میں حلم و بردباری کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھا پوچھا گیا کہ تم نے علم و بردباری کا سبق کس سے لیا ہے؟ کہا حکیم عرب اکثم ابنِ صیفی سے اور اکثم ابنِ صیفی سے پوچھا گیا کہ تم نے حکمت، ریاست، حلم اور سرداری و سربراہی کے اصول کس سے سیکھے ہیں؟ کہا:-

من حلیف الحلم والادب سید العجم والعرب ابی طالب ابن عبد المطلب۔	سردارِ عرب و عجم، سراپا حلم و ادب ابوطالب ابنِ عبد المطلب سے۔"

(ہدیۃ الاحباب۔ صفحہ ۲۵۲)

آپ اپنے دور میں ایک مدبر و معلم اخلاق اور مفکر و دانشمند ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر و سخن دان بھی تھے۔ اور ایک دیوان "دیوان شیخ الاباطح" کے علاوہ ان کے اشعار کا ایک کافی وافی ذخیرہ تاریخ و سیر کی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ یوں تو عرب شعر و شاعری کا گہوارہ تھا اور مجلسوں، بازاروں اور میلے ٹھیلوں میں تفاخر و خود ستائی کی آوازیں قصائد کی صورت میں گونجا کرتی تھیں مگر معانی و مطالب کے لحاظ سے آپ کی راہ دوسروں کی راہ سے مختلف تھی۔ ان کے اشعار میں نہ بیجا خود ستائی کا شائبہ تھا اور نہ ابتذال اور بازاری پن کی جھلک بلکہ روانی و سادگی اور متانت و حُسنِ نظم کے ساتھ ان میں اخلاقی تعلیمات اور حق پرستی و حق نوازی کے زرّیں درس ہوتے تھے۔ اسی لئے حضرت علیؑ اُن کے اشعار کو علمی و اخلاقی سرمایہ سمجھتے ہوئے فرماتے تھے۔

تعلموہ و علموہ اولادکم فانہ کان علی دین اللہ وفیہ علم کثیر۔	ان کے اشعار پڑھو اور اپنی اولاد کو پڑھاؤ اس لئے کہ وہ دینِ خدا پر تھے اور ان کے کلام میں علم کا بڑا ذخیرہ ہے۔"

(بحار الانوار۔ ج ۹۔ صفحہ ۳۳)

ان امتیازات کے علاوہ نسبی و خاندانی بلندی کے لحاظ سے اور رسولِ خدا کی تربیت اور اسلام اور بانیٔ اسلام کے گراں قدر خدمات کے اعتبار سے بھی ان کی عظمت مسلّم ہے۔ پیغمبر اکرم نے انہی کے دامنِ عاطفت میں

پرورش پائی، اور انہی کے زیر سایہ زندگی کا بیشتر عرصہ بسر کیا۔ آنحضرتؐ کے والد ماجد جناب عبداللہ آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے اور جب چھ برس کے ہوئے تو آپ کی والدہ ماجدہ جناب آمنہ نے بھی انتقال فرمایا اور آپ اپنے دادا عبدالمطلب کے آغوشِ شفقت میں پرورش پانے لگے۔ لیکن دو ہی برس گزرے تھے کہ دادا تے بھی دنیا سے رحلت فرمائی۔ مگر زندگی کے آخری لمحوں میں ابوطالب سے خصوصی طور پر وصیت فرما گئے کہ وہ آنحضرت کی کفالت و نگہداشت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ ابوطالب خود بھی یتیم عبداللہ سے اتنی محبت و الفت رکھتے تھے۔ کہ جس کے بعد کسی وصیت کی احتیاج نہ تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے آنحضرتؐ کے بارے میں اپنے پدر بزرگوار کی وصیت کو سنا تو کہا:-

یا ابت لا توصنی بمحمدؐ فانہ ابنی و ابن اخیہ۔

(مناقب۔ ج ۱۔ ص ۲۱)

بابا مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو میرے بیٹے اور بھتیجے ہیں"

حضرت عبدالمطلب کثیرالاولاد تھے۔ اور آخر وقت ان کے تمام عزیز و اقارب اور بیٹے اُن کے گرد و پیش جمع تھے۔ اور اُن میں سے ہر ایک بآسانی اس بار کفالت کا متحمل ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے انتہائی بصیرت و دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے تربیت و کفالت کا ذمہ دار ابوطالب کو ٹھہرایا کیونکہ انہوں نے آنحضرتؐ کے ساتھ ابوطالب کے طرزِ عمل اور برتاؤ سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ جو محبت و شیفتگی انہیں یتیم عبداللہ سے ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ اور تربیت کی تکمیل کے لئے محبت و شفقت کے جذبات از بس ضروری ہیں۔ لہٰذا ان سے بہتر کوئی دوسرا اس خدمت کو سرانجام نہ دے سکے گا۔ اور بعد کے حالات نے بتا دیا کہ جو توقعات ان سے وابستہ کئے گئے تھے وُہ غلط نہ تھے بلکہ ان توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ثابت ہوئے اس کے علاوہ اس امر سے بھی انتخاب کو تقویت پہنچی ہو گی چونکہ ابوطالب اور عبداللہ صرف صلبی یگانگت ہی نہیں بلکہ بطنی یگانگت بھی ہے۔ لہذا جس ہمدردی و غمگساری اور خلوص و ایثار کی ان سے توقع ہو سکتی ہے وہ دوسرے مختلف البطن بھائیوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور کیا بعید ہے کہ آسمانی صحیفوں میں آنے والے نبی کے بارے میں پیشین گوئیوں کو پڑھ کر اور ابوطالب میں اسلام پروری و ایمان نوازی کے جوہر دیکھ کر اس دُعائے خلیل اور نوید مسیحا کو ان کے آغوش کے سپرد کیا ہو۔ اور بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابوطالب اور زبیر ابن عبدالمطلب میں قرعہ اندازی کی گئی ہو اور قرعہ ابوطالب کے نام نکلا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جب ان دو میں معاملہ دائر ہوا تو آنحضرتؐ نے ابوطالب کا دامن پکڑ لیا۔ اور انہی کے کنار عاطفت میں رہنے کی خواہش کی۔ بہر حال یہ انتخاب کسی بناء پر ہوا ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ

اللہ کے خصوصی لطف وکرم کا کرشمہ تھا اور مشیت ایزدی بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ امانت ابوطالب کے سپرد ہو اور انہی کے پاکیزہ آغوش میں پروان چڑھے۔ چنانچہ قدرت نے آنحضرتؐ پر جو جو احسانات فرمائے ان میں سے اس احسان کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: الم یجدک یتیما فاوی (کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہ دی) مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس پناہ سے مراد حضرت ابوطالب کا سایۂ عاطفت و آغوش شفقت ہے۔

غرض ابوطالب نے اپنے مرنے والے باپ کی وصیت کے مطابق آنحضرتؐ کو اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیا اور وہ تمام فرائض جو ایک مربّی و نگران کے ہو سکتے ہیں نہایت حسن و خوبی سے انجام دیئے اور اس طرح محبت و دلسوزی سے تربیت کی کہ ہر مؤرخ کے قلم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

کان یحبہ حبا شدیدا لا یحب	ابوطالب رسول خدا سے بے انتہا محبت کرتے اور
ولدہ وکان لا ینام الا الی جنبہ	اپنی اولاد سے زیادہ انہیں چاہتے تھے ان کے پہلو
ویخرج فیخرج معہ وصب بہ	میں سوتے، جب کہیں باہر جاتے تو انہیں ساتھ لے
ابوطالب صبابۃ لم یصب مثلھا	جاتے اور دنیا جہان کی ہر چیز سے زیادہ اُن پر
بشیئ قط۔ (طبقات ج۱۔ ص۱۱۹)	فریفتہ و گرویدہ تھے"

ابوطالب نے ابتداء سے آنحضرتؐ کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اُن کی افتادِ طبع اور اطوار و عادات کو اچھی طرح دیکھا بھالا تھا کہ وہ کم سخن، کم آمیز اور تنہائی پسند ہیں، نہ کھیل کود میں دلچسپی لیتے ہیں نہ سیر و تفریح میں۔ نہ ان سے کوئی ناسزا بات سننے میں آتی ہے اور نہ کوئی ناروا چیز دیکھنے میں۔ اور پھر عبدالمطلب کی مثالی خودداری اور رکھ رکھاؤ کے باوجود یتیم عبداللہ کے ساتھ اُن کا پُر شفقت و عظمت آمیز رویہ بھی دیکھا تھا۔ ان تمام چیزوں نے ابوطالب کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ شروع ہی سے آنحضرتؐ کی غیر معمولی شخصیت کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور جب آپ سے خوارق عادات اور مافوق العادہ آثار ظاہر ہوتے دیکھے تو بخوبی سمجھ گئے کہ یہ بچہ عام بچوں کی سطح سے بلند تر اور غیر معمولی عظمت و رفعت کا مالک ہے۔ اسی لئے جہاں محبت ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی وہاں عقیدت و ارادت بھی ان کے دل میں گھر کر گئی اور اسی محبت و عقیدت نے انہیں ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ کر دیا۔

ابوطالب نے آنحضرتؐ سے جو کرامات و خوارق عادات دیکھے اُن میں سے یہ چیز تو ہر روز مشاہدہ کرتے کہ جب آنحضرتؐ دسترخوان پر موجود ہوتے تو کھانا خواہ کتنا کم ہوتا سب شکم سیر ہو جاتے اور کوئی بھی بھوکا نہ رہتا۔ اس لئے آپ نے یہ معمول قرار دے لیا تھا کہ اگر آنحضرت کھانے کے وقت کہیں ادھر اُدھر ہوتے تو

نہ خود کھاتے اور نہ کسی کو کھانے کی اجازت دیتے اور فرماتے کہ جب تک میرا بھتیجا نہ آجائے کوئی کھانے کو نہ چھوئے۔ جب وہ آتے تو سب مل کر کھانا کھاتے۔ اگر کوئی دسترخوان پر سے کوئی دودھ کا پیالہ اٹھاتا تو کہتے ٹھہرو پہلے میرے بھتیجے کو پینے دو۔ جب وہ پی لیتے تو پھر دوسرے پیتے۔ اور سب سیر و سیراب ہو جاتے۔ ابوطالب یہ دیکھ کر آنحضرتؐ سے کہتے اِنَّكَ لَمُبَارَكٌ۔ تم تو بڑے ہی بابرکت ہو۔"

آپ ایک مرتبہ آنحضرتؐ کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے جب عرفہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام ذی المجاز میں پہنچے تو پیاس محسوس کی۔ آنحضرت سے کہا کہ اے میرے بھتیجے کیا آس پاس کہیں پانی مل سکتا ہے؟ آنحضرتؐ اونٹ سے نیچے اُترے اور ایک پتھر پہ ٹھوکر ماری اور زبان مبارک سے کچھ فرمایا۔ اِدھر الفاظ ختم ہوئے۔ اُدھر پتھر سے پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ فرمایا چچا پانی پی لیجیے۔ جب پی چکے تو آنحضرت نے دوبارہ ٹھوکر ماری اور ابلتا ہوا چشمہ خشک ہو گیا۔ انہی آثار خیر و برکت کو دیکھ کر ابوطالب انہیں اپنی دعاؤں کا وسیلہ بناتے اور ان کے صدقہ سے باران رحمت طلب کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ مکہ میں بارش کے نہ ہونے سے شدید قحط پڑ گیا۔ لوگ خشک سالی سے گھبرا اٹھے۔ کوئی کہتا لات و عزیٰ سے التجا کریں۔ کوئی کہتا منات کے آگے گڑگڑائیں کہ ایک خوش وضع و خوش فکر بزرگ نے کہا:

انی تؤفکون وفیکم باقیة ابراهیم	کہاں بھٹک رہے ہو حالانکہ تمہارے اندر یادگارِ
وسلالة اسمٰعیل (تاریخ الاسلام ذہبی ج ۱)	ابراہیمؑ و فرزندِ اسمٰعیلؑ موجود ہیں۔"

لوگوں نے کہا کیا اس سے تمہاری مراد ابوطالب ہیں؟ کہا کہ ہاں۔ یہ سنتے ہی لوگ ابوطالب کے ہاں آئے اور کہا کہ اے سردارِ قریش ہم قحط اور خشک سالی سے تباہ حال ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے بارش کی دعا کیجیے۔ آپ نے یتیم عبداللہ کا ہاتھ پکڑا اور خانہ کعبہ کے پاس آئے اور آنحضرتؐ کو دیوارِ کعبہ کے پاس بٹھایا اور ان کی انگشت مبارک کو اُوپر اٹھا کر حرکت دی۔ بارش کے کوئی آثار نہ تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں۔ ابرِ رحمت جھوم کے اٹھا اور اس شدت سے پانی برسا کہ سوکھی ہوئی زمین سیراب ہو گئی اور خشک صحراؤں میں شادابی آ گئی۔

ابوطالب گیہوں اور عطر کے معروف تاجر تھے اور قریش کے دستور العمل کے مطابق سال میں ایک بار تجارت کی غرض سے شام جاتے تھے۔ جب ان کے سفر شام کا زمانہ قریب آیا تو انہوں نے آنحضرتؐ سے اپنے سفر کا ذکر تو کیا مگر آپ کو ساتھ لے جانے کا خیال ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ اس وقت آپ کی عمر بارہ سال کی تھی اور دور دراز کے سفر کی صعوبتیں جھیلنے کے قابل نہ تھے۔ جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا کہ چچا انہیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تو وہ ان سے لپٹ گئے اور ساتھ چلنے کی پُرزور خواہش کی۔ ابوطالب کو بھی ان کی جدائی

گوارا نہ تھی آخر انہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

واللہ لاخرجنی بہ معی ولا یفارقنی ولا افارقہ ابدا	خدا کی قسم میں انہیں ساتھ لے جاؤں گا اور ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

(تاریخ خمیس۔ج ا۔ص ۲۵۷)

جناب ابو طالب نے انہیں ساتھ لے لیا اور شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ان کا تجارتی قافلہ شام کے جنوبی حصہ میں پہنچا تو وہاں کے ایک راہب جرجیس ابن ابی ربیعہ نے جو بحیرا کے نام سے مشہور ہے آنحضرتؐ کو اس قافلہ میں دیکھا اور ان سے ایسے آثار مشاہدہ کئے جو نبی خاتم کے لئے مخصوص تھے۔ اس نے انہیں قریب سے دیکھنے کے لئے تمام اہلِ قافلہ کو اپنے یہاں دعوت دی۔ قریش نے آنحضرتؐ کو سامان کے پاس چھوڑا اور اس کے ہاں پہنچ گئے۔ بحیرا نے جب آنحضرتؐ کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ کوئی اور بھی ہے؟ کہا کہ صرف ایک بچہ باقی رہ گیا ہے جسے سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑ آئے ہیں۔ کہا کہ اسے بھی بلا یا جائے۔ جب آنحضرتؐ تشریف لائے تو بحیرا نے انہیں سر سے پیر تک بغور دیکھا اور پشت مبارک سے پیراہن ہٹا کر مہر نبوت پر نگاہ کی اور اُن سے خواب و بیداری کی مختلف باتیں دریافت کرنے کے بعد ابو طالب سے پوچھا کہ یہ بچہ آپ کا کیا ہوتا ہے؟ ابو طالب نے کہا کہ میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ یہ آپ کا بیٹا تو ہو نہیں سکتا۔ اور ان کے سراپا پر نظر کرنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے والد کو زندہ نہ ہونا چاہیئے۔ ابو طالب نے کہا کہ یہ میرا بھتیجا اور میرا پروردہ ہے۔ ان کے والد کا انتقال ان کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ انہیں یہیں سے واپس لے جائیے ایسا نہ ہو کہ یہود ان کے درپے آزار ہوں اور انہیں گزند پہنچائیں۔ یہ ہدایت کے پیغامبر اور نبی مرسل ہیں۔ اہلِ قافلہ میں سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ تم نے کیونکر جانا کہ یہ نبی و رسول ہوں گے۔ کہا کہ جب تمہارا قافلہ پہاڑ کی بلندی سے نیچے اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ تمام درخت اور پتھر سجدے میں جھک گئے ہیں اور جدھر یہ بچہ جاتا ہے ابر سایہ کئے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خدوخال شکل و شمائل اور حسب و نسب کا تذکرہ میں نے آسمانی صحیفوں میں پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہا ہے کہ یہ اللہ کے رسولؐ اور سردارِ انبیاءؑ ہیں۔

"سالے کہ نکوست از بہارش پیدا"

جب آنحضرتؐ کا سن بیس برس کا ہوا تو ایک دن انہوں نے ابو طالب سے ذکر کیا کہ میں خواب میں تین نورانی پیکروں کو دیکھتا ہوں کہ اُن میں سے ایک میری طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہتا ہے کہ یہ ہے وہ جس کی نصرت وقت آنے پر تمہیں کرنا ہوگی اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ ابو طالب نے

مکہ کے ایک عالم سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس نے آنحضرتؐ کو غور سے دیکھا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ پاکیزہ روح کے حامل اور پاکیزہ نبی ہیں۔ ابو طالب نے اس سے کہا کہ چپ رہیے اور اسے ظاہر نہ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ انہی کی قوم رشک وحسد کی بنا پر ان کی دشمن ہو جائے۔ تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے اور میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔

لقد انبأنی ابی عبد المطلب بانه النبی المبعوث وامرنی ان استر ذٰلک لئلا یغری به الاعادی۔	میرے والد عبد المطلب مجھے بتا گئے تھے کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس بات کو پردۂ خفا میں رکھوں تاکہ دشمن اس کے خلاف نہ بھڑک اٹھیں۔
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۲)	

یہ واقعات وحالات ابو طالب کے لئے تصدیقِ نبوت کی راہیں ہموار کر چکے تھے۔ اور آفتابِ نبوت کے برافگندہ نقاب ہونے سے پہلے ان کے دل پر پرتو رسالت کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔ اور وہ علم الیقین رکھتے تھے کہ یتیم عبد اللہ مستقبل کے نبی ہیں۔ اسی لئے ان کی خدمت، تربیت اور دیکھ بھال میں مادی مسرت سے کہیں زیادہ روحانی کیفیت وسرور محسوس کرتے پروانہ وار اُن کے گرد وپیش رہتے، شب وروز انہیں نظروں میں رکھتے اور اُن کی فلاح وبہبود میں کوشاں رہتے۔ آنحضرتؐ بچپن کے حدود سے نکل کر جوان ہو چکے تھے۔ اب ابو طالب کو تربیت کے ضمن میں ان کے روزگار ومعیشت کی فکر ہوئی۔ قریش کا ذریعہ معیشت تجارت تھا مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کاروبار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت مکہ میں ایک معزز خاتون خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ جو خرید وفروخت کے لئے اپنے کارندے دوسرے شہروں میں بھیجا کرتی تھیں۔ آپ نے آنحضرتؐ کو خدیجہ کا کاروبار سنبھالنے کا مشورہ دیا اور خود جناب خدیجہ سے جا کر کہا کہ وہ جن شرائط پر دوسروں کو مالِ تجارت دے کر بھیجتی ہیں محمدؐ ابن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی بھیجیں۔ خدیجہ نے اسے منظور کر لیا اور شرائط تجارت طے کرنے کے بعد مالِ تجارت آنحضرتؐ کے سپرد کیا۔ آپؐ کچھ عرصہ ان کا کاروبار کرتے رہے اور اس میں انتہائی کامیابی حاصل کی۔ خدیجہ ان کے کاروبار سے مطمئن اور ان کی دیانت، راستبازی وخوش معاملگی سے بہت متاثر ہوئیں اور انہیں کسی ذریعہ سے شادی کا پیغام بھجوایا۔ آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ کرنے کے بعد اس رشتہ کو منظور فرمایا۔ ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد ابو طالب، حمزہ، عباس اور دوسرے بنی ہاشم واکابر قریش کے ہمراہ حضرت خدیجہ کے مکان پر آئے۔ بزم عقد آراستہ ہوئی اور جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا:۔

الحمد للہ الذی جعلنا من ذریة ابراهیم وزرع اسمٰعیل وضئضئ معد وعنصر مضر وجعلنا حضنة	تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں ذریت ابراہیم اور نسلِ اسمٰعیل اولادِ معد اور صلب مضر سے پیدا کیا اور ہمیں اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حرم

بيته وسواس حرمه وجعله لنا بيتا محجوجا وحرما امنا وجعلنا حكام الناس ثم ان ابن اخي هذا محمد ابن عبد الله لا يوزن به رجل الا رجح به شرفا وفضلا وعقلا وان كان في المال قل فان المال ظل زائل وامر حائل وعارية مسترجعة وهو والله بعد هذا له نبأ عظيم وخطر جليل۔ (سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۱۳۹)

کا پاسبان بنایا اور اسے ہمارے لئے حج کا مقام اور جائے امن و قرار دیا اور ہمیں لوگوں پر حاکم بنایا۔ یہ میرے بھتیجے محمد ابن عبد اللہ ہیں، جس کسی سے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے گا، تو شرف و نجابت اور عقل و فضیلت سے ان کا پلہ بھاری رہے گا۔ اگرچہ دولت ان کے پاس کم ہے لیکن دولت تو ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں، پلٹ جانے والی چیز اور واپس لے لی جانے والی عاریت ہے۔ خدا کی قسم! ان کا مستقبل عظمت بکنار اور ان سے ایک عظیم خبر کا ظہور ہوگا۔"

یہ خطبہ اگرچہ مختصر ہے اس سے ان کے عقائد و نظریات اور آنحضرتؐ کے متعلق ان کے خیالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے خطبہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے کی ہے جس سے اُن کی توحید پرستی پر روشنی پڑتی ہے۔ حمد و ثنا کی بعد ذریتِ ابراہیمی و نسلِ اسمٰعیلی سے اپنی وابستگی کا اظہار کر کے خانہ کعبہ کی نگرانی، حرم کی پاسبانی اور عامۃ الناس پر حکمرانی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صرف یہی امر واضح نہیں ہوتا کہ وُہ نسلِ ابراہیمؑ میں سے ہونے کی بناء پر ان منصبوں اور عہدوں پر فائز ہوتے چلے آرہے تھے، بلکہ اس امر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ حرم کے عہدوں کے علاوہ ان کے تعلیمات کے بھی ورثہ دار تھے۔ اگر وہ اُن کے تعلیمات سے بیگانہ اور ان کے دین و آئین سے بے تعلق ہوتے تو اس انتساب پر فخر کا کوئی مورد ہی نہ تھا۔ اس شرفِ انتساب اور خصوصی امتیازات کے بعد آنحضرتؐ کے کمالِ فہم و فراست اور بلندیٔ عقل و دانش کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے محاسن و کمالات کے مقابلہ میں مالِ دنیا کی بے قدری و بے وقعتی کو واضح کیا ہے اس طرح کہ اسے ڈھلتے ہوئے سایہ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس طرح سایہ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا اور اس کا گھٹنا، بڑھنا، سمٹنا، پھیلنا دوسری شے کے تابع ہوتا ہے اسی طرح مالِ دنیا بھی غیر مستقل اور عارضی ہے۔ آج ایک کے پاس ہے اور کل دوسرے کے پاس۔ لہٰذا اس مال کے ذریعہ جو عزت و سربلندی حاصل ہوگی۔ وُہ سایہ کے مانند ناپائیدار ہوگی۔ آخر میں نبأ عظیم کے الفاظ سے آنحضرتؐ کے درخشندہ مستقبل، علوِ منزلت اور عالمگیر نبوت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ عنقریب آسمانِ ہدایت پر نیرِ درخشاں بن کر چمکیں گے اور اپنے تعلیمات کی روشنی میں بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ دکھائیں گے۔

جب آنحضرت کاروانِ حیات کی چالیس منزلیں طے کر چکے تو قدرت نے جس مقصد کے لئے انہیں خلق کیا تھا اس مقصد کی تکمیل کے لئے مامور فرمایا اور ہدایت عالم کا بارِ گراں ان کے کاندھوں پر رکھا۔ آپ کفر و شرک کی گھٹاٹوپ اندھیاریوں میں ہدایت کے دیئے جلانے اور اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
بعثت کے ابتدائی سالوں میں دائرہ تبلیغ محدود اور دعوتِ اسلام بڑی حد تک مخفی تھی۔ گنے چنے چند افراد کے علاوہ دوسروں سے اظہارِ اسلام میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ نماز کے لئے تنہائی کے مواقع ڈھونڈے جاتے تھے کبھی مکانوں میں چھپ کے عبادت کرتے اور کبھی حضرت علیؑ کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی کھائیوں کی طرف نکل جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ایک مرتبہ ابوطالب نے ان دونوں کو پہاڑ کی ایک کھائی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ آپ نے علیؑ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے؟ جو تم نے اختیار کیا ہے۔ کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین پر ہوں۔ ابوطالب نے یہ سنا تو کہا:

انہ لا یدعوک الا الی خیر فالزمہ — "تم ان سے چمٹے رہو یہ تمہیں نیکی و ہدایت ہی کی راہ بتائیں گے"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۵۸)

اگر ابوطالب کفر پسند اور اسلام دشمن ہوتے تو آنحضرت سے یہ کہتے کہ میں نے بیشک اپنے فرزند کو آپ کے حوالے کیا تھا لیکن یہ آئینِ اخلاق و مروت کے خلاف ہے کہ آپ مجھ سے پوچھے بغیر میرے بچے کی ذہنی ناپختگی سے فائدہ اٹھائیں اور اسے اپنے نئے مذہب کی راہ پر لگائیں اور اس طرح باپ بیٹے کے درمیان ذہنی و نظریاتی تفرقہ ڈالیں، اور علی سے بھی یہ کہتے کہ تم اس اُٹھا بیٹھی کو چھوڑو اور اپنے باپ کے دین و آئین پر قائم رہو۔ اس لئے کہ ہر انسان اپنی اولاد کو اسی دین و مذہب پر دیکھنا چاہتا ہے جس کا وہ خود پابند ہوتا ہے۔ مگر ابوطالب نے پیغمبرؐ کو کچھ کہنے یا علی کو روکنے کی بجائے انہیں آنحضرتؐ کی پیروی کا حکم دیتے ہیں۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے، کہ وہ کفار و مشرکین کے مشرکانہ عبادات و رسوم کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھتے تھے ورنہ بت پرستی کے مقابلہ میں اس طرز عبادت کو خیر سے تعبیر نہ کرتے اور علیؑ سے یہ نہ کہتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریق و مسلک پر مضبوطی سے جمے رہو وہ تمہیں نیکی اور بھلائی ہی کا راستہ دکھائیں گے۔ اس سے یہ حقیقت بڑی حد تک آشکارا ہو جاتی ہے کہ ابوطالب ذہنی طور پر اسلام سے پورے ہم آہنگ اور ہمہ تن اس کی پذیرائی کے لئے آمادہ تھے۔

آنحضرتؐ کو در پردہ تبلیغ کرتے ہوئے تین برس گزر گئے۔ جب چوتھا سال شروع ہوا تو علانیہ تبلیغ اسلام کا حکم آیا۔ آپ نے ابوطالب کے مکان پر ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اپنے عزیز و اقارب کو جمع کر کے انہیں اللہ کا پیغام سنایا کہ وہ بتوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش کریں۔ ابوطالب قریش کے تیوروں سے سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے قدیم رسم و رواج کے خلاف کوئی آواز سننا گوارا نہ کریں گے۔ اور لامحالہ آنحضرت کے خلاف اُٹھ

کھڑے ہوں گے آپ نے ان کی مخالفت کے زور پکڑنے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ ان کے گوش گزار کر دیں کہ وہ ابن عبداللہ کو تنہا و بے سہارا نہ سمجھیں بلکہ ہم اُن کے دست و بازو بن کر اُن کے ساتھ ہوں گے اور ہر لمحہ اُن کے سینہ سپر رہیں گے۔ چنانچہ آپ نے جذبۂ حق پرستی سے متاثر ہو کر پُر اعتماد لہجے میں کہا:۔

واللہ لنمنعہ ما بقینا۔! "خدا کی قسم ہم جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں سے اُن کی حفاظت کریں گے"

(تاریخ کامل ج ۱۔ صٓ)

جب پیغمبر اکرمؐ کی آواز گھر کی چار دیواری سے نکل کر کفر پرور فضا میں گونجی تو ردِ عمل کے طور پر مخالفت کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جو لوگ دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے آنکھیں دکھانے اور جو پھول برساتے تھے۔ کانٹے بچھانے لگے۔ قریش نے قدم قدم پر تبلیغ حق میں مشکلات پیدا کیں۔ وہ کون سی رکاوٹ تھی جو آپ کے راستے میں کھڑی نہ کی ہو اور وہ کون سا حربہ تھا جو اٹھا رکھا ہو۔ مگر پیغمبرؐ نے کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھا اور قریش کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ہمہ تن اپنے تبلیغی کاموں میں مصروف رہے۔ قریش نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ ایک وفد کی صورت میں ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ فرزند عبداللہ کے طور طریقے دیکھ رہے ہیں انہوں نے چند کم حیثیت لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے دین میں داخل کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُن سے رُو در رُو بات چیت کریں اور آپ بھی انہیں سمجھائیں کہ وہ اپنا رویہ بدلیں اور اس نئی اپج سے باز آئیں۔ ابوطالب اٹھ کر آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ چند رؤسائے قریش آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اگر مناسب سمجھیں تو ان کی بات سن لیں۔ آنحضرتؐ باہر تشریف لائے اور اُن لوگوں سے پوچھا کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہ بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے بتوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ انہیں بُرا بھلا نہ کہیں اور نہ ہمارے دین و مذہب پر حملہ کریں۔ اگر آپ نے ہمارا یہ مطالبہ مان لیا تو ہم آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دیں گے آپ جانیں آپ کا کام۔ فرمایا میں بھی تو چاہتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اسی کی عبادت کرو اور اُسے چھوڑ کر اپنے خود ساختہ خداؤں کی پرستش نہ کرو۔ اور یہ میرا فرض منصبی ہے کہ میں بت پرستی کی مذمت اور خدا پرستی کی تبلیغ کروں۔ قریش نے کہا کہ یہ تو عجیب بات ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے مسلک کو چھوڑ کر اور تمام معبودوں سے منہ موڑ کر بس ایک خدا کے ہو رہیں۔ یہ کہہ کر تیوریوں پر بل ڈالے اور منہ لٹکا کر چل دیے۔

اس موقع پر ابوطالب نے اپنی حکمت عملی اور حسن تدبر سے کام لیتے ہوئے ایسا رویہ اختیار کیا کہ قریش کے بھڑکے ہوئے جذبات اور بھڑکنے نہ پائیں۔ اگر نرم روی کے بجائے سخت رویہ اختیار کیا جاتا تو دشمنی و عناد کی آگ بھڑک اُٹھتی اور کفار کی تشدد پسند طبیعتیں اور سختی و تشدد پر اُتر آتیں۔ اس مصلحت کے علاوہ دعوتِ فکر کا اہم مقصد بھی اس میں شامل تھا کہ قریش سیخ پا ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے آنحضرتؐ کی باتیں

سنیں، اُن پر غور کریں اور اپنے معتقدات اور اُن کے تعلیمات کا جائزہ لے کر حق و باطل کا فیصلہ کریں اور جس طرح دوسرے معاملات میں ان کی راستگوئی و صدق بیانی تسلیم کرتے آئے ہیں، دین کے بارے میں بھی اُن کی سچائی کا اعتراف کریں اور سوچیں کہ جس نے چالیس سال کی عمر تک نہ کبھی جھوٹ بولا ہو اور نہ کبھی غلط بیانی کی ہو وہ یکبارگی اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے کہ رسالت اور اللہ کی نمائندگی کا ادعا کرنے لگے۔ مگر قریش اپنے معتقدات سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے اور نہ ان کی منجمد طبیعتوں میں بآسانی تبدیلی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا تحفظ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس داعیِ حق کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر ابوطالب کے ہوتے ہوئے انہیں آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کی جرأت بھی تو نہ تھی۔ انہوں نے ابوطالب کی حمایت و سرپرستی کو ختم کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا کہ قریش کے ایک خوبصورت نوجوان عمارہ ابن ولید کو ابوطالب کے پاس لائے اور کہا کہ آپ اسے اپنا بیٹا بنا لیجئے اور محمدؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیے۔ ابوطالب نے ان کی یہ انوکھی فرمائش سنی تو فرمایا:۔

اتعطوننی ابنکم اغذوہ لکم و اعطیکم ابنی تقتلونہ ھذا واللہ لایکون ابدا۔ (تاریخ کامل ج ۲ - ص۴۳)	یہ اچھا انصاف ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر پالوں اور اپنا بیٹا تمہارے حوالے کر دوں تاکہ تم اسے قتل کرو۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوگا۔

قریش کا یہ مطالبہ انسان کے فطری لگاؤ اور جذبۂ محبت سے بے خبری یا اس سے عمداً بے رخی پر مبنی تھا کہ ابوطالب اپنے حقیقی بھتیجے اور پروردہ کو خونخوار درندوں کے حوالے کر دیں اور ایک اجنبی اور بیگانے کو لے کر پالیں پوسیں۔ ایک معمولی سطح کا انسان بھی اسے گوارا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ابوطالب ایسا باحمیت انسان جو پناہ مانگنے والوں کے لئے بھی مضبوطی و تندہی سے جم جاتا ہو وہ اپنے جگر بند کو اس آسانی سے خون آشام تلواروں کے سپرد کر دے اور اپنی حمیت، مروت اور شرف کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہ کرے۔

قریش کی اس پیشکش سے اُن کی پست ذہنیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی دشمنی میں کس حد تک ہوش و خرد کے تقاضوں سے دور ہو چکے تھے کہ ایسی پوچ اور بے طرح باتوں پر اُتر آئے تھے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ ایسے کج فکر لوگوں کو سمجھانا بجھانا اور ان کے ارادوں کو ناکام بنانا کتنا دشوار تھا۔ اور ان دشواریوں کے دور کرنے میں کیا ابوطالب کے علاوہ کسی اور کا بھی عمل دخل تھا؟ تاریخ کسی اور کا نام بتانے سے قاصر ہے۔ غرض قریش کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا اور ان کی سخت گیریوں اور ستم رانیوں کے باوجود اسلام کی آواز دبنے کے بجائے ابھرتی ہی گئی۔ اب انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر آنحضرتؐ کی آواز سے متاثر ہو کر لوگ اسی طرح دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے اور یہ سلسلہ یونہی بڑھتا رہا تو یہ مختصر جماعت آگے بڑھ کر مکہ کی سیاست

پرچھا جائے گی اور انہیں پیروں تلے روند کر اُن کے اقتدار کو ملیامیٹ کر دے گی۔ جب انہیں انقلاب نو کے زیر اثر اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا تو ان کے چند شیوخ و عمائد ابوطالب کے پاس پھر آئے اور کہا کہ ہم پہلی مرتبہ تو خاموش چلے گئے تھے مگر اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ ہم کہاں تک آپ کی بزرگی و عظمت کا پاس و لحاظ کریں گے آخر ہم کو وہ قدم اٹھانا پڑے گا جو اب تک اس توقع پر نہیں اٹھایا کہ شاید یہ آواز دب جائے مگر یہ آواز خود سے دبتی نظر نہیں آتی۔ آپ اپنے بھتیجے کو سختی سے سمجھائیں کہ وہ خاموش بیٹھ جائیں اور ان ان آسمانی باتوں کا سلسلہ ختم کریں۔ ورنہ آپ درمیان سے ہٹ جائیں اور ہمیں دو ٹوک فیصلہ کر لینے دیں۔ ابوطالب نے اُن کے بُرے ارادے اور بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو گھبرائے ہوئے آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ سرداران قریش پھر جتھا باندھ کر آئے ہیں۔ آپ ایسا طریق اختیار کریں کہ اُن کے جذبات مشتعل نہ ہوں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ اچانک آپ کو قتل کر دیں گے۔ میں ایک اکیلا کہاں تک اُن کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور ان کی بڑھتی ہوئی طغیانی و سرکشی کو روک سکتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے ابوطالب کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا۔ چچا میں تو انہیں نیکی اور خدا پرستی کی دعوت دیتا ہوں اور میرے منصب کا تقاضا یہی ہے کہ میں انہیں اللہ کے احکام بتاؤں، ناشائستہ اعمال سے روکوں۔ اگر وہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں۔ جب بھی میں اعلانِ حق اور ادائے فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ وہاں سے چل دیے۔ ابوطالب نے پیغمبرؐ کو جاتے دیکھا تو بوڑھے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آواز دے کر پیغمبرؐ کو روکا اور ان کے عزم و استقلال سے متاثر ہو کر پوری خود اعتمادی سے کہا:۔

اذھب یا بن اخی فقل ما احببت فو اللہ لا اسلمک لشیئ ابدا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۶۶)

"برادر زادے جائیے اور جو چاہے کہیے۔ خدا کی قسم میں کبھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

ابوطالب کے اس جرأت آفریں جواب سے پیغمبرؐ کے آنسو تھم گئے۔ پُرعزم دل کا حوصلہ بڑھ گیا اور تنہائی و بے یاری کا احساس جاتا رہا۔ اس تجدید عہد کے بعد ابوطالب نے قریش کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ آپ لوگ کیا کھڑے ہیں جائیے۔

واللہ ما کذب ابن اخی قط (اصابہ۔ ج ۴۔ ص ۱۱۶)

"خدا کی قسم! میرے بھتیجے کی زبان کبھی جھوٹ سے آشنا نہیں ہوئی۔"

قریش کے ان وفدوں میں اگرچہ ابوطالب کو ایک واسطہ و ذریعہ ٹھہرایا جاتا رہا ہے مگر وہ کسی موقع پر قریش کے مسلک کی تائید و ہمنوائی کرتے نظر نہیں آتے۔ اگر وہ ان کے نظریات کے ہمنوا ہوتے تو جہاں پیغمبر کو قریش کا

پیغام پہنچاتے تھے۔ وہاں یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ آپ ان کے مذہب کے خلاف کچھ نہ کہیں اور نہ بتوں کی مذمت کریں
آخر میں بھی انہی کے مذہب و آئین پر ہوں۔ مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آپ نے کبھی اُن کی ہمنوائی کی
ہو۔ بلکہ صرف ایک پیغامبر کی حیثیت سے پیغام پہنچا دیتے تھے اور کچھ کہتے بھی تھے تو قریش کے خلاف پڑتا تھا
قریش بھی ان کے طرزِ عمل سے سمجھ گئے تھے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اپنے بھتیجے کے ساتھ ہیں اور ان سے کبھی یہ
امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت سے دستبردار ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا انہوں
نے مزید کچھ کہنا سننا بے سود سمجھا اور ایک محاذ قائم کر کے پیغمبر اکرمؐ کو ستانا اور اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ کبھی ڈھیلے
مارتے، کبھی کوڑا کرکٹ پھینکتے، کبھی کاہن و مجنوں اور آسیب زدہ کہتے، اور جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے
تو آوازے کستے اور مذاق اڑاتے۔

پیغمبر اکرمؐ ایک دن خانہ کعبہ کے پاس مصروفِ نماز تھے کہ ابوجہل نے حرم میں بیٹھے ہوئے چند آدمیوں
سے کہا کہ تم میں کون ہے جو ان کی نماز خراب کرے۔ عبداللہ ابن الزبعری اُٹھا اور خون اور گوبر لے کر آپ
کے چہرۂ اقدس پر مل دیا۔ آنحضرتؐ نماز سے فارغ ہوئے تو سیدھے ابوطالب کے پاس آئے۔ اور ان کے سوا کون
تھا جو ان کی حالت پر کڑھتا اور دکھ درد سنتا۔ ابوطالب نے پیغمبر کی یہ حالت دیکھی تو ان کا خون کھولنے
لگا۔ پوچھا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ فرمایا عبداللہ ابن الزبعری کی۔ ابوطالب نے تلوار ہاتھ میں لی اور خانہ کعبہ
کی طرف چل دیے۔ عبداللہ ابن الزبعری اور دوسرے لوگوں نے جیسے ہی ابوطالب کو آتے دیکھا تو کھسکنا چاہا۔
آپ نے گرج کر کہا کہ اگر تم میں ایک بھی اپنی جگہ سے ہلا تو اس کی جان کی خیر نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ جہاں بیٹھے
تھے وہیں دبک کر بیٹھ گئے۔ آپ نے خون اور گوبر لے کر ایک ایک کے چہرے پر ملا اور نفرین و ملامت کرتے
ہوئے واپس آئے۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ شام تک گھر نہ پلٹے۔ ابوطالب کو فکر دامن گیر ہوئی کیونکہ ان حالات
میں یہ اندیشہ تھا کہ قریش آنحضرتؐ کو کہیں غائب کر دیں یا قتل کر ڈالیں۔ آپ نے جہاں جہاں آنحضرتؐ کے ملنے
کا امکان تھا ڈھونڈھ ڈالا مگر کہیں پتہ نہ چل سکا۔ آپ نے چند ہاشمی نوجوانوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم اپنی
آستینوں میں تیز دھار خنجر چھپا کر سردارانِ قریش میں سے ایک ایک کے پہلو میں بیٹھ جاؤ اور ایک ابوجہل کے
کے پاس۔ اگر یہ سنو کہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے ہیں تو تم ایک دم ان پر ٹوٹ پڑنا اور سب کو بے دریغ قتل کر دینا۔
ہاشمی نوجوانوں نے خنجر سنبھالے اور سردارانِ قریش کو اپنی زد میں لے کر بیٹھ گئے۔ ابوطالب تلاش میں سرگرداں تھے
کہ کوہِ صفا کی جانب سے زید ابن حارثہ کو آتے دیکھا پوچھا کہ تم نے میرے بھتیجے کو کہیں دیکھا ہے؟ کہا کہ ہاں
میں ابھی ابھی ان کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہ کوہِ صفا کے دامن میں تشریف فرما ہیں۔ فرمایا انہیں ابھی بلا کر

لاؤ۔ میں جب تک انہیں زندہ وسلامت دیکھ نہ لوں گا گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ زید نے آنحضرتؐ کو ابوطالب کی پریشانی کی خبر دی۔ آپ فوراً اٹھ کر چچا کے پاس آئے۔ ابوطالب نے انہیں صحیح وسالم دیکھا تو اطمینان ہوا۔ دوسرے دن آپ پیغمبر اکرمؐ اور ہاشمی نوجوانوں کو لے کر قریش کے پاس آئے اور ان نوجوانوں سے کہا کہ جو چیز تم چھپائے ہوئے ہو اسے ظاہر کر دو۔ سب نے آستینوں سے خنجر نکال کر دکھائے۔ قریش نے پوچھا کہ یہ خنجر کیسے ہیں؟ کہا کہ کل محمدؐ دن بھر غائب رہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ قتل نہ کر دیئے گئے ہوں۔ میں نے ان ہاشمی نوجوانوں کو مامور کیا تھا کہ اگر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قتل کی خبر آئے تو سرداران قریش پر حملہ کر دینا۔ اور ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑنا۔ لہٰذا ان تیز دھار خنجروں کو اچھی طرح دیکھ بھال لو۔

واللہ لو قتلتموہ مابقیت منکم احدا حتی نتفانی نحن وانتم۔	اگر تم محمدؐ کو قتل کر دیتے تو خدا کی قسم! میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ ہم بھی مرجاتے اور تمہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے۔
(طبقات ابن سعد۔ ج۱۔ ص۲۰۳)	

قریش اور بنی ہاشم میں رقیبانہ چشمک تو پہلے ہی سے تھی اور اب ان کی معاندانہ روش کے نتیجہ میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی اور ان کی دشمنی وعداوت کھل کر سامنے آ گئی۔ قریش کا عناد اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے بنی ہاشم سے قطع مراسم کا فیصلہ کر لیا اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ شہر سے باہر ایک گھاٹی میں پناہ لیں۔ یہ مقام بھی قریش کی پہنچ سے باہر نہ تھا اور ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ اچانک کسی سمت سے حملہ نہ ہو جائے۔ اور رات کے وقت یہ خطرہ اور بڑھ جاتا تھا۔ اس خطرہ کے پیش نظر ابوطالب راتیں جاگ کر کاٹتے، پیغمبرؐ کے بستر پر اپنے بچوں میں سے کسی کو اور علی العموم اپنے چھوٹے فرزند علیؑ کو سلا دیتے تاکہ رات کے اندھیرے میں حملہ ہو تو ان کا کوئی بیٹا کام آ جائے اور پیغمبرؐ پر آنچ نہ آئے۔ یہ دور وہ تھا جب خطۂ عرب میں گنے چنے چند آدمیوں کے علاوہ پیغمبرؐ کا نہ کوئی حامی تھا اور نہ کوئی مددگار کیا اپنے اور کیا بیگانے سب ہی دشمنی پر آمادہ اور مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ اس سخت ترین دور میں ایک ابوطالب تھے جو پیغمبرؐ کی حمایت وپشت پناہی پر کوہ آسا جمے رہے نہ کسی موقع پر ان کا ساتھ چھوڑا اور نہ ان کی نصرت واعانت سے ہاتھ اٹھایا۔ یہ انہی کی حمایت وپاسداری کا نتیجہ تھا کہ قریش اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور آنحضرتؐ ان کی دسترس سے باہر اور خطروں سے محفوظ رہے۔ وہ نرمی کے موقع پر نرمی سے اور سختی کے موقع پر سختی سے دفاع کرتے رہے اور اپنے اثر ونفوذ سے کام لے کر ان کے شیطانی منصوبوں کو ناکام بناتے رہے۔ غرض کہ ہر ممکن طریقہ سے قریش کی شر انگیزیوں کو دبایا اور معاشی مقاطعہ کے ہنگام اپنی اولاد کو خطرہ میں ڈال کر آنحضرتؐ کے تحفظ کا انتظام کیا۔ اگر وہ عرب کے چیرہ دستوں اور قریش کے فتنہ پردازوں کے ظلم ناروا کو روکنے کے لئے کھڑے نہ ہوتے تو مظالم قریش کی تاریخ موجودہ تاریخ سے

کہیں زیادہ دردناک و الم انگیز ہوتی۔

ابو طالب کی فداکاری و جاں نثاری اور پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت میں پامردی وہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس سے آج تک کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکی۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس نصرت کو دوسرا رنگ دے کر اس کی اصل روح کو مضمحل کر دینا چاہا ہے۔ چنانچہ اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ یہ نصرت مذہبی و اعتقادی جذبہ کے زیر اثر نہ تھی بلکہ اس میں قرابت و عزیزداری کے جذبات کارفرما تھے۔ اور عرب تو دور کی قرابت کو بھی نظرانداز نہ کرتے تھے اور پیغمبرؐ تو آپ کے پروردہ اور حقیقی بھتیجے تھے وہ کیونکر ان کی حمایت و پاسداری نہ کرتے اور کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے سینہ سپر نہ ہوتے۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ پیغمبرؐ آپ کے قریبی عزیز، پروردہ خاص اور حقیقی بھائی کی یادگار تھے۔ اور یہ بھی مسلّم ہے کہ عرب قرابت داری کا پاس و لحاظ کرتے تھے مگر کتنی بھی عزیزداری کیوں نہ ہو کوئی شخص اپنے مذہب کے مقابلہ میں قرابت و رشتہ داری کا خیال نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ اپنے معتقدات کے خلاف آواز اٹھانے میں تعاون کرے اور اپنے معبودوں کی تذلیل و توہین کے سلسلہ میں ہاتھ بٹائے۔ اور ابو طالب تو بتوں کو برا بھلا کہنے میں پیغمبرؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسلامی نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اُسے تو کسی صورت میں پاس قرابت کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور اگر یہ سب کچھ بربنائے قرابت تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیٹوں سے زیادہ قرابت ہوتی ہے یا بھتیجے سے؟ ظاہر ہے کہ جو قرابت اپنی اولاد سے ہوتی ہے وہ بھائی کی اولاد سے نہیں ہو سکتی۔ تو اگر اس نصرت میں نسبی قرابت کا تقاضا ہی کارفرما ہوتا تو بیٹوں کی جانوں کا خطرہ مول لے کر انہیں پیغمبرؐ کے بستر پر سونے کا حکم نہ دیتے بلکہ ان کا تحفظ پیغمبرؐ کے تحفظ پر مقدم رکھتے۔ اور پھر تاریخ عالم سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی نے ایک ایسے شخص کی خاطر جس کے نظریات کو باطل اور دعویٰ کو غلط سمجھتا ہو محض قرابت کی بنا پر اپنی اولاد کو ہلاکت میں دھکیل دیا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نصرت میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھی قرابت کا جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ دینی و مذہبی رابطہ تھا جو انہیں نصرت میں سرگرم عمل رکھے ہوئے تھا۔ اور دین و مذہب کا رابطہ سب روابط سے قوی تر ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں تمام روابط مضمحل ہو جاتے ہیں۔ آخر پیغمبرؐ اور ابولہب میں بھی رشتہ تھا۔ وہ بھی پیغمبرؐ کا چچا تھا۔ وہ نسبی قرابت کی بنا پر کیوں نصرت و حمایت کے لئے کھڑا نہ ہوا۔ یا کم از کم اس قریبی رشتہ کی بنا پر دشمنی و عناد کے مظاہروں ہی سے باز رہا ہوتا۔ اسی طرح آزر اور حضرت ابراہیم میں رشتہ تھا وہ بھی خلیلؑ خدا کا چچا ہی تھا وہ ان کی ایذا رسانی کے کیوں درپے ہوا۔ یونہی نوحؑ اور ان کے فرزند میں اس رشتہ سے بھی قوی تر رشتہ تھا۔ وہ کفار کی ہمنوائی میں باپ کو چھوڑ کر کیوں الگ ہو گیا۔ نوحؑ اور لوطؑ اور اُن کی بیویوں کے درمیان رشتہ تھا۔ ان میں منافرت کی خلیج کیوں حائل رہی۔ اسی لئے نا کہ ان میں مذہبی اتحاد نہ تھا۔

غرض ابوطالب کی نصرت وحمایت کو قرابت پر محمول کرکے ایک طرح سے ان پر ظلم ڈھانا اور ان کی کاوشوں اور جانفشانیوں پر پانی پھیرنا ہے۔

جناب ابوطالب کے اس طرز عمل کو دیکھنے کے بعد کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ آنحضرتؐ کی خدمت نصرت اور حمایت کے لئے وقف کر دیا، ہر متوازن ذہن یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگر وہ پیغمبرؐ کی صداقت کے قائل اور کفار و مشرکین کے عقائد و اعمال سے بیزار نہ ہوتے تو آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت پر اس تندہی سے آمادہ نہ ہوتے اور نہ ان کی وجہ سے پرسکون زندگی کو تج کر قوم و قبیلہ اور دنیا جہاں کی دشمنی مول لیتے یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ ان کا دل یقین کی شعاعوں سے روشن اور صدق و صفا کی ضوپاشیوں سے منور تھا اور اُن کے صفحۂ قلب پر اللہ کی وحدانیت اور پیغمبرؐ کی رسالت کے نقوش ثبت تھے اور وہ دل کی گہرائیوں سے نبوت کی تصدیق کر چکے تھے۔ اور اسی تصدیقِ قلبی و یقینِ باطنی کا نام ایمان ہے۔ چنانچہ قاضی عضدالدین نے تحریر کیا ہے:۔

فھو عندنا وعلیہ اکثر الائمۃ کالقاضی والاستاذ التصدیق للرسول فیما علم مجیئۃ بہ ضرورۃ۔ (شرح مواقف۔ ص۶۱۱)

"ہمارے نزدیک ایمان یہ ہے کہ اُن چیزوں میں رسول کی تصدیق کی جائے جن کا شریعت میں وارد ہونا صراحتہً ثابت ہے اور یہی اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ جیسے قاضی (باقلانی) اور استاد (ابو اسحاق اسفرائنی)۔"

جب اکابر علماء و جمہور محققین کے نزدیک قلبی تصدیق اور باطنی اعتقاد ہی کا نام ایمان ہے تو پھر حضرت ابوطالب کے ایمان سے انکار کی کیا وجہ؟ جب کہ نشر اسلام، تبلیغ دین اور نصرت رسول کے سلسلہ میں ان کا کردار اُن کی تصدیقِ قلبی کا زندہ ثبوت اور ان کے ایمان کی واضح شہادت ہے۔ بلکہ اُن کے عمل و کردار اور خلوص و ایثار کی نظیر ان لوگوں میں بھی نظر نہیں آتی جنھوں نے برملا ایمان کا اقرار اور آنحضرتؐ کی رسالت کا اعتراف کیا تھا۔ پھر اظہارِ ایمان تو منافقت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور ایسے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی جنھوں نے زبان سے اسلام کا اقرار کیا، بڑے بلند بانگ دعوے کئے اور جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑی تو گھر کے گوشہ میں دُبکے بیٹھے رہے یا دشمنوں سے ساز باز کرتے رہے اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔ سچّا ایمان وہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے ہو نہ صرف نوکِ زباں سے۔ کیونکہ ایمان اعتقاد کا نام ہے اور اعتقاد کی منزل دل ہے نہ حنجرہ و حلق۔ اگر صرف زبانی اقرار ہی کا نام ایمان ہوتا تو ایسے ایمان لانیوالوں سے ایمان کی نفی نہ کی جاتی۔ ارشاد خداوندی ہے:

ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاٰخر وما ھو بمؤمنین۔

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

البتہ قلبی تصدیق اور عقیدہ وہ چیز ہے جس میں منافقت و دو رخی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اور ہر عمل ایمان کا آئینہ دار اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اور انہی اعمال کو دیکھ کر ایمان کا حکم لگایا جاتا ہے اس لئے کہ ایمان کے معنی یقین و اعتقاد کے ہیں۔ اور یقین اپنے اثرات سے اور اعتقاد، اعتقاد پر مرتب ہونے والے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ ابوطالب کی زندگی اور اُن کے عمل و کردار پر نظر کرنے کے بعد اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کی کوششیں اسلام کے استحکام میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں سہہ کر اسلام کے نشر و فروغ کی راہیں اختیار کیں اور پورے خلوص و دیانت کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمات و کارِ متعلقہ انجام دیتے رہے اور مشرکانہ رسوم و بت پرستی سے الگ رہ کر اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے۔ جب وہ عملاً اسلامی احکام کے پابند اور دینِ حنیف کے پیرو تھے۔ اور ان کی زندگی کے واقعات سے اسلام دوستی اور پیغمبرؐ کی اطاعت و پیروی عیاں ہے تو پھر کسی کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے جب کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر کسی کا طور طریقہ اسلامی اور اس کے اعمال مسلمانوں کے سے ہوں تو اُسے کفر کی زد میں نہ لے آؤ۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنا۔ — "جو شخص تمہیں سلام کرے (اور اپنے کو مسلمان ظاہر کرے) تو تم یہ نہ کہہ دیا کرو کہ تو ایماندار نہیں ہے۔"

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انہوں نے علانیہ اظہارِ اسلام نہیں کیا تو جمہور علماء کے نزدیک اعلانِ اسلام شرط اسلام نہیں ہے خصوصاً جب کہ اسلام کے مخفی رکھنے میں کوئی مصلحت کارفرما ہو یا کوئی ضرورت اظہار سے مانع ہو چنانچہ ابتدائے بعثت میں کہ جب دعوتِ اسلام مخفی تھی پیغمبرؐ مسلمانوں کو اظہارِ اسلام سے خود منع کرتے تھے۔ اور یہ اسلام کے تحفظ کا ایک حکیمانہ طریقِ کار تھا۔ اس ہدایت کے پیشِ نظر بیشتر مسلمان چند سالوں تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے رہے اور کوئی بھی ان کے اسلام سے آگاہ نہ تھا۔ وہ اسی حد تک اسلامی امور کا لحاظ کرتے تھے جہاں تک ان کے حالات اجازت دیتے تھے اور ان کے اختیار میں ہوتا تھا۔ بلکہ جب اسلام ایک جماعتی صورت اختیار کر رہا تھا اور کم کم یہ جماعت آشکارا ہوتی جا رہی تھی اس وقت بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے اور لوگوں کے اندر غیر مسلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ اپنے حالات کی کمزوریوں یا بعض خاندانی مصلحتوں کی بنا پر اپنے ایمان کو مخفی رکھنے پر مجبور تھے۔ اگرچہ وہ کفار کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور بظاہر انہی میں شمار ہوتے تھے لیکن وہ اسلامی عقائد کے پورے معتقد تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ جو سعید ابن زید سے بیاہی ہوئی تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ اسلام لا چکی تھیں وہ اپنے اسلام کو مخفی رکھتی تھیں۔ اسی طرح نعیم ابن عبداللہ جو قبیلہ بنی عدی سے تھے مسلمان ہو چکے تھے مگر اپنے قبیلہ کے ڈر سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ یونہی اور چند قبیلوں کے افراد اسلام لا چکے تھے مگر قبائلی پابندیوں اور سخت گیریوں کی وجہ سے اپنے

اسلام کو چھپاتے تھے۔ ہجرت پیغمبرؐ کے بعد کہ جب مدینہ میں ایک گونہ اسلامی حکومت کی تشکیل ہو چکی تھی۔ مکہ میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو بظاہر مسلمان نہ تھی مگر در پردہ اسلام کی پابند تھی۔ عم رسولِ عباس ابن عبدالمطلب بھی اسی جماعت کی ایک فرد تھے۔ چنانچہ ابورافع کہتے ہیں کہ:۔

کنت غلاماً للعباس ابن عبدالمطلب وکان الاسلام قد دخلنا اهل البیت واسلمت ام الفضل واسلمت و کان العباس یهاب قومه ویکره ان یخالفهم وکان یکتم اسلامه۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صہ ۱۵۹)	میں عباس ابن عبدالمطلب کا غلام تھا اور پیغمبرؐ کے عزیزوں کے گھروں میں اسلام آچکا تھا چنانچہ اُم الفضل (زوجہ عباس) اور میں اسلام لا چکے تھے اور عباس اپنی قوم سے ڈرتے تھے اور ان کی مخالفت پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے رکھتے تھے۔"

یہ لوگ اپنے اسلام کو چھپا کر مسلمانوں کی ایسی خدمات انجام دیتے جو اظہار اسلام کے بعد ممکن نہ تھیں چنانچہ انہی لوگوں کے ذریعہ قریش کی نقل و حرکت کی خبریں اور دشمن کے جنگی عزائم کی ایسی اطلاعیں مدینہ پہنچتی تھیں جن سے اسلام کا اجتماعی مفاد وابستہ ہوتا تھا اور پیغمبرؐ اکرم پیش آئند حالات میں ان سے فائدہ اٹھاتے تھے اور ہمیشہ ان لوگوں سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے عباس ابن عبدالمطلب کے بارے میں تحریر کیا ہے:۔

کان یکتب باخبار المشرکین الی رسول الله وکان المسلمون یتقوون به بمکة وکان یحب ان یقدم علی رسول اللهؐ فکتب الیه رسول الله ان مقامك بمکة خیر (استیعاب۔ ج ۲۔ صہ ۴۹۵)	وہ مشرکین کے بارے میں تمام خبریں پیغمبرؐ اکرم کو تحریراً بھیجتے جس سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوتی عباس چاہتے تھے کہ رسول اللہ کے پاس چلے جائیں۔ مگر آنحضرتؐ نے انہیں تحریر کیا کہ تمہارا مکہ ہی میں قیام بہتر و سود مند ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اخفائے اسلام پیغمبرؐ کی اجازت سے تھا۔ اور اگر اخفائے اسلام آئینِ اسلام کے خلاف ہوتا تو آنحضرتؐ اس کی اجازت نہ دیتے۔ بہر حال اخفائے اسلام، اسلام کے منافی نہیں ہے اور مخفی اسلام بھی دین پیغمبرؐ میں اسی طرح موردِ اعتبار و اعتماد ہے جس طرح علانیہ اقرارِ اسلام۔

اگر اثباتِ ایمان کے لئے زبانی اقرار و اعلان کو بھی ضروری قرار دیا جائے تو یہ شرط تو بہر حال غیر ضروری ہو گی کہ وہ مخصوص لفظوں میں ہو تو معتبر ہے ورنہ ناقابلِ اعتبار۔ جب یہ قید ضروری نہیں ہے تو ابو طالب کے اقرار رسالت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انہوں نے مختلف الفاظ و عبارت میں آنحضرتؐ کی نبوت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ اکرم ایک مرتبہ اُن کے ہاں عیادت کے لئے آئے تو آپ نے عرض کیا:۔

يا بن اخي ادع ربك الذي بعثك يعافيني۔ (اصابہ۔ ج ۴۔ ص۱۱۶) — اے میرے بھتیجے اپنے پروردگار سے دعا کیجئے جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے کہ مجھے شفا بخشے۔"

آنحضرتؐ نے دست بدعا ہو کر کہا اللھم اشف عمی۔ خدایا میرے چچا کو شفا دے۔" اس دعا کے نتیجہ میں آپ فوراً شفایاب ہو گئے اور بستر بیماری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر آپ آنحضرتؐ کو خدا کا فرستادہ رسول نہ سمجھتے ہوتے تو ان کی رسالت و بعثت کو بیچ میں لا کر دعا کے طلبگار نہ ہوتے۔ کیا بعثت کا اعتراف رسالت کا اعتراف نہیں ہے اور کیا دعا کے نتیجہ میں فوراً شفایابی سے ان کے یقین پر جلا نہ ہوئی ہو گی؟ اس کے علاوہ آپ کے وہ اشعار اقرار رسالت کے ثبوت میں بہت کافی ہیں جن میں اسلام کی صداقت دین کی حقانیت اور آنحضرتؐ کی رسالت کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے اور وہ اشعار اس کثرت سے ہیں کہ ابن شہر آشوب مازندرانی کے متشابہات القرآن میں سورۃ حج کی آیت ولينصرن الله من ينصره کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ حضرت ابوطالب کے وہ اشعار جو ان کے ایمان و تصدیق رسالت پر روشنی ڈالتے ہیں، تین ہزار سے زائد ہیں۔ ابن ابی الحدید نے آپ کے مختلف اشعار درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے:۔

هذه الاشعار جاءت مجئ التواتر	یہ اشعار تواتر کے طور پر نقل ہوتے آئے ہیں اگر متفرق
لانه ان لم يكن احادها متواترة	طور پر ان میں تواتر نہ بھی ہو مگر مجموعی طور پر بہرحال
فمجموعها يدل على امر واحد	متواتر ہیں کیونکہ وہ مجموعی طور پر ایک ہی امر کی نشاندہی
مشترك وهو تصديق محمد	کرتے ہیں جو ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اور وہ
صلى الله عليه وآله وسلم ومجموعها	قدر مشترک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا اعتراف
متواتر۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ ص۳۱۵)	ہے۔"

ذیل میں حضرت ابوطالب کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے عقائد و نظریات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں اور مورخین نے انہیں صحت و وثوق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جب کفار قریش نے پیغمبرؐ کی طرف کذب بیانی کی نسبت دی تو آپ نے آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:۔

انت الامين امين الله لا كذب — والصادق القول لا لهو ولا لعب

آپؐ امین اور اللہ کے امین ہیں جس میں جھوٹ نہیں۔ اور لغو اور پوچ باتوں سے پاک اور راست گفتار ہیں۔"

انت الرسول رسول الله نعلمه — عليك تنزل من ذي العزة الكتب

آپ وہی اللہ کے رسول ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ اور آپ ہی پر تو رب العزت کی طرف سے قرآن نازل ہوا" (مناقب شہر آشوب۔ ج ۱۔ ص ۳۹)

جب قریش نے آپ سے یہ کہا کہ پیغمبرؐ کو خاموش کیجیے۔ ورنہ ہم سختی و تشدد کریں گے، تو آپ نے یہ اشعار کہے:۔

واللہ لن یصلوا الیك بجمعهم — حتیٰ اوسد فی التراب دفینا

خدا کی قسم جب تک میں زیر زمین دفن نہ کر دیا جاؤں قریش اپنے جتھوں سمیت آپؐ کے قریب پھٹک نہیں سکتے۔"

فاصدع بامرك ماعلیك غضاضة — وابشر بذاك وقر منك عیونا

بے کھٹکے اللہ کے احکام بیان کیجیے اور اس طرح خوش و خرم رہ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجیے۔"

ودعوتنی وعلمت انك ناصحی — ولقد دعوت وکنت ثم امینا

آپ نے مجھے دعوتِ اسلام دی اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں اور پھر آپ امین بھی تو ہیں۔"

ولقد علمت بان دین محمدٍ — من خیر ادیان البریة دینا

مجھے یقین ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین دنیا کے تمام دینوں سے بہتر ہے۔" (تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص)

جب شعب ابوطالب میں پناہ لی تو ایک سو بیس اشعار کا ایک طویل قصیدہ کہا۔ اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:۔

کذبتم وبیت اللہ نبزی محمداً — ولما نطاعن دونه و نناضل

خانہ کعبہ کی قسم تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کے بارے میں دبا دیئے جائیں گے اور ان کے سینہ سپر ہو کر نیزے اور تیر نہیں چلائیں گے۔"

ونسلمه حتی نصرع حوله — ونذهل عن ابنائنا والحلائل

ہم اس وقت تک انہیں دشمنوں کے حوالے نہیں کریں گے جب تک اُن کے سامنے مر نہ جائیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھول نہ جائیں۔"

حدبت بنفسی دونه وحمیته — ودافعت عن بالذراء والکلاکل

میں نے دل و جان سے اُن کی حفاظت کی اور اپنے دست و بازو اور سینہ کے زور سے اُن کا دفاع کیا۔"

فایده رب العباد بنصره — واظهر دینا حقه غیر باطل

پروردگار عالم اپنی نصرت سے اُن کی دستگیری کرے اور اس دین کو جو سراسر حق، اور باطل کی

آمیزش سے پاک ہے غلبہ دے۔" (سیرۃ ابن ہشام۔ ج ۱ ص ۱۲۹)

ابن ہشام نے اس قصیدہ کے متعدد اشعار درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے۔ کہ ایک سال اہلِ مدینہ بارش کے نہ ہونے سے قحط کی سختیوں میں مبتلا ہوگئے پریشان وسراسیمہ حال پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور التجا کی کہ آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ بارش برسائے اور قحط سالی دور کرے۔ پیغمبر اکرمؐ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی ابھی دُعا کے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ افق پر گھٹائیں چھا گئیں اور اس طرح جھوم کر برسیں کہ جل تھل بھر گئے۔ برستے پانی کو دیکھ کر آنحضرت کو ابوطالب یاد آئے اور فرمایا: لو ادرک ابوطالب ھذا الیوم لسرہ: "اگر آج ابوطالب زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے" ایک شخص نے کہا شاید آپ کو ان کا یہ شعر یاد آگیا ہے جو آپ کے بارے میں کہا تھا:

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتٰمی عصمۃ للارامل

وہ روشن چہرے والے جن کے رُخِ مبارک کا واسطہ دے کر بارانِ رحمت طلب کی جاتی ہے جو یتیموں کی ڈھارس اور بیواؤں کا سہارا ہیں۔"

فرمایا کہ ہاں میرا اشارہ اسی طرف تھا۔

پیغمبرؐ کے دل پر ابوطالب کی محبت وخلوص کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ وہ کسی لمحہ انہیں فراموش نہ کرتے تھے اور زندگی کے آخری لمحوں میں بھی ان کی یاد تازہ کی۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ جب آنحضرت پر مرض کی شدت ہوئی۔ اور جناب فاطمہؑ نے آپ کی حالت دگرگوں دیکھی تو کہا آپ پر فدا، خدا کی قسم آپ ویسے ہی ہیں جیسا کہ کہنے والے نے کہا ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتٰمی عصمۃ للارامل

آنحضرتؐ نے یہ سن کر آنکھیں کھول دیں اور فرمایا:۔

ھذا قول عمی ابی طالب (انساب الاشراف ج ۱ ص ۵۵) یہ تو میرے چچا ابوطالب کا شعر ہے۔"

ابوطالب کے اشعار اُن کے جذبۂ ایمان، جوشِ عقیدت، اعترافِ صداقت اور اسلام و بانیٔ اسلام سے والہانہ محبت کے آئینہ دار ہیں۔ اور ایک ایک شعر ان کے ایمان کی ناطق برہان اور روشن آیت ہے۔ اگر تعصب و تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ایمان سے انکار کیا جائے یا اس میں شک و شبہ کیا جا سکے۔ انصاف سے کہئے کہ اگر ان اشعار میں سے ایک آدھ شعر کسی اور کی طرف منسوب ہوتا تو کیا اسے اس کے ایمان کی دستاویز بنا کر پیش نہ کیا جاتا اور ایک ناقابلِ شکست دلیل کا درجہ نہ دیا جاتا۔ پھر کس گناہ کی پاداش میں ابوطالب ایسے جاں نثارِ پیغمبرؐ کے ایمان سے صریح انکار کیا جاتا ہے۔ کیا اس جرم پر کہ انہوں نے آنحضرتؐ کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا، یا اس جرم پر کہ انہوں نے کفار قریش سے ان کا تحفظ کیا۔ یا اس قصور پر کہ انہوں نے مشرکین

کی سازشوں کو ناکام بنایا یا اس خطا پر کہ انہوں نے جان، مال اور اولاد کی قربانی تک سے دریغ نہ کیا یا اس جرم پر کہ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ نبوت کا پیغام عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا۔ اگر کفر اس کا نام ہے تو ملأ اعلیٰ سے روحِ ابو طالب پکارے گی کہ: "نازم بہ کفر خود کہ بہ ایمان برابر است۔"

حقیقت یہ ہے کہ ابو طالب کا جرم ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ حضرت علیؑ کے والد ہیں ورنہ ہر چشمِ بینا تاریکی و روشنی کا فرق محسوس کرتی اور کفر و ایمان میں امتیاز کر سکتی ہے۔ اگر روشنی کی شعاعیں نظروں کو کھینچ رہی ہوں اور کسی تاریک نظر انسان کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور روشنی کی کرن تک دکھائی نہ دے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نور و روشنی کا وجود نہیں ہے۔ وہ تو اپنے مقام پر ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اسی طرح ابو طالب کا ایمان بھی ایک تابندہ حقیقت ہے جس سے وہی انکار کرے گا جو سپیدۂ سحر اور ضیائے انجم کے انکار کا عادی ہو۔ ابن ابی الحدید نے کیا خوب کہا ہے:۔

وما ضر مجد ابی طالب جھول لغا او بصیر تعامی

کسی جاہل کی بیہودہ گوئی اور واقفِ حال کی عمداً چشم پوشی سے ابو طالب کی عظمت و بزرگی گھٹ نہیں سکتی۔

کما لا یضر ایاۃ الصباح من ظن ضوء النھار الظلاما

جس طرح دن کے اجالے کو اندھیرا سمجھ لینے سے صبح کی درخشندگیوں پر برا اثر نہیں پڑتا۔"

حضرت ابو طالب کے ایمان کا اثبات انہی شعروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اشعار سے بڑھ کر اہمیت ان اقوال و ارشادات کی ہے جو پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ نے ان کے ایمان کے سلسلہ میں فرمائے ہیں۔ یہ ارشادات دو اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ائمہ اہلبیت انہی کی اولاد اور انہی کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر شخص کی زندگی کا ورق اس کی اولاد اور خاندان کے سامنے کھلا ہوتا ہے وہ ان سے نہ اپنا عقیدہ مخفی رکھ سکتا ہے اور نہ اپنے اعمال و افعال۔ اس لئے ان کی شہادت زیادہ اعتماد و اعتبار کے قابل ہوگی۔ دوسرے یہ کہ شرعی نقطۂ نظر سے بھی ان کے اقوال و ارشادات سند قرار دیئے گئے ہیں جس کے بعد نہ انہیں جنبہ داری پر محمول کیا جا سکتا ہے نہ خاندانی عصبیت پر۔ چنانچہ محدث دہلوی نے حدیث نبویؐ ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

المراد بالاخذ بھم التمسک بمحبتھم و محافظۃ حرمتھم والعمل بروایتھم والاعتماد علیٰ مقالتھم۔ (حاشیہ مشکوٰۃ۔ صـ ۵۶۹)

اخذ سے مراد یہ ہے کہ اہلبیت کی محبت سے وابستہ رہا جائے، ان کی عزت و حرمت کا پاس و لحاظ رکھا جائے۔ ان کی روایات پر عمل کیا جائے اور ان کے اقوال پر اعتماد کیا جائے۔"

ائمہ اہل بیت میں سے کسی ایک نے بھی ابوطالب کے ایمان میں شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سب کے سب ان کے ایمان پر متفق و متحد ہیں۔ اس اتفاق و اتحاد کو اجماع اہلبیتؑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ اجماع علماء اسلام کے نزدیک ایک مستند ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے اور حجت و سند کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ابوالکرام عبدالسلام ابن محمد کہتے ہیں:۔

اتفق ائمة اهل البیت ان اباطالب مات مسلمًا و خلاف اهل البیت فی الاسلام غیر معتبر (ارجح المطالب۔ صفحہ ۲۹۵)	ائمہ اہل بیتؑ اس امر پر متفق ہیں کہ ابوطالب مسلمان مرے۔ اور جو بات اہل بیتؑ کے مسلک کے خلاف ہو وہ اسلام میں غیر معتبر ہے۔"

علمائے شیعہ میں سے علامہ طبرسی تحریر کرتے ہیں:۔

قد ثبت اجماع اهل البیتؑ علی ایمان ابی طالب و اجماعهم حجة۔ (مجمع البیان۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۸۷)	ابوطالب کے ایمان پر اہل بیت کا اجماع ثابت ہے اور ان کا اجماع حجت و سند ہے۔"

ذیل میں پیغمبرؐ اسلام اور آئمہ اہلبیتؑ کے متعدد ارشادات میں سے چند ارشاد درج کئے جاتے ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ آنحضرتؐ اور اہلبیتؑ اطہار ابوطالب کے ایمان اور ان کی نجات اخروی پر یک رائے و یک زبان تھے۔

عباس ابن عبدالمطلب نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ کیا آپ ابوطالب کی نجات کے متوقع ہیں؟ فرمایا:۔

کل الخیر ارجو من ربی (طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۴)	میں اُن کے لئے اپنے پروردگار سے ہر قسم کی بھلائی کا متوقع ہوں۔"

حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے:۔

ما مات ابوطالب حتی اعطی رسول اللہ من نفسه الرضا۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۱۲)	ابوطالب اس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہوئے جب تک رسولؐ خدا کو اپنی طرف سے راضی و خوشنود نہیں کر لیا۔"

امام زین العابدین علیہ السلام سے ایمانِ ابوطالب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:۔

واعجباً ان اللہ نهی رسوله ان	تعجب ہے کہ اللہ نے تو رسولؐ خدا کو یہ حکم دیا کہ وہ

يقر مسلمة على نكاح كافر و قد كانت فاطمة بنت اسد من السابقات الى الاسلام ولم تزل تحت ابى طالب حتى مات۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳ ۔ صہ۳۱۳)

کسی مسلمان عورت کو کافر کے نکاح میں نہ رہنے دیں، اور فاطمہ بنت اسد جو اسلام میں سبقت کرنیوالی خواتین میں سے تھیں وہ ابوطالب کے مرتے دم تک ان کی زوجیت میں رہیں۔"

اس مقام پر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فاطمہ بنت اسد اوائل بعثت میں اسلام لائیں اور بعد اسلام دس برس تک حضرت ابوطالب کی زوجیت میں رہیں۔ اگر ان دونوں میں مذہبی اختلاف ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں میں آئے دن تکرار اور مذہبی تزاع رہتی۔ مگر کوئی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اُن میں کبھی لڑائی جھگڑا یا نظریاتی ٹکراؤ پیدا ہُوا ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے :۔

مات ابوطالب ابن عبد المطلب مسلما مومناً۔ (الحجۃ ابن معد صہ۲۲)

ابوطالب ابن عبد المطلب دنیا سے مسلم و مومن اُٹھے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک شخص نے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ابوطالب کافر مرے ؟ فرمایا وُہ لوگ جھوٹے ہیں۔ وہ تو پیغمبرؐ کی نبوت کا اعتراف و اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

الم تعلموا انا وجدنا محمدًا نبیا کموسیٰ خط فی اول الکتب

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے محمدؐ کو ویسا ہی پایا ہے جیسے موسیٰؑ تھے جن کا تذکرہ پہلی کتابوں میں موجود ہے" (اصول کافی۔ صہ۲۴۴)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے درست ابن ابی منصور نے ایمان ابوطالب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا :۔

اقر بالنبی وبما جاء بہ۔ (اصول کافی۔ صہ۲۴۴)

انہوں نے پیغمبرؐ کا اور جن چیزوں کو وُہ لے کر آئے سب کا اقرار کیا۔"

امام رضا علیہ السلام نے ابان ابن محمود کو اس کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا :۔

ان لم تقر بایمان ابی طالب کان مصیرك الی النار۔ (مرآۃ العقول۔ ج ۲۔ صہ۲۶۴)

اگر تم ابوطالب کے ایمان کا اقرار نہیں کرو گے تو تمہاری بازگشت دوزخ کی طرف ہو گی۔"

امام حسن عسکری علیہ السلام کا ارشاد ہے :۔

ان اباطالب کمومن آل فرعون یکتم ایمانہ (الحجۃ ابن معد ص ۱۱۵)

"ابوطالب مومن آلِ فرعون کی مانند تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔"

ابتدائے زمانہ بعثت میں ابوطالب کا اپنے ایمان کو پردۂ خفا میں رکھنا اور کفار قریش کے سامنے کھل کر اپنے عقیدہ کا اظہار نہ کرنا ان کی انتہائی فراست و موقع شناسی کا نتیجہ تھا۔ اگر وہ اعلانِ رسالت کے ساتھ ہی اسلام کا اعلان کر دیتے تو کفار قریش نے جس طرح آنحضرتؐ کے خلاف علانیہ محاذ قائم کر لیا تھا اسی طرح ان کی دشمنی پر بھی کھلم کھلا اتر آتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طوفانِ مخالفت کو وہ اپنے تدبر اور حکمت عملی سے روکے ہوئے تھے نہ روک سکتے بلکہ قریش کو اپنا حریف بنا کر اس نہج پر پیغمبرؐ کی مدد نہ کر سکتے جس نہج پر انہوں نے کی ہے۔ اگرچہ کفار قریش سے یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہ تھی کہ ابوطالب ہر موقع پر پیغمبرؐ کا ساتھ دیتے اور اُن کی تائید و حمایت کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کی آواز اُبھر رہی ہے اور مسلمانوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ مگر ان کے پاس بظاہر کوئی وجہ جواز نہ تھی کہ وہ اُن سے الجھتے اور انہیں اپنا حریف ٹھہراتے۔ اس مدبرانہ روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں کفار کو سمجھانے بجھانے اور اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے مواقع ملتے جس سے حق پسند افراد اسلام کی طرف کھنچتے اور پیغمبرؐ کے ہدایت آفریں کلمات کان دھر کر سنتے۔ اگر ابوطالب یہ طریق کار اختیار نہ کرتے تو اس کفر پرور فضا میں جب کہ قریش اپنی کثرت اور طاقت کے بل بوتے پر حق کو دبانے اور اسلام کو کچلنے پر تلے ہوئے تھے کبھی اسلام کو ابھرنے کا موقع نہ ملتا۔ بلاشبہ قریش کی معاندانہ کارروائیوں اور مخالفت کی طوفان انگیزیوں میں آنحضرتؐ کو تبلیغ اسلام کا جو بھی موقع ملا وہ ابوطالب کی حمایت و طرفداری اور ان کے مدبرانہ طریق کار اور حکیمانہ روش کی بدولت ملا۔ اگر ان کا دم نہ ہوتا تو ظاہری اسباب و حالات کی بناء پر اسلام کی آواز فضائے مکہ میں بلند نہ ہوتا، اور حق کی آواز باطل کے شور و شغب میں دب کر رہ جاتی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام کا چراغ کفر کی تیز آندھیوں کے تھپیڑوں سے محفوظ رہا اور کفار و مشرکین کی سینہ زوریوں کے باوجود اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ فرقہ معتزلہ کے مشہور عالم ابن ابی الحدید نے ایمانِ ابوطالب میں سکوت اختیار کرنے کے باوجود ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے :۔

ولولا ابو طالب وابنہ　　　　لما مثل الدین شخصا وقاما

"اگر ابوطالب اور ان کے فرزند (علیؑ) نہ ہوتے تو اسلام کبھی اپنے پیروں پر جم کر کھڑا نہ ہوتا۔"

فذاک بمکۃ آوی وحامی　　　　وھذا بیثرب خاض الحماما

ان میں سے ایک نے مکہ میں حمایت و پشت پناہی کی اور دوسرے نے مدینہ میں اپنی جان کو

خطروں میں ڈالا۔

فللہ ذا فاتحا للھدی   وللہ ذا للمعالی ختاماً

کیا کہنا اس کا جس نے ہدایت کو فتح یاب کیا، اور کیا کہنا اس کا جس پر بزرگیوں کا خاتمہ ہوا۔"

یہ امر انتہائی تعجب انگیز ہے کہ ایک طرف تو یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی جانبازیوں اور عملی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام کی آواز بلند ہوئی اور انہوں نے پورے ثبات و استقلال کے ساتھ اپنی زندگی کا طویل عرصہ آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت میں صرف کیا اور دوسری طرف اُن کے کفر پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ اور اُن کی تمام خدمات کو بے اثر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ کوششیں ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور قرائن و شواہد کو اثباتِ ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور بعض افراد کے ایمان میں باوجودیکہ وہ نبوت میں شک کرتے رہے، شبہ تک نہیں کرتے، مگر یہاں ذہنی و فکری رحجان دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس جانباز و جاں نثارِ اسلام کو اس کی محنتوں، کاوشوں اور دینی خدمتوں کے باوجود دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے حالانکہ ان کے کلام پر نظر کی جائے تو اس میں توحید و رسالت کے اعتراف کے جواہر ریزے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اور اس اقرار و اعتراف کے ساتھ اُن کے افعال و اعمال وہ ہیں کہ کسی ایک عمل کو بھی اسلام کے خلاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ایمان کے اجزاء اعتقاد بالجنان، تصدیق باللسان اور عمل بالارکان میں کوئی جزو ایسا ہے جو ان میں نظر نہ آتا ہو؟ ابوطالب کا اخفاء بھی اظہار اور خاموشی میں گویائی تھی۔ اس لئے کہ ان کی عملی زندگی سراپا اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اور ان کا ایک ایک عمل تصدیق نبوت کا آئینہ دار اور صداقتِ اسلام کے اعتراف کا زندہ ثبوت ہے انہوں نے قولاً و عملاً اس طرح پیغمبرِ اسلام کی نصرت و حمایت کی کہ جو نظریات اسلام کے خلاف رہ کر ممکن ہی نہ تھی اور نہ اُبھرے ہوئے فتنوں کو دبانا، قریش کی سازشوں کو کچلنا اور پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہ کر اسلام کے پھلنے پھولنے کی راہیں ہموار کرنا، کفر و شرک کے عقیدہ سے میل کھاتا ہے۔ کیا ان کی تکفیر سے پیغمبرؐ اور اہلبیت اطہار کی تکذیب لازم نہ آئے گی اور کیا پیغمبرؐ کو یہ امر گوارا نہ ہوگا کہ ایک مسلمان کو کافر گردانا جائے۔ اور اُن کے ناصر و دوست پر دشمنی کا شبہ کیا جائے۔

اگر ان تمام شواہد و براہین کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابوطالب پیغمبر اکرمؐ سے شیفتگی کی حد تک محبت رکھتے تھے اور عشقِ رسول اُن کے رگ و پے میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا تھا۔ یہ محبت و وارفتگی خود ان کے اسلام کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اس لئے کہ محبتِ رسول اور بغضِ اسلام یکجا نہیں ہو سکتے جس طرح بغضِ رسولؐ اور اسلام دوستی یکجا نہیں ہو سکتی۔ اگر دل میں محبتِ رسولؐ رچی بسی ہو تو اسلام بھی ہے۔ اور اگر دل جذبِ عشقِ رسولؐ سے خالی ہو تو اسلام کا دعویٰ ہو بھی تو وہ صرف ایک دعویٰ ہی ہوگا جس

میں صداقت نہ ہو اور ایک کالبد ہوگا جس میں زندگی وحیات نہ ہو۔ کیونکہ عشقِ رسولؐ ہی اصلِ اسلام، روحِ اسلام بلکہ عینِ اسلام ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ۔۔۔ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

ایک طبقہ اگرچہ ذہنی طور پر اُن کے کفر کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ مگر چند بے سروپا روایتوں کی بنا پر کھل کر اُن کے اسلام کا اعتراف بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ روایتیں صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور اُن پہ وضعیت کے آثار اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے موضوع وخود ساختہ ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان روایات کے کھوکھلا پن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دسیسہ کاروں اور اموی ہوا خواہوں نے محسنِ اسلام ومربّیِ پیغمبرؐ کی خدمات پر پردہ ڈالنے اور اُن کے فرزند حضرت علیؑ کے پدری امتیاز کو ختم کرنے کے لئے ایسی روایتیں وضع کرلیں جن سے ان کے کفر کا اثبات ہو اور اس طرح حضرت علیؑ کو بھی اس صف میں کھینچ لائیں جس میں دوسرے نظر آتے ہیں ضرورت ہے کہ ان روایتوں پر ایک نظر کی جائے تاکہ نقد وتجزیہ کی روشنی میں اربابِ بصیرت خود فیصلہ کرسکیں کہ یہ اصولِ صحت کے معیار پر پوری اترتی ہیں یا وضعی وخود ساختہ ہیں اور کہاں تک ان سے استناد واحتجاج کیا جاسکتا ہے۔

پہلی روایت یہ ہے کہ جب ابوطالب کا وقتِ آخر آیا تو پیغمبر اکرمؐ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں پر ابوجہل اور عبداللہ ابن اُمیہ بھی موجود تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا چچا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھئے تاکہ میں آپ کے ایمان کی شہادت دے سکوں۔ ابوجہل اور عبداللہ ابن اُمیہ نے ابوطالب سے کہا کیا آپ ملتِ عبدالمطلب سے رُوگرداں ہو جائیں گے۔ ابوطالب نے کہا۔ اَنَا عَلٰی مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔ میں عبدالمطلب کی ملت ہی پر ہوں اور کلمہ نہ پڑھا اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا لاستغفرن لك مالم انه عنه۔ اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔" جس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

ماکان للنبی والذین امنوا ان	نبی اور اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ وہ مشرکوں کے لئے
یستغفروا للمشرکین ولوکانوا	دعائے مغفرت نہ کریں اگرچہ وہ اُن کے قرابت دار
اولی قربیٰ من بعد ماتبین لهم	کیوں نہ ہوں جب کہ اُن پر یہ امر واضح ہو چکا ہے
انهم اصحاب الجحیم۔	کہ وہ دوزخی ہیں۔

یہ روایت متعدد وجوہ سے محلِّ نظر ہے۔

اوّلاً یہ کہ اس کا راوی مسیب ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں تحریر کیا ہے کہ مسیب ان رواۃ میں سے ہے جو ابوسفیان ابن حرب اور اپنے باپ حزن سے روایت کرتا ہے اور اس سے صرف اس کا

بیٹا سعید روایت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس دور میں نہ اس کی روایت کو اہمیت دی جاتی تھی اور نہ اس پر اعتماد و وثوق کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا۔ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت نہ تو یہ مسلمان تھا اور نہ اس موقع پر اس کے موجود ہونے کے قرائن ہیں اور نہ کسی نے اس کی موجودگی کا دعوےٰ کیا ہے۔ اگر اس نے یہ واقعہ کسی سے سنا تھا تو جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کس سے سنا تھا نہ اس روایت کا کوئی وزن ہو سکتا ہے اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ واقعہ اس کے زمانہ کفر کا ہے۔ اور پھر مسیب سے اس کے بیٹے سعید نے روایت کی ہے جو حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوا اور ان لوگوں میں شمار ہوتا تھا جو حضرت علیؑ اور اہلبیت اطہارؑ سے منحرف سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

كان سعيد ابن المسيب منحرفاً عنه۔ (شرح نہج۔ ج۱۔ ص۳۷۰)	سعید ابن مسیب حضرت علیؑ سے منحرف و برگشتہ تھا۔

اس کی اہلبیت دشمنی کا یہ واقعہ شاہد ہے کہ جب امام زین العابدین علیہ السلام نے رحلت فرمائی اور اُن کا جنازہ مسجد نبوی میں لایا گیا تو تمام لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوئے مگر یہ مسجد میں بیٹھا رہا اور نماز میں شریک نہ ہوا۔ اس سے کہا گیا کہ کیا تم اس مرد صالح کی نماز میں شریک نہ ہو گے؟ اس نے جواب دیا:۔

اصلی رکعتین فی المسجد احب الی من ان اشهد هذا الرجل الصالح فی البیت الصالح۔ (طبقات ابن سعد ج۵ ص۲۲۲)	میں اس متبرک جگہ میں ایک مرد صالح کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے دو رکعت نماز پڑھ لینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

اس دشمنی و کج ذہنی کی کوئی حد ہے کہ اہلبیت کی ایک جلیل القدر ہستی پر نماز جنازہ بھی گوارا نہیں کی جاتی کیا ایسے شخص کی روایت پر کسی کے مومن و غیر مومن ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً حضرت ابوطالب کے ایمان کے بارے میں اس کی روایت کا کوئی وزن ہو سکتا ہے جب کہ اولادِ ابوطالب کے ساتھ اس کا بغض و عناد اس حد تک ہو۔

دوسرے یہ کہ یہ روایت اس روایت سے متعارض ہے جس میں اس امر کی صراحت ہے کہ حضرت ابوطالب نے زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے لبوں کو جنبش دی اور کلمۂ توحید پڑھا۔ یہ روایت متعدد علماء و مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے۔ چنانچہ مورخ ابوالفداء تحریر کرتے ہیں:۔

لما تقارب من ابی طالب الموت جعل یحرك شفتیه فاصغی الیه العباس وقال والله یا ابن اخی	جب ابوطالب کا وقتِ وفات قریب آیا تو انہوں نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ عباس نے کان لگا کر سنا تو آنحضرتؐ سے کہا اے برادر زادے خدا کی

قال الكلمة التي امرته ان يقولها فقال رسول الله الحمد لله الذي هداك يا عم۔ (تاریخ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۲۰)	قسم! ابوطالب نے وہ کلمہ پڑھا ہے جو آپ ان سے پڑھوانا چاہتے تھے۔ آنحضرتؐ نے سنا تو فرمایا اے چچا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو ہدایت کی۔"

اس روایت کو صرف سابقہ روایت سے تعارض دکھانے کے لئے تحریر کیا گیا ہے۔ ورنہ جو ابتدائے بعثت سے آنحضرتؐ کو صادق و امین اور خدا کا فرستادہ رسولؐ سمجھتا رہا ہو ان کی سچائی اور راست بیانی کا معترف ہو۔ اور اپنی زندگی کا نصب العین ہی پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت اور ترویج و تبلیغ اسلام قرار دے چکا ہو اور جس کے قول و عمل کا محور صرف احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق ہو اس سے اقرار لینے اور کلمہ پڑھوانے کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرتؐ نے ان سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے ہر مومن کو آخر وقت کلمہ پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اور وہ کلمہ پڑھتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب اس سے توحید و رسالت کا اقرار لے کر اسے مسلمان کیا جا رہا ہے۔

تیسرے یہ کہ اس روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ حضرت ابوطالب کے انتقال کے فوراً بعد نازل ہوئی ہوگی تاکہ پیغمبرؐ کو ایک فعل نامشروع سے روک دیا جائے۔ حالانکہ یہ آیت سورۃ براۃ کی ہے اور سورۃ براۃ بالاتفاق فتح مکہ کے بعد نازل ہوا۔ اور حضرت ابوطالب ہجرت سے تین سال قبل وفات پا چکے تھے یعنی اس سورۃ کے نازل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے۔ اس سے ہر صاحب نظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابوطالب سے کہاں تک ہو سکتا ہے۔ روایت سازنے نہ اس پر نظر کی کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور نہ ادھر نگاہ دوڑائی کہ ابوطالب نے کب انتقال کیا۔ اسے تو اس آیت کا مصداق ابوطالب کو ثابت کرنا تھا۔ لہٰذا ایک واقعہ گڑھ کر اسے چابک دستی سے اس آیت کے ساتھ جوڑ دیا۔ تاکہ ظاہر بین افراد یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے سے اپنے رسول سے منع کر دیا تھا اب ان کے کفر میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے اگر اس آیت کو ابوطالب کے متعلق مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پیغمبرؐ اکرم دس برس تک ابوطالب کے حق میں حسب وعدہ دعائے مغفرت کرتے رہے اور قدرت کو اس بے اثر و بے ثمر دعا سے روکنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اور جب پیغمبر کو دعا کرتے ہوئے ایک طویل مدت گزر گئی، تو ادھر توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور دعائے مغفرت سے روکنے کے لئے آیت نازل کر دی اور پیغمبرؐ اتنا عرصہ ایک ایسے فعل کے مرتکب ہوتے رہے جو تقاضائے اسلام اور منشائے خداوندی کے سراسر خلاف تھا۔ کیا ایسی بے سر و پا روایت پر کسی عقیدہ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے یا اس کی صحت پر اعتماد کرتے ہوئے کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اس آیت کے نزول سے پہلے بہت سی ایسی آیتیں نازل ہو چکی تھیں جن میں واضح طور پر کفار

دمنافقین کے لئے دعائے مغفرت سے روکا جاچکا تھا۔ مثلاً یہ آیت اور اس قبیل کی دوسری آیتیں :۔

سواء علیھم استغفر لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم۔	تم ان کے لئے دعائے مغفرت مانگو یا نہ مانگو اُن کے لئے برابر ہے۔ خدا تو انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔"

یہ سورۂ منافقون کی آیت ہے اور یہ سورہ چھٹی ہجری میں سورۂ براۃ سے قبل نازل ہوا۔ لہٰذا جب پیغمبرؐ کو پہلے سے کفار ومشرکین کے لئے دعائے مغفرت سے منع کیا جاچکا تھا تو پھر پیغمبر کے یہ کہنے کا کیا محل تھا، کہ اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ممانعت کی آیتوں کے بعد کسی مشرک وکافر کے لئے دعائے مغفرت کریں اور اس طرح ایک امر ممنوع کے مرتکب ہو کر قرآنی آیات کی خلاف ورزی کریں۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ اس آیت کا ابوطالب سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اور پیغمبر اکرمؐ انہیں مومن ومسلم سمجھ کر ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہے تھے۔ ورنہ ان کے کافر ہونے کی صورت میں اُن کے لئے دعائے مغفرت کا کوئی جواز نہ تھا۔ اور اگر اسی پر اصرار ہو کہ اسلام سے منحرف ہوتے کے باوجود ان کے لئے دعائے مغفرت کا سلسلہ جاری رکھا تو اس سے پیغمبرؐ کا دامن عصمت داغدار اور پیراہن نبوت تار تار ہو جائے گا اس لئے کہ قرآنی تعلیمات کے خلاف عمل پیرا ہونے سے عدالت بھی برقرار نہیں رہتی چہ جائیکہ نبوت۔ کیا اثبات کفر کی ایسی روایتیں توجہ والتفات کے قابل سمجھی جاسکتی ہیں جن سے نبوت کی توہین اور دامن رسالت کی پاکیزگی وتقدیس بھی محفوظ نہ رہتی ہو۔

پانچویں یہ کہ ترمذی نے اپنی صحیح کے باب التفسیر میں اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک شخص کو اپنے کافر ماں باپ کے حق میں دعائے مغفرت کرتے سنا۔ تو اس سے کہا کہ تم ایسے والدین کے لئے دعا کرتے ہو جو کافر ومشرک مرے تھے۔ اس نے کہا کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آزر کے لئے دعائے مغفرت نہیں کی تھی حالانکہ وہ مشرک اور بت پرست تھا۔ حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ تمام واقعہ بیان کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اپنے کافر و مشرک عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت سے منع کر دیا گیا۔

اس روایت میں چند امور فکر طلب اور قابلِ توجہ ہیں :۔

پہلا امر یہ کہ اگر کافر ومشرک عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت جائز نہ ہوتی تو حضرت علیؑ جو اسلام کے اوامر ونواہی اور احکام وسنن کے عالم اور ان کے حکم ومصالح پر حاوی تھے کبھی اس پر معترض نہ ہوتے اور نہ اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ امیرالمومنینؑ کا اس کی دعا پر حیرت واستعجاب اس امر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے کہ کفار ومشرکین کے حق میں دعائے بخشش کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا امر یہ کہ اس شخص نے اپنے عمل کے جواز کے لئے حضرت ابراہیمؑ کے عمل سے استناد کیا کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک چچا کے لئے دعائے مغفرت کی تھی حالانکہ اسے ماضی کے اوراق الٹ کر اتنا دور جانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے عمل سے استناد کرنے کی بجائے پیغمبرؐ کے عمل سے استناد کرنا چاہیئے تھا کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک چچا کے لئے دعائے مغفرت کی تھی مگر اس کا عمل پیغمبر کو پیش نہ کرنا بتاتا ہے کہ اس کے ذہن میں ابوطالب کے مشرک ہونے کا تصور بھی نہ تھا۔ اور نہ اس دور میں انہیں کوئی کافر و مشرک سمجھتا تھا اور نہ ان کے کفر و شرک کے متعلق اکابر صحابہ سے کوئی روایت وارد ہوئی ہے۔

تیسرا امر یہ کہ اس شخص نے اپنے مردہ ماں باپ کے حق میں دعائے مغفرت کے جواز کی سند حضرت ابراہیم کے عمل میں تلاش کی حالانکہ حضرت ابراہیمؑ نے آزر کے مرنے کے بعد اس کے حق میں دعا نہیں فرمائی بلکہ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ راہِ ہدایت پر آنے والا نہیں ہے تو اپنی زبان بند کر لی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وما كان استغفار ابراهيم لابيه الا عن موعدة وعدها اياه فلما تبين له انه عدو لله تبرا منه۔	ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا اس وعدہ کی بنا پر تھا جو انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ اور جب ان پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو اُس سے بیزار ہو گئے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی دعا محض طلبِ ہدایت کے لئے تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اسے ہدایت نصیب ہو تاکہ آخرت میں بخشش و آمرزش کا مستحق قرار پائے۔ اس لئے کہ انسان زندگی میں خواہ کتنا بے راہ اور کفر و ضلالت میں ڈوبا ہوا ہو اس کے راہِ راست پر آنے سے مایوسی نہیں ہوتی اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ شائد وہ ضلالت و گمراہی سے نکل کر حق و ہدایت کی راہ پر آ جائے اور مرنے کے بعد تو ہدایت کے حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ہوتا کہ اس کے لئے ہدایت و مغفرت کی دعا کی جا سکے۔ لہٰذا اس دعائے خلیلؑ سے حالتِ کفر میں مر جانے والوں کے لئے دعائے مغفرت کا جواز ثابت نہ ہو گا۔ ان شواہد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کفار کے لئے دعائے مغفرت سے ممانعت اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی اور کسی کافر کے لئے اس کے مرنے کے بعد نہ دعا کا کوئی محل ہے اور نہ کوئی وجہ جواز۔ لہٰذا پیغمبرؐ کے بارے میں یہ تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ابوطالب کو کافر سمجھنے کے باوجود ان سے یہ کہا ہو گا کہ "اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا" کیونکہ دعائے مغفرت امیدِ بخشش سے وابستہ ہے اور ایک کافر کے لئے بخشش کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے جب کہ اللہ کا فیصلہ کافروں کے جہنمی ہونے کا ہو چکا ہے لہٰذا یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ پیغمبرؐ انہیں مومن و مسلم سمجھ کر ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے تھے، اور

اس دعائے مغفرت کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ابوطالب کے کفر پر اصرار کیا جائے جب کہ دعائے پیغمبر اُن کے ایمان کی دلیل اور ان کی مغفرت کی ناقابلِ تردید سند ہے۔

چھٹے یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں روایت مذکورہ کے علاوہ اور بھی مختلف و متعارض روایات ہیں اور روایات کے اختلاف سے واقعیت مشکوک ہو جایا کرتی ہے۔ اور کوئی بھی روایت استناد و احتجاج کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ اپنی والدہ کی قبر کے پاس سے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے زیارتِ قبر اور دعائے مغفرت کی اجازت مانگی۔ اللہ نے زیارتِ قبر کی اجازت دے دی اور دعائے مغفرت سے اس آیت کے ذریعہ روک دیا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے والد کے لئے دعائے مغفرت کا ارادہ کیا جس سے روکنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی اور ایک روایت یہ ہے کہ کچھ مسلمانوں نے پیغمبر اکرمؐ سے اپنے کافر بزرگوں کے لئے جو مر چکے تھے دعائے مغفرت کی اجازت طلب کی۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ غرض کوئی اسے آنحضرتؐ کے چچا ابوطالب کے متعلق بتاتا ہے۔ کوئی آنحضرتؐ کے والد جناب عبداللہ کے متعلق اور کوئی آنحضرتؐ کی والدہ جناب آمنہ کے متعلق اور کوئی مسلمانوں کے کافر بزرگوں کے متعلق۔ جہاں اتنے مختلف اقوال ہوں اور ہر قول میں واقعہ کی نوعیت مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہو اور روایات کے تعارض اور رواۃ کی کثرت تعبیر نے اسے خواب پریشاں بنا کر رکھ دیا ہو اور پھر اس میں بھی اختلاف ہو کہ آیا استغفار سے مراد دعائے مغفرت ہے یا نماز جنازہ جو حضرت ابوطالب کی وفات تک مشروع و نافذ ہی نہ ہوئی تھی۔ وہاں اس کا مورد صرف ابوطالب کو قرار دے کر ان کے کفر پر اصرار کرنا کہاں تک حق و انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے کیا ہمیں یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے جسے چاہیں اسے مسلمان اور جسے چاہیں اسے کافر قرار دے لیں۔

دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب ابوطالب کا وقت رحلت قریب آیا تو پیغمبرؐ نے اُن سے فرمایا کہ چچا کلمہ پڑھیئے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کے ایمان کی گواہی دے سکوں۔ ابوطالب نے انکار کیا اور کہا کہ اگر قریش کے طعن و تشنیع کا ڈر نہ ہوتا تو میں کلمہ پڑھ لیتا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

انک لا تھدی من احببت و لکن اللہ یھدی من یشاء۔

"تم جسے دوست رکھتے ہو اسے تم ہدایت نہیں کرتے مگر خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

یہ روایت بھی متعدد وجوہ سے درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت محمد ابن عباد، ابن ابی عمر وغیرہ کے واسطہ سے ابوہریرہ دوسی سے اور عبدالقدوس شامی اور ابوسہل السری کے واسطہ سے ابن عمر اور ابن عباس سے نقل کی گئی ہے اور یہی امر اس کی افسانوی حیثیت کو

کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ ان میں ابوہریرہ ابوطالب کے انتقال کے موقع پر اپنی جنم بھومی یمن میں تھے اور ۷ھ میں جب کہ حضرت ابوطالب کو انتقال کئے دس برس گزر چکے تھے اسلام لائے تھے۔ لہٰذا ابوطالب کی نزعی حالت کے موقع پر ان کے موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں اور پیغمبرؐ کو تلقین کرتے اور ابوطالب کو انکار کرتے اپنے کانوں سے سنا ہو۔ اگر کسی سے سن لیا تھا تو اس کا نام لینے میں کیا امر مانع تھا۔ جب کہ یہ واقعہ اُن کے زمانۂ کفر اور مکہ میں عدم موجودگی کا ہے۔ اور پھر ابوطالب کے بارے میں ان کی روایت اس اعتبار سے بھی ساقط الاعتبار ہے کہ وہ معاویہ کے خصوصی مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں میں سے تھے اور یہ مصاحبت و وابستگی حضرت علیؑ سے دشمنی و عناد کی دلیل ہے۔ کیونکہ ان سے انحراف و عناد کے بغیر نہ دربارِ شام میں تقرب حاصل ہو سکتا تھا اور نہ معاویہ کی مصاحبت کا شرف۔ ابن ابی الحدید نے اس دشمنی و عناد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب وہ معاویہ کے ہمراہ کوفہ میں آئے تو راتوں کو بابِ کندہ کے پاس آ کر بیٹھ جاتے کچھ لوگ بھی ان کے گرد و پیش جمع ہو جاتے۔ ایک مرتبہ اصبغ ابن نباتہ بھی اُن کے حلقہ میں آ کر بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ کیا تم نے علیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کا یہ ارشاد سنا ہے:۔ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔ "خدا اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ کو دشمن رکھے" کہا ہاں سنا ہے۔ اس پر اصبغ نے کہا:۔

فاشھد باللّٰہ لقد والیت
عدوہ وعادیت ولیہ۔

(شرح نہج۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۶۰)

"تو پھر میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تم نے ان کے دشمنوں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے اور اُن کے دوستوں سے دشمنی پر اُتر آئے ہو۔"

اسی دشمنی کا نتیجہ یہ تھا کہ معاویہ نے انہیں مدینہ کی حکومت سونپ دی اور ہمیشہ ان پر نظرِ خصوصی رکھتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے وارثوں سے حسنِ سلوک کرتے رہے۔ چنانچہ جب ان کے مرنے کی اطلاع آئی تو اپنے عامل ولید ابنِ عقبہ کو لکھا:۔

انظر من ترك فادفع الی ورثتہ
عشرۃ آلاف درھم واحسن
جوارھم وافعل الیھم معروفاً
فانہ کان ممن نصر عثمان
وکان معہ فی الدار۔

(طبقات ابن سعد۔ ج ۴۔ صفحہ ۳۴۰)

"اس کے وارثوں کو تلاش کر کے انہیں دس ہزار درہم دو اور ان سے حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کرو اس لئے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حضرت عثمان کی نصرت کی اور محاصرہ کے دنوں میں اُن کے گھر میں موجود رہے۔"

معاویہ سے وابستگی اور اموی خاندان سے لگاؤ کے ساتھ کثیر الروایہ بھی تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی صحبت میں انتہائی کم عرصہ رہنے کے باوجود روایتِ حدیث میں ان تمام لوگوں سے سبقت لے گئے جو مدتوں پیغمبرؐ کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے رہے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ اس کثرتِ روایت نے ان کی روایات کو مشکوک و بے اعتماد بنا دیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے بھی ان کی روایات کی سبکی و بے وزنی کو محسوس کرتے ہوئے انہیں کثرتِ روایت پر سرزنش کی تھی اور کہا تھا:۔

لتترکن الحدیث عن رسول اللہ	حدیث بیانی کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا
اولا لحقنک بارض دوس۔	تو میں تمہیں قبیلۂ دوس کی سرزمین کی طرف چلتا
(سیر اعلام النبلاء، ص۴۳۴)	کروں گا۔"

یہ اس صورت میں کہ ابھی احادیث کا بیشتر ذخیرہ ان کے حافظہ کی تہوں میں محفوظ پڑا تھا اور اسے "ناگفتہ بہ" سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں:۔

لو انبأتکم بکل ما اعلم لرمانی	جو کچھ میں جانتا ہوں اگر سب بتانے لگوں تو
الناس بالخزف وقالوا ابوهريرة	لوگ مجھے ٹھیکرے ماریں اور کہیں کہ ابوہریرہ
مجنون۔ (طبقات ابن سعد، ج۴، ص۳۳۱)	تو باؤلا ہے۔"

حضرت علیؑ بھی نقلِ حدیث میں ان کی راست گوئی و صدق بیانی کے قائل نہ تھے بلکہ انہیں دروغ گو سمجھتے تھے چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

الا ان اکذب الناس علی رسول	ابوہریرہ سب سے زیادہ رسول اللہ پر جھوٹ
اللہ ابوهريرة الدوسی۔	باندھتا تھا۔"

(شرح ابن ابی الحدید، ج۱، ص۳۶۰)

اسی طرح ابنِ عمر کا بھی وفاتِ ابوطالب کے موقع پر موجود ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے کیونکہ وہ بعثت کے تین سال بعد پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ابوطالب کے انتقال کے وقت ان کی عمر سات سال بنتی ہے۔ اور ایک سات برس کے بچے کا ایسے مقام پر گزر ہی کہاں ہو سکتا ہے جہاں سردارِ قریش حالتِ احتضار میں پڑا ہو اور بنی ہاشم و عمائدِ قریش اس کے گرد و پیش جمع ہوں اور اگر گزر ہوا بھی ہو تو آنحضرتؐ اور ابوطالب کی گفتگو سننا، اسے سمجھنا اور محفوظ رکھنا اس سے زیادہ بعید از قیاس ہے۔ لہٰذا وہ بھی اس واقعہ کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ انہوں نے کس سے سنا ان کی روایت کو کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جب کہ ابنِ عمر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خلیفۂ ثالث کے

بعد حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہمیشہ ان سے منحرف و برگشتہ ہی رہے۔ باقی رہے ابنِ عباس تو وہ ہجرت سے تین سال قبل شعب ابو طالب میں پیدا ہوئے تھے اور اسی سال حضرت ابو طالب نے انتقال فرمایا تھا۔ لہٰذا ان کے بھی وہاں موجود ہونے اور گفتگو سننے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کون باور کرے گا کہ ایک دودھ پیتے بچے نے حضرت ابو طالب کی زبان سے کچھ سنا اور اسے بیان کیا۔ اگر انہوں نے کسی سے سنا تھا تو اس کا نام لیتے تاکہ اُسے دیکھ کر روایت کا وزن قائم کیا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ معاندین نے اس روایت کو گڑھ کر ابن عباس کی طرف منسوب کر دیا ہے تاکہ دیکھنے والے ان کا نام دیکھ کر خاموش ہو جائیں اور ان کی جلالت قدر کے پیشِ نظر یہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں کہ وفاتِ ابو طالب کے وقت ان کی عمر کیا تھی اور وہ روایت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے یا نہیں۔

اس کے علاوہ ابو ہریرہ کے سلسلۂ روایت میں محمد ابن عباد ہوں یا ابن ابی عمر یا ابن کیسان۔ مجہول ہیں یا مشتبہ۔ اور ابن عمر اور ابن عباس کے سلسلۂ روایت میں عبد القدوس شامی ہوں یا ابو سہل سری یہ دونوں علمائے رجال کے نزدیک حدیث ساز ہیں اور کاذب۔

دوسرے یہ کہ جب پیغمبرِ اسلام آیہ قرآنی: "وانذر عشیرتک الاقربین۔" "اپنے قریبی عزیزوں کو ڈراؤ" کے تحت اپنے رشتہ داروں اور کنبہ والوں کو خصوصی طور پر دعوتِ اسلام دینے پر مامور تھے اور آپ نے اس آیت کے نزول کے بعد علانیہ تبلیغ ابو طالب ہی کے گھر سے شروع کی تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ دوسرے عزیزوں اور قریبیوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے اور ابو طالب کو تبلیغ کرتے اور کلمہ پڑھوانے کا خیال اس وقت آتا ہے کہ جب وہ بستر بیماری پر موت و حیات کی کشمکش میں تھے اور دس سال کے طویل عرصہ میں انہیں دعوتِ اسلام دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیا آنحضرتؐ نے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں عمداً کوتاہی و سہل انگاری سے کام لیا یا ابو طالب کی امداد و تعاون کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں اپنے معتقدات بدلنے کی ہدایت نہیں کی۔ تاکہ وہ بددل ہو کر ان کی حمایت و نصرت سے دستکش نہ ہو جائیں۔ پہلی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ پیغمبرؐ نے ادائے فرائض میں غفلت برتی اور حکم خصوصی کے باوجود انہیں دعوتِ اسلام دینے میں تعویق کی۔ اور یہ ایک نبی کے شایان شان نہیں ہو سکتا کہ وہ فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہو اور حکم خدا کی خلاف ورزی کرے اور دوسری صورت میں خود غرضی کا پہلو نمایاں ہے کہ آپ نے صرف مطلب برآری و مقصد جوئی کے لئے انہیں اپنے عقائد بدلنے کے نہیں کہا۔ اور یہ خود غرضانہ روش کسی کی بھی بلند سطح انسان کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ پیغمبرؐ مداہنت و خود غرضی سے کام لیں اور کسی کی طرف داری سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے غلط نظریات و عقائد پر باقی رہنے دیں اور تبلیغ و دعوت کے بجائے خاموشی اختیار کریں۔ اب ایک

صورت یہ رہ جاتی ہے کہ پیغمبرؐ ان کے اسلام و ایمان پر شروع سے مطمئن تھے اور ان کے اعمال و افعال کو ان کے عقاید کی ترجمانی کے لئے کافی ووافی سمجھتے تھے اور بلاشبہ ان کا ہر فعل و عمل اسلام کے نظریات کے عین مطابق تھا جس کے بعد ضرورت ہی نہ تھی کہ آخر وقت میں جب کہ ایمان تو درکنار، توبہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی ان سے کلمہ پڑھواتے اور اس لفظی اقرار پر ان کے ایمان کی شہادت کو اٹھا رکھتے۔

تیسرے یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں اور بھی متعدد روایات اور مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ جنگ اُحد میں جب آنحضرتؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے تو آپ نے دست بدعا ہو کر کہا بار الٰہا تو ان لوگوں کو ہدایت فرما یہ جاہل وبے خبر ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ حارث ابن نعمان کے بارے میں نازل ہوئی۔ آنحضرت چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہو جائے مگر وہ اسلام سے گریزاں ہی رہا اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ:۔

نزلت انك لا تهدی من احببت وانا مع النبیؐ فی اللحاف۔ (مرقاۃ برحاشیہ ترمذی۔ جلد ۲۔ ص۱۹۹)	آیت "انك لا تهدی من احببت" اس وقت نازل ہوئی جب میں رسولؐ اللہ کے ساتھ لحاف میں تھی۔"

غرض اس طرح کی اور بھی روایات ہیں جو ایک دوسرے سے متعارض و مختلف ہیں۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے زیرِ نظر روایت کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے خصوصاً جب کہ اس کے رواۃ بھی پایۂ اعتبار سے ساقط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اور پھر پہلی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے چھ برس بعد نازل ہوئی اس لئے کہ جنگ اُحد ۳ھ میں واقع ہوئی اور ابوطالب ہجرت سے تین سال پہلے وفات پا چکے تھے اور حضرت عائشہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے تین چار سال بعد نازل ہوئی اس لئے کہ حضرت عائشہ کی رخصتی ۱ھ میں عمل میں آئی اور ابوطالب کو وفات پائے تین چار سال کا عرصہ گذر چکا تھا لہٰذا کسی طرح اس آیت کا تعلق ابوطالب سے نہیں ہو سکتا جب کہ وہ نزولِ آیت کے موقع پر دنیا میں موجود ہی نہ تھے اور دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد نہ ہدایت کرنے کا کوئی موقع ہوتا ہے اور نہ انکار کرنے کا کوئی محل۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت اس موقع پر بھی نازل ہوئی اور بعد کے مواقع پر بھی تو تکرارِ نزول کو خلافِ اصل ہونے کی بنا پر اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر اس آیت کو ابوطالب کے بارے میں تسلیم کر لیا جائے جب بھی اُن کے ایمان کی نفی نہیں ہوتی اس لئے کہ اس آیت کا نہج و اسلوب وہ ہے جو آیۂ قرآنی ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (اے رسولؐ جب تم نے تیر پھینکا تو تم نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا) کا ہے۔ اس میں ما رمیت سے رمی کی نفی بھی

ہے اور اذ رمیت سے اثبات بھی۔ اثبات اس بنا پر کہ یہ عمل پیغمبرؐ کے ہاتھوں انجام پایا اور نفی اس بنار پر کہ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی تھی۔ اسی طرح آیت میں ہدایت کا اثبات بھی ہے اور ہدایت کی نفی بھی۔ نفی کی نسبت رسولؐ کی طرف ہے اور اثبات کی نسبت اللہ کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ ہدایت بظاہر پیغمبرؐ کی تبلیغ و تلقین کے ذریعہ ہوئی مگر حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی امداد و تائید کا نتیجہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اگر اس کی توفیق و تائید شامل حال نہ ہو تو کوئی بھی راہِ ہدایت پر نہیں آسکتا اور نہ اس کے ارادہ و مشیت کے بغیر ہدایت و رہنمائی کسی کے بس کی بات ہے۔ اور پیغمبر اس ہدایت کے سلسلہ میں صرف ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جنہیں آنحضرت دوست رکھتے ہیں۔ انہیں ہدایت کرنے سے قاصر ہیں یا ان کی ہدایت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ معنی یہ ہوں گے کہ جنہیں رسولؐ دوست رکھتا ہے انہیں رسولؐ ہدایت نہیں کرتا بلکہ اللہ انہیں ایمان کی راہ دکھاتا ہے اور یہی معنی زیادہ نمایاں اور واضح ہیں اور اسی کی قرآنی آیات سے تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :۔

لیس علیك هداهم ولكن الله يهدي من يشاء	اے رسولؐ! ان لوگوں کی ہدایت کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

اس ہدایت کی نسبت خصوصی سے اس کی خصوصی و امتیازی حیثیت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے اس طرح کہ ابو طالب کا ایمان پیغمبرؐ کی دعوتِ عمومی کی بنار پر نہ تھا بلکہ اس میں اللہ کی مشیت بھی کارفرما تھی لہذا اس آیت سے نفی ایمان کے بجائے ان کے ایمان و یقین کی فوقیت کا بھی اثبات ہو گا۔ چنانچہ اُن کی اسلامی خدمات ان کے رسوخِ ایمان کی آئینہ دار اور یقین کی بلند پایگی کا واضح ثبوت ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس آیت کو ابو طالب کے بارے میں مان لینے کی صورت میں یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہو گا کہ آنحضرت انہیں دوست رکھتے تھے اور واقعات بھی اس کے شاہد ہیں کہ پیغمبرؐ ان سے بیحد محبت و وابستگی رکھتے تھے۔ بلکہ اس محبت کی نسبت سے عقیل سے بھی محبت کرتے تھے۔ چنانچہ ابو طالب کی وفات کے بعد عقیل سے ایک موقع پر فرمایا:۔

اني احبك حبين حبا لقرابتك مني وحبا لحب ابي طالب اياك۔ (تاریخ اسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص ۲۳۳)	میں تمہیں دو جہتوں سے دوست رکھتا ہوں۔ ایک تم سے قرابت کی بنار پر اور دوسرے ابو طالب کی محبت کی وجہ سے کہ وہ تمہیں دوست رکھتے تھے۔"

یہ محبت ابو طالب کے ایمان کا واضح ثبوت ہے اس لئے کہ پیغمبر کسی کافر و مشرک کو دوست نہیں رکھ سکتے خواہ وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے :۔

لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم۔

جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں تم انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ پاؤ گے اگرچہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا قوم قبیلے والے ہی کیوں نہ ہوں۔"

جب اہلِ ایمان کو کفار و مشرکین سے دوستی و محبت اور راہ و رسم رکھنے سے منع کیا گیا ہے اگرچہ وہ ان کے عزیز و اقارب اور قوم و قبیلہ والے کیوں نہ ہوں۔ تو پیغمبرؐ اکرم سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک مشرک و غیر مومن سے محبت و دوستی روا رکھیں گے جب کہ کافر و مشرک دشمنِ خدا ہے اور دشمنِ خدا اس کے رسول کا محبوب نہیں ہو سکتا تو درصورتیکہ ابوطالب سے پیغمبرؐ کی محبت ناقابلِ انکار ہے تو پھر ان کے ایمان سے انکار کا جواز بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

چھٹے یہ کہ یہ امر درایت کے سراسر منافی ہے کہ جس نے اپنی زندگی کے لمحات پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت کے لئے وقف کر دیئے ہوں علانیہ اسلام کی تائید کرتے رہے ہوں۔ قریش کے بھرے مجمعوں میں آنحضرتؐ کے دین کو بہترین دین کہا ہو، انہیں انبیائے سلف کی طرح کا ایک نبی مانا ہو، ان سے حفاظت دین کا عہد کیا ہو اور کٹھن سے کٹھن موقعوں پر کسی قوت و طاقت سے مرعوب نہ ہوئے ہوں اور نہ اعلانِ حق میں کبھی خوف و ہراس محسوس کیا ہو وہ آخر وقت محض قریش کی خاطر یا ان کے طعن و تشنیع سے گھبرا کر کلمہ توحید پڑھنے سے انکار کر دیں اور اس دین سے منہ موڑ لیں جسے ہمیشہ سچا سمجھا اور سچا کہا ہو اور جسے کڑیاں جھیل کر پروان چڑھایا ہو۔ تیسری روایت یہ ہے کہ ابن عباس سے ایک شخص نے سنا کہ آیت وھم ینھون عنہ وینأون عنہ۔ ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی اور اسے ابوطالب پر منطبق کرنے کے لئے اس کے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ " وہ رسولؐ سے کفار کی ایذا رسانیوں کو روکتے ہیں اور خود رسول سے دور بھاگتے ہیں" اور ان کے نزدیک ابوطالب کی یہی حالت تھی کہ وہ مشرکین و کفار سے پیغمبر کا دفاع تو کرتے رہے مگر اُن پر ایمان نہ لائے اور معنوی لحاظ سے اُن سے دور رہے۔

یہ روایت بھی پایۂ اعتبار سے ساقط اور ناقابلِ اعتبار و اعتماد ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت مرسل ہے اور اس میں اس شخص کی نشاندہی نہیں کی گئی جو ابن عباس اور اس کے راوی حبیب ابن ابی ثابت کے درمیان واسطہ ہے۔ جب راوی نے خود ابن عباس سے اسے نہیں سنا اور نہ اس شخص کا نام لیا ہے جس نے ابن عباس سے سنا تھا، تو ایک مجہول الاسم والرسم شخص کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے اسے ابوطالب کے متعلق کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے جب کہ حبیب ابن ابی ثابت علمائے رجال کے نزدیک جعل ساز اور افتراء پرداز بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ آیت کا مورد و محل اور سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ یہ

آیت کفار و مشرکین کے ایک گروہ کے متعلق ہے جو قرآن کو اساطیر الاولین "پرانے لوگوں کے قصے کہانیوں" سے تعبیر کرتا تھا چنانچہ صاحب کشاف اور علامہ بیضاوی نے تحریر کیا ہے کہ ابوسفیان، ولید، عتبہ، شیبہ، ابوجہل، نضر ابن حارث اور چند دوسرے مشرکین نے آنحضرتؐ کو قرآن مجید کی آیتیں پڑھتے سنا تو انہوں نے نضر ابن حارث سے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کیا پڑھتے ہیں؟ اس نے کہا کہ اساطیر الاولین "پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں"۔ اور اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں اسی کا تذکرہ ہے:۔ ویقول الذین کفروا ان ھی الا اساطیر الاولین "کافر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگلے لوگوں کے قصے کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ اور آیت کے آخری ٹکڑے میں ان کی بے راہرویوں اور گمراہیوں کے نتیجہ میں ان کی ہلاکت و تباہی کا تذکرہ ہے:۔ وان یھلکون الا انفسھم وما یشعرون۔ "اور وہ خود ہی اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور کچھ شعور نہیں رکھتے"۔ ان دو ٹکڑوں کے درمیان وھم ینھون عنہ وینأون عنہ کا ٹکڑا ہے۔ اگر ینھون عنہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ پیغمبر سے ایذا رسانیوں کو روکتے ہیں تو پوری آیت بے ربط اور اس کا تسلسل درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آیت میں انہی چیزوں کا ذکر ہوتا آ رہا ہے جو مذموم و قابل نفرین ہیں اور جن کی پاداش میں ہلاکت و تباہی ضرور ہے۔ مگر پیغمبرؐ سے ایذا و گزند کو روکنا اور انہیں کفار کی شر انگیزیوں سے بچانا ایک غیر مذموم اور قابل ستائش عمل اور اس کا پہلے اور آخری ٹکڑے سے کوئی ربط نہیں ہے۔ لہٰذا وھم ینھون عنہ کا یہ ترجمہ کہ وہ لوگوں کو پیغمبرؐ کے اتباع یا قرآن کے سننے سے روکتے ہیں "صحیح و درست ہوگا اور ماقبل و مابعد سے مربوط ہوگا۔ چنانچہ ابن کثیر اور فخر الدین رازی نے انہی معنوں کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آیت ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اتباعِ پیغمبرؐ سے روکتے اور قرآن کے سننے سے مانع ہوتے تھے۔ لہٰذا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ابوطالب لوگوں کو آنحضرتؐ کے اتباع یا قرآن کے سننے سے روکتے تھے اس آیت کا تعلق اُن سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حضرت ابوطالب کے متعلق قرآن کے سننے یا پیغمبر کی اطاعت سے روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوست و دشمن سبھی معترف ہیں کہ انہوں نے کسی موقع پر نہ قرآن سننے سے منع کیا اور نہ آنحضرتؐ کے اتباع سے روکا۔ اور نہ خود ان کے ہدایات و تعلیمات سے سرِ مو انحراف کیا۔ بلکہ اپنی پوری زندگی آنحضرتؐ کی حمایت اور ان کے اتباع و پیروی میں گزار دی۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ چیز دیانت سے بمراحل دور ہو گی کہ آیت میں تحریفِ معنوی کر کے اسے ابوطالب پر چسپاں کرنے کی کوشش کی جائے اور آیت کا ماقبل و مابعد سے ربط توڑ کر اور اسے من مانے معنی پہنا کر ابوطالب ایسے جاں نثارِ اسلام کا کفر ثابت کیا جائے۔ آخر انہوں نے کس موقع پر پیغمبرؐ سے دوری ظاہر کی اور ان سے منہ موڑ کر علیحدہ ہوئے؟ کیا نصرتِ رسولؐ و دفاعِ اسلام کا نام کفر ہے؟

"یہ اگر کفر ہے پھر کیا ہے مسلمان ہونا"

چوتھی روایت وہ ہے جسے عباس ابن عبدالمطلب سے نسبت دی گئی ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ابوطالب آپ کی حمایت و نصرت میں سرگرم عمل رہے ہیں کیا انہیں اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا؟ یہ ساری محنتیں اور کاوشیں رائیگاں جائیں گی؟ آنحضرتؐ نے فرمایا وہ ٹخنوں تک دوزخ کے اندر ہیں۔ اگر میں ان کی سفارش نہ کرتا تو وہ جہنم کے نیچے والے طبقہ میں ہوتے۔

یہ روایت بھی موضوع اور خود ساختہ ہے۔

اولاً یہ کہ یہ روایت عباس ابن عبدالمطلب سے منسوب کی جاتی ہے حالانکہ عباس کی یہ روایت درج کی جا چکی ہے کہ ابوطالب نے رسول اللہؐ کے کہنے سے کلمہ پڑھا اور توحید و رسالت کا اقرار کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے کیا ایک ہی شخص کی طرف اسلام اور کفر دو متضاد باتوں کی نسبت سے روایت کا کوئی وزن باقی رہ جاتا ہے؟

دوسرے یہ کہ اس روایت اور اس مطلب کی دوسری روایتوں میں نفس مضمون کے لحاظ سے ایک گونہ تعارض و اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی روایت میں یہ ہے کہ شفاعت ہو چکی ہے اور وہ جہنم کی اُوپر والی سطح پر پہنچ چکے ہیں اور کسی روایت میں ہے کہ یہ شفاعت قیامت کے دن ہو گی اور کسی میں صرف عذاب میں تخفیف کا ذکر ہے۔ اور شفاعت رسولؐ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس قسم کے اختلاف سے روایت کی صحت مشکوک ہو جایا کرتی ہے اور اس پر اعتماد و وثوق نہیں رہتا۔

تیسرے یہ کہ ان روایتوں کے راوی کذاب، جعل ساز اور ناقابل اعتماد ہیں۔ چنانچہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان روایتوں کے رواۃ میں سے سفیان کے بارے میں یکتب عن الکذابین (جھوٹوں سے روایت نقل کرتا ہے) اور عبدالملک ابن عمیر کے بارے میں ضعیف یغلط (ضعیف اور غلط بیان ہے) اور عبدالعزیز دراوردی کے متعلق سیئ الحفظ (حافظہ صحیح نہیں ہے) کے آراء نقل کئے ہیں۔ اور اسی طرح کے چند رواۃ اور ہیں، جو مجہول الحال اور علمائے رجال کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں لہذا ایسے لوگوں کی روایت پر بناء کرتے ہوئے نہ کسی کے کفر و اسلام کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ جنتی و دوزخی ہونے کا۔

چوتھے یہ کہ یہ روایت بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوطالب کے عمل پیہم اور جہد مسلسل کے پیش نظر اُن کے حق میں شفاعت کی جس کے نتیجہ میں اس عذاب میں جس کے مستحق تھے تخفیف ہوئی حالانکہ کفار و مشرکین کے حق میں نہ شفاعتِ رسولؐ کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ تخفیف عذاب کا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ونسوق المجرمین الی جھنم — ہم گنہگاروں کو جہنم تک پیاسے جانوروں کی طرح

ورد الا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمٰن عھدا

ہنکالے جائیں گے اس وقت شفاعت کا حاصل کرنا ان کے بس میں نہ ہوگا۔ مگر وہ جس سے خدا نے اقرار (توحید) لے لیا ہو۔"

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

والذین کفروا لھم نار جھنم لا یقضیٰ علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا۔

جو لوگ کافر ہوئے ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے نہ ان کی قضا آئے گی کہ وہ مر جائیں اور نہ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی۔"

ابن اثیر نے لکھا ہے :۔

قال القاضی عیاض انعقد الاجماع علی ان الکفار لا تنفعھم اعمالھم ولا یثابون علیھا بنعیم ولا تخفیف عذاب (جامع الاصول۔ ج ۱۔ صہ ۳۵۹)

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ کفار کو ان کے اعمال فائدہ نہیں دیں گے اور نہ انہیں نعمت کی صورت میں اجر ملے گا نہ تخفیف عذاب کی صورت میں۔"

جب یہ روایت قرآن مجید کے نصوص واضحہ اور اجماع امت کے سراسر خلاف ہے تو اس پر اعتماد کیسا۔ بلکہ اس کے راوی ثقہ و عادل بھی ہوتے جب بھی اس پر اعتماد صحیح نہ تھا چہ جائیکہ قرآن کے خلاف ہونے کے ساتھ اس کے راوی بھی غیر ثقہ اور ناقابل اعتماد ہیں۔

پانچویں یہ کہ وہ نبیؐ رحمت و پیکرِ رأفت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اتنا نہ کر سکتے تھے کہ جب ان کے حق میں سفارش کر کے انہیں جہنم کی تہ سے نکال کر اوپر والی سطح پر لے آئے تھے تو اُن کی اسلامی خدمات اور کم از کم اسلام دوستی کی بناء پر کہ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں نہ سہی اعراف میں پہنچا دیتے جب کہ اس قسم کی مراعات کفر کے باوجود نوشیروان کے لئے اس کی عدالت کی وجہ سے اور حاتم کے لئے اس کی سخاوت کی وجہ سے تجویز کی جاتی ہے بلکہ ایک طرح کی مراعات ابولہب ایسے کافر و دشمن اسلام کے لئے بھی تجویز کی گئی ہے۔ چنانچہ مشہور عالم اہلحدیث وحید الزمان نے کتب صحاح سے نقل کیا ہے کہ: "ایک شخص نے ابولہب کو خواب میں دیکھا۔ اس نے بیان کیا کہ پیر کے دن کچھ پانی پینے کے لئے مجھ کو مل جاتا ہے۔ یہ اس کی جزا ہے جو میں نے ثویبہ کو آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں آزاد کر دیا تھا" (لغات الحدیث باب الضاد۔ صہ ۱۲) اور ایک روایت اس طرح ہے کہ آنحضرتؐ نے ابولہب کو خواب میں دیکھا کہ وہ پیاس سے بے حال ہے۔ لیکن کچھ سیرابی کا بھی سامان ہے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ یہ سیرابی کس بناء پر ہے؟ کہا :۔

بعتقی ثویبة لانها ارضعتک۔	ثوبیہ نے آپ کو دودھ پلایا تھا اور میں نے اُسے
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۹)	آزاد کر دیا تھا، یہ اس کی جزا ہے۔"

کتنی حیرت انگیز ہے یہ چیز کہ ابولہب کے لئے اتنی سی بات پر سیرابی کو تجویز کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی کنیز ثوبیہ کو آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں یا انہیں دودھ پلانے کی وجہ سے آزاد کر دیا تھا حالانکہ ابولہب رسول اللہؐ کے دشمنوں کی صف اول میں تھا اور انہیں جھٹلانے، ایذا دینے اور ان کا تمسخر اڑانے میں پیش پیش تھا اور زندگی کی آخری گھڑیوں تک کفر و عناد پر قائم رہا تھا۔ اور ابوطالب جو اپنی زندگی آنحضرتؐ کی حفاظت و نصرت کے لئے وقف کئے ہوئے تھے۔ ان کی محنت و جانفشانی کے صلہ میں اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اُن کے لئے بھی تھوڑی بہت سیرابی کو تجویز کر دیا جاتا۔ کیا رسولؐ کی تربیت و کفالت اور اسلام کی نصرت و حمایت کا درجہ ایک کنیز کے آزاد کر دینے سے بھی کمتر ہے۔ اور پھر شفاعت کے بعد حضرت ابوطالبؑ کے عذاب کی جو نوعیت تجویز کی گئی ہے کیا اس سے شفاعت پیغمبرؐ کی بے وزنی و بے اثری ثابت نہیں ہوتی جب کہ اس قسم کی روایات میں یہ تک کہا گیا ہے کہ "اگرچہ وہ جہنم کی اوپر کی سطح پر ہوں گے مگر ان کا بھیجا پگھل پگھل کر ان کے پیروں پر بہہ رہا ہوگا۔ کیا شفاعتِ رسولؐ کے بعد اس ہولناک اور لرزہ انگیز عذاب کا تصور صحیح ہوسکتا ہے اور کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان کے لئے شفاعت کو تجویز ہی نہ کیا جاتا تاکہ شفاعت کی سبکی و بے قدری ظاہر نہ ہوتی اور پھر اس جاں نثاری و جانفشانی کے صلہ میں ان کے لئے جہاں تخفیف عذاب کی شفاعت تجویز کی جاتی ہے وہاں یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پیغمبر ان کے لئے دعا کرتے کہ خدا انہیں ایمان کی توفیق دے جب کہ پیغمبرؐ کی یہ دلی خواہش بھی تھی کہ وہ ایمان سے سرفراز ہوں اور اس طرح کی دعا دوسروں کے حق میں کر بھی چکے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں:۔

دعا لام ابی ھریرة فامنت فی	آنحضرتؐ نے ابوہریرہ کی ماں کے لئے دعا فرمائی اور
یومھا (حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۲۔ ص۱۸۵)	وہ اسی دن مسلمان ہوگئی۔"

یہ تو نہ ہوسکتا تھا کہ ابوہریرہ کی ماں کے بارے میں تو ان کی دُعا قبول ہوجاتی اور ابوطالب کے بارے میں بے اثر ہو کر رہ جاتی جب کہ اُم ابوہریرہ کی کوئی خصوصیت بھی نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں تھی اور ابوطالب کے اور خدمات سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی دیکھا جائے تو صرف تربیت رسولؐ کے سلسلہ میں ان کے خدمات کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ کیا پیغمبرؐ کی تربیت و کفالت میں ان کی تندہی و جانفشانی ان کی نجات کی ضامن نہیں ہوسکتی جب کہ آنحضرتؐ کا یہ ارشاد زبان زد خلائق ہے کہ انا و کافل الیتیم فی الجنة کھاتین (ترمذی ص۲۸۵) میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ساتھ ساتھ ہوں گے۔" کیا ابوطالب سے بڑھ کر یتیم کی کفالت میں

کسی کا درجہ بلند تر ہو سکتا ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو بھوکا رکھ کر یتیم عبداللہ کی پرورش کی ہو اپنا خون پسینہ ایک کر کے انہیں پروان چڑھایا ہو اور اپنی جان و مال اور اولاد کے نثار کرنے میں بھی دریغ نہ کیا ہو۔

پانچویں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حدیث نبویؐ میں وارد ہوا ہے کہ: لا توارث بین اھل ملتین۔ "دو جداگانہ ملتوں میں باہمی توارث نہیں ہوتا"۔ چنانچہ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اگر ابو طالب مسلمان ہوتے تو حضرت علی اور جعفر طیار کو بھی ان کے ترکہ میں سے حصہ ملتا۔ اور وہ اپنے حصے کا مطالبہ کرتے۔ لیکن ان دونوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوا کرتا۔ اور عقیل اور طالب اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اس لئے وہی ان کے وارث قرار پائے۔

یہ دلیل صرف ایک مغالطہ ہے جسے نظر فریب بنانے کے لئے پہلے تو ایک بے سند روایت پیش کی جاتی ہے کہ علیؑ اور جعفرؓ نے ابو طالب کی میراث میں سے حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور پھر ایک حدیث سے اس کو تقویت دی جاتی ہے کہ یہ انکار ابو طالب کے کفر کی بنا پر تھا۔ حالانکہ نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے اور نہ کسی صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے میراث سے انکار کیا تھا۔ اس حدیث کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر وارث و مورث میں اتحاد مذہب نہ ہو تو ان میں باہمی توارث نہیں ہوتا۔ اس طرح کہ اگر باپ مسلمان ہو اور بیٹا کافر تو کافر وارث نہیں ہو گا۔ اور اگر باپ کافر ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو بیٹا وارث نہیں ہو گا۔ یعنی عدم توارث اس وقت صادق آئے گا جب مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث قرار نہ دیا جائے۔ حالانکہ اگر ایک وارث ہو اور دوسرا وارث نہ ہو بایں صورت کہ کافر مسلمان کا وارث نہ ہو اور مسلمان کافر کا وارث ہو تو اس صورت میں بھی عدم توارث صادق آتا ہے کیونکہ جب توارث کے معنی یہ ہیں کہ دو آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں تو درصورتیکہ ایک وارث ہو اور دوسرا وارث نہ ہو تو یہ بھی عدم توارث ہے اس لئے کہ توارث طرفین کی نفی کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ ایک وارث ہو اور دوسرا وارث نہ ہو۔ لہٰذا اگر مسلمان کافر کا وارث ہو اور کافر مسلمان کا وارث نہ ہو تو ان میں توارث کی نفی صحیح ہو گی۔ اور فقہائے امامیہ کے نزدیک صورت مسئلہ بھی یہی ہے کہ مسلمان کافر کا بھی وارث ہوتا ہے اور مسلمان کا بھی۔ اور کافر صرف کافر کا وارث ہوتا ہے اور مسلمان کے ترکہ میں سے کچھ نہیں پاتا تاکہ اسلام کی بالادستی قائم رہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے: الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ۔ اسلام کو سب پر تفوق حاصل ہے اور اس پر کسی کو بالادستی حاصل نہیں" لہٰذا ابو طالب کو اگر کافر بھی فرض کر لیا جائے تو یہ کفر اس کا باعث نہیں ہو سکتا کہ ان کی مسلمان اولاد ان کے ترکہ سے محروم رہے۔ اور اسلام کو بھی کفر کی طرح موجب حرمان ارث قرار دے کر اسلام کے آگے ایک دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اگر اسلام

کا قانونِ وراثت یہی ہوتا کہ مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ تو وہ صحابہ جن کے والدین کفر کی حالت میں مرے تھے انہیں اپنے ماں باپ کا وارث نہ ہونا چاہئے تھا حالانکہ تاریخ ایک فرد کی بھی نشاندہی نہیں کرتی جو اسلام کی بنا پر کافر ماں باپ کے ورثہ سے محروم قرار دی گئی ہو۔ تو کیا یہ میراث سے محرومی خاندان پیغمبرؐ ہی کے لئے مخصوص تھی؟ پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اگر حضرت علیؑ نے ابو طالب کے ترکہ میں سے کچھ نہیں لیا تو ان کے کفر کی بنا پر جب کہ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی قناعت پسندی، سیر چشمی اور عدم احتیاج کی بنا پر نہ لیا ہو اور سب کچھ عقیل کے لئے چھوڑ دیا ہو یا عقیل نے قبضہ کر لیا اور انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا ہو۔ اور تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ جب پیغمبرؐ اکرم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو عقیل نے آنحضرتؐ کے ترک وطن سے فائدہ اٹھایا اور حضرت خدیجہؓ کا مکان اور وہ مکانات جو عبد المطلب سے ابو طالب کی طرف منتقل ہوئے تھے ابو سفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ اس موقع پر نہ پیغمبر موجود تھے نہ علیؑ اور جعفر کہ انہیں روکتے یا قیمت فروخت میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرتے۔ اور جب فتح مکہ کے بعد کچھ کہنے سننے کا موقع آیا تو درگزر سے کام لیا۔ اس درگزر کو تنہا عقیل کے استحقاق میراث کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا جب کہ ان کا یہ تصرف حالات سے فائدہ اٹھانے کے نتیجہ میں تھا نہ میراث کی بنا پر۔ چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں:۔

الحق ان عقیلا رضی اللّٰہ عنہ انما استولی علی بیوت عبد المطلب بعد الھجرۃ کما استولت کفار قریش علی سائر دور المھاجرین ولو کان استحقاق عقیل لھا بالارث لما ساغ لہ بیع بیت خدیجۃ بنت خویلد رضی اللّٰہ عنہا۔

(دیو حاشیہ فائق۔ ج ۱۔ ص ۱۹۸)

حق بات یہ ہے کہ عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت رسولؐ کے بعد عبد المطلب کے گھروں پر قابض ہو گئے تھے جس طرح کفار قریش نے مہاجرین کے متروکہ گھروں پر قبضہ جما لیا تھا اور فتح مکہ کے بعد نہ پیغمبرؐ اکرم نے اور نہ مہاجرین میں سے کسی نے ان گھروں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اگر ان مکانوں پر عقیل کا استحقاق ورثہ کی بنا پر تھا تو پھر انہوں نے خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کا مکان کس حق وراثت کی بنا پر فروخت کیا تھا۔"

چھٹی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کسی ضعیف روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابو طالب نے اکیلے یا پیغمبرؐ کے ساتھ کبھی نماز پڑھی ہو۔ حالانکہ وہ آنحضرتؐ کے اعلانِ رسالت کے بعد دس برس تک زندہ رہے۔ اگر وہ مسلمان ہو چکے ہوتے تو کبھی نہ کبھی تو نماز پڑھتے جب کہ نماز اسلام کا ایک لازمی فریضہ ہے اور اس کی پابندی ضروری ہے۔

یہ دلیل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ ایسے ماحول میں جہاں ان کے کفر کے اثبات کے لئے حدیثیں وضع کی جاتی ہوں اور انہیں خارج از اسلام ثابت کرنے کے لئے دلائل تراشے جاتے ہوں اگر کوئی ایسی روایت موجود نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تاہم اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اوائل بعثت میں جب انہوں نے اپنے فرزند حضرت علی کو پیغمبرؐ کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس پر اپنی خوشنودی و رضامندی کا اظہار کیا اور اس طریق عبادت کو عمل خیر سے تعبیر کرکے انہیں پیغمبرؐ سے وابستہ رہنے کی تاکید کی اور ایک مرتبہ علیؑ کو پیغمبرؐ کی داہنی جانب کھڑے ہوکر نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے فرزند جعفر سے جو اسلام لاچکے تھے فرمایا۔

صل جناح ابن عمك فصل على يسارہ (سیرت نبویہ دحلان ص۱۱۱) — تم بھی اپنے ابن عم کی بائیں جانب کھڑے ہوکر نماز پڑھو"

اگر انہوں نے بالفرض نماز میں شرکت نہیں تو اس لئے کہ قریش کی فتنہ سامانیوں کی روک تھام اور اُن کی شر انگیزیوں سے پیغمبر کا تحفظ کرسکیں۔ اور پھر ان کی زندگی میں نماز کو وجوبی حیثیت حاصل ہی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی شکل متعین ہوئی تھی بلکہ صرف بطور نفل و استحباب پڑھی جاتی تھی۔ لہذا ان کے نماز نہ پڑھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے منحرف تھے۔

ساتویں دلیل یہ ہے کہ اگر وہ مسلمان ہوتے اور اسلام پر ان کا خاتمہ ہوتا تو پیغمبرؐ اسلام ان کی نماز جنازہ پڑھتے یا کسی کو پڑھنے پر مامور کرتے۔ اس لئے کہ یہ بھی اسلامی فرائض و دینی شعائر میں شامل ہے۔ حالانکہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے یا کسی اور نے ان کی میت پر نماز ادا کی ہو۔

یہ شبہ سرے سے بے محل ہے اس لئے کہ نمازِ میت کا حکم اُن کے مرنے کے بعد نافذ ہوا اور اس دور کے مرنے والوں میں سے کسی کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ چنانچہ حضرت ابوطالب کی رحلت کے کچھ دنوں بعد ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے انتقال فرمایا تو ان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی گئی۔ حالانکہ ان کا نہ صرف اسلام مسلّم ہے بلکہ اسلام میں سبقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:-

نزل رسول الله فى قبرها و لم يكن سنت الصلوٰة على الجنائز يومئذ (انساب الاشراف ج۱ ص۴۰۶) — رسولؐ اللہ حضرت خدیجہؓ کی قبر میں اُترے اور اس وقت میت پر نماز جنازہ کا حکم نافذ نہ ہوا تھا"

یہ ہے روایات و شبہات کا وہ پلندہ جو ابوطالب کے کفر کے اثبات کے لئے فراہم کیا گیا ہے اور انہی روایتوں اور من گھڑت دلیلوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے کفر و شرک پر اصرار کیا جاتا ہے حالانکہ ان کے صریحی اعتراف ایمان پیغمبرؐ اکرم کی شہادت اور ائمہ اطہار کے اجماع و اتفاق کے بعد ان کے ایمان سے انکار کا کوئی

محل نہیں رہتا۔ اور ہر صاحب بصیرت ان بے سر و پا روایتوں اور خود ساختہ دلیلوں کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان میں مغالطہ آفرینیوں اور ابلہ فریبیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

حضرت ابوطالب دین کے محافظ اسلام کے پشت پناہ اور پیغمبر اسلامؐ کے لئے ایک دفاعی حصار اور مستحکم قلعہ تھے۔ انہوں نے شدید سے شدید مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کسی موقع پر نہ حرف شکایت لب پر آیا اور نہ جبین پر شکن آئی۔ اور اپنی جوانی و پیرانہ سالی میں ایک لمحہ بھی پیغمبرؐ کی حفاظت میں فروگذاشت اور اسلامی خدمات میں کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ بلکہ بستر مرگ پر بھی اُن کا ذہن اسلام اور بانئ اسلام کے تحفظ کی فکر سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ جب شعب ابی طالب کی پیہم و مسلسل جان گداز مصیبتوں کے نتیجہ میں صحت نے جواب دے دیا اور موت کے آثار نظر آنے لگے تو شیوخ و عمائد قریش کو طلب کیا اور انہیں امانت، صدق بیانی، صلۂ رحم، فقراء کی اعانت و دستگیری اور خانہ کعبہ کے احترام کی ہدایت کے بعد آنحضرتؐ کی حفاظت و نصرت کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

انا اوصیکم بمحمد خیرا فانہ
الامین فی قریش والصدیق فی
العرب وھو جامع لکل ما اوصیکم
بہ وقد جاء بامر قبلہ الجنان و
انکرہ اللسان مخافۃ الشنان و
ایم اللہ کانی انظر الی صعالیک
العرب واھل البر فی الاطراف
والمستضعفین من الناس قد
اجابوا دعوتہ وصدقوا کلمتہ
وعظموا امرہ فخاض بھم غمرات
فصارت رؤسا قریش وصنادیدھا
اذنابا ودورھا خرابھا وضعفاؤھا
اربابا واذا اعظمھم علیہ احوجھم
الیہ وابعدھم منہ احظاھم عندہ
قد محضتہ العرب ودادھا واصفت

میں تمہیں محمدؐ کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں
وہ قریش میں امین اور عرب میں صدیق ہیں اور ان
میں وہ تمام صفتیں موجود ہیں جن کی میں نے تمہیں
وصیت کی ہے وہ ایسی چیز لے کر آئے ہیں جس
کے دل معترف ہیں اور زبانیں عداوت کے ڈر سے
چپ ہیں۔ خدا کی قسم گویا یہ منظر میں اپنی آنکھوں
سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے فقراء اور اطراف و جوانب
کے بادیہ نشین اور کمزور افراد ان کی آواز پر لبیک کہہ
رہے ہیں۔ محمدؐ انہیں لے کر سختیوں کے بھنور میں اتر
پڑے ہیں اور قریش کے سربلند پست اور سردار ذلیل
ہو گئے ہیں ان کے گھر اجڑ گئے ہیں۔ اور کمزور و ناتواں
افراد برسر اقتدار آ گئے ہیں۔ باعظمت لوگ ان کے
دست نگر ہو گئے ہیں اور دور والے فائدہ اٹھا رہے
ہیں۔ عرب ان کے مخلص دوست اور دل کی پاکیزگی
کے ساتھ ہمنوا ہو گئے ہیں اور انہیں اپنی قیادت

له فؤادها واعطته قيادها دونكم يامعشر قريش ابن ابيكم كونوا له ولاة ولحزبه حماة و والله لا يسلك احد سبيله الارشد ولا ياخذ احد بهديه الاسعد ولو كان لنفسي مدة ولاجلي تاخير لكفيت عنه الهزاهز ولدفعت عنه الدواهي۔ (ثمرات الاوراق۔ ج۲۔ ص۱۱۳)

سونپ دی ہے۔ اے گروہ قریش تم بھی محمد (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے دوست اور ان کی جماعت کے مددگار بن جاؤ۔ خدا کی قسم جو بھی اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا وہ ہدایت پائے گا۔ اور جو بھی اُن کے طریقہ پر عمل کرے گا خوش بخت ہوگا اگر مجھے کچھ اور زندگی ملتی اور میری موت میں تاخیر ہوتی تو میں ان سے دشمن کے حملوں کو روکتا اور مصیبتوں سے انہیں بچاتا۔"

اس عمومی وصیت کے بعد اولاد عبدالمطلب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

لن تزالوا بخير ما سمعتم من محمدٍ وما اتبعتم امره فاتبعوه واعينوه ترشدوا۔

(طبقات ابن سعد۔ ج۱۔ ص۱۲۳)

جب تک تم محمدؐ کی بات سنتے رہو گے اور ان کے احکام کی پیروی کئے جاؤ گے خیر و سعادت سے بہرہ ور رہو گے ان کی پیروی کرو ان کا ہاتھ بٹاؤ ہدایت یافتہ رہو گے۔"

زندگی کے آخری لمحوں میں پیغمبرؐ کی صداقت و امانت کی گواہی دینا اور خیر و سعادت اور رشد و ہدایت کو ان کے اتباع سے وابستہ کرنا اعترافِ رسالت و تصدیق نبوت نہیں ہے تو کیا ہے۔ اور کیا یہ ہدایت آموز و ایمان افروز کلمات ان کے اسلام کے آئینہ دار نہیں ہیں؟

جب وصیت کر کے اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو گئے تو موت کے آثار ظاہر ہوئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا، پیشانی پر پسینہ آیا اور پیغمبرؐ کا سب سے بڑا ناصر و مددگار اور سرپرست و غمگسار چھیاسی برس کی عمر میں جوارِ رحمت میں پہنچ گیا۔ آنحضرتؐ پر کوہِ غم و الم ٹوٹ پڑا، آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور گلوگیر آواز میں علیؑ سے فرمایا:۔

اذهب فغسله وكفنه وواره غفر الله ورحمه

(طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص۱۰۵)

جاؤ انہیں غسل دو کفن پہناؤ اور دفن کا سامان کرو خدا ان کی مغفرت کرے اور اپنی رحمت ان کے شامل حال رکھے۔"

آنحضرتؐ نے غسل و کفن کی انجام دہی پر حضرت علیؑ کو مامور فرمایا حالانکہ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ عقیل اور طالب اس وقت تک زمرۂ اسلام میں شمار نہ ہوتے

تھے۔ اور ابوطالب ایسے مسلم و مومن کا غسل و کفن کسی غیر مسلم سے متعلق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت جعفرؑ اگرچہ اسلام لا چکے تھے مگر اس موقع پر وہ بلادِ حبشہ میں تھے۔ اب اولادِ ابوطالب میں ایک علیؑ ہی ایسے تھے جو اس فریضہ کو انجام دے سکتے تھے۔ یہ چیز بھی ابوطالب کے ایمان پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس لئے کہ اگر ابوطالب کافر ہوتے تو ان کا غسل و کفن حضرت علی کے بجائے ان کی ہم مذہب و ہم مسلک اولاد سے متعلق کیا جاتا۔ کیونکہ ایک مسلمان سے یہ خدمت نہیں لی جا سکتی کہ وہ ایک کافر کو غسل و کفن دے۔ غرض حضرت علیؑ نے غسل و کفن دیا۔ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے، اپنے محسن و مربّی چچا کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر بہت روئے۔ اور فرمایا:۔

یاعم ربیت صغیرا و کفلت یتیما و نصرت کبیرا جزاک اللہ عنی خیرا۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صہ ۲۶)

اے چچا آپ نے بچپن میں پالا، یتیمی میں میری کفالت کی، بڑا ہونے پر میری نصرت و حمایت کی۔ خداوند عالم میری طرف سے آپ کو جزائے خیر دے۔"

جب جنازہ اٹھا کر لے چلے تو آپ کندھا دیتے ہوئے شروع سے آخر تک شریک جنازہ رہے اور اس کوہِ صبر و ثبات کو کوہِ حجون کے دامن میں دفن کر کے واپس ہوئے۔

آنحضرت کے لئے ابوطالب کی موت ایک عظیم سانحہ تھی۔ ان کا سب سے بڑا حامی و پشت پناہ جاتا رہا تھا اور آپ خونخوار دشمنوں کے نرغہ میں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی مگر ان میں ابوطالب ایسا بااثر کوئی نہ تھا جو قریش کے بڑھتے ہوئے مظالم کا انسداد کر سکے۔ چنانچہ ان کے اٹھ جانے کے بعد قریش کے مظالم میں شدت پیدا ہو گئی اور آپ پر ظلم و ستم کے اتنے پہاڑ توڑے کہ ابوطالب کی زندگی میں اس قدر مظالم ڈھانے کی انہیں جرأت و جسارت نہ ہو سکتی تھی۔ ابن ہشام نے تحریر کیا ہے:۔

فلما ھلک ابوطالب نالت قریش من رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم من الاذی مالم تکن تطمع فی حیات ابی طالب۔

(سیرت ابن ہشام۔ ج ۲۔ صہ ۵۸)

"جب ابوطالب وفات پا گئے تو قریش نے آنحضرتؐ کو اتنی تکلیفیں دیں کہ ابوطالبؑ کی زندگی میں ستانے کی اتنی ہوس ان کے دلوں میں پیدا نہ ہو سکتی تھی۔"

ابوطالب کی وفات کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ان کی رحلت کے ایک مہینہ پانچ دن بعد جناب خدیجہؓ نے بھی انتقال فرمایا۔ اس حادثہ کا بھی رسول اللہؐ کو انتہائی رنج و قلق ہوا اور آپ نے ان دونوں کے مرنے کا یکساں غم منایا۔ اور اپنے غم و حزن کی یاد باقی رکھنے کے لئے اس سال کا نام "عام الحزن" (غم و اندوہ

کا سال) رکھا۔ اور فرمایا:۔

اجتمعت علی ھذہ الامۃ فی ھذہ الایام مصیبتان لاادری بایھما انا اشد جزعاً۔
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۲۶)

"ان دنوں اس امت پر دو عظیم حادثے ایک ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں صدموں میں سے کون سا صدمہ میرے لئے زیادہ رنج و کرب کا باعث ہے"

آنحضرتؐ نے حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؑ کی وفات کو اپنی امت کے لئے ایک حادثۂ عظمیٰ و مصیبت ناگہانی قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ابتدائے بعثت میں یہی وہ دو ہستیاں تھیں جنہوں نے اسلام کے نشر و فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور پیغمبرؐ اکرم کی نصرت و حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ایک نے اپنی ساری دولت آنحضرتؐ کے قدموں پہ نثار کر دی اور دوسرا استبدادی طاقتوں کے مقابلہ میں سینہ سپر بن کر کھڑا ہو گیا۔ اگر احسان شناسی کا جذبہ اور حسن خدمات کا احساس ہو تو یہ دونوں موتیں جو پیغمبر کی زندگی کا عظیم حادثہ تھیں، امت کے لئے بھی ایک ناقابل فراموش المیہ ہوں گی۔

اہل مکہ نے سردار قریش، یادگار عبدالمطلب، رئیس بطحا ابوطالب کے مرنے پر سوگ منایا اور حضرت علیؑ نے اپنے اس عظیم باپ کی وفات پر پُر اندوہ مرثیے کہے۔ ایک مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں:۔

اباطالب عصمۃ المستجیر وغیث المحول ونور الظلم

"اے ابوطالب آپ پناہ مانگنے والوں کے لئے دارالامان، قحط سالی میں ابر باراں اور تاریکیوں میں شمع درخشاں تھے۔"

لقد ھد فقدک اھل الحفاظ فصلی علیک ولی النعم

آپ کی موت سے ارباب غیرت و حمیت کو انتہائی صدمہ ہوا۔ خداوند عالم آپ پر رحمت فراواں نازل کرے۔

ولقاک ربک رضوانہ فقد کنت للطھر من خیر عم

آپ کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی نصیب ہو آپ نبیؐ پاک کے بہترین چچا تھے۔

(تذکرہ سبط ابن جوزی۔ ص۶)

فاطمہ بنتِ اسد

فاطمہ بنتِ اسد حضرت علی کی والدہ گرامی تھیں، اسد، قیلہ بنت عامر کے بطن سے حضرت ہاشم کے فرزند تھے اس لحاظ سے آپ ہاشم کی پوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی اور حرم ابوطالب ہونے کی بنا پر چچی ہوئیں۔ جب آنحضرتؐ ابوطالبؑ کی کفالت میں آئے تو انہی کی گود پیغمبرؐ ایسے ہادیٔ اکبر اور رہنمائے اعظم کی گہوارۂ تربیت بنی۔ اور انہی کی آغوشِ محبت و شفقت میں پرورش پائی۔ اگر حضرت ابوطالبؑ نے تربیت و نگہداشت میں باپ کے فرائض انجام دیے تو فاطمہ بنتِ اسد نے اس طرح محبت و دلسوزی سے دیکھ بھال کی کہ یتیم عبداللہ کو ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اپنے بچوں سے زیادہ ان کا خیال رکھتیں اور ان کے مقابلہ میں اپنی اولاد تک کی پرواہ نہ کرتیں۔ ان کی محبت و التفات کا یہ عالم تھا کہ جب خرما کے درختوں میں پھل آتا تو صبح کے تڑکے اٹھ کر خرموں کے کچھ دانے چُن کر علیحدہ رکھ دیتیں۔ اور جب اُن کے بچے اِدھر اُدھر ہوتے تو وہ خرمے آنحضرتؐ کو پیش کرتیں اور جب دسترخوان بچھتا تو اس پر سے کچھ کھانا اٹھا کر الگ رکھ دیتیں۔ کہ اگر کسی وقت وہ کھانا مانگیں تو انہیں دے سکیں۔

پیغمبر اکرمؐ بھی انہیں ماں سمجھتے، ماں کہہ کر پکارتے اور ماں ہی کی طرح عزت و احترام کرتے تھے چنانچہ ان کی شفقت و محبت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:۔

لم یکن بعد ابی طالب ابربی منھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص۷۷۳)

"ابوطالب کے بعد اُن سے زیادہ کوئی مجھ پر شفیق و مہربان نہ تھا۔"

آنحضرتؐ ان کی مادرانہ شفقت و لطف و محبت سے اتنا متاثر تھے کہ منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد اپنے فرائض منصبی سے وقت نکال لیتے، ان کے ہاں آتے اور اکثر دوپہر کے اوقات انہی کے ہاں گزارتے۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

کان رسول اللہ یزورھا ویقیل فی بیتھا۔ (طبقات۔ ج ۸۔ ص۲۲۲)

"رسول اللہؐ آپ کی زیارت کو آتے اور دوپہر کو انہی کے ہاں استراحت فرماتے۔"

آپ کے بطن سے ابوطالب کی سات اولادیں ہوئیں جن میں تین صاحبزادیاں تھیں: ریطہ، جمانہ اور فاختہ جو اُم ہانی کی کنیت سے معروف ہیں اور چار صاحبزادے تھے: طالب، عقیل، جعفر اور علیؑ۔ طالب عقیل سے دس سال بڑے تھے اور عقیل جعفر سے دس سال بڑے تھے اور جعفر حضرت علیؑ سے دس سال بڑے تھے۔

جناب ابو طالب ہاشمی تھے اور فاطمہ بنت اسد بھی ہاشمیہ تھیں اور مادری و پدری دونوں نسبتوں سے ہاشمی ہونے کا شرف سب سے پہلے ابو طالب و فاطمہ ہی کی اولاد کو حاصل ہوا۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے:۔

هی اول هاشمیة ولدت الهاشمی (المعارف۔ ص۲۰۳)

فاطمہ بنت اسد پہلی ہاشمیہ خاتون ہیں جن سے ہاشمی اولاد ہوئی"

فاطمہ بنت اسد اسی دودمان ہاشمی کی فرد تھیں جو اخلاق و کردار، طرز بود و ماند اور تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے دوسرے خاندانوں سے مختلف جاہلیت کے اثرات سے بیگانہ اور انسانی اقدار کا نمائندہ تھا۔ آپ میں موروثی صفات و خاندانی خصوصیات پوری طرح راسخ تھیں۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح مسلکِ ابراہیمی کی پابند، دینِ حنیف کی پیرو اور شرک و کفر کی آلائشوں سے پاک و صاف تھیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے صلبی و خلقی اشتراک کے سلسلہ میں فرمایا:۔

ان الله عزوجل نقلنا من صلب ادم فی اصلاب طاهرة الی ارحام زکیة فما نقلت من صلب وعلی نقل معی فلم نزل کذلك حتی استودعنی خیر رحم وهی امنة وستودع علیا خیر رحم وهی فاطمة بنت اسد۔ (کفایة الطالب۔ ص۲۶۰)

خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں حضرت آدمؑ کے صلب سے پاکیزہ صلبوں اور پاکیزہ شکموں کی طرف منتقل کیا۔ جس صلب سے میں منتقل ہوا اسی صلب سے ایک ساتھ علیؑ منتقل ہوئے۔ یہاں تک کہ خداوند عالم نے مجھے آمنہؓ کے شکمِ اطہر میں اور علی کو فاطمہ بنت اسد کے پاکیزہ شکم میں ودیعت فرمایا"

جناب فاطمہ خاندانی رفعت، نسبی شرافت اور پاکیزگی سیرت کے ساتھ اسلام، بیعت اور ہجرت میں بھی سبقت کا شرف رکھتی ہیں۔ ابنِ صباغ مالکی نے تحریر کیا ہے:۔

اسلمت وهاجرت مع النبیؐ وکانت من السابقات الی الایمان۔ (فصول المهمه۔ ص۱۳)

فاطمہ بنت اسد اسلام لائیں، پیغمبرؐ کے ساتھ ہجرت کی اور سابق الاسلام خواتین میں سے تھیں"

ابو الفرج اصفہانی تحریر کرتے ہیں:۔

عن الزبیر ابن العوام قال سمعت النبیؐ یدعوا النساء الی البیعة حین انزلت هذه الآیة یا ایها

زبیر ابن عوام کہتے ہیں کہ جب آیۂ یا ایھا النبی اذا جاءك المومنات۔ نازل ہوا تو میں نے پیغمبرؐ اکرم کو عورتوں کو بیعت کی دعوت دیتے ہوئے سنا

النبی اذا جاءك المومنات" یبایعنك كانت فاطمة بنت اسد اول امرأة بایعت رسول اللہ (مقاتل الطالبین ص۲)

اور فاطمہ بنت اسد پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آپ غزوۂ بدر میں ان خواتین میں شامل تھیں جو مجاہدین کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اس اسلامی جذبۂ خدمت کے ساتھ ایک منتظم اور سلیقہ مند خاتون کی طرح گھر کا نظم قائم رکھتیں اور گھر اور باہر کے کام زیادہ تر خود انجام دیتیں۔ البتہ جب ۲ھ میں جناب فاطمہ زہرا دلہن کی حیثیت سے گھر میں آئیں تو دونوں میں تقسیم عمل اس طرح ہوا کہ گھر کا کام کاج جناب سیدہ کرتیں اور باہر کے کام آپ انجام دیتیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے ان سے کہا:۔

اکفی فاطمة سقایة الماء والذهاب فی الحاجة وتکفیك الطحن العجن۔ (اصابہ۔ ج ۴۔ ص ۳۹۹)

فاطمہ بنت رسولؐ آٹا پیسنے اور گوندھنے سے آپ کو بے نیاز کر دیں گی۔ اور پانی اور دوسرے ضروریات کے لئے باہر جانا آپ سے متعلق ہوگا۔"

گھر اور گھر کے باہر کے کاموں کے لئے ایک کنیز بھی آپ کے ہاں تھی۔ مگر آپ یہ چاہتی تھیں کہ اس کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اسے آزاد کر دیں۔ چنانچہ ایک دن رسول اللہ سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کنیز کو آزاد کر دوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر آپ اسے آزاد کر دیں گی تو خداوند عالم اس کے ہر عضو بدن کے بدلے آپ کے ہر جزو بدن کو دوزخ کی آگ سے آزاد کر دے گا۔ ابھی اس آزادی کی نوبت نہ آئی تھی کہ سخت بیمار پڑ گئیں۔ آپ نے حالتِ مرض میں پیغمبر اکرمؐ کو اس کی آزادی کے بارے میں وصیت کرنا چاہی مگر زبان لڑکھڑا گئی اور قوتِ گویائی ساتھ نہ دے سکی۔ پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں آپ کی وصیت و خواہش کے مطابق اسے آزاد کر دوں گا۔

آپ ریاضت و عبادت زہد و ورع اور تقویٰ و طہارت میں بلند درجہ رکھتی تھیں۔ جب فشار قبر حشر و نشر اور حساب و کتاب کا ذکر سنتیں تو لرز جاتیں اور خوفِ آخرت سے کانپ اٹھتیں۔ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ سے سنا کہ لوگ قیامت کے دن برہنہ محشور ہوں گے۔ کہا کہ یہ تو بڑی رسوائی کی بات ہے۔ فرمایا کہ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو بے پردہ محشور نہ کرے۔ اور ایک دفعہ فشار قبر کا ذکر سنا تو کہا کہ میں ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اسے کیسے برداشت کروں گی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے التجا کروں گا کہ وہ اپنی رحمت و رأفت سے آپ کو فشار قبر سے محفوظ رکھے۔ جب دارِ دنیا سے رحلت فرمائی تو حضرت علیؑ روتے ہوئے رسولِ خداؐ کو اطلاع دینے آئے۔ آنحضرتؐ نے علیؑ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو پوچھا کہ کیا بات ہے؟ عرض کیا کہ ابھی

ابھی میری ماں نے انتقال کیا ہے۔ آنحضرتؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا خدا کی قسم وہ میری بھی ماں تھیں۔ اور اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ صحابہ بھی سر جھکائے ساتھ ہو لئے۔ جب اُن کے ہاں آئے تو پیراہن اتار کر دیا اور فرمایا کہ یہ پیراہن انہیں کفن کے طور پر پہنا دیا جائے۔ اور جب غسل و کفن کے بعد جنازہ باہر نکلا تو آپ نے آگے بڑھ کر کاندھا دیا۔ کبھی میت کے سرہانے کی طرف سے کاندھا دیتے اور کبھی پائنتی کی طرف سے۔ اور جنۃ البقیع تک پا برہنہ جنازہ کے ساتھ رہے۔ آنحضرتؐ نے چند آدمیوں کو قبر کھودنے پر مامور فرمایا تھا۔ جب قبر کھد چکی تو خود بنفسِ نفیس قبر میں اُترے۔ اسے کناروں سے کھود کر کشادہ کیا اور اپنے ہاتھ سے لحد کھودی اور اسے ہموار کر کے مٹی باہر نکالی۔ پھر کچھ دیر کے لئے لحد میں لیٹ گئے اور دائیں بائیں کروٹ لینے کے بعد باہر آئے اور روتے ہوئے فرمایا۔

جزاک اللہ من ام خیرا فلقد کنت خیرام۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۲۔ ص ۵۲۶)

اے مادر گرامی خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ بہترین ماں تھیں۔

پیغمبرؐ کے اس امتیازی برتاؤ کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہؐ کسی اور کے لئے یہ چیزیں آپ سے دیکھنے میں نہیں آئیں۔ فرمایا کہ میرے چچا ابو طالب کے بعد اس خاتون کے سب سے زیادہ مجھ پر احسانات ہیں۔ یہ خود بھوکی رہتی تھیں اور مجھے کھانا کھلاتی تھیں۔ خود پھٹے پرانے کپڑوں میں گزارہ کرتی تھیں اور مجھے اچھا لباس پہناتی تھیں۔ اپنے بچوں کو پراگندہ مو رکھتی تھیں اور میرے سر میں تیل ڈالتی تھیں اور خود تکلیفیں اٹھاتی تھیں اور میرے لئے راحت و آرام کا سامان کرتی تھیں۔ میں نے اپنا پیراہن انہیں اس لئے پہنایا ہے تاکہ پردہ پوش محشور ہوں۔ اور لحد میں اس لئے لیٹا ہوں تاکہ فشارِ قبر سے محفوظ رہیں۔ عالم اہلسنت شیخ علی المرزوقی نے تحریر کیا ہے۔

ان النبی تولی دفن فاطمۃ بنت اسد و کان اشعرھا قمیصا لہ فسمع وھو یقول ابنک ابنک فقال انما سئلت عن ربھا فاجابت وعن نبیھا فاجابت وعن امامھا فلجلجت۔ فقلت ابنک ابنک۔

پیغمبر اکرمؐ نے فاطمہ بنت اسد کو خود دفن کیا۔ اور انہیں اپنے پیراہن کا کفن دیا۔ اس موقع پر آنحضرتؐ کو فرماتے سنا گیا کہ "آپ کا فرزند" جب آنحضرتؐ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ فاطمہ بنت اسد سے پروردگار کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتا دیا اور نبی کے بارے میں پوچھا گیا تو اس کا جواب دے دیا۔ پھر امام کے بارے میں سوال ہوا تو ان کی زبان لڑکھڑائی میں نے کہا: - آپ کا فرزند آپ

(کتاب الازمنة والامکنة - ج ۲ - ص۲) کا فرزند"

آپ نے ۲۳ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں۔ مگر جنۃ البقیع کے گرد چار دیواری کھینچ دینے سے یہ قبر موجودہ حدود جنۃ البقیع سے باہر ایک خستہ و خراب رہگزر پر واقع ہے۔ جب حجاج و زائرین ادھر سے گزرتے ہیں تو اس قبر پر بھی فاتحہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں جو ابھی تک دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے اور خدا نہ کرے کہ راستوں کی توسیع کی تجویز اسے اپنے تصرف میں لے لے۔

ولادت باسعادت

خانہ کعبہ ایک قدیم ترین عبادت گاہ ہے۔ جس کی نیو آدمؑ نے ڈالی، اور جس کی دیواریں ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے اٹھائیں۔ اگرچہ یہ گھر بالکل سادہ، نقش و نگار سے معرا، زینت و آرائش سے خالی اور چونے اور پتھروں کی سیدھی سادی عمارت ہے مگر اس کا ایک ایک پتھر برکت و سعادت کا سرچشمہ اور عزت و حرمت کا مرکز و محور ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے :۔

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام۔ "اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو محترم گھر قرار دیا ہے۔"

خانہ کعبہ کی یہ عزت و حرمت دائمی و ابدی ہے جو نہ پہلے زمانہ و وقت کی پابند تھی اور نہ اب ہے بلکہ روز تعمیر سے اسے بلند ترین عظمت اور غیر معمولی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور اب بھی اس کی مرکزیت و اہمیت بدستور قائم ہے جس کا اظہار مختلف اسلامی عبادات کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان چاہے وہ مشرق کا باشندہ ہو یا مغرب کا عرب کا رہنے والا ہو یا عجم کا جب بھی نماز کے لئے کھڑا ہو گا اسے ہی عبادات کی مرکزی سمت قرار دے گا اور اس کے گرد چکر لگانا اور طواف کرنا اس احتیاط کے ساتھ کہ شانے اس کی سمت سے منحرف نہ ہونے پائیں، حج کا ایک بڑا رکن اور اس کی عظمت و تقدیس کا ایک خاص مظاہرہ ہے۔

حضرت علیؑ اسی متبرک و باعظمت گھر میں روز جمعہ تیرہ رجب تیس عام الفیل میں پیدا ہوئے، اور یہ شرف خاص نہ ان سے پہلے کسی کو ملا اور نہ ان کے بعد کسی کو حاصل ہو گا۔ محدثین و اہل سیر نے اسے حضرت امیرالمومنینؑ کے مختصات میں شمار کرتے ہوئے اپنے کتب و مصنفات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حاکم نیشاپوری تحریر کرتے ہیں :۔

تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیرالمومنین علی	اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ وسط خانہ

ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فی جوف الکعبۃ (مستدرک۔ ج ۳، ص ۴۸۳)

کعبہ میں فاطمہ بنت اسد کے بطن سے متولد ہوئے۔"

شاہ ولی اللہ نے بھی اسے نقل کیا ہے اور اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو یہ شرف نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیرالمومنین علیاً فی جوف الکعبۃ فانہ ولد فی یوم الجمعۃ ثالث عشر من شہر رجب بعد عام الفیل بثلثین سنۃ فی الکعبۃ ولم یولد فیہا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ۔ (ازالۃ الخفاء۔ ج ۔ ص ۲۵۱)

متواتر روایات سے ثابت ہے کہ امیرالمومنین علیؑ روز جمعہ تیرہ رجب تیس عام الفیل کو وسط کعبہ میں فاطمہ بنتِ اسد کے بطن سے پیدا ہوئے اور آپؑ کے علاوہ نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہوا۔"

عبقریۃ علی کے مصنف عباس محمود عقاد نے اس مبارک پیدائش کو خانہ کعبہ کی عظمت پارینہ کی تجدید اور خدائے واحد کی پرستش کے دورِ جدید سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ولد علی فی داخل الکعبۃ وکرم اللہ وجہہ عن السجود لاصنامہا فکانما کان میلادہ ثمۃ ایذاناً بعہد جدید الکعبۃ وللعبادۃ فیہا (العبقریۃ الاسلامیہ ص ۹۶۳)

علی ابن ابی طالب خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے اور خداوند عالم نے ان کے چہرے کو بتانِ کعبہ کے آگے جھکنے سے بلند تر رکھا۔ گویا اس مقام پر حضرت کی پیدائش کعبہ کے نئے دور کا آغاز اور خدائے واحد کی پرستش کا اعلانِ عام تھا۔"

اس طرح تقریباً ہر مورخ و سیرت نگار نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے ایسے گوشے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی امتیازی و انفرادی حیثیت ختم ہو جائے اور یہ شرف، شرف نہ رہے یا علی سے مخصوص نہ رہے۔ چنانچہ کبھی یہ کہا گیا کہ خانہ کعبہ کے اندر ولادت میں رکھا ہی کیا ہے جب کہ وہ اس وقت ایک بت خانہ کی حیثیت رکھتا تھا اور چاروں طرف سے بتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ اگر مسجد کو مندر یا کلیسا میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ حکم مسجد سے خارج قرار نہیں پاتی بلکہ اس کی حرمت و تقدیس بدستور باقی رہتی ہے۔ اسی طرح بتوں کے عمل دخل سے خانہ کعبہ کی بھی حرمت و توقیر زائل نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے دامن تقدیس پہ حرف آ سکتا ہے۔ چنانچہ جب اسے

عالم اسلام کا قبلہ قرار دیا گیا تو اس وقت بھی اس کے گرد و پیش بُت رکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ بت اس کے قبلہ قرار پانے سے مانع نہ ہو سکے۔ اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ عام الفیل سے تیرہ سال قبل فاختہ بنت زہیر کے بطن سے حکیم ابن حزام بھی خانہ کعبہ میں پیدا ہوا تھا تو اس میں شرف ہی کیا جب کہ ایک کافر بھی وہاں پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ واقع ان وسیع النظر علماءٔ و مورخین کے تصریحات کے خلاف ہے جنہوں نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ حضرت علیؑ سے پہلے اور ان کے بعد کوئی خانہ کعبہ کے اندر پیدا نہیں ہُوا۔ اور پھر یہ مقام شرف ہے تو مسلم کے واسطے نہ کہ کافر کے واسطے۔ لہذا اگر کوئی کافر وہاں پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے یہ سبب اعزاز و افتخار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے، کہ کفر کے ساتھ اس قسم کے امتیازات مورد فخر نہیں قرار پا سکتے اگر کفر کی حالت میں زیارتِ رسول وجہِ شرف نہیں اور زیارتِ کعبہ قابلِ تعریف نہیں تو اس میں پیدائش کیونکر وجہِ نازش ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر ایمان کے ساتھ ایسا ہوتا تو سبب امتیاز ہو سکتا تھا۔ اور علی ابن ابی طالب کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ وہ نہ محکوم بالکفر تھے اور نہ کافر پیدا ہوئے۔ چنانچہ اہلسنت میں یہ روایت موجود ہے کہ جب آپ شکم مادر میں تھے اور ماں بتوں کے آگے سرنگوں ہونا چاہتی تھیں تو آپ شکم مادر میں اس طرح پیچ و تاب کھاتے کہ وہ بتوں کے آگے جھک نہ سکتی تھیں۔ اگرچہ یہ روایت شیعہ نقطۂ نظر سے قابل تسلیم نہیں ہے مگر اتنا تو واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک بھی علی کی زندگی کا کوئی لمحہ بطن مادر سے لے کر آغوش لحد تک کفر و شرک میں نہیں گزرا۔ اور پھر جنہوں نے ابن حزام کی ولادت کے متعلق لکھا ہے۔ انہوں نے اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے جس سے کسی شرف و بلندی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا مگر امیرالمومنینؑ کی ولادت کسی اتفاقی حادثہ کی بجائے مشیتِ ایزدی کی کارفرمائی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ عباس ابن عبدالمطلب بیان کرتے ہیں کہ وہ اور یزید ابن قعنب اور بنی ہاشم و بنی عزیٰ کے چند افراد خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے تھے کہ فاطمہ بنت اسد تشریف لائیں اور خانہ کعبہ کے قریب آکھڑی ہو گئیں۔ ابھی ایک آدھ لمحہ گزرا تھا کہ ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے، مضطرب نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: "اے میرے پروردگار! میں تجھ پر اور تیرے نبیوں پر اور تیری نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتی ہوں۔ تو اس باعزت گھر، اس گھر کے معمار اور اس مولود کے صدقہ میں جو میرے شکم میں ہے میری مشکل حل کر اور اس کی ولادت کو میرے لئے آسان کر دے مجھے یقین ہے کہ یہ مولود تیرے جلال و عظمت کی نشانیوں میں سے ایک روشن نشانی ہے اور تو ضرور میری مشکل آسان کرے گا۔" عباس کہتے ہیں کہ جب فاطمہ بنت اسد اس دعا سے فارغ ہوئیں تو ہم نے دیکھا کہ خانہ کعبہ

کی عقبی دیوار شق ہوئی اور وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً اس نئے در سے اندر داخل ہوگئیں اور دیوار کعبہ شگافتہ ہونے کے بعد پھر اپنی اصلی حالت پر پلٹ آئی گویا اس میں کبھی شگاف پڑا ہی نہ تھا۔
اس واقعہ کی صحت کو علمائے شیعہ کے علاوہ اہلسنت نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علمائے اہل تشیع میں سے ابو جعفر طوسی نے امالی میں علامہ مجلسیؒ نے بحار میں اور علمائے اہلسنت میں سے میر صالح کشفی نے مناقب میں اور مولوی محمد مبین نے وسیلۃ النجاۃ میں اسے درج کیا ہے۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ صورت یکایک اور اتفاقیہ طور پر پیش نہیں آئی۔ اگر یہ اتفاق ایسا ہوتا تو نہ خرق عادت کے طور پر دیوار شق ہوتی اور نہ بنت اسد دیوار کے شگاف سے درانہ وبیباکانہ اندر داخل ہوتیں۔ بلکہ یہ غیبی طاقت ہی کا کرشمہ اور قدرت کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ تھا۔ اس ولادت کے تین دن بعد تک فاطمہ بنت اسد بیت اللہ میں رہیں اور چوتھے دن مولود نو کو گود میں لئے ہوئے باہر آئیں ؎

در پس پردہ آنچہ بود آمد اسد اللہ در وجود آمد

پیغمبر اکرمؐ جو منتظر و چشم براہ تھے آگے بڑھے اور اپنے محسن و مربی چچا کے لخت جگر کو ہاتھوں پر لے کر سینہ سے لگایا۔ بچے نے شمیم نبوت سونگھ کر آنکھیں کھول دیں اور سب سے پہلے جمال جہاں آرائے حبیب خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا۔ پیغمبرؐ نے اپنی زبان مولود کے منہ میں دے کر آب وحی سے چمن امامت کی آبیاری کی۔ علم نبوت لعاب دہن رسول میں حل ہو کے علی کے رگ و پے میں اترا۔ اور زبان پیغمبرؐ نے گواہی دی کہ خصنی بالنظر وخصصتہ بالعلم "اس نے مجھے پہلی نظر کے لئے منتخب کیا میں نے اسے علم کے لئے منتخب کر لیا۔"
حضرت علی کو خانہ کعبہ سے کئی نسبتیں حاصل ہیں۔ پیغمبرؐ نے انہیں مثیل کعبہ فرمایا انہی کے آباؤ اجداد نے اسے تعمیر کیا اور وہی اس کے پاسبان و نگہبان رہے اور اسے طاغوتی طاقتوں کی دستبرد سے بچاتے رہے۔ چنانچہ حسان ابن عبد کلال نے اسے مسمار کرنا چاہا تو فہر ابن مالک نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ ابرہہ ابن اشرم نے ہاتھیوں کے ساتھ حملہ کیا تو حضرت عبد المطلب در کعبہ پر جم کر کھڑے ہوگئے۔ اگر بت پرستوں نے اسے صنم کدہ بنا ڈالا تو انہی کے فرزند نے پیغمبر کے دوش پر بلند ہو کر اس کی تطہیر کی اور ایک ایک بت کو توڑ پھوڑ کر باہر پھینکا اور یہی ان کا مولد قرار پایا اور اس طرح ان کی ولادت کعبہ کی طہارت کی تمہید بن گئی۔
اگر آپ کی ولادت کو مکانی لحاظ سے یہ شرف حاصل ہے کہ بنائے خلیل مطاف خلق اور مامن عالم میں پیدا ہوئے تو زمانی لحاظ سے بھی یہ شرف ہے کہ آپ ماہ رجب میں پیدا ہوئے۔ جو حرمت والے مہینوں

میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی محترم مہینہ کی ستائیسویں تاریخ کو پیغمبر اکرمؐ کی بعثت ہوئی اور دعوت اسلام کا آغاز ہوا۔ یہ ولادت و بعثت کا زمانی اتحاد علی اور اسلام کے اتحاد باہمی کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ کردار علی اسلامی تعلیمات کا عکس بردار، اور اسلامی تعلیمات سیرت علی کا آئینہ ہیں؛ دونوں ایک ساتھ پیغمبرؐ کے سایہ میں پروان چڑھے اور دونوں ایک دوسرے کی عظمت و رفعت کے پاسبان رہے۔

نام، لقب، کنیت

حضرت ابو طالب نے اپنے جد قصی ابن کلاب کے نام پر آپ کا نام زید رکھا اور فاطمہ بنت اسد نے اپنے باپ اسد کے نام پر "حیدر" نام تجویز کیا۔ (اسد اور حیدر دونوں کے معنی شیر کے ہیں) چنانچہ آپ نے جنگ خیبر میں مرحب کے رجز کے جواب میں فرمایا۔ انا الذی سمتنی امی حیدرہ "میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا" اور پیغمبر اکرمؐ نے قدرت کے ایما پر آپ کو علی کے نام سے موسوم کیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابو طالب ہی نے آپ کا نام علی رکھا۔ اور سند میں ان کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے؎

سمیته بعلی کی یدوم له　　عزالعلو وفخرالعز ادومه

"میں نے ان کا نام علیؑ رکھا ہے تاکہ رفعت و سربلندی کی عزت ہمیشہ ان کے پائے نام رہے۔ اور عزت ہی وہ سرمایۂ افتخار ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔"

یہ نام جو اپنے اندر علو و بلندی کے معنی رکھتا ہے اسم بامسمی ثابت ہوا اور ہمیشہ کائنات میں بلند و بالا رہا۔ پستی سے نا آشنا، رزم و بزم میں ورد زبان اور زمین کی فضاؤں سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک گونجتا رہا۔ اگرچہ اموی حکمرانوں نے حضرتؑ کے نام اور کنیت پر پہرا بٹھا دیا تھا اور اس پر ناک بھوں چڑھاتے تھے چنانچہ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں تحریر کیا ہے کہ عبداللہ ابن عباس کے فرزند کا نام علی اور کنیت ابوالحسن تھی۔ ایک دن علی ابن عبداللہ، عبدالملک کے ہاں گئے تو اس نے کہا کہ میں تمہارا یہ نام اور کنیت گوارا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنا نام تو نہ بدلا مگر کنیت ابوالحسن کے بجائے ابو محمد رکھ لی۔ اسی ذہنیت کے زیر اثر صدیوں تک اسلامی حکمرانوں میں سے کسی کا نام علی نہ ہو سکا۔ مگر آج محمدؐ کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ علی ہی کے نام پر نام رکھے جاتے ہیں اور صدیوں تک متروک اور سب و شتم کا ہدف قرار دیئے جانے کے باوجود آخر یہ نام اسلام کے ساتھ ساتھ ہر گوشۂ عالم میں پہنچ کے رہا۔

آپ کے القاب آپ کے متنوع اور گوناگوں اوصاف کے لحاظ سے متعدد ہیں جن میں سے مرتضیٰ وصی

اور امیرالمومنینؑ زبان زد خلائق ہیں۔ اور مشہور و معروف کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ پہلی کنیت بڑے بیٹے حسن کے نام پر ہے۔ اور عرب عموماً فرزند اکبر ہی کے نام پر کنیت رکھا کرتے تھے۔ جیسے حضرت ابوطالب کی کنیت اپنے بڑے فرزند طالب کے نام پر ابو طالب اور حضرت عبدالمطلب کی کنیت اپنے بڑے بیٹے حارث کے نام پر ابوالحارث تھی۔ اور دوسری کنیت پیغمبر اکرمؐ نے تجویز فرمائی تھی۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ غزوۂ عشیرہ کے موقع پر حضرت علی اور عمار ابن یاسر بنی مدلج کے ایک چشمہ کی طرف نکل گئے اور درختوں کے سایہ میں ایک نرم و ہموار زمین پر لیٹ گئے۔ ابھی لیٹے زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ پیغمبر اکرمؐ بھی اُدھر آگئے اور علیؑ کا بدن خاک میں اٹا ہوا دیکھ کر فرمایا مَالَكَ یَا اَبَا تُرَاب "اے ابوتراب یہ کیا حالت ہے۔" اور اس دن سے آپ کی کنیت ابوتراب قرار پائی۔ علامہ حلبی نے تحریر کیا ہے:۔

وکنی صلی اللہ علیہ وسلم فیھا	غزوۂ عشیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
علیا بابی تراب حین وجدہ نائما	نے حضرت علی کی کنیت ابوتراب رکھی جب کہ رسولِ
ھو وعمار ابن یاسر وقد علق	خدا نے انہیں اور عمار ابن یاسر کو سوتے ہوئے پایا
بہ التراب۔ (سیرت حلبیہ۔ ج ۲، ص۱۴۲)	اور علی خاک میں اٹے ہوئے تھے۔"

سب سے پہلے یہ کنیت آپ ہی کے لئے تجویز ہوئی اور آپ سے قبل کسی کی یہ کنیت نہ تھی۔ چنانچہ شیخ علاءالدین نے تحریر کیا ہے:۔

اول من کنی بابی تراب علی ابن	سب سے پہلے علی ابن ابی طالب ہی ابوتراب کی
ابی طالب۔ (محاضرۃ الاوائل۔ ص۱۲۳)	کنیت سے پکارے گئے۔"

اس سلسلہ میں بخاری نے اپنی صحیح میں یہ روایت درج کی ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ جناب سیدہ کے گھر تشریف لائے اور علی کو وہاں موجود نہ پا کر دریافت کیا کہ علی کہاں ہیں؟ جناب سیدہ نے کہا کہ میرے اور ان کے درمیان کچھ شکر رنجی ہو گئی ہے اور وہ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ایک شخص سے کہا کہ جا کر دیکھو کہ علیؑ کہاں ہیں۔ اس نے مسجد میں حضرت علی کو لیٹے ہوئے دیکھا تو آنحضرتؐ سے پلٹ کر کہا کہ وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ پیغمبر مسجد میں تشریف لائے اور علی کے خاک آلودہ بدن سے گرد جھاڑی اور فرمایا قم یا ابا تراب۔ "ابوتراب اٹھئے" اس کے بعد آپ ابوتراب کی کنیت سے یاد کئے جانے لگے۔

یہ روایت پہلی روایت سے مقام اور واقعہ کے اعتبار سے مختلف ہونے کے علاوہ درایۃً بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ حضرت علی اور جناب فاطمہ کی گھریلو زندگی کے واقعات یہ بتانے سے قاصر ہیں: کہ

جناب فاطمہؓ ایک لمحہ کے لئے بھی علیؓ کی شکوہ سنج ہوئی ہوں اور ان دونوں میں ان بن یا رنجش و کشیدگی کی صورت پیدا ہوئی ہو۔ بلکہ ان کی گھریلو زندگی اتحاد و یکجہتی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عمار یاسر کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علی کی کنیت ابو تراب جمادی الثانیہ ۲ھ میں تجویز کی تھی۔ کیونکہ غزوۂ عشیرہ اسی مہینہ میں ہوا تھا۔ اور جناب سیدہ سے حضرت علی کا عقد غزوۂ بدر کے بعد یکم ذی الحجہ ۲ھ میں ہوا تھا۔ یعنی اس کنیت کے تجویز ہونے کے چھ ماہ بعد۔ تو اس صورت میں نہ رنجش و کشیدگی کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ خفگی کی بنا پر گھر چھوڑ کر مسجد میں لیٹنے کا جب کہ اس وقت جناب سیدہ آپ کے نکاح میں تھی ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اموی حکمرانوں کو خوش کرنے کے لئے گھڑی گئی ہے جو تنقیص و مذمت اور سب و شتم کے موقع پر حضرت کو اس کنیت سے یاد کرتے تھے۔ اگر یہ کنیت اسی مفروضہ رنجش کے موقع پر تجویز ہوتی تو جس نام کے ساتھ کوئی تلخ یاد یا ناگوار واقعہ وابستہ ہوتا ہے وہ نام کبھی مرغوب و پسندیدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ حضرت کو یہ کنیت اپنے تمام ناموں سے زیادہ پسندیدہ تھی۔ چنانچہ سہل ابن سعد کہتے ہیں :۔

ما کان لعلی اسم احب الیہ من ابی تراب۔ (صحیح بخاری۔ جزو ۳ ص ۳۳)	حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو سب ناموں سے زیادہ محبوب نام ابوتراب تھا۔"

حلیہ و سراپا

اعضاء شناسی علمِ نفسیات کی ایک شاخ ہے جو مسلسل تجربات و مشاہدات سے اخذ نتائج پر مبنی ہے۔ اس سے آنکھ، ناک، پیشانی اور دوسرے اعضاء بدن سے انسان کے عادات و اطوار اور اس کے کردار کے جاننے میں مدد لی جاتی ہے۔ چنانچہ ماہرین فن اعضاء کی ساخت، ڈیل ڈول، ناک نقشہ اور رفتار و گفتار سے انسان کی شخصیت کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان اعضاء شناسوں کے نزدیک ماتھے کا کھلا اور پیشانی کا ابھرا ہونا، فہم و ادراک کی، بازوؤں کا طویل و پُرگوشت ہونا بزرگی و ریاست کی، بالوں کی سختی شجاعت کی اور آنکھوں کا بڑا ہونا تیزیِ طبع کی علامت ہے، اسی طرح گردن کا کوتاہ ہونا مکر و تشدد پسندی کی پنڈلیوں کا پُرگوشت ہونا حماقت کی، آنکھوں کا چھوٹا اور اندر کو دھنسا ہونا خبث و فریب کی، شانوں کا نازک و باریک ہونا کمزوریِ عقل کی اور دانتوں میں دراڑوں کا ہونا کمزوری و ضعف کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ظنی و تخمینی علامات ہیں جنہیں قطعی و یقینی نہیں کہا جا سکتا تاہم

ظاہر، باطن کا ایک حد تک عکاس و آئینہ دار ضرور ہوتا ہے:

سیمائے آدم آئینۂ حالِ باطن است

کتب تاریخ و سیر کی رُو سے امیرالمومنینؑ کا حلیہ مبارک یہ تھا، "جسم بھاری بھرکم، رنگ کھلتا ہوا گندم گوں، خدوخال انتہائی موزوں اور دلکش، چہرہ متبسم اور چودھویں رات کے چاند کی طرح درخشاں۔ ابوالحجاج مدرک کہتے ہیں۔ کان من احسن الناس وجھا "سب لوگوں سے زیادہ وجیہہ اور حسین تر تھے"۔ پیشانی کشادہ۔ ابن عباس کہتے ہیں: ما رأیت احسن من شرصة علی "میں نے علی کی کنپٹیوں سے حسین تر کسی کی کنپٹیاں نہیں دیکھیں"۔ ماتھے پر سجدوں کی کثرت سے گھٹا پڑا ہوا، ستواں ناک، آنکھیں بڑی اور سیاہ اور ان میں عزم و ایقان کی چمک۔ ابوالحجاج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کی آنکھوں میں سُرمہ کے نشان بھی دیکھے ہیں۔ پتلیاں روشن، بھویں قوس نما، پلکیں لانبی، دانت سلکِ منظم کی طرح ضیا بار، ضرار ابن ضمرۂ کنانی کہتے ہیں: ان تبسم فعن مثل اللولوء المنظوم۔ "اگر مسکراتے تو دانت موتی کی لڑیوں کی طرح چمکتے"۔ گردن موٹی صراحی دار، سینہ چوڑا چکلا اور اس پر بال، بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئیں، شانے بھرے بھرے کلائیاں ٹھوس، کلائیوں اور بازوؤں میں جوڑ کا پتہ نہ چلتا تھا۔ دونوں کندھوں کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط ہتھیلیاں سخت، پنڈلیاں نہ لاغر اور نہ پُرگوشت، پیٹ کچھ نکلا ہوا۔ ریش مبارک گھنی اور عریض، سر اور داڑھی کے بال سفید۔ محمد ابن حنفیہ کہتے ہیں: اختضب علی بالحناء مرۃ ثم ترکہ۔ حضرت علی نے ایک دفعہ مہندی کا خضاب لگایا اور پھر چھوڑ دیا"۔ خود کے کثرتِ استعمال سے سر کے اگلے حصہ پر سے بال اُڑے ہوئے، قد میانہ سے کچھ نکلتا ہوا۔ حضرت خود فرماتے ہیں: خلقنی معتدلا اضرب القصیر فاقدہ واضرب الطویل فاقطہ۔ "اللہ تعالٰی نے مجھے قد و قامت میں اعتدال بخشا ہے۔ اگر میرا حریف پست قامت ہوتا ہے تو میں اس کے سر پر ضرب لگا کر اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں اور اگر دراز قامت ہوتا ہے تو بیچ سے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں"۔ آواز پر شکوہ، رفتار پیغمبر کی رفتار سے مشابہ پُروقار اور کچھ آگے کو جھکی ہوئی جب میدانِ جنگ میں دشمن کی طرف بڑھتے تو تیزی کے ساتھ چلتے اور آنکھوں میں سرخی دوڑ جاتی۔

ابن قتیبہ نے المعارف میں لکھا ہے کہ ایک عورت نے حضرت کو دیکھ کر کہا کانہ کسر ثم جبر۔ اس جملہ کے لفظی معنی یہ ہیں۔ "گویا توڑے گئے ہیں اور دوبارہ جوڑے گئے ہیں"۔ اس جملہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ آپ غیر متوازن اور بے ڈھنگے تھے۔ حالانکہ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ جس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔ چنانچہ سید محسن عاملی نے اعیان الشیعہ میں اور عمر ابوالنصر نے الزہرا میں ابن عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ یہ جملہ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کے بازو بھرے ہوئے اور نظریں زمین کے اندر گڑی ہوں

نہ اس شخص پر جس کا جسم بے جوڑ، بے ڈھنگا اور غیر متوازن ہو۔

اخلاق و عادات

امیرالمومنینؑ خندہ جبیں، شگفتہ مزاج، بے غرضی و اخلاص کا پیکر، غریبوں کے ہمدرد، یتیموں کے غمخوار اور اخلاقِ نبوی کا مکمل نمونہ تھے۔ اعلیٰ و ادنیٰ سے یکساں خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے، غلاموں سے عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے۔ مزدوروں کو بوجھ اٹھانے میں مدد دیتے۔ خود بینی و خود نمائی سے نفرت کرتے۔ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے۔ عام لوگوں کی طرح سادہ اور معمولی خوراک کھاتے اور انہی کی طرح عام اور معمولی لباس پہنتے۔ اکثر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ اپنی جوتیاں خود گانٹھتے، کپڑوں میں پیوند خود لگاتے اور بازار سے سودا سلف خود خرید کر لاتے۔ کھیتوں میں ایک مزدور کی طرح کام کرتے۔ اپنے ہاتھ سے چشمے کھودتے، درخت لگاتے اور ان کی آبیاری کرتے۔ مال سمیٹ کر رکھنے کے بجائے غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے۔ رنگ و نسل کا امتیاز اور طبقاتی تفریق گوارا نہ کرتے۔ حاجتمندوں کے کام آتے۔ مہمانوں کو بڑے احترام سے ٹھہراتے۔ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ پھراتے۔ بغض و کینہ اور انتقامی جذبات کو پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ حیرت انگیز حد تک عفو و درگذر سے کام لیتے۔ دینی معاملات میں سختی برتتے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے۔ حق و صداقت کے جادہ پر گامزن رہتے اور کسی کی رورعایت نہ کرتے۔ دشمن کے مقابلہ میں مکر و فریب اور داؤں پیچ سے کام نہ لیتے۔ رات کا بیشتر حصہ مناجات و نوافل میں گزارتے۔ صبح کے تعقیبات کے بعد قرآن و فقہ کی تعلیم دیتے۔ خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں رہتے۔ اور دعا و مناجات میں اتنا روتے کہ ریش مبارک تر ہو جاتی۔

ایک مرتبہ ضرار ابن ضمرہ ضبائی معاویہ کے ہاں آئے۔ معاویہ نے کہا کہ تمہیں تو علی کی صحبت میں رہنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے کچھ اُن کے متعلق بیان کرو۔ ضرار نے معذرت چاہی جب اصرار زیادہ ہوا تو کہا:۔

کان واللہ شدید القویٰ	خدا کی قسم ان کے ارادے بلند اور قویٰ مضبوط تھے
یقول فصلا و یحکم عدلا	فیصلہ کن بات کہتے اور عدل و انصاف کے ساتھ حکم کرتے۔
یتفجر العلم من جوانبہ	ان کے پہلوؤں سے علم کے سوتے پھوٹتے
وتنطق الحکمۃ من نواحیہ	اور کلام کے گوشوں سے حکمت و دانائی کے نغمے گونجتے تھے۔
ویستوحش من الدنیا	دنیا اور اس کی رونق و بہار سے وحشت

زهرتها ويستأنس بالليل و
وحشته و كان غزير العبرة
طويل الفكرة يعجبه من
اللباس ما قصر و من الطعام
ما خشن كان فينا كاحدنا
يجيبنا اذا سألناه وينبئنا
اذا استنبأناه و نحن والله
مع تقريبه ايانا وقربه لنا
لا نكاد نكلمه هيبةً له
يعظم اهل الدين ويقرب
المساكين لا يطمع القوى
فى باطله ولا ييئس الضعيف
من عدله واشهد انه لقد
رأيته فى بعض مواقفه وقد
ارخى الليل سدوله و غارت
نجومه قابضا على لحيته يتململ
تململ السليم ويبكى بكاء
الحزين ويقول يا دنيا غرى
غيرى الى تعرضت ام الى تشوقت
هيهات هيهات قد باينتك ثلاثا
لا رجعة فيها فعمرك قصير وخطرك
حقير آه من قلة الزاد وبعد
السفر ووحشة الطريق۔

(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۶۳)

کھاتے۔ رات اور اس کے سناٹوں سے جی بہلاتے۔
آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرتے اور فکر اور سوچ
میں ڈوبے رہتے لباس وہ پسند آتا جو مختصر ہوتا
اور کھانا وہ بھاتا جو روکھا پھیکا ہوتا۔ وہ ہم میں
ایک عام آدمی کی طرح رہتے سہتے۔ ہم کچھ پوچھتے
تو جواب دیتے اور کچھ دریافت کرتے تو بتاتے۔ خدا
کی قسم باوجود قرب کے ان کی ہیبت و جلال کے
سامنے ہمیں لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔
اہلِ دین کی تعظیم کرتے مسکینوں کو قرب کا شرف
بخشتے۔ طاقتور کو یہ توقع نہ ہوتی تھی کہ بے راہروی
میں ان کی ہمدردی حاصل کر سکے گا اور کمزور کو
ان کے انصاف سے مایوسی نہ ہوتی تھی۔ خدا شاہد
ہے میں نے بعض مقامات پر جب کہ رات کے پردے
آویزاں اور ستارے پنہاں ہوتے تھے انہیں دیکھا
کہ اپنی ریش مبارک کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے
اس طرح تڑپتے تھے جس طرح کوئی مارگزیدہ تڑپتا
ہے اور اس طرح روتے تھے جس طرح کوئی غم زدہ
روتا ہے۔ اور کہہ رہے تھے اے دنیا جا کسی اور کو
فریب دے کیا میرے سامنے اپنے کو لاتی ہے یا مجھ
پر فریفتہ ہو کر آئی ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے میں
تو تین بار تجھے طلاق دے چکا ہوں جس کے بعد
رجوع کی صورت نہیں۔ تیری عمر چند روزہ اور تیری
اہمیت بہت کم ہے۔ افسوس زادِ راہ تھوڑا، سفر
دور و دراز اور راستہ وحشت ناک ہے۔"

یہ وہ آوازِ حق تھی جو امیر شام ایسے دشمن کے دربار میں بلند ہوئی جہاں حکومت کے کاسہ لیس اور

دولت کے پرستار جمع تھے مگر کسی کی زبان تردید میں نہ کھل سکی بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ لوگ اس طرح دہاڑیں مارمار کر روئے کہ گلے میں پھندے پڑ گئے۔ اور معاویہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ یہ تھا حسن سیرت و حسن عمل کا کامقناطیسی اثر جس کے تذکرہ نے اغیار تک کے دل موم کر دیئے اور ہنستی کھیلتی محفل کا رنگ بدل دیا۔ امیرالمومنین ہیبت وصولت اور رحم و رأفت کے مزاج کا ایک دلکش پیکر اور پہاڑ کے مانند سخت اور اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح نرم تھے۔ حضرت کے ایک صحابی صعصعہ ابن صوحان عبدی کہتے ہیں:۔

کان فینا کاحدنا لین جانب وشدة تواضع و سھولة قیاد وکنا نھابہ مھابة الاسیر المربوط للسیاف الواقف علی راسہ۔ (مقدمہ شرح ابن ابی الحدید)	حضرت ہم میں ایک عام آدمی کی طرح رہتے سہتے، خوش خلقی، انتہائی انکسار اور نرم روی کے باوجود ہم ان کے سامنے اس طرح خائف و ترساں رہتے جس طرح وہ جکڑا ہوا قیدی جس کے سر پر جلاد تلوار لئے کھڑا ہو۔"

حضرت کے اسی دبدبہ و ہیبت اور جذبۂ محبت و عطوفت کو دیکھتے ہوئے ملا علی آذربائیجانی نے کیا خوب کہا ہے:۔

اسد اللہ اذا صال وصاح ابو الایتام اذا جاد وبر

دشمن کو للکارتے اور اس پر حملہ آور ہوتے تو اللہ کے شیر، اور بخشش و احسان کرتے تو یتیموں کے باپ نظر آتے۔"

پوشش و لباس

امیرالمومنین سیدھی سادی وضع کا عام اور کم قیمت لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس دور کا غریب اور متوسط طبقہ پہنتا تھا بلکہ بعض اوقات اس سطح سے بھی گر جاتا تھا۔ لباس سے صرف تن پوشی مطلوب تھی نہ نمود و نمائش۔ اس لئے اس میں کوئی امتیاز گوارا نہ کرتے اور نہ گرمی و سردی کے موسم کا لحاظ رکھتے۔ گرمیوں میں سردی کا اور سردیوں میں گرمی کا لباس پہن لیتے۔ ضرورت کے وقت کبھی چمڑے کا اور کبھی لیف خرما کا پیوند لگوا لیتے اور اس میں کوئی سبکی و عار محسوس نہ کرتے۔ ایک مرتبہ ایسا کرتا پہنے ہوئے تھے جس میں جابجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس پر نکتہ چینی کی تو فرمایا "ایسا لباس پہننے سے دل میں عجز و فروتنی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اہل ایمان مجھے اس لباس میں دیکھیں گے تو لباس کی سادگی میں میری پیروی کریں گے۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ آپ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کبھی نیا لباس نہیں پہنا۔ عام پوشش، تہہ بند، کرتہ اور چادر تھی۔ سر پر عمامہ زیادہ پسند کرتے اور فرماتے :۔

العمائم تیجان العرب۔ عمامہ عربوں کا تاج ہے۔

(سیرة ابن ہشام۔ ج ۲۔ ص ۲۹۶)

ذیل میں چند لوگوں کے بیان درج کئے جاتے ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں امیرالمومنینؑ کو دیکھا اور ان کے لباس کی نوعیت اور وضع قطع کا ذکر کیا :۔

جابر مولی جعفی کہتے ہیں کہ میں نے امیرالمومنین کے سر پر سیاہ رنگ کا عمامہ دیکھا اس کا ایک سرا سینہ پر پڑا تھا اور ایک سرا پشت پر لٹک رہا تھا۔

عمرو ابن مروان کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا۔ جس کا شملہ دونوں کاندھوں کے درمیان پشت پر پڑا تھا۔

یزید ابن حارث فزاری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ سر پہ ایک سفید مصری ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔

ابو حیان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کے سر پہ باریک کپڑے کی ٹوپی دیکھی ہے۔

ایوب ابن دینار کہتے ہیں کہ میرے والد کہا کرتے تھے کہ میں نے حضرت علیؑ کو دیکھا تھا آپ آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھے ہوئے اور ایک چادر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ اور ایک مرتبہ دیکھا کہ آپ نجران کی دھاری دار دو چادریں اوڑھے ہوئے تھے۔

ابجر ابن حرموز کہتے ہیں کہ میرے والد نے حضرت کو مسجد کوفہ سے باہر نکلتے دیکھا آپ تہبند باندھے ہوئے تھے جو نصف ساق تک تھا اور ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے۔

اس دور میں موسم گرما کا عموماً یہی لباس ہوتا تھا۔ چنانچہ غدیر خم کے موقع پر جب رسولِ خداؐ نے حضرت علی کو اپنے ہاتھوں پر بلند کیا تو روایت میں ہے کہ اتنا اونچا کیا کہ سفیدیٔ بغل ظاہر ہو گئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ پیغمبر اکرمؐ صرف چادر اوڑھے ہوئے تھے جو حضرت علیؑ کو اٹھاتے وقت سرک گئی اور سفیدیٔ بغل نمایاں ہو گئی۔

نوف بکالی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؑ کو دیکھا کہ آپ کے جسم مبارک پر ایک کرتہ تھا اور پیروں میں کھجور کی چھال کے جوتے تھے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کے پیروں میں ایک پھٹا پرانا جوتا دیکھا جسے اپنے ہاتھ

سے گانٹھ رہے تھے۔

عطا ابی محمد کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے جسم پر ڈھلے گاڑھے کا کرتہ دیکھا۔

خالد ابی اُمیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ کا تہبند گھٹنوں تک تھا۔

عبداللہ ابن ابی الہذیل کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے جسم پر گاڑھے کا لمبی آستینوں والا کرتہ دیکھا۔ اگر اس کی آستینیں چھوڑ دیتے تھے تو انگلیوں کے سروں کو مس کرتی تھیں۔

عبدالجبار ابن مغیرہ کہتے ہیں کہ مجھ سے اُم کثیرہ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ کا تہبند موٹے گاڑھے کا تھا جو نصف ساق تک اُونچا تھا، اور موٹے گاڑھے کا کرتہ پہنے اور ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے۔

ابوالعلاء مولی اسلم کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرتؑ نے ناف کے اُوپر سے تہبند باندھ رکھا ہے۔

ابو ملیکہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ آپ عبا، تہبند کی طرح باندھے ہوئے ہیں اور اس پر رسّی لپیٹ رکھی ہے۔

قدامہ ابن عتاب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ سفید اُونی کرتہ پہنے اور مقام قطر کی سرخ دھاریوں والی دو چادریں اوڑھے اور سر پر باریک کپڑے کا عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

ابو ظبیان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کو دیکھا کہ آپ زرد رنگ کا تہبند باندھے اور بیل بوٹے والی سیاہ کملی اوڑھے ہوئے تھے۔

زید ابن وہب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرتؑ گھر سے باہر نکلے اور ان کے تہبند میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔

محمد ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں :۔

ان علیا کان یتختم بالیمین۔ — حضرت علیؑ[1] داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔"

(کفایۃ الطالب ص۲۹۵)

---

[1] داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہننا مسنون و مستحب ہے۔ پیغمبر اکرمؐ داہنے ہاتھ ہی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ چنانچہ ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے :۔

ان رسول اللہ کان یتختم فی یمینہ۔ (جامع الاصول۔ ج ۴۔ ص ۷۶۴) — آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔"

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

انگوٹھی کا نگینہ کبھی یاقوت کبھی فیروزہ کبھی حدید چینی اور کبھی عقیق کا ہوتا تھا۔ اور نقش خاتم الملک للہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ للہ الملک تھا۔ دستِ مبارک میں تازیانہ یا دُرہ رکھتے تھے اور خطبہ دیتے وقت کمان یا تلوار پر ٹیک لگا لیتے تھے۔

طعام اور آدابِ طعام

پوشش و لباس کی طرح حضرت کا کھانا بھی روکھا پھیکا اور انتہائی سادہ ہوتا تھا۔ عموماً جَو کے اَن چھنے آٹے کی روٹی اور ستو پر قناعت کرتے۔ روٹی کے ساتھ نانخورش کے طور پر کبھی نمک ہوتا کبھی سرکہ کبھی ساگ پات اور کبھی کبھار دودھ، گوشت کا استعمال بہت کم کرتے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

کان یأتدم اذا ائتدم بخل او ملح فان ترقی من ذلک فبعض نبات الارض فان ارتفع عن ذلک فبقلیل من البان الابل ولا یاکل اللحم الا قلیلا و یقول لا تجعلوا

اگر روٹی کے ساتھ کوئی چیز استعمال کرتے تو وہ سرکہ ہوتا یا نمک۔ اس سے آگے بڑھتے تو کوئی سی سبزی۔ اور اس سے بھی آگے بڑھتے تو تھوڑا سا اونٹنی کا دودھ۔ اور گوشت بہت کم کھاتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اپنے شکموں کو حیوانوں کا گورستان

(بقیہ حاشیہ) حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

کان رسول اللہ یتختم فی یمینہ و قبض علیہ الصلوٰۃ والسلام والخاتم فی یمینہ۔ (مستطرف۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۵)

رسول اللہ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے اور جب دنیا سے رحلت فرمائی تو اس وقت بھی آپ کے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔

آنحضرتؐ کے بعد معاویہ نے اس طریقِ رسولؐ کو بدل دیا اور دائیں ہاتھ کی بجائے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کر دی۔ چنانچہ صاحب مستطرف نے تحریر کیا ہے:۔

ذکر السلامی ان رسول اللہ کان یتختم فی یمینہ والخلفاء بعدہ فنقلہ معاویۃ رضی اللہ عنہ الی الیسار واخذ الامویۃ بذلک۔ (مستطرف۔ ج ۲ صفحہ ۲۵)

سلامی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ اور ان کے بعد خلفاء دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے بائیں ہاتھ میں پہننا شروع کر دی۔ اور امویوں نے اسے اپنا شعار بنا لیا۔

بطونکم قبور الحیوان (مقدمہ شرح نہج البلاغہ) نہ بناؤ۔"

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امیرالمومنین مہمانوں کو گوشت اور روٹی کھانے کو دیتے اور خود جَو کی روٹی سرکہ یا روغن زیتون کے ساتھ کھاتے۔

حضرت روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور ستو ایک تھیلی میں بند رکھتے تھے اور اس پر مہر لگا دیتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ عراق ایسی سرزمین پر رہتے ہوئے ایسا کرتے ہیں جب کہ یہاں غلہ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ فرمایا کہ میں کمی کی بناء پر ایسا نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کہ:۔

لا احب ان یدخل بطنی الاما اعلم۔ (تاریخ کامل) — مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس چیز سے پیٹ بھروں جسے میں جانتا نہیں ہوں۔"

عمرو ابن حریث کہتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کے وقت مجھے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک مہر شدہ تھیلی آپ کے آگے رکھی ہے۔ آپ نے اس میں سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے نکالے اور انہیں پانی میں بھگو کر اور ان پر نمک چھڑک کر کھانے لگے۔ میں نے روٹی کے ٹکڑوں کو دیکھ کر فضہ سے کہا کہ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ گوندھنے سے پہلے آٹا چھان کر بھوسی الگ کر دیا کرو۔ فضہ نے کہا کہ میں نے ایک دفعہ آٹا چھانا تھا مگر حضرت نے آئندہ ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اور میں نے اس تھیلی میں سوکھے ٹکڑوں کے علاوہ کھانے کی کچھ اور چیزیں بھی رکھ دی تھیں۔ مگر حضرت نے اس پر مُہر لگا دی تاکہ اس میں کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر سکوں۔

عدی ابن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ دیکھا کہ حضرت کے آگے جَو کی روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور نمک رکھا ہے اور ایک چھاگل پانی سے بھری رکھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ دن کے اوقات میں مصروفِ جہاد اور راتوں کے لمحات میں مشغولِ عبادت رہتے ہیں اور پھر یہ کھانا کھاتے ہیں؟ حضرتؑ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ "نفس کو ریاضت کا خوگر بنانا چاہیئے تاکہ وہ طغیانی اور سرکشی پر نہ اتر آئے اور پھر یہ شعر پڑھا ؎

علل النفس بالقنوع والا طلبت منك فوق ما یکفیها

(مناقب ابن شہر آشوب)

" اپنے نفس کو قناعت کا خوگر بناؤ ورنہ وہ ضرورت سے زیادہ کا خواہشمند ہوگا۔"

سوید ابن غفلہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ آپ کے آگے ترش دہی کا ایک پیالہ رکھا ہے اور ہاتھ میں جَو کی ایک روٹی ہے جس پر جَو کے چھلکے جھلک رہے ہیں۔ آپ اس روٹی کو کبھی ہاتھ سے اور کبھی گھٹنے پر رکھ کر توڑتے تھے۔ اور ایک دفعہ عید کے موقع پر حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت

کے آگے دسترخوان بچھا ہے اور اس پر روٹی اور خطیفہ[1] رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ عید کے دن بھی ایسا کھانا کھاتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا: انما ھذا عید لمن غفرلہ۔ عید اس کی ہے جسے اللہ نے بخش دیا ہو۔"
حضرت ایک وقت میں کبھی دو قسم کے کھانے نہیں کھاتے تھے۔ اگر کسی موقع پر مختلف کھانے آپ کے سامنے رکھ دیئے جاتے تو ان کھانوں کو آپس میں ملا لیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر مختلف کھانے آپ کے سامنے جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کھانوں کو ایک دوسرے میں ملا کر ایک کھانا بنا لیا۔ ایک دفعہ آپ کے سامنے کھانا آیا جس میں گوشت تھا مگر اس میں روغن نہیں ڈالا گیا تھا۔ آپ سے کہا گیا کہ اگر فرمائیں تو اس میں روغن ڈال دیا جائے۔ فرمایا:۔

انا لا ناکل اداماین جمیعاً۔ ہم ایک وقت میں دو قسم کی چیزیں نہیں کھاتے۔"

(کفایۃ الطالب)

حضرتؑ نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور زندگی کے آخری ایام میں جب آپ کی دختر جناب ام کلثومؑ نے جَو کی روٹی کے ساتھ نمک اور دودھ رکھا تو آپ نے دودھ اٹھوا دیا اور نمک سے روٹی کھائی۔
آپ نے کمال تقویٰ اور تاسئ رسولؐ کی بنا پر ان چیزوں سے بھی ہمیشہ اجتناب برتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کھائی تھیں۔ چنانچہ عدی ابن ثابت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت کے سامنے فالودہ پیش کیا گیا تو آپ نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا:۔

شیئ لم یاکل منہ رسول اللہ لا احب ان اکل منہ۔ (ریاض النضرہ) جس چیز کو رسول اللہؐ نے نہ کھایا ہو اس کا کھانا مجھے پسند نہیں ہے۔"

حضرت نے اس انتہائی سادہ غذا اور ترکِ لذائذ کے ساتھ کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھایا۔ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے:۔

ما شبع من طعام قط آپ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔"

(مقدمہ شرح نہج البلاغہ)

امیر المومنین جہاں زندگی کے اور شعبوں میں اسوۂ رسولؐ کے پیرو تھے وہاں کھانے پینے میں بھی آدابِ نبویؐ کے پابند تھے۔ یہاں تک کہ دسترخوان پر نشست کی وضع، لقمہ اٹھانے کا طریقہ اور کھانے کا انداز بھی رسولِ خدا سے ملتا جلتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔

---

[1] عرب کا ایک کھانا ہے جو آٹے کو دودھ میں جوش دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ ۱۲

كان اميرالمومنين عليه السلام اشبه الناس طعمة برسول الله صلى الله عليه وآله۔ (صافی)	امیرالمومنین علیہ السلام کھانے کے معاملہ میں سب سے زیادہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہہ تھے۔"

دستر خوان پر بیٹھنے سے پہلے اور فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھوتے اور فرماتے کہ کھانے سے قبل اور بعد ہاتھ دھونے سے ہاتھوں کی چکناہٹ دور ہوتی ہے۔ اور آنکھوں میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ کھانے کے وقت گھٹنوں کے بل دو زانو بیٹھتے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو ناپسند کرتے۔ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے۔ اور فرماتے کہ اگر کسی کو کھانے کے وقت بسم اللہ یاد نہ آئے تو کھانے کے دوران جب یاد آئے پڑھے۔ کھانے کا آغاز نمک سے کرتے۔ کھانا گرم ہوتا تو اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرتے۔ کھانا پانچوں انگلیوں سے کھاتے اور ادھر اُدھر ہاتھ ڈالنے کی بجائے سامنے سے کھاتے اور ثرید (شوربے میں بھگوئے ہوئے روٹی کے ٹکڑے) کو درمیان سے نہ اٹھاتے بلکہ کناروں کی طرف سے کھاتے۔ مشروبات میں سادہ پانی خصوصاً بارش کا پانی پسند فرماتے اور فرماتے کہ بارش کے پانی سے امراض کا دفعیہ اور بدن کی تطہیر ہوتی ہے۔ دستر خوان پر سے روٹی کے ریزے پھینکنے کے بجائے چن کر کھا لیتے اور فرماتے کہ یہ باعث شفا ہے۔ لوٹے یا بدھنے کی ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی نہ پیتے اور نہ برتن کے ٹوٹے ہوئے کنارے کی طرف سے پیتے۔ کھانے پینے کی چیزوں پر پھونک مارنا پسند نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے خادم "مسلم" سے پینے کے لئے پانی طلب کیا۔ وہ پیالہ بھر کر پانی لایا۔ جب حضرت کے سامنے آیا تو اس نے تنکا وغیرہ ہٹانے کے لئے پھونک ماری۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پانی اب تم پیو اور میرے لئے دوسرا لاؤ۔

عہدِ طفولیت

انسان کی زندگی کے تین ادوار ہیں۔ بچپنا، جوانی اور بڑھاپا۔ ہر سن کے تقاضے جُدا اور ہر دور کے مشغلے مختلف ہوتے ہیں۔ بچپنا کھیل کود کا زمانہ ہے جس میں کھیل کے سوا کسی اور بات کا خیال نہیں ہوتا۔ اس دور میں نہ فہم ہی کامل ہوتا ہے اور نہ شعور ہی پختہ۔ اور بچوں کے مشاغل سے ان کے شعور کی ناپختگی کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ اچھے بُرے سے آنکھ بند کر کے جن کھیلوں میں اپنے ہمسنوں کو دیکھتے ہیں وہی کھیل کھیلتے اور انہی سے دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں۔

فرزند ابوطالب کی روش عام بچوں کی روش سے مختلف تھی۔ وہ نہ کبھی کھیل کود میں نظر آئے نہ لہو و

لعب میں دکھائی دیئے۔ اور ان تمام مشغلوں سے جو عام طور پر بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں کنارہ کش رہے۔ انہیں نہ اس سے غرض تھی کہ لہو کسے کہتے ہیں اور نہ اس سے مطلب تھا کہ لعب کیا ہے ان کے تیوروں سے ہمت و جرأت کے ولولے عیاں اور حرکات و سکنات سے عظمت و وقار کے آثار نمایاں تھے۔ اور کیا جسمانی اور کیا ذہنی دونوں اعتبار سے ان کا بچپنا دوسرے بچوں کے عہد طفولیت سے میل نہ کھاتا تھا۔ ان کی جسمانی نشوونما کی رفتار دوسروں سے تیز تر تھی۔ اور ایک دن میں اتنا بڑھتے جتنا دوسرے بچے ایک مہینہ میں۔ اس قوت نمو کی فراوانی کا اثر تھا کہ جسم مضبوط، فہم و ادراک قوی اور ظاہری و باطنی حواس تیز تھے، صاحب ارجح المطالب نے نجم الدین فخر الاسلام ابوبکر ابن محمد المرندی کی کتاب مناقب الاصحاب کے حوالہ سے حیدر کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ ابھی شیر خواری کے زمانہ میں تھے کہ ان کی والدہ انہیں گھر میں تنہا چھوڑ کر کسی کام کو باہر گئیں۔ یہ گھر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ اس پہاڑی سے ایک سانپ اترا اور آپ کے قریب پہنچ کر پھنکارنے لگا۔ آپ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑ لیا یہاں تک کہ وہ آپ کے ہاتھوں ہی میں مر گیا۔ جب آپ کی والدہ واپس آئیں تو علی کی گرفت میں مردہ سانپ دیکھ کر کہنے لگیں: حیاك الله یا حیدرہ "اے میرے شیر خدا تجھے زندہ رکھے" جب بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے، تو وزنی پتھروں کو بڑی آسانی سے اُٹھا لیتے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر سے اٹھا کر لے آتے اور بتوں کی توڑ پھوڑ میں لگے رہتے۔

عرب کے دستور تربیت کے مطابق حضرت ابو طالبؑ اپنے بچوں کو تیر اندازی، شہسواری اور کشتی لڑنے کا فن سکھاتے اور اپنے بیٹوں، بھتیجوں کو جمع کر کے انہیں بھڑاتے اور داؤ پیچ کی تعلیم دیتے۔ حضرت علیؑ اگرچہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ مگر کسی کی کاوزوری نہ چلنے دیتے۔ اور اپنے سے سن و سال میں بڑوں کو داؤں پر رکھ کر بچاڑ لیتے، شانے چت گراتے اور اچھے اچھے شہزوروں سے اپنی قوت و طاقت کا لوہا منوا لیتے یہ قوت خداداد ہی کا کرشمہ تھا کہ ان ابتدائی مشقوں سے لے کر بڑے سے بڑے معرکوں تک کسی سورما سے شکست سے زیر نہیں ہوئے۔ اور جس سے بھڑے اسے پچھاڑے بغیر نہ چھوڑا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے:۔

لم یصارع قط احد الا صرعه — جس سے کشتی لڑے اسے پچھاڑ کر چھوڑا۔

(المعارف۔ ص۹۱)

اس جسمانی قوت کے ساتھ ذہنی و شعوری ارتقاء کے لحاظ سے بھی بہت آگے تھے۔ بچپنے ہی میں حق و باطل میں امتیاز کا جوہر پیدا ہو گیا۔ پہلی ہی نظر میں معبود حقیقی کو پہچانا۔ بت پرستی کے مرکز میں رہتے ہوئے بتوں کو پرستش کے قابل نہ سمجھا۔ اور جبکہ لوگوں کو اعلان نبوت کے بعد بھی نبوت کے تسلیم کرنے میں تامل تھا آپ اعلان نبوت سے قبل مقام نبوت کو سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

اری نور الوحی والرسالۃ واشم ریح النبوۃ۔ (نہج البلاغہ)	میں وحی و رسالت کی روشنی دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔"

آپ کی نگاہِ بلند نے نورِ نبوت کو دیکھا اور قوتِ شامہ نے شمیمِ رسالت کو سونگھا ہی نہ تھا بلکہ آنحضرت کی بعثت کے قبل ان کے طریق کار کو اپنا دستور العمل بنا کر دوسروں کے لئے آئینہ عمل بن گئے تھے۔ غرض حضرت کا بچپن بھی اُن کی جوانی و پیری کی طرح عظمتوں کا کوہِ گراں تھا۔ اور ان کے اس دورِ صغیرسنی پر نظر کرنے کے بعد یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ عظیم انسان عظمت بکنار پیدا ہوتا ہے۔ اور اِدھر اُدھر سے مانگ تانگ کر عظمت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ عطیہ الٰہیہ ہے جو بقدرِ ظرف و بحدِ وسعت داماں نصیب ہوتا ہے۔"

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

تعلیم و تربیت

حضرت علی ابن ابی طالب کو تعلیم و تربیت کا جیسا گہوارہ نصیب ہوا وہ دنیا میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ انہوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں آنکھیں کھولیں۔ انہی کی پاکیزہ آغوش میں پرورش پائی اور بچپنے سے لے کر جوانی کا پورا زمانہ انہی کے ساتھ گزارا۔ انہی کے سرچشمۂ علم و ہدایت سے فیضیاب ہوئے اور انہی کی زبان چوس کر پھولے پھلے اور پروان چڑھے۔ چنانچہ جناب فاطمہ بنت اسد فرماتی ہیں:۔

لما ولد نہ سماہ صلی اللہ علیہ وسلم علیا وبصق فی فیہ ثم انہ القمہ لسانہ فما زال یمصہ حتی نام قالت فلما کان من الغد طلبنا لہ مرضعۃ فلم یقبل ثدی احد فدعونا لہ محمد افا لقمہ لسانہ فکان کذلک ماشاء اللہ تعالیٰ۔ (سیرۃ نبویہ دحلان ص۱۰)	جب علی پیدا ہوئے تو پیغمبرؐ نے ان کا نام علیؑ رکھا اور اپنا لعابِ دہن ان کے منہ میں ٹپکایا اور اپنی زبان اُن کے منہ میں دے دی۔ جسے چوستے چوستے سو گئے۔ جب دوسرا دن ہوا تو ہم نے دایہ تلاش کی مگر علیؑ نے کسی کی چھاتی کی طرف منہ نہ بڑھایا۔ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یاد کیا۔ آپ نے اپنی زبان علیؑ کے منہ میں دے دی اور وہ میٹھی نیند سو گئے" اور جب تک خدا نے چاہا ایسا ہی ہوتا رہا"۔

اگرچہ زمانۂ رضاعت میں آپ ماں ہی کی گود میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اس نومولود کی دیکھ بھال زیادہ تر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کرتے۔ اپنے ہاتھ سے نہلاتے دھلاتے۔ پھر ان گود میں لئے رہتے سوتے تو خود

جھولا جھلاتے۔ جاگتے تو لوری دیتے اور غیر معمولی محبت و گرم جوشی کا اظہار کرتے اور ماں باپ سے بڑھ کر نگرانی و تربیت میں حصہ لیتے۔ بلکہ چھ برس کے سن میں علی مستقل طور پر پیغمبرؐ کی تربیت و کفالت میں آگئے اور ماں باپ دونوں ان کی طرف سے کلیتہً بے فکر ہو گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر تربیت آنے کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ مکہ میں قحط پڑ گیا اور اس قحط سالی نے حضرت ابوطالب کی معاشی و اقتصادی حالت انتہائی کمزور کر دی اور ان کی محدود آمدنی سے وسیع کنبہ کی پرورش دشوار ہو گئی۔ آنحضرتؐ نے اپنے چچا کی ذمہ داریوں کو دیکھ کر محسوس کیا کہ انہیں ہمدردی و تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے چچا عباس سے کہا کہ ابوطالب عیالدار اور معاشی بحران میں گرفتار ہیں۔ وہ اپنی زبان سے تو کچھ کہیں گے نہیں اور نہ وہ تنگدستی کا شکوہ کرنے کے عادی ہیں۔ آپ کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے ہمیں مل جل کر ان کا ہاتھ بٹھانا چاہیئے۔ عباس نے اس سے اتفاق کیا اور دونوں مل کر ابوطالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپ اس قحط سالی میں کثرت عیال کی وجہ سے پریشان حال ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا بوجھ ہلکا کر دیں اور آپ کے بچوں کی پرورش کا بار اٹھالیں۔ ابوطالب نے کچھ پس و پیش کیا اور آخر بھائی اور بھتیجے کے اصرار پر کہا کہ عقیل کو میرے پاس رہنے دیجئے اور دوسرے بچوں کو اپنے ہاں لے جائیے۔ چنانچہ عباس نے طالب کی کفالت کا بار اٹھا لیا اور جعفر حضرت حمزہ کے حصہ میں آئے اور آنحضرتؐ نے علی کا انتخاب کر لیا جو روزِ ازل سے انہی کے لئے منتخب ہو چکے تھے۔

حضرت علیؑ کے لئے یہ خشک سالی بہار تازہ کا پیغام اور تنگ دستی ایک نعمتِ عظمیٰ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور قحط کے تھپیڑوں نے انہیں دامن رحمت کے سایہ اور مہبطِ وحی کی آغوش میں پہنچا دیا۔ ابن جریر طبری نے لکھا ہے:۔

كان من نعمة الله على علي ابن ابی طالب وما صنع الله واراد به من الخير ان قريشا اصابتهم ازمة شديدة۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۵۶)	علی ابنِ ابی طالب پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام تھا کہ قریش شدید قحط کی زد میں آگئے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے علی کے لئے جس بہتری اور بھلائی کا ارادہ کیا تھا اُسے پورا کیا۔"

یہ فطری امر ہے کہ بچوں کو ماں باپ سے علیحدگی گوارا نہیں ہوتی۔ مگر پیغمبرؐ کی محبت و شفقت نے علیؑ کو اس علیحدگی کا احساس نہ ہونے دیا انہوں نے پیغمبرؐ کی محبت بھری نظروں میں باپ کی نگاہِ محبت کو دیکھ لیا اور ان کے کنارِ عاطفت میں مسرتوں اور راحتوں کا خزانہ پا لیا۔ دنیا میں کون باپ اس طرح سے پالے پوسے گا جس طرح پیغمبرؐ نے پالا۔ انہیں اپنے ہاتھ سے کھلاتے پلاتے، اپنے قریب سلاتے۔ شب و روز نظروں

کے سامنے رکھتے اوران کی تمام ضروریات کا خود اہتمام کرتے۔ حضرت علی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش و تربیت کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

وضعنی فی حجرة وانا ولد یضمنی الی صدرہ ویکنفنی الی فراشه ویمسنی جسدہ ویشمنی عرفه وکان یمضغ الشیٔ ثم یلقمنیه۔ (نہج البلاغہ)

میں بچہ ہی تھا کہ رسول اللہ نے مجھے گود میں لے لیا تھا۔ اپنے سینہ سے چمٹائے رکھتے تھے۔ بستر میں اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے اور اپنے جسم مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے ۔ پہلے آپ کسی چیز کو چباتے پھر اس کے لقمے بنا کر میرے منہ میں دیتے تھے۔"

یہ تو تھی جسمانی تربیت۔ مگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو تمام عالم کے اخلاق کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے خلق ہوئے تھے کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ جسے وہ خصوصی طور پر آغوش تربیت میں لیں اس کی اخلاقی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی اٹھا رکھیں گے؟ جب کہ مربی ہونے کے اعتبار سے الگ اور معلم عالم ہونے کے اعتبار سے الگ ان پر اس کی دوہری ذمہ داری تھی کیا ان کی یہ کوشش نہ ہوگی کہ اسے اپنے حسن تربیت کا شہکار بنا کر پیش کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آنحضرتؐ نے علیؑ کی جسمانی پرورش و پرداخت کے ساتھ ان کی طبعی استعداد اور ہمہ گیر صلاحیت کا جائزہ لے کر ذہنی و فکری نشوونما اور علمی و اخلاقی تربیت میں بھی غیر معمولی توجہ و انہماک سے کام لیا۔ حضرت خود اس اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

کنت اتبعه اتباع الفصیل اثر امه یرفع لی فی کل یوم من اخلاقه علماً و یامرنی بالاقتداء به۔ (نہج البلاغہ)

میں رسول خدا کے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جس طرح اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے۔ آپ ہر روز میرے لئے اخلاق حسنہ کے پرچم بلند کرتے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے۔"

اس تعلیم و تربیت نے آپ کی شخصیت کی تعمیر اور سیرت کی تخلیق میں ایسا موثر کردار ادا کیا کہ آپ سیرت میں ، اخلاق میں اور علم و عمل میں پیغمبر اکرمؐ کا کامل ترین نمونہ اور ان کے اوصاف و کمالات کے مظہر اتم قرار پائے۔ ان کی سیرت میں سیرت نبویؐ کی جھلک اور ان کے اخلاق میں اخلاق نبویؐ کا پرتو نظر آتا تھا۔ اور ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ ان کے لوح دل پر کسی سیرت کا نقش اُبھرا تو وہ سیرت رسولؐ تھی اور صفحۂ قلب پر کسی کے حسن ماحول کی چھوٹ پڑی تو وہ پیغمبرؐ کا عمل و کردار تھا۔ غرض قدرت کے فیضان اور ایک قدسی ماحول کے اثرات و عوامل نے آپ کو غیر معمولی صفات و کمالات سے آراستہ کر دیا۔ جب تربیت رسولؐ ایسے

نباض فطرت و معلم عالم انسانیت کی ہو اور اثر پذیر طبیعت علی ایسے نابغہ وفطین کی ہو تو علم و حکمت کا کون سا نقش دل ودماغ پر اُبھرا نہ ہو گا اور حقیقت و عرفان کا کون سا گوشہ نگاہوں سے مخفی رہا ہو گا۔

گوہر پاک بباید کہ شود قابلِ فیض　　ورنہ ہر سنگ و گلے لولو و مرجاں نشود

امیرالمؤمنینؑ نے اس علمی تربیت کو ایک موقع پر اس طرح بیان فرمایا: ھٰذا ما زقنی رسول اللّٰہ زقا زقا۔ "میرے سینہ میں وہ علم ہے جو رسولؐ اللہ نے مجھے اس طرح بھرایا تھا جس طرح پرندہ اپنے بچہ کو دانہ بھراتا ہے۔" حضرت کی یہ بیان کردہ تشبیہ اپنے اندر یہ معنویت و لطافت لئے ہوئے ہے کہ جس طرح پرندہ اپنے پوٹے میں جمع کی ہوئی غذا جوں کی توں اپنے بچے کے منہ میں منتقل کرتا ہے۔ اسی طرح پیمبر نے وہ تمام علوم، وہ شریعت کے ہوں یا حکمت کے۔ قرآن کے ہوں یا سنت کے، اخلاق کے ہوں یا سیاست کے، ظاہر کے ہوں یا باطن کے، حاضر کے ہوں یا غیب کے۔ جوں کے توں ان کے سینہ میں منتقل کر دیئے اور ان میں کوئی تغیر و تبدل اور ردو بدل نہیں ہوا۔ اس تربیت علمی کی تکمیل کے بعد اعلم امتی کی سند دی اور انا مدینۃ العلم و علی بابھا "میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں" کا تمغا جبینِ امامت پر آویزاں کیا اور اس طرح اپنے علم تک پہنچنے کا ذریعہ بتایا۔ یعنی جس طرح شہر میں داخل ہونے کا ذریعہ دروازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح میرے علم تک رسائی کا ذریعہ علی ہیں۔ علیؑ وہ ہیں جن کا شجرۂ علم، علم نبوت سے بلاواسطہ ملتا ہے اور علم نبوت کا شجرہ علم خدا سے براہِ راست ملتا ہے۔ لہٰذا جو اس در سے بے خبر ہو گا وہ خدا و رسولؐ کی تعلیمات سے بے خبر رہے گا۔ فردوسی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:-

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی　　خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیّم در است　　درست ایں سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کایں سخن رازِ اوست　　تو گوئی دو گوشم بر آوازِ اوست

اولیّتِ اسلام

اسلام وہ ضابطہ حیات ہے جو انسانی فطرت اور مزاج کائنات کی طرف سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہے اور زندگی کے کسی موڑ پر فطری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ جو فطرت کے تقاضے ہیں وہی اسلام کے تقاضے ہیں۔ دونوں کا نصب العین ایک اور دونوں کی راہ و منزل ایک ہے۔ اسی لئے قرآن میں دین کو "اسلام" بھی کہا گیا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامِ۔ "دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے" اور فطرۃ سے بھی

تعبیر کیا گیا ہے :-

فاقم وجھک للدین حنیفاً فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔

"ہر چیز سے منہ موڑ کر دین کی طرف رُخ کر لو۔ یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا ہے"

پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے :-

کل مولود یولد علی الفطرۃ (وافی)

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق سے پوچھا گیا کہ فطرت کیا ہے؟ فرمایا ھی الاسلام "فطرت اسلام ہی تو ہے" جب اسلام عین فطرت اور فطرت عین اسلام ہے تو فطرت پر پیدا ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر بچہ وہ مسلمان کے گھر پیدا ہو یا کافر کے ہاں۔ پرستار توحید کے ہاں جنم لے یا کسی مشرک کے ہاں۔ سرزمین اسلام میں پیدا ہو یا سرزمین کفر میں اصل خلقت و فطرت کے لحاظ سے مسلم ہوگا۔ اور جب تک اس پر غیر مسلم ماں باپ کے عقائد و نظریات کا سایہ نہیں پڑتا وہ مسلم ہی رہتا ہے۔ اور جب کافر ماں باپ اور غیر مسلم معاشرہ کے افکار و آراء اور غیر اسلامی نظریات اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں تو وہ ان سے متاثر ہو کر وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو اس معاشرہ و ماحول سے سازگار ہوتا ہے اور شاہراہِ فطرت سے بے راہ ہو کر ماں باپ کی راہ پر چل پڑتا ہے اور انہی کا دین و مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ اور اگر کسی بچے کو فطرت سے سازگار ماحول مل جائے تو فطرتِ اسلام پر پیدا ہونے کے بعد اسی دینِ فطرت پر باقی سمجھا جائے گا۔ اور باطناً اور ظاہراً محکوم بالاسلام ہوگا۔

حضرت علیؑ دینِ فطرت پر پیدا ہوئے اور ایسے ماحول میں تربیت پائی جو پوری طرح فطرت سے ہم آہنگ تھا۔ حضرت خود فرماتے ہیں :-

ولدت علی الفطرۃ وسبقت الی الایمان والھجرۃ۔ (نہج البلاغہ)

"میں دینِ فطرت پر پیدا ہوا اور ایمان و ہجرت میں سبقت لے گیا"

آپ اوائل عمر سے پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ رہے، انہی کی آغوش میں پرورش پائی اور انہی کے عقائد و نظریات پر اپنے عقائد و نظریات کی بنیاد رکھی اور کبھی کفر و شرک سے واسطہ ہی نہیں رہا۔ چنانچہ احمد ابن زینی دحلان نے لکھا ہے :-

لم یتقدم من علی رضی اللہ عنہ شرک ابداً لانہ کان مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کفالتہ کاحد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کبھی شرک سے سابقہ نہیں پڑا۔ کیونکہ وہ رسولِ خدا کی تربیت و کفالت میں مثل ان کی اولاد کے رہے۔ اور تمام امور میں انہی کی

اولاده وتبعه فی جمیع اموره۔	پیروی کرتے تھے۔"

(سیرت نبویہ ص۱۴۱)

لہذا جس کی ولادت اسلام پر اور تربیت بانیٔ اسلام کے زیرِ سایہ ہو اور تمام افعال و اعمال میں نبیؐ کا تابع رہا ہو اسے قانونِ فطرت و حکم تربیت کی رُو سے ایک لمحہ کے لئے بھی کافر و مشرک تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ان کے بارے میں اس سوال کی کوئی گنجائش ہے کہ وہ کب اسلام لائے اور کس عمر میں مسلمان ہوئے۔ ایک دفعہ سعید ابن مسیب نے امام زین العابدینؑ سے پوچھا کہ حضرت کس عمر میں ایمان لائے تھے آپ نے فرمایا:۔

او کان کافرا قط انما کان لعلی	کیا وہ کبھی کافر بھی رہے ہیں (جو یہ پوچھتے ہو)
حیث بعث اللہ تعالیٰ رسولہ	البتہ جب اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ والہ وسلم عشر سنین	علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو ان کی عمر دس
ولم یکن یومئذ کافرا۔ (وافی)	برس کی تھی اور وہ اس وقت کافر نہ تھے۔"

یہ سوال تو ان لوگوں کے بارے میں ہو سکتا ہے جو کافر و مشرک رہے ہوں اور پھر کفر و شرک کے دائرے سے نکل کر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ہوں نہ اس کے بارے میں جو کفر سے کبھی آشنا ہی نہ ہوا ہو۔ حضرت علیؑ کو اگر سابق الاسلام اور اول مسلم کہا جاتا ہے تو اس اعتبار سے کہ انہوں نے پیغمبرؐ کے مبعوث برسالت ہونے کے بعد سب سے پہلے اقرار نبوت و تصدیق رسالت کرتے ہوئے اظہارِ اسلام کیا ورنہ دعوت اسلام کے موقع پر علیؑ اسی مذہب و ملت پر تھے جس مذہب و ملت پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل بعثت تھے۔

آنحضرتؐ نے مبعوث برسالت ہونے کے بعد دعوت و تبلیغ کا آغاز گھر کے افراد ہی سے کیا تھا۔ اور گھر والوں سے زیادہ کسی کی اخلاقی پاکیزگی و راست بیانی کو دوسرا نہیں جان سکتا۔ چنانچہ ابھی اسلام کی آواز گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلی تھی کہ جناب خدیجۃ الکبریٰ اور علی مرتضیٰ جو اس ساعتِ ہمایوں فال کے منتظر تھے فوراً اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ انہیں نہ پیغمبر کی صداقت میں شبہ ہوا اور نہ اس دعویٰ پر حیرت و استعجاب۔ یہی وہ دو ہستیاں تھیں جو سب سے زیادہ پیغمبرؐ سے قریب اور اسلام میں سابق تھیں۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:۔

لم یجمع بیت واحد یومئذ	اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ اور (ام
فی الاسلام غیر رسول اللہ صلی	المومنین) خدیجہ کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چار

اللہ علیہ والہ وخدیجۃ وانا ثالثھما۔ (نہج البلاغہ)	دیواری میں اسلام نہ تھا۔ البتہ تیسرا اُن میں مَیں تھا۔"

اس سبقت ایمانی کے ساتھ نماز میں اولیت کا شرف بھی انہی دونوں کے لئے مخصوص ہے اور بعثت کے ایک عرصہ بعد تک ان دو کے علاوہ صفِ ماموین میں کوئی اور نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اسمٰعیل ابن ایاس کہتے ہیں کہ میرے دادا عفیف بیان کرتے تھے کہ میں بسلسلۂ تجارت مکہ آیا جایا کرتا تھا اور عباس ابن عبدالمطلب کے ہاں مہمان ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے خانہ کعبہ کے پاس ایک وجیہہ صورت جوان کو دیکھا اس نے پہلے سورج کی طرف نگاہ کی اور پھر خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرکے اللہ اکبر کہا۔ اتنے میں ایک بچہ آیا اور اس کی داہنی جانب کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک خاتون آئی اور اُن دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس نوجوان نے رکوع کیا تو اس کے ساتھ اس بچے اور خاتون نے بھی رکوع کیا۔ اُس نے سر اٹھایا تو ان دونوں نے بھی سر اُٹھا لیا۔ پھر اس نے سجدہ کیا، اس کے ساتھ ان دونوں نے بھی سجدہ کیا۔ میں اس پُرعظمت طریق عبادت سے متاثر ہوا اور عباس سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا یہ جوان میرا بھتیجا محمد ابن عبداللہ اور یہ بچہ میرا بھتیجا علی ابن ابی طالب ہے اور یہ خاتون محمدؐ کی بیوی خدیجہ بنت خویلد ہے۔ اور محمدؐ نے مجھ سے بیان کیا کہ اللہ تعالےٰ نے اسے اس طریق پر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے:۔

وایم اللہ ما اعلم علی ظھر الارض کلھا احد علی ھذا الدین غیر ھولاء الثلثہ۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۵۹)	خدا کی قسم مجھے علم نہیں ہے کہ تمام روئے زمین پر ان تین کے علاوہ کوئی اور بھی اس دین پر ہو۔"

عفیف جب مسلمان ہو گئے تو بڑی حسرت سے کہتے تھے:۔

لیتنی کنت اٰمنت یومئذ فکنت ثالثا۔ (طبری۔ ج ۲۔ ص ۶۵)	کاش میں اس دن ایمان لے آتا تو ایمان لانے والوں میں تیسرا ہوتا۔"

عفیف نے یہ منظر اس وقت دیکھا تھا جب کہ مصلائے زمین کے اوپر اور محراب فلک کے نیچے ان تین کے سوا کوئی اور خدا کی عبادت کرنے والا نہ تھا اور ہمیشہ ان کے دل میں یہ حسرت رہی کہ اگر توفیق رہنمائی کرتی اور اس دن ایمان لے آتے تو ایمان لانے والوں کی صف اوّل میں ہوتے اور علیؑ اور خدیجہؑ کے بعد ان کا نام آتا۔ اگر اس دور میں کوئی اور بھی اسلام لایا ہوتا تو وہ اس کا بھی تذکرہ کرتے، اور عباس بھی ان تین کے علاوہ دوسروں سے دین کی نفی نہ کرتے۔ امیرالمومنینؑ کی سبقتِ ایمانی کا قریب قریب ہر مورخ نے ذکر کیا ہے چنانچہ ابن ہشام تحریر کرتے ہیں:۔

كان اول ذكر من الناس امن برسول الله وصلى معه وصدق بما جاءه من الله تعالىٰ على ابن ابى طالب ابن عبد المطلب ابن هاشم رضوان الله وسلامه عليه وهو يومئذ ابن عشر سنين۔ (سیرت ابن ہشام۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۶۳)

مردوں میں جو سب سے پہلے رسولؐ اللہ پر ایمان لایا اور ان کے ساتھ نمازوں میں شریک ہُوا اور جو کچھ اللہ کی طرف سے رسولؐ لے کر آئے اس کی تصدیق کی وُہ علی ابن ابی طالب سلام اللہ علیہ تھے۔ اور اس وقت آپ کی عمر مبارک دس سال تھی۔"

اس سلسلہ میں پیغمبرؐ اکرم اور صحابہ کبار کی چند شہادتیں بھی درج کی جاتی ہیں تاکہ حضرت کا سابق الاسلام ہونا روز روشن کی طرح واضح و عیاں ہو جائے اور اس میں کسی شک و شبہ اور چون وچرا کی گنجائش نہ رہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کا ارشاد ہے:۔

اولكم اسلاما على ابن ابى طالبؑ۔ (الاستیعاب۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۵۷)

"تم لوگوں میں اوّل مسلم علی ابن ابی طالب ہیں۔"

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

انا اول من اسلم مع النبیؐ۔ (تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۴۔ صفحہ ۲۳۳)

"سب سے پہلے میں نے نبی اکرم کی آواز پر اسلام قبول کیا۔"

عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں:۔

اول من اسلم على ابن ابى طالب۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۵۸)

"سب سے پہلے علی ابن ابی طالب اسلام لائے۔"

سلمان فارسی کہتے ہیں:۔

اول هذه الامة ورودا على نبيها الحوض اولها اسلاما على ابن ابى طالب۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۵۷)

"اس امت میں سب سے پہلے پیغمبر کے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہونے والے اور سب سے پہلے اسلام لانے والے علی ابنِ ابی طالب ہیں۔"

ابوذر غفاری کہتے ہیں:۔

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لعلى انت اول من

میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو علی سے یہ کہتے سُنا۔ "تم سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائے

امن بی وصدق۔ (ریاض النضرہ۔ ج ۲ صفحہ ۱۵۸) — اور میری تصدیق کی۔"

ابو ایوب انصاری کہتے ہیں:۔

اوّل الناس اسلاماً علی ابن ابی طالب۔ (شرح التقریب۔ ج ۱ صفحہ ۵۹) — رسولِ خدا پر سب سے پہلے ایمان لانے والے علی ابنِ ابی طالبؑ تھے۔"

زید ابن ارقم کہتے ہیں:۔

اوّل من اسلم مع رسول اللہ علی ابن ابی طالب۔ (مسند احمد۔ ج ۴۔ صفحہ ۳۶۸) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والے علی ابن ابی طالب تھے۔"

اس اسلامی سبقت کے ساتھ نماز میں تقدم کا شرف بھی انہی کے لئے مخصوص ہے۔ اور تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اوائل زمانہ بعثت میں جناب خدیجہ اور حضرت علی کے علاوہ کوئی اور بھی پیغمبر کے ساتھ شریک نماز ہوا ہو۔ اگر اس دور میں کوئی اور بھی اسلام لایا ہوتا تو کبھی نہ کبھی تو نماز میں شریک ہوتا جب کہ نماز اسلام کی علامت اور اس کا عملی اعتراف ہے۔ بلکہ سات برس تک ان دو کے علاوہ اور کوئی صفِ نماز میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ حضرت علیؑ کا قول ہے:۔

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل الناس بسبع سنین۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۷) — میں نے دوسرے لوگوں سے سات برس پیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں۔"

اس تقدم و اولیت کے مزید ثبوت کے لئے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں:۔

انس ابن مالک کہتے ہیں:۔

بعث رسول اللہ یوم الاثنین و صلی علی یوم الثلاثاء۔ (ترمذی۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۴) — پیر کے دن پیغمبر اکرم مبعوث ہوئے اور منگل کے دن علیؑ نے نماز پڑھی۔"

بریدہ اسلمی کہتے ہیں:۔

اوحی الی رسول اللہ یوم الاثنین و صلی علی یوم الثلاثاء۔ (مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۱۲) — دوشنبہ کے دن رسول اللہ پر وحی نازل ہوئی اور سہ شنبہ کے دن علیؑ نے نماز ادا کی۔"

جابر ابن عبداللہ انصاریؓ کہتے ہیں:۔

بعث النبیؐ یوم الاثنین و صلی علیؑ یوم الثلاثاء۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۲) — دوشنبہ کے دن پیغمبر مبعوث برسالت ہوئے۔ اور سہ شنبہ کے دن علیؑ نے نماز پڑھی۔"

مجاہد کا قول ہے :۔

اول من صلی علیؑ وھو ابن عشر سنین۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۳۔ ص ۲۱)	سب سے پہلے علیؑ نے نماز پڑھی اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی۔"

ان شواہد کے بعد حضرت کی سبقت و اولیت میں کسی شک وشبہ اور اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیئے تھی۔ مگر کچھ لوگوں نے سن وسال کے اختلافات اور دوسرے اعتبارات سے سبقت کو تقسیم کرکے دوسروں کے لئے بھی سبقت کی گنجائش پیدا کرنے اور ایک مسلمہ حقیقت کو اختلافی مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ مردوں میں حضرت ابوبکر، عورتوں میں حضرت خدیجہ، بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں زید ابن حارثہ سب سے پہلے اسلام لائے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گروہ میں سابق ہے۔ اس تفصیل سے سابقیت کے خدوخال نکھرنے کے بجائے اور دھندلا کر رہ گئے ہیں۔ اور اس نظریہ سے مسئلہ صاف نہ ہو سکا کہ واقع میں کون سابق الاسلام تھا۔ اس تقسیم کا مقصد تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کی سابقیت و اولیت کو مشکوک بنا کر کسی اور کو سابق الاسلام یا کم از کم سبقت میں شریک ثابت کیا جائے مگر یہ نظریہ خود دعوے کی کمزوری کا آئینہ دار اور دلیل سے تہی دامنی کا غماز ہے اس لئے کہ اگر کسی اور کی اولیت وسابقیت مسلم ہوتی تو اس پر دعویٰ اجماع کیا جاتا، دلائل پیش کئے جاتے اور بلحاظ سن وسال سبقت کو تقسیم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جاتی۔ اور پھر یہ صرف ایک مزعومہ ہی تو ہے جس کا نہ کوئی ماخذ ہے اور نہ اس کی تائید اس دور کے کسی شخص کے قول سے ہوتی ہے۔ بلکہ جن جن لوگوں نے حضرت کی سبقتِ اسلامی کا تذکرہ کیا ہے بلا قیدو بلا استثنار کیا ہے اور علی الاطلاق انہیں مسلم اوّل مانا ہے۔ اور یوں بھی علیؑ کو بچوں میں سابق الاسلام قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہوتے جب کہ اس دور میں اس کی نشاندہی کی جا سکتی کہ وہ بچے کون تھے اور کن کے تھے جو اسلام لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب بڑے اسلام نہ لائے تو بچوں نے کہاں اسلام لانا تھا۔ لہذا جب کوئی بچہ اسلام لایا ہی نہ تھا تو وہ بچے آئیں گے کہاں سے جن پر علی کو سابق قرار دیا جا رہا ہے۔ اور بغیر مسبوق کے کسی کو سابق کہنا بے معنی سی بات ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابوبکر بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرت علی سے بھی پہلے اسلام لا چکے تھے۔ اس لئے کہ انہیں بالغ مردوں میں سابق قرار دیا گیا ہے اور حضرت علی بالغ مردوں کی صف میں آتے ہی نہیں ہیں۔ وہ بالاتفاق سن بلوغت سے پہلے اسلام لائے اور ایک نابالغ بچے کا حضرت ابوبکر سے پہلے اسلام لانا اس خود ساختہ نظریہ سے کہ حضرت ابوبکر بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ متصادم ومتعارض نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نظریہ کی رُو سے یہ امر محل نزاع نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی سابق الاسلام تھے یا حضرت ابوبکر۔ البتہ یہ امر محل

نزاع ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے یا بالغ مردوں میں سے کوئی اور بھی ان سے پہلے اسلام لا چکا تھا۔ لیکن تاریخ تو اسے بھی تسلیم نہیں کرتی کہ وہ بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے بلکہ ایک کثیر جماعت ان سے پہلے اسلام لا چکی تھی۔ چنانچہ محمد ابن سعد کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سعد ابن ابی وقاص سے دریافت کیا:۔

اکان ابو بکر اولکم اسلاما فقال لا ولقد اسلم قبلہ اکثر من خمسین۔	کیا آپ لوگوں میں اسلام کے لحاظ سے سابق ابو بکر تھے؟ کہا نہیں۔ بلکہ پچاس سے زیادہ آدمی اُن سے پہلے اسلام لا چکے تھے"
(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صفحہ ۶۰)	

سعد ابن ابی وقاص کبار صحابہ اور عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتے ہیں اور صحابی کے قول کے مقابلہ میں کسی تبع تابعی یا تابعی کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیا جاتا۔ تو پھر یہاں ایک صحابی کے قول کے مقابلہ میں کسی کی قیاس آرائی کیونکر سند سمجھی جا سکتی ہے اور اس نظریئے کو کیا اہمیت دی جا سکتی ہے۔ حضرت ابو بکر کے سابق الاسلام ہونے کا سوال اس وجہ سے بھی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ بعثتِ رسولؐ کے موقع پر مکہ میں موجود ہی نہ تھے بلکہ یمن میں تھے اور وہاں سے وارد مکہ ہونے کے بعد انہیں بعثتِ رسولؐ کی خبر ملی جب کہ پیغمبرؐ کے دعوائے نبوت کی خبر عام طور پر پھیل چکی تھی۔ چنانچہ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

قال ابو بکر فقدمت مکۃ وقد بعث النبیؐ فجاء نی عقبہ ابن ابی معیط وشیبہ وربیعۃ وابو جہل وابو البختری وصنادید قریش فقلت لہم ھل نابتکم نائبۃ او ظھر فیکم امر قالو ایا ابا بکر اعظم الخطب یتیم ابی طالب یزعم انہ نبی مرسل۔	ابو بکر کہتے ہیں کہ جب میں مکہ میں واپس آیا اسوقت نبی اکرمؐ مبعوث برسالت ہو چکے تھے۔ عقبہ ابن معیط، شیبہ، ربیعہ، ابو جہل اور ابو البختری اور سرداران قریش میرے پاس آئے۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کیا تم پر کوئی افتاد پڑی ہے یا کوئی حادثہ رونما ہوا ہے؟ انہوں نے کہا اے ابو بکر! سب سے بڑی اندوہناک خبر یہ ہے کہ یتیم عبداللہ یہ گمان کرنے لگا ہے کہ وہ اللہ کا فرستادہ نبیؐ ہے"
(اسد الغابہ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۰۶)	

لہٰذا جب وہ بعثت کے موقع پر مکہ میں موجود ہی نہ تھے تو پھر ان کا اسلام علیؑ کے اسلام سے کیونکر سابق ہو سکتا ہے جب کہ اقوالِ صحابہ سے یہ ثابت ہے اور جس سے کسی مورخ کو انکار نہیں ہے کہ حضرت علیؑ بعثت کے دوسرے دن پیغمبرؐ کے ساتھ شریک نماز ہوئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بعثت رسولؐ کے دن یا کم از کم بعثتِ رسولؐ کے دوسرے دن ایمان لے آئے تھے۔

ان واقعات و شواہد کو سامنے رکھنے کے بعد امیر المومنینؑ کی سبقتِ ایمانی کا اعتراف ناگزیر ہے۔ اگر اس سے انکار کی گنجائش ہوتی تو نہ بلوغ و عدم بلوغ کا شاخسانہ کھڑا کیا جاتا اور نہ اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی جاتی۔ چنانچہ کچھ متعصب و تنگ نظر افراد کو حضرت کی سبقت اسلامی سے انکار کی گنجائش نظر نہ آئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سبقت کا پلہ سبک کرنا چاہا کہ علی صغیر السن اور نابالغ تھے۔ انہوں صرف اپنے مربی کے زیر اثر اسلام قبول کیا اس میں اگر سبقت ہو بھی تو یہ باعثِ امتیاز و فضیلت نہیں ہو سکتی کیونکہ صغر سنی کا اسلام علم و تحقیق پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ بزرگوں کی پیروی و تقلید کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے بعد بلوغ اسلام قبول کیا ان کا اسلام تحقیق اور حقیقت رسی پر مبنی تھا۔ اور تقلیدی اسلام سے تحقیقی اسلام کا درجہ بلند تر ہے۔ لہٰذا اس دور کے مسلمانوں کا اسلام اگرچہ علیؑ کے اسلام سے متاخر تھا مگر تحقیق کی بناء پر علیؑ کے اسلام سے زیادہ مستحکم و بلند پایہ تھا۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ بلوغ کا لحاظ ہوتا ہے تو احکام شرعیہ میں اور ایمان کا تعلق امور عقلیہ سے ہے جس میں عقل و شعور بلوغ ہی سے وابستہ نہیں ہے اور نہ عدم بلوغ کمال شعور و خرد کے منافی ہے۔ چنانچہ کبھی نابالغ، بالغ مردوں سے زیادہ با فہم و باشعور ثابت ہوتا ہے۔ اسی کمال فہم و شعور کی بناء پر حضرت یحییٰ کے بارے میں ارشاد باری ہے: و آتیناہ الحکم صبیاً۔ ابھی وہ بچے ہی تھے کہ ہم نے انہیں حکم و فہم سلیم عطا کیا۔" اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے گہوارے کے اندر سے کہا: انی عبد اللہ آتانی الکتاب و جعلنی نبیا۔" میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔" یہاں شعور اپنے عروج پر نظر آتا ہے حالانکہ بلوغ کی منزل ابھی دور تھی۔ امیر المومنین اگرچہ سن کے لحاظ سے نابالغ تھے مگر عقل و شعور کا جوہر اسی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے صغر سنی میں اللہ کے علاوہ نہ کسی کو اپنا معبود بنایا اور نہ کسی بت کے آگے سرنگوں ہوئے۔ علامہ سیوطیؒ نے تحریر کیا ہے:۔ لم یعبد الاوثان قط لصغرہ۔ (تاریخ الخلفاء ص۱۱۴) علیؑ نے بچپن میں کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔" حالانکہ اس وقت بالغ و سن رسیدہ افراد اپنی بے شعوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے شعور پتھروں کو اپنا دیوتا سمجھتے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ اگر بلوغ کے ساتھ ان میں عقل و شعور بھی ہوتا تو وہ نہ ترشے ہوئے پتھروں کی پرستش کرتے اور نہ بے جان بتوں سے حاجت طلبی کرتے۔ اس لئے کہ یہ چیز کسی صورت میں عقل و شعور کے تقاضوں سے سازگار نہیں ہے۔

یہ پھر بھی ایک حد تھی کہ بچپن کے ایمان کو بلوغ کے ایمان کے مقابلہ میں پست ثابت کرنا چاہا ہے۔ مگر ابو عثمان جاحظ اور ابن تیمیہ اور ان کے ہم مسلک افراد نے تو صغر سنی کی بناء پر حضرت کے ایمان کو پایۂ اعتبار ہی سے گرا دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ عدم بلوغ کی بناء پر انہیں حکم اسلام کا مورد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

یعنی وہ اسلام لانے کے باوجود غیر مسلم ہی رہے۔ یہ عقیدہ اسی کا ہو سکتا ہے جو نواصب کے عقیدہ کا ہمنوا ہو۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا اُن کا خیال ہے تو کیا پیغمبر اکرمؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تھی یا وہ از خود ایمان لائے۔ اگر از خود اسلام لائے تو انہیں کیونکر یہ معلوم ہوا کہ پیغمبر کی آواز پر لبیک کہنا ضروری اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اگر پیغمبر اکرمؐ نے انہیں دعوت اسلام دی تو اگر ان کا اسلام قابل قبول ہی نہ تھا تو انہیں دعوت کیوں دی اور ان کے اسلام کو کیوں قبول فرمایا۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ نے ان کے اسلام کو صحیح سمجھتے ہوئے دعوتِ اسلام دی ہوگی۔ اور اگر ایمان کے لئے بلوغ کی شرط ہوتی تو پیغمبرؐ کبھی انہیں دعوتِ اسلام نہ دیتے جب کہ وہ اسلام قابلِ اعتبار نہ تھا۔ لہٰذا دعوتِ اسلام اگر صحیح ہے تو علیؑ کے ایمان کو بھی صحیح و معتبر ماننا پڑے گا اور اگر دعوتِ اسلام صحیح نہیں ہے تو علیؑ کے ایمان کا جائزہ لینے کے بجائے اپنے اسلام کا جائزہ لینا ہوگا کہ پیغمبرؐ کی طرف ایسی بے نتیجہ دعوت کی نسبت دینا کہ جسے مانا جائے جب غیر مسلم اور نہ مانا جائے جب غیر مسلم کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اسلام کے منافی نہیں ہے؟ اگر حضرت علیؑ کا یہ اسلام صغر سنی کی بنا پر غیر معتبر تھا تو اس غیر معتبر اسلام کے بعد حضرت کے لئے ضروری تھا کہ بعد بلوغ تجدید اسلام کر کے اس کا تدارک کرتے مگر کوئی ضعیف تو درکنار کوئی غلط روایت بھی یہ نہیں بتاتی کہ آپ نے پھر کسی موقع پر تجدید اسلام کی ضرورت محسوس کی ہو۔ اس صورت میں علیؑ کے اسلام کو غیر معتبر قرار دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ انہوں نے آخر تک اسلام قبول ہی نہیں کیا۔ اور یہ وہی کہہ سکتا ہے جسے خود اسلام سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب کچھ لوگوں کو حضرت کی سبقت کھلی تو صغر سنی و عدم بلوغ کا سہارا لے کر کبھی اسے تقلیدی اسلام کہا گیا اور کبھی غیر معتبر۔ اور اس حقیقت سے آنکھ بند کر لی کہ اس وقت نہ تکلیف شرعی میں بلوغ کی شرط تھی اور نہ ایمان میں۔ بلکہ اسلام اور اس کے احکام تمیز و رشد سے وابستہ تھے۔ چنانچہ علامہ حلبی نے لکھا ہے :۔

انما صح اسلام علی مع انهم اجمعوا علی انه لم یکن بلغ الحلم ومن ثم نقل منه انه قال سبقتکم الی الاسلام طرا صغیرا ما بلغت اوان حلمی لان الصبیان کانوا ذ ذاک مکلفین لان القلم انما رفع عن الصبی عام خیبر۔ وعن البیهقی ان الاحکام انما تعلقت بالبلوغ

حضرت علی کا اسلام اس بنا پر صحیح تھا حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔ چنانچہ آپ کا قول ہے کہ میں ابھی بچہ ہی تھا اور سن بلوغ کو نہ پہنچا تھا کہ اسلام میں سب پر سبقت لے گیا۔ کیونکہ اس وقت بچے بھی مکلف تھے اور بچوں سے قلم تکلیف خیبر والے سال برطرف ہوا۔ اور بیہقی نے کہا ہے کہ خندق والے سال میں احکام بلوغ سے وابستہ ہوئے اور ایک قول یہ

فی عام الخندق و فی لفظ فی عام الحدیبیۃ و کانت قبل ذلک منوطۃ بالتمییز۔ (سیرۃ حلبیہ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹)

ہے کہ حدیبیہ والے سال میں بلوغ سے متعلق ہوئے اور اس سے پہلے صرف تمیز و رشد سے وابستہ تھے۔

بعثتِ رسولؐ کے وقت حضرت علیؑ کی عمر دس یا بارہ برس کی تھی اور یہ پورے طور پر رشد و تمیز کا زمانہ ہے۔ لہٰذا جب ظاہر شریعت کے معیار پر بھی ان کا اسلام پورا اترتا ہے تو اسے کمزور کر کے دکھانے کی کوشش صحیح جذبات کی عکاسی نہیں کرتی۔

دعوتِ عشیرہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منصب رسالت پر فائز ہوتے ہی مخفی طور پر تبلیغ کا آغاز کر دیا اور جب رازداری کے ساتھ تبلیغ کرتے ہوئے تین برس گزر گئے اور چوتھا سال شروع ہوا تو علانیہ دعوت و تبلیغ کا حکم آیا: وانذر عشیرتک الاقربین "اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کرو۔" اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت ابو طالب کے مکان کو مرکزِ تبلیغ قرار دیا۔ اور حضرت علیؑ سے فرمایا کہ وہ اولادِ عبد المطلب کے کھانے کا سامان کریں اور انہیں پیغام دیں کہ وہ شریک دعوت ہوں۔ حضرت علیؑ نے ایک ران گوشت ایک پیالہ دودھ اور تین سواسیر جو کے آٹے کی روٹیوں کا بندوبست کیا اور اولادِ عبد المطلب کو کھانے پر طلب کیا۔ مقررہ وقت پر کم و بیش چالیس افراد جمع ہو گئے۔ ان میں آنحضرتؐ کے چچا ابو طالب، حمزہ، عباس اور ابو لہب بھی شامل تھے۔ اگرچہ کھانے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے کھانا کم تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس تھوڑے سے کھانے میں اتنی برکت دی کہ سب نے کھلے خزانے کھایا پھر بھی کھانا بچ رہا۔ جب یہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو آنحضرتؐ نے کھڑے ہو کر چاہا کہ اپنی رسالت کا اعلان کر کے انہیں خدا پرستی کی دعوت دیں کہ ابولہب نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) تمہیں بہکانا اور تمہارے آباؤ اجداد کے دین سے تمہیں بے راہ کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھو ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا ورنہ اندیشہ ہے کہ تم ان کی سحر کاریوں سے متاثر ہو کر بے راہ ہو جاؤ گے۔ ابولہب کی اس شر انگیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجمع میں انتشار پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پیغمبر اکرم جو کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکے۔ دوسرے دن پھر حضرت علیؑ کے ذریعہ انہیں دعوت دی۔ وہ لوگ دوبارہ کھانے پر جمع ہوئے۔ جب کھا پی چکے تو پیغمبرؐ اکرم فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ابولہب نے پھر رخنہ اندازی کرنا چاہی مگر ابو طالب نے اس کی معاندانہ روش دیکھ کر اسے ڈانٹا اور کہا: یا اعور ما انت

دخلن ا۔ زفاق۔ج ۲۔ ص۹۵) اے بدبخت! تجھے ان باتوں سے کیا واسطہ" یہ سن کر ابولہب کو ردکنے ٹوکنے کی ہمت نہ ہوئی اور گھٹنوں میں سر دے کر چپ بیٹھ گیا۔ آپ نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اپنی اپنی جگہ پر اطمینان وسکون سے بیٹھے رہو۔ اور پیغمبر سے کہا آپ جو کہنا چاہتے ہیں شوق سے کہیں ہم آپ کی ایک ایک بات غور سے سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ آنحضرتؐ کی ڈھارس بندھی اور آپ نے اولادِ عبدالمطلب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

یابنی عبد المطلب انی واللہ ما اعلم شابا فی العرب جاء قومہ بافضل مما قد جئتکم بہ انی قد جئتکم بخیر الدنیا والاخرۃ وقد امرنی اللہ تعالیٰ ان ادعوکم الیہ فایکم یوازرنی علیٰ ھذا الامر علیٰ ان یکون اخی ووصیی وخلیفتی فیکم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۶۳)	اے فرزندانِ عبدالمطلب خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ عرب میں کوئی جوان اس چیز سے بہتر چیز لایا ہو جو میں تمہارے لئے لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی لایا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس بھلائی کی طرف تمہیں دعوت دوں۔ تم میں کون شخص ہے جو اس سلسلہ میں میرا معاون و مددگار بننے کے لئے تیار ہو؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا"

دو چار آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی اس اعلان پر خوش نہ تھا چہ جائیکہ ان میں سے کوئی دستِ تعاون بڑھاتا یا نصرت وحمایت کا وعدہ کرتا۔ سب سر نہوڑائے چپ بیٹھے رہے کہ دفعتہً اس خاموش فضا میں علیؑ کی آواز سکوت اور سناٹے کو توڑتی ہوئی گونجی کہ یارسول اللہ اگرچہ میں نوعمر اور ان سب سے کمسن ہوں مگر آپ کا معاون و مددگار اور سینہ سپر رہوں گا۔ اگر کسی نے آپ کو ترچھی نظر سے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ اور کسی نے شرانگیزی کی تو اس کا پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اے علی تم ذرا توقف کرو شاید ان بڑوں میں سے کوئی میری آواز پر لبیک کہے۔ جب تین مرتبہ کہنے سننے کے باوجود کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ نے علیؑ کو قریب بلا کر ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:۔

ان ھذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۶۳)	یقیناً یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو لازم ہے کہ اس کی بات مانو اور اس کی اطاعت کرو"

قریش نے یہ اعلان سنا تو ان کے لبوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ کنکھیوں سے ایک دوسرے

کو دیکھا اور اسے ایک مضحکہ خیز بات سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا اور کچھ منچلوں نے ابوطالب سے کہا کہ لو تم بھی اپنے بیٹے کی بات مانو اور اس کی اطاعت کرو۔ اگرچہ اس وقت حضرت علیؑ کی آواز کو کوئی وزن نہیں دیا گیا۔ اور سرسری اور بے سروپا بات سمجھ کر اس کا تمسخر اڑایا گیا۔ مگر دنیا نے ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا۔ ترک موالات و قطع تعلقات کرکے دیکھ لیا کہ اس کمسن اور نوخیز بچے نے قریش کی بھری محفل میں جو وعدہ کیا تھا اسے پوری طرح نباہا۔ کٹھن سے کٹھن موقع پر پیغمبرؐ کا سینہ سپر رہا اور دشمنوں کے نرغہ میں تلواروں کے سایہ میں اور دشمنوں کے حصار میں نصرت و حمایت کا فریضہ ادا کیا۔ اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ پیغمبرؐ کے اعلان کے مطابق آنحضرتؐ کی اخوت و حمایت اور قائم مقامی کا اس سے بڑھ کر کوئی حقدار نہیں ہے۔

امیرالمومنینؑ کے ایفائے عہد کے نتیجہ میں پیغمبرؐ اکرم پر بھی یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ علیؑ کی نیابت و خلافت کا عمومی اعلان کر کے دنیا کو بتادیں کہ اگر علیؑ نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے وعدہ کی تکمیل کی ہے اور نصرت و اعانت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے تو میں بھی اپنے وعدہ کو پورا کر کے دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اسی احساس فرض کے پیش نظر آپ نے حجۃ الوداع سے پلٹتے ہوئے غدیر خم کے مقام پر من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ بھی مولا ہیں") کہہ کر علی کی خلافت وحاکمیت کا اعلان کیا۔ یہ اعلان اسی دعوتِ عشیرہ کے وعدہ کی صدائے بازگشت اور علیؑ کے ایفائے عہد و حسن خدمات کا عملی اعتراف تھا۔

اس دعوتِ عشیرہ کے اعلان سے حضرت علیؑ کی خلافت کی بنیادی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اس طرح کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس عمومی دعوت اسلام کے موقع پر صرف تین چیزوں کا اعلان کیا۔ ایک توحید دوسرے رسالت اور تیسرے حضرت علی کی وصایت و خلافت۔ توحید و رسالت کے اعلان کے ساتھ ساتھ اس نیابت و خلافت کا اعلان اس کی اساسی و بنیادی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا توحید و رسالت اگر اصول اسلام میں داخل ہیں تو حضرت علیؑ کی امامت بھی اسلام کا ایک اہم رکن شمار ہو گی۔ اور جس طرح اسلام کے لئے توحید و رسالت کا اقرار ضروری ہے۔ اسی طرح علی کی وصایت و نیابت کا اقرار بھی لازمی ہو گا۔

نصرتِ رسولؐ کا آغاز

پیغمبر اسلام نے جب علانیہ تبلیغ اسلام کا آغاز کیا تو قریش کو حضرت ابوطالب کا تھوڑا بہت پاس و لحاظ تھا انہوں نے براہ راست مزاحمت کرنے کے بجائے اپنے لڑکوں بالوں کو یہ سکھایا کہ وہ آنحضرتؐ کو جہاں پائیں

ستائیں اور ان پر اینٹ پتھر برسائیں تاکہ وہ تنگ آکر بت پرستی کے خلاف کہنا چھوڑ دیں اور اسلام کی تبلیغ سے کنارہ کش ہو کر گھر میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ جب پیغمبر اکرمؐ گھر سے باہر نکلتے تو قریش کے لڑکے پیچھے لگ جاتے۔ کوئی خس و خاشاک پھینکتا اور کوئی اینٹ پتھر مارتا۔ آنحضرتؐ آزردہ خاطر ہوتے اذیتیں برداشت کرتے مگر زبان سے کچھ نہ کہتے اور نہ کچھ کہنے کا محل تھا۔ اس لئے کہ بچوں سے الجھنا اور ان کے منہ لگنا کسی بھی سنجیدہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ ایک مرتبہ علی نے آپ کے جسم مبارک پر چوٹوں کے نشانات دیکھے تو پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ آپ کے جسم پر نشانات کیسے ہیں؟ پیغمبرؐ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اے علی قریش خود تو سامنے آتے نہیں اپنے بچوں کو سکھاتے پڑھاتے ہیں کہ وہ مجھے جہاں پائیں تنگ کریں۔ میں جب بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں تو وہ گلیوں اور بازاروں میں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھیلے پھینکتے اور پتھر برساتے ہیں۔ یہ انہی چوٹوں کے نشانات ہیں۔ علیؑ نے یہ سنا تو بے چین ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ آئندہ آپ تنہا کہیں نہ جائیں۔ جہاں جانا ہو مجھے ساتھ لے جائیں۔ آپ تو ان بچوں کا مقابلہ کرنے سے رہے مگر میں تو بچہ ہوں، میں انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا اور آئندہ انہیں جرأت نہ ہو گی کہ وہ آپ کو اذیت دیں یا راستہ روکیں۔ دوسرے دن پیغمبرؐ گھر سے نکلے تو علیؑ کو بھی ساتھ لے لیا۔ قریش کے لڑکے حسب عادت ہجوم کرکے آگے بڑھے۔ دیکھا کہ پیغمبرؐ کے آگے علیؑ کھڑے ہیں۔ وہ بچے بھی علی کے سن و سال کے ہوں گے انہیں اپنے ہمسن کے مقابلہ میں تو بڑی جرأت دکھانا چاہیئے تھی مگر علیؑ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر جھجکے۔ پھر ہمت کرکے آگے بڑھے۔ اِدھر علیؑ نے اپنی آستینیں الٹیں اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے۔ کسی کا بازو توڑا کسی کا سر پھوڑا، کسی کو زمین پر پٹخا اور کسی کو پیروں تلے روندا۔ بچوں کا ہجوم اپنے ہی سن و سال کے ایک بچے سے پٹ پٹا کر بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے بڑوں سے فریاد کی کہ: قضمنا علی "علیؑ نے ہمیں بری طرح پیٹا ہے۔" مگر بڑوں کو بھی جرأت نہ ہو سکی کہ فرزند ابوطالب سے کچھ کہیں اس لئے کہ یہ سب کچھ انہی کے ایما پر ہوتا تھا۔ اس دن کے بعد بچوں کو بھی ہوش آگیا اور جب وہ پیغمبرؐ کے ہمراہ علی کو دیکھتے تو کہیں دبک کر بیٹھ جاتے یا اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے۔ اور پیغمبرؐ کو ستانے اور اینٹ پتھر پھینکنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس واقعہ کے بعد علیؑ کو قضیم کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ جس کے معنی ہیں ہڈی پسلی توڑ دینے والا" چنانچہ جنگ اُحد میں جب آپ طلحہ ابن ابی طلحہ کے مقابلہ کے لئے نکلے تو اس نے پوچھا کہ میرے مقابلہ میں آنے والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ طلحہ نے جب دیکھا کہ اس کا مقابلہ علیؑ سے ہے تو کہا:۔

قد علمت یا قضیم انہ لایجسر — اے قضیم! میں سمجھتا تھا کہ میرے مقابلہ میں آنے

علی احد غیرك ۔ (اعیان الشیعہ) کی جرأت تمہارے علاوہ کسی کو نہ ہوگی"

اس موقع پر طلحہ نے آپ کو اسی بچپن والے لقب سے یاد کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے بچوں میں یہ بھی شریک رہا ہوگا اور علیؑ کے ہاتھ سے ہڈی پسلی تڑوا چکا ہوگا۔ جب ہی تو یہ نام اس کے حافظہ میں محفوظ رہ گیا۔ اور اسی نام سے حضرت کو مخاطب کیا۔

مقاطعۂ قریش

جب قریش نے اسلامی تحریک کو پھیلنے اور پیغمبر اسلام کی آواز کو دبانے میں اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھا اور بزعم خود انہیں راہ راست پر لانے سے ناامید ہو گئے تو انہوں نے تبادلۂ خیال اور سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا کہ جب تک محمدؐ کو ہمارے سپرد نہیں کیا جاتا بنو ہاشم سے تمام تعلقات ختم کر دیئے جائیں اور ان سے ایک دم معاشی و معاشرتی مقاطعہ کیا جائے۔ نہ اُن کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کی جائے نہ ان سے رشتہ ناطہ کیا جائے اور نہ باہمی میل جول رکھا جائے۔ اس فیصلہ کو قومی معاہدہ کا درجہ دینے کے لئے منصور ابن عکرمہ عبدری نے بالاتفاق رائے ایک دستاویز قلمبند کی جس پر اسّی سرداران قریش نے اپنی مہریں ثبت کیں اور اسے ابوجہل کی خالہ ام الجلاس کے سپرد کر دیا کہ وہ اسے ایک قیمتی دستاویز کی طرح بحفاظت تمام رکھے تاکہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکے۔

جب بنو ہاشم کو اس معاہدہ کا علم ہوا تو انہیں مکہ میں زندگی گزارنا مشکل نظر آیا۔ انہوں نے شہر سے دُور ایک درّہ کوہ میں جو شعب ابوطالب کے نام سے موسوم تھا پناہ لے لی اور وہ اہل مکہ سے، اور اہل مکہ ان سے بے تعلق ہو گئے۔ بلکہ قریش کے اس باہمی معاہدہ کا اثر دوسرے قبائل پر بھی پڑا اور کسی کو ان سے راہ ورسم رکھنے اور اُن کے ہاتھ کوئی چیز بیچنے یا کھانے پینے کا سامان پہنچانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ابوالعاص ابن ربیع، حکیم ابن حزام اور ہشام ابن عمرو کبھی کبھار چوری چھپے اونٹوں پر غلہ لاد کر انہیں شعب کی طرف ہنکا دیتے یا حج کے دنوں میں تھوڑا بہت غلہ مہنگے داموں خرید لیا جاتا اور اس سے گزر بسر کی جاتی۔ اس گراں خریداری اور مسلسل بیکاری کے نتیجہ میں رہی سہی پونجی ختم ہو گئی۔ فاقوں پر فاقے ہونے لگے اور درختوں کے پتے چبانے کی نوبت آگئی۔ بڑے تو صبر کر لیتے تھے مگر بچے بھوک سے بلبلاتے اور ان کے رونے چیخنے کی آوازیں دوسرے سنتے تھے۔ مگر نہ ان پر کسی کو ترس آتا تھا اور نہ کسی کا دل پسیجتا تھا۔ قریش ان کی بے کسی و خستہ حالی سے متاثر ہونے کے بجائے خوش ہوتے اور رسد رسانی کے ذرائع پر کڑی نظر رکھتے۔ قریش کی تشدد پسند طبیعتوں کا تقاضا یہی تھا اور اُن

سے اسی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر تعجب اس پر ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت موجود تھی جن میں کچھ متمول اور کھاتے پیتے افراد بھی تھے۔ مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ قید و بند کے اس طویل عرصہ میں کسی نے اُدھر جھانک کر بھی دیکھا ہو کہ پیغمبر اور اُن کے عزیز و اقارب کس حال میں ہیں یا چوری چھپے کوئی مدد امداد کی ہو جب کہ چند افراد جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے۔ کسی نہ کسی طرح مدد کر دیتے تھے۔ آرام و راحت کے دنوں میں محبت و دوستی کے دعوے کہاں اور فقر و پریشاں حالی میں یہ بے رخی کہاں۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست ‏ ‏ در پریشاں حالی و درماندگی

قریش اپنے مقام پر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بنی ہاشم ان شدائد کو برداشت نہ کر سکیں گے اور پیغمبر کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔ اور جب وہ اکیلے رہ جائیں گے تو بڑی آسانی سے ان کی آواز کو دبا دیا جائے گا۔ مگر بنی ہاشم نے ایک لمحہ کے لئے بھی ان کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور پوری جرأت و پامردی سے تکالیف و شدائد کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس محاصرہ میں ابوطالب کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے نہ ان کے پائے استقامت میں جنبش آئی اور نہ اُن کے استقلال میں کوئی فرق آیا۔ بلکہ بڑی خندہ پیشانی سے ان جانگداز مصیبتوں کو برداشت کرتے رہے۔ اس قید و بند میں انہیں کوئی فکر تھی تو یہ کہ کہیں دشمن اچانک حملہ کر کے پیغمبرؐ کو گزند نہ پہنچائے یا انہیں قتل کر دے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا تھا۔ البتہ رات کے اندھیرے میں خطرہ بڑھ جاتا تھا۔ آپ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر آنحضرتؐ کے گرد پہرا دیتے یا انہیں سوتے سے جگا کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے اور اُن کے بستر پر اپنے بیٹوں میں سے کسی کو سلا دیتے تاکہ حملہ ہو تو اُن کا کوئی بیٹا کام آ جائے اور آنحضرتؐ پہ آنچ نہ آئے۔ علامہ حلبی نے تحریر کیا ہے:۔

وکان ابوطالب فی کل لیلۃ یامر رسول اللہ ان یاتی فراشہ و یضطجع بہ فاذا نام الناس اقامہ وامر احد بنیہ او غیرھم ای من اخوتہ او بنی عمہ ان یضطجع مکانہ خوفا علیہ ان یغتالہ احد ممن یرید بہ السوء۔ (سیرت حلبیہ۔ ج ۱۔ ص ۳۴۲)

ابوطالب ہر شب آنحضرتؐ سے کہتے کہ اپنے بستر پر جائیے اور آرام فرمائیے اور جب دوسرے لوگ سو جاتے تو پیغمبرؐ کو اٹھاتے اور اپنے کسی بیٹے یا بھائی یا ابن عم سے کہتے کہ وہ آنحضرتؐ کے بستر پر سو جاتے اس اندیشہ سے کہ آپ کے بدخواہوں میں سے کوئی اچانک حملہ کر کے انہیں قتل نہ کر دے۔

یہ خدمت اکثر و بیشتر حضرت علیؑ سے لی جاتی اور انہی کو آنحضرتؐ کے بستر پر سلاتے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید

نے تحریر کیا ہے :۔

کان ابوطالب کثیرا ما یخاف علی رسول اللہ البیات اذا عرف مضجعہ فکان یقیمہ لیلا من منامہ و یضجع ابنہ علیا مکانہ

"جب پیغمبرؐ کی خواب گاہ کا کسی کو علم ہو جاتا تو ابوطالب کو خطرہ محسوس ہوتا۔ آپ رات کے کسی حصہ میں انہیں سوتے سے جگاتے اور اپنے بیٹے علی کو ان کی جگہ پر سلا دیتے۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۱۱)

یہ قید و بند کا سلسلہ بعثت کے ساتویں سال یکم محرم سے شروع ہوا اور بعثت کے دسویں سال جب کہ بنو ہاشم کو مصائب و شدائد برداشت کرتے ہوئے تین برس گزر چکے تھے کچھ لوگوں کو قریش کے ظلم و ستم اور بنو ہاشم کی مظلومیت کا احساس ہوا اور انہوں نے چاہا کہ اس معاہدہ کو ختم کر کے پیغمبرؐ اور ان کے عزیز و اقارب کو ان کے گھروں میں آباد ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ مکہ کی ایک باثر شخصیت ہشام ابن عمرو نے سلسلہ جنبانی کی اور زہیر ابن عبداللہ مخزومی سے کہا کہ اے زہیر تمہاری والدہ عاتکہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ تمہیں کیونکر گوارا ہوتا ہے کہ تم کھاؤ پیو اور مزے کرو اور عبدالمطلب کی اولاد فاقوں پر فاقے کرے اور قید و بند کی سختیاں جھیلے۔ زہیر نے کہا کہ مجھے یہ گوارا تو نہیں مگر یہ سوچ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ میں ایک اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ ہشام نے کہا کہ تم اکیلے نہیں ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں کو مل کر کوشش کرنا چاہیئے کہا کہ یہ دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے ایک آدھ اور بھی ہونا چاہیئے۔ کہا کہ مطعم ابن عدی کے طور طریقوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دے گا۔ چلو اس کا عندیہ معلوم کریں۔ جب انہوں نے اس سے بات چیت کی تو اس نے بڑی گرم جوشی سے ان دونوں کی رائے سے اتفاق کیا ان لوگوں کے کھل کر سامنے آنے سے ابو البختری ابن ہشام اور زمعہ ابن ابی الاسود بھی ان کے ہم خیال ہو گئے۔ اب یہ پانچوں مل کر رؤسائے قریش کی مجلس میں آئے اور کہا کہ اے سردارانِ قریش ہم اس مقصد سے آئے ہیں کہ تم لوگوں سے بنو ہاشم کی رہائی کا مطالبہ کریں۔ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ ہم آرام چین سے زندگی گزاریں اور عبدالمطلب کی اولاد قید و بند اور فقر و فاقہ میں دن کاٹے۔ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ جب تک دستاویز کو پارہ پارہ نہ کر دیں گے اور بنو ہاشم کو ان کے گھروں میں لا کر نہ بسائیں گے۔ ابوجہل نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ ہم اس کی کبھی اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے گھروں میں واپس آئیں۔ ان پر مکہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں۔ ادھر سے بھی سختی کا جواب سختی سے دیا گیا۔ قریش اپنی بات پر اڑ گئے اور کسی قیمت پر مقاطعہ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ قریب تھا کہ دونوں فریق آپس میں دست و گریباں

ہو جائیں کہ دور سے ابوطالب کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ اس خلاف توقع آمد سے ابوجہل یہ سمجھا کہ بنی ہاشم قید و بند کی سختیوں سے گھبرا کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہمارے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ جب ابوطالب واردِ مجلس ہوئے تو سردارانِ قریش نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا فرمایا:۔

ان ابن اخی قد اخبرنی ولم یکذبنی قط ان اللہ قد سلط علی صحیفتکم الارضۃ فلحست کل ما کان فیھا من جور او ظلم او قطیعۃ رحم و بقی فیھا کل ما ذکر بہ اللہ فان کان ابن اخی صادقا نزعتم عن سوء رایکم و ان کان کاذبا دفعتہ الیکم فقلتموہ او استحییتموہ۔

(طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۲۰۹)

میرے بھتیجے نے مجھے خبر دی ہے اور میں نے ان کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سنا کہ اللہ نے تمہاری دستاویز پر دیمک کو مسلط کر دیا ہے اور اللہ کے نام کے علاوہ ظلم و جور اور قطع رحمی پر مشتمل تمام عبارت کو چاٹ لیا ہے اگر وہ سچے ثابت ہوں تو تم اپنے غلط رویہ سے باز آجاؤ اور اگر جھوٹے ثابت ہوں تو میں انہیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ خواہ تم انہیں قتل کرنا یا زندہ رہنے دینا۔

قریش نے ابوطالب کی اس منصفانہ پیش کش کو مان لیا اور دستاویز کو منگوا کر دیکھا۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پیغمبر کے قول کے مطابق سرنامۂ تحریر بسمک اللھم کے علاوہ تمام عبارت دیمک چاٹ چکی ہے اور ایک لفظ بھی خواندگی کے قابل نہیں رہا۔ اب قریش پیچ و تاب کھانے لگے اور حیل و حجت کر کے اپنی کہی ہوئی بات سے پہلو بچانے لگے۔ ابوجہل آخر تک یہی کہتا رہا کہ ہم ترکِ موالات کا معاہدہ ختم نہیں ہونے دیں گے۔ مگر ہشام ابن عمرو اور اس کے ساتھیوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور مطعم ابن عدی نے اس دستاویز کو اٹھا کر پارہ پارہ کر دیا۔ معاہدہ کالعدم قرار دے دیا گیا اور بنی ہاشم درۂ کوہ سے باہر نکل کر دوبارہ اپنے گھروں میں آباد ہو گئے۔

بنی ہاشم کے لئے یہ دور انتہائی مشکلات کا دور تھا۔ ادھر قریش مادی طاقت کے بل پر ظلم و تشدد پر تلے ہوئے تھے اور ادھر چند فاقہ کش ایک درۂ کوہ میں دبکے سہمے پڑے تھے جو سامانِ راحت تو درکنار عام ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم کر دیئے گئے تھے بچے ہراساں، بڑے پریشان، خوف و دہشت کا عالم۔ اور ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں دشمن اچانک حملہ نہ کر دے یا سوتے میں شبخون نہ مارے۔ ایسی پریشان حالی میں ہمتیں پست اور قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور اپنے بیگانے سب ہی ساتھ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر ان محصورین نے اس طویل عرصہ میں پیہم کڑیاں جھیلیں، فاقوں پر فاقے کئے مگر کسی حال میں پیغمبرؐ کا ساتھ

چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور کمال ہمدردی و مواسات کے نمونے چھوڑ گئے۔ خصوصاً ابوطالب کا جذبۂ ایثار و قربانی اور علی کا ولولۂ سرفروشی تاریخ کا ایک عدیم النظیر مثالیہ ہے۔ باپ بیٹے کو موت کے منہ میں دے کر مطمئن نظر آتا ہے اور بیٹا اپنے کو موت کے خطرے میں ڈال کر پرسکون رہتا ہے۔ اگرچہ چند افراد اس کے خلاف آواز نہ اٹھاتے اور تحریری معاہدہ دیمک کی نذر نہ ہو جاتا تو بظاہر حالات اس قید و بند سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

قریش کے لئے یہ ایک موقع تھا کہ دستاویز کو دیکھ کر بصیرت و بصارت سے کام لیتے۔ مگر وہ اپنی آنکھوں سے غیبی طاقت کا کرشمہ دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ جب انہوں نے پیغمبر کی دی ہوئی خبر کو حرف بحرف درست پایا تھا تو عصبیت و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر یہ سوچتے کہ دستاویز کی لپٹی ہوئی تہوں میں دیمک کی نقل و حرکت کو وہی آنکھ دیکھ سکتی ہیں جن میں نورِ نبوت کی روشنی ہو۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ پیغمبرؐ کی یہ قیاس آرائی تھی کہ اتنے عرصہ تک ایک کاغذی دستاویز دیمک کے حملہ سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ دیمک لگنے کا خطرہ سرد و مرطوب مقامات پر ہوتا ہے نہ عربستان ایسے گرم و خشک علاقہ میں۔ اور اگر ایسا اتفاقیہ ہی ہوا ہوتا تو دیمک نے جہاں ساری تحریر کو چاٹ کر خاک کر دیا تھا وہاں سرنامۂ دستاویز بسمک اللّٰھم کو بھی چاٹ کر ختم کر دیتی۔ اگرچہ قریش نے آنحضرتؐ کی نبوت کا اعتراف نہ کیا اور نہ اس واقعہ سے کوئی اثر لیا مگر کچھ حق پسند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے کہ "اس واقعہ سے کچھ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ اسی وقت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے"۔ جب کچھ لوگوں نے کرم خوردہ دستاویز کو دیکھنے کے بعد آنحضرتؐ کی صدق بیانی کا اعتراف کر کے اسلام قبول کر لیا ہو تو حضرت ابوطالب جنہوں نے دستاویز کو دیکھنے سے پہلے ہی قولِ پیغمبرؐ کی صحت و صداقت پر اعتماد و یقین کا اظہار کیا ہو وہ آنحضرتؐ کے دعوائے نبوت کی صحت میں کیونکر شک و شبہ کر سکتے تھے یا اسلام سے الگ تھلگ رہ سکتے تھے۔

ہجرتِ مدینہ

شعب ابوطالب کی قید و بند سے رہائی کے بعد قریش کے ولولے سرد پڑ گئے۔ اگرچہ ان کے سینوں میں غیظ و غضب کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں مگر ابوطالب کا تھوڑا بہت پاس و لحاظ مانع تھا اس لئے ان کی معاندانہ کارروائیوں میں تیزی نہ آسکی۔ ابوطالب ضعیف ہو چکے تھے اور اس ضعیفی میں محاصرہ کی سختیوں نے

انہیں اتنا متاثر کیا کہ صحت جاتی رہی، اعضاء کمزور پڑ گئے اور شعب سے نکلنے کے تھوڑا عرصہ بعد دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اب قریش کو کھل کھیلنے کی موقع مل گیا پیغمبر کا سہارا جاتا رہا تھا۔ اہل مکہ جس طرح چاہتے بے روک ستاتے اور بیباکانہ مظالم ڈھاتے۔ نہ کسی میں روکنے ٹوکنے کی ہمت تھی اور نہ منع کرنے کی جرأت۔ قریش کی ایذا رسانیوں میں روز بروز شدت پیدا ہونے لگی اور پیغمبرؐ کے ساتھ مسلمان بھی ستائے جانے لگے۔ انہیں طرح طرح سے پریشان کیا جاتا اور گوناگوں اذیتیں اور تکلیفیں دی جاتیں۔ پیغمبر اکرمؐ ان کی مظلومیت دیکھ کر کڑھتے، کبیدہ خاطر و ملول ہوتے مگر گنتی کے مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کی کثرت و قوت دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔

جب قریش کی ستم کیشی و ستم رانی حد سے بڑھ گئی تو آپ مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور طائف کا رخ کیا جو مکہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے پر رونق و آباد بستی تھی۔ ابوالحسن مدائنی کی روایت کی بنا پر حضرت علی اور زید بن حارثہ بھی اس سفر میں آپ کے ہمرکاب تھے۔ پیغمبر کا مقصد تو یہ تھا کہ اہل طائف کو اسلام کی دعوت دیں شاید وہ حق کی آواز سے متاثر ہو کر قریش کے خلاف ان سے تعاون کریں۔ مگر یہاں کے لوگ اہل مکہ سے بھی زیادہ نابکار و ناہنجار ثابت ہوئے۔ انہوں نے پیغمبرؐ کی بات تک سننا گوارا نہ کی اور اوباشوں کا ایک گروہ آپ کے پیچھے لگ گیا جو آپ پر ڈھیلے پھینکتا اور پتھر برساتا۔ آنحضرتؐ نے جوں توں کر کے ایک مہینا یہاں گزارا اور آخر ان اوباشوں نے آپ کا پیچھا کر کے آپ کو شہر سے باہر نکال دیا۔ جب کہیں جائے پناہ نظر نہ آئی تو پھر مکہ کا رخ کیا اور شہر کے قریب پہنچ کر کوہ حرا پر منزل کی۔ حدود شہر میں کسی کی حمایت و پناہ کے بغیر قدم رکھنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ آپ نے ایک شخص کے ذریعہ مطعم ابن عدی سے پناہ مانگی اس نے پناہ دینے کی حامی بھر لی تو آپ اس حمایت و ذمہ داری کی آڑ لے کر مکہ میں داخل ہوئے۔ یہاں پھر انہی دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا تھا۔ مگر ان کاوشوں اور کاہشوں کے باوجود آپ اپنے منصبی فرائض برابر انجام دیتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور آس پاس کی بستیوں میں بھی تشریف لے جاتے جہاں مختلف قبائل کو اسلام کے محاسن سے آگاہ کر کے دعوت اسلام دیتے۔ قریش بھی پیچھا کرتے اور جادوگر اور مجنون کہہ کر آپ کی بات کو بے اثر بنانے کی کوشش کرتے۔ مگر آپ صبر و استقلال اور عزم و ثبات کے ساتھ اپنی آواز دوسروں تک پہنچاتے رہے۔

پیغمبرؐ اکرم کا معمول تھا کہ حج کے موقع پر جب مختلف شہروں اور دیہاتوں کے لوگ مکہ میں جمع ہوتے تو آپ انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔ ان میں جو سلیم الفطرۃ ہوتے وہ آپ کی آواز پر لبیک کہتے اور اسلام قبول کر لیتے۔ بعثت کا دسواں سال تھا کہ یثرب سے کچھ لوگ حج کے لئے مکہ آئے۔ پیغمبر تبلیغ کرتے ہوئے منیٰ میں

پہنچے تو عقبہ کے پاس ان میں کے چھ آدمیوں کو دیکھا۔ آپ ان لوگوں کے پاس آئے اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کس قبیلہ سے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یثرب سے آئے ہیں اور قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنحضرتؐ انہی کے حلقہ میں بیٹھ گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کرنے کے بعد انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اُن لوگوں کے اسلام لانے سے یثرب میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ سال آئندہ یثرب سے بارہ آدمی آئے اور آپ کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔ اگلے سال پھر تہتر آدمیوں کی ایک جمعیت آئی اور بیعت کے بعد اسلام سے وابستہ ہو گئے۔ ان لوگوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ آپ مکہ کے بجائے مدینہ میں رونق افروز ہوں اور اسے نشرِ اسلام کا مرکز قرار دیں۔ ہم آپ کی حمایت و حفاظت کے لئے ہر طرح تیار ہیں۔ مکہ میں اسلام کے پنپنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ آپ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں۔ مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ جب انہیں جائے امن نظر آئی تو ایک ایک کر کے ہجرت کرنے لگے۔ جب قریش نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو اہل یثرب کی حمایت و پشت پناہی حاصل ہو گئی ہے اور وہ ترکِ وطن کر کے جا رہے ہیں تو انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر پیغمبر بھی یہاں سے چلے گئے تو یہ پاشان و پریشان جماعت مجتمع ہو کر ہمارے خلاف اٹھ کھڑی ہو گی۔ انہوں نے جانے والوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا اور ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ کسی کے بال بچوں کو روک لیا، کسی کا روپیہ پیسہ چھین لیا، کسی کو ڈرایا دھمکایا۔ مگر ان کی یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور دو چار آدمیوں کے علاوہ سب مدینہ پہنچ گئے۔

قریش کو مسلمانوں کے روک لینے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے باہمی مشورہ کے لئے ایک مجلس منعقد کی۔ جس میں بنی ہاشم کے سوا تمام قبیلوں کے سرکردہ افراد نے شرکت کی۔ بنو عبد شمس سے عتبہ، شیبہ اور ابو سفیان، بنو نوفل سے طعیمہ ابن عدی، جبیر ابن مطعم اور حارث ابن عمر، بنو عبد الدار سے نضر ابن حارث، بنو اسد سے ابو البختری ابن ہشام، زمعہ ابن اسود اور حکیم ابن حزام، بنو مخزوم سے ابو جہل ابن ہشام، بنو سہم سے نبیہ اور منبہ پسران حجاج، بنو جمح سے امیہ ابن خلف ان عمائد و شیوخ کے علاوہ اور لوگ بھی شریک ہوئے اور نجد کا ایک بوڑھا بھی آ کر ان میں شامل ہو گیا۔ ایک شخص نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے باہر کے لوگوں سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور وہ کسی وقت بھی بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو قوی اندیشہ ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی قیادت میں ہم پر چڑھائی کر دیں گے۔ لہذا کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ اسلام کا قصہ پاک ہو جائے اور محمد کو عبرت ناک سزا دی جائے کہ آئندہ کسی کو ہمارے دین و مذہب کے خلاف

لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے۔ عاصی ابن اوائل، امیہ ابن خلف اور ابی ابن خلف نے کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ محمد کو طوق وزنجیر میں جکڑ کر کسی کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے یہاں تک کہ قیدِ تنہائی میں بھوک پیاس کی تکلیف سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ شیخ نجدی نے کہا کہ یہ رائے صائب و درست نہیں ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ان کے قوم قبیلے اور ماننے والے حملہ کر کے انہیں نکال لے جائیں گے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ عتبہ، شیبہ اور ابوسفیان نے کہا کہ انہیں جلاوطن کر دینا چاہیئے تاکہ ہمارے معبودوں کے خلاف کوئی آواز ہمارے کانوں میں نہ پہنچے۔ شیخ نجدی نے اس رائے سے بھی اختلاف کیا اور کہا کہ وہ جہاں جائیں گے اپنی چرب زبانی و طلاقت لسانی سے لوگوں کو اپنے گرد و پیش جمع کر لیں گے اور انہیں اپنا ہمنوا بنا کر تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے پھر نہ تم انہیں روک سکو گے اور نہ ان کا مقابلہ کر سکو گے۔ ابوجہل نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے کڑیل گراں ڈیل جوان منتخب کئے جائیں وہ سب مل کر یکبارگی ان پر ٹوٹ پڑیں اور انہیں قتل کر دیں۔ اس صورت میں کسی ایک شخص یا ایک قبیلہ کو ملزم نہ قرار دیا جاسکے گا بلکہ تمام قبائل اس میں شریک سمجھے جائیں گے اور بنی ہاشم کے امکان سے یہ باہر ہوگا کہ وہ تمام قبائل عرب سے جنگ چھیڑیں اور خون کا بدلہ خون چاہیں لہٰذا وہ قصاص کے بجائے دیت پر راضی ہو جائیں گے اور ہم سب مل کر بڑی آسانی سے دیت ادا کر دیں گے۔

یہ رائے سب نے پسند کی اور شیخ نجدی نے بھی اسے سراہا۔ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ طے کیا کہ سرِ شام آنحضرتؐ کے مکان کے گرد پہرا بٹھا دیا جائے جو ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے تاکہ وہ حملہ کی سن گن پا کر کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ اور جب رات کا اندھیرا چھا جائے تو تمام نوجوان گھر کے اندر گھس کر انہیں قتل کر دیں۔ اِدھر کفار قریش آنحضرتؐ کے قتل کے منصوبے باندھ رہے تھے اُدھر قدرت نے ان کے ناپاک عزائم سے پیغمبرؐ کو باخبر کر دیا اور اُن کے منصوبے کو ناکام بنانے کی تدبیر بتا دی۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے :۔

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔

اس وقت کو یاد کرو جب کفار تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ تمہیں کسی جگہ بند کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

آنحضرتؐ نے اللہ کی بتائی ہوئی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علیؑ کو بلا کر کہا کہ اے علی قریش نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آج کی رات مجھے قتل کر دیں اور میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا جاؤں اور تمہیں اپنے بستر پر سلا دوں۔ مجھے انتہائی گراں ہے کہ میں دشمنوں کے نرغے میں تمہیں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں

مگر خدا کا حکم یہی ہے لہذا:

نم علیٰ فراشی واتشح ببردی الحضرمی الاخضر فنم فیه فانه لا یخلص الیك شیئ تکرهه۔ (تاریخ کامل ج ۲ ص ۴۲)

"تم میری حضرمی سبز چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ اور تمہیں ان کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔"

حضرت علی نے بجائے اس کے کہ اپنے بارے میں مزید اطمینان کیا ہو یا یہ کہا ہو کہ آخر میری جان بھی تو خطرہ میں پڑ جائے گی یا کسی اور کو سلانے کا مشورہ دیا ہو یا کوئی عذر و بہانہ تلاش کیا ہو یہ پوچھا کہ یا رسولؐ اللہ کیا میرے سو جانے سے آپ کی جان بچ جائے گی؟ فرمایا کہ ہاں اگر تم میرے بستر پر سو جاؤ گے تو میں مشرکین کی گرفت سے آزاد ہو کر نکل جاؤں گا۔ یہ سن کر علیؑ نے ادائے شکر کے لئے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی۔ ابن شہر آشوب مازندرانی نے لکھا ہے:۔

فکان اول من سجد لله شکرا و اول من وضع وجهه علی الارض بعد سجدته (مناقب ج ۱ ص ۳۴)

"علی وہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے سجدۂ شکر ادا کیا اور سب سے پہلے سجدہ کے بعد اپنا چہرہ کرۂ خاک پر رکھا۔"

سجدۂ شکر سے سر اٹھانے کے بعد عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ آپ تشریف لے جائیں میں رات آپ کے بستر پر سوؤں گا۔ پیغمبرؐ اکرم کفار قریش کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے جبل ثور کی طرف راہ سپار ہو گئے اور علی آنحضرتؐ کی چادر اوڑھ کر بے کھٹکے ان کے بستر پر سو گئے۔ علامہ دیار بکری لکھتے ہیں:۔

ان لیلة بات علی ابن ابی طالب علیٰ فراش رسولؐ الله اوحی الله الیٰ جبرئیلؑ و میکائیل انی اخیت بینکما وجعلت عمر احدکما اطول من عمر الآخر فایکما یوثر صاحبه بحیاة فاختارا کلاهما الحیاة واحباها فاوحی الله الیهما افلا کنتما مثل علی ابن ابی طالب اخیت بینه وبین محمد فبات علیٰ فراشه یفدیه بنفسه و یوثره بالحیاة اهبطا الی الارض فاحفظاه

"ہجرت کی شب جب علی ابن ابی طالب بستر رسولؐ پر سوئے تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل و میکائیل کی طرف وحی کی کہ میں نے تم دونوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا ہے کہ ایک کی زندگی دوسرے سے دراز کی ہے تم میں کون ہے جو دوسرے کے لئے زندگی کا ایثار کرے۔ ان دونوں نے اپنے لئے ہی زندگی کو چاہا۔ خدا نے ان دونوں پر وحی کی کہ تم علیؑ کے مثل کیوں نہ ہوئے۔ میں نے انہیں محمد کا بھائی بنایا۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر ان کے بستر پر سو رہے ہیں۔ تم دونوں زمین پر اترو اور جا کر دشمنوں سے ان کی حفاظت

من عدادہ فکان جبرئیل عند راسہ ومیکائیل عند رجلیہ ینادی بخ بخ من مثلک یا ابن ابی طالب تباھی بک الملٰئکۃ فانزل اللہ تعالیٰ "و من الناس من یشری نفسہ ابتغآء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد"

"تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ ص ۳۲۵"

کر دچنانچہ جبرئیل سرہانے اور میکائیل پائنتی کی جانب بیٹھ گئے اور کہنا شروع کیا۔" مبارک ہو اے فرزند ابوطالب! کون ہے تمہارا مثل کہ تمہارے سبب سے اللہ تعالیٰ فرشتوں پر فخر کرتا ہے" اور اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "ایسے بھی لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔"

رسولِ خدا کے روانہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکر آپ کے مکان پر آئے اور انہیں موجود نہ پاکر حضرت علیؑ سے پوچھا کہ رسولؐ اللہ کہاں ہیں؟ فرمایا کہ وہ جبل ثور کی طرف چلے گئے ہیں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو ادھر چلے جائیے۔ حضرت ابوبکر وہاں سے اٹھے اور رسولؐ اللہ کے عقب میں روانہ ہو گئے۔ مورخ طبری نے لکھا ہے کہ:۔

فسمع رسولؐ اللہ جرس ابی بکر فی ظلمۃ اللیل فحسبہ من المشرکین فاسرع رسولؐ اللہ المشی فانقطع قبال نعلہ ففلق ابہامہ حجر فکثر دمھا واسرع السعی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۰۱)

جب رسولؐ اللہ نے رات کے اندھیرے میں ابوبکر کے قدموں کی آہٹ سنی تو یہ خیال کیا کہ مشرکین میں سے کوئی تعاقب میں آ رہا ہے آپ نے رفتار تیز کر دی۔ آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا اور ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی جس سے انگوٹھا زخمی ہو گیا اور بہت سا خون بہہ گیا مگر آپ تیزی کے ساتھ چلتے رہے"

حضرت ابوبکر کو محسوس ہوا کہ وہ پیغمبرؐ کے لئے اذیت کا باعث ہو رہے ہیں انہوں نے بلند آواز سے آنحضرتؐ کو پکارا۔ آپ ابوبکر کی آواز پہچان کر ٹھہر گئے اور انہیں ساتھ لے کر صبح ہوتے جبلِ ثور پر پہنچ گئے اور دونوں ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

ادھر کفار قریش رات بھر گھر کا محاصرہ کئے پڑے رہے اور اندر جھانک کر جب پیغمبرؐ کی خواب گاہ دیکھتے تو یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے کہ پیغمبرؐ چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ جب پو پھٹی تو تلواریں سونت کر اندر داخل ہوئے۔ حضرت علیؑ نے آہٹ پا کر چادر الٹ دی۔ انہوں نے پیغمبرؐ کے بجائے علیؑ کو دیکھا تو چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ محمد کہاں ہیں؟ علیؑ نے کہا کیا میرے سپرد کر گئے تھے جو مجھ سے پوچھتے ہو؟ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ کفار اس جواب پر جزبز ہوئے مگر اس کی تردید بھی تو نہ ہو سکتی تھی۔ ان

کے عزائم ناکام ہو چکے تھے۔ پیغمبرؐ ان کے ہاتھوں سے بچ کر جا چکے تھے۔ انہوں نے جھلا کر اپنی ناکامی کا بدلہ علی سے لینا چاہا اور سختی و تشدد کے ذریعہ پیغمبرؐ کا راز اگلوانا چاہا۔ مگر وہ پوچھ گچھ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر خود ہی کہا کہ ہمیں علیؑ سے کیا سروکار انہیں چھوڑو اور محمدؐ کے تعاقب میں چلو۔

مشرکین قریش کو اب تک تو یہ اطمینان تھا کہ اگر مسلمان یہاں سے جا چکے ہیں تو پیغمبرؐ اکرم تو یہاں موجود ہیں۔ اگر مسلمانوں نے یثرب میں قوت و طاقت حاصل کر بھی لی تو وہ ہمارے خلاف جتھا بازی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ پیغمبرؐ تو ہمارے قبضہ میں ہیں۔ مگر جب پیغمبرؐ اکرم بھی چلے گئے تو انہیں تشویش ہوئی۔ اور انہوں نے اِدھر اُدھر آدمی دوڑائے تاکہ آنحضرتؐ کو تلاش کر کے واپس لائیں۔ کچھ لوگ کھوج لگاتے ہوئے غار ثور تک پہنچ گئے۔ غار ثور سے آگے کوئی نشان قدم تھا اور نہ غار کے اندر داخل ہونے کے آثار۔ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور کبوتروں نے آشیانہ بنا لیا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آنحضرتؐ زمین میں سما گئے یا آسمان پر چڑھ گئے۔ آخر وہاں سے ناکام پلٹے۔ ابو جہل نے اعلان کیا کہ جو آنحضرتؐ کو واپس لائے گا اسے سو اونٹ بطور انعام دیئے جائیں گے۔ سراقہ ابن مالک انعام کے لالچ میں آنحضرتؐ کے تعاقب میں گیا۔ اس نے آنحضرتؐ کو دیکھ بھی لیا۔ مگر ہیبت و جلالِ نبوت سے مرعوب ہو کر واپس آ گیا۔ آپ نے تین شبانہ روز غار میں قیام کیا اور ۵ ربیع الاول کو مدینہ کی سمت روانہ ہوئے اور مدینہ سے تین میل ادھر بنی عمرو ابن عوف کی بستی قبا میں ٹھہر گئے اور علی کے آنے تک وہیں ٹھہرے رہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے بعد حضرت علی تین دن مکہ میں رہے اور جن لوگوں کی امانتیں آنحضرتؐ کی تحویل میں تھیں انہیں واپس کیں اور چوتھے دن فاطمہؑ بنت محمدؐ فاطمہ بنت زبیر اور فاطمہ بنت اسد کو محملوں پر سوار کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریش کو جب یہ معلوم ہوا کہ علی بھی مکہ چھوڑ کر جا چکے ہیں تو انہیں اپنی ذلت کا احساس ہوا اور انہیں روک لینے کے لئے آٹھ سواروں کی ایک دوڑ ان کے تعاقب میں روانہ کی تاکہ انہیں راستہ میں روک لیں اور مجبور کر کے واپس لائیں۔ جب علی مکہ سے پچیس میل کے فاصلہ پر کوہ ضجنان کے قریب پہنچے تو یہ لوگ بھی پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر آپ نے عورتوں کی محملیں پیچھے کی جانب دامنِ کوہ میں ٹھہرا دیں اور خود آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو گھیرے میں لے کر سخت لہجے میں کہا کہ آپ مکہ واپس چلیں اور اگر آپ چلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ہم آپ کو زبردستی لے جائیں گے۔ حضرت نے سنی ان سنی کر دی اور حصار توڑ کر آگے بڑھے۔ حرب ابن امیہ کے غلام جناح نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت کے تیور بدلے۔ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا اور قدم آگے بڑھائے۔ جناح نے حملہ کیا آپ نے اس کا وار خالی دے کر تلوار چلائی اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے ہمراہیوں نے یہ منظر

دیکھا تو خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور جدھر سے آئے تھے ادھر واپس چلے گئے۔ حضرت نے وہ رات کوہ ضجنان کے دامن میں بسر کی اور صبح ہوتے مدینہ کی طرف چل دیے۔ گرمی کا موسم، بادِ سموم کے تھپیڑے، جھلسے ہوئے ریگزاروں اور تپتے ہوئے صحراؤں کا پاپیادہ اور طویل سفر۔ تلووں میں چھالے پڑ گئے تکان و خستگی سے بے حال ہو گئے مگر ایک لگن تھی جو آگے بڑھائے لئے جا رہی تھی اور ایک ولولہ تھا جو کھینچے لئے جا رہا تھا۔ آخر منزلوں پر منزلیں طے کر کے مقام قبا میں آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ رسولؐ خدا نے آگے بڑھ کر انہیں سینے سے لگایا آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اپنے ہاتھوں سے جسم پر پڑی ہوئی گرد جھاڑی اور انہیں ساتھ لے کر مدینہ میں وارد ہوئے۔

حضرت علیؑ نے بستر رسولؐ پر سو کر جس سرفروشی و جانبازی کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا انہیں پیغمبرؐ کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ کفار قریش آنحضرتؐ کے قتل کا فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ آج ہی کی رات ہے جس میں وہ اپنے ناپاک ارادہ کی تکمیل کریں گے۔ ایسے پُر ہول و پُر خطر موقع پر جب کہ چاروں طرف خون کے پیاسوں کا نرغہ تھا کھنچی ہوئی تلواروں کا گھیرا تھا اور ہر آن دشمن کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ اطمینان قلب و سکون خاطر کے ساتھ پیغمبرؐ کی چادر اوڑھ کر ان کے بستر پر سو گئے۔ نہ دشمن کے عزائم سے خوفزدہ ہوئے نہ تلواروں کی چمک سے ہراساں۔ نہ کسی قسم کا حزن و کرب تھا نہ خوف و اضطراب۔ اگر کچھ بھی خوف و خطر محسوس کرتے تو سوتے کے بجائے چوکنا ہو کر بیٹھ جاتے یا صرف آنکھیں بند کر کے لیٹے رہتے۔ مگر آج کی رات اپنی جان سے بے نیاز ہو کر تحفظ رسالت کا فریضہ ادا کرنا تھا اور جاگنے کے بجائے سو کر اطمینان و بے خوفی اور عزم جاں سپاری کی جھلک دکھانا تھی۔ انہیں کوئی تشویش تھی تو یہ پیغمبرؐ کی زندگی پر آنچ نہ آنے پائے اور وہ دشمنوں کے نرغہ سے نکل کر صحیح و سالم منزل مقصود پر پہنچ جائیں اپنی جان رہے یا جائے ؎

من و دل گر فنا شدیم چہ باک ‌‌ ‌ غرض اندر میاں سلامت اوست

اگر اس موقع پر علیؑ آڑے نہ آتے اور اپنی جان کی بازی لگا کر بستر رسولؐ پر نہ سوتے یا اُن کے سامنے سو جاتے اور اُن کے جانے کے بعد بستر چھوڑ کر کسی گوشہ میں چھپ جاتے تو کفار بستر رسولؐ کو خالی پا کر اسی وقت تعاقب میں نکل کھڑے ہوتے اور غار میں پناہ لینے سے پہلے اپنی گرفت میں لے لیتے۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ یا تو پیغمبرؐ کی زندگی ختم کر دی جاتی یا ظاہر اسباب کی بناء پر ہجرت کا ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اور اسلام کے نشر و فروغ کی راہیں جو اس ہجرت کے نتیجہ میں کھلیں نہ کھلتیں اور وہ فتوحات جو اس ہجرت کے بعد حاصل ہوئے کبھی حاصل نہ ہوتے۔ حضرت علیؑ ہی نے تلواروں کے سایہ میں سو کر فتح و نصرت کی راہیں ہموار کیں اور پرچم اسلام کی سربلندی کا سامان کیا۔ بلاشبہ اسلام کا فروغ و استحکام ہجرت کا ثمرہ ہے۔

اور ہجرت کی تکمیل علیؑ کے جان پر کھیلنے کا نتیجہ ہے۔

مواخات

مدینہ میں منتقل ہونے کے بعد مہاجرین و انصار آپس میں اس طرح گھل مل گئے گویا ان میں قومی و وطنی تفرقہ تھا ہی نہیں۔ ان کے رہن سہن اور باہمی تعلقات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب ایک ہی کنبہ کے افراد اور ایک ہی خاندان سے وابستہ ہیں۔ ان کا مال مشترک، عزت و ناموس مشترک اور دکھ سکھ مشترک تھا۔ اور پوری زندگی یگانگت و یکجہتی کا مکمل نمونہ تھی۔ آنحضرتؐ نے اس یگانگت و اخوت کو مضبوط تر کرنے کے لئے جس طرح مکہ میں مسلمانوں کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔ مدینہ میں بھی مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا اور ایک کو دوسرے کا بھائی بنایا تاکہ رنگ، نسل اور قومیت و وطنیت کے امتیازات ختم کر کے ان میں مساوات و برابری کا احساس پیدا کریں اور نتیجۃً وہ تعلقات کی خوشگواری کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں اور محبت، شفقت اور ہمدردی و ایثار کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو کر اتحاد و یکجہتی کا نمونہ قرار پائیں۔

حکماء کے نزدیک اخوت کے روابط متحد الطبائع افراد ہی میں مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اور اگر طبائع میں اتحاد نہ ہو تو وقتی طور پر کسی غرض یا مصلحت کی بناء پر اخوت کا رشتہ جوڑا بھی جائے تو اس میں دوام و استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسی اتحاد و یک رنگیٔ مزاج پر اخوت کی بنیاد رکھی اور رشتۂ اخوت قائم کرنے سے پہلے مختلف افراد کے طبعی رجحان و ذہنی میلان کا جائزہ لے لیا ہوگا اور جن دو فردوں کے اخلاق و عادات میں مماثلت دیکھی ہوگی۔ انہیں آپس میں ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہوگا۔ چنانچہ مکہ میں ابو بکر اور عمر میں، عثمان اور عبدالرحمٰن ابن عوف میں، طلحہ اور زبیر ابن عوام میں بھائی چارہ قائم کیا۔ اور ان کی ہم آہنگی و یکرنگی خلافت، شوریٰ اور جمل کے واقعات سے واضح و عیاں ہے۔ اسی طرح مدینہ میں ذہنی و طبعی رجحانات کو دیکھتے ہوئے حضرت ابو بکر کو خارجہ ابن زید کا، حضرت عمر کو عتبان ابن مالک کا، حضرت عثمان کو اوس ابن ثابت کا، ابو عبیدہ کو سعد ابن معاذ کا، عبدالرحمٰن ابن عوف کو سعد ابن ربیع کا، زبیر کو سلمہ ابن سلامہ کا، طلحہ کو کعب ابن مالک کا، عمار ابن یاسر کو قیس ابن ثابت کا، سلمان فارسی کو ابو الدرداءؓ کا بھائی قرار دیا۔ غرض جو جس سے افتادِ طبع کے لحاظ سے میل کھاتا نظر آیا اسے اس کا بھائی بنایا۔ اور جو جس فضیلت و شرف کا مالک تھا اسی مرتبہ و حیثیت کا بھائی اس کے لئے منتخب فرمایا۔ اس موقع پر پیغمبر نے پینتالیس یا پچاس مہاجرین اور اتنے ہی انصار کو آپس میں بھائی بنا کر اخوت کے مضبوط بندھنوں سے جوڑ

دیا۔ مگر کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا جس سے علیؑ کا رشتۂ اخوت جوڑا جاتا۔ اور کسی سے رشتۂ اخوت جوڑا بھی نہیں جاسکتا تھا اس لئے کہ دعوتِ عشیرہ کے قول و قرار کی رو سے پیغمبرؐ کے بھائی قرار پاچکے تھے۔ پھر بھی اسی عہد اخوت کی تجدید کے لئے جس طرح مکہ میں سلسلۂ اخوت قائم کرتے ہوئے انہیں بھائی قرار دیا تھا مدینہ میں بھی انہیں شرف اخوت سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے:۔

اخی رسول اللہ بین المہاجرین ثم	رسول اللہؐ نے ایک دفعہ مہاجرین کے درمیان بھائی
اخی بین المہاجرین والانصار و	چارہ قائم کیا اور ایک دفعہ مہاجرین و انصار میں۔
قال فی کل واحد منھما لعلی انت	اور دونوں مرتبہ حضرت علیؑ سے فرمایا تم دنیا و آخرت
اخی فی الدنیا والآخرۃ (استیعاب۔ ج۲ ص۴۶۰)	میں میرے بھائی ہو۔"

اس اخوت سے مراد عام اسلامی اخوت نہیں ہے جو آیہ انما المومنون اخوۃ (اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی رو سے سبھی اہل ایمان کو حاصل تھی بلکہ ایک ایسی اخوت مراد ہے جو عام اخوت کی سطح سے بلند تر اور انتہائی قربت و وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ اگر اس سے عام اخوت مراد ہوتی تو علیؑ کو مومن ہونے کے اعتبار سے پہلے ہی سے حاصل تھی بلکہ ابن عم ہونے کی وجہ سے نسلی اخوت بھی حاصل تھی۔ پھر اس مظاہرۂ اخوت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت علی شروع میں اخوت کے لئے منتخب نہ ہونے پر آزردہ خاطر ہوتے اور پیغمبرؐ سے گلہ کرتے۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ نے صحابہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا اور علیؑ کو اخوت کے لئے منتخب نہ کیا تو حضرت کے دل کو ٹھیس لگی اور آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ آپ نے مہاجرین و انصار کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے مگر مجھے نظر انداز کر دیا ہے اور کسی کی اخوت کے قابل سمجھا ہی نہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ شکوہ سنا تو علیؑ کو سینہ سے لگایا اور فرمایا:۔

یا علیؑ انت اخی فی الدنیا والآخرۃ	اے علیؑ تم دنیا میں بھی میرے بھائی ہو اور آخرت
(ترمذی۔ ج۲۔ ص۲۱۳)	میں بھی۔"

اس اخوت نے نہ صرف نسبی اخوت پر جلا کی بلکہ تمام مہاجرین و انصار کے مقابلہ میں علیؑ کی فضیلت و برتری اور اخلاق و کردار میں پیغمبرؐ سے مماثلت کو بھی واضح کر دیا اس لئے کہ یہ انتخاب اس کا ثبوت ہے کہ صرف علیؑ ہی آنحضرتؐ کے صفات کے آئینہ دار اور شرفِ اخوت کے سزاوار تھے اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس اخوت پر فائز ہونے کا اہل نہ تھا۔ اگر ہوتا تو پیغمبرؐ کی نظر اس پر پڑتی اس لئے کہ اس انتخاب کا تعلق نسبی قرابت سے نہیں ہے بلکہ صفات اور عمل و کردار سے ہے اور حضرت علیؑ بھی اسے ایک خصوصیت خاصہ اور معیارِ امتیاز سمجھتے ہوئے اپنے دورِ حکومت میں منبر پر بلند ہو کر فرمایا کرتے تھے:۔

انا عبداللہ و اخو رسول اللہ
(تاریخ ابوالفداء ۔ ج ۱ ۔ ص ۳)

میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسولؐ کا بھائی ہوں۔"

خانہ آبادی

حضرت فاطمہ زہرا جناب خدیجہ کبریٰ کے بطن سے پیغمبرؐ اکرم کی عزیز ترین بیٹی تھیں۔ بعثت کے پانچویں سال مکہ میں ولادت ہوئی۔ اور ابھی پانچ ہی برس کا سن تھا کہ خدیجۃ الکبریٰ دنیا سے رحلت فرما گئیں۔ ماں کی آغوش شفقت چھننے کے بعد تربیت کی تنہا ذمہ داری پیغمبرؐ پر آپڑی۔ آپ شب و روز کی کاوشوں اور رسالت کی مصروفیتوں کے باوجود اس گوہر یکتائے عصمت و طہارت کی دیکھ بھال بھی کرتے اور تعلیم و تربیت میں بھی پوری توجہ فرماتے اور ان کے فطری گوہر کو اپنے علمی و عملی تعلیمات سے اس طرح نکھارا کہ کمسنی ہی میں زنانِ عالم کے لئے نمونۂ عمل قرار پائیں۔ اگر ایک طرف شکل و صورت میں پیغمبرؐ کی تصویر تھیں تو دوسری طرف ان کے محاسن و کمالات کا بھی کامل ترین مرقع تھیں۔ اگر چلتی تھیں تو پیغمبرؐ کے چلنے کا شبہ ہوتا تھا اور بولتی تھیں تو ترجمانِ وحی کے بولنے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ اور دامنِ رسالت میں پرورش پاکر اس مرتبہ عالیہ پر فائز ہوئیں کہ پیغمبرؐ انہیں عدیلۂ مریم اور سیدۃ نساء العالمین کے لقب سے یاد فرماتے۔ اور جب پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں آئیں تو آنحضرتؐ بیساختہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں :-

کانت اذا دخلت علیہ قام الیھا فقبلھا و رحب بھا و اخذ بیدھا فاجلسھا مجلسہ
(مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ ص ۱۶۰)

جب جناب فاطمہؑ رسولِ خدا کے پاس آتیں تو آنحضرتؐ کھڑے ہو جاتے۔ بوسہ دیتے۔ خوش آمدید کہتے اور ہاتھ تھام کر انہیں اپنی مسند پر بٹھاتے۔"

مدینہ منورہ میں ورود کے بعد جناب سیدہ سن بلوغ کو پہنچیں تو قریش کے سرکردہ افراد کی طرف سے خواستگاری کے پیغام آنے لگے۔ ایک صاحب کو اپنی دولت پر غرہ تھا اس نے گرانبہا مہر کی پیش کش کرکے خواستگاری کی مگر آنحضرتؐ نے کچھ لوگوں کے پیغام پر منہ کو پھیر لیا اور صاف جواب دے دیا اور کچھ لوگوں کے جواب پر فرمایا ان امرھا الی ربھا ان شاء ان یزوجھا زوجھا۔" فاطمہؑ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جہاں چاہے گا نسبت ٹھہرا دے گا۔" جب رسولؐ کی طرف سے کسی کو ہمت افزا جواب نہ ملا تو بعض صحابہ نے حضرت علیؑ کو مشورہ دیا کہ آپ پیغمبرؐ کے ابن عم اور قریب ترین عزیز ہیں آپ کا خون ایک اور خاندان ایک ہے۔ آپ

بھی پیغام دیجئے اور خواستگاری کیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ درخواست کریں اور پیغمبرؐ انکار کر دیں۔ فرمایا کہ مجھے آنحضرتؐ سے عرض کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے اصرار کیا تو کہا اچھا کسی مناسب موقع پر آنحضرتؐ سے عرض کروں گا۔ چنانچہ ایک دن ضروری کاموں سے فارغ ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک گوشہ میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ پیغمبرؐ نے آپ کو خاموش دیکھا تو سمجھ گئے کہ اس خاموشی کے پردہ میں کوئی عرضداشت چھپی ہوئی ہے۔ فرمایا کہ علی کچھ کہنا چاہتے ہو؟ عرض کیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھر کہو۔ علی کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔ نگاہوں کو نیچا کر کے دبی زبان میں کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے مجھے بچپن سے پالا پوسا ہے۔ مجھ پر آپ کے احسانات ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہیں اب میں مزید احسان کا امیدوار ہو کر حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر آنحضرتؐ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فرمایا کچھ دیر توقف کرو میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور فاطمہ زہراؑ سے کہا کہ بیٹی! علی رشتہ کی درخواست لے کر آئے ہیں تمہاری کیا مرضی ہے؟ فاطمہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا سکوتھا اقرارھا۔ "خاموشی اظہار رضامندی ہے۔" اور باہر تشریف لا کر علی سے بشاش چہرے کے ساتھ فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہو گا۔ اب تم زرِ مہر کا سروسامان کرو۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے پاس زرہ، تلوار اور ایک اونٹ ہے فرمایا کہ تلوار اور اونٹ رہنے دو۔ زرہ زائد ہے اسے فروخت کر ڈالو۔ آپ نے وہ زرہ حضرت عثمان کے ہاتھ چار سو اسی درہم میں فروخت کر دی اور اس رقم کو بطور مہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے ان درہموں میں سے کچھ درہم حضرت ابوبکر کو دیئے اور عمار یاسر اور چند صحابہ کو ان کے ہمراہ کر دیا تاکہ وہ گھر گرہستی کا سامان خرید لائیں اور کچھ درہم بلال کو دیئے اور فرمایا کہ اس رقم سے خوشبو کا سامان عطر و غالیہ خرید لاؤ۔

ماہِ ذی قعدہ ۲ھ کو مسجد نبویؐ میں محفل عقد آراستہ ہوئی۔ صحابہ نے شرکت فرمائی۔ آنحضرتؐ نے خطبہ دیا فصاحت کی کلیاں چٹکیں۔ بلاغت کے پھول کھلے اور طرفین سے ایجاب و قبول ہوا اور یہ مبارک تقریب انتہائی سادگی کے ساتھ آنحضرتؐ کی دعائے خیر و برکت پر ختم ہوئی۔ ماہِ ذی الحجہ ۲ھ میں رخصتی عمل میں آئی۔ پیغمبرؐ نے دعوت ولیمہ کے سلسلہ میں گوشت اور روٹیوں کا سروسامان کیا اور علیؑ نے روغن اور کھجوریں مہیا کیں۔ دعوت کا اعلان عام تھا۔ سب مہاجر و انصار شریک ہوئے۔ زن و مرد نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اللہ نے اس کھانے میں ایسی برکت دی کہ سب نے سیر ہو کر کھایا، پھر بھی کھانا بچ رہا۔ اس بچے ہوئے کھانے میں سے ایک طبق علیؑ و فاطمہؑ کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور ایک ایک خوان ازواجِ پیغمبرؐ کے گھروں میں تقسیم کے لئے بھیجا گیا۔

سردارِ دو عالمؐ کی دختر اور سرزمین حجاز کی متمول ترین خاتون جناب خدیجہ کی بیٹی کو جو جہیز دیا گیا وہ یہ

تھا۔ ایک پیراہن ایک اوڑھنی ایک خیبری سیاہ سرپیچ ایک کھجور کی رسیوں سے بنی ہوئی چارپائی دو توشکیں ایک میں اُون بھری ہوئی اور دوسری میں کھجور کی چھال۔ طائف کے چمڑے کے چار تکئے جن میں گیاہ اذخر کے ریشے بھرے ہوئے تھے۔ ایک چٹائی ایک صوف کا پردہ ایک چکی ایک تانبے کا لگن ایک چھوٹا مشکیزہ ایک بڑی مشک ایک گھڑا ایک بڑا پیالہ ایک لوٹا اور مٹی کے چند پیالے۔ ان تمام چیزوں کی مجموعی قیمت اسی درہم تھی۔ جب آنحضرتؐ نے اپنی عزیزہ بیٹی کے جہیز کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور سر آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا اللّٰھم بارك لقوم جل آنیتھم الخزف۔ خدایا! ان ان لوگوں کو برکت دے جن کے برتن زیادہ تر مٹی کے ہوتے ہیں۔"

جب دن نے اپنا دامن سمیٹا، رات نے اپنے سیاہ پردے آویزاں کئے عقد پروین نے جبین فلک پر افشاں چنی اور مشاطہ فطرت نے عروس سپہر کو ستاروں سے آراستہ کیا تو پیغمبرؐ اکرم نے جناب فاطمہؑ کو اپنے خچر شہبار پر سوار کیا۔ تکبیر کی آوازوں سے فضائے مدینہ گونج اٹھی۔ ہر طرف سے خیر و برکت کی صدائیں بلند ہوئیں تحمید و تقدیس کے نغمے در و دیوار سے ٹکرائے۔ انصار و مہاجرین کی عورتیں رجز پڑھتی ہوئی ساتھ ساتھ، سلمان فارسی باگ پکڑے ہوئے آگے آگے۔ پیغمبرؐ اکرم اور تمام بنی ہاشم تلواریں علم کئے پیچھے پیچھے۔ اس شان و شکوہ سے یہ جلوس روانہ ہوا اور مسجد نبویؐ کا طواف کرنے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچا۔ آنحضرتؐ نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر علیؑ کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا بارك الله لك فی ابنة رسول الله۔ "علی تمہیں دخترِ رسولؐ مبارک ہو۔" پھر پانی کا ایک پیالہ طلب کیا اور اس میں سے ایک گھونٹ منہ میں لے کر اسی میں انڈیل دیا اور علیؑ و فاطمہؑ کے سر و سینہ پر چھڑکا۔ اور فرمایا:۔

اللّٰھم بارك فیھما و بارك علیھما	بارِ الٰہا ان دونوں کو برکت دے ان دونوں پر
و بارك فی نسلھما۔	برکت نازل کر اور ان کی نسل و اولاد میں بھی
(اصابہ۔ ج ۴۔ ص ۳۶۵)	برکت دے۔"

اس تقریب پُر تبریک کے بعد جب علیؑ و فاطمہؑ کے ہاں آئے تو پھر ان کے حق میں خیر و برکت کی دعا کی اور یادگارِ خدیجہؑ کو اپنے گھر میں بستے آباد ہوتے دیکھ کر خوش خوش واپس ہوئے۔

ابناءِ رسولؐ

یہ رشتہ ازدواج اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک طرف اس سے نسلِ رسولؐ کا سلسلہ قائم

رہا اور دوسری طرف ان دشمنانِ دین کی روسیاہی کا سامان ہوا جنہوں نے آنحضرتؐ کو ابتر (بے اولاد) کا خطاب دے رکھا تھا۔ اگرچہ پیغمبرؐ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی مگر حسنؑ و حسینؑ فرزندانِ دختر ہونے کے اعتبار سے ابناءِ رسولؐ قرار پائے اور انہی دونوں سے آپ کی نسل پھولی پھلی دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور پیغمبرؐ کی نسبت سے ذریت رسولؐ کہلائی۔ چنانچہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ عزوجل جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ وان اللہ تعالیٰ جعل ذریتی فی صلب علیؑ ابن ابی طالب۔	خداوند عالم نے ہر نبی کی ذریت کو اس کے صلب میں قرار دیا اور میری ذریت کو علیؑ ابن ابی طالب کے صلب میں قرار دیا ہے۔"

(صواعق محرقہ۔ ص۱۵۴)

اولاد صلبی ہو یا دختری دونوں اولاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اولادِ دختری کو اولاد نہ سمجھنا زمانۂ جاہلیت کے غلط نظریات کی پیداوار ہے۔ اس دور میں بعض افراد اس کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے کہ وہ اپنی لڑکیوں کا ازدواجی رشتہ قائم کر کے انہیں دوسروں کی کنیزی میں دے دیں۔ یہاں تک کہ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا عزت کا معیار قرار پا چکا تھا۔ اور جن قبائل میں لڑکیاں ہلاکت سے بچ کر بیاہی جاتی تھیں۔ ان کی اولاد کو اولاد ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر عرب ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے:

بنونا بنوا ابنائنا و بناتنا ۔۔۔ بنوهن ابناء الرجال الاباعد

"ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہمارے بیٹے ہیں۔ رہے ہماری لڑکیوں کے بیٹے تو وہ اجنبی لوگوں کے فرزند ہیں۔"

پیغمبرِ اسلام نے فرزندانِ دختری کو فرزند قرار دے کر دورِ جاہلیت کی غلط ذہنیت پر کاری ضرب لگائی اور اس حقیقت کو عملاً نمایاں کیا کہ جس طرح پسر کی اولاد اولاد ہوتی ہے۔ اسی طرح دختر کی اولاد بھی اولاد ہے اور نسبت مادری بھی اعتبار کے اسی درجہ پر ہے جس درجہ پر نسبتِ پدری۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ جب بھی فرزندانِ زہراؑ کا ذکر کرتے تو انہیں بیٹا کہہ کر یاد کرتے۔ اور حسنین علیہما السلام بھی انہیں باپ کہہ کر خطاب کرتے۔ اور امیر المومنین کو باپ کے بجائے یا ابا الحسن کہہ کر پکارتے۔ البتہ وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد انہیں باپ کہہ کر پکارنا شروع کیا اور امیر المومنینؑ بھی انہیں اولادِ فاطمہ ہونے کی بناء پر فرزندانِ رسولؐ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جنگ صفین میں جب امام حسن علیہ السلام قتال کے لئے آگے بڑھے تو آپ نے فرمایا:۔

املکوا عنی هذا الغلام لایهدنی فانی انفس بهذین علی الموت	میری طرف سے اس جوان کو روک لو اس کی موت مجھے خستہ و بے حال نہ کر دے کیونکہ میں ان دونوں

لئلا ینقطع بهما نسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ۔ (نہج البلاغہ)

نوجوانوں (حسن و حسین) کو موت کے منہ میں دینے سے بخل کرتا ہوں کہ کہیں ان کے مرنے سے رسولؐ اللہ کی نسل قطع نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ ابو الجارود نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے امام حسنؑ و امام حسینؑ کے فرزندانِ رسولؐ ہونے پر آیۂ مباہلہ ابناءنا و ابناءکم سے ثبوت پیش کیا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ دختر کی اولاد اولاد تو ہوتی ہے مگر صلبی اولاد نہیں ہوتی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں حرام عورتوں کے سلسلہ میں فرمایا ہے:۔

وحلائل ابناءکم الذین من اصلابکم۔

اور تمہارے صلبی لڑکوں کی بیویاں (تم پر حرام کی گئیں")

تم ان معترضین سے دریافت کرو کہ کیا پیغمبرؐ کے لئے حسنین علیہما السلام کی بیویوں سے نکاح جائز تھا؟ اگر وہ یہ کہیں کہ جائز تھا تو یہ صریحاً غلط ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ جائز نہیں تھا تو وجہ حرمت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی صلبی اولاد کی ازواج تھیں جنہیں اللہ نے اس آیت میں حرام ٹھہرایا ہے۔

ابن بابویہ قمی رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے کہ جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون رشید کے ہاں طلب کئے گئے تو اس نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ تم اولادِ رسولؐ کہلاتے ہو۔ حالانکہ تم اولادِ علی ہو۔ اور سلسلۂ نسب باپ سے چلتا ہے نہ ماں سے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر رسولِ اکرم دوبارہ دنیا میں تشریف فرما ہوں اور تم سے رشتہ طلب کریں تو کیا تم اسے قبول کرو گے؟ کہا سر آنکھوں پر۔ یہ رشتہ ہمارے لئے عرب و عجم میں باعث صد افتخار ہوگا۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا:۔

لکنه لا یخطب الی ولا ازوجه لانه ولدنی ولم یلدك۔ (عیون الاخبار)

لیکن وہ ہم سے رشتہ طلب نہیں کر سکتے اور نہ ہم انہیں رشتہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم ان کی اولاد ہیں اور تم ان کی اولاد نہیں ہو"

محمد ابن طلحہ شافعی نے مطالب السئول میں تحریر کیا ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی کو معلوم ہوا کہ شعبی جب بھی حسن و حسین علیہما السلام کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں فرزندانِ رسولؐ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ حجاج اس پر برافروختہ ہوا اور انہیں باز پرس کے لئے اپنے ہاں طلب کیا۔ جب شعبی اس کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ مجلس میں کوفہ و بصرہ کے علماء اعیان جمع ہیں۔ حجاج نے شعبی سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم حسنؑ اور حسینؑ کو فرزندانِ رسولؐ کہتے ہو، حالانکہ وہ ان کے بیٹے نہ تھے بلکہ اُن کی بیٹی فاطمہؑ کے بیٹے تھے اور سلسلۂ نسب ماں سے نہیں چلتا

کرتا۔ شعبی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر اس آیت کی تلاوت کی:۔

ومن ذریته داؤد وسلیمان و ایوب و یوسف و موسیٰ و ھارون کذلک نجزی المحسنین و زکریا و یحییٰ و عیسیٰ و الیاس کل من الصالحین۔	اور ابراہیمؑ کی نسل میں سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی ہدایت کی اور ہم یونہی نیکو کاروں کو صلہ دیتے ہیں۔ اور زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو ہدایت کی یہ سب خدا کے نیک بندوں میں سے تھے۔

اس آیت کی تلاوت کے بعد کہا کہ اس میں حضرت عیسیٰ کو بھی ذریت ابراہیمؑ میں شمار کیا گیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ وہ مادری سلسلہ سے ان تک منتہی ہوتے ہیں۔ جب مریم بنت عمران کی نسبت سے حضرت عیسیٰ کو ذریت ابراہیم میں شمار کیا جا سکتا ہے تو فاطمہؑ بنت رسولؐ کی نسبت سے حسن وحسین کو ذریتِ رسولؐ میں سے کیوں نہیں سمجھا جا سکتا جب کہ صورت یہ ہے کہ جناب مریمؑ اور حضرت ابراہیمؑ میں تیس پشتوں کا فاصلہ حائل ہے اور یہاں فاطمہؑ اور رسولؐ میں کوئی واسطہ حائل نہیں ہے۔ یہ سن کر حجاج خاموش ہو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

ایک مرتبہ عمرو ابن عاص نے بھی امیرالمومنین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ وہ حسنؑ وحسینؑ کو فرزندان رسولؐ کہتے ہیں حالانکہ وہ فرزندانِ رسولؐ نہ تھے۔ حضرت نے سنا تو فرمایا کہ اس دشمن خدا اور رسولؐ سے کہو کہ اگر وہ فرزندانِ رسولؐ نہیں ہیں تو پھر آنحضرتؐ ابتر (بے اولاد) قرار پائیں گے جیسا کہ اس کا باپ عاص ابن وائل آں حضرت کو اسی لفظ ابتر سے یاد کیا کرتا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے بجائے ان کے دشمنوں کو ابتر کہا ہے۔

معاویہ کا غلام ذکوان بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ نے کہا کہ حسنؑ وحسینؑ کو فرزندانِ رسولؐ کہنے کے بجائے فرزندانِ علیؑ کہنا چاہیئے کیونکہ وہ صلبِ رسولؐ سے نہیں ہیں بلکہ صلبِ علیؑ سے ہیں۔ ذکوان کہتا ہے کہ اس کے بعد معاویہ نے مجھے مامور کیا کہ میں ان کی اولاد کی فہرست ترتیب دے کر پیش کروں۔ میں نے اُن کے بیٹے بیٹیوں اور پوتوں کے نام لکھ کر پیش کر دیئے۔ معاویہ نے فہرست کو دیکھا تو کہا کہ تم نے میرے نواسوں کے نام درج نہیں کیئے؟ میں نے کہا کہ وہ تمہاری اولاد کی فہرست میں کیسے آسکتے ہیں وہ تو تمہاری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ معاویہ نے میری بات کو تاڑ کر کہا کہ خاموش رہو۔" ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد"

حیرت ہے کہ معاویہ نے اپنے باپ کی ناجائز اولاد زیاد ابن سمیہ کو تو ابوسفیان کا بیٹا تسلیم کر لیا جو سراسر آئین اسلام کے خلاف تھا۔ مگر جنہیں اللہ نے بھی فرزندِ رسولؐ کہا ہو اور خود رسولؐ نے بھی، اُن کی

فرزندی سے ہمیشہ انکار ہی رہا۔

خطبۂ بنت ابی جہل

حضرت علیؑ نے جناب فاطمہ زہراؑ کی زندگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں کیا اور نہ ہی ان کی موجودگی میں دوسرے عقد کا ارادہ کیا۔ مگر کچھ دسیسہ کاروں نے حضرت علیؑ کو مطعون کرنے کے لئے ایک بے سروپا روایت گھڑ لی کہ حضرت علیؑ نے ابوجہل کی بیٹی سے جس کا نام جویریہ یا جمیلہ بیان کیا جاتا ہے عقد کرنا چاہا اور یہ امر پیغمبرؐ کو انتہائی ناگوار گزرا اور آپ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ مسور ابن مخرمہ بیان کرتا ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوجہل کی لڑکی سے رشتہ کرنا چاہا۔ جب جناب فاطمہ کو علم ہوا تو وہ رسولؐ اللہ کے پاس شکوہ لے کر آئیں۔ اور کہا کہ آپ کے قوم و قبیلہ والے آپ کے متعلق یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی ذرا پاسداری نہیں کرتے اب علی آپ کی بیٹی پر سوت لا رہے ہیں اور ابوجہل کی لڑکی سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ سنا تو چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:۔

انی لست احرم حلالا ولا احل حراما ولکن واللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ و بنت عدو اللہ عند رجل واحد۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ صہ ۴۱۳)	میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا لیکن خدا کی قسم رسولؐ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی دونوں ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔"

اس سلسلہ کی ایک روایت یوں ہے کہ مسور ابن مخرمہ نے آنحضرتؐ کو منبر پر فرماتے سنا کہ بنی ہشام ابن مغیرہ نے مجھ سے اجازت مانگی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ علی ابن ابی طالب سے کریں۔

فلا اذن ثم لا اذن ثم لا اذن الا ان یحب ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی وینکح ابنتھم۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ صہ ۴۱۳)	میں اجازت نہیں دیتا، میں اجازت نہیں دیتا میں اجازت نہیں دیتا مگر یہ کہ فرزند ابو طالب چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے دے اور ان کی لڑکی سے نکاح کر لے۔"

اس قسم کی اور بھی مختلف و مضطرب روایتیں ہیں جو مسور ابن مخرمہ پر منتہی ہوتی ہیں۔ یہ شخص عبدالرحمٰن ابن عوف کا بھانجا تھا اور ہجرت کے دو سال بعد مکہ میں پیدا ہوا اور ۸ھ کے اواخر میں مدینہ آیا۔ ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے:۔

ولد بمكة بعد الهجرة بسنتين فقدم به ابوه المدينة فى عقب ذى الحجة سنة ثمان۔

"ہجرت کے دو سال بعد مکہ میں پیدا ہوا اور اواخر ذی الحجہ ۸ھ میں اپنے باپ کے ساتھ مدینہ آیا۔"

(تہذیب التہذیب۔ ج ۱۰۔ ص ۱۵۱)

صاحب اصابہ نے تحریر کیا ہے:۔

كان مولده بعد الهجرة بسنتين وقدم المدينة فى ذى الحجة بعد الفتح سنة ثمان وهو غلام ايفع ابن ست سنين۔ (اصابہ۔ ج ۳۔ ص ۳۹۹)

"ہجرت کے دو برس بعد پیدا ہوا اور فتح مکہ کے بعد ذی الحجہ ۸ھ کو مدینہ آیا اور اس وقت وہ چھ برس کا نوخیز بچہ تھا۔"

مکہ ۸ھ میں فتح ہوا اور یہ خواستگاری کا واقعہ بھی ۸ھ میں یا اس کے بعد ہوا ہو گا کیونکہ فتح مکہ سے پہلے ابو جہل کی اولاد اسلام نہ لائی تھی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب بلال نے خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر اذان دی تو اسی جویریہ بنتِ ابی جہل نے اپنے کفر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا:۔

لقد اكرم الله ابى حين لم يشهد نهيق بلال فوق الكعبة۔

"خدا نے میرے باپ کو اس سے محفوظ رکھا کہ وہ کعبہ میں بلالؓ کی بے ہنگم آواز سنتا۔"

(تاریخ ابو الفداء۔ ج ۱۔ ص ۱۴۵)

اور کسی کافرہ و مشرکہ سے تو نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیران کن امر یہ ہے کہ بزرگ صحابہ تو خاموش نظر آتے ہیں اور ایک زائد سے زائد چھ سال کا بے شعور بچہ جو ان معاملات کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا بڑے شد و مد سے اس اہم واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ حدیثِ قرطاس کے سلسلہ میں ابنِ عباس کی صغر سنی پر جرح و قدح کرنے والے علما اس مجہول و نامعروف بچے کی طفلانہ شوخی کو اٹھائے پھرتے ہیں حالانکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو مخفی رہ ہی نہیں سکتا تھا اور جس کی شہرت عام ہونا چاہیئے تھی۔ خصوصاً عورتوں کے طبقہ میں اس کا عام چرچا ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے باوجود اس زمانہ کے زن و مرد کا خاموش رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ سرے سے غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو امیر شام جنہوں نے برائی ڈھونڈھ نکالنے کا کوئی گوشہ نہ چھوڑا تھا کسی موقع پر تو اس کا ذکر کرتے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ کو اپنی زندگی میں اکثر ایسے مواقع پیش آئے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتیں۔ مگر ان کا بھی اس معاملہ میں سکوت ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ یہ قطعاً من گھڑت بچوں کی کہانی ہے۔

اس کے علاوہ حضرت علی کی سیرت پر نظر کرنے سے بھی یہ واقعہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت کی تاریخ حیات میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپ نے پیغمبر اکرمؐ کے حکم یا مشورہ کے بغیر کوئی قدم اٹھایا ہو یا کوئی ایسا اقدام کیا ہو جس میں پیغمبرؐ کی ذرا سی ناگواری کا اندیشہ محسوس کیا ہو اور نہ آپ کی پاکیزہ فطرت اس کی روادار ہو سکتی تھی کہ آپ ایسی بات کا تصور بھی کریں جو رسول اللہ کی ادنیٰ ناراضی کا باعث ہو سکتی ہو تو ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ نہ اپنے ولی و سرپرست سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کریں اور نہ اُن کی رضا و عدم رضا کا خیال کریں اور بالا ہی بالا رشتہ طے کرنے لگ جائیں جب کہ ابو جہل کی اولاد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کا عندیہ معلوم کریں شاید انہیں یہ گوارا نہ ہو کہ اُن کی دختر پر سوت آئے۔ اور پھر اس واقعہ کے سلسلہ میں جو کلمات آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان کی صحت پر وہی اعتماد کرے گا جو منصب نبوت کے تقاضوں سے بے خبر ہو۔ منصب نبوت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ جذبات سے بلند تر ہو کر حلالِ خدا کو حلال کہیں اور حرامِ خدا کو حرام اور ذاتی لگاؤ کی بنا پر اس میں کوئی تفریق پیدا نہ کریں۔ لہٰذا ہماری عقلیں یہ باور نہیں کر سکتیں کہ جس رسولؐ نے شرعی احکام کے سلسلہ میں کبھی ذاتی تعلقات کا لحاظ نہ کیا ہو وہ محض اپنی بیٹی کی محبت میں خدا کے حلال کردہ امر کی مخالفت کریں گے۔ رسولؐ تو بڑی ہستی ہیں جب کہ احکامِ خدا و رسولؐ کا تھوڑا سا پاس و لحاظ رکھنے والے شہنشاہ جن کا غرورِ شاہی احکامِ خدا و رسولؐ کو پس پشت ڈالنے کے لئے آمادہ رہتا ہو وہ بھی ایسے موقع پر بیٹی کی محبت کا خیال نہ کرتے ہوئے احکامِ خدا و رسولؐ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے مشہور شہنشاہ مامون عباسی نے اپنی بیٹی ام الفضل کا عقد امام محمد تقی سے کیا اور امام اسے اپنے ہمراہ مدینہ لے گئے۔ مدینہ سے اس نے اپنے باپ مامون کو تحریر کیا کہ امام محمد تقی نے کچھ کنیزیں بھی اپنے گھر میں ڈال لی ہیں۔ مامون نے سیخ پا ہونے کے بجائے اپنی بیٹی کو تنبیہہ کرتے ہوئے لکھا:۔

الا لم نزوجك له لنحرم عليه حلالا فلا تعودی لمثله۔	ہم نے ان سے تمہارا عقد اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کے لئے حلالِ خدا کو حرام قرار دیں لہٰذا آئندہ ایسی بات نہ دہرائی جائے۔
(صواعق محرقہ۔ ج۔ ص ۱۲۳)	

جب مامون ایسے حکمران اور دنیوی فرمانروا کو حلالِ خدا کا اتنا پاس ہو کہ وہ اپنی بیٹی کی شکایت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھے تو پیغمبر اکرمؐ جو حلال و حرامِ خدا کی تعلیم دینے آئے تھے۔ ان کے متعلق کیونکر یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ حلالِ خدا کا کوئی لحاظ و پاس نہ کریں گے اور اپنی بیٹی پر سوت آجانے کے خیال سے اتنا برافروختہ ہوں گے کہ مسلمانوں کے بھرے مجمع میں منبر پر اپنی خفگی و ناراضی کا اعلان فرمائیں گے۔ کیا آنحضرت حضرت علی کو بھی

چکے تھے اور وہ مخالفت و نافرمانی پر اصرار کر رہے تھے کہ اب منبر پہ اس کا ذکر ضروری ہو گیا تھا یا یہ بھی کوئی شرعی حکم کی حیثیت رکھتا تھا جس کی علانیہ تبلیغ ضروری تھی کہ رسولؐ کی بیٹی اور دشمنِ خدا کی بیٹی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ کیا اس موقع پر یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جب کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ رسولؐ خدا کی بیٹیاں کافروں اور خدا کے دشمنوں سے بیاہی گئیں تو ایک دشمن خدا کی بیٹی جو مسلمان بھی ہو چکی ہو دخترِ رسولؐ کے ساتھ کیوں جمع نہیں ہو سکتی۔ اور پھر خود رسول اللہؐ کے ازواج میں کافر و مسلم باپ کی بیٹیاں موجود تھیں اور آپ نے ام حبیبہ بنت ابو سفیان اور صفیہ بنت حی سے عقد کے وقت یہ خیال نہ کیا کہ یہ دشمنانِ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ تو جس چیز پہ آنحضرتؐ نے خود عمل فرمایا ہو اور اُسے برا نہ سمجھا ہو اسے دوسرے کے لئے معیوب قرار دینا کہاں تک روا اور انصاف کا متقاضی ہو سکتا ہے۔

امر واقعہ تو یہ ہے کہ جب کچھ لوگوں کو امیر المومنین میں کوئی نقص و عیب ڈھونڈھے سے نہ مل سکا، اور کوئی بات بنائی بھی تو اس کا تار پود بکھر گیا تو انہوں نے تنقیص کا وہ طریقہ اختیار کیا جو کسی کی تنقیص کا موثر ترین ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تنقیص کا پیرایہ بیان ہمدردانہ ہو۔ چنانچہ یہاں پر راوی تاثر تو یہ دیتا ہے کہ وہ جناب سیدہؑ کی فضیلت اور پیغمبرؐ کی نگاہوں میں ان کی اہمیت دکھانا چاہتا ہے مگر تنقیص کرتا ہے علیؑ کی اور وہ بھی پیغمبر اکرمؐ کی زبان سے اگر صرف حضرت علیؑ کی تنقیص ہوتی تو ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کے آنسو پنچھ جاتے مگر یہاں تو اس نے خود رسولؐ کی بھی تنقیص کر دی اس طرح کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو الگ بلا کر سمجھانے کے بجائے ایک مجمع کر کے خطبہ دے ڈالا اور خطبہ بھی ایسا جو قرآنی اجازت کے بھی خلاف اور خود عملِ رسولؐ کے بھی خلاف۔ روایت کے اس پہلو اور اس کے اضطراب و اختلاف کو دیکھ کر اربابِ بصیرت خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ روایت کسی واقعہ پہ مبنی نہیں بلکہ صرف اس ہستی کی توہین و تنقیص کے لئے وضع کی گئی ہے۔ جس سے رسولؐ آخر وقت تک خوش اور انتہائی خوش رہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت اس قابل نہ تھی کہ اس کا تذکرہ کیا جاتا اور بہتر بھی یہی تھا کہ جو شے اکابر صحابہ کی زبان پر نہیں آئی وہ ہماری زبان قلم پر بھی نہ آتی۔ مگر اس خیال سے کہ صحاح سے لے کر شعراء کے قصائد تک میں اس کا ذکر آیا ہے اور ایک طبقہ نے اسے خوب خوب اچھالا ہے اس پہ اجمالی تبصرہ کیا ہے۔

ازواج و اولاد

امیر المومنین نے جناب فاطمہ زہراؑ کی عظمت و منزلت کے پیشِ نظر ان کی زندگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں

کیا البتہ ان کے انتقال کے بعد مختلف اوقات میں مختلف قبائل میں چند عقد کئے ان ازواج سے متعدد اولادیں ہوئیں حضرت کی ازواج و اولاد کی تفصیل یہ ہے :۔

حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہا :۔ ان کے بطن اطہر سے ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ میں امام حسن اور ۳ یا ۵ شعبان المعظم ۴ھ میں امام حسین پیدا ہوئے ۔ تاریخ میں ایک تیسرے صاحبزادے کا بھی نام آتا ہے جن کا نام محسن تھا ۔ بعض کے نزدیک وہ صغر سنی میں انتقال کر گئے اور بعض کے نزدیک قبل ولادت ایک حادثہ میں ساقط ہو گئے ۔ یہ حادثہ تاریخ اسلام کا ایک المیہ ہے جو وفات پیغمبرؐ کے ایک آدھ دن بعد پیش آیا ۔ اور دو صاحبزادیاں پیدا ہوئیں ایک زینب کبریٰ جن کا لقب عقیلہ تھا اور ایک زینب صغریٰ جن کی کنیت ام کلثوم تھی ۔ جناب زینب کبریٰ کی شادی عبداللہ ابن جعفر سے ہوئی اور جناب ام کلثوم کا عقد محمد ابن جعفر سے ہوا ۔

امامہ بنت ابی العاص :۔ حضرت نے جناب سیدہؑ کی وصیت کے مطابق ان سے عقد کیا ۔ ان کے بطن سے محمد الاوسط متولد ہوئے جو جنگ کربلا میں لڑ کر شہید ہوئے ۔

ام البنین بنت حزام کلابیہ :۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے بھائی عقیل سے کہا کہ آپ انساب عرب سے خوب واقف ہیں میرے لئے ایسی خاتون کا انتخاب کیجئے جو عرب کے شجاع و بہادر خاندان سے رکھتی ہو تا کہ اس سے جو اولاد ہو وہ دلیر و شجاع ہو ۔ عقیل نے کہا کہ آپ ام البنین کلابیہ سے عقد کریں کیونکہ ان کے آباؤ اجداد سب کے سب عرب کے مانے ہوئے دلیر اور شجاع گزرے ہیں ۔ چنانچہ حضرت نے ام البنین سے عقد کیا ۔ جن سے چار فرزند پیدا ہوئے ۔ عباس، عبداللہ، عثمان اور جعفر ۔ عباس ۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ۔ پھر عبداللہ پیدا ہوئے پھر عثمان جو عبداللہ سے دو برس چھوٹے تھے اور پھر جعفر جو عثمان سے دو برس چھوٹے تھے ۔ یہ چاروں کے چاروں کربلا میں یزیدی لشکر کی خون آشام تلواروں سے شہید ہوئے ۔

لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ :۔ ابن اثیر نے کامل میں اور ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان کے بطن سے دو صاحبزادے ابوبکر اور عبیداللہ پیدا ہوئے اور بعض نے ان دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے ۔ شیخ عباس قمی نے منتہی الآمال میں تحریر کیا ہے کہ ان سے محمد الاصغر اور ابوبکر پیدا ہوئے ۔ سید محسن امین نے اعیان الشیعہ میں لکھا ہے کہ بظاہر یہ دونوں ایک ہی ہیں ۔ محمد الاصغر نام ہے اور ابوبکر کنیت ہے ۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے بھی اسے کنیت ہی قرار دیا ہے ۔ یہ بھی جنگ کربلا میں شہید ہوئے ۔

اسما بنت عمیس خثعمیہ :۔ ابن اثیر نے کامل میں تحریر کیا ہے کہ محمد الاصغر انہی کے بطن سے متولد ہوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان سے یحییٰ اور عون پیدا ہوئے ۔ یحییٰ حضرت کی زندگی ہی میں انتقال

کر گئے اور عون معرکۂ کربلا میں شہید ہوئے۔

ام حبیب صہبا بنت ربیعہ تغلبیہ :۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ عمر الاطراف اور ایک صاحبزادی رقیہ کبریٰ جڑواں پیدا ہوئے۔ رقیہ کبریٰ، مسلم ابن عقیل سے بیاہی گئیں۔

خولہ بنت جعفر حنفیہ :۔ ان کے بطن سے محمد پیدا ہوئے جو ابن حنفیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی کنیت ابو القاسم تھی ۸۱ھ میں طائف میں وفات پائی۔

ام سعید بنت عروہ ثقفیہ :۔ ابن شہر آشوب نے تحریر کیا ہے کہ ان کے بطن سے نفیسہ، زینب صغریٰ اور رقیہ صغریٰ متولد ہوئیں۔ اور سید محسن امین نے لکھا ہے کہ ان سے ام الحسن اور ام کلثوم صغریٰ پیدا ہوئیں اور بعض نے لکھا ہے کہ ام کلثوم نفیسہ ہی کی کنیت تھی۔

ام شعیب مخزومیہ :۔ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے کہ ام الحسن اور رملہ دو صاحبزادیاں ان سے پیدا ہوئیں۔

محیاۃ بنت امراء القیس :۔ ان سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جو بچپن میں وفات پا گئیں۔

ان ازواج کے علاوہ متعدد کنیزیں بھی تھیں جن سے چند لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے نام یہ ہیں :۔ ام ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ، رملہ صغریٰ، فاطمہ امامہ خدیجہ، ام الکرام ام سلمہ ام جعفر، جمانہ اور نفیسہ۔

حضرت کی شہادت کے وقت امامہ، اسما بنت عمیس اور ام البنین اور اٹھارہ کنیزیں موجود تھیں۔ آپ کی اولاد امجاد امام حسنؑ، امام حسینؑ، محمد ابن حنفیہ عباس اور عمر الاطراف سے چلی۔ اولاد ذکور و اناث کی تعداد بعض نے پچیس بعض نے ستائیس بعض نے اٹھائیس بعض نے تینتیس اور بعض نے چھتیس تک لکھی ہے۔ اس اختلاف کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ بعض نے نام اور کنیت کو دیکھتے ہوئے دو الگ الگ اولادیں قرار دے لیں اور بعض نے انہیں ایک ہی شمار کیا۔ اسی طرح بعض نے محسن کو شمار کیا ہے اور بعض نے شمار نہیں کیا۔

تعمیر مسجد و فتح باب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ میں نزول اجلال فرمانے کے بعد سات ماہ تک ابو ایوب انصاری کے مکان پر قیام فرما رہے۔ اس عرصہ میں نہ نماز کے لئے کوئی جگہ مخصوص تھی اور نہ رہائش کے لئے کوئی مستقل منزل تھی۔ آپ نے گھر کی تعمیر کے ساتھ مسجد کی تعمیر بھی ضروری سمجھی اور ابو ایوب کے مکان سے متصل ایک افتادہ زمین جس میں مویشی بندھے رہتے تھے تعمیر مسجد کے لئے منتخب فرمائی۔ یہ زمین جناب عبد المطلب کے ننھیال بنی نجار کی تھی۔ آنحضرتؐ نے ان سے یہ قیمت خریدنا چاہی مگر انہوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور زمین

کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ ہم قیمت کے بجائے ثواب اخروی چاہتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے اسے قیمت ادا کئے بغیر لینا گوارا نہ کیا لیکن کیونکہ دراصل وہ زمین بنی نجار کے دو یتیم بچوں کی تھی جن کے نام سہل اور سہیل تھے اور اسعد ابن زرارہ کی زیرتربیت تھے۔ آنحضرتؐ نے اسعد کے ذریعہ وہ زمین بہ قیمت خرید فرمائی اور اسے ہموار کرکے اس پر مسجد کی تعمیر شروع کردی۔ جو چند دنوں میں قد آدم چار دیواری کی صورت میں تیار ہوگئی اور بعد میں لکڑی کے کھمبے کھڑے کرکے اس کے ایک حصہ پر گھاس پھوس کی چھت ڈال دی گئی۔ مسجد کی ایک سمت ازواج کے لئے دو حجرے بھی تعمیر کئے گئے جن میں حسب ضرورت بعد میں اضافہ ہوتا رہا۔ انہی حجروں کے وسط میں علی ابن ابی طالب کا گھر تعمیر کیا گیا اور مکہ سے آنے والے مہاجرین نے بھی مسجد کی دوسری سمتوں میں گھر بنا لئے۔ ان گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے اس لئے مسجد ہی کی طرف سے اُن کی آمدورفت تھی اور لوگ جس حالت میں ہوتے ادھر سے آتے جاتے اور اسی سے گزرگاہ کا کام لیتے رہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے مسجد کی تقدیس کے منافی سمجھتے ہوئے حکم دیا کہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں صرف حضرت علی کو اجازت دی کہ وہ اپنے گھر کا دروازہ مسجد کی طرف کھلا رکھیں اور ادھر ہی سے آیا جایا کریں۔ ترمذی نے تحریر کیا ہے:۔

ان النبیؐ امر بسد الابواب الا باب علیؑ۔ (صحیح ترمذی۔ ج ۲۔ ص ۲۱۴)

"پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ علیؑ کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں۔"

یہ حکم بعض طبیعتوں پر شاق گزرا۔ کچھ پیشانیوں پر بل پڑے، کچھ زبانیں کھلیں اور آپس میں چہ گوئیاں ہونے لگیں۔ پیغمبر اکرمؐ کو صحابہ کی اس ناگواری کا علم ہوا تو آپ نے انہیں جمع کرکے فرمایا:۔

ما انا سددت ابوابکم ولا فتحت باب علی ولکن اللّٰہ سد ابوابکم و فتح باب علی۔

(خصائص نسائی۔ ص ۳۷)

"میں نے تمہارے دروازوں کو بند نہیں کیا اور نہ میں نے علیؑ کے دروازہ کو کھلا رہنے دیا ہے بلکہ اللہ نے تمہارے دروازوں کو بند کیا اور علیؑ کے دروازہ کو کھلا رہنے دیا ہے۔"

آنحضرتؐ کے بعض عزیزوں نے بھی چاہا کہ ان کے گھروں کے دروازے کھلے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے علی کو اجازت دے دی ہے اور ہمیں منع کر دیا ہے آپ نے فرمایا:۔

ما انا اخرجتکم و اسکنتہ ولکن اللّٰہ اخرجکم و اسکنہ۔

(مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ ص ۱۱۷)

"میں نے نہ تمہیں نکالا ہے اور نہ علیؑ کو ٹھہرایا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے اور علیؑ کو ٹھہرایا ہے۔"

حضرت عمر بھی اسے امیرالمومنینؑ کے امتیازی خصوصیات میں سے شمار کرتے ہوئے کہا کرتے تھے:۔

لقد اعطی علی ابن ابی طالب ثلاثہ خصال لان تکون لی خصلۃ منھا احب الی من ان اعطی حمر النعم قیل وما ھن یا امیرالمومنین؟ قال تزوجہ فاطمۃ بنت رسول اللہ وسکناہ المسجد مع رسولؐ اللہ یحل لہ فیہ ما یحل لہ والرایۃ یوم خیبر۔

(مستدرک حاکم ۳۔ ص۱۲۵)

علی ابن ابی طالب کو تین ایسی خصوصیتیں حاصل تھیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی تو وہ مجھے سرخ بالوں والے اونٹوں سے زیادہ پسند ہوتی۔ پوچھا گیا کہ اے امیرالمومنین وہ خصوصیتیں کیا ہیں؟ کہا ایک تو یہ کہ فاطمہؑ بنت رسولؐ اللہ ان کے عقد میں آئیں، دوسرے یہ کہ انہیں رسولؐ اللہ کے ساتھ مسجد میں رہائش پذیر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور جو امور رسولؐ کے لئے اس میں جائز تھے وہ ان کے لئے بھی جائز قرار پائے اور تیسرے یہ کہ انہیں خیبر کے دن علم دیا گیا۔"

ابراہیم حموینی نے فرائد السمطین میں تحریر کیا ہے کہ حدیث فتح باب کو تقریباً تیس صحابہ نے روایت کیا ہے اور اسے امیرالمومنینؑ کی منقبت خاصہ قرار دیا ہے مگر کتب اہلسنت میں جہاں یہ روایت درج ہے وہاں یہ روایت بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

لا تبقین فی المسجد خوخۃ الا خوخۃ ابی بکر۔

ابو بکر کی کھڑکی کے علاوہ مسجد میں اور کوئی کھڑکی باقی نہ رہے۔"

جب پہلی روایت کی تضعیف یا اس سے انکار کی گنجائش نہ نکل سکی تو ان دونوں روایتوں کی تطبیق دینے کی کوشش کی گئی اور یہ کہا گیا کہ پہلی روایت ہجرت کے سالِ اوّل کا واقعہ ہے اور دوسری روایت کا تعلق پیغمبرؐ کے آخری زمانۂ حیات سے ہے یعنی آنحضرتؐ نے جب پہلی مرتبہ دروازوں کے چنوانے کا حکم دیا تو حضرت علیؑ کے علاوہ سب کے دروازے چنوا دیئے۔ اور جب وقتِ وفات قریب آیا تو حضرت ابو بکر کے دریچے کے علاوہ تمام دریچے بند کرا دیے اور اس طرح یہ سمجھ لیا گیا کہ دونوں روایتوں کی گرہ کشائی ہو گئی۔ لیکن دو مختلف روایتوں میں تطبیق کی ضرورت تو وہاں پر ہوتی ہے جہاں دونوں روایتوں کا پلہ سنداً اور درایۃً برابر ہو۔ اور یہاں دوسری روایت غریب ہونے کے علاوہ درایت کے بھی سراسر خلاف ہے اس لئے کہ حضرت ابو بکر کا کوئی مکان مسجد سے متصل تھا ہی نہیں کہ کھڑکی کے کھلا رکھنے یا بند کرنے کی نوبت آئے وہ ہجرت کے بعد بنی عبد عوف کے ہاں مقیم ہوئے اور پیغمبرؐ کے آخر زمانۂ حیات میں مدینہ سے باہر ایک گاؤں سخ میں رہتے تھے جو مسجد سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور پیغمبرؐ کے زمانۂ علالت میں انہیں دیکھنے کے لئے وہیں سے آتے تھے اور پھر وہیں چلے

جاتے تھے۔ چنانچہ مورخ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ پیغمبرؐ کی وفات کے دن مدینہ آئے اور پیغمبرؐ کی حالت دیکھی کہ :-

قد افاق من وجعه فرجع ابوبکر الیٰ اھلہ بالسنح (تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۴۲)	آنحضرتؐ کو درد سے افاقہ ہے تو وہ سنح میں اپنے گھر والوں کے پاس چلے گئے "

حیرت ہے کہ جب وہ مقام سنح میں رہتے سہتے تھے اور وفات پیغمبرؐ کے موقع پر بھی مدینہ میں موجود نہ تھے اور نہ مسجد سے متصل ان کا کوئی مکان تھا تو کھڑکی کہاں سے لائی گئی اور کہاں نصب کی گئی۔ اور پھر جب کہ یہ واقعہ پیغمبرؐ کے آخری ایام کا بتایا جاتا ہے جیسا کہ ترمذی کے حواشی پر تحریر ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات میں تین دن یا اس سے کم دن باقی ہوں گے کہ آنحضرتؐ نے تمام کھڑکیوں کو بند کرنے اور ابوبکر کی کھڑکی کے کھلا رہنے کا حکم دیا تو اس بنا پر جمعہ یا ہفتہ کے دن یہ فرمان نبویؐ صادر ہوا ہو گا اس لئے کہ پیر کے دن آنحضرتؐ کی وفات ہوئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ حکم واقعہ قرطاس کے بعد کا ہے کیونکہ واقعہ قرطاس جمعرات کو ہوا جب کہ پیغمبرؐ نے صحابہ کو باہمی نزاع اور شوروشغب سے منع کیا اور انہیں اٹھ جانے کا حکم دیا اگر کاغذ اور قلم کے طلب کرنے پر پیغمبرؐ کے لئے اختلال حواس تجویز کیا جا سکتا ہے تو اس کے بعد والے حکم کے لئے کیوں یہ رائے قائم نہیں کی گئی۔ جب کہ گھر کے بغیر کھڑکی کے کھلا رہنے کا حکم سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں ہے۔

یہ روایت خلاف درایت ہونے کے علاوہ لفظاً و معناً مضطرب بھی ہے اس لئے کہ کہیں لفظ خوخہ (کھڑکی) ہے اور کہیں لفظ باب (دروازہ) ہے اور دونوں کا مفہوم الگ الگ اور معنی جدا جدا ہیں یہ اضطراب و اختلاف روایت کو مشکوک اور پایۂ اعتبار سے ساقط کرنے کے لئے کافی ہے اور درصورتیکہ روایت میں لفظ خوخہ کے بجائے باب تسلیم کیا جائے تو دونوں روایتوں میں تطبیق کی جو صورت پیدا کی گئی ہے وہ یہاں منطبق نہ ہو سکے گی اس لئے کہ اگر پیغمبرؐ اکرم نے ابتدائے زمانہ ہجرت میں حضرت علیؑ کے علاوہ سب کے دروازے چنوا دیئے تھے تو آخری ایام میں تمام دروازوں کے بند کرنے اور حضرت ابوبکر کے دروازہ کو کھلا رکھنے کا حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے جب کہ بشمول ابوبکر سب کے دروازے بند دیئے گئے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابتدا ہی میں دونوں کے دروازوں کا کھلا رکھنے کا حکم دیا تھا تو یہ روایات و واقعات کے سراسر خلاف ہے اور اگر ایسا ہوتا تو جنہوں نے فتح باب کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا ذکر کیا ہے وہ حضرت ابوبکر کا بھی ذکر کرتے اور اور حضرت عمر بھی اسے علیؑ کے خصوصیات و امتیازات میں سے قرار نہ دیتے۔

اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ دوسروں کے دروازوں کو چنوانے اور علیؑ کے دروازہ کو کھلا رکھنے

میں کیا مصلحت کارفرما تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی غرض و غایت مسجد کی تقدیس و پاکیزگی کا اظہار تھا۔ چونکہ صحابہ کے گھروں کے دروازے صحن مسجد میں کھلتے تھے اور وہ ادھر ہی سے ہر حالت میں آتے جاتے تھے اور یہ امر مسجد کی تقدیس کے منافی تھا۔ لہذا پیغمبرؐ نے مسجد میں کھلنے والے تمام دروازے چنوا دیئے تاکہ مسجد ظاہری و باطنی نجاستوں سے پاک رہے اور لوگ حالتِ جنابت میں ادھر سے گزرنے اور اس میں ٹھہرنے نہ پائیں۔ اور اور چونکہ حضرت علیؑ کی یہ خصوصیت خاصہ تھی کہ وہ طیب و طاہر اور ظاہری و معنوی نجاستوں سے پاک تھے اس لئے ان کے لئے کسی حالت میں مسجد میں آنے جانے اور اس میں ٹھہرنے کی ممانعت نہ تھی جس طرح کہ خود پیغمبر اکرم کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:۔

یا علی لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری و غیرك۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۴)

"اے علیؑ اس مسجد میں میرے اور تمہارے علاوہ کسی کے لئے حالتِ جنب میں ہونا جائز نہیں۔"

اسی طہارت و تقدیس کی بنا پر اوروں کے دروازے چنوا دیئے اور اپنا اور علی کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور جس طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے گھر کو ان کے لئے مسجد قرار دیا گیا تھا اسی طرح پیغمبرؐ اور وصیٔ پیغمبرؐ کے لئے جو مثیلِ موسیٰؑ و ہارونؑ تھے مسجد کو قیام گاہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:۔

ان اللہ امر موسیٰ ان یبنی مسجد طاھرا لا یسکنہ الا ھو و ھارون و ان اللہ امرنی ان ابنی مسجدا طاھرا لا یسکنہ الا انا و علیؑ و ابناء علیؑ۔ (خصائص سیوطی۔ صفحہ ۲۴۳)

"خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ وہ ایک پاک و پاکیزہ مسجد تعمیر کریں اور اس میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے علاوہ کوئی اور سکونت اختیار نہ کرے اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میں ایک پاکیزہ مسجد تعمیر کروں جس میں میرے اور علیؑ اور ان کے دونوں بیٹوں کے علاوہ کوئی اور رہائش نہ رکھے۔"

جب یہ امر صرف پیغمبرؐ، علیؑ اور ان کی اولاد اطہار کے لئے مخصوص تھا اور کوئی اس شرف و پاکیزگی میں ان کا شریک و سہیم نہ تھا تو کسی اور کے لئے دروازہ یا کھڑکی کے کھلا رکھنے کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی۔ اگر حضرت ابوبکر کو بھی یہ خصوصیت حاصل ہوتی تو البتہ ان کے لئے بھی دروازہ یا کھڑکی کا کھلا رکھنا تجویز ہو سکتا تھا۔ مگر جب وہ اس خصوصیت کے حامل ہی نہ تھے تو ان کے لئے کھڑکی یا دروازہ کے کھلا رکھنے کے معنی ہی کیا ہیں جب کہ وہ حکم عمومی کے ماتحت ادھر سے گزرنے کے مجاز نہ تھے۔ اور پھر لفظ خوخہ کے معنی کھڑکی کے کب ہیں کہ ادھر سے آنے جانے کی صورت پیدا کی جا سکے بلکہ اس کے معنی روشندان کے ہیں جیسا

کہ فیروز آبادی نے قاموس میں لکھا ہے: کوۃ تودی الضوء الی البیت۔ "وہ سوراخ جس سے گھر کے اندر روشنی آتی ہے۔" اور عادۃً روشندان سے گزرگاہ کا کام کس طرح لیا جاسکتا ہے جب کہ روشندان دیوار کے بالائی حصہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا جب روشندان سے آمد و رفت ہی نہیں ہو سکتی تو پھر اس سے کون سی فضیلت کا اثبات مقصود ہے۔

عہدِ نبویؐ کے غزوات

آنحضرتؐ بعثت کے بعد تیرہ برس تک مشرکین مکہ کے مظالم سہتے رہے اور جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو کفار و مشرکین کے خلاف انتقامی کارروائی کا کوئی تصور آپ کے ذہن میں نہ تھا لیکن مشرکین قریش جو اپنے منصوبوں کی ناکامی پر پیچ و تاب کھا رہے تھے اور آنحضرتؐ کے جان بچا کر نکل جانے پر کفِ افسوس مل رہے تھے فتنہ و شورش کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کرنے کے بعد انہیں اطمینان و جمعیت خاطر سے محروم کرنے اور اسلام کی توسیع و ترقی کو روکنے کے لئے حرب و پیکار پر اتر آئے اور اس بے سروساماں جماعت کو اپنی طاغوتی طاقتوں سے کچلنے کا تہیہ کر لیا۔ پیغمبرِ اسلام جنہوں نے مکہ میں پرامن طریقہ سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہا تھا اور مدینہ میں قبائل یہود سے صلح و امن کا تحریری معاہدہ کیا تھا وہ قریش کی شرانگیزیوں کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ جنگ کی نوبت آئے اور کشت و خون کی گرم بازاری ہو مگر قریش کی شرپسندی و فتنہ انگیزی نے جب مسلمانوں کے سکون و اطمینان کو ختم کر دینا چاہا اور جنگ ان کے سروں پر مسلط کر دی تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ جارحانہ حملوں کے خلاف مدافعانہ قدم اٹھایا جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اس وقت تک جنگ کا نام نہیں لیا اور نہ کسی کو لڑنے بھڑنے کی اجازت دی جب تک قریش و یہود نے آپ کو جنگ کے لئے مجبور نہیں کر دیا اور قدرت نے کفار کے بڑھتے ہوئے ظلم و تشدد کو روکنے کے لئے جہاد کی اجازت نہیں دے دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔	جن (مسلمانوں) کے خلاف (کافر) لڑا کرتے ہیں اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے اس بنا پر کہ ان پر مظالم ہوئے اور یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔"

یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ کفار نے پہلے مسلمانوں کو جلاوطن کیا اور پھر ان کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اس صورت میں اگر ان کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کیا جاتا تو خود مسلمانوں کی ملی بقا خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔ بے شک اسلام امن و سلامتی کا محافظ اور صلح و آشتی کا پیغامبر ہے مگر اس

کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دشمن کی چیرہ دستیوں اور شورش انگیزیوں کو دیکھتے ہوئے خاموش رہا جائے اور انہیں من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ اللہ نے مظلوم وستم رسیدہ لوگوں کو حق دیا ہے کہ وہ دشمن کی بڑھتی ہوئی ستیزہ کاریوں کے انسداد اور اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے امکانی جدوجہد کریں اور جس جماعت سے جینے اور سانس لینے تک کا حق چھین لیا جائے اور اسے تباہی وہلاکت کے گڑھے میں دھکیلنے کا فیصلہ کر لیا جائے اس کے لئے جنگ کے علاوہ چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اگر جنگ مذموم اور قابل نفرت ہے تو اس امر مذموم کے ارتکاب کا الزام اس پر عائد ہوگا جس نے از خود جنگ چھیڑ کر انسانی حقوق پر دست درازی کی ہو اور کمزور و ناتوان کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا ہو۔ لیکن جو مظلوم کی حمایت فتنہ کے انسداد جماعتی حقوق کے تحفظ اور اعتقاد و عمل کی آزادی کے لئے دشمن سے ٹکرائے وہ ہرگز ہرگز موردِ الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسلام "سلم" سے مشتق ہے جس کے معنی 'صلح' کے ہیں۔ اس نام ہی سے ظاہر ہے کہ اسلام بنیادی طور پر خونریزی کا مخالف، حرب و پیکار کا دشمن اور تمام عالم کے لئے امن و سلامتی کا پیغام ہے اور اس میں رنگ و نسل اور قوم و وطن کے تعصب اور عقائد کے اختلاف کی بناء پر فوج کشی و صف آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اور نہ ملک گیری کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے دور کا واسطہ ہے۔ اسلام صرف دو صورتوں میں جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ ایک یہ کہ دشمن مسلمانوں کے استیصال کے لئے مرکزِ اسلام پر حملہ آور ہو اور جنگ کے بغیر جان و مال اور ناموس کا تحفظ ممکن نہ ہو۔ اور دوسری صورت یہ کہ دشمن جنگی تیاریوں میں سرگرم عمل ہو۔ اور ڈھیل دینے کی صورت میں اس کی عسکری قوت و مادی وسائل کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ انہی دو صورتوں میں جب کہ جنگ ناگزیر تھی۔ پیغمبرِ اسلام نے علمِ جنگ بلند کیا اور مسلمانوں کو اجازت دی۔ کہ وہ حفاظتِ خود اختیاری اور حیاتِ ملی کے قیام و بقاء کے لئے دشمن سے لڑیں۔ اگرچہ ابتداء میں مسلمان کفار کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے کمزور تھے مگر دشمن کی کثرت و قوت اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود میدانِ حرب و ضرب میں اتر آئے کبھی بدر کے کنوؤں پر ان سے ٹکرائے کبھی اُحد کی پہاڑیوں میں لڑے اور کبھی مدینہ کے حدود میں رہ کر مدافعت کی۔ یہ مقامات محل وقوع کے لحاظ سے دارالاسلام مدینہ سے قریب اور دارالکفر مکہ سے فاصلہ پر واقع ہیں۔ ان جنگی محاذوں کا نقشہ دیکھ کر ہر بابصیرت انسان بآسانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ جارحانہ اقدام کس کی طرف سے ہوا اور مدافعانہ قدم کس نے اٹھایا۔ اگر اسلام کا اقدام جارحانہ ہوتا تو جنگوں کی جائے وقوع کو دشمن کے مسکن سے قریب ہونا چاہیئے تھا اور مسلمانوں کے محل وقوع سے دور تر۔ لیکن ہر محاذِ جنگ اسلام کے مرکز سے قریب نظر آتا ہے اور کفار کے مرکز سے دور۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ پیش قدمی دشمن کی جانب سے ہوئی اور مسلمان ان کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے صف آرا ہوئے۔ البتہ خیبر ایک ایسی جگہ ہے جو اسلامی

مرکز سے دور اور یہودیوں کی جائے قرار تھی۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جو عہد شکنی کے نتیجہ میں مدینہ سے نکالے گئے تھے اور اب ایک گراں لشکر کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہے تھے اور اڑوس پڑوس کے قبیلوں سے معاہدہ کر کے جنگی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ اگر پیغمبر اسلام پیشقدمی نہ کرتے اور آگے بڑھ کر ان کا راستہ نہ روکتے تو وہ جنگی ہتھیاروں اور دل بادل فوجوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوتے اور مسلمانوں کے لئے اس امنڈتے ہوئے سیلاب کو روکنا مشکل ہو جاتا۔

اسلام نے اگرچہ ان ناگزیر حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے مگر جنگ کے مختلف مراحل آغاز اثنا اور اختتام کے لئے ایسی ہدایات دی ہیں جو اسلام کی امن پسندی اور انسان دوستی کے آئینہ دار ہیں اسلامی نقطۂ نظر سے کسی خونریز اقدام سے پہلے دعوتِ اسلام دینا ضروری ہے تاکہ محارب گروہ اگر اسلام سے متاثر نہ بھی ہو تو کم از کم اس پر یہ واضح ہو جائے کہ جنگ کا مقصد انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا، مالِ غنیمت سمیٹنا یا بچے کھچے لوگوں کو غلام بنانا نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کو عام کر کے ایک امن پسند معاشرہ تعمیر کرنا ہے۔ اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اپاہجوں، مزدوروں، امن پسندوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے اور اندھا دھند خون بہانے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ جنگ حنین میں جب خالد ابن ولید نے ایک عورت کو قتل کر دیا تو آنحضرتؐ نے اپنی خفگی و برہمی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں کہلوا بھیجا کہ وہ کسی عورت، بچے یا مزدور پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ اکرم نے صحابہ کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ جنگ کے دوران مشرکین کے بچوں کو قتل نہ کرنا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ تو مشرکوں کی اولاد ہیں۔ فرمایا: اولیس خیارکم اولاد المشرکین۔ " کیا تم میں کے اچھے لوگ مشرکوں کی اولاد نہیں ہیں "۔ اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے سامانِ رسد کھانے پانی وغیرہ میں رکاوٹ پیدا کی جائے انہیں ضروریاتِ زندگی سے محروم کیا جائے اور بلاوجہ ان کے باغوں، کھیتوں کو اجاڑا پھلدار درختوں کو کاٹا اور عمارتوں کو گرایا جلایا جائے اسی طرح اسلامی تعلیمات کی رو سے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید اور انہیں جلانا اور برہنہ کرنا انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ اسلام نے مفتوحین و بقیۃ السلف کے ساتھ بھی بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور ان سے فدیہ لے کر یا انہیں ممنونِ احسان کر کے چھوڑ دینے کی تعلیم دی ہے۔ اور اگر بعض حالات میں انہیں اسیری وغلامی کی صورت میں رکھنا پڑے تو ان کے ساتھ خصوصی مراعات کی تاکید کی ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیغمبرؐ اسلام کے بعد اسلام کے نام پر کچھ جارحانہ جنگیں بھی لڑی گئیں جن میں اخلاقی حدود اور جہاد اسلامی کے شرائط و آداب کو نظر انداز کیا گیا۔ اگرچہ ایک طبقہ نے قہر و غلبہ کو حق کا معیار قرار دے کر اس قسم کی جنگوں کو بھی جہاد اسلامی میں شامل کر لیا ہے اور قتل و

خونریزی کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی کامیابی کو حق وصداقت کی کامیابی کا نام دیا ہے۔ مگر اسلام نہ ایسے اقدامات کا حامی ہے اور نہ ان جنگوں کی ذمہ داری اسلام پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ نہ وہ اسلامی تعلیمات کے زیر اثر لڑی گئیں اور نہ ان میں کوئی اسلامی مفاد مضمر تھا۔ اسلام کا واضح اعلان ہے کہ لا اکراہ فی الدین "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے" اور قرآن مجید میں جس قدر آیتیں جہاد کے متعلق وارد ہوئی ہیں وہ انہی مواقع کے لئے ہیں جہاں دشمن اسلام کی آواز کو قوت وطاقت سے دبانے اور مسلمانوں کی جمعیت کو کچلنے کے لئے لشکر کشی کرتا ہے۔ اسلام کی طرف سے نہ جارحانہ اقدام کی اجازت ہے اور نہ زبردستی اپنے عقائد ٹھونسنے کی۔ ان جنگوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو ان شاہنشاہوں پر جنہوں نے ملک گیری وکشور کشائی کے لئے فوج کشی کی اور گردو پیش کے امن پسند ملکوں کو جہاد کی آڑ میں پامال کیا اور اس طرح امن عامہ میں خلل ڈال کر اسلام کی صلح جوئی وامن پسندی کو داغدار کر دیا اور اپنے مردم آزار طرز عمل سے کچھ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ اسلام کا پھیلاؤ تلوار اور دباؤ کا مرہون منت ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد عہد رسالت کے چند مشہور غزوات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ایک طرف جنگوں کا دفاعی پہلو اجاگر کیا جا سکے اور دوسری طرف ان غزوات کے فاتح وعلمبردار حضرت علیؑ کی مثالی کارکردگی اور عدیم النظیر شجاعت پر روشنی پڑ سکے۔ حضرت علیؑ نے تبوک کے علاوہ تمام جنگوں میں پورے جوش وولولہ سے حصہ لیا اور اپنی خداداد قوت سے دشمنوں کے پرے الٹے مگر کسی مرحلہ پر نہ اخلاقی قیود کو توڑا اور نہ اسلامی حدود کے باہر قدم رکھا۔ چنانچہ نہ کسی عورت اور بچے پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا کیا نہ کسی زخمی پر ہاتھ ڈالا اور نہ کسی کی پردہ دری کی۔ اور تاریخ میں ایسی مثالیں چھوڑ گئے جنہیں ہمیشہ اسلام کی اصول پرستی، صلح پسندی اور امن دوستی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا رہے گا۔

غزوۂ بدر

قریش مسلمانان مکہ کے درپے ایذا تو تھے ہی۔ ہجرت کے بعد انصار مدینہ بھی ان کے عتاب کی زد میں آگئے۔ انہوں نے انصار مدینہ پر یہ فرد جرم عائد کی کہ انہوں نے پیغمبرؐ کو اپنے ہاں پناہ دے کر نہ صرف ان کی حمایت وحفاظت کا ذمہ لیا ہے بلکہ اسلام کی روز افزوں ترقی کا بھی سامان کر دیا ہے۔ قریش جس دین کو اپنے ہاں پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکتے تھے وہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ اسے کہیں اور ترقی، عروج اور فروغ حاصل ہو اور مسلمان ان کی قاہرانہ گرفت سے نکل کر آزادانہ سانس لیں۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے معاشرتی وروایتی آداب و

رسوم کے تحفظ کے لئے اس نئے دین کو پنپنے نہ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا نہ دیں یا اسلام سے دستبردار ہونے پر مجبور نہ کردیں۔ چنانچہ قرآن مجید ان کے عزائم کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔

"یہ کفار ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔"

یہود مدینہ نے اگرچہ پیغمبرؐ اکرم کی آمد پر ان سے یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ مگر پیغمبرؐ کی بڑھتی ہوئی قوت و طاقت کو دیکھ کر انہیں خود اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا تو انہوں نے قریش سے رابطہ قائم کرلیا اور قریش نے بھی اُن سے گٹھ جوڑ کرکے ایک مشترکہ محاذ بنالیا اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔ چنانچہ فتنہ و باہم آویزی کو ہوا دینے کے لئے کرز ابن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کیا اور اہل مدینہ کے مویشی ہنکا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ آنحضرتؐ نے وادیٔ سفوان تک اس کا پیچھا کیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ ان حالات میں ضرورت تھی کہ ان لوگوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے تاکہ بروقت ان کی فتنہ انگیزیوں کا تدارک کیا جاسکے۔ اسی دیکھ بھال کے لئے آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن جحش کو چند آدمیوں کے ہمراہ نخلہ کی جانب روانہ کیا جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک مشہور جگہ تھی۔ جب یہ لوگ نخلہ میں وارد ہوئے تو قریش کا ایک قافلہ جو طائف سے مال تجارت لے کر آرہا تھا فروکش ہوا۔ عبداللہ ابن جحش کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص واقد ابن عبداللہ تمیمی نے عمرو ابن الحضرمی کو تیر مار کر ہلاک کردیا اور عثمان ابن عبداللہ اور حکم ابن کیسان کو گرفتار کرلیا گیا۔ عبداللہ ابن جحش ان دونوں اسیروں اور قافلہ کے مال و متاع کو سمیٹ کر مدینہ چلے آئے۔ یہ واقعہ چونکہ ماہ رجب کی آخری تاریخ میں ہوا تھا جس میں جنگ و قتال ممنوع ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن جحش کو سرزنش کی اور دونوں اسیروں کو آزاد اور قافلہ کا لوٹا ہوا مال واپس کردیا۔ اگرچہ یہ ایک انفرادی فعل تھا جو پیغمبرؐ کی اجازت کے بغیر سرزد ہوا مگر اس سے قریش کو جنگ چھیڑنے کا بہانہ مل گیا اور انہوں نے ابن الحضرمی کے قصاص کا ڈھنڈورا پیٹ کر جنگی تیاریاں شروع کردیں اور یہ طے کیا کہ ابوسفیان کی واپسی پر مسلمانوں پر حملہ کردیا جائے۔ ابوسفیان تجارتی قافلہ لے کر شام گیا ہوا تھا اور اسے واپسی پر مدینہ کی طرف سے گزرنا تھا۔ کیونکہ مدینہ قریش کے قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ ادھر اہل مکہ اس کی واپسی کے منتظر تھے کہ اس نے شام سے پلٹتے ہوئے اہل مکہ کو ضمضم ابن عمرو غفاری کے ذریعہ یہ غلط اور شرانگیز پیغام بھیجا کہ مسلمان دھاوا بول کر مال تجارت لوٹنا چاہتے ہیں لہذا تم جنگی ہتھیاروں کے ساتھ نکل کھڑے ہو۔ قریش پہلے ہی سے جنگ کے لئے آمادہ تھے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

ادھر ابوسفیان نے عام راستا چھوڑ کر ساحل سمندر کا راستا اختیار کیا اور پانچ دن میں جدہ اور جدہ سے تین دن میں مکہ پہنچ گیا۔ جب قریش کا لشکر بدر کے قریب پہنچا تو اسے قافلہ کے صحیح وسالم پہنچنے کی اطلاع ملی۔ بنی زہرہ کے چند آدمیوں نے کہا کہ قافلہ تو آچکا ہے اب جنگ کی کیا ضرورت ہے ہمیں واپس پلٹ جانا چاہیئے۔ مگر ابوجہل جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہُوا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ابوجہل کی ضد اور ہٹ دھرمی سے صاف ظاہر ہے کہ قریش کے پیش نظر قافلہ کا بچاؤ نہ تھا بلکہ وہ ہر حالت میں جنگ چھیڑنا اور اہل مدینہ پر تاخت و تاراج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ قریش کی اس روش کو دیکھ کر بنی زہرہ واپس چلے آئے اور جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

مدینہ میں یہ خبر تو عام ہو چکی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ باربردار اونٹوں پر سامانِ تجارت لاد کر ادھر سے گزرے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ لشکر قریش پورے جنگی سازوسامان کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہا ہے۔ مسلمان کم اور بے سروسامانی کی حالت میں تھے اور قریش کی مسلح و منظم فوج سے دوبدو ہو کر لڑنے سے بچنا چاہتے تھے اور رہ رہ کر ان کی نظریں رہگزر کی طرف اٹھتی تھیں کہ ابوسفیان سے مڈبھیڑ ہو جائے تو بہتر ہے۔ ایک تو گنتی کے چند آدمیوں کا مقابلہ دشوار نہ ہو گا اور دوسرے مالِ فراواں آسانی سے ہاتھ لگے گا۔ قرآن اس کی شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم۔	جب اللہ نے تمہیں اطلاع دی کہ کفار مکہ کے دو گروہوں میں سے ایک سے تمہارا سامنا ہو گا اور تم لوگ یہ چاہتے تھے کہ جو قوت و طاقت نہیں رکھتا وہ تمہارے حصہ میں آئے۔"

عام طور پر مؤرخین نے اموی ہوا خواہوں کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے یہ لکھ ڈالا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ابوسفیان کے قافلہ کو لوٹنے کے ارادہ سے نکلے تھے مگر کاروانِ تجارت کے بجائے اچانک لشکر قریش کا سامنا ہو گیا اور جنگ چھڑ گئی۔ بے شک بعض لوگوں کی نظریں مالِ دنیا پر تھیں اور وہ قافلہ کو لوٹنا چاہتے تھے مگر تاریخ نویسوں کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے پیغمبرؐ اکرم کو بھی اس میں شریک کر لیا اور صرف کاررواں کو لوٹنا ہی اس مہم کا مقصد قرار دے دیا۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری تک نے یہ روایت لکھ دی ہے کہ:۔

انما خرج رسول اللہ یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینھم وبین عدوھم علیٰ غیر میعاد۔ صحیح بخاری ج۳ ص۱	رسول اللہ تو قریش کے تجارتی قافلہ کے ارادہ سے نکلے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ناگہانی طور پر ان کا اور ان کے دشمنوں کا سامنا کر دیا۔"

یہ نظریہ قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں واقعاتِ بدر کے سلسلہ میں ارشادِ باری ہے:۔

كما اخرجك ربك من بيتك بالحق وان فريقا من المومنين لكارهون يجادلونك في الحق بعد ما تبين كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون۔

"جس طرح تمہارے پروردگار نے تمہیں حق کے ساتھ گھر سے باہر بھیجا اس حالت میں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جنگ سے ناگواری محسوس کر رہا تھا اور حق کے ظاہر ہونے کے بعد حق کے بارے میں تم سے جھگڑ رہا تھا گویا ان کی آنکھوں کے سامنے انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔"

اگر پیغمبر اسلامؐ کا یہ اقدام کارواں کو لوٹنے کی غرض سے ہوتا تو یہ مسلمانوں کی خواہش کے عین مطابق تھا لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قافلہ سے دوچار ہونے سے گھبراتے، لڑنے بھڑنے سے پہلو بچاتے اور یہ سمجھتے کہ وہ موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں جب کہ ابوسفیان کے قافلہ میں چالیس سے زیادہ افراد نہ تھے اور مسلمانوں کی تعداد تین سو سے اوپر تھی۔ یہ خوف و ہراس اور احساس ناگواری ہو سکتا ہے تو قریش کے لشکر سے جس کے دفاع کی سکت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ قرآن مجید کے اس بیان کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آنحضرتؐ کارواں کے تعاقب میں نہیں نکلے تھے بلکہ قریش کی پیش قدمی کی خبر سن کر صف آرا ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:۔

وكان النبيؐ يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم الى بدر وبدر بئر فسبقنا المشركين اليها۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۳۳)

"پیغمبر اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کے بارے میں پوچھا کرتے تھے جب ہمیں معلوم ہوا کہ مشرکین آگے بڑھ آئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی جانب روانہ ہوئے۔ بدر ایک کنوئیں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین (قریش) سے پہلے پہنچ گئے۔"

یہ کفر و اسلام کے درمیان پہلا معرکہ رونما ہونے والا تھا۔ مسلمان اسلحہ جنگ کے لحاظ سے کمزور اور کفار کی متوقع تعداد کے مقابلہ میں کم تھے اس لئے پیغمبر اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضروری خیال کیا کہ انصار و مہاجرین کا عندیہ معلوم کریں کہ وہ کہاں تک عزم و ثبات کے ساتھ دشمن کا دفاع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے استفسار پر لوگوں نے مختلف جوابات دیئے۔ کچھ ہمت شکن تھے اور کچھ ہمت افزا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے جواب پر آنحضرتؐ نے منہ پھیر لیا۔ مقداد ابن اسود نے پیغمبرؐ کے چہرے پر تکدر کے آثار دیکھے تو کہا کہ یا رسول اللہؐ ہم بنی اسرائیل نہیں ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا: اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا

قاعدون - تم جاؤ اور تمہارا خدا اور تم ہی دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں "۔ اس ذات گرامی کی قسم جس نے آپ کو خلعت رسالت پہنایا ہے ہم آپ کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں رہ کر لڑیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فتح و نصرت عطا کرے۔ اس جواب سے پیغمبر کا تکدر جاتا رہا اور آپ نے مقداد کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

پھر انصار کی طرف رُخ کر کے پوچھا کہ تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ سعد ابن معاذ انصاری نے بڑی گرم جوشی سے کہا کہ یا رسول اللہ ہم آپ پر ایمان لائے اور اطاعت کا عہد و پیمان کیا لہٰذا ہم آپ کے ساتھ ہیں اگر آپ سمندر میں پھاندیں گے تو ہم آپ کے ساتھ پھاندیں گے اور کوئی چیز ہماری راہ میں حائل نہ ہو گی۔ آپ اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ہم میں کی ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہے گی۔ پیغمبرؐ اس جواب پر انتہائی خوش ہوئے اور فرمایا:۔

واللہ لکانی انظر الی مصارع القوم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۱۴۰)	خدا کی قسم! اب میں دشمن کے گر کر مرنے کی جگہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ تین سو تیرہ آدمیوں کی ایک مختصر جمعیت کے ساتھ جن میں ۷۷ مہاجر اور باقی انصار تھے مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور چاہ بدر سے کچھ فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ اندیشہ تو تھا ہی کہ کہیں دشمن اچانک حملہ نہ کر دے یا رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شب خون نہ مارے۔ آپ نے پیش بندی کرتے ہوئے حضرت علیؑ سعد ابن ابی وقاص اور زبیر ابن عوام کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن کا ٹھور ٹھکانا معلوم کریں اور دیکھیں کہ وہ یہاں سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ یہ تینوں دیکھتے بھالتے ہوئے چاہ بدر تک پہنچ گئے۔ وہاں پر چند آدمیوں کو دیکھا جو انہیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت علیؑ نے تعاقب کر کے ان میں سے دو غلاموں کو پکڑ لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ صحابہ انہیں دیکھتے ہی ان کے گرد جمع ہو گئے اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم قریش کے سقے ہیں۔ انہوں نے ہمیں پانی لانے کے لئے بھیجا ہے۔ صحابہ نے قریش کا نام سنا تو ان کے تیور بگڑ گئے اور مار پیٹ کر ان سے کہلوانا چاہا کہ وہ قریش کے غلام نہیں ہیں بلکہ ابوسفیان کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ڈر کے مارے کہہ دیا کہ ہم ابوسفیان کے آدمی ہیں۔ پیغمبرؐ نماز میں مشغول تھے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں تو تم انہیں پیٹتے ہو اور جھوٹ بولتے ہیں تو چھوڑ دیتے ہو۔ یہ قریش ہی کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ پھر آنحضرتؐ نے ان سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے ابوسفیان کے قافلہ سے لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ بتایا کہ قریش کا لشکر یہاں سے تین میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ لشکر کی تعداد کیا ہے؟ کہا کہ ہمیں تعداد کا صحیح علم نہیں ہے البتہ کبھی نو اور کبھی دس اونٹ نحر کئے جاتے ہیں۔ فرمایا کہ پھر ان کی تعداد نو سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے۔ پھر دریافت فرمایا کہ ان میں نمایاں و سرکردہ افراد کون کون

..... ہیں؟ انہوں نے چند سرداران قریش کے نام لئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:- ھٰذہٖ مکۃ قد القت افلاذ کبدھا مکہ نے تو اپنے جگر پاروں کو میدان میں لا انڈیلا ہے۔"

قریش کی آمد کی خبر سن کر لشکر اسلام نے حرکت کی اور چاہِ بدر کی جانب روانہ ہو گیا۔ لشکر قریش وادیٔ بدر کے آخری کنارے پر ریت کے ایک ٹیلے کے پاس پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی اور سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے ان کے ساتھ تھے اور تیز ول تلواروں اور ہتھیاروں کی کوئی کمی نہ تھی اس کے برعکس مسلمان تعداد میں کم اور سامان جنگ کے لحاظ سے انتہائی کمزور تھے۔ ان کے پاس اسلحہ جنگ میں سے چند تلواریں اور گنتی کی چند زرہیں تھیں اور باربرداری اور سواری کے لئے ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے اور جہاں پڑاؤ ڈالا تھا وہاں زمین کی حالت یہ تھی کہ اس پر پیر رکھتے تھے تو ریت میں دھنس جاتے تھے مگر اللہ کی کارسازی آڑے آئی اور رات کو خوب بارش ہوئی جس سے ریت بھی جم گئی اور پینے کے لئے پانی کی بھی فراوانی ہو گئی۔ اس قدرتی تائید سے مسلمانوں کی ہمت بندھ گئی دل بڑھ گئے اور پوری مجاہدانہ سرجوشی کے ساتھ دشمن سے ٹکرانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

ابن اثیر، طبری اور دوسرے مورخین نے واقعات بدر کے سلسلہ میں یہ روایت درج کی ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وادیٔ بدر میں وارد ہوئے تو سعد ابن معاذ نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم کھجور کی شاخوں کا ایک چھپر ڈالے دیتے ہیں آپ اس میں قیام فرمائیں۔ اس چھپر کے قریب آپ کی سواری موجود رہے گی۔ اگر ہم دشمن پر غالب آئے تو بہتر اور اگر ہمیں شکست سے دوچار ہوتے دیکھیں تو آپ سواری پر بیٹھ کر مدینہ واپس چلے جائیں وہاں ہماری قوم کے لوگ موجود ہی ہیں وہ آپ کے سینہ سپر رہیں گے۔ اگر انہیں یہ گمان ہوتا کہ آپ کو جنگ سے واسطہ پڑے گا تو وہ کبھی پیچھے نہ رہتے۔ آنحضرتؐ نے سعد کے حق میں دعائے خیر کی اور چھپر بنانے کی اجازت دیدی اور اس میں قیام فرما ہوئے۔

اگر روایات کی جانچ پرکھ میں درایت کا دخل ہے تو آنکھ بند کر کے اس روایت کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ نہ واقعات بدر سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ سیرتِ رسولؐ ہی سے سازگار ہے۔ اول تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کھجور کی اتنی شاخیں کہاں سے لائی گئیں جن سے چھپر تعمیر ہوا جب کہ بدر کے آس پاس کہیں کھجور کے درخت تھے ہی نہیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:-

لاعجب من امر العریش من	مجھے عریش (چھپر) کے معاملہ میں بڑی حیرت
این کان لھم او معھم من سعف	ہے کہ کھجور کی اتنی شاخیں جن سے چھپر بنایا
النخل ما یبنون بہ عریشاً ولیس	گیا کہاں سے مہیا کی گئیں۔ جب کہ بدر

تلك الارض اعنى ارض بدر ارض نخل۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ صہ ۳۳۳)

کی سرزمین پر کھجور کے درخت ہوتے ہی نہ تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مدینہ سے لاد کر ساتھ لائے تھے تو یہ بھی بعید ہے کیونکہ بار بردار سواریوں کی پہلے ہی کمی تھی اور نہ وہاں سے چلتے وقت چھپر کے تعمیر کرنے کا انہیں کوئی خیال تھا اس کے علاوہ پیغمبرؐ کی سیرت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ ہر مرحلہ پر مسلمانوں کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک ہوتے تھے خواہ وہ معمولی سے معمولی کام کیوں نہ ہوتا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر اور جنگ احزاب میں خندق کی کھدائی تک میں حصہ لیا۔ اور ان کی قیادت و سربراہی کا تقاضا بھی یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ سرگرم عمل رہیں اس لئے کہ اگر قائد شریک عمل نہ ہو تو سعی وعمل کا ولولہ مضمحل ہو جاتا ہے اور اس کی شرکت سے جوش و سرگرمی بڑھ جایا کرتی ہے۔ اور جنگ میں تو کامیابی کا انحصار ہی جوش و ولولہ اور قوتِ معنوی پر ہوتا ہے۔ پھر کیونکر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر ان کے جوش و ولولہ اور عزم و ہمت کو ڈھارس دینے کے بجائے عافیت کوش بن کر ایک گوشہ میں بیٹھ جانا گوارا کیا ہو گا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ شکست کی صورت میں بقیۃ السیف کو نرغۂ اعدا میں چھوڑ کر اپنے فرار کا راستہ ہموار کر لیا ہو گا حالانکہ اسی جنگ کی کامیابی سے مسلمانوں کی عزت و عظمت اور ان کا قومی و ملی تحفظ وابستہ تھا۔ واقعاتِ بدر شاہد ہیں کہ پیغمبرؐ نے لشکر کی صف بندی کی، میمنہ و میسرہ ترتیب دیا۔ موقع و محل کے مطابق جنگ کے احکام صادر کئے دشمن کے قتل ہو ہو کر گرنے کے مقامات کی نشاندہی کی اور ایک ماہر و آزمودہ کار سپہ سالار کی طرح فوج کی کمان کی۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

رؤی رسول اللہ فی اثر المشرکین یوم بدر مصلتا السیف یتلو ھذہ الآیۃ: "سیھزم الجمع ویولون الدبر" (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صہ ۱۴۲)

بدر کے دن پیغمبر اکرمؐ تلوار علم کئے مشرکوں کا پیچھا کرتے دیکھے گئے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے: "عنقریب لشکر شکست کھائے گا اور پیٹھ پھرا کر چل دے گا"۔

یہ تمام امور لشکر سے علیحدہ رہ کر اور ایک چھپر میں بیٹھ کر انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ ان امور کی انجام دہی اور فتح و کامرانی کی پیشین گوئی کے بعد جو یقیناً وحیٔ الٰہی کی بناء پر تھی فرار کا سامان مہیا رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ امیر المومنین نے بھی آنحضرتؐ کی سرگرمی و سرجوشی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے:۔

لما ان کان یوم بدر وحضر الناس اتقینا برسول اللہ فکان من اشد

جب بدر کا دن آیا اور لوگ حاضر ہوئے تو ہم رسول اللہؐ کے دامن میں پناہ لیتے تھے آپ کا

الناس باساً وما كان منا احد اقرب الى العدو منه ۔ (تاریخ طبری ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۳۵)	دبدبہ سب لوگوں سے زیادہ تھا اور ہم سب کی بہ نسبت دشمن سے زیادہ قریب تھے۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ چھپر کا گوشہ منتخب کرنے یا شکست کی صورت میں فرار کی سبیل ڈھونڈ رکھنے کے بجائے لشکر میں شامل تھے اور کسی خوف و خطر کا احساس کئے بغیر دشمن کی صفوں سے قریب تر تھے۔ اس روایت کا آخری ٹکڑا کہ "اگر مدینہ میں رہ جانے والوں کو یہ گمان کہ آپ کو جنگ سے سابقہ پڑے گا تو وہ گھروں میں بیٹھے نہ رہتے۔" اس روایت کی کمزوری کا آئینہ دار ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ گھروں سے نکلتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ ناگواری محسوس کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔" اگر انہیں جنگ کا سان گمان نہ تھا تو یہ خوف و اضطراب کس بنا پر تھا اور کیوں ڈرے سہمے جا رہے تھے۔

قریش کے لشکر میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کا رویہ پیغمبرؐ کے ساتھ زیادہ معاندانہ نہ رہا تھا اور وہ کفر کے باوجود کچھ نہ کچھ آنحضرتؐ کا پاس و لحاظ کرتے تھے اسی طرح کچھ لوگ اسلام لا چکے تھے اور ابھی تک اعلان اسلام نہ کیا تھا یہ لوگ جنگ میں شریک ہونا نہ چاہتے تھے مگر قریش کھینچ تان کر انہیں اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ آنحضرتؐ نے ضروری سمجھا کہ جنگ چھڑنے سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں لشکر اسلام کو متنبہ کر دیں چنانچہ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم میں سے کچھ افراد اگرچہ لشکر کفار میں شامل ہیں۔ مگر وہ ہم سے جنگ و مخاصمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا تم سے کوئی ابوالبختری ابن حارث، عباس ابن عبدالمطلب یا کسی ہاشمی کو دیکھے تو اسے قتل نہ کرے۔ اس لئے کہ وہ جبراً لائے گئے ہیں۔" پیغمبر اکرمؐ کے اس اعلان پر بعض لوگ تلملائے اور اپنی ناگواری کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ابو حذیفہ ابن عتبہ نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ہم اپنے ماں باپ بیٹوں بھائیوں اور عزیزوں کو تہ تیغ کریں۔ اور عباس کو چھوڑ دیں۔ خدا کی قسم اگر میں ان سے دو بدو ہوا تو انہیں قتل کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ پیغمبرؐ نے حضرت عمر سے کہا کہ سنتے ہو یہ ابو حذیفہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا یہ میرے چچا پر تلوار چلائے گا۔ حضرت عمر نے کہا:-

یا رسولؐ اللہ دعنی فلاضرب عنقه فو الله لقد نافق۔	یارسولؐ اللہ مجھے اجازت دیجئے میں تلوار سے اس کی گردن ماروں خدا کی قسم یہ منافق ہے۔"

اس ضروری ہدایت کے بعد فوج کی صفیں اور میمنہ و میسرہ ترتیب دے کر انصار کا علم سعد ابن عبادہ کو اور مہاجرین کا رایت علی ابن ابی طالب کو دیا۔ ابن کثیر نے تحریر کیا ہے:-

دفع النبیؐ الرایة یوم بدر الی	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے دن

علی وھو ابن عشرین سنہ   رایت جنگ علیؑ کو دیا اور اس وقت آپ کی عمر
(البدایہ والنھایہ - ج، صہ۲۲۳)   بیس برس کی تھی۔"

دشمن بھی صفیں باندھے ہتھیار سنبھالے میدان میں اتر آیا اور عتبہ ابن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید قریش کی صفوں سے نکل کر مبارز طلب ہوئے۔ مسلمانوں کے لشکر سے عوف ابن حارث معوذ ابن حارث اور عبداللہ ابن رواحہ مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم انصار مدینہ ہیں۔ عتبہ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ تم ہمارے ہم رتبہ نہیں ہو تم واپس جاؤ۔ اور آنحضرتؐ سے مخاطب ہو کر کہا: یا محمد اخرج الینا اکفاءنا من قومنا" اے محمدؐ ہمارے مقابلہ میں ہمارے ہمسر لوگوں کو بھیجئے جو ہماری قوم میں سے ہوں۔ یہ تینوں اپنی صفوں میں واپس آگئے۔ آنحضرتؐ نے جب قریش کی یہ متمردانہ ذہنیت دیکھی کہ وہ انصار کو اپنا حریف و مدمقابل نہیں سمجھتے تو ان کی جگہ عبیدہ ابن حارث، حمزہ ابن عبدالمطلب اور علی ابن ابی طالب کو بھیجا۔ عتبہ کا مطالبہ تو یہ تھا کہ ان کے مقابلہ میں قریش آئیں۔ مگر پیغمبرؐ نے نہ صرف قریش بلکہ عبدالمطلب کے جگر پاروں کو منتخب کیا تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ پیغمبرؐ نے اپنے قریبیوں اور عزیزوں کو روک کے رکھا اور دوسروں کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا۔ حالانکہ حضرت عبیدہ ستر سال کے بوڑھے تھے اور حضرت علیؑ ابھی نوخیز تھے اور پہلی مرتبہ ایک نبرد آزما کی حیثیت سے میدان کارزار میں اترے تھے۔ جب عتبہ کو معلوم ہوا کہ علیؑ، حمزہ اور عبیدہ لڑنے کے لئے آئے ہیں تو کہا کہ یہ برابر کا جوڑ ہے۔ حضرت عبیدہ عتبہ سے، حضرت حمزہ شیبہ سے اور حضرت علی ولید سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ ولید نے تلوار سونت کر حملہ کرنا چاہا مگر علیؑ نے ایک تیر مار کر اسے بے بس کر دیا۔ اور اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ حملہ کر سکے۔ تیر کھاتے ہی اپنے باپ عتبہ کے دامن میں پناہ لینے کے لئے دوڑا مگر فرزند ابوطالب نے اس طرح گھیر ڈالا کہ جان توڑ کوشش کے باوجود تلوار کی زد سے بچ نہ سکا اور باپ کی گود میں پہنچنے سے پہلے موت کی آغوش میں سو گیا۔ جب امیرالمومنینؑ ولید کے قتل سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں نے پکار کر کہا کہ اے علی شیبہ آپ کے چچا حمزہ پر چھایا جا رہا ہے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ دونوں آپس میں گتھے ہوئے ہیں تلواریں کند ہو چکی ہیں اور ڈھال کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ آپ نے بڑھ کر شیبہ پر وار کیا اور تلوار سے اس کا سر اڑا ڈالا۔ اب حضرت علیؑ اور جناب حمزہ عتبہ کی طرف بڑھے جو جناب عبیدہ سے نبرد آزما تھا۔ دیکھا کہ عبیدہ عتبہ کے ہاتھ سے گھائل ہو کر تاب مقاومت کھو چکے ہیں۔ قریب تھا کہ عتبہ تلوار لے کر جھپٹے اور انہیں شہید کر دے کہ حضرت علیؑ اور حمزہؓ کی تلواریں چمکیں اور اس کا لاشہ خاک و خون میں تڑپتا نظر آنے لگا۔ حضرت عبیدہ شدید زخمی ہو چکے تھے حضرت علیؑ اور حمزہؓ دونوں نے مل کر انہیں اٹھایا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے۔ پیغمبرؐ نے دیکھا کہ عبیدہ کا پیر کٹ چکا ہے اور پنڈلی کی

ہڈی سے گودا بہہ رہا ہے۔ آپ نے عبیدہ کے سر کو زانو پر رکھا۔ آنکھوں سے آنسو آ گئے جو عبیدہ کے چہرے پر گرے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر پیغمبرؐ کی طرف دیکھا اور کہا یا رسول اللہ کیا میں بھی شہیدوں میں محسوب ہوں گا؟ فرمایا کہ ہاں آپ بھی شہیدوں میں شمار ہوں گے۔ عبیدہؓ نے کہا کاش آج ابو طالب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے ان کی بات کو جھوٹا نہیں ہونے دیا ہے

ونسلمہ حتی نصرع دونہ ونذھل عن ابناءنا والحلائل

"ہم محمدؐ کو اس وقت دشمنوں کے حوالے کریں گے جب لڑتے ہوئے ان کے سامنے مرجائیں اور بیوی بچوں کی یاد سے غافل کر دیئے جائیں۔"

عبیدہ میدانِ بدر سے پلٹتے ہوئے وادی روحار یا صفرا میں انتقال فرما گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

قریش کے ان مانے ہوئے سورماؤں کے قتل سے کفار پر خوف و ہراس چھا گیا۔ ابو جہل نے ان کی ہمت کو پست ہوتے دیکھا تو چیخ چیخ کر انہیں ابھارا اور دم دلاسا دے کر اُن کی ہمت بندھائی۔ طعیمہ ابن عدی کو جوش آیا اور وہ فیلِ مست کی طرح جھومتا ہوا نکلا۔ حضرت علیؑ نے اس پر نیزہ مارا جس سے وہ سنبھل نہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور کچھ دیر ایڑیاں رگڑنے کے بعد دم توڑ دیا۔ حضرت نے فرمایا:۔

واللہ لا یخاصمنا فی اللہ بعد الیوم ابداً۔ (اعلام الوریٰ۔ صفحہ ۸۹)

"خدا کی قسم آج کے بعد یہ کبھی اللہ کے بارے میں ہم سے جنگ و خصومت پر نہ اترے گا"

طعیمہ کے بعد عاص ابن سعید ہتھیار سج کر میدان میں اترا۔ حضرت نے اسے بھی تلوار کی ضرب سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر عبداللہ ابن منذر اور حرملہ ابن عمر گرجتے دندناتے ہوئے نکلے۔ اور دونوں حضرت کی تلوار سے لقمۂ اجل ہو گئے۔ اسی طرح حنظلہ پیچ و تاب کھاتا ہوا نکلا۔ حضرت نے اس کے سر پر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ چلایا کہ اس کا سر دو پارہ ہو گیا۔ آنکھیں حلقہ ہائے چشم سے باہر آ گئیں اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ حنظلہ ابوسفیان کا بیٹا اور معاویہ کا بھائی تھا۔ اور اس سے پہلے اس کا نانا عتبہ اور ماموں ولید حضرت کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ چنانچہ حضرت کے دورِ خلافت میں جب معاویہ نے انہیں جنگ کی دھمکی دے کر مرعوب کرنا چاہا تو آپ نے معاویہ کو اس کے نانا، ماموں اور بھائی کا انجام یاد دلاتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:۔

فانا ابو الحسن قاتل جدك و خالك و اخيك شدخا يوم البدار۔ (نہج البلاغہ)

"میں (کوئی اور نہیں) وہی ابوالحسن ہوں جس نے تمہارے نانا عتبہ تمہارے ماموں ولید اور تمہارے بھائی حنظلہ کے پرخچے اڑا کر بدر کے دن مارا تھا۔"

کفار کی ان نامی گرامی شخصیتوں کے قتل ہو جانے سے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور اکیلے دوکیلے

میدان میں اترنے سے جی چرانے لگے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اس طرح ایک ایک کر کے میدان میں نکلتے رہے تو کوئی بھی شیرِ خدا کی تلوار سے بچ کر زندہ نہ پلٹے گا۔ اور ایک ایک کر کے سب موت کے گھاٹ اتر جائیں گے اب انھوں نے جنگ مغلوبہ کے لئے بڑھنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے ان کی بڑھتی ہوئی یلغار دیکھ قدم آگے بڑھانا چاہا مگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنی صفوں کو درہم برہم نہ کریں اور قریش کے حملہ کو تیروں سے روکیں۔ اور خود بارگاہِ احدیت میں دستِ بدعا ہو کر عرض کیا۔

اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ	بارِ الٰہا! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو
من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض	روئے زمین پر تیری پرستش کرنے والا کوئی نہ رہے
اللّٰھم انجزلی ما وعدتنی (تاریخ کامل ج ۲)	گا۔ پروردگارا اپنے وعدۂ فتح و نصرت کو پورا کر۔"

پھر نیند کی ایک جھپکی لی اور آنکھیں کھول کر فرمایا خدا کا شکر ہے اس نے میری دعا قبول فرمائی۔ اور ہماری امداد کے لئے فرشتے بھیج دیئے۔ چنانچہ ارشادِ رب العزت ہے :۔

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب	جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے اس
لکم انی ممدکم بالف من	نے تمہاری دعا قبول کی اور جواب دیا کہ میں ایک ہزار
الملٰئکۃ مردفین۔	فرشتوں سے جو پے در پے آئیں گے تمہاری مدد کروں گا۔"

جب قریش تیروں کے جواب میں تیر برساتے ہوئے لشکرِ اسلام کے قریب آئے تو آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دم حملہ کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ایک ساتھ تلواریں بے نیام ہوئیں کمانیں کڑکیں۔ تیر رہا ہوئے اور ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی بوچھار سے میدان گونج اٹھا مسلمان تلواریں چلاتے، صفوں کو چیرتے اور دشمنوں کو تہ تیغ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ آخر حضرت علیؑ اور جناب حمزہ کے پرزور حملوں سے کافروں کے قدم ڈگمگا گئے اور اس طرح تتر بتر ہوئے جس طرح شیر کے حملہ آور ہونے پر بھیڑیں تتر بتر ہوتی ہیں۔ سعد کہتے ہیں :۔

رایت علیا یوم بدر یحمحم	میں نے بدر کے دن علیؑ کو لڑتے دیکھا اُن کے
کما یحمحم الفرس ویقول الشعر	سینہ سے گھوڑے کے ہنہنانے کی سی آواز نکل
ثم ارجع حتی خضب سیفہ	رہی تھی اور برابر رجز پڑھتے جاتے تھے۔ اور
دما۔ (کنز العمال۔ ج ۵۔ ص ۲۷۰)	جب پلٹے تو اُن کی تلوار خون سے رنگین تھی۔"

اس معرکۂ کارزار میں نوفل ابن خویلد جو پیغمبر اکرمؐ کا انتہائی دشمن تھا حضرتِ علیؑ کے سامنے سے گزرا۔ آپؑ نے اس کے سر پر تلوار ماری جو خود کو کاٹتی اور سر کو توڑتی ہوئی جبڑے تک اُتر آئی اور پھر دوسرا وار

اس کی ٹانگوں پر کیا جس سے اس کے دونوں پیر کٹ گئے۔ آنحضرتؐ اس دشمن دین کے قتل ہونے سے خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ جنگ آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ کفار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ابوجہل، اس کا بھائی عاص ابن ہشام اور دوسرے سردار تہ تیغ ہو چکے تھے۔ دشمن شکست کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔ زوال آفتاب کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا اور انہیں قتل کرنے کے بجائے پکڑ پکڑ کر اسیر کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کے عوض قریش سے زر فدیہ حاصل کر سکیں۔ سعد ابن معاذ نے جب دیکھا کہ مسلمان کفار کو تہ تیغ کرنے کے بجائے زندہ گرفتار کر رہے ہیں۔ تو وہ مسلمانوں کی حرکت پر پیچ و تاب کھانے لگے اور اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ اپنی ناگواری کو چھپا نہ سکے۔ پیغمبرؐ نے اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے تو فرمایا کیا مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل تمہیں بُرا معلوم ہوتا ہے؟ عرض کیا کہ:۔

یا رسولؐ اللہ، اول وقعۃ اوقعہا اللہ بالمشرکین کان الاثخان احب الی من استبقاء الرجال۔	"یا رسولؐ اللہ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں اللہ نے مشرکوں کو شکست دلائی ہے۔ ان لوگوں کو زندہ چھوڑ دینے کے بجائے انہیں اچھی طرح کچل دینا مجھے زیادہ پسند تھا۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۸)

ستر کفار کے لاشے میدان میں بکھرے پڑے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان لاشوں کو چاہِ بدر میں پھنکوا دیا۔ اور انہیں مخاطب کر کے کہا کہ "میں نے اپنے پروردگار کے وعدے کو سچا پایا ہے۔ کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا ہے۔" کچھ لوگوں نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ آپ مُردوں سے باتیں کرتے ہیں کیا مُردے بھی سُنا کرتے ہیں؟ فرمایا:۔

ما انتم باسمع لما اقول منہم ولکنہم لا یستطیعون ان یجیبوا۔	"وہ تم سے زیادہ میری بات سنتے ہیں مگر جواب دینے سے عاجز ہیں۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۹)

ان امور سے فارغ ہو کر آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت ایک جگہ پر جمع کر دیا جائے۔ یہ حکم بعض طبیعتوں پر گراں گزرا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ دستورِ عرب کے مطابق جو جس نے لوٹا ہے وُہ اسی کے پاس رہے۔ مگر پیغمبرِ اکرمؐ نے اس کی اجازت نہ دی اور تمام مالِ غنیمت یکجا کر کے عبداللہ ابن کعب کی نگرانی میں دیدیا۔ اور اسیرانِ جنگ کو حراست میں لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب وادیٔ صفراء میں پہنچے تو آپ نے مالِ غنیمت شرکاء جنگ پر مساوی تقسیم کر دیا۔ یہ کام مدینہ پہنچ کر بھی انجام دیا جا سکتا تھا مگر ممکن ہے کہ بعض لوگوں

نے صبر آزما انتظار سے بچنے کے لئے جلدی کی ہو اور آپ نے یہی مناسب سمجھا ہو کہ اسے یہیں پر تقسیم کر دیا جائے جب مدینہ میں پہنچے تو آپ نے ان اسیروں کو مختلف لوگوں کے ہاں ٹھہرایا اور ان سے حسن سلوک کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ جب تک مسلمانوں کی تحویل میں رہے اُن کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا جاتا رہا جس کا بعض اسیروں نے خود بھی اعتراف کیا۔ اور پھر ان قیدیوں میں سے جو صاحب حیثیت تھے ان سے فدیہ لے کر اور جو نادار تھے انہیں ویسے ہی آزاد کر دیا۔ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت قریش میں صرف سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپ نے اس کمی کو محسوس فرماتے ہوئے ان لوگوں سے جو مالی اعتبار سے کمزور اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ طے کیا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور اس کے عوض انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ ان اسیرانِ بدر کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علیؑ سے مشورہ کیا کہ انہیں قتل کیا جائے یا ان سے مالی معاوضہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ حضرت ابوبکر نے یہ مشورہ دیا کہ ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور حضرت عمر نے اس رائے کے خلاف رائے دیتے ہوئے کہا :۔

لا واللہ ما اری الذی رای ابوبکر ولکنی اری ان تمکننی من فلان فاضرب عنقہ و تمکن حمزۃ من اخ لہ فیضرب عنقہ و تمکن علیا من عقیل فیضرب عنقہ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۹۹)	خدا کی قسم مجھے ابوبکر کی رائے سے اتفاق نہیں ہے آپ مجھے حکم دیں کہ میں فلاں کی گردن اڑا دوں اور حمزہ سے کہیئے کہ وہ اپنے بھائی (عباس) کی گردن ماریں اور علیؑ سے کہیئے کہ وہ عقیل کو قتل کریں۔"

آنحضرتؐ نے اپنے "اجتہاد" سے کام لے کر حضرت عمر کے مشورہ پر عمل کرنے کے بجائے حضرت ابوبکر کے مشورہ کو ترجیح دی اور فدیہ لے کر اسیروں کو رہا کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ کے دوسرے دن حضرت عمر پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت ابوبکر دھاروں دھار رو رہے ہیں۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ دونوں کیوں رو رہے ہیں۔ اگر رونے کی کوئی بات ہے تو میں اس رونے دھونے میں شریک ہو جاؤں۔ فرمایا کہ فدیہ کے قبول کرنے پر مجھے عذاب منڈلاتا نظر آیا ہے جو اس درخت سے بھی زیادہ نزدیک تھا (اور ایک درخت کی طرف اشارہ کیا) اور یہ تہدید آمیز آیت نازل ہوئی ہے :۔

ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ واللہ عزیز حکیم لولا کتاب من اللہ	نبی کو نہیں چاہیئے کہ اچھی طرح خون ریزی کئے بغیر لوگوں کو قیدی بنائے۔ تم لوگ مال دنیا چاہتے ہو اور اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر خدا کا نوشتہ پہلے سے موجود

سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم۔ نہ ہوتا تو تم جو کچھ سمیٹتے اس پر تمہیں بڑا عذاب ہوتا۔"

حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس فدیہ ہی کے نتیجہ میں دوسرے سال جنگِ اُحد میں رسول اللہؐ کے ستر صحابی شہید ہوئے، ستر اسیر کئے گئے، آنحضرتؐ کے دندان مبارک ٹوٹے، چہرہ اور سر زخمی ہوا اور آپ کے اصحاب آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ امر غور طلب ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو صحابہ سے مشورہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا قرآن مجید میں اسیروں کے بارے میں کوئی ہدایت موجود نہ تھی؟ ایسا تو نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں واضح طور پر جنگی اسیروں کے احکام اور ان سے فدیہ لے کر انہیں آزاد کرنے کی تعلیم موجود ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

اذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا۔ "جب تم کافروں سے لڑو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب انہیں زخموں سے چور چور کر دو تو اُن کی مشکیں کس لو۔ پھر اُن پر احسان کرتے ہوئے انہیں چھوڑ دو یا معاوضہ لے کر رہا کر دو یہاں تک کہ دشمن جنگ کے ہتھیار رکھ دے۔"

یہ سورۂ محمدؐ کی آیت ہے جو بالاتفاق جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی۔ لہٰذا جب قرآن میں اسیروں کے بارے میں پہلے سے حکم آچکا تھا کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے یا اُن سے فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے تو پیغمبرؐ نے اس حکم قرآنی کے پیش نظر جب کچھ لوگوں سے فدیہ لے لیا اور کچھ لوگوں کو یونہی چھوڑ دیا اور کچھ لوگوں کو تعلیم کتابت کے عوض آزاد کر دیا۔ تو اس پر عتاب کیوں اور عذاب کی دھمکی کس جرم کی پاداش میں۔ ظاہر ہے کہ اس نص صریح کے ہوتے ہوئے صحابہ سے مشورہ لینا اور پھر اپنے اجتہاد سے کام لے کر ایک کا مشورہ قبول کر لینا اور ایک کا مشورہ مسترد کر دینا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ جب کہ پیغمبرؐ کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ وحی الٰہی پر عمل پیرا ہو اور اس کے مقابلہ میں کسی کے مشورہ و رائے پر عمل نہ کرے۔ اگر وحی کے ہوتے ہوئے کسی کے مشورہ پر عمل پیرا ہونے کا جواز ہو تو وحی الٰہی کی ضرورت اور افادیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی رہا حضرت عمر کا یہ مشورہ کہ حمزہ سے کہیے کہ وہ عباس کو قتل کریں اور علیؑ سے کہئے کہ وہ عقیل کی گردن ماریں، خدا جانے پیغمبرؐ نے اس کا کیا جواب دیا جب کہ وہ میدان جنگ میں بنی ہاشم اور عباس کو قتل کرنے سے منع کر چکے تھے اور اللہ جانے کہ حضرت عمر نے یہ مشورہ کیسے دیا جب کہ وہ ابو حذیفہ کو کہ جب اس نے عباس کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، منافق کہہ چکے تھے۔ کیا حضرت عمر کے ذہن سے یہ دونوں باتیں اتر چکی تھیں، یا میدانِ جنگ

میں تو ان کا قتل ناجائز تھا اور اب جائز ہو گیا تھا۔

اگر اس روایت کی بناء پر یہ فرض کر لیا جائے کہ فدیہ قبول کرنے کی وجہ سے عذاب منڈلاتا نظر آتا تو پیغمبرؐ اس عذاب کی جھلک دیکھنے کے بعد اس فدیہ کو مسترد کر دیتے جب کہ یہ واقعہ فدیہ کو قبول کرنے کے دوسرے دن کا بتایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان قیدیوں کے پاس فدیہ زر موجود تو نہ تھا کہ انہوں نے فوراً ادا کر کے رہائی حاصل کر لی ہوگی۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے منگواتے اور حاصل کرنے میں ڈیڑھ دو ماہ کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اور پھر اُحد کی ہزیمت صحابہ کے فرار اور ستر مسلمانوں کے شہید کو اس فدیہ کی پاداش قرار دینا ایک عجیب سی بات ہے یہ سزا تو انہیں ملنا چاہئے تھی جنہوں نے یہ رقم فدیہ لی تھی۔ کیا اس سے عدل الٰہی پر حرف نہیں آتا کہ جرم کوئی کرے اور سزا کوئی بھگتے۔ بہر حال یہ روایت موضوع ہے اور بظاہر اس کے گڑھنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُحد میں صحابہ کے فرار کو قدرت کی طرف سے ایک طے شدہ امر قرار دے کر ان کے فرار عن الزحف کے جرم کو ہلکا کر کے دکھایا جائے اس طرح کہ یہ فرار اس جرم کی پاداش میں تھا جس میں معاذ اللہ پیغمبرؐ بھی شریک تھے اور وہی فدیہ قبول کر کے اس فرار و ہزیمت کا باعث ہوئے تھے۔ لہٰذا اس میں بھاگنے والوں کا کیا قصور۔ نہ پیغمبرؐ فدیہ قبول کرتے اور نہ صحابہ کے میدان چھوڑنے کی نوبت آتی۔ اور ساتھ ہی فدیہ کی خاطر مشرکوں کو زندہ گرفتار کرنے کی کارروائی کو اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ آیت کے تہدیدی لہجے کا رخ پیغمبرؐ کی طرف مڑ جائے کہ انہوں نے اجتہادی غلطی کے نتیجہ میں فدیہ لینے پر رضامندی ظاہر کی جس پر قدرت نے اپنا عذاب دکھایا اور تنبیہ کے لئے آیت نازل فرمائی۔ حالانکہ آیت میں پیغمبرؐ پر عتاب کا شائبہ تک نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں پر عذاب ہے، جنہوں نے فدیہ بٹورنے کے لئے مشرکوں کو قتل کرنے کے بجائے اسیر بنایا۔ چنانچہ آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے شایانِ شان یہ نہیں ہے کہ وہ کفر کی طاقت کو کچلنے اور اس کا زور توڑنے سے پہلے کافروں کو گرفتار کرتے لگیں۔ مگر تم نے دنیوی مفاد کی خاطر پکڑ دھکڑ شروع کر دی تاکہ زرِ فدیہ حاصل کر سکو۔ بے شک تمہیں فدیہ لینے کی اجازت دی جا چکی ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دشمن کا قلع قمع کرنے میں کوتاہی کی جائے اور فدیہ کی خاطر ہاتھ روک لیا جائے اور مال کی جمع آوری ہی کو جہاد کا مقصد قرار دے لیا جائے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے صحابہ ہی کو موردِ عتاب سمجھتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

کان میلھم للافتداء مخالفا لما احبہ اللہ من قطع دابر الشرک فعو تبوا ثم عفی عنھم۔

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ۔ ص ۵۲۲)

"صحابہ فدیہ لینے کی طرف مائل تھے اور یہ اللہ کی پسندیدہ چیز کے خلاف تھا۔ اللہ تو یہ چاہتا تھا کہ شرک کی جڑ کٹ جائے۔ اسی وجہ سے اُن پر عتاب ہوا اور پھر انہیں معاف کر دیا گیا۔"

مال و دولت کی ہوس یوں تو انسان کی طبعی کمزوری ہے مگر جہاں ایک طرف دین کے استحکام اور دشمنانِ دین کے استیصال کا سوال ہو اور دوسری طرف مالی مفاد کا وہاں مالی مفاد کو نظر انداز کر دینا ہی دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ مگر مال و زر کی ہوس عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اسلام کے بعد بھی اس دیرینہ ذہنیت میں تبدیلی نہ ہوئی تھی اور اس کا مظاہرہ اس موقع پر بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں قریش کے لشکر سے بھڑنے اور اس کی فکر کرنے کے بجائے ابوسفیان کے کارواں کی جستجو میں رہے جو شام سے لدا پھندا ہوا آ رہا تھا اور جنگ کے خاتمہ پر اپنے سمیٹے ہوئے مال پر اپنا حق جتانے بیٹھ گئے۔ لوٹنے والے کہتے ہیں ہماری ملکیت ہے اور لڑنے والے کہتے کہ یہ ہماری وجہ سے ملا ہے اس لئے ہم اس کے حقدار ہیں۔ اور اسی دولت کے لالچ میں آ کر کفار کا استیصال کرنے سے پہلے انہیں پکڑ پکڑ کر قیدی بنانے لگے جس پر سعد ابن معاذ انصاری نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا اور رسول اللہؐ سے کہا کہ کافی خونریزی سے پہلے کفار کو اسیر بنانا مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ حضرت عمر نے بھی اگرچہ مشرکوں کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا مگر اس وقت کہ جب انہیں اسیر بنا کر مدینہ لایا جا چکا تھا اور ان کے قتل کا کوئی موقع و محل نہ رہا تھا۔ چنانچہ نہ قرآن میں ہے اور نہ کسی حدیث میں کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اسیروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور نہ آیت کا عتاب اس بنا پر تھا کہ ان سے فدیہ لینے کے بجائے انہیں قتل کیوں نہ کر دیا گیا، بلکہ وجہ عتاب یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں پوری طرح خونریزی سے پہلے انہیں اسیر کیوں کیا گیا اور اب جبکہ انہیں اسیر بنایا جا چکا تھا تو سورۂ محمدؐ کی آیت کی رو سے ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دینا عین منشائے الٰہی کے مطابق تھا۔

اس غزوہ میں جو اسلام کا پہلا غزوہ تھا، کفار کو بری طرح زک اٹھانا پڑی۔ ان کے ستر آدمی قتل اور ستر اسیر ہوئے اور باقی ماندہ افراد نے راہِ فرار اختیار کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے جن میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے۔ امیر المومنینؑ کی تلوار سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد پینتیس تھی یعنی جتنی تعداد کل مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوئی اتنی ہی تعداد تنہا حضرت کے ہاتھ سے ماری گئی۔ خصوصاً سردارانِ قریش شیبہ، ولید، حنظلہ، نوفل ابن خویلد، عاص ابن سعید، مغیرہ ابن ولید وغیرہ۔ حضرت کے مقتولین کی تعداد اس امر کی شاہد ہے کہ آپ نے نہ مالِ غنیمت سمیٹنے کی فکر کی اور نہ اسیر بنانے کے لئے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا بلکہ ہمہ تن دشمنانِ دین کے استیصال اور کفر و شرک کی بیخ کنی میں لگے رہے اور شجاعت و فنی مہارت کا وہ بے نظیر مظاہرہ کیا جس سے دشمن کے دلوں پر اسلام کی قوت و برتری کی ہمیشہ کے لئے دھاک بیٹھ گئی اور مسلمانوں کے لئے فتح و کامرانی کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ اگر اس مرحلہ پر مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو وہ کفار کے مقابلہ میں مرعوبیت کا شکار ہو جاتے اور یہ احساسِ شکست انہیں دشمن سے ٹکرانے اور میدانِ جنگ میں اترنے سے پست

ہمت بنا دیتا اور مایوسی و کم ہمتی کا نتیجہ ہمیشہ شکست و ہزیمت ہی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ مگر فتح بدر کے نتیجہ میں مسلمان ایک بڑی طاقت سمجھے جانے لگے اور اسی شہرت نے مسلمانوں کو فاتحین کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا۔ بلا شبہ تمام اسلامی فتوحات اس فتح و کامرانی کا نتیجہ و ثمرہ ہیں۔ اور یہ فتح جو حق و صداقت، عدل و انصاف اور عزم و عمل کی فتح تھی، علیؑ کے دست و بازو کی رہینِ منت ہے اور انہی کے سر اس کامیابی و کامرانی کا سہرا ہے۔

یہ جنگ روزِ جمعہ ۱۷ رمضان ۲ھ میں واقع ہوئی۔

غزوۂ اُحد

بدر میں قریش کے ستر نامور سورما مارے گئے، ستر اسیر کئے گئے اور باقی ہزیمت اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس شکست فاش سے مکہ کی فضا میں ایک سکون سا پیدا ہو گیا تھا لیکن یہ سکون عارضی اور سمندر کی اس خاموش سطح کے مانند تھا جس کے نیچے طوفانی لہریں موجزن ہوں یا اس خاموش آتش فشاں کے مانند تھا جس کے اندر ہی اندر لاوا سُلگ رہا ہو اور زمین کی تہوں اور چٹانوں کو چیر کر پھوٹ نکلنے کے لئے بے قرار ہو۔ قریش کے دلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی اور سینوں میں انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی اور اس خیال سے کہ کہیں جوشِ انتقام سرد نہ پڑ جائے، مقتولین بدر پر رونے سے منع کر رکھا تھا اور یوں بھی عرب کا دستور تھا کہ عورتیں اس وقت تک اپنے مقتولین پر نہ روتی تھیں جب تک ان کا انتقام نہ لے لیا جاتا تھا۔ اس ضبط گریہ جانی و مالی نقصان، شکست و ہزیمت کی شرمندگی اور انتقامی جذبہ نے انہیں فیصلہ کُن جنگ لڑنے پر اُبھارا۔ ابوسفیان جو قیادت و سربراہی کے خواب دیکھ رہا تھا اُسے ابوجہل اور دوسرے سرکردہ افراد کے مارے جانے سے آگے آنے کا موقع مل گیا۔ اس نے عوام کے جذبات کو متاثر کرنے کے لئے قسم کھائی کہ میں اس وقت تک سر میں تیل نہیں لگاؤں گا جب تک قریش کے کشتوں کا بدلہ نہیں لے لوں گا۔ چنانچہ ذی الحجہ ۲ھ کو دو سو کی ایک جمعیت کے ساتھ مدینہ پر تاخت و تاراج کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ جب مدینہ کے قریب پہنچا تو قبیلہ انصار کے دو آدمیوں کو جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے قتل کر دیا اور کھجوروں کے ایک باغ میں آگ لگا دی۔ پیغمبر اکرمؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے مقام کدر تک اُس کا تعاقب کیا مگر وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ حملہ ایک بڑے حملے کی تمہید تھا جس کی تیاری بدر کے بعد سے کی جا رہی تھی اور عکرمہ ابن ابی جہل، صفوان بن اُمیہ، عبد اللہ ابنِ ربیعہ اور دوسرے سرکردہ لوگوں نے گزشتہ سال کی تجارت کا مشترکہ منافع جو پچاس ہزار مثقال سونا اور ایک ہزار اونٹوں کی شکل میں تھا اور ابھی تک شرکا میں تقسیم نہیں ہوا تھا۔ جنگی

مصارف کے لئے مخصوص کر دیا تا کہ مالی اعتبار سے مضبوط ہو کر مسلمانوں سے جنگ لڑی جا سکے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں ارشاد ہے :۔

ان الذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ فسینفقونھا ثم تکون علیھم حسرۃ ثم یغلبون والذین کفروا الی جھنم یحشرون۔	یہ کفار اپنے مال کو اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روک دیں یہ عنقریب اسے خرچ کریں گے پھر یہی مال اُن کے لئے حسرت واندوہ کا باعث ہوگا پھر یہ شکست کھا جائیں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ سیدھے جہنم میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

قریش کو مصارف جنگ کی طرف سے تو اطمینان تھا ہی البتہ جنگجو افراد کی کمی کا احساس تھا۔ اس کا تدارک انہوں نے یوں کیا کہ چند آتش بیان شاعروں کو اپنا نمائندہ بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیج دیا تا کہ مسلمانوں کے خلاف اُن کے جذبات ابھار کر انہیں قریش سے تعاون پر آمادہ کریں۔ مکہ کا ایک شاعر ابو عزہ عمرو ابن عبد اللہ تہامہ میں آیا اور اہلِ تہامہ اور بنی کنانہ کو اپنے کلام سے متاثر کر کے قریش کا ہمنوا بنا لیا اور ان کے سات سو آدمی قریش کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اس طرح بڑھتے بڑھتے لشکر کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی جس نے سر دھڑ کی بازی لگا کر جنگ کرنے کی ٹھان لی۔

ہند زوجۂ ابوسفیان جس کا باپ عتبہ، بھائی ولید اور چچا شیبہ جنگ بدر میں مارے گئے تھے اس نے بھی سُلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکتا ہوا شعلہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور چودہ عورتوں کی سرگروہ بن کر فوج میں شامل ہو گئی ان عورتوں میں خالد ابن ولید کی بہن فاطمہ، عمرو ابن عاص کی بیوی ریطہ، عکرمہ ابن ابی جہل کی زوجہ ام حکیم بنت حارث، سفیان ابن عویف کی بیوی رملہ بنت طارق اور صفوان ابن امیہ کی بیوی برہ بنت مسعود بھی شریک تھیں۔ ان عورتوں کے شامل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدانِ کارزار میں جنگ آزماؤں کے جذبات کو بھڑکائیں اور پسپائی کی صورت میں انہیں جوش و غیرت دلا کر واپس میدان میں لائیں۔

جب یہ لشکر ابوسفیان کی قیادت میں مکہ سے نکل کھڑا ہوا تو عباس ابن عبد المطلب نے اس خیال سے کہ اگر اس لشکرِ گراں نے بے خبری کے عالم میں مدینہ پر حملہ کر دیا تو مسلمان اس منظم و مسلح فوج کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، بنی غفار کے ایک شخص کے ذریعہ آنحضرتؐ کو پیغام بھیجا کہ قریش کا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے مکہ سے نکل چکا ہے۔ آپ اس بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کا بندوبست کر لیں ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک حملہ کر دے۔ اس بروقت اطلاع کے ملتے ہی آنحضرتؐ نے دو آدمیوں کو مدینہ کے باہر بھیجا کہ وہ دیکھیں بھالیں کہ یہ خبر کہاں

تک درست ہے۔ انہوں نے پلٹ کر بتایا کہ عباس کی بھیجی ہوئی اطلاع صحیح ہے اور قریش کا لشکر مار دھاڑ کرتا ہوا اطراف مدینہ میں پہنچ چکا ہے اور کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔ اگرچہ یہ وہی بدر کے شکست خوردہ لوگ تھے مگر پہلے سے زیادہ تیار ہو کر آئے تھے اور اہل تہامہ اور بنی کنانہ کے شامل ہو جانے سے ان کی تعداد بڑھ گئی تھی مسلمانوں کو دشمن کے سر پر پہنچ جانے کی خبر ہوئی تو ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ چونکہ مسلمان تعداد میں کم ہیں اور کفار کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا دفاعی صورت اختیار کرنا بہتر ہو گا۔ اس طرح کہ جنگجو افراد تیروں تلواروں اور نیزوں سے راستوں کے ناکوں پر انہیں روکیں۔ اور اگر ان میں کے کچھ لوگ سینہ زوری کر کے حدودِ شہر میں داخل ہو جائیں تو عورتیں، بچے اور بوڑھے چھتوں پر سے سنگباری کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیں اور جب دشمن کا زور ٹوٹ جائے تو پھر اس کے مقابلہ میں صف آرا ہو کر لڑا جائے۔ اور کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ شہر کے اندر محصور رہ کر صرف دفاعی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ اور دفاعی جنگ اس صورت میں اختیار کی جایا کرتی ہے جب دشمن سے زور آزما ہونے کا حوصلہ نہ ہو۔ لہٰذا دشمن کو اپنی کمزوری و بے طاقتی کا تاثر دینے کے بجائے ہمیں شہر سے باہر نکل کر محاذِ جنگ قائم کرنا چاہیئے۔ جو لوگ حدودِ شہر سے نکل کر جنگ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے ان میں حضرت حمزہؓ، سعد ابن عبادہ اور وہ افراد شامل تھے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور اب شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کے بجائے کھلے میدان میں دادِ شجاعت دینا چاہتے تھے اور جو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے ان میں عبداللہ ابن ابی مشہور منافق پیش پیش تھا۔ ذہن اس چیز کو تو قبول نہیں کر سکتا کہ اس کی یہ تجویز مسلمانوں کی ہمدردی و خیر خواہی کے پیش نظر ہو گی جب کہ وہ اور اس کا گروہ یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کا شیرازہ درہم و برہم ہو کر رہ جائے اور ذلت و خواری کے ساتھ مدینہ سے نکال باہر کیئے جائیں۔

مؤرخین نے عام طور پر یہ لکھ دیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بھی مدینہ میں محصور رہ کر جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ مگر رائے عامہ سے متاثر ہو کر مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ پیغمبرؐ کی یہی رائے تھی۔ تو اس پر عمل درآمد کرنے میں مانع ہی کیا تھا جب کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جو لوگ باہر نکلنے پر اصرار کر رہے تھے انہوں نے پیغمبرؐ کو ہتھیار سج کر باہر نکلتے دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر آپ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

ما ینبغی لنبی اذا لبس لامتہ ان یضعھا حتی یقاتل۔۔۔!	نبیؐ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ جب وہ جنگ کا لباس پہن لے تو پھر جنگ کیئے بغیر اُسے اتارے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۹)

یہ الفاظ اطمینان، استقلالِ مزاج اور دشمن سے جہاد کرنے کے غیر متبدل عزم و ارادہ کے عکاس ہیں جس سے یہ صاف عیاں ہے کہ پیغمبرؐ کسی خارجی دباؤ کے زیر اثر شہر سے نکلنے پر مجبور نہ ہوئے تھے بلکہ جوشِ عمل اور ولولہ جہاد کا تقاضا ہی یہ تھا کہ غنیم سے کھلے میدان میں مقابلہ کیا جاتا اور شہر میں محصور رہ کر دشمن کو مدینہ پر تاخت و تاراج کا موقع نہ دیا جاتا۔ پیغمبرؐ کا یہ ارشاد نہ صرف ان کے ناقابلِ تسخیر عزم اور بلند حوصلگی کا ترجمان ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے بھی عزم و عمل کا ایک زرّین درس ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ میں بزدلی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور جب جنگ ناگزیر ہو چکی ہے تو اس میں عملی کمزوری کا گزر نہ ہونے دیں۔ اور کتنی ہی ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں اور اس کی قوت و کثرت کو نظر انداز کر کے آخر دم تک لڑتے رہیں۔

آنحضرتؐ نے ابن مکتوم کو مدینہ میں منتظم و نگران مقرر کیا اور ۱۴ شوال ۳ھ کو نماز جمعہ کے بعد ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور ایک قریب کے راستے سے کوہِ اُحد کی جانب روانہ ہو گئے۔ جہاں قریش کا لشکر ۱۲ شوال سے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ابھی پیغمبرؐ نے آدھا راستا طے کیا ہو گا کہ عبداللہ ابن ابی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت لشکر سے کٹ کر واپس مدینہ آ گیا اور عذر یہ تراشا کہ چونکہ میری رائے پر عمل نہیں کیا گیا کہ اندرون شہر رہ کر جنگ لڑی جائے لہٰذا میں حدودِ شہر سے باہر نکل کر اپنے ساتھیوں کی جانیں خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اب مسلمانوں کی تعداد سات سو رہ گئی جنہیں تین ہزار جنگجوؤں سے مقابلہ کرنا تھا۔ ان سات سو میں سے انصار کے دو قبیلے بنی سلمہ و بنی حارثہ بھی واپسی کے منصوبے باندھنے لگے مگر پھر سنبھل گئے اور پلٹنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ قرآن مجید میں انہی کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا۔	جب تم میں سے دو گروہوں نے (وہیں سے) پسپا ہونے کی ٹھان لی۔"

پیغمبر اسلامؐ نے انہی سات سو لشکریوں کے ساتھ دامنِ کوہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ آج کا دن تو گزر ہی چکا تھا دوسرے دن ۱۵ شوال روز شنبہ دونوں طرف کی فوجوں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ مشرکین کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسلحۂ جنگ بھی ان کے پاس فراواں تھا۔ ان کے لشکر میں سات سو زرہ پوش تھے اور مسلمانوں کے پاس کل ایک سو زرہیں تھیں۔ ان کے پاس تین ہزار اونٹ اور دو سو کوتل گھوڑے تھے اور یہاں صرف دو گھوڑے ایک رسول اللہؐ کے پاس اور ایک ابو بردہ کے پاس بس۔ فوج کی قلت اور سامانِ جنگ کی کمی کی وجہ سے ضرورت تھی کہ لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ دشمن کو ہر سمت سے حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکے چنانچہ تحفظی تدابیر کے پیش نظر آنحضرتؐ نے کوہِ اُحد کو پسِ پشت رکھا اور مدینہ کو سامنے کے رُخ پر۔ اور بائیں جانب کوہِ عینین کے ایک تنگ درہ پر پچاس کمانداروں کا ایک دستہ عبداللہ ابن جبیر کی زیرِ نگرانی کھڑا کر دیا اور اسے

تاکید کی کہ خواہ فتح ہو یا شکست جب تک اسے حکم نہ دیا جائے کسی حالت اور کسی صورت میں اپنا مورچہ نہ چھوڑے۔ جنگی اعتبار سے یہ کارروائی نہایت ضروری تھی اگر یہ انتظام نہ کیا جاتا تو کفار اس سمت سے حملہ آور ہو کر لشکر اسلام کو اپنے محاصرہ میں لے لیتے اور مسلمانوں کے لئے ان کے حصار کو توڑ کر اپنی جانیں بچا لے جانا مشکل ہو جاتا۔ اس نظم والنصرام کے بعد بقیہ لشکر کی صف بندی کی۔ میمنہ پر سعد ابن عبادہ کو اور میسرہ پر اسیر ابن حضیر کو متعین کیا۔ لوار مصعب ابن عمیر کو دیا اور رایت جنگ حضرت علیؑ کے سپرد کیا جو جنگِ بدر میں بھی علمبردار تھے اور بعد کے غزوات میں بھی علمبردار رہے۔

کفار نے بھی اپنے لشکر کو میمنہ و میسرہ میں تقسیم کیا۔ میمنہ کا سردار خالد ابن ولید کو بنایا اور میسرہ کا عکرمہ ابن ابی جہل کو۔ سواروں کا افسر عمرو ابن عاص کو مقرر کیا اور تیر اندازوں کا عبداللہ ابن ربیعہ کو۔ اور قلب لشکر میں جہاں قریش نے اپنا مشہور بت ہبل ایک اونٹ پر لاد رکھا تھا ابوسفیان جا کھڑا ہوا اور عَلَم لشکر بنی عبدالدار کی ایک فرد طلحہ ابن عثمان کے سپرد کیا گیا۔ جب کیل کانٹے سے لیس ہو گئے تو قریش نے اعل ھبل (ہبل کا بول بالا) کا نعرہ لگایا۔ اور ہند اور دوسری عورتیں صفوں کے آگے کھڑی ہو گئیں اور لشکریوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے دف پر ٹھمک ٹھمک کر گانے لگیں :۔

نحن بنات طارق	نمشی علی النمارق	مشی القطا النوازق

"ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں۔ قالینوں پر ناز و انداز سے اس طرح چلتی ہیں جس طرح سبک رو قطا پرندہ چلتا ہے۔"

والمسك فی المفارق	والدر فی المخانق	ان تقبلوا نعانق

"مانگ میں مشک بھری ہے۔ اور گردنوں میں موتی جگمگا رہے ہیں۔ اگر تم آگے بڑھو گے۔ تو ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے۔"

ونفرش النمارق	او تدبروا نفارق	فراق غیر وامق

"اور تمہارے لئے مسندیں بچھائیں گے۔ اور پیٹھ پھرائی تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اس طرح کہ گویا تم سے کبھی چاہت تھی ہی نہیں۔"

اس ترانہ کے ختم ہوتے ہی طبلِ جنگ بجنے لگا اور دست بدست لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ قریش کا علمبردار طلحہ ابنِ عثمان ہتھیار سج کر بڑے کروفر سے میدان میں آیا اور طنز آمیز لہجہ میں کہنے لگا مسلمانو! تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر تم میں سے کوئی مارا جائے تو وہ جنت میں جاتا ہے اور ہم میں سے کوئی مارا جائے تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہوتا ہے۔ لہٰذا تم میں جو جنت جانا چاہے یا مجھے دوزخ میں بھیجنے کا خواہشمند ہو وہ آئے اور مجھ سے لڑے حضرت علیؑ

تلوار لہراتے اور رجز پڑھتے ہوئے اس کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ اور دونوں شمشیر بکف آپس میں بھڑ گئے طلحہ نے تلوار سے حملہ کیا، حضرتؑ نے اس کا وار خالی دے کر اس پر جوابی حملہ کیا اور بیک ضرب شمشیر اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر رکھ دیں۔ طلحہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ پیغمبرؐ نے اُسے گرتے اور علم کفار کو سرنگوں ہوتے دیکھا تو صدائے تکبیر بلند کی اور اس کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرت نے اس کا سر کاٹنا چاہا تو دیکھا کہ وہ برہنہ ہو چکا ہے۔ آپ نے اس حالت میں اس پہ دوسرا وار کرنا گوارا نہ کیا اور اُسے تڑپتا سسکتا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اسے ختم کئے بغیر کیوں چھوڑ دیا؟ فرمایا کہ جب وہ بے پردہ ہو گیا تو مجھے اس پر حملہ کرتے ہوئے شرم آئی اور پھر اس نے مجھے قرابت و عزیزداری کا واسطہ بھی تو دیا تھا۔ آخر اس نے تھوڑی دیر زمین پر سر ٹپک کر دم توڑ دیا۔ طلحہ کے مارے جانے سے مشرکین کے حوصلے پست ہو گئے اور عام بے دلی سی پیدا ہو گئی اور ایک ایک کر کے میدان میں نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اب انہوں نے ایک دم ہلہ بول دیا۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر ان کے ریلے کو روکا۔ دونوں طرف سے کمانیں کڑکیں، تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ابو دجانہ انصاری اور جناب حمزہ اور حضرت علیؑ اور دوسرے مجاہدین نے حملوں پر حملے کئے اور دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچا دیا۔

رسولِ خدا نے اس معرکہ میں ابو دجانہ کو ایک تلوار مرحمت فرمائی تھی۔ ابو دجانہ نے سر پر سُرخ پٹکا باندھا اور تلوار لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں کفار کی عورتیں دف بجا بجا کر اپنے نغموں سے فوج میں جوش پیدا کر رہی تھیں۔ آپ نے ہند بنت عتبہ پر تلوار اٹھائی اور چاہا کہ اس کے پرخچے اڑا دیں مگر اس خیال سے ہاتھ روک لیا کہ رسولؐ کی دی ہوئی تلوار کو ایک عورت کے خون سے رنگین کرنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت حمزہ کی تلوار صاعقہ بار بھی دشمن کے سروں پر پیہم چل رہی تھی۔ طلحہ ابن عثمان کے مارے جانے کے بعد عثمان ابن ابی طلحہ نے قریش کا علم بلند کیا تھا آپ نے تلوار سے اس پر حملہ کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔

حضرت علیؑ دونوں صفوں کے درمیان علم کو فضا میں لہراتے ہوئے حملوں پر حملے کئے جا رہے تھے اور لشکر قریش میں سے جو بھی علم ہاتھوں میں لیتا اُسے تہ تیغ کر کے پرچم کفر سرنگوں کر دیتے یہاں تک آٹھ علمبرداروں کو یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور جب بنی عبدالدار میں سے کوئی پرچم اٹھانے والا نہ رہا تو اس قبیلہ کے ایک غلام صواب نے علم سنبھال لیا۔ حضرت نے آگے بڑھ کر اس کی کمر پر تلوار کا وار کیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح تمام پرچم برداروں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

کان الذی قتل اصحاب اللواء   "جس نے علمبرداران لشکر کو تہ تیغ کیا وُہ علیؑ"

علیؓ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲، ص ۱۰۷) تھے۔"

علمبرداران لشکر کے قتل سے قریش کا دم خم جاتا رہا۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور کفار کے مقابلہ میں ایک چوتھائی سے بھی کم ہونے کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑتے سینوں کو چھیدتے اور صفوں کو الٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ دشمن کے پاؤں جم نہ سکے اور شکست کھا کر میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ ابوسفیان علم کو سرنگوں اور ہبل کو خاک بسر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور قریش کی عورتیں بھی پائینچے سمیٹے دوڑ پڑیں۔ مسلمانوں نے جب کفار کو دوڑتے اور میدان خالی کرتے دیکھا تو ان پر حرص و طمع کی کمزوری غالب آگئی اور دشمن کی طرف سے غافل ہو کر مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ درہ کوہ کے محافظوں نے جب مال غنیمت لٹتے دیکھا تو اُن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ عبداللہ بن جبیر نے انہیں پیغمبرؐ کا حکم یاد دلایا اور درّہ کو خالی چھوڑ کر جانے سے منع کیا مگر دس یا اس سے کم آدمیوں کے علاوہ کسی نے اُن کی بات نہ سنی اور مال غنیمت لوٹنے کے لئے دوڑ پڑے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

جعلوا یقولون الغنیمۃ الغنیمۃ فقال عبداللہ مھلا اما علمتم ما عھد الیکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فابوا فانطلقوا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳، ص ۱۹۳)	"وہ لوگ غنیمت غنیمت پکارنے لگے۔ عبداللہ نے کہا ٹھہرو۔ کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد نہیں ہے۔ مگر انہوں نے ٹھہرنے سے انکار کر دیا اور مال غنیمت لوٹنے کے لئے چل دیئے۔"

کمانداروں کی اس بے صبری و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد ابن ولید اور عکرمہ ابن ابی جہل نے درۂ کوہ کو خالی پا کر دو سو کی جمعیت کے ساتھ عقب سے حملہ کر دیا۔ عبداللہ ابن جبیر نے اپنے دو چار آدمیوں کے ساتھ بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا مگر چند آدمی اس یلغار کو روک نہ سکتے تھے ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ خالد کے اس کامیاب حملہ کو دیکھ کر بھاگنے والے پلٹ آئے۔ سرنگوں علم کو بنی عبدالدار کی ایک عورت عمرہ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھا لیا۔ کفار نے اپنی بکھری ہوئی طاقت کو از سر نو جمع کیا اور مسلمانوں کے منتشر لشکر پر حملہ کر دیا۔ مسلمان حملہ سے بے خبر مال غنیمت سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے کہ ایک طرف سے پسپا ہونے والی فوج اور دوسری طرف سے خالد کے دستہ نے گھیراؤ ڈال لیا اور تلواریں لے کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس دو طرفہ یلغار سے مسلمان حواس باختہ سے ہو گئے اور کچھ خوف و دہشت اور کچھ گرد و غبار کی وجہ سے اپنے آدمیوں کے چہرے بھی نہ پہچان سکے اور بے دیکھے بھالے ایک دوسرے پر تلواریں چلانے لگے۔ چنانچہ اسید ابن حضیر کو ابو بردہ ابن نیار نے زخمی کر دیا اور ابو بردہ ابو زعنہ کی تلوار سے زخمی ہو گئے۔ اور اس افراتفری میں حذیفہ کے والد یمان حذیفہ کے چیخنے چلانے کے باوجود مسلمانوں

کی تلواروں سے مارے گئے۔ جنگ کا نقشہ پلٹ گیا، جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل گئی۔ کچھ مسلمان شہید ہو گئے کچھ زخمی ہوئے اور کچھ حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مؤرخ طبری نے تحریر کیا ہے :۔

کان المسلمون لما اصابھم ما	جب مسلمانوں پر یہ مصیبت پڑی تو ان میں سے
اصابھم من البلا اثلاثا ثلث	ایک تہائی قتل ہو گئے، ایک تہائی زخمی ہو گئے اور
قتیل ثلث جریح وثلث منھزم	ایک تہائی بھاگ کھڑے ہوئے"

(تاریخ طبری۔ج ۲۔ص۱۹)

اس ہنگامۂ رست وخیز میں سباع ابن عبد العزیٰ حضرت حمزہ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے اسے یا بن مقطعۃ البظور "اے ختنہ کرنے والی کے بیٹے" کہہ کر خطاب کیا اور شمشیر لے کر اس جھپٹے اور وہیں پر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ جبیر ابن مطعم جس کا چچا طعیمہ ابن عدی جنگ بدر میں حضرت علیؑ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اس نے اپنے غلام وحشی سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ محمدؐ، علیؑ یا حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو اسے آزاد کر دیا جائے گا اور ہند بنت عتبہ نے بھی اسے زر و جواہر سے نہال کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وحشی کے لئے پیغمبرؐ اور علیؑ پر حملہ کرنا تو مشکل تھا اس نے حضرت حمزہ کو شہید کرنے کی ٹھان لی۔ اور موقع تاک کر پوری چابکدستی سے اپنا بھالا ان کی طرف پھینکا جو ناف پر لگا اور پیٹ کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ آپ اس جہلک ضرب کے باوجود اس کی طرف لپکے مگر قوت نے ساتھ نہ دیا اور زمین پر گر کر شہادتِ عظمیٰ کے درجہ پر فائز ہوئے۔

ابن اثیر نے اسد الغابہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ جب عام بھگدڑ مچی تو پیغمبر اسلام میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے مقتولین کے لاشوں میں دیکھا بھالا مگر کہیں نظر نہ آئے۔ میں نے دل میں کہا کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ میدان چھوڑ کر چلے جائیں اور جہادِ راہِ خدا سے منہ موڑ لیں۔ کہیں اللہ نے مسلمانوں کی ناروا حرکت پر غضب ناک ہو کر انہیں زندہ آسمانوں پر نہ اٹھا لیا ہو۔ اب میرے لئے یہی بہتر ہے کہ لڑتے لڑتے قتل ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے تلوار کا نیام توڑ ڈالا اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑا۔ جب کفار کا پرا چھٹا تو میں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ اکرم میدان میں ثابت قدم کھڑے ہیں۔ غرض اس ہنگامۂ دار و گیر میں آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی میدان چھوڑنا گوارا نہ کیا اور جان سے بے نیاز ہو کر دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوتے، تیر و تلوار کے وار سہتے اور انہیں درہم و برہم کرتے رہے اور پورے ثبات قدم کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہے۔

ابن سعد نے تحریر کیا ہے :۔

وکان علی ممن ثبت مع رسول	اُحد کے دن جب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو علیؑ
اللہ یوم احد حین انھزم الناس	رسول اللہؐ کے ساتھ ثابت قدم رہنے والوں میں

وبایعہ علی الموت۔ (طبقات ج ۳۔ ص۲۳) سے تھے اور موت پر پیغمبرؐ کی بیعت کی۔"

اس انتشار میں پچاس سواروں کا ایک دستہ آنحضرتؐ پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھا۔ آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علی دشمن حملہ کے لئے بڑھ رہا ہے اسے آگے بڑھ کر روکو۔ علی نے شیرانہ حملہ کرکے انہیں منتشر کر دیا۔ پھر دوسری سمت سے مشرکین نے حملہ کرنا چاہا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے علی اب انہیں روکو۔ حضرت نے انہیں بھی تتر بتر کر دیا۔ غرض جدھر سے ہجوم بڑھتا ادھر علیؑ آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے اور دشمن کے پرے توڑ کر رکھ دیتے۔ ان حملوں میں شیبہ ابن مالک عامری اور سفیان ابن عویف کے چاروں بیٹوں ابوالشعثاء، خالد، ابوالحمرٰ اور غراب کو قتل کرکے پیغمبرؐ کو خون آشام تلواروں سے محفوظ رکھا۔ حضرت کی اس جاں نثاری و فداکاری کو دیکھ کر جبرائیل امینؑ نے پیغمبرؐ سے کہا:۔

یارسول اللہ ان ھذہ للمواساۃ یارسولؐ اللہ ہمدردی و غمخواری اسے کہتے ہیں۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲، ص۱۹۷)

پیغمبرؐ نے فرمایا کہ کیوں نہ ہو جب کہ علی میرے ہیں اور میں ان کا ہوں اور جبرئیلؑ نے کہا اور میں آپ دونوں کا ہوں۔ اسی موقع پر لاسیف الا ذوالفقار و لافتیٰ الا علیؑ۔ کی آواز فضا میں گونجی اور فرش سے عرش تک تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

حضرت علیؑ میدانِ جنگ میں مصروفِ پیکار تھے کہ مشرکین نے پیغمبرؐ پر ہجوم کیا اور عبداللہ ابن شہاب، عتبہ ابنِ ابی وقاص، ابنِ قمیئہ لیثی، ابی ابن خلف اور عبداللہ ابن حمید نے براہِ راست آپ پر حملہ کر دیا۔ عبداللہ ابن شہاب نے آپ پیشانی اقدس پر ضرب لگائی۔ عتبہ ابن ابی وقاص نے یکے بعد دیگرے چار پتھر پھینکے۔ جس سے آپ کے چار دانت شہید اور ہونٹ شگافتہ ہو گئے۔ ابن قمیئہ نے قریب آکر تلوار کی ضرب لگائی جس سے خود کی کڑیاں پیشانی میں گڑ گئیں۔ چہرہ مبارک خون سے رنگین ہو گیا۔ ابی ابن خلف نے آگے بڑھ کر حملہ کیا آنحضرتؐ نے ایک صحابی حارث ابن صمہ کے ہاتھ سے نیزہ لے کر اُس کی گردن پر مارا جس سے ہلکا سا زخم آیا مگر وہ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور پلٹتے ہوئے مقام سرف تک پہنچا تھا کہ مر گیا۔ ان حملہ آوروں میں سے عبداللہ ابنِ حمید کو ابو دجانہ نے تہِ تیغ کیا۔ قبیلہ انصار کے چند آدمیوں نے پیغمبرؐ پر حملہ ہوتے دیکھا تو وہ آگے بڑھ کر حائل ہوئے۔ انصار کو دیکھ کر کفار پیچھے ہٹے اور تھوڑے فاصلہ سے تیر برسانے شروع کئے۔ ابو دجانہ انصاری تیروں کی بوچھار میں پیغمبرؐ کے سینہ سپر بن گئے اور آنحضرتؐ پر جھک کر اپنی پیٹھ پر تیر کھاتے رہے۔ پیغمبرؐ کے قریب ہی مصعب بن عمیر دشمن کے حملوں کو روکنے میں مصروف تھے کہ ابن قمیئہ نے حملہ کرکے انہیں شہید کر دیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ اس نے پیغمبرؐ کو قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی صفوں کے قریب پہنچ کر فخریہ لہجے میں کہا کہ میں نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے شور مچا دیا کہ الا ان محمداً قد قتل (محمدؐ قتل کر دیئے گئے) مسلمانوں میں سے کچھ تو پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے اور جو رہ گئے تھے اس خبر کو سن کر اُن کی ہمت جواب دے گئی اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ دُور چٹانوں کی اوٹ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے مدینہ میں پہنچ کر دم لیا۔ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

تفرق عنه اصحابه ودخل	آنحضرتؐ کے اصحاب آپ کو چھوڑ کر الگ ہو گئے
بعضهم المدينة وانطلق	ان میں سے کچھ مدینہ پہنچ گئے کچھ پہاڑ کے اُوپر
بعضهم فوق الجبل الى الصخرة	ایک چٹان پر چڑھ گئے اور وہیں پر ڈیرے ڈال
فقاموا عليها وجعل رسول الله	دیئے۔ پیغمبرؐ خدا انہیں پکارتے تھے "اے بندگانِ
يدعو الناس الى عباد الله الى	خدا اے اللہ کے بندو میرے پاس آؤ میرے پاس
عباد الله۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲، ص ۲۰۱)	آؤ"

قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:۔

اذ تصعدون ولا تلوون على	جب تم پہاڑ پر چڑھے جا رہے تھے اور رسولؐ
احد والرسول يدعوكم في	پیچھے سے تمہیں پکار رہا تھا مگر تم کسی کو مڑ کر بھی
اخراكم۔	نہ دیکھتے تھے"

اس افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں انس ابن نضر کا گزر اس پہاڑ کی چوٹی کی جانب ہوا جہاں چند مہاجرو انصار سر چھپائے بیٹھے تھے۔ آپ نے حیرت و استعجاب سے انہیں دیکھا اور کہا کہ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟ انہوں نے کہا کہ رسولؐ تو قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کہا کہ ان کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ اٹھو اور جس دین کی خاطر انہوں نے جان دی ہے تم بھی اپنی جانیں دے دو۔ یہ کہہ کر انس میدان کی طرف بڑھے۔ میدانِ جنگ میں سعد ابن معاذ دکھائی دیئے اُن سے کہا کہ کوہِ اُحد کی سمت سے میرے مشام میں جنت کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ کہہ کر تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار میں دشمن کی سپاہ پر حملہ کر دیا اور تیر و تلوار کے ستر زخم کھا کر شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔ علامہ طبری نے چٹان پر بیٹھنے والوں میں حضرت عمرؓ اور طلحہ ابن عبیداللہ کا خصوصیت سے نام لیا ہے اور ان کی باہمی گفتگو بھی درج کی ہے۔ جس سے اُن خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے جن میں غلطاں و پیچاں تھے وہ لکھتے ہیں:۔

قال بعض اصحاب الصخرة	چٹان پر بیٹھنے والوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ
ليت لنا رسولا الى عبد الله	کاش ہمیں کوئی قاصد مل جاتا جسے ہم عبداللہ

ابن ابی فیاخذ لنا امنة من ابی سفیان یاقوم ان محمدًا قد قتل فارجعوا الی قومکم قبل ان یاتوکم فیقتلوکم۔

ابن ابی کے پاس بھیجتے جو ہمارے لئے ابوسفیان سے امان کی درخواست کرتا اے لوگو محمدؐ تو قتل ہو گئے اب اپنی قوم (قریش) کی طرف واپس چلو قبل اس کے کہ وہ آئیں اور تمہیں قتل کر دیں۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۰۱)

قرآن مجید میں ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے :۔

افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم و من ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا سیجزی الله الشاکرین۔

اگر پیغمبرؐ (اپنی موت) مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پیروں کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ اور جو الٹے پاؤں پلٹے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور خدا جلد ہی شکر گزاروں کو اچھا بدلہ دے گا۔"

آنحضرتؐ نے مصعب کی شہادت کے بعد لواء حضرت علیؑ کے سپرد کر دیا تھا۔ آپ دشمن کو پیچھے دھکیلنے میں مصروف تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خبر شہادت سن کر چونکے۔ صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر آئے جہاں پیغمبرؐ زندہ و سلامت موجود تھے۔ اگرچہ خود بھی زخموں سے چور چور تھے مگر پیغمبرؐ کی حالت دیکھ کر اپنی حالت بھول گئے۔ اور آنحضرتؐ کو سہارا دے کر ایک گھاٹی کی طرف لے چلے۔ کعب ابن مالک کی نظر آنحضرتؐ پر پڑی تو انہوں نے خوش ہو کر بے ساختہ کہا یہ رہے رسولِ خدا۔ آپ نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بچے کھچے مسلمانوں کے ساتھ گھاٹی میں تشریف فرما ہوئے۔ امیرالمومنین پیغمبرؐ کو گھاٹی میں پہنچا کر چشمۂ مہراس سے ڈھال میں پانی بھر کر لائے۔ اتنے میں جناب فاطمہ زہراؑ چند خواتین کے ہمراہ یہ سن کر کہ پیغمبرؐ شہید کر دیئے گئے ہیں اس گھاٹی میں تشریف لے آئیں۔ باپ کو زندہ و سلامت دیکھ کر اطمینان ہوا مگر چہرہ و پیشانی کو خون سے رنگین دیکھ کر رونے لگیں اور بے ساختہ باپ سے لپٹ گئیں اور علیؑ کے ساتھ مل کر زخموں کو دھویا اور بوریئے کا ٹکڑا جلا کر زخموں پر رکھا جس سے خون تھم گیا۔

جنگ عملاً ختم ہو چکی تھی۔ کفار اپنی فتح یابی اور مسلمانوں کی ہزیمت پر خوش تھے۔ ابوسفیان نے پہاڑ کی ایک چوٹی پر چڑھ کر مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا محمدؐ زندہ ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسے کوئی جواب نہ دے اس نے پھر پوچھا کہ کیا ابن ابی قحافہ ہیں کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا عمر ابن خطاب ہیں۔ اس پر بھی کوئی جواب نہ دیا گیا تو اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ یہ تو سب مارے گئے۔ حضرت عمر پیغمبرؐ کے منع

کرنے کے باوجود خاموش نہ رہ سکے اور کہا کہ ہم سب زندہ موجود ہیں۔ ابوسفیان نے اعل ھبل کا نعرہ لگایا مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی ہدایت پر اللہ اعلیٰ واجل (اللہ بزرگ و برتر ہے) کہہ کر اس کے نعرہ کا جواب دیا۔ ابوسفیان نے کہا کہ لنا العزی ولاعزی لکم۔ (ہم عزیٰ رکھتے ہیں اور تم عزیٰ نہیں رکھتے) مسلمانوں نے کہا: اللہ مولانا ولامولیٰ لکم (اللہ ہمارا والی ہے اور تمہارا کوئی والی نہیں ہے) اس نے پھر کہا کہ کل تم جیتے تھے اور آج ہم جیتے ہیں۔ ہم نے مقتولینِ بدر کا بدلہ تمہارے مقتولین سے لے لیا ہے۔ اب سال آیندہ اسی مہینہ میں بدر کے مقام پر تم سے مڈبھیڑ ہوگی۔ مسلمانو! تمہارے ہاں کی کچھ لاشوں کو مثلہ کیا گیا ہے مگر میں نے نہ اس کا حکم دیا تھا اور نہ اس سے منع کیا تھا۔ یہ کہہ کر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مکہ روانہ ہوگیا۔

اس خونیں معرکہ میں دو عورتوں کا کردار جو میدانِ جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور پانی پلانے کے لئے آئی تھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ایک ام عمارہ نسیبہ بنت کعب ہیں جن کا شوہر زید بن عاصم اور دو بیٹے حبیب اور عبداللہ اس جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ اس خاتون نے جب دیکھا کہ پیغمبر اسلامؐ تیروں کی زد میں ہیں تو آنحضرتؐ کے آگے کھڑی ہوگئیں اور تیروں کو اپنے سینہ پر روک کر پیغمبرؐ کا بچاؤ کرتی رہیں اور جب ابن قمیئہ تلوار لے کر آنحضرتؐ پر حملہ آور ہوا تو تلوار لے کر اس کے مقابلہ میں کھڑی ہوگئیں یہاں تک کہ بازو زخمی ہوگیا اور دوسری خاتون ام ایمن ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو جنگ سے پیٹھ پھرا کر بھاگتے دیکھا تو ان کی غیرت ایمانی جوش میں آئی اور تو ان کا کوئی بس نہ چلا مٹی اٹھا اٹھا کر ان کے چہروں پر پھینکتی جاتی تھیں اور یہ کہتی جاتی تھیں۔

ھاك المغزل فاعزل به وھلم	لے یہ تکلا لیتا جا اور گھر میں بیٹھ کر سوت کات
السیف (سیرۃ حلبیہ۔ ج ۲۔ ص۲۵۲)	اور اپنی تلوار مجھے دیتا جا۔"

ان عورتوں کے کردار کے مقابلہ میں مردوں کے کردار پر نظر کی جائے تو میدان چھوڑنے والوں کی فہرست میں ایسے ایسے لوگوں کے نام بھی صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہیں جن سے اس کٹھن مرحلہ پر ثباتِ قدم کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ مگر حضرت علیؑ، ابودجانہ انصاری، سہل ابن حنیف، عاصم ابن ثابت، مقداد ابن عمرو، سعد ابن معاذ، اسید ابن حضیر، طلحہ ابن عبیداللہ اور زبیر ابن عوام کے علاوہ کوئی ثابت قدم نظر نہیں آتا۔ بلکہ ان میں سے بھی اکثر میدان سے روگرداں ہوگئے تھے اور پھر واپس ہوئے تھے۔ ان پلٹ کر آنے والوں میں سے ایک حضرت ابوبکر بھی تھے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

لما صرف الناس یوم احد عن	جب اُحد کے دن لوگ رسولؐ اللہ کو چھوڑ کر
رسول اللہ کنت اول من جاء	چلے گئے تو میں سب سے پہلے پلٹ کر آنحضرتؐ

النبیؐ (تاریخ خمیس۔ ج۱۔ ص۴۳۸) کے پاس آیا۔"

اگرچہ اس قول میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ واپسی کس وقت ہوئی۔ لیکن واقعات سے ظاہر ہے کہ یہ واپسی خاتمہ جنگ کے بعد ہوئی۔ اس لئے کہ اگر دورانِ جنگ میں ہوتی تو کسی نہ کسی موقع پر ضرب لگانے یا کھانے والوں میں ان کا نام آتا جب کہ لڑنے والوں میں سے جو بھی مجروح ہوا اس کا نام تاریخ میں آئے بغیر نہیں رہا۔ یہاں تک کہ طلحہ کی ایک انگلی پر خراش آ گئی تو تاریخ نے اسے بھی محفوظ کر لیا البتہ ان کا نام آتا ہے اس موقع پر جب دونوں طرف کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پیغمبرؐ چند لوگوں کے ہمراہ گھاٹی میں تشریف فرما ہوئے۔

حضرت عمر کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر دیکھے گئے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:۔

تفرقنا عن رسول اللہ یوم احد ہم اُحد کے دن رسولؐ اللہ سے الگ ہو گئے اور میں
فصعدت الجبل۔ (ازالۃ الخفاء ج ۱۔ ص۳۹۱) پہاڑ کے اوپر چڑھ گیا۔"

حضرت عثمان اس گروہ میں شامل تھے جو تین دن کے بعد مراجعت فرما ہوا۔ چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں۔

فیھم عثمان ابن عفان وغیرہ ان بھاگنے والوں میں عثمان ابن عفان اور دوسرے
الی الاعوص فاقاموا بہ ثلاثا لوگ شامل تھے جو اعوص میں تین دن ٹھہرنے کے بعد
ثم اتوا النبیؐ فقال لھم حین نبیؐ اکرم کے پاس آئے۔ آپ نے انہیں دیکھا تو فرمایا
راٰھم لقد ذھبتم فیھا عریضہ تم لوگ تو بہت دور نکل گئے۔"
(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص۱۱۰)

حضرت علی اس غزوہ میں جس پامردی و ثبات قدمی سے لڑے وہ اسلامی جہاد کا ایک عظیم نمونہ اور تاریخ کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ آپ اس وقت جب کہ دشمن کی یورش سے گھبرا کر لشکر کے قدم ڈگمگا گئے تھے تن تنہا دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوتے رہے اور اپنے زورِ بازو سے اُن کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روک کر اسلام اور بانیٔ اسلام کا تحفظ کرتے رہے اور جب تک معرکہ کارزار گرم رہا ایک لمحہ کے لئے نہ ہاتھ قبضۂ شمشیر سے الگ ہوا اور نہ پائے عزم و ثبات کو جنبش ہوئی۔ حالانکہ پے درپے حملوں سے نڈھال اور تیروں اور تلواروں کے وار سے گھائل ہو چکے تھے۔ علامہ سیوطی نے لکھا ہے:۔

اصابت علیا یوم احد ست عشرۃ اُحد کے دن حضرت علی کو تلوار کی سولہ ضربیں
ضربۃ۔ (تاریخ الخلفاء۔ ص۱۱۴) لگیں۔"

اس غزوہ میں مسلمانوں کو فتح تو حاصل نہ ہو سکی۔ پھر بھی حضرت علی، جناب حمزہ اور دوسرے دو چار جانبازوں کی ثابت قدمی نے مسلمانوں کو شکست کی بدترین صورت سے بچا لیا۔ شکست کی یہ پیش آمدہ صورت کسی ناگہانی

حادثہ کی وجہ سے رونما نہیں ہوئی بلکہ اختلاف رائے اور بے ضابطگی کا قہری نتیجہ تھی۔ چنانچہ مسلمان پہلے محاذ جنگ ہی کے سلسلہ میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مدینہ میں رہ کر لڑنا چاہتا تھا اور دوسرا گروہ شہر سے باہر نکل کر نبرد آزما ہونے کا خواہشمند تھا اور جب پیغمبرؐ کے نکل کھڑے ہونے پر باہر نکلنا طے پا گیا تو پھر کچھ لوگوں کی رائے نے پلٹا کھایا اور ایک گروہ کٹ کر مدینہ واپس آگیا۔ جس نے مسلمانوں کے عزم و ثبات اور جماعتی یکجہتی کو متاثر کیا اور انصار کے دو قبیلے بنی سلمہ و بنی حارثہ جنگ سے منہ موڑ کر واپس مدینہ چلے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ شروع ہی سے مسلمانوں کے طرز عمل میں کمزوری رونما ہو چکی تھی۔ اور جہاد میں جس جوش و ولولہ اور حرارت عزم و عمل کی ضرورت ہوتی ہے وہ ناپید تھی اور آخر اس ذہنی پراگندگی اور عملی کمزوری کے نتیجہ میں مجموعی طور پر شکست و ہزیمت اور ناقابل تلافی جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ہزیمت مسلمانوں کی قلت اور کفار کی عددی کثرت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس میں عزم کی کمزوری اور فرض کے عدم احساس ہی کا دخل تھا۔ چنانچہ جب تک مسلمانوں میں تھوڑا بہت ادائے فرض کا احساس اور مجاہدانہ ولولہ رہا تعداد میں کم ہونے کے باوجود دشمن انہیں مغلوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ انہوں نے کفار کو ان کی کثرت و قوت کے باوجود پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور جب انہوں نے صبر و استقلال اور جماعتی تنظیم کو ختم کر کے خود ناکامی کو دعوت دی تو پھر کس طرح شکست و ہزیمت سے بچ سکتے تھے۔ چنانچہ اس ہزیمت و ناکامی کو قریب ترلانے اور قیمتی جانوں کے ضیاع کا باعث وہی لوگ ہوئے جو درہ کوہ کی حفاظت پر متعین تھے۔ مگر انہوں نے نظم و ضبط کو خیرباد کہہ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور وقتی فتح کو مستقل فتح سمجھ کر مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے نہ رسول خدا کا تاکیدی فرمان یاد رکھا نہ اپنے سربراہ کا حکم مانا نہ انجام کار پہ نظر کی اور مال دنیا کی طمع میں آ کر دشمن کو حملہ آور ہونے کا موقع دے دیا۔ اگر یہ لوگ عاقبت اندیشی سے کام نہ لیتے اور اپنا مورچہ خالی نہ چھوڑتے تو شکست کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کی دنیا طلبی کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ومنکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرۃ۔	تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب ہیں اور کچھ آخرت کے خواستگار ہیں ۔

علامہ طبری نے لکھا ہے کہ طالبانِ دنیا سے مراد وہ لوگ ہیں جو درہ کو خالی چھوڑ کر غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور طلبگارانِ آخرت سے مراد وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ ہم ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کریں گے اور اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑیں گے۔ ابن مسعود کہتے ہیں:۔

ما شعرت ان احدا من اصحاب	میں نہیں سمجھتا تھا کہ اصحاب رسولؐ میں سے کوئی

النبیؐ کان یرید الدنیا وعرضها	دنیا و مال دنیا کا بھی پرستار ہو سکتا ہے یہاں
حتیٰ کان یومئذ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۹۳)	تک کہ یہ دن دیکھنے میں آیا"

اس محافظ دستہ کے علاوہ ان لوگوں پر بھی شکست کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو رسولؐ خدا کو دشمنوں کے نرغہ میں چھوڑ کر میدانِ کارزار سے بھاگ کھڑے ہوئے اور پیغمبرؐ کے پیہم پکارنے پر بھی ان کے قدم نہ رکے حالانکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ :-

یا ایھا الذین امنوا اذا لقیتم	اے ایماندارو جب تم سے اور کافروں سے میدانِ
الذین کفروا زحفا فلا	جنگ میں مڈبھیڑ ہو تو خبردار ان کی طرف سے
تولوھم الادبار۔	پیٹھ پھرا کر چلے نہ جانا"

اگرچہ مسلمانوں کو کثیر جانی نقصان اٹھا کر اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا مگر اس تباہی ونا کامی نے انہیں یہ درس بھی دیا کہ وہ اپنی صفوں میں انتشار رونما نہ ہونے دیں، ہر قیمت پر نظم وضبط برقرار رکھیں اور امیر و سربراہ کے احکام کی پابندی کریں۔ کیونکہ انتشار، خودغرضی اور نزاع و بددلی شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور عزم و نظم ہی سے دشمن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس شکست سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ظاہری فتح و شکست حالات و اسباب کے تابع ہوتی ہے۔ اسے حق و باطل کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کبھی حق پر ہوتے ہوئے شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کبھی باطل پر ہونے کے باوجود مادی اعتبار سے فتح ہو جاتی ہے اس لئے اسلام نہ قوت و اقتدار کو حق کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور نہ مادی شکست کو باطل کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی ہوا کہ نفاق کی دبیز تہوں میں چھپے ہوئے چہرے بے نقاب ہو گئے جنہوں نے تھوڑی دیر کے لئے ساتھ دیا اور پھر اپنا راستا الگ کر لیا اور ان تھڑدلوں کا بھی حال معلوم ہو گیا جو دشمن کے مقابلہ میں جم کر لڑنے کے بجائے تلواروں کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور جہاد راہِ خدا میں عملی اعتبار سے کمزوری دکھائی۔

اس غزوہ میں ستر مسلمان شہید ہوئے اور بائیس کفار موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ مشرکین قریش نے اگرچہ مقتولین بدر کا بدلہ لے لیا مگر ان کا جوشِ انتقام فرو نہ ہوا اور فتح و کامرانی کی سرمستیوں میں کھو کر شہداء کے لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ چنانچہ معاویہ ابن مغیرہ ابن ابی العاص نے حضرت حمزہؓ کی میت کی ناک کاٹی اور ہند بنتِ عتبہ نے ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور اسے اپنے دانتوں سے چبایا اور اعضاء و جوارح کاٹ کر ان کا ہار بنایا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسری عورتوں نے بھی شہیدوں کے ناک کان کاٹے اور رسّی میں پرو کر ہاتھوں میں سجے۔ اور ابو سفیان نے بھی تہذیب و شرافت کو بالائے طاق رکھ کر حضرت حمزہؓ کے لاشہ کی بے حرمتی کی اور نیزے کی انی ان کے چہرے پر ماری جس پر بنی کنانہ کی ایک فرد حلیس ابن علقمہ

نے چیخ کر کہا کہ دیکھو یہ ابوسفیان ایک شریف قوم کے لاشہ سے کیا شرمناک سلوک کر رہا ہے۔ ابوسفیان نے سنا تو شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

ابوسفیان کی دشمنی و عناد اور انتقامی جذبہ اسلام لانے کے بعد بھی بدستور قائم رہا۔ چنانچہ حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں اس نے حضرت حمزہؓ کی قبر پر ٹھوکر ماری اور کہا۔

یا اباعمارہ ان الامر الذی اجتلدنا علیہ بالسیف امسی فی ید غلماننا یتلعبون بہ۔	اے ابوعمارہ (حمزہؓ) وہ حکومت جس پر ہم آپس میں تلواریں چلاتے تھے آج ہمارے لڑکے بالوں کے ہاتھ میں ہے جس سے وہ کھیل رہے ہیں۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۴۔ ص۵۱)

یہ تھی ابوسفیان کی انتقام پسندی و کینہ جوئی جو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی اولاد میں اسی جوش و خروش کے ساتھ باقی رہی۔ چنانچہ ابوسفیان کے بیٹے معاویہ نے میدانِ صفین میں عبداللہ ابن بذیل کے لاشہ کو مثلہ کرنا چاہا جس پر انہی کے گروہ کی ایک فرد عبداللہ ابن عامر نے کہا:۔

لا یمثل بہ و فی روح۔	میرے جیتے جی اسے مثلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

(شرح ابن ابی الحدید جزو ۵۔ ص۲۷۱)

آخر معاویہ کو ہاتھ روکنا پڑا۔ یونہی اس کے پوتے یزید ابن معاویہ نے امام حسین علیہ السلام کے سر اقدس کی بے حرمتی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کے عمل کو دہرایا اور بنی امیہ کی بدفطرتی و بدطینتی کو بے نقاب کر کے واقعہ کربلا میں جذبۂ انتقام کی کارفرمائی کا ثبوت دیا۔

پیغمبرؐ اکرم سن چکے تھے کہ شہیدوں کی لاشیں مثلہ کی گئی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے چچا حمزہ کی دلاش کا پتا کیا جائے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ حارث ابن صمہ نے کہا کہ میں ان کی جائے شہادت دیکھ چکا ہوں۔ ابھی جا کر خبر لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دامن کوہ میں آئے۔ حضرت حمزہ کے لاشہ کو دیکھا مگر جو حالت تھی پلٹ کر پیغمبرؐ سے بیان نہ کر سکے۔ آپ نے حضرت علی کو بھیجا مگر انہوں نے بھی پلٹ کر گوارا نہ کیا کہ آنحضرتؐ کو ان کے مثلہ کئے جانے کی کیفیت سے آگاہ کریں۔ آخر پیغمبرؐ خود وہاں پر تشریف لے گئے۔ اور جب حضرت حمزہ کا لاشہ دیکھا اور ان کے کٹے پھٹے اعضاء پر نظر کی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ابن مسعود کہتے ہیں:۔

ما رأینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باکیا اشد من بکائہ علی حمزۃ رضی اللہ عنہ (سیرۃ حلبیہ۔ ج ۲ ص۲۴۳)	ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا روتے کبھی نہیں دیکھا جتنا حضرت حمزہ پہ روتے دیکھا۔"

جب کچھ لوگوں نے بتایا کہ ہند نے ان کا کلیجہ دانتوں سے چبایا تھا تو پوچھا گیا اس میں سے کچھ کھایا بھی تھا؟ کہا کہ صرف چبایا مگر نگل نہ سکی اور اگل دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

ما کان اللہ لیدخل شیئاً من حمزۃ النار۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۱)

اللہ تعالیٰ یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ حمزہؓ کا کوئی جزو بدن دوزخ میں ڈالے "

حضرت حمزہؓ کی خبر شہادت جب مدینہ پہنچی تو ان کی بہن صفیہ بے تابانہ نکل کھڑی ہوئیں اور اُحد میں پہنچ گئیں۔ آنحضرتؐ نے چاہا کہ صفیہ جناب حمزہؓ کا لاشہ نہ دیکھیں، مگر صفیہ نے کہا کہ مجھے روکنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی لاش کے ساتھ کیا بہیمانہ سلوک ہوا ہے۔ آخر پیغمبرؐ نے حمزہؓ کی لاش پر اپنی چادر ڈالی، چادر چھوٹی تھی پیر کھلے رہ گئے۔ آپ نے پیروں پر گھانس پھونس ڈال کر انہیں چھپا دیا۔ اور صفیہ کو لاش پر جانے کی اجازت دے دی۔ صفیہ نے جب لاشہ دیکھا تو زبان سے انا للہ و انا الیہ راجعون کہا اور صبر و ضبط کے باوجود بے ساختہ رونے لگیں اور پیغمبر بھی اس گریہ وزاری میں شریک ہوئے۔

اب شہداء کی میتوں کی تدفین کا مرحلہ درپیش تھا۔ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے حضرت حمزہؓ کی میت پر کرب و اندوہ کی حالت میں نماز جنازہ ادا کی اور پھر دوسرے شہداء پر نماز پڑھی اس طرح کہ ہر نماز میں حمزہ بھی شریک کئے جاتے اور پھر دو دو کر کے تمام شہداء اپنے خون آلودہ کپڑوں میں دفن کر دیئے گئے۔ حضرت حمزہؓ کے ساتھ ان کے ہمشیرزادہ عبداللہ ابن جحش کو دفن کیا گیا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ انہیں تنہا دفن کیا گیا۔ شہدائے اُحد کے کچھ لاشے مدینہ کے قبرستان جنۃ البقیع میں بھی دفن ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے منع کرنے سے پیشتر ان کے ورثا اٹھا لائے تھے اور یہاں پر سپرد خاک کر دیا تھا۔

آنحضرتؐ ۲۲ شوال روز شنبہ مدینہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے۔ جب انصار کے محلہ کی طرف سے گزرے تو خواتین کے رونے اور نوحہ و ماتم کی آوازیں سنیں تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انصار کی عورتیں اُحد میں شہید ہونے والے عزیزوں پر گریہ و بکا کر رہی ہیں۔ یہ سن کر پیغمبرؐ اکرم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: لکن حمزۃ لابواکی لہ" مگر حمزہؓ پر رونے والیاں نہیں ہیں" انصار نے سنا تو اپنی مستورات سے کہا کہ وہ حمزہؓ کے پرسہ کے لئے جائیں اور ان پر نوحہ و ماتم کریں۔ چنانچہ خواتین انصار جناب فاطمہؑ کے ہاں جمع ہوئیں اور اپنے عزیزوں کی طرح حضرت حمزہؓ پر گریہ و بکا کیا۔ آنحضرتؐ مسجد میں تشریف فرما تھے ان کے رونے کی آوازوں کو سن کر اور ان کے جذبۂ ہمدردی و غمگساری سے متاثر ہو کر ان کے حق میں دعائے خیر کی۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

فھن الی الیوم ان مات المیت

انصار کی عورتوں میں آج تک یہ دستور چلا آ رہا ہے

من الانصار بدأ النساء ببكين على حمزة ثم بكين على ميتهن۔ (طبقات ج ۲۔ ص۱۲)

کہ جب ان کے ہاں کوئی میت ہو جاتی ہے تو پہلے حضرت حمزہؓ پر گریہ و بکا کرتی ہیں اور پھر اپنے مرنے والے روتی ہیں۔"

یہ واقعہ ان لوگوں کے لئے آئینہ بصیرت ہونا چاہیئے جنہوں نے عمل پیغمبرؐ کے برخلاف یہ نظریہ قائم کر لیا ہے کہ ؎

روئیں وہ جو قائل ہیں مماتِ شہدا کے ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

غزوۂ احد سے واپسی پر لشکرِ کفار کے دو آدمی گرفتار کئے گئے جو اپنے کیفرِ کردار کو پہنچائے گئے۔ ان میں سے ایک ابوعزہ جمحی تھا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ اس نے اپنے زورِ بیان سے اہلِ تہامہ و بنی کنانہ کو متاثر کرکے قریش کے جھنڈے کے نیچے جمع کیا تھا۔ یہ بدر کے اسیروں میں شامل تھا اور پیغمبرؐ نے اس کی ناداری و عیالداری پر ترس کھاتے ہوئے اسے بلا معاوضہ رہا کر دیا تھا اور اس سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریگا۔ اب اس نے پھر پیغمبرِ اکرمؐ کی خوشامد درآمد کی مگر آپ نے فرمایا:۔

لا یلسع المومن من جحر مرتین۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص۱۱۴)

مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈسا نہیں جاتا۔"

آخر غدر و عہد شکنی کی پاداش میں قتل کر دیا گیا اور دوسرا معاویہ ابن مغیرہ تھا جس نے حضرت حمزہؓ کو مثلہ کرنے میں حصہ لیا تھا۔ اس نے خاتمۂ جنگ پر رات تو مدینہ کے اطراف میں گزاری اور صبح کے وقت چھپتا چھپاتا اپنے عزیز حضرت عثمان کے مکان پر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں کہا کہ میں نے ان سے ایک اونٹ خرید کیا تھا اس کی قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔ لہذا وہ جہاں بھی ہوں انہیں ڈھونڈ کر لایا جائے چنانچہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر لایا گیا۔ حضرت عثمان نے دشمنِ خدا و رسولؐ کو دروازے پر دیکھا تو بہت گھبرائے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ کہا کہ آپ میرے عزیز اور قریبی رشتہ دار ہیں مجھے اپنے ہاں پناہ دیجئے۔ حضرت عثمان اسے گھر کے اندر لے گئے اور مکان کے ایک تاریک گوشہ میں چھپا دیا اور خود گھر سے نکل کر پیغمبرؐ کے پاس چلے آئے اور انہیں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ معاویہ مدینہ کے اندر موجود ہے اور آج صبح بھی یہیں تھا۔ اسے ڈھونڈو اور تلاش کرو۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ عثمان کے علاوہ اور کہاں ہوگا۔ چنانچہ کچھ لوگ حضرت عثمان کو پیغمبرؐ کے پاس چھوڑ کر ان کے گھر پر آئے اور معاویہ کو دریافت کیا۔ ان کے گھر والوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا اس گوشہ کی طرف اشارہ کر دیا جہاں وہ چھپا بیٹھا تھا۔ ان لوگوں نے آگے بڑھ کر پکڑ لیا اور پیغمبرؐ کی خدمت میں لائے۔ حضرت عثمان نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو چکا ہے تو رسولِ خدا سے کہا کہ یا رسولؐ اللہ میں صبح صبح

اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے معاویہ کے لئے امان کی درخواست کردں۔ آپ اس کی جان بخشی فرمائیں اور اسے چھوڑ دیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت عثمان کے کہنے سننے سے اُسے تین دن کی مہلت دی کہ وُہ اس عرصہ میں حدودِ مدینہ سے باہر نکل جائے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت عثمان نے اس کے لئے سواری اور زادِ راہ کا بندوبست کر دیا تاکہ جہاں جانا چاہتا ہے بآسانی چلا جائے۔ لیکن تین دن گزرنے کے بعد بھی حدودِ مدینہ میں رہا۔ چوتھے دن آنحضرتؐ نے فرمایا کہ معاویہ ابھی تک مدینہ کے گرد منڈلا رہا ہے اس کا تعاقب کرکے اسے گرفتار کرو اور قتل کر دو۔ یہ سنتے ہی زید ابن حارثہ اور عمار یاسر اٹھ کھڑے ہوئے اور حمار کے قریب اسے جا لیا۔ عمار یاسر نے اس پر تیر مارا اور زید نے تلوار سے حملہ کرکے اسے کیفرِ کردار تک پہنچایا اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت علی نے اسے قتل کیا چنانچہ بلاذری نے لکھا ہے:۔

ان الذی قتل معاویة ابن المغیرة علی علیه السلام۔	علی علیہ السلام نے معاویہ ابن مغیرہ کو قتل کیا۔"

(انساب الاشراف ج ۱، ص ۳۳۵)

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ سے نکل چکا تھا مگر راستہ بھول کر دوبارہ مدینہ میں آگیا۔ اور اس خیال سے کہ حضرت عثمان پھر سفارش کرکے چھڑا لیں گے انہی کے ہاں آچھپا۔ مگر مسلمانوں نے حضرت عثمان کی سفارش سے پہلے ہی اسے گرفتار کرکے قتل کر دیا۔ روایت کا یہ حصہ کہ وہ راستہ بھٹک کر دوبارہ مدینہ پہنچ گیا، کچھ بعید معلوم ہوتا ہے۔ آخر مدینہ کے گرد کون سا صحرائے تیہ تھا کہ جس میں بھٹکتا رہا یا کون سی بھول بھلیاں تھیں جو اسے ہر پھر کر وہیں لے آئیں جہاں سے چلا تھا۔ اس کا مقصد تو مدینہ اور اطرافِ مدینہ ہی میں رہنا تھا تاکہ مسلمانوں کے جنگی انتظامات اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور قریش کے لئے اطلاعات فراہم کرے۔

غزوۂ بنی نضیر

ماہِ صفر ۴ھ میں قبیلۂ بنی عامر کا ایک سردار ابو برار نجد سے مدینہ میں آیا۔ پیغمبرِ اکرمؐ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ مجھے اسلام کے قبول کرنے میں کوئی باک نہیں ہے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ مسلمانوں کی ایک جماعت میرے ہمراہ نجد روانہ کریں جو وہاں کے باشندوں کو دعوتِ اسلام دے۔ فرمایا کہ اہلِ نجد سے اندیشہ ہے کہ وہ میرے آدمیوں کو گزند پہنچائیں گے کہا کہ وہ میری پناہ میں ہوں گے اور میں

ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔ آنحضرتؐ نے ستر صحابیوں کو جو عابد و پرہیزگار اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھے ایک مکتوب دے کر نجد روانہ کیا۔ انہوں نے سرزمین نجد میں پہنچ کر بئر معونہ میں منزل کی اور حرام ابن ملحان کو آنحضرتؐ کا مکتوب اقدس دے کر ابو براء کے بھتیجے عامر ابن طفیل کے پاس بھیجا۔ اس دشمن خدا نے خط کا پڑھنا تو در کنار اس کے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ حرام ابن ملحان نے یہ صورت عناد دیکھی تو کہا کہ مجھے امان دی جائے تاکہ میں کچھ کہہ سکوں۔ ابھی وہ کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ عامر ابن طفیل کا اشارہ پا کر ایک شخص نے ان کی پشت پر نیزہ مارا جو سینہ کو چیر کر نکل گیا۔ آپ زمین پر گرے اور روح ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔

اس قتل ناروا کے بعد عامر نے اپنے قبیلہ والوں کو بئر معونہ میں مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی مگر انہوں نے ابو براء کے عہد و پیمان کی بناء پر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے دو چار دوسرے قبیلوں کی مدد سے مسلمانوں کے گرد گھیرا ڈالا اور دو آدمیوں کے علاوہ سب کو قتل کر دیا۔ ان دو میں سے ایک کعب ابن زید تھے جنہیں مقتول سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور دوسرے عمرو ابن امیہ تھے جنہیں اسیر کر لیا گیا اور بعد میں عامر ابن طفیل نے اپنی ماں کی ایک نذر کے سلسلہ میں انہیں آزاد کر دیا۔ عمرو ابن امیہ مدینہ واپس آتے ہوئے قرقرۃ الکدر میں پہنچے تو بنی عامر کے دو آدمیوں کو دیکھ کر ان کی تاک میں لگ گئے اور جب وہ ایک درخت کے سایہ میں سو گئے تو اپنے ساتھیوں کے قصاص میں انہیں قتل کر دیا اور مدینہ چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان دونوں کو رسول اللہ تحریراً امان دے چکے تھے۔ آنحضرتؐ اس واقعہ پر مطلع ہوئے تو فرمایا کہ جو کچھ ہوا ہے غلطی کی بناء پر ہوا ہے۔ ہمیں ان دونوں کا خونبہا دینا چاہیئے۔

پیغمبرؐ اسلام قبائل یہود بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنی نضیر سے باہمی تعاون و سازگاری کا معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ آپ نے چاہا کہ ان دونوں مقتولوں کے خونبہا کے سلسلہ میں بنی نضیر سے کچھ رقم بطور قرض یا بطور امانت لیں۔ چنانچہ زرِ دیت کی بابت انہیں پیغام بھجوایا۔ انہوں نے کہلوا بھیجا کہ آپ ہمارے مہمان ہوں اور جیسا فرمائیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔ پیغمبرؐ چند صحابہ کے ہمراہ بنی نضیر کی آبادی میں جو مدینہ سے متصل تھی تشریف لے گئے اور ان کی گڑھی کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ بنی نضیر پہلے ہی سے بدنیت تھے انہوں نے ایک شخص عمرو ابن حجاش کو کہا کہ وہ اس دیوار پر چڑھ جس کے نیچے آنحضرتؐ تشریف فرما ہیں ایک بڑا سا پتھر اوپر گرا دے تاکہ پیغمبرؐ کا کام تمام ہو جائے۔ الہام غیبی نے پیغمبرؐ کو آگاہ کیا اور آپ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ واپس آ گئے اور محمد ابن مسلمہ کے ذریعہ انہیں پیغام بھیجا کہ تم نے غداری و بدعہدی کی ہے اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میرے قتل کا اقدام کیا ہے لہٰذا دس دن کے اندر اندر اپنا تمام جمع جتھا سمیٹ کر یہاں سے نکل جاؤ اور کسی دوسری جگہ پر سکونت اختیار کرو۔ بنی نضیر

نے پیغمبرؐ کا یہ تہدیدی حکم سنا تو وہ خائف و مرعوب ہو کر فوراً مدینہ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے مگر عبداللہ ابن ابی نے جو ان کا معاہد و حلیف تھا انہیں کہلا بھیجا کہ تم اپنے گھروں میں دلجمعی سے بیٹھے رہو اور کسی دوسری جگہ جانے کا ارادہ ترک کر دو۔ میں دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا اور اس موقع پر بنی قریظہ بنی غطفان اور اُن کے حلیف قبائل بھی تمہارے ساتھ تعاون کریں گے اور تمہیں بے گھر اور بے در نہ ہونے دیں گے۔ بنی نضیر نے اپنی پشت پر معاون و مددگار دیکھے تو جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور آنحضرتؐ کو کہلوا بھیجا کہ ہم اپنے گھروں کو خالی نہیں کریں گے اور نہ یہاں سے کہیں اور جائیں گے۔ آپ سے جو بن پڑتا ہے کیجئے۔ یہ ایک طرح سے دعوت جنگ و قتال تھی جس پر خاموش نہ رہا جا سکتا تھا۔ آنحضرتؐ نے ایک مختصر سا لشکر ترتیب دیا اور ان کے قلعوں کی طرف حرکت کی۔ طبری نے لکھا ہے کہ :-

کانت رایتہ یومئذ مع علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔

اس دن علم پیغمبرؐ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں میں تھا۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۲۶)

بنی نضیر نے جب سپاہ اسلام کو آتے دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمانوں نے قلعہ کے گرد محاصرہ ڈال دیا۔ بنی نضیر نے اپنے گرد گھیرا دیکھا تو قلعہ کے اندر سے تیر اور پتھر برسانے شروع کئے مگر محاصرہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک رات چند یہودی قلعہ سے باہر نکلے تاکہ مسلمانوں پر تیر باراں کر کے انہیں محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیں۔ ان میں سے ایک شخص نے پیغمبرؐ کا خیمہ تاک کر تیر چلایا۔ آنحضرتؐ نے کھلی جگہ کی بجائے ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ ادھر پیغمبرؐ نے جگہ تبدیل کی اُدھر حضرت علیؑ چپکے سے اس تیر انداز کا پتہ لگانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ صحابہ نے حضرتؑ کو نہ دیکھا تو پیغمبرؐ سے پوچھا کہ علیؑ کہاں ہیں؟ فرمایا کسی کام سے گئے ہوں گے ابھی آتے ہوں گے۔ اتنے میں علیؑ ایک یہودی کا سر لئے ہوئے آئے اور پیغمبرؐ کے قدموں میں ڈال کر کہا کہ یہ ہے وہ بدبخت جس نے آپ کے خیمہ پر تیر چلایا تھا۔ یہ یہودیوں کا مشہور تیر انداز غلول ہے۔ اور ابھی اس کے نو ساتھی قلعہ کے باہر گھوم پھر رہے ہیں۔ اگر چند آدمی میرے ساتھ چلیں تو انہیں بھی پکڑ کر لایا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ابودجانہ، سہل ابن حنیف اور دو چار آدمی آپ کے ساتھ کر دیئے۔ آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اُن یہودیوں کو قلعہ بند ہونے سے پہلے گھیرے میں لے لیا اور وہیں پر سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بنی نضیر نے جب یہ دیکھا کہ اُن کے چند آدمی مارے گئے ہیں اور نہ بنی غطفان و بنی قریظہ مدد کو آئے ہیں اور نہ عبداللہ ابن ابی کے دو ہزار آدمیوں کا کچھ پتہ ہے تو انہوں نے شکست و ہزیمت کا اعتراف

کرتے ہوئے آنحضرتؐ کو پیغام بھجوایا کہ اگر آپ ہماری جان بخشی کر دیں تو ہم اس سرزمین کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں اسلحۂ جنگ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہتھیاروں کے علاوہ جو چیزیں وہ لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ چنانچہ یہود نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو مسمار کیا، مکانوں کے دروازے کھڑکیاں اور جو کچھ وہ لاد سکتے تھے چھ سو اونٹوں پر لادا اور گاتے دف بجاتے ہوئے چل دیے۔ ان میں سے کچھ لوگ شام کے علاقہ کی طرف چلے گئے۔ اور ایک گروہ جس میں سلام ابن ابی الحقیق، کنانہ ابن ربیع اور حیی ابن اخطب بھی شامل تھے، مدینہ سے جانب غرب خیبر میں آکر آباد ہو گئے۔

بنی نضیر کی زمینیں اور باغات مالِ فے ہونے کی بنا پر پیغمبرؐ کی ملکیت قرار پائے۔ چنانچہ حضرت عمر کہتے ہیں :۔

کانت اموال بنی النضیر مما	بنی نضیر کے اموال جو اللہ نے اپنے رسول کو دلوائے
افاء اللہ علی رسولہ ولم یوجف	وہ رسول اللہؐ کی ملکیت خاصہ تھے اس لئے کہ
المسلمون علیہ بخیل ولا رکاب	انہیں حاصل کرنے میں مسلمانوں نے نہ گھوڑے
فکانت لہ خالصۃ (فتوح البلدان[۲۶])	دوڑائے اور نہ اونٹ"

یہ واقعہ ربیع الاول ۴ھ میں غزوۂ احد کے چھ ماہ بعد ہوا"

غزوۂ احزاب

بنی نضیر مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آبسے مگر ان کی شرپسند طبیعتوں نے انہیں نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ جلاوطنی کا بدلہ لینے کے لئے ہمہ وقت بے چین رہتے اور غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتے۔ خود تو ان میں اتنا دم خم نہ تھا کہ اہل اسلام کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے اور ان سے نمٹنے میں کامیاب ہو جاتے انہوں نے اپنی عسکری قوت کو بڑھانے کے لئے ہاتھ پیر مارے اور یہ طے کیا کہ قریش کو اپنے ساتھ ملا کر اور مختلف قبائل سے فوجی امداد لے کر مدینہ پر چڑھائی کی جائے اور مسلمانوں کو اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ آئندہ سر نہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ ان میں کے بیس آدمی جن میں حیی ابن اخطب، کنانہ ابن ربیع، سلام ابن مشکم اور سلام ابن ابی الحقیق بھی شامل تھے اور بنی وائل کے چند سردار مکہ آئے اور ابوسفیان اور دوسرے سردارانِ قریش سے جنگ کے سلسلہ میں بات چیت کی۔ قریش اسلام دشمنی میں یہود سے کم نہ تھے۔ دونوں نے اپنے سینے دیوار

کعبہ سے مس کر کے اور قسمیں کھا کر باہم عہد و پیمان کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں گے جب تک ان کا استیصال نہیں ہو جاتا۔ جب قریش سے قول و قرار ہو چکا تو یہود نے بنی غطفان کا رخ کیا اور انہیں بھی طمع و لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح بنی کنانہ اور دوسرے قبائل سے ساز باز کر کے چار ہزار کی جمعیت فراہم کر لی اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے نکل کھڑے ہوئے راستے میں بنی سلیم، بنی اسد، بنی فزارہ، بنی مرہ اور بنی اشجع کے لشکر آ آ کر ملتے رہے اور بڑھتے بڑھتے ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان کے پاس سواری و بار برداری کے لئے تین سو گھوڑے اور چار ہزار اونٹ تھے اور اسلحۂ جنگ اور سامانِ رسد بھی فراوانی سے تھا۔

ان اسلام دشمنوں نے اگرچہ اپنی جنگی تیاریوں کو پوشیدہ رکھ کر بے خبری میں حملہ کرنا چاہا تھا۔ مگر بنی خزاعہ کے چند سواروں کے ذریعہ پیغمبر اکرم کو ان کی پیش قدمی کی اطلاع ہو گئی۔ آپ نے دشمن کی کثرت و قوت کو دیکھتے ہوئے صحابہ کو جمع کیا اور دفاع کے طریق کار کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ سلمان فارسیؓ نے کہا کہ اہلِ عجم کا دستور ہے کہ جدھر سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے ادھر سے خندق کھود لیتے ہیں۔ ہمیں بھی اسی طریق کار پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ خندق ہمارے لئے دفاعی قلعہ کا کام دے گی۔ اور دشمن اسے بآسانی عبور کر کے یکبارگی حملہ آور نہ ہو سکے گا۔ اس تجویز پر عام طور پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور آنحضرتؐ نے بھی اسے پسند فرماتے ہوئے اس پر عملدرآمد کا حکم دے دیا۔ مدینہ تین اطراف سے مکانوں کی دیواروں پہاڑیوں اور نخلستان کی وجہ سے محفوظ تھا۔ البتہ شرقی جانب سے کوئی روک نہ تھی اور ادھر ہی سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ تھا۔ آنحضرتؐ نے عورتوں اور بچوں کو مدینہ کی مختلف گڑھیوں میں ٹھہرا دیا اور خود تین ہزار صحابہ کے ساتھ کوہِ سلع کے دامن میں قیام فرما ہوئے۔ اور مدینہ کے اسی رخ پر خطوط کھینچ کر خندق کے حدود قائم کئے اور تقسیم کار کے اصول پر مہاجرین و انصار کے دس دس آدمیوں پر چالیس چالیس ہاتھ زمین تقسیم کر دی۔ صحابہ نے کمریں کس لیں اور پھاوڑے اور کدال لے کر پوری سرگرمی سے زمین کی کھدائی شروع کر دی۔ آنحضرتؐ نے خود بھی بنفسِ نفیس اس میں حصہ لیا اور شام و روم اور فارس و یمن پر اسلامی پرچم لہرانے کی پیشین گوئی فرمائی۔

عرب خندق اور اس کی تعمیر و ساخت سے ناواقف تھے۔ سب سے پہلے فریدون کے پوتے منوچہر نے جنگی تدابیر کے سلسلہ میں خندق ایجاد کی تھی اور عرب میں اس کی داغ بیل سلمان فارسی کے مشورہ کے بعد پڑی اس لئے وہی اس کے ناظر و نگران قرار دیئے گئے۔ آپ کا کام صرف دیکھ بھال ہی نہ تھا بلکہ اس مستعدی سے زمین کھودتے تھے کہ تنہا ان کا کام دس آدمیوں کے کام کے برابر ہوتا تھا۔ اسی مہارت اور کام کی تیز رفتاری

کو دیکھ کر مہاجرین و انصار نے انہیں اپنے گروہ میں شامل کرنا چاہا۔ چنانچہ مہاجرین نے کہا کہ سلمان منا۔ "سلمان ہم میں سے ہیں" اور انصار نے کہا کہ سلمان منا "سلمان ہم میں سے ہیں" پیغمبر اکرمؐ نے سنا تو فرمایا۔

سلمان منا سلمان منا اهل البیت۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۱۲۲) — "سلمان ہمارے ہیں سلمان ہمارے اہل بیت میں شامل ہیں"

بہر حال مسلمانوں نے جو گنتی میں تین ہزار تھے رات دن ایک کر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانچ گز چوڑی پانچ گز گہری اور تین ساڑھے تین میل لمبی خندق کھود کر تیار کر لی۔ آنحضرتؐ نے خندق کے اندرونی کنارے پر آٹھ حفاظتی چوکیاں قائم کیں اور ہر چوکی پر ایک انصاری اور ایک مہاجر کی زیر نگرانی چند افراد متعین کر دیئے تاکہ دشمن اگر خندق عبور کرنے کی کوشش کرے تو اس پر سنگباری کر کے اسے آگے بڑھنے سے روک دیں۔ جب یہود و مشرکین نواح مدینہ میں پہنچے تو خندق کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر بہت سٹپٹائے اور کہنے لگے:۔

واللہ ان هذه لمکیدة ما کانت العرب تکیدها۔ (سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۵) — "خدا کی قسم یہ ایسی چال ہے جو اب تک عرب نے نہ چلی تھی"

یہود و قریش اپنی فوجی برتری اور ہتھیاروں کی فراوانی کی بناء پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ مدینہ پہنچتے ہی مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر تلوار کی باڑ پر رکھ لیں گے۔ مگر اس نئی جنگی تدبیر نے ان کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے، سوچے سمجھے منصوبے خاک میں ملا دیئے اور ان کی کثرت و قوت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کمی وضعف حالی کا بڑی حد تک تدارک کر دیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ میں جن قبائل سے معاہدہ کیا تھا ان میں یہود کا ایک قبیلہ بنی قریظہ بھی تھا۔ اور وہ معاہدہ کی رو سے پابند تھے کہ دشمن کے خلاف مسلمانوں سے تعاون کریں۔ ابوسفیان کو یہ فکر ہوئی کہ اگر بنی قریظہ معاہدہ کی بناء پر مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے تو ان کی قوت و طاقت بڑھ جائے گی لہٰذا انہیں کسی نہ کسی طرح معاہدہ شکنی پر اکسانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے بنی نضیر کے ایک سردار حیی ابن اخطب کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں مسلمانوں کے تعاون سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ حیی بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کی گڑھی پر آیا جو مدینہ کی مشرقی سمت واقع تھی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ کعب نے پوچھا کہ کون ہے کہا میں حیی ابن اخطب ہوں۔ کعب سمجھ گیا کہ وہ اس طرح چوری چھپے کس مقصد سے آیا ہے اس نے دروازہ کھولنے اور بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ حیی نے کہا کہ تم دروازہ کھولو میں تمہیں یہ خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ قریش اور تمام قبائل عرب مسلمانوں سے لڑنے کے لئے متحد ہو چکے ہیں۔ اگر تم سرخروئی اور عرب میں

نیکنامی چاہتے ہو تو مسلمانوں کے خلاف ہمارا ساتھ دو۔ کعب نے کہا کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے خیر و نیکی اور وفائے عہد کے علاوہ کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ہم بلا وجہ عہد شکنی نہیں کریں گے اور تو ہمارے لئے ننگ نامی کا پیغام لے کر نہیں آیا بلکہ ہمیں رسوا و ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ اور قبائل عرب کے جس متحدہ محاذ پر تو اترا رہا ہے وہ اس ابر تیز رو کے مانند ہے جو گرجتا ہے اور بن برسے چھٹ جاتا ہے۔ حیی نے کہا کہ مہمان کے لئے دروازہ بند رکھنا عرب کی خصلت نہیں ہے۔ تم دروازہ کھولو اور مجھ سے رُو در رُو بات کرو۔ حیی کے اصرار پر کعب نے دروازہ کھول دیا اور دونوں میں پھر بحث چھڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حیی نے اپنی چرب زبانی سے اُسے بہلا پھسلا کر اپنا ہم خیال بنا لیا اور بنی قریظہ سے وعدہ کیا کہ یہود و قریش کے پسپا ہونے کی صورت میں اگر ان پر کوئی افتاد پڑی تو وہ انہیں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ بلکہ انہی کے ہاں فروکش رہے گا اور جو حشر ان کا ہوگا وہی اس کا ہوگا۔ چنانچہ پیغمبرؐ سے کیا ہوا تحریری معاہدہ چاک کر دیا گیا اور بنی قریظہ علانیہ قریش کے معاون و مددگار بن گئے۔

جب پیغمبرؐ اکرم کو بنی قریظہ کی بدعہدی و عہد شکنی کا علم ہُوا تو آپ نے سعد بن معاذ کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لائیں اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے روکیں۔ مگر سعد کے سمجھانے بجھانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہُوا اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی کو جانتے پہچانتے نہیں ہیں اور نہ ہمارا کسی سے کوئی معاہدہ ہے یہ لوگ چونکہ مدینہ کے اندر ہی آباد تھے اس لئے شہر میں رہ جانے والے بچوں اور عورتوں کے لئے مستقل خطرہ بن گئے۔ مسلمان سخت ہراساں اور پریشانی و کشمکش کے عالم میں تھے۔ ایک طرف دشمن کا محاصرہ شدت اختیار کئے ہوئے تھا اور دوسری طرف بنی قریظہ کے نقض عہد سے کفار کا دباؤ بڑھ گیا تھا اس دوطرفہ یلغار کے نتیجہ میں مسلمانوں کے خوف و اضطراب کا نقشہ قدرت نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

اذ جاءوکم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالا شدیدا۔

"جس وقت وہ لوگ تم پر تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے آپڑے اور جس وقت تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور دل پہنچ کر گلوں میں آگئے اور تم خدا کے متعلق مختلف گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی آزمائش کا وقت آگیا اور انہیں بڑی سختی سے جھنجھوڑ دیا گیا۔"

اس موقع پر مسلمانوں کو گھبراہٹ ہونا ہی چاہئے تھی جب کہ دشمن کی دل بادل فوجیں گھیرا ڈالے پڑی۔

تھیں اور شہر کے اندر بنی قریظہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ پھر مسلمانوں میں ایک اچھی خاصی تعداد منافقوں اور تھڑدلے مسلمانوں کی بھی تھی جو خود بھی ڈرے سہمے جا رہے تھے اور دوسروں میں بھی بددلی و بے حوصلگی پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حیلے بہانے کر کے میدان سے کھسکنا شروع کر دیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں چوری چکاری کا اندیشہ ہے ہمیں اپنے گھروں میں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

واذا قالت طائفة منهم يا اهل يثرب لا مقام لكم فارجعوا ويستأذن فريق منهم النبيّ يقولون ان بيوتنا عورة وما هي بعورة ان يريدون الا فرارا۔	اور جب ان میں کا ایک گروہ کہنے لگا کہ اے اہل مدینہ تمہارا یہاں کوئی ٹھکانا نہیں لہذا پلٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ پیغمبرؐ سے اجازت طلب کرتے ہوئے کہتا تھا کہ ہمارے گھر خالی پڑے ہیں حالانکہ وہ خالی اور غیر محفوظ نہ تھے وہ تو اس بہانے سے بھاگنا چاہتے تھے۔"

یہاں تک کہ معتب ابن قشیر جو بدری ہونے کا امتیاز رکھتا تھا یہ کہہ دیا کہ:۔

كان محمدٌ يعدنا ان ناكل كنوز كسرىٰ وقيصر واحدنا اليوم لا يأمن على نفسه ان يذهب الى الغائط۔ (سیرت ابن ہشام۔ ج ۳۔ صـ۲۳۳)	محمدؐ ہم سے یہ وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ و قیصر کے خزانوں پر ہاتھ صاف کریں گے اور آج یہ حالت ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی رفع حاجت کے لئے جانا چاہے تو وہ اپنی جان کو محفوظ نہیں سمجھتا۔"

البتہ کچھ مخلص ارباب ایمان ایسے بھی تھے جو نہ دشمن کی کثرت کو خاطر میں لاتے تھے اور نہ سختیوں سے دوچار ہونے سے گھبراتے تھے بلکہ شدائد و آلام میں گھر کر ان کا یقین و ایمان بڑھتا اور خود اعتمادی کا جوہر نکھرتا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

ولما را المومنون الاحزاب قالوا ما وعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله وما زادهم الا ايمانا وتسليما۔	جب سچے ایمانداروں نے کفار کے جتھوں کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا تھا اور اس سے ان کا ایمان اور جذبۂ اطاعت اور زیادہ ہو گیا۔"

مسلمانوں کے لئے یہ کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ سردی کی شدت اور فاقوں کی سختی سے خستہ و بے حال ہو چکے تھے اور کفار بھی پڑے پڑے اکتا گئے تھے انہیں محاصرہ کئے ستائیس دن ہو چکے تھے اور خندق کے حائل ہونے کی وجہ سے دست بدست جنگ کی نوبت نہ آئی تھی صرف پتھروں اور تیروں کا تبادلہ ہو تا رہا تھا جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی طرح پہرہ داروں کی نظروں سے بچ کر خندق پار کریں اور مسلمانوں کو تلواروں کی زد پر رکھ لیں۔ چنانچہ ان کے چند سردار دیکھتے بھالتے ہوئے خندق کے ایک ایسے حصہ پر پہنچے جو کم چوڑا تھا اور اس کی حفاظت کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ انہوں نے اندازہ کر لیا، کہ یہاں سے گھوڑوں کو مہمیز کر کے خندق کو عبور کیا جا سکتا ہے اس کام کے لئے قریش کے نامور شہسوار عمرو ابن عبدود عامری، عکرمہ ابن ابی جہل، حسل ابن عمرو، منبہ ابن عثمان، ضرار ابن خطاب فہری، نوفل ابن عبداللہ اور ہبیرہ ابن ابی وہب منتخب کئے گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور خندق کو پھلانگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس منزل کے سر ہونے سے کفار کے پژمردہ دلوں میں کچھ توانائی آئی اور ابوسفیان اور خالد بن ولید نے فوراً لشکر کی صف بندی کی تاکہ ان شہسواروں کے جوہر شجاعت دکھانے کے بعد فوجوں کو خندق کے اس پار اتاریں اور جنگ مغلوبہ شروع کر دیں۔ ان پھلانگنے والوں میں یوں تو سب ہی آزمودہ کار اور جنگ آزما تھے مگر ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر اور نامور شمشیر زن عمرو ابن عبدود تھا جو عماد عرب اور فارس یلیل کے نام سے پکارا جاتا تھا میدان کارزار میں ایک مخصوص علامت سے پہچانا جاتا تھا اسے فارس یلیل اس لئے کہا جاتا تاکہ اس نے اس مقام پر ایک ہزار قزاقوں کو پسپا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت عمر نے پیغمبرؐ اکرم سے بیان کیا تھا یا رسول اللہ میں ایک کاروان تجارت میں شریک ہو کر شام جا رہا تھا اور یہ بھی ہمارا ہمسفر تھا۔ جب ہمارا قافلہ مقام یلیل پر پہنچا تو ایک ہزار رہزنوں نے قافلہ پر حملہ کر دیا۔ تمام اہل قافلہ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا اور اس طرح جی توڑ کر لڑا کہ رہزنوں کو بھاگتے ہی بن پڑی اور ہمارا قافلہ صحیح و سالم منزل پر پہنچ گیا۔ اس واقعہ کے بعد عرب کے دلوں پر اس کی شجاعت اور شمشیر زنی کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ اکیلا ہزار کے برابر سمجھا جانے لگا۔ ہزار آدمیوں کے برابر سمجھے جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شرکت سے فوج کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا تھا جیسے ایک ہزار کا اس میں اضافہ ہو گیا ہو۔ جب اس نے آگے بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلہ میں کون آتا ہے تو کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور نہ کسی کو اس کے مقابلہ میں آنے کی جرأت ہوئی۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ من لهذا الكلب "کون ہے جو اس کتے کو جواب دے" حضرت علی خندق کا کنارا چھوڑ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا انا له يا نبي الله " یا رسولؐ اللہ میں اس کا مقابلہ کروں گا" فرمایا بیٹھو شاید کوئی اور اس کے مقابلہ

کی ہمت کرے۔ مگر جب کوئی صدا بلند نہ ہوئی تو آنحضرتؐ نے دوبارہ فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس کا مقابل ہو اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بچائے۔ حضرت علی نے پھر اجازت مانگی۔ فرمایا ابھی ٹھہرو۔ عمرو پھر للکارا اور کہا کون ہے جو میرے مقابلہ کو آتا ہے مگر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ جب عمرو تیسری مرتبہ للکارا اور کوئی بڑھ کر اس کے سامنے نہ آیا تو اس نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانو! تمہاری وہ جنت کیا ہوئی جس میں تمہیں مر کر جانا ہے اور وہ دوزخ کیا ہوا جو مرنے کے بعد ہمارا ٹھکانا ہے۔ آؤ یا تم جنت میں جاؤ یا مجھے دوزخ میں بھیجو۔ پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سپاہِ اسلام کے قریب آ کر رجز پڑھنے لگا:۔

ولقد بححت من النداء بجمعکم ھل من مبارز ۔۔۔ ووقفت اذ جبن المشجع موقف البطل المناجز

"چیختے چیختے میری آواز بیٹھ گئی ہے میں ان مقامات پر بھی ایک بہادر جنگجو کی طرح جم کر لڑتا ہوں جہاں اچھے اچھے شجاع کمزوری دکھا جاتے ہیں۔"

وکذالك انی لم ازل متسرعا نحو الھزاھز ۔۔۔ ان الشجاعة فی الفتیٰ والجود من خیر الغرائز

"جنگ کی طرف میرے قدم تیزی سے بڑھتے ہیں اور ایک جوانمرد کی سب سے بڑی خوبی سخاوت اور شجاعت ہی تو ہے۔"

عمرو کے بار بار للکارنے پر ایک سناٹا تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور چپ سادھ لیتے۔ اور کسی کو ہمت و جرأت نہ ہوتی تھی کہ آگے بڑھ کر للکارتا اور اس کا غرور توڑتا۔ تاریخ نگاروں نے اس وقت کی خاموشی و بے حسی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔ کان علیٰ رؤوسھم الطیر۔ گویا[1] اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علی نے جب کفر کی مبارز طلبی اور مسلمانوں کی خاموشی دیکھی تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھے اور پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ اب مجھے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت دیجیے۔

---

[1] یہ ایک مثل ہے جو اس موقع پر بولی جاتی ہے جب کوئی شخص دشمن کی للکارنے یا جواب طلب کرنے پر سر نہوڑائے خاموش رہے چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے:۔ اذ حلت بنو لیث عکاظا ٭ رأیت علیٰ رؤوسھم الغرابا

(ترجمہ شعر) "جب بنو لیث بازار عکاظ میں اترتے ہیں تو تم ... ان کے سروں پر کوے بیٹھے ہوئے دیکھو گے۔"

اس کی اصل یہ ہے کہ جب اونٹ کے سر یا کسی حصۂ جسم پر کوئی زخم آتا ہے اور کھجلی کی وجہ سے اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو وہ سر نیچے ڈال کر کسی گوشہ میں الگ تھلگ بیٹھ جاتا ہے اور پرندے اس کے سر و جسم پر بیٹھ کر ان کیڑوں کو چننے لگتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اپنے سر کو جنبش نہیں دیتا اور نہ سر اوپر اٹھاتا ہے تاکہ وہ پرندے اڑ نہ جائیں۔ اس سے یہ مثل اس شخص کے لئے چل نکلی جو سر نیچے ڈالے چپ چاپ بیٹھا رہے۔

اس سے پہلے پیغمبرؐ دو مرتبہ علیؑ کو روک چکے تھے۔ یہ روکنا اس بنا پر نہ تھا کہ آپ عمرو کے مقابلہ میں انہیں کمزور و ناتواں سمجھتے تھے بلکہ آنحضرتؐ یہ چاہتے تھے کہ انہیں روک کر دوسروں کی ہمت و جوانمردی کی آزمائش کریں اور دیکھیں کہ کس کی رگ حمیت پھڑکتی اور خونِ شجاعت جوش مارتا ہے۔ اگر عمرو کی پہلی ہی للکار پر علیؑ کو اجازت دے دیتے تو دوسرے کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی مقابلہ کے لئے تیار تھے مگر علیؑ کے میدان میں اتر آنے سے ہم خاموش ہو گئے اور ہمیں زور آزمائی کا موقع نہ مل سکا۔ مگر عمرو کی پیہم للکار پر سکوت و بے حسی نے اُن کی ہمت و شجاعت کا پردہ چاک کر دیا۔ اس عمومی آزمائش کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کی جرأت و خود اعتمادی کا جوہر نمایاں کرنے کے لئے اُن سے کہا۔ هذا عمرو ابن عبدود فارس یلیل۔ "یہ شہسوار یلیل عمرو ابن عبدود ہے" آپ نے کہا اگر وہ عمرو ہے تو ہُوا کرے میں بھی تو علی ابن ابی طالب ہوں۔ آنحضرتؐ نے علی کے سر پر اپنا عمامہ "سحاب" رکھا اپنی زرہ ذات الفضول پہنائی کمر میں ذوالفقار باندھی اور بارگاہِ احدیت میں ہاتھ اٹھا کر عرض کیا:۔

اللهم انك اخذت منی عبیدة	خداوندا تو نے عبیدہ کو بدر کے دن اور حمزہ کو
یوم بدر وحمزة یوم احد	اُحد کے دن اٹھا لیا۔ اب ایک علی ہیں، تو
فاحفظ علی الیوم علیا رب لا	ان کی حفاظت فرما۔ پروردگارا مجھے اکیلا نہ چھوڑنا
تذرنی فردا وانت خیر الوارثین۔	اور تو بہترین وارث ہے۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص ۳۳۴)

ادھر حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ سے اجازت لے کر میدان کا رُخ کیا اُدھر آنحضرتؐ کی زبان سے یہ کلمات فضا میں گونجے۔ برز الایمان کله الی الشرك کله۔ "کل ایمان کل شرک کی طرف بڑھ رہا ہے۔" آپ نے آگے بڑھ کر عمرو کو للکارا اور اس کے رجز یہ اشعار کے جواب میں فرمایا:۔

لاتعجلن فقد اتاك مجیب صوتك غیر عاجز ذو نیة وبصیرة والصدق منجی کل فائز

"ٹھہرو تمہاری للکار کا جواب دینے والا آگیا ہے جو کمزور نہیں ہے وہ صاحب عزم و بصیرت ہے اور سچائی ہی ہر رستگار کے لئے وجہِ کامرانی ہے۔"

انی لارجوان اقیم علیك نائحة الجنائز من ضربة تفنی ویبقی ذکرها عند الهزاهز

"مجھے امید ہے کہ میں تمہارے لئے بین کرنے والی عورتوں کا بندوبست کروں گا ایسی ضرب سے جو اپنا کام کر کے مٹ جائے گی مگر اس کا تذکرہ ہمیشہ معرکوں میں ہوتا رہے گا۔"

اب دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو گئے۔ عمرو نے دستورِ عرب کے مطابق پوچھا کہ میرا حریف

ومد مقابل کون ہے؟ حضرت نے فرمایا میں ہوں علی ابن ابی طالب۔ عمرو نے کہا کیا لشکر اسلام میں تمہارے اعمام میں سے کوئی نہیں ہے جو مجھ سے لڑنے کے لئے آتا۔ تم ابوطالب کے بیٹے ہو اور وہ میرے دوست تھے میں نہیں چاہتا کہ اپنے دوست کے بیٹے پر ہاتھ اٹھاؤں اور اسے قتل کروں۔ لہٰذا تم واپس جاؤ اور کسی بڑے کو میرے مقابلہ کے لئے بھیجو تاکہ تمہارے بجائے وہ میرے ہاتھ سے قتل ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ لکن واللہ احب ان اقتلک "لیکن میں تو تمہارا خون بہانا پسند کرتا ہوں" اہلسنت کے مشہور عالم مصدق ابن شبیب کہتے ہیں کہ عمرو نے ابوطالب سے اپنی دوستی کا اظہار محض اپنی جان بچانے کے لئے کیا تھا کیونکہ وہ جنگ بدر میں دیکھ چکا تھا کہ جو بھی علی کے مقابلہ میں نکلا وہ اپنی جان سلامت لے کر واپس نہ آسکا۔ اس لئے اس نے چاہا، کہ علی سے لڑنے کی نوبت نہ آئے اور ان کے بجائے کسی اور سے مقابلہ ہو۔ میدان میں اترنے کے بعد جنگ سے پہلو تہی تو کر نہیں سکتا تھا اس لئے ابوطالب کی دوستی کی آڑ لی تاکہ لڑے بھی نہیں اور اس کی کمزوری پر پردہ بھی پڑا رہے۔

جب عمرو نے دیکھا کہ حیلے بہانوں سے جان چھڑانا مشکل ہے تو لڑنے پر تیار ہو گیا۔ حضرت نے دیکھا کہ وہ خود پیادہ ہیں اور عمرو سوار ہے اور پیادہ ہمیشہ سوار کی زد میں ہوتا ہے آپ نے چاہا کہ اُسے بھی گھوڑے سے نیچے اتروالیں۔ فرمایا اے عمرو میں نے سنا ہے کہ اگر حریف میدانِ جنگ میں تم سے تین باتوں کی درخواست کرتا ہے تو تم ایک ضرور مان لیتے ہو۔ کہا ہاں۔ فرمایا پھر میری پہلی خواہش یہ ہے کہ تم اسلام قبول کرو تاکہ مجھے تم سے لڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کہا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کروں۔ فرمایا کہ پھر میری دوسری خواہش یہ ہے کہ تم اپنے لشکر سے علیحدہ ہو کر واپس چلے جاؤ۔ کہا میدان سے منہ موڑنا مردوں کا کام نہیں ہوتا میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ عورتیں میرے فرار پر مجھے طعنے دیں اور میری شجاعت پر حرف رکھیں۔ فرمایا اگر تم یہ بھی نہیں مانتے تو میری آخری خواہش یہ ہے کہ تم گھوڑے سے نیچے اُتر آؤ اور مجھ سے جنگ کرو۔ یہ سن کر عمرو غصہ سے پیچ و تاب کھاتا ہوا نیچے اُترا اور اُترتے ہی گھوڑے کے پیروں پر تلوار چلائی اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ بظاہر یہ ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ میں نے گھوڑے کے پاؤں کاٹ کر اپنے لئے فرار کی راہ بند کر دی ہے۔ اب قتل کئے یا قتل ہوئے بغیر میدان سے ہٹنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور یہ غرض بھی ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنی قوت وطاقت اور تیغ زنی کا مظاہرہ کر کے حریف کو مرعوب و متاثر کرے تاکہ وہ مقابلہ سے جی چھوڑ بیٹھے، کیونکہ نفسیاتی حیثیت سے اگر حریف کو اپنی قوت و توانائی سے متاثر کر لیا جائے تو اس کی قوت و مقاومت مضمحل ہو جاتی ہے اور اس پر بآسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر علیؑ بڑے سے بڑے بہادر و شہزور کو نظر میں نہ لاتے

تھے وہ اس سے کیا مرعوب و متاثر ہوتے اور نہ ایمان کی یہ شان ہے کہ وہ کفر کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے آپ نے عمرو کے مظاہرۂ شمشیر زنی کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی اور اُسے موقع دیا کہ وہ پہلے حملہ کرے۔ چنانچہ وُہ تلوار لے کر حضرت پر حملہ آور ہُوا۔ آپ نے سپر پر اس کا وار روکا مگر عمرو بلا کا تیغ زن تھا روکتے روکتے بھی تلوار کا اچٹتا ہوا وار آپ کے سر پر لگا اور پیشانی خون سے رنگین ہو گئی۔ اب تیغ ایمان بار رگ کفر کو کاٹنے کے لئے بے نیام ہوئی اور آپ جوابی حملہ کے لئے زخمی شیر کی طرح جھپٹے اور اس کے پیروں پر اس طرح تلوار ماری کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ عمرو لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ حضرتؑ نے تکبیر کا نعرہ لگایا اور اس کے سینہ پر سوار ہو کر اس کا سر کاٹ لیا۔ صحابہ گرد و غبار کی وجہ سے کچھ دیکھ نہ سکے تھے۔ جب تکبیر کی آواز سنی تو سمجھ گئے کہ علیؑ فاتح و کامران ہوئے اور عمرو مارا گیا۔ اتنے میں گرد کا دامن پھٹا تو لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ علی مرتضیٰؑ ایک ہاتھ میں شمشیر خون آشام اور دوسرے ہاتھ میں عمرو کا لہو میں ڈوبا ہوا سر لئے اس طرح جھومتے چلے آرہے ہیں جس طرح شیر ہلکی پھوار میں بل کھاتا ہُوا چلتا ہے اور زبان پر یہ ترانہ گونج رہا ہے :-

انا علی و ابن عبد المطلب　　　الموت خیر للفتی من الهرب

" میں علی ہوں اور عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ جوانمرد کے لئے بھاگنے سے موت بہتر ہے "

علی کو اس طرح آتے دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ علیؑ تو آج بڑی رعونت سے چل رہے ہیں۔ پیغمبرؐ نے سنا تو فرمایا کہ میدانِ جنگ میں اللہ تعالیٰ کو یہی چال پسند ہے۔ غرض جب کفر و ایمان کا معرکہ سر کر کے پیغمبرؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو آنحضرتؐ نے انہیں سینہ سے لگایا اور اُن کی اس عظیم خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:-

ضربۃ علیؑ یوم الخندق افضل　　　خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت جن و انس کی

من عبادۃ الثقلین۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۲)　　　عبادت پر بھاری ہے "

حضرت عمرؓ نے جب یہ دیکھا کہ حضرت علیؑ نے عرب کی عام روش کے برخلاف نہ عمرو کی زرہ اتاری ہے اور نہ اس کی تلوار خود وغیرہ پر قبضہ کیا ہے تو ان سے کہا هلا سلبت درعه یا علی ! " اے علی آپ نے عمرو کی زرہ کیوں نہ اتار لی " فرمایا مجھے حیا آئی کہ میں اس کی لاش کو برہنہ کر کے زرہ اتاروں۔ یہ تھی حضرت علیؑ کی سیر چشمی و بلند نگاہی کہ جہاں مالِ غنیمت مجاہد کی سب سے بڑی کمزوری ہے وہاں علیؑ کی بلند کرداری و عالی ظرفی کا جوہر یوں نمایاں ہوتا ہے کہ نہ جذبۂ جہاد میں طمعِ دنیوی کی آمیزش ہونے پاتی ہے اور نہ مقتول کی بیش قیمت زرہ پر نظر پڑتی ہے۔ اس موقع کے لئے ایک عرب شاعر نے کہا ہے :-

ان الاسود اسود الغاب همتها　　　یوم الکریهة فی المسلوب لا السلب

" معرکہ کارزار میں شیرانِ بیشۂ شجاعت کی پُر عزم نگاہیں دشمن کی طرف اٹھتی ہیں نہ مالِ غنیمت

کی طرف۔"

حضرتؑ کی اس بلند نظری کا اعتراف عمرو کی بہن نے بھی کیا۔ چنانچہ جب اس نے یہ سنا کہ قاتل نے عمرو کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور اس کی زرہ تک نہیں اتاری تو کہا ماقتله الا کفو کریم۔ "اس کا قاتل کوئی شریف اور عالی ظرف انسان ہے۔" پوچھا کہ اس کا قاتل کون تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ علی ابن ابی طالب۔ یہ سن کر اس نے برجستہ یہ دو شعر پڑھے:۔

لو کان قاتل عمرو غیر قاتله　　　لکنت ابکی علیه آخر الابد!

"اگر عمرو کا قاتل علیؑ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو میں رہتی دنیا تک اس پر روتی۔"

لکن قاتله من لا یعاب به　　　من کان یدعی ابوه بیضة البلد

"مگر اس کا قاتل تو وہ ہے جس میں کوئی برائی نہیں ہے اور جس کا باپ سردار مکہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔"

عمرو کے مارے جانے سے اس کے ساتھیوں کے قدم اکھڑ گئے اور پھر کسی کو مبارز طلبی کی جرأت نہ ہو سکی سب کے سب بدحواسی کے عالم میں خندق کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر گھیر ڈالا اور عمرو کے بیٹے حسل پر تلوار ماری اور اسے وہیں پر ڈھیر کر دیا۔ نوفل ابن عبداللہ خندق کو پھاندتے ہوئے اس میں گرا۔ کچھ لوگوں نے اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر پتھر برسانا شروع کئے۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو ذلت سے نہ مارو۔ تم میں سے کوئی نیچے اترے اور مجھ سے لڑے۔ حضرت علی خندق میں اترے اور ایک ہی ضرب میں اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ منبہ ابن عثمان خندق کو عبور کرتے ہوئے کسی کا تیر کھا کر زخمی ہوا اور مکہ پہنچ کر مر گیا۔ عکرمہ نے اپنا نیزہ پھینک کر اپنا بوجھ ہلکا کیا اور ہبیرہ کے ساتھ خندق پھاند کر لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ ضرار ابن خطاب فہری کو حضرت عمر نے بھاگتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا۔ ضرار نے پلٹ کر حملہ کرنا چاہا تو دیکھا کہ حضرت عمر ہیں اس نے ہاتھ روک لیا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ اے عمر! میرے اس احسان کو یاد رکھنا اور خندق کو پھاند کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ یہ لوگ اپنے کشتوں کو تو ساتھ لے جا نہیں سکتے تھے۔ کفار نے آنحضرتؐ کو پیغام بھجوایا کہ عمرو اور نوفل کے لاشے ہمارے حوالے کر دیے جائیں ہم اس کا عوض زرِ نقد کی صورت میں دینے کو تیار ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هو لکم ما ناکل ثمن الموتی۔ "یہ تمہارا ہی مال ہے۔ ہم مردے بیچ کر نہیں کھایا کرتے۔" انہیں اجازت مل گئی تو وہ لاشے اٹھا کر لے گئے۔

ان چند نامور سورماؤں کے مارے جانے اور چند کے پسپا ہونے سے کفار کی ہمتیں پست ہو گئیں اور پھر کسی کو جرأت نہ ہو سکی کہ خندق کو پھاند کر آگے بڑھے یا صدائے هل من مبارز بلند کرے۔ خوراک کی قلت اور

رسد کی نایابی کی وجہ سے ان کی حالت پہلے ہی نازک تھی۔ اب وہاں پر پڑے رہنا ہلاکت و تباہی کو دعوت دینا تھا وہ محاصرہ اٹھانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اس اثنا میں ایک رات سخت طوفان باد و باراں آیا جس نے کفار کے خیمہ و خرگاہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اونٹوں اور گھوڑوں نے رسیاں تڑوالیں اور اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ چولہوں پر چڑھی ہوئی دیگیں الٹ گئیں۔ کھلا میدان سخت سردی آندھی اور جھکڑ کا زور ایک کو ایک بھائی نہ دیتا تھا اور نہ کسی کو کسی کا ہوش تھا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ محاصرہ اٹھا کر اپنی راہ لیں۔ چنانچہ ابو سفیان نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔ اتنے دن ہم محاصرہ ڈالے پڑے رہے مگر نقصان ہی اٹھایا۔ اب مناسب یہ ہے کہ ہم ڈیرے خیمے اٹھالیں اور یہاں سے چل دیں۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسروں نے اسے جاتے دیکھا تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور راتوں رات میدان صاف ہو گیا۔ صبح کو جب مسلمانوں نے میدان خالی پایا تو دشمن کی پسپائی پر اللہ کا شکر بجالائے۔ اور فتح و کامرانی کے نعرے لگاتے ہوئے خوش خوش اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

اس معرکہ میں مشرکین کے چار آدمی مارے گئے جن میں سے عمرو ابن عبدود، نوفل ابن عبداللہ اور حسل ابن عمرو حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور منبہ ابن عثمان زخمی ہو کر بھاگا اور مکہ پہنچ کر ختم ہو گیا۔ مسلمانوں نے صرف اتنا کیا کہ نوفل جب خندق میں گرا تو اس پر پتھر مارے اور منبہ پر دور سے تیر چلائے اور حضرت عمر نے ضرار ابن خطاب کا پیچھا کیا مگر انہیں خود ہی ایک طرح سے اس کا ممنون احسان ہونا پڑا۔ کفار کے ان مانے ہوئے شجاعوں سے نمٹنے والے صرف حضرت علیؑ تھے جنہوں نے ضرب یداللّٰہی سے عمرو و نوفل ایسے سورماؤں کو قتل کر کے انہیں میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور مشرکین کا زور ایسا توڑا کہ آئندہ وہ مدینہ پر چڑھائی کی جرأت نہ کر سکے۔ اُن کا دم خم جاتا رہا۔ تاب مقاومت چھن گئی اور اپنی ناکامی و نامرادی پر صبر کر کے گھروں کے گوشوں میں بیٹھ گئے۔

غزوۂ خندق اور محاربۂ طالوت و جالوت میں بڑی حد تک مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس محاربہ کی بھی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے تاکہ دونوں کے مشترکہ پہلوؤں کو واضح کیا جا سکے۔ جالوت فرعونِ مصر کی اولاد میں سے بنی اسرائیل کا فرمانروا تھا اور اپنے ظلم و جور سے رعایا کا جینا مشکل کر رکھا تھا۔ بنی اسرائیل نے اس دور کے نبی اشموئیل سے کہا کہ ہم جالوت کے ظلم و تشدد سے تنگ آ چکے ہیں آپ اس کی ستم رانیوں سے ہمیں چھٹکارا دلائیں۔ اشموئیل نے قدرت کے ایما سے طالوت کو جو غریب و نادار سقائی کا پیشہ کرتا تھا حکومت و شاہی کے لئے منتخب کیا۔ بنی اسرائیل اس پر معترض ہوئے اور کہا کہ طالوت میں خوبی ہی کون سی ہے۔ نہ اس کا کوئی رعب و دبدبہ ہے اور نہ اس کے پاس مال و دولت ہے وہ ہم پر کیا حکومت کرے گا۔ اشموئیل نے جو جواب دیا وہ قرآن مجید کی ان لفظوں میں مذکور ہے۔

قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم — کہا خدا نے اسے تم پر فوقیت و فضیلت دی ہے۔

وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم — اور علم کی وسعت اور جسم کا پھیلاؤ بھی اسی کا زیادہ
واللہ یؤتی ملکہ من یشاء۔ — کیا ہے اور خدا جسے چاہتا ہے اسے اپنا ملک دیتا ہے“

قدرت کے اس ارشاد سے حاکم کے طریق کار اور معیارِ حکومت پر بھی روشنی پڑتی ہے اللہ جسے چاہتا ہے اسے مقرر کرتا ہے۔ اور یہ تقرر دولت و ثروت اور شان و شکوہ کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ فضیلتِ علم اور کمالِ شجاعت کی بنا پر عمل میں آتا ہے۔

جب جالوت نے یہ دیکھا کہ حکومت طالوت کی طرف منتقل ہو رہی ہے تو وہ لشکر و سپاہ کو لے کر میدانِ جنگ میں اتر آیا۔ طالوت بھی بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین سے نکل کھڑا ہوا اور اردن کے علاقہ میں دشمن کی فوجوں کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ طالوت کے ہمراہیوں کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی۔ انہوں نے جب جالوت کی انبوہ در انبوہ فوجوں کو دیکھا تو ان پر خوف و ہراس چھا گیا۔ اور جب جالوت ہاتھی پر سوار ہو کر للکارتا ہوا میدان میں آیا تو کوئی بھی اس سے زور آزمائی کے لئے تیار نہ ہوا۔ طالوت نے جب اپنے ہمراہیوں کی کمزوری و بزدلی کو دیکھا تو ان سے کہا کہ تم میں سے جو اسے قتل کرے گا میں آدھا ملک اس کے نام کر دوں گا اور اپنی بیٹی بھی اس کے عقد میں دوں گا۔ مگر کسی کو اس کڑیل گراں ڈیل سے لڑنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حضرت اشموئیل نے کہا کہ یہ اس کے ہاتھوں سے قتل ہو گا جو لاوی ابن یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہو گا اور حضرت موسیٰؑ کی زرہ اس کے جسم پر ٹھیک اترے گی۔ چنانچہ لاوی ابن یعقوب کی اولاد میں سے ایشا سے کہا گیا کہ وہ اپنے دسوں بیٹوں کو پیش کرے جب وہ آئے تو ان میں سے ہر ایک نے زرہ پہن کر دیکھی مگر زرہ کسی کے جسم پر ٹھیک نہ بیٹھی۔ آخر میں اس کے سب سے چھوٹے فرزند حضرت داؤد کو پہنائی گئی۔ جب زرہ ان کے قد و قامت پر راست آئی تو ان سے کہا گیا کہ آپ ہی جالوت سے سرپرہ ہو سکتے ہیں اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت داؤد زرہ پہن کر جالوت کے سامنے آئے۔ جالوت نے انہیں دیکھ کر کہا:۔

یا ھذا الصبی انت مع صغر سنک — اے صاحبزادے تم اس سن و سال میں مجھ سے
تبارزنی۔ (بدائع الزہور، صفحہ ۱۵۱) — لڑو گے؟“

کہا کہ ہاں میں لڑنے ہی کے لئے آیا ہوں۔ جب حضرت داؤد نے اسے مارنے کے لئے گوپھن میں پتھر رکھا تو اس نے کہا کہ تم مجھے اس طرح مارو گے جس طرح کتے کو مارا جاتا ہے کہا کہ ہاں لانک اشر من الکلب“ اس لئے کہ تم کتے سے بھی بدتر ہو۔“ جناب داؤد نے گوپھن کو حرکت دے کر اس زور سے پتھر پھینکا کہ اس کے سر کو توڑتا ہوا نکل گیا۔ جالوت زمین پر گرا اور گرتے ہی ختم ہو گیا۔ جالوت کے مرنے سے اس کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس حسن کارکردگی کے صلہ میں حضرت داؤد کو طالوت کی سلطنت ملی اور

اس کے داماد بھی ہوئے۔

اب غزوہ خندق کا اس محاربہ سے موازنہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان دونوں میں کتنی مشابہت پائی جاتی ہے خندق میں مسلمانوں کی سپاہ کم اور کفار کی تعداد کئی گنا زائد تھی اسی طرح طالوت کی فوج مختصر اور اس کے مقابلہ میں جالوت کا لشکر صحرائے اردن پر محیط تھا جس طرح مسلمان دشمن کی کثرت و قوت سے ہراساں تھے اسی طرح سپاہ طالوت پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا جس طرح عمرو اسلحہ سج کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر مبارز طلب ہوا اسی جالوت زرہ بکتر سے آراستہ اور ہاتھی پر سوار ہو کر میدان میں آیا جس طرح عمرو کے مقابلہ میں حضرت علی کے علاوہ کسی کو ہمت نہ ہوئی اس طرح جالوت کے مقابلہ میں حضرت داؤد کے علاوہ کسی کو جرأت نہ ہو سکی۔ جس طرح حضرت داؤد دشمن کے مقابلہ میں پیادہ تھے اسی طرح حضرت علیؑ حریف کے مقابلہ میں پیادہ پا تھے۔ جس طرح حضرت داؤد کے بدن پر حضرت موسیٰ کی زرہ ٹھیک اتری اسی طرح حضرت علیؑ کے جسم پر پیغمبرؐ کی زرہ پوری آئی۔ جس طرح حضرت داؤد اپنے بھائیوں میں سب سے کمسن تھے اسی طرح حضرت علیؑ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ جس طرح داؤدؑ کی عمر تیس برس تھی اسی طرح حضرت علیؑ کا سن تیس برس کے لگ بھگ تھا۔ جس طرح جالوت نے حضرت داؤد کی صغر سنی پر اعتراض کیا اسی طرح عمرو حضرت علیؑ کی کم سنی پر معترض ہوا۔ جس طرح انبیاء میں حضرت داؤدؑ بڑے جنگجو اور بہادر تھے اسی طرح اولیاء میں حضرت علیؑ جوانمردی و شجاعت میں فرد فرید تھے۔ شیخ علی علاؤالدین نے تحریر کیا ہے:۔

امام المبارزین من الانبیاء داؤد علیہ السلام ومن الاولیاء علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ (محاضرۃ الاوائل ص ۳۰۴)

انبیاء میں داؤد علیہ السلام اور اولیاء میں علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ جنگ آزماؤں کے امام و سرخیل تھے۔

جس طرح پیغمبرؐ نے عمرو کو کلب کی لفظ سے یاد کیا اسی طرح حضرت داؤد نے جالوت کو کتے سے بدتر قرار دیا۔ جس طرح جالوت کے مارے جانے سے تمام لشکر بھاگ کھڑا ہوا اسی طرح عمرو کے قتل ہونے سے مشرکین کے قدم اکھڑ گئے اور راتوں رات میدان خالی کر کے چل دیے۔ جس طرح عمرو کا قاتل دامادِ پیغمبرؐ اور وارث مسندِ خلافت تھا اسی طرح جالوت کا قاتل طالوت کی سلطنت کا وارث اور اس کا داماد قرار پایا۔ ان وجوہِ مماثلت کو دیکھنے کے بعد حافظ یحییٰ ابن آدم کے اس قول کی واقعیت نمایاں ہو جاتی ہے:۔

ما شبهت قتل علیؑ عمرا الا بقوله تعالی فهزموهم باذن الله وقتل داؤد

علیؑ کے عمرو کو قتل کرنے کی تشبیہ کسی واقعہ سے دی جا سکتی ہے تو اس واقعہ سے جس کا تذکرہ قرآن مجید کی اس آیت میں ہے۔" پھر ان لوگوں نے اللہ کے

جالوت۔ حکم سے دشمنوں کو شکست دی اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا۔"

(سیرت دحلان برحاشیہ سیرۃ حلبیہ ج ۲ صلا)

غزوۂ بنی قریظہ

جب غزوۂ احزاب یہود و مشرکین کے مشترکہ محاذ کی شکست و ہزیمت پر ختم ہوا تو پیغمبر اکرمؐ نے دشمن کے ناکام ہونے کے بعد بنی قریظہ کی طرف فوج بھیجنے کا ارادہ کیا۔ جنہوں نے حیی ابن اخطب کی باتوں میں آ کر مسلمانوں سے علانیہ غداری کی تھی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس غزوہ میں کھل کر حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ آنحضرتؐ نے تیس خزرجیوں کا ایک ہراول دستہ حضرت علیؑ کی قیادت میں ان کی طرف بھیجا اور علم جنگ حضرت کے سپرد کیا۔ طبری نے لکھا ہے:۔

قدام رسول اللہ علی ابن ابی طالب برایتہ الی بنی قریظۃ

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صلا ۲۴۵)

"پیغمبر اکرمؐ نے علی ابن ابی طالب کو رایتِ جنگ دے کر بطور مقدمۃ الجیش بنی قریظہ کی طرف بھیجا۔"

بنی قریظہ کو یہ اندیشہ تو تھا ہی کہ اس بدعہدی و عہد شکنی کی پاداش میں ان سے مواخذہ ہو گا انہوں نے لشکر کفار کے پسپا ہونے کے بعد اپنے ایک قلعہ میں پناہ لے لی اور یہ سمجھ لیا کہ قلعہ کو سر کر لینا مسلمانوں کی قوت و طاقت سے باہر ہے۔ جب حضرت علیؑ ان کے قلعہ کے پاس پہنچے اور زمین میں نیزہ گاڑا تو انہوں نے آنحضرتؐ کی شان میں نازیبا کلمات کہے اور گالی گلوچ پر اُتر آئے۔ آپ نے ان کی بدزبانی سنی تو واپسی کے ارادہ سے پلٹے تاکہ پیغمبرؐ کو قلعہ کے قریب جانے سے روک دیں۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ آنحضرتؐ تشریف لے آئے۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ آپ قلعہ کے پاس نہ جائیں۔ فرمایا اس لئے کہ وہ دشنام طرازی پر اُتر آئے ہیں؟ عرض کیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ جب وہ مجھے دیکھیں گے تو بدزبانی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ آنحضرتؐ نے ان کے ہاں پہنچ کر انہیں تنبیہ و سرزنش کی اور قلعہ کے سامنے خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے قلعہ کو اپنے حصار میں لے لیا اور قلعہ والوں پر آمد و رفت کی راہیں بند کر دیں۔ ان محصورین میں حیی بن اخطب بھی شامل تھا جس نے بنی قریظہ سے وعدہ کیا کہ وہ شکست کی صورت میں انہی کے ہاں ٹھہرے گا اور جو افتاد ان پر پڑے گی اس میں برابر کا شریک ہو گا۔

رئیس بنی قریظہ کعب بن اسد نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا محاصرہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے تو اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا تذکرہ آسمانی کتابوں کے اندر موجود

ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ ہم ان کی نبوت کا اعتراف کر کے اسلام قبول کریں اور اپنے جان و مال کا تحفظ کر لیں۔ انہوں نے اس مشورہ کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کعب نے کہا کہ اگر تم تبدیلیٔ مذہب کے لئے تیار نہیں ہو تو اپنے بچوں اور عورتوں کو ٹھکانے لگاؤ اور قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرو اس صورت میں تمہارے ذہن بچوں اور عورتوں کی فکر سے خالی ہوں گے اور پوری یکسوئی اور تندہی سے لڑ سکو گے۔ انہوں نے یہ بات بھی نہ مانی اور کہا کہ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کے خون سے ہاتھ رنگین نہیں کریں گے۔ کہا کہ پھر میری رائے یہ ہے کہ آج سبت کی رات ہے اور مسلمانوں کو یہ سان گمان بھی نہ ہو گا کہ آج کی شب ان پر حملہ ہو سکتا ہے۔ لہذا ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان پر شب خون مارو۔ کہا کہ ہم سبت کی بے حرمتی گوارا نہیں کر سکتے۔ جب کہ ہمارے دین و آئین کے خلاف ہے۔ کہا کہ پھر تم عقل و خرد سے عاری اور اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہو۔

یہود کو محاصرہ میں گھرے ہوئے پچیس دن ہو چکے تھے وہ اتنے دنوں تک تیر اور پتھر برساتے رہے۔ مگر مسلمانوں کا حصار توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب محاصرہ کی شدت سے تنگ آ گئے تو انہوں نے نباش ابن قیس کے ذریعہ پیغمبرؐ سے درخواست کی کہ ہم ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ہماری جان بخشی کی جائے اور ہمیں اپنی عورتوں، بچوں اور ہتھیاروں کے علاوہ اپنا مال و اسباب اونٹوں پر بار کر کے لے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہمیں یہ منظور نہیں ہے۔ کہا کہ پھر ہم اپنا مال و اسباب یہیں چھوڑے دیتے ہیں۔ ہمیں صرف عورتوں اور بچوں کو لے کر نکل جانے کی اجازت دی جائے۔ فرمایا کہ یہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ تمہیں غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو ہمارے سپرد کرنا ہو گا اور ہم جو مناسب سمجھیں گے فیصلہ کریں گے۔ نباش نے پلٹ کر بنی قریظہ کو آنحضرتؐ کے جواب سے آگاہ کیا۔ انہوں نے رسول خدا کو پیغام بھیجا کہ ابو لبابہ انصاری کو ہمارے پاس بھیجئے تاکہ ہم ان سے بات چیت کر کے کوئی آخری فیصلہ کریں۔ آنحضرتؐ نے ابو لبابہ کو اُن کے ہاں بھیجا۔ کہا کہ تمہاری کیا رائے ہے کیا ہم مشروط طور پر اپنے آپ کو محمد (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے سپرد کر دیں؟ ابو لبابہ نے زبان سے تو ہاں کہا اور ساتھ ہی اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ اگر تم نے اپنے آپ کو پیغمبرؐ کے سپرد کر دیا تو سب کے سب قتل کر دیے جاؤ گے۔ انہوں نے ابو لبابہ کا اشارہ پا کر اپنے آپ کو پیغمبرؐ کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔

ابو لبابہ کی یہ حرکت اصول رازداری کے خلاف اور اُن کے منصب کے منافی تھی چنانچہ انہیں قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعہ تنبیہ کی گئی۔

یا ایھا الذین امنوا لاتخونوا اللہ والرسول ولا تخونوا اماناتکم	اے ایمان دارو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے معاملات میں خیانت مت کرو اور نہ جانتے بوجھتے ہوئے

وانتم تعلمون۔ امانتوں میں بددیانتی کا ارتکاب کرو۔"

جب بنی قریظہ کو یہ احساس ہُوا کہ غیر مشروط پر آنحضرتؐ کے فیصلہ پر انحصار کر لینے کا نتیجہ قتل ہوگا تو انہوں نے کہا:۔

ننزل علی حکم سعد ابن معاذ "ہم سعد ابن معاذ کو ثالث تسلیم کرتے ہوئے اُن کے فیصلہ پر انحصار کریں گے۔"
(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۴۶)

آنحضرتؐ نے بھی سعد ابن معاذ کو ثالث قرار دیئے جانے کی اجازت دے دی اس طرح کہ اُن کا فیصلہ دونوں فریق کے لئے قابل تسلیم ہوگا۔

ابن ہشام نے تحریر کیا ہے کہ جب بنی قریظہ نے اپنے آپ کو سپرد کرنے سے انکار کیا تو حضرت علیؑ نے کہا:۔

واللہ لاذوقن ماذاق حمزہ او لافتحن حصنھم (سیرت ابن ہشام۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۵۱) "خدا کی قسم میں یا تو شہید ہو جاؤں گا جس طرح حمزہ شہید ہوئے یا ان کا قلعہ فتح کر کے رہونگا۔"

یہ کہہ کر زبیر ابن عوام کو ساتھ لیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ بنی قریظہ نے انہیں حملہ کے ارادہ سے بڑھتے دیکھا تو بوکھلا اُٹھے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے: یامحمدؐ ننزل علی حکم سعد ابن معاذ "اے محمدؐ ہم سعد ابن معاذ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔" سعد ابن معاذ جنگ احزاب میں تیر سے زخمی ہو کر مسجد نبویؐ کے قریب رفیدہ انصاریہ کے خیمہ میں پڑے تھے۔ جب انہیں سواری پر لایا گیا تو بنی اوس نے انہیں گھیر لیا اور ان سے کہا کہ آنحضرتؐ نے بنی قریظہ کا فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے اور بنی قریظہ نے بھی آپ کو حکم مانا ہے وہ ہمارے معاہد و حلیف رہ چکے ہیں۔ لہٰذا ان سے نرمی و مروّت کا برتاؤ کریں۔ سعد نے کہا کہ میں وہی فیصلہ کروں گا جو حق و انصاف کا تقاضا ہے اور کسی کی رو رعایت نہیں کروں گا۔ سعد کے اس جواب سے لوگ سمجھ گئے کہ فیصلہ بنی قریظہ کے خلاف ہوگا اور انہیں کسی رعایت کا مستحق قرار نہ دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی قریظہ کے مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، عورتوں کو کنیز اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کے اموال و املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد ہُوا اور ان کے مرد قتل کر دیے گئے۔ عورتیں اور بچے اسیر کر لئے گئے اور مال تقسیم کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

وانزل الذین ظاھروھم من اھل الکتاب من صیاصیھم وقذف فی قلوبھم الرعب "اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفار کی مدد کی تھی اللہ انہیں قلعوں سے نیچے اتار لایا اور ان کے دلوں میں ایسا رعب بٹھایا کہ تم لوگ ایک گروہ کو قتل کرتے

فریقا تقتلون وتاسرون فریقا و — لگے اور ایک گروہ کو اسیر بنانے لگے اور نہیں ان لوگوں
اورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم۔ — کی زمینوں گھروں اور ان کے اموال کا مالک بنایا۔[1]

بظاہر یہ سزا بڑی سخت اور انتہائی ہولناک نظر آتی ہے مگر حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس سزا کا پس منظر دیکھا جائے تو ایک متشدد سے متشدد معترض کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ واقعاً اس سزا کے مستحق تھے۔ آخر وہ کون سی جائز رعایت تھی جس سے پیغمبرؐ نے انہیں محروم کیا ہو یا کون سی نیکی تھی جو ان کے لئے روا نہ رکھی ہو اور خود سردار بنی قریظہ کعب بن اسد نے اس کا اعتراف کیا بھی تھا کہ ہم نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نیکی اور وفائے عہد کے علاوہ کوئی چیز نہیں دیکھی۔ آپ نے مدینہ میں قیام فرما ہونے کے بعد ان سے خصوصی مراعات برتیں امن وصلح کا معاہدہ کیا اور اس کا احترام ملحوظ رکھا انہیں مذہبی آزادی دی جان ومال کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اور ان کے معاشی ومعاشرتی حقوق کا تحفظ کیا اور جب بنی نضیر نے معاہدہ شکنی کی اور ان کو مدینہ سے جلا وطن ہونا پڑا تو ان سے معاہدہ کی تجدید کر کے ان کے سابقہ حقوق برقرار رکھے لیکن اس کے باوجود انہیں جب بھی موقع ملا دغا فریب سے باز نہ آئے اور دشمن کے دست وبازو بن کر اسلام کی بربادی پر تلے رہے۔ چنانچہ جنگ بدر میں دشمنوں سے ساز باز کی اور ان کو ہتھیار بہم پہنچائے اور پھر جنگ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف یہود ومشرکین سے بھرپور تعاون کیا اور ان ناشائستہ حرکات پر نادم وشرمسار ہونے کے بجائے کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئے اور اپنی بدفطرتی کا ثبوت دیتے ہوئے پیغمبرؐ اکرم کو دشنام طرازیوں کا نشانہ بنایا۔ ان حالات میں اگر انہیں زندہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً اہلِ مدینہ کے لئے مستقل خطرہ بن جاتے اور بنی نضیر کی طرح جنہوں نے قریش کو اپنے ساتھ ملا کر لشکر کشی کی تھی یہ بھی دوسرے دشمنانِ اسلام سے مل کر اس کے خلاف فوج کشی کرتے اور جنگ وقتال سے مدینہ واطراف مدینہ کے امن عامہ میں خلل انداز ہوتے رہتے۔ اور اس کے نتائج اتنے ہولناک ہوتے کہ ان کے مقابلہ میں چند افراد کا قتل کر دیا جانا چنداں اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اور پھر یہ دنیا جہان سے کوئی انوکھی سزا نہ تھی۔ اگر عالمی تاریخ بغاوت اور اس پر مرتب ہونے والی سزاؤں پر نظر کی جائے تو زمانہ قدیم سے لے کر اس متمدن دور تک جرم بغاوت پر کیا کیا سزائیں دی گئی ہیں اور ان میں کیا کیا کرب وایذا کے پہلو پیدا کئے گئے ہیں تو ان عہد شکن اور سرکش باغیوں کی سزائے قتل پر کوئی حیرت واستعجاب نہ ہو گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ باغیوں کو ایسی ایسی سزائیں دی جاتی تھیں کہ جنہیں سن کر اب بھی انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ کولھو میں پیلنا، شکنجے میں کھینچنا، آگ میں جھونکنا، ہاتھوں اور پیروں میں میخیں گاڑ کر الٹا لٹکانا بستیوں کی بستیاں جلا دینا، قبروں کو اکھیڑ کر لاشوں کو روندنا باغیوں کی عام سزا تھی۔ اس کے برعکس یہاں قتل کی سزا تو تجویز کی جاتی ہے مگر اس میں کوئی کرب افزا پہلو پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ ایک عام طریقہ سے انہیں موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔

چنانچہ اس بغاوت کا محرک اوّل اور اسلام کا دشمن اعظم حیی ابن اخطب جب قتل کے لئے حضرت علیؑ کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اعتراف کرتا ہے کہ قتلة شريفة بيد شريف۔ یہ ایک شریفانہ قتل ہے جو ایک شریف کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔" اور پھر حضرت سے یہ فرمائش کرتا ہے کہ جب مجھے قتل کر دیں تو میرا لباس اتار کر مجھے بے پردہ نہ کریں۔ جس پر حضرتؑ نے فرمایا کہ دشمن کو قتل کرنے کے بعد اسے عریاں کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے معمول کے مطابق اُسے قتل کرنے کے بعد اس کا لباس نہیں اُتارا۔

معاہدۂ حدیبیہ

مکہ رسولؐ خدا کا آبائی وطن اور مولد و مسکن تھا۔ یہیں پر آپ نے زندگی کے ترپن برس گزارے اور یہیں پر پہلے پہل وحی الٰہی کا خوش آہنگ نغمہ سنا۔ اور پھر تیرہ برس تک یہ متبرک سرزمین وحی کی صداؤں سے گونجتی رہی۔ اگرچہ اہل مکہ کے رویہ سے تنگ آکر آپ کو گھر بار چھوڑنا پڑا مگر اکثر مکہ کا تذکرہ اور اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے رہتے۔ وطن کی محبت و کشش فطری ہے چاہے انسان کو وطن میں سکون و آرام میسر ہو یا شدائد و محن سے واسطہ پڑا ہو وہ اس کی یاد سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہیں رکھ سکتا۔ اس فطری و طبعی وابستگی کے علاوہ دینی و مذہبی اعتبار سے بھی اس سرزمین سے ایک خصوصی لگاؤ تھا۔ اسی سرزمین میں خانہ کعبہ اور دوسرے مشاعر واقع تھے جن سے فریضۂ حج وابستہ ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی تعظیم و تقدیس ضروری ہے یہ تڑپ صرف رسولؐ خدا ہی کے دل میں نہ تھی بلکہ صحابہ کے دلوں میں بھی مکہ کے در و دیوار کو دیکھنے کی لگن تھی۔ انہیں مکہ چھوڑے ہوئے چھ برس ہو چکے تھے اور اب اس سرزمین پر قدم رکھنے اور عمرہ و طواف کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے اپنے ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہم مسجد الحرام میں داخل ہوئے ہیں۔ اور خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔ یہ خواب سن کر صحابہ کی بے چینی بڑھ گئی۔ انہوں نے پیغمبرؐ اکرم سے مکہ جانے اور عمرہ و طواف بجا لانے کے لئے اصرار کیا۔ قریش کی طرف سے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ وہ عمرہ و طواف بجا نہ لانے دیں گے مگر جنگ احزاب کے نتیجہ میں اُن کے سکوت سے یہ سمجھا گیا کہ اُن کے جنگی ولولے سرد پڑ گئے ہوں گے اور اب عمرہ و طواف ایسی چیز ہے جس کی ہر فرد اور ہر مذہب کو عمومی اجازت تھی مانع نہ ہوں گے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے صحابہ کے اصرار اور اُن کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے مکہ جانے کا ارادہ کر لیا اور مدینہ کے گرد و پیش کے لوگوں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی کچھ لوگ اس خیال سے رُک گئے کہ کہیں پھر جنگ نہ چھڑ جائے اور کچھ لوگ جن کی تعداد چودہ سو یا پندرہ سو پچیس تھی آنحضرتؐ کے ہمرکاب جانے کے

لئے تیار ہوگئے۔ آپ اس جمعیت کو لے کر روز دو شنبہ اول ماہ ذیقعدہ ۶ھ کو مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ قربانی کے ستر اونٹ ساتھ لے لئے وادی ذی الحلیفہ سے احرام باندھے اور ہتھیار اتار کر رکھ دیئے تاکہ قریش کو اطمینان ہو جائے کہ مسلمانوں کے پیش نظر جنگ و قتال نہیں ہے بلکہ صرف آداب و رسوم زیارت بجالانا ہے۔

پیغمبرؐ اکرم اور صحابہ کی ہیئت اور اُن کے سر و سامان سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑائی کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ مگر قریش نے گوارا نہ کیا کہ انہیں مکہ میں داخل ہونے اور مراسم زیارت بجالانے دیں۔ چنانچہ جب یہ کارواں وادی عسفان کے قریب پہنچا تو بسر ابن ابی سفیان کعبی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا قریش آپ کی آمد کی خبر سن کر وادی ذی طوی میں جمع ہو چکے ہیں اور خالد ابن ولید کو ایک دستہ سپاہ کے ساتھ کراع الغمیم کی جانب بھیج دیا ہے تاکہ آپ کو آگے بڑھنے اور مکہ میں داخل ہونے سے روکے۔ آنحضرتؐ نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور ثنیۃ المرار کی طرف سے ہوتے ہوئے حدیبیہ میں جو مکہ سے پندرہ میل کے فاصلہ پہ ایک کنواں تھا اور اس کی نسبت سے آس پاس کی زمین اس نام سے موسوم ہوگئی تھی، اتر پڑے۔ اُدھر خالد ابن ولید نے مسلمانوں کی جمعیت دیکھی تو اُس نے پلٹ کر قریش کو اطلاع دی کہ مسلمانوں نے راستہ تبدیل کر لیا ہے اور حدیبیہ کی طرف چل دیے ہیں۔ قریش نے بدیل ابن ورقا خزاعی کو بنی خزاعہ کے چند آدمیوں کے ہمراہ آنحضرتؐ سے گفت و شنید کے لئے بھیجا۔ اس نے حدیبیہ میں پہنچ کر آنحضرتؐ سے کہا کہ آپ مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیں اور یہیں سے واپس چلے جائیں۔ اگر آپ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو قریش مزاحم ہوں گے اور کسی صورت میں آپ کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہم خانہ کعبہ کا طواف اور مراسم زیارت بجالانے کے لئے آئے ہیں۔ قریش کو ہماری طرف سے مطمئن رہنا چاہیئے ہم نہ جنگ کے ارادہ سے آئے ہیں اور نہ جنگ لڑیں گے۔ بدیل نے پلٹ کر آنحضرتؐ کا پیغام قریش کو پہنچایا۔ قریش نے کہا کہ یہ مانا کہ ان کا ارادہ جنگ کا نہیں ہے۔ پھر بھی ہم انہیں حدودِ مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اگر وہ سینہ زوری سے داخل ہونے کی کوشش کریں گے تو ہم پوری طاقت و قوت سے انہیں روکیں گے۔ عروہ ابن مسعود ثقفی نے کہا کہ اس میں ہمارا بگڑتا ہی کیا ہے کہ وہ آئیں، عمرہ اور طواف بجالائیں اور پھر پلٹ جائیں۔ قریش نے کہا کہ عرب اسے ہماری کمزوری پہ محمول کریں گے اور ہم دوسروں کو اپنی کمزوری کا تاثر نہیں دینا چاہتے۔ عروہ نے کہا کہ پھر مجھے اجازت دی جائے کہ میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بات چیت کر کے اس معاملہ کو سلجھاؤں۔ قریش نے اُسے اجازت دی اور وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش آپ کا قبیلہ و خاندان ہے فرض کیجئے کہ آپ نے ان کا قلع قمع کر دیا تو یہ عرب کی پہلی مثال ہوگی کہ کسی نے اپنے قوم و قبیلہ کو تباہ و برباد کیا ہو۔ قریش یہ نہیں چاہتے

کہ آپ مکہ میں داخل ہوں۔ اگر آپ نے زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ اور جب چھڑے گی تو یہی لوگ جو آپ کے گرد و پیش منڈلا رہے ہیں بھاگتے نظر آئیں گے۔ اس پر حضرت ابوبکر نے اُسے ایک غلیظ سی گالی دی اور کہا کہ ہم کبھی رسولؐ خدا کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ عروہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ اسے بتایا گیا کہ ابوبکر ہیں۔ کہا کہ اے ابوبکر تمہارا ایک احسان مجھے یاد ہے اگر وہ احسان نہ ہوتا تو میں اس بدزبانی کا تمہیں جواب دیتا۔ عروہ کے ضبط و حلم اور احسان شناسی نے بات بڑھنے نہ دی ورنہ ممکن تھا کہ وہ مشتعل ہو کر بات ادھوری چھوڑ دیتا اور پلٹ کر قریش کو بھڑکاتا اور انہیں لڑائی پر ابھارتا۔ آنحضرتؐ نے اس کی متوازن طبیعت کا اندازہ کر لیا اور اس کے منصفانہ جذبات کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہمیں عمرہ و طواف سے روکا جائے اور قربانی کے اونٹوں کو کعبہ تک لیجانے سے منع کیا جائے۔ ہم نہ جنگ کے ارادہ سے آئے ہیں اور نہ زبردستی جنگ چھیڑنا چاہتے ہیں۔ عروہ آنحضرتؐ کی صلح پسندانہ گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور پلٹ کر قریش سے کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے پُرشکوہ درباروں کو دیکھا ہے مگر جو شان و شکوہ اور عقیدت و احترام کا جذبہ یہاں دیکھا ہے وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ہمیں چاہیے کہ انہیں عمرہ و طواف سے نہ روکیں اور پُرامن رہتے ہوئے انہیں مکہ میں آنے کی اجازت دیں۔ مگر قریش نے اس کی ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔ حلیس ابن علقمہ نے جب معاملہ رو براہ ہوتے نہ دیکھا تو کہا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں حالات کا جائزہ لے کر مناسب تجویز پیش کروں۔ قریش نے اسے اجازت دی اور وہ حدیبیہ کی جانب روانہ ہوا جب اس نے مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب قربانی کے اُونٹ دیکھے جو بھوک کے مارے بلبلا رہے تھے اور لبیک اللھم لبیک کی آوازیں سنیں تو وہیں سے پلٹ آیا اور قریش سے کہا کہ ان لوگوں کو طواف و زیارت کعبہ سے روکنا زیادتی ہے اور کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ ہم مراسم زیارت کی بجا آوری سے مانع ہوں مگر قریش ٹس سے مس نہ ہوئے۔ حلیس نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا:۔

یامعشر قریش واللہ ما علیٰ ھذا	اے گروہ قریش ہم تمہارے حلیف سہی مگر ہم نے اس
حالفناکم ولا علیٰ ھذا عاقدناکم	بات پر تم سے عہد و پیمان نہیں باندھا تھا کہ جو
ان تصدوا عن بیت اللہ من	خانہ کعبہ کے مراسم تعظیم بجا لانے کے لئے آئے تم اُسے
جاءہ معظما لہ۔ (تاریخ طبری ج۲۔ ص۲۷۴)	روکو اور آنے سے منع کر دو۔

جب ان سفارتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آنحضرتؐ نے خراش ابن امیہ خزاعی کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قریش کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں اطمینان دلائیں کہ پیغمبرؐ کا مقصد جنگ نہیں ہے بلکہ عمرہ و زیارت کعبہ ہے۔ خراش نے مکہ پہنچ کر قریش سے بات چیت کی اور ان سے کہا کہ وہ طواف و مراسم زیارت کے بجالانے سے مانع نہ ہوں

مگر قریش نے ان کی بات نہ مانی اور ان کے قتل کے درپے ہو گئے۔ حلیس اور اس کے زیر اثر قبائل نے جب یہ دیکھا کہ قریش انہیں قتل کیا چاہتے ہیں تو وہ ان کے سینہ سپر ہو گئے اور انہیں تلواروں کے نرغہ سے نکال کر واپس بھیج دیا۔ البتہ قریش نے اپنی ذہنی شکست خوردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ کا اونٹ کاٹ ڈالا۔ قریش نے اسی پر بس نہ کی بلکہ پچاس سر پھروں کو آنحضرتؐ کی قیامگاہ کی طرف بھیجا تاکہ مسلمانوں کو ہراساں کر کے واپسی پر مجبور کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ مسلمان اتنے بے دست و پا نہ تھے کہ اُن سے مغلوب ہو جاتے انہوں نے گھیرا ڈال کر ان سب کو گرفتار کر لیا اور پیغمبر اکرمؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے امن پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اور سب کو رہا کر دیا اور حضرت عمر کو بلا کر کہا کہ تم مکہ جا کر قریش کو واضح طور پر بتاؤ کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے۔ بلکہ طوافِ کعبہ اور مراسم زیارت بجا لانے کے لئے آئے ہیں۔ حضرت عمر نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا:۔

لیس بمکۃ من بنی عدی من یمنعنی وقد علمت قریش عداوتی لھا وغلظتی علیھا واخافھا علی نفسی فارسل عثمان فھو اعز بھا منی۔

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۱۳۵)

مکہ میں میرے قبیلہ بنی عدی کا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو میری حفاظت کا ذمہ لے اور قریش سے میری عداوت اور اُن کے خلاف میری سختی و تشدد پسندی ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے مجھے تو ان سے اپنی جان کا خطرہ ہے آپ عثمان کو بھیج دیجئے وہ مجھ سے زیادہ با اثر ہیں۔

اب پیغمبر نے حضرت عثمان کو بلایا اور انہیں اس کام پر مامور فرمایا اور اُن کے عقب میں دس مہاجرین کا ایک اور وفد بھیجا۔ جب یہ لوگ مکہ میں پہنچے تو حضرت عثمان نے ابوسفیان اور اکابر قریش کو آنحضرتؐ کی طرف سے پیغام دیا کہ وہ بلا وجہ مزاحمت نہ کریں جب کہ وہ زیارت کعبہ کے قصد سے آئے ہیں اور قطعاً جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے مگر قریش نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی اور انہیں واپس بھیجنے کے بجائے اپنے ہاں روک لیا۔ حضرت عثمان نے تو اپنے ایک عزیز ابان ابن سعید کی حمایت حاصل کر کے اپنا تحفظ حاصل کر لیا البتہ باقی ماندہ لوگ قریش کے رحم و کرم پر رہ گئے ان لوگوں کے مکہ میں روک لئے جانے سے مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان اور دوسرے مہاجر قتل کر دیئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ نبی اکرمؐ کی طرف سے بسلسلہ سفارت بھیجے گئے تھے اور سفیروں کا قتل مسلمہ بین الاقوامی آئین کے خلاف تھا اس لئے اس غیر آئینی قتل پر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور کہنے لگے کہ ہم اس قتل کا بدلہ لئے بغیر مدینہ واپس نہیں ہوں گے۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو جنگ پر مصر دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں یہ ذہنی ہنگامی جوش و ولولہ نہ ہو انہیں ایک ببول[1] کے درخت کے نیچے

---

[1] حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

جمع کیا اور ان سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں میدان سے منہ نہیں موڑیں گے اور پورے ثباتِ قدم کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ جابر ابن عبداللہ کہتے ہیں:۔

بایعنا رسول اللہ علیٰ ان لا نفر! (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۷۹)	ہم سے رسولِ خدا نے اس بات پر بیعت لی کہ ہم فرار اختیار نہیں کریں گے۔

اس بیعت کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ کیونکہ خداوند عالم نے اس پر رضا و خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔	جس وقت ایمان لانے والے تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالےٰ ان کی اس بات سے راضی ہوا۔

اس بیعت کی تکمیل کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت عثمان اور دوسرے مہاجرین کے قتل کیے جانے کی افواہ غلط تھی اور قبل اس کے کہ جنگ کی نوبت آئے وہ سب صحیح و سالم واپس آگئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ مسلمانوں کے جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے اور جنگی ولولے سرد پڑ جائیں۔ ادھر مشرکین قریش بھی لڑائی کے حق میں نہ تھے وہ صرف اپنی بات کو بالا دیکھنا چاہتے تھے تاکہ قبائل عرب پر ان کی دھاک جمی رہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد انہوں نے حویطب اور سہیل ابن عمرو کو صلح کی گفتگو کے لئے بھیجا۔ پیغمبر اکرمؐ بھی امن پسند اور مجبوری کے علاوہ جنگ کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور صلح کی بات چیت کے لئے حضرت علیؑ کو مقرر فرمایا۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

ان قریشا بعثوا سہیل ابن عمرو وحویطبا فولوھم صلحھم و بعث النبیؐ علیا علیہ السلام فی صلحہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۷۵)	قریش نے سہیل ابن عمرو اور حویطب کو صلح کے اختیارات دے کر بھیجا اور آنحضرتؐ نے علی علیہ السلام کو صلح کی گفتگو کے منتخب فرمایا۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس بیعت کے بعد یہ درخت متبرک سمجھا گیا اور مسلمان ادھر سے گذرتے تو تبرکاً اس کے نیچے نماز پڑھتے اور بیعت رضوان کی یاد تازہ کرتے۔ جب حضرت عمر کو اپنے دورِ خلافت میں اس کا علم ہوا تو انہیں مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل ناگوار گذرا چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص وہاں پر نماز پڑھے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ چنانچہ وہ درخت جس سے بیعتِ رضوان اور فتح مبین کی یاد وابستہ تھی قطع کر دیا گیا۔" ۱۲

جب دونوں فریق میں گفتگو شروع ہوئی تو قریش کے نمائندوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ فریق ثانی لڑنا نہیں چاہتا اس پر جا و بیجا شرائط عائد کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ بڑی رد و قدح کے بعد ان شرائط پر فریقین میں سمجھوتہ ہو گیا:۔

۱:۔ اس سال مسلمان عمرہ ادا کئے بغیر واپس چلے جائیں؛

۲:۔ آئندہ سال عمرہ کے لئے آ سکتے ہیں مگر تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہیں کر سکتے؛

۳:۔ اپنے ہمراہ تلوار کے علاوہ جنگی ہتھیار نہیں لا سکتے اور تلوار بھی نیام کے اندر رہے؛

۴:۔ قبائل عرب میں سے ہر قبیلہ کو اختیار ہو گا کہ وہ فریقین میں سے جس سے چاہے معاہدہ کر لے اور حلیف و معاہد قبائل پر بھی ان شرائط کی پابندی لازمی ہوگی؛

۵:۔ مکہ والوں میں سے اگر کوئی شخص مسلمانوں کے ہاں چلا جائے گا تو مسلمان پابند ہوں گے کہ اسے واپس کر دیں اور اگر ان کا کوئی آدمی قریش کے ہاں چلا آئے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا؛

۶:۔ اس معاہدہ کی میعاد دس برس ہوگی۔ اس عرصہ میں نہ کسی کو آنے جانے سے روکا جائے گا اور نہ کوئی لڑائی جھگڑا ہوگا؛

یہ تمام شرطیں قریب قریب قریش ہی کے حق میں تھیں اور وہ ان شرائط کو منوائے بغیر کسی طرح صلح پر آمادہ نہ تھے۔ ان حالات میں صلح سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہ تھا جب کہ قریش کا بھی ایک طبقہ صلح کے حق میں نہ تھا اور مسلمانوں کی اکثریت بھی ان شرائط پر مطمئن نہ تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو ان کے مطالبات کو من و عن تسلیم کر لیا جاتا یا ان سے جنگ چھیڑ دی جاتی۔ پیغمبر اکرمؐ کی نظر جنگ کے نتائج پر بھی تھی، اور صلح کے فوائد و مصالح پر بھی۔ اگر پیغمبر ان شرائط کے مقابلہ میں جو مسلمانوں کی کمزوری و بے بسی کی آئینہ دار تھیں جنگ کرتے اور یہ مان لیا جائے کہ اس جنگ کے نتیجہ میں فاتح و کامران بھی ہوتے اور قریش کو مغلوب کر کے مکہ میں داخل بھی ہو جاتے مگر قریش اور مسلمانوں میں اتنی منافرت بڑھ جاتی کہ وہ کبھی اسلام کے قریب بھی نہ پھٹکتے اور ہمیشہ اسلام دشمنی پر تلے رہتے۔ نیز اس اقدام سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاتا کہ پیغمبرؐ طبعاً صلح پسند نہ تھے بلکہ اپنی کمزوری و بے طاقتی کی بنا پر اب تک خاموش رہے تھے اور جب عسکری طاقت بہم پہنچا لی تو دشمن کو کچلنے کے لئے چڑھائی کر دی اور اس طرح یہ جنگ سابقہ دفاعی جنگوں کے مقابلہ میں جارحانہ قرار پاتی اور پیغمبرؐ کی امن پسندی و صلح جوئی پر حرف رکھنے کی گنجائش نکل آتی اس بنا پر آپ نے جنگ پر صلح کو ترجیح دی۔ اگرچہ شرائط کے سلسلہ میں کچھ دبنا پڑا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے دبنا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ نے یہ شرائط کسی جنگ کی شکست کے نتیجہ میں تسلیم نہیں کیں بلکہ سابقہ جنگوں میں اپنی طاقت کی برتری منوانے

کے بعد ان شرائط پر رضامندی دی۔ چنانچہ بدر و احزاب میں قریش کو شکست فاش دی جا چکی تھی اور اب بھی آپ کے مقابلہ پر وہی شکست خوردہ لوگ تھے جنہیں بآسانی شکست دے کر فاتحانہ صورت میں آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ مگر آنحضرتؐ یہ چاہتے تھے کہ جنگی برتری کے ساتھ اپنی صلح پسندی کا بھی تاثر دیں اور قریش کی جہالت عصبیت اور تنگ نظری کو بے نقاب کر کے اپنی وسیع القلبی اور امن جوئی کا ثبوت مہیا کریں۔

شرائط صلح کے طے ہو جانے کے بعد معاہدہ کی تحریر کا مرحلہ درپیش تھا۔ سہیل نے اس میں قدم قدم پر الجھنیں پیدا کیں اور رکاوٹیں ڈالیں۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ دستاویز تحریر کرنے لگے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سرعنوان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھو۔ سہیل نے کہا کہ ہم نہیں جانتے الرحمٰن کیا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے باسمک اللھم[له] لکھیے جو ہمارے ہاں کا دستور چلا آرہا ہے۔ آنحضرتؐ نے الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ فرمایا کہ اچھا یہی لکھ دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے یہ فقرہ لکھا: ھذا ما صالح علیہ محمد رسول اللہ سہیل ابن عمرو۔ " یہ وہ معاہدۂ صلح ہے جو اللہ کے رسول محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سہیل ابن عمرو سے کیا ہے" سہیل نے پھر اس پر اعتراض کیا کہ کہا کہ ہم انہیں اللہ کا رسول کب سمجھتے ہیں۔ اگر ہم انہیں اللہ کا رسول مانتے تو مکہ میں داخلہ سے مانع نہ ہوتے۔ لہٰذا اس کے بجائے محمدؐ ابن عبداللہ لکھا جائے۔ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ لفظ رسولؐ اللہ قلمزد کر دو اور محمدؐ ابن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؑ نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں لفظ رسولؐ اللہ نہیں کاٹوں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ لاؤ میں اسے خود مٹائے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے لفظ رسول اللہؐ پر خط کھینچ دیا اور حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

لتبلین بمثلھا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲ ص ۱۳۸) "ایک دن تمہیں بھی اس قسم کی آزمائش سے دوچار ہونا پڑے گا"

جب دستاویز قلمبند ہو گئی تو دونوں فریق کے گواہوں نے اس پر شہادتیں ثبت کیں اور اس کا ایک نسخہ رسولؐ اللہ کے سپرد کیا گیا اور ایک نسخہ سہیل ابن عمرو کو دیا گیا۔

اس صلح کی گفتگو سے لے کر تحریر معاہدہ تک کے تمام مراحل پیغمبرؐ اکرم نے اپنی صوابدید سے طے کیے اور اس پوری کارروائی میں نہ صحابہ کو شریک مشورہ کیا گیا اور نہ اُن کی رائے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ البتہ ایک حضرت علیؑ تھے جو شرائط صلح طے کرنے اور معاہدہ کے تحریر کرنے میں پیغمبرؐ کے شریک کار تھے۔ اکثر صحابہ صلح

له یہ جملہ سب سے پہلے امیہ ابن ابی الصلت ثقفی نے تحریر کیا۔ اور قبل اسلام یہی جملہ خطوط و دستاویزات میں سرعنوان لکھا جایا کرتا تھا۔ ۱۲

اور اس کے شرائط کے سرے سے مخالف تھے۔ وہ تو یہ توقع لئے ہوئے تھے کہ کفار کے علی الرغم مکہ میں داخل ہوکر عمرہ و طواف بجا لائیں گے۔ مگر جب قرار داد صلح کی رُو سے یہیں سے واپسی طے پا گئی تو ان میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ اور یہ بے چینی اور ہیجانی کیفیت اس حد تک بڑھی کہ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات نے جگہ لے لی۔ چنانچہ علامہ طبری تحریر کرتے ہیں:۔

قد کان اصحاب رسول اللہؐ خرجوا وھم لا یشکون فی الفتح لرؤیا راھا رسول اللہ فلما رأو ما رأو من الصلح والرجوع وما تحمل علیہ رسولؐ اللہ فی نفسہ دخل الناس من ذالک امر عظیم حتی کادوا ان یھلکوا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۸۱)

پیغمبرؐ کے اصحاب جب مدینہ سے نکلے تھے تو انہیں فتح میں کوئی شک و شبہ نہ تھا اس خواب کی بنا پر جو آنحضرتؐ نے دیکھا تھا۔ مگر جب انہوں نے صلح اور واپسی کی صورت دیکھی اور یہ دیکھا کہ رسولؐ اللہ نے ذاتی طور پر شرائط منظور کر لئے ہیں تو ان لوگوں کے دلوں میں ایک بڑا خدشہ پیدا ہوا اور قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت عمر اس صلح پر سب سے زیادہ برافروختہ تھے۔ اور ان کی ناراضگی اس حد تک بڑھی کہ وہ غصہ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور کہا کیا آپ پیغمبرؐ برحق نہیں ہیں فرمایا کہ ہاں میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ کہا کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم سب مسجد الحرام میں داخل ہوں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کریں گے۔ فرمایا کہ ہاں میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی تھی کہ وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ ہم مسجد الحرام میں داخل ہوں اور خانہ کعبہ کا طواف بجا لائیں۔ مگر یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال ہوگا۔ جو کچھ ہوا ہے اللہ کے حکم سے ہُوا ہے اور میں اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ اور اللہ مجھے ضائع و برباد اور دشمن کے ہاتھوں سے پامال نہ ہونے دے گا۔ پیغمبرؐ اکرم کے اس سمجھانے سے بھی حضرت عمر کی اُلجھن کم نہ ہوئی اور وہ غم و غصہ میں بھرے ہوئے حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ان سے بھی وہی باتیں کہیں جو رسولؐ خدا سے کہیں تھیں۔ انہوں نے کہا:۔

یا عمر الزم غرزہ فانی اشھد انہ رسول اللہ (تاریخ طبری۔ ج ۲ صفحہ ۲۸۰)

اے عمر تم ان کی رکاب تھامے رہو میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں۔

حضرت ابوبکر کو پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کی یقین دہانی کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ حضرت عمر کے اندازِ گفتگو سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ وہ اس صلح سے اس حد تک متاثر اور برافروختہ ہیں کہ انہیں پیغمبرؐ کی رسالت مشکوک و مشتبہ نظر آ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے خود بھی اپنے شک و تذبذب کا اظہار ان الفاظ

میں کیا ہے:۔

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ۔ (تاریخ خمیس۔ ج۲۔ ص۳۲)	خدا کی قسم میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے اس دن کے سوا کبھی شک نہیں کیا۔"

صحابہ کی ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ جب آنحضرتؐ نے معاہدۂ صلح کو عملی جامہ پہناتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ قربانیاں کرو اور سروں کے بال منڈواؤ تو جو کچھ دیر پہلے پیغمبرؐ کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتے اور اشارہ چشم و ابرو پر دیوانہ وار دوڑ پڑتے تھے نافرمانی پر اُتر آئے اور بار بار کہنے کے باوجود نہ قربانی کرنے پر آمادہ ہوئے اور نہ سر منڈانے پر۔ مورخ طبری نے لکھا ہے:۔

فو اللہ ما قام منھم رجل حتٰی قال ذلک ثلاث مرات۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۲۸۳)	خدا کی قسم آنحضرتؐ کے تین مرتبہ حکم دینے کے باوجود کوئی بھی تعمیل کے لئے کھڑا نہ ہوا۔"

جب آنحضرتؐ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو کبیدہ خاطر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جناب ام سلمیٰ کے خیمہ میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جناب اُم سلمہ نے پیغمبرؐ کے چہرہ پر آثار ملال دیکھے تو وجہ پوچھی۔ آپ نے صحابہ کی نافرمانی اور بے اعتنائی کا شکوہ کیا۔ اُم سلمہ نے کہا کہ آپ کسی کو مجبور نہ کریں اور خود جا کر قربانی کریں اور سر منڈوا کر احرام اتار دیں۔ آنحضرتؐ نے باہر نکل کر قربانی کی اور سر منڈوا کر احرام اُتار دیا۔ جب صحابہ نے دیکھا کہ اب پیغمبرؐ کے فیصلہ میں تبدیلی نہیں آسکتی تو کچھ لوگوں نے بادل نخواستہ سر منڈوائے اور اکثر لوگوں نے صرف تھوڑے تھوڑے بال ترشوائے مگر ان کا غم و غصہ کسی طرح کم نہ ہوا۔ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

جعل بعضھم یحلق بعضا حتٰی کاد بعضھم یقتل بعضا غماً۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۲۸۳)	وہ آپس میں ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رنج و غم کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے۔"

جب پیغمبرؐ نے سر منڈواتے والوں کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا ان سر منڈوانے والوں پر رحم کرے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ:۔

یا رسولؐ اللہ فلما ظاھرت الترحم للمحلقین دون المقصرین قال لانھم لم یشکوا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۲۸۳)	یا رسولؐ اللہ آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے دعائے رحمت کی ہے اور بال ترشوانے والوں کے لئے کچھ نہیں کہا۔ فرمایا اس لئے کہ انہوں نے شک نہیں کیا۔"

صحابہ کے پیچ و تاب کھانے کے باوجود پیغمبر نے ان شرائط کی پوری پوری پابندی فرمائی۔ چنانچہ ابھی شرائط صلح پر گفتگو ہو رہی تھی کہ سہیل ابن عمرو کا بیٹا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور اس جرم کی پاداش میں قید و بند کی کڑیاں جھیل رہا تھا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ مکہ کے قریب تشریف فرما ہیں تو وہ نگہبانوں کی نظر بچا کر بھاگ نکلا اور پا بہ زنجیر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے اپنے ہمرکاب رہنے کی اجازت دیجئے۔ جب نمائندہ قریش سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو آنحضرتؐ سے کہا کہ ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہمارا جو آدمی بھاگ کر آئے اسے واپس کیا جائے گا لہٰذا ابو جندل کو واپس کیجئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی تو معاہدہ کی تکمیل بھی نہیں ہوئی کہ تم نے اس کی پابندی کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ سہیل نے کہا کہ آپ نے میرے بیٹے کو میرے حوالے نہ کیا تو ہم معاہدہ صلح ختم کر دیں گے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اچھا تم اسے لے جاؤ۔ چنانچہ ابو جندل کو صبر و تحمل کی ہدایت کرتے ہوئے ان کے حوالے کر دیا۔

جب ابو جندل اٹھ کر جانے لگا تو حضرت عمر بھی اُس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کا ہاتھ تلوار کے قبضہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک مشرک کا خون ایک کتے کے خون سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنے باپ پر حملہ کر کے اسے قتل کر دے گا مگر ابو جندل نے کہا:۔

یا عمر ما انت باحری بطاعة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۲۲)	اے عمر تم حکم رسولؐ کی بجا آوری کا مجھ سے زیادہ حق تو نہیں رکھتے۔"

کفار قریش نے اپنی اس شرط کو عملاً منوا کر یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے میدان کو سر کر لیا ہے حالانکہ یہ شرط مسلمانوں کے لئے قطعاً ضرر رساں نہ تھی۔ اس لئے کہ اگر کوئی اسلام سے منحرف ہو کر قریش کے ہاں جاتا ہے تو وہ ارتداد کے بعد زمرۂ مسلمین میں شامل کئے جانے کے لئے قابل ہی کب رہتا ہے کہ اس کے واپس لئے جانے پر اصرار کیا جاتا۔ اور اگر قریش کسی بھاگ نکلنے والے کی واپسی پر مصر تھے تو اسے واپس کر دینے میں مسلمانوں کا نقصان ہی کیا تھا۔ جب کہ وہ مکہ میں رہ کر بھی مسلمان رہ سکتا تھا۔ اور شرائط صلح کی رُو سے اسے کوئی اسلامی اعمال و عبادات سے روکنے کا مجاز نہ تھا۔ البتہ یہ شرط قریش کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئی اور ان کے مال و جان کی تباہی کا باعث بن گئی۔ چنانچہ اس صلح کی تکمیل کے بعد قریش کا ایک آدمی ابو بصیر عتبہ ابن اسید مسلمان ہو کر چوری چھپے مدینہ چلا آیا۔ قریش نے دو آدمیوں کو خط دے کر مدینہ روانہ کیا اور ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرتؐ نے ابو بصیر کو بُلا کر کہا کہ تم ان کے ہمراہ مکہ واپس چلے جاؤ۔ ابو بصیر بادل نخواستہ ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب یہ لوگ وادیٔ ذوالحلیفہ میں پہنچے تو ابو بصیر نے ان میں سے ایک کی تلوار کی بڑی تعریف کی۔ اس نے کہا کہ ہاں واقعاً

میری تلوار بڑی عمدہ ہے اور یہ کہہ کر تلوار نیام سے نکال لی۔ ابو بصیر نے دیکھنے کے بہانہ سے وہ تلوار لے لی اور اسی کی تلوار سے اسے قتل کر دیا۔ جب دوسرے آدمی نے دیکھا کہ اس کا ساتھی مارا گیا ہے تو وہ ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہوا اور مدینہ پہنچ کر رسولؐ اللہ سے کہا کہ ابو بصیر نے میرے ساتھی کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور مجھے بھی اس سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اتنے میں ابو بصیر بھی واپس آ گیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ یارسولؐ اللہ آپ نے مجھے ان کے حوالے کر دیا تھا اور معاہدہ کی رُو سے اب آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی لہٰذا مجھے دوبارہ اس کے ہمراہ مکہ جانے کے لئے نہ کہا جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ شخص جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے اگر اس کی حمایت کی گئی تو قریش جنگ چھیڑے بغیر نہیں رہیں گے۔ ابو بصیر سمجھ گیا کہ پیغمبرؐ اسے واپس کئے بغیر نہیں رہیں گے اس نے موقع تاک کر ساحلِ سمندر کا رُخ کر لیا اور وہیں پر سکونت اختیار کر لی۔ اِدھر ابو جندل کو جو مکہ میں نظر بند تھا یہ پتہ چلا کہ ابو بصیر ساحلِ سمندر کی طرف نکل گیا ہے تو اس نے بھی چپکے سے اُدھر کا رُخ کر لیا اور رفتہ رفتہ یہ جگہ مکہ سے بھاگ نکلنے والوں کے پناہ گاہ بن گئی اور مزید ستر مسلمان ان سے آ کر مل گئے اور اپنی طاقت کو یکجا کر کے ایک مضبوط جتھا بنا لیا اور جب قریش کے قافلے شام جاتے ہوئے اُدھر سے گزرتے تو یہ ان پر چھاپے مارتے اور ان کا مال واسباب لوٹ لیتے۔ قریش جب ان کے ہاتھوں تنگ آ گئے تو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ ان لوگوں کو اپنے ہاں بلا لیں ہم آئندہ کسی ایسے شخص سے تعرض نہیں کریں گے جو مسلمان ہو کر آپ کے ہاں چلا آئے گا۔ آنحضرتؐ نے ابو بصیر کو کہلوا بھیجا کہ وہ مدینہ چلا آئے۔ ابو بصیر کو یہ پیغام اس وقت ملا جب اس پر نزعی کیفیت طاری تھی۔ اس نے ابو جندل سے کہا کہ تم مدینہ چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو منتشر کر کے مدینہ چلا آیا اور قریش کے لئے راستہ بے خطر ہو گیا۔

اس صلح کے حِکَم و مصالح کو اکثر مسلمان اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے نہ سمجھ سکے تھے اور صلح کے موقع پر بھی اور اس کے بعد بھی اس پر افسردہ و کبیدہ خاطر رہے۔ مگر جب اس کے نتیجہ میں انہیں دینی و سیاسی اعتبار سے وہ کامیابیاں حاصل ہوئیں جن کی وہ توقع بھی نہ کر سکتے تھے تو اُن کی آنکھیں کھُل گئیں اور انہیں پیغمبر اکرمؐ کی دور اندیشی انجام بینی اور حقیقت رسی کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس صلح پر جو فوائد مرتب ہوئے ان میں سے چند واضح اور روشن فوائد یہ ہیں:۔

پہلا فائدہ یہ ہوا کہ تمام قبائل عرب پر قریش کی بیجا سخن پروری، ضد اور ہٹ دھرمی واضح ہو گئی کہ انہوں نے محض اس خیال سے کہ ان کی سبکی نہ ہو مسلمانوں کو عمرہ و طواف سے روک دیا۔ حالانکہ خانہ کعبہ ایک عمومی عبادت خانہ اور مشترکہ معبد تھا جس سے ان کے معاہد و حلیف قبائل بھی اُن سے بدظن ہو گئے اور جن کڑی شرطوں کو منوا کر انہوں نے اپنا جھوٹا وقار قائم کرنا چاہا تھا وہی ان کی ذلت و ناکامی کا باعث بن گئیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان جو مکہ میں اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھے اور کفار کے ڈر سے اظہارِ اسلام نہ کر سکتے تھے ان کے دلوں سے خوف و ہراس جاتا رہا اور وہ کھلے بندوں مسلمان کہلوانے اور اسلامی عبادات واحکام پر عمل کرنے لگے۔ بلکہ جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتا قریش باہمی صلح کی بناء پر اس سے تعرض کرتے اور نہ اسلام کے اختیار کرنے سے مانع ہوئے۔

تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ کفار کو مسلمانوں سے میل جول کا موقع ملا اور آمد و رفت کی پابندیوں کے اٹھ جانے سے قریش اور دوسرے لوگ بے کھٹکے مدینہ میں آتے اور آنحضرتؐ کے اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ قدسیہ سے متاثر ہوتے۔ اسلام کے تعلیمات واحکام سنتے اور ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور جب یہ دیکھتے کہ لوگ کس طرح آنحضرتؐ کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے اور ان کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلتے ہیں تو وہ پلٹ کر اہلِ مکہ سے اس کا ذکر کرتے جس سے ان کے دلوں پر آنحضرتؐ کی عظمت اور اسلام کی صداقت کا نقش ابھرتا اور جب مسلمان مکہ میں آتے تو مشرکین سے آزادانہ ملتے جلتے اور اپنے عزیزوں اور ملنے جلنے والوں سے اسلام کے محاسن بیان کرتے اور اس کے آداب و اخلاق سنن و فرائض اور امر و نواہی اور مواعظ و عبر کا تذکرہ کرتے جس سے ان کے دل اسلام کی طرف کھنچتے اور برضاء و رغبت اسلام قبول کر لیتے۔ چنانچہ دو سال کے قلیل عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد دوگنی سے بھی زائد ہو گئی۔ مورخ طبری تحریر کرتے ہیں :۔

دخل فی تینك السنتین فی الاسلام مثل ما کان فی الاسلام قبل ذٰلك او اکثر۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲ ص ۲۸۲)	دو سالوں کے اندر ہی مسلمانوں کی تعداد سابقہ تعداد سے دُوگنا یا اس سے زیادہ گئی۔

چوتھا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے ان لوگوں کے قول کی تردید ہو گئی جو اسلام کی صداقت کو مجروح کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی نشر و اشاعت تلوار کے ذریعہ ہوئی اس لئے کہ اگر اسلام کا فروغ و ارتقاء تلوار کا مرہونِ منت ہوتا تو صلح کو اسلام کی ترقی میں سدِّ راہ ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ جتنی ترقی اس صلح پسندی کے نتیجہ میں ہوئی وہ برسرِ پیکار رہنے کے نتیجہ میں نہ ہو سکی۔ وجہ یہ ہے کہ جنگ میں نفرت کے جذبات اس شدت سے بھڑک اٹھتے ہیں کہ حق، بغض و عناد کی دبیز تہوں میں چھپ کر رہ جاتا ہے۔ اور صلح و سکون کے لمحات میں جذبات میں توازن پیدا ہو جاتا ہے اور دل و دماغ حق کی پذیرائی کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں چنانچہ اس صلح نے دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھار کر سعید الفطرت لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔

پانچواں فائدہ یہ ہوا کہ جب قریش کی نئی پود نے ایک طرف آنحضرتؐ کا مصالحانہ طرزِ عمل اور صلح پسندانہ روش دیکھی اور دوسری طرف ابو جہل و ابو سفیان اور یہود و مشرکین کی اڑائی ہوئی باتوں کا جائزہ لیا تو انہیں

ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آیا۔ کہاں تو وہ یہ سنتے آرہے تھے کہ پیغمبرؐ فتنہ پرور و جنگجو ہیں۔ اور کہاں یہ کہ وہ امن پسندی کا ایسا کردار اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جو ایک جنگجو کی طبیعت سے قطعاً سازگار نہ تھا۔ اس سے انہیں یقین ہو گیا کہ وہ آنحضرتؐ کے متعلق جو سنتے آئے ہیں وہ سراسر غلط اور صریحی بہتان تھا۔ اگر وہ جنگجو ہوتے تو ان کے لئے جنگ سے مانع ہی کیا تھا جب کہ ان کے ہمراہ فوج پہلے سے کہیں زیادہ تھی اور وہ قریش کو بدر و احزاب میں شکست بھی دے چکی تھی۔ یہ ایک ایسا تاثر تھا جس نے انہیں آنحضرتؐ کی صلح جوئی و امن پسندی کا معترف بنا دیا اور ان پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ اب تک جتنی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ وہ قریش ہی کے جارحانہ اقدام کے دفاع میں لڑی گئی ہیں اور آنحضرتؐ نے اُن کے مقابلہ میں صفیں جمائیں تو حفاظت خود اختیاری اور اپنی جماعت کے تحفظ کے لئے۔

چھٹا فائدہ یہ ہوا کہ قریش صلح کی بناء پر مطمئن رہے کہ معاہدہ کی مقررہ مدت کے اندر ان پر حملہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انہوں نے ہتھیاروں کی فراہمی اور جنگی تیاریوں کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مگر جب انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنی بکر و بنی خزاعہ کی جنگ میں حصہ لیا اور اپنے حلیف قبیلہ بنی بکر کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنی خزاعہ کو قتل و غارت کیا تو مسلمانوں کے لئے مکہ پر چڑھائی کا جواز پیدا ہو گیا۔ اور جب اس عہد شکنی کے نتیجہ میں مسلمانوں کا لشکر مکہ پر منڈلانے لگا تو قریش میں تاب مقاومت ہی نہ تھی کہ وہ مقابلہ کرتے اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بغیر کسی مزاحمت کے آگے بڑھ کر مکہ فتح کر لیا۔ اگر معاہدۂ صلح نہ ہوتا تو قریش ہمہ وقت چوکنا رہتے اور جنگی ساز و سامان مہیا رکھتے۔ اس صورت میں مسلمان جنگ کئے بغیر مکہ کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ چونکہ اس صلح کے زیر اثر مکہ فتح ہوا۔ اور اسلامی اقتدار کی بنیاد پڑی اس لئے قدرت نے اسے فتح مبین اور پیغمبرؐ نے اعظم الفتوح سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدہ صلح سے جہاں پیغمبر اکرمؐ کی اصابت رائے امن پسندی اور عہد و پیمان کی پاسداری پر روشنی پڑتی ہے وہاں ایسے نتائج بھی اس سے اخذ کئے جا سکتے ہیں جو اسلامی نظریات و احساسات کی بلندی کا ثبوت دیتے اور بین الاقوامی معاہدات میں رہنما اصولوں کا کام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

ایک یہ کہ صلح کے امکان ہوتے ہوئے جنگ چھیڑی نہیں جا سکتی خواہ ایسے شرائط پر صلح کی نوبت آئے جن سے جماعت کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہو اور بظاہر قومی وقار مجروح ہوتا ہو۔ بشرطیکہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر زد نہ پڑتی ہو۔ چنانچہ یہاں کفار و مشرکین سے انہی کے پیش کردہ شرائط پر صلح ہو گئی اور جنگ

کی نوبت نہ آنے دی گئی اب اس طرز عمل کو دہرایا گیا ہو اور امام حسنؑ نے زمانہ کے حالات و مقتضیات کو دیکھتے ہوئے امیر شام سے صلح کر لی ہو تو اس پر نہ اعتراض کی گنجائش نکل سکتی ہے اور نہ اسے فریق ثانی کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ معاہدہ کی پابندی بہرحال ضروری ہے اگرچہ معاہدہ کفار و مشرکین سے کیوں نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ابو جندل اور ابو بصیر کو کفار کے حوالے کر کے معاہدہ کا جو معیار قائم کیا وہ دیانت، راست روی اور ایفائے عہد کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ البتہ جب قریش نے عہد شکنی کر کے مسلمانوں کے حلیف بنی خزاعہ کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا تو پیغمبرؐ پر فرض ہو گیا کہ وہ اپنے معاہد قبیلہ کی نصرت و امداد کے لئے قدم اٹھائیں۔ اگر قریش اپنے عہد پر باقی رہتے تو پیغمبر اسلام کبھی مکہ پر لشکر کشی نہ کرتے۔ مگر قریش کی بدعہدی نے مکہ پر حملہ کا جواز پیدا کر دیا۔ اسی سیرت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے امیر المومنینؑ نے اپنے دورِ خلافت معاہدۂ تحکیم کی پابندی کی اگرچہ آپ پر خوارج نے پورا پورا زور ڈالا کہ اس معاہدہ کو ختم کر دیا جائے۔ مگر آپ نے اس وقت تک اسے توڑنا گوارا نہ کیا۔ جب تک خود اہل شام کی طرف سے اس کی خلاف ورزی ظہور میں نہ آئی۔

تیسرے یہ کہ پیغمبرؐ جمہور کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ چنانچہ جمہور صحابہ کی رائے آنحضرتؐ کی رائے کے خلاف تھی مگر آپ عوام کی رائے پر عمل پیرا ہونے کے بجائے اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ نہ ان کی رائے کو قابل اعتنا سمجھا اور نہ ان سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس کی۔ اس لئے کہ جہاں وحی ذریعہ علم و بصیرت ہو وہاں کسی کے مشورہ کی احتیاج ہی نہیں رہتی۔ اور اگر کبھی مشورہ فرمایا بھی تو محض مسلمانوں کی دلجوئی اور اُن کے تالیف قلب کے لئے۔ لہٰذا جب اس مورد پر اُن کی رائے قابل عمل قرار نہ پائی تو اس سے اہم تر موارد کے لئے ان کی رائے کیونکر سند ہو سکتی ہے۔

اس صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں امیر المومنینؑ نے جو عملی مظاہرہ کیا وہ آپ کے تدبر، معاملہ فہمی اور عزم و یقین کا روشن ثبوت ہے۔ آپ نے اس صلح کے مرحلہ کو اسی طرح طے کیا جس طرح جنگ کے دشوار گزار مرحلوں کو سر کرتے رہے تھے۔ حالانکہ جو لوگ جنگ آزما ہوتے ہیں وہ جنگی معاملات ہی میں رائے دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ انہیں نہ صلح سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ان میں صلح کے معاملات سلجھانے کی اہلیت۔ اور جو لوگ امن پسند اور صلح جو ہوتے ہیں وہ حرب و ضرب کے معاملات سے بیخبر سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ بوصف اہل اسلام میں سب سے بڑے جنگجو تھے۔ انہیں اس معاہدۂ صلح سے کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیئے تھی اس لئے کہ صلح و جنگ دو متضاد چیزیں ہیں اور دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں مگر آپ جس طرح جنگ کے نشیب و فراز اور اس کے داؤ پیچ سے واقف تھے اسی طرح صلح کی پیچیدگیوں سے بھی باخبر تھے۔ اسی لئے پیغمبرؐ اکرم نے صلح کی گفتگو صلحنامہ کی تحریر اور اس سلسلہ کے تمام

امور آپ سے متعلق کئے۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے :۔

کان نظام تدبیر ھذہ الغزاۃ متعلقاً بامیر المومنین وکان ماجری فیہا من البیعۃ وصف الناس للحرب ثم الھدنۃ والکتاب کلہ لامیر المومنین۔ (ارشاد، ص۵۴)

غزوۂ حدیبیہ کا تمام نظم و انصرام امیر المومنینؑ سے متعلق تھا۔ وہ بیعت (رضوان) ہو یا جنگ کے لئے لوگوں کی صف بندی، صلح کی گفتگو ہو یا صلح نامہ کی تحریر یہ تمام اُمور آپ نے انجام دیئے۔

آپ نے شروع ہی سے صلح کی مصلحت و حکمت کو محسوس کر لیا تھا اس لئے نہ شک و تذبذب میں پڑے اور نہ حکم رسولؐ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ بلکہ جب دوسروں کے عقائد متزلزل ہو رہے تھے اور رسالت کے متعلق دلوں میں شکوک و شبہات گزر رہے تھے آپ نے صفحۂ قرطاس سے بھی لفظ رسول اللہ کو مٹانا سوء ادب سمجھا اور رسولؐ اللہ کے فرمانے کے باوجود اس پر خط کھینچنا گوارا نہ کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حضرت کے اس انکار پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :۔

ایں امتناع علی از محو لفظ رسولؐ اللہ نہ از باب ترک امتثال است کہ مستلزم ترک ادب است بلکہ عین امتثال ادب وناشی از غایت عشق و محبت است۔

حضرت علیؑ کا لفظ رسولؐ اللہ مٹانے کے لئے آمادہ نہ ہونا نافرمانی و ترک ادب میں داخل نہیں ہے بلکہ یہ عین فرمانبرداری، ادب شناسی اور محبت و وارفتگی کا مظاہرہ تھا۔

(مدارج النبوۃ، ج ۲، ص۲۸۶)

غزوۂ خیبر

صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کے ساتویں سال کے آغاز میں پیغمبر اکرمؐ نے خیبر پر چڑھائی کا قصد کیا۔ خیبر عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی قلعہ و حصار کے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ عمالقہ میں یثرب اور خیبر نام کے دو بھائی تھے انہوں نے جہاں جہاں رہائش اختیار کی وہ جگہیں ان کے نام سے موسوم ہو گئیں۔ چنانچہ یثرب کے نام پر یثرب (مدینہ) آباد ہوا اور خیبر کے نام پر خیبر۔ خیبر مدینہ منورہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر حجاز و شام کی سرحد پر واقع ہے اور اپنے نخلستانوں اور سرسبز و شاداب کھیتوں کی وجہ سے دُور دُور تک مشہور تھا۔ یہ علاقہ یہودیوں کی آبادی پر مشتمل اور ان کی جنگی قوت کا مرکز تھا۔ انہوں نے دفاعی استحکام کے پیش نظر یہاں چھوٹے بڑے سات قلعے تعمیر کر رکھے تھے جو ناعم، کتیبہ، شق، نطاۃ، وطیح، سلالم اور قموص کے ناموں سے موسوم تھے۔ ان قلعوں میں دس ہزار

یا چودہ ہزار یہودی آباد تھے۔ جن میں وہ یہودی بھی شامل تھے جو مدینہ سے جلاوطن ہو کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور مشرکین کے ساتھ مل کر پیغمبرؐ اسلام سے جنگ کی تھی۔ اور عسکری قوت اور عددی برتری کے باوجود شکست کھائی تھی۔ جب انہیں حدیبیہ کا حال معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے قریش سے دب کر صلح کر لی تھی اور اُن کے تمام شرائط بھی مان لئے ہیں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان اب لڑنے بھڑنے سے گھبراتے لگے ہیں اور دشمن سے ٹکرانے کی اُن میں ہمت نہیں رہی ہے۔ اس غلط فہمی اور غلط تاثر نے انہیں جرأت دلائی اور مسلمانوں کی صلح پسندانہ روش کو کمزوری پر محمول کر کے اسلامی مرکز پر تاخت و تاراج کا منصوبہ بنایا تا کہ غزوۂ احزاب کی ناکامی کی خفت مٹائیں اور جلاوطنی کی ذلت کا دھبہ دھوئیں۔ یہودی اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی کثرت و قوت بڑھانے کے لئے بنی غطفان سے جو خیبر سے چھ میل کے فاصلہ پر آباد تھے معاہدہ کیا کہ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے تو انہیں خیبر کی نصف پیداوار دی جائے گی۔ بنی غطفان نے اسے منظور کیا اور ان کے چار ہزار فرد آزما ان کے پرچم کے نیچے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

جب پیغمبر اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ یہود خیبر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں تو آپ نے تادیبی کارروائی ضروری سمجھی تا کہ فتنہ انگیز طاقتوں کو کچل کر امن کو برقرار رکھا جا سکے۔ چنانچہ حدیبیہ سے مراجعت کے بعد بیس دن مدینہ میں قیام فرمایا اور سولہ سو صحابیوں کے ساتھ جن میں دو سو سوار اور باقی پیادہ تھے خیبر کی طرف روانہ ہو گئے جب لشکر اسلام نواحِ خیبر میں پہنچا تو صبح کا وقت تھا۔ اہلِ خیبر پھاوڑے اور زنبیلیں لئے کھیتوں پر کام کرنے جا رہے تھے کہ لشکر اسلام کو آتے دیکھا۔ لشکر کو دیکھتے ہی بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے اور بدحواس ہو کر اپنے قلعوں کی طرف بھاگے۔ پیغمبرؐ نے انہیں بھاگتے دیکھا تو صدائے تکبیر بلند کی اور فرمایا:-

خربت خیبر انا اذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرین۔	خیبر برباد ہو گیا۔ ہم جب کسی قوم کی سرحد پر اترتے ہیں تو جن لوگوں کو ڈرایا گیا تھا۔ ان پر کیا برا وقت پڑا۔
(صحیح مسلم۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۵۹)	

پیغمبر اسلامؐ کو چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ بنی غطفان اہلِ خیبر کے حلیف و معاہد ہیں اور وہ جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے اس لئے اہلِ خیبر اور بنی غطفان کی بستیوں کے درمیان مقام رجیع میں پڑاؤ ڈال دیا تا کہ بنی غطفان اہلِ خیبر کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب وہ مسلمانوں کی آمد کی سن گن پا کر خیبر کے ارادہ سے نکلے تو مسلمانوں کو اپنے راستہ میں حائل دیکھ کر رُک گئے اور اپنے گاؤں کی تباہی کے پیشِ نظر اپنے گھروں میں واپس چلے آئے۔ بنی غطفان کے پلٹ جانے کے بعد مسلمان خیبر کے محاصرہ کے لئے آگے بڑھے۔ یہودیوں نے عورتوں اور بچوں کو قلعہ کتیبہ میں محفوظ کر دیا۔ اور خود دوسرے قلعوں میں قلعہ بند ہو کر مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کئے۔

مسلمانوں نے مختصر جھڑپوں کے بعد چند ایک گڑھیاں فتح کر لیں مگر جس قلعہ پر فتح کا دارومدار تھا وہ ابن ابی الحقیق کا قلعہ تھا جو ایک ڈھلوان پہاڑی پر واقع تھا یہ پہاڑی قموص کہلاتی تھی جس سے یہ قلعہ بھی قموص کے نام سے مشہور ہو گیا اور یہی قلعہ تاریخ و حدیث میں قلعہ خیبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک گہری خندق کھدی ہوئی تھی اور اپنی مضبوطی و استحکام کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر تھا۔

غزوات میں سپہ سالاری کے فرائض عام طور پر پیغمبر اکرمؐ خود انجام دیتے تھے اور علمبرداری کا منصب امیرالمومنین کے سپرد کیا جاتا تھا۔ مگر پیغمبر اکرمؐ چند دنوں سے دردِ شقیقہ میں مبتلا تھے اور حضرت علیؑ آشوب چشم کی وجہ سے لشکر کے ساتھ نہ آسکے تھے اس سے کچھ لوگوں کو اپنی دھاک بٹھانے کا موقعہ مل گیا تھا اور انہوں نے خود سے علم لے کر قلعہ قموص کو فتح کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ حضرت عمر نے علم ہاتھوں میں لیا اور ایک دستۂ فوج کے ساتھ قلعہ پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھے انہوں نے ہاتھ پیر مارے مگر ان کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور ہزیمت اٹھا کر واپس پلٹ آئے۔ پھر حضرت ابو بکر علم لے کر نکلے مگر ان کے بنائے بھی کچھ بن نہ پڑی اور ناکام واپس آگئے۔ پھر حضرت عمر نے دوبارہ علم لیا مگر اس مرتبہ بھی ناکام پلٹے اور اپنی ناکامی کی خفت مٹانے کے لئے فوج کو اس ہزیمت کا ذمہ دار ٹھہرایا لیکن فوج نے ان کی قیادت کو وجہ شکست قرار دیا۔ علامہ طبری تحریر کرتے ہیں:۔

نهض من نهض معه من الناس فلقوا اهل خيبر فانكشف عمر و اصحابه فرجعوا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم يجبنه اصحابه و يجبنهم۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۳۰۰)

"حضرت عمر کچھ لوگوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور خیبریوں سے مڈ بھیڑ ہوتے ہی حضرت عمر اور ان کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے اور رسول اللہؐ کے پاس واپس چلے آئے اس موقع پر فوج والے کہتے تھے کہ عمر نے بزدلی دکھائی اور عمر کہتے تھے کہ فوج بزدل نکلی۔"

پیغمبر اکرمؐ کے دردِ سر میں کچھ کمی ہوئی تو خیمہ سے باہر تشریف لائے اور اس شکست و ہزیمت سے فوج میں بددلی پھیلی ہوئی دیکھی تو فتح کی نوید دیتے ہوئے فرمایا:۔

اما والله لاعطين الراية غدا رجلا كرارا غير فرار يحب الله ورسوله و يحبه الله ورسوله يفتح الله على يديه۔

(تاریخ خمیس۔ ج ۲۔ ص ۵۳)

"خدا کی قسم میں کل اس مرد کو علم دوں گا جو پیہم حملہ کرنے والا ہو گا اور راہِ فرار اختیار کرنے والا نہ ہو گا۔ وہ خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسولؐ اُسے دوست رکھتے ہیں اور اسی کے دونوں ہاتھوں پر اللہ فتح دے گا۔"

آنحضرتؐ نے سردارِ لشکر کے اس الزام کے باوجود کہ فوج نے کم ہمتی اور بزدلی دکھائی۔ فوج میں کوئی ردو بدل نہیں کیا بلکہ سردارِ لشکر کی تبدیلی کا اعلان فرمایا۔ اس لئے کہ فوج کا ثبات سردار کے ثباتِ قدم پر منحصر ہوتا ہے۔ جب اس کے قدم اکھڑ جائیں تو پھر فوج کے قدم جما نہیں کرتے۔ اور حدیث کے الفاظ کرار غیر فرار سے بھی صاف ظاہر ہے کہ علمبردار فوج کے قدم اکھڑے تھے ورنہ ضرورت ہی کیا تھی کہ جسے اب علم دیتے والے ہیں اس کے خصوصی صفات میں اس صفتِ عدمِ فرار کا بھی تذکرہ کرتے۔ بہر حال یہ اعلانِ نبویؐ ایک روشن آئینہ ہے جس میں تصریح بھی ہے اور تلمیح بھی۔ مدح بھی ہے اور طنز بھی۔ اس میں فاتح خیبر کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں اور پلٹ کر آنے والوں کے چہرے مہرے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عبارت کی گونج میں نوید فتح بھی ہے اور الفاظ کے پردہ میں اسبابِ شکست پر تبصرہ بھی۔ اس میں شروع میں حرفِ تنبیہ اور قسم اور قسم کے بعد لاعطین کے شروع میں لام اور آخر میں نون مشدّد تاکید بالائے تاکید کے لئے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بالکل ضرور بالضرور ایسا ہو گا۔ یہ حتم وجزم اور علم ویقین وحی ہی کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے کیونکہ اگر یہ اعلان از خود ہوتا تو پیغمبرؐ اس طرح اطمینان ویقین کے ساتھ عطائے علَم کو کل سے وابستہ نہ کرتے اور نہ اس طرح یقینی کامیابی وفتحمندی کا اعلان کرتے جب کہ انہیں حکمِ خدا یہ ہے کہ اگر وہ کسی امر کو کل سے وابستہ کریں تو حتمی طور پر یہ نہ کہا کریں کہ میں کل ایسا کروں گا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ولا تقولن لشیئٍ انی فاعل ذٰلک غدا الا ان یشاء اللہ۔	"کسی چیز کی نسبت یہ نہ کہا کرو کہ میں کل ایسا کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے تو۔"

مگر یہاں مشیت باری کے استثناء کے بغیر پورے حتم ووثوق سے فرماتے ہیں کہ میں کل ضرور بالضرور ایسا کروں گا۔ یہ اندازِ تکلم اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ عطائے علم میں قدرت کا اشارہ کارفرما تھا اور پیغمبرؐ کی زبان صرف منشائے الٰہی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اب نہ تردد وتذبذب کی گنجائش تھی اور نہ ارادۂ مشیت کے بعد استثنائے مشیت کا محل۔

حدیث کے الفاظ اگرچہ مختصر ہیں مگر ایک ایک لفظ منقبت وفضیلت کا دفتر بے پایاں اور حامل رایت کی افضلیت واولویت اور اس کی انفرادیت پر شاہد ناطق ہے۔

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مرد ہو گا۔ یہ قید اگر توضیحی ہے تو مطلب یہ ہے کہ وہ ہمت ومردانگی کے جوہر سے آراستہ ہو گا اور تیغ وسنان کے سایہ میں مردانہ وار لڑے گا۔ اور اگر احترازی ہے تو یہ دوسروں کی شجاعت ومردانگی پر ایک طنز ہو گا کہ مرد ہونا اور ہے اور مرد صورت ہونا اور ہے۔ مرد وہ جو میدانِ جنگ میں اترنے کے بعد پیچھے ہٹنا عار سمجھے اور دشمن کے مقابلہ میں نہ اس کا دل دہلے اور نہ قدم لرزے۔ اور مرد صورت وہ ہے جو

جنگ چھڑنے سے پہلے بڑے بلند بانگ دعوے کرے اور جب دشمن کا سامنا ہو تو جان بچا کر بھاگ نکلے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ کرار غیر فرار ہو گا۔ کرار کے بعد غیر فرار کہنے کی بظاہر ضرورت نہ تھی اس لئے کہ کرار کے معنی پیہم حملہ آور کے ہیں۔ اور جو پیہم حملہ کرنے والا ہو گا وہ میدان چھوڑ کر جا نہیں سکتا مگر یہ کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس فرمائی کہ علم کی آس لگانے والے خود اپنا جائزہ لے لیں کہ ان کے قدم میدان جنگ میں ڈگمگائے تو نہیں۔ اگر قدم اُکھڑ چکے ہیں تو وہ اپنے دلوں کو علم کی آرزو سے خالی رکھیں اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔" یہ محبت و دوستی ہی کا کرشمہ ہے۔ کہ انسان اللہ کی راہ میں ہر مصیبت خوشی خوشی جھیل لیتا ہے اور جتنا یہ جذبۂ محبت زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی جوشِ عمل زیادہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص محبت کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کی ادنےٰ خوشنودی اور اس کے دین کی سربلندی کی خاطر باطل قوتوں سے ٹکرانا، خطروں میں پھاند پڑنا یا جان دے دینا اس کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر دل اس جذبۂ عشق و شیفتگی سے خالی ہو تو نہ قدموں میں ثبات آتا ہے اور نہ میدانِ جنگ کی کڑیاں جھیلنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ بھی اس کو دوست رکھتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس دوستی کا جو بندے کو خدا اور رسولؐ سے ہوتی ہے اس لئے کہ جب اس کے اعمال اللہ کی دوستی و رضا طلبی کی خاطر ہیں تو پھر اللہ کی خوشنودی اور دوستی سے سرفرازی بھی یقینی ہے اور پھر اس موقع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو شجاعت وہ صفت ہے جسے اللہ خصوصی طور پر دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ شجاعت کو دوست رکھتا ہے اگرچہ وہ سانپ کے مارنے ہی سے کیوں نہ ظاہر ہو۔ جب یہ معمولی مظاہرۂ شجاعت اللہ کی دوستی کا باعث ہو سکتا ہے تو وہ شجاعت جس کا اظہار دشمنانِ خدا و رسولؐ کے مقابلہ میں ہو اُسے اللہ کیونکر دوست نہ رکھے گا اور قرآن بھی گواہی دیتا ہے کہ دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جرأت و ہمت اور ثباتِ قدم بندے کو اللہ کا محبوب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیل اللہ صفاً کانھم بنیان مرصوص۔	"اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں پرا باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

پانچویں صفت یہ ہے کہ خدا اس کے ہاتھوں پر قلعہ فتح کرے گا۔" جب ثباتِ قدم ہو تو اللہ کی تائید بھی شاملِ حال ہوتی ہے اور تائیدِ الٰہی کے نتیجہ میں فتح و کامرانی بھی ضروری ہے۔ یہ فتح اتنی یقینی

تھی کہ حدیبیہ سے پلٹتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کو اس کی بشارت ان لفظوں میں دی جا چکی تھی: واثابھم فتحاً قریباً۔ انہیں جلد ہی فتح دی جائے گی۔" اسی لئے پیغمبرؐ کے الفاظ یفتح اللہ علی یدیہ۔ خدا اس کے ہاتھ پر فتح دے گا" فتح وظفر کو بازگشت کی طرح لے کر پلٹیں گے۔ اور پیہم ہزیمتوں کے بعد فتح کا پرچم فضائے خیبر پر لہرائے گا۔ اللہ نے فتح کی خوشخبری دی اور پیغمبرؐ نے علَم لینے والے کے ہاتھوں پر خیبر کشائی کی پیشینگوئی کی۔ اب جس کے ہاتھوں پر فتح ہوگی وُہ تنہا اس کی فتح نہ ہوگی بلکہ اسلام کی بھی فتح ہوگی اور پیغمبرؐ کی بھی کیونکہ اس فتح کے نتیجہ میں قرآنی آیت اور پیغمبرؐ کی پیشین گوئی کی صداقت ظہور میں آئی۔

پیغمبر اکرمؐ کے اس اعلان کے بعد ہر زبان پر اس کی گونج سنائی دینے لگی اور اسی کے تذکرے اور چرچے ہونے لگے۔ ہر ایک کو یہ انتظار کہ دیکھئے کل علَم کس کو ملتا ہے۔ صحابہ میں کوئی نمایاں شخصیت ایسی نہ تھی جسے یہ توقع نہ رہی ہو کہ کل علَم اسی کو ملے گا بلکہ وُہ افراد بھی کم امیدوار نہ تھے جو علَم لے کر قسمت آزمائی کر چکے تھے ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

رجا کل واحد منہم ان یکون صاحب ذالک (تاریخ کامل ج۲ صـ۱۴۹)	قریش میں سے ہر ایک یہ اُمید رکھتا تھا کہ وُہی علمدار ہوگا"

اگر انہوں نے الفاظِ حدیث پر غور کیا ہوتا اور اپنے ماضی کو پیشِ نظر رکھا ہوتا تو ایک ایک لفظ شمعِ امید کی بھڑکتی ہوئی لَو کو بجھانے کے لئے کافی تھا۔ مگر تفوّق پسند انسانوں کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ امتیاز طلبی کے موقع پر پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا کرتے خواہ کامیابی کی اُمید کتنی ہی موہوم کیوں نہ ہو۔ حضرت علیؑ کی طرف سے تو انہیں اطمینان تھا کہ وُہ میدان میں نہیں جا سکتے کیونکہ آشوبِ چشم کی وجہ سے وُہ قدم رکھنے کی جگہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کو یہ کہہ کر اُمید دلاتے کہ علیؑ کی طرف سے مطمئن رہو۔ اُن کی آنکھیں دُکھ رہی ہیں وُہ تو علم لے کر میدان میں جانے سے رہے۔ اب ہم ہی میں سے کسی ایک کو عَلم دیا جائے گا۔ اِدھر یہ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اُدھر حضرت علیؑ سے پیغمبرؐ کے اس اعلان کا ذکر کیا گیا تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت" بارِ الٰہا جسے تو عطا کرے اُسے کوئی محروم نہیں کر سکتا اور جسے تو محروم رکھنا چاہے کوئی عطا نہیں کر سکتا"

کل کے انتظار میں صحابہ نے رات کروٹیں لے لے کر گزاری۔ صبح ہوئی تو پیغمبرؐ کے خیمہ کے سامنے جمع ہوئے اور درِ خیمہ پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ محمد ابن اسمٰعیل بخاری رقمطراز ہیں:۔

نغدوا علی رسول اللہ کلھم یرجون ان یعطاھا۔	وہ صبح ہی صبح رسول اللہ کے پاس جمع ہو گئے اور ہر ایک یہ اُمید لگائے ہوئے تھا کہ علم اُسی

کو ملے گا" (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۵)

پیغمبر اکرمؐ نمازِ صبح سے فارغ ہو کر ہاتھوں پر سفید پرچم لئے ہوئے خیمہ سے باہر تشریف لائے۔ پرچم پر نظر پڑتے ہی لوگوں میں ہلچل مچی۔ کچھ لوگ صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے کسی نے گردن بلند کی اور کوئی گھٹنوں کے بل اُونچا ہوا تاکہ پیغمبرؐ کی نظر ان پر پڑ سکے۔ یوں تو ہر ایک عَلَم لینے کے لئے بے چین اور فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لئے بے قرار تھا مگر کچھ لوگوں کی بے چینی اس حد تک بڑھی کہ تاریخ میں اُن کے نام آئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ان میں سے ایک حضرت عمر ہیں جو خود کہتے ہیں:۔

فما احببت الامارة قبل یومئذ	مجھے اس دن سے پہلے کبھی سرداری کی خواہش نہیں
فتطاولت لہا واستشرفت رجاء	ہوئی مگر اس دن میں اونچا ہو کر اور گردن لمبی کر کے
ان یدفعہا الی (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۸۰)	اُمید کر رہا تھا کہ عَلَم مجھے دیں گے"

بریدہ اسلمی جو غزوۂ خیبر میں موجود تھے اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت عمر اور حضرت ابو بکر دونوں کے نام لئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

فلما کان من الغد تطاول لہا	جب دوسرا دن ہوا تو ابو بکر اور عمر دونوں نے عَلَم
ابو بکر و عمر۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۹۳)	کے لئے گردنیں بلند کیں"

سعد ابن ابی وقاص بیان کرتے ہیں:۔

جئت فبرکت بحذاء النبیؐ وقمت	میں پیغمبرؐ کے بالمقابل پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھا
ووقفت بین یدیہ (تاریخ خمیس ج ۲ ص ۵۴)	اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا"

پیغمبر اکرمؐ سے کسی کے شجاعانہ کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے نہ تھے کہ کسی کے گردن بلند کرنے یا گھٹنوں کے بل اُونچا ہونے سے متاثر ہوتے یا کسی کو عمدًا نظر انداز کر دیتے یا نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے بھول جاتے۔ آپ نے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا کہ علیؑ کہاں ہیں۔ کسی کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ علیؑ کا نام لیا جائے گا۔ ہر طرف سے شور اٹھا کہ ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ فرمایا کسی کو بھیجو اور انہیں بلاؤ۔ چنانچہ سلمہ ابن اکوع گئے اور انہیں لے کر آئے۔ آنحضرتؐ نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اور فرمایا اللھم اذھب عنہ الحر والبرد وانصرہ علیٰ عدوہ۔ بارِ الٰہا انہیں گرمی اور سردی کے اثرات سے

---

[۱] اس دعائے پیغمبرؐ کے چند معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر گرمی ہو تو ان پر گرمی کا اثر نہ ہو اور سردی ہو تو سردی کا اثر نہ ہو اس معنی کی تائید حضرت علیؑ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ فما وجدت حرا ولا بردا منذ یومئذ" اس (باقی اگلے صفحہ پر)

محفوظ رکھ کر اور دشمن کے مقابلہ میں ان کی نصرت و امداد فرما۔" لعاب دہن رسولؐ نے اکسیر شفا کا کام کیا اسی وقت آشوب چشم جاتا رہا اور سوزش و تکلیف ختم ہوگئی اس موقع پر حسان ابن ثابت نے اظہار عقیدت کے طور پر یہ اشعار پڑھے:۔

وکان علی ارمد العین یبتغی — دواء فلما لم یحس مداویا
رمد آلودہ آنکھیں تھیں علیؑ کی جنگ خیبر میں — دوائے چشم مضمر تھی پیمبر کے لب تر میں
شفاہ رسول اللہ منہ بتفلۃ — فبورک مرقیا و بورک راقیا
بنا آب دہن اکسیر، آنکھوں میں جلا آئی — مبارک تھی شفایابی مبارک تھی مسیحائی
قال ساعطی الرایۃ الیوم صارما — کمیا محبا للرسول موالیا
کہا اس کو علم دوں گا جو شمشیر دو پیکر ہے — دلیر وصف شکن جانباز و شیدائے پیمبر ہے
یحب الٰہی والالہ یحبہ — بہ یفتح اللہ الحصون الاوابیا
وہ سرمست ولائے داور و محبوب داور ہے — وہی قلعہ کشاؤ فاتح درہائے خیبر ہے
فاصفی بہا دون البریہ کلہا — علیا و سماہ الوزیر المواخیا
زمانہ بھر میں اسکو ہی نبی نے یہ شرف بخشا! — کہ اپنی جانشینی اور اخوت کا دیا تمغا!

جب حضرت علیؑ کی آنکھیں روشن ہوگئیں تو پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھ سے زرہ پہنائی تلوار کمر میں لگائی اور م دے کر خیبر فتح کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے ہوئے رخ موڑ کر پیغمبر اکرمؐ

(بقیہ حاشیہ) دن کے بعد نہ مجھے گرمی کا احساس ہوا اور نہ سردی کا۔" دوسرے یہ کہ سردی و گرمی کا جتنا احساس دوسروں کو ہوتا ہے اتنا احساس انہیں نہ ہو نہ یہ کہ گرمی و سردی کا احساس کلیتہً جاتا رہے۔ اس معنی کی تائید ہارون ابن عنترہ کی روایت سے ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کو قصر خورنق میں دیکھا آپ ایک ہلکا کمبل اوڑھے ہوئے سردی سے ہانپ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ بیت المال میں آپ کا حق ہے آپ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ فرمایا یہ کمبل مدینہ سے لے کر آیا تھا اس کے ہوتے ہوئے مجھے بیت المال سے لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ آنحضرتؐ نے یہ دعا آشوب چشم کے موقع پر فرمائی اور آشوب چشم عموماً شدید گرمی کے اثر سے ہوتا ہے لہذا بعید نہیں کہ یہ مقصد ہو کہ علیؑ گرمی و سردی کے اثرات بد سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ اس دعا کے بعد کبھی آپ کی آنکھیں دکھنے میں نہیں آئیں اور گرمی و سردی کا احساس نہ ہونے میں کوئی خاص خوبی کا پہلو بھی تو نہیں ہے بلکہ خوبی تو یہ ہے کہ احساس کے ہوتے ہوئے اس سے چنداں متاثر و متاذی نہ ہوا جائے۔ اور اس مفہوم کو سامنے رکھ کر پہلی اور دوسری روایت میں جمع آوری کی بھی صورت نکل سکتی ہے۔"

سے پوچھا کہ کب تک لڑوں؟ فرمایا جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لیں۔ اگر تمہارے ذریعہ ایک شخص بھی راہِ حق پر آ گیا تو وہ تمہارے لئے سرخ بالوں والے اونٹوں سے بہتر ہوگا۔ حضرتؑ دوڑتے ہوئے میدان کی طرف آئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ذرا ٹھہریئے ہم بھی ساتھ ہولیں مگر حضرتؑ نے جوشِ شجاعت میں توقف نہ کیا اور قلعہ قموص کے قریب پہنچ کر رُکے اور عَلم سنگلاخ زمین میں گاڑ دیا۔ ایک یہودی نے قلعہ کے اُوپر سے یہ منظر دیکھا تو متحیر ہو کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہا میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ اس یہودی نے حضرتؑ کے تیور دیکھے تو کہا غلبتم یامعشر یھود۔ اے گروہ یہود اب تمہاری شکست یقینی ہے۔" یہودیوں کو قلعہ قموص کی مضبوطی پر بڑا ناز تھا اور پہلے پرچم برداروں کی ناکامی سے ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ مگر اپنی ہی جماعت کے ایک آدمی سے یہ حوصلہ شکن جواب سنے تو ان میں کھلبلی مچ گئی اور دلوں پر رعب چھا گیا۔ اب لشکرِ اسلام میں سے کچھ لوگ بھی حضرتؑ کے پاس پہنچ گئے اور قلعہ کے سامنے پرا جما کر کھڑے ہوگئے۔ سردار قلعہ مرحب کا بھائی جو اس سے پہلے بھی میدان میں نکل چکا تھا ایک دستہ فوج لے کر قلعہ سے باہر آیا اور ایک دم حملہ کرکے دو مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ حضرتؑ نے بڑھ کر اس پر حملہ کیا اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مرحب نے جب دیکھا کہ اس کا بھائی مارا جا چکا ہے تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے زرہ پر زرہ پہنی، سر پر پتھر کا ترشا ہوا خود رکھا اور دو تلواریں اور تین بھال کا نیزہ لے کر قلعہ سے باہر آیا اور رجز پڑھتے ہوئے مبارز طلب ہوا:۔

قد علمت خیبر انی مرحب　　　　شاکی السلاح بطل مجرب

"اہلِ خیبر جانتے ہیں کہ میں مرحب ہوں جو ہتھیار بند بہادر اور آزمودہ کار ہے۔"

مرحب بڑا تنومند اور شہزور تھا اس کے للکارنے پر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس کے مقابلہ کے لئے نکلتا۔ دیار بکریؒ نے لکھا ہے:۔

لم یقدر احد فی الاسلام ان　　　　مسلمانوں میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ جنگ

یقاومه فی الحرب (تاریخ خمیس ج۲ ص۵)　　　　میں اس کا مدمقابل ہوتا۔"

جناب امیرؑ نے اس کا یہ رجز سنا تو یہ رجز پڑھتے ہوئے اس کے مقابلہ کے لئے نکلے:۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　　　ضرغام اجام و لیث قسورہ

"میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے میں شیرِ نر اور اسد بیشۂ شجاعت ہوں۔"

عبل الذراعین غلیظ القصرہ　　　　کلیث غابات کریھه المنظرہ

"جس کی کلائیاں مضبوط اور گردن موٹی ہے جیسے جنگل کا وہ شیر جو دیکھنے میں ڈراؤنا ہو۔"

اضربکم ضربا یبین الفقرہ   واترك القرن بقاع جزرہ

میں تم پر ایسا وار کروں گا جو جوڑ بند کو توڑ دے اور حریف کو درندوں کا لقمہ بننے کیلئے چھوڑ دے۔"

اضرب بالسیف جموع الکفرہ   ضرب غلام ماجد حزورہ

میں ایک باعزت اور طاقت ور جوان کی طرح کفار کی صفوں پہ تلوار چلاؤں گا۔"

اکیلکم بالسیف کیل السندرہ

اور تمہیں تلوار سے وسیع پیمانے پر قتل کروں گا۔"

مرحب نے آگے بڑھ کر حضرت پر تلوار کا وار کرنا چاہا مگر آپ نے اسے موقع نہ دیا اور پھر تاک کر تلوار اس کے سر پر ماری یہاں تک کہ تلوار خود کو کاٹتی اور سر کی ہڈی کو توڑتی ہوئی جبڑوں تک اُتر آئی۔ مرحب زمین پر گرا اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ مرحب کے مارے جانے سے یہودیوں میں بددلی پیدا ہوگئی اور جب مرحب کے علاوہ چند اور نامور شجاع بھی حضرت کے ہاتھ مارے گئے تو ان میں بھاگڑ پڑ گئی اور سب کے سب قلعہ کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت لڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک یہودی نے آپ کے ہاتھ پر ضرب لگائی جس سے سپر چھوٹ کر گر پڑی۔ آپ نے اعجازی قوت وطاقت سے ایک دروازہ اٹھا کر اسے سپر بنا لیا۔ یہ دروازہ اتنا وزنی تھا کہ بعد میں آٹھ آدمیوں نے مل کر اُسے اٹھانا چاہا مگر ان کی کوشش ناکام رہی۔ چنانچہ ابورافع کہتے ہیں:۔

فلقد رأیتنی فی نفر سبعۃ معی انا ثامنھم نجھد علی ان نقلب ذلك الباب فما نقلبہ۔

میرے ہمراہ سات آدمی تھے اور میں آٹھواں تھا۔ ہم سب نے پوری کوشش کی کہ اس دروازہ کو پلٹیں مگر ہم اسے پلٹ نہ سکے۔

(سیرت ابن ہشام۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۵)

حضرت عمر کو بھی اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت علیؑ سے کہا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں پر بڑا بوجھ اٹھایا۔ حضرت نے فرمایا کہ:۔

ما کان الا مثل جنتی التی فی یدی

وہ مجھے اپنی سپر سے زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوا۔"

(مناقب۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۴۴)

یہودی حضرتؑ کے اس غیر معمولی مظاہرۂ قوت سے متاثر ہو کر قلعہ کے اندر داخل ہوگئے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر قلعہ کے آہنی در کو جھٹکا دیا اور اُس کے دونوں پٹ اکھڑ کر آپ کے ہاتھوں میں آگئے اور فتح نے جھوم کر آپ کے دونوں قدم چوم لئے۔ یہ حیرت انگیز قوت، قوتِ روحانیہ ہی کا کرشمہ ہوسکتی ہے۔ ورنہ

عام انسانی قوت و طاقت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حضرت خود فرماتے ہیں:۔

ما قلعت باب خیبر بقوت جسمانیہ	میں نے خیبر کا دروازہ اپنی جسمانی قوت سے نہیں
ولکن قوت الھیۃ (تاریخ خمیس ج ۲ ص ۵۲)	اکھاڑا بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا ہے۔"

اسلامی خدمات کے سلسلہ میں اگر کوئی اہم خدمت انجام دیتا ہے تو اس سے انکار کرنا یا اُسے دوسرے کی طرف منسوب کر دینا اخلاقی نقطۂ نظر سے انتہائی سنگین جرم ہے مگر اقتدار کے زیر اثر یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور واقعات میں تحریف و تبدل سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ خیبر کے سلسلہ میں بھی ناکام کوشش کی گئی ہے اور جابر ابن عبداللہ انصاری کے نام سے جو خیبر میں موجود نہ تھے، یہ روایت گڑھ لی گئی ہے کہ مرحب، محمد ابن مسلمہ انصاری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ حالانکہ قریب قریب تمام مستند تاریخیں اس امر کی شاہد ہیں کہ مرحب حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ محمد ابن مسلمہ کا نام اس سے پہلے شجاعانہ کارناموں کے سلسلہ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر ان لوگوں کے زمرہ میں ضرور آتا ہے جنہوں نے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور علانیہ مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ غالباً اسی انکارِ بیعت اور انحراف کے صلہ میں قاتلِ مرحب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اگر محمد ابن مسلمہ نے مرحب کو قتل کیا تھا تو پھر فاتح خیبر بھی اسی کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قلعۂ قموص قتل مرحب کے نتیجہ میں فتح ہوا لہذا جو قاتلِ مرحب ہوگا وہی فاتح خیبر قرار پائے گا اور درصورتیکہ محمد ابن مسلمہ کو فاتح خیبر تسلیم کر لیا جائے تو حدیث پیغمبرؐ یفتح اللہ علیٰ یدیہ "خدا اس کے ہاتھوں پر فتح خیبر دے گا" کی حیثیت کیا باقی رہ جاتی ہے جب کہ بالاتفاق یہ ارشاد حضرت علیؑ کے بارے میں ہے۔ کیا اس سے تکذیبِ رسولؐ لازم نہ آئے گی کہ پیغمبرؐ جس کے ہاتھ پر فتح کی نوید دیں وہ تو فاتح نہ بنے اور اس کے بجائے دوسرا فاتح ہو جائے۔

قبائل یہود باوجودیکہ پیغمبرؐ اکرم سے پُرامن رہنے کا معاہدہ کر چکے تھے مگر جب بھی انہیں موقع ملتا تخریبی کارروائیوں سے باز نہ آتے۔ یہاں تک کہ انہیں مدینہ سے جلاوطن کرنے کی نوبت آئی۔ مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی ان کی سرگرمیوں میں کمی نہ آئی اور اسلام کی بربادی پر تلے رہے۔ اب اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ ان دشمنانِ دین کو قرارِ واقعی سزا دے کر ان کی جارحانہ حرکتوں اور امن سوز سازشوں کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے تاکہ آئندہ قیامِ امن اور نشرِ اسلام میں سدِّ راہ نہ ہوں۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے یہ اقدام عمل میں آیا اور اس کے نتیجہ میں ۱۵ مسلمان شہید ہوئے اور ۹۳ یہودی مارے گئے اور کچھ عورتیں اسیر ہوئیں جن میں حی ابن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھیں جو آزاد ہونے کے بعد رسولِ خدا کے حرم میں داخل ہوئیں اور باقی یہودیوں کو اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ خیبر کی زمینوں پر کاشتکار کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں

گے اور نصف حصہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

خیبر کا علاقہ بڑا سرسبز و شاداب تھا اور اہلِ حجاز کی غذائی ضروریات کا بیشتر حصہ یہیں سے فراہم ہوتا تھا جب یہ علاقہ مفتوح ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اُن کے لئے معاشی وسعت کی راہیں کھل گئیں اور وُہ مہاجرین جو مکہ سے نکلنے کے بعد فقر و افلاس سے دوچار تھے نہ صرف معاشی اعتبار سے آسودہ ہو گئے۔ بلکہ زمینوں اور جاگیروں کے مالک بن گئے۔ عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں:۔

ماشبعنا حتی فتحنا خیبر۔ "فتح خیبر کے بعد ہمیں شکم سیر ہو کر کھانے کو ملا"

(صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۶۰۹)

ام المؤمنین حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

لما فتحت خیبر قلنا الان نشبع من التمر۔ (صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۶۰۹) "جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا کہ اب ہم شکم سیر ہو کر کھجوریں کھا سکیں گے"

بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ خیبر کی پیداوار میں سے ازواجِ رسولؐ میں سے ہر زوجہ کو اسی[1] وسق خرما اور بیس وسق جو سالانہ ملتا تھا۔

اس غزوہ میں اگرچہ پیغمبرؐ کے ہمراہ سواروں اور پیادوں کا جم غفیر تھا مگر جس کے زورِ بازو سے یہ مہم سر ہوئی وہ فاتح خیبر علی ابن ابی طالب تھے۔ اگرچہ اور لوگ بھی علم لے کر فتح کے ارادہ سے نکلے تھے مگر انہیں شکست و ہزیمت ہی سے دوچار ہونا پڑا تھا اور ان پے در پے ہزیمتوں کے بعد پیغمبرؐ اکرم کا اعلان، اور حاملِ علم کے خصوصی اوصاف کا بیان، اور آشوبِ چشم کا غیر متعارف طریق سے علاج یہ بتاتا ہے کہ یہ شرف علیؑ کے لئے اٹھا رکھا گیا تھا جنہوں نے اپنی خداداد قوت و طاقت سے خیبریوں کو شکست فاش دے کر اسلام کی سربلندی کا سامان کیا اور یہودی سرمایہ داروں کو ایک باج گزار کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور جو لوگ وفاداری کے بعد بدعہدی کرتے اور مخالف طاقتوں سے ساز باز کر کے تخریبی کارروائیوں پر اتر آتے ہیں آخر کار اُن کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

---

[1] ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع تین سیر کا۔ لہذا ہمارے ہاں کے مروجہ اوزان کے لحاظ سے تین سو ساٹھ من خرما اور نوے من جو ہوں گے۔ ۱۲

اراضیٔ فدک

فدک خیبر کے مضافات میں ایک زرخیز و شاداب بستی تھی جہاں پہلے پہل فدک ابن حام نے ڈیرے ڈالے اور اسی کے نام پر اس بستی کا نام فدک قرار پایا۔ خیبر کی طرح یہاں بھی یہود آباد تھے جنہوں نے آبپاشی کے وسائل مہیا کر کے افتادہ زمینوں کو آباد کیا اور باغوں، نخلستانوں اور لہلہاتے کھیتوں سے اُسے جاذبِ نظر بنا دیا۔ یاقوت حموی نے لکھا ہے:۔

فیها عین فوارة ونخیل کثیرة۔ (معجم البلدان۔ ج ۱۴۔ صفحہ ۳۴۳)

اس قریہ میں اُبلتے چشمہ ہائے آب اور کثیر تعداد میں نخلستان تھے۔

فتح خیبر کے بعد خیبر کے پڑوس میں بسنے والوں کے دلوں پر مسلمانوں کی قوت و طاقت کا ایسا رعب بیٹھا کہ انہوں نے بغیر جنگ کے اطاعت قبول کر لی۔ اس موقع پر اہلِ فدک نے بھی اپنا بچاؤ اسی میں سمجھا کہ اراضیٔ فدک کی ملکیت سے دستبردار ہو کر پیداوار کے آدھوں آدھ پر مصالحت کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو پیغام بھیجا کہ ہم لڑنا بھڑنا نہیں چاہتے بلکہ جن شرائط پر اہلِ خیبر کو ان کی زمینوں پر کھیتی باڑی کی اجازت دی گئی ہے ہمیں بھی انہی شرائط پر فدک کی زمینوں پر زراعت کی اجازت دی جائے۔ آنحضرتؐ نے اسے منظور فرمایا اور حضرت علیؑ کو ان کے سردار یوشع ابن نون کے پاس تفصیلات طے کرنے کے لئے بھیجا۔ دونوں فریق میں گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ فدک کے باشندے زمینوں کی ملکیت سے دستبردار ہو کر بطورِ کاشتکار کام کریں گے اور نصف پیداوار خود لیں گے اور نصف پیداوار رسولؐ اللہ کو دیں گے۔ اس مصالحت کے نتیجہ میں اراضیٔ فدک رسولِ خداؐ کی ملکیت قرار پائیں۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے جو علاقے مسلمانوں کی لشکر کشی کے نتیجہ میں فتح ہوتے تھے ان میں مسلمانوں کے حقوق ہوتے تھے۔ اور جو لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہوتے تھے وہ رسولِؐ خدا کی ملکیت قرار پاتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

وما افاء الله علی رسوله منهم فما اوجفتم علیه من خیل ولا رکاب ولکن الله یسلط رسله علی من یشاء والله علی کل شیئٍ قدیر۔

"جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو ان لوگوں سے دلوایا تم نے اس پر اونٹ اور گھوڑے نہیں دوڑائے تھے لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

جو علاقے مسلمانوں کی چڑھائی کے نتیجہ میں مفتوح ہوتے ہیں انہیں غنیمت کہا جاتا ہے اور جو جنگ و قتال کے بغیر حاصل ہوتے ہیں انہیں شرعی اصطلاح میں فے اور انفال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ فدک بھی مالِ فے تھا۔

جو مسلمانوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے بغیر مفتوح ہوا تھا۔ اس لئے یہ خالص رسولؐ اللہ کی ملکیت تھا جس میں مسلمانوں کا کوئی حق نہ تھا۔ علامہ طبریؒ نے تحریر کیا ہے:۔

کانت فدک خالصة لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہم لم یجلبوا علیہا بخیل ولا رکاب۔	فدک خالص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا۔ کیونکہ اس پر نہ مسلمانوں نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔"

(فتوح البلدان۔ صـ۳۰)

بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

کانت فدك لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہ لم یوجف المسلمون علیہا بخیل ولا رکاب۔	فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیتِ خاصہ تھا۔ کیونکہ اس پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ۔"

(فتوح البلدان۔ صـ۳۰)

یاقوت حموی نے لکھا ہے:۔

افاء اللہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی سنة سبع صلحا۔	یہ گاؤں خداوندِ عالم نے پیغمبر اکرمؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سات ہجری میں صلح کے نتیجہ میں دلوایا۔"

(معجم البلدان۔ ج ۱۴۔ صـ۲۳۸)

قرآن مجید کے واضح ارشاد اور علماء ملت کی تصریحات کے بعد اس میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ فدک رسولؐ اللہ کی ملکیتِ خاصہ تھا جس میں انہیں ہر طرح کا حقِ تصرف حاصل تھا چنانچہ اسی حقِ تصرف کی بناء پر آپ نے یہ گاؤں حضرت فاطمہ زہراؑ کو اپنی زندگی میں ایک دستاویز کے ذریعہ ہبہ فرما دیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے تحریر کیا ہے:۔

اخرج ابن مردویة عن ابن عباس قال لما نزلت وآتِ ذا القربیٰ حقہ اعطی رسول اللہ فاطمة فدکا۔	ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جب آیہ "اے رسولؐ اپنے قرابتداروں کو ان کا حق دے دو۔" نازل ہوا تو آنحضرتؐ نے فدک فاطمہؑ کو عطا کر دیا۔"

(تفسیر درمنثور۔ ج ۴۔ صـ۱۷۷)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تحریر کرتے ہیں:۔

اخرج الطبرانی وغیرہ عن ابی سعید	طبرانی وغیرہ نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے

الخدری قال لما نزلت وآت ذا	"جب آیہ" اے رسول اپنے قرابتداروں کو اُن کا
القربیٰ حقہ دعا رسول اللہ صلی	حق دے دو" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؑ
اللہ علیہ وسلم فاطمۃ فاعطاھا	کو طلب کیا اور فدک انہیں دے دیا"
فدک" (تفسیر مظہری۔ ج ۵۔ ص ۴۳۳)	

آنحضرتؐ کی زندگی تک فدک جناب سیدہؑ کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ چنانچہ امیرالمومنینؑ نے اپنے مکتوب میں اس قبضہ و تصرف کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

کانت فی ایدینا فدک من کل ما	اس آسمان کے سایہ تلے لے دے کر ایک فدک ہمارے
اظلتہ السماء فشحت علیھا نفوس	ہاتھوں میں تھا۔ اس پر بھی کچھ لوگوں کے مُنہ سے
قوم وسخت عنھا نفوس قوم آخر	رال ٹپکی اور دوسرے فریق نے اس کے جانے کی پروا
ونعم الحکم اللہ۔ (نہج البلاغہ)	نہ کی۔ اور بہترین فیصلہ کرنے والا اللہ ہے"

لیکن وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد چند "ملکی مصالح" کے ماتحت اسے حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ جناب سیدہ نے حکومت کے خلاف مرافعہ کیا مگر ان کا دعویٰ ہبہ مسترد کر دیا گیا اور فدک کے تمام حقوق حکومت کے پائے نام ہو گئے یہ امر تو "مسئلہ فدک" کے ذیل میں تحریر ہو گا کہ کون حق بجانب تھا اور کون حق بجانب نہ تھا۔ اور کن وجوہ کی بنا پر یہ دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ مگر یہ کہاں کا انصاف تھا کہ جس امر کے خلاف مرافعہ تھا تصفیہ کا اختیار وہ خود سنبھال لے اور مدعا علیہ ہی مسند قضا پر بیٹھ کر مقدمہ فیصل کر دے۔

فیک الخصام وانت الخصم والحکم

اس عدل گستری و انصاف کیشی کے نتیجہ میں وہی فیصلہ ہونا تھا جو ہوا اور جناب سیدہؑ نہ ہبہ کے اعتبار سے فدک کی مالک تسلیم کی گئیں اور نہ وراثت کے لحاظ سے۔ اس احساسِ محرومی نے انہیں اس حد تک متاثر کیا کہ نمائندہ حکومت سے مقاطعہ و ترکِ کلام کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اس کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔

فتح مکہ

حدیبیہ میں قریش اور اہلِ اسلام کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ دونوں فریق دس برس تک جنگ و قتال سے کنارہ کش رہیں گے اور دونوں کے حلیف بھی اس معاہدہ کی پابندی کریں گے اور اگر کسی ایک فریق یا اس کے حلیف نے خلاف ورزی کی تو دوسرا فریق معاہدہ صلح کا پابند نہ رہے گا۔ مسلمانوں کے حلیف، بنو خزاعہ

اور قریش کے حلیف بنو بکر میں پہلے سے چپقلش چلی آ رہی تھی اور دونوں آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے مگر قریش اور مسلمانوں کی باہمی جنگوں کی وجہ سے اُن کی آپس کی لڑائیاں کچھ عرصہ سے ملتوی تھیں اور دونوں اپنے اندرونی اختلافات کو نظر انداز کر کے اسلام کے مقابلہ میں متحد ہو چکے تھے۔ جب قریش اور اہل اسلام میں ایک طویل عرصہ کے لئے معاہدۂ صلح ہو گیا تو قریش کے حلیف بنو بکر نے ایک رات بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور ان کا ایک آدمی مار ڈالا۔ دبی ہوئی رنجشیں پھر سے اُبھر آئیں اور دونوں میں پھر سے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اگرچہ بنو خزاعہ بنو بکر سے نپٹنے کے لئے کافی تھے مگر قریش نے بنو بکر کو ہتھیار بہم پہنچائے اور عکرمہ ابن ابی جہل، صفوان ابن امیہ اور سہیل ابن عمرو جس نے قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے صلحنامہ پر دستخط کئے تھے بنو بکر کے ساتھ ہو کر جنگ کرتے رہے۔ بنو خزاعہ نے اپنی جانوں کے بچاؤ کے لئے خانہ کعبہ میں پناہ لی۔ مگر سرزمین حرم بھی اُن کے خون سے رنگین کر دی گئی۔ جب بنو خزاعہ سے کچھ نہ بن پڑا تو ان میں سے چالیس آدمی عمرو ابن سالم کی سربراہی میں مدینے آئے اور پیغمبر اکرمؐ کو قریش کی بدعہدی و پیمان شکنی کی اطلاع دی اور اپنی تباہی و بربادی کا حال سنایا۔ آنحضرتؐ نے بنو خزاعہ کی فریاد و زاری پر نصرت کا وعدہ فرمایا اور قریش کو پیغام بھجوایا کہ وہ بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کریں یا بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ اور اگر دونوں باتوں میں سے کوئی بات قبول نہ کریں تو پھر معاہدۂ صلح ختم سمجھیں۔ قریش نے ان دونوں باتوں کے ماننے سے انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نہ خون بہا ادا کریں گے اور نہ بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہوں گے۔ قریش کی اس شوریدہ سری کے نتیجہ میں آنحضرتؐ نے اعلان فرما دیا کہ اب ہم سے اور قریش سے کوئی معاہدہ نہیں رہا۔

پیغمبرؐ کے اس اعلان سے قریش میں کھلبلی مچ گئی اور عہد شکنی کے ہولناک نتائج اُن کی نظروں کے سامنے آ گئے انہوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کا مقابلہ اُن کے بس سے باہر ہے معاہدہ صلح کو برقرار رکھنا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا تا کہ وہ حکمتِ عملی سے کام لے کر معاہدۂ صلح کی تجدید کرائے۔ جب ابوسفیان مدینہ میں آیا تو سیدھا اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس گیا جو پیغمبر اکرمؐ کے حرم میں داخل تھیں۔ ام حبیبہ نے اپنے باپ کو آتے دیکھا تو رسولؐ خدا کا بستر تہہ کر دیا۔ ابوسفیان نے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیا میں اس بستر کے قابل نہیں یا یہ بستر میرے لائق نہیں؟ ام حبیبہ نے کہا یہ رسولؐ خدا کا بستر ہے اور مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ تم اس بستر پر بیٹھو جب کہ تم مشرک و ناپاک ہو۔ ابوسفیان منہ بسور کر واپس ہوا اور رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر معاہدۂ صلح کی تجدید کی خواہش کی۔ مگر آنحضرتؐ نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا اور سنی ان سنی کر دی۔ وہ کچھ دیر ٹھہرا اور پھر اٹھ کر حضرت ابوبکر کے پاس آیا اور کہا کہ آپ رسولؐ خدا سے ہماری سفارش کیجئے۔ حضرت ابوبکر نے اپنی معذوری کا اظہار فرمایا۔ پھر حضرت عمر کے پاس آیا اور ان سے بھی کہا سنا مگر انہوں

نے بھی اُسے کوئی امید افزا جواب نہ دیا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو حضرت علیؑ کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ آپ پیغمبرؐ سے ہماری سفارش کر دیجئے کہ وہ معاہدۂ صلح کو برقرار رکھیں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ پیغمبرؐ اکرم جو ارادہ فرما چکے ہیں اس میں کسی کو دخل انداز ہونے کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابوسفیان نے جناب فاطمہؑ سے جو وہاں تشریف فرما تھیں کہا کہ اے دخترِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر آپ اپنے بیٹے حسن کو حکم دیں کہ وہ اتنا کہہ دیں کہ میں نے دونوں فریق میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو وہ رہتی دنیا تک سردارِ عرب کہلائیں گے۔ جناب سیدہؑ نے فرمایا کہ حسن ابھی بچہ ہے اور ایک بچے کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ ابوسفیان کو جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو حضرت علیؑ سے کہا کہ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے مشورہ ہی دیجئے کہ مجھے اس نازک صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم خود ہی تجدیدِ صلح کا اعلان کر دو اور پھر مکہ چلے جاؤ۔ کہا کہ اس اعلان سے ہمیں کچھ فائدہ بھی پہنچے گا؟ فرمایا کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ تدبیر کارگر ہو گی یا بے نتیجہ ثابت ہو گی کہا کہ اچھا میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے مسجد میں کھڑے ہو کر کہا کہ میں دونوں فریق میں معاہدۂ صلح کی تجدید کرتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر مکہ روانہ ہو گیا۔

جب مکہ میں پہنچا تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا کارنامہ انجام دے کر آئے ہو۔ کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گیا مگر انہوں نے میری کسی بات کا جواب تک نہ دیا۔ پھر ابنِ قحافہ کے پاس گیا اُن سے بھی کوئی کام نہ نکلا۔ پھر ابنِ خطاب کے پاس گیا۔ وہ بھی دشمن ثابت ہوئے۔ پھر علیؑ کے پاس گیا تو ان کا رویہ نرم رہا۔ اور ان کے مشورہ پر میں نے بیچ بچاؤ کا اعلان کر دیا۔ قریش نے کہا کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے؟ کہا کہ انہوں نے تو تسلیم نہیں کیا۔ کہا کہ تم ہوش و حواس رکھتے ہوئے اتنا نہ سمجھ سکے کہ تمہارے یک طرفہ اعلانِ صلح سے کیا ہوتا ہے جب تک دوسرا فریق بھی اسے تسلیم نہ کرے۔ علیؑ نے تم سے اچھا خاصا مذاق کیا ہے جس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

پیغمبرؐ اکرمؐ قریش اور بنو بکر کی خونریزی و بدعہدی سے بہت متاثر تھے اور معاہدہ کی رُو سے پابند تھے کہ بنو خزاعہ کی نصرت کریں۔ چنانچہ آپ نے اہلِ مدینہ کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور بیرونِ مدینہ کے لوگوں کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ جنگی ہتھیاروں کے ساتھ مدینہ پہنچیں۔ پیغمبرؐ کی آواز پر لوگ جوق در جوق مدینہ میں جمع ہونے لگے اور ہتھیاروں کی دیکھ بھال اور کوچ کی تیاریوں میں لگ گئے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کدھر جانا ہے اور کس سمت بڑھنا ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کا پورا اہتمام کیا تھا کہ اہلِ مکہ کو خبر نہ ہونے پائے اور ایک دم ان کے سروں پر پہنچ جائیں۔ صحابہ میں سے جنہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مکہ پر چڑھائی کا ارادہ ہے انہیں یہ تاکید فرما دی تھی کہ وہ اسے مخفی رکھیں اور کسی سے اس کا تذکرہ نہ کریں تاکہ اہلِ مکہ کے کانوں تک اس کی

بھنک نہ پڑنے پائے۔ مگر حاطب ابن ابی بلتعہ نے کہ جس کے اہل و عیال مکہ میں تھے اس راز کو فاش کرنے کی سعی مذموم کی۔ اور ایک خط لکھ کر عمرو ابن عبدالمطلب کی کنیز سارہ کو دیا کہ وہ اسے مکہ پہنچا دے۔ اور اس میں تحریر کیا کہ رسولؐ اللہ مکہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کو وحی کے ذریعہ اس کی اطلاع ہو گئی۔ آپ نے فوراً حضرت علیؑ اور زبیر ابن عوام کو اس کنیز کے تعاقب میں بھیجا کہ وہ اسے جہاں پائیں گرفتار کر کے لائیں ابھی وہ وادیٔ حلیفہ تک پہنچی تھی کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت علیؑ نے اس سے خط کے بارے میں دریافت کیا مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میرے پاس کوئی تحریر نہیں ہے۔ زبیر نے اسکے سامان کی تلاشی لی مگر اس میں سے کچھ نہ نکلا۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے پاس خط نہ ہو جب کہ رسولؐ اللہ ہمیں خبر دے چکے ہیں۔ اور ان سے غلط بیانی کا امکان ہی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس سے سختی کے ساتھ خط کا مطالبہ کیا۔ اور کہا کہ اگر تم نے ذرا بھی حیل و حجت سے کام لیا تو تمہاری جامہ تلاشی لی جائے گی۔ اس دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ اس نے سر کے بالوں میں سے خط نکال کر پیش کر دیا۔ حضرت علیؑ وہ خط لے کر پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے اور تمام سرگزشت بیان کی۔ آنحضرتؐ نے صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ میں نے تاکیداً کہہ دیا تھا کہ اس اقدام کو مخفی رکھا جائے مگر تم میں سے ایک شخص نے راز کو فاش کرنے کی سعیٔ ناکام کی ہے اور قریش کو خط لکھ کر ہمارے ارادہ سے آگاہ کرنا چاہا ہے۔ وہ خط پکڑا جا چکا ہے۔ لہٰذا جس نے یہ نامناسب حرکت کی ہے وہ خود ہی بتا دے ورنہ وہ رُسوا ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ حاطب نے یہ سنا تو لرزاں و ترساں کھڑا ہوا اور کہا یا رسولؐ اللہ یہ غلطی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ میں نے قریش کی دوستی اور اسلام کی دشمنی میں ایسا نہیں کیا بلکہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس طرح قریش کو ممنونِ احسان کر کے اپنے بال بچوں کا تحفظ کروں جو ابھی تک قریش کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس پر حضرت عمر نے بگڑ کر کہا:۔

یا رسولؐ اللہ دعنی فلاضرب عنقه فان الرجل قد نافق۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۳۸	یا رسولؐ اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں یہ شخص منافق ہے۔"

مگر پیغمبر اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درگزر سے کام لیا اور اسے معاف فرما دیا۔
قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق ارشادِ باری ہے:۔

تسرون الیھم بالمودة وانا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم ومن یفعله فقد ضل سواء السبیل۔	تم ہو کہ کفار کے پاس چوری چھپے دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر یا کھلم کھلا کرتے ہو میں اس سے بخوبی واقف ہوں اور تم میں سے جو بھی ایسا کرتا ہے وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ہے۔"

۱۰ ماہِ رمضان ۸ھ کو رسولِ خدا دس ہزار مسلح مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ چار سو صحابہ گھوڑوں پر سوار تھے اور باقی پیادہ چل رہے تھے۔ جب لشکرِ اسلام کدید میں پہنچا تو پیغمبرؐ نے صحابہ کو روزہ افطار کر لینے کا حکم دیا اور خود بھی روزہ ختم کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اس میں پس و پیش کیا۔ پیغمبرؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ یہ لوگ عاصی و گنہگار ہیں۔ اس پر سب نے روزہ افطار کر لیا۔ جب منزل بمنزل بڑھتے ہوئے ثنیۃ العقاب تک پہنچے تو عم رسولؐ عباس ابن عبدالمطلب اپنے اہل و عیال کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عباس نے اپنے متعلقین کو مدینہ بھجوا دیا اور خود پیغمبرؐ کے ساتھ ہو گئے۔ مکہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر آنحضرتؐ نے پڑاؤ ڈالا۔ تو عباس رسولِ خدا کے خچر پر سوار ہو کر باہر نکلے اس خیال سے کہ اگر کوئی آدمی مل جائے تو اس کے ہاتھ قریش کو یہ پیغام بھجوائیں کہ وہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر امان کی درخواست کریں اور اسلام لا کر اپنی جانوں کا تحفظ کر لیں۔ قریش کو ابوسفیان کے ناکام واپس آنے کے بعد اس خطرہ کا احساس تو تھا ہی کہ مسلمان انہیں عہد شکنی کی سزا دینے کے لئے لامحالہ کوئی قدم اٹھائیں گے اس لئے وہ راتوں کو مکہ کے گرد چکر لگاتے اور حالات کا جائزہ لیتے۔ اسی مقصد سے ابوسفیان، حکیم ابن حزام اور بدیل ابن ورقا مکہ کے اطراف میں گشت کر رہے تھے کہ مرالظہران کی جانب سے آگ کی روشنی اور لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ کر حیرت میں کھو گئے ابوسفیان نے کہا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ بدیل ابن ورقا نے کہا کہ بنو خزاعہ کا لشکر ہو گا۔ ابوسفیان نے کہا کہ بنو خزاعہ میں اتنا دم خم کہاں کہ وہ اپنے پرچم کے نیچے اتنا عظیم لشکر جمع کر سکیں۔ ابھی یہ لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ عباس ابن عبدالمطلب سے ملاقات ہو گئی۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ فوج و سپاہ کیسی ہے؟ کہا کہ یہ فوجِ بیکراں پیغمبرؐ کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی ہے۔ آنحضرتؐ دس ہزار مسلح مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی جانب بڑھ رہے ہیں اور پو پھٹتے ہی مکہ پر حملہ کر دیں گے اور قریش میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ یہ سن کر ابوسفیان کانپ اٹھا اور کہا کہ پھر ہمارے بچاؤ کی کیا صورت ہو گی۔ عباس نے کہا کہ تم میرے پیچھے میری سواری پر بیٹھ جاؤ میں آنحضرتؐ سے کہہ سن کر تمہیں امان دلوا دوں گا۔ جب عباس ابوسفیان کو لئے ہوئے لشکرِ اسلام کی طرف سے گزرے تو حضرت عمر نے ابوسفیان کو دیکھ لیا۔ وہ دوڑتے ہوئے رسولؐ اللہ کے پاس گئے اور کہا کہ یا رسولؐ اللہ دشمنِ خدا آ رہا ہے۔ مجھے حکم دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ عباس نے حضرت عمر کو قتلِ ابوسفیان پر زور دیتے ہوئے دیکھا تو کہا:-

مهلا یا عمر فوالله ما تصنع به	ٹھہرو اے عمر! خدا کی قسم تم یہ اس لئے کہہ رہے ہو
هذا الا انه رجل من بنی عبد مناف	کہ وہ اولادِ عبد مناف میں سے ہے اگر وہ تمہارے
ولو کان من عدی ابن کعب ما	قبیلہ بنی عدی میں سے ہوتا تو تم کبھی ایسی بات

قلت هٰذا ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲ ۔ صـ۳۳۱) نہ کہتے یہ

آنحضرتؐ نے عباس سے فرمایا اسے آج کی رات اپنے خیمے میں ٹھہراؤ اور کل صبح میرے پاس لاؤ۔ جب دوسرے دن اُسے رسولؐ اللہ کے سامنے پیش کیا گیا تو فرمایا اے ابوسفیان تمہیں اب بھی معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ کہا کہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود ہوتا تو اس آڑے وقت میں میرے کام آتا۔ فرمایا تم نے اب بھی نہیں پہچانا کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ کہا کہ اس کے بارے میں میرا ذہن صاف نہیں ہے۔ عباس نے کہا کہ اے ابوسفیان اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو اسلام قبول کرلو ورنہ کسی کے ہاتھ سے مارے جاؤ گے۔ جب اسے مسلمان ہوئے بغیر جان بچتی نظر نہ آئی تو بادلِ ناخواستہ کلمہ پڑھا اور مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ عباس نے سفارش کی کہ یا رسولؐ اللہ ابوسفیان جاہ پسند ہے اسے کوئی امتیازی حیثیت دے کر اس کی دلجوئی کی جائے۔ فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے اس کے لئے امان ہے اور جو مسجد حرام میں پناہ لے اسے بھی امان دی جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ بھی محفوظ رہے

لہ علامہ دمیری نے حیاۃ الحیوان میں تحریر کیا ہے کہ ایک عالم (ابن مجلی صاحب مشارف الضاعہ) نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو خواب میں دیکھا اور ان سے کہا کہ جب آپ لوگوں نے مکہ فتح کیا تو ابوسفیان کے گھر کو پناہ گاہ قرار دیا اور جب ابوسفیان کی اولاد برسرِ اقتدار آئی تو اس نے فرزندِ رسولؐ کو ان کے عزیز و اقارب سمیت بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا اور کسی ایک کو بھی پناہ نہ دی۔ حضرت علی نے فرمایا کیا ابن الصیفی (حیص بیص متوفی ۵۷۴ھ) کے اشعار تمہارے گوش گزار نہیں ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ تم اس کے ہاں جاؤ اور اس کا جواب سن لو۔ میں صبح کو بیدار ہوا تو سیدھا ابن الصیفی کے ہاں گیا اور اس سے اپنا خواب بیان کیا اور ان اشعار کے سنانے کی فرمائش کی جن کی طرف حضرت علیؑ نے خواب میں اشارہ کیا تھا۔ ابن الصیفی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ اشعار میں نے آج ہی کی رات کہے ہیں اور ابھی کسی کو سنانے کی نوبت نہیں آئی۔ لو اب تم سنو۔

ملکنا فکان العفو منا سجیۃ   فلما ملکتم سال بالدم ابطح

ہم برسرِ اقتدار آئے تھے تو ہمارا شیوہ عفو و درگزر تھا اور تم برسرِ اقتدار آئے تو خون سے وادیاں چھلک اٹھیں۔

وحللتم قتل الاساری وطالما   غدونا علی الاسری فنعفو ونصفح

تم نے اسیروں کے قتل کو حلال جانا اور ہم نے اسیروں پر قابو پایا تو عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے انہیں معاف کر دیا۔

حسبکم ھٰذا التفاوت بیننا   فکل اناء بالذی فیہ ینضح

اس سے ہمارا اور تمہارا تفرقہ ظاہر ہے۔ اور ہر ظرف سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔

گا۔" پھر فرمایا اے عباس اسے کسی ایسی جگہ پر لے جا کر کھڑا کرو جہاں سے یہ لشکرِ اسلام کے پھیلاؤ کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ عباس اسے ایسی جگہ پر لے گئے۔ اس نے جب انبوہ در انبوہ فوجوں اور ان کے چمکتے ہوئے ہتھیاروں کو دیکھا تو لرز اٹھا اور عباس سے کہا: لقد اوتی ابن اخیک ملکا عظیما۔ "تمہارا بھتیجا تو ایک عظیم سلطنت کا مالک ہو گیا ہے۔" عباس نے کہا: انہ لیس بملک انما ھی النبوۃ۔ "یہ سلطنت نہیں ہے بلکہ نبوت کا شکوہ ہے۔" ابوسفیان نے کہا کہ مجھے اس کا خیال نہیں رہا ایسا ہی ہو گا۔

ابوسفیان لشکرِ اسلام کی جھلک دیکھ کر مکہ آیا اور قریش سے کہا کہ محمد ایک لشکرِ جرار کے ساتھ پہنچ گئے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ تم وہاں گئے تھے۔ انہوں نے کچھ کہا بھی ہے؟ کہا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے امان دی جائے گی۔ لوگوں نے کہا کہ تمہارے گھر میں آدمی ہی کتنے آ سکتے ہیں کہا کہ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے گا یا مسجد حرام میں پناہ لے گا۔ اس کے لئے بھی امان ہے۔ پھر قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے گروہ قریش تم ان کا مقابلہ تو کر نہیں سکتے بہتر ہے کہ اسلام قبول کر کے اپنی جانیں بچا لو۔ اس کی بیوی ہند بنت عتبہ نے سنا تو آگے بڑھ کر اس کی داڑھی پکڑ لی اور کہا: اقتلوا ھذا الشیخ الاحمق، "اے لوگو اس بوڑھے احمق کو قتل کر ڈالو" ابوسفیان نے کہا کہ یاد رکھو کہ تم نے اسلام کے قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش کیا تو تمہاری گردن بھی اڑا دی جائے گی۔

قریش ابھی حیرت میں کھوئے ہوئے سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کہ اسلام کے پرچم لہرانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مکہ کی فضا پر چھا گئے۔ سعد ابن عبادہ رایت اسلام اٹھائے حدودِ مکہ میں داخل ہوئے تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔

الیوم یوم الملحمہ	الیوم تستحل الحرمہ
آج گھمسان کی لڑائی کا دن ہے	آج ہتکِ حرمت کا دن ہے۔"

سعد کے یہ الفاظ غمازی کر رہے تھے کہ وہ آج قریش کے مظالم کا بدلہ چکائیں گے اور کشت و خون کیے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے۔ عباس نے آنحضرتؐ سے کہا کہ سعد کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ خونریزی پر آمادہ ہیں۔ پیغمبرؐ کا کوئی ارادہ جنگ کا نہ تھا اور نہ جنگ کی ضرورت ہی تھی۔ آپ نے مناسب سمجھا کہ سعد سے علم لے لیا جائے۔ چنانچہ علیؑ کو بلایا اور اُن سے کہا:۔

ادرکہ فخذ الرایۃ وکن انت الذی تدخل بھا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲ صفحہ ۱۲۲)	تم سعد کے پاس جاؤ اور اس سے علم لے لو اور تم ہی علم لے کر مکہ میں داخل ہو۔"

جناب امیر نے آگے بڑھ کر سعد سے علم لے لیا اور لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔

قریش میں تابِ مقاومت ہی نہ تھی کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو روکتے۔ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے اور کل جن کے لئے مکہ کے دروازے بند کئے تھے آج ان کے لئے فتح و کامرانی کے دروازے کھل گئے یہ اسلام کی امن پسندی اور حق و صداقت کی فتح تھی جس میں نہ جنگ کی نوبت آئی اور نہ جنگ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لیکن ہر جماعت میں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی افتادِ طبیعت امن پسندی کے خلاف ہوتی ہے۔ اور وہ ضرورت ہو یا نہ ہو سختی و تشدد کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ خالد ابن ولید جو فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے اسلام لائے تھے اور ابھی اسلام نے ان کے دل و دماغ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی مکہ کے زیریں حصہ سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مل کر بنو بکر سے جنگ چھیڑ دی۔ پیغمبر اکرمؐ کو وجون سے گزرتے ہوئے تلواروں کی چمک دیکھی تو سخت برہم ہوئے۔ فرمایا کہ فوراً اس کشت و خون کو بند کیا جائے۔ مگر اتنے میں بنو بکر کے متعدد آدمی مارے جا چکے تھے۔

جب پیغمبر اکرمؐ مکہ کی بالائی سمت سے شہر میں داخل ہوئے تو سیدھے خانہ کعبہ کے پاس آئے اور طواف بجا لائے۔ طواف سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ عمائدِ قریش سر نہوڑائے چپ سادھے کھڑے ہیں یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پیغمبرؐ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ آپ کو گھر سے بے گھر کیا اور غربت میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور پیہم خونریز حملے کرتے رہے۔ آنحضرتؐ نے ان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم سے کیا سلوک کیا جائے گا؟ سب نے ندامت سے سر نیچے ڈال دیے۔ خطیبِ قریش سہیل ابن عمرو نے کہا: نظن خیرا و نقول خیرا اخ کریم و ابن عم کریم " آپ شریف بھائی اور شریف چچا کے بیٹے ہیں ہم آپ سے نیکی اور بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں"۔ فرمایا: لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ "آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ جاؤ تم سب آزاد ہو" یہ پیغمبرؐ کی بلند نفسی و وسعتِ قلبی کا کرشمہ تھا کہ جو لوگ ہر وقت دشمنی و عناد پر کمربستہ رہتے تھے اور آپ کی آواز پر کان دھرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر آپ کا کلمہ پڑھنے لگے اور کل کا یتیم اور آج کا فرمانروا نہ صرف ان کے جسموں پر بلکہ ان کے دل و دماغ اور ضمیر و وجدان پر حکومت کرنے لگا۔ قریش کی دھاک دم توڑ کر فنا ہو گئی کفر کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اسلام کا پرچم فضائے بطحا پر لہرانے لگا۔

اہل مکہ اگرچہ اسلام لے آئے اور ان میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اسلام کی صداقت سے پہلے ہی سے متاثر رہے ہوں گے اور اب صدق دل سے اسلام قبول کیا ہو گا۔ مگر بلاشبہ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی۔ جنہوں نے بے بس ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ کیونکہ عقائد و نظریات میں یکلخت تبدیلی انسانی افتادِ طبائع کے خلاف ہے۔ ان اسلامی لبادہ اوڑھنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ وہ بھی تھے جو اپنے کفر پر بضد تھے اور وقتی

طور پر مکہ سے چلے گئے تھے۔ یا اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے۔ یہ لوگ اسلام کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ انہیں قرار واقعی سزا دے کر فتنہ و شر کو ابھرنے سے پہلے دبا دیا جائے گا۔ پیغمبرؐ اسلام نے اگرچہ عمومی طور پر امان کا اعلان کر دیا تھا مگر چند مفسدہ پرداز عناصر کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو خواہ وہ خانہ کعبہ کے پردہ سے چمٹے ہوئے کیوں نہ ہوں چنانچہ ان افراد میں سے عبداللہ ابن خطل اور اس کی کنیز جو رسول اللہ کی ہجو گایا کرتی تھی حویرث ابن نقید اور مقیس ابن صبابہ اپنے کیفر کردار کو پہنچائے گئے اور کچھ لوگوں کی جان بخشی بھی کی گئی۔ چنانچہ عبداللہ ابن ابی سرح نے حضرت عثمان کی پناہ حاصل کر لی۔ اور انہیں کی سفارش پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ عکرمہ ابن ابی جہل یمن کی طرف بھاگ گیا اور اس کی بیوی ام حکیم نے اس کے لئے امان کی درخواست کی تو اُسے بھی امان دے دی گئی۔ اور ہبار ابن اسود، عمرو ابن عبدالمطلب کی کنیز سارہ اور ابن خطل کی ایک دوسری کنیز نے اسلام کی آڑ لے کر اپنی جانیں محفوظ کر لیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں سے بھی شر انگیزی کا اندیشہ تھا جو مکہ ہی میں چھپے ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کو یہ خبر ملی کہ حارث ابن ہشام اور قیس ابن سائب اور بنی مخزوم کے چند افراد ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر میں موجود ہیں۔ آپ ام ہانی کے مکان پر آئے اور فرمایا کہ اس گھر میں جو لوگ چھپے ہوئے ہیں انہیں باہر نکالو۔ ام ہانی حضرت علیؑ کو پہچان نہ سکیں۔ کہا کہ اے شخص میں علیؑ کی حقیقی ہمشیرہ اور رسول اللہ کی چچیری بہن ہوں۔ اگر تم نے ان لوگوں کو جو میری پناہ میں ہیں باہر نکلنے پر مجبور کیا تو میں رسول اللہ سے تمہاری شکایت کروں گی۔ اتنے میں حضرت علیؑ نے سر سے خود اتارا تو ام ہانی نے انہیں پہچان لیا۔ دوڑ کر حضرت کے پاس آئیں اور کہا کہ میں قسم کھا چکی ہوں کہ رسول اللہ سے شکایت کروں گی۔ فرمایا تم رسولؐ خدا سے شکایت کر کے اپنی قسم پوری کر لو۔ جناب ہانی اسی وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں۔ آنحضرتؐ نے پوچھا اے ام ہانی کیسے آنا ہوا؟ عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ میں نے سسرال والوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے علیؑ انہیں اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ فرمایا: اجرتُ من اجرتِ "جسے تم نے پناہ دی اسے میں نے پناہ دی۔"

فتح مکہ کے واقعات کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا کردار از ابتدار تا انتہا ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کو ہر چیز پر مقدم سمجھا اور یہ جذبۂ اطاعت ان کے مزاج میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اُن کا ہر قول و عمل حرکت و سکون اور خاموشی و گویائی آنحضرتؐ کے اشارۂ چشم و ابرو سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ فتح مکہ کی تیاریوں کے سلسلہ میں پیغمبرؐ کے رازوں کے امین تھے مگر کسی موقع پر اپنی برتری جتلانے کے لئے لب کشائی نہیں کرتے جب کہ جنگ بدر اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والا ایک ممتاز

صحابی اپنی بیوی بچوں کے تحفظ کے پیش نظر اس راز کو افشا کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جس کا اخفا لازمی تھا اور اس طرح قومی و اجتماعی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ابو سفیان نے آپ سے خواہش کی کہ صلح کے بارے میں آنحضرتؐ سے سفارش کیجئے تو آپ نے پیغمبرؐ کے عزم و ارادہ کو دیکھتے ہوئے اشارۃً یا کنایۃً بھی کچھ کہنا گوارا نہ کیا۔ اور جب اس نے خود حضرت سے مشورہ طلب کیا تو حسن تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے گفتگو میں وہ طرز عمل اختیار کیا جو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے طرز عمل سے مختلف تھا ان دونوں نے اسے سختی سے جھڑک دیا تھا۔ مگر آپ نے اپنا رویہ نرم رکھا جس کا اعتراف خود ابو سفیان نے بھی مکہ پہنچ کر قریش کے سامنے کیا۔ اس نرم روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معاہدہ صلح کی تجدید سے پوری طرح مایوس ہو کر نہیں پلٹا۔ اگر وہ پوری طرح مایوس و ناکام ہو کر پلٹتا تو قریش کو یقین دلاتا کہ مسلمان حملہ آور ہوئے بغیر نہیں رہیں گے اور وہ مصلحت جو حملہ کو مخفی رکھنے میں ملحوظ رکھی گئی تھی فوت ہو جاتی۔ اور پھر ابو سفیان کے دریافت کرنے پر یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اس مشورہ پر عمل پیرا ہونے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ فائدہ بھی ہو گا۔ حضرت کا یہ مشورہ ایک دفع الوقتی کی حیثیت رکھتا تھا مگر اس نے اُسے بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر غنیمت جانا تاکہ پلٹ کر قریش سے کچھ تو کہہ سکے۔

اس موقع پر بھی علم فتح و نصرت حضرت ہی کے ہاتھوں میں تھا جو اس سے پہلے تمام جنگوں میں علمبردار ہوتے چلے آئے تھے۔ اگرچہ ابتدا میں علم سعد ابن عبادہ کو دیا گیا تھا۔ مگر جب سعد کے طور طریقوں سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر جنگ کرنا چاہتے ہیں تو آنحضرتؐ نے اُن سے علم لے کر حضرت علیؑ کے سپرد کر دیا۔ اگر پیغمبرؐ سعد سے علم لے کر کسی اور کو دینے کا ارادہ کرتے تو سعد اسے اپنی ذلت و توہین سمجھتے اور علم دینے میں پس و پیش کرتے۔ مگر علیؑ کو علم دینا تو ایسا ہی تھا جیسے خود رسول اللہؐ کو دینا جس سے نہ سعد دل شکستہ ہوئے اور نہ آزردہ خاطر۔ امیر المومنینؑ جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں قیادت کی اہلیت رکھتے تھے۔ اور یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ جوش میں آ کر کوئی ایسا اقدام کریں گے جو نبوت کی فتح کو کسرویت و قیصریت کی فتح میں تبدیل کر دے۔ حضرتؑ کی سیرت کا یہ جاذب نظر پہلو ہے کہ جنگ کا موقع ہو تو ایسے جنگ آزما جیسے کبھی صلح سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔ اور صلح کا محل ہو تو ایسے امن پسند جیسے حرب و ضرب کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی ہو۔

اس موقع پر حضرت علیؑ نے اپنی اصول پسندی کا بھی ثبوت دیا اور فرائض کی بجا آوری کے سلسلہ میں اپنی حقیقی بہن کے گھر میں پناہ لینے والوں کو اس وقت تک معاف نہیں کیا جب تک رسول اللہؐ نے ام ہانی کی قدر افزائی کرتے ہوئے ان کی پناہ کو اپنی پناہ قرار نہیں دے لیا۔ یہ تھی حضرتؑ کی آئین پسندی

کہ آئین و قانون کے مقابلہ میں نہ اپنے اور غیر کی تمیز کی اور نہ اپنے طرزِ عمل میں لچک پیدا ہونے دی۔

تطہیرِ کعبہ

عمرو ابن لحی خزاعی نے ۲۰۰ء میں مصر و شام کے علاقہ میں عمالقہ کو بت پرستی کرتے دیکھا تو اسے بتوں کی پرستش میں اگرچہ کوئی فائدہ نظر نہ آیا تھا مگر ترشے ہوئے بتوں کی صنعت اسے بھا گئی اور چند بت اٹھا کر مکہ لے آیا اور انہیں خانہ کعبہ کے گردو پیش نصب کر کے لوگوں کو بت پرستی کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ اہل مکہ کی اکثریت نے بت پرستی اختیار کر لی اور خانہ کعبہ صنم کدہ اور مکہ بت پرستی کا مرکز بن گیا۔ قریش کا سب سے بڑا دیوتا ہبل تھا جو خانہ کعبہ میں بلندی پر نصب تھا۔ اور اس کے آس پاس سینکڑوں بت ایک دوسرے سے جڑے بندھے رکھے تھے اور سال کے ۳۶۰ دنوں میں ایک ایک دن ایک ایک کی پوجا کے لئے خاص کر دیا گیا تھا۔ اہل مکہ کی دیکھا دیکھی اطراف و جوانب کے لوگ بھی بت پرستی کی طرف مائل ہو گئے اور جب حج کے لئے مکہ آتے تو حرم سے پتھر اٹھا کر ساتھ لے جاتے اور انہیں مکہ کے بتوں کی شکل و صورت میں تراش کر اپنے ہاں نصب کر لیتے یہاں تک کہ تمام عرب میں بت پرستی عام ہو گئی اور ہر قبیلہ نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ بت بنا لیا۔ مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر مقام نخلہ میں عزیٰ کی مورتی نصب تھی جو قریش اور بنی کنانہ کی عقیدت کا مرکز تھی۔ طائف میں لات نصب تھا جو بنی ثقیف کا دیوتا تھا۔ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر منات نصب تھا جو اوس و خزرج اور غسان کا دیوتا کہلاتا تھا۔ نجران میں قبیلہ ہمدان یعقوق کی پوجا کرتا تھا۔ ینبع کے اطراف میں بنی ہذیل کا بت سواع نصب تھا۔ اور دومۃ الجندل میں بنی کلب کا دیوتا ود تھا۔ اسی طرح مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا ہوتی تھی۔ کچھ بت پرست ان حس و حرکت سے خالی اور فہم و شعور سے عاری پتھروں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے تھے اور ان کے سامنے گڑگڑاتے، جھولیاں پھیلاتے اور مرادیں مانگتے تھے اور یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ پتھر آخر پتھر ہے اس کی کیا طاقت کہ کسی کو کچھ دے سکے۔ یا کسی سے کچھ چھین سکے۔ اور بعض انہیں وسیلہ مانتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ ہم ان کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ قرآن مجید ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔	ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

مکہ پر فوج کشی کا یہ مطلب نہ تھا کہ پیغمبرؐ اپنی مملکت کے حدود کو وسعت دیں اور فاتح و کشور کشا

کہلائیں بلکہ اصل مقصد بت پرستی کو مٹا کر توحید کا پرچم بلند کرنا تھا۔ چنانچہ مکہ کو زیر نگیں کرنے کے بعد سب سے پہلے بتوں کی شکست و ریخت کی طرف توجہ فرمائی۔ حالانکہ اس موقع پر یہ اندیشہ تھا کہ قریش کے بت پرستانہ جذبات بھڑک نہ اٹھیں اور وہ اپنے بتوں کی تذلیل و توہین دیکھ کر حملہ نہ کر دیں مگر پیغمبرؐ نے اپنے فرض منصبی کے سامنے اس خطرہ کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور پہلے دیواروں پر بنی ہوئی فرشتوں اور نبیوں کی تصویروں کو مٹایا اور پھر حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر نیچے والے بت توڑے جا چکے تو اوپر والے بتوں کو توڑنے کے لئے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علی تم میرے کاندھوں پر بلند ہو کر بتوں کو توڑو گے یا میں تمہارے شانوں پر سوار ہو کر انہیں توڑوں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ میرے کاندھوں پر سوار ہو کر انہیں توڑیں۔ جب پیغمبرؐ آپ کے کاندھوں پر سوار ہوئے تو آپ نے کمزوری و ضعف کا احساس کیا۔ پیغمبرؐ آپ کے کاندھوں سے اتر آئے اور فرمایا کہ اے علی تم میرے کاندھوں پر سوار ہو جاؤ۔ حضرت علیؑ دوشِ پیغمبرؐ پر بلند ہوئے اور چھوٹے موٹے بتوں کے علاوہ ہبل کو جو آہنی میخوں سے گڑا ہوا تھا جھٹکا دے کر اکھاڑ لیا اور زمین پر اس طرح پھینکا کہ پاش پاش ہو گیا۔ قریش کے لئے یہ منظر کتنا عبرت خیز ہو گا کہ کل تک جس کے آگے پیشانیاں رگڑتے رہے تھے اور اُحد میں جس کی جے کے نعرے لگائے تھے آج اس کے ٹکڑے پیغمبرؐ کے قدموں میں پڑے ہوئے عجز و بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

حضرت علیؑ اس صنمِ اکبر کو توڑنے کے بعد میزاب کی طرف سے نیچے اترے اور مسکراتے ہوئے پیغمبرؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ میں اتنی بلندی پر سے کودا ہوں مگر ذرا چوٹ نہیں آئی۔ فرمایا: رفعک محمد و انزلک جبرئیل "اے علی چوٹ کیونکر آتی جب کہ محمدؐ نے تمہیں بلند کیا ہے اور جبرئیل امین نے تمہیں اتارا ہے"۔ یہ تھی علیؑ کی رفعت و بلندی کہ جن کے ہاتھوں سے کائنات کو اوج و عروج حاصل ہوا اُن کے کاندھوں کا سہارا لے کر بلند ہوئے اور جن ہاتھوں سے لوحِ محفوظ کی بلندیوں سے قرآن اترا انہیں ہاتھوں سے سرزمینِ حرم پر اترے۔ گویا یہ علیؑ کی معراج تھی جو صاحبِ معراج کے کاندھوں پر ہوئی۔ خود حضرت کا ارشاد ہے: لو شئت لنلت افق السماء۔ "اگر میں چاہتا تو آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتا"۔ ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اس موقع پر اور لوگ بھی موجود تھے جنہیں یہ کام سپرد کیا جا سکتا تھا یا اس میں شریک کیا جا سکتا تھا مگر پیغمبرؐ نے اس کارِ نبوت کی انجام دہی میں علیؑ کے علاوہ کسی کی شرکت گوارا نہ کی کیونکہ ایک علیؑ ہی تھے جو کبھی بتوں کے آگے نہ جھکے تھے اور ہمیشہ معبودِ حقیقی کے آگے سجدہ ریز رہے تھے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے افراد زندگی کے کسی نہ کسی دور میں مورتیوں کی پوجا کرتے رہے تھے۔ اگر انہیں بت شکنی کا کام سپرد کیا جاتا یا اس

میں شریک کیا جاتا تو ممکن تھا کہ بتوں پر ہاتھ اٹھانے سے گھبراتے اور انہیں توڑنے میں جھجک محسوس کرتے جیسا کہ اہل طائف نے مسلمان ہونے کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبرؐ کے دست حق پرست پر بیعت کرتے ہوئے کہا کہ یا رسولؐ اللہ ہمارے بت خانہ کو ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے اور رسولؐ خدا نے اسے منظور نہ کیا تو کہا کہ پھر ہم اپنے ہاتھوں سے اسے نہیں توڑیں گے کسی اور سے فرمایئے کہ وہ اسے توڑے۔

یوم غمیضاء

فتح مکہ کے بعد پیغمبرؐ اسلام ابھی مکہ ہی میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے اطراف و جوانب میں مختلف وفود کے بھیجنے کا اہتمام کیا تاکہ وہ لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کر کے دعوت اسلام دیں۔ اس سلسلہ میں خالد ابن ولید کو تین سو پچاس افراد کی جمعیت کے ساتھ بنی جذیمہ کے پاس بھیجا اور انہیں تاکید کر دی کہ وہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھائیں اور نہ جنگ و قتال کریں بلکہ اپنا دائرۂ کار تبلیغ اسلام تک محدود رکھیں۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

بعثہ الی بنی جذیمہ داعیا الی الاسلام ولم یبعثہ مقاتلا۔ (طبقات۔ ج ۲۔ ص ۱۴۷)	پیغمبرؐ نے خالد ابن ولید کو بنی جذیمہ کے پاس دعوت اسلام کے لئے بھیجا تھا ان سے جنگ و قتال کے لئے نہیں بھیجا تھا۔

زمانۂ قبل اسلام میں خالد کا چچا فاکہ ابن مغیرہ اور عبدالرحمٰن کا باپ عوف یمن سے واپسی کے بعد بنی جذیمہ کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں سے مارے گئے تھے۔ قریش نے انتقام کے لئے ان پر چڑھائی کی مگر انہوں نے خونبہا دے کر صلح صفائی کر لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اب خالد کو وفد کی سربراہی کرتے ہوئے اُن کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تو ان کے انتقامی جذبات اُبھر آئے اور وہ اپنے کو انتقام کشی سے باز نہ رکھ سکے۔ چنانچہ جب یہ وفد مکہ سے دو منزل کے فاصلہ پر چاہ غمیضاء پر پہنچا تو وہاں اُتر پڑا۔ یہ کنواں بنی جذیمہ کی ملکیت تھا جس کے آس پاس وہ آباد تھے۔ جب انہوں نے خالد کو لشکر کے ہمراہ اپنے کنوئیں پہ پڑاؤ ڈالے دیکھا تو انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ خالد کہیں جنگ نہ چھیڑ دیں، انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے ہتھیار باندھ لئے اور لڑنے بھڑنے پر تیار ہو گئے۔ خالد نے انہیں ہتھیار باندھے دیکھا تو کہا تم کون ہو؟ کہا کہ ہم مسلمان ہیں ہم نے اپنی آبادی میں مسجد تعمیر کر رکھی ہے جس میں اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ خالد نے کہا کہ جب تم مسلمان ہو تو یہ ہتھیار کیوں باندھ رکھے ہیں؟ کہا کہ ہم نے یہ ہتھیار اس خیال سے باندھے ہیں کہ سابقہ عداوت کی بنا پر تم جنگ و قتال پہ نہ اتر آؤ۔ کہا کہ تم مطمئن رہو ہم جنگ نہیں کریں گے اور اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو۔ انہوں نے کہا کہ:۔

لا ناخذ السلاح علی اللّٰہ ولا علی رسولہ و نحن مسلمون۔
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۴۹)

جب ہم مسلمان ہیں تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ہتھیار اتارنا چاہے کہ ان کے قبیلہ کے ایک شخص جحدم نے کہا کہ ہتھیار اتارنے سے پہلے سوچ سمجھ لو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالد ہتھیار اتروانے کے بعد تمہاری مشکیں باندھے گا اور پھر تمہیں تہ تیغ کر دے گا۔ میں ہرگز ہتھیار نہیں اتاروں گا۔ اور تمہیں بھی یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے ہتھیار نہ اتارو۔ لوگوں نے اُسے سمجھایا بجھایا کہ کیوں اپنی اور اپنے قبیلہ کی تباہی کا سامان کرتے ہو۔ جنگ کا دور ختم ہو چکا اب وہ بھی مسلمان ہیں اور ہم بھی اسلام لا چکے ہیں پھر اپنوں سے خطرہ کیا اور اندیشہ کس بات کا۔ غرض سب نے ہتھیار اتار کر رکھ دیئے۔ خالد نے جب دیکھا کہ سب بے دست و پا ہو چکے ہیں تو انہوں نے اپنے ہمراہیوں کو جو زیادہ تر انہی کے قبیلہ کے تھے حکم دیا کہ سب کی مشکیں کس لو اور ہتھیار چھین لو۔ چنانچہ انہیں رسیوں میں جکڑ کر ان کے ہتھیار چھین لئے گئے اور پھر ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا گیا۔ عبدالرحمٰن ابن عوف جو اس مہم میں شریک تھے خالد کے اس اقدام پر بہت بگڑے اور دونوں میں تکرار شروع ہو گئی۔ عبدالرحمٰن نے کہا:۔

عملت بامر الجاھلیۃ فی الاسلام فقال انما ثأرت بابیک فقال عبدالرحمٰن بن عوف کذبت قد قتلت قاتل ابی ولکنک انما ثأرت بعمک الفاکھۃ ابن المغیرہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۳۲۲)

تم نے زمانہ اسلام میں دورِ جاہلیت کی حرکت کی ہے۔ خالد نے کہا کہ میں نے تمہارے باپ عوف کا انتقام لیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو میں نے خود اپنے باپ کے قاتل کو قتل کیا تھا تم نے اپنے چچا فاکہہ ابن مغیرہ کے خون کا بدلہ لیا ہے۔"

مؤرخ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

قال عبدالرحمٰن ابن عوف واللّٰہ لقد قتل خالد القوم مسلمین فقال خالد انما قتلتھم بابیک عوف ابن عبد عوف فقال لہ عبدالرحمٰن ولکنک قتلت بعمک الفاکھۃ ابن

عبدالرحمٰن ابن عوف نے کہا کہ خدا کی قسم خالد نے ان لوگوں کو تہ تیغ کیا جو اسلام لا چکے تھے۔ خالد نے ان سے کہا کہ میں نے تمہارے باپ عوف کے انتقام میں انہیں قتل کیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ تم نے اپنے چچا فاکہہ

المغیرہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۶۱) ابن مغیرہ کا انتقام لیا ہے۔"

جب پیغمبر اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنی جذیمہ کے قتل کئے جانے کی خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہُوا اور قبلہ رُخ کھڑے ہو کر اور اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا:۔

اللّٰھم انی ابرء الیك مما صنع خالد ابن الولید (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص۶۷) خداوندا میں تیری بارگاہ میں خالد ابن ولید کے اس فعل سے اظہارِ بیزاری کرتا ہوں۔"

پھر حضرت علیؑ کو بلا کر فرمایا کہ تم یمن سے آیا ہوا مال لے کر بنی جذیمہ کے پاس چاہِ غمیضا پر جاؤ اور ایک ایک آدمی کا خون بہا ادا کرو۔ اور ان کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کرو۔ حضرت علیؑ اُن کے ہاں گئے مقتولین کے وارثوں کو اُن کا خون بہا دیا اور ان کے تمام نقصانات کی تلافی کی۔ جب سب کا خون بہا ادا کر چکے تو پوچھا کہ اب کسی کا کوئی مطالبہ تو باقی نہیں رہا؟ کہا کہ اب ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ فرمایا کہ ابھی میرے پاس کچھ مال بچ رہا ہے میں اسے واپس لے جانا نہیں چاہتا وہ بھی تمہیں رسولؐ اللہ کی جانب سے دیتا ہوں۔ جب خون بہا اور باقی ماندہ مال تقسیم کر چکے تو واپس تشریف لائے اور پیغمبر اکرمؐ سے تمام واقعہ بیان کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

فداك ابی و امی ما فعلت احب الی من حمر النعم۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۶۱) میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں تم نے جو کچھ کیا ہے وہ مجھے سرخ بالوں والے اونٹوں سے بھی زیادہ پسند ہے۔"

خالد ابن ولید کا یہ اقدام سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی تھا۔ اسلام اس کا قطعاً روادار نہیں ہے کہ کافر کو بھی بلا وجہ قتل کیا جائے۔ بلکہ میدانِ جنگ میں اگر کوئی کافر تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ لے تو اس پر بھی حملہ آور ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ اسامہ ابن زید نے ایک مہم میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے تلوار کو دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا تھا۔ جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا تو اسامہ کو سرزنش کی۔ اسامہ نے کہا کہ اس نے تو تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ فرمایا: ھلا شققت قلبه؟ "کیا تم نے اس کے دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیا تھا؟" چہ جائیکہ جو مسجدیں تعمیر کرتے، اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے ہوں، ان سے فریب اور غلط بیانی سے ہتھیار رکھوائے جائیں اور پھر دورِ جاہلیت کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اُن کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔ حالانکہ پیغمبرؐ نے فتح مکہ کے موقع پر دورِ جاہلیت کے قتل کے انتقام کو ختم کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

کل دم او ماثرة او مال یدعی زمانہ جاہلیت کے خون کا انتقام، قومی مفاخر

تحت قدمی ھاتین۔ — اور خونبہا میں نے اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالے ہیں۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص۱۷۳)

اس موقع پر امیرالمومنینؑ نے نہ صرف یہ کہ پیغمبرؐ کے حکم سے ایک ایک کا خونبہا ادا کیا بلکہ ان کے حق سے زیادہ دے کر ان کی دلجوئی کی۔ اگر حضرتؑ اس طرح ان سے ہمدردی و مواسات نہ کرتے اور اُن پر یہ واضح نہ کر دیتے کہ آنحضرتؐ اس قتل و خون ریزی سے قطعاً بری الذمہ ہیں تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ لوگ جو ابھی تازہ مسلمان ہوئے تھے اسلام ہی سے بدظن ہو جاتے اور دوسروں کے دلوں میں بھی اسلام کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کرتے۔ لیکن آپ نے خونبہا کے علاوہ بقیہ مال بھی انہی پر تقسیم کر کے ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا اور پوری طرح سے اُن کی تسلّی و تشفّی کی۔

غزوۂ حنین

فتح مکہ کے موقع پر قریش نے پیغمبر اسلامؐ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو تمام قبائل عرب پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور ان میں سے اکثر نے اسلام کے دامن میں پناہ لے لی۔ لیکن بنی ہوازن و بنی ثقیف کی شوریدہ سری میں ذرا کمی نہ آئی اور بدستور دشمنی و عناد پر تلے رہے۔ بنی ہوازن کے ایک سردار مالک ابن عوف نصری نے بنی جشم و بنی نصر کو اپنے ساتھ ملا کر لشکر ترتیب دیا اور فیصلہ کن جنگ کا تہیہ کر لیا۔ بنی ثقیف جنہوں نے پیغمبرؐ اکرم پر پتھر برسا کر انہیں طائف سے باہر نکالا تھا وہ بھی اُن کے معاون و مددگار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مالک ابن عوف نے بنی سعد کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دیں۔ بنی سعد نے جنگ پر آمادگی ظاہر نہ کی اور کہا کہ محمدؐ ہمارے قبیلہ میں پلے بڑھے ہیں ہم نہیں چاہتے کہ ان کے مقابلہ میں صف آرا ہوں مگر ان پر زور دینے سے اُن کے کچھ آدمی شریک ہو گئے اور لشکر کی تعداد چار پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ مالک ابن عوف سپہ سالار اور ابو جرول علمبردار لشکر مقرر ہوا۔ اور بال بچوں مویشیوں اور بھیڑ بکری کے ریوڑوں کو ساتھ لے کر بڑے زور و شور سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس لشکر میں عرب کا مشہور ماہر فنون حرب درید ابن صمہ بھی شامل تھا۔ اس کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی اور چلنے پھرنے سے معذور تھا مگر اسے ہودج میں بٹھا کر اس غرض سے ساتھ لے لیا تا کہ بروقت اس کے تجربہ و اصابت رائے سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ جب لشکر نے وادیٔ اوطاس میں منزل کی تو اس نے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اسے بتایا گیا کہ یہ وادیٔ اوطاس ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جگہ گھوڑوں کی آمد و رفت اور حرب و پیکار کے لئے موزوں رہے گی اس لئے کہ یہ نہ زیادہ پتھریلی اور سخت ہے اور نہ زیادہ ریتلی اور نرم۔ اتنے میں اس کے کانوں میں بچوں کے رونے جھینکنے اور بھیڑ

بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آئیں۔ اس نے مالک ابن عوف کو بلا کر پوچھا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں اسے بتایا گیا کہ عورتیں بچے بھی ساتھ ہیں۔ کہا کہ انہیں کیوں ساتھ لائے ہو؟ کہا کہ بال بچوں کے ساتھ ہوتے ہوئے کوئی میدان چھوڑنے کا ارادہ نہ کرے گا۔ کہا کہ جب میدان سے قدم اُکھڑ جاتے ہیں تو پھر عورتوں اور بچوں کا خیال اُکھڑے ہوئے قدموں کو روک نہیں سکتا۔ دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ تم عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لاتے۔ اگر شکست ہوئی تو ایسی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا جسے پشتوں تک مٹایا نہ جا سکے گا۔ پھر پوچھا کہ کیا بنی کعب اور بنی کلاب بھی تمہارے ساتھ ہیں؟ کہا کہ وہ تو شریک نہیں ہوئے۔ کہا کہ اگر تمہارا بخت یاور ہوتا تو وہ بھی شریک ہوتے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم اپنی بستیوں میں واپس چلے جائیں۔ اگر مسلمان ہم پر حملہ آور ہوئے تو ہم اپنا بچاؤ بھی کر سکیں گے۔ اور جن قبیلوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا اس صورت میں وہ بھی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ مالک نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ درید نے کہا کہ تم جانو ہمیں تمہارے کسی کام میں دخل نہیں دوں گا۔ مالک تو یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی کام میں دخل نہ دے تاکہ جنگ جیتنے کی صورت میں کامیابی کو اس کی رائے کا نتیجہ نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک صائب رائے ٹھکراتے ہوئے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

جب پیغمبر اکرمؐ کو اطلاع ہوئی کہ بنی ہوازن و بنی ثقیف جنگ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو آپ نے عبداللہ ابن ابی حدرد کو ان کی طرف بھیجا تاکہ اُن کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ انہوں نے گھوم پھر کر تمام حالات کا جائزہ لیا اور پلٹ کر آنحضرتؐ کو خبر دی کہ دشمن جنگ کا ارادہ کر چکا ہے ہمیں اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کو بلایا اور ابن ابی حدرد سے جو سنا تھا اس کا ذکر کیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ ابن ابی حدرد کی بات کا اعتبار ہی کیا یہ جھوٹ کہتا ہے۔ اس پر ابن ابی حدرد نے حضرت عمر سے مخاطب ہو کر کہا:۔

ان تکذبنی فطالما کذبت بالحق یا عمر۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۳۴۶)

"اے عمر اگر تم مجھے جھٹلاتے ہو تو تم حق کو جھٹلانے کے خوگر رہ چکے ہو۔"

آنحضرتؐ نے ابن ابی حدرد کی اطلاع پر اعتماد کرتے ہوئے لشکر کو صف بندی کا حکم دیا۔ صفوان ابن اُمیہ سے جو ابھی تک مسلمان نہ ہوا تھا ایک سو زرہیں اور دوسرا سامانِ جنگ عاریۃً لیا اور ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ ان بارہ ہزار میں دس ہزار تو وہی مسلمان تھے جو مدینہ سے آپ کے ہمراہ آئے تھے اور باقی دو ہزار مکہ کے تازہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی تعداد کفار کے لشکر سے تین گنا زائد تھی۔ اس کثرت نے بیشتر مسلمانوں میں ایک نخوت کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے لشکر اسلام کی کثرت

و قوت کو دیکھ کر برملا کہا کہ لن نغلب الیوم من قلت ۔ "آج تعداد کی کمی کی بنا پر ہم شکست نہیں کھائیں گے۔"
دشمن نے وادیٔ حنین میں پہنچ کر پہلے ہی سے دروں اور کھوؤں میں مورچے سنبھال لئے تھے ۔حنین مکہ و طائف کے درمیان پھیلے ہوئے پہاڑوں کے اندر ایک وادی کا نام ہے جس میں ایک طرف مسطح و ہموار میدان ہے اور دوسری طرف گہرے کھڈ، پُر پیچ گھاٹیاں اور دشوار گزار کھائیاں تھیں ۔جب مسلمان صبح ہی صبح وادیٔ حنین میں پہنچے اور تنگ اور ڈھلوان راستوں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے تو دشمن نے کمین گاہوں سے نکل کر یکبارگی تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی ۔مسلمان اس ناگہانی حملہ کے لئے تیار نہ تھے ۔لشکر میں عام بھگدڑ مچ گئی ۔سب سے پہلے مقدمۃ الجیش نے راہِ فرار اختیار کی جس کے سربراہ خالد ابن ولید تھے ۔جب عقب میں آنے والوں نے خالد کو اپنے دستۂ سپاہ کے ساتھ بھاگتے دیکھا تو وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی اور جدھر جس کا رُخ ہوا ادھر نکل گیا ۔ابو قتادہ جو ان بھاگنے والوں میں شامل تھے بیان کرتے ہیں :-

انهزم المسلمون وانهزمت معهم فاذا بعمر ابن الخطاب فی الناس فقلت ما شان الناس قال امر الله
(صحیح بخاری ۔ج ۲ ص ۴۵)

"مسلمانوں نے راہِ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگ نکلا ۔اچانک میں نے اُن لوگوں میں عمر ابن خطاب کو دیکھا تو کہا کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو ۔کہا کہ اللہ کی مرضی۔"

حدیث و سیر کی کتابوں میں تو اس فرار کا تذکرہ ہوا ہی ہے خود قرآن مجید نے بھی اس پر واشگاف لفظوں میں تبصرہ کیا ہے :-

و یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا و ضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین ۔

"اور حنین کا دِن یاد کرو جب کہ کثرتِ تعداد نے تمہیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس کثرت نے تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوئی اور تم پیٹھ پھرا کر چل دیئے۔"

ابو سفیان نے مسلمانوں کو بھاگتے دیکھا تو کہا لا تنتھی ھزیمتھم دون البحر" ابھی کیا ہے یہ لوگ شکست کھا کر سمندر تک بھاگیں گے ۔" کلدہ ابن حنبل نے کہا : الا بطل السحر الیوم " آج اسلام کا سحر ٹوٹ گیا ہے ۔" کچھ لوگوں نے کہا کہ آج لات و ہبل نے اپنی پامالی کا بدلہ لے لیا ہے ۔یہ لوگ اگرچہ لشکرِ اسلام میں شامل تھے مگر دل سے شریک نہ ہوئے تھے اور نہ ان سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ جنگ کا نقشہ بگڑنے کی صورت میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے ۔مگر تعجب تو اس امر پر ہے کہ بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے اور موت پر پیمان باندھنے والے بھی ثابت قدم نہ رہ سکے ۔دیکھتے ہی دیکھتے بارہ ہزار کا جمِ غفیر چھٹ گیا اور پیغمبرؐ کے پاس معدودے

چند آدمی رہ گئے۔ ایک روایت کی بنا پر علی ابن ابی طالب، عباس ابن عبدالمطلب، ابوسفیان ابن حارث اور عبداللہ ابن مسعود صرف چار آدمی ثابت قدم رہے۔ اور ایک روایت کی بنا پر دس آدمی باقی رہے۔ علی ابن ابی طالب، عباس ابن عبدالمطلب، فضل ابن عباس، ابوسفیان ابن حارث، ربیعہ ابن حارث، عبداللہ ابن زبیر ابن عبدالمطلب اور عتبہ و معتب پسران ابولہب اور ایمن ابن عبید۔ پیغمبر اسلامؐ خچر پر سوار میدان میں کھڑے تھے۔ عباس اور فضل آپ کے دائیں بائیں ایستادہ تھے۔ ابوسفیان عقب سے زین پکڑے ہوئے تھے اور حضرت علی پیغمبرؐ کے سامنے تلوار سے دشمن کی یلغار روک رہے تھے اور باقی جانباز آنحضرتؐ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے دشمن کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ مالک ابن عوف پیغمبرؐ پر حملہ کے ارادہ سے بڑھا، ایمن ابن عبید نے اس کا حملہ روکا اور دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ قوت برداشت، صبر و تحمل اور اطمینان و ثابت قدم میں پیغمبرؐ سے بڑھ کر کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے جو آپ کے اطمینان و سکون قلب کے ترجمان ہیں :-

انا النبی لا کذب　　　انا ابن عبد المطلب

"میں نبی ہوں جس میں جھوٹ نہیں　　　میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں"

آپ نے مسلمانوں کو میدان چھوڑ کر جاتے دیکھا تو داہنی طرف اور بائیں طرف رخ کر کے انہیں آواز دی الی این یا عباد اللہ۔ "اے اللہ کے بندو کہاں جا رہے ہو؟" جب اس آواز پر کوئی پلٹتا نظر نہ آیا تو عباس سے کہا کہ چچا تم انہیں بلند آواز سے پکارو۔ عباس نے یامعشر الانصار یا اصحاب الشجرۃ۔ اے گروہ انصار اے بیعت رضوان میں شریک ہونے والو" کہہ کر انہیں پکارا۔ اس آواز پر کچھ لوگ پلٹے۔ حضرت علیؑ نے انہیں اپنے پرچم کے نیچے جمع کیا اور دشمن پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھے۔ ادھر دشمن بھی جنگ کے لئے تیار تھا۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر تلواریں سروں سے ٹکرا کر چنگاریاں برسانے لگیں تو آنحضرتؐ نے فرمایا: الان حمی الوطیس "اب جنگ کا تنور گرم ہوا ہے"۔ بنی ہوازن کا علمبردار ابوجرول اونٹ پر سوار تھا۔ سیاہ پرچم کو لہراتا جوش میں رجز پڑھتا اور حملوں پر حملے کرتا ہوا آگے بڑھا۔ حضرت علی اس کی تاک میں تھے۔ عقب سے اس کے اونٹ کے پیروں پر تلوار ماری، اونٹ زمین پر گرا ابوجرول ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ آپ نے اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ابوجرول کا قتل ہونا تھا کہ دشمن کی رہی سہی ہمت ختم ہو گئی۔ قدموں کا جماؤ اکھڑ گیا اور گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دشمن کی صفوں کو منتشر ہوتے دیکھ کر وہ لوگ جو کونے کھدروں میں دبکے پڑے تھے پلٹ آئے اور سب نے مل کر دشمن کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ کچھ قتل ہوئے کچھ اسیر کر لئے گئے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ چاشت کا وقت ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اب ہاتھ روک

لیا جائے اور اسیرانِ جنگ کو قتل نہ کیا جائے۔ مگر پیغمبرؐ کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود دو اسیر قتل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک ابن اکوع تھا جو فتح مکہ کے موقع پر بنی ہذیل کی طرف سے جاسوسی کا کام کرتا تھا حضرت عمرؓ نے اسے بے دست و پا دیکھا تو ایک انصاری کو اشارہ کیا اس نے اسے قتل کر دیا اور دوسرا جمیل ابن معمر تھا۔ یہ بھی ایک انصاری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جب رسولِ خداؐ نے اس سے جواب طلبی کی تو اس نے کہا کہ مجھے عمر ابن خطاب نے کہا کہ اسے قتل کر دو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں اسیروں کے قتل کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ اور پھر خفگی و ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ آخر کچھ دنوں کے بعد عمیر ابن وہب کے کہنے سننے سے اُن کی غلطی سے درگزر فرمایا۔ اسی طرح ایک عورت کے قتل پر آنحضرتؐ کبیدہ خاطر ہوئے۔ اور اس کی لاش دیکھ کر پوچھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ خالد ابن ولید نے۔ آپ نے ایک آدمی سے کہا کہ خالد کے پاس جاؤ اور اُسے کہو:۔

ان رسول اللہ ینھاک ان تقتل امرأۃ اوولید اوعسیفاً	رسولؐ خدا تمہیں عورتوں بچوں اور مزدوروں کو قتل کرنے سے منع کرتے ہیں۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲ ص ۱۸۱)

جنگ ختم ہو گئی مگر مسلمانوں نے کفار کا تعاقب جاری رکھا اور ان کے چوپاؤں بھیڑ بکریوں اور دوسرے سازوسامان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور بقیۃ السیف میں سے ایک بڑی تعداد کو جن میں عورتیں بچے بھی شامل تھے جنگی اسیر بنا لیا۔ آنحضرتؐ نے بنی سعد کے ایک شخص بجاد کے بارے میں حکم دیا تھا کہ اسے جہاں پاؤ زندہ گرفتار کر لو۔ چنانچہ مسلمانوں نے اُسے اور اس کے خاندان والوں کو گرفتار کر لیا۔ ان اسیروں میں پیغمبر اکرمؐ کی رضاعی بہن شیما بنت حارث بھی تھیں۔ جب قیدیوں کے ساتھ ان پر بھی کچھ سختی ہوئی تو انہوں نے کہا مسلمانو! میں تمہارے رسول کی دودھ شریک بہن ہوں۔ میں نے تمہارے رسولؐ کو کھلایا انہیں لوریاں دیں اور میری ماں نے انہیں دودھ پلایا ہے۔ مسلمانوں کو اس پر یقین نہ آیا۔ جب انہیں رسولؐ اللہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا یارسولؐ اللہ میں آپ کی بہن شیما بنت حلیمہ ہوں۔ آپ نے ایک مرتبہ میری پشت پر کاٹا تھا اس کا نشان اب تک باقی ہے۔ آنحضرتؐ نے انہیں پہچان لیا اور اپنی ردا بچھا کر اس پر بٹھایا۔ اور کہا کہ تم ہمارے ہاں رہنا چاہتی ہو یا اپنے قبیلہ کے پاس جانا چاہتی ہو۔ انہوں نے اپنے قبیلہ کے ہاں جانا پسند کیا۔ آنحضرتؐ نے انہیں ایک غلام کچھ اونٹ اور چند بکریاں دے کر عزت و احترام سے رخصت کر دیا۔

اس غزوہ میں چار مسلمان شہید ہوئے ستر کفار مارے گئے اور ہزاروں اسیر ہوئے۔ مالِ غنیمت بھی بڑی کثیر مقدار میں حاصل ہوا۔ اس میں چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار سے زائد بھیڑ بکریاں اور چالیس ہزار اوقیہ چاندی شامل

تھی۔ مالِ غنیمت اور اسیروں کو وادیٔ جعرانہ میں بدیل ابن ورقاء خزاعی کی نگرانی میں محفوظ کر دیا گیا۔ جو لوگ جان بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ان میں سے اکثر طائف میں چلے آئے تھے بنی ہوازن مالک ابن عوف بھی انہی میں شامل تھا۔ ایک گروہ وادی اوطاس میں چلا آیا اور کچھ لوگ نخلہ کی طرف چلے گئے۔

غزوۂ حنین مسلمانوں کے لئے ایک کڑی آزمائش تھا۔ انہوں نے شروع میں دشمن کے اچانک حملہ سے ہراساں ہو کر پسپائی کا مظاہرہ کیا اور کثرت و قوت کے غرور میں یہ نہ سوچا کہ دشمن کھوؤں اور دروں میں چھپا ہوگا۔ اور بے خبری میں حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اگر وہ احتیاط برتتے اور دشمن کی طرف سے غافل نہ رہتے تو نوبت وہاں تک نہ پہنچتی جہاں تک پہنچی۔ بے شک لشکرِ اسلام میں فتح مکہ کے نتیجہ میں مسلمان ہونے والوں کی بھی ایک جمعیت تھی جو اسلام کی سربلندی کے لئے جان کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھی مگر اکثریت تو انہی مسلمانوں کی تھی جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لا چکے تھے اور پیغمبرؐ کے ہمرکاب رہ کر جنگوں میں شریک بھی ہو چکے تھے۔ مگر فتح مکہ سے پہلے کے مسلمان ہوں یا بعد کے کسی نے بھی اسلام کی شکست میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اگر اس موقع پر پیغمبرؐ اکرم اور ان کے گنتی کے چند عزیز و اقارب بھی میدان سے ہٹ جاتے تو پھر ایسی شرمناک شکست ہوتی کہ سابقہ فتوحات پر بھی پانی پھر جاتا۔ اور مسلمانوں کی جو دھاک قبائل عرب پر بیٹھ چکی تھی ایک دم ختم ہو جاتی۔

اس فتح و کامرانی میں سب سے زائد حصہ حضرت علیؑ کا ہے جنہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی میدان سے ہٹنا گوارا نہیں کیا اور پیغمبرؐ کے سینہ سپر بن کر دشمن کے حملوں کو روکتے رہے بلکہ انہی کے استقلال و ثبات قدم کی وجہ سے باقی نو آدمیوں کے قدم جمے رہے۔ کیونکہ ان میں کوئی نہ ہمت و شجاعت میں آپ سے بڑھ کر تھا اور نہ آپ سے زیادہ حرب و ضرب کے معرکے جھیلے ہوئے تھا۔ اور انہی کے ثباتِ قدم سے متاثر ہو کر جانے والے واپس پلٹے اور پھر آپ ہی نے لشکر کفار کے علمبردار کو قتل کر کے مسلمانوں کے حوصلے بلند کئے اور ستر مقتولین میں سے چالیس جنگجوؤں کو تہ تیغ کر کے ایک طرف اپنی شجاعت و پُر جگری کی دھاک بٹھائی اور دوسری طرف اسلام کو نمایاں فتح و کامرانی سے ہمکنار کیا۔ غرض اللہ کی تائید و نصرت پیغمبرؐ کے استقلال و استقامت اور علی مرتضیٰ کی جرأت و نبرد آزمائی سے مسلمانوں کو ہزیمت کے بعد سرخروئی حاصل ہوئی اور پھر طاغوتی طاقتوں کو ان کے مقابلہ میں جتھا بندی کی جرأت نہ ہو سکی۔

محاصرۂ طائف

بنی ثقیف اور ان کے سردار مالک ابن عوف نصری نے حنین سے بھاگ کر طائف میں پناہ لی اور سال

بھر کا سامان رسد اور آلاتِ حرب و ضرب جمع کر کے قلعہ بند ہو گئے۔ لشکرِ اسلام نے آنحضرتؐ کی سربراہی میں طائف کا رخ کیا اور قلعہ کے سامنے پڑاؤ ڈال کر انہیں محاصرہ میں لے لیا۔ دونوں طرف سے تیروں کا تبادلہ ہوتا رہا مگر مسلمان کھلے میدان میں پڑے تھے اور کفار قلعہ بند ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔ انہوں نے قلعہ کے اوپر سے اس قدر تیر برسائے کہ کچھ مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ جب دشمن کو زیر کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو سلمان فارسی نے منجنیق کے ذریعہ قلعہ کی دیوار پر سنگ باران کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ منجنیق کے ذریعہ پتھر برسا کر قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ جب مسلمانوں نے اس شگاف کے راستے سے قلعہ کے اندر داخل ہونا چاہا تو کفار نے دہکتی ہوئی آہنی سلاخیں اوپر پھینکیں۔ مسلمان مجبور ہو کر پیچھے ہٹے اور قلعہ کو سر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اسی دوران میں پیغمبرِ اکرم نے حضرت علیؑ کو طائف کے گرد و نواح میں جانے کے لئے کہا اور انہیں مامور فرمایا کہ جہاں کہیں بتخانہ نظر آئے اسے مسمار کر دیں۔ حضرت علیؑ ایک دستہ سپاہ کے ساتھ چل دیئے ابھی رات کی تاریکی چھٹنے نہ پائی تھی کہ قبیلہ بنی خثعم کی طرف سے گزر ہوا انہوں نے مزاحمت کی اور ان میں کا ایک نامور جنگجو آگے بڑھ کر مبارز طلب ہوا۔ حضرت علیؑ نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی آگے بڑھ کر اسے ٹھکانے لگائے مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ جب کوئی آمادہ نہ ہوا تو آپ خود تیار ہوئے۔ ابو العاص ابن ربیع نے آپ کو تیار ہوتے دیکھا تو کہا کہ آپ ٹھہریئے میں جاتا ہوں۔ فرمایا اب مجھے ہی جانے دو۔ اگر میں کام آ گیا تو اس دستہ کے سربراہ تم ہو گے۔ یہ کہہ کر حضرت اس پر جھپٹے اور پہلے ہی وار میں اسے قتل کر دیا۔ بنی خثعم نے اسے قتل ہوتے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے اور پھر کسی کو مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حضرتؑ نے قدم آگے بڑھایا اور بنی ہوازن و بنی ثقیف کا جو بھی بت خانہ نظر آیا اسے توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیا۔ جب تمام علاقہ بتوں سے پاک ہو گیا تو واپس پلٹے۔ پیغمبرِ اکرم نے انہیں آتے دیکھا تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک گوشہ میں لے گئے اور دیر تک کچھ راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ لوگوں کو یہ رازدارانہ اندازِ گفتگو ناگوار ہوا کہنے لگے۔ لقد طال نجواہ مع ابن عمہ۔ "آج تو ابن عم سے سرگوشیوں کا سلسلہ دراز ہو گیا ہے۔" حضرت عمر سے نہ رہا گیا تو انہوں نے رسول اللہؐ سے برملا کہہ دیا آپ علیؑ سے خلوت میں باتیں کرتے ہیں اور ہمیں قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ فرمایا:۔

ما انتجیتہ و لکن اللہ انتجاہ۔	"میں نے علی سے راز کی باتیں نہیں کی ہیں، بلکہ
(صحیح ترمذی۔ ص۲۴۳)	اللہ تعالیٰ نے کی ہیں۔"

انہی ایام محاصرہ میں نافع ابن غیلان بنی ثقیف کے چند سواروں کو لے کر قلعہ سے باہر نکلا۔ حضرتؑ

نے اس کا تعاقب کر کے طائف کی ایک وادی وج میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل ہوتے ہی اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر محصورین میں سے کسی کو باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس عرصہ میں طائف کے اطراف میں رہنے والوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور بنی ثقیف کے چند غلام بھی قلعہ سے باہر نکل کر آزادی کے وعدہ پر مسلمان ہو گئے۔ مسلمانوں کو محاصرہ کئے بیس دن سے زائد ہو چکے تھے اور ابھی تک قلعہ فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ آنحضرتؐ نے نوفل ابن معاویہ دئلی سے محاصرہ کے طویل ہونے کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ لومڑی اپنے بھٹ میں گھس گئی ہے اگر انتظار کیا جائے تو اسے پکڑا جا سکتا ہے اور اگر چھوڑ دیا جائے تو کسی ضرر کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے بنی ثقیف کو ان کی حالت پر چھوڑ کر محاصرہ اٹھا لینا مناسب سمجھا اور اعلان فرمایا کہ کل ہم یہاں سے چل دیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن صحابہ نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپسی کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عیینہ ابن حصن فزاری نے جب مسلمانوں کو محاصرہ اٹھاتے اور بنی ثقیف کو اپنے تحفظ میں کامیاب ہوتے دیکھا تو بنی ثقیف کو اچھے الفاظ سے یاد کیا جس پر ایک شخص نے کہا کہ تم سپاہِ اسلام میں شامل ہوتے ہوئے دشمن کی مدح و توصیف کرتے ہو۔ کہا:۔

انی واللہ ماجئت لاقاتل معکم ثقیفا ولکنی اردت ان یفتح محمدؐ الطائف ناصیب من ثقیف جاریۃ۔
(تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۵۵)

"خدا کی قسم میں اس لئے نہیں آیا تھا کہ تمہارے ساتھ مل کر بنی ثقیف سے لڑوں بلکہ میری غرض یہ تھی کہ محمدؐ طائف کو فتح کر لیں گے تو میں بنی ثقیف کی کسی عورت کو کنیزی میں لے سکوں گا۔"

کچھ لوگوں نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ بنی ثقیف کے لئے بددعا کرتے جائیے۔ آنحضرتؐ نے بددعا کے بجائے یہ الفاظ فرمائے:۔

اللھم اھد ثقیفا وائت بھم
(تاریخ کامل، ج ۲، ص ۱۸۱)

"خدایا! بنی ثقیف کو ہدایت فرما اور انہیں میرے پاس حاضر کر۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی قبولیت تھوڑے ہی عرصہ بعد ظاہر ہو گئی اور بنی ثقیف کا ایک نمائندہ وفد مدینہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کہا کہ یا رسولؐ اللہ ہم اسلام قبول کرتے ہیں مگر ہماری یہ استدعا ہے کہ تین برس تک ہمارے بت لات کو توڑا نہ جائے۔ پیغمبرؐ نے اسے منظور نہ کیا تو پھر دو سال پھر ایک سال اور پھر ایک ماہ کے لئے کہا مگر پیغمبرؐ نے ہر مرتبہ انکار کیا۔ کہا اگر آپ یہ نہیں مانتے تو کسی اور کو حکم دیجئے کہ وہ اسے توڑے ہم اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑیں گے۔ آنحضرتؐ نے اسے منظور فرمایا۔ پھر کہنے لگے کہ یا رسولؐ اللہ ہمیں نماز سے معاف رکھا جائے۔ فرمایا: لا خیر فی دین لا صلوٰۃ فیہ۔

جس دن میں نماز نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ پھر انہیں تنبیہ و تہدید کرتے ہوئے فرمایا:۔

لتسلمن او لابعثن رجلا منی (اوقال) مثل نفسی فلیضربن اعناقکم ولیسبین ذراریکم ویاخذن اموالکم۔	تم اسلام قبول کرو ورنہ میں اس شخص کو جو مجھ سے ہے (یا یہ فرمایا) کہ جو مثل میرے نفس کے ہے تمہاری طرف بھیجوں گا جو تمہاری گردنیں مارے گا تمہارے بچوں اور عورتوں کو اسیر کرے گا اور تمہارا مال و متاع چھین لے گا۔"
(استیعاب۔ ج ۲ ص ۴۶)	

حضرت عمر کہتے ہیں کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آنحضرت میرے بارے میں فرمائیں کہ وہ یہ ہے مگر آپ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر دو مرتبہ کہا ھٰذا ھو ھٰذا ھو۔" وہ یہ ہے وہ یہ ہے۔"

اس وفد نے پلٹ کر اپنے قبیلہ سے یہ تمام گفتگو نقل کی اور وہ سب کے سب غیر مشروط طور پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اس مہم میں بھی امیرالمومنینؑ دوسری مہموں کی طرح اپنی کارگردگی کے اعتبار سے ممتاز نظر آتے ہیں اور فریضۂ جہاد کے ساتھ فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی میں بھی مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے محاصرہ کے دوران میں بنی ثقیف و ہوازن کے بتوں کو توڑا اور اطراف و جوانب کے لوگوں میں ذہنی تبدیلی پیدا کر کے انہیں اسلام کی پذیرائی کے لئے آمادہ کیا بنی خثعم کے ایک جنگجو کو قتل کر کے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا اور نافع ابن غیلان کو تہ تیغ کر کے بنی ثقیف کے سواروں کو مار بھگایا اور آخر میں انہی کے نام سے مرعوب و متاثر ہو کر انہوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔

اس موقع پر امیرالمومنینؑ کے فضیلت کے بعض پہلو بھی صبح درخشاں کی طرح عیاں ہیں۔ پیغمبرؐ نے انہیں راز کی گفتگو کا شرف بخشا۔ پہلی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ دوسروں کے چیں بہ جبیں ہونے پر آنحضرتؐ نے اس کی نسبت اللہ کی طرف دی کہ علی صرف میرے رازوں کے امین نہیں بلکہ اللہ کے رازوں کے بھی امین ہیں اور پھر انہیں اپنے نفس کے مانند قرار دے کر دوسروں پر ان کی فضیلت کو واضح کیا۔ کیونکہ جو نفس مثل رسولؐ ہو گا اس کی فوقیت بھی اسی طرح ناقابلِ انکار ہو گی جس طرح خود رسول اللہ کی فضیلت و فوقیت ناقابلِ انکار ہے۔

تقسیمِ غنائم

پیغمبر اکرم طائف سے پلٹ کر ۵ ذی قعدہ کو وادی جعرانہ میں قیام فرما ہوئے تو بنی ہوازن کا

ایک وفد اسلام لا کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور التجا کی کہ ہمارے اسیروں کو رہا کر دیا جائے۔ بنی سعد کے ایک سردار زہیر ابن صرد نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ ان قیدیوں میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں جنہوں نے آپ کو گودیوں میں کھلایا ہے۔ اگر کسی سردار عرب نے ہمارے قبیلہ کی کسی خاتون کا دودھ پیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کا لحاظ کرتا اور حسن سلوک سے پیش آتا۔ آپ بھی ہم سے حسن سلوک کریں اور آپ سے بڑھ کر حسن سلوک کی کس سے امید کی جا سکتی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جب مسلمان جمع ہوں تو تم ان سے قیدیوں کی رہائی کے بارے میں کہنا میں اس موقع پر اپنے اور اولادِ عبد المطلب کے حصہ میں آنے والے اسیروں کی رہائی کا اعلان کر دوں گا۔ چنانچہ جب مسلمان نماز ظہر سے فارغ ہوئے تو ان لوگوں نے کہا کہ اے مسلمانو رسولِ خداؐ نے ہمارے قبیلہ کی ایک خاتون کا دودھ پیا ہے تم ہمارے اسیروں کو چھوڑ دو۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میں اپنا اور بنی عبد المطلب کا حصہ تمہیں بخشتا ہوں۔ مہاجرین و انصار نے کہا کہ ہمارا مال رسولؐ اللہ کا مال ہے ہم ان قیدیوں سے دستبردار ہوتے ہیں۔ البتہ اقرع ابن حابس عباس ابن مرداس اور عیینہ ابن حصن نے اس میں کچھ پس و پیش کیا۔ جب اسیر رہا ہو گئے تو آنحضرتؐ نے ارکانِ وفد سے مالک ابن عوف نضری کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے کہا کہ وہ بنی ثقیف کے ہمراہ طائف میں مقیم ہے۔ فرمایا کہ مالک کو پیغام بھیجو کہ اگر وہ یہاں آئے گا تو اس کے اہل و عیال واپس کر دیئے جائیں گے۔ جب مالک کو یہ پیغام ملا تو وہ چپکے سے راتوں رات نکل کھڑا ہوا اور جعرانہ میں پہنچ کر خدمتِ رسولؐ میں باریاب ہو گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ پیغمبرؐ نے اس کا مال اور اس کے اہل و عیال اس کے سپرد کیے اور سو اونٹ بھی عطا فرمائے۔

جب اسیرانِ ہوازن کو واپس کر دیا گیا تو مسلمانوں نے مالِ غنیمت کی تقسیم پر اصرار کیا اور کہا یا رسولؐ اللہ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کو یہیں پر بانٹ دیجئے۔ پیغمبرؐ نے اجازت دی اور تقسیم شروع ہو گئی۔ آنحضرتؐ نے اپنے حصہ خمس میں سے تازہ مسلمانوں کو ان کی دلجوئی اور تالیف قلب کے لئے سو سو اونٹ دیئے۔ ابو سفیان اور اور اس کے دونوں بیٹوں معاویہ اور یزید کو بھی سو سو اونٹ دیئے۔ ان کے علاوہ اقرع ابن حابس، عیینہ ابن حصن اور کچھ اور لوگوں کو بھی سو سو اونٹ ملے اور کچھ لوگوں کو پچاس پچاس۔ اور عام طور پر ہر شخص کو چار اونٹ اور چالیس بکریاں دی گئیں۔ انصار کو بھی یہی کچھ ملا جس پر انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ آنحضرتؐ نے اپنے قوم و قبیلہ والوں سے ترجیحی سلوک کیا ہے حالانکہ ہم نے اس وقت دستِ تعاون بڑھایا جب اُن کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا اور وہ قریش ہی تھے جو ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ کے کانوں تک انصار کا یہ شکوہ پہنچا تو انہیں جمع کر کے سمجھایا کہ ان لوگوں سے یہ برتاؤ محض اس لئے کیا گیا ہے تاکہ وہ ثابت قدم رہیں اور بددل ہو کر اسلام سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ اے گروہِ انصار تم اس پر خوش نہیں ہو کہ اُن

کے ہمراہ اونٹ اور بکریاں ہوں اور تمہارے ہمراہ اللہ کا رسولؐ ہو۔ یہ سننا تھا کہ انصار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے کہ یا رسولؐ اللہ ہم اس تقسیم پر بدل و جان راضی ہیں کہ اُن کے حصہ میں مالِ دنیا ہو اور ہمارے حصہ میں آپ ہوں۔ آنحضرتؐ نے انصار کے اس رویہ سے خوش ہو کر اُن کے اور اُن کی اولاد کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

عباس ابن مرداس اسلمی بھی عام حصہ سے زیادہ کا خواہشمند تھا اور اس نے چند شکوہ آمیز اشعار کہہ کر اس تقسیم پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان میں سے دو شعر یہ ہیں:۔

وما کان حصن و حابس یفوقان مرداس فی المجمع

حصن اور حابس کسی بزم میں میرے باپ مرداس سے فائق نہ تھے۔"

وما کنت دون امرءٍ منہما ومن تضع الیوم لا یرفع

اور نہ میں ان دونوں (عیینہ اور اقرع) سے پست ہوں آج جسے آپ گرائیں گے وہ بلند نہ ہو سکے گا۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا اقطعوا عنی لسانہ " اس کی زبان قطع کرو۔" پیغمبرؐ کا مقصد یہ تھا کہ اسے کچھ اور دے کر اس کی زبان درازی ختم کی جائے۔ مگر وہ یہ سمجھا کہ پیغمبرؐ نے اس کی زبان قطع کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ یہ سزا سن کر کانپ اٹھا اور جب حضرت علیؑ نے اسے اپنے ہمراہ چلنے کے لئے کہا تو اس نے پوچھا کہ آپ مجھے کہاں لئے جاتے ہیں؟ فرمایا رسولؐ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کے لئے۔ چنانچہ وہ آپ کے ساتھ ہو لیا اور اس جگہ پر پہنچ کر جہاں غنیمت کے اونٹ چر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ ان اونٹوں میں سے اور اونٹ لے کر سو کی تعداد پوری کر لو اور مولفۃ القلوب میں شامل ہو جاؤ یا انہی چار اونٹوں پر قناعت کر کے مہاجرین میں شامل رہو کہا کہ میرے پاس وہی چار اونٹ رہنے دیجئے جو میرے حصہ کے ہیں میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ زیادہ اونٹ لے کر مؤلفۃ القلوب میں شمار ہونے لگوں۔

امیرالمومنینؑ نے اس کے سامنے دونوں صورتیں اور ہر صورت میں مرتب ہونے والا نتیجہ واضح کر کے اسے دے دیا کہ چاہے وہ شرفِ ہجرت کو برقرار رکھے اور چاہے اس شرف سے دستبردار ہو کر اونٹوں کی گنتی بڑھا لے اگر حضرتؑ کچھ کہے سنے بغیر فوراً اونٹ اس کے حوالے کر دیتے تو اسے مال کی طبعی محبت میں یہ نہ سوجھتا کہ یہ طمع اور حرص اسے کس پستی میں لے جا رہی ہے۔ مگر حضرتؑ نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر اُسے یہ سوچنے کا موقع دیا کہ وہ کون سی راہِ عمل اختیار کرے وہ کہ جس میں بلندئ نفس برقرار رہتی ہے یا وہ کہ جس میں عزتِ نفس پامال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی احساس دلانے کا یہ اثر تھا کہ اس نے بلندی سے پستی میں گرنے سے اپنے کو بچا لیا اور چند اونٹوں کی خاطر مولفۃ القلوب میں شمار ہونا گوارا نہ کیا۔

اس تقسیم سے فارغ ہو کر پیغمبر اکرمؐ مکہ میں تشریف فرما ہوئے اور مناسکِ عمرہ بجا لائے۔ عتاب ابن اسید کو عامل مکہ مقرر کیا اور معاذ ابن جبل کو قرآن و احکام شرعیہ کی تعلیم پر مامور فرمایا اور مکہ سے روانہ ہو کر اوائل ذی الحجہ میں مدینہ پہنچ گئے۔

یمن میں نشرِ اسلام

سنہ ۸ھ میں پیغمبر اکرمؐ نے خالد ابن ولید کو صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے یمن روانہ کیا جہاں ان لوگوں نے چھ مہینے قیام کیا۔ اور اس عرصہ میں وہاں کے باشندوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے مگر ان کی تبلیغی کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ نہ کسی نے ان کی باتوں پر کان دھرا اور نہ کسی نے کوئی اثر لیا۔ براء ابن عازب جو اس جماعت میں شریک تھے وہ کہتے ہیں:۔

بعث رسول اللہ خالد ابن الولید الی اھل الیمن یدعوھم الی الاسلام فکنت فیمن سار معہ فاقام علیہ ستۃ اشھر لا یجیبونہ الی شیئ۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۸۹)	رسولِ خدا نے خالد ابن ولید کو اہلِ یمن کی طرف بھیجا تا کہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ ان کے ساتھ جانے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ وہ چھ مہینے وہاں ٹھہرے مگر کسی نے ان کی کوئی بات نہ مانی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس تبلیغی مشن کی ناکامی کا علم ہوا تو آپ نے علی ابن ابی طالب کو اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے بھیجا۔ اور فرمایا کہ خالد اور اُن کے ہمراہیوں کو واپس بھیج دو اور اگر کوئی اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ رہنا چاہے تو وہ رہ جائے۔ براء ابن عازب کہتے ہیں کہ میں نے واپس آنے کے بجائے حضرت کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ جب اہلِ یمن کو یہ اطلاع ہوئی کہ خالد اور ان کے ہمراہی واپس جا رہے ہیں۔ اور حضرت علیؑ ایک داعی و مبلغ کی حیثیت سے آئے ہیں تو وہ سب ایک جگہ پر جمع ہو گئے۔ حضرت علی نمازِ صبح سے فارغ ہو کر ان کے ہاں گئے اور رسولِ خدا کا خط جو اہلِ یمن کے نام تھا پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد اسلام کے محاسن پر ایک خطبہ دیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جو لوگ خالد کی چھ ماہ کی تبلیغ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے اسلام کی خوبیوں کے معترف ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ مورخ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

اسلمت ھمدان کلھا فی یوم واحد۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۳۹۰)	تمام قبیلۂ ہمدان ایک ہی دن میں مسلمان ہو گیا۔

حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کو قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی اطلاع دی تو آنحضرتؐ سجدۂ شکر بجالائے اور تین مرتبہ فرمایا:۔ السلام علی ھمدان۔ "ہمدان پر میرا سلام ہو"

جنگ صفین میں یہ قبیلہ ہمدان حضرت علیؑ کا بازوئے شمشیر زن تھا اور آپ نے ان کی جانفشانیوں اور معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر فرمایا تھا:۔

ولو کنت بوابا علی باب جنۃ　　　لقلت لھمدان ادخلوا بسلام

"اگر میں جنت کے دروازہ کا دربان ہوتا تو قبیلہ ہمدان سے کہتا کہ سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ"

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کے بعد یمن میں اسلام کی ترقی و فروغ کی راہیں کھل گئیں لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کفر کی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ آفتاب ہدایت کی درخشندگیوں سے ظلمت کدۂ کفر میں اجالا ہو گیا۔ ہر طرف توحید کی صدائیں گونجنے لگیں اور نسیم ایمان کے جھونکوں سے دل و دماغ ترو تازہ ہو گئے۔

امارتِ یمن

حضرت علیؑ کی یک روزہ تبلیغ سے گو اہل یمن مسلمان ہو گئے مگر ابھی اسلام کے تعلیمات سے پوری طرح باخبر نہ ہوئے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ انہیں حلال و حرام کی تعلیم دی جائے واجبات و محرمات بتائے جائیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے مقدمات فیصل کئے جائیں۔ آنحضرتؐ نے ان امور کو سرانجام دینے کے لئے حضرت علیؑ کو دوبارہ یمن جانے کا حکم دیا۔ اس اہم منصب کے لئے ذہن رسا فکر بلند اور تجربہ و مہارت کی ضرورت ناقابل انکار ہے۔ حضرت علیؑ کی ذہنی و فکری بلندی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سرزمین حجاز سے باہر نکل کر اس طرح کے کام کا پہلا تجربہ تھا اس لئے اس عظیم ذمہ داری کے قبول کرنے میں کچھ متردّد ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ابھی میرا سن زیادہ نہیں ہے اور اس قسم کے کاموں سے نہ سابقہ پڑا ہے اور نہ ہی تجربہ ہے کیا کسی مشیر کار کے بغیر اس مہم کو سر کر لوں گا۔ آنحضرتؐ نے اپنا ہاتھ علیؑ کے سینہ پر رکھا اور فرمایا:۔

اللھم اھد قلبہ وسدد لسانہ　　　اے اللہ علیؑ کے دل کو ہدایت آشنا اور زبان کو عیب و غلطی سے پاک رکھ۔

(استیعاب۔ ج ۳۔ صہ ۳۶)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں کبھی شک و تردد لاحق نہیں ہوا اور یقین و خود اعتمادی کا جوہر میرے اندر پیدا ہو گیا۔

اس موقع پر مہاجرین و انصار اور صحابہ کبار موجود تھے مگر پیغمبرؐ نے حضرت کو جوانی کی منزل میں ہونے کے باوجود امارتِ یمن کے لئے نامزد کیا۔ اس سلسلہ میں نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کی رائے دریافت کی اس لئے کہ پیغمبرؐ کو اعتماد و وثوق تھا کہ علیؑ اس منصب کے سزاوار ہیں اور جو کام انہیں سپرد کیا گیا ہے اسے باحسن وجوہ سرانجام دیں گے اسی اعتماد کی بناء پر پیغمبرؐ نے انہیں اپنی زندگی میں بھی امور امت کے حل و انصرام اور فصل قضایا کا کام سپرد کیا اور زندگی کے بعد کے لئے بھی ان امور کی انجام دہی آپ سے متعلق کر گئے۔ چنانچہ پیغمبرؐ اکرم کا ارشاد ہے :۔

تبین لامتی ما اختلفوا فیہ بعدی۔ (مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ ص ۱۲۲)

(اے علیؑ) تم میرے بعد میری امت کے باہمی اختلافات کا تصفیہ کرو گے۔"

اگر امامت صلوٰۃ کو خلافت کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے تو امارتِ یمن سے حضرت علیؑ کے استحقاقِ خلافت پر کیوں دلیل قائم نہیں ہو سکتی جب کہ امامتِ نماز اور قیادتِ امت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور امارت و خلافت کے فرائض ایک سے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تمدن کا تحفظ مملکت کا نظم و انضباط اور فصل قضایا ایسے امور ہیں جو امارت سے بھی وابستہ ہیں اور خلافت سے بھی۔ لہذا جسے امارت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل قرار دیا تھا اسے ہی خلافت کا اہل سمجھا جا سکتا ہے۔

سریہ وادی الرمل

وادی الرمل میں کچھ لوگوں نے جمع ہو کر مدینہ پر شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا ابھی وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ ایک شخص کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ یہ لوگ منظم اور باقاعدہ فوج کی صورت میں نہ تھے بلکہ راہزنوں اور قزاقوں کا ایک جتھا تھا جو قتل و غارت اور لوٹ مار کے لئے جمع ہو گیا تھا۔ آنحضرتؐ نے انہیں پراگندہ و منتشر کرنے کے لئے حضرت ابوبکر کو علم دے کر ایک دستہ سپاہ کے ساتھ ان کے تعاقب میں بھیجا۔ جب یہ دستہ وادی الرمل میں پہنچا تو وہ کمین گاہوں میں چھپ گئے۔ مسلمانوں نے اِدھر اُدھر دیکھا بھالا مگر ان میں سے کوئی دکھائی نہ دیا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ وہ سپاہِ اسلام کو دیکھ کر یہاں سے چل دیے ہیں۔ مسلمان تھکے ماندے تو تھے ہی رات بسر کرنے کے لئے وہیں پر اتر پڑے۔ دشمن کی طرف سے مطمئن تو تھے ہی پڑ کر سو رہے ابھی سوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ دشمن نے کمین گاہوں سے نکل کر اچانک حملہ کر دیا۔ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ہتھیار ٹٹولے اور پھر سنبھل کر کچھ دیر لڑے مگر نتیجہ میں کچھ مارے گئے کچھ زخمی ہوئے اور کچھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

ان لوگوں کی واپسی پر آنحضرتؐ نے حضرت عمر کو علم دے کر بھیجا۔ دشمن کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اس نے فوج کو آتے دیکھا تو کمین گاہوں سے نکل کر حملہ آور ہوئے اور اس طرح تابڑ توڑ حملے کئے کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے ان دو ہزیمتوں کے بعد عمرو ابن عاص نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں دشمن کی سرکوبی کے لئے جاؤں۔ آنحضرتؐ نے ان کی خواہش پر انہیں سردار لشکر بنا کر بھیجا مگر نتیجہ وہی ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ ان پے درپے ہزیمتوں کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو سالار لشکر بنا کر بھیجا اور ہزیمت خوردہ لوگوں کو بھی ان کی سپاہ میں شامل ہونے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ نے پہلے تو یہ کیا کہ وہ راستہ تبدیل کر دیا جس راستے سے پہلے لوگ گئے تھے اور پھر دن کا قیام اور رات کا سفر اختیار کیا اور خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے اچانک دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ ابھی سورج کی کرنوں نے پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں کو چھوا نہ تھا کہ ان کے سروں پر تلواریں چمکنے لگیں۔ دشمن اس ناگہانی حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمان فتح کا پرچم لہراتے ہوئے مدینہ کی طرف چل دیے۔ پیغمبر اکرمؐ نوید فتح سن کر مدینہ سے باہر استقبال کے لئے نکلے اور فتح و کامرانی پر اظہار مسرت کے بعد فرمایا:۔

یا علی لولا اننی اشفق ان تقول	اے علیؑ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری اُمت
فیک طوائف من امتی ماقالت	کے کچھ لوگ تمہارے بارے میں وُہ کہیں گے جو عیسائی
النصاری فی المسیح عیسیٰ ابن	حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے بارے میں کہتے ہیں تو میں
مریمؑ لقلت فیک الیوم مقالا لا	تمہارے بارے میں وہ بات کہتا کہ تم جدھر سے ہو کر
تمر بملاٍ من الناس الا اخذوا التراب	گزرتے لوگ تمہارے قدموں کے نیچے کی مٹی تک اٹھاتے
من تحت قدمیک (ارشاد شیخ مفیدؒ)	

اس مہم کی کامیابی حضرت علیؑ کے تدبّر اور جنگی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے سابقہ مہموں کی ناکامی کے وجوہ و اسباب پر نظر کی اور وہ طریقہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں کامیابی کی صورت بآسانی نکل سکتی تھی۔ پہلی مہم نے سستی و غفلت سے کام لیا اور دشمن کی قیام گاہ پر پہنچ کر یہ خیال نہ کیا کہ وہ یہیں آس پاس چھپے ہوں گے وُہ پہلے چھپنے کی جگہوں کو دیکھتے اور پھر سب کے سب سو نہ جاتے بلکہ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے تاکہ بروقت دشمن کے حملہ کو روک سکتے۔ مگر اس طرف توجہ نہ دی گئی اور آخر اس غفلت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور دوسری اور تیسری سپاہ سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے وہی عام راستا اختیار کیا جس پر دشمن کی نگاہیں برابر لگی رہتی تھیں امیرالمومنینؑ نے جہاں راستہ تبدیل کیا وہاں سفر کے اوقات بھی بدل دیئے اور اس وقت حملہ کیا جب دشمن مطمئن اور اس کی آنکھوں میں رات کی نیند کا خمار باقی تھا تاکہ دشمن کے سنبھلنے سے پہلے جکڑ لیا جائے۔ اگر آپ بھی وہی طریق کار

اختیار کرتے جو پہلے اختیار کیا جاتا رہا تھا تو پھر اس آسانی سے کامیابی نہ ہوتی۔

سریہ بنی طے

فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ سے بتوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ غزوۂ طائف کے دوران بنی ثقیف و بنی ہوازن کے بت توڑے جا چکے تھے اور مختلف قبیلوں اور علاقوں کے صنم کدے ویران ہو چکے تھے مگر بنی طے کا بت خانہ ابھی جوں کا توں باقی تھا۔ جس میں فلس نام کا ایک بت ان کی عقیدت و ارادت کا مرکز تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے بھی منہدم کرنے کا ارادہ کیا اور ربیع الآخر ۹ھ میں حضرت علیؑ کو بنی طے کی بستیوں کی طرف بھیجا تاکہ ان کے بتخانے کو مسمار کریں اور صنم پرستی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیں۔ حضرت علیؑ نے ڈیڑھ سو انصار کی جمعیت کے ساتھ بنی طے کی بستیوں کا رُخ کیا۔ بنی طے کا سردار عدی ابن حاتم لشکر اسلام کی آمد پر اپنے اہل و عیال کو لے کر شام کی طرف نکل گیا اور وہاں پناہ لے لی۔ حضرتؑ نے محلہ آلِ حاتم پر حملہ کر کے اُن کے بت خانہ کو پیوند زمین کر دیا۔ اس بت خانہ سے تین قیمتی زرہیں اور تین تلواریں رسوب، مخذم اور یمانی دستیاب ہوئیں۔ ان میں سے رسوب اور مخذم عرب کی مشہور تلواریں تھیں۔ جنہیں حارث ابن ابی شمر نے بت خانہ کی نذر کیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سا مالِ غنیمت چند اسیر اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ حضرت علیؑ نے کچھ مالِ غنیمت شرکاء مہم پر حصہ رسدی تقسیم کر دیا اور بقیہ مالِ غنیمت اور اسیروں کو لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ان اسیروں میں حاتم کی بیٹی سفانہ بھی تھی۔ جسے مسجد سے متصل جہاں کنیزیں ٹھہرائی جاتی تھیں ٹھہرایا گیا۔ انہی ایام میں پیغمبرؐ ادھر سے ہو کر گزرے تو اس نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ میرا باپ مر چکا ہے اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ مجھ پر احسان کیجئے اور مجھے چھوڑ دیجئے۔ خدا آپکو اس احسان کا بدلہ دے گا۔ فرمایا تم کون ہو؟ کہا میں عدی ابن حاتم کی بہن سفانہ ہوں۔ فرمایا وہی عدی جو اللہ اور اس کے رسول سے منہ موڑ کر چل دیا ہے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن پھر گزر ہوا تو اس نے رہائی کی التجا کی آپ نے وہی جواب دیا جو پہلے دے چکے تھے اور آگے نکل گئے۔ سفانہ کہتی ہے کہ اب مجھے رہائی سے ناامیدی ہو گئی۔ تیسرے دن جب رسولؐ اللہ ادھر سے گزرنے لگے تو مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ دو دفعہ میری التجا کو ٹھکرایا جا چکا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ کچھ عرض کروں یا خاموش رہوں کہ آنحضرتؐ کے عقب سے ایک شخص نے مجھے اشارہ کیا کہ میں پیغمبرؐ سے رہائی کے بارے میں پھر کہوں۔ میری ہمت بندھی اور میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے میری قوم میں رسوا نہ کیجئے میں بنی طے کے سردار حاتم

کی بیٹی ہوں میرا باپ فیاض اور سخی تھا۔ قیدیوں کو چھڑاتا، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کرنا اس کا کام تھا۔ فرمایا کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ یہ اس باپ کی بیٹی ہے جو کریم اور بلند اخلاق کا مالک تھا۔ پھر سفانہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم چند دن صبر کرو۔ جب قابلِ اعتماد لوگ مل جائیں گے تو تمہیں ان کے ساتھ بہ حفاظت تمہارے عزیزوں تک پہنچا دیا جائے گا۔ سفانہ کہتی ہے کہ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ کون تھا جس نے مجھے اشارہ کیا تھا کہ میں پیغمبرؐ سے پھر درخواست کروں۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ابن عم رسولؐ اللہ علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے۔ چند دنوں کے بعد بنی قضاعہ کا ایک قافلہ مدینہ آیا۔ سفانہ نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ مجھے ان کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔ پیغمبرؐ نے اس کے لئے زاد و راحلہ کا سرو سامان کیا اور چند پارچے دے کر اُسے ان لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

جب سفانہ اپنے بھائی عدی کے پاس شام پہنچی تو پہلے اس سے شکوہ کیا کہ تم مجھے تنہا چھوڑ کر یہاں چلے آئے اور پھر حضرت علیؑ کے اشارہ کا جس کے نتیجہ میں رہائی نصیب ہوئی تھی اور پیغمبر اکرمؐ کے حسن سلوک کا ذکر کر کے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ تم جلد ان کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ اگر وہ نبی ہیں تو تمہیں ایمان لانے والوں کی صف اول میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہو گا۔ اور اگر وہ بادشاہ ہیں تو تم ان کے قرب سے دنیوی عز و وقار حاصل کر سکو گے۔ عدی کہتا ہے مجھے یہ رائے پسند آئی اور میں مدینہ کے لئے روانہ ہو گیا جب مسجد نبویؐ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوا تو عرض کیا کہ میں عدی ابن حاتم ہوں۔ آنحضرتؐ میری آمد پر خوش ہوئے اور مجھے ساتھ لے کر گھر کی طرف چل دیئے۔ راستے میں ایک ضعیفہ کے کہنے پر ٹھہر گئے اور دیر تک اس کی داد فریاد سنتے رہے۔ میں نے دل میں کہا کہ ایسا آدمی جس میں ذرا سا شاہانہ رکھ رکھاؤ اور خو بو نہ ہو وہ بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اور جب میں ان کے ہمراہ گھر میں داخل ہُوا تو میرے لئے اپنی مسند بچھا دی اور خود زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے پھر اپنے دل میں کہا کہ یہ طرزِ عمل بھی شاہوں کا طرزِ عمل نہیں ہے۔ ابھی میں ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اے عدی تم غنائم میں چوتھا حصہ لیتے ہو حالانکہ تمہارے مذہب عیسوی میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ شاید تم اس لئے اسلام سے گریزاں ہو کہ ہمارے ہاں غربت ہے اور گرد و پیش دشمنوں کی کثرت ہے۔ مگر یہاں بھی مال کی اتنی فراوانی ہو گی کہ ڈھونڈے سے بھی کوئی لینے والا نہ ملے گا۔ عورتیں گھروں سے تن تنہا زیارتِ بیت اللہ کے لئے آئیں گی اور انہیں کوئی خطرہ نہ ہو گا اور تم سنو گے کہ بابل کے قصر ابیض مفتوح ہو کر مسلمانوں کی جولانگاہ بن گئے ہیں۔

عدی نے اپنی آنکھوں سے اس خلق مجسم کے اخلاق و اطوار دیکھے اور دل میں اتر جانے والی باتیں سنیں تو اسی وقت آپ کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا اور پھر امیرالمومنینؑ کے اصحاب مخلصین میں شامل

ہو کر جمل و صفین اور نہروان کے معرکوں میں آپ کے ہمرکاب رہا۔

غزوۂ تبوکؐ

شام کے ایک کاروانِ تجارت کے ذریعہ مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ قیصرِ روم ہرقل مدینہ پر فوج کشی کر رہا ہے اور عیسائی قبائل بنی غسان بنی لخم بنی جذام اور بنی عاملہ اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے ہیں اور بنی غسان نے اپنی مملکتِ شام کو چھاؤنی قرار دے کر روم و شام کی فوجوں کو جمع کر لیا ہے اور مقدمۃ الجیش بلقاء کے حدود تک پہنچ چکا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان اطلاعات کی بناء پر مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مسلمانوں نے اب تک جتنی جنگیں لڑی تھیں وہ اندرون ملک تک محدود تھیں۔ اور کسی بیرونی غنیم سے مقابلہ کی نوبت نہ آئی تھی۔ اور یہ جنگ نہ صرف بیرون ملک لڑی جانے والی تھی بلکہ اس دور کی سب سے بڑی شہنشاہیت سے تھی جس کی فتوحات کا سلسلہ فارس تک پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے پیغمبرؐ کا حکم سنا تو جوش و سرگرمی کے بجائے افسردگی و بددلی کا مظاہرہ کیا۔ اس بددلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ عرصہ سے خشک سالی کے باعث پیداوار کم ہو رہی تھی۔ فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ اور کٹائی کے دنوں میں پکی ہوئی کھیتیوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کو چھوڑ کر سفرِ جنگ پر نکلنا شاق گزر رہا تھا۔ اس کے علاوہ تڑاقے کی گرمی پڑ رہی تھی۔ دُور کا سفر اور سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ مسلمان ان صبر آزما حالات میں جی چھوڑ بیٹھے اور جنگ سے بچنے کے لئے حیلے بہانے کرنے لگے۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے :۔

یا ایھا الذین آمنوا ما لکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیٰوۃ الدنیا من الآخرۃ۔	اے ایمان لانے والو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو تو تمہارے قدم زمین میں گڑ جاتے ہیں۔ کیا آخرت کے بجائے تم اسی دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو۔

جب تہدیدی آیتوں کے ذریعہ مسلمانوں پر دباؤ پڑا اور انہیں قدم بڑھائے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا تو کچھ خوش خوش اور کچھ مارے بندھے اس مہم پر جانے کے لئے آمادہ ہو گئے اور کچھ جھوٹی سچی باتیں بنا کر گھروں کے گوشوں میں پڑے رہے۔ آنحضرتؐ نے مدینہ و اطراف مدینہ سے مالی و فوجی کمک لے کر تیس ہزار کا لشکر ترتیب دیا اور ماہِ رجب ۹ھ میں مدینہ سے حرکت کی اور ثنیۃ الوداع میں پہلا پڑاؤ ڈالا۔ عبداللہ ابن ابی بھی

اپنے گروہ کو لے کر نکلا اور ثنیۃ الوداع کے نشیبی حصہ میں خیمہ زن ہوا۔ مگر جب رسولؐ اللہ لشکر کو لے کر آگے بڑھے تو وہ اپنی جماعت سمیت واپس آ گیا۔

مسلمانوں کی اس عظیم اکثریت کے چلے جانے کے بعد ان منافقین سے جو مدینہ میں رہ گئے تھے یا منزل پر پہنچنے سے پہلے راستے ہی سے واپس آ رہے تھے یہ قوی اندیشہ تھا کہ اگر سپاہ اسلام کو شکست ہوئی جیسا کہ عبداللہ ابن ابی کا خیال تھا یا سفر کی مدت طویل ہو گئی تو وہ مدینہ کا گھر بار لوٹ لیں گے اور ان کے اہل عیال کو شہر سے باہر نکال دیں گے اسی طرح ان لوگوں سے بھی خطرہ تھا جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے یا اہل اسلام کے مقابلہ میں شکست کھا چکے تھے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدینہ پر تاخت و تاراج کریں اور اسلامی دارالسلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر تدبر و دور اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ مدینہ کے اندر ایک ایسے شخص کو نگران بنا کر مدینہ پر چھوڑا جائے جو بہادر نڈر اور دشمن کے عزائم کو کچلنے پر قادر ہو۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بناء پر پیغمبر اکرمؐ حضرت علیؑ کو جو اپنے زورِ بازو کی دھاک عرب پر بٹھا چکے تھے۔ اپنا قائم مقام بنا کر مدینہ میں چھوڑ گئے تاکہ کفر و نفاق کی طاغوتی طاقتوں کو ابھرنے کا موقع نہ ملے۔ اور اگر کچھ فتنہ پرداز فتنہ برپا کرنا چاہیں تو انہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔ منافقین مدینہ کو حضرتؑ کی یہ موجودگی بری طرح کھلی۔ وہ کوئی بات نہ بنا سکے تو یہ کہنے لگے :۔

ماخلفه الا استثقالا له وتخففاً منه۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صـ ۳۶۸)

"پیغمبرؐ انہیں بار خاطر سمجھتے ہوئے اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے یہاں چھوڑ گئے ہیں"

حضرت علیؑ جو کفار کو پیہم شکست دیتے چلے آ رہے تھے اس غزوہ میں اپنی عدم شمولیت کو محسوس تو کر ہی رہے تھے جب منافقین کی زبان سے یہ طنزیہ بات سنی تو آپ سے رہا نہ گیا فوراً ہتھیار سجے اور لشکر کے تعقب میں چل دیئے اور مدینہ سے کچھ فاصلہ پر وادیٔ جرف میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ علی کیسے آئے؟ عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ منافق یہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے بار خاطر سمجھتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ فرمایا وہ جھوٹ کہتے ہیں اور وہ اس سے پہلے بھی مجھ پر جھوٹ باندھتے رہے ہیں۔ میں تمہیں مدینہ اس لئے چھوڑے جاتا ہوں کہ اس کا نظم و ضبط میرے یا تمہارے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور تم میرے اہلبیت اور میری امت میں میرے جانشین و قائم مقام ہو۔

اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی۔ (صحیح بخاری۔ ج ۳۔ صـ ۵۴)

"کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے"

حضرت علیؑ یہ نوید سن کر خوش خوش مدینہ واپس چلے آئے اور پیغمبر اکرمؐ لشکر کو لے کر سرحد شام کی جانب روانہ ہوگئے۔ اس راہ میں قوم ثمود کی ویران بستیاں پڑتی تھیں۔ جب پیغمبرؐ اس سرزمین پر پہنچے تو لشکر والوں کو حکم دیا کہ وہ یہاں کے کنوؤں سے پانی نہ لیں نہ اس سے وضو کریں اور نہ کھانے پینے کے کام میں لائیں۔ اور جب وہاں کے کھنڈروں پر نظر پڑی تو اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سواری کو مہمیز کر کے تیزی سے آگے نکل گئے۔ دوسرے دن مسلمانوں کے پاس پانی نہ رہا تو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے ہمیں پانی لینے سے منع کیا تھا اب اس صحرائے بے آب میں پانی کہاں سے آئے گا۔ آنحضرتؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے دعا کے ختم ہوتے ہی افق پر بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لشکر والوں نے پانی پیا اور اپنے مشکیزے بھر لئے۔

یہ خشک اور بے آب صحراؤں کا طویل سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ پندرہ بیس آدمیوں کے حصہ میں ایک سواری آتی تھی جس پر باری باری سوار ہوتے اور زیادہ مسافت پیادہ پاطے کرتے۔ پیٹ بھرنے کے لئے سوکھے ٹکڑے میسر نہ تھے اور پانی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ ان صعوبتوں کو جو لوگ برداشت نہ کر سکتے وہ واپس چلے جاتے۔ آنحضرتؐ کو ان جانے والوں کی اطلاع دی جاتی تو فرماتے اگر ان میں بھلائی ہو گی تو پلٹ آئیں گے اور اگر نہیں تو ہمارے سر سے بوجھ اترا۔ حضرت ابوذر غفاری اونٹ کے خستہ ہو جانے کی وجہ سے پیچھے رہ گئے تو لوگوں نے ان کے بارے میں بھی کہا کہ یا رسول اللہ ابوذر بھی گئے۔ آپ نے ان کے بارے میں بھی یہی فرمایا کہ اگر ان میں نیکی کا جذبہ ہوگا تو وہ تم سے آکر مل جائیں گے۔ اُدھر حضرت ابوذر نے جب یہ دیکھا کہ اونٹ چلنے سے رہ گیا ہے تو انہوں نے اپنا سامان اپنی پشت پر لادا اور پیادہ پا چل دیئے۔ لشکر کے کچھ آدمیوں نے انہیں دُور سے آتے دیکھا تو کہا یہ کون ہو سکتا ہے جو اکیلا چلا آ رہا ہے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابوذر ہوں گے۔ جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو کہا ہاں یا رسول اللہ ابوذر ہی ہیں۔ فرمایا :-

یرحم اللہ ابوذر یمشی وحدہ ویموت وحدہ ویبعث وحدہ۔	"خدا ابوذر پر رحم کرے وہ اکیلے آ رہے ہیں، اکیلے مریں گے اور اکیلے ہی قیامت میں اٹھائے جائیں گے"
(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۳۶۱)	

جب لشکر اسلام تبوک میں پہنچا تو وہاں پر پڑاؤ ڈال دیا۔ مگر دُور دُور تک نہ رومی عساکر نظر آئے اور نہ ایسے آثار دکھائی دیئے جن سے دشمن کے جنگی عزائم کی نشاندہی ہوتی۔ پیغمبرؐ نے بیس دن وہاں قیام کیا مگر کسی سمت سے فوجوں کی نقل و حرکت کی خبر نہ آئی اور شامی تجار کی پھیلائی ہوئی خبر بے حقیقت اور ان

کی غلط خیالی و غلط فہمی کا نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس عرصہ میں آنحضرتؐ نے اطراف جوانب کے سرداروں کے پاس وفود بھیجے کہ وہ اسلام قبول کریں یا جزیہ دے کر اسلامی رعایا میں داخل ہوں۔ ایلہ کا سردار یوحنا ابن رؤبہ آنحضرتؐ کے آنے کی خبر سن کر فوراً حاضر ہو گیا اور تین سو دینار جزیہ پر اس نے مصالحت کر لی اسی طرح جربا اذرح اور مقنا کے عیسائی جزیہ پر راضی ہو گئے اور پیغمبر اکرمؐ سے امان نامہ حاصل کر لئے۔ دومۃ الجندل کے حاکم اکید ابن عبدالملک کو اسیر کر کے لایا گیا اور آخر اس نے بھی جزیہ قبول کر لی۔ جب پیغمبر اکرمؐ دشمن کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو لشکر کو واپس مدینہ جانے کا حکم دے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ لشکر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور مدینہ کی طرف راہ سپار ہو گیا۔ مدینہ و تبوک کی گزرگاہ میں ایک وادی پڑتی تھی جس کا نام مشقق تھا یہاں ایک چشمہ تھا جس سے پانی کم مقدار میں رستا تھا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جو لوگ وادیٔ مشقق میں ہم سے پہلے پہنچیں وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے پانی نہ پئیں۔ مگر چند آدمی جو پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے تمام پانی جو رس رس کر جھری میں پہنچ چکا تھا ختم کر ڈالا۔ جب پیغمبر وہاں آئے تو دیکھا کہ گڑھا خالی پڑا ہے پوچھا کہ یہاں پہلے کون آیا تھا؟ لوگوں نے پہلے آنے والوں کے نام لئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کیا ہم نے منع نہیں کیا تھا کہ جب تک ہم نہ آجائیں اس میں سے پانی نہ لیں۔ علامہ طبری لکھتے ہیں:۔

ثم لعنہم رسول اللہ ودعا علیہم — پھر رسول اللہؐ نے ان پر لعنت اور انہیں بددعا دی۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۳۷۳)

آنحضرتؐ نے پانی کی کمی کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اس رستے ہوئے پانی کے نیچے اوک کی صورت میں پھیلا دیا۔ جب ہاتھوں میں پانی بھر گیا تو دعا پڑھ کر اسی میں انڈیل دیا۔ دعا نے اپنا اثر دکھایا زمین کے بندھن ٹوٹے پانی جوش مارتا ہوا پھوٹ نکلا اور خشک لبوں کی سیرابی کا سامان ہو گیا۔

اس واپسی کے موقع پر ایک اور افسوس ناک واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ جب پیغمبر اکرمؐ عقبہ ذی فتق کے قریب پہنچے تو اس خیال سے کہ پہاڑوں کے بیچ میں سے ہو کر گزرنے والا راستہ پُرپیچ، تنگ اور انتہائی خطرناک ہے۔ اگر سواری دوسری سواریوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھی تو رات کے اندھیرے میں کسی کھڈ میں گرنے کا قوی اندیشہ ہے۔ آنحضرتؐ کی طرف سے اعلان ہوا کہ کوئی شخص اس گھاٹی پر سے نہ گزرے۔ جب تک رسول اللہؐ کی سواری گزر نہ جائے۔ مگر کچھ لوگوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ آنحضرتؐ کی سواری کو بھڑکا دیا جائے چنانچہ پیغمبرؐ ناقہ پر سوار حذیفہ ابن یمان مہار تھامے اور عمار ابن یاسر پیچھے سے ہنکاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ بجلی کے کوندے میں بارہ سوار دکھائی دیئے جو چہروں پر نقاب ڈالے گھاٹی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ حذیفہ نے آنحضرتؐ کو ادھر متوجہ کیا۔ آپ نے ان لوگوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور حذیفہ اور عمار

نے ان کے اونٹوں کو مارپیٹ کر انہیں بھگا دیا۔ آنحضرتؐ نے حذیفہؓ سے فرمایا کہ تم نے پہچانا کہ یہ کون لوگ تھے؟ حذیفہؓ نے عرض کیا کہ میں نے نہیں پہچانا۔ فرمایا کہ یہ منافق ہیں اور ہمیشہ منافق رہیں گے۔ یہ اس ارادہ سے آئے تھے کہ میری سواری کو بھڑکائیں اور اس طرح میرا خاتمہ کر دیں۔ پھر آپ نے حذیفہؓ کو ایک ایک کا نام بتایا اور انہیں تاکید کی کہ ان ناموں کو پردۂ اخفا میں رکھیں۔ مگر اس تاکید کے باوجود بعض لوگوں کے نام چھپ نہ سکے اور موقع بہ موقع ظاہر ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام حسنؑ نے معاویہ ابن ابی سفیان سے فرمایا:۔

یوم وقفوا لرسول اللہ صلی اللہ	تمہیں وہ دن یاد ہوگا کہ جب کچھ لوگ گھاٹی میں
علیہ والہ وسلم فی العقبۃ لیستنفروا	رسول اللہ کے ناقہ کو بھڑکانے کے لئے جمع ہوئے
ناقتہ کانوا اثنی عشر رجلا منھم	تھے جو تعداد میں بارہ تھے اور ان میں ایک ابوسفیان
ابوسفیان۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲، ص ۱۰۳)	بھی تھا۔

پیغمبر اکرمؐ جب تبوک کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو کچھ بد باطن لوگوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم نے ایک مسجد تعمیر کی ہے تاکہ بیمار اور لاچار جو بارش اور سردی کے دنوں میں دور نہیں جا سکتے وہاں نماز پڑھ لیا کریں۔ آپ وہاں چل کر نماز پڑھا دیجئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں اس وقت آمادہ سفر ہوں کسی دوسرے موقع پر دیکھا جائے گا۔ جب آپ تبوک کی مہم سے فارغ ہو کر مدینہ کے قریب مقام ذی اوان میں پہنچے تو یہ آیت نازل ہوئی:۔

والذین اتخذوا مسجدا	اور وہ لوگ بھی منافق ہیں جنہوں نے نقصان پہنچانے
ضرارا وکفرا وتفریقاً	کفر کرنے اور مومنوں میں پھوٹ ڈلوانے کی غرض
بین المومنین ہ	سے مسجد کی بنا ڈالی ہے۔

آنحضرتؐ نے مالک ابن دخشم اور معن ابن عدی کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس نو تعمیر مسجد کو گرا کر نذر آتش کر دیں جو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مسجد کو جلا دیا گیا۔

یہ مہم مسلمانوں کے لئے ایک سخت آزمائش تھی۔ جھلسا دینے والی گرمی میں باغوں کے رسیدہ پھلوں اور لہلہاتے کھیتوں کی پیداوار کو چھوڑ کر ریگزاروں اور تپتے صحراؤں میں راہ پیما ہونا آسان مرحلہ نہ تھا۔ اس مرحلہ میں وہی لوگ ثابت قدم رہ سکتے تھے جو آخرت کی سرخروئی پر دنیا کی ہر نعمت اور ہر راحت کو قربان کر سکتے ہوں اور وہ لوگ جو دنیوی مفاد کی خاطر یا اسلام کی سطوت و شوکت سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے تھے ان سے یہ توقع ہی بے سود تھی کہ وہ اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں گے۔ چنانچہ اس موقع پر منافقوں نے اپنے باطنی عناد کا ثبوت دیا۔ حیلے بہانے کر کے گھروں میں پڑے رہے اور دوسروں کی ہمت شکنی کرتے رہے

اب تک تو وہ اپنے کفر کو نفاق کی دبیز تہوں میں چھپاتے آرہے تھے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے تھے مگر اس موقع پر ان کی حیلہ تراشیوں اور ریشہ دوانیوں نے اُن کے نفاق کا پردہ فاش کر دیا اور ان کی دلی حالت اور اندرونی کیفیت بے نقاب ہو گئی۔ اسی بناء پر اس مہم کو غزوۂ فاضحہ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی قلعی کھل گئی اور انہیں فضیحت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس موقع پر اپنے نفاق کو مخفی بھی رکھنا چاہتے تو مخفی نہ رکھ سکتے تھے کیونکہ نفاق اسی صورت میں چھپا رہ سکتا تھا جب گھروں کو خیرباد کہہ کر نکل کھڑے ہوتے اور دشمن کی کثرت و قوت سے آنکھ بند کر کے چل پڑتے۔ مگر یہ اُن کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ ایمان نہ ہو تو دین کی خاطر اس قسم کے خطرات کی طرف قدم بڑھا نہیں کرتا اگرچہ وہ بعض مصالح کے پیش نظر جنگوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ مگر جان کا خطرہ نظر آتا تھا تو بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور یہاں وطن سے کوسوں دور جانے کی وجہ سے رُوبفرار ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اور پھر اس لئے بھی انہیں اپنے اصلی روپ میں سامنے آنا پڑا کہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ مسلمان ہزیمت اٹھائے بغیر نہیں رہیں گے کیونکہ اب مقابلہ یہاں کے منتشر و پراگندہ لوگوں سے نہیں ہے بلکہ روم ایسی عظیم سلطنت سے ہے جس کے سامنے بڑی بڑی طاقتیں ہتھیار ڈال چکی ہیں۔ لہذا ایسے لوگوں کے لئے جن کی شکست آنکھوں کے سامنے ہے اپنے آپ کو کیوں خطرہ میں ڈالا جائے۔ اس لئے کہ انسان خطرہ مول لینے کے لئے اسی صورت میں تیار ہوتا ہے جب اسے دنیوی فوائد نظر آرہے ہوں یا اسے ایمان کا سہارا ہو اور جب کوئی فائدہ بھی نظر نہ آتا ہو اور ایمان سے بھی تہی داماں ہو تو مخلص مسلمین میں شمار ہونے کی خاطر جان کا خطرہ کیوں مول لے۔ یہ لوگ اگرچہ رسولؐ اللہ کی مصاحبت میں رہے مگر دل میں نفاق لے کے رسول اللہ کے پہلو میں بیٹھ جانا مفید نہیں ہو سکتا۔ جب تک زبان سے نکلی ہوئی صدا دل کی آواز سے ہم آہنگ نہ ہو اور دل کی آواز کا اثر عمل و کردار سے ظاہر نہ ہو۔

اکبر الہ آبادی نے سچ کہا ہے :۔

آمنوا میں تو سب سے ہیں آگے   اعملوا الصالحات مشکل ہے

غزوۂ تبوک ہی ایسا غزوہ ہے جس میں فاتح بدر و حنین علی مرتضیٰؑ شریک نہیں ہوئے مگر یہ عدم شرکت جنگ سے جی چرانے اور جہاد سے پہلو تہی کرنے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ حکم رسولؐ ہی یہ تھا کہ آپ مدینہ میں قیام فرما رہیں ریاست کا نظم و نسق سنبھالیں اور ان تمام فرائض کو انجام دیں جو آنحضرتؐ کی موجودگی میں خود ان پر عائد ہوتے تھے۔ یہ بھی جہاد کی طرح کا ایک فریضہ تھا جسے آپ نے پوری فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نظم و ضبط برقرار رکھا۔

پیغمبر اکرمؐ جب کسی غزوہ یا مہم پر تشریف لے جاتے تھے تو کسی نہ کسی کو مدینہ کا نگران مقرر کر جاتے تھے

اور اسے ایک عام والی و عامل کی حیثیت دی جاتی تھی مگر اس تقرری کی نوعیت عام حکام وولاۃ کی تقرری سے جداگانہ تھی۔ چنانچہ اسی جداگانہ حیثیت کو واضح کرنے کے لئے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے علی تمہاری منزلت میرے نزدیک وہ ہے جو ہارون کی موسیٰ کے نزدیک تھی اور ہارون کی منزلت یہ تھی کہ وہ موسیٰ کے وزیر قوت بازو نبوت میں شریک کار اور خلیفہ و جانشین تھے جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کی دعا کے سلسلہ میں ارشاد ہے:۔

واجعل لی وزیرا من اھلی ھرون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری۔	میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور اس کے ذریعہ میری پشت قوی کر اور اسے میرے کاموں میں میرا شریک بنا"

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:۔

وقال موسیٰ لاخیہ ھارون اخلفنی فی قومی۔	موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے جانشین ہو"

پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علی کو مثیل ہارون قرار دے کر یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے وزیر اور خلیفہ تھے اسی طرح علی میرے وزیر اور خلیفہ ہیں اور ان تمام مدارج پر فائز ہیں جن مدارج پر ہارون فائز تھے اور چونکہ حضرت ہارون نبی بھی تھے اس لئے لا نبی بعدی کہہ کر نبوت کا استثنار کر دیا۔ جب باستثنائے نبوت تمام مدارج و خصائص میں حضرت کو مثیلِ ہارون قرار دیا گیا ہے تو پھر ان کے علاوہ کسی اور کو مثیلِ موسیٰ کا وارث و جانشین تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کو طور پر جاتے وقت اپنا نائب بنایا تھا جو ایک محدود عرصہ کے لئے وقتی و ہنگامی نیابت تھی اسی طرح حضرت علی کی نیابت بھی وقتی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کسی اور کو نائب کیوں نہ بنا گئے، ظاہر ہے کہ یہ انتخاب حضرت ہارون کی اہلیت اور امت پر برتری کی بناء پر تھا اور انہی سے اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اگر وہ حضرت موسیٰ کی زندگی میں انتقال نہ کر جاتے تو وہی اُن کے خلیفہ و جانشین ہوتے اس لئے کہ جو زندگی میں اپنے کو نیابت و قائم مقامی کا اہل ثابت کر چکا ہو اگر وہ زندہ رہتا تو کسی کو اس کی نیابت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوتا۔ اسی طرح حضرت علی کی نیابت پیغمبرؐ کی زندگی ہی سے وابستہ نہ تھی کہ اُسے وقتی و عارضی کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر یہ نیابت وقتی و ہنگامی ہوتی تو لا نبی بعدی کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس جملہ سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ انہیں اپنی زندگی کے بعد کے لئے بھی نامزد کر رہے تھے۔

تبلیغ سورۃ برأۃ

عرب کے کفار و مشرکین خانہ کعبہ کا حج کیا کرتے تھے اور فتح مکہ کے بعد بھی وہ حج کے لئے آتے اور اپنے طریقہ پر حج بجالاتے رہے۔ ان کے مراسم حج میں عریاں طواف کی بھی ایک اخلاق سوز رسم تھی جس کا انسداد ضروری تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اب تک انہیں طواف اور دوسرے ارکان حج کی بجاآوری سے منع نہیں کیا تھا مگر جب سورۃ برأۃ کی ابتدائی آیتیں کفار و مشرکین سے اظہار بیزاری کے سلسلہ میں نازل ہوئیں تو حکم خداوندی کے پیش نظر انہیں روکنا ضروری ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے وہ آیتیں دے کر پہلے حضرت ابوبکر کو مکہ بھیجا اور پھر ان کے عقب میں حضرت علیؑ کو اپنے ناقہ عضباء پر سوار کر کے روانہ کیا تاکہ وہ کفار و مشرکین کو یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ حضرت علی تیزی سے ناقہ کو ہنکاتے ہوئے ان تک پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے پیغمبرؐ نے حکم دیا ہے کہ میں تم سے آیتیں لے لوں اگر تم چاہو تو میرے ساتھ مکہ چلو ورنہ یہیں سے مدینہ واپس چلے جاؤ۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

بعث النبی ببرأۃ مع ابی بکر ثم دعاہ فقال لا ینبغی لاحد ان یبلغ ھذہ الا رجل من اھلی فدعا علیا و اعطاھا ایاھا۔

(جامع الاصول۔ ج ۹۔ صہ۴۷۵)

"پیغمبر اکرمؐ نے حضرت ابوبکر کو سورہ برأۃ دے کر بھیجا پھر انہیں واپس بلا لیا اور فرمایا کہ اس کی تبلیغ کے لئے وہ شخص مناسب ہے جو میرے گھر والوں میں سے ہو چنانچہ حضرت علی کو بلایا اور وہ آیتیں ان کے حوالے کیں۔"

علامہ طبری نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے وہ تحریر کرتے ہیں:۔

بعث بھن رسول اللہ مع ابی بکر و امرہ علی الحج فلما سار فبلغ الشجرۃ من ذی الحلیفۃ اتبعہ بعلی فاخذھا منہ فرجع ابوبکر الی النبی فقال یارسول اللہ بابی انت وامی انزل فی شانی شیئ قال لا ولکن لا یبلغ عنی غیری او رجل منی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صہ ۳۰۲)

"رسول اللہ نے حضرت ابوبکر کو سورۃ برأۃ کی آیتیں دے کر بھیجا اور انہیں امیر حج مقرر کیا۔ جب وہ وادی ذی الحلیفہ میں مسجد شجرہ تک پہنچے تو ان کے پیچھے علیؑ کو روانہ کیا جنہوں نے آیتیں اُن سے لے لیں۔ حضرت ابوبکر پیغمبرؐ کے پاس واپس چلے آئے اور کہا یارسولؐ اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا کیا میرے بارے میں کچھ نازل ہوا ہے فرمایا نہیں لیکن ان آیتوں کی تبلیغ مجھ سے متعلق ہے یا اس سے جو مجھ سے ہو۔"

امیرالمومنین نے مکہ پہنچ کر عرفات مشعرالحرام اور منیٰ میں کھڑے ہو کر ان آیتوں کی تلاوت کی اور اعلان فرمایا کہ جن مشرکین نے بدعہدی کی ہے ان سے کئے ہوئے معاہدے چار ماہ کے بعد ختم ہو جائیں گے اور کوئی کافر و مشرک ایمان لائے بغیر خانہ کعبہ کے حدود میں آنے طواف کرنے اور حج بجا لانے کا مجاز نہ ہو گا لہٰذا سال آئندہ کوئی کافر و مشرک یہاں نہ آئے۔ اس اعلان سے کفار و مشرکین کی پیشانیوں پر بل پڑے مگر کسی کو روکنے ٹوکنے کی جرأت نہ ہو سکی بلکہ اسلام کے تسلط و اقتدار کے آگے بے بس ہو کر اسلام کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔
علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

فرجع المشرکون فلام بعضھم بعضا و قالوا ما تصنعون و قد اسلمت قریش فاسلموا۔
(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۳۸۳)

مشرکین ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس ہوئے اور کہنے لگے کہ اب جب کہ قریش مسلمان ہو چکے ہیں تمہارے لئے چارہ کار ہی کیا ہے چنانچہ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔"

یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا آسان نظر آتا ہے۔ مشرکین سے معاہدے ختم کئے جا رہے تھے حج اور مسجدالحرام میں داخلہ سے انہیں روکا جا رہا تھا اس صورت میں ممکن تھا کہ وہ بغاوت و سرکشی پر اتر آتے یا در پردہ سازش کر کے درپے ایذا ہوتے۔ انہی خطرات کے پیش نظر آنحضرت حضرت علی کی طرف سے متفکر اور ان کی واپسی کے بڑے بے چینی سے منتظر تھے۔ جب حضرت ابوذر نے آپ کی آمد کی اطلاع دی تو فکر و پریشانی دور ہوئی چہرہ مسرت سے کھل اٹھا خوش خوش اٹھ کھڑے ہوئے اور شہر سے باہر نکل کر صحابہ کے مجمع کے ساتھ استقبال کیا اور انہیں ساتھ لے کر مدینہ میں داخل ہوئے۔

اس موقع پر ایک کا عزل اور دوسرے کا نصب پیغمبرؐ کی ذاتی رائے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وحی الٰہی کے تابع تھا اور قدرت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی یہ مصلحت کارفرما ہی ہو گی کہ کام اور کام انجام دینے والے کی اہمیت کو نمایاں کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر شروع ہی میں حضرت علیؑ کو بھیج دیا جاتا تو کام کی اہمیت دب کر رہ جاتی اور کہنے والے یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کام کے سرانجام دینے کی اہلیت حضرت علی میں بھی تھی اور دوسروں میں بھی اور ان میں سے کسی ایک ہی کو منتخب ہونا تھا اور وہ کسی وجہ سے علی ہو گئے مگر ایک کے عزل کے بعد دوسرے کے تقرر سے اور وہ بھی اس اعلان کے ساتھ کہ یہ کام نبی کے کرنے کا ہے جو نبی سے ہو اس کام کی اہمیت عیاں ہو گئی اور کام کی اہمیت ہی سے کام انجام دینے والے کی اہمیت کا اندازہ ہوا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جو ایک جزوی امر کی تبلیغ کے لئے سزاوار ثابت نہ ہو سکا ہو وہ پیغمبرؐ کے بعد ان کی نیابت و جانشینی کا کیونکر اہل ہو سکتا

ہے۔ حیرت ہے کہ رہبر عالم کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد رائے عامہ کا سہارا لے کر نیابت خلافت رسول کا تصفیہ کر لیا جاتا ہے اور جو کار نبوت کی انجام دہی میں پیش پیش رہا ہو وہ دنیا والوں کی بے توجہی وسرد مہری کا شکار ہو کر کنج عزلت اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ یہ تقرر ان کے سب سے بڑھ کر سزاوار خلافت ہونے کا ثبوت تھا۔ مفسر قرآن ابن عباس بھی اس واقعہ سے آپ کے حقدار خلافت ہونے پر استدلال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیعت سقیفہ کی تکمیل کے بعد جب حضرت عمر نے ان سے کہا کہ اے عباس لوگوں نے حضرت علی کو اس کا اہل نہ سمجھا کہ انہیں ولی امر بنائیں تو ابن عباس نے کہا:۔

واللہ ما استصغرہ رسول اللہ	خدا کی قسم رسول اللہ نے تو صرف انہی کو اس کا
اذا ختارہ بسورۃ براۃ یقرأھا	اہل سمجھا تھا کہ وہ اہل مکہ کو سورۃ براۃ کی آیتیں
علی اھل مکۃ۔ (کنز العمال۔ ج ۶۔ ص ۳۹۱)	پڑھ کر سنائیں۔

ابن عباس کا استحقاق خلافت کے سلسلہ میں سورہ براۃ کی تبلیغ سے استدلال کرنا یہ بتاتا ہے کہ وہ اسے علیؑ کی خلافت کا ثبوت اور نیابت و جانشینی کا عملاً اظہار سمجھتے تھے اور خود امیر المومنین نے بھی مجلس شوریٰ کے موقع پر اسے استحقاق خلافت کے ثبوت میں پیش کیا اور ارکان شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

افیکم من اؤتمن علی سورۃ براۃ	کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ہے جسے سورۂ براۃ
وقال لہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ	کی تبلیغ کے لئے امین منتخب کیا گیا ہو اور اس
انہ لا یودی عنی الا انا او رجل	سے رسول اللہ نے یہ فرمایا ہو کہ اسے میرے اور اس
منی غیری۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۶ ص ۱۶۷)	کے علاوہ جو مجھ سے ہو کوئی دوسرا نہیں پہنچا سکتا۔

اگر حضرت ابوبکر کی خلافت پر نماز کی امامت سے استدلال کیا جاتا ہے تو کیا سورۂ براۃ کی تبلیغ ان سے متعلق رہتی تو اسے ان کی خلافت کے اثبات کے لئے ایک قوی دلیل کی صورت میں پیش نہ کیا جاتا؟ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جواب ہاں ہو۔ تو پھر حضرت علیؑ کی خلافت کے ثبوت میں اسے کیوں دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دعوتِ مباہلہ

نجران یمن کے شمالی کوہستان میں صنعاء سے دس منزل کے فاصلہ پر ایک زرخیز مقام تھا جہاں چھوٹی بڑی تہتر بستیوں میں کم و بیش چالیس ہزار عیسائی بستے تھے جو پہلے تو اہل عرب کی طرح بت پرست تھے مگر

فیمیون نامی ایک مسیحی راہب تھا معماری کے پیشہ سے گزر بسر کرتا تھا اپنا وطن روم چھوڑ کر یہاں آبسا تو اس نے یہاں کے باشندوں کو دینِ عیسوی کی تعلیم دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بے لوث تبلیغ کے نتیجہ میں تمام آبادی نے عیسائیت قبول کر لی اور نجران عیسائیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ انہوں نے مذہبی مراسم بجالانے کے لئے ایک کلیسا بھی تعمیر کر لیا جو اونٹ کی کھالوں سے منڈھی ہوئی ایک بلند و بالا عمارت تھی اور اسے کعبۂ نجران کے نام سے موسوم کیا۔ وہ عبادت کے اوقات میں وہاں جمع ہوتے اور نذریں پیش کرتے۔ ان نذروں اور چڑھاووں کے علاوہ کلیسا کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ دینار سالانہ تھی جس سے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی پرورش ہوتی تھی۔

جب فتح مکہ کے بعد اسلام کو عروج حاصل ہوا اور متحارب گروہ سرنگوں ہو گئے تو آنحضرتؐ نے ان قبائل کو جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں پیغامات بھیجے۔ ۱۰ھ میں نصاریٰ نجران کو بھی ایک نامہ تحریر فرمایا اور انہیں اسلام قبول کرنے یا جزیہ دے کر مملکتِ اسلامی کی رعایا بننے کی دعوت دی۔ جب نجران کے اسقف اعظم (بشپ) نے آنحضرتؐ کا مکتوب پڑھا تو اس نے فوراً علاقہ کے تمام سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے صورتِ حال سے مطلع کیا اور کہا کہ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور غور و فکر سے کوئی حل تجویز کرنا چاہیئے اس خبر سے اگرچہ پوری آبادی میں ہلچل مچ گئی تھی مگر کچھ من چلے بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ اسقف اعظم نے انہیں روکا اور کہا کہ ہمیں جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا چاہیئے اور مشتعل ہو کر اپنی تباہی و بربادی کا سامان نہ کرنا چاہیئے۔ جب لوگوں سے رائے لی گئی تو انہوں نے مختلف رائیں دیں اور آخر بڑی رد و کد کے بعد یہ طے پایا کہ ایک وفد مدینہ جائے اور پیغمبرِؐ اسلام سے گفتگو کرے۔ اگر بات چیت سے کوئی حل نکل آئے تو بہتر ورنہ کوئی اور تدبیر سوچی جائے۔ چنانچہ چودہ آدمیوں کا ایک وفد عاقب، سید اور ابو حارثہ کی زیرِ قیادت مدینہ روانہ ہوا۔ ان میں ابو حارثہ دنیائے عیسائیت کا اسقف اعظم اور مشہور عالم تھا اور سید اور عاقب تدبر و فراست اور معاملہ فہمی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ جب یہ وفد مدینہ میں وارد ہوا تو اہلِ مدینہ ان کے زرق برق لباس، ریشمیں عبائیں اور سج دھج دیکھ کر حیرت میں کھو گئے۔ کیونکہ اس سے پیشتر کوئی وفد اس طنطنہ اور طمطراق کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ جب وہ بنے ٹھنے مسجد نبوی کے قریب پہنچ کر سواریوں سے اترے اور اینٹھتے اور اکڑتے مسجد میں داخل ہوئے تو آنحضرتؐ نے اُن کے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور جسموں پر دیبا و حریر کے لباس فاخرہ دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس دوران میں ان کی نماز کا وقت شروع ہو گیا اور انہوں نے مشرق کی سمت رخ کر کے نماز شروع کر دی۔ کچھ لوگوں نے انہیں روکنا چاہا آنحضرتؐ نے فرمایا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنے طریقہ پر نماز پڑھنے دو۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے کچھ

دیر توقف کیا۔ جب پیغمبر نے ان کی طرف توجہ نہ فرمائی تو تیوریوں پر بل ڈالے اور باہر نکل آئے۔ مسجد کے باہر حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن کو دیکھا تو حضرت عثمان سے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں پیغام بھیجا اور جب ہم حاضر ہوئے تو منہ پھیر لیا اور جواب سلام تک نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا برتاؤ کیوں روا رکھا گیا ہے۔ حضرت علی کے پاس جائیے وہ اس کا مطلب بتا سکیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں اس وفد کو لے کر حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے پیغمبرؐ کی بے التفاتی کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم یہ ریشمیں عبائیں اور سونے کی انگوٹھیاں اتار کر اور سیدھے سادھے کپڑے پہن کر جاؤ۔ آنحضرتؐ تمہیں باریاب ہونے کا موقع دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور پیغمبرؐ نے نماز عصر سے فارغ ہو کر مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کی اور جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ ہم پہلے ہی سے مسلمان ہیں فرمایا تم مسلمان کیونکر ہو سکتے ہو جب کہ خنزیر کا گوشت کھاتے ہو، صلیب کی پرستش کرتے ہو اور مسیح کو ابن اللہ سمجھتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بیشک مسیح ابن اللہ ہیں۔ اگر وہ ابن اللہ نہیں ہیں تو آپ فرمائیے کہ ان کا باپ کون تھا۔ اور کیا کوئی بغیر باپ کے بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ آنحضرتؐ نے قرآن مجید کی اس آیت سے انہیں جواب دیا۔

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔

اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے جسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر کہا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔

مطلب یہ تھا کہ عیسیٰؑ کا تو فقط باپ نہ تھا اور آدمؑ کا نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی پھر انہیں خدا کا بیٹا کیوں نہیں کہتے لگے پاس اس کا تو کوئی جواب نہ تھا کٹھ حجتیوں اور کج بحثیوں پر اتر آئے۔ جب وہ دلیل و حجت سے قائل ہوتے نظر نہ آئے تو اللہ کی طرف سے وحی ہوئی:۔

فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءكم ونساءنا ونساءكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين ہ

جب تمہارے پاس علم آ چکا اس کے بعد بھی یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے حجت کریں تو ان سے کہو کہ آؤ اس طرح فیصلہ کریں کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو پھر اللہ کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔

آنحضرتؐ نے نصاریٰ کو یہ آیت پڑھ کر سنائی اور انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ دعوتِ مباہلہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر صرف گفت وشنید اور افہام وتفہیم پر معاملہ ختم کر دیا جاتا تو وہ پلٹ کر یہ دعویٰ کرتے کہ ہم نے پیغمبرِ اسلام سے بحث ومناظرہ کیا مگر ان کی باتوں سے نہ ہماری تشفی ہوئی اور نہ وہ دلیل وبرہان سے ہمیں قائل کر سکے۔ اب ان کی زبان بندی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ انہیں مباہلہ کی دعوت دی جاتی کیونکہ مباہلہ میں یا اس کے نتیجہ میں شکست تو چھپنے والی بات ہی نہ تھی کہ باتوں کے ذریعہ اس پر پردہ ڈالا جا سکتا۔ اور ہر سو اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ نصاریٰ پہلے تو اثباتِ حق کے اس طریق کار سے گھبرائے اور پھر کہا کہ ہمیں آج کے دن کی مہلت دیجئے کل ہم اس کے لئے تیار ہیں یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مقام پر پہنچ کر آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ ابو حارثہ نے کہا کہ اگر کل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب واتباع اور لاؤ لشکر کے ساتھ سطوت وشکوہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے آئیں تو بے کھٹکے مباہلہ کرنا اور اگر اپنے بچوں اور کنبہ والوں کو لے کر عجز وانکسار کے ساتھ آئیں تو پھر مباہلہ نہ کرنا۔

مباہلہ کی قرار داد طے ہونے کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ کی آبادی سے متصل ایک جگہ مباہلہ کے لئے منتخب کی جسے سلمان فارسی نے خس وخاشاک سے پاک وصاف کیا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی نصاریٰ مقام مباہلہ پر پہنچ گئے۔ مہاجرین وانصار بھی گھروں سے نکل آئے اور میدان میں جمع ہو گئے۔ جب پیغمبر اکرمؐ کو نصاریٰ کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے علی مرتضیٰ فاطمہ زہرا اور حسن وحسین کو مباہلہ میں شرکت کے لئے طلب کیا۔ سعد ابن ابی وقاص کہتے ہیں:۔

لما نزلت ھذہ الآیۃ ندع ابناءنا وابناءکم دعا رسول اللہ علیا و فاطمۃ وحسنا وحسینا فقال اللھم ھؤلاء اھلی۔ (صحیح مسلم۔ ج ۲۔ ص ۲۷۸)	جب آیۂ مباہلہ نازل ہوا تو رسول اللہ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو طلب کیا اور کہا اے میرے اللہ یہی میرے اہلبیت ہیں۔

ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

غدا رسول اللہ آخذا بید الحسن والحسین علیھما السلام تتبعہ فاطمہ وعلی ابن ابی طالب بین یدیہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۶۶)	رسول خدا صبح صبح اس طرح نکلے کہ حسن وحسین علیہما السلام کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور پیچھے پیچھے جناب فاطمہ اور آگے آگے حضرت علیؑ تھے۔

جب پیغمبرؐ میدان مباہلہ میں پہنچے تو ایک درخت کے نیچے دو زانو بیٹھ گئے اور علی کو آگے فاطمہ کو عقب

میں اور حسن و حسین کو داہنے بائیں بٹھا لیا۔ اور ان سے کہا جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ نصاریٰ نے جب پیغمبرؐ کے ہمراہ ایک مرد ایک خاتون اور دو بچوں کو دیکھا تو پہلے تو حیرت زدہ ہوئے اور پھر ایک مبہم سا خوف ان پر طاری ہو گیا۔ ابو حارثہ نے کہا:۔

یامعشر النصاری انی لاری وجوھا	اے گروہِ نصاریٰ میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں
لوشاء اللہ ان یزیل جبلا من	کہ اگر اللہ چاہے کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکا دے
مکانہ لازالہ بھا فلا تباھلوا	تو وہ ان چہروں کی خاطر سرکا دے۔ ان سے مباہلہ
فتھلکوا۔ (تفسیر کشاف۔ پارہ۳)	نہ کرنا ورنہ تباہ و ہلاک ہو جاؤ گے۔

جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ کے ہمراہ آنے والے ان کے داماد اور ابن عم علی مرتضیٰ اور بیٹی فاطمہ زہرا اور نواسے حسن و حسین ہیں تو صداقت و خود اعتمادی کے ان حسین پیکروں کو دیکھ کر ان پر برق خاطف گری اور چرخ نبوت کے نیرِ اعظم اور فلک ہدایت کے درخشندہ ستاروں کی تابانیوں سے ان کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور مباہلہ سے پیچھا چھڑاتے نظر آنے لگے اور اس تصور نے انہیں اور پست ہمت بنا دیا کہ اگر پیغمبرؐ کو اپنی صداقت پر مکمل وثوق و اعتماد نہ ہوتا تو وہ اس پُر خطر منزل میں عزیروں کو لے کر آتے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ساتھ نہ لاتے کیونکہ یہی وہ افراد تھے جن سے بقائے نسلِ رسولؐ وابستہ تھی اگر یہی بددعا کے نتیجہ میں ہلاک ہو جاتے تو نسلِ رسولؐ ہی ختم ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا اقدام وہی کر سکتا ہے جسے اپنی صداقت پر مکمل یقین اور اپنی حقانیت پر پورا بھروسہ ہو۔ ابھی نصاریٰ تذبذب کے عالم میں تھے کہ ابو حارثہ کے بھائی کرز ابن علقمہ نے جو اسلام کی صداقت سے متاثر ہو چکا تھا کہا کہ اے گروہ نصاریٰ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ محمدؐ ہی وہ نبی خاتم ہیں جن کا تذکرہ ہمارے مقدس صحیفوں میں ہے ہمیں ان سے مباہلہ نہ کرنا چاہیئے۔ اس لیئے جو نبیوں سے مباہلہ کرتا ہے وہ ہلاکتِ ابدی کے گڑھے میں گرے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لو کیا تمہیں فطرت کی جوشِ غضب میں اُبلی ہوئی نگاہیں عذاب کی آمد کا پتا نہیں دے رہیں۔ اب جو نظریں اٹھیں تو دیکھا کہ سورج کی چمک دمک پھیکی پڑ چکی ہے۔ فضا میں دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے ہیں شاخوں سے پتے جھڑ رہے ہیں اور پرندے آشیانوں سے بے آشیاں ہو کر زمین پر دُبکے پڑے ہیں۔ کائنات کے ان خشمگیں تیوروں کو دیکھ کر نصاریٰ کے دل دہل گئے۔ مباہلہ سے دست بردار ہو کر صلح کی درخواست کی آنحضرتؐ نے ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور حضرت علیؑ کو شرائط صلح طے کرنے کے لیئے مامور فرمایا۔ حضرت نے اس شرط پر صلح کی کہ وہ سال میں دو مرتبہ ماہ صفر اور ماہ رجب میں ایک ہزار پارچے بطور جزیہ دیا کریں گے اور ہر پارچہ چالیس درہم کا ہوگا اور اگر یمن میں کبھی جنگ چھڑی تو وہ جنگی امداد

کے سلسلہ میں تیس زرہیں تیس نیزے اور تیس گھوڑے عاریۃً دیں گے اور اس کے صلہ میں وہ اپنی زمینوں پر بدستور آباد رہیں گے اور ان کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہو گی۔

یہ فتح و سرفرازی تاریخ اسلام میں کیا تاریخ عالم میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے کہ ایک طرف گنے چنے پانچ افراد ہیں جن میں ایک خاتون اور دو کمسن بچے بھی شامل ہیں جن کے جلو میں نہ مادی قوت و طاقت کے عساکر ہیں نہ اُن کے سروں پر خود نہ جسموں پر زرہیں اور نہ ہاتھوں میں تلواریں ہیں۔ وہ صرف یقین کی قوت اور اعتماد کی طاقت سے نجران کے نمایندہ وفد کو بے دست و پا کرکے اپنی صداقت کا لوہا منوالیتے اور اُن کے تمرد و شکوہ کو کچل کر ان کی گردنوں میں باجگزاری کا جوا رڈال دیتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عیسائیوں نے مباہلہ سے انکار کرکے اپنی شکست اور اسلام کی فتح کا عملاً اعتراف کر لیا اور الوہیت مسیح کے سلسلہ میں اپنے عقیدہ و یقین کا پردہ چاک کر دیا۔ اگر انہیں اپنے مسلک کی صحت اور اپنے عقیدہ کی صداقت پر اعتماد ہوتا تو کبھی مباہلہ سے گریز نہ کرتے اور جزیہ قبول کرکے اپنے عقائد کی ناپختگی کا ثبوت نہ دیتے۔

اس موقع پر انصار و مہاجرین عشرۂ مبشرہ و اصحاب بدرین اور ان کی اولادیں موجود تھیں اور الفاظ قرآن میں بلحاظ جمع سب کے لئے گنجائش بھی تھی اور صحابہ اور ان کی اولاد و ازواج کو مباہلہ میں شریک کیا جا سکتا تھا مگر وسعت و گنجائش کے باوجود صرف حسن حسین فاطمہ زہرا اور علی مرتضیٰ منتخب ہوئے۔ اگر آیت کا مفہوم یہ ہوتا کہ دو بیٹوں ایک خاتون اور ایک اپنے دل و جان کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلو تو پیغمبرؐ دوسروں کو یہ کہہ سکتے تھے کہ میں تمہیں بھی اس قابل سمجھتا تھا کہ مباہلہ میں شریک کرتا مگر حکم قرآن کے پیش نظر چار افراد سے زیادہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا اور دوسرے بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر چار سے زائد افراد کے لے جانے کی گنجائش ہوتی تو وہ بھی شریک مباہلہ کئے جاتے مگر الفاظ میں انتہائی وسعت کے ہوتے ہوئے کسی کو شرکت کی دعوت نہ دینا اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مباہلہ میں شمولیت سے مانع الفاظ کی تنگ دامنی اور تعداد کی قید نہ تھی بلکہ اس کے لئے جن اوصاف کی ضرورت تھی وہ ان منتخب ہستیوں کے علاوہ کسی اور میں نہ تھے ورنہ پیغمبرؐ بلا وجہ کسی کو نظر انداز نہ کرتے۔

مباہلہ کی منزل میں قدم رکھنے کے لئے دو صفتیں از بس ضروری تھیں ایک یقین اور دوسرے صدق:

یقین اس لئے کہ بحسب ظاہر مباہلہ میں ہلاکت کا خطرہ تھا اور جب تک اپنے موقف کی صداقت پر یقین کامل اور اپنے دعویٰ کی صداقت پر وثوق تام نہ ہو کوئی عاقل معرض ہلاکت میں آکھڑا نہیں ہوتا ایسے پرخطر موقع پر وہی ثابت قدم رہ سکتا ہے جس کا یقین غیر متزلزل ہو۔ ورنہ بے یقینی کے نتیجہ میں قدم لرز جاتے اور دل دہل جاتے۔ اسی ضرورتِ یقین کے پیش نظر آنحضرتؐ نے ان افراد کو منتخب کیا

جن کے یقین میں نہ کبھی کمزوری رونما ہوئی اور نہ شکوک واوہام کے غبار سے دھندلا ہوا اگر کوئی اور بھی یقین کی اس منزل پر فائز ہوتا تو نظر انتخاب اس پر بھی پڑتی مگر کسی اور کا نظر انتخاب میں نہ آنا اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبرؐ انہی کو یقین کے بلند ترین مرتبہ کا حامل سمجھتے تھے۔ دوسری صفت صدق ہے۔ یہ اس لئے ناگزیر تھی کہ کذب سے ٹکراؤ تھا اور کاذبین کے مقابلہ میں صادقین ہی کو لایا جا سکتا ہے کیونکہ جھوٹی قوتوں سے وہی افراد برسرِ پیکار ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ سچائی کی راہ پر گامزن رہے ہوں۔ اور نصاریٰ نجران بنصِ قرآن کاذب تھے۔ کیونکہ ان کے عقیدوں میں کذب کار فرما تھا اس طرح کہ وہ تین خداؤں کے قائل تھے اور باپ بیٹا اور روح القدس کو الوہیت میں شریک سمجھتے تھے۔ مگر عقیدۂ توحید اتنا فطری ہے کہ تین کہنے کے ساتھ ایک بھی کہتے تھے اس فطری اور اعتقادی تصادم کے نتیجہ میں تین ایک اور ایک تین کا پیچیدہ اور ناقابلِ فہم مزعومہ عقیدہ بن کر ان کے ذہنوں میں رچ بس گیا تھا یہ عقیدۂ تثلیث چند لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو انتہائی کوششوں اور کاوشوں کے باوجود ابھی تک لاینحل ہے اس لئے کہ کوئی انسان عقل و شعور کی روشنی میں یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا کہ ایک تین کیسے ہو سکتا ہے اور تین ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ واقع کے خلاف ہے کیونکہ واقع میں نہ تین خدا ہیں اور نہ ایک تین اور تین ایک کا کوئی مصداق اور جو چیز واقع کے خلاف ہو اسی کا نام کذب ہے۔ بلکہ اگر کوئی نظریہ واقع کے مطابق بھی ہو مگر زبان اس سے ہمنوا نہ ہو تو وہ بھی کذب ہے جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔

اذا جاءك المنافقون قالوا نشهد	جب تمہارے پاس منافق آتے ہیں تو وہ یہ کہتے
انك لرسول الله والله يشهد	ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسولؐ
ان المنافقون لكاذبون۔	ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر دل زبان سے الگ ہو اس طرح کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ ہو تو وہ بھی جھوٹ ہے اگرچہ زبان پر آنے والے کلمات واقع کے مطابق کیوں نہ ہوں۔ اور صدق یہ ہے کہ دل زبان کی صدا سے ہم آہنگ ہو اور جو زبان پر ہو وہ واقع کے مطابق بھی ہو اب صادق وہ ہوگا جس کی زبان کی ہر لفظ دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش واقع کے عین مطابق ہو۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جن ذواتِ مقدسہ کو مباہلہ کے لئے منتخب کیا تھا ان کا ہر قول ہر عمل اور ہر ارادہ صداقت کا آئینہ دار تھا وہ اعتقاداً قولاً اور عملاً ہر لحاظ سے سچے تھے نہ ان کے قول و عمل میں کبھی کوئی غلطی دیکھی گئی اور نہ کبھی ان کے عقیدہ میں کوئی لغزش نظر آئی۔ حضرت علیؑ خود فرماتے ہیں:۔

ما وجد لی کذبة فی قول ولا	پیغمبرؐ نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا!

خطلہ فی فعل۔ (نہج البلاغہ) اور نہ میرے کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔"

اس انتخاب سے جہاں اہلبیت اطہار کی عصمت و صداقت اور دوسروں پر فوقیت و برتری کا اظہار ہوتا ہے وہاں اسلام میں ان کی بنیادی و اساسی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس طرح قدرت نے مباہلہ میں ان کی شرکت کو ضروری قرار دیا اور پیغمبرؐ نے اپنی دعا کا تکملہ ان کی صدائے آمین کو قرار دیا۔ اور انہی کے امتیازی کردار کی بدولت اسلام کو یہ فتح مبین حاصل ہوئی۔ حیرت ہے کہ جو کار نبوت کے سرانجام دینے میں پیغمبرؐ کے شریک کار ہوں اور جن کی شرکت کے بغیر مباہلہ کی تکمیل نہ ہو سکتی ہو وہ نیابت پیغمبرؐ کے سلسلہ میں اس طرح نظر انداز کر دیئے جائیں۔ کہ ادھر نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے اور مشورہ تک میں ان کی شمولیت کو غیر ضروری سمجھا جائے۔

"دریں دیار مگر رسم باز دیدن نیست۔"

سریہ بنی زبید

پیغمبر اکرمؐ تبوک سے پلٹ کر جب مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو بنی مذحج کی ایک شاخ بنی زبید کا سردار عمرو ابن معدیکرب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے اور اس کے قبیلہ کے آدمیوں نے جو اس کے ہمراہ تھے اسلام قبول کر لیا۔ عمرو کا باپ معدیکرب دور جاہلیت میں مارا گیا تھا اس نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے قصاص لینا چاہتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جاہلیت کے خون کا قصاص ختم کر دیا گیا ہے۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا مگر وہاں سے پلٹ کر وہ بغاوت و سرکشی پر اتر آیا اور بنی حارث ابن کعب پر حملہ کر کے انہیں قتل و غارت کیا اور اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گیا۔

پیغمبر اکرمؐ کو اس کے شر و فساد کی اطلاع ہوئی تو آپ نے حضرت علیؑ کو تین سو کے لشکر کے ساتھ یمن جانے کا حکم دیا تاکہ ان شورشوں کو دبائیں اور نصاریٰ نجران سے بھی جزیہ وصول کریں۔ جب حضرت علیؑ روانہ ہونے لگے تو پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھوں سے علم سج کر آپ کو دیا اور اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا جس کا ایک سرا سینہ پر تھا اور ایک سرا پشت پر اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ لڑائی چھیڑیں تو تم ان سے لڑنا ورنہ از خود ابتدا نہ کرنا۔ اس لشکر کے ساتھ ایک اور لشکر خالد ابن ولید کی ماتحتی میں قبیلۂ بنی جعفی کی طرف روانہ کیا اور خالد کو یہ ہدایت کی کہ اگر کسی مقام پر دونوں لشکر یکجا ہو جائیں اور دشمن سے جنگ چھڑ جائے تو دونوں

لشکروں کے سردار علی ہوں گے۔ حضرت علی نے فوج کے اگلے حصہ کا سردار خالد ابن سعید کو اور خالد ابن ولید نے ابو موسیٰ اشعری کو مقرر کیا اور دونوں اپنے اپنے لشکروں کی قیادت کرتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب خالد ابن ولید بنی جعفی کی طرف بڑھے اور انہیں لشکر اسلام کی آمد کا پتا چلا تو وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مین چلا گیا اور ایک گروہ بنی زبید سے جا ملا۔ امیرالمومنین کو بنی جعفی کے تقسیم ہو جانے کی اطلاع ہوئی تو خالد کو کہلا بھیجا کہ جس مقام پر میرا قاصد تمہیں ملے وہیں پر رک جاؤ مگر خالد نے اس خیال سے کہ اگر دونوں لشکر ایک ہوگئے تو افسری جاتی رہے گی، رکنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے خالد ابن سعید سے کہا کہ فوج کا ایک دستہ لے کر جاؤ اور خالد کو جہاں پاؤ روک لو۔ خالد ابن سعید نے آگے بڑھ کر انہیں روک لیا۔ امیرالمومنین وہاں پر پہنچے تو خالد ابن ولید کو حکم عدولی پر سرزنش کی اور دونوں لشکروں کو ایک کرکے آگے چل دیئے۔ جب مقام کشر میں پہنچے تو بنی زبید سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ عمرو ابن معدیکرب مقابلہ پر اُتر آیا۔ خالد ابن سعید نے چاہا کہ اس سے جنگ آزما ہوں۔ مگر حضرت نے انہیں روک دیا۔ اور شمشیر بکف میدان میں اُتر آئے۔ عمرو ابن معدیکرب اگرچہ عرب کا مشہور جنگ آزما اور تیغ زن تھا مگر حضرت علیؑ کو اپنے مقابلہ میں آتے دیکھ کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک بھائی اور ایک بھتیجا مارا گیا اور اس کی بیوی رکانہ بنت سلامہ اور بچے اسیر کر لئے گئے ان کے علاوہ اور عورتیں بھی قید کی گئیں اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ دشمن کو مغلوب و اسیر کرنے کے بعد حضرت حجۃ الوداع میں شریک ہونے کے لئے مکہ روانہ ہوگئے اور خالد ابن سعید کو وہاں چھوڑ گئے تاکہ بنی زبید سے صدقات جمع کریں اور ان میں سے کوئی مسلمان ہو کر امان طلب کرے تو اسے امان دیں۔ جب عمرو ابن معدیکرب کو معلوم ہوا کہ اس کے بیوی بچے اسیر کر لئے گئے ہیں تو وہ خالد ابن سعید کے پاس آیا۔ اور دوبارہ اسلام قبول کرکے اپنے بیوی بچوں کو واپس لے لیا اور اس کے صلہ میں اپنی مشہور تلوار صمصامہ خالد ابن سعید کو نذر کر دی۔

امیرالمومنین نے مال غنیمت کے خمس میں سے ایک کنیز لے لی تھی۔ خالد ابن ولید نے براء ابن عازب کے ہاتھ ایک خط پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا۔ جس میں حضرت علیؑ کے اس اقدام کی سخت لب و لہجہ میں شکایت کی۔ جب آنحضرتؐ نے وہ تحریر پڑھی تو آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور براء سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

ماترى فى رجل يحب الله و رسوله و يحبه الله و رسوله۔	تم اس شخص کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ و رسولؐ اسے دوست رکھتے ہیں۔
(صحیح ترمذی ج ۲ ص ۲۱۵)	

برانے پیغمبرؐ اکرم کے چہرے پر آثارِ غضب دیکھ کر کہا کہ یا رسولؐ اللہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں میں تو صرف ایک پیغامبر کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر پیغمبرؐ اکرم خاموش ہو گئے۔

امیرالمومنین کو اس مال میں ہر طرح کا حق تصرف حاصل تھا اور ان کا حصہ بھی ایک خادمہ سے کہیں زیادہ تھا مگر وہ لوگ جو اپنے دلوں میں عناد لئے ہوئے تھے وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس سے پیغمبرؐ کو ان کے خلاف کیا جا سکے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی پیغمبرؐ کے جذبات کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی مگر علیؑ کو موردِ طعن بنانے والے خود پیغمبرؐ کے غیظ و غضب کا ہدف بن گئے اور پیغمبرؐ نے یہ کہہ کر ان کی زبانوں کو بند کر دیا۔ کہ علیؑ خدا اور رسولؐ کے دوست ہیں اور خدا و رسولؐ ان کے دوست ہیں مقصد یہ تھا کہ اگر یہ ناسزا و ناروا عمل ہوتا تو پھر نہ خدا ان کا دوست رہتا اور نہ اس کا رسولؐ اور نہ وہ خدا و رسولؐ کے دوست رہتے۔

حجۃ الوداع

۶ھ میں پیغمبر اسلامؐ عمرہ کے ارادے سے نکلے مگر قریش سدِ راہ ہوئے اور آپ حدیبیہ سے واپس پلٹ آئے اور مکہ پہنچ کر عمرہ بجا نہ لا سکے۔ ۷ھ میں پھر عمرہ کے لئے تشریف لے گئے مگر قریش سے معاہدہ کی بنا پر تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کر سکے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور بتوں سے خانہ کعبہ کی تطہیر عمل میں آئی۔ ۹ھ میں حضرت علیؑ کو سورہ برأۃ کی آیتیں دے کر رسوم حج کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے بھیجا انہوں نے مشرکین سے بیزاری و لاتعلقی کا اعلان کر کے انہیں حرم کعبہ میں آئندہ قدم رکھنے سے منع کیا۔ ۱۰ھ میں ادائے فریضۂ حج کا قصد فرمایا اور دعوت حج کی صدا تمام اکنافِ عالم میں گونج اٹھی۔

اذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علی کل ضامر من کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم۔	لوگوں میں حج کے لئے پکارو تمہارے پاس دور و دراز کی راہوں سے پیادہ اور سفر سے تھکی ماندی سواریوں پر چڑھ کر آئیں گے تاکہ وہ (دین و دنیا کے) فائدے حاصل کریں۔

پیغمبر اکرمؐ کی آواز پر ہر سمت سے مسلمان کثیر تعداد میں مدینہ پہنچ گئے تاکہ پیغمبرؐ کے ساتھ فریضۂ حج بجا لائیں اور آداب و احکام حج سیکھیں آنحضرتؐ ۲۶ ذی قعدہ کو ہزاروں مسلمانوں کے جلو میں مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے۔

جناب فاطمہ زہراؑ اور ازواج رسولؐ بھی اس سفر میں شریک تھیں جب ظہر کے قریب وادیٔ ذی الحلیفہ میں پہنچے تو غسل احرام کے بعد احرام باندھا۔ صحابہ نے احرام باندھ لئے اور سب نے مل کر تلبیہ کیا تو لبیک اللّٰھم لبیک کی آوازوں سے دشت و صحرا گونج اٹھے۔

حضرت علی یمن ہی میں تھے کہ آنحضرتؐ نے انہیں تحریر فرمایا کہ وُہ مکہ پہنچ کر حج میں شریک ہوں۔ آپ اپنے دستۂ سپاہ کے ساتھ وہاں سے چل دیئے۔ راستے میں لشکر کی امارت ایک شخص کے سپرد کر کے آگے بڑھے اور وادیٔ یلملم سے احرام باندھ کر آنحضرتؐ کے وارد مکہ ہونے سے پہلے ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ پیغمبرؐ نے آپ کو دیکھا تو چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اٹھا۔ پوچھا کہ اے علی تم نے کس نیت سے احرام باندھا ہے۔ عرض کیا کہ آپ نے اس کے متعلق تحریر نہیں فرمایا تھا اس لئے میں نے اپنی نیت کو آپ کی نیت سے وابستہ کر دیا تھا کہ جو آپ کی نیت ہوگی وہی میری نیت ہوگی۔ میں اپنے پیچھے چونتیس اُونٹ قربانی کے چھوڑ آیا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے ہمراہ قربانی کے چھیاسٹھ اونٹ ہیں اور تم مناسکِ حج اور قربانی کے اونٹوں میں میرے شریک ہو۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے یمن کی تمام روداد اور جزیہ اور غنائم و صدقات کی تفصیل بیان کی اور عرض کیا کہ میں اموالِ غنیمت و جزیہ لشکر کے سپرد کر کے شوقِ زیارت میں پہلے چلا آیا ہوں فرمایا کہ تم اپنے ہمراہیوں کے پاس جاؤ اور انہیں لے کر جلد مکہ پہنچ جاؤ۔ حضرت علیؑ پیغمبرؐ سے رخصت ہو کر واپس پلٹے ابھی تھوڑا سا راستہ طے کیا ہوگا کہ لشکر کو آتے دیکھا۔ جب وہ لوگ قریب پہنچے تو دیکھا کہ سب نے بندھی ہوئی گٹھڑیوں میں سے نئے جامے نکال کر احرام باندھ رکھے ہیں۔ آپ نے نگرانِ لشکر سے پوچھا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر یہ پارچے کیوں تقسیم کئے ہیں کہا کہ ان لوگوں نے اصرار کیا تھا کہ یہ پارچے انہیں دیدیئے جائیں اور بعد میں واپس لے لئے جائیں۔ فرمایا کہ انہیں آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا۔ پھر حکم دیا کہ یہ پارچے اتار دیئے جائیں اور انہیں بحفاظت رکھ دیا جائے۔ لوگوں نے پارچے اتار تو دیئے مگر انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔ جب پیغمبرؐ کی خدمت میں پہنچے تو علیؑ کا گلہ شکوہ کیا۔ آنحضرتؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا:۔

یا ایھا الناس لا تشکوا علیا	اے لوگو علی کا گلہ نہ کرو
فواللہ انہ لاخشن فی ذات	وہ اللہ کے معاملہ میں سخت
اللہ او فی سبیل اللہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲ ص ۴۰۲)	گیر ہیں "

حجۃ الوداع سے پیشتر دو قسم کے حج ہوتے تھے ایک حج افراد اور ایک حج قران۔ ان دونوں میں عمرہ ایک جداگانہ اور مستقل عمل کی حیثیت رکھتا ہے جو اعمالِ حج بجا لانے کے بعد بجا لایا جاتا ہے۔ فرق

صرف اتنا ہے کہ حج قران میں قربانی کے جانور ساتھ ہوتے ہیں اور حج افراد میں قربانی کے جانور ساتھ نہیں ہوتے اس موقعہ پر آیۃ "واتموا الحج والعمرة لله" "اللہ کے لئے حج اور عمرہ پورا کرو" نازل ہوا تو حج میں ایک تیسری قسم کا اضافہ ہوگیا جسے حج تمتع کہا جاتا ہے۔ حج تمتع میں عمرہ حج ہی کا ایک جزو ہوتا ہے جو ایام حج میں حج سے پہلے بجالایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے عمرہ بجالا کر احرام کھول دیا جائے اور آٹھ ذی الحجہ یوم ترویہ کو حج کا احرام باندھا جائے اور اعمال حج بجالائے جائیں اسے حج تمتع اس لئے کہا جاتا ہے کہ عمرہ و حج کے درمیانی وقفہ میں احرام کے قیود اٹھ جاتے ہیں اور جو چیزیں احرام کی حالت میں جائز نہیں ہیں۔ ان سے متمتع ہوا جاسکتا ہے۔ یہ حج ان لوگوں کے لئے ہے جو مکہ سے اڑتالیس میل سے زیادہ فاصلہ کے رہنے والے ہوں۔ اور حج افراد و حج قران مکہ سے اڑتالیس یا اس سے کم مسافت کے رہنے والوں کیلئے ہے۔

اس سفر حج میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے۔ آنحضرتؐ نے انہیں حکم دیا کہ وہ حج کی نیت کو عمرہ کی نیت سے بدل لیں اور عمرہ کے بعد احرام اتار دیں اور حج تمتع بجالائیں۔ اور جن لوگوں کے ہمراہ قربانی کے جانور ہیں وہ احرام باندھے رکھیں۔ آنحضرتؐ کے ہمراہ چونکہ قربانی کے اونٹ تھے اس لئے آپ کا حج، حج قران تھا اور حضرت علی کی نیت بھی پیغمبرؐ کی نیت حج کے تابع تھی اس لئے دونوں نے احرام نہ کھولے۔ جب لوگوں نے پیغمبرؐ کو احرام باندھے دیکھا تو احرام کھولنے میں پس و پیش کرنے لگے اور سابقہ طریق حج سے مانوس طبیعتوں پر یہ امر انتہائی شاق گزرا اور وہ بدستور احرام باندھے رہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے انہیں تعمیل حکم سے پہلو تہی کرتے دیکھا تو سخت رنجیدہ ہوئے اور غیظ و غضب کی شکنیں ماتھے پر ابھر آئیں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

قدم رسول الله لاربع مضين من ذی الحجة او خمس فدخل علی وھو غضبان فقلت من اغضبك يا رسول الله ادخله الله النار قال اوما شعرت انی امرت الناس بامر فاذا ھم يترددون ولو انی استقبلت من امری ما استدبرت ما سقت الھدی معی حتی اشتريه ثم احل كما حلوا۔
(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۹۰)

رسولؐ اللہ ذی الحجہ کی چوتھی یا پانچویں تاریخ کو وارد ہوئے اور غیظ و غضب کی حالت میں میرے ہاں آئے میں نے کہا یا رسولؐ اللہ کس نے آپ کو غضبناک کیا ہے خدا اُسے جہنم واصل کرے فرمایا کیا تمہیں خبر نہیں کہ میں نے لوگوں کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ تردد و تذبذب میں پڑ گئے ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صورت حال یہ پیش آنے والی ہے تو میں قربانی کے جانور اپنے ساتھ لانے کے بجائے یہاں سے خرید لیتا اور ان لوگوں کی طرح احرام کھول دیتا۔"

جس طرح آنحضرتؐ کی زندگی میں کچھ لوگوں نے حج تمتع کی مخالفت کی اسی طرح پیغمبرؐ کے بعد بھی اس کی مخالفت کرتے رہے اور حکم شرعی کے مقابلہ میں اپنی رائے کو ترجیح دیتے رہے۔ چنانچہ عمران ابن حصین کہتے ہیں:۔

نزلت اٰیۃ المتعۃ فی کتاب اللہ وامرنا بھا رسول اللہ ثم لم تنزل اٰیۃ تنسخ اٰیۃ متعۃ الحج ولم ینہ عنھا رسول اللہ حتی مات قال رجل برایہ بعد ماشاء۔ (صحیح مسلم۔ ج۱۔ ص۴۰۴)

"حج تمتع کی آیت قرآن مجید میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے ہمیں اس کا حکم دیا تھا اور بعد میں کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی جو حج تمتع کی آیت کو منسوخ کرتی اور نہ رسول اللہ نے مرتے دم تک اس سے منع کیا۔ البتہ ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہہ دیا۔"

شارح مسلم نواوی نے تحریر کیا ہے:۔

یعنی عمر ابن الخطاب رضی اللہ لانہ اول من نھی عن المتعۃ فکان من بعدہ من عثمان وغیرہ تابعالہ فی ذلک۔ (حاشیہ مسلم۔ ج۱۔ ص۴۰۴)

"اس سے مراد عمر ابن خطاب ہیں اس لئے کہ سب سے پہلے انہی نے حج تمتع سے منع کیا تھا۔ باقی رہے حضرت عثمان وغیرہ تو وہ اس مسئلہ میں انہی کے تابع تھے۔"

بہرحال آٹھ ذی الحجہ روز پنجشنبہ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جنہوں نے عمرہ کے بعد احرام کھول دیئے تھے وہ احرام حج باندھ لیں خود پیغمبر اکرمؐ پہلے سے احرام باندھے ہوئے تھے اور حضرت علیؑ بھی آپ کے حسب ہدایت حالتِ احرام پر باقی تھے۔ جب احرام باندھے جا چکے تو مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور منیٰ میں تشریف لے آئے دوسرے دن نمازِ صبح کے بعد منیٰ سے عرفات کی طرف روانہ ہوگئے۔ قبل اسلام قریش نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ وہ مشعرالحرام پہنچ کر رک جاتے اور کہتے کہ ہم اہلِ حرم ہیں حرم سے باہر نہیں نکلیں گے۔ البتہ دوسرے لوگ عرفات میں چلے جاتے۔ قریش کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ بھی منیٰ سے نکل کر مشعرالحرام میں رک جائیں گے اور آگے نہیں بڑھیں گے مگر حکم قرآن ثم افیضوا من حیث افاض الناس "جہاں سے دوسرے لوگ چل کھڑے ہوں تم بھی وہیں سے چل کھڑے ہو" کی بنا پر پیغمبرؐ مشعرالحرام سے آگے عرفات کی طرف چل دیئے اور وہاں پہنچ کر نمرہ میں خیمہ زن ہوئے۔ ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی غروب آفتاب تک وقوف فرمایا اور بعد غروب وہاں سے چل کر مشعرالحرام میں تشریف فرما ہوئے اور مغرب و عشار کی نماز ایک ساتھ پڑھی۔ مشعرالحرام میں رات گزارنے کے بعد روز عید صبح کے وقت منیٰ میں آئے اور جمرۂ عقبیٰ پر رمی کرنے کے بعد تیس اونٹ اپنے ہاتھ سے نحر کئے اور بقیہ اونٹوں کے نحر کرنے پر حضرت علیؑ کو مامور فرمایا۔ جب اونٹ نحر ہو چکے تو ہر اونٹ میں

سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے کر ایک دیگ میں پکوایا اور حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر اس میں سے کچھ کھایا اور باقی تقسیم کر دیا۔ قربانی سے فارغ ہو کر سر منڈوایا اور احرام کھول دیا۔ اور اسی دن مکہ معظمہ میں پہنچ کر خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی بجا لائے اور منیٰ میں واپس آ گئے جہاں ۱۳ ذی الحجہ تک قیام فرمایا اور رمی جمرات کا فریضہ ادا کیا۔ جب اعمالِ حج سے فارغ ہو گئے تو ۱۴ ذی الحجہ کو مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ مدینہ روانہ ہو گئے۔

غدیر خم

پیغمبر اسلامؐ فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد جب مدینہ کی جانب روانہ ہوئے تو کم و بیش ایک لاکھ کا مجمع آپ کے ہمرکاب تھا جو مختلف شہروں اور بستیوں سے سمٹ کر جمع ہو گیا تھا اور اب فرض سے سبکبار ہو کر خوش خوش اپنے گھروں کو پلٹ رہا تھا۔ کچھ لوگ مدینہ پہنچ کر الگ ہونے والے تھے اور کچھ لوگوں کو راستے ہی سے علیحدہ ہو جانا تھا۔ جوں جوں اُن کی بستیاں قریب آتی جا رہی تھیں ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی کچھ لوگ شاداں و فرحاں آگے بڑھ گئے تھے اور کچھ افتاں و خیزاں چلے آ رہے تھے۔ غرض قافلہ رواں دواں تھا کہ مقام جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک پُر خار وادی میں جو خم غدیر کہلاتی تھی انہیں ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم اتنا اچانک اور ناگہانی تھا کہ لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کہ یہاں منزل کیسی کیونکہ یہ جگہ نہ تو قافلوں کے اترنے کے لئے موزوں تھی نہ گرمی سے بچنے کا کوئی سامان تھا اور نہ دھوپ سے بچاؤ کے لئے سایہ اور نہ اُدھر سے گزرتے ہوئے عربوں کے کسی کارواں کو یہاں منزل کرتے دیکھا گیا تھا۔

اس کارواں کو روکنے کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کو اللہ کے ایک اہم فیصلہ سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور اس کے عمومی اعلان کے لئے مناسب موقع و محل کے منتظر تھے اور اس سے مناسب تر کوئی اور موقع نہ ہو سکتا تھا کیونکہ چند لمحوں کے بعد یہ مجمع متفرق و پراگندہ ہو جانے والا تھا اور پھر اتنی عظیم جمعیت کے یکجا ہونے کی بظاہر حال کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ عالم اسلام کے ہر کونے اور ہر خطے کے لوگ جمع تھے اور اُن کے منتشر ہونے سے پہلے یہ حکم ان کے گوشگزار کر دینا ضروری تھا۔ پھر اس صحرائے بے آب و گیاہ میں کارواں کو روک لینے میں یہ مصلحت بھی کار فرما ہو سکتی ہے کہ اگر معمولاً اس مقام پر قافلے ٹھہرا کرتے تو یہ سمجھا جاتا کہ آرام اور سفر کی تکان دور کرنے کے لئے منزل کی گئی ہے اور ضمناً ایک اعلان

بھی کر دیا گیا ہے جس سے اس اعلان کی اہمیت کم ہو جاتی۔ آنحضرتؐ نے اس کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جو کبھی قافلوں کی فرودگاہ نہ رہی تھی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہاں ٹھہرنے کا مقصد آرام و استراحت نہیں ہے بلکہ معاملہ کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ کتنی زحمت و تکلیف کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے اس چلتے ہوئے میدان میں چلتے ہوئے کارواں کو روک لیا جائے اور سب کو فیصلہ خداوندی سے آگاہ کر دیا جائے اور وہ فیصلہ آنحضرتؐ کی نیابت و جانشینی کے متعلق تھا۔

اس سے پیشتر دعوتِ عشیرہ کے ایک محدود دائرہ میں اور غزوۂ تبوک و تبلیغ سورۂ برأۃ کے مواقع پر پیغمبرؐ کی زبان سے مختلف پیراؤں اور اشاروں کنایوں میں ایسے کلمات سنے جا چکے تھے جن سے ایک انصاف پسند اور غیر جانبدار انسان یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور تھا کہ ہو نہ ہو پیغمبرؐ علیؑ کو اپنا نائب و جانشین مقرر کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی دیکھنے میں آتا تھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں خواہ مخواہ علیؑ کے خلاف شکوہ ریز رہتی ہیں اور ان کے معمولی منصب پر بھی ان کی دلی کدورتیں چہروں پر کھل جاتی ہیں وہ بھلا اسے کیونکر ٹھنڈے دل سے گوارا کریں گے اور اسے عملی جامہ پہننے دیں گے۔ پیغمبر اکرمؐ بھی ان چیزوں سے خالی الذہن نہ تھے۔ وہ بعض چہروں کے اتار چڑھاؤ سے ان کی دلی کیفیتوں کو بھانپ رہے تھے۔ اور ان کے حرکات و سکنات سے ان کے ارادوں کو سمجھ رہے تھے کہ یہ مخالفت کئے بغیر نہیں رہیں گے اور ہر ممکن طریقہ سے روڑے اٹکائیں گے۔ اس لئے مزاج شناسِ قدرت یہ چاہتا تھا کہ قدرت کی طرف سے ان لوگوں کے شر سے تحفظ کا ذمہ لے لیا جائے تو پھر اس کا عمومی اعلان کیا جائے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے تحفظ کی ذمہ داری کے ساتھ اس مقام پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔	اے رسولؐ تمہارے پروردگار کی طرف سے جو حکم تم پر اتارا گیا ہے اسے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے کوئی پیغام پہنچایا ہی نہیں اور اللہ (ہر حال میں) تمہیں لوگوں کے شر سے بچائے گا۔"

علامہ قاضی شوکانی تحریر فرماتے ہیں:۔

عن ابی سعید الخدری قال نزلت ھذہ الآیۃ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک علی رسول اللہ یوم غدیر خم فی علی ابن ابی طالب (فتح القدیر ج ۲ ص ۵۷)	ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ آیۂ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک غدیر خم میں علی ابن ابی طالب کے بارے میں رسول اللہ پر نازل ہوا۔"

اس تہدید آمیز حکم کے بعد تاخیر کی گنجائش نہ تھی۔ پیغمبر اکرمؐ سواری پر سے اُترے ساتھ والے بھی اُتر پڑے حی علیٰ خیر العمل کی آواز پر آگے بڑھ جانے والے پلٹے اور پیچھے رہ جانے والے تیزی سے بڑھے اور تمام مجمع سمٹ کر یکجا ہو گیا۔ دوپہر کا وقت بادِ سموم کے جھلسا دینے والے جھونکے جلتا ہوا ریگستان آفتاب کی تمازت اور گرمی کی شدت چند ببول کے درختوں کے علاوہ نہ کہیں سبزہ نہ کہیں سایہ۔ صحابہ نے عبائیں کندھوں سے اتار کر پیروں کے گرد لپیٹ لیں اور اس جلتی ہوئی زمین پر ہمہ تن گوش بن کر بیٹھ گئے۔ آنحضرتؐ نے اونٹوں کے کجاوے جمع کر کے ببول کے دو درختوں کے درمیان ایک منبر تیار کروایا اور زیب دہ عرشۂ منبر ہوئے۔ زید بن ارقم کہتے ہیں :۔

قام رسول الله یوم فینا خطیبا بماء یدعی خما بین مکۃ و المدینۃ فحمد الله واثنی علیہ و وعظ و ذکر ثم قال اما بعد الا یا ایھا الناس فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول ربي فاجیب و انا تارك فیکم الثقلین اولھما کتاب الله فیہ الھدی والنور فخذوا بکتاب الله واستمسکوا فحث علی کتاب الله و رغب فیہ ثم قال واھل بیتي اذکرکم الله فی اھل بیتي اذکرکم الله فی اھل بیتي اذکرکم الله فی اھل بیتي۔ (صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۷۹)

پیغمبر اکرمؐ مکہ اور مدینہ کے درمیان اس تالاب پر جو خم کہلاتا تھا خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور پند و تذکیر کے بعد فرمایا اے لوگو میں ایک بشر ہی تو ہوں وہ وقت دور نہیں ہے کہ میرے پروردگار کی طرف سے پیغامبر آئے اور میں اس کی آواز پر لبیک کہوں میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب جس میں نور و ہدایت ہے لہذا کتاب خدا کو مضبوطی سے پکڑو اور اس سے وابستہ رہو۔ آپ نے کتاب خدا سے تمسک پہ زور دیا اور اس کی طرف رغبت دلائی پھر فرمایا اور دوسرے میرے اہل بیت ہیں۔ میں تمہیں اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں میں تمہیں اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں میں تمہیں اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔"

ان تمہیدی کلمات کے بعد تین مرتبہ بلند آواز سے فرمایا الست اولی بکم منکم بانفسکم " کیا میں تم پر خود تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا" سب نے ہم آواز ہو کر کہا اللھم بلیٰ۔ " بیشک ایسا ہی ہے" اپنی اولویت و حاکمیت کا اقرار لینے کے بعد حضرت علی کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اوپر اٹھایا اور فرمایا :۔

یا ایھا الناس ان اللہ مولای وانا مولی المومنین وانا اولی بھم من انفسھم فمن کنت مولاہ فھذا مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔	اے لوگو اللہ میرا مولا ہے اور میں تمام مومنوں کا مولا ہوں اور میں ان کے نفسوں سے زیادہ اُن پر حاکم و متصرف ہوں۔ یاد رکھو کہ جس جس کا میں مولا ہوں اُس کے یہ بھی مولا ہیں خدایا اُسے دوست رکھ جو انہیں دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو انہیں دشمن رکھے۔"

ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے:۔

قال یوم غدیر خم من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۶)	پیغمبرؐ نے غدیر خم کے دن فرمایا جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔ اے اللہ جو انہیں دوست رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو انہیں دشمن رکھے تو اسے دشمن رکھ۔"

اس اعلان کے بعد آنحضرتؐ فراز منبر سے نیچے تشریف لائے اور نماز ظہر با جماعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ گروہ در گروہ علی کے خیمہ میں جائیں اور انہیں اس منصب رفیع پر مبارکباد دیں۔ چنانچہ صحابہ نے تبریک و تہنیت کے کلمات کہے۔ امہات المومنین اور دوسری خواتین نے بھی اظہار مسرت کرتے ہوئے مبارک باد دی اور حضرت عمر کے الفاظ تہنیت تو اب تک کتب تاریخ و حدیث میں موجود ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

ھنیا لک یا بن ابی طالب اصبحت وامسیت مولی کل مومن و مومنۃ (مسند احمد حنبل۔ ج ۴۔ ص ۲۸۱)	مبارک ہو اے فرزند ابوطالب آپ تو ہر مومن اور مومنہ کے مولا ہو گئے۔"

ادھر مبارکبادیوں کا سلسلہ جاری تھا ادھر جبرئیل امین نے اُتر کر تکمیل دینؑ اتمام نعمت کا روح پرور مژدہ سنایا:۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔	آج میں نے تمہارے دین کو ہر لحاظ سے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔"

جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں:۔

عن ابی سعید الخدری قال لما نصب رسول اللہ علیا یوم غدیر خم فنادی لہ بالولایۃ ھبط جبرئیل علیہ بھذہ الآیۃ الیوم اکملت لکم دینکم۔

ابوسعید خدری کہتے ہیں جب رسول اللہؐ نے غدیر خم کے دن علی کو اپنی جگہ پر نصب کیا اور ان کی ولایت کا اعلان کیا تو جبرئیلؑ ایں آیۂ الیوم اکملت لکم دینکم لے کر آنحضرت پر نازل ہوئے ۔"

(تفسیر در منثور۔ ج ۲۔ ص ۲۵۹)

واقعہ غدیر خم متواتر و مسلم اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہے اس میں تاویلات سے تو کام لیا جاتا رہا لیکن اصل واقعہ کو جھٹلایا نہ جا سکا۔ اور نہ الفاظ حدیث کی صحت سے انکار کیا جا سکا کیونکہ اس حدیث کے کثرتِ طرق پر نظر کرنے کے بعد وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو مشاہدات و بدیہات کے انکار کا عادی ہو۔ علم الہدیٰ سید مرتضیٰ نے فرمایا کہ واقعۂ غدیر کا انکار چاند سورج اور ستاروں کے انکار کے برابر ہے۔ علامہ مقبلی نے کہا ہے کہ اگر واقعہ غدیر یقینی نہیں ہے تو پھر دین کی کوئی بات یقینی نہیں ہے۔" فریقین کے علماء و محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک عظیم اجتماع کے اندر اپنی حاکمیت و اولویت کا اقرار لینے کے بعد فرمایا کہ جو مجھے اپنا مولا سمجھتا ہے وہ علی کو بھی اپنا مولیٰ سمجھے مگر لفظ مولا کو حسب پسند معنی پہنا کر حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی گئی اس لئے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ اس حدیث کی رو سے جو حیثیت رسولؐ کی امت سے ہے وہی حیثیت علی کی ہے تو سقیفہ بنی ساعدہ کی کارروائی کا کوئی جواز نہ رہتا چنانچہ کبھی یہ کہا گیا کہ اس کے معنی دوست کے ہیں اور کبھی یہ کہا گیا کہ اس کے معنی ناصر و مددگار کے ہیں۔ لیکن سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک جلتے ہوئے صحرا میں ہزاروں کے مجمع کو جو اپنے گھروں میں پہنچنے کے لئے بے چین تھا سمیٹنا جب کہ کارواں کا ایک حصہ عقب میں رہ گیا تھا اور اگلا ریلا تین میل آگے جحفہ کے حدود تک پہنچ چکا تھا کانٹوں کو سمیٹ کر جلتی زمین پر بیٹھنے کی جگہ بنانا پالانوں کو جمع کر کے منبر نصب کرنا اور پیغمبر کا اپنے حاکم و اولیٰ بالتصرف ہونے کا اقرار لینا کیا صرف یہ بتانے کے لئے تھا کہ جس کا میں دوست ہوں اس کے علی بھی دوست ہیں یا جس کا میں مددگار ہوں۔ علی بھی اس کے مددگار ہیں۔ کوئی بھی صاحب عقل و دانش یہ باور نہیں کرے گا کہ یہ اہتمام و انصرام محض اتنی سی بات کے لئے تھا کیا ان لوگوں سے علی کی رسول اللہ سے دوستی و وابستگی مخفی تھی یا اوائل عمر سے اسلام و اہلِ اسلام کی نصرت میں علی کے کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے تھے کسی تعارف کے محتاج تھے۔ یا اللہ کا ارشاد:۔

المومنون والمومنات بعضہم

مومنین کیا مرد کیا عورتیں آپس میں ایک دوسرے

اولیاء بعض۔ کے دوست ہیں"

اس دوستی کے اظہار کے لئے کافی نہیں تھا اور کیا پیغمبر اپنی حاکمانہ حیثیت منوائے بغیر اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ بلاشبہ دوست و ناصر کے معنی مراد لینے سے یہ تمام چیزیں بے معنی و بے مدعا ہو کر رہ جائیں گی۔ اور پھر اس پر بھی نظر ڈالئے کہ پیغمبرؐ کو نصرت و دوستی کے اعلان سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا کہ قدرت کو یہ کہنا پڑا واللہ یعصمك من الناس۔ " اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے بچائے رکھے گا" اور یہ خطرہ بیرونی خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تمام بیرونی خطروں کا انسداد کیا جا چکا تھا۔ اب اگر تھا تو اندرونی خطرہ تھا اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب پیغمبرؐ کا اعلان ایک طبقہ کے سیاسی مصالح سے متصادم ہوتا اور ظاہر ہے کہ دوستی و نصرت کا اعلان تو خطرہ کو دعوت نہ دے سکتا تھا۔

یہ تمام قرائن و شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس مقام پر مولا کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں اور جس طرح آنحضرتؐ کی ولایت و حاکمیت کا اقرار ضروری ہے اسی طرح علی کی ولایت و حاکمیت کا اقرار بھی لازمی ہے اور اسی معنی کی توضیح و تعیین کے لئے پیغمبرؐ نے اپنی حاکمانہ و متصرفانہ حیثیت کا اقرار لیا تھا ورنہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اور حضرت عمر نے مبارک باد پیش کی تو کچھ سمجھ کر ہی پیش کی ہوگی۔ اگر اس میں کسی نمایاں اعزاز کا اعلان نہ ہوتا تو تبریک کا محل ہی کیا تھا۔ اگر جنبہ داری سے ہٹ کر انصاف و حق پسندی سے کام لیا جائے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ اعلان اسی اعلان کی صدائے بازگشت تھا جو واقعہ غدیر سے بیس برس قبل دعوتِ عشیرہ کے ایک محدود حلقہ میں کیا گیا تھا کہ:۔

ان ھذا اخی و وصیی و	یہ میرا بھائی میرا ولی عہد اور
خلیفتی فیکم فاسمعوا له	میرا جانشین ہے اس کی سنو
واطیعوا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۲)	اور مانو"

بہر حال اس اعلان سے نہ صرف مسئلہ خلافت واضح ہو جاتا ہے بلکہ پیغمبرؐ کی تمام تبلیغات و تعلیمات میں اس مسئلہ کی اہمیت اور بنیادی حیثیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگرچہ پیغمبرؐ اکرم نے بعثت سے ہجرت تک اور ہجرت سے حجۃ الوداع تک ان تمام احکام کی تبلیغ کی جو وقتاً فوقتاً آپ پر نازل ہوتے رہے اور مسلمان ہر ہر حکم پر عمل بھی کرتے رہے۔ چنانچہ وہ نمازیں پڑھتے روزے رکھتے زکوٰۃ دیتے اور جہاد میں شریک ہوتے تھے اور حج کے موقع پر جوق در جوق ادائے حج کے لئے بھی جمع ہو گئے تھے مگر آیہ قرآنی وان لم تفعل فما بلغت رسالته۔ " اگر تم نے یہ نہ کیا تو گویا تم نے کوئی پیغام پہنچایا ہی نہیں" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آخری تبلیغ کے بغیر تمام احکام کی تبلیغ ناتمام بلکہ کالعدم تھی۔ حالانکہ اللہ نے کسی حکم کی تبلیغ کو دوسرے حکم کی

تبلیغ پر موقوف نہیں رکھا مگر یہاں پیغمبرؐ کی تیئس سالہ تبلیغ کو صرف اس تبلیغ پر منحصر کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ اگر یہ تبلیغ نہ ہوتی تو دین ناتمام رہ جاتا اور کارِ رسالت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ اس سے دو چیزوں کا ثبوت ملتا ہے ایک تو یہ کہ اس حکم کی حیثیت اسلام میں اصل و اساس کی ہے اور دوسرے اعمال و احکام کی حیثیت فروع کی ہے اور جس طرح بنیاد کے بغیر دیواروں میں استحکام نہیں آتا اور جڑ کے بغیر شاخیں پھلتی پھولتی نہیں اسی طرح اس آخری تبلیغ کے بغیر رسالت ناتمام رہتی اور دین اتمام و اکمال کو نہ پہنچتا۔ لہٰذا رسالت کو اگر اصول میں شمار کیا جاتا ہے تو جسے تکملۂ تبلیغ رسالت قرار دیا گیا ہے۔ اسے بھی اصول میں داخل ہونا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ جب اس امر کے نہ پہنچانے کے نتیجہ میں تمام احکام کا پہنچانا نہ پہنچانے کے برابر ہو جاتا ہے تو اس امر کے نہ ماننے کی صورت میں ان تمام احکام کا سیکھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا گیا بے نتیجہ نہ ثابت ہو گا۔

جیش اسامہ

پیغمبر اکرمؐ نے دعوت اسلام کے سلسلہ میں حارث ابن عمیر ازدی کو اپنا سفیر بنا کر حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا۔ مگر راستے میں حاکم بلقاء شرجیل ابن عمرو غسانی نے انہیں گرفتار کر کے قتل کروا دیا۔ آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع ہوئی۔ تو آپ نے تین ہزار کا ایک لشکر زید ابن حارثہ، جعفر ابن ابی طالب اور عبداللہ ابن رواحہ کی زیر سرکردگی ترتیب دیا۔ اور فرمایا کہ اگر زید کام آ جائیں تو جعفر ابن ابی طالب سردار لشکر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ ابن رواحہ سپہ سالار ہوں گے۔ جب یہ لشکر معان میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہرقل روم، روم و شام کی فوجوں کے ساتھ بلقاء میں چھاؤنی ڈالے پڑا ہے۔ مسلمانوں کو دشمن کی کثرت و قوت کا پتا چلا تو ہراساں ہو کر معان میں رک گئے اور کہنے لگے کہ ہمیں مدینہ سے مزید کمک طلب کرنا چاہیئے مگر عبداللہ ابن رواحہ نے لشکر کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ ہمیں دشمن کی ٹڈی دل فوجوں کو خاطر میں نہ لانا چاہیئے مسلمانوں کی ہمت بندھی اور انہوں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ جب بلقاء کے قریوں میں سے ایک قریہ مشارف میں پہنچے تو دشمن کی نقل و حرکت کو دیکھ کر موتہ کی طرف مڑ گئے تاکہ کسی مناسب جگہ پر پڑاؤ ڈال کر دشمن سے نمٹیں۔ جب موتہ میں پہنچے تو ایک میدان میں صف بندی کی اور میمنہ و میسرہ ترتیب دیا۔ دشمن نے بھی وہاں پہنچ کر صفیں جما دیں۔ زید ابن حارثہ ہاتھوں میں علم لے کر نکلے اور شہید ہو گئے۔ اب جعفر ابن ابی طالب نے علم لے لیا اور میدان میں اتر آئے۔ دشمن سے لڑتے ہوئے کسی کی تلوار پڑی اور آپ کا داہنا ہاتھ قلم ہو گیا

آپ نے بائیں ہاتھ سے علم سنبھالا اور جب بایاں ہاتھ بھی قطع ہو گیا تو علم کو سینہ سے لگا لیا اور اسی سے زیادہ تیر و تلوار کے زخم کھا کر شرفِ شہادت سے ہمکنار ہوئے اور پیغمبرؐ نے انہیں ذوالجناحین (دو پروں والا) اور الطیار فی الجنۃ (جنت میں پرواز کرنے والا) کے لقب سے یاد کیا۔ پھر عبد اللہ ابن رواحہ نے علم سنبھالا اور جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان جلیل القدر علمبرداروں کے بعد کوئی نامزد علمبردار نہ رہا تھا ایک انصاری ثابت ابن ارقم نے علم اٹھا لیا اور کہا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو۔ لوگوں نے کہا کہ اب تم ہی علم لئے رہو کہا کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کسی اور کو منتخب کر و۔ چنانچہ خالد ابن ولید نے علم لے کر سپہ سالاری کا منصب سنبھال لیا۔ انہوں نے کچھ دیر لڑائی کو جاری رکھا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا اندھیرے کی وجہ سے لڑائی رُک گئی۔ خالد نے اسے غنیمت سمجھا اور راتوں رات لشکر کو لے کر میدان سے ہٹ گئے اور مدینہ کا رُخ کر لیا۔ جب یہ شکست خوردہ لشکر مدینہ میں پہنچا اور لوگوں کو لشکریوں کے رو بفرار ہونے کا پتہ چلا تو مٹی اٹھا اٹھا کر اُن کے چہروں پر پھینکنا شروع کی اور انہیں بھگوڑوں کے نام سے یاد کیا۔ یہ لوگ شرمندگی سے منہ چھپاتے پھرتے تھے اور سلمہ ابن ہشام نے جو اس لشکر میں شریک تھے۔ نمازِ جماعت میں آنا چھوڑ دیا اس لئے کہ جب مسجد میں آتے تھے تو لوگ یہ کہنے لگتے تھے :۔

افررتم فی سبیل اللہ۔	کیا تم وہی ہو جو اللہ کی راہ سے بھاگ نکلے تھے۔"
(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۳۱)	

یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں رونما ہوا تھا۔ مگر ابھی تک شہدارِ موتہ کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کسی مصلحت کی بنا پر اسے اپنی زندگی کے آخری دنوں کے لئے اٹھا رکھنا چاہتے تھے چنانچہ اپنی بیماری کے ایام میں ایک اٹھارہ انیس سالہ نوجوان اسامہ ابن زید کی زیر سرکردگی ایک لشکر ترتیب دیا اور مہاجرین و انصار کو ان کی ماتحتی میں جانے پر مامور کیا۔ ابن سعید نے تحریر کیا ہے :۔

فلم یبق من وجوہ المہاجرین الاولین	انصار و مہاجرین اولین میں سے کوئی نمایاں
والانصار الا انتدب فی تلک الغزوۃ	فرد ایسی نہ تھی جسے اس غزوہ میں شرکت
فیھم ابوبکر الصدیق و عمر ابن الخطاب	کے لئے نہ کہا گیا ہو ان لوگوں میں ابوبکر صدیق
وابوعبیدۃ ابن الجراح وسعد ابن	عمر ابن خطاب، عبیدہ ابن الجراح، سعد ابن
ابی وقاص وسعید ابن زید وقتادۃ	ابی وقاص، سعید ابن زید، قتادہ ابن نعمان
ابن النعمان وسلمۃ ابن اسلم ابن	اور سلمہ ابن اسلم ابن حریش بھی شامل
حریش۔ (طبقات۔ ج ۲۔ ص ۱۹۰)	تھے۔"

جب پیغمبرؐ نے علالت کے باوجود اپنے ہاتھ سے علم سج کر اسامہ کو دیا تو مسلمانوں نے ان کے پرچم کے نیچے جانے کے بجائے ان کی افسری پر لے دے شروع کر دی اور کھلے خزانوں اعتراضات کرنے لگے۔ کبھی یہ کہا کہ یہ نو عمر اور ناتجربہ کار ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ ایک آزاد کردہ غلام کا بیٹا ہی تو ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے کانوں میں یہ نکتہ چینی کی آوازیں پہنچیں تو بخار کی حالت میں پلٹے لپٹائے سر پر پٹی باندھے باہر تشریف لائے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

ان تطعنوا فی امرته فقد کنتم	اگر تم اس کی امارت پر معترض ہو تو اس سے پہلے
تطعنون فی امرة ابیه من قبل	اس کے باپ کی امارت پر بھی طعنہ زنی کر چکے ہو
وایم الله انه کان لخلیقا للامرة	خدا کی قسم وہ امارت کا سزاوار تھا اور میری نظروں
وانه کان لمن احب الناس الی وان	میں دوسروں سے زیادہ پسندیدہ تھا اور اس کے
هذا احب الناس الی بعده۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۸۳)	بعد یہ بھی مجھے دوسروں سے زیادہ عزیز ہے۔"

اس کے بعد آپ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور مرض نے شدت کی صورت اختیار کر لی مگر اس حالت میں بھی بار بار یہی فرماتے رہے: جهزوا جیش اسامه انفذوا جیش اسامه ارسلوا جیش اسامة "لشکر اسامہ کو جلدی بھیجو، لشکر اسامہ کو فوراً بھیجو، لشکر اسامہ کو فوراً روانہ کرو"۔ اسامہ پیغمبرؐ کو دیکھنے کے لئے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ بہتر ہوگا کہ آپ کے صحت یاب ہونے کے بعد لشکر کی روانگی ہو۔ فرمایا نہیں تم لشکر کو لے کر فوراً چلے جاؤ اور اس میں ذرا تاخیر نہ کرو۔ اسامہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ ادھر پیغمبر پر مرض کا دباؤ بڑھ گیا اور غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب ذرا سنبھالا لیا تو دریافت فرمایا کیا لشکر روانہ ہو گیا ہے۔ بتایا گیا کہ ابھی جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آنحضرتؐ کی تیوریوں پر بل آئے اور فرمایا:۔

جهزوا جیش اسامة لعن الله	اسامہ کے لشکر کو فوراً روانہ کرو۔ خدا کی لعنت
من تخلف عنها۔ (کتاب الملل والنحل ص ۲)	ہو اس پر جو لشکر میں شریک نہ ہو"

آنحضرتؐ کے بار بار کہنے اور زور دینے سے نکل تو کھڑے ہوئے مگر مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر وادی جرف میں جا کر رُک گئے۔ اتنے میں کسی نے خبر بھجوائی کہ پیغمبرؐ کا دم واپسیں ہے یہ سُن کر اسامہ، ابو عبیدہ اور حضرت عمر مدینہ چلے آئے۔ یہ دن رسول اللہ کی زندگی کا آخری دن تھا۔ جب آپ جوارِ حق میں پہنچ گئے۔ تو دوسرے لوگ بھی واپس پلٹ آئے۔

اہل اسلام کے نزدیک پیغمبرؐ اکرم کا ہر حکم، حکم الٰہی کا آئینہ دار اور وحی الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور

اس کی مخالفت حکم خدا کی مخالفت ہے مگر اس کے باوجود پیغمبرؐ کا یہ تاکیدی فرمان ٹال مٹول کی نذر ہو جاتا ہے اور مامورین میں سے کوئی اس پر عمل پیرا ہوتا نظر نہیں آتا۔ کاغذ و قلم کے طلب کرنے پر تو ہذیان کی آڑ میں خلاف ورزی کا جواز پیدا کر لیا گیا تھا مگر خدا جانے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کے لئے کیا جواز ڈھونڈا جائے گا۔

اس تجہیز جیش کی مصلحت اور اس کی خلاف ورزی کے دواعی و اسباب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس واقعہ کے پس منظر کا جائزہ لیا جائے اور ان حالات پر نظر کی جائے جن حالات کے ماتحت رسولؐ خدا نے مہاجرین و انصار کو اسامہ کی زیر قیادت لشکر کشی کا حکم دیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد سے پیغمبرؐ کی طبیعت پژمردہ رہنے لگی تھی اس طبیعت کے اضمحلال نے بیماری کی صورت اختیار کر لی اور یہی بیماری موت کا پیش خیمہ بن گئی۔ آنحضرتؐ حجۃ الوداع اور غدیر خم کے خطبوں میں یہ خبر دے چکے تھے کہ میری موت کی ساعت قریب ہے اور میں جلد اس جہان فانی سے رخصت ہو جانے والا ہوں اور حجۃ الوداع سے پلٹنے کے بعد بھی آپ کی زبان سے ایسے کلمات سنے گئے جو ایک طرح سے موت کا واضح اعلان تھے اور صحابہ بھی سمجھ رہے تھے کہ یہ رحمت و رأفت کا آسمان جو تیئیس برس سے ان کے سروں پر سایہ فگن تھا پیوند زمین ہونے والا ہے عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں:۔

نعی الینا نبینا و حبیبنا نفسه قبل موت بشهر (تاریخ طبری ج ۲ صفحہ ۴۳۵)	ہمارے پیغمبرؐ نے رحلت سے ایک مہینہ پہلے اپنی موت کی خبر دے دی تھی۔"

پیغمبر ایک طرف سفر آخرت کے قرب کی خبر دے رہے تھے اور دوسری طرف ایسے فتنوں کے ابھرنے کی پیشین گوئیاں بھی فرما رہے تھے جن کے مہیب سائے اُفق عالم پر چھائے جا رہے تھے اور شب تاریک کے مانند فضا کو تیرہ و تار بنانے کے لئے امنڈے آئے تھے۔ چنانچہ آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک رات لڑکھڑاتے سنبھلتے جنۃ البقیع میں تشریف لے گئے اور اہل قبور کے حق میں دعائے مغفرت اور ان پر سلام کرنے کے بعد فرمایا:۔

لیهن لکم ما اصبحتم فیه مما اصبح الناس فیه قد اقبلت الفتن کقطع اللیل المظلم یتبع آخرها اولها و الآخرة شر من الاولی۔ (تاریخ طبری ج ۲ صفحہ ۴۳۲)	جس حال میں زندہ لوگ ہیں اسے دیکھتے ہوئے یہ حال تمہیں گوارا اور مبارک ہو۔ اب تو کالی راتوں کی طرح کے فتنے پے در پے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور جو فتنہ اٹھے گا وہ پہلے فتنہ سے بدتر ہو گا۔"

ان حالات میں کہ ایک طرف دم واپسیں اور دوسری طرف تباہ کن فتنے سر اٹھاتے نظر آ رہے ہیں کیا

ان فتنوں کا انسداد زیادہ ضروری تھا یا موتہ کے ان شہیدوں کا قصاص زیادہ لازمی تھا۔ جنہیں شہید ہوئے دو ڈھائی سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس عرصہ میں نہ ادھر کوئی توجہ کی گئی اور نہ کوئی عملی اقدام کیا گیا۔ اگر دشمن کی طرف سے چڑھائی کا اندیشہ ہوتا یا غنیم حملہ آور ہوتا تو اس صورت میں فوج کشی بہر حال لازمی تھی مگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تھی۔ نہ دشمن چڑھ آیا تھا نہ غنیم حملہ آور تھا اور نہ ہوس ملک گیری کا سوال پیدا ہوتا ہے پھر اچانک اس کی اہمیت کا اتنا احساس کیوں کہ جب غشی سے آنکھیں کھلتی ہیں بار بار یہی فرماتے ہیں کہ جس طرح بن پڑے لشکر کو بھیج دو اور میں اپنی زندگی میں سن لوں کہ لشکر جا چکا ہے۔ اور پھر اس تاکید نے تہدید کی صورت اختیار کر لی اور فرمایا کہ جو لشکر میں شریک ہو کر جانے سے گریز کرے وہ اللہ کی لعنت کا سزا وار ہے۔ اس سے پہلے کبھی پیغمبرؐ نے یہ تہدیدی لہجہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ جنگ و جہاد میں جانے سے کسی نے عذر کیا تو اس کا عذر منظور کر لیا کسی نے مجبوری ظاہر کی تو اسے رخصت دے دی مگر یہاں نہ کوئی عذر مسموع ہوتا ہے۔ اور نہ جھوٹی سچی مجبوری کو مجبوری سمجھا جاتا ہے۔ بس ایک ہی اٹل فیصلہ ہے کہ یہاں سے چل دو۔ جس میں نہ رد و بدل کی گنجائش ہے اور نہ ترمیم کی حالانکہ زندگی کے آخری لمحات میں انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے یار و انصار اس کے گرد و پیش جمع رہیں۔ تجہیز و تکفین میں حصہ لیں۔ نماز جنازہ میں شریک ہوں اور اس کے قریبیوں اور عزیزوں کا غم بٹائیں اور انہیں تسلی و تسکین دیں۔ اور پھر ان لوگوں کے لئے تو اس میں اور زیادہ الجھاؤ ہے اور جس کا نظریہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنی نیابت و جانشینی کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ اسے امت کے ارباب حل و عقد پر چھوڑ دیا تھا اور اب جب کہ مستقبل قریب میں ان کے سر جوڑ کر بیٹھنے کا وقت آ رہا تھا انہیں مدینہ سے کوسوں دور چلے جانے کا حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر خلافت کا مسئلہ اہل شوریٰ و رائے کی صوابدید سے وابستہ ہوتا تو انہیں جانے کا حکم قطعاً نہ دیا جاتا تاکہ وہ آپ کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ طے کریں اور امت کو فتنہ و انتشار سے بچا سکیں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ پیغمبرؐ ان کے جانے پر زور دیتے رہے کیا وہ مرکز میں رہ کر ان فتنوں کا سد باب نہ کرتے جن فتنوں کے سر اٹھانے کی پیشین گوئی فرما رہے تھے یا یہ کہ خود انہی سے کسی فتنہ کا اندیشہ تھا جس کے انسداد کے لئے ان سے مدینہ خالی کرایا جا رہا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ اپنے گرد و پیش والوں سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ کچھ لوگ تو آپ کی خبر علالت سن کر اسلام سے منحرف ہو رہے تھے اور کچھ لوگوں کے طور طریقے یہ بتا رہے تھے کہ وہ اقتدار کی راہیں ہموار کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ جس کے معیار گھڑے جائیں گے، اصول بنائے جائیں گے اور ان خود ساختہ اصولوں کے نتیجہ میں مسلمان بٹ جائیں گے اور اسلام پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اسلام کے تحفظ کی واحد ضمانت پیغمبرؐ کے ہدایات پر عمل پیرا ہونے میں مضمر تھی۔ آنحضرتؐ مختلف مواقع پر اور خصوصاً غدیر خم کے موقع پر

ہدایت فرما چکے تھے کہ ان کے بعد علی خلیفہ و ولی امر ہوں گے مگر اس کے ساتھ کچھ مشکلات بھی نظر آ رہی تھیں آپ دیکھ چکے تھے کہ بعض لوگوں کی نظروں میں علی کا معمولی سے معمولی انداز بھی کھٹکتا ہے اور وہ بات بات پر شکایات کا طومار باندھنے لگتے ہیں۔ وہ یقیناً دعوتِ عشیرہ کے عہد و پیمان اور غدیر خم کے اعلان کو عملی جامہ پہنائے جانے میں مزاحم ہوں گے اور جنہوں نے آپ کے جیتے جی اسامہ کی امارت کو تسلیم نہ کیا ہو اور ان کی نوعمری کی وجہ سے انہیں قیادت کا اہل نہ سمجھا ہو وہ علی کو بلا چون و چرا کس طرح نمائندۂ اسلام اور خلیفۂ رسول تسلیم کر لیں گے اور کیا ان کی کم عمری پر بھی اعتراض نہ ہوگا۔ اگرچہ پیغمبرؐ نے ایک نوجوان کو امارت دے کر اس اعتراض کو اعتراض نہیں رہنے دیا تھا پھر بھی حضرت علی اس اعتراض سے نہ بچ سکے۔ اور یہ کہا گیا کہ وہ ابھی جوان ہیں اور خلافت و امارت کے لئے کوئی عمر رسیدہ آدمی ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ اس تجہیز جیش میں جہاں یہ مقصد کار فرما تھا کہ شہداء موتہ کا قصاص لیا جائے وہاں یہ اہم مقصد بھی اس میں مضمر تھا کہ جن جن سے یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ وہ حضرت علی کی خلافت کی عملی تکمیل میں مزاحم ہوں گے۔ انہیں اتنے عرصہ کے لئے مدینہ سے باہر بھیج دیا جائے کہ جب وہ پلٹ کر آئیں تو خلافت اپنے مرکز پر قائم ہو چکی ہو اور رخنہ اندازیوں کا سد باب ہو چکا ہو۔ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ جانے والے نہیں ہیں مگر پیغمبر کا پیغمبرؐ ہونے کی حیثیت سے بہر حال یہ فرض تھا کہ وہ خاموش بیٹھنے کی بجائے پیہم جدوجہد کرتے رہیں اور لوگوں کی نافرمانی و خلاف ورزی سے گھبرا کر سپر انداختہ نہ ہوں۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ کا کام ادائے فرائض ہے خواہ ان کی آواز پر کان دھرا جائے یا نہ دھرا جائے۔ اور پھر یہ اصرار رائیگاں بھی تو نہیں گیا اس سے کوئی اور مقصد حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر اتنا تو ہوا کہ جنہوں نے پیغمبرؐ کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں اقتدار حاصل کیا ان کے دلوں کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی ہوسِ اقتدار بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی اور ان کے اقتدار کی شرعی حیثیت بھی واضح ہو گئی۔ بہر حال اس خلاف ورزی کا مقصد ہی یہ تھا کہ اگر چلے جانے کی صورت میں یہ بیل منڈھے چڑھ گئی اور اقتدار کا رخ دوسری سمت مڑ گیا تو اپنی طرف موڑنے میں کامیابی نہ ہو سکے گی اس طرح یہ ایک اعصابی جنگ تھی جو اندر ہی اندر لڑی جا رہی تھی۔ اُدھر پیغمبرؐ جانے کے لئے کہتے ادھر جاتے اور پھر پلٹ آتے۔ کبھی مزاج پرسی کے حیلہ سے اور کبھی سامان کی فراہمی کے بہانہ سے، کچھ کنی سوئیاں لینے کے لئے یہیں رہ جاتے اور کچھ لشکر گاہ کی طرف پلٹ جاتے۔ غرض پیغمبرؐ نے لاکھ کہا سنا مگر نہ جانا تھا نہ گئے۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں تو ان کا حکم ہوسِ حکمرانی کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے اور پیغمبرؐ کے کے بار بار کہنے کے باوجود بوجھل قدموں میں جنبش پیدا نہیں ہوتی مگر جب خلافت قائم کر لی جاتی ہے تو

سب سے پہلے لشکر اسامہ کی روانگی کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس طرح حکم رسولؐ کی نافرمانی کا دھبا بھی دُھل جائے اور یہ تاثر بھی دیا جا سکے کہ اللہ اللہ حکم رسولؐ کا کتنا پاس و لحاظ تھا کہ اقتدار کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی فوراً لشکر روانہ کر دیا۔ اگرچہ ایک کثیر تعداد نے اس کی مخالفت کی تھی مگر حضرت ابوبکر کو اصرار تھا کہ اسامہ کی زیر نگرانی لشکر کی روانگی ضرور عمل میں لائی جائے اور جسے چند دن پیشتر امارت کا اہل تصور نہ کیا گیا تھا اب اسے اہل سمجھ لیا گیا۔ انصار کی رائے یہ تھی کہ لشکر کی روانگی ملتوی کر دی جائے اور اگر ملتوی نہ کی جائے تو اسامہ کی بجائے کسی معمر و سن رسیدہ شخص کو لشکر کی امارت سپرد کی جائے۔ چنانچہ حضرت عمر نے انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت ابوبکر سے کہا کہ اسامہ کو امارت سے برطرف کر دیا جائے۔ جس پر حضرت ابوبکر بہت بگڑے اور حضرت عمر کی ڈاڑھی پکڑ کر کہا:۔

ثكلتك امك وعدمتك يا ابن الخطاب استعمله رسول الله وتامرني ان انزعه۔
(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۶۲)

تم مرجاؤ اور تمہاری ماں تمہارے سوگ میں بیٹھے اے خطاب کے بیٹے اسے رسول اللہ نے امیر مقرر کیا تھا اور تم مجھے یہ کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔"

اگر لشکر کی روانگی میں حکم رسولؐ کا احترام ملحوظ تھا تو اس احترام کا تقاضا یہ بھی تھا کہ اسامہ کی معزولی کا مطالبہ نہ کیا جاتا اس لئے کہ وہ رسولؐ کے منتخب کردہ تھے اور رسول نے ان لوگوں سے خفگی کا بھی اظہار کیا تھا جنہوں نے اُن کی امارت پر نکتہ چینی کی تھی اگرچہ حضرت عمر انصار کے پیغامبر تھے مگر اس معزولی میں ان کے ہمنوا تھے۔ اگر وہ انصار کے ہمنوا نہ ہوتے تو وہ ان کی طرف سے پیغامبر بن کر آنے کی بجائے انہیں کہہ دیتے کہ اسامہ رسولؐ کے مقرر کردہ ہیں تم ان کی معزولی کا مطالبہ کرنے والے کون ہوتے ہو یا یہ کہتے کہ تم خود ہی حضرت ابوبکر کے پاس چلے جاؤ اور انہیں کہو کہ وہ اسامہ کو برطرف کر دیں، اور حضرت ابوبکر بھی حضرت عمر پر بگڑنے کے بجائے انصار پر بگڑتے۔ ظاہر ہے کہ یہ خفگی اسی بناء پر ہوگی کہ انہیں انصار کا ہمنوا پایا ہوگا۔ بہرحال حضرت ابوبکر کے کہنے سننے سے اسامہ کی امارت تو گوارا کر لی گئی مگر پھر بھی کچھ لوگوں نے عملاً ان کی امارت کو تسلیم نہ کیا اور لشکر میں شریک ہونے سے کنارہ کش رہے۔ حضرت ابوبکر تو حکومت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے نہ گئے ہوں گے حضرت عمر بھی اسامہ سے اجازت لے کر رہ گئے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا اسامہ کو یہ حق پہنچتا تھا کہ جنہیں رسول اللہ نے نام لے لے کر مامور فرمایا ہو وہ انہیں اجازت دے کر رخصت کر دیں؟ ظاہر ہے کہ اُن کی حیثیت ایک سپہ سالار کی تھی اور وہ قطعاً اس کے مجاز نہ تھے کہ جسے چاہیں ساتھ رکھیں اور جسے چاہیں چھوڑ جائیں۔ پھر اس اجازت طلب کرنے اور اجازت دینے کے معنی ہی کیا

ہیں۔ اور اگر وہ مجاز بھی فرض کر لئے جائیں تو حکومت کی سطوت و ہیبت کے سامنے اجازت دینے سے انکار بھی کیسے کر سکتے تھے۔

امامت نماز

پیغمبر اکرمؐ اپنے زمانۂ علالت میں جب تک قوت و توانائی ساتھ دیتی رہی برابر مسجد میں آتے جاتے اور نماز پڑھاتے رہے لیکن جب مرض نے انتہائی شدت اختیار کر لی تو یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔ چنانچہ دوشنبہ کے دن جب صبح کی اذان کے بعد بلال نے حاضر خدمت ہو کر نماز کے لئے عرض کیا تو فرمایا کہ میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ مسجد تک جا سکوں کسی شخص کو کہو کہ وہ نماز پڑھا دے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ میرے باپ ابوبکر سے کہہ دیجئے کہ وہ نماز پڑھا دیں حضرت حفصہ نے کہا کہ میرے باپ عمر سے فرمایئے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان دونوں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام سنا تو پتا چلا کہ وہ جیش اسامہ میں شامل ہونے کے بجائے مدینہ میں موجود ہیں آپ فوراً مرض کی سختی و سنگینی کے باوجود اٹھ کھڑے ہوئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی نماز پڑھا دے اور یہ امامت خلافت کا پیش خیمہ بن جائے اور فضل ابن عباس اور علی ابن ابی طالب کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں تشریف لے آئے دیکھا کہ حضرت ابوبکر محراب مسجد تک پہنچ چکے ہیں آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے پیچھے ہٹنے کے لئے کہا اور خود آگے بڑھ کر نماز پڑھائی۔ واقعہ تو اتنا ہی ہے مگر اسے بنیاد قرار دے کر یہ قصہ گھڑ لیا گیا کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کے لئے مامور کیا تھا اور خود ان کے عقب میں نماز پڑھی اور اسی بناء پر انہیں منصب خلافت کے لئے منتخب کیا گیا کیونکہ جسے پیغمبر نماز میں اپنا نائب قرار دیں وہی ریاست عامہ یعنی حدود و احکام شرعیہ کے نفاذ و اجراء میں ان کا خلیفہ و جانشین ہو سکتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا حضرت ابوبکر خود مصلائے رسول پر کھڑے ہو گئے تھے یا رسول اللہؐ نے انہیں مامور فرمایا تھا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پیغمبرؐ کے حکم سے کھڑے ہوئے تھے تو کیا نماز کی امامت خلافت کی دلیل بن سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں جو روایات کتب تاریخ و احادیث میں درج ہیں وہ اس قدر متعارض و متضاد ہیں کہ ان کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک روایت کچھ کہتی ہے اور دوسری روایت اس کے خلاف کچھ اور ہی کہتی ہے۔ اب کسے صحیح سمجھا جائے اور کسے غلط کہا جائے۔ حیرت یہ ہے کہ ان متضاد روایات میں سے اکثر حضرت عائشہ ہی سے مروی ہیں ان روایات کا تعارض و تضاد ہی اصل دعوی کو کمزور ثابت کرنے کے لئے

بہت کافی تھا چہ جائیکہ وہ نماز کے مسلمہ اصول وضوابط کے بھی منافی ہیں۔ اس مقام پر چند روایتیں درج کی جاتی ہیں تاکہ ارباب فکر ونظر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ ان متضاد روایات سے کہاں تک اثبات مدعا میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ابن ہشام تحریر کرتے ہیں :-

دعاہ بلال الی الصلوٰۃ فقال مروا من یصلی بالناس قال فخرجت فاذا عمر فی الناس وکان ابوبکر غائبا فقلت قم یا عمر فصل بالناس قال فقام فلما کبر سمع رسول اللہ صوتہ وکان عمر مجھرا قال فقال فاین ابوبکر یابی اللہ ذلک والمسلمون یابی اللہ والمسلمون قال فبعث الی ابی بکر فجاء بعد ان صلی عمر تلک الصلوٰۃ فصلی بالناس۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۳۰۲)

بلال نے آنحضرتؐ سے نماز کے لئے عرض کیا تو عبداللہ ابن زمعہ سے فرمایا کہ کسی کو کہو کہ وہ نماز پڑھادے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ میں باہر نکلا، تو دیکھا کہ لوگوں میں حضرت عمر ہیں اور حضرت ابوبکر نہیں ہیں۔ میں نے حضرت عمر سے کہا کہ چلئے آپ نماز پڑھا دیجئے۔ جب انہوں نے تکبیر کہی اور ان کی آواز بلند تھی تو پیغمبرؐ نے ان کی آواز سن کر فرمایا کہ ابوبکر کہاں ہیں اللہ اور مسلمانوں کو انکار ہے کہ عمر نماز پڑھائیں اللہ اور مسلمانوں کو یہ گوارا نہیں ہے۔ پھر حضرت ابوبکر کو بلوایا مگر وہ اسوقت آئے جب حضرت عمر نماز پڑھا چکے تھے۔ پھر حضرت ابوبکر نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔"

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ابتدا میں کسی خاص شخص کو نماز کے لئے معین نہیں کیا تھا بلکہ عبداللہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ جسے چاہیں اسے کہہ دیں کہ وہ نماز پڑھائے اس عمومی اجازت کی بناء پر عبداللہ نے حضرت عمر کو نماز پڑھانے کے لئے کہہ دیا اور جب وہ نماز شروع کر چکے تو آنحضرتؐ نے ابوبکر کو بلوا بھیجا کہ وہ نماز پڑھائیں مگر ان کے آتے تک حضرت عمر نماز پڑھا چکے تھے اور حضرت ابوبکر نے پھر سے نماز پڑھائی۔ اس روایت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب آنحضرتؐ نے عبداللہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی سے کہیں کہ وہ نماز پڑھادے اور ان کے کہنے پر حضرت عمر نے نماز پڑھا دی تو پھر حضرت ابوبکر کے پیچھے آدمی دوڑانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ نماز پڑھائیں کیا حضرت عمر کے پیچھے نماز صحیح نہ تھی؟ اور اگر صحیح تھی تو اعادۂ نماز کیوں؟ اگر پیغمبرؐ یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکر ہی نماز پڑھائیں تو وہ عبداللہ سے فرما دیتے کہ وہ ابوبکر سے نماز پڑھانے کے لئے کہیں تاکہ نہ حضرت عمر کو خجالت اٹھانا پڑتی اور نہ اعادۂ نماز کی ضرورت ہوتی۔

ابن سعد تحریر کرتے ہیں :-

فلما کبر قال رسول اللہ لا لا این ابن ابی قحافہ قال فانقضت الصفوف وانصرف عمر فما برحنا حتی طلع ابن ابی قحافہ وکان بالسنح فتقدم فصلی بالناس ۔ (طبقات ۔ ج ۔ ص۲۲۳)

جب حضرت عمر نے تکبیر کہی تو رسول اللہ نے کہا نہیں نہیں ! فرزند ابو قحافہ کہاں ہیں یہ سن کر صفیں درہم وبرہم ہو گئیں اور حضرت عمر نماز چھوڑ کر الگ ہو گئے راوی کہتا ہے کہ ابھی ہم اپنی اپنی جگہ پر تھے کہ حضرت ابو بکر سنح سے آگئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی "

پہلی روایت میں یہ تھا کہ حضرت ابو بکر کے پیچھے آدمی بھیجا گیا اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود سے آگئے ۔ پہلی روایت میں یہ تھا کہ وہ نماز ختم ہونے کے بعد آئے اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوران نماز ہی میں آگئے ۔ پہلی روایت میں یہ تھا کہ نماز ختم ہونے کے بعد اعادۂ نماز کیا گیا ۔ اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی نماز توڑ دی گئی اور از سر نو نماز ہوئی ۔ اس تضاد کے علاوہ اس میں ذہنی پریشانی کا یہ پہلو ہے کہ نماز کے توڑنے کا کیا جواز تھا ۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امام فاسق وغیر عادل تھا تو ایک گروہ کے نزدیک امامت کے لئے سرے سے عدالت کی شرط ہی نہیں ہے اور جس گروہ کے نزدیک عدالت شرط ہے ان کے نزدیک بھی قول راجح کی بناء پر نماز کے توڑنے کا جواز نہیں ہے بلکہ دوران نماز میں اگر امام کے فاسق وغیر عادل ہونے کا انکشاف ہو جائے تو ماموم جماعت کی نیت سے عدول کر کے فرادی کی نیت کر لے اور نماز نہ توڑے ۔

ابن جریر طبری تحریر فرماتے ہیں :-

مروا ابا بکر یصلی بالناس قال فخرج یہادی بین رجلین قدماہ تخطان فی الارض فلما دنی من ابی بکر تاخر ابو بکر فاشار الیہ رسول اللہ ان قم فی مقامک فقعد رسول اللہ فصلی الی جنب ابی بکر جالسا قالت فکان ابو بکر یصلی بصلوۃ النبی وکان الناس

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابو بکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں پھر خود دو آدمیوں کا سہارا لے کر نکلے اس طرح کہ آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے جب ابو بکر کے قریب پہنچے تو ابو بکر پیچھے ہٹے آپ نے اشارہ کیا کہ اپنی جگہ پر رہو اور آپ نے ابو بکر کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھی ۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ابو بکر نبی اکرم کی اقتدار کر رہے تھے اور دوسرے نمازی ابو بکر کی اقتدار کر رہے تھے "

یصلون بصلوٰۃ ابی بکر۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صہ ۴۳۹)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر کو کہلوا بھیجا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو خود بھی ضعف و نقاہت کے باوجود دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے آئے۔ اور حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ پیغمبر اکرمؐ کا حضرت ابوبکر کو امامت پر مامور کرنا اور پھر خود بھی بلا توقف مسجد میں چلے آنا جب کہ خود سے چلنے پھرنے کی سکت نہ تھی ذہن میں یہ شبہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا کہ کیا پیغمبرؐ نے انہیں کہلوایا تھا یا خود چلے آئے تھے۔ اگر پیغمبرؐ نے کہلوا بھیجا تھا تو پھر مرض کی شدت کے باوجود مسجد میں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی اور اگر پیغمبرؐ نے نہیں کہلوایا تھا تو محراب مسجد تک کیسے پہنچ گئے۔ روایت یہ تو نہیں بتاتی کہ پیغمبرؐ نے خود ان سے براہ راست کہا تھا تو پھر ایسا تو نہیں ہے کہ جس طرح عبداللہ ابن زمعہ نے حضرت عمر سے کہہ دیا تھا اسی طرح کسی پیغامبر نے آنحضرتؐ کی طرف سے بھی کہہ دیا ہو اور وہ مصلّے پر آ کھڑے ہوئے ہوں اور جب پیغمبرؐ کو اطلاع ہوئی ہو تو لڑکھڑاتے کانپتے اس لئے مسجد میں پہنچے ہوں تا کہ خود امامت کے فرائض انجام دیں ورنہ اس کے علاوہ مسجد میں آنے کی اور وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے۔ اس روایت کا یہ جزو کہ ابوبکر رسولؐ اللہ کے مقتدی تھے اور دوسرے لوگ حضرت ابوبکر کی اقتدا کر رہے تھے ایک بے معنی سی بات ہے اس لئے کہ اگر حضرت ابوبکر امام تھے تو وہ ماموم نہیں ہو سکتے اور اگر رسولؐ اللہ امام تھے تو پھر حضرت ابوبکر مقتدی و ماموم ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ایک ہی نماز میں ایک شخص امام بھی ہو اور ماموم بھی صحیح نہیں ہے ورنہ تو ہر پچھلی صف والوں کو اگلی صف والوں کی اقتدا جائز ہونا چاہیئے۔

ابن جریر طبری ایک روایت یہ لکھتے ہیں:۔

قال رسول اللہ ابعثوا الی علی فادعوہ فقالت عائشہ لو بعثت الی ابی بکر وقالت حفصۃ لو بعثت الی عمر فاجتمعوا عندہ جمیعا فقال رسول اللہ انصرفوا فان تك لی حاجۃ ابعث الیکم فانصرفوا و قال رسول اللہ ان الصلوٰۃ

آنحضرتؐ نے فرمایا کسی کو بھیج کر علی کو بلا دو حضرت عائشہ نے کہا کہ کاش آپ ابوبکر کو بلاتے۔ حضرت حفصہ نے کہا کہ کاش آپ عمر کو بلاتے۔ اتنے میں وہ سب پیغمبرؐ کے پاس جمع ہو گئے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تم لوگ چلے جاؤ اگر مجھے ضرورت ہو گی۔ تو تمہیں بلوا بھیجوں گا۔ چنانچہ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر رسولؐ اللہ نے پوچھا کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے؟ بتایا گیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ ابوبکر کو کہو کہ وہ نماز پڑھا

قیل نعم قال فامروا ابا بکر لیصلی بالناس فقالت عائشة انه رجل رقیق فمر عمر فقال عمر ما کنت لاتقدم وابوبکر شاھد فتقدم ابوبکر ووجد رسول خفة فخرج لما سمع ابوبکر حرکته تاخر فجذب رسول اللہ ثوبہ فاقامہ وقعد رسول اللہ فقرأ من حیث انتھی ابوبکر۔

دیں حضرت عائشہ نے کہا کہ وہ نرم دل ہیں۔ آپ عمر کو حکم دیں فرمایا اچھا عمر کو کہہ دو۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں ابوبکر کے ہوتے ہوئے سبقت نہیں کر سکتا اس پر حضرت ابوبکر آگے بڑھے اتنے میں رسولؐ نے کچھ افاقہ محسوس کیا تو حجرے سے باہر آئے۔ ابوبکر نے آپ کی آہٹ محسوس کی تو پیچھے ہٹنا چاہا آپ نے ان کے دامن کو کھینچا اور جہاں وہ کھڑے تھے وہیں کھڑا رہنے دیا اور خود بیٹھ گئے اور جہاں سے ابوبکر نے قرأت تمام کی تھی وہاں سے قرأت شروع کر دی۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۳۹)

اس روایت میں چند باتیں ایسی بھی آگئی ہیں۔ جن سے اصل واقعہ کے سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے ایک بات تو بالکل واضح اور عیاں ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی کو بلوانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر کیوں اور کس لئے اس سلسلہ میں روایت خاموش ہے۔ لیکن روایت کا آخری حصہ کہ پیغمبرؐ نے دریافت کیا کہ کیا نماز کا وقت ہو چکا ہے جس کا جواب ہاں میں دیا گیا اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ حضرت علی کو اس وقت بلایا گیا تھا۔ جب نماز کا وقت ہو چکا تھا اور نماز کے وقت طلب کرنے کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں نماز کے لئے کہا جائے۔ یہ اتنی صاف بات تھی کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ بھی سمجھ گئیں کہ انہیں نماز کے لئے بلایا جا رہا ہے اسی بناء پر انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام لیا کہ کاش انہیں بلایا جاتا۔ اگر پیغمبرؐ نے حضرت علی کو ملاقات یا کسی ذاتی کام کے لئے بلوایا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام بیچ میں لایا جاتا نام تو اسی صورت میں لیا جا سکتا تھا جب بلوانے کا مقصد اور کام کی نوعیت ان پر واضح ہو چکی ہو اور وہ چاہتی ہوں کہ اس کام کی انجام وہی کا سہرا ان کے سر بندھے۔ یہ چیز بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے کہ ادھر ان کا نام لیا جاتا ہے ادھر وہ پہنچ بھی جاتے ہیں۔ اس بروقت آمد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ آنحضرتؐ کے مرض کی سنگینی دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ خود تو نماز کے لئے مسجد میں نہ پہنچ سکیں گے یہ خدمت کسی اور ہی کے متعلق کریں گے۔ لہٰذا نماز کے وقت آس پاس رہنا چاہئے۔ تاکہ حضرت عائشہ یا حضرت حفصہ کی طرف سے بلاوا آئے تو فوراً پہنچ جائیں اور آنحضرتؐ ہمیں اجازت دے ہی دیں گے

اور پھر اس بنیاد امامت پر قصر خلافت بآسانی تعمیر کیا جا سکے گا۔ مگر پیغمبر انہیں یہ کہہ کر رخصت دیتے ہیں کہ تم چلے جاؤ ضرورت ہوگی تو تمہیں بلوا لیا جائے گا۔ ان لفظوں سے صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر اس وقت تخلیہ چاہتے تھے تاکہ جس مقصد کے لئے علی کو بلوا بھیجا ہے اس میں دخل در اندازی نہ ہونے پائے۔ اگر پیغمبر اکرمؐ یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھائیں تو اس وقت مانع ہی کیا تھا۔ انہیں نماز کے لئے کہہ دیتے جب کہ نماز کا وقت بھی ہو چکا تھا اور وہ موجود بھی تھے۔ مگر ان سے اشارے کنائے میں بھی کچھ نہیں کہتے۔ اور ادھر وہ حجرے سے باہر نکلتے ہیں کہ یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھائیں۔ اس مقام پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے آنے پر انہیں کیوں نہ کہہ دیا گیا، دوسرے کے کہلانے میں کیا مصلحت سمجھی گئی۔ اور جس سے کہلوایا گیا وہ تھا کون تو اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں کہا گیا۔ نہ کہلوایا گیا بلکہ جدھر سے ان کا نام پیش ہوا تھا ادھر سے کہلوا دیا گیا۔

اس موقع پر حضرت عائشہ نے حضرت ابوبکر کی نرم دلی کا عذر کر کے حضرت عمر کا نام لیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اگر واقعاً وہ یہی چاہتی تھیں کہ حضرت ابوبکر کے بجائے حضرت عمر نماز پڑھائیں تو جب پیغمبرؐ نے حضرت علی کو بلوا بھیجا تھا تو حضرت ابوبکر کا نام نہ لیا ہوتا مگر اس وقت تو یہ کہا کہ کاش ابوبکر کو بلایا ہوتا اور اب ان کی نرم دلی کا عذر کر کے حضرت عمر کا نام پیش کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ ورطہ حیرت میں ڈال دینے والی بات تو یہ ہے کہ پیغمبر بھی ہاں میں ہاں ملا کر کہہ دیتے ہیں کہ اچھا عمر ہی سے کہہ دیا جائے کہ وہ نماز پڑھائیں حالانکہ عبداللہ ابن زمعہ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ جب آپ نے حضرت عمر کی صدائے تکبیر سنی تو برافروختہ ہو گئے اور فرمایا کہ ان کی امامت نہ اللہ کو پسند ہے اور نہ مسلمانوں کو اور اس روایت کی رو سے بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دی جا رہی ہے اب کس کو صحیح سمجھا جائے اور کس کو غلط۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جس کی امامت سے اللہ بھی بیزار ہو اور مسلمان بھی اس کو حضرت عائشہ کے کہنے سے اجازت دے دی جائے۔ اور جب حضرت عمر سے کہا جاتا ہے کہ آپ نماز پڑھائیں تو وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر کے ہوتے ہوئے کیسے نماز پڑھا دوں یہ ایک عملی اعتراف ہے اس امر کا کہ فاضل پر مفضول کو ترجیح نہیں دی جا سکتی تو پھر امامت نماز میں اسے تسلیم کر لینے کے بعد خلافت میں اسے نظر انداز کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے اس موقع پر یہ بات کسی مصلحت پر مبنی ہوگی ورنہ پہلی روایت کی بنا پر جب عبداللہ ابن زمعہ نے انہیں نماز پڑھانے کے لئے کہا تو انہوں نے یہ نہ کہا کہ حضرت ابوبکر یہیں کہیں ہوں گے انہیں دیکھ لو۔ ایک آدھ لمحہ انتظار کر لو بلکہ فوراً تیار ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پڑھی پڑھائی نماز نہ پڑھنے کے برابر ہو گئی۔ یا بیچ میں ادھوری چھوڑنا پڑی اور اس روایت کی رو سے انہوں نے حضرت ابوبکر پر سبقت مناسب نہیں سمجھی اور

انہیں آگے کھڑا کر دیا مگر وہ نماز کے لئے کھڑے ہوئے ہی تھے کہ پیغمبرؐ بھی پہنچ گئے۔ ابھی ابھی تو انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا تھا پھر کیوں چلے آئے۔ قرین قیاس یہ بات نظر آتی ہے کہ حضرت علیؑ کی طلبی پر کچھ لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ پیغمبرؐ کہیں انہیں نماز کے لئے نہ کہہ دیں انہوں نے پیغمبرؐ کی طرف سے حضرت ابوبکر کو کہہ دیا کہ آپ نماز پڑھائیں اور جب وہ دوسرے کے کہنے سے کھڑے ہوگئے تو پیغمبرؐ انہیں روکنے کے لئے جس طرح بن پڑا مسجد میں چلے آئے اور خود نماز پڑھائی ورنہ عذر کر دینے کے بعد پھر مسجد میں چلے آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس روایت میں بڑی چابکدستی سے یہ جملہ بھی درج کر دیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے وہاں سے قرأت شروع کی جہاں سے حضرت ابوبکر نے ختم کی تھی تاکہ ان کی نماز کا پیوند رسولؐ کی نماز سے جڑا رہے اور یہ نماز بھی حضرت عمر کی نماز کی طرح کالعدم نہ سمجھی جائے مگر اتنا نہ سوچا کہ قرأت کو بیچ سے شروع کرنے سے قرأت ناتمام رہے گی اور قرأت کے ناقص و ناتمام ہونے کی صورت میں نماز ہی صحیح نہیں ہوتی۔

صاحب صحیح محمد ابن اسمٰعیل بخاری تحریر کرتے ہیں :۔

عن عائشة قالت لما مرض النبی مرضه الذی مات فیه اتاه بلال یوذنه بالصلوٰة فقال مروا ابا بکر فلیصل قلت ان ابابکر رجل اسیف ان یقم مقامك یبکی فلا یقدر علی القراءة قال مروا ابابکر فلیصل فقلت مثله فقال فی الثالثة او الرابعة انکن صواحب یوسف فلیصل فصلی وخرج النبی یهادی بین رجلین کانی انظر الیه یخط برجلیه الارض فلما راٰه ابوبکر ذهب یتاخر فاشار الیه ان صل فتاخر ابوبکر وقعد النبی الیٰ جنبه وابوبکر یسمع الناس

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب نبی اکرم مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو بلال نے حاضر ہو کر نماز کے لئے عرض کیا فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں میں نے کہا کہ ابوبکر رقیق القلب ہیں اگر آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے اور قرأت نہ کر سکیں گے فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں میں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہہ چکی تھی تیسری یا چوتھی مرتبہ کے تکرار پر فرمایا کہ تم صواحب یوسف (یوسف والیاں) ہو۔ ابوبکر نماز پڑھائیں چنانچہ وہ نماز پڑھانے لگے اتنے میں پیغمبر دو آدمیوں کا سہارا لے کر نکلے وہ منظر مجھے یاد ہے کہ آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے جب ابوبکر نے آنحضرت کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے۔ آنحضرتؐ نے انہیں اشارہ کیا کہ پڑھتے رہو۔ حضرت ابوبکر پیچھے ہٹ گئے اور پیغمبرؐ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے

التکبیر۔ اور ابو بکر لوگوں کو تکبیر کی آواز سنا رہے تھے۔"

(صحیح بخاری۔ ج ۱۔ ص ۹۵)

اس روایت میں بھی حضرت ابوبکر کی نرم دلی کا تذکرہ اس اضافہ کے ساتھ ہے کہ جب وہ محراب مسجد میں کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے۔ اس طرح حضرت عائشہ پیغمبرؐ کے یہ ذہن نشین کرنا چاہتی تھیں کہ آپ کی بیماری کا جتنا احساس حضرت ابوبکر کو ہے وہ کسی کو نہیں ہے وہ آپ کے مصلے پر کھڑے ہو کر اس تصور سے کانپ اٹھیں گے کہ کیا رسول پھر اس مصلے پر کبھی رونق افروز نہ ہوں گے اور روتے روتے ان کی آواز گلوگیر ہو جائے گی۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی طرف سے معذرت چاہ رہی ہیں مگر درحقیقت یہ تاثر دینا تھا کہ جب وہ سب سے زیادہ ہمدرد شریک درد اور غمگسار ہیں تو پھر ان سے بڑھ کر نماز پڑھانے کا حق کس کو ہے اس پر پیغمبرؐ نے انہیں صاحبۂ یوسف کہا۔ صاحب سیرت حلبیہ نے تحریر کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ کو صاحبۂ یوسف (زلیخا) اس بنا پر کہا کہ جس طرح زلیخا نے زنان مصر کو اپنے ہاں ضیافت کے لئے جمع کیا حالانکہ مقصد ضیافت نہ تھا بلکہ وہ یہ چاہتی تھیں کہ زنان مصر یوسف کو دیکھ کر انہیں محبت و دلدادگی میں معذور سمجھیں اسی طرح حضرت عائشہ دل سے تو یہ چاہتی تھیں کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھائیں اور ظاہر یہ کرتی ہیں کہ وہ اُن کی امامت کی ذرا خواہشمند نہیں ہیں تو جس طرح وہاں پر ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ اسی طرح یہاں پر ظاہر میں استغنا و بے نیازی ہے اور باطن میں خواہش و طلب گاری۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر کی امامت پر اصرار کیا تھا مگر حیرت ہے کہ ایک طرف تو اصرار کیا جاتا ہے اور دوسری طرف حضرت ابوبکر کے کھڑے ہوتے ہی گرتے پڑتے دو آدمیوں کے سہارے پر مسجد میں چلے آتے ہیں اور بیٹھ کر خود نماز پڑھاتے ہیں۔ پیغمبرؐ کے اس اقدام سے اصرار تو درکنار تقرر پر بھی کوئی انصاف پسند اعتماد نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تقرر پیغمبر کی طرف سے ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ نماز شروع ہوتے ہی افتاں و خیزاں محراب مسجد میں پہنچ جاتے اور فرائض امامت خود ادا کرتے البتہ حضرت ابوبکر مکبر کا فریضہ انجام دیتے رہے جیسا کہ اس روایت کے آخر میں ہے یعنی جب پیغمبر رکوع یا سجدہ میں جاتے تو وہ اُونچی آواز میں تکبیر کہتے جاتے تھے تاکہ نمازیوں کو پتہ چلتا رہے کہ اب پیغمبر رکوع میں گئے ہیں اور اب سجدہ سے سر اٹھایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مکبر کی حیثیت امام کی نہیں ہوتی کہ ان کے سر امامت کا سہرا باندھنے کی کوشش کی جائے۔

ان روایات اور ان کے باہمی تضاد کو دیکھ کر قطعاً اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرتؐ نے ابوبکر کو نماز پڑھانے پر مامور کیا تھا اور نہ ان کے مامور کئے جانے کا سوال پیدا ہوتا تھا اس لئے کہ انہی دنوں

میں آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر حضرت عمر اور دیگر صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں مدینہ سے باہر نکل کر لشکر کشی کا حکم دیا تھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک تاکید پر تاکید کرتے رہے تھے۔ پھر یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف مدینہ چھوڑنے کا حکم دیں اور دوسری طرف انہیں مدینہ میں نماز پڑھانے پر مقرر فرمائیں۔ یہ امامت کا شاخسانہ اس لئے کھڑا کیا گیا ہے تاکہ حضرت ابوبکر کی خلافت کی صحت پر دلیل قائم کی جاسکے اور ابن حجر مکی نے تو اس امامت کو ان کی خلافت پر نص کا درجہ دے دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

لهذا ادعى جميع العلماء ان — اس امامت کی بناء پر تمام علماء اس کے قائل ہیں۔

خلافة منصوص عليها (تطہیر الجنان ص) — کہ حضرت ابوبکر کی خلافت نصی تھی ۔"

اگر واقعاً پیغمبر اس سے حضرت ابوبکر کی خلافت پر نص کرنا چاہتے تھے تو پھر اس امر کا داعی کیا تھا، کہ انتہائی ضعف اور نقاہت کے عالم میں دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد میں آئیں اور حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ کر یا انہیں پیچھے ہٹا کر خود نماز پڑھائیں کیا یہ خلافت کی اہلیت پر نص کی جا رہی ہے یا اس کے خلاف ثبوت بہم پہنچایا جا رہا تھا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امامت نماز دلیلِ خلافت ہے تو جب پیغمبر نے حضرت عمر کی آواز تکبیر سن کر انہیں نماز پڑھانے سے روک دیا تھا تو پھر حضرت ابوبکر نے کس بنا پر انہیں اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کیا۔ امامت نماز کو نص قرار دینے سے پہلے ضروری ہے کہ امامت نماز اور خلافت میں تلازم ثابت کیا جائے۔ اگر تلازم نہیں ہے تو پھر یہ خلافت کی دلیل کیسے اور اگر تلازم ہے تو پھر ان لوگوں کو خلافت سے محروم رکھنے کا کیا جواز ہے جنہیں پیغمبر وقتاً فوقتاً نماز پڑھانے کا حکم دیتے رہے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ جب کسی غزوہ میں تشریف لے جاتے تو نماز کی امامت کسی نہ کسی سے متعلق کر جاتے تھے اور عموماً اس کام کے لئے ابن ام مکتوم کو جو نابینا تھے چھوڑ جاتے تھے۔ ابن قتیبہ تحریر کرتے ہیں :۔

وكان رسول الله يستخلفه على المدينة يصلى بالناس فى عامة غزواته ۔ (المعارف۔ ص) — رسولؐ اللہ عام غزوات کے موقع پر ابن ام مکتوم کو مدینہ میں چھوڑ جاتے تھے تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں ۔"

کیا اس امامت سے جو حضرت ابوبکر کی امامت سے بلحاظ مدت طویل تر ہوتی تھی کسی کو یہ گمان بھی ہوا تھا کہ آنحضرتؐ ابن ام مکتوم کو اپنا خلیفہ و جانشین منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی موجودگی میں بھی مختلف مواقع پر مختلف اشخاص کو امامت کی خدمت سپرد کر دیتے تھے جن میں ابولبابہ، سباع ابن عرفطہ، عتاب ابن اسید، سعد ابن عبادہ، ابوذر غفاری، زید ابن حارثہ، ابوسلمہ مخزومی اور عبداللہ ابن رواحہ شامل تھے۔ کیا ان لوگوں میں سے جو بحکم رسول نماز پڑھاتے رہے تھے۔ کسی ایک نے بھی اس نماز سے

استحقاقِ خلافت کو ثابت کرنا چاہا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسی نماز کو دلیلِ خلافت قرار دینے کے کیا معنی جب کہ اسے دلیل خلافت سمجھنے والوں کے نزدیک یہ دلیل عدالت بھی نہیں بن سکتی کیونکہ ان کے نزدیک ہر فاسق و غیر عادل کے پیچھے نماز جائز ہے۔ چنانچہ ابو ہریرہ دوسی پیغمبرؐ سے روایت کرتے ہیں:۔

الصلوٰة واجبة عليكم خلف كل مسلم برا كان او فاجرا وان عمل الكبائر (مشکوٰة ص۱۰۰)	نماز وہ فریضہ ہے جو ہر اچھے اور بُرے مسلمان کے پیچھے پڑھی جاسکتی ہے اگرچہ وہ گناہائے کبیرہ کا مرتکب کیوں نہ ہوتا ہو۔

اگر یہ امامتِ نماز دلیلِ خلافت بن سکتی ہے تو اسامہ کی امارت بھی جن کی ماتحتی میں حضرت ابوبکر حضرت عمر اور دیگر مہاجرین و انصار تھے دلیل قرار دی جا سکتی ہے جب کہ یہ امارت اس امامت سے اہم بھی تھی اگر اہم نہ ہوتی تو انصار و مہاجرین اس پر نکتہ چینی نہ کرتے اور نہ اُن کے پرچم کے نیچے جانا اپنے لئے ذلت و سبکی کا باعث سمجھتے۔ غرض اس وقتی امامت کو اگر استحقاقِ خلافت کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے تو اسامہ کی قیادت و امارت کو بدرجۂ اولیٰ پیش کیا جا سکتا ہے۔

المیۂ قرطاس

اسلام پیغمبر اکرمؐ کا سرمایۂ حیات تھا جس کی تبلیغ و ترویج میں آپ نے سعی و عمل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا اور خون پسینہ ایک کر کے اسے تکمیل کی منزل تک پہنچایا تھا۔ ہر شخص کی فطری و طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی محنت و ریاضت کا ثمرہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ اور تخریب کاروں کی تاخت و تاراج سے بچا رہے وہ زندگی میں اس کی نگہداشت کرتا ہے اور آخر وقت میں بھی اس کی طرف سے مطمئن ہو کر دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے زبانی ہدایت کی صورت میں یا تحریری وصیت کی شکل میں اس کا مستقبل محفوظ کر جانا اپنا اہم وظیفہ سمجھتا ہے تو اس صورت میں کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ اسلام کے تحفظ کی فکر سے اور اس کی حفاظت و بقاء کی تدبیر سے غافل رہے ہوں گے جب کہ آپ کی فرض شناسی و منصبی ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ہر اس طریقِ کار کو بروئے کار لائیں جس سے اسلام کا مستقبل محفوظ اور اس کے خلاف ہر تخریبی کارروائی کا سدِ باب ہو جائے اور اس صورت میں تو اس کی ضرورت اور زیادہ ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے جب کہ ضلالت و گمراہی کے اندھیرے پھیلتے ہوئے نظر آرہے ہوں۔ اور اس ظلمت کدہ عالم میں اور کوئی مشعلِ نبوت روشن ہونے والی نہ ہو۔

اس اہم ضرورت کے پیش نظر آنحضرتؐ نے سفر آخرت سے دو چار روز پہلے کاغذ و قلم طلب کیا تاکہ ایک نوشتہ لکھ کر چھوڑ جائیں جو رہتی دنیا تک منشورِ ہدایت کا کام دے۔ اور امتِ مسلمہ ضلالت و گمراہی اور مختلف گروہوں میں بٹ جانے سے محفوظ ہو جائے۔ مگر کچھ لوگ اس تحریر میں آڑے آئے اور

قال عمر ان النبی غلبہ الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا۔

(صحیح بخاری۔ ج ۱۔ ص ۲۵)

"حضرت عمر نے کہا کہ پیغمبرؐ پر درد کا غلبہ ہے۔ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔"

یہ بخاری کی روایت ہے اور بخاری ہی میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بھی درج ہے:۔

قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا اھجر رسول اللہ قال دعونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ۔

(صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۱۲)

"آنحضرتؐ نے فرمایا تم ایک کاغذ لاؤ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے اس پر لوگ آپس میں جھگڑنے لگے حالانکہ نبی کے پاس جھگڑا مناسب نہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں جس حال میں ہوں وہ بہتر ہے اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔"

جب جھگڑے نے طول کھینچا اور شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں تو پسِ پردہ سے ازواجِ پیغمبرؐ نے کہا:۔

ائتوا رسول اللہ بحاجتہ قال عمر فقلت اسکتن فانکن صواحبہ اذا مرض عصرتن اعینکن واذا صح اخذتن بعنقہ فقال رسول اللہ ھن خیر منکم۔

(طبقات ابن سعد۔ ج ۲۔ ص ۲۴۴)

"پیغمبرؐ جو مانگتے ہیں دے دو۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تم چپ رہو تم وہی یوسف والیاں ہو جب پیغمبرؐ بیمار پڑتے ہیں تو آنسو بہاتی ہو۔ اور جب تندرست ہوتے ہیں تو ان کی گردن پر سوار ہو جاتی ہو۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ تم سے تو بہتر ہی ہیں۔"

اندرونِ خانہ سے یہ آواز آتی رہی مگر کسی نے اس پر کان نہ دھرا اور قلم دوات نہ دینے کے ہی ارادے سے مانع رہے۔ پیغمبرِ اکرمؐ کو دنیا والوں کی بے وفائی کا رنج حکم کی خلاف ورزی کا ملال ہذیان کی تہمت کا صدمہ اور اس پر تو تکار اور چیخ و پکار کی دردسری آپ نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا قوموا عنی "میرے پاس سے اٹھ کر چلے

جاؤ" تاریخ اسلام کا یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ پیغمبرؐ اکرم اپنی اُمت کی بہبود اور گمراہی سے تحفظ کے لئے وصیت قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی آواز شور و غل میں دب کر رہ جاتی ہے اور آخر حسرت و اندوہ کے عالم میں اس دنیا سے کنارا کر جاتے ہیں۔ ابن عباس اس واقعہ کو یاد کر کے اتنا رویا کرتے تھے کہ سامنے رکھے ہوئے سنگریزے تر ہو جاتے تھے اور گلوگیر آواز میں کہتے :-

الرزیة کل الرزیة ماحال بین رسول اللہ و بین ان یکتب لهم ذلك الكتاب من اختلافهم و لغطهم (طبقات ابن سعد۔ ج ۲۔ ص ۲۴۴)

یہ مصیبت کتنی بڑی مصیبت ہے کہ صحابہ کے اختلاف اور اُن کے شور و ہنگامہ کی وجہ سے رسولِ خدا اور تحریر وصیت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی "

اس واقعہ میں تاویلات کا سہارا ڈھونڈا گیا۔ الفاظ کے معنی و مفہوم کو بدلنے کی کوشش کی گئی۔ اور پورے مجمع کو اس جرم و جسارت کا مرتکب قرار دے کر اصل مرتکب پر پردہ ڈالا گیا مگر یہ سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور حقیقت چھپائے سے چھپ نہ سکی۔ بخاری کی دونوں مندرجہ روایتوں کی یہی صورت ہے۔ چنانچہ پہلی روایت میں جہاں پیغمبرؐ پر درد کے غلبہ کا ذکر ہے کہنے والے کا نام حضرت عمر درج کیا گیا ہے۔ اور دوسری روایت میں جہاں پیغمبرؐ کی طرف ہذیانی گفتگو کی نسبت دی گئی ہے وہاں اس کے قائل کو قالوا کے صیغہ جمع میں چھپا دیا گیا۔ یعنی جس روایت کے الفاظ ہلکے اور سبک ہیں وہاں کہنے والے کا نام ظاہر کر دیا جاتا ہے اور جس میں الفاظ درشت اور نازیبا ہیں۔ وہاں کہنے والے کا نام نہیں لیا جاتا مگر اس سے پردہ پوشی کا کام نکلتا نظر نہیں آتا اس لئے کہ جب سب ہی کہہ رہے تھے تو جس کا کردار ان سب میں نمایاں رہا ہو وُہ ان سے علیحدہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے اگر ایسا ہوتا تو تاریخ میں بڑی جلی سرخیوں سے اس کا ذکر آتا اور مدح و ستائش کے پھول برسائے جاتے۔ البتہ بعض روایات میں کل کے بجائے بعض کی طرف نسبت ہے۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں :-

قال بعض من كان عنده ان نبی اللہ ليهجر۔ (طبقات۔ ج ۲۔ ص ۲۴۲)

کچھ لوگوں نے جو وہاں تھے یہ کہا کہ رسول اللہ شدت مرض میں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں "

اس روایت میں کہنے والوں کا دائرہ پہلے سے محدود ہو گیا ہے مگر پھر بھی لفظ بعض سے قائل کی صحیح نشان دہی نہیں ہوتی البتہ شیخ شہاب الدین خفاجی نے بعض دوسرے علماء کی طرح اس بعض پر سے پردہ اٹھا کر صاف صاف لکھ دیا ہے :-

فقال عمر ان النبی صلی اللہ

حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہکی

علیه وسلم لیهجر۔ (نسیم الریاض ج ۴ ص ۳۸)　　بہکی باتیں کر رہے ہیں۔"

پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہذیانی کیفیت کی نسبت خواہ کسی کی طرف سے ہو۔ انتہائی سوء ادب کا مظاہرہ ہے۔ مقام نبوت کا ادنیٰ عرفان رکھنے والا بھی ان لفظوں کو سن کر ایک مرتبہ تو لرز اٹھتا ہے کہ زبان وحی ترجمان ہذیان آشنا کیسے ہو گئی۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو آپ کی ہر جنبش لب کو وحی الٰہی کے زیر اثر اور حکم کو حکم ربانی کا ترجمان مانا جاتا ہے اور ان کی زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو محفوظ کر لینا سعادت کا نشان سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف ہذیان کو تجویز کر کے ان کے ارشادات کو بے اعتماد بنانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ انصاف سے کہئے کہ قلم و کاغذ کے طلب کرنے اور وصیت لکھنے میں بد حواسی کی بات ہی کون سی تھی بلکہ آپ کا ارشاد کہ "میں ایک نوشتہ لکھ دوں تاکہ تم کبھی گمراہ نہ ہو" آپ کے کمال صحت عقل وصحت حواس کا واضح ترین ثبوت ہے۔ پھر ہذیان کی نسبت کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ اور اگر بفرضِ محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرتؐ پر ہذیانی کیفیت طاری تھی اور اسی کیفیت کے زیر اثر قلم و کاغذ طلب کر رہے تھے تو اس میں مضائقہ ہی کیا تھا کہ آپ کی دلجوئی کے لئے قلم و کاغذ پیش کر دیتے وہ کوئی ایسی چیز تو مانگ نہیں رہے تھے۔ جس میں خود ان کے لئے یا حاضرین میں سے کسی کے لئے نقصان یا گزند پہنچنے کا احتمال ہوتا اس طرح وہ لوگ اتباع رسول و احترام رسول کی ایک درخشاں مثال چھوڑ جاتے کہ انہوں نے پیغمبرؐ کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی گوارا نہ کی کہ جو ہذیانی حالت میں دیا گیا تھا۔

اس مقام پر حکم رسول سے سرتابی کا جواز پیدا کرنے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی تھی۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اب کسی تحریر کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بیشک دین کی تکمیل ہو چکی تھی مگر تکمیل کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اب امت گمراہی سے محفوظ بھی ہو چکی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ مسلمانوں کے عقائد میں تصادم ہوتا نہ نظریات میں تضاد پایا جاتا اور نہ مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے نظر آتے یہ باہمی تفرقہ اور گروہ بندی گمراہی ہی کا نتیجہ ہے جسے دین کی تکمیل روک نہ سکی۔ انہی فکری و اعتقادی گمراہیوں کا سدباب کرنے کے لئے پیغمبرؐ نوشتہ تحریر کرنا چاہتے تھے اور یہ کہنا کہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی تو ہمیں اس کی ضرورت و عدم ضرورت کا فیصلہ کرنے کے بجائے رسول اللہ پر اس کا فیصلہ چھوڑ دینا چاہیئے اگر وہ اس کی ضرورت و اہمیت نہ سمجھتے تو قلم و دوات کیوں طلب کرتے اور جب انہوں نے ضروری سمجھا تو ہمیں غیر ضروری کہنے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے اور یہ بات تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ وحی منقطع ہو چکی تھی اس لئے یہ حکم وحی نہ تھا۔ اس لئے کہ وحی کا سلسلہ آنحضرتؐ کے آخری لمحہ حیات تک جاری رہا۔ چنانچہ انس ابن مالک کہتے ہیں:۔

ان اللہ تبارک و تعالیٰ تابع الوحی　　اللہ تبارک و تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ پیغمبرؐ کے قبل

علی رسول اللہ قبل وفاتہ حتی	وفات سے لے کر ان کے مرتے دم تک برابر جاری
توفی واکثر ما کان الوحی فی یوم	رکھا اور سب سے زیادہ وحی اس دن نازل ہوئی۔
توفی۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۲۔ صہ ۹۳)	جس دن آپ نے رحلت فرمائی۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر جو کچھ فرما رہے تھے اور جو کچھ تحریر کرنا چاہتے تھے۔ وہ وحی کی ہدایت اور وحی کی تعلیم کے ماتحت تھا مگر سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کے آگے نہ صرف دیوار کھڑی کر دی گئی۔ بلکہ اسے ہذیان کہہ دیا گیا تاکہ رسول اگر کچھ لکھ بھی جائیں تو اسے یہ کہہ کر مسترد کیا جا سکے کہ یہ ہذیانی حالت کی لکھی ہوئی تحریر ہے جو قابلِ عمل نہیں ہے اور اس طرح اسے بے اثر بنا کر رکھ دیا جاتا اور لکھنا نہ لکھنا برابر ہو جاتا۔

اس پر بھی ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر پیغمبر کیا لکھنا چاہتے تھے اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کتب تاریخ و حدیث شاہد ہیں کہ پیغمبر بستر مرگ پر اور اس سے پہلے بھی بار بار فرماتے تھے:۔

انی تارک فیکم ما ان تمسکتم	"میں تم میں (دو) چیزیں چھوڑے جاتا ہوں اگر تم اُن
بہ لن تضلوا بعدی احدھما	سے وابستہ رہے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے
اعظم من الآخر کتاب اللہ	ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ ایک اللہ
حبل ممدود من السماء الی	کی کتاب ہے جو ایک (مضبوط) رسی ہے۔ جس کا
الارض وعترتی اھل بیتی	ایک سرا آسمان پر ہے اور ایک زمین پر اور دوسری
ولن یفترقا حتی یردا علی	میری عترت ہے جو میرے اہلبیت ہیں یہ دونوں ایک
الحوض فانظروا کیف	دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس
تخلفونی فیھما	حوض کوثر پر وارد ہوں گے۔ تم خود ہی سوچو کہ
(مشکوٰۃ۔ صہ ۵۶۹)	تمہیں ان دونوں کے ساتھ کیا رویہ رکھنا چاہیئے۔"

اور جب وفات کا وقت قریب آیا تو علی کو ہاتھ سے بلند کر کے فرمایا:۔

ھذا علی مع القرآن والقرآن	"یہ علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ
مع علی لا یفترقان حتی یردا	ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔
علی الحوض فاسألھما ما	یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔ میں
خلفتم فیھما۔	ان دونوں سے پوچھوں گا کہ تم ان کے حق میں کیسے
(صواعق محرقہ۔ صہ ۱۲۶)	ثابت ہوئے۔"

اس حدیث سے پہلی حدیث میں پیغمبر اکرمؐ نے قرآن و اہلبیت کے اتباع کو ضلالت و گمراہی سے تحفظ کی سپر قرار دیا ہے جیسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ لن تضلوا ابعدی (میرے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے) اور اس موقع پر بھی اپنی تحریر کو گمراہی سے بچاؤ کا ذریعہ بتاتے ہوئے بعینہٖ انہی الفاظ کا اعادہ کیا ہے۔ لن تضلوا بعدہ (اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے) اس سے ہر ذی شعور و بافہم انسان یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے گمراہی سے تحفظ کے لئے جس چیز کا قولاً اعلان کیا تھا اسی کو عملاً تحریر میں لانا چاہتے تھے تاکہ ہر لحاظ سے حجت تمام ہو جائے اور آپ کے بعد رہنمائی کے لئے انہی پر انحصار کیا جائے یہ ایک طرح سے آپ کی نیابت و جانشینی کی دستاویز تھی جس کا پہلے سے اظہار کرتے چلے آرہے تھے اور غدیر خم میں اس کا اعلان بھی کر چکے تھے۔ اس اعلان سے اگرچہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا تھا مگر جیش اسامہ میں بعض لوگوں کے تخلف و اعراض اور دوسرے قرائن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ اس کی عملی تکمیل میں مانع ہوں گے اس لئے پیغمبر نے زبانی اعلان کو تقویت دینے کیلئے اسے تحریری صورت میں پیش کرنا ضروری سمجھا تاکہ اس تحریری دستاویز کے ہوتے ہوئے اس کے خلاف کوئی اقدام عمل میں نہ آئے۔ حضرت عمر اس سے بے خبر نہ تھے کہ پیغمبرؐ قرآن کے ساتھ اہلبیت کے اتباع کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور لفظ لن تضلوا سے تو واضح طور پر سمجھ گئے تھے کہ آنحضرتؐ علی کے بارے میں جنہیں قرآن کا قرین و مصاحب قرار دیا ہے وصیت تیار کرنا چاہتے ہیں اور یہ چیز ان کے مستقبل کے عزائم میں سد راہ ہو سکتی تھی اس لئے عندنا کتاب اللہ حسبنا کہہ کر اس کی ضرورت ہی سے انکار کر دیا۔ یہ جملہ اگرچہ ایک ہنگامی ضرورت کی بنا پر کہا گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ برگ و بار لایا اور ایک فرقہ نے اپنے عقائد کی بنیاد اس پر رکھ دی اور قرآن کے علاوہ حدیث تک کی ضرورت سے انکار کر دیا حالانکہ جب عمر حدیث پر عمل پیرا ہو کر عملاً قرآن کے ناکافی ہونے کا اعتراف کرتے رہے تھے۔ چنانچہ جب خلافت کے سلسلہ میں مہاجرین و انصار میں نزاع کی صورت رونما ہوئی تو قرآن کو رفع نزاع کا ذریعہ قرار دینے کے بجائے الائمہ من القریش (امام قریش میں سے ہوں گے) سے اپنے حق کی فوقیت کا اثبات کیا اور وراثت رسول کے سلسلہ میں قرآن سے دلیل ڈھونڈنے کے بجائے انا معاشر الانبیاء لا نورث (ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے) پر اعتماد کیا اور جن جن مواقع پر لولا علی لهلك عمر (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا) کہا گیا وہاں یہ قرآن سے حل تلاش کرنے کے بجائے علی سے رہنمائی طلب کرتے رہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ قرآن کو کافی کہنے کے باوجود عمل کے اعتبار سے صرف اسی پر انحصار نہ کرتے تھے بلکہ حدیث کو بھی مورد اعتماد و عمل سمجھتے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرآن اپنی جامعیت کے باوجود اپنے حقیقی ترجمان کے بغیر کافی نہیں ہو سکتا ورنہ تو رسول کی ضرورت سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔

پیغمبرؐ کا سفر آخرت

آنحضرتؐ نے وفات سے ایک دن پہلے حضرت علی کو قریب بلا کر فرمایا کہ اے علی اب میرے چل چلاؤ کا وقت قریب ہے میرے انتقال کے بعد تم ہی مجھے غسل دینا کفن پہنانا اور لحد میں اُتارنا۔ میں نے جن لوگوں سے جو جو وعدے کر رکھے ہیں انہیں پورا کرنا لشکر اسامہ کی تیاری کے سلسلہ میں فلاں یہودی کا مجھ پر قرضہ ہے اسے ادا کر دینا۔ پھر دستِ مبارک سے انگشتری اتار کر آپ کو دی اور فرمایا کہ اسے پہن لو اور اپنی تلوار خود زرہ پٹکا اور دوسرے ہتھیار آپ کو مرحمت فرمائے۔ آج کا دن گذر گیا اور دوسرے دن روز دوشنبہ ۲۸ صفر ۱۱ھ کو آنحضرتؐ کی حالت غیر ہو گئی۔ کاشانۂ نبوت پر موت کے بادل منڈلاتے لگے۔ نزع کی سی حالت طاری ہو گئی اور وہ لمحہ قریب تھا کہ نفس کی آمد و شد بند ہو جائے اور روح طیب اپنے مرکز کی طرف پرواز کر جائے کہ غشی سے آنکھیں کھولیں علی کسی کام سے ادھر ادھر ہو گئے تھے نظر نہ آئے تو فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں:۔

قال رسول اللہ لما حضرۃ الوفاۃ ادعوا لی حبیبی فدعوا لہ ابوبکر فنظر الیہ ثم وضع راسہ ثم قال ادعوا لی حبیبی فدعوا لہ عمر فلما نظر الیہ وضع راسہ ثم قال ادعوا لی حبیبی فدعوا لہ علیا فلما راٰہ ادخلہ معہ فی الثواب الذی کان علیہ فلم یزل یحتضنہ حتی قبض ویدہ علیہ (ریاض النضرہ۔ ج ۲۔ ص ۲۳۶)

جب پیغمبرؐ کا وقت آخر قریب آیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ۔ کوئی حضرت ابوبکر کو بلا لایا۔ آپ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور سر نیچے رکھ دیا۔ اور فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ اب کوئی حضرت عمر کو بُلا لایا، آپ نے انہیں دیکھا تو سر نیچے رکھ دیا اور فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ اب علی کو بلا لایا۔ آپ نے انہیں دیکھا تو اپنی چادر میں جسے اوڑھے ہوئے تھے لے لیا اور پہلو میں لئے رہے یہاں تک کہ آپ انتقال فرما گئے اور آپ کا ہاتھ حضرت علی کے اوپر رکھا تھا۔

یہ حادثہ دنیائے اسلام کا عظیم ترین حادثہ تھا۔ یوں تو ہر شخص اس سانحہ سے متاثر تھا مگر بنی ہاشم و افرادِ خاندان پر غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دختر رسولؐ کا یہ حال تھا کہ گویا ان سے زندگی چھین لی گئی ہے اور ان کے بچے نانا کی شفقتیں یاد کر کے تڑپ رہے تھے اور علی کی دنیا ہی بدل چکی تھی رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ اور

صبر و ضبط کے باوجود آنکھوں سے سیل اشک جاری ہو گیا آپ نے روتے ہوئے اپنا ہاتھ آنحضرتؐ کے چہرۂ اقدس سے مس کیا اور اپنے منہ پر پھیرا میت کی آنکھوں کو بند کیا اور نعش اطہر پر چادر پھیلا دی۔ اور حسب وصیت رسول غسل و کفن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

توفی رسول اللہ و راسہ فی حجر علی وغسلہ علی والفضل محتضنہ واسامۃ یناول الفضل الماء۔ (طبقات۔ ج۲۔ ص۲۶۳)	جب رسول اللہ نے انتقال فرمایا تو آپ کا سر اقدس حضرت علی کی گود میں تھا اور علی ہی نے آپ کو غسل دیا۔ فضل ابن عباس آنحضرتؐ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اور اسامہ انہیں پانی دیتے جا رہے تھے۔"

جب امیرالمومنین غسل دینے سے فارغ ہو گئے تو کفن پہنایا اور تنہا نماز جنازہ پڑھی۔ مسجد میں جو لوگ جمع تھے وہ آپس میں مشورے کر رہے تھے کہ کسے نماز جنازہ کی امامت کے لئے کہیں اور کون سی جگہ دفن کے لئے تجویز کریں۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ صحن مسجد میں دفن کئے جائیں اور کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ جنۃ البقیع میں دفن ہوں۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ نے حجرے سے باہر نکل کر فرمایا کہ پیغمبرؐ زندگی میں بھی ہمارے امام و پیشوا تھے اور رحلت کے بعد بھی ہمارے امام و پیشوا ہیں لہذا ایک ایک جماعت اندر جائے اور فرادی نماز پڑھ کر باہر نکل آئے۔ رہا آنحضرتؐ کے دفن کا سوال تو وہ اسی مقام پر دفن کئے جائیں۔ جہاں انہوں نے رحلت فرمائی ہے چنانچہ بنو ہاشم پھر مہاجرین اور پھر انصار نے نماز ادا کی۔ البتہ ایک گروہ جو تشکیل حکومت کی فکر میں تھا تجہیز و تکفین کی شرکت اور نماز جنازہ کی سعادت سے محروم رہا۔ نماز جنازہ کے بعد اسی حجرے میں جہاں آنحضرتؐ نے انتقال فرمایا تھا۔ زید ابن سہل سے قبر کھدوائی گئی۔ حجرے کے اندر دفن کا انتظام کرنے والے حضرت علی، عباس ابن عبدالمطلب، فضل ابن عباس اور اسامہ بن زید تھے۔ جب دفن کا وقت آیا تو انصار نے باہر سے پکار کر کہا کہ اے علی ہمارا ایک آدمی بھی اس میں شریک کر لیجئے تاکہ ہم اس شرف سے محروم نہ رہ جائیں۔ حضرت نے اوس ابن خولی کو شریک کر لیا اور انہیں قبر میں اترنے کی اجازت دے دی۔ حضرت علی نے نعش اقدس کو دونوں ہاتھوں پر لے کر قبر میں اتارا۔ جب لحد میں رکھا تو چہرے پر سے کفن ہٹایا اور نعش کو قبلہ رو کر کے رخسار مبارک خاک پر رکھا اپنے ہاتھوں سے قبر میں مٹی ڈالی اور قبر کو ہموار کر کے اس پر پانی چھڑکا۔

الا یا ضریحا ضم نفسا زکیۃ

علیک سلام اللہ فی القرب والبعد

تعمیلِ وصیت

انسان اپنی زندگی میں جن چیزوں کی تکمیل نہیں کر پاتا ان پر عملدر آمد کا موقع ہی مرنے کے بعد آتا ہے۔ تو وہ انہیں بطور وصیت کسی ایسے شخص سے متعلق کر جاتا ہے جس پر اسے مکمل اعتماد و یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی وصیت سے انحراف نہیں کرے گا خواہ اسے کتنی ہی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے اور ایک فرض شناس انسان کی فرض شناسی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وصیت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہر حال میں اس کی پابندی کرے۔ پیغمبرؐ اکرم نے اسی اعتماد کی بناء پر حضرت علی کو اپنا وصی مقرر کیا تھا کہ ان پر جو ذمہ داریاں عاید کی جائیں گی وہ انہیں ایک اہم فریضہ سمجھ کر پورا کریں گے۔ چنانچہ حضرت نے ایک فرض شناس کی طرح وصیت کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھا اور ایک ایک ہدایت پر عمل کیا۔ تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں خود غسل دیا خود کفن پہنایا خود قبر میں اُترے اور گرد و پیش کے بدلے ہوئے حالات سے آنکھیں بند کر کے ہمہ تن اُدھر ہی متوجہ رہے۔ ان عمومی فرائض کے علاوہ آنحضرتؐ کے وعدوں کے ایفاء کا ذمہ اور ادائے حقوق و ادائے قرض کا بار بھی آپ پر تھا جیسا کہ حدیثِ پیغمبرؐ میں ہے کہ علی ینجز عداتی ویقضی دینی۔ "علی میرے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں گے اور میرا قرضہ ادا کریں گے۔" آپ ان تمام ذمہ داریوں سے اس طرح عہدہ بر آ ہوئے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالواحد ابن عوان کہتے ہیں:۔

ان رسول الله لما توفی امر علی صائحا یصیح من کان له عند رسول الله عدة او دین فلیاتنی فکان یبعث کل عام عند العقبة یوم النحر من یصیح بذلك حتی توفی ثم کان الحسن ابن علی یفعل ذلك حتی توفی ثم کان الحسین یفعل ذلك وانقطع ذلك بعده۔

(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۴۹)

جب پیغمبر اکرمؐ کا انتقال ہوا تو حضرت علی نے ایک اعلان کرنے والے کو مامور کیا کہ وہ اعلان کرے کہ جس کسی سے رسولؐ اللہ نے کوئی وعدہ کیا ہو یا جس کسی کا قرضہ ان کے ذمہ ہو وہ میرے پاس آئے اور ہر سال زمانہ حج میں کسی اعلان کرنے والے کو بھیجتے جو قربانی کے دن عقبہ کے پاس اعلان کرتا۔ اور آپ کی زندگی تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ آپ کے بعد حسن ابن علی زندگی بھر اس پر کاربند رہے اور ان کے بعد حسین ابن علی کی طرف سے اعلان ہوتا رہا اور پھر یہ سلسلہ بند ہو گیا۔"

اس سے بڑھ کر احساس فرض و ادائے قرض کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ حج کے موقع پر جہاں ہر سمت کے لوگ سمٹ کر جمع ہو جاتے ہیں مسلسل پچاس برس تک یہ اعلان ہوتا رہا تاکہ کسی کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہ جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت علی نے نہ کسی تحریری دستاویز کی شرط رکھی اور نہ کسی گواہ کی ضرورت محسوس کی بلکہ عبد الواحد ابن عوان کہتے ہیں کہ جس نے جو طلب کیا اور جو مانگا آپ نے بلا حیل و حجت دے دیا۔ خواہ اس نے سچ کہا ہو یا جھوٹ۔

امیر المومنینؑ کا یہ طرزِ عمل ان لوگوں کے لئے باعث عبرت ہونا چاہیے۔ جنہوں نے بنتِ رسول کے قول کو قابلِ اعتماد نہ سمجھا اور نصاب شہادت کے ناتمام ہونے کا عذر تراش کر ان کا دعویٰ مسترد کر دیا۔ اس مقام پر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ درصورتیکہ پیغمبرؐ کے پسماندگان میں سے اُنکے ترکہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ان کے متروکہ اموال و املاک کی مالک حکومت ہوتی ہے تو ان قرضوں کی ادائیگی بھی حکومت پر عائد ہونا چاہیے تھی جو پیغمبر کی نیابت کی دعوے دار تھی۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ متروکہ اموال حکومت کی تحویل میں چلے جائیں اور قرضوں کی ادائیگی کا بار کسی اور پر ڈال دیا جائے۔ خصوصاً جب کہ یہ قرضے شخصی نہ ہوں بلکہ ملی و ملکی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہوں۔ اب یا تو یہ تسلیم کیجئے کہ جو قرضوں کی ادائیگی کا ذمہ دار تھا وہی پیغمبرؐ کے بعد ان کا نائب و کارپرداز تھا یا پیغمبرؐ کے اموال و املاک کا حکومت کی تحویل میں لیا جانا صحیح نہ تھا۔

رسولؐ اکرم کی وفات سے انکار

پیغمبر اسلام کی وفات سے مدینہ منورہ کی فضاؤں پر سوگوارانہ سکوت چھایا ہوا تھا در و دیوار پر دحشت و سراسیمگی برس رہی تھی ہر گھر ماتم کدہ اور ہر شخص اشکبار تھا مسلمان پاشان و پریشان مسجد نبوی کے اندر اور اس کے گرد و پیش جمع تھے جن کی حسرت بھری نظریں رہ رہ کر اس حجرہ کی طرف اٹھ رہی تھیں جہاں ہادیٔ عالم کی نعش مبارک رکھی تھی اور نالہ و شیون کی گونج میں غسل و کفن کے ابتدائی مراحل طے کئے جا رہے تھے۔ ہر شخص غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا اور فکر و تشویش میں کھویا ہوا تھا کہ ناگاہ اس غم انگیز فضا میں ایک آواز بلند ہوئی:۔

ان رجالا من المنافقین یزعمون ان رسولؐ اللہ توفی وان رسولؐ اللہ واللہ مامات ولکنہ ذھب الی ربہ کما ذھب موسیٰ ا بن	کچھ منافقوں کا خیال ہے کہ رسولؐ اللہ وفات پا گئے حالانکہ خدا کی قسم وہ مرے نہیں ہیں، بلکہ اپنے پروردگار کے پاس گئے ہیں جس طرح موسےٰ ابن عمران گئے تھے اور چالیس راتیں اپنی قوم سے

عمران فغاب عن قومہ اربعین لیلۃ ثم رجع بعد ان قیل قد مات واللہ لیرجعن رسول اللہ فلیقطعن ایدی رجال وارجلہم یزعمون ان رسول اللہ مات۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۴۲)

پوشیدہ رہنے کے بعد پلٹ آئے تھے۔ اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ موسیٰ وفات پا گئے۔ خدا کی قسم رسولِ خدا پلٹ کر آئیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر وفات پا گئے ہیں۔"

پھر تہدیدی لہجہ میں یہ آواز گونجی:۔

من قال ان رسول اللہ مات علوت راسہ بسیفی ھذا و انما ارتفع الی السماء۔

(تاریخ ابو الفداء۔ ج ۱۔ ص ۱۵۶)

جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ مر گئے ہیں۔ میں اپنی تلوار اس پر جڑ دوں گا۔ پیغمبرؐ تو آسمان پر اٹھ گئے ہیں۔"

یہ آوازیں حضرت عمر کے دہن سے نکل رہی تھیں جو اس امر پر بضد تھے کہ پیغمبرؐ اکرم زندہ ہیں اور ان کی موت کی خبر منافقین نے اڑائی ہے۔ انہوں نے ڈرا دھمکا کر اور تلوار گھما گھما کر بجبر و قہر لوگوں کی زبانوں پر پہرا بٹھا دیا تاکہ کسی کے دہن سے اس کے خلاف آواز بلند نہ ہو۔ ابن کثیر رقمطراز ہیں:۔

وقام عمر ابن الخطاب یخطب الناس ویتوعد من قال مات بالقتل والقطع ویقول ان رسول اللہ فی غشیۃ لو قد قام قتل وقطع وعمرو ابن زائدہ فی موخر المسجد یقرء وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ (البدایۃ والنہایہ۔ ج ۵۔ ص ۲۴۲)

حضرت عمر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے اور پیغمبرؐ کی وفات کے بارے میں لب کشائی کرنے والوں کو قتل اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی دھمکیاں دینے لگے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ بے ہوشی میں پڑے ہیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو قتل کریں گے۔ اور ہاتھ پیر کاٹیں گے اور عمرو ابن زائدہ مسجد کے پچھلے حصے میں یہ آیت پڑھ رہے تھے "محمدؐ اللہ کے رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔"

حضرت عمر کی اس آواز کا یہ قہری اثر ہونا ہی تھا کہ لوگوں کے خیالات پراگندہ ہو جائیں۔ ذہنوں کے رُخ مڑ جائیں اور موضوعِ سخن بدل جائے۔ چنانچہ افسردہ سوگوار مجمع حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا اور اس غم آلودہ فضا میں یہ کھسر پھسر شروع ہو گئی کہ کیا پیغمبر واقعاً رحلت فرما گئے ہیں یا زندہ ہیں۔ اگرچہ

سننے والوں کا ذہن اس اپچ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا اور نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ تھی مگر دبی زبان میں اظہار خیال کے علاوہ کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ یہ کہے کہ اندر چل کر آنحضرتؐ کی میت دیکھ کر اطمینان کر لیا جائے۔ کیونکہ زندگی کو اپنا وجود ثابت کرنے میں کسی مشکل کا سامنا کرنا نہیں پڑتا اور نہ موت کو اپنا ثبوت مہیا کرنے میں کوئی دشواری پیش آتی ہے۔ سب چپ سادھے ہوئے ہیں اور حضرت عمر کو تلوار گھماتے دیکھ کر نہ خلاف کہتے بنتی ہے اور نہ ہاں میں ہاں ملائی جا سکتی ہے اس لئے کہ حضرت عمر کبھی یہ کہتے کہ پیغمبرؐ بیہوشی میں پڑے ہیں کبھی یہ کہتے کہ آسمان پر اٹھ گئے ہیں اور کبھی یہ کہتے کہ وہ موسیٰ ابن عمران کی طرح غیبت اختیار کر چکے ہیں۔ اب کس بات کو صحیح کہا جائے اور کس کو غلط۔ اگر اسے بیہوشی کہا جائے تو بیہوشی اور موت میں واضح فرق ہے۔ بیہوشی میں سانس کی آمد و شد قائم رہتی ہے اگرچہ حس و حرکت نہیں رہتی اور موت میں حس و حرکت بھی جاتی رہتی ہے اور سانس کی آمد و شد کا سلسلہ بھی قطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اس واضح علامت سے دوسروں کو بھی بڑی آسانی سے بے ہوشی کا قائل کر سکتے تھے تلوار لے کر ڈرانے دھمکانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور اگر آسمان پر اُٹھ جانے والی بات کو صحیح سمجھا جائے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں ہے اس لئے کہ یہ ارتفاع صرف روح کا تھا یا اس میں جسم بھی شریک تھا۔ اگر صرف روح نے آسمان کی طرف پرواز کی تھی تو ظاہر ہے کہ اسی کا نام موت ہے اور اگر جسم بھی ساتھ تھا تو یہ مشاہدہ کے خلاف تھا کیونکہ جسد اطہر اپنے مقام پر موجود تھا۔ اور اگر یہ غیبت تھی تو کیسی غیبت تھی کیا پیغمبر نے اپنی زندگی میں کبھی اس کا ذکر کیا یا اس کی طرف کوئی اشارہ فرمایا تھا اور پھر اس میں اور حضرت موسیٰ کی غیبت میں کیا مماثلت پائی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ تو جیتے جی جسم و روح کے ساتھ چالیس راتوں کے لئے طور پر گئے تھے اور توراۃ لے کر پلٹ آئے تھے اور یہاں پیغمبر اکرمؐ کا جنازہ آنکھوں کے سامنے بے حس و حرکت موجود تھا۔ نہ کہیں نقل مکانی ہوئی اور نہ ان کا جسد اطہر نظروں سے اوجھل ہوا پھر وہ کون سی چیز غائب ہوئی تھی جس کے متعلق یہ کہا گیا کہ وہ پلٹ آئے گی اور پھر اس غیبت کو حضرت موسیٰ کی غیبت سے تشبیہ دینے کا تقاضا تو یہ تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ غیبت کے دنوں میں اپنے بھائی ہارون کو اپنا نائب و جانشین بنا کر چھوڑ گئے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وقال موسیٰ لاخیه هارون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین۔	موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے خلیفہ و جانشین رہو اور (لوگوں کی) اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کی راہ پر نہ چلنا۔"

اسی طرح پیغمبرؐ بھی کسی کو اپنا جانشین بنا کر امت میں چھوڑ جاتے اور پھر اُن کے مقرر کردہ نائب کی نشاندہی کی جاتی مگر ادھر ذہن کا رُخ نہیں مڑتا یا مصلحۃً اس کا ذکر زبان پر نہیں آتا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی اُلجھی ہوئی اور دریافت طلب ہے کہ وہ منافق کون کون تھے جنہوں نے پیغمبرؐ کی موت کی خبر اڑائی تھی جب کہ یہ خبر پیغمبرؐ کے گھر کے اندر سے آئی تھی جہاں ازواج پیغمبرؐ جناب فاطمہ زہراؑ حضرت علی حضرت حسن حضرت حسین، عباس، عبداللہ ابن عباس فضل ابن عباس عبداللہ ابن جعفر اور دوسرے بنی ہاشم موجود تھے کیا یہ افراد بھی منافقین میں شامل تھے اور پیغمبرؐ پلٹ کر انہی کے ہاتھ پیر کاٹیں گے۔
پیغمبرؐ اکرم کی موت کے بارے میں الجھاؤ تو پیدا ہو ہی چکا تھا اور خدا جانے کب تک یہ الجھاؤ باقی رہتا کہ حضرت ابوبکر جو مدینہ کے باہر مقام سنح میں رہتے تھے۔ آنحضرتؐ کی خبر وفات سن کر مدینہ میں آئے اور حضرت عمر کو وفات پیغمبرؐ کی تردید کرتے سنا تو اندر جا کر نعش اقدس کے چہرے پر سے چادر سرکا کر دیکھا اور باہر نکل کر حضرت عمر سے کچھ دیر بات چیت کی اور پھر لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت ومن کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات ثم قرأ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۴۳)

جو شخص اللہ کا پرستار ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے جسے موت نہیں ہے اور جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا۔ اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمدؐ وفات پا گئے۔ (پھر یہ آیت پڑھی) محمد اللہ کے رسولؐ ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اگر وہ اپنی موت مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم الٹے پیروں کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پلٹ جائے گا تو وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور خدا جلد ہی شکر گزاروں کو بدلہ دے گا"

حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی زبان سے یہ آیت سنی تو حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

اوانھا فی کتاب اللہ ماشعرت انھا فی کتاب اللہ ثم قال یا ایھا الناس ھذا ابوبکر ذوا سبقیۃ فی المسلمین فبایعوہ فبایعوہ۔

(البدایہ والنہایہ۔ ج ۵۔ ص ۲۴۳)

کیا یہ آیت قرآن مجید میں ہے؟ مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے (پھر کہا) اے لوگو یہ ابوبکر ہیں جنہیں مسلمانوں میں سبقت حاصل ہے ان کی بیعت کرو! ان کی بیعت کرو"

حضرت عمر جو ابھی ابھی پیغمبرؐ کے زندہ ہونے پر زور دے رہے تھے۔ اس آیت کو سن کر فوراً آنحضرتؐ

کی وفات کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اس فوری تبدیلی کو دیکھتے ہوئے یہ شک تو گزرتا ہی ہے کہ حضرت عمر واقعاً یہ عقیدہ رکھتے بھی تھے یا نہیں کہ پیغمبرؐ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اگر یہ عقیدہ رکھتے تھے تو شروع ہی سے یہ سمجھتے آ رہے تھے یا خبر وفات سن کر انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ پیغمبرؐ مر نہیں سکتے اگر پہلے ہی سے یہ سمجھتے تھے تو آنحضرتؐ کے قلم و کاغذ طلب کرنے پر یہ کہنے کے بجائے کہ آنحضرتؐ پر درد کا غلبہ ہے یا ہذیانی کیفیت طاری ہے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ وصیت کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے جس کا رشتۂ حیات ٹوٹ جانے والا ہو اور جو مرنے والا ہی نہ ہو اسے اپنے بعد کے لئے وصیت کی احتیاج ہی کیا ہے۔ لہذا یہ وصیت کیوں اور یہ تحریر کس لئے؟ اور اگر خبر مرگ سن کر انہوں نے یہ رائے قائم کی تھی تو کون سا ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے ان کے خیالات نے پلٹا کھایا یا کون سی ایسی دلیل اُن کے ہاتھ لگی کہ ایک دم ان کا نظریہ بدل گیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ آنحضرت کی موت واقع نہیں ہوئی بلکہ یہ چند روزہ غیبت ہے۔ حضرت عمر نے اپنے موقف کی تشریح کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا ہے:۔

واللہ ان حملنی علیٰ ذالک الا انی اقرء ھذہ الآیۃ "وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا فو اللہ انی کنت لاظن ان رسول اللہ سیبقی فی امتہ حتی یشھد علیھا باخر اعمالھا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ صفحہ ۴۵)

خدا کی قسم مجھے اس بات کے کہنے پر اس آیت نے آمادہ کیا تھا۔ "اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہے" خدا کی قسم مجھے یہ گمان غالب ہوا کہ رسول اپنی امت میں باقی رہیں گے یہاں تک کہ امت کے ایک ایک عمل کی گواہی دیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ آیت کے اندر لفظ شہید دیکھ کر انہیں یہ گمان ہوا کہ پیغمبر چونکہ امت کے اعمال کے نگران و شاہد ہیں لہذا وہ ہمیشہ دنیا میں باقی رہیں گے لیکن یہ بقول ان کے گمان ہی تو تھا جسے یقینی شواہد کے مقابلہ میں باور ہوا ہو جانا چاہیئے تھا۔ جب وہ پیغمبرؐ کو موت و حیات کی کشمکش میں دیکھ چکے تھے۔ اور اب یہ بھی دیکھ لیا کہ آنحضرتؐ میں آثار حیات ناپید ہیں گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آ رہی ہیں اور ہر شخص کی زبان پر آپ کی موت کا تذکرہ ہے تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ شہید کا مفہوم وہ نہیں ہے جو انہوں نے سمجھا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ مشاہدہ و قطعی ثبوت کے مقابلہ میں اپنے گمان کو ترجیح دیتے ہیں اور بار بار قسم کھا کر آنحضرتؐ کی زندگی کا یقین دلانے اور اپنی بات کے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان کی ذاتی رائے

کچھ بھی ہو اس پر پہرا نہیں بٹھایا جا سکتا مگر دوسروں کو اپنی رائے کا پابند بنانے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے اگر انہوں نے لفظ شہید کا یہ مفہوم پیدا کیا اور کوئی دوسرا اس کا یہ مفہوم قرار نہ دے اور آیہ انک میت و انھم میتون (اے رسول تم بھی مرنے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں) کے تحت آنحضرتؐ کو میت قرار دے تو کس جرم کی پاداش میں قتل یا ہاتھ پاؤں کے کاٹے جانے کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ کیا کسی آئین میں میت کو میت کہنا جرم ہے اور پھر انہی سے اگر کوئی یہ پوچھ لیتا کہ اگر لفظ شہید سے آنحضرتؐ کی زندگی پر استدلال صحیح ہے تو پھر درمیانی امت کو بھی ایسی ہی زندگی کا حامل سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اسے بھی شھداء علی الناس قرار دیا گیا ہے تو اس کا کیا جواب ہوگا۔ اس انکار کی بعض لوگوں نے یہ بھی توجیہہ کی ہے کہ حضرت عمر وفات رسولؐ کے سانحہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ شدت غم سے اوسان کھو بیٹھے اور ذہنی پراگندگی کے زیر اثر یہ کہنے لگ گئے کہ رسول زندہ ہیں مرے نہیں ہیں۔ یہ بات بھی کوئی وزنی نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ اگر یہ انکار حواس کے متاثر ہونے کی بناء پر ہوتا تو وہ یہ کہنے کے بجائے کہ مجھے لفظ شہید سے پیغمبر کے زندہ ہونے کا گمان ہوا تھا یہ معذرت کرتے کہ میں نے وفاتِ رسولؐ کے موقع پر جو کہا تھا وہ اختلالِ حواس کا نتیجہ تھا اور پھر اس انکار کے علاوہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہو کہ واقعاً ان کے ہوش و حواس پر اثر تھا۔ اور ان کی افتادِ طبیعت کو دیکھتے ہوئے کون باور کرے گا کہ جو اثر کسی پر نہ ہوا ہو وہ ان پر ہوا ہوگا اگر واقعاً ان کے حواس معطل ہو گئے تھے تو حضرت ابوبکر کے آیۂ وما محمد الا رسول پڑھتے ہی ایک دم حواس بجا کیسے ہو گئے۔ اگر یہ اس آیت کا معجزانہ اثر تھا۔ تو حضرت ابوبکر کی آمد سے پہلے عمرو ابن قیس مسجد میں یہی آیت تو پڑھ رہے تھے مگر اس وقت نہ اس کے آیہ قرآنی ہونے کی طرف التفات ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی اثر ہی ظاہر ہوتا ہے اور وہ برابر مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہی کہتے رہے کہ پیغمبر زندہ ہیں اور وہ ہرگز نہیں مریں گے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جب پیغمبرؐ کی نزعی کیفیت اور وہ آثار جو موت کا یقین دلانے کے لئے بہت کافی تھے انہیں موت کا یقین نہ دلا سکے تو اس آیت میں کون سی ایسی بات تھی جو موت کو یقینی طور پر ثابت کر رہی تھی جس سے انہیں فوراً موت کا یقین ہو گیا۔ اس آیت کا ایک ٹکڑا تو یہ ہے کہ :۔ "محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں" اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ دوسرے رسولوں کی طرح پیغمبر بھی ایک نہ ایک دن دنیا سے اٹھ جائیں گے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ موت واقع ہو چکی ہے اگر اس سے موت کا ثبوت مہیا ہوا تھا تو پھر جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت یہ کیوں نہ سمجھ لیا گیا کہ پیغمبرؐ رحلت فرما چکے ہیں حضرت عمر کو تو اپنے یقین کی بناء پر جو انہیں پیغمبر کے زندہ ہونے کے بارے میں تھا یہ کہنا چاہئے تھا کہ یہ آیت تو اپنے مقام پر درست ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ پیغمبرؐ ایک نہ ایک دن رحلت فرما جائیں گے لیکن ابھی تو وہ زندہ ہیں اور جب تک نگرانی

اعمال کا فریضہ انجام نہیں دے لیں گے وفات نہیں پائیں گے۔ اور آیت کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ "اگر پیغمبرؐ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں" اس سے بھی موت کے واقع ہونے پر ثبوت مہیا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ آیت میں موت یا قتل کا ذکر بطور شرط ہوا ہے اور شرط کے لئے وقوع ضروری نہیں ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اگر مینہ برسے تو کھیتیاں ہری ہو جائیں گی اس سے یہ کون سمجھ سکتا ہے کہ بارش ہو چکی ہے۔ اسی طرح آیت سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ موت واقع ہو چکی ہے۔ پھر خدا جانے کس بناء پر اس آیت کے سنتے ہی ان کے یقین کا تار پود بکھر جاتا ہے اور فوراً آنحضرت کی موت کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

اس انکار اور انکار پر زور اور پھر فوری اعتراف کو دیکھ کر ہر غیر جانبدار یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ انکار کسی مصلحت کے پیش نظر رہا ہو گا ورنہ جس پر خبرِ مرگ اس حد تک اثر انداز ہو کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے وہ اس قابل کب رہتا ہے کہ میت ابھی رکھی ہو اور وہ غسل و کفن اور دوسرے امور سے بے نیاز ہو کر حکومت کی فکر و تدبیر کرنے لگے اور صفِ ماتم سے اٹھ کر سقیفہ بنی ساعدہ میں چلا جائے اور انصار سے بحث و مباحثہ اور دھینگا مشتی کر کے اپنے حق کی فوقیت ثابت کرے اور یہ بھول جائے کہ پیغمبر کی میت ابھی غسل و کفن کے مرحلہ سے نہیں گزری جسے پیغمبر کی تجہیز و تکفین کی اتنی فکر نہ ہو جتنی کہ حکومت و اقتدار کی اس کے بارے میں یہ کیونکر تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ خبرِ مرگ سن کر حواس کھو بیٹھا ہو گا اور بے اوسان ہو کر پیغمبر کی موت سے انکار کر دیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر اتنے بے خبر نہ تھے کہ انہیں پیغمبر کی موت کا یقین نہ ہوتا یا اُن کے حواس اتنا متاثر ہوتے کہ وہ واقعہ و مشاہدہ کے خلاف کچھ کا کچھ کہنے لگتے بلکہ یہ انکار وقتی و ہنگامی اور بعض اہم سیاسی مصالح کی بناء پر تھا۔

اس سیاسی مصلحت کو سمجھنے کے لئے چند واقعات اور ان کے پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی دعوتِ اسلام کے دورِ آغاز سے لے کر زمانۂ اختتام تک اسلام کی خدمت و نصرت پر کمربستہ رہے اور پیغمبرؐ انہی کے ذریعہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حفاظت کا سامان کرنا چاہتے تھے جس کا اعلان دعوتِ عشیرہ سے لے کر حجۃ الوداع تک اور حجۃ الوداع سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک مختلف طریقوں سے کرتے رہے اسی بناء پر صحابہ کرام کیا مہاجر اور کیا انصار کسی کو اس میں ذرا شبہ نہ تھا۔ کہ علی ہی مسندِ خلافت پر متمکن ہوں گے۔ ابن ابی الحدید تحریر کرتے ہیں :-

وکان عامة المهاجرين وجل	مہاجرین اور انصار کی اکثریت کو
الانصار لایشکون ان علیاهو	اس میں کوئی شبہ نہ تھا ، کہ
صاحب الامر بعد رسول الله	پیغمبرؐ کے بعد علی ولی امر

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ ہوں گے۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ ص)

اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک گروہ نبوت و خلافت کو ایک ہی گھر میں دیکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے پیغمبرؐ کی زندگی ہی میں اقتدار کی راہ ہموار کرنا شروع کر دی اور ہر اس کارروائی کے آگے دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی جو اُن کے مقاصد کی تکمیل میں حائل ہوسکتی تھی۔ پیغمبر اکرمؐ بستر مرگ پر قلم و دوات طلب کرتے ہیں مگر ہنگامہ کھڑا کرکے انہیں وصیت نامہ لکھنے نہیں دیا جاتا تاکہ علی کی نیابت کے متعلق تحریری دستاویز نہ چھوڑ جائیں۔ پھر انہی ایام میں ایک ایک کو حکم دیتے ہیں کہ وہ لشکر اسامہ میں شریک ہوکر یہاں سے چلے جائیں مگر اسے عملاً مسترد کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے خلافت کسی اور طرف منتقل نہ ہو جائے۔ اور جب پیغمبر دنیا سے رحلت فرما جاتے ہیں تو اس خطرہ کا انسداد ضروری تھا کہ کہیں اندر ہی اندر علی کی بیعت کی تکمیل نہ ہو جائے اور ایسا ہو بھی جاتا اگر امیرالمومنین یہ گوارا کر لیتے کہ پیغمبر کے غسل و کفن سے پہلے بیعت ہو جائے مگر ان کی حمیت آڑے آئی اور انہوں نے اسے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

لما قبض رسول اللہ اخرج حتی ابایعك علی اعین الناس لئلا یختلف علیك اثنان فابی و قال اومنهم من ینكر بحقنا و یستبد علینا فقال العباس ستری ان ذلك سیكون۔

(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۵۸۳)

جب رسول خدا رحلت فرما گئے تو عباس نے کہا کہ اے علی باہر نکلئے میں لوگوں کے روبرو آپ کی بیعت کروں تاکہ آپ کے بارے میں کوئی اختلاف نہ کرے۔ مگر علی نے انکار کیا اور کہا کہ کون ہمارے حق سے انکار کر سکتا ہے اور کون ہم پر مسلط ہو سکتا ہے۔ عباس نے کہا کہ پھر دیکھ لیجئے گا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔"

حضرت عمر جو اس گروہ کی ایک فرد تھے جو نبوت و خلافت کو ایک گھر میں دیکھنا نہ چاہتا تھا انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ بیعت کی یہ تحریک کہیں عملی صورت نہ اختیار کرلے اس لئے وہ اس تحریک کو ابھرنے سے پہلے دبا دینا چاہتے تھے اس وقت کوئی اور تدبیر نہ سوجھی تو پیغمبر کے زندہ ہونے کا شاخسانہ کھڑا کر دیا تاکہ کسی کی بیعت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی اور لوگوں میں آنحضرتؐ کی موت و حیات کا مسئلہ چھڑ گیا اور حضرت ابوبکر کے آنے تک اسی بحث میں اُلجھے رہے اور ان کے آتے ہی وہ تمام شور و ہنگامہ جو آنحضرتؐ کو زندہ ثابت کرنے کے لئے تھا یکدم ختم ہو گیا اور انہوں نے ایسا افسوں پھونکا کہ حضرت عمر نے فوراً اپنا موقف

بدل لیا اور آنحضرت کی موت کے اعتراف کے ساتھ حضرت ابوبکر کی بیعت کا بھی مطالبہ شروع کر دیا۔ یہ مطالبہ انہی تصورات کا ردعمل تھا جو خلافت کے سلسلہ میں ان کے ذہن میں نشوونما پا رہے تھے اور اس قرارداد کے ماتحت تھا جو پہلے سے آپس میں طے شدہ تھی ورنہ جب دعوی یہ ہے کہ خلافت جمہور کی صوابدید اور اس کی رائے سے وابستہ ہے تو بیعت کے مطالبہ کا جواز ہی کیا تھا جب کہ نہ ابھی انتخاب عمل میں آیا تھا اور نہ رائے عامہ معلوم کی جا سکی تھی۔ غرض اس مطالبۂ بیعت کے بعد یہ حقیقت چھپ نہیں سکتی کہ وفات رسول سے انکار نہ حواس کی پراگندگی کی بنا پر تھا اور نہ آیت قرآنی سے بے خبری و ناواقفیت کی وجہ سے بلکہ سیاسی ضرورت کے پیش نظر تھا تاکہ خلافتِ رسول کے سلسلہ میں کوئی آواز بلند ہو تو اُسے دبایا جا سکے اور پھر جمہور کی آڑ میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ واقعات سقیفہ بنی ساعدہ اس کے شاہد ہیں کہ انہوں نے پیغمبر کے دفن وکفن پر حکومت کی تشکیل کو مقدم سمجھا اور انصار کو سیاسی شکست دے کر حکومت قائم کر لی یہ کامیابی جمہور کی موافقت کی مرہون منت نہ تھی بلکہ ان کی سیاسی بصیرت اور موقع شناسی کی احسان مند تھی۔

واقعات سقیفہ پر ایک نظر

پیغمبر اکرم کی وفات کے بارے میں جو اختلاف رونما ہوا تھا ختم ہو گیا اور اسے ختم ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس لئے کہ وہ صرف دفع الوقتی کے لئے تھا۔ جب تک اس کی ضرورت رہی اسے باقی رکھا گیا اور جب اس کی ضرورت نہ رہی اسے ختم کر دیا گیا۔ مگر اس اختلاف نے انصار کے ذہنوں میں ہلچل ڈال دی اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ تحریر وصیت پر ہنگامہ، جیش اسامہ سے تخلف اور موت ایسی واضح حقیقت سے انکار کیا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تو نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہ تھا کہ انہیں کسی نتیجہ پر پہنچنے میں دشواری ہوتی انہوں نے بڑی آسانی سے بھانپ لیا کہ یہ ساری تدبیریں خلافت کو اس کے مرکز سے ہٹا کر دوسری طرف منتقل کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ انہوں نے حالات کی تبدیلی اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً سقیفۂ بنی ساعدہ میں ایک اجتماع کیا تاکہ انصار میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر کے مہاجرین کے منصوبے کو ناکام بنا دیں۔ اگر انصار کو یہ یقین ہوتا کہ مہاجرین حضرت علی کے برسر اقتدار آنے میں مزاحم نہیں ہوں گے تو وہ نہ یہ بزم مشاورت قائم کرتے اور نہ اس سلسلہ میں جلد بازی سے کام لیتے ان کے قلب وضمیر کی آواز وہی تھی جو سقیفہ میں بیعت کے ہنگامہ کے موقع پر بلند ہوئی کہ لا نبایع الا علیاً۔ ہم علی کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔"

اس اجتماع میں انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج رقیبانہ چشمک کے باوجود شریک ہوئے۔ اس لئے کہ اوس ہوں یا خزرج دونوں کو مہاجرین کے ایک طبقہ کی بالادستی گوارا نہ تھی اور نہ ان کے اقتدار کو اپنے حقوق کے تحفظ کی ضمانت سمجھتے تھے البتہ خزرج اس اجتماع کے انتظام و اہتمام میں پیش پیش تھے اور انہی میں کی ایک ممتاز شخصیت سعد ابن عبادہ میر مجلس تھے جو ناسازئ طبع کی وجہ سے ردا اوڑھے مسند پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر سے کاروائی کا آغاز کیا مگر ضعف و نقاہت کی وجہ سے آہستہ بول رہے تھے اور ان کے فرزند قیس بلند آواز سے ان کی تقریر دہراتے جاتے تھے تاکہ تمام حاضرین کے کانوں تک پہنچ جائے۔ انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔" اے گروہ انصار تمہیں دین میں جو سبقت و فضیلت حاصل ہے وہ عرب میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ دس برس تک اپنی قوم کو خدا پرستی کی دعوت دیتے رہے۔ مگر گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ کوئی ان پر ایمان نہ لایا۔ اور چند آدمیوں کے بس کی یہ بات نہ تھی کہ وہ آنحضرتؐ کی حفاظت کا ذمہ لے سکتے اور دین کی تقویت کا سامان کرتے۔ اللہ نے تمہیں یہ توفیق بخشی کہ تم ایمان لائے اور پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں کے سینہ سپر بن کر کھڑے ہو گئے۔ میدانِ کارزار میں اترے اور دشمنانِ دین سے لڑے۔ تمہاری ہی تلواروں سے عرب کے سرکشوں کے سر خم ہوئے اور تمہارے ہی زورِ بازو سے اسلام کو اوج و عروج حاصل ہوا۔ پیغمبرؐ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور آخر دم تک تم سے راضی و خوشنود رہے۔ ان خدمات کے پیشِ نظر تمہارے علاوہ منصبِ خلافت کا کون سزاوار ہو سکتا ہے۔ لہذا اٹھو اور خلافت پر اپنی گرفت مضبوط کر لو۔" سب نے اس کی تائید کی اور کہا کہ ہم آپ ہی کو منصبِ خلافت پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ تنہا انصار کا ہوتا تو بیعت کی تکمیل کے بعد اس کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر یہ خدشہ بھی ساتھ لگا ہوا تھا کہ اگر مہاجرین نے مخالفت کی تو یہ بیل کس منڈھے چڑھے گی۔ چنانچہ سعد ابن عبادہ کی تقریر کے بعد اس ذہنی خلش کے نتیجہ میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ اگر مہاجرین نے ان سے اتفاق نہ کیا تو اس معاملہ کو کس طرح سلجھایا جا سکے گا اور کون سی متبادل صورت اختیار کی جائے گی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر وہ نہ مانیں گے تو ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے ہو۔ اس پر سعد نے کہا کہ یہ پہلی کمزوری ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان کے عزم و ارادہ میں پختگی ہوتی تو وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اقتدار آدھوں آدھ تقسیم کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ فوراً اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناتے اور مہاجرین کی مزاحمت سے پہلے بیعت کر چکے ہوتے مگر انہوں نے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر خود ہی موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

اس اجتماع میں اگرچہ اوس بھی شریک تھے مگر ان کی شرکت اس غرض سے تھی کہ دوسروں کو یہ تاثر نہ دیں کہ انصار میں باہمی اتحاد و یک جہتی نہیں ہے ورنہ دل سے انہیں خزرج کا اقتدار گوارا نہ تھا اور نہ گوارا ہونے

کی کوئی وجہ تھی اس لئے کہ دونوں حریف و متحارب خاندان تھے اور اسلام لانے سے تھوڑا عرصہ پہلے ان میں ایک خونریز جنگ بھی ہو چکی تھی جو جنگ بعاث کے نام سے موسوم ہے اگرچہ اسلام نے ان دونوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا کر دی تھی اور بڑی حد تک ان کی باہمی کدورتوں کو ختم کر دیا تھا مگر اسے انسانی کمزوری کہئے یا انسانی طبیعت کا خاصہ کہ وہ ایک دوسرے کو حریف و مدمقابل ہی کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور ایک کا امتیاز دوسرے کو کھٹکے بغیر نہ رہتا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی اوس کے دو آدمیوں نے مخبری کی اور حضرت عمر کو خفیہ طور پر اس اجتماع کی اطلاع دے دی جس پر حضرت عمر بہت سٹپٹائے اور اپنے دو ایک ہمنواؤں کے ساتھ اس اجتماع کو درہم و برہم کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں :-

سمع عمر الخبر فاتی منزل النبی وابو بکر فیه فارسل الیه ان اخرج الی فارسل الیه انی مشتغل فقال عمر قد حدث الامر لابد لك من حضوره فخرج الیه فاعلمه الخبر فمضیا مسرعین نحوهم ومعهما ابو عبیدۃ۔	حضرت عمر نے یہ خبر سنی تو حجرۂ نبوی پر آئے جہاں حضرت ابوبکر اندر موجود تھے۔ حضرت عمر نے انہیں کہلوا بھیجا کہ ذرا باہر آئیے انہوں نے کہا کہ میں مصروف ہوں کہا کہ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ تمہارا آنا ضروری چنانچہ حضرت ابوبکر باہر نکلے اور انہیں اس واقعہ کی اطلاع دی اور وہ دونوں ابو عبیدہ کو ساتھ لے کر انصار کی طرف تیزی سے چل دیئے۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۲۲)

حضرت عمر نے انصار کے اجتماع پر مطلع ہونے کے بعد صرف ابوبکر کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ یہ کوئی شخصی و انفرادی معاملہ نہ تھا بلکہ ملک و ملت کے مجموعی مصالح سے متعلق تھا۔ اگر انصار کے اجتماع سے امت مسلمہ کو کسی ضرر کے پہنچنے کا اندیشہ تھا تو دوسرے سربرآوردہ افراد کو بھی اس کی خبر دینا چاہیئے تھی۔ کیا عم رسولؐ عباس، ابن عم رسول علی، زبیر ابن عوام اور دوسرے بنی ہاشم و اکابر قریش میں سے کوئی اس قابل نہ تھا کہ انہیں صورت حال پر مطلع کر کے مشورہ لیا جاتا اور پھر جماعتی طور پر اس فتنہ کے انسداد کی تدبیر کی جاتی۔ اور حضرت عمر کسی قاصد کے ذریعہ پیغام بھیجنے کے بجائے خود اندر چلے جاتے اور ان تمام افراد کو جو غسل و کفن کا سامان کر رہے تھے انصار کے اجتماع اور ان کے عزائم سے آگاہ کرتے۔ مگر انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ اگر وہ خود اندر چلے جاتے حضرت ابوبکر سے چپکے چپکے باتیں کرتے اور پھر انہیں ساتھ لے کر وہاں سے چل دیتے تو اندیشہ تھا کہ کوئی کھٹک جاتا اور ٹوہ لگانے کے لئے پیچھے لگ جاتا اور یہ بات صیغۂ راز میں نہ رہتی اور وہ مقصد فوت ہو جاتا جو اُسے پردۂ راز میں رکھنے میں اُن کے پیش نظر تھا۔

جب یہ تینوں آدمی ہانپتے کانپتے سقیفہ بنی ساعدہ میں اچانک وارد ہوئے تو انصار ششدر ہو کر رہ گئے انہیں راز افشا ہو جانے سے اپنی کامیابی مشکوک نظر آنے لگی اور اوس کو بھی موقع مل گیا کہ وہ ان مہاجرین کا سہارا لے کر اپنے حریف قبیلہ کے منصوبے کو ناکام بنائیں۔ حضرت عمر نے آتے ہی مجمع پر ایک نظر ڈالی اور سعد ابن عبادہ کو چادر میں لپٹے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ سعد ابن عبادہ ہیں جو صدر مجلس اور خلافت کے امیدوار ہیں۔ حضرت عمر نے تیوری پر بل ڈالا اور پھر اس مجمع سے مخاطب ہو کر کچھ کہنا چاہا مگر حضرت ابو بکر نے اس خیال سے کہ ان کی تیزیٔ طبع کام نہ بگاڑ دے انہیں روک دیا۔ حضرت عمر بغیر کسی حیل و حجت کے یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ:۔

لا اعصی خلیفۃ النبی فی یوم مرتین۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۴۳)

"میں ایک دن میں دو مرتبہ خلیفۂ رسولؐ کے حکم سے سرتابی نہیں کروں گا"

حضرت ابو بکر خود اٹھے اور تقریر کرتے ہوئے کہا:۔ خداوند عالم نے پیغمبرؐ کو اس وقت بھیجا جب ہر طرف بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ آپ دنیا کو بت پرستی سے ہٹانے اور خدا پرستی کی راہ پر لگانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر اہل عرب نے اپنا آبائی دین و مذہب چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ خدا نے مہاجرین اولین کو جو رسول اللہ کے ہم قوم و ہم قبیلہ ہیں ایمان و تصدیق رسالت کے لئے منتخب کیا۔ انہوں نے ایمان لانے کے بعد اپنے قبیلہ والوں کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا۔ ان کے جھٹلانے کی پروا نہ کی اس وقت تو سب ہی لوگ مخالفت پر ایکا کئے ہوئے تھے اور ہر طرح سے ڈراتے دھمکاتے تھے مگر تعداد میں کم ہونے کے باوجود ذرا ہراساں نہ ہوئے انہوں نے روئے زمین پر پہلے پہل اللہ کی پرستش کی سب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ یہ لوگ رسولؐ کے ولی و دوست اور ان کے کنبہ کے افراد ہیں لہذا منصب خلافت کا ان سے بڑھ کر کوئی حقدار نہیں ہو سکتا جو اس معاملہ میں ان سے جھگڑا کرے گا وہ ظالم قرار پائے گا۔ اے گروہ انصار تمہاری دینی فضیلت اور اسلامی سبقت بھی ناقابل انکار ہے اللہ نے تمہیں اسلام اور پیغمبر اسلام کا حامی و مددگار بنایا اور تمہارے شہر کو دار الہجرت قرار دیا۔ ہمارے نزدیک مہاجرین اولین کے بعد تمہارا مرتبہ سب سے بلند تر ہے۔ لہذا ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر ہوگے اور کوئی معاملہ تمہارے مشورہ کے بغیر طے نہیں پائے گا"

حضرت ابو بکر کا یہ خطبہ ان کی پیش بینی معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کا آئینہ دار ہے۔ یہ اُن کے تدبر ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے حضرت عمر کو افتتاحی تقریر سے منع کر دیا تاکہ ان کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نہ نکل جائے جس سے انصار کے جذبات بھڑک اٹھیں اور پھر انہیں اپنے ڈھرے پر لگانا مشکل ہو جائے۔ حضرت ابو بکر کی مصلحت اندیش نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ محل سختی برتنے

کا نہیں ہے بلکہ نرمی اور حکمتِ عملی سے کام نکالنے کا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تلے الفاظ سے انصار کو متاثر کر کے ان کا جوش کم کیا انہیں مہاجرین کا مشیر کار قرار دیا اور وزارت کی پیشکش سے ان کی دلجوئی کی۔ اس خطبہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے فریق مخالف ہوتے ہوئے اپنی ذات کو ایک فریق کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ وہ انداز اختیار کیا جو ایک ثالث اور غیر جانبدار شخص کا ہوتا ہے اور ایک مبصر کی طرح دونوں گروہوں کے مرتبہ و مقام کا جائزہ لیا تاکہ شعوری یا لاشعوری طور پر مہاجر و انصار کا سوال نہ پیدا ہو جائے۔ اگر مہاجر و انصار کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا تو پھر کچھ نہ کہا جا سکتا تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے۔ ممکن تھا کہ قومی و قبائلی عصبیت جو عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ابھر آتی، ہر گروہ اقتدار پر چھا جانے کی کوشش کرتا، خانہ جنگی تک نوبت پہنچتی اور کامیابی مشکوک ہو کر رہ جاتی۔ اس سلسلہ میں مزید احتیاط یہ برتی کہ انصار کے مقابلہ میں عام مہاجرین کو لانے کے بجائے مہاجرین کے ایک خاص طبقہ کو جو اولین کہلاتا تھا پیش کیا تاکہ انصار کو یہ تاثر دیں کہ یہاں قومی و قبائلی تقابل نہیں ہے۔ بلکہ بلحاظ فضیلت و اولیت شخصی جائزہ ہے اور پھر اس تاثر کو مستحکم تر کرنے کے لئے جہاں مہاجرین اولین کے اوصاف بھی گنوائے وہاں انصار کے اوصاف گنوانے میں بھی فراخ حوصلگی سے کام لیا۔ یوں تو مہاجرین کے اور اوصاف بھی گنوائے جا سکتے تھے مگر استحقاق خلافت کے لئے صرف انہی اوصاف کا ذکر کیا جو ناقابلِ تردید تھے۔ انصار میں کون ایسا ہو گا جسے یہ اعتراف نہ ہو کہ مہاجرین اولین کا ایک گروہ انصار سے اسلام میں سابق ہے اور ان کا قبیلہ بھی وہی ہے جو رسول خدا کا قبیلہ ہے۔ اگر کسی اور فضیلت کا ذکر کرتے تو ممکن تھا کہ اس کی تردید میں آواز بلند ہوتی اور اس تردید کا اثر ان اوصاف پر بھی پڑتا اور اس کے نتیجہ میں استحقاق خلافت بھی متاثر ہوتا۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ مہاجرین کی سبقت بھی مسلم اور پیغمبرؐ کا ہم قبیلہ ہونا بھی تسلیم مگر اس سے استحقاقِ خلافت کا ثبوت کس دلیل شرعی کی رُو سے اور اگر یہ استحقاقِ خلافت کی دلیل ہے تو کیا علی مہاجرین اولین میں سابق اور قرابت کے لحاظ سے سب سے قریب تر نہیں ہیں پھر ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کا استحقاق کیوں؟ اس اعتراض کو انصار کے حق وزارت کا اعلان کر کے دبا دیا گیا اس طرح کہ اگر انصار اس دلیل کو مسترد کر کے مہاجرین کے استحقاق خلافت پر معترض ہوتے تو اس دلیل کو بھی مسترد کرنا پڑتا جس سے ان کا استحقاق وزارت ثابت ہوتا تھا اس وزارت کی پیش کش نے یہ خدشہ بھی ان کے دلوں سے دور کر دیا کہ ان کے حقوق پر کوئی زد پڑے گی یا ان پر سختی و زیادتی ہو گی اس لئے کہ وزارت جو تکملۂ خلافت ہے ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وزارت کا عہدہ نہ حضرت ابوبکر کے عہد میں قائم ہو سکا اور نہ حضرت عمر کے طویل دور میں۔ اور جب عہدہ ہی نہیں ہے تو عہدہ پر تقرری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ حضرت عثمان

کے عہد حکومت میں وزارت کے لگ بھگ کاتب کا عہدہ تھا مگر ایک اموی کے ہوتے ہوئے ایک انصاری کو یہ اعزاز کیسے مل سکتا تھا۔

حضرت ابوبکر کی تقریر سے اوس نے جو اپنے حریف قبیلہ کی سیادت و امارت پر خوش نہ تھے اچھا تاثر لیا اور سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے اور اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی لیکن خزرج خاموش نہ رہے اور ان کے نمائندہ حباب ابن منذر نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اے گروہ انصار تم اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہو۔ یہ لوگ تمہارے زیر سایہ آباد ہیں کسی میں یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ تمہارے خلاف کچھ کہے یا تمہاری رائے کی خلاف ورزی کرے۔ تمہارے پاس عزت ہے، ثروت ہے، طاقت ہے، شجاعت ہے تم نہ گنتی میں ان سے کم ہو اور نہ تجربہ و جنگی مہارت میں لوگوں کی نظریں تم پر لگی ہوئی ہیں۔ آپس میں متحد رہو اگر تم میں اتفاق و یکجہتی باقی نہ رہی تو ناکام ہو جاؤ گے۔ رسول اللہ تمہارے شہر میں ہجرت کر کے آباد ہوئے تمہاری وجہ سے کھلے بندوں اللہ کی عبادت ہوئی اور عبادت گاہیں تعمیر ہوئیں تمہاری تلواروں سے قبائل عرب سرنگوں ہوئے اور اسلام کا بول بولا ہوا تم منصب خلافت کے غلط دعوے دار نہیں ہو۔ اگر یہ لوگ تمہارا حق تسلیم نہیں کرتے تو پھر ایسا ہو کہ ایک امیر ہمارا ہو اور ایک امیر اُن کا ہو"

حباب نے جس جوش و ولولہ سے تقریر کا آغاز کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی صورت میں مہاجرین کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور نہ اپنے عزم و استقلال میں فرق آنے دیں گے مگر ایسا نہ ہو سکا اور ایک امیر ان میں سے ہو کہاں تو وہ شورا شوری اور کہاں یہ بے نمکی۔ اس سے بجائے اس کے کہ انصار کے مقصد کو تقویت حاصل ہوتی فریق ثانی کو اس کی تردید کر کے اپنے موقف کو مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حضرت عمر نے فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے کہا: "یہ کہاں ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں دو حکمران ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس پر قطعاً رضا مند نہیں کہ تمہیں برسر اقتدار لائیں جب کہ نبی تم میں سے نہیں ہیں لیکن عرب کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حاکم و ولی امر اس گھرانے سے منتخب ہو جس گھرانے میں نبوت ہے لہذا جو ہمارے حق کا انکار کرے گا ہم اس واضح دلیل سے اسے خاموش کر دیں گے اور جو پیغمبرؐ کی سلطنت و امارت کے سلسلہ میں ہم سے ٹکرائے گا۔ وہ غلط کار گنہگار اور خود اپنے ہاتھوں تباہ ہونے والا ہے۔

حضرت عمر نے تقریر ختم کی تو حباب پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور جوش بھرے لہجہ میں انصار سے مخاطب ہو کر کہا: "اے گروہ انصار تم اپنی بات پر قائم رہو اور ان لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو یہ خلافت میں تمہارا کوئی حصہ رکھنا نہیں چاہتے۔ اگر یہ تمہارا مطالبہ تسلیم نہ کریں تو انہیں اپنے شہر سے نکال باہر کرو اور جسے چاہتے ہو اسے امیر منتخب کر لو۔ خدا کی قسم تم ان سے زیادہ خلافت کے حقدار ہو کیونکہ تمہاری تلواروں

سے دین پھیلا اور لوگ اسلام کی طرف جھکے۔ خدا کی قسم اب کسی نے میری بات کی تردید کی تو میں اپنی تلوار سے اس کی ناک توڑ دوں گا۔

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے بیانات کے مقابلہ میں حباب کی تقریر ذہنوں کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اگرچہ حباب انصار میں صاحب رائے سمجھے جاتے تھے مگر عوامی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے جس سوجھ بوجھ اور سیاسی شعور کی ضرورت ہوتی ہے اس کی جھلک ان کی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ بیشک بعض مواقع پر پُرجوش لب و لہجہ اور گرجتا برستا انداز تقریر کام دے جاتا ہے مگر جو چیز ایک وقت میں موثر و مفید ثابت ہو ضروری نہیں ہے کہ دوسرے موقع پر بھی نتیجہ خیز ثابت ہو۔ اس مقام پر ضرورت تھی کہ دورِ جاہلیت کی عصبیت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اسلامی فضا میں بات چیت کی جاتی اور تشدد آمیز دھمکیوں سے اجتناب برتا جاتا۔ چنانچہ اس طرز عمل سے خود انہوں نے اپنے موقف کو کمزور کیا اور لوگوں کے جذبات کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابو عبیدہ جو موقع و محل کی نزاکت کو سمجھ رہے تھے انہوں نے انصار کے دینی جذبات کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:۔ "اے گروہِ انصار تم نے ہماری نصرت کی ہمیں اپنے ہاں پناہ دی اب اپنا طور طریقہ نہ بدلو اور سابقہ روش پر برقرار رہو" اس نرم روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزرج کے لوگ بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ اور بشیر ابن سعد خزرج نے ہوا کا رُخ دیکھ کر کہا:۔ اے گروہ انصار اگرچہ ہمیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ ہم نے مشرکین سے جہاد کئے اور اسلام کے قبول کرنے میں سبقت کی مگر ہمارے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کے رسول کی اطاعت تھی یہ مناسب نہیں کہ ہم دین کو دنیوی سربلندی کا ذریعہ بنائیں اور حکومت و اقتدار کی فکر کریں۔ دین تو اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت تھی۔ پیغمبر اکرم قریش میں سے تھے لہذا ان کا قبیلہ ان کی نیابت کا زیادہ حقدار ہے خدا نہ کرے کہ میں ان سے جھگڑا کروں اور تم بھی اللہ سے ڈرو اور خواہ مخواہ ان سے نہ الجھو۔" بشیر کا یہ کہنا تھا کہ انصار کی یکجہتی درہم برہم ہو گئی عوام کا رُخ بدلنے لگا اور عوام کو بدلتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ ابھی ایک کے ساتھ ہیں کہ کسی نے کوئی شوشہ چھوڑا اور فوراً اس کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے یا ابھی ایک کے خلاف سرگرم عمل ہیں کہ کسی کی جذباتی تقریر سے متاثر ہو کر فوراً اس کے موافق ہو گئے۔ وہ ذہنی انقلاب جو اچانک اور ناگہانی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے عقل و شعور اور فکر و تدبیر کارفرما نہیں ہوتا۔ سقیفہ کے اندر بھی یہی صورت پیدا ہوئی انصار اس لئے جمع ہوئے تھے کہ اپنے قبیلہ کی ایک ممتاز فرد سعد ابن عبادہ کو امیر منتخب کریں اور ان میں ویسا ہی جوش و ولولہ تھا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے مگر بشیر ابن سعد کی تقریر ان کے جوش کو بہا لے گئی اور جو لوگ اس تحریک کو لے کر اٹھے تھے وہی اس تحریک کو کچلنے پر آمادہ ہو گئے جسے اب تک فریق مخالف سمجھا جا

تھا رائے عامہ کا رُخ ادھر مڑتا نظر آنے لگا۔

انصار کی کمزوری و بے تدبیری کے نتیجہ میں جب ان کے دعویٰ کی بنیادیں ہلنے لگیں تو مہاجرین کو موقع مل گیا کہ وہ ان کے وقتی تاثر سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ عمر ہیں اور یہ ابو عبیدہ ہیں ان میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو۔ یہ ایک ایسا طریق کار تھا جس سے عوام کو الجھاؤ میں تو ڈالا جاسکتا تھا مگر نتیجہ خیز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ اس موقع پر عوام کی ذہنی کشمکش کی وہی صورت ہوئی جو اس مسافر گم کردہ راہ کی ہوتی ہے جو دوراہے پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ادھر جائے یا اُدھر۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور ان دو میں سے ایک کو منتخب کرنے میں اُلجھ کر رہ گئے اگر حضرت ابوبکر ان دو میں سے ایک کی طرف اپنا رجحان ظاہر کر دیتے تو انتخاب میں کوئی دشواری نہ رہتی کیونکہ عوام ایسے موقعوں پر اس شخص کے اشارۂ چشم و ابرو کو دیکھا کرتے ہیں جس نے ان کی رائے کو متاثر کیا ہو۔ اور وہ آنکھ بند کر کے اُدھر چلے جاتے ہیں جدھر وہ لے جانا چاہتا ہے یا انہوں نے شروع ہی میں ایک کا نام تجویز کیا ہوتا یا ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تو بھی انتخابی منزل آسان ہو جاتی۔ مگر حضرت ابوبکر نے نام ہی ایک تجویز کیا نہ ان میں سے ایک کی طرف خصوصی رجحان ظاہر کیا اور نہ ابوعبیدہ حضرت عمر کی اور نہ حضرت عمر ابوعبیدہ کی بیعت کرتے نظر آئے۔ اس صورت میں ذہنی الجھاؤ ہونا ہی چاہیئے تھا اور یہ کوئی غیر متوقع نتیجہ نہ تھا بلکہ حضرت ابوبکر کی باریک بینی و دوررسی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس نتیجہ سے باخبر تھے اور جانتے بوجھتے ہوئے یہ صورت پیدا کی گئی تھی تاکہ لوگ اس مخمصے سے نکلنے کے لئے ان دونوں کو نظر انداز کر کے ادھر بڑھیں جدھر سے یہ تحریک ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے لوگوں کی اس متذبذبانہ کیفیت کو بھانپ کر حضرت ابوبکر سے کہا کہ آپ کا حق ہم دونوں سے فائق ہے۔ آپ ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کی بیعت کریں گے۔ حضرت ابوبکر نے بغیر کسی تردد و توقف کے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گویا ان دونوں کا نام تمہید یا رسمی پیش کش کے طور پر لیا گیا تھا اور دراصل مرکز اقتدار وہ خود تھے۔ حضرت عمر ابھی بیعت نہ کرنے پائے تھے کہ بشیر ابن سعد نے حضرت ابوبکر کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بیعت کر لی پھر حضرت عمر اور ابوعبیدہ نے بیعت کی اور پھر خزرج کے لوگ بیعت کے لئے بڑھے۔ اوس اگرچہ سعد ابن عبادہ کے طرفدار بن کر آئے تھے مگر دل سے وہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ خزرج کی کوئی فرد برسر اقتدار آئے۔ چنانچہ اوس کے نقیب اسید ابن حضیر نے خزرج کو بیعت کے لئے بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے قبیلہ والوں سے کہا۔

واللہ لئن ولیتھا الخزرج — خدا کی قسم اگر خزرج ایک دفعہ تم پر حکمران ہو

علیکم مرۃ لا زلت لھم علیکم بذلک الفضیلۃ ولاجعلوا لکم معکم نصیبا ابدا فقوموا فبایعوا ابابکر۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۵۸)	گئے تو انہیں ہمیشہ کے لئے تم پر فضیلت و برتری حاصل ہو جائے گی اور تمہیں اس امارت میں سے کبھی حصہ نہیں دیں گے۔ لہذا اٹھو اور ابوبکر کی بیعت کر لو۔

اسیر ابن حضیر کے کلمات سے صاف عیاں ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کی بیعت پر آمادہ ہوئے تو صرف اوس و خزرج کی باہمی چشمک اور رقابت کی بنا پر وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ خزرج میں سے کوئی خلیفہ ہو کہ ہمیشہ کے لئے اوس پر ان کی بالادستی قائم ہو جائے اس کے علاوہ خزرج کے برسر اقتدار آنے کی صورت میں انہیں حرماں نصیبی کے سوا کچھ نظر بھی نہ آ رہا تھا اور دوسری طرف وزارت انصار کے پائے نام ہو چکی تھی اور یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اوس کو آمادۂ بیعت کرنے کے صلہ میں وزارت انہیں مل جائے مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انصار کو معمولی عہدوں کے سلسلہ میں بھی ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا اور وزارت کا عہدہ تو سرے سے تھا ہی نہیں۔ اور حباب ابن منذر کی وہ بات سچ ثابت ہوئی جو انہوں نے انصار کو بیعت سے روکتے وقت کہی تھی کہ:۔ اے گروہ انصار میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بچے مہاجرزادوں کے دروازوں پر جھولی پھیلائے کھڑے ہیں اور انہیں کوئی پانی تک کو نہیں پوچھتا۔"

اس بیعت کے ہنگامہ میں حباب ابن منذر تلوار لے کر کھڑے ہو گئے مگر ان کے ہاتھ سے تلوار چھین کر انہیں بے دست و پا کر دیا گیا۔ سعد ابن عبادہ پیروں تلے روند ڈالے گئے۔ حضرت عمر کی بن آئی تھی۔ اور جو نرم لب و لہجہ شروع میں تھا۔ اب سیاسی خطرے کے ٹل جانے کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی تھی، چنانچہ نرم روی نے سخت گیری کی صورت اختیار کر لی اور سعد ابن عبادہ سے تلخ کلامی ہاتھا پائی اور داڑھی نوچنے نچوانے تک نوبت پہنچی اور حضرت عمر نے للکار کر کہا:۔

اقتلوہ قتلہ اللہ فانہ صاحب فتنۃ۔ (عقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۶۳)	اسے قتل کرو خدا اسے مارے یہ فتنہ پرداز ہے۔"

تاریخ طبری کے الفاظ یہ ہیں:۔

قتلہ اللہ انہ منافق۔ ج ۲۔ ص ۴۵۹	خدا اسے مارے یہ منافق ہے۔"

سعد ابن عبادہ جو انصار کی جلیل القدر فرد خزرج کے راس و رئیس اور افاضل صحابہ میں سے تھے۔ اُن کا جرم کیا تھا کہ انہیں گردن زنی فتنہ گر اور منافق قرار دیا گیا۔ اگر وہ خلافت کے امیدوار تھے تو دوسرے بھی تشکیل خلافت ہی کے لئے آئے تھے۔ اگر حضرت ابوبکر و حضرت عمر کا نظریہ یہ تھا کہ پیغمبرؐ کی تجہیز و تکفین سے پہلے خلافت

کا تصفیہ از بس ضروری ہے تاکہ مملکت کے نظم و نسق میں خلل نہ پڑے تو انصار کا اجتماع بھی تو اسی مقصد کی تکمیل کے لئے تھا اگر یہ اجتماع غیر آئینی اور غیر اسلامی تھا تو مہاجرین نے بھی تو اسی غیر آئینی و غیر اسلامی اجتماع کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انصار کا اجتماع غیر نمائندہ تھا کیونکہ اس میں مہاجرین شریک نہ تھے تو ان تین آدمیوں کو کس نے حق نمائندگی دیا تھا کہ ان کی شرکت سے یہ غیر نمائندہ اجتماع ہو گیا۔ اور پھر کیا بنی ہاشم کی شرکت کے بغیر اس اجتماع کو نمائندہ حیثیت دی جا سکتی ہے۔ جب کہ خاندانی اتحاد کو خلافت کا معیار قرار دیا گیا تھا اور بنی ہاشم ہی صحیح معنی میں پیغمبرؐ کے ہم قبیلہ و ہم خاندان تھے۔ بہر حال اگر اسلامی ضابطہ یہ ہے کہ امت کے ارباب حل و عقد جمع ہو کر امیر و سربراہ کا انتخاب کریں۔ تو سعد ابن عبادہ کے اقدام کو ضابطہ اسلام کے ماتحت صحیح ماننا ناگزیر ہو گا اور انہیں فتنہ گر اور منافق کہنے کا کوئی جواز نہ ہو گا۔ اور اگر یہ اسلامی ضابطہ ہی نہیں ہے تو اس ضابطہ کے ماتحت جو کارروائی ہو گی غیر اسلامی متصور ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سعد ابن عبادہ کا یہ جرم نہ تھا کہ وہ خلافت کے اُمیدوار تھے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ اجتماع کیا تھا بلکہ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سیاسی جوڑ توڑ کا مقابلہ نہ کر سکے اور شکست کھا گئے۔ اگر وہ کامیاب ہو کر برسر اقتدار آ جاتے تو نہ فتنہ پرداز رہتے اور نہ منافق بلکہ امن کے دیوتا اور کشتیٔ اسلام کے ناخدا کہلاتے۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکر کی بیعت ہنگامی جذبات کے نتیجہ میں دفعۃً ظہور میں آئی۔ ایک طرف اوس و خزرج کی چپقلش اور دوسری طرف دو خزرجیوں کے باہمی حسد و رقابت نے مہاجرین کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ بیعت کے لئے کسی کو آگے لائیں۔ بشیر ابن سعد نے ابن عبادہ کی امارت کا راستہ مسدود کرنے کے لئے بیعت میں پہل کی بشیر کی دیکھا دیکھی خزرج آگے بڑھے اور اوس نے بھی اس خیال سے کہ خزرج سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اس ہڑبونگ میں نہ مشورہ کرنے کی نوبت آئی نہ سنجیدگی سے سوچا سمجھا گیا اور اچانک بیعت کر لی گئی۔ حضرت عمر بھی اسے ہنگامی حالات ہی کی پیداوار سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔

ان بیعۃ ابی بکر کانت فلتۃً لکن وقی اللّٰہ شرھا فمن عاد الیٰ مثلھا فاقتلوہ۔	ابو بکر کی بیعت فلتۃً یعنی بے سوچے سمجھے ناگہانی طور پر ہوئی پھر بھی اللہ نے اس کے شر سے بچائے رکھا۔ آئندہ اگر کسی نے یہ طریق کار اختیار کیا تو اسے قتل کر دینا۔

(صواعق محرقہ۔ ص۳۶)

علامہ زمخشری نے فلتۃً کے معنی بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:۔

فما قلدھا ابو بکر الا انتزاعاً	حضرت ابو بکر نے خلافت کا طوق اس طرح اپنے

من الایدی واختلاساً من المخالب ومثل ھذہ البیعۃ جدیرۃ بان تکون مھیجۃً للشر والفتنہ فعصم اللہ من ذلک ووقی۔ (فائق۔ ج ۱۔ ص ۱۳۶)

گلے میں ڈالا جس طرح چھینا جھپٹی کرکے دوسروں کے ہاتھوں سے کوئی چیز چھین لی جاتی ہے یا جھپٹا مار کر پنجوں سے اچک لی جاتی ہے۔ لامحالہ ایسی بیعت فتنہ زا و شر انگیز ہو سکتی تھی مگر اللہ نے اس کے شر و مفاسد سے بچائے رکھا۔"

حضرت عمر باوجودیکہ اس طریق کار کے ایک طرح سے بانی تھے مگر یہ طریقہ ہمیشہ ان کی نگاہوں میں کھٹکتا رہا اور وہ اس کے دہرانے پر قتل کی سزا بھی تجویز کر گئے کیا ان کے نزدیک یہ طریق کار شرعی حدود کے اندر نہ تھا۔ اگر شرعی حدود کے اندر اور ضابطۂ اسلام کے مطابق تھا تو اسے دہرانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں قتل کی سزا کیوں؟ اور اگر شرعی حدود کے باہر تھا تو اس غلط اور غیر شرعی طریق کار سے جو انتخاب عمل میں آئے گا یا اس انتخاب پر جو انتخاب مترتب ہوگا وہ کیونکر صحیح قرار پائے گا۔

انصار کی نسبت سے تو یہ بیعت ناگہانی ہو سکتی ہے اس لئے کہ انہیں یہ تصور بھی نہ تھا کہ مہاجرین ان کے خفیہ اجلاس میں یوں درانہ چلے آئیں گے اور سعد ابن عبادہ کے بجائے حضرت ابوبکر منتخب ہو جائیں گے۔ مگر حضرت عمر کے نزدیک یہ بیعت بے سوچی سمجھی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ واقعات اس کے شاہد ہیں کہ یہ انتخاب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت زیر عمل آیا تھا۔ چنانچہ حجرۂ رسول سے حضرت ابوبکر کو چپکے سے بلوانا پیغمبرؐ کے قریبی عزیزوں تک سے اسے پردۂ اخفا میں رکھنا، اچانک سقیفہ میں پہنچ جانا اور رائے عامہ کو ہموار کرنا کسی طے شدہ قرارداد کے بغیر نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تمام احتیاطی تدبیریں کسی طے شدہ مقصد کی تکمیل ہی کے لئے ہو سکتی ہیں۔ اگر حضرت عمر کے ذہن میں حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے کے متعلق کوئی تصور قائم نہ ہوا تھا تو کس بنیاد پر انہیں خلیفۃ النبیؐ کی لفظوں سے یاد کیا تھا جب کہ نہ ابھی بیعت ہوئی تھی اور نہ وہ خلیفہ منتخب ہوئے تھے یہ واقعہ ہے کہ سقیفہ میں انصار کے اجتماع کی ابھی بنیاد بھی نہ پڑی تھی کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا مسئلہ طے کر لیا گیا تھا۔ اور نہ صرف حضرت ابوبکر کی خلافت طے شدہ تھی بلکہ ان کے بعد حضرت عمر اور ابوعبیدہ کی خلافت بھی طے پا چکی تھی۔ چنانچہ اس طے شدہ قرارداد کے ماتحت حضرت ابوبکر حضرت عمر کو نامزد کر جاتے ہیں۔ اور اگر ابوعبیدہ حضرت عمر کی زندگی میں وفات نہ پا جاتے تو تیسرے درجہ پر وہ خلیفہ قرار پاتے۔ چنانچہ حضرت عمر کا قول ہے۔

ان ادرکنی اجلی وابوعبیدہ حی استخلفتہ۔ (تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۔ ص ۲)

اگر میرے آخر وقت تک ابوعبیدہ زندہ رہے۔ تو میں انہیں خلیفہ مقرر کر دوں گا۔"

حضرت ابوبکر کے بعد یہ دونوں حضرات خلافت کے لئے نامزد تو تھے ہی ان کے دور میں بھی شریک اقتدار رہے چنانچہ اس دور میں دو ہی کلیدی عہدے تھے جن پر یہ دونوں فائز ہوئے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے۔

لما ولی ابوبکر قال لہ ابوعبیدۃ انا اکفیک المال وقال لہ عمر انا اکفیک القضاء۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲ صفحہ ۲۸۹)	جب حضرت ابوبکر حکمران ہوئے تو ابوعبیدہ نے کہا کہ شعبۂ مالیات کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ اور حضرت عمر نے کہا کہ محکمۂ قضا (عدلیہ) کے لئے میں کافی ہوں"

ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے۔

اول من ولی شیئا من امور المسلمین عمر ابن الخطاب ولاہ ابوبکر القضاء کان اول قاض فی الاسلام۔ (استیعاب۔ ج۲ صفحہ ۱۱)	جو شخص سلطنت اسلامی کے کلیدی عہدوں میں سے سب سے پہلے کسی عہدہ پر فائز ہوا وہ عمر ابن خطاب تھے جنہیں ابوبکر نے محکمہ قضا سپرد کیا تھا چنانچہ وہ اسلام میں پہلے قاضی تھے"

اس بیعت کو اس اعتبار سے فلتۃً کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے باوجودیکہ حضرت ابوبکر کا نام پہلے سے تجویز کر رکھا تھا اور میدان ہموار کرنے کے لئے ضروری تدبیریں بھی بروئے کار لا رہے تھے۔ مگر آخر تک انہوں نے حضرت ابوبکر کا نام صیغۂ راز میں رکھا اور جب یہ دیکھا کہ ہوا ساز گار ہے اور انصار کسی ایک کی بیعت کر کے اپنے حریف کو شکست دینا چاہتے ہیں تو انہوں نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے حضرت ابوبکر کا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لوگ تو بیعت کرنے پر آمادہ تھے ہی فوراً ٹوٹ پڑے۔ اور یہ بیعت فلتۃً ظہور میں آگئی۔

حضرت عمر کا یہ انتہائی سیاسی تدبر تھا کہ انہوں نے پوری احتیاط ملحوظ رکھی کہ شریک راز افراد کے علاوہ کسی کے کانوں میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے۔ اگر یہ راز فاش ہو جاتا تو اندیشہ تھا کہ کچھ لوگ مزاحم ہوتے یا بنی ہاشم میں سے کسی کو اطلاع ہو جاتی تو یہ سوچا سمجھا منصوبہ ناکام ہو جاتا اس لئے کہ مہاجرین نے انصار کے مجمع میں قرابتِ رسول کو اساس قرار دے کر اپنا حق ثابت کرنا تھا اگر بنی ہاشم میں سے کوئی پہنچ جاتا تو اس دلیل کی افادیت ختم ہو جاتی اس لئے کہ بنی تیم ہوں یا بنی عدی، بنی ہاشم کے مقابلہ میں قرابت دارانِ رسولؐ کہلوانے کے مستحق نہ تھے یا حضرت علی وہاں پہنچ جاتے تو کسی اور کے منتخب ہونے کی نوبت نہ آتی کیونکہ خاندانی قرابت اسلامی سبقت ہجرت جہاد علمی برتری اور عملی خدمات کے لحاظ سے پہلی نظر انہی پر پڑتی۔ چنانچہ منذر ابن ارقم انصار کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ان فیھم رجلا لو طلب ھذا الامر لم ینازعہ فیہ احد یعنی علی ابن ابی طالب۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲ ص ۱۰۳)	مہاجرین میں ایک علی ابن ابی طالب ایسے تھے کہ اگر وہ خلافت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو انصار کی ایک فرد بھی ان کے خلاف نہ جاتی۔

جمہوری نظریۂ خلافت کی رو سے اس ناگہانی طور پر ظہور پذیر ہونے والی خلافت کو جمہور کا انتخاب نہیں کہا جاسکتا۔ جمہوری انتخاب کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسے عوام مسلمین کے سامنے پیش کیا جاتا اور سب کو اظہار رائے کا موقع دیا جاتا مگر ہوتا یہ ہے کہ پہلے تو خلافت کو مہاجرین میں محدود کر دیا جاتا ہے اور پھر مہاجرین میں سے ان تین افراد میں جو اس وقت سقیفہ میں موجود تھے۔ جمہوریت اور رائے عامہ کے احترام کا اقتضا یہ تھا کہ جب ابتدا میں اکثریت سعد ابن عبادہ کے ساتھ تھی اور انصار ان کے حق میں رائے دے چکے تھے تو اکثریت کی ہمنوائی کی جاتی اور یہ تاثر دیا جاتا کہ اسلام خلافت کے سلسلہ میں قومی و نسلی امتیاز گوارا نہیں کرتا اور نہ خلافت کو کسی خاص قبیلہ سے وابستہ کر کے ایک طرح سے موروثی قرار دیتا ہے بلکہ ہر شخص کو آگے بڑھنے کا حق دیتا ہے خواہ انصاری ہو یا مہاجر، قرشی ہو یا غیر قرشی۔ جب خلافت بنی تیم و بنی عدی کو مل سکتی ہے تو انصار کو اس سے بے تعلق کر دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو رسول اللہ کے قبیلہ و خاندان سے ہو۔ چنانچہ سقیفہ میں سارا زور اسی پر دیا گیا تو بنی ہاشم کو بے خبر رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔ جب کہ وہ نسبی اعتبار سے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ساتویں اور نویں پشت پر رسول سے ملتے ہیں قریب تر تھے۔ امیرالمومنین نے اسی موقع پر فرمایا تھا۔

استدلوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ۔ (نہج البلاغہ)	انہوں نے شجرہ پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی اور اس کے پھلوں کو ضائع کر دیا۔"

سقیفہ بنی ساعدہ میں مدمقابل انصار تھے اس لئے یہ دلیل چل گئی کہ "عرب خلافت کو وہیں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں نبوت ہے۔" اور اگر مقابلہ میں بنی ہاشم ہوتے تو سیاسی کاربراری کے لئے وہ کہا جاتا جو حضرت عمر نے ایک موقع پر ابن عباس سے کہا تھا:۔

کرھوا ان یجمعوا لکم النبوۃ والخلافۃ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۳۴)	لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ نبوت و خلافت دونوں سمٹ کر تمہارے خاندان میں جمع ہو جائیں۔"

بیعت اور جبر و تشدد

حضرت ابو بکر حضرت عمر اور ابو عبیدہ کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور وہ اپنے حق میں خلافت کا فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب یہ مہم سر ہو گئی تو سقیفہ سے نکل کر مسجد کی طرف چل دیئے کچھ لوگ بھی ساتھ ہو گئے اور ایسے موقع پر لوگ اقتدار سے متاثر ہو کر یا شاہی قرب حاصل کرنے کے لئے ساتھ ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ راستے میں جو لوگ نظر آتے انہیں بلا کر ان کے ہاتھوں کو حضرت ابو بکر کے ہاتھوں سے مس کرتے اور یوں بیعت لیتے اور اعلانِ خلافت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ براء ابن عازب کہتے ہیں:۔

لا یمرون باحد الا خبطوہ و قدموہ فمدوا یدہ فمسحوھا علی ید ابی بکر یبایعہ شاء ذلک او ابی۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۷۴)	جس کسی کے پاس سے ہو کر گزرتے اسے کھینچ کھانچ کر آگے لاتے اور بیعت کے لئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ابو بکر کے ہاتھ سے مس کرتے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے"

جب مسجد میں وارد ہوئے تو چند کارندوں کو ادھر اُدھر دوڑایا گیا کہ وہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر بیعت کے لئے لائیں۔ چنانچہ لوگوں کو جمع کر کے لایا گیا اور مسجد نبوی میں جہاں پاس ہی ایک حجرہ میں پیغمبرؐ کو غسل و کفن دیا جا رہا تھا تکبیروں کی گونج میں بیعت ہونے لگی۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

اتی بابی بکر المسجد فبایعوہ وسمع العباس وعلی التکبیر فی المسجد ولم یفرغوا عن غسل رسول اللہ۔	حضرت ابو بکر کو مسجد میں لایا گیا اور لوگوں نے ان کی بیعت کی عباس اور علی نے مسجد سے تکبیر کی آوازیں سنیں اور ابھی وہ پیغمبر کے غسل سے فارغ نہ ہوئے تھے"

(انساب الاشراف ج ۱ ص ۵۸۲)

یہ دنیا کی بے وفائی و سرد مہری کا انتہائی عبرت انگیز مرقع ہے کہ ایک طرف شہنشاہ دو عالم کی میت رکھی ہے اور ان کے عزیز و اقارب باہر کی دنیا سے بے خبر تجہیز و تکفین میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف حکمران طبقہ کے گرد بیعت کرنے والوں کا جمگھٹا ہے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور نعروں کی گونج میں بیعت کا سلسلہ جاری ہے ابھی کچھ دیر پہلے یہی لوگ مسجد میں سوگواروں کی صورت میں جمع تھے مگر اب نہ کسی کی آنکھ اشکبار ہے اور نہ کسی کے چہرے پر غم کے آثار گویا کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس سے عوام کی ذہنیت

کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ اقتدار کی قوت انہیں کتنی جلدی متاثر و مسحور کرتی ہے کہ عظیم سے عظیم حادثہ کے اثرات بھی مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فوراً اپنے جذبات کو حکومت کی رضا جوئی سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ یہ انتخاب کیسے ہُوا اور کیوں ہوا رائے عامہ کے استصواب سے ہوا یا ارباب حل و عقد کی صوابدید سے۔ اگر استصواب رائے سے ہُوا ہے تو انہیں اظہار رائے کا موقع کب دیا گیا۔ اور اہل حل و عقد کا فیصلہ ہے تو کیا مہاجرین میں صرف تین آدمی اہل حل و عقد تھے اور حضرت علی، عباس ابن عبد المطلب، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد ابن اسود، عمار ابن یاسر، زبیر ابن عوام خالد ابن سعید ایسے عمائدِ دین و اکابر ملت اور بنی ہاشم و اعزہ رسولؐ ان میں شامل کئے جانے کے قابل نہ تھے۔ غرض لوگ بے سوچے سمجھے ہوا کے رُخ پر اڑتے اور سیلاب کے بہاؤ پر بہتے چلے گئے۔ اگر کسی نے ذرا نفرت و بیزاری کا اظہار کیا یا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو ڈرا دھمکا کر یا لالچ دلا کر اسے خاموش کر دیا گیا اور جن لوگوں کی پشت پر قوت و طاقت تھی انہیں وقتی طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ چنانچہ سعد ابن عبادہ سے حکومت کے استحکام سے پہلے الجھنا اور بیعت کا مطالبہ کرنا خلاف مصلحت سمجھا گیا اور جب حضرت عثمان عبد الرحمٰن ابن عوف سعد ابن ابی وقاص بنی امیہ و بنی زہرہ کی بیعت سے حکومت کی بنیادوں میں جماؤ آ گیا تو انہیں بیعت کا پیغام بھجوا دیا گیا۔ انہوں نے اس پیغام کے جواب میں کہلا بھیجا:۔

لا واللہ لا ابایع حتی ارمیکم بما فی کنانتی واقاتلکم بمن تبعنی من قومی وعشیرتی۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۳، صفحہ ۶۱۶)	خدا کی قسم میں اس وقت تک بیعت نہیں کروں گا جب تک اپنے ترکش کے تیر تم پر چلا نہ لوں اور اپنے قوم و قبیلہ کے لوگوں کو لے کر تم سے جنگ نہ کر لوں۔

حضرت ابوبکر یہ جواب سن کر مصلحتاً خاموش ہو گئے مگر حضرت عمر نے برافروختہ ہو کر کہا کہ ہم اس سے بیعت لئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس پر بشیر ابن سعد نے کہا کہ اگر انہوں نے بیعت سے انکار کر دیا ہے۔ تو قتل ہونا گوارا کر لیں گے مگر بیعت نہیں کریں گے۔ اور اگر وہ قتل کئے گئے تو ان کا خاندان بھی ساتھ قتل ہو گا اور ان کا خاندان اس وقت تک قتل نہ ہو گا جب تک قبیلۂ خزرج قتل نہ ہو جائے اور خزرج اس وقت تک قتل نہ ہو گا۔ جب تک قبیلہ اوس موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے۔ دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ان سے کچھ نہ کہا سنا گیا۔ حضرت ابوبکر کے دور میں وہ مدینہ ہی میں رہے مگر حکمران جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھا نہ ان کے ساتھ نمازوں میں

شریک ہوتے نہ ان کے ساتھ اعمالِ حج بجالاتے اور نہ ان کی کسی مجلس میں شامل ہوتے۔ جب حضرت عمر برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے ایک دفعہ سعد کو راستے میں دیکھ کر کہا کہ تم وہی ہو نہ۔ کہا کہ ہاں میں وہی ہوں اور میرا موقف بھی وہی ہے۔ میں تمہارے قرب سے اب بھی اتنا ہی بیزار ہوں جتنا پہلے تھا۔ کہا کہ پھر مدینہ چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے۔ سعد خطرہ تو محسوس کر ہی رہے تھے۔ حضرت عمر کے تیوروں کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ کسی وقت بھی انہیں موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ اس خدشہ کے پیشِ نظر وہ مدینہ چھوڑ کر شام چلے گئے اور چند دنوں کے بعد مقامِ حوران میں کسی کے تیروں کا نشانہ بن گئے۔ ابن عبدربہ الاندلسی تحریر کرتے ہیں:۔

بعث عمر رجلا الی الشام فقال ادعه الی البیعة واحمل له بکل ما قدرت علیه فان ابی فاستعن الله علیه فقدم الرجل الشام فلقیه بحوران فی حائط فدعاه الی البیعة فقال لا ابایع قرشیا ابدا قال فانی اقاتلك قال وان قاتلتنی قال افخارج انت مما دخلت فیه الامة قال اما من البیعة فانا خارج فرماه بسهم فقتله۔	حضرت عمر نے ایک شخص کو شام روانہ کیا اور اسے کہا کہ وہ سعد سے بیعت کا مطالبہ کرے اور اس سلسلہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے اور اگر وہ انکار کریں تو اُن کے خلاف اللہ سے مدد چاہے۔ وہ شخص شام پہنچا اور مقامِ حوران میں ایک چاردیواری کے اندر سعد سے ملا اور انہیں بیعت کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ میں کسی قرشی کی کبھی بیعت نہیں کروں گا۔ اس شخص نے کہا کہ میں تم سے جنگ کروں گا۔ کہا کہ خواہ جنگ کرو۔ کہا کہ تم اس چیز سے باہر رہنا چاہتے ہو۔ جس میں امت داخل ہو چکی ہے۔ کہا کہ میں بیعت سے باہر رہنا چاہتا ہوں۔ اس شخص نے تیر مارا اور انہیں قتل کر دیا"

(عقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۶۵)

یہ شخص محمد ابن مسلمہ یا مغیرہ ابن شعبہ بتایا جاتا ہے مگر مشہور یہ کر دیا گیا کہ انہیں کسی جن نے تیر مار کر ہلاک کر دیا اور ان کے مرنے پر یہ شعر پڑھا:۔

نحن قتلنا سید الخزرج سعد ابن عبادہ ۔۔۔ رمیناہ بسهم فلم یخط فوادہ

"ہم نے سردار خزرج سعد ابن عبادہ کو قتل کر دیا اور اس پر تیر چلایا جو اس کے دل میں پیوست ہو گیا"

دورِ اوّل میں سعد ابن عبادہ کو نہ بیعت پر مجبور کیا گیا اور نہ ان پر سختی روا رکھی گئی لیکن کار پردازان

خلافت نے حضرت علی سے جلد از جلد بیعت حاصل کرنے کی کاروائی شروع کر دی اور جبر و تشدد اور ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ آپ دنیا کی نیرنگی اور زمانہ کے انقلاب سے افسردہ خاطر گھر میں بیٹھے تھے کہ حکومت کی طرف سے بیعت کا پیغام آیا۔ آپ نے اور آپ کے ساتھ ان تمام افراد نے جو گھر کے اندر موجود تھے بیعت سے انکار کر دیا۔ جس پر حضرت عمر آگ بگولا ہو گئے اور گھر کو پھونک دینے پر اتر آئے۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

ان ابا بکر ارسل الی علی یرید البیعة فلم یبایع فجاء عمر و معه فتیلة فتلقته فاطمة علی الباب فقالت یا ابن الخطاب اتراك محرقا علی بابی قال نعم۔

حضرت ابو بکر نے حضرت علی کو بیعت کے لئے پیغام بھجوایا مگر حضرت علی نے بیعت نہ کی جس پر حضرت عمر جلتی ہوئی آگ لے کر آئے۔ حضرت فاطمہؑ نے عمر کو دیکھا تو کہا اے خطاب کے بیٹے کیا تم دروازے کو مجھ سمیت جلا دو گے کہا ہاں۔"

(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۵۸۶)

زبیر ابن عوام بھی اس گھر کے اندر موجود تھے اگرچہ وہ حضرت ابو بکر کے داماد تھے مگر اپنی والدہ صفیہ ابن عبد المطلب کی طرف سے بنی ہاشم سے بھی عزیزداری رکھتے تھے انہوں نے یہ صورت دیکھی تو تلوار سونت کر مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے مگر سلمہ ابن اشیم نے تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی اور انہیں نہتا کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ مورخ طبری تحریر کرتے ہیں:۔

اتی عمر ابن الخطاب منزل علی وفیه طلحة والزبیر ورجال من المهاجرین فقال واللہ لاحرقن علیکم او لتخرجن الی البیعه فخرج الیه الزبیر مصلتا بالسیف فعثر فسقط السیف من یده فوثبوا علیه فاخذوه۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۴۳)

عمر ابن خطاب حضرت علی کے گھر پر آئے گھر میں طلحہ زبیر اور چند مہاجرین تھے حضرت عمر نے کہا کہ بیعت کے لئے باہر نکلو۔ ورنہ خدا کی قسم میں تم سب کو آگ لگا کر پھونک دوں گا۔ زبیر نے تلوار کھینچ لی اور باہر نکل آئے مگر ٹھوکر کھائی اور ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں گرفتار کر لیا۔"

حضرت عمر اور ان کے ہمراہی حضرت علی کو بھی کشاں کشاں حضرت ابو بکر کے پاس بیعت کے لئے لے آئے۔ آپ نے بیعت کے مطالبہ پر احتجاج کرتے ہوئے فرمایا:۔

انا احق بهذا الامر منکم لا ابایعکم و انتم اولی بالبیعة لی اخذتم هذا الامر من الانصار واحتججتم علیهم بالقرابة من النبی و تاخذونه منا اهل البیت غصبا الستم زعمتم للانصار منکم اولی بهذا الامر منهم فاعطوکم المقادة وسلموا الیکم الامارة وانا احتج علیکم بمثل ما احتججتم به علی الانصار نحن اولی برسول اللہ حیا و میتا فانصفونا ان کنتم تؤمنون الا فبؤوا بالظلم وانتم تعلمون۔ (الامامة والسیاسة۔ ج ۱، ص۱۱)	میں تم لوگوں سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں۔ میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا بلکہ تمہیں میری بیعت کرنا چاہیئے تم نے انصار سے خلافت لی اور ان کے مقابلہ میں دلیل یہ دی کہ تمہیں نبی سے قرابت ہے اور اب تم زبردستی اہل بیت سے خلافت چھیننا چاہتے ہو کیا تم نے انصار کے مقابلہ میں دعویٰ نہیں کیا تھا کہ تم خلافت کے ان سے زیادہ حقدار ہو جس پر انہوں نے قیادت و امارت تمہارے سپرد کردی جس دلیل سے تم نے انصار کے مقابلہ میں اپنا حق ثابت کیا تھا اسی دلیل سے میں تمہارے مقابلہ میں اپنا حق ثابت کرتا ہوں ہم رسول اللہ سے ان کی زندگی و موت میں زیادہ خصوصیت رکھتے ہیں اگر تم ایمان لائے ہو تو ہم سے انصاف کرو ورنہ تم بے خبر نہیں ہو کہ ظلم کے مرتکب ہو گے۔"

حضرت ابوبکر چپ سادھے بیٹھے رہے۔ مگر حضرت عمر نے کہا کہ جب تک تم بیعت نہیں کرو گے تمہیں چھوڑا نہیں جائے گا۔ فرمایا خدا کی قسم نہ میں تمہاری بات کان پر دھروں گا اور نہ بیعت کروں گا۔ پھر رازِ درونِ پردہ کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

احلب حلبا لک شطرہ واللہ ماحرصک علی امارتہ الیوم الا لیوثرک غدا۔ (انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص۵۸۸)	خلافت کا دودھ دوہ لو اس میں تمہارا بھی برابر کا حصہ ہے خدا کی قسم تم آج ابوبکر کی خلافت پر اس لئے جان دیئے جا رہے ہو تاکہ کل وہ خلافت تمہیں دے جائیں۔"

امیرالمومنین کے انکار بیعت پر ایذا و اہانت کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا گیا آگ لگانے کا سامان کیا گیا گلے میں رسی ڈالی گئی اور قتل تک کی دھمکیاں دی گئیں یہ ایسا متشددانہ طرز عمل تھا کہ معاویہ ابن ابی سفیان ابوبکر کے فرزند محمد پر طنز کئے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں ان کے خط کے جواب میں تحریر کیا:۔

كان ابوك و فاروقه اول من ابتزه حقه وخالفه على امره على ذلك اتفقا واتسقا ثم انهما دعواه الى بيعتهما فابطاء و تلكا عليهما فهمابه الهموم وارادا به العظيم۔

جنہوں نے سب سے پہلے علی کا حق چھینا اور خلافت کے سلسلہ میں ان کی مخالفت پر ایکا کیا وہ تمہارے باپ (ابوبکر) اور فاروق تھے انہوں نے علی سے بیعت کا مطالبہ کیا مگر علی نے بیعت میں توقف کیا اور ٹال دیا جس پر ان دونوں نے ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑنے کا تہیہ کر لیا"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص۶۰)

اس بیعت کے سلسلہ میں تشدد کی جو صورت روا رکھی گئی وہ سراسر غیر آئینی اور ناجائز تھی اس لئے کہ کسی آئین میں اس کی اجازت نہیں ہے کہ کسی کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا جائے اور جبر و تشدد کے ذرائع کام میں لاکر بیعت لی جائے اگر وہ لوگ یہ دیکھتے کہ حضرت علی پیغمبرؐ کے زمانہ سے کسی جماعت کے قیام کی تیاری کر رہے ہیں اور اب اس جماعت کے تعاون سے متوازی حکومت قائم کر کے ان کے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا چاہتے ہیں یا شورش و ہنگامہ کھڑا کر کے امن عامہ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اس تشدد کا سیاسی جواز ہو سکتا تھا اور جب نہ ایسی کوئی صورت تھی اور نہ ٹکراؤ کے کوئی آثار تھے تو پھر بیعت پر اتنا اصرار کیوں ممکن ہے کہ اس میں یہ مصلحت کارفرما رہی ہو کہ اس طرح بیعت لے کر اپنے موقف اور طریق کار کے حق بجانب ہونے کا ثبوت مہیا کریں تو اس طرح کی جبری بیعت کو بیعت ہی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے "جمہوری" خلافت کی صحت پر سند لائی جا سکتی۔

حضرت علی کا انکار جذبات کے زیر اثر نہ تھا بلکہ اصول کے ماتحت تھا۔ اگر تشدد آخری حد تک بھی پہنچ جاتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جمہوریت کے نام پر قائم کی ہوئی حکومت کی بیعت کر کے ایک ایسے اصول کو تسلیم کر لیتے جس کی کوئی شرعی سند ہی نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے پورے صبر و ضبط کے ساتھ ان تمام شدائد کو برداشت کیا مگر نہ جمہوری خلافت کو مانا اور نہ جمہور کے حق انتخاب کو اس کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جس اصول کی بنا پر آپ نے بیعت سے انکار کیا تھا اس اصول سے انحراف کر کے سپر انداز ہو جائیں گے اور بیعت کر کے اپنے سابقہ قول و عمل کی تردید کریں گے۔

امیرالمومنین کا مدبرانہ سکوت

امیرالمومنین نے جمہوری خلافت کے خلاف علانیہ احتجاج کیا اور اپنے حق کی فوقیت اسی دلیل سے ثابت کی جس دلیل سے برسراقتدار طبقہ نے انصار کو قائل کیا تھا۔ یہ احتجاج دراصل اس نظام سیاست کے خلاف تھا جس کے تحت انتخابی حکومت کو خلافت کا اور منتخب حکمران کو خلیفۂ رسول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس میں نہ حکومت کی ہوس کارفرما تھی اور نہ اقتدار کی خواہش مضمر تھی اگر امیرالمومنین کو حکومت و اقتدار کی ہوس ہوتی تو ان تمام حربوں کو کام میں لاتے جو سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں اور دستِ تعاون بڑھانے والوں کا تعاون حاصل کر کے حکومتِ وقت سے ٹکر لیتے اور اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کرتے مگر آپ نے اس سلسلہ کی ہر کارروائی کو نظر انداز کر دیا اور موقف سے نہ سرمو انحراف کیا اور نہ اپنا زاویۂ نظر بدلا۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جب حضرت ابوبکر کا انتخاب عمل میں لایا جا رہا تھا تو اموی سردار ابوسفیان مدینہ میں موجود نہ تھا۔ آنحضرت نے اپنی زندگی میں اسے مامور کر کے مدینہ سے باہر بھیج دیا تھا۔ جب وہ رحلت پیغمبرؐ کے بعد پلٹ کر مدینہ آیا اور آنحضرت کے انتقال اور حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے کی خبر سنی تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور ایک ہنگامہ سا کھڑا کر دیا۔ بھاگا بھاگ عباس ابن عبدالمطلب کے ہاں گیا اور اُن سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت علی کے پاس آیا اور چاہا کہ انہیں اپنے قبیلہ کے تعاون کا یقین دلا کر حکومت کے خلاف میدان میں لا کھڑا کرے۔ چنانچہ اس نے پُراعتماد لہجہ میں کہا:۔

ما بال ھذا الامر فی اقل حی من	ایسا کیوں ہوا کہ خلافت قریش کے ایک پست ترین
قریش واللہ لئن شئت لاملانھا	خاندان میں چلی گئی اگر آپ چاہیں تو میں خدا کی قسم
علیہ خیلا و رجالا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲ ص ۴۴۹)	مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں۔"

ایک عام انسان کے لئے جذبات کے دباؤ سے آزاد رہنا بہت مشکل ہوتا ہے اس سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس مرحلہ پر تعاون پیش کرنے والے کے اصل مقصد کو سمجھتے ہوئے بھی نظر انداز کر دے گا۔ یا خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اسے ہمدردی و خیر خواہی کا نتیجہ سمجھ لے گا اور عواقب و نتائج سے آنکھیں بند کر کے وقتی امداد کے سہارے اٹھ کھڑا ہو گا مگر امیرالمومنین نہ جذبات کے آگے سپرانداز ہو سکتے تھے اور نہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر انہیں فریب دیا جا سکتا تھا۔ آپ نے اپنی خداداد فراست سے فوراً بھانپ لیا کہ

اس پیشکش میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کو جنگ میں اُلجھا کر اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی ایک سازش ہے۔ آپ نے اس پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے اسے ڈانٹ کر جواب دیا:۔

واللہ ما اردت بھذا الا الفتنة وانك واللہ طالما بغيت الاسلام شرا لاحاجة لنا فی نصیحتك۔	خدا کی قسم تمہارا مقصد صرف فتنہ انگیزی ہے تم نے ہمیشہ اسلام کی بدخواہی کی ہے مجھے تمہاری ہمدردی و نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۴۹)

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ابوسفیان کو حضرت ابوبکر سے کیا کد تھی کہ آتے ہی اُن کے خلاف سرگرم عمل ہو گیا حالانکہ ان دونوں کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار چلے آرہے تھے اور حضرت ابوبکر اس کے زمانۂ کفر میں بھی اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند صحابہ جن میں سلمان صہیب اور بلال بھی شامل تھے ایک مقام پر بیٹھے تھے کہ ادھر سے ابوسفیان کا گزر ہوا انہوں نے اسے دیکھ کر کہا کہ اس دشمن خدا کو اللہ کی تلواروں نے ابھی کیفر کردار تک نہیں پہنچایا۔ اس پر حضرت ابوبکر بگڑ گئے اور کہا کہ تم ایک بزرگ قریش و سردار قوم کے بارے میں ایسا کہتے ہو پھر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان لوگوں کے الفاظ جو ابوسفیان کے بارے میں تھے نقل کئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

لعلك اغضبتهم ان كنت اغضبتهم لقد اغضبت ربك۔	شاید تم نے ان لوگوں کو ناراض کیا ہے اگر تم نے انہیں غصہ دلایا ہے تو یاد رکھو کہ تم نے اپنے پروردگار کو غضب ناک کیا ہے۔"

(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۴۸۹)

حضرت ابوبکر نے پیغمبر کی زبان سے یہ کلمات سنے تو پلٹ کر ان لوگوں سے کہا کہ تمہیں میری بات بُری تو نہیں معلوم ہوئی انہوں نے اتنا کہا کہ اللہ تمہیں بخشے اور خاموش ہو گئے۔

یہ واقعہ ابوسفیان کے زمانۂ کفر ہی کا ہو سکتا ہے اس لئے کہ اگر وہ کافر نہ ہوتا تو یہ ممتاز صحابہ اسے گردن زدنی نہ قرار دیتے اور نہ اُسے دشمنِ خدا کی لفظوں سے یاد کرتے اور حضرت ابوبکر بھی اسے بزرگ قریش کہنے کے بجائے یہ کہتے کہ تم ایک مسلمان کے بارے میں یہ کہتے ہو۔ اور بعض مؤرخین نے یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ۶ھ میں یہ واقعہ ہوا۔ اور ابوسفیان ۸ھ میں فتح مکہ کے نتیجہ میں اسلام لایا تھا۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نہ حضرت ابوبکر سے کوئی عناد رکھتا تھا اور نہ حضرت ابوبکر اس سے نفرت رکھتے تھے۔ پھر ان تعلقات کی خوشگواری کا تقاضا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کی حکومت کا

تختہ الٹنے کی فکر کرتا اور ان کے مقابلہ میں اپنے حریف قبیلہ کی اس فرد کو برسر اقتدار لانے کے لئے عملاً کوشاں ہوتا جس کی تلوار نے اس کے خاندان کے بیشتر افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے یہ شوشہ اس لئے چھوڑا تھا کہ حکومتِ وقت کو اپنے ردعمل سے یہ تاثر دے کہ حزبِ مخالف تیار کرکے موجودہ اقتدار کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے اور اس طرح حضرت ابوبکر اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کو ڈرا سہا کر ذاتی مفاد حاصل کرے اور مفاد پرست طبقہ ایسے موقعوں پر ایسے ہی ہتھکنڈوں سے اپنے مفادات حاصل کیا کرتا ہے۔ چنانچہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور جب یہ خبر اڑی کہ ابوسفیان بنی ہاشم کو حکومت کے خلاف ابھار رہا ہے تو اربابِ حکومت اس کے مزاج آشنا تو تھے ہی انہوں نے اُسے لالچ کے جال میں جکڑ کر خاموش کردیا اور حضرت عمر نے ابوبکر سے کہا:۔

ان ھذا قد قدم وھو فاعل شر وقد کان النبی یستالفہ علی الاسلام فدع لہ ما بیدہ من الصدقۃ ففعل فرضی ابوسفیان وبایعہ۔

(عقد الفرید۔ ج ۳۔ ص۶۲)

ابوسفیان آ پہنچا ہے یہ کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور کھڑا کرے گا۔ پیغمبر اکرم اسلام کے سلسلہ میں اس کی تالیفِ قلب کیا کرتے تھے جو صدقات اس کے قبضہ میں اسی کو دے دیئے جائیں چنانچہ ابوبکر نے ایسا ہی کیا اور ابوسفیان خوش ہو گیا اور اس نے بیعت کرلی۔"

ابوسفیان کو صرف اسی سے نہیں نوازا گیا بلکہ اس کے صلہ میں اس کے بیٹے یزید کو شام کی امارت بھی دے دی گئی جو اموی اقتدار کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔

اس موقع پر امیرالمومنین کی خاموشی ان کے تدبر معاملہ فہمی اور سلامت روی کی آئینہ دار ہے۔ اگر آپ ابوسفیان کے اکسانے پر جنگ کے لئے آمادہ ہوجاتے تو اس جنگ کو اقتدار کی جنگ سے زیادہ اہمیت نہ دی جاتی اس سے ایک طرف دشمنانِ اسلام کے اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی کہ پیغمبرؐ نبوت کی آڑ میں اپنے خاندان کو برسر اقتدار لانا چاہتے تھے اور دوسری طرف جس غلط طریق کار کے خلاف آپ نے صدائے احتجاج بلند کی تھی بے اثر ہو کر رہ جاتی۔ بازوؤں میں قوت و طاقت بھی تھی اور دل میں جوش و ولولہ بھی تھا، مگر حضرت کی دور اندیش نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ چاروں طرف زہریلی فضا محیط ہے۔ فتنۂ ارتداد سر اُٹھا رہا ہے نفاق سرگرم عمل ہے۔ شکست خوردہ یہود اور باج گزار نصاریٰ اس تاک میں لگے ہیں کہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑے تو ان سے اپنی شکست و ہزیمت کا بدلہ لیں۔ اور منافقین اسلام کی نقاب اوڑھے تخریبِ اسلام کے درپے ہیں یہ تمام اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کو دست و گریباں ہوتے دیکھ کر اسلام کے خلاف متحد ہو جائیں گی اور اسلام کی تباہی و بربادی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گی۔ امیرالمومنین کا دنیائے

اسلام پر یہ عظیم احسان ہے کہ انھوں نے خاموش احتجاج سے قدم آگے نہیں بڑھایا اور خانہ جنگی کا سدِّباب کرکے مخالف طاقتوں کو محاذ قائم کرنے کا موقع نہیں دیا ورنہ ایک دفعہ خلافت کے لئے جنگ چھڑ جاتی۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر دور میں خلافت کے لئے تلوار چلتی کشت و خون کا دروازہ کھل جاتا اور مسلمان ہمیشہ چکی کے دو پاٹوں میں پستے رہتے۔

امیرالمومنین جو عالم مزاج اسلام اور اسلام کی اصلاح پسند تھے وہ گوارا نہ کرسکتے تھے کہ زلزلہ فگن نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا کریں اور ہنگامہ آرائیوں سے انقلاب کو دعوت دیں۔ ایک انقلاب پسند نتائج سے آنکھیں بند کرکے جنگوں میں کود پڑتا ہے اور تلواروں سے کھیلنے لگ جاتا ہے۔ چاہے اس کے نتیجہ میں مقصد کی پامالی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ مگر ایک مصلح مقصد پر نظر رکھتا ہے حالات کا جائزہ لیتا ہے، نتائج پر نظر کرتا ہے اور جذبات کو عقل کے تابع رکھ کر ایسا قدم اٹھاتا ہے جس سے سازگاری کا ماحول پیدا ہو اور اس مقصد اور اصول پر کوئی زد نہ پڑے۔ امیرالمومنین پر دین کا پاسبان ملت کا محافظ اور ایک مصلح ہونے کی حیثیت سے یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ وہ ہر حالت میں اسلام کے مفادات پر نگاہ رکھیں اور کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس سے اسلام کو نقصان پہنچنے کا ادنیٰ احتمال ہو خواہ اس کے لئے صبر و ضبط کی کتنی ہی کڑی منزلوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ یہ ایک ایسا اہم فریضہ تھا کہ جس کے مقابلہ میں حکومت کو کوئی اہمیت نہ دی جاسکتی تھی جو اسلام کی خاطر تلواروں کے سائے میں سو جائے جان جوکھوں میں ڈالے اور جوانی کے ایام حرب و پیکار کی نذر کردے وہ اسلام کے قیام و دوام کے لئے چند روزہ اقتدار کو بھی قربان کرسکتا ہے۔ چنانچہ آپ ماحول کی تلخیوں اور زمانہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہوئے بغیر ہمہ تن اسلام کے فروغ و ارتقاء اور علوم و معارف کے احیاء اور تدوین احکام و جمع قرآن کا کام انجام دیتے رہے اور اس طرح اپنے اس فریضہ سے عہدہ برآ ہوئے جو بحیثیت امام و خلیفۂ رسول ان پر عائد ہوتا تھا۔

مسئلہ فدک

فدک رسول اللہ کی ملکیت خاصہ تھا اور جب آیہ وات ذاالقربیٰ حقہ نازل ہوا تو آپ نے ایک دستاویز کے ذریعہ اسے اپنی صاحبزادی فاطمہ زہراؑ کے نام منتقل کردیا جو آنحضرتؐ کی زندگی تک ان کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ لیکن حضرت ابوبکر نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جناب فاطمہ زہراؑ کے مختار کار کو اراضی فدک سے بے دخل کردیا اور عمومی صدقات کے ماتحت اسے حکومت کی تحویل میں لے لیا۔ اس پر جناب سیدہؑ

نے مرافعہ کیا اور اثبات دعویٰ کے لئے حضرت علی اور ام ایمن کو بطور گواہ پیش کیا ان دونوں نے گواہی دی کہ جناب فاطمہ اپنے دعویٰ میں حق بجانب ہیں اور رسولؐ اللہ اپنی زندگی میں انہیں فدک ہبہ کر گئے تھے حضرت ابوبکر نے دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

یا بنت رسول اللہ لا تجوز الا شہادۃ رجلین او رجل وامرأتین۔

اے دختر رسولؐ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کے بغیر گواہی صحیح نہیں ہوتی۔"

(فتوح البلدان۔ ص۳۳)

جناب سیدہ نے جب یہ دیکھا کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی کو ناتمام قرار دے کر فدک کے ہبہ رسولؐ ہونے سے انکار کیا جا رہا ہے تو انہوں نے میراث کی بناء پر فدک کا مطالبہ کیا مقصد یہ تھا کہ اگر تم اسے ہبہ تسلیم نہیں کرتے تو نہ کرو اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ فدک مملوکہ رسول تھا اور میں شرعاً ان کی وارث ہوں لہٰذا فدک مجھے ملنا چاہیئے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ اموالِ رسول میں وراثت کا نفاذ نہیں ہو سکتا کیونکہ پیغمبرؐ فرما گئے ہیں کہ انا معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔" ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے" اس پر جناب سیدہ نے فرمایا:۔

افی کتاب اللہ ان ترث اباک ولا ارث ابی اما قال رسول اللہ المرء یحفظ فی ولدہ۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۲۷)

کیا یہ اللہ کی کتاب میں ہے کہ تم اپنے باپ کی میراث پاؤ اور میں اپنے باپ کا ورثہ نہ پاؤں کیا رسولؐ اللہ نے نہیں فرمایا تھا کہ کسی شخص کے حقوق کی نگہداشت یہ ہے کہ اس کی اولاد کا تحفظ کیا جائے۔"

حضرت ابوبکر کے فیصلہ پر حضرت فاطمہ کو اتنا رنج و ملال ہوا کہ ان سے قطع کلام کر لیا اور ہمیشہ ان سے رنجیدہ و کبیدہ خاطر رہیں اور یہ رنجش و برہمی کسی ہنگامی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی کہ وقتی غم و غصہ کے فرو ہونے پر ختم ہو جاتی بلکہ دینی جذبات کے ماتحت تھی کہ قرآن کے عمومی حکم میراث کو پامال اور جنہیں پیغمبرؐ نے مباہلہ میں حق و صداقت کا شاہکار قرار دیا تھا ان کی صدق بیانی کو مجروح کیا گیا ہے اس لئے اس رنجیدگی نے اتنا طول کھینچا کہ مرتے دم تک باقی رہی اور صلح و ہمکلامی کی نوبت نہ آسکی۔ امام بخاری تحریر کرتے ہیں:۔

ان فاطمۃ علیہا السلام بنت رسول اللہ سألت ابابکر الصدیق بعد وفات رسول اللہ ان یقسم لہا میراثہا ما ترک

فاطمہ بنت رسولؐ اللہ نے وفات پیغمبرؐ کے بعد ابوبکر صدیق سے مطالبہ کیا کہ اللہ نے جو مال رسولؐ اللہ کو کفار سے لڑے بغیر دلوایا تھا اور آپ اسے بطورِ ترکہ چھوڑ گئے ہیں اس کی میراث مجھے پہنچتی

رسول اللہ مما افاء اللہ علیہ فقال لها ابوبکر ان رسول اللہ قال لا نورث ما ترکنا ہ صدقۃ فغضبت فاطمۃ بنت رسول اللہ فھجرت ابا بکر فلم تزل مھاجرتہ حتی توفیت۔

(صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۱۳۶)

ہے وہ مجھے دلوایا جائے۔ ابوبکر نے کہا کہ رسول اللہ فرما گئے ہیں کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس پر فاطمہ بنت رسولؐ اللہ غضب ناک ہوئیں اور ابوبکر سے تمام راہ و رسم قطع کر لئے اور مرتے دم تک قطع تعلق کئے رہیں۔"

چنانچہ حضرت ابوبکر نے زبیر ابن عوام کو وادیٔ جرف میں جاگیر دی اور حضرت عمر نے بھی انہیں وادی عقیق میں جاگیر عطا کی اور حضرت عثمان نے اپنے دورِ اقتدار میں فدک مروان کو دے دیا تو کیا حضرت ابوبکر جناب فاطمہؑ کو فدک بطور جاگیر نہیں دے سکتے تھے تاکہ ان کی ناراضگی کی نوبت نہ آتی۔ اور اس ناراضگی کی اہمیت پیغمبرؐ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے:۔

ان اللہ یرضی لرضاک ویغضب لغضبک۔ (اصابہ ج ۴۔ ص ۳۶۶)

(اے فاطمہ) اللہ تمہارے غضب سے غضب ناک اور تمہاری خوشنودی سے خوشنود ہوتا ہے۔"

اس فیصلہ پر حیرت ہوتی ہے کہ کس حکم شرعی کی بنا پر جناب سیدہؑ کے دعوائے ہبہ کو مسترد کیا گیا جب کہ پیغمبرؐ قبضہ دے کر ہبہ کی تکمیل کر چکے تھے اگر قبضہ نہ ہوتا تو حضرت ابوبکر کہہ سکتے تھے کہ چونکہ قبضہ نہیں ہے لہٰذا یہ ہبہ نامکمل ہے اور گواہوں کو طلب کئے بغیر دعویٰ مسترد کر دیتے مگر گواہوں کو طلب کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ قبضہ تسلیم کرتے تھے۔ اور قبضہ چونکہ دلیل ملکیت ہے لہٰذا حضرت ابوبکر کو چاہیے تھا کہ وہ اس ہبہ کے خلاف ثبوت بہم پہنچاتے نہ یہ کہ جناب سیدہؑ سے گواہ طلب کرتے۔ کیا جناب سیدہ کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ فدک کی خاطر غلط بیانی سے کام لیں گی اور اس چیز پر اپنا حق جتائیں گی جس پر ان کا حق نہ تھا جب کہ ان کی راست بیانی مسلم ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

ما رأیت احدا کان اصدق لھجۃ من فاطمۃ الا ان یکون الذی ولدھا۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۳۷۶)

میں نے فاطمہ کے پدر بزرگوار کے علاوہ کسی کو فاطمہ سے بڑھ کر راست گو نہیں پایا۔"

پھر گواہوں کے طلب کرنے پر جناب سیدہ نے گواہ پیش کر دیئے تو ان کی شہادت کو ناتمام بھی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ رسول اللہ ایک گواہ اور ایک قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے اگر حضرت ابوبکر چاہتے تو حضرت علی

علی سے قسم لے کر جناب فاطمہ کے حق میں فیصلہ کر سکتے تھے بلکہ کتب احادیث میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جہاں گواہوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی اور صرف مدعی کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے اس کے دعوے کو تسلیم کیا گیا یا صرف ایک ہی گواہ پر فیصلہ کر دیا گیا۔ چنانچہ فرزندان صہیب نے جب مروان کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ رسول اللہ صہیب کو دو مکان اور ایک حجرہ دے گئے تھے تو مروان نے کہا کہ اس کا گواہ کون ہے انہوں نے کہا کہ ابن عمر۔ اس نے ابن عمر کو شہادت کے لئے طلب کیا :۔

فشهد لاعطی رسول الله صهیبا بیتین وحجرة فقضی مروان بشهادته لهم۔ (صحیح بخاری۔ ج ۱۔ ص ۳۵۴)	اس نے گواہی دی کہ رسول اللہ نے صہیب کو دو مکان اور ایک حجرہ عطا کیا تھا۔ مروان نے ابن عمر کی شہادت پر ان کے حق میں فیصلہ کر دیا۔"

اس موقع پر نہ ابن عمر کی گواہی کو ناتمام و غیر موثر کہا گیا اور نہ اس کے قبول کرنے میں پس و پیش کیا گیا تو کیا حضرت علی عدالت کے اس درجہ پر بھی فائز نہ تھے جس درجہ پر ابن عمر فائز تھے۔ ابن عمر پر تو بیعت یزید کی وجہ سے حرف گیری کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے مگر جنہوں نے فدک کی گواہی دی تھی ان کی راست بیانی تو ہر دور میں شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے۔ چنانچہ مامون عباسی نے ایک مرتبہ علماء وقت کو جمع کر کے ان سے دریافت کیا کہ جنہوں نے فدک کے ہبہ قرار پانے کی شہادت دی تھی تم ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ سب نے کہا کہ وہ صادق و راستباز تھے اور ان کی راستگوئی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

فلما اجمعوا علی هذا ردها علی ولد فاطمة وکتب بذلك۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۳۔ ص ۱۹۶)	جب علماء نے ان کی صدق بیانی پر اتفاق کیا تو مامون نے فدک اولاد فاطمہ کے حوالے کر دیا اور ایک نوشتہ بھی لکھ دیا۔"

اسی طرح جناب سیدہ کے دعویٰ میراث کو رد کرنے کا کوئی جواز نہ تھا اس لئے کہ حضرت ابوبکر نے جس حدیث سے اپنے عمل کی صحت ثابت کی وہ قرآن کے عمومات کے صریحاً خلاف ہے۔ قرآن مجید کا واضح حکم ہے :۔

ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون۔	جو ترکہ ماں باپ اور اقربا چھوڑ جائیں ہم نے ان کے وارث قرار دیئے ہیں۔"

اس آیت کے عموم کی رو سے ترکہ رسول کو صدقہ قرار دے کر نفی ارث کا کوئی جواز نہیں ہے اگر اموال رسول صدقہ ہوتے تو پیغمبر اکرم کے لئے ان پر قبضہ رکھنا جائز ہی نہ تھا بلکہ جس وقت ان کی ملکیت میں آتے اسی وقت انہیں اپنی ملکیت سے الگ کر کے ان کے اصلی حقداروں کے حوالے کر دیتے مگر پیغمبر ان اموال پر ایک مالک کی طرح قابض و متصرف رہے۔ بے شک آنحضرتؐ ان اموال سے عزیزوں اقارب اور فقراء و مساکین

کی پرورش بھی کرتے تھے لیکن صرف خیر سے ملکیت کی نفی لازم نہیں آتی کہ ان مصارف کی آڑ لے کر ملکیت سے انکار کر دیا جائے۔ اس ملکیت سے تو حضرت ابوبکر کو بھی انکار نہ تھا اگر انہیں ملکیت رسول سے انکار ہوتا تو حدیث لا نورث کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے یہ کہتے کہ فدک رسول اللہ کی ملکیت ہی کب تھا کہ اسے ترکہ قرار دے کر ورثہ کو دیئے جانے کا سوال پیدا ہو ظاہر ہے کہ ملکیت کے بغیر وراثت کی نفی کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔ جب پیغمبرؐ کی ملکیت بلاشبہ ثابت ہے تو آیات میراث کی رُو سے وارثوں کا حق بھی مسلم ہوگا۔ یہ حق ایک ایسی حدیث کی رو سے ساقط نہیں ہو سکتا جو حضرت ابوبکر کے علاوہ نہ کسی نے سنی ہو نہ روایت کی اور نہ فدک کے علاوہ مملوکات رسول میں کہیں اس پر عملدرآمد ہوا ہو حالانکہ اس حدیث کے الفاظ ما ترکناہ صدقۃ کے عموم کا تقاضا یہ تھا کہ پیغمبر کی تمام متروکہ اشیاء کو صدقۂ عمومی قرار دیا جاتا اور منقولہ وغیر منقولہ اشیاء میں کوئی تفریق نہ کی جاتی۔ مگر منقولہ اشیاء کا پیغمبرؐ کے وارثانِ بازگشت سے مطالبہ نہیں کیا جاتا صرف فدک کو اس حدیث کا مورد قرار دے لیا جاتا ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس حدیث کا تعلق صرف اراضی وغیر منقولہ اشیاء سے تھا تو پھر ازواج رسول سے ان کے گھروں کو بھی واپس لے لینا چاہیئے تھا مگر ان سے واپسی کا مطالبہ تو درکنار ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں اور اسی حق ملکیت کی بناء پر حجرۂ رسول میں دفن ہونے کے لئے حضرت عائشہؓ سے اجازت طلب کی جاتی ہے اور حضرت امام حسنؑ کے دفن کے موقع پر ام المومنین نے بھی واشگاف لفظوں میں کہا :۔

البیت بیتی ولا اذن ان یدفن فیہ۔ — یہ گھر میرا گھر ہے اور میں اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس گھر میں دفن کئے جائیں۔" (تاریخ ابوالفداء۔ ج ۲۔ ص ۱۸۳)

اس مقام پر اگر یہ کہا جائے کہ وہ حجرے ازواجِ رسول کی ملکیت قرار پا چکے تھے اور اسی ملکیت کی بنا پر آیہ قرآنی وقرن فی بیوتکن (اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھی رہو) میں ان گھروں کی نسبت ازواج طرف دی گئی ہے تو نہ یہ دعویٰ صحیح ہے اور نہ اس آیت کے ازواجِ رسولؐ کی ملکیت پر استدلال صحیح ہے اس لئے کہ اگر اس آیت میں گھروں کی اضافت ازواج کی طرف ہے تو دوسری آیت میں ان گھروں کی نسبت رسول کی طرف بھی ہے :۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم۔ — اے ایمان لانے والو نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو مگر یہ کہ تمہیں اجازت دی جائے۔

جب قرآن مجید میں ان گھروں کی اضافت ازواج کی طرف بھی ہے اور رسول اللہ کی طرف بھی تو اگر یہ اضافت ملکیت کی بناء پر ہو تو ایک چیز کے واقع میں دو مالک تو ہو نہیں سکتے لہذا ان دو اضافتوں میں

سے ایک اضافت ملکیت کی بناء پر ہوگی اور ایک ان گھروں میں رہائش کی بناء پر۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف یہ اضافت ملکیت کی بناء پر ہوگی اور ازواج کی طرف رشتۂ زوجیت اور سکونت کی بناء پر اور عربی زبان میں ادنیٰ سا لگاؤ بھی صحت اضافت کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر ازواج کے حق ملکیت کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان کی ملکیت میں کیونکر آئے کیا رسول اللہؐ انہیں ہبہ کر گئے تھے تو اس صورت میں ان سے ہبہ کے گواہوں کا مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا اور اگر کسی اور ذریعہ سے ان کی طرف منتقل ہوئے تھے تو وہ ذریعہ کیا تھا۔ ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ یہ حدیث صرف جناب سیدہؑ کو فدک سے محروم کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پیغمبرؐ کے ترکہ کا کوئی وارث نہ تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ پیغمبر متعلقہ افراد کو بے خبر رکھتے بلکہ آنحضرتؐ نے جہاں میراث کے تمام احکام و جزئیات بیان فرمائے وہاں واضح طور پر انہیں یہ بتا دیتے کہ ان کے منقولہ و غیر منقولہ ترکہ کا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ اگر تمام افراد کو اس پر مطلع کرنے میں کوئی امر مانع تھا تو کم از کم حضرت علیؑ کو جنہیں اپنا وصی مقرر کیا تھا بتا جاتے اس لئے کہ یہ وصایت آنحضرت کی نیابت و جانشینی سے متعلق تھی یا اُن کے مالیات اور لین دین کے معاملات سے یا احکام شریعت سے اور ان سب صورتوں میں انہیں اپنے ترکہ کے حکم شرعی سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ وہ اموال جو عامۂ مسلمین کے مفاد کے لئے تھے۔ تصرف ناجائز سے محفوظ رکھے جا سکیں اگر اپنے وصی سے مخفی رکھنے میں کوئی مصلحت تھی تو اپنی عزیز ترین بیٹی ہی کو بتا جاتے کہ وہ ان کے ترکہ میں سے کسی چیز کی وارث نہیں ہیں تاکہ وہ اس چیز کا مطالبہ نہ کرتیں جس کا انہیں کوئی حق نہ تھا لیکن آنحضرتؐ اپنی بیٹی کو بھی کچھ نہیں بتاتے اور انہیں بھی بے خبر رہنے دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں انہیں سر دربار جھٹلائے جانے کی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر بیٹی کو بتانے میں بھی کوئی امر مانع تھا تو اپنی بیویوں ہی کو بتا جاتے جو آپ کے ترکہ میں آٹھویں حصہ کی مالک تھیں مگر ان سے بھی یہ امر پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور اسی بے خبری کی بناء پر انہوں نے حضرت عثمان کی وساطت سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرنا چاہا۔ چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں

ان ازواج النبی حین توفی رسول اللہ اردن ان یبعثن عثمان ابن عفان الی ابی بکر فیسألنہ میراثھن من النبی قالت عائشہ لھن الیس قد قال رسول اللہ لا نورث ما	جب رسولؐ وفات پا گئے تو ازواجِ نبی نے چاہا کہ عثمان ابن عفان کو ابوبکر کے پاس بھیجیں اور اُن سے پیغمبر اکرم کی میراث کا مطالبہ کریں۔ حضرت عائشہ نے کہا کیا نبی اکرم یہ نہیں فرما گئے کہ ہم کسی کو وارث

تركنا فهو صدقة۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹)   نہیں بناتے ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔"

اگر یہ حدیث ازواج رسولؐ کے گوش گزار ہو چکی ہوتی تو وہ کبھی رسول اللہ کے ترکہ سے میراث طلب کرنے کا ارادہ نہ کرتیں اور اگر حضرت عثمان مطلع ہوتے تو مطالبۂ میراث کے لئے نظر انتخاب ان پر نہ پڑتی۔ البتہ حضرت عائشہ ازواج رسولؐ سے یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر نے فرمایا تھا کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے۔ حضرت عائشہ کی یہ آواز حضرت ابو بکر ہی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے ورنہ حضرت عائشہ کا نظریہ تو یہ تھا کہ میراث رسولؐ کے بارے میں حضرت ابو بکر کے علاوہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ چنانچہ ان کا قول ہے:۔

اختلفوا فی میراثه فما وجدنا عند احد من ذلك علما فقال ابوبكر سمعت رسول الله يقول انا معاشر الانبياء لا نورث ما تركناه صدقة۔ (تاریخ الخلفاء ص ۵۴)

لوگوں نے پیغمبرؐ کی میراث میں اختلاف کیا تو ہم نے ایک فرد کو بھی نہ پایا جسے اس مسئلہ کا علم ہوتا البتہ ابو بکر نے کہا کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ ہم گروہ انبیا کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔"

اگر تمام انبیاء سے نفی ارث کرنے کے بجائے صرف پیغمبر اکرم کے ورثہ کی نفی کی جاتی تو شاید کچھ بات بن جاتی اور اسے بھی آنحضرتؐ کے خصائص میں سے قرار دے کر اس پر سکوت اختیار کر لیا جاتا مگر جب تمام نبیوں کے بارے میں یہ حکم لگا دیا گیا کہ ان کا کوئی وارث ہوتا ہی نہیں ہے تو ذہن میں اطمینانی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا، کہ کیا انبیاء سابقین نے کسی موقع پر اپنے ورثہ کی نفی کی تھی اور اپنے وارثوں کو بتا گئے تھے کہ وہ ان کے ترکہ کے حقدار نہیں ہیں اور کیا حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسٰی تک تمام انبیاء کے وارث ورثہ سے محروم چلے آرہے تھے اور نبوت کو بھی کفر و قتل کی طرح موانع ارث میں سے شمار کیا جاتا تھا؟ عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر انبیاء کی اولاد ورثہ سے محروم ہی چلی آرہی تھی تو اسے پردۂ خفا میں نہ رہنا چاہیئے تھا بلکہ امم سابقہ میں اس کی شہرت ہوتی ان کے صحف و کتب میں اس کا تذکرہ ہوتا ان کے علماء و احبار کو اس کا علم ہوتا مگر کتب آسمانی ہوں یا کتب تاریخ و حدیث ایک کتاب بھی ایسے نبی کی نشاندہی نہیں کرتی جس کے وارث نبوت کی بناء پر محروم الارث قرار دیئے گئے ہوں بلکہ اس کے برعکس قرآن مجید نے واضح لفظوں میں بیان کیا ہے کہ انبیاء کی میراث ان کے وارثوں کو پہنچتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کی وراثت کے بارے میں ارشاد ہے:۔

وورث سليمان داؤد۔   سلیمان (اپنے باپ) داؤد کے وارث ہوئے۔"

اس آیت میں یہ تاویل کی گئی ہے کہ اس سے ورثہ مالی مراد نہیں ہے بلکہ علم و نبوت کا ورثہ مراد ہے۔ حالانکہ علم و نبوت وہ ترکہ نہیں ہے جو وارثوں کو وراثت میں ملتا ہے۔ علاوہ بریں ورثہ وہ ہوتا ہے جو مورث کے اٹھ جانے کے بعد وارث کی طرف منتقل ہوتا ہے اور حضرت سلیمان حضرت داؤد کی زندگی ہی میں علم و نبوت پر فائز ہو چکے تھے۔ لہذا اس سے ورثہ مالی ہی مراد ہو سکتا ہے جو حضرت داؤد کے بعد انہیں حاصل ہوا۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے:۔

توفی داؤد علیہ السلام وورث سلیمان ملکہ۔ (اخبار الطوال۔ ص۲)	داؤد علیہ السلام نے وفات پائی تو حضرت سلیمان ان کے ملک کے وارث ہوئے۔"

محمد ابن سائب کلبی بیان کرتے ہیں:۔

ان الصافنات الجیاد المعروضۃ علی سلیمان ابن داؤد علیہما السلام کانت الف فرس ورثہا من ابیہ۔ (عقد الفرید۔ ج۱۔ ص۴۲)	وہ عمدہ اور اصیل گھوڑے جو حضرت سلیمان کے سامنے پیش کئے گئے تھے وہ ایک ہزار گھوڑے تھے جو سلیمان نے اپنے باپ سے میراث میں پائے تھے۔"

اسی طرح حضرت زکریا کی زبانی قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

انی خفت الموالی من ورائی وکانت امرأتی عاقرا فھب لی من لدنک ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب واجعلہ رب رضیاً۔	میں اپنے بعد اپنے بنی اعمام سے خطرہ محسوس کرتا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے اے اللہ تو مجھے اپنی طرف سے ایک وارث عطا کر جو میرا اور آلِ یعقوب کا ورثہ پائے اور اے میرے پروردگار تو اسے پسندیدہ قرار دے۔"

اس آیت میں بھی ورثہ سے علم و نبوت کا ورثہ مراد لینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ نہ علم و نبوت میں وراثت کارفرما ہوتی ہے اور نہ نبوت کوئی موروثی چیز ہے اگر اس سے علم و نبوت کا ورثہ مراد لیا جائے تو حضرت زکریا نے جس خوف و خطر کا اظہار کیا ہے بے معنی ہو جاتا ہے اس لئے کہ علم و نبوت کے متعلق ابناء عمام سے خطرہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا انہیں یہ خطرہ تھا کہ وہ نبوت پر حملہ آور ہو کر اسے چھین لے جائیں گے اور زبردستی اس پر قابض و متصرف ہو جائیں گے یا یہ اندیشہ تھا کہ نبوت کی عدم صلاحیت کے باوجود انہیں نبوت مل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کا خطرہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا اس لئے کہ نبوت عطیۂ قدرت ہے جو نہ چھین سکتی ہے اور نہ کسی نااہل کو مل سکتی ہے۔ البتہ اندیشہ ہو سکتا تھا تو اس بات کا

کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کے املاک و اموال پر قابض ہو جائیں گے اور حضرت زکریا یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ترکہ ان کے بنی اعمام کی طرف منتقل ہو اس لئے نہیں کہ انہیں مال دنیا سے محبت و وابستگی تھی بلکہ اس لئے کہ ان کی بے راہرویوں کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ مال ان کے ہاتھ لگا تو وہ اسے غلط کاریوں اور گناہ کے کاموں میں صرف کریں گے۔ اس بناء پر انہوں نے ایک ایسے وارث کی دعا مانگی، جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو تاکہ اس مال کو فسق و فجور میں صرف کرنے کی بجائے امورِ خیر میں صرف کرے۔ اور ایک نبی کی کمائی نیک کاموں میں لگے۔

ان واضح شہادتوں کے بعد حدیث کی آڑ لے کر یہ کہنا کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، حقائق سے عمداً گریز کرنا ہے جب کہ قرآن کے مقابلہ میں فرد واحد کی بیان کردہ حدیث کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اور اس حدیث کا وزن ہی کیا ہو سکتا ہے جس کی صحت سے بنتِ رسول اور وصیِ رسول نے انکار کر دیا ہو۔ اگر جنابِ فاطمہ نے اس حدیث کو حدیث رسول سمجھا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ حضرت ابوبکر پر غضبناک ہوتیں بلکہ اس سلسلہ میں انہیں مجبور و معذور قرار دیتیں۔ اور اگر حضرت علی نے اس حدیث کو مانا ہوتا تو جناب سیدہ کی ہمنوائی کرنے کے بجائے انہیں اس بے محل ناراضگی سے منع کرتے بلکہ واقعات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ابوبکر کو بھی اس حدیث کی صحت پر اعتماد نہ تھا اور نہ ان کے بعد آنے والے خلفاء نے اس کی صحت کو تسلیم کیا۔ چنانچہ ابتداء میں حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہؑ کا حقِ وراثت تسلیم کر لیا۔ اور دستاویز لکھ کر بھی دے دی مگر حضرت عمر کے دخل دینے سے انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ علامہ حلبی تحریر کرتے ہیں:-

كتب لها بفدك ودخل عليه عمر فقال ما هذا فقال كتاب كتبته لفاطمة ميراثها من ابيها قال ماذا تنفق على المسلمين وقد حاربتك العرب كما ترى ثم اخذ عمر الكتاب فشقه۔

(سیرۃ حلبیہ۔ ج ۳۔ ص [illegible])

حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہ [illegible] لکھ دی اتنے میں حضرت عمر آئے اور [illegible] کیا ہے حضرت ابوبکر نے کہا [illegible] لئے میراث کا وثیقہ لکھ دیا ہے جو انہیں [illegible] طرف سے پہنچی ہے۔ [illegible] پر کیا صرف کرو گے جب کہ [illegible] کے لئے آمادہ ہیں اور یہ کہہ کر [illegible] چاک کر ڈالی۔

اگر حضرت ابوبکر کو اس حدیث کی صحت پر یقین ہوتا اور وہ یہ سمجھتے کہ پیغمبر اکرم کا کوئی وارث نہیں

ہے تو اس حدیث کے پیش نظر اسی وقت فدک سے انکار کر دیتے اور وثیقہ تحریر کرنے کی نوبت نہ آتی اور حضرت عمر مانع ہوئے تو اس بنا پر نہیں کہ جناب سیدہ کا دعویٰ وراثت غلط ہے اور انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا بلکہ ملکی ضروریات اور جنگی مصارف کے پیش نظر انہوں نے فدک روک لینے کا مشورہ دیا۔ اگر حضرت عمر کے نزدیک یہ حدیث قابل اعتماد و وثوق ہوتی تو وہ پیش آمدہ جنگی ضروریات کو وجہ قرار دینے کے بجائے اس کی بنیاد پر مطالبہ کرتے اور یہ کہتے کہ یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اور فدک دینے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کا ترکہ مصالح عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے اور وارثوں کو دیئے جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا خواہ حکومت کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اس موقع پر اگرچہ حضرت عمر نے دستاویز چاک کی فدک کے دینے میں سدّ راہ ہوئے۔ مگر حضرت ابوبکر کی پیش کردہ حدیث سے ان کی ہمنوائی ظاہر نہیں ہوتی اور کتب اہلسنت میں تو یہاں تک درج ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں حق وراثت تسلیم کرتے ہوئے فدک حضرت علی اور عباس ابن عبد المطلب کے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے :۔

کان علی ابن ابی طالب والعباس	حضرت علی اور عباس ابن عبد المطلب میں فدک
ابن عبد المطلب یتنازعان فیھا	کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی حضرت علی کہتے تھے
فکان علی یقول ان النبی جعلھا	کہ رسولِ خدا نے اپنی زندگی میں فدک جناب فاطمہؑ
فی حیاتہ لفاطمۃ وکان العباس	کو دے دیا تھا اور عباس اس سے انکار کرتے تھے
یابی ذلک ویقول ھی ملک لرسول	اور کہتے تھے کہ فدک رسول اللہ کی ملکیت تھا اور
اللہ وانا وارثہ فکانا یتخاصمان	میں ان کا وارث ہوں۔ یہ جھگڑا حضرت عمر تک پہنچا
الی عمر فیابی ان یحکم بینھما	انہوں نے کہا کہ تم اپنے معاملات کو بہتر سمجھتے ہو۔
ویقول انتما اعرف بشانکما	میں نے تو اسے تمہارے حوالے کر دیا ہے ۔"

اما انا فقد سلمتھا الیکما۔ (معجم البلدان ج ۴ ص ۲۳۹)

اس روایت کی رو سے حضرت علی اور عباس میں مابہ النزاع یہ امر تھا کہ فدک ہبہ ہے یا ترکہ۔ حضرت علی کا موقف یہ تھا کہ آنحضرتؐ نے فدک جناب فاطمہ کو ہبہ کر دیا تھا اور عباس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ترکہ ہے اور میں عم رسولؐ ہونے کی حیثیت سے اُن کا وارث ہوں۔ اس صورت میں تصفیہ طلب امر یہ تھا کہ یہ ہبہ ہے یا ترکہ یا ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ بلکہ صدقہ عمومی ہے۔ اگر حضرت عمر کی نظروں میں ہبہ ثابت تھا تو حضرت علی کے حوالے کرتے اور اگر صدقہ تھا تو اسے مسلمانوں کے مشترکہ مال کی حیثیت سے باقی رہنے دیتے مگر انہوں نے نہ تنہا حضرت علی کے حوالے کیا کہ اسے ہبہ قرار دیا جائے اور نہ اسے مشترکہ صورت میں

باقی رہنے دیا کہ اُسے صدقہ سمجھا جائے بلکہ ان دونوں کے سپرد کر دیا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نہ اسے ہبہ سمجھا اور نہ صدقہ بلکہ ترکہ اور مال موروث قرار دیا۔ اس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ اگر وہ حدیث "لا نورث" کو قابلِ اعتماد سمجھتے تو فدک پر میراث کا حکم جاری نہ کرتے۔ بعض لوگوں نے یہاں بھی تاویل کا سہارا ڈھونڈا ہے اور یہ کہا ہے کہ حضرت عمر نے فدک بربنائے میراث نہیں دیا تھا بلکہ ان دونوں کو اپنا وکیل قرار دے کر اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو حضرت عمر یہ کہہ سکتے تھے کہ میں نہ اسے ہبہ تسلیم کرتا ہوں اور نہ اسے ترکہ و مال موروث سمجھتا ہوں لیکن تم دونوں کو وکیل متصرف قرار دیتا ہوں کہ اس سے استفادہ کرو۔ جب حضرت عمر نے ایسا نہیں کیا تو اس کو بربنائے وکالت سمجھنا دعویٰ بلا دلیل اور رکیک تاویل ہی تو ہے۔

اس روایت سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے حق وراثت تسلیم کر لیا اور جہاں تک فدک کی عملاً واپسی کا تعلق ہے واقعات مابعد سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک لاوارث مال کی ہو کر رہ گئی اور برسر اقتدار طبقہ نے جس طرح چاہا اس میں تصرف کیا اور جسے چاہا عطائے خسروانہ کے طور پر دے دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان کا دور آیا تو انہوں نے ۲۴ھ میں اپنے داماد مروان کو عطا کر دیا۔ مورخ ابو الفداء نے تحریر کیا ہے :۔

واقطع مروان ابن الحکم فدك وهی صدقة رسول الله صلی الله علیه وسلم التی طلبتها فاطمة میراثا۔ (تاریخ ابو الفدا۔ ج ۱۔ ص ۱۶۹)	حضرت عثمان نے فدک مروان کو بطور جاگیر دے دیا حالانکہ وہ رسول اللہ کا صدقہ تھا جسے فاطمہؑ نے میراث میں طلب کیا تھا۔

جب معاویہ ابن ابی سفیان برسر اقتدار آئے تو انہوں نے فدک اپنی تحویل میں لے کر ایک تہائی مروان کے نام پر رہنے دیا اور ایک تہائی عمر ابن عثمان اور ایک تہائی اپنے بیٹے یزید کے نام منتقل کر دیا اور جب مروان کو اقتدار حاصل ہوا تو اس نے دوبارہ تمام اراضی فدک پر قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے عبد العزیز کو ہبہ کر دیا اور جب عمر ابن عبد العزیز کو وراثت میں ملا تو انہوں نے اولاد فاطمہ کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے :۔

فلما ولی عمر ابن عبد العزیز الخلافة کتب الی عامله بالمدینة یامره برد فدك الی ولد فاطمة	جب عمر ابن عبد العزیز خلافت پر فائز ہوئے تو انہوں نے عامل مدینہ کو ایک تحریر کے ذریعہ حکم دیا کہ وہ فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد

رضی اللہ عنہا۔ (معجم البلدان۔ ج ۱۴۔ ص ۲۳۹) کو واپس کر دے۔"

عمر ابن عبدالعزیز کے اس عملی اقدام سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حدیث لا نورث کو قابل اعتماد نہیں سمجھا اور سابقہ خلفاء کے فیصلہ کو صریحاً غلط قرار دیا۔ ان کا یہ اقدام قابل صد تحسین ہے کہ انہوں نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا اور جناب سیدہ کا غصب شدہ حق ان کی اولاد کے سپرد کر کے ایک عظیم ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن ان کے بعد وہی ہوا جو ان سے پہلے ہوتا چلا آ رہا تھا اور یزید ابن عبدالملک نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد فدک بنی فاطمہ سے واپس لے لیا اور بنی مروان کے دور تک خلفاء بنی امیہ ہی کے قبضہ میں رہا۔ جب اموی دور ختم ہو گیا اور ابوالعباس سفاح تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے فدک عبداللہ ابن حسن ابن حسن ابن علی کے حوالے کر دیا۔ سفاح کے بعد منصور دوانیقی نے اپنے دور حکومت میں اسے اولاد حسن سے واپس لے لیا لیکن مہدی ابن منصور نے پھر فاطمین کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد جب موسیٰ ابن مہدی بر سر اقتدار آیا تو اس نے پھر حکومت کی تحویل میں لے لیا اور مامون رشید کے دور تک خلفاء بنی عباس ہی کے تصرف میں رہا۔ مامون نے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد ماہ ذیقعد ۲۱۰ھ میں عامل مدینہ قثم ابن جعفر کو تحریر کیا:

قد كان رسول الله اعطى فاطمة بنت رسول الله فدك وتصدق بها عليها وكان ذلك امرا ظاهرا معروفا لا اختلاف فيه بين آل رسول الله ولم تزل تدعى منه ما هو اولى به من صدق عليه فرأى امير المومنين ان يردها الى ورثتها ويسلمها اليهم تقربا الى الله تعالى باقامة حقه وعدله والى رسول الله بتنفيذ امره وصدقته فامر باثبات ذلك فى دواوينه والكتاب به الى

رسول اللہ نے فدک اپنی بیٹی جناب فاطمہ کو عطا کیا تھا اور یہ ایسی کھلی ہوئی اور واضح بات ہے جس کے متعلق آل رسول میں کوئی اختلاف نہیں ہے فدک امیر المومنین (مامون) سے اسی امر کا متقاضی ہے جو رسول اللہ سے ان کے صدق و خلوص کے لحاظ سے مناسب تر ہے لہٰذا امیر المومنین (مامون) نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ فدک ان لوگوں کو جو اس کے صحیح وارث ہیں واپس دیا جائے اور ان کے حوالے کیا جائے اور اس طرح اللہ کے قائم کردہ حق و انصاف کے تقاضوں پر عمل اور رسول اللہ کے حکم اور اُن کے صدقہ کا نفاذ کر کے اللہ و رسول سے تقرب حاصل کریں۔ لہٰذا وہ حکم دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ ان کے دفتروں میں درج کر دیا جائے اور

عماله فلان کان ینادی فی کل موسم بعد ان قبض الله نبیه ان یذکر کل من کانت له صدقة اوھبة اوعدة ذلك فیقبل قوله و ینفذ عدته ان فاطمة رضی الله عنہا لاولی بان یصدق قولہا فیما جعل رسول الله لہا وقد کتب امیر المومنین الی المبارك الطبری مولی امیر المومنین یامرہ برد فدك علی ورثة فاطمة بنت رسول الله بحدودھا وجمیع حقوقہا المنسوبة الیہا وما فیہا من الرقیق والغلات وغیر ذلك۔ (فتوح البلدان۔ صـ۳۹)

اور ان کے عمال کو اس کی اطلاع پہنچادی جائے ۔ جب وفات پیغمبرؐ کے بعد ایسا ہوتا تھا کہ ہر حج کے موقع پر یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ جسے کوئی صدقہ دیا گیا ہو یا کوئی چیز ہبہ کی گئی ہو وُہ آکر مطالبہ کرے اور اس کی بات مانی جاتی تھی اور وعدہ پورا کیا جاتا تھا تو جناب فاطمہ بدرجۂ اولیٰ مستحق تھیں کہ اس چیز کے بارے میں جو رسول اللہؐ ان کے لئے مخصوص کر گئے تھے ان کی بات صحیح سمجھی جاتی۔ امیر المومنین (مامون) نے اپنے آزاد کردہ غلام مبارک طبری کو تحریری حکم دیا ہے کہ وہ فدک کو اس کے مقررہ حدود اور ان تمام حقوق سمیت جو اسے حاصل ہیں مع غلاموں اور غلہ وغیرہ کے حضرت فاطمہ کے وارثوں کو واپس لوٹا دے ۔"

چنانچہ مامون کے حسب فرمان فدک بنی فاطمہ کے حوالے کر دیا گیا اور جب متوکل عباسی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو پھر اُسے واپس لے لیا۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے :۔

فلما استخلف المتوکل علی الله رحمه الله امر بردھا الی ما کانت علیه قبل المامون۔ (فتوح البلدان۔ صـ۴۱)

جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ فدک کو اسی حالت پر پلٹا دیا جائے جس حالت پر مامون سے پہلے تھا۔"

اس ردوبدل کو دیکھتے ہوئے کہ فدک پر کبھی حکومت وقت قابض ہے اور کبھی وابستگان حکومت کبھی بنی فاطمہ کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے اور کبھی ان سے واپس لے لیا جاتا ہے۔ تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت ابوبکر کی پیش کردہ حدیث کی صحت پر اتفاق نہ تھا۔ اگر اسے قابلِ وثوق و اعتماد سمجھا گیا ہوتا تو فدک کسی دور میں بھی اولاد فاطمہ کی تحویل میں نہ دیا جاتا آخر عمر ابن عبد العزیز ایسا احساس دین رکھنے والا اور مامون ایسا ذی اقتدار شہنشاہ اور بعض دوسرے خلفار نے اس کے کسی کمزور پہلو کو دیکھ کر ہی فدک سے

دستبرداری کا اعلان کیا ہو گا ورنہ ان کا مفاد تو اسی میں تھا کہ اس حدیث کی آڑ لے کر اس پر اپنا قبضہ باقی رکھتے جس طرح بعض خلفاء نے اس حدیث کا سہارا لیتے ہوئے اپنا قبضہ برقرار رکھا تھا۔

فتنۂ ارتداد

سقیفۂ بنی ساعدہ کی ہنگامی بیعت کے بعد اہلِ مدینہ کی اکثریت نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی اور جمہوری نقطۂ نظر سے ان کی خلافت قائم ہو گئی۔ مگر اطراف و جوانب میں جب یہ خبر نشر ہوئی تو ناراضگی کی عام لہر پھیل گئی اور قبائل عرب کے دلوں میں بے چینی اور ذہنوں میں تشویش انگیز اضطراب نے جگہ لے لی جس نے ان کے احساسات کو متاثر کر کے حکومت سے عدم تعاون پر آمادہ کر دیا اور چند قبائل مرتدین کے پرچموں کے نیچے بھی جمع ہو گئے اور ہر طرف سے مخالفت کے طوفان اُمڈ آئے۔ اس ہنگامہ و شورش میں قریش اور بنی ثقیف کے علاوہ قریب قریب تمام قبائل عرب شامل ہو گئے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

ارتدت العرب وتضرمت الارض نارا وارتدت کل قبیلة عامة او خاصة الا قریشا وثقیفا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۳۱)	اہلِ عرب مرتد ہو گئے اور سرزمین عرب فتنہ و فساد کی آگ سے بھڑک اٹھی۔ قریش اور بنی ثقیف کے علاوہ ہر قبیلہ تمام کا تمام یا اس میں کا ایک خاص گروہ مرتد ہو گیا۔"

حضرت ابوبکر کے دورِ حکومت میں جن مرتدین نے سر اٹھایا ان کے سرگروہ پیغمبر اکرم کی زندگی ہی میں مرتد ہو چکے تھے۔ چنانچہ اسود عنسی مسیلمہ کذاب اور طلیحہ ابن خویلد نے آنحضرتؐ کے زمانۂ حیات ہی میں اسلام سے منحرف ہو کر دعوئ نبوت کیا اسود عنسی آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں فیروز دیلمی کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس کے پیروکاروں نے بعد میں شرانگیزی کی۔ مسیلمہ حضرت ابوبکر کے دور میں لڑتا ہوا وحشی کے ہاتھ سے قتل ہوا اور طلیحہ نے حضرت عمر کے دور میں اسلام قبول کر لیا۔ اسی طرح علقمہ ابن علاثہ نے اور سلمیٰ بنت مالک نے پیغمبر کے دور میں ارتداد اختیار کیا اور آنحضرت کے بعد لشکر کشی کی۔ البتہ لقیط ابن مالک پیغمبر کے بعد مرتد ہوا اور سجاح بنت حارث نے بھی آپ کی وفات کے بعد دعوئ نبوت کیا۔ لقیط نے مسلمانوں سے بُری طرح شکست کھائی اور سجاح مسیلمہ کا ضمیمہ بن کر رہ گئی اور اس سے نکاح کر کے بقیہ زندگی گمنامی میں گزار دی۔ یہ تھے وہ مرتدین جنہوں نے حضرت ابوبکر کے دورِ حکومت میں ہنگامہ آرائی کی اور جن قبائل کو منکرین زکوٰۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وُہ یہی مدعیان نبوت اور اُن کے متبعین تھے۔ چنانچہ حضرت

ابوبکر نے طلیحہ ابن خویلد کے وفد ہی کے بارے میں کہا تھا:۔

لو منعونی عقالا لجاھدتھم علیہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۴۷۶)

اگر انہوں نے اس رسی کے دینے سے بھی انکار کیا جس سے اونٹ کے پیر باندھے جاتے ہیں تو میں ان سے جہاد کروں گا۔"

یہ فتنہ ارتداد پیغمبر کی زندگی ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بعد میں چند ایک قبائل بھی اس رو میں بہہ گئے۔ لیکن یہ کہنا کہ پیغمبر کے بعد قریش و ثقیف کے علاوہ تمام قبائل مرتد ہو گئے نہ صرف خلاف واقع ہے بلکہ اسلام کی صداقت پر بھرپور حملہ ہے۔ یہ کیونکر قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے انتقال کے فوراً بعد تمام قبائل یکلخت اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو جائیں۔ کیا یہ قبائل اسلام کے فتوحات اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام لائے تھے اور پیغمبر کی رحلت سے مرعوبیت کا تاثر ختم ہو گیا تو اسلام کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا۔ اس سے تو ان لوگوں کے نظریہ کو تقویت حاصل ہو گی جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت پیغمبر کی پُر امن تبلیغ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ عربوں کو بنوک شمشیر مسلمان بنایا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض قبائل سے جنگ چھیڑنے اور انہیں تہ تیغ کرنے کے لئے ارتداد کا نیا معیار بنا لیا گیا اور ان قبائل کو بھی مرتدین میں شمار کر لیا گیا جو اللہ کی وحدانیت اور پیغمبر کی رسالت کا عقیدہ رکھتے تھے مگر حاکم وقت کی بیعت بحیثیت خلیفہ رسول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں انہیں ارتداد کی سند دے دی گئی اور اسلام سے خارج تصور کر لیا گیا۔ چنانچہ عمرو ابن حریث نے سعید ابن زید سے پوچھا کہ تم رسول اللہ کی وفات کے موقع پر موجود تھے کہا کہ ہاں میں موجود تھا۔ پوچھا کہ حضرت ابوبکر کی بیعت کس دن ہوئی کہا اسی دن جس دن رسولِ خدا نے رحلت فرمائی۔ پوچھا کسی نے اختلاف تو نہیں کیا:۔

لا الامرتد او کاد ان یرتد (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۴۴۷)

کسی نے اختلاف نہیں کیا مگر اس نے جو مرتد تھا یا مرتد ہونے والا تھا۔"

یہ جواب اس امر کا غماز ہے کہ جنہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت سے انکار کیا تھا انہیں ذہنی طور پر مرتد یا مرتد ہونے والا قرار دے لیا گیا تھا حالانکہ اس انکار بیعت کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آتی جس سے ان کا ارتداد ثابت ہوتا ہو۔ جہاں تک زکوٰۃ کے روک لینے کا تعلق ہے تو ان لوگوں نے جب حضرت ابوبکر کی خلافت ہی کو تسلیم نہیں کیا تو انہیں زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کیا ہو گا۔ اس اعتبار سے انہیں مانعین زکوٰۃ کہا جا سکتا ہے مگر مرتدین اور منکرین زکوٰۃ کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ انہوں نے زکوٰۃ کے وجوب اور اس کی مشروعیت سے انکار نہیں کیا بلکہ حکومت کو زکوٰۃ دینے سے مانع ہوئے۔ اس کا واضح ثبوت

یہ ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے اور کسی نے ان پر ترک صلوٰۃ کا الزام عائد نہیں کیا اگر وہ زکوٰۃ کے منکر ہوتے تو نماز کے بھی منکر ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ۸۲ مواقع پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے اور دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے تو پھر یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ نماز کے وجوب کا عقیدہ رکھتے ہوئے زکوٰۃ کی مشروعیت اور اس کے وجوب سے انکار کر دیں گے۔ البتہ اگر وہ زکوٰۃ کے وجوب کا انکار کرتے تو ضروریاتِ دین میں سے ایک امر ضروری کے انکار سے ان پر حکم ارتداد عائد ہوتا مگر زکوٰۃ روک لینے اور اسے حکومت کی تحویل میں نہ دینے سے انہیں مرتد نہیں کہا جا سکتا بلکہ اگر وہ سرے سے زکوٰۃ ادا ہی نہ کرتے اور اس فریضۂ الٰہی کے تارک ہوتے جب بھی ان پر کفر و ارتداد کا حکم نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ کسی امر واجب کے ترک سے ارتداد لازم نہیں آتا اور نہ ان سے جنگ کا جواز پیدا ہوتا ہے اور نہ ان کا قتل مباح ہو سکتا ہے۔ اسی بناء پر جب حضرت ابوبکر نے ان لوگوں کے خلاف قدم اٹھانا چاہا تو صحابہ کبار نے حضرت ابوبکر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس اقدام کی شدید مخالفت کی اور حضرت عمر نے بھی واضح لفظوں میں کہا :-

یا ابابکر کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فقد عصم منی مالہ و نفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ (اتمام الوفا ص۴۴)	اے ابوبکر تم ان لوگوں سے کس بناء پر جنگ کرو گے جبکہ رسول اللہ فرما گئے ہیں کہ مجھے ان لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے جب تک وہ کلمۂ توحید نہیں پڑھتے اور کسی حق کے علاوہ ان کی جانیں اور ان کا مال محفوظ ہے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے"

مگر اس موقع پر نہ صحابہ کے متفقہ فیصلہ کو درخور اعتناء سمجھا گیا نہ حضرت عمر کی بات مانی گئی۔ اور حضرت ابوبکر نے اپنے موقف پر برقرار رہتے ہوئے خالد ابن الولید کو قبائل عرب پر تاخت و تاراج کے لئے بھیج دیا۔ چنانچہ انھوں نے مالک ابن نویرہ اور ان کے قبیلہ بنی یربوع کا قتل عام کر کے تاریخ اسلام میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کیا اور بلا امتیاز سب کو اپنی تلوار کی زد پر رکھ لیا اور انہیں بے دست و پا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مالک ابن نویرہ قبیلۂ بنی یربوع کے ایک بلند پایہ سردار تھے اور بنی یربوع کی کسی فرد کو ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مدینہ منورہ میں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے اور انہی سے آداب مذہب و احکام شریعت سیکھے۔ آنحضرتؐ نے اُن کی دیانت پر وثوق و اعتماد کرتے ہوئے انہیں صدقات

کی وصولی پر عامل مقرر کیا تھا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے :۔

بعث مالک ابن نویرۃ علیٰ صدقات بنی حنظلہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۰۵)	آنحضرتؐ نے مالک ابن نویرہ کو بنی حنظلہ کے صدقات کی وصولی پر مامور فرمایا تھا۔"

ان کی سخاوت و شجاعت اور ہمت و جوانمردی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ عرب میں بطور مثل کہا جاتا تھا "فتی ولا کمالك" جوان تو ہے تو مگر مالک ایسا کہاں"۔ ان کے مہمان خانہ میں رات بھر آگ روشن رہتی تھی۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ان اطراف میں آ جاتا تو آگ کو دیکھ کر اُدھر چلا آتا تھا۔ اگر کسی کے ہاں کوئی مہمان آتا تو اسے اپنے ہاں لے آتے اور اس طرح مسافر نوازی و مہمان پروری کا ثبوت دیتے۔ پیغمبر اسلام کے آخر زمانہ حیات تک صدقات جمع کر کے بھجواتے رہے اور جب آنحضرتؐ کے انتقال کی خبر ملی تو زکوٰۃ کی جمع آوری سے دستبردار ہو گئے اور اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ مال زکوٰۃ اس وقت تک اپنے پاس محفوظ رکھو جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کا اقتدار قابلِ اطمینان ہاتھوں میں آیا ہے۔ انہی ایام میں سجاح بنت حارث نے چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ جب وہ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بنی یربوع کی بستی بطاح کے قریب حِرون میں پہنچی تو اس نے مالک کو صلح کا پیغام بھیجا اور اُن سے ترکِ جنگ کا معاہدہ کیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے :۔

وکانت سجاح تریدغزو ابی بکر فارسلت الی مالك ابن نویرۃ تطلب الموادعۃ فاجابھا و ردھا عن غزو ابی بکر و حملھا علیٰ احیاء من بنی تمیم فاجابتہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۳۹)	"سجاح نے حضرت ابو بکر سے جنگ کا ارادہ کیا۔ اور مالک ابن نویرہ کو پیغام بھجوایا اور ان سے مصالحت و ترکِ جنگ کے معاہدہ کی خواہش کی۔ جسے مالک نے قبول کیا اور اسے حضرت ابو بکر سے جنگ آزما ہونے سے باز رکھا اور اسے بنی تمیم کے قبیلوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی جسے سجاح نے منظور کر لیا۔"

اس وقتی مصالحت اور معاہدہ ترک جنگ کو کسی صورت میں ارتداد سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ابن اثیر جزری تحریر کرتے ہیں :۔

لما توفی النبی و ارتدت العرب و ظھرت سجاح و ادعت النبوۃ صالحھا الا انہ لم تظھر عنہ	جب نبی اکرم وفات پا گئے اور اہلِ عرب مرتد ہو گئے اور سجاح نے دعویٰ نبوت کیا تو مالک نے اس سے مصالحت کی لیکن ان سے کوئی ایسی چیز

سادۃ۔ (اسد الغابہ۔ ج ۴۔ ص ۲۹۵) ظاہر نہیں ہوئی جسے ارتداد کہا جا سکے۔"

اس معاہدۂ صلح میں یہ مصلحت کار فرما تھی کہ سجاح کو غیر مسلم قبائل سے جنگ میں الجھا کر مرکز اسلام مدینہ پر حملہ آور ہونے سے روکا جا سکے۔ چنانچہ وہ اس مصالحت کے ذریعہ اسے روکنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کا رخ بنی تمیم کی بستیوں کی طرف موڑ کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اگر اسے جرم قرار دیا جائے تو تنہا مالک اس کے مرتکب نہ ہوئے تھے بلکہ وکیع ابن مالک جو انہی قبائل میں صدقات کی جمع آوری پر متعین تھے اس معاہدۂ صلح میں شامل تھے لیکن ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا گیا اور مالک اور اس کے قبیلہ بنی یربوع کو مرتد قرار دے دیا گیا اور خالد ابن ولید نے انہیں قتل و غارت کرنے کے لئے بطاح پر چڑھائی کر دی مالک نے بنی یربوع کو ادھر ادھر منتشر کر دیا تھا۔ خالد نے ان کے تعاقب میں لشکر روانہ کیا اور انہیں گرفتار کر کے لایا گیا جب بنی یربوع نے یہ صورت دیکھی تو انہوں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ ابو قتادہ انصاری نے جو خالد کے لشکر میں شریک تھے انہیں ہتھیار باندھے ہوئے دیکھا تو کہا:۔

انا المسلمون فقالوا ونحن المسلمون قلنا وما بال السلاح معکم قالوا لنا ما بال السلاح معکم قلنا فان کنتم کما تقولون فضعوا السلاح قال فوضعوا ثم صلینا وصلوا۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۵۰۳)

"ہم مسلمان ہیں انہوں نے کہا ہم بھی مسلمان ہیں کہا کہ پھر یہ ہتھیار کیوں باندھ رکھے ہیں انہوں نے کہا تم کیوں ہتھیار لئے ہوئے ہو ہم نے کہا کہ اگر تم اپنے قول کے مطابق مسلمان ہو تو ہتھیار اتار ڈالو۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار اتار دیئے پھر ہم نے بھی نماز ادا کی اور انہوں نے بھی نماز پڑھی۔"

جب بنی یربوع سے ہتھیار اتروا لئے گئے تو مالک ابن نویرہ کو گرفتار کر کے خالد کے سامنے لایا گیا۔ مالک کی گرفتاری پر ان کی بیوی ام تمیم بنت منہال ان کے پیچھے باہر نکل آئی۔ ابن واضح یعقوبی لکھتے ہیں:۔

اتبعتہ امرأتہ فلما رآھا اعجبتہ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۱۰)

"ان کی بیوی ان کے پیچھے پیچھے آئی خالد نے اسے دیکھا تو انہیں پسند آ گئی۔"

مالک جو خالد کی خو بو سے واقف تھے انہیں تیور بُرے نظر آئے تو سمجھ گئے کہ انہیں سنگ راہ سمجھ کر کسی بہانے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں:۔

روی ثابت ابن قاسم فی الدلائل ان خالدا رأی

"ثابت ابن قاسم دلائل میں روایت کرتے ہیں کہ جب خالد نے مالک کی بیوی کو دیکھا کہ جو حسن

امرأة مالك وكانت فائقة في الجمال فقال مالك فقتلني۔ (اصابہ۔ ج ۳۔ ص ۳۳۶)

وجمال میں بے مثال تھی تو مالک نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ تو نے میرے قتل کا سر و سامان کر دیا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خالد نے ایک بہانہ تلاش کر لیا جس سے قتل کا جواز پیدا کر لیا گیا اور وہ یہ کہ گفتگو کے دوران مالک کی زبان سے ایک آدھ بار یہ جملہ نکلا:۔

ما اخال صاحبکم الا قال کذا وکذا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۴۳)

میرا خیال یہ ہے کہ تمہارے صاحب (ابو بکر) نے ایسا اور ایسا کہا ہو گا۔"

اس پر خالد نے بگڑ کر کہا کہ تم انہیں بار بار ہمارا صاحب کہتے ہو کیا تم انہیں اپنا صاحب نہیں مانتے اور ساتھ ہی ضرار ابن ازور کو اشارہ کیا کہ انہیں قتل کر دے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر تلوار چلائی اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر سپاہ خالد بنی یربوع پر ٹوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سو افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور کٹے ہوئے سروں کے چولہے بنا کر ان پر دیگچیاں چڑھا دی گئیں۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

ان اهل العسکر اثفوا برؤسهم القدور۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۵۰۳)

لشکر والوں نے ان کے سروں کے چولہے بنا کر ان پر دیگچیاں چڑھا دیں۔"

اس قتل و خونریزی اور مظاہرہ بربریت کے بعد خالد بن ولید نے مالک کی بیوی ام تمیم کے سلسلہ میں مزید اخلاق سوزی کا ثبوت دیا جس سے لشکر میں عام نفرت پھیل گئی ابو قتادہ انصاری اتنا متاثر ہوئے کہ خالد کا ساتھ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔

وقد کان عهد الله ان لا یشهد مع خالد ابن الولید حربا ابدا بعدها (تاریخ طبری۔ ج ۲ ص ۵۰۳)

اور اللہ سے یہ عہد کیا کہ وہ اس کے بعد کبھی خالد ابن ولید کے ساتھ کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔"

ابو قتادہ کی واپسی پر جب اس افسوس ناک واقعہ کی خبر عام ہوئی تو اہل مدینہ نے خالد کے اس فعل پر نفرین و ملامت کی اور حضرت عمر بھی انتہائی برافروختہ ہوئے۔ چنانچہ جب خالد پلٹ کر آئے اور بڑی شان و شکوہ اور فاتحانہ انداز سے عمامہ میں تیر آویزاں کئے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت عمر نے بڑھ کر ان کے عمامہ سے تیر کھینچ لئے اور توڑ پھوڑ کر پیروں تلے روند ڈالے اور بگڑ کر کہا:۔

قتلت امرأ مسلما ثم نزوت علی امرأته والله لارجمنك

تم نے ایک مرد مسلمان کو قتل کیا پھر اس کی بیوی پر مجرمانہ حملہ کیا۔ خدا کی قسم میں تمہیں سنگسار

باحجادك ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صفحہ ۵۰۴) کروں گا۔"

حضرت عمر یہ چاہتے تھے کہ خالد کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا جائے یا مالک کے قصاص میں قتل کیا جائے یا کم از کم انہیں معزول کر دیا جائے مگر حضرت ابو بکر نے یہ کہہ کر ٹال دیا:۔

هیه یا عمر تاول فاخطأ فارفع	ٹھہرو اے عمر اس نے تاویل کی اور اس میں غلطی کی
لسانك عن خالد۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲ صفحہ ۵۰۳)	لہٰذا اس کے بارے میں لب کشائی نہ کرو۔"

اس واقعہ کے بعد مالک کے بھائی متمم ابن نویرہ مدینہ میں آئے۔ نماز صبح مسجد میں ادا کی اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے فراق میں چند دردناک اشعار پڑھے اور جب یہ شعر پڑھا:۔

ادعوته بالله ثم قتلته لو هو دعاك بذمة لم يغدر

"تم نے اللہ کے نام پر اسے بلایا اور پھر اس سے غدر و بے وفائی کی اگر وہ تمہیں کسی امر کی دعوت دیتا تو کبھی بے وفائی نہ کرتا۔"

تو حضرت ابو بکر نے کہا کہ ما غدرته وما قتلته۔ "میں نے اسے قتل کیا ہے اور نہ اس سے غداری کی ہے۔" اور پھر حکم دیا کہ اس بے گناہ خون کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

فامر ابو بکر برد السبی و ودی	حضرت ابو بکر نے حکم دیا کہ اسیروں کو واپس کیا جائے
مالکا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۴۳)	اور مالک کے خون کی دیت ادا کی۔"

ان واقعات کو دیکھنے کے بعد اس یکطرفہ جنگ کو جہاد سے تعبیر کرنا اسلامی جہاد کے مفہوم کو بدل دینے کے مترادف ہے۔ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ مسلمانوں کو نہتا کر کے انہیں تہ تیغ کر دیا جائے۔ یہ اقدام نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی تھا بلکہ حضرت ابو بکر کے صریحی احکام کے بھی خلاف تھا حضرت ابو بکر نے خالد کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ اگر کسی بستی سے اذان و اقامت کی آواز آئے تو اس پر حملہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

وكان مما اوصى به ابو بكر	حضرت ابو بکر نے منجملہ اور ہدایتوں کے ایک ہدایت
اذا نزلتم منزلا فاذنوا واقيموا	یہ کی تھی کہ جب کسی مقام پر اترو تو اذان و اقامت
فان اذن القوم واقاموا فكفوا	کہو اگر وہاں کے لوگ بھی اذان و اقامت کہیں تو
عنهم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صفحہ ۵۰۲)	ان پر حملہ آور ہونے سے باز رہو۔"

مگر یہاں ابو قتادہ انصاری عبد اللہ ابن عمر اور دوسرے مسلمان بنی یربوع کو اذان و اقامت دیتے اور نمازیں پڑھتے دیکھتے ہیں اور ان کے اسلام کی گواہی دیتے ہیں مگر اس کے باوجود انہیں بے دریغ قتل کر دیا جاتا

ہے۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے :۔

وکان ممن شهد لمالك بالاسلام ابوقتادہ الحارث ابن ربعی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲، ص ۵۰۳)

ان لوگوں میں سے جنہوں نے مالک ابن نویرہ کے اسلام کی گواہی دی تھی ایک ابو قتادہ حارث ابن ربعی تھے۔"

انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ غلط اقدام کو غلط سمجھا جائے اور ایک فرد کے اقدام کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ارتداد پہ زور نہ دیا جائے کیا کسی مسلمان کو مرتد قرار دے لینا کوئی جرم نہیں ہے اگر خالد صحابی رسول تھے تو مالک اور ان کے ہمراہی بھی تو زمرۂ صحابہ میں شامل تھے تعجب ہے کہ یہ مان لینے میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ پیغمبر کے بعد ارتداد ہمہ گیر ہو گیا اور قبیلوں کے قبیلے اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گئے اور یہ کہنا گوارا نہیں کیا جاتا کہ انہوں نے ارتداد اختیار نہیں کیا بلکہ اس اقتدار کو تسلیم نہیں کیا جو ان کے سروں پر جمہوریت کے نام سے مسلط کر دیا گیا تھا۔ کیا اس انکارِ خلافت کے علاوہ کسی ایسی چیز کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس سے ان کا ارتداد ظاہر ہوتا ہو۔ رہا ادائے زکوٰۃ سے انکار تو وہ انکار خلافت ہی کا لازمہ تھا اس لئے کہ جب ان کے نزدیک حکومت ہی ناجائز تھی تو اس کی تحویل میں زکوٰۃ دینا کیونکر جائز ہو سکتا تھا ورنہ وہ نمازیں پڑھتے زکوٰۃ دیتے اور احکام اسلام پر کاربند تھے۔ چنانچہ حضرت عمر نے بھی ان کے اسلام کا اعتراف کیا اور حضرت ابوبکر نے بھی ان پر جرم ارتداد عائد نہیں کیا۔ اگر حضرت ابوبکر انہیں مرتد سمجھتے تو خالد ابن ولید کے بارے میں تاول فاخطأ (تاویل کی اور اس میں غلطی کی) کے بجائے تاول فاصاب (تاویل کی اور درست کیا) کہتے اور متمم ابن نویرہ کے طلب قصاص پر یہ کہتے کہ قصاص کیسا وہ ارتداد کے جرم میں قتل کئے گئے ہیں لیکن یہ کہنے کے بجائے بیت المال سے ان کی دیت دے کر ان کے اسلام کا اعتراف کرتے ہیں ورنہ کوئی وجہ جواز نہ تھی کہ ایک مرتد کے خون کی دیت بیت المال سے ادا کی جاتی۔ البتہ انہوں نے خالد کے جرم سے چشم پوشی کی اور اسے خطائے اجتہادی کے پردہ میں چھپا دیا۔ عموماً خطائے اجتہادی کی آڑ وہیں لی جاتی ہے جہاں جرم کو چھپانا اور مجرم کو جرم کی پاداش سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔ ورنہ اسلام کے ایک واضح اور صریح حکم کے خلاف اجتہاد کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں۔ اگر اس قسم کے جرائم کی پردہ پوشی اجتہاد کے ذریعہ ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں کوئی جرم، جرم ہی نہ رہے گا اور بڑے سے بڑے جرم کو خطائے اجتہادی کہہ کر ٹال دیا جائے گا۔

یہ اسلام میں پہلا دن تھا جب تاویل کا سہارا لے کر ایک مجرم کی جرم پوشی کی گئی اور اس کے بعد تو تاویل کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا گیا اور ہر جرم کے لئے تاویل کی گنجائش پیدا کر لی گئی۔ چنانچہ تاریخ

ایسے واقعات کی نشاندہی کرتی ہے۔ جہاں خطائے اجتہادی کی آڑ میں ہزاروں مسلمانوں کے لئے خون بہائے گئے۔ سینکڑوں بستیاں نذر آتش کی گئیں اور شہروں کے شہر تباہ و برباد کر دیئے گئے مگر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے خلاف زبان کھول سکے کیونکہ یہ تمام حوادث خطائے اجتہادی کا نتیجہ تھے اور خطائے اجتہادی جرم نہیں ہے خواہ نص صریح کو پس پشت ڈال کر محرمات کا ارتکاب کیا جائے یا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل جائے۔

حیرت ہے کہ حضرت ابوبکر نے کس اصول کی بنا پر خالد کے جرم کو تاویل کی غلطی کا نتیجہ قرار دیا اور انہیں مواخذہ سے بالاتر سمجھ لیا کیا قتل مسلم کے عدم جواز میں اور بیوہ کے لئے عدہ یا کنیز کے لئے استبراء کے وجوب میں عقل ورائے سے تاویل کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ اسلام کے صریحی احکام کی خلاف ورزی کو خطائے اجتہادی قرار دے لیا جائے اور شریعت کو شخصی رجحانات اور ذاتی خواہشات کے تابع کر دیا جائے۔ بہرحال جرم، جرم ہے اور خطائے اجتہادی سے نہ کسی مسلمان کے قتل کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی امر حرام کو سبک ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ابن ابی الحدید معتزلی نے باوجودیکہ خالد کی برأت ثابت کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارے ہیں مگر آخر میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے ہے۔

ولست انزہ خالدا عن الخطأ واعلم انہ کان جبارا فاتکا لا یراقب الدین فیما یحملہ علیہ الغضب وھوی نفسہ ولقد وقع منہ فی حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ مع بنی جذیمۃ اعظم ما وقع منہ فی حق مالک ابن نویرۃ وعفا عنہ رسول اللہ بعد ان غضب علیہ مدۃ واعرض عنہ وذلک العفو ھو الذی اطمعہ حتی فعل ببنی یربوع ما فعل بالبطاح۔

(شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۱۸۷)

میں خالد کو جرم سے بری قرار نہیں دیتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جابر و سفاک تھا جس چیز پر اسے طیش اور نفسانی خواہش اُبھارتی وہ اس میں دین کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی زندگی میں بنی جذیمہ کے ساتھ جو اس نے کیا وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا جو مالک ابن نویرہ کے ساتھ کیا۔ رسول اللہ ایک عرصہ تک اس پر غضب ناک رہے اور اس سے منہ پھیرے رکھا۔ پھر درگزر سے کام لیا اور اسی درگزر کی وجہ سے اس کی ہمت بڑھی اور مقام بطاح میں بنی یربوع کے ساتھ وہ کیا جو اس نے کیا۔"

استخلاف

سقیفہ بنی ساعدہ میں جمہوریت پر خلافت کی نیو رکھی گئی تھی وہ جمہوریت جیسی کچھ بھی تھی بعد میں قائم نہ رہ سکی اور نمائندہ جمہور کے ہاتھوں اس کا تار و پود بکھر گیا اور اس کی جگہ نامزدگی نے لے لی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے بستر مرگ پر حضرت عمر کو نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور عبدالرحمٰن ابن عوف اور حضرت عثمان کو بلا کر ان کا عندیہ دریافت کیا۔ عبدالرحمٰن یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ آپ کی رائے صائب ہے لیکن ان میں سختی و درشتگی کا عنصر غالب ہے اور حضرت عثمان نے اس سے پوری ہمنوائی کی اور امامت کے لئے اسے فال نیک قرار دیا۔ اس گفت و شنید کے بعد حضرت ابوبکر نے انہیں رخصت کر دیا۔ اور پھر تنہائی میں حضرت عثمان کو وثیقۂ خلافت قلمبند کرنے کے لئے طلب کیا۔ جب وثیقہ لکھوانے بیٹھے تو ابھی سرنامہ ہی لکھوایا تھا کہ شدت مرض سے بیہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان جانتے تو تھے ہی کہ کیا لکھوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس بیہوشی کے وقفہ میں لکھ دیا کہ:۔ قد استخلفت علیکم عمر ابن الخطاب ”میں نے عمر ابن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے“ جب غشی سے افاقہ ہوا تو پوچھا کہ کیا لکھا ہے حضرت عثمان نے جو لکھا تھا پڑھ کر سنا دیا۔ کہا کیا تم نے نام لکھنے میں جلدی اس لئے کی ہے کہ مبادا میں لکھوا نہ سکوں اور مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا ہو جائے کہا کہ ہاں یہی وجہ تھی۔ کہا کہ خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے۔

اس وصیت نامہ کی تحریر کے بعد حضرت عمر کو بلا کر کہا کہ وصیت نامہ اپنے پاس رکھو اور لوگوں سے کہو کہ جو فرمان اس کے اندر ثبت ہے اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان کریں حضرت عمر نے وہ وصیت نامہ لے لیا اور لوگوں سے عہد لیا کہ وہ دستاویزی حکم کے پابند رہیں گے۔ ایک شخص نے پوچھ لیا کہ اس میں لکھا کیا ہے حضرت عمر نے کہا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے البتہ جو کچھ اس میں درج ہے میں برضا و رغبت اسے تسلیم کروں گا۔ اس شخص نے کہا:۔

لکن واللہ ادری مافیہ امرتہ عام اول وامرک العام۔

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱، صـ ۲۳)

”لیکن خدا کی قسم مجھے معلوم ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تم نے گزشتہ سال انہیں خلیفہ بنایا تھا۔ اور اب وہ تمہیں خلیفہ بنائے جاتے ہیں“

جب یہ خبر عام ہوئی تو کچھ لوگ ”رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند“ کے پیش نظر خاموش رہے اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ حضرت ابوبکر کے ہاں آیا اور کہا:۔

یاخلیفۃ رسول اللہ ماذا تقول لربك اذا قدمت علیه و قد استخلفت علینا ابن الخطاب ۔ (تخلیص الحبیر۔ صہ۳۴۵)

اے نائب رسول تم نے ابن خطاب کو خلیفہ بنا کر ہم پر حاکم ٹھہرا دیا ہے کل جب پروردگار کے حضور میں پیش ہوگے تو اسے کیا جواب دوگے۔"

طلحہ ابن عبید اللہ نے بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

استخلفت علی الناس عمر و قد رأیت ما یلقی الناس منه و انت معه فکیف به اذا خلا بهم و انت لاق ربك فسألك عن رعیتك ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ صہ۶۲۱)

تم نے لوگوں پر عمر کو خلیفہ و حاکم مقرر کر دیا ہے اور تم جانتے ہو کہ تمہارے ہوتے ہوئے لوگوں کو ان کے ہاتھوں کتنی ناگوار صورتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اب تو انہیں کھلی چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنے پروردگار کے حضور جا رہے ہو وہ تم سے رعایا کے بارے میں سوال کرے گا۔"

جمہوریت کی نمائش کرنے والی حکومتوں کا شیوہ رہا ہے کہ جب تک اقتدار حاصل نہیں ہوتا بڑے شد و مد سے انتخاب کا حق عوام کے لئے تسلیم کرتے ہیں اور جب اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو پھر حکمران عوام کی مرضی و منشا کو نظر انداز کر کے اقتدار کی قوت سے یہ حق اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں اور جمہوریت سمٹ کر ایک فرد یا چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ سقیفۂ بنی ساعدہ کی جمہوریت کا بھی یہی نتیجہ نکلا اور دو ڈھائی برس کی مختصر مدت میں نامزدگی کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اگر یہ نامزدگی صحیح تھی تو یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ خلیفہ کا انتخاب جمہور کی رائے کے تابع نہیں ہے۔ اور اگر جمہور کی رائے ہی سے وابستہ ہے۔ تو اس نامزدگی کو کسی صورت میں صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابو بکر نمائندہ جمہور تھے اور جمہور نے انہیں سفید و سیاہ کا مالک بنا دیا تھا اسے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو جمہور نے استخلاف و انتخاب کا حق تو اُن کے سپرد نہیں کیا تھا اور نہ کسی جمہوری حکومت میں نمائندہ حکومت کو یہ حق تفویض کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکر کا یہ انتخاب رائے عامہ کا ترجمان تھا اور انہوں نے جانچ پرکھ کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ عوام حضرت عمر ہی کو مسند خلافت پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو رائے عامہ پر اعتماد کرتے اور نام کو صیغۂ راز میں رکھ کر عوام سے عہد اطاعت لینے کے بجائے ان کی رائے پر چھوڑ دیتے یا لوگوں کو اپنے ہاں جمع کر کے اعلان عام کرتے اور ان کا ردعمل دیکھ کر فیصلہ کرتے۔ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا تو حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن ابن عوف سے جن میں سے

ایک نے مخالفت کو بے سود سمجھ کر ہاں میں ہاں ملا دی اور دوسرے نے اقتدار نو کو اپنی وفاداری کا تاثر دینے کے لئے پُر زور تائید کر دی۔ ان دو آدمیوں کی ہمنوائی کو عوام کی رائے تو نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اہل حل و عقد سے مشورہ ہی مطلوب تھا تو عباس ابن عبدالمطلب تھے۔ جن کے بارے میں پیغمبر نے فرمایا تھا کہ ھو عمی و بقیۃ آبائی۔ (وہ میرے چچا اور میرے آبا کی یادگار ہیں) حضرت علی بھی موجود تھے جنہوں نے پیغمبر اکرم کا ہاتھ بٹا کر اسلام کو تکمیل کی منزل تک پہنچایا تھا اور تمام آسائشوں کو تج کر اپنی ذات کو اسلام اور اہل اسلام کے مفاد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انہیں بلاوا نہ دینے کا تو عذر تھا کہ پیغمبر کی تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر کیسے آتے مگر یہاں مشورہ لینے میں کیا مانع تھا حیرت ہے کہ غزوات اور دوسرے معاملات میں تو ان سے مشورے لئے جاتے رہے اور ان کی اصابت رائے اور بلند نفسی کا اعتراف کیا جاتا رہا مگر اس اہم معاملہ میں ان کی رائے کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے اور ان کی بے غرضی و بے لوثی پر اعتماد نہ تھا تو ان سے مشورہ لینے میں مضائقہ ہی کیا تھا کیا اس لئے انہیں نظر انداز کیا گیا کہ ارشادات پیغمبر کی روشنی میں اس ثقلین ثانی و سفینہ نجات کا حق فائق تھا اور انہیں سطوت و اقتدار سے متاثر کر کے اپنا ہمنوا بنایا نہیں جا سکتا تھا۔

بہر حال جنہوں نے سقیفہ کی برائے نام جمہوریت کے آگے سر خم کر کے حضرت ابوبکر کو خلیفہ مان لیا تھا انہوں نے اس نامزدگی کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور حضرت عمر کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ حضرت ابوبکر دو سال تین ماہ اور دس دن مسند خلافت پر متمکن رہنے کے بعد ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ کو دنیا سے رخصت ہو گئے اور اسی دن حضرت عمر نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

شوریٰ

حضرت عمر کو عالم اسلامی کی باگ ڈور سنبھالے دس سال چھ ماہ اور چار دن بیت چکے تھے کہ مغیرہ ابن شعبہ کے غلام ابو لؤلؤ فیروز نے کسی بات پر بگڑ کر دو دھارے خنجر سے ان پر حملہ کیا اور انہیں بری طرح گھائل کر دیا۔ کچھ لوگ انہیں اٹھا کر گھر لائے دوا دارو کے لئے معالج بلایا گیا مگر شکم کا گھاؤ اتنا گہرا تھا کہ جب انہیں نبیذ پلائی گئی تو زخم کے راستے نکل گئی اور جانبر ہونے کی کوئی امید نہ رہی۔ اس ناگہانی حادثہ سے ہر شخص حیرت زدہ و دم بخود تھا۔ مسند خلافت خالی اور دس سالہ دور اقتدار ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے باہم سرگوشیاں کرتے اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے کہ حضرت عمر اس کاری ضرب سے جانبر تو ہوتے نظر نہیں آتے خلافت کا بار کون اٹھائے گا خلیفہ کا انتخاب

کس طرح عمل میں آئے گا۔ کسی کو نامزد کریں گے یا رائے عامہ پر چھوڑ جائیں گے کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ وُہ خود ہی کسی کو مقرر کر جائیں اور ہم انتخاب کے الجھیڑے بکھیڑے میں نہ پڑیں۔ چنانچہ چند اکابر صحابہ حضرت عمر کے ہاں احوال پرسی کے لئے آئے اور ان کی حالت دگرگوں دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ کسی کو خلافت کے لئے نامزد کر جایئے۔ حضرت عمر نے حسرت آمیز لہجے میں کہا کہ میں کسے نامزد کروں آج ابوعبیدہ زندہ ہوتے تو خلافت ان کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا اور اللہ مجھ سے پوچھتا تو کہتا کہ میں نے خلافت ان کے سپرد کی ہے جسے تیرے نبی نے امین امت کہا تھا یا ابوحذیفہ کا غلام سالم ہوتا تو یہ منصب اس کے حوالے کرتا اور اللہ سے کہتا کہ میں نے مسلمانوں کی قیادت ایسے شخص کے ہاتھوں میں دی ہے جس کے بارے میں تیرے نبی نے فرمایا تھا کہ وہ اللہ سے بے حد محبت کرنے والا ہے۔ ابن قتیبہ نے معاذ ابن جبل اور خالد ابن ولید کا نام بھی اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ انہیں بھی خلافت کے لئے یاد کیا تھا۔ یزید ابن معاویہ کی ولیعہدی کے محرکِ اوّل مغیرہ ابن شعبہ نے حضرت عمر کو مشورہ دیا کہ وُہ اپنے بیٹے عبداللہ کو نامزد کر جائیں۔ اس پر حضرت عمر نے کہا:۔

قاتلك الله والله ما اردت الله بهذا ويحك كيف استخلف رجلا عجز عن طلاق امرأته

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۹۲)

”خدا تمہیں غارت کرے بخدا تم نے یہ بات اللہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہی میں اس شخص کو کیسے خلیفہ بنادوں جو اپنی بیوی کو طلاق دینے سے بھی عاجز و بے خبر ہو۔“

ابن حجر مکی نے تحریر کیا ہے:۔

اى لانه فى زمن رسول الله طلقها فى الحيض فقال لعمر مره فيراجعها۔

(صواعق محرقہ۔ صفحہ ۱۳۴)

”یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف کہ عبداللہ نے پیغمبر کے زمانہ میں اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی جس پر آنحضرتؐ نے حضرت عمر سے کہا کہ اسے کہو کہ وہ رجوع کرے۔“

حضرت عمر نے مغیرہ کی بات کو رد کرنے کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کروں تو کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ ابوبکر نے مجھے خلیفہ مقرر کیا اور وہ مجھ سے بہتر تھے۔ اور اگر مقرر نہ کروں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ پیغمبرؐ نے کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا اور وُہ ہم دونوں سے بہتر تھے اس عرصہ میں حضرت عائشہ نے عبداللہ ابن عمر کے ذریعہ انہیں یہ پیغام بھجوایا کہ وُہ امت کو انتشار و پراگندگی میں چھوڑنے کے بجائے کسی کو خلیفہ مقرر کر جائیں اور خود عبداللہ ابن عمر نے بھی جانشین کی نامزدگی پر زور دیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر چکا ہوں اور غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے: کہ

علی ابن ابی طالب، عثمان ابن عفان، عبدالرحمٰن ابن عوف، سعد ابن ابی وقاص، زبیر ابن عوام اور طلحہ ابن عبیداللہ کو نامزد کر کے ایک مجلس شوریٰ ترتیب دوں۔ پیغمبر اکرم ان افراد سے زندگی کے آخری لمحوں تک راضی و خوشنود رہے یہ اس لائق ہیں کہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ جب تنہائی ہوئی تو کہا کہ اگر یہ لوگ علی کی خلافت پر اتفاق کر لیں تو وہ امت محمدیہ کو حق و صداقت کی راہ پر چلائیں گے۔ عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ اگر علی کے بارے میں آپ کا یہ نظریہ ہے تو انہیں براہ راست خلیفہ مقرر کر دیجئے۔ کہا:۔

اکرہ ان اتحملها حیا ومیتا۔ — مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میں زندگی و موت دونوں حالتوں میں اس بوجھ کو اٹھاؤں۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۳)

مجلس شوریٰ کا خاکہ ترتیب دینے کے بعد منتخب ارکان کو اپنے ہاں طلب کیا تا کہ انہیں مجوزہ لائحہ عمل سے آگاہ کریں۔ جب ارکان شوریٰ ان کے ہاں جمع ہوئے تو کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص طالب خلافت ہے اس پر زبیر خاموش نہ رہے اور کہا کہ ہمیں خلافت کی طلب ہونا ہی چاہیئے۔ ہم سبقت میں قرابت میں مرتبہ و مقام میں تم سے کم نہیں ہیں۔ اگر تم خلیفہ ہو سکتے ہو تو ہمارے ہاتھوں میں بھی زمام خلافت آ سکتی ہے۔ ابن ابی الحدید نے کہا ہے کہ حضرت عمر زخمی پڑے تھے۔ اس لئے زبیر کا انداز گفتگو بے باکانہ تھا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو اس طرح کی بے باکی و جرأت کا مظاہرہ نہ کرتے۔ حضرت عمر اس بات پر تو خاموش رہے البتہ ارکان شوریٰ پر جو تبصرہ کیا اس سے ان کی برہمی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ زبیر سے مخاطب ہو کر کہا اے زبیر تم حریص تنگدل اور کج خلق ہو غصہ میں ہو تو کافر خوش ہو تو مومن اگر تمہیں خلافت مل گئی تو تم سیر آدھ سیر جو کے لئے لوگوں سے لڑتے جھگڑتے پھرو گے۔ پھر طلحہ کے بارے میں کہا کہ وہ مغرور اور نخوت پسند ہے اس نے ایک موقع پر ایسی ناسزا بات کہی تھی جس سے پیغمبر اکرم کو بہت دکھ پہنچا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اس سے ناخوش رہے۔ پھر سعد کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تم تیر انداز تو اچھے ہو مگر خلافت تمہاری زد سے باہر ہے۔ اس لئے کہ تم قبیلہ بنی زہرہ سے ہو اور بنی زہرہ کو خلافت سے کیا تعلق۔ اور عبدالرحمٰن ابن عوف سے کہا کہ تم آرام طلب اور آسائش پسند ہو اگر تم خلیفہ ہوئے تو خلافت کا کاروبار اپنی بیوی پر چھوڑ دو گے۔ ابن قتیبہ نے یہ الفاظ روایت کئے ہیں:۔

ما یمنعنی منك یا عبدالرحمٰن الا انك فرعون هذه الامة۔ — اے عبدالرحمٰن میں تمہیں خلافت دینے کو تو دے دیتا مگر تم اس امت کے فرعون ہو۔"

(الامامۃ والسیاسۃ۔ ص ۲۴)

حضرت عثمان سے کہا کہ اگر خلافت تمہارے سپرد کی گئی تو تم بنی امیہ و بنی عاص کو عوام کی گردنوں پر

مسلط کر دو گے اور بیت المال تمہارے قبیلہ کی جاگیر بن جائے گا۔ اور حضرت علی سے کہا کہ آپ ہر لحاظ سے خلافت کے لئے موزوں اور اس کے اہل ہیں۔ مگر آپ کے مزاج میں ظرافت و خوش طبعی کا عنصر غالب ہے۔

اس نقد و تبصرہ کے بعد ارکان شوریٰ سے کہا کہ تم تین دن کے اندر اندر خلافت کا تصفیہ کر لینا اور حسن ابن علی، عبداللہ ابن عباس اور چند اکابر انصار کو بھی شرکت کی دعوت دینا مگر اُن کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور ابو طلحہ انصاری مجلس شوریٰ کے ناظم و نگران ہوں گے۔ اور ابو طلحہ کو یہ ہدایت کی کہ میرے انتقال کے بعد ارکان شوریٰ کو حضرت عائشہ کے حجرہ میں جمع کرنا اور انہیں پابند کر دینا کہ وُہ مقررہ مدت کے اندر خلافت کا فیصلہ کر لیں اور اس عرصہ میں امامت نماز کے فرائض صہیب رومی انجام دیں۔ اگر تمام ارکان باتفاق رائے ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں تو بہتر ورنہ پانچ ایک طرف ہوں اور ایک مخالف ہو تو اس ایک کو قتل کر دینا اور چار متفق ہوں اور دو مخالف ہوں تو ان دو کو قتل کر دینا۔ اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو میرے بیٹے عبداللہ کو ثالث ٹھہرانا وہ جس فریق کے بارے میں رائے دے خلیفہ کا انتخاب اس فریق میں سے کیا جائے۔ اور عبداللہ کو یہ تلقین کی۔

یا عبد اللہ ابن عمران اختلف القوم فکن مع الاکثر و ان کانوا ثلاثۃ و ثلاثۃ فاتبع الحزب الذی فیہ عبد الرحمٰن۔	اے عبداللہ اگر قوم میں اختلاف ہو تو تم اکثریت کا ساتھ دینا اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو تم اس فریق کا ساتھ دینا جس میں عبدالرحمٰن ہو۔

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۵)

حضرت عمر تین دن موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد دنیا سے چل بسے۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی تو حضرت عائشہ کے حجرہ میں یا عبدالرحمٰن ابن عوف کے بھانجے مسور ابن مخرمہ کے مکان پر مجلس شوریٰ منعقد ہوئی اور ابو طلحہ پچاس آدمیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ مغیرہ ابن شعبہ اور عمرو ابن عاص بھی اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے دروازے پر آ کر بیٹھ گئے۔ سعد ابن وقاص نے انہیں دھرنا مار کر بیٹھے دیکھا تو ان پر کنکریاں پھینکیں اور کہا:-

تریدان ان تقولا حضرنا وکنا فی اهل الشوریٰ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۵)	تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہم بھی اہل شوریٰ میں شامل تھے۔

یہ دونوں ڈھیلے کھا کر وہاں سے چل دیے اور شوریٰ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ طلحہ اور سعد نے اپنا حق رائے دہندگی حضرت عثمان کو دے دیا اور زبیر نے اپنا حق حضرت علی کے حوالے کر دیا۔ اب علی عثمان اور عبدالرحمٰن

تین اُمیدوار رہ گئے۔ عبدالرحمٰن نے علی اور عثمان سے کہا کہ تم دونوں میں سے ایک اپنے حق سے دستبردار ہو کر بقیہ دو میں سے ایک کو منتخب کرنے کا حق لے لے یا میں اپنے حق سے دستبردار ہو کر تم دونوں میں سے ایک کو منتخب کئے لیتا ہوں۔ علی اور عثمان دونوں میں سے کوئی اپنے حق سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ پھر مجھے ثالث مان لو۔ حضرت عثمان عبدالرحمٰن کی ثالثی پر فوراً رضامند ہو گئے۔ حضرت علی نے انہیں ثالث تسلیم کرنے میں توقف کیا۔ جب آپؑ زور دیا گیا تو فرمایا کہ میں اس صورت میں تمہاری ثالثی منظور کر سکتا ہوں کہ تم یہ عہد کرو کہ خواہش نفس سے مغلوب ہو کر حق سے بے راہ نہیں ہو گے اور قرابت و عزیز داری کا پاس نہیں کرو گے۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہو گا اور میں وہی فیصلہ کروں گا جو حق و صداقت کا تقاضا ہو گا۔ جب عبدالرحمٰن نے ثالثی کا اختیار لے لیا تو ارکانِ شوریٰ کے ساتھ مہاجرین و انصار کو مسجد میں جمع کیا اور ان سے کہا کہ تم کسے خلیفہ منتخب کرنا چاہتے ہو۔ عمار ابن یاسر نے مہاجرین و انصار سے کہا کہ اگر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ مسلمانوں میں اختلاف و انتشار پیدا نہ ہو تو علی کی بیعت کر لو۔ مقداد ابن اسود نے اس کی تائید کی اور کہا کہ اگر تم علی کی بیعت کرو گے تو ہم اسے برضا و رغبت منظور کریں گے۔ عبداللہ ابن ابی سرح اور عبداللہ ابن ربیعہ نے عثمان کے بارے میں رائے دی اس پر عمار اور ابن ابی سرح میں تلخ کلامی کی نوبت آ گئی۔ عبدالرحمٰن نے جب بات بڑھتے دیکھی تو کہا اے لوگو خاموش ہو جاؤ۔ پھر حضرت علی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

عليك عهد الله و ميثاقه لتعلمن بكتاب الله وسنة رسوله وسيرة الخليفتين من بعده۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۷)	آپ یہ عہد و پیمان کریں کہ اللہ کی کتاب رسولؐ کی سنت اور دونوں خلیفوں کی سیرت پر عمل کریں گے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا:۔

ارجو ان افعل واعمل بمبلغ علمي وطاقتي۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۷)	میں امید کرتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم و طاقت کی رسائی ہے اس کے مطابق عمل کروں گا۔

پھر حضرت عثمان سے یہی بات کہی انہوں نے فوراً سیرت شیخین کی پابندی کا اقرار کر لیا جس پر عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ حضرت علی نے یہ صورت دیکھی تو فرمایا:۔

ليس هذا اول يوم تظاهرتم فيه علينا فصبر جميل والله	یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم نے ہم پر زیادتی کی ہو اب صبرِ جمیل کے علاوہ کیا چارہ ہے۔ اور جو

المستعان علیٰ ما تصفون واللہ	باتیں تم کرتے ہو اس پر اللہ ہی مددگار ہے۔ خدا کی
ما ولیت عثمان الا لیرد الامر	قسم تم نے عثمان کو اس اُمید پر خلافت دی ہے کہ
الیك واللہ کل یوم فی شان۔	وُہ اسے کل تمہارے حوالے کر جائے اور اللہ ہر روز
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۳۰)	(بندوں کے) کسی نہ کسی کام میں ہے“

حضرت عثمان کے ہوا خواہ اور بنی امیہ بیعت کے لئے بڑھے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کرکے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ مغیرہ ابن شعبہ جو مصلحت کوش اور اقتدار پرست تھا حضرت عثمان سے کہنے لگا کہ اگر عبدالرحمٰن کسی اور کی بیعت کرتے تو ہم اسے کبھی بھی تسلیم نہ کرتے۔ عبدالرحمٰن نے اس کی یہ خوشامدانہ روش دیکھی تو کہا:۔

کذبت یا اعور، لو بایعت غیرہ	اے بدبخت تو سراسر جھوٹ کہتا ہے اگر میں کسی اور
لبایعتہ ولقلت ھذہ المقالہ	کی بیعت کرتا تو تو بھی اس کی بیعت کرتا اور اس سے
(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۹۸)	بھی یہی کچھ کہتا“

حضرت عمر کے اس شورائی نظام سے حسب ذیل چند نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

(۱) خلیفہ کے لئے قرشی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ایک آزاد کردہ عجمی غلام بھی خلیفہ ہو سکتا ہے۔ اور حدیث الأئمة من قریش۔ انصار کے مقابلہ میں وقتی ضرورت کے لئے وضع کی گئی تھی جس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں ہے۔

(۲) جمہور کے اتفاق رائے سے خلیفہ کا انتخاب غیر ضروری ضابطہ ہے بلکہ خلیفہ وقت اپنی رائے سے کسی کو نامزد کرنے یا خلافت کو دو چار آدمیوں میں محدود کر دینے کا مجاز ہے۔

(۳) اگر اکثریت کی رائے کے خلاف کوئی آواز بلند کرے تو وہ سزائے قتل کا مستحق ہے خواہ وہ صحابی رسول کیوں نہ ہو۔

(۴) امت تین دن تک بغیر خلیفہ کے رہ سکتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک کے مرنے کے بعد فوراً دوسرے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ البتہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد جو تعجیل کی گئی اور آنحضرت کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظار نہ کیا گیا تو وہ صرف وقتی مصالح اور سیاسی حالات کا تقاضا تھا۔

(۵) وہ عیوب و قبائح جو اصحاب شوریٰ میں گنوائے گئے جیسے غرور و نخوت حرص دنیا کنبہ پروری، مالی خیانت اور ایذاء رسول وغیرہ استحقاق خلافت کے منافی نہیں ہیں۔ اور نہ امامت و خلافت کے لئے علمی عملی اور اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے۔

اس شوریٰ اور اس کے قبل کے انتخابی طریقوں پر نظر کی جائے تو انتخاب کے سلسلہ میں نہ کسی خاص

قاعدہ و قانون کا پتا چلتا ہے اور نہ کسی ضابطہ و اصول کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خلافت کا فیصلہ اہلِ حل و عقد یا جمہور کی رائے کے تابع ہے تو اکابر صحابہ جن میں ام المومنین حضرت عائشہ اور عبداللہ ابن عمر بھی شامل ہیں کس اصول کے ماتحت حضرت عمر کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کو نامزد کر جائیں کیا ان کے علم میں یہ چیز نہ تھی کہ خلیفہ کا تقرر اہل حل و عقد کی صوابدید اور جمہور کی رائے سے وابستہ ہے اور حضرت عمر اس کی تردید کرنے کے بجائے اس کا جواز حضرت ابوبکر کے عمل سے ثابت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ابوعبیدہؓ یا سالم زندہ ہوتا تو ان دو میں سے ایک کو خلیفہ مقرر کر جاتا اور اگر خلیفہ کا تقرر نامزدگی کے ذریعہ ہوتا ہے اور خلیفہ وقت کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی کو خلیفہ مقرر کر جائے تو پیغمبر کو یہ حق بدرجہ اولیٰ ہونا چاہئے تھا کہ وہ کسی کو منتخب کر جاتے جب کہ ان کی نظر انتخاب دوسروں کی نگاہِ انتخاب سے بہر حال بلند تر اور صائب تھی۔ حضرت عمر کہنے کو تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں کسی کو نامزد کروں تو سیرت ابوبکر کی پیروی ہو گی اور نامزد نہ کروں تو پیغمبرؐ کی اقتدا ہو گی۔ مگر عملاً ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر وہ راستہ اختیار کرتے ہیں جسے نہ رسولؐ کی اقتداً کہا جا سکتا ہے اور نہ خلیفہ اول کی پیروی نہ اسے فیصلہ جمہور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ نامزدگی سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نہ "مصلحتہً" کسی کا نام لینا چاہتے تھے اور نہ انہیں رائے عامہ پر اطمینان تھا کہ وہ وہی فیصلہ کرے گی جو خود ذہنی طور پر طے کئے ہوئے تھے۔ اس لئے چھ آدمیوں کا ایک محدود شوریٰ ترتیب دے دیا جو رائے عامہ سے آزاد اور طریق کار کے لحاظ سے کامیابی کی ضمانت تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے چند آدمیوں کے نام بھی لئے کہ ان میں کوئی زندہ ہوتا تو اسے خلیفہ مقرر کر جاتے ان میں سے ابو عبیدہ کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرشی بھی تھے اور سقیفۂ بنی ساعدہ کی کاروائی میں شریک کار بھی رہ چکے تھے اس لئے ان کا بھی ایک طرح سے حق تھا کہ انہیں خلافت میں شریک کیا جاتا مگر اکابر صحابہ کی موجودگی میں سالم کو خلافت کا اہل کیونکر سمجھ لیا گیا۔ جب کہ خلافت کے لئے قرشیت کو لازم قرار دے لیا گیا تھا۔ اور اسی قرشیت کی بنا پر مہاجرین نے انصار پر اپنی فوقیت ثابت کی تھی اور سالم نہ قرشی تھا اور نہ عرب بلکہ ابوحذیفہ کی بیوی بثینہ بنت یعار کا آزاد کردہ غلام تھا اور اس سلسلہ میں معاذ ابن جبل اور خالد ابن ولید کا نام لیا جانا بعید معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ معاذ ابن جبل انصار کے قبیلہ خزرج کی ایک فرد تھے اور حضرت عمر انصار کے حق خلافت سے انکار کر چکے تھے۔ رہے خالد ابن ولید تو حضرت عمر ان سے ایک لمحہ بھی خوش نہیں رہے۔ اور برسر اقتدار آتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انہیں معزول کر دیا۔ اور جب انہیں اپنے ماتحت رکھنا بھی گوارا نہیں کیا تو انہیں مسلمانوں کی امارت و قیادت کا اہل کیونکر سمجھ سکتے تھے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے :-

وکان اول کتاب کتبہ الی (خلافت کے بعد) حضرت عمر نے پہلا تحریری فرمان

ابی عبیدۃ ابن الجراح بتولیۃ جند خالد و بعزل خالد لانہ کان ساخطا علیہ فی خلافۃ ابی بکر کلھا لوقعتہ بابن نویرہ وما کان یعمل فی حربہ و اول ما تکلم بہ عزل خالد وقال لا یلی لی عملا ابدا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۲۹۳)	ابو عبیدہ جراح کے نام جاری کیا کہ وہ خالد کے لشکر کی امارت لے لیں اور اُسے برطرف سمجھیں اس لئے کہ حضرت عمر حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت سے اس پر ناراض چلے آرہے تھے۔ مالک ابن نویرہ پر حملہ آور ہونے اور ان افعال کی وجہ سے جن کا وہ جنگ میں مرتکب ہوا تھا۔ اور حضرت عمر نے پہلی بات بھی کی تو خالد کی برطرفی کے بارے میں اور یہ کہا کہ اسے میرے ماتحت کوئی عہدہ نہیں دیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں حضرت علی کا نام بھی لیا تھا مگر اس سے یہ کہہ کر پہلو بچائے گئے کہ میں اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ حیرت ہے کہ ابوعبیدہ اور سالم کے زندہ ہونے کی صورت میں یہ بار آسانی اٹھایا جا سکتا تھا۔ مگر حضرت علی کے تقرر کا بار ناقابلِ برداشت نظر آتا ہے اور ان کی اہلیت کا اعتراف کرنے کے باوجود شوریٰ پر بنا کی جاتی ہے اور خلافت کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے کسی کو نامزد نہیں کیا مگر یہ شوریٰ ایک طرح سے نامزدگی ہی تھا کیونکہ اس کا طریق کار ایسا تجویز کیا کہ تمام رائیں ایک رائے کے تابع ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جس کے بعد شوریٰ و نامزدگی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ چنانچہ پہلے تو یہ تجویز کیا کہ خلیفہ کثرت رائے سے منتخب کیا جائے اور ارکان وُہ منتخب کئے جن میں سے اکثریت کی تائید حضرت عثمان ہی کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے کہ عبدالرحمٰن حضرت عثمان کے بہنوئی تھے ان کی زوجہ ام کلثوم بنت عقبہ حضرت عثمان کی مادری بہن تھیں اور سعد ابن ابی وقاص عبدالرحمٰن کے ابن عم تھے ان دونوں کا تعلق قبیلہ بنی زہرہ سے تھا اور طلحہ ابن عبیداللہ حضرت ابوبکر کے قبیلہ بنی تیم سے تھے اس وجہ سے حضرت علی سے پرخاش رکھتے تھے اور اس کا فائدہ حضرت عثمان ہی کو پہنچتا تھا۔ البتہ زبیر ابن عوام کی رائے حضرت علی کے حق میں ہو سکتی تھی کیونکہ ان کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب حضرت علی کی پھوپھی تھیں اس صورت میں تین رائیں حضرت عثمان کے حق میں تھیں اور صرف ایک رائے حضرت علی کے حق میں تھی اور اگر طلحہ بھی آپ کے حق میں رائے دیتے تو دونوں فریق برابر ہو جاتے۔ اور دونوں فریق کے برابر ہونے کی صورت میں حضرت عمر یہ ہدایت دے گئے تھے کہ عبداللہ ابن عمر کو ثالث بنایا جائے اور اسے مامور کر گئے تھے کہ وہ اس فریق میں سے خلیفہ منتخب کرے جس فریق میں عبدالرحمٰن ہوں اور عبدالرحمٰن کے متعلق انہیں یقین تھا کہ وُہ حزب عثمان میں ہوں گے۔ اب فریق مخالف کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو اپنے ہاتھوں اپنے قتل کا سامان کرے یا عبدالرحمٰن کی ہمنوائی کرتے ہوئے حضرت عثمان کی

خلافت پر اتفاق کرلے۔ یہ تھا وہ چکر جس کے نتیجہ میں ہر پھر کے خلافت کی تان حضرت عثمان پر ٹوٹتی تھی اور تشکیل شوریٰ کا مقصد و مدعا بھی یہی تھا جو پہلے سے طے شدہ اور حضرت عمر کے ذہن میں محفوظ تھا۔ چنانچہ صاحب ریاض النضرہ لکھتے ہیں:۔

قیل لعمر وھو بالموقف من الخلیفه بعدك قال عثمان ابن عفان۔ (ریاض النضرہ۔ ص۱۵۳)	موقف حج میں حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا کہا عثمان ابن عفان۔"

امیرالمومنین نے شوریٰ کی ہیئت و ساخت کو دیکھ کر شوریٰ کی کاروائی سے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ خلافت حضرت عثمان کے پائے نام کی جارہی ہے اور عباس ابن عبدالمطلب سے کہہ دیا تھا:۔

عدلت عنا قال وما علمك قال قرن بی عثمان وقال کونوا مع الاکثر فان رضی رجلان رجلا ورجلان رجلا فکونوا مع الذین فیھم عبدالرحمٰن ابن عوف فسعد لا یخالف ابن عمه عبدالرحمٰن صھر عثمان۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص۲۹۴)	خلافت کا رُخ ہم سے موڑ دیا گیا ہے عباس نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرمایا کہ میرے ساتھ عثمان کو بھی لگا دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اکثریت کا ساتھ دو اور اگر دو ایک پر اور دو ایک پر رضامند ہوں تو تم ان لوگوں کا ساتھ دینا جن میں عبدالرحمٰن ابن عوف ہو۔ چنانچہ سعد تو اپنے چچیرے بھائی عبدالرحمٰن کا ساتھ دے گا اور عبدالرحمٰن تو عثمان کا بہنوئی ہوتا ہی ہے۔"

اگر حضرت عثمان ہی کو برسرِ اقتدار لانا تھا تو بہتر تھا کہ شوریٰ ترتیب دینے کے بجائے انہیں براہِ راست نامزد کردیتے تاکہ فتنہ و فساد اور خانہ جنگیوں کی ذمہ داری سے اپنے کو بچالے جاتے کیونکہ اسی رکنیت کی وجہ سے ارکان شوریٰ کے ذہنوں میں ہوس اقتدار نے کروٹیں لیں اور ان میں سے ہر فرد اپنے کو خلافت کا اہل تصور کرنے لگا جس نے افتراق و انتشار اور ذہنی تصادم کی صورت پیدا کردی اور اس ذہنی ٹکراؤ کے نتیجہ میں مسلمانوں میں خونریزی کا دروازہ کھل گیا اور طلحہ و زبیر اقتدار کی خاطر حضرت علی کے مقابلہ میں اُتر آئے حالانکہ زبیر شوریٰ سے قبل حضرت علی کے ہمدرد و خیر خواہ تھے۔ غرض اس شوریٰ سے جنگ و جدل کی بنیاد پڑگئی اور جمل و صفین اور نہروان ایسے خون ریز معرکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ابن عبدربہ نے تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابن حصین زیاد کے قاصد کی حیثیت سے معاویہ کے ہاں آیا۔ معاویہ نے ایک دن اسے تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ مسلمانوں میں انتشار و پراگندگی کا سبب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ قتل عثمان۔ معاویہ نے کہا کہ میں نے یہ سنا تھا

کہ تم بڑے زیرک اور معاملہ فہم ہو مگر تمہارا جواب بالکل سطحی ہے کہا محاربہ صفین کہا یہ بھی کوئی بات نہ ہوئی کہا معرکہ جمل کہا یہ بھی درست نہیں ہے کہا کہ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی کہا کہ مسلمانوں کی پریشانی و پاشانی کا اصل سرچشمہ چھ آدمیوں کا شوریٰ تھا جو حضرت عمر نے تشکیل دیا تھا:۔

فلم یکن رجل الارجا لنفسہ	چنانچہ ان میں سے ہر شخص خلافت کی توقع کرنے لگا
و رجاھا لہ قومہ و تطلعت	اور اقتدار کی طرف اس کے نفس کا جھکاؤ ہو گیا
الیٰ ذلک نفسہ۔	اور اس کا قوم قبیلہ بھی اس کے لئے خلافت کا خواہاں
(عقدالفرید۔ ج ۳۔ ص۷۵)	ہو گیا۔

اس ہوس خلافت کی وجہ ارکان شوریٰ کا تمول بھی تھا اس لئے کہ جہاں دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہاں سیاسی اقتدار کی خواہش بھی قہراً ابھر آیا کرتی ہے۔ چنانچہ ارکانِ شوریٰ کو دیکھا جاتا ہے تو تاریخ شاہد ہے کہ ایک علی ابن ابی طالب کے علاوہ سب کے سب انتہائی متمول اور سرمایہ دار تھے۔ اگر شوریٰ ترتیب دینا ناگزیر تھا تو ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کے بجائے جو صرف دولت مند طبقہ کی نمائندگی کرتے ہوں ایسے لوگوں کو منتخب کیا جاتا جو عوام کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے اور پسماندہ طبقہ کے مفاد پر نظر رکھتے۔ سرمایہ دارو سے تو سرمایہ داری کے تحفظ ہی کی توقع کی جا سکتی ہے انہیں عوام کے سود و بہبود اور معاشرتی حقوق سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اگر اسے سیاسی مصلحت کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ان کی رایوں کو بنوک شمشیر ایک فرد کی رائے کے تابع کر دینے کا کیا جواز تھا۔ کیا آزادیٔ رائے کو سلب کرنے کے بعد اس شوریٰ کو شوریٰ کے نام سے تعبیر کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر نے معیار انتخاب پیغمبر اکرم کی رضاؤ خوشنودی کو قرار دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آنحضرت ان چھ آدمیوں سے آخر وقت تک راضی و خوشنود رہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ بس انہی چھ افراد سے راضی تھے اور ان کے علاوہ اور کسی کو یہ شرف و امتیاز حاصل نہ تھا اور کیا حضرت عثمان کا انتخاب رسول اللہ کی رضاؤ خوشنودی کے نتیجہ میں ہوا تھا یا عبدالرحمٰن کی خوشنودی کے زیر اثر۔ قرآن مجید میں مومنین کے بارے میں ارشاد ہے:۔

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ	اللہ مومنین سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے
یبایعونك تحت الشجرۃ۔	تمہاری بیعت کر رہے تھے۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جن سے اللہ راضی ہو پیغمبر اُن سے راضی نہ ہوں۔ جب پیغمبر کی خوشنودی کا شرف اور لوگوں کو بھی حاصل تھا تو پھر پیغمبر کی رضاؤ خوشنودی کو چھ آدمیوں میں محدود کر دینے کے کیا معنی۔ کیا پیغمبر اکرم

مہاجرین میں سے صرف چھ افراد سے خوش تھے اور انصار میں سے کسی فرد پر راضی نہ تھے۔ اگر آنحضرت ان سے خصوصی طور پر راضی تھے تو اس خصوصی رضامندی کو واضح کیا جاتا۔ مگر اس کے بجائے ان کے عیوب و نقائص کی ایک فہرست پیش کر دی جاتی ہے جس سے رسُول خدا کی خوشنودی تو درکنار اس کی نفی ہوتی ہے چنانچہ اسی تضاد کو دیکھتے ہوئے ابو عثمان جاحظ نے کہا ہے:۔

لو قال لعمر قائل انت قلت	اگر کوئی کہنے والا حضرت عمر سے یہ کہتا کہ تم نے
ان رسول اللہ مات وھو	یہ کہا تھا کہ جب رسول اللہ نے وفات پائی تو وُہ
راض عن الستة فکیف یقول	ان چھ آدمیوں سے راضی تھے۔ اور اب کس بنا پر
الآن لطلحة انه مات ساخطا	طلحہ سے یہ کہتے ہو کہ پیغمبر ایک بات پر مرتے دم
علیك للکلمة التی قلتها لکان	تک تم سے ناراض رہے تو انھی کی بات سے انہیں
لقد رماہ بمشاقصه۔	لاجواب کر دیتا۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱ صفحہ ۶۲)

طلحہ کی وُہ بات جو پیغمبر کی ناراضگی کا باعث ہوئی تھی یہ تھی کہ انہوں نے آیہ حجاب کے اترنے پر کہا تھا کہ آج تو رسول اللہ اپنی بیویوں کو پردہ میں رکھ رہے ہیں اور کل ہم انہی سے نکاح کریں گے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وما کان لکم ان تؤذوا رسول	تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم رسول خدا کو
اللہ ولا ان تنکحوا ازواجه	اذیت دو اور نہ کبھی یہ جائز ہو سکتا ہے کہ تم ان
ابدا۔	کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔"

ایک وقت تھا کہ طلحہ کی زبان سے یہ نازیبا کلمات نکلے تھے جو یقیناً قابلِ گرفت تھے مگر خود حضرت عمر نے صلح حدیبیہ کے موقع پر جو مظاہرہ کیا یا پیغمبر کے آخر زمانہ حیات میں جو تند و تیز الفاظ کہے وہ طلحہ کے ان الفاظ سے کہیں زیادہ قابلِ گرفت تھے۔ اگر نبوت میں شک اور پیغمبر کی طرف ہذیان کی نسبت تجویز کرنے کے باوجود عرشۂ خلافت تک پہنچا جا سکتا ہے تو ان الفاظ کی بنا پر طلحہ کی اہلیت خلافت پر طعن کا کیا جواز ہے

حضرت علی کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا اسے بھی ایک خود ساختہ بات سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ پیغمبرؐ کے بعد دورِ اوّل میں تو یہ کہا گیا کہ علی نو عمر ہیں اور خلافت کے لئے سن رسیدہ و پختہ کار آدمی ہونا چاہئے مگر اب نو عمری کا عذر تو ہو نہیں سکتا تھا اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ ان میں مزاح و خوش طبعی پائی جاتی ہے۔ حضرت عمر کا یہ چھوڑا ہوا شوشہ دوسرے معاندین کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اسے خوب

خوب ہوا دی۔ چنانچہ عمرو ابن عاص نے شامیوں کے ذہن میں یہ چیز بٹھا دی کہ حضرت کا شیوہ ہی شوخی و بذلہ سنجی ہے۔ جس پر امیرالمومنین کو کہنا پڑا "مجھے نابغہ کے بیٹے پر حیرت ہے کہ وہ میرے بارے میں اہل شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مسخرہ پن پایا جاتا ہے اور میں کھیل تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ اس نے غلط کہا اور کہہ کر گنہگار ہوا۔ خدا کی قسم مجھے موت کی یاد نے کھیل کود سے باز رکھا ہے اور اسے عاقبت فراموشی نے سچ بولنے سے روک دیا ہے "۔ بے شک امیرالمومنین خندہ جبیں، ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج تھے اور ترش روئی و تند خوئی سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر وہ مزاج جو لطیف اور سنجیدہ طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ آپ کے مزاج میں پیغمبر کے مزاج کی جھلک ہوتی تھی۔ پیغمبر کے مزاج کی یہ صورت تھی کہ نہ اس میں طنز کا پہلو ہوتا تھا اور نہ خلاف واقعہ کوئی بات ہوتی تھی اسی طرح امیرالمومنین مزاحاً کوئی بات کہتے تو وہ نہ واقع کے خلاف ہوتی اور نہ وقار و سنجیدگی کے منافی۔ اگر اس حد تک مزاح شانِ رسالت کے منافی نہیں ہے تو اسے منصب خلافت کے منافی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر یہاں پر مزاح سے وہ مزاح مراد ہے۔ جس سے انسان کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے یا رعب و داب ختم ہو جاتا ہے تو ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ آپ کی زبان سے کبھی کوئی ایسا جملہ نکلا ہو جس سے وقار مجروح ہوتا ہو یا متانت و سنجیدگی میں فرق آتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دلوں سے آپ کا رعب و دبدبہ اٹھ جاتا اور نظروں میں ان کا وقار گر جاتا حالانکہ آپ کے جلال و ہیبت اور وقار و عظمت کا یہ عالم تھا کہ کوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کر سکتا تھا۔ اور جب تک آپ گفتگو کا آغاز نہ کرتے کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ابن عباس کہتے ہیں :۔

کان امیر المومنین علی علیہ السلام اذا اتی ھبنا ان نبتدئہ بالکلام (شرح ابن ابی الحدید ج ۲۔ ص۱۳)	جب علی علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو ہمیں جرأت نہ ہوتی تھی کہ ہم سلسلہ کلام شروع کریں"

حضرت اپنے وصیت نامہ فرماتے ہیں :۔

ایاک ان تذکر فی الکلام مایکون مضحکا وان حکیت ذٰلک عن غیرک۔ (نہج البلاغہ)	خبردار اپنی گفتگو میں ہنسانے والی باتوں کا ذکر نہ آنے دینا اگرچہ وہ نقل قول کی حیثیت سے کیوں نہ ہوں "

بہرحال حضرت علی کی طرف مزاح کی نسبت واقعات کی روشنی میں کسی طرح بھی صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ آخر اس موقع پر حضرت عمر کو کچھ کہنا تھا اگر یہ نہ کہتے تو کچھ اور کہتے اور جہاں تک انہیں خلافت سے

الگ رکھنے کا تعلق ہے وہ شوریٰ کی ہیئت اور اس کے طریق کار سے ظاہر ہے۔

شوریٰ کی تجویز اگرچہ حضرت عمر کے ذہن کی پیداوار تھی مگر اسے عملی جامہ پہنانے میں عبدالرحمٰن ابن عوف کی ہوشیاری و کارگزاری کا بہت دخل ہے انہیں خود تو خلافت کے ملنے کی توقع تھی نہیں۔ انہوں نے امیدواران خلافت کی صف سے اپنے کو الگ کر کے خلیفہ گری کا حق حاصل کر لیا حالانکہ حضرت عمر نے انہیں ثالثی کا حق نہیں دیا تھا یہ ثالثی کا حق عبداللہ ابن عمر کا تھا مگر انہوں نے عبداللہ کو اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اور خود ثالثی کا اختیار حاصل کر لیا اور پھر خلافت کا دھارا حضرت عثمان کی طرف موڑنے کے لئے کتاب و سنت کے ساتھ سیرت شیخین کا ضمیمہ لگا دیا جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ حضرت علی اسے کبھی قبول نہیں کریں گے اور حضرت عثمان کے لئے اس سیرت کی پذیرائی سے کوئی امر مانع نہ تھا یہ شرط نہ حضرت عمر نے خود عائد کی تھی اور نہ عبدالرحمٰن سے اس قسم کی شرط کے عائد کرنے کا مطالبہ کیا تھا اگر حضرت عمر بعد میں آنے والے خلیفہ پر پہلے خلیفہ کی سیرت پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھتے تو حضرت ابوبکر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کسی کو نامزد کر جاتے مگر انہوں نے خلیفہ سابق کی سیرت کے خلاف قدم اٹھا کر یہ واضح کر دیا کہ بعد میں آنے والا خلیفہ پہلے خلیفہ کی سیرت کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ اپنی رائے اور صوابدید پر عمل پیرا ہو گا۔ اگر عبدالرحمٰن کتاب و سنت کے ساتھ سابقہ خلفاء کی سیرت کی پابندی کو اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر خلافت کا انعقاد ہو ہی نہیں سکتا تو انہیں تشکیل شوریٰ کے موقع پر حضرت عمر کو یہ مشورہ دینا چاہیے تھا کہ وہ حضرت ابوبکر کی سیرت پر چلیں اور جس طرح انہوں نے آپ کو نامزد کیا تھا اسی طرح آپ بھی کسی کو نامزد کر جائیں یا یہ شرط اسی موقع کے لئے اٹھا رکھی تھی۔ عبدالرحمٰن نے یہ شرط تو پیش کر دی مگر اس پر غور نہ کیا کہ ان دونوں کی سیرت پر کیونکر چلا جا سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں تو ممکن تھا جب دونوں کی سیرت یکساں ہوتی اور دونوں کا نظریہ ایک ہوتا اور جب کہ متعدد مواد پر دونوں کی رائیں جدا جدا اور نظریات مختلف تھے پھر دونوں کی سیرت پر ایک ہی وقت میں یکساں عملدرآمد کیونکر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے جواز و عدم جواز میں اختلاف تھا خالد ابن ولید کی بحالی و برطرفی میں اختلاف تھا اسی طرح متعدد مواقع پر دونوں کی رائیں مختلف تھیں تو اب کسے مورد عمل قرار دیا جائے اور کسے نظر انداز کیا جائے۔

امیرالمومنین نے اسلام کے ایک بنیادی ضابطہ کے پیش نظر سیرت شیخین کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا اس انکار کا اصل محور سیرت بحیثیت سیرت نہ تھی بلکہ وہ نظریہ تھا جس کی داغ بیل اس سیرت کے ذریعہ ڈالی جا رہی تھی اور وہ یہ کہ کتاب و سنت کے ساتھ سیرت خلفاء کو بھی مذہبی و آئینی درجہ حاصل ہے حالانکہ سیرت

شیخین ہو یا کسی اور کی سیرت قرآن و سنت کی آئینہ دار ہو یا قیاس و رائے کی پروردہ اسے نہ مذہبی و آئینی درجہ دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے دینی ماخذ قرار دینا صحیح ہے اگر ایک دفعہ اس نظریہ کی بنیاد پڑ جاتی تو حکام کی سیرت کو مستقل ماخذ و مدرک دینی کی حیثیت حاصل ہو جاتی اور قرآن و سنت کی طرح ان کے طرز عمل کو بھی سند و حجت قرار دے لیا جاتا۔ امیرالمومنین نے سیرت شیخین سے انکار کر کے اسلام کی اساس و بنیاد کو متزلزل ہونے سے بچا لیا اور اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ کتاب و سنت اور ہے اور سیرت اور ہے اسے دینی ماخذ قرار دینا آئین اسلام کے منافی ہے۔ اگر آپ اس شرط کو تسلیم کر لیتے تو ایک طرف سیرت خلفاء اسلام کی عملی تصویر سمجھی جاتی اور دوسری طرف حکام کا طرز عمل دینی احکام کا ماخذ و مدرک قرار پا جاتا اور نتیجتاً ان کے افعال و اعمال ہی کا نام اسلام ہو کر رہ جاتا۔

اس پر بھی ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ سیرت شیخین سے مراد کیا ہے۔ اگر اس سے وہ مسائل و احکام مراد ہیں جو انہوں نے اپنے فہم و اجتہاد سے مستنبط کئے اور ان پر عمل پیرا رہے تو انہیں من و عن تسلیم کر لینے اور ان پر عمل کی بنیاد رکھنے کے معنی یہی ہوں گے کہ شیخین کی تقلید کی جائے۔ چنانچہ ملا علی قاری نے اس سیرت کی پابندی کو تقلید ہی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

فابی علی ان یقلد هما ورضی عثمان ۔ (شرح فقہ اکبر۔ صد۸۲)

حضرت علی نے شیخین کی تقلید سے انکار کر دیا اور حضرت عثمان اس پر راضی ہو گئے"

اگر امیرالمومنین کو امام مفترض الطاعۃ اور خلیفہ منصوص نہ بھی سمجھا جائے مگر کم از کم انہیں اس پایہ کا مجتہد تو تسلیم کیا ہی جائے گا جس پایہ کا مجتہد شیخین کو سمجھا جاتا ہے اور ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کے فتوی و رائے کا پابند کر دینا اصولی طور پر غلط ہے اور اس میں قطعاً کوئی معقولیت نہیں ہے کہ ایک مجتہد سے یہ کہا جائے کہ تمہیں عملاً وہ راہ اختیار کرنا ہو گی جو پہلے مجتہد کی تھی یہ پابندی ذہنی و فکری جمود کو دعوت دینے والی اور تفکر و اجتہاد کی روح کو مضمحل کر دینے والی ہے۔ جب آنکھیں ہیں تو دیکھنے کا حق ہے کان ہیں تو سننے کا حق ہے اور عقل ہے تو غور و خوض کے بعد خود راہ متعین کرنے کا حق ہے۔ کسی سے زبردستی یہ حق چھین کر یہ کہا جائے کہ تم اندھے بہرے بن کر ہماری متعین کردہ راہ پر چلتے رہو اسے نہ عقل و دانش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اسلام ایسے حکیمانہ دین سے کوئی واسطہ ہے۔

اور اگر سیرت سے مراد شیخین کا وہ لائحہ عمل ہے جو احکام کے اجراء و نفاذ میں انہوں نے اختیار کیا تو اسے قابل تقلید و اتباع نہیں قرار دیا جا سکتا اس لئے کہ طریق کار وقتی حالات کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے حالات ہوں گے ویسا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ اور حالات کبھی یکساں نہیں رہتے لہذا حالات کی تبدیلی

کے ساتھ طریقِ کار کا مختلف ہونا ناگزیر ہو گا۔ مثال کے طور پر حضرت عمر کے عہد کو دیکھئے کہ ان کے دورِ حکومت میں روم و ایران فتح ہوئے اور ان فتوحات کے نتیجہ میں دولت کی ریل پیل شروع ہو گئی ذرائع آمدنی وسیع سے وسیع تر ہو گئے۔ اور اس مالی فراوانی کی بناء پر وظائف کی مقدار بڑھ گئی اب ان کی سیرت کی پیروی کا تقاضا یہ تھا کہ خواہ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو جائیں ان کے جاری کردہ وظائف بے کم و کاست باقی رکھے جائیں حالانکہ ذرائع آمدنی کے کم یا نہ ہونے کی صورت میں یہ مطالبہ ناروا ہو گا۔ تو جو چیز حضرت عمر کے عہد میں روا اور قابلِ عمل تھی۔ اب ناقابلِ عمل قرار پائے گی۔ اس لئے کہ حالات بدل چکے ہیں۔ اس عہد کا تقاضا اور تھا اور اس عہد کا تقاضا اور ہے۔ بعید نہیں ہے کہ حضرت عمر کے بعد آنے والے خلیفہ پر ان کی سیرت کی پابندی عائد کرنے کا مقصد یہ رہا ہو کہ جو وظائف ان کے دور میں ملا کرتے تھے وہ علیٰ حالہ باقی رکھے جائیں۔ اور ان میں کمی واقع نہ ہونے پائے خواہ سابقہ آمدنی کے ذرائع باقی رہیں یا نہ رہیں۔ اس اعتبار سے اس شرط کو دینی شرط کہنے کے بجائے اقتصادی شرط کہنا چاہیئے جو سرمایہ داروں کی طرف سے مالی مفاد کے تحفظ کے لئے عائد کی گئی تھی۔

شوریٰ کے واقعات پر نظر کرنے کے بعد امیرالمومنین کی سیرت کے اس درخشاں پہلو سے آنکھ بند نہیں کی جا سکتی کہ آپ بیک جنبشِ لب سلطنت و اقتدار کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کتاب و سنت کے مقابلہ میں حکام کی راہ روش کو اپنا لائحہ عمل بنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اس شرط کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتے خواہ بعد میں اس پر عمل نہ کرتے آخر حضرت عثمان نے کب عمل کیا تھا۔ تو بڑی آسانی سے ایک وسیع و عریض مملکت کی حکومت حاصل کر سکتے تھے مگر حضرت نہ ضمیر کے خلاف اقرار کرنا گوارا کرتے ہیں اور نہ اصول کے مقابلہ میں عظیم سے عظیم سلطنت کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا والے اقتدار کے لئے نہ وعدہ کو کوئی وزن دیا کرتے تھے اور نہ قول و اقرار کو بلکہ ہر قسم کے حیلہ و مکر کو سیاست و مصلحت بینی کا نام دے کر جائز قرار دے لیا کرتے تھے۔ کیا دنیا میں اصول پرستی حق پسندی اور بلند نفسی کی اس سے بہتر مثال مل سکتی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب حضرت کی نظروں میں سابقہ خلفاء کی سیرت اُن کے بعد ناقابلِ سند اور ناقابلِ عمل تھی تو ان کی زندگی میں ان کی سیرت کو صحیح اور قابلِ اتباع سمجھتے ہوئے ان کی بیعت کیونکر کر سکتے تھے اور پھر اس خلافت کو بھی کیونکر تسلیم کر سکتے تھے جو اس سیرت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو جس سیرت کو آپ رد کر چکے ہوں۔ جب وہ سیرت ناقابلِ قبول تھی تو وہ خلافت بھی ناقابلِ قبول ہو گی جو اس سیرت پر عمل پیرا ہونے کے وعدہ پر ظہور میں آئی ہو۔

بیعتِ امیرالمومنین

حضرت عثمان نے ۷۰ برس کی عمر میں یکم محرم ۲۴ھ کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ بدقسمتی سے ان کا دورِ حکومت امویوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے لئے خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ عوام سختیوں میں جکڑ دیے گئے بزرگ ترین صحابہ پر مظالم توڑے گئے۔ عبداللہ ابن مسعود کی پسلیاں توڑی گئیں۔ عمار ابن یاسر کو زدوکوب کیا گیا۔ ابوذر غفاری جلا وطن کئے گئے۔ جبرو استبداد کے سائے پھیلے ظلم و استحصال کی گھٹائیں چھائیں اور خود سر عمال نے طاقت کے نشہ میں مدہوش ہو کر رعایا کو پامال کر کے رکھ دیا۔ حضرت عثمان کے اس طرزِ عمل کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور دلوں میں غم و غصہ کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔ اصحاب شوریٰ میں سے حضرت علی تو ان سے شاکی تھے ہی طلحہ اور زبیر بھی علانیہ ان کے خلاف ہو گئے اور عبدالرحمٰن ابن عوف جو سیرتِ شیخین کے زینہ سے انہیں خلافت کے بام بلند تک لے گئے تھے وہ اس حد تک بگڑے کہ ہمیشہ اپنے کئے پر پچھتاتے رہے اور زندگی کے آخری لمحہ میں ان سے بات چیت کے روادار نہ ہوئے۔ ابن عبدربہ تحریر کرتے ہیں :۔

دخل له عثمان عائداً له فی مرضه فتحول عنه الی الحائط	عبدالرحمٰن کی بیماری کی حالت میں حضرت عثمان ان کی عیادت کے لئے آئے عبدالرحمٰن نے انہیں دیکھ کر اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔"
(عقدالفرید۔ ج ۳ ص۸۰)	

آخر اس عام ناراضگی کے نتیجہ میں ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو گھر کے اندر قتل کر دیئے گئے۔

اس بارہ سالہ دورِ حکومت نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے احساسات کو جھنجھوڑا اور غلط قیادت کو آزمانے اور اس کے نتائج بھگتنے کے بعد ان کی آنکھیں کھلیں اور یہ احساس شدت سے ابھرا کہ قیادت اس شخص کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جو عوامی فلاح و بہبود اور اجتماعی مفاد پر نظر رکھے اور مملکت کی دولت سمٹ کر اس کی ذات اور اس کے خاندان کے افراد تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ مسند خلافت کے خالی ہوتے ہی اکابر صحابہ اور خواص و عوام کی نظریں حضرت علی کی طرف اٹھنے لگیں۔ اگر حضرت عثمان عام حالات میں طبعی موت مرتے تو خلافت نے سقیفائی و شورائی نظام کے ماتحت جو رخ اختیار کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے، یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ خلافت اپنے اصلی مرکز کی طرف پلٹ کر آئے گی اور حضرت علی کو مسند خلافت پر متمکن ہونے کا موقع دیا جائے گا اس لئے کہ حضرت عثمان کے اہالی موالی وہ لوگ تھے جو انہیں عمومی مفاد کے

بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور وہ کبھی گوارا نہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کو برسر اقتدار آنے دیا جائے جو ان کے بگڑے ہوئے اطوار پر قدغن لگائے اور انہیں اپنی سابقہ عادتوں میں تبدیلی پر مجبور کرے یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ معاویہ عمرو ابن عاص اور عثمانی حکام و عمال جو امیرالمومنین کی متوازن و معتدل سیرت سے بخوبی واقف تھے ان کے اقتدار میں سد راہ ہوتے اور اس سلسلہ میں ام المومنین حضرت عائشہ کی بھی انہیں پوری تائید و حمایت حاصل ہوتی جو بڑی حد تک ملکی سیاست پر اثر انداز اور امیرالمومنین کے مخالفین کی صف اوّل میں تھیں یہ لوگ اپنے امتیازات و مفادات کے تحفظ کے لئے حضرت عثمان کو نئی بزم شوریٰ کی تشکیل کا مشورہ دیتے اور ایسی تدبیر کرتے کہ خلافت انہی کے پسندیدہ افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی یا حضرت عثمان شوریٰ کے چکر میں پڑے بغیر کسی کو نامزد کر جاتے جس کا جواز سیرت شیخین کی پابندی کو قبول کرنے کے بعد پیدا ہو چکا تھا۔ مگر حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ ان کے لئے یہ موقع ہی نہ رہا کہ وہ خلافت کے سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتے یا کوئی خاص ہدایت کرتے۔ اور اگر کرتے بھی تو اس ہنگامہ و شورش میں ان کی سنتا کون جب کہ لوگ ان کی خویش نوازیوں اور ان کے عمال کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے انہی کی خلافت کو انتہائی ناپسند کر رہے تھے اور انہیں جیتے جی یا قتل کر کے خلافت سے الگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور آخر ان بے اعتدالیوں کا نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہا۔

پیغمبر اکرم کے بعد امیرالمومنین نے ایک طویل عرصہ جس بے غرضی و بے نفسی کے ساتھ گزارا اور جس اعتدال پسندی و اصول پرستی کا مظاہرہ کیا وہ دلوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس تاثر نے عوام کے ذہن بدل دیئے اور گرد و پیش پر نظر دوڑانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ علی ابن ابی طالب سے بہتر کوئی شخصیت نہیں ہے جو قیادت امت کا بار اٹھا سکے اور موجودہ انتشار بدامنی اور بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا سکے۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کے نمایاں افراد مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ حضرت علی سے خلافت کی درخواست کی جائے۔ اس فیصلہ کے بعد ایک وفد جس میں طلحہ اور زبیر بھی شامل تھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے زمام کار اپنے ہاتھوں میں لینے کی التجا کی۔ حضرت نے ان کی پیشکش کو قبول کرنے میں توقف کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے معاملات میں دخیل ہونا نہیں چاہتا جسے چاہو اسے اپنا امیر منتخب کر لو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں نے کہا:۔

انا لا نعلم احد احق به منك ولا اقدم سابقة ولا اقرب قرابة من رسول الله۔	ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے اور نہ سابقہ خدمات کے لحاظ سے آپ سے کوئی مقدم ہے اور نہ کوئی رسول اللہ سے قرابت

میں آپ سے قریب تر ہے۔" (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۹۸)

آپ نے پھر انکار کیا مگر وہ لوگ باصرار آمادہ کرتے رہے اور جب یہ دیکھا کہ حضرت کسی طرح خلافت کے قبول کرنے پر تیار نہیں تو گڑگڑا کر کہنے لگے :-

نَنْشُدُكَ اللّٰهَ اَلَا تَرٰى مَا نَحْنُ فِيْهِ اَلَا تَرٰى الْاِسْلَامَ اَلَا تَرٰى الْفِتْنَةَ اَلَا تَخَافُ اللّٰهَ۔

"ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس عالم میں ہیں کیا آپ اسلام کی حالت اور فتنوں کو ابھرتے دیکھ نہیں رہے کیا آپ اللہ سے بھی نہیں ڈرتے۔" (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۹۹)

جب امیرالمومنین نے دیکھا کہ اصرار حد سے بڑھ گیا ہے اور حالات لاکھ نامساعد سہی مگر اتمام حجت کے بعد اب ادائے فرض سے پہلو تہی نہیں کی جاسکتی تو آپ نے فرمایا :-

قَدْ اَجَبْتُكُمْ وَاعْلَمُوْا اَنِّيْ اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ۔

"مجھے منظور ہے مگر اس بات کو جان لو کہ یہ منظوری اس صورت میں ہے کہ میں تمہیں اس راہ پر چلاؤں جسے میں بہتر سمجھوں۔" (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۹۹)

یہ عوامی رجحانات اور تبدیلیٔ حالات کا کرشمہ ہے کہ حضرت عمر کے بعد سیرت شیخین کی شرط عائد کرکے خلافت کی پیش کش کی گئی تھی۔ جسے آپ نے رد کر دیا تھا اور اب حضرت عثمان کے بعد خلافت انہیں سونپی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ حضرت کو کسی شرط کا پابند کریں۔ حضرت انہیں اپنی شرط کا پابند بناتے ہیں کہ وہ دوسروں کی سوابدید کے بجائے اپنی صوابدید پر عمل پیرا ہوں گے اور انہیں بھی وہ راہ اختیار کرنا ہوگی جسے آپ تجویز فرمائیں اور بہتر سمجھیں۔ یہ حضرت کی اصول پسندی کی نمایاں فتح ہے۔ جس کے سامنے مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بلا چون وچرا اسے تسلیم کر لیا اور صحیح اصول کی پاسداری دوسروں کو جھکنے پر مجبور کر ہی دیا کرتی ہے۔

حضرت کی منظوری کے بعد ۲۵ ذی الحجہ روز جمعہ ۳۵ھ کو عمومی بیعت کا اہتمام کیا گیا امیرالمومنین بیت الشرف سے نکل کر مسجد کی طرف آئے جہاں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ حضرت سادگی اور حد کی سادگی کے ساتھ سر پر ایک معمولی عمامہ رکھے ایک ہاتھ میں جوتے اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں عصا کے بجائے کمان لئے مسجد میں داخل ہوئے۔ حضرت کی آمد پر مجمع میں حرکت پیدا ہوئی آپ مجمع کو چیرتے ہوئے منبر کی طرف بڑھے اور اس مقام پہ جہاں رسول اللہ بیٹھتے تھے جا بیٹھے کمان پر ٹیک لگائی۔ اور بیعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ طلحہ اور زبیر نے پہل کی اور بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ حسین دیار بکری

تحریر کرتے ہیں:-

اول من بایعہ طلحۃ والزبیر ثم سائر الناس۔ | سب سے پہلے طلحہ و زبیر نے بیعت کی اور پھر دوسرے لوگوں نے۔"

(تاریخ خمیس۔ ج ۲۔ ص ۲۶۷)

طلحہ کا ایک ہاتھ جنگ اُحد میں ناکارہ ہو گیا تھا۔ جب حبیب ابن ذویب نے انہیں بیعت کرتے دیکھا تو کہا:-

اول من بداء بالبیعۃ ید شلا لا یتم ھذا الامر۔ | ایک ناکارہ ہاتھ والے نے بیعت کی ابتدا کی ہے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۵۱)

اس کے بعد لوگ بیعت پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح پیاسے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اصحاب بدر میں سے کوئی فرد باقی نہ رہی جس نے بیعت نہ کی ہو۔ ابن حجر مکی نے تحریر کیا ہے:-

فلم یبق من اھل بدر الا اتی علیا فقالوا ما نری احدا احق منک مد یدک نبایعک فبایعوہ۔ (صواعق محرقہ۔ ص ۱۱) | اہل بدر میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اور سب کے سب حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم بیعت کریں چنانچہ انہوں نے بیعت کی۔"

ان بیعت کرنے والوں میں صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے بلکہ یمن مصر اور عراق کے باشندے بھی تھے۔ سب نے خوشی سے بیعت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس طرح متفقہ طور پر آپ کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔

بیعت کی تکمیل کے بعد خطیب انصار ثابت ابن قیس نے انصار کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:-

واللہ یا امیر المومنین ولئن کانوا تقدموک فی الولایۃ فما تقدموک فی الدین ولئن سبقوک امس لقد لحقتھم الیوم ولقد کانوا وکنت لا | خدا کی قسم اے امیر المومنین اگرچہ وہ لوگ حکومت میں آپ سے سابق تھے مگر دین میں آپ سے سبقت نہ لے جا سکے اگر وہ کل آپ سے آگے بڑھ گئے تھے تو آج آپ بھی اسی مقام پر آ گئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے نہ آپ کا مرتبہ ڈھکا چھپا تھا اور نہ

یخفی موضعك ولا یجهل لا یعلمون ولا احتجت الی احد مع علمك۔

آپ کی منزلت انجانی تھی وہ آپ کے محتاج تھے ان چیزوں میں جنہیں نہیں جانتے تھے اور آپ اپنے علم کی بنا پر کسی کے محتاج نہیں رہے ۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صہ ۱۵۵)

انصار نے بیعت کے سلسلہ میں عمومی طور پر بڑی سرگرمی سے حصہ لیا مگر ان میں سے چند آدمیوں نے جو عثمانی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بیعت سے گریز کیا۔ چنانچہ حسان ابن ثابت، کعب ابن مالک، مسلمہ ابن مخلد، ابو سعید خدری، محمد ابن مسلمہ، نعمان ابن بشیر، زید ابن ثابت، رافع ابن خدیج، فضالہ ابن عبید اور کعب ابن عجرہ نے بیعت نہیں کی۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی بیعت سے پہلوتہی کی۔ چنانچہ قدامہ ابن مظعون عبداللہ ابن سلام، مغیرہ ابن شعبہ، سعد ابن وقاص، عبداللہ ابن عمر، صہیب ابن سنان، سلمہ ابن وقشی اسامہ ابن زید، اور دہبان ابن صیفی بیعت سے منہ موڑ کر گھروں میں بیٹھے رہے۔ یہ لوگ بھی حضرت عثمان سے وابستہ رہے تھے اور یہی وابستگی ان کے لئے بیعت سے مانع رہی۔

امیرالمومنین نے کسی شخص کو آزادئ رائے کے حق سے محروم نہیں کیا بلکہ ہر شخص کو اس کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا۔ نہ کسی پر دباؤ ڈالا اور نہ کسی پر سختی گوارا کی۔ جس نے برضا و رغبت بیعت کرنا چاہی اس سے بیعت لے لی اور جس نے بیعت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی اس سے مطالبہ نہ کیا البتہ سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر سے بیعت کے لئے کہا کیونکہ ان دونوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ صرف خود ہی بیعت سے علیحدہ نہیں رہیں گے بلکہ دوسروں کو بھی بیعت سے روکیں گے۔ چنانچہ سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر کو طلب کیا اور ان سے بیعت کے لئے فرمایا۔ سعد نے دفع الوقتی کرتے ہوئے کہا کہ جب دوسرے لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی بیعت کر لوں گا اور اگر بیعت نہ بھی کروں تو کھل کر مخالفت بھی نہیں کروں گا حضرت نے دوبارہ ان سے کچھ نہ کہا ا نہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اور عبداللہ ابن عمر نے بیعت سے انکار کیا تو اطمینان خاطر کے لئے اتنا فرمایا کہ تم اس امر کی ضمانت دو کہ ملک کے نظم و نسق میں رخنہ اندازی کرکے فضا کو مکدر کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اس نے ضمانت دینے سے انکار کیا۔ اس پر مالک اشتر نے بگڑ کر کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا سر اڑا دوں حضرت نے فرمایا کہ تم اس سے کوئی تعرض نہ کرو میں خود اس کا ضامن ہوتا ہوں۔ یہ بچپن میں بھی کج خلق تھا اور بڑا ہو کر بھی کج خلق رہا۔

امیرالمومنین کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے بیعت کے موقع پر بڑی سرگرمی دکھائی مگر بعد میں بیعت سے منحرف ہو کر تخریبی کاروائیوں پر اتر آئے۔ ان تخریب پسندوں

میں طلحہ اور زبیر بھی شامل تھے جنہوں نے مجمع عام میں بیعت کی اور جب انہیں اپنے توقعات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو بیعت توڑ کر الگ ہو گئے اور بیعت شکنی کے جواز کے لئے عذر یہ تراشا کہ ہم تے تلوار کے سایہ میں مارے باندھے بیعت کی تھی اور اگر بیعت نہ کرتے تو قتل کر دیے جاتے۔ امیرالمومنین کی بیعت جس صورت اور جس حالت میں ہوئی اسے پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی انصاف پسند یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ جس ہستی نے مسلمانوں کے انتہائی اصرار کے بعد خلافت کی ذمہ داری قبول کی ہو اس نے بیعت کا آغاز سختی و تشدد سے کیا ہو گا اور لوگوں کو ہراساں و خوفزدہ کر کے ان سے بیعت لی ہو گی اور پھر ان دو کے علاوہ اور بھی ایسے افراد تھے جنہوں نے بیعت سے انکار کیا تھا مگر کسی پر جبر کرنا تو درکنار کچھ کہا سنا بھی نہیں تو صرف انہی دو آدمیوں پر جبر کس لئے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دو سے بجبر بیعت لینے میں یہ مصلحت تھی کہ ان کے اثر و نفوذ کی بناء پر انہیں پابند بیعت کر کے سیاسی استحکام حاصل کیا جائے تو یہ مصلحت عبداللہ ابن عمر اور سعد ابن ابی وقاص کے بارے میں بھی ملحوظ ہونا چاہئے تھی اور انہیں بھی بجبر پابند بیعت کرنا چاہئے تھا جب کہ یہ دونوں اثر و رسوخ کے اعتبار سے طلحہ و زبیر سے کم نہ تھے۔ عبداللہ ابن عمر خلیفہ زادہ اور سعد ابن وقاص مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ جب ان پر سیاسی استحکام کی بناء پر جبر نہیں کیا گیا تو ان دونوں پر جبر کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اگر امیرالمومنین بیعت کے سلسلہ میں جبر کرتے تو دور اول میں جو جبر ان پر کیا گیا تھا اسے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ کہا جاتا کہ جب حضرت علی نے جبر و اکراہ سے بیعت لی تو اگر انہیں بیعت کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ ظلم و زیادتی کیوں حالانکہ حضرت علی پر کئے جانے والے جبر کے جواب میں کسی نے یہ اشارۃً بھی نہیں کہا کہ آپ نے بھی بیعت کے سلسلہ میں جبر و تشدد روا رکھا تھا۔ لہٰذا یہی کہا جائے گا کہ ان دونوں نے بیعت کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بعد میں یہ بات بنائی جسے واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

امیرالمومنین کی بیعت سے دینی و دنیوی اقتدار ایک مرکز پر جمع ہو گیا دنیوی اقتدار کو حکومت سے اور دینی قیادت کو خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حکومت کی تشکیل میں عوامی انتخاب کارفرما ہو سکتا ہے مگر خلافت میں نہ انتخاب کا دخل ہوتا ہے اور نہ کسی خود ساختہ اصول کے ماتحت اسے کسی کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ خلافت اللہ کی جانب سے اس کے احکام کے اجراء و نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے جو نبوت کی طرح عوام کے چناؤ پر منحصر نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسلام کا کوئی جزوی و فرعی حکم بھی ایسا نہیں ہے۔ جسے عوام کی رائے پر چھوڑا گیا ہو تو خلافت ایسے اہم معاملہ کو جس پر حیات ملی اور بقائے دین کا انحصار ہے عوام کی رائے پر کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امیرالمومنین کی خلافت جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہے

عوام کی رائے اور ان کی بیعت پر موقوف نہ تھی۔ اس مرحلہ پر جس خلافت کی پیش کش آپ کے سامنے کی گئی وہ صرف ایک انتخابی اصول کے ماتحت اقتدار کی منتقلی تھی جسے جمہوری خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لئے امیرالمومنین نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور اصرار کے بعد اسے قبول کیا تو اس مقصد کے پیش نظر کہ قیام حجت کے بعد ان فرائض کو انجام دے سکیں جو بحیثیت امام و جانشین رسول ان پر عائد ہوتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کو حضرت نے ایک خطبہ میں بیان فرمایا ہے۔ "اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پُری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اوّل کو سیراب کیا تھا۔" اگرچہ پیغمبر کے بعد آپ ظاہری اقتدار سے الگ رہے مگر خلافت الٰہیہ کے منصب جلیل سے ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو علیحدہ تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ اقتدار و عدم اقتدار دونوں صورتوں میں آپ خلیفۂ رسول اور امام منصوص ہونے کی حیثیت سے واجب الاطاعۃ تھے اس ظاہری خلافت سے تو بس اتنا ہوا کہ جو انہیں امام مفترض الطاعۃ نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں میں ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اگرچہ ان دونوں گروہوں میں اطاعت قدر مشترک تھی۔ مگر دونوں کے زاویہ ہائے نظر مختلف تھے ایک گروہ نے خلافت الٰہیہ کے اعتبار سے اطاعت کی اور ایک گروہ نے عوامی انتخاب کی رُو سے سر اطاعت خم کیا۔ جنہوں نے خلیفۂ منصوص ہونے کی حیثیت سے اطاعت کی انہوں نے اس اطاعت کے پردہ میں الٰہی حاکمیت کا اعتراف کیا اور جنہوں نے بربنائے اقتدار اطاعت کی انہوں نے فقط ملوکیت پرستی کے جذبہ کے زیر اثر سر جھکائے اور وہ ہر اس شخص کی جو کسی بھی طریق سے خواہ قوت و طاقت سے خواہ سیاسی حیلہ گری سے برسراقتدار آ جاتا اطاعت کرتے۔ یہ اطاعت و سرافگندگی اقتدار پرستی ہے اور خلافت الٰہیہ کے ماتحت اطاعت، اطاعتِ خدا و رسول ہے۔

دنیوی اقتدار اوروں کے لئے اوج و سربلندی کا باعث ہو تو ہو مگر امیرالمومنین کی قدر و منزلت اس سے بالاتر ہے کہ حکومت و اقتدار ان کے لئے وجہ افتخار بن سکے۔ اس ظاہری خلافت سے پہلے نہ آپ میں کوئی کمی تھی اور نہ اب کوئی اضافہ ہوا جہاں ہر بلندی سرنگوں ہو وہاں تاج و تخت کی بلندی رفعت کا سامان مہیا نہیں کرتی اور جہاں امامت کا جوہر ضیا بار ہو وہاں شہنشاہیت کا گرد فر زینت افزا نہیں ہوتا۔

زروئے خوب تو مشاطہ دست باز کشید   کہ شرم داشت کہ خورشید را بیاراید

چنانچہ صعصعہ ابن صوحان عبدی نے بیعت کے موقع پر حضرت سے مخاطب ہو کر کہا:۔

والله یا امیرالمومنین لقد زینت الخلافۃ وما زانتك ورفعتھا وما رفعتك ولھی احوج الیك منك الیھا۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۱۔ ص۱۳۵)

خدا کی قسم اے امیرالمومنین آپ نے خلافت کو زینت بخشی ہے اس نے آپ کو زینت نہیں دی آپ اسے بلندی پرلے گئے ہیں اس نے آپ کا پایہ بلند نہیں کیا آپ کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ اسے آپ کی ضرورت تھی۔"

ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے سامنے خلافت کی بحث چھڑی تو انہوں نے کہا:۔

یا ھولاء قد اکثرتم فی علی والخلافۃ والخلافۃ وعلی ان الخلافۃ لم تزین علیا بل علی زینھا (تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ص۱۳۵)

اے لوگو تم علی اور خلافت، خلافت اور علی کو طول دے رہے ہو خلافت نے علی کے لئے زینت کا ساماں نہیں کیا بلکہ علی نے خلافت کو زینت دی ہے۔"

امیرالمومنین کا طرزِ جہانبانی

زمانۂ قدیم سے انسانوں پر شہنشاہی نظام مسلط رہا ہے جس کے نتیجہ میں انسانی مزاج اقتدار پرستی کا خوگر ہو گیا اور جذبۂ نیازمندی پرستش کی حد تک پہنچ گیا۔ چنانچہ قدیم مصریوں اور جاپانیوں نے اپنے حکمرانوں کے بارے میں یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ وہ پیدا ہی حکومت و فرمانروائی کے لئے ہوتے ہیں اور دوسرے افراد پیدائشی طور پر ان کے غلام اور خدمت گزار ہیں۔ اس تصور نے عام انسانوں کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیا اور سختیوں میں پیسے جانے اور استبدادیت کے پنجوں میں جکڑے رہنے کے باوجود یہ سمجھتے رہے کہ انہیں فرمانرواؤں کے خلاف لب کشائی کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے ان کے عیش و عشرت کا سامان کرتے اور ان کے شبستانوں کی رونق بڑھاتے رہیں۔

جب سرزمین عرب پر اسلام کی آواز بلند ہوئی تو اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ کمزور طاقت وروں کے سامنے بے بس تھے غریب سود خواروں کی گرفت میں اور غلام آقاؤں کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے اسلام نے ان جکڑے بندھے انسانوں کو حریت و مساوات کا مژدہ سنایا رنگ و نسل کا امتیاز مٹایا غلاموں کو انسانی حقوق سے بہرہ یاب کیا اور انسانی حکومت کو ختم کر کے حکومت الٰہیہ کا پیغام دیا۔ حکومت الٰہیہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا اعتراف کیا جائے۔ اور دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ سمو لیا جائے کہ وہی ہمارا اور سب کا مالک ہے وہ ہمارے ہر قول و فعل کا سننے اور

دیکھنے والا ہے اور ہم اسی کے احکام کے پابند اور اسی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس حاکمیت کا اعتراف استبدادیت کے بتوں کو پاش پاش کر کے دل و دماغ میں برادری و برابری کا احساس پیدا کرتا ہے اور تمام ناروا پابندیوں سے چھڑا کر فطری و طبعی آزادی کی راہ پر لے چلتا ہے۔

پیغمبر اسلام کا مطمح نظر حکومت یا سیاسی اقتدار نہ تھا بلکہ مقصد بعثت حکومت الٰہیہ کی تشکیل اور خداوندی اقتدار کا قیام تھا۔ چنانچہ انہوں نے درس توحید دے کر تمام انسانوں کو ایک مرکز وحدت پر جمع ہونے کی دعوت دی تا کہ اللہ کے احکام کا اجراء اور اس کے قوانین کا نفاذ کر کے ایک پاک و پاکیزہ اور معیاری معاشرہ قائم کریں جس میں ظلم کے بجائے عدل و انصاف کو جہالت کے بجائے علم و حکمت کو اور انسانوں کی حکومت کے بجائے اللہ کی حاکمیت کو فروغ حاصل ہو تا کہ فرزندان توحید اللہ کے علاوہ کسی اور کے آگے سرنگوں نہ ہوں۔ آنحضرت نے صرف اپنے دور ہی میں حکومت الٰہیہ کی تشکیل نہیں کی بلکہ اپنے بعد کے لئے بھی ایک ایسے ابدی نظام کی رہنمائی فرما گئے جو اللہ کی حاکمیت پر مبنی تھا۔ اس نظام کا نام خلافت الٰہیہ ہے جس کے قیام کا ذمہ دار وہ ہوگا جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اپنے قول و عمل سے عوام کو الٰہی حاکمیت کے تصور سے ادھر ادھر نہ ہونے دے اور ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل میں اللہ کے احکام کا پابند اس کے قوانین کا نگران اور اسی کا مقرر کردہ ہو تا کہ زمین میں اسے اللہ کا نمائندہ سمجھ کر اس کے احکام کے آگے سر اطاعت خم کیا جائے کیونکہ خدا کے احکام کی تعمیل اسی کے احکام کی بجا آوری میں مضمر ہوتی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :-

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے
و اولی الامر منکم	صاحبان امر ہوں۔"

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پیغمبر کے بعد جس کمزور جمہوریت پر حکومت کی اساس رکھی گئی تھی وہ قیصری و کسروی طرز حکومت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اللہ کی حاکمیت کی جگہ شخصی حکومت نے لے لی حالانکہ اسلام میں آمریت ملوکیت اور شخصی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق ہے خواہ وہ تیغ و سنان کا سہارا لے کر برسر اقتدار آیا ہو جمہور کی رائے ہموار کر کے۔ اس لئے کہ حکومت الٰہیہ کا معیار نہ قوت و طاقت ہے اور نہ ان عوام کی ہمنوائی جن کی اکثریت خود غرضی و مفاد پرستی کا شکار ہوتی ہے بلکہ جسے حکمران حقیقی اپنے نمائندہ کی حیثیت سے نگران ریاست مقرر کرے گا وہی اسلامی مملکت کا رئیس و سربراہ متصور ہوگا جو الٰہی حاکمیت کی اساس پر حکومت کی تشکیل کرے گا اور اللہ کے احکام و قوانین کے نفاذ کا پابند ہوگا۔ بے شک مسند نشینان خلافت مسلمان کہلاتے

اور حلقہ بگوش اسلام سمجھے جاتے تھے مگر اسلامی حکومت صرف مسلم افراد کے برسر اقتدار آ جانے کا نام نہیں ہے بلکہ اس نظام حیات کے احیار کا نام ہے جسے آنحضرتؐ نے نافذ کیا اور اپنے بعد ایک ناقابلِ ترمیم لائحہ عمل کے طور پر چھوڑ گئے۔ اگر کوئی اس لائحہ عمل کے خلاف حکومت تشکیل دیتا ہے تو وہ لاکھ مسلمان کہلاتا اور مسلمان سمجھا جاتا ہو اسے اسلامی حکمران نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ یزید، مروان، عبدالملک اور اس قبیل کے دوسرے فرمانرواؤں کی حکومت کو اسلامی حکومت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ حکومتیں اسلامی حکومت کا آئینہ دار ہونے کے بجائے ہرقلی وقیصری حکومتوں کا نمونہ تھیں جنہیں اسلامی حکومت کہنا اسلامی طرزِ حکومت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

حضرت علی کی حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت تھی اور آپ نے حکومت کی ذمہ داری اسی شرط پر قبول کی تھی کہ اسے اسلامی قالب میں ڈھالنے اور منہاج نبوت پر چلانے میں کوئی دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ آپ نے حالات کی تبدیلی اور انسانی مزاج کی تغیر پذیری کے باوجود حکومت ربانیہ کے تقاضوں کے مطابق حکومت کی تشکیل کی اور رسول اللہ کے طرز جہانبانی پر اپنی حکومت کی اساس رکھی اگرچہ آپ کا دورِ حکومت مختصر اور انتہائی مختصر مگر وہ بھی شورشوں اور ہنگاموں کا آماجگاہ بن گیا تھا مگر اس تھوڑے عرصہ میں بھی اسلامی حکومت کے خدوخال کو اس طرح نمایاں کر کے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا کہ دور نبوی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اگر آپ زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو مسلمانوں پر حکومت اسلامیہ کا مفہوم واقعی روشن نہ ہوتا اور اسے بھی مادی حکومتوں کی طرح ایک حکومت تصور کر لیا جاتا جس کا مقصد ملک گیری وکشورکشائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا مگر آپ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر ان تمام پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھا دیا جو اسلامی حکومت پر ڈالے گئے تھے اور اپنے طرز عمل سے واضح کر دیا کہ اسلامی اصول وآئین کے ماتحت حکومت کا قیام اور ہے اور بتقاضائے سیاست اسلام کا نام لیکر حکومت کی تشکیل اور ہے۔

امیرالمومنین کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے کہ ان کے ہر عمل میں للہیت کارفرما ہوتی ہے اور انہوں نے اقتدار کو قبول کیا تو اسی جذبہ للہیت کے زیر اثر تاکہ افراد کی حکومت کے بجائے اللہ کی حکومت قائم کریں اور لم یکن لہ شریک فی الملک کو صحیح معنی میں عملی جامہ پہنائیں۔ اگر حضرت کو ذاتی اقتدار کی خواہش ہوتی تو آپ کو مشورے دیئے جا رہے تھے کہ سابقہ حکومت کے عمال کو ان کے عہدوں سے نہ ہٹائیں تاکہ حکومت کے استحکام کو نقصان نہ پہنچے مگر آپ نے اس نقصان کو درخور اعتنا نہ سمجھا کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیا گیا تو وہ خداوندی اقتدار کے بجائے اپنا اقتدار قائم کریں گے اور آپ نے حکومت

قبول کی تھی تو اسی شخصی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے۔ اگر حضرت کو اپنا اقتدار عزیز ہوتا تو جائز و ناجائز سے آنکھیں بند کرکے تمام استحکامی تدبیروں پر عمل کرتے اور شر انگیز عناصر سے سازگاری کرکے اپنا دور کامیاب بناتے مگر حضرت کی نگاہوں میں شخصی حکومت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ ان کی نظروں میں کسی چیز کی اہمیت تھی تو امت کی عملی تربیت اور اسلامی شعائر کے احیاء کی۔ ایک مرتبہ اپنا جوتا گانٹھتے ہوئے ابن عباس سے پوچھا کہ اس جوتے کی قیمت کیا ہوگی کہا کہ اب تو اس کی قیمت کچھ نہیں ہے:۔

واللہ لاحب الی امرتکم الا ان اقیم حقا او ادفع باطلا۔

(نہج البلاغہ)

"خدا کی قسم اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے"

امیر المومنین نے اسلامی حکومت کی غرض و غایت کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ ایک حق کا قیام اور دوسرے باطل کا استیصال۔ اور آپ نے اپنے عہد اقتدار میں انہی دو چیزوں کو پیش نظر رکھا۔ اور اپنا دور حکومت حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی کے لئے وقف کر دیا اور اسلامی احکام کے اجرا اور اخلاقی اقدار کے تحفظ ہی کو مقصد اولین قرار دیا اور جب کہ اقتدار کے مقابلہ میں اصول و آئین کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی جاتی تھی اور حکومت کی خاطر اسلامی اصولوں کو نظر انداز کیا جا رہا تھا اور کوئی قانون ذاتی مفاد سے متصادم ہوتا تو اسے تاویلات کا ہدف بنا لیا جاتا تھا آپ نے کسی قیمت پر صحیح اصولوں سے انحراف گوارا نہ کیا اور نہ مخالفت کی تیز و تند آندھیاں آپ کے موقف میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ آپ نہ صرف اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہے بلکہ اپنے طرز عمل سے منجمد طبیعتوں میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کیا اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرکے ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی اگرچہ آپ ملک گیری کی طرف متوجہ ہوئے اور نہ ہی اندرونی شورشوں کی وجہ سے اس کا کوئی موقع تھا مگر دلوں کی تسخیر اور ذہنوں کی تعمیر کشور کشائی سے بڑا کارنامہ ہے۔ بے شک اور فرمانرواؤں نے لشکر کشی کرکے مملکت کے حدود وسیع کئے اور علاقوں پر علاقے فتح کرکے فاتح کہلائے۔ مگر حضرت نے گلشن اسلام کی تازگی کے لئے کانٹوں کو چھانٹا اور ماؤف اعضا کو کاٹ کر فاسد مواد کا اخراج کیا اور اسلامی نظام کو اس کی صحت مندانہ قدروں پر استوار کرکے دکھا دیا۔ پیہم ہنگاموں اور متواتر خانہ جنگیوں میں اسلامی خطوط پر معاشرہ کی تطہیر کی رفاہ عامہ کے کام انجام دیئے۔ استحصال کی روک تھام کی رعایا کی شکایات سنیں اور ان کا ازالہ کیا۔ ناروا بندشوں کو ختم کرکے آزادانہ فضا میں سانس لینے کا موقع دیا۔ تعمیری عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور تخریبی قوتوں کا سر توڑ مقابلہ کیا عمال کی کارگزاریوں کا ہر پہلو سے جائزہ لیا خراج و زکوٰۃ کے کارندوں کے دائرہ کار اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے حقوق و فرائض کا تعین کیا اور نسلی

و ملکی امتیازات کو ختم کر کے معاشرتی عدل کو فروغ دیا۔

امیر المومنین کے پیشِ نظر ایک ایسا معیاری و مثالی معاشرہ تھا جس میں ظلم و جور، استحصال و زر اندوزی اور رشوت و خیانت کی قطعاً کوئی گنجائش نہ ہو اور نظامِ حکومت حق و انصاف و قانونی مساوات وسائل معیشت کی آزادی انفرادی و اجتماعی فلاح اور اسلامی اقدار پر مبنی ہو۔ حضرت خود بھی ان چیزوں پر کاربند رہے اور عمالِ حکومت کو بھی ان پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً انہیں دینی اقدار اور اسلامی ضابطہ اخلاق کی طرف تحریراً متوجہ فرماتے رہتے ان تحریرات میں سرعنوان تقویٰ و پرہیزگاری کی ہدایت اور یوم حساب کی یاد دہانی ہوتی تاکہ تقویٰ ان کے دلوں میں عظمتِ الٰہی کا احساس اور آخرت کی یاد عمل کا جذبہ پیدا کرے اور اس طرح یقین و عمل کی روح ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ یوں تو آپ کا ہر تحریری فرمان ایک دفترِ ہدایت ہوتا تھا مگر مالک اشتر کو والیٔ مصر مقرر کرتے وقت جو دستاویز لکھ کر دی وہ الہامی تعلیمات کی آئینہ دار اور دستوری شقوں پر اس حد تک حاوی ہے کہ آج تک ذہن انسانی اس سے آگے سوچ نہیں سکا اور نہ مزید ارتقائی مراحل طے کر کے اس میں بنیادی طور پر کسی شق کا اضافہ کر سکے گا۔ جورج جرداق مسیحی نے اس کی جامعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

هي من جلائل وصایاه و اجمعها لقوانین المدینة و الحقوق العامة والتصرفات الخاصة (صوت العدالة۔ ج۔ ص۳۳۵)	"آپ کے عہد ناموں میں سے یہ ایک عظیم منشور ہدایت ہے جو شہریت و مدنیت کے قوانین کا جامع اور عامۃ الناس کے حقوق اور خواص کے حدودِ کار پر حاوی ہے۔"

اس دستاویز میں حضرت نے معاشرہ کے ادنیٰ طبقہ سے لے کر اعلیٰ طبقہ تک ایک ایک کے حقوق و فرائض وضاحت سے بیان فرمائے ہیں اور مزدوروں صنعت کاروں تاجروں لشکریوں قاضیوں مشیروں وزیروں اور اکتسابِ معیشت سے درماندہ افراد کے حقوق کا تعین کیا ہے اور صیغہ مالیات حکومتی معاہدات داخلہ و خارجہ تعلقات اہل اسلام اور ذمیوں کے شہری و معاشرتی حقوق سیاسی و معاشی نظام عدلیہ و انتظامیہ کے قیام اور قضاۃ و عمال اور ان کے ماتحت عملہ کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ منشور ہدایت اپنی افادیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے کسی خاص دور کسی خاص طبقہ اور کسی خاص ملک سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حضرت نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے جو راعی اور رعایا کا مقام متعین کیا اور مملکت کا جو لائحہ عمل تجویز فرمایا وہ آج بھی اتنی ہی افادیت کا حامل جتنا اس دور میں تھا اور ہر جمہوری و غیر جمہوری مملکت اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اگر امن عالم اور تحفظ حقوق کی آواز بلند کرنے والی

حکومتیں اسے اپنا لائحہ عمل قرار دے لیں تو نہ زمیندار و کاشتکار میں کشمکش ہو سکتی ہے نہ مزدور کی حق تلفی اور سرمایہ کار کے ظلم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ دولت کی غیر متوازی تقسیم سے ناہمواری جنم لے سکتی ہے۔ بلکہ ایسا پُرامن معاشرہ صورت پذیر ہو سکتا ہے جو باہمی سازگاری خوشحالی و معاشی برتری کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہو۔

ہم اس منشور کو یہاں نقل کرنے کے بجائے ترجمہ نہج البلاغہ باب مکاتیب کا حوالہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں قارئین کرام چاہیں تو نہج البلاغہ کے صفحات پر دیکھ سکتے ہیں البتہ اس کتاب میں کہیں کہیں اس کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔

اب حضرت کی حکومت کے مختلف شعبوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپ کی سیاست عین اسلامی سیاست تھی اور چونکہ اسلامی سیاست ایک ایسا نظام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں کو دین سے وابستہ کر دیا گیا ہے اس لئے حکومت علویہ کا کوئی شعبہ ور معیشت سے متعلق ہو یا معاشرت سے رعایا سے متعلق ہو یا راعی سے دین کے حدود سے خارج تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عمال کا معیار تقرر

تمدنی ارتقاء اور معاشرتی بلندی، ریاست کی تنظیم اور حکومت کی تشکیل سے وابستہ ہے۔ خواہ شخصی حکومت ہو یا جمہوری اسلامی ہو یا غیر اسلامی حکومت ہی کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں نظم و نسق پیدا کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ شورش و بدنظمی کا انسداد انسانی حقوق کا احترام اور ملکی اصلاحات کا نفاذ ممکن ہے۔ ریاست کا نظم و انضباط اور اس کی شیرازہ بندی سربراہ مملکت کے تدبر اور عمال کی انتظامی صلاحیتوں اور عملی کارگزاریوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی ریاست میں عمال و نگران کار نہ ہوں یا ہوں مگر خود غرض مفاد پرست اور ادائے فرض سے غافل ہوں تو نہ نظم و ضبط قائم رہ سکتا ہے اور نہ فتنہ و شر اور لاقانونیت کا استیصال کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے انتظامی و اصلاحی امور کا نفاذ انہی حکام و عمال کے ذریعہ عمل میں آتا ہے اور انہی کے ذریعہ رعایا کو ملکی قوانین و ضوابط کا پابند بنایا جاتا ہے۔ ان عمال کا تقرر ریاست کے مختلف علاقوں میں سربراہ مملکت کی صوابدید سے ہوتا ہے۔ اگر حکومت اسلامی ہوگی تو وہ ان امور کے علاوہ جو اسلامی و غیر اسلامی حکومت میں مشترک ہیں جزیہ و زکوٰۃ کی جمع آوری حدود و تعزیرات کے اجرائ اسلامی احکام کے نفاذ اور دینی و اخلاقی تربیت ایسے تعمیری فرائض کی انجام دہی کے بھی ذمہ دار ہونگے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عوام اپنے حکام کے طرزِ عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی طور طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ان حکام کا ہوتا ہے۔ اگر وہ بلند کردار نیک سیرت اور اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ ہوں گے تو عوام میں بھی حسن عمل کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور اگر خود غرض رشوت خور اور استحصال پسند ہوں گے تو رعایا بھی خود غرضی کی ڈگر پر چل پڑے گی اور تمام اخلاقی قدروں کو اپنے ذاتی مفاد پر بھینٹ چڑھا کر ملکی فضا کو مکدر کر کے رکھ دے گی۔ اور اس کا نتیجہ انتشار بے اطمینانی بدامنی اور آخر میں حکومت کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے مملکت کی بہبود اور عوام کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ حکام و عمال کے تقرر میں باریک بینی سے کام لیا جائے ان کے عادات و اطوار پرکھ لئے جائیں اور معیار پر پورے اتریں تو ان کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

امیرالمومنین تقویٰ دیانت اور صلاحیت کار ہی کو عہدوں کا معیار سمجھتے تھے اور اپنے دور حکومت میں کلیدی عہدے انہی لوگوں کے سپرد کئے جن کی امانت دیانت نیکی اور راست روی پر پورا اعتماد تھا۔ ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں:۔

ولا یخص بالولات الا اهل الدیانات والامانات۔

(استیعاب۔ ج ۳۔ ص۴۷)

حضرت علی انہی لوگوں کو والی و حاکم مقرر کرتے جو امین اور دیانت دار ہوتے۔

اس سلسلہ میں خاندانی اثرات قبائلی طاقت قرابت اور سفارش سے قطعاً متاثر نہ ہوتے تھے۔ صرف دیانت اور نظم و ضبط کی اہلیت کو دیکھتے تھے اور ان عمال کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ وہ سفارش پر عہدے نہ دیں۔ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا:۔

لا تقبلن فی استعمال عمالك وامرائك شفاعة الا شفاعة الکفایة والامانة (اسد الغابہ)

کارندوں اور کار پردازوں کو عہدہ دینے میں کسی کی سفارش قبول نہ کرنا بلکہ یہ دیکھو کہ وہ امین اور اس کام کے لئے موزوں ہیں۔

امیرالمومنین کے عمال میں چند عمال ہاشمی بھی تھے جیسے فرزندان عباس: عبداللہ، عبیداللہ اور قثم۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ تاثر لیا ہے کہ حضرت نے عہدہ داروں کے انتخاب میں قرابت کا پاس کیا ہے۔ اور عزیزداری کو ملحوظ رکھا ہے لہٰذا حضرت عثمان نے اگر اپنے قبیلہ و خاندان سے عمال مقرر کئے تو ان پر حرف گیری کیوں کی جائے جب کہ حضرت علی پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی اس سے حضرت علی کی شخصیت کا تخفظ پیش نظر نہیں ہے بلکہ حضرت عثمان کی اقربا نوازی کا جواز ثابت کرنا ہے مگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت علی کے انتخاب میں اقربا پروری کا جذبہ شامل تھا تو حضرت عثمان خویش نوازی کے الزام سے بری کیسے

ثابت ہو گئے جب کہ الزام کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو برسر اقتدار لائے بلکہ الزام یہ ہے کہ ایسوں کو برسر اقتدار لائے جو خود سر، عافیت اندیش اور امور نظم و نسق سے بے خبر تھے جنہوں نے قبائلی عصبیت کو ابھارا، سرمایہ داری کا رجحان پیدا کیا اور جبر و استحصال اور ظلم و تشدد سے انسانی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا۔ اگر ایسے لوگوں کو منتخب کرتے جو حق پسند انصاف پرور اور تقویٰ و دیانت کے پابند ہوتے تو اقربا نوازی ہوتی بھی تو لوگ اسے نظر انداز کر دیتے اور نوبت وہاں تک نہ پہنچتی جہاں تک پہنچی۔ حضرت علی نے جن عزیزوں کو عہدے دیئے ان کی انتظامی صلاحیت اور تقویٰ و دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہے اس تفرقہ کے باوجود دونوں دوروں کے عاملوں کو صرف قرابت میں اشتراک کی بنا پر ایک سطح پر سمجھنا اور اس سے حضرت عثمان کی بے غرضی و بے لوثی پر ثبوت لانا واقع کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ پھر یہ بات اس وقت کہی جا سکتی تھی جب اموی عمال کی طرح ہاشمی عمال تمام صوبوں پر چھائے ہوتے اور تمام علاقوں کا دروبست ان کے ہاتھوں میں ہوتا۔ لے دے کر دو چار عمال ہاشمی تھے اور وہ بھی ایسے جن کی علمی و عملی جلالت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ پچیس برس کے طویل عرصہ میں ہاشمی کسی عہدہ پر نظر نہیں آتا۔ تو اسے اتفاق پر محمول کر کے قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا اور امیر المومنین کے دَور میں چند ہاشمی منصب پر فائز ہو جاتے ہیں۔ تو ذہنی کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے اور پیشانی پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ کیا بنی ہاشم میں کوئی بھی کلیدی منصب کی اہلیت نہ رکھتا تھا اور اگر ان میں اہلیت تھی تو پھر ہاشمیت کی بناء پر انہیں عہدوں سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہوتا۔ اگر بقول حضرت عمر نبوت و خلافت ایک خاندان میں جمع نہ ہو سکتی تھی تو کیا خاندان نبوت میں کسی عہدہ و منصب کی بھی گنجائش نہ تھی۔ کیا ان میں اہل افراد نہ تھے یا یہ بنی ہاشم سے بے التفاتی و سرد مہری کا مظاہرہ تھا۔ امیر المومنین کی فرض شناسی و بے نفسی کو دیکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے قربت سے متاثر ہو کر عدم اہلیت کے باوجود کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ دیا ہو گا یا ان سے امتیازی برتاؤ روا رکھا ہو گا۔ حضرت کے نزدیک عہدوں کا معیار صرف اہلیت اور کردار کی پاکیزگی تھا اور جو اس معیار پر پورا اترتا وہ ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی مہاجر ہو یا انصار اسے اس کے حق سے محروم نہ کرتے۔ اگر ان میں سے کوئی بے راہروی کا مرتکب ہوتا تو قرابت و عزیزداری کی بناء پر درگزر سے کام نہ لیتے بلکہ فوراً مواخذہ کرتے اور مناسب سزا دیتے۔

عمال کا محاسبہ

عمال حکومت مملکت میں تعمیر اور تخریب دونوں طرح کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہی کی تعمیری صلاحیتوں سے نظم مملکت سنورتا ہے اور انہی کی تخریبی کارروائیوں سے نظم و نسق بگڑتا ہے۔ حزم و احتیاط اور احساس فرض کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہ مملکت عمال کے حالات و معاملات سے باخبر رہے ان کی تخریبی و تعمیری تمام کارروائیوں پر نظر رکھے اور سلطنت کا کاروبار ان پر چھوڑ کر مطمئن نہ ہو جائے اس لئے کہ عمال حکومت کتنے ہی بلند کردار اور پاکیزہ نفس کیوں نہ ہوں ان کے گرد عصمت کا حصار نہیں ہوتا کہ ان سے کسی لغزش و بے راہروی کا احتمال نہ ہو جب کہ دولت و اقتدار کے نشہ میں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور حرص و طمع کا شکار ہو کر رشوت، غبن اور خیانت ایسے جرائم کا ارتکاب کر گزرتے ہیں اور خدمت خلق کے بجائے ذاتی مفاد کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

امیرالمومنین انسانی مزاج کی بے ثباتی کو خوب سمجھتے تھے اس لئے وہ آنکھ کان بند کر کے اعتماد کر لینے کے قائل نہ تھے اور پھر سابقہ حکومت کے بھی دو ایک عمال حضرت کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلا کر اپنے عہدوں پر بحال تھے جیسے ابوموسیٰ اشعری، اشعث ابن قیس اور مصقلہ ابن ہبیرہ۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ان کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھی جائے۔ آمد و خرچ کا جائزہ لیا جائے اور ان کا پورا پورا احتساب کیا جائے چنانچہ امیرالمومنین ان کے رہن سہن طور طریقہ اور چھوٹے بڑے معاملہ پر نظر رکھتے ان کی کارکردگیوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی کوتاہیوں پر تنبیہ و سرزنش کرتے بیت المال کا حساب جانچتے اور جائز و ناجائز مصرف کو وقت نظر سے دیکھتے اگر کسی کے متعلق خیانت کی خبر آتی تو نظریں آسمان کی طرف اٹھا کر بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے تھے:۔

اللّٰھم انک تعلم انی لم آمرھم بظلم خلقک ولا بترک حقک	بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے انہیں تیری مخلوق پر ظلم کرنے اور تیرے حق کو نظر انداز کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔"
(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۷۸)	

اور پھر عملاً محاسبہ و مواخذہ کرتے اور جرم کی سبکی و سنگینی کے لحاظ سے کسی کو فقط تنبیہہ و سرزنش کرتے کسی سے غبن کیا ہوا سرمایہ اگلواتے اور کسی کو قید و بند کی سزا دیتے۔ اس سلسلہ کے متعدد واقعات میں سے چند واقعات اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں تاکہ حضرت کی سیرت کا یہ رُخ نظروں کے سامنے

آ جائے۔

والی بصرہ عثمان ابن حنیف ایک دعوت میں شریک ہوئے حضرت کو معلوم ہوا تو انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔" مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کروگے جن کے یہاں فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور دولت مند مدعو ہوں۔ جو لقمے چباتے ہو انہیں دیکھ لیا کرو اور جس کے متعلق شبہ بھی ہو اسے چھوڑ دیا کرو اور جس کے پاک و پاکیزہ طریق سے حاصل ہونے کا یقین ہو اس میں سے کھاؤ۔ اے ابن حنیف! اللہ سے ڈرو اور اپنی روٹیوں پر قناعت کرو تاکہ جہنم کی آگ سے چھٹکارا پاسکو۔"

اشعث ابن قیس جو حضرت عثمان کے زمانہ سے آذربائیجان کا حاکم چلا آرہا تھا حضرت کو اسکی بے راہروی کی اطلاع ملی تو جنگ جمل سے فارغ ہو کر اسے تحریر کیا کہ:۔" تمہارے ہاتھوں میں اللہ کا جتنا مال ہے تم اس وقت تک اس کے خزانچی ہو جب تک اسے میرے حوالے نہ کردو۔" اشعث سمجھ گیا کہ اسے برطرف کیا جارہا ہے اس نے یہ کیا کہ جتنا مال سمیٹ سکتا تھا سمیٹ لیا اور اپنے چند دوستوں سے حضرت کے خط کا ذکر کرنیکے بعد کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں معاویہ کے ہاں چلا جاؤں انہوں نے کہا کہ تمہارے لئے مناسب نہیں کہ اپنے قوم و قبیلہ کو چھوڑ کر شام جاؤ۔ اس نے دوستوں کے کہنے سننے سے شام جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مال پی جانا چاہا حضرت نے حجر ابن عدی کندی کو اس کے پاس بھیجا جو اسے گھیر گھار کر کوفے لائے۔ جب اس کا سامان دیکھا گیا تو اس میں سے چار لاکھ درہم برآمد ہوئے۔ حضرت نے تیس ہزار درہم اس کے خدمات کے صلہ میں اسے دیئے اور باقی مال بیت المال میں جمع کر دیا۔

منذر ابن جارود عبدی نے جو آپ کی طرف سے اصطخر کا حاکم تھا کچھ ہیر پھیر کیا آپ نے اُسے تحریر فرمایا:۔" مجھے تمہارے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ تم آخرت گنوا کر دنیا بنا رہے ہو اور دین سے رشتہ توڑ کر اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کر رہے ہو۔ تم اس قابل نہیں کہ تمہیں امانت میں شریک کیا جائے۔ یا خیانت کی روک تھام کے لئے تم پر بھروسہ کیا جائے۔ لہٰذا جب میرا خط ملے تو فوراً میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔" جب منذر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو جانچ پڑتال کے بعد اس کے ذمہ ۳۰ ہزار درہم نکلے منذر نے انکار کیا اور کہا کہ میرے ذمہ کوئی رقم نہیں ہے۔ حضرت نے اسے قسم کھانے کو کہا اس نے قسم کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ آپ نے اسے جیل میں بھجوا دیا۔ آخر صعصعہ ابن صوحان کے کہنے سے اسے رہا کر دیا گیا۔

زیاد ابن سمیہ کے بارے میں جو بصرہ میں ابن عباس کا قائم مقام تھا کچھ بد دیانتی کی خبریں آئیں۔ حضرت نے اسے تحریر کیا کہ" اگر مجھے پتہ چل گیا کہ تم نے مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتے ہوئے کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں ہیر پھیر کیا ہے تو یاد رکھو کہ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو تمہیں تہی دست بوجھل پیٹھ والا

اور بے آبرو کرکے چھوڑے گی۔"

اردشیر خرہ کے عامل مصقلہ ابن ہبیرہ کو تحریر کیا:" وہ مال جسے مسلمانوں کے نیزہ کی انیوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں سے جمع کیا گیا تھا اور جس پر ان کے خون بہائے گئے تھے تم اپنی قوم کے ان بدوؤں میں بانٹ رہے ہو جو تمہارے ہوا خواہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ثابت ہُوا تو تم میری نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ اس مال میں وُہ مسلمان جو میرے ہاں ہیں یا تمہارے ہاں دونوں برابر کے شریک ہیں۔"

جب بنی تمیم کے کچھ افراد نے ابن عباس کے متشددانہ رویہ کا شکوہ کیا تو حضرت نے ابن عباس کو لکھا:۔ "خدا تم پر رحم کرے رعیت کے بارے میں تمہارے ہاتھ اور زبان سے جو اچھائی یا برائی ہونے والی ہو اس میں جلد بازی نہ کیا کرو کیونکہ ہم دونوں اس ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں۔"

والی حلوان اسود ابن قطبہ کو تحریر کیا:۔" دیکھو جب حاکم کے رجحانات مختلف اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوں گے تو یہ امر اکثر انصاف پروری سے مانع ہو گا۔ لہٰذا حق کی رُو سے سب لوگوں کا معاملہ تمہاری نظروں میں برابر ہونا چاہیئے۔ اپنے نفس کی حفاظت کرو اور مقدور بھر رعایا کی نگرانی رکھو۔"

محکمۂ قضا

حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ رعایا کے نزاعی امور کا بے لاگ فیصلہ کرنے کے لئے ایسی عدالت گاہیں قائم کرے جہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ اور امیر و غریب کو حصول انصاف کا یکساں موقع ہو۔ تاکہ کمزور کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور مظلوم دادرسی سے محروم نہ رہے۔ اگر کمزور و درماندہ افراد کو حکومت کی طرف سے یہ تحفظ نہ ہو تو نہ اجتماعی نظم باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کی صورت پیدا ہو سکتی ہے بلکہ کمزور افراد یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وُہ ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں ظلم کے خلاف فریاد سننے والا اور ظالم کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی ہو گی اور دوسری طرف کمزور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ظلم دُور سہتے رہیں گے اور آخر اندرونی گھٹن انہیں آمادہ بغاوت کرے گی اور بغاوت کا آتش فشاں پھٹتا ہے تو حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم۔ کفر کے ساتھ ملک باقی رہ سکتا ہے اور ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔

دنیا کی آئینی حکومتیں عدل و انصاف کو بروئے کار لانے کے لئے دیوانی فوجداری خفیفہ اور عالیہ کے

نام سے عدالتیں قائم کرتی ہیں مگر حصول انصاف کے لئے عدالتوں کے چکر لگانے پیشیاں بھگتنے وکیل کرنے اور کورٹ فیسوں کا بار اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اسلام نے محکمۂ قضا کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ اگر اس کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط ملحوظ رکھے جائیں تو نہ صرف انصاف کے حصول میں دشواری پیش آسکتی ہے اور نہ مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ نہ اس میں جنبہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ رشوت کی گنجائش ہے اس لئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس منصب پر وہی لوگ فائز ہو سکتے ہیں جو تقویٰ و عدل سے آراستہ اور اسلامی قوانین پر اجتہادی نظر رکھتے ہوں۔ خودداری و عزتِ نفس انہیں عزیز ہو اور معاشرہ میں معزز و باوقار ہوں تاکہ رشوت ستانی سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیں اور کسی دولت مند سے مرعوب ہو کر عدل و انصاف سے انحراف نہ کریں۔

امیرالمومنین نے اپنے دورِ خلافت میں محکمہ قضا کو خاص اہمیت دی اور ہر مرکزی مقام پر اس کا شعبہ قائم کیا اور انہی لوگوں کو منصب قضا کے لئے نامزد فرمایا جو تقویٰ و دیانت اور علمی اہلیت کے لحاظ سے اسلام کے مقرر کردہ معیار پر پورے اترتے تھے۔ حضرت خود بھی پیغمبر اکرم کے دور میں منصب قضا پر فائز رہے تھے اور اپنی انصاف پروری معاملہ فہمی اور نکتہ رسی کا سکہ دلوں پر بٹھا چکے تھے۔ اس عملی تجربہ کے بعد ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ محکمہ قضا کن لوگوں پر قائم ہونا چاہئے۔ حکام عدلیہ کے فرائض کیا ہیں اور کس نہج پر انہیں تربیت دینا چاہیئے۔ کہ وہ رشوت سفارش اور جنبہ داری سے بچ کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ انسان کی طبعی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس کا پورا لحاظ رکھا کہ قضاۃ کو اتنا وظیفہ ملنا چاہیئے کہ وہ رشوت اور ناجائز آمدنی سے بے نیاز ہو کر آسودگی و خوش اسلوبی سے گزر بسر کر سکیں اور ضرورت و احتیاج انہیں غلط راہ پر نہ ڈال دے۔ مزید اطمینان کے لئے ان کی مالی حالت اور معیار زندگی پر نظر رکھتے تھے املاک و جائیداد کا جائزہ لیتے اور آمد و خرچ کا موازنہ کرتے اگر صورت حال مشتبہ نظر آتی تو تنبیہہ و سرزنش کرتے یا برطرف کر دیتے۔ چنانچہ قاضی کوفہ شریح ابن حارث کے بارے میں جو حضرت عمر کے دور سے عہدہ قضا پر فائز چلا آرہا تھا یہ معلوم ہوا کہ اس نے ۸۰ دینار میں ایک مکان خرید کیا ہے حضرت نے اسے طلب کیا اور فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک مکان ۸۰ دینار میں خریدا ہے۔ شریح نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ حضرت نے اسے غصہ کی نظر سے دیکھا اور کہا "اے شریح ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے اس گھر کو دوسرے کے مال سے خریدا ہو یا حرام کی کمائی سے قیمت ادا کی ہو اگر ایسا ہے تو تم نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔"

اسلام مذہب عدل ہی کو ہر شعبہ میں کارفرما دیکھنا چاہتا ہے اور محکمہ قضا کا تو بنیادی مقصد ہی

قیامِ عدل ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد باری ہے :۔

و اذا حکمتم بین الناس ان	جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو عدل و
تحکموا بالعدل۔	انصاف سے فیصلہ کرو۔"

اس عدل کا تقاضا یہ ہے کہ سماعت کے دوران فریقین سے یکساں طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور دعوےٰ وجواب دعویٰ پر یکساں توجہ کی جائے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے اگر قاضی سلام کرے تو الگ الگ سلام کرنے کے بجائے ایک ساتھ سلام کرے اور جواب سلام دے تو ایک ساتھ جواب دے۔ کھڑا ہونے کے لئے کہے تو دونوں کو اور بیٹھنے کے لئے کہے تو دونوں کو اور کسی ایک فریق کی طرف اپنا میلان ظاہر نہ کرے تاکہ یکطرفہ التفات دوسرے فریق کے دل میں انصاف سے محرومی کا احساس پیدا نہ کرے۔ فریقین میں مساوات و برابری کا برتاؤ امیرالمومنین کا ایک مستقل کردار تھا اور فریقین میں خواہ ایک ذمی ہو اور دوسرا مسلمان ادنٰی امتیاز کے بھی روادار نہ ہوتے تھے اور اپنے قضاۃ عمال کو بھی اس کا سختی سے پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ صاحب وفیات الاعیان نے تحریر کیا ہے کہ حضرت ایک ذمی کے ساتھ فریق مقدمہ کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں آئے۔ قاضی شریح نے کھڑے ہو کر آپ کا خیر مقدم کیا اس پر آپ نے فرمایا:" یہ تمہاری پہلی ناانصافی ہے۔" ایک شخص آپ کے ہاں مہمان ہوا اور ابھی مہمانی کے دنوں میں اس نے آپ کی عدالت میں ایک شخص کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم فریق مقدمہ ہو اور پیغمبر اکرم فرما گئے ہیں کہ یہ امر تقاضائے انصاف کے خلاف ہے کہ فریقین مقدمہ میں سے ایک کو مہمان ٹھہرایا جائے اور دوسرے کو مہمان نہ کیا جائے۔ لہٰذا تم میرے ہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ کتب سیر میں درج ہے کہ آپ حضرت عمر کے دورِ حکومت میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ان کے ہاں گئے۔ حضرت عمر نے آپ کو یا ابا الحسن کی کنیت سے اور آپ کے حریف کو نام سے مخاطب کیا اس پر حضرت کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ عدل کا اقتضاء یہ تھا کہ فریقین مقدمہ کے طرزِ تخاطب میں یکسانیت ہوتی۔ ایک کو نام سے اور دوسرے کو کنیت سے مخاطب کرنا تقاضائے عدل کے خلاف ہے۔

ان دو ایک واقعات کو دیکھنے کے بعد جو صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت کی نگاہیں عدل کے جملہ پہلوؤں پر مرکوز رہتی تھیں اور کوئی نیم روشن یا ڈھکا چھپا گوشہ بھی اُن کی باریک بین نظروں سے اوجھل نہ رہتا تھا۔ مندرجہ واقعات میں یہ تفریق تو ایک حد تک عیاں ہے کہ ایک کا خیر مقدم کیا جائے اور دوسرے کا خیر مقدم نہ ہو یا ایک کو مہمان کیا جائے اور دوسرے کو مہمان نہ کیا جائے مگر ایک کو کنیت سے اور دوسرے کو نام سے مخاطب کرنے میں امتیاز کی جو جھلک پائی جاتی ہے

اس پر اگر کسی باریک بین اور نکتہ رس کی نظر پڑ سکتی ہے تو غور و فکر کے بعد ہی پڑ سکتی ہے۔ مگر حضرت فوراً ان دونوں کے باہمی فرق کی طرف ملتفت ہو جاتے ہیں اور اس خیال سے کہ اس طرز تخاطب سے یہ تاثر لیا جا سکتا ہے کہ فیصلہ میں جھکاؤ بھی ادھر ہوگا جدھر تخاطب کا انداز تعظیمی ہے۔ آپ فوراً ادھر توجہ دلاتے ہیں کہ یا تو دونوں کو کنیت سے مخاطب کیا جاتا یا دونوں کو نام سے تاکہ اس تفریق کے نتیجہ میں کوئی غلط تاثر پیدا نہ ہونے پائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دنیا میں کون ایسا ہوگا جسے اپنے حق میں تعظیمی رویہ ناگوار گزرتا ہوگا جب کہ وہ واقع میں تعظیم کا سزاوار بھی ہو۔ مگر حضرت کی طبع عدل آشنا پہ یہ تعظیمی لب و لہجہ بھی بار ثابت ہوتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر عدل پسندی کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

موجودہ دور میں اکثر حلقوں سے یہ آواز سننے میں آتی ہے کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد رہنا چاہیئے، تاکہ عدلیہ حکومت کی مقصد براری کا ذریعہ نہ بن جائے اور عوامی مفاد کا تحفظ کرنے کے بجائے حکومت کے مقاصد کی پشت پناہی ہی اس کا کام نہ رہ جائے۔ بیشک اس حد تک عدلیہ کی آزادی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے اور اس کے دائرہ کار کو وسیع ہونا ہی چاہئے۔ اس لئے کہ عدلیہ قانون کی ترجمان ہے اور قانون کی بالادستی عوام تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک اصول و آئین کی پابند حکومت بھی اسی کے آگے جھکنے پر مجبور ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عدلیہ کو آنکھ بند کرکے کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہے اور جو چاہے فیصلے کرے اور اس کے غلط فیصلوں پر ٹوکنے والا اور صحت و سقم سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ ہو جب کہ ایک حکومت عادلہ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ عدالتی فیصلوں کو جانچے پرکھے اور غلط فیصلوں میں ردّ و بدل کرے یا انہیں سرے سے کالعدم قرار دے۔ چنانچہ امیرالمومنین نے عدلیہ پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ اہم امور کے فیصلے ان کے علم میں آئے بغیر نہ کریں صاحب وسائل نے تحریر کیا ہے کہ آپ نے قاضی شریح سے فرمایا:۔

اياك ان تنفذ قضية في	خبردار! قصاص یا حدود الٰہیہ میں سے کسی حد کا
قصاص او حد من حدود الله	اجرا اور مسلمانوں کے حقوق میں سے کسی حق کا
او حق من حقوق المسلمين حتى	فیصلہ اس وقت تک نہ کرنا جب تک وہ فیصلہ
تعرض ذلك علي۔ (وسائل ج ۳ صفحہ ۳۹۵)	میرے سامنے پیش نہ کر دو۔"

البتہ جہاں تک عمومی فیصلوں میں آزادی اور بین الملی مساوات کا تعلق ہے تو حضرت اس کے سب سے بڑے حامی تھے آپ عدل کے اقتضا اور قانون کی بالادستی کے مقابلہ میں نہ کسی کی برتری کے قائل تھے نہ ترجیحی سلوک کے روادار تھے اور نہ اپنی ذات کو اس سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ اس

کا شاہد ہے کہ آپ صفین سے پلٹتے ہوئے ایک زرہ کھو بیٹھے۔ چند دنوں کے بعد ایک نصرانی کو وہی زرہ پہنے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا کہ تم نے یہ زرہ کہاں سے لی ہے یہ زرہ تو میری ہے اس نے اپنی ملکیت ظاہر کیا۔ حضرت نے قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ قاضی کے دریافت کرنے پر اس نصرانی نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اور میرا قبضہ دلیل ملکیت ہے۔ شریح نے حضرت سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ زرہ آپ کی ہے؟ آپ نے فرمایا ھذہ درعی لم ابع ولم اھب۔ "یہ زرہ میری ہے نہ میں نے اسے بیچا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے۔" شریح نے دیکھا کہ ایک طرف یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ غلط دعویٰ کیا ہوگا اور دوسری طرف شرعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قبضہ کو دلیل ملکیت سمجھا جائے جب تک اس کے خلاف ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔ فیصلہ حضرت کے خلاف جاتا تھا۔ قاضی کو آپ کے خلاف فیصلہ دینے میں تردد ہوا۔ حضرت نے اسے متردد دیکھا تو فرمایا کہ تم وہی فیصلہ کرو جو منصب قضا کا تقاضا ہے۔ چنانچہ فیصلہ حضرت کے خلاف ہوا اور وہ زرہ اس نصرانی کو مل گئی۔

اس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے تو عدل کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو حضرت کی عدل پسندی و نصفت شعاری کا روشن ثبوت ہیں۔ آپ خود بھی سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ اور وہ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوتا مگر آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ مدعی اپنا فیصلہ خود کرے۔ اس لئے اس کا فیصلہ قاضی کے سپرد کیا اور قاضی سے یہ کہنے کے بجائے کہ اس نے چوری کی ہے یا چوری کرنے والے سے خریدی ہے یہ فرمایا کہ میں نے نہ اس کے ہاتھ بیچی ہے اور نہ ہبہ کی ہے اگرچہ مقصد یہی تھا کہ یہ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ جب بیچی بھی نہیں گئی اور ہبہ بھی نہیں کی گئی تو پھر چوری ہی کے ذریعہ اس تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر حضرت اس کی طرف چوری کی نسبت دیتے تو خلافِ واقعہ نہ ہوتا مگر آپ اسے چور کہہ کر نہ اس کے جذبات کو ٹھیس لگانا چاہتے ہیں اور نہ اس کے وقار کو مجروح کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ آپ کی نظروں میں ایک زرہ کے مقابلہ میں انسانی اقدار کا تحفظ زیادہ عزیز تھا۔ اگرچہ فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور مقدمہ ہار گئے مگر حقیقۃً یہ حضرت کی اخلاقی جیت تھی جس کا ردعمل یہ ہوا کہ اس نصرانی کو جیت کے باوجود اپنی شکست کا احساس ہوا اور اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑا اور جب عدالت گاہ سے باہر نکلا تو حضرت سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔ دبے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ زرہ آپ کی ہے میں نے صفین کے راستے سے اسے اٹھایا اب یہ زرہ حاضر ہے اور میں آپ کی بلند نفسی، عالی ظرفی اور عدل پسندی کو دیکھ کر اسلام قبول کرتا ہوں۔ حضرت زرہ کی واپسی پر تو کیا خوش ہوتے البتہ اس کے اسلام لانے پر خوش ہوئے اور وہ زرہ اسے ہبہ کر دی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی مرحمت فرمایا۔

بُنیادی حقوق کا تحفظ

ہر انسان دنیائے شعور میں قدم رکھنے کے بعد ایک طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس میں کچھ معاشرتی حقوق بھی رکھتا ہے۔ اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے فرائض کو پہچانے اور اپنے حقوق کا تحفظ کرے وُہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اور اپنے حقوق کے ساتھ دوسروں کے حقوق کو بھی پامالی سے بچائے اور اگر ان حقوق میں کوئی سدِّراہ ہو تو بقدر امکان انہیں آزاد کرانے کی کوشش کرے تاکہ ناجائز پابندیوں اور ناروا بندشوں کو توڑ کر اپنی فطری آزادی بحال رکھ سکے۔ ان حقوق کے تحفظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے اور حکومتیں بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رسمی طور پر سہی دستوری دفعات میں حقوق عامہ کو جگہ دیتی ہیں تاکہ عوام کے دلوں میں عدم تحفظ کا احساس اور ملک میں بے اطمینانی بدامنی اور شورش پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ حقوق بنیادی طور پر چار ہیں :۔

پہلا حق، حقِ حیات ہے یعنی ہر شخص کو اس دنیا میں جینے کا حق ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو زندگی سے محروم کر دے۔ اسلام جو پُرامن زندگی کا داعی اور حیاتِ انسانی کا پاسبان ہے قتل کو انتہائی سنگین جرم قرار دیتا ہے اور ایک خون ناحق کو اتنی اہمیت دی ہے جتنی سب لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے :۔

من قتل نفس بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً۔	"جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلے میں اور نہ فساد انگیزی کے نتیجہ میں بلکہ یونہی قتل کر ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا"

اس آیت کے استثنا سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کو قتل یا فساد فی الارض کی پاداش میں قتل کر دیا جائے تو یہ قتل ناروا نہ ہوگا اس لئے کہ ایسے شخص نے خود ہی قتل اور فتنہ فساد کے ارتکاب سے اپنے حق حیات کو کھو دیا ہے۔ عدل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے تاکہ انتقام در انتقام کی صورت میں قتل و خونریزی کا دروازہ نہ کھل جائے۔ اسلام نے جان کے بدلے میں جان لینے کا حق دے کر قتل کے انسداد میں موثر قدم اٹھایا ہے۔ اس لئے کہ قتل کو قتل کا خوف ہی روک سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ارتکاب قتل

سے پہلے یہ سوچ لے کہ اسے بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے تو وہ اپنی جان کے بچاؤ کے لئے کبھی قتل کا مرتکب نہیں ہوگا اور نتیجۃً دونوں قتل سے محفوظ رہیں گے اسی لئے قرآن مجید میں قانونِ قصاص کو زندگی و حیات سے تعبیر کیا گیا ہے :۔

ولکم فی القصاص حیاۃ۔ قصاص میں تمہارے لئے زندگی مضمر ہے ''

اسی طرح کسی حملہ آور کا قتل بھی ناجائز نہ ہوگا جب کہ جان کا بچاؤ اس قتل پر منحصر ہو کیونکہ حملہ آور نے خود دوسرے کے حق پر حملہ کر کے اپنے حق کو ضائع کیا ہے اور اپنے قتل کا جواز پیدا کر دیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے صرف دوسرے ہی کو قتل کرنا جرم نہیں ہے بلکہ اپنے ہاتھوں خود اپنی جان کو تلف کرنا اور خودکشی کا مرتکب ہونا بھی قتل ہی کی طرح کا سنگین جرم ہے بلکہ اپنے اعضا بدن میں سے کسی عضو کو قطع کرنا تک ناروا ہے اس لئے کہ انسان زندگی کا امین بنایا گیا ہے اور یہ عمل امانت میں خیانت اور تصرف ناجائز ہے۔ اگرچہ بعض ممالک میں خودکشی کو شجاعانہ اقدام تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بزدلی اور حوادث زمانہ کے سامنے سپراندازی کا نتیجہ ہے جسے شجاعت ایسی اخلاقی فضیلت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس اقدام سے واضح لفظوں میں روکا ہے :۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما۔ اپنی جانوں کو تلف نہ کرو کیونکہ اللہ تم پر بہرحال مہربان ہے ''

امیرالمومنین جہاں انسانی اقدار کے محافظ تھے وہاں انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ اور کسی صورت میں اتلاف جان اور خون ناحق کو گوارا نہ کرتے تھے۔ اگرچہ پیغمبر اکرم کے دور میں جنگوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے عہد میں بھی خونریز جنگیں لڑیں مگر ان میں سے ہر جنگ دفاعی اور حفاظت خود اختیاری کے لئے تھی۔ پیغمبر اکرم نے اس وقت تلوار اٹھائی جب دشمن آپ پر حملہ آور ہوا اور حضرت نے اپنے دور میں اس وقت قدم اٹھایا جب دشمن نے لشکر کشی کر کے امن عامہ کو تباہ کر دینا چاہا۔ اس صورت میں بھی آپ امکان بھر یہ کوشش کرتے رہے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور کشت و خون کے بغیر حالات سدھر جائیں۔ جنگ چھڑنے سے پہلے صلح و آشتی کی دعوت دی پُرامن رہنے کی تلقین کی اور جب ساری کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں اور فریق مخالف جنگ پر تل گیا تو اس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھایا جب تک دشمن کی طرف سے پہل نہیں ہوئی۔ اور جس حد تک دشمن پر پسپائی کے لئے جنگ ضروری تھی اس سے آگے نہیں بڑھے اور جنگ کے خاتمہ پر خون کے پیاسوں تک کی جان بخشی کر دی۔ چنانچہ جنگِ جمل کے اختتام پر اہلِ بصرہ کو یک قلم معاف کر دیا۔ مروان، عبداللہ ابن زبیر وغیرہ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا اور ام المومنین کو حفاظت

کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا اور جنگ صفین میں جتنے شامی عراقیوں کی قید و بند میں تھے سب کو بلا شرط رہا کر دیا اور جنگ نہروان کے خاتمہ پر خوارج کے زخمیوں کو جن کی تعداد چار سو تھی ایک جگہ جمع کیا اور ان کے قبیلہ والوں کو طلب کر کے فرمایا کہ ان زخمیوں کو اٹھا لے جاؤ اور ان کے زخموں کا علاج و مداوا کرو اور جب یہ تندرست ہو جائیں تو انہیں کوفہ پہنچا دو۔ حضرت کے اس طرز عمل سے ہر انصاف پسند یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپ کا مقصد صرف فتنہ و فساد کا انسداد تھا۔ اور جب اس کا انسداد ہو گیا تو پھر انسانی جانوں سے کھیلنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ایسے موقع پر دشمن کے تڑپتے سسکتے زخمیوں کو ختم کر دیا جاتا ہے مگر اس کے برعکس یہاں ان کے علاج معالجہ کی فکر کی جاتی ہے تاکہ بلا ضرورت انسانی جانوں کا اتلاف نہ ہونے پائے اور اس طرح غیر ضروری کشت و خون سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔ یہی وہ کردار تھا جس نے آپ کے جوہر ذاتی کو جلا بخشی اور دنیا نے امن پسندی عدالت کیشی اور انسانی ہمدردی میں آپ کی انفرادیت کا اعتراف کیا۔

امیر المومنین جہاں ناحق خونریزی کے شدید مخالف تھے وہاں یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کسی کا خون رائیگاں جائے اور قاتل قصاص سے بچ رہے۔ چنانچہ جب حضرت عمر قتل کر دیئے گئے تو ان کے فرزند عبید اللہ نے ہرمزان اور چند بے گناہوں کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمان نے اس سے چشم پوشی کی اور اسے قتل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب امیر المومنین نے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تو اسے ہرمزان کے قصاص میں قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اموی سامراج کے دامن میں پناہ لینے کے لئے شام بھاگ گیا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

لما ولی الخلافۃ اراد قتلہ	جب حضرت خلافت پر فائز ہوئے تو عبید اللہ کے
فھرب منہ الی معاویۃ بالشام	قتل کا ارادہ کیا مگر وہ بھاگ کر معاویہ کے پاس
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۴۲)	شام چلا گیا"

اور آخر صفین میں امیر المومنین کے مقابلہ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

دوسرا حق آزادی فکر ہے یعنی ہر شخص کی فکر کو خارجی دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے تاکہ وہ خود سے اچھے بُرے کی تمیز کر کے راہِ عمل متعین کرے۔ اگر اس آزادیٔ فکر کو سلب کر لیا جائے تو وہ اسے خیر کہے گا جسے طاقت در خیر کہے اور اسے شر سمجھے گا جسے بالادست قوت شر سمجھے اور اپنے شعور و عقل سے روشنی لینے کے بجائے دوسرے کی رائے کے تابع ہو جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اس کی آزادیٔ عمل بھی چھن جائے گی اس لئے کہ حریتِ فکر حرکت و عمل کی آزادی کا سرچشمہ ہے اور تمام افعال و اعمال فکر کے اسی طرح تابع ہوتے ہیں جس طرح لوہے کا ٹکڑا مقناطیس کی حرکت کے تابع ہوتا ہے۔ اگر فکر آزاد ہے تو عمل بھی آزاد رہے گا اور فکر جکڑی بندھی

ہے تو عمل بھی جکڑا بند صا رہے گا۔

اسلام اسی فکری آزادی کا پیغام لے کر آیا اور تمام تقلیدی بندشوں کو توڑ کر آزادانہ فکر کی دعوت دی اس نے نہ فکری آزادی پر پہرا بٹھایا اور نہ اس کی اجازت دی کہ مذہبیات میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے۔ اور کسی پر ایسا عقیدہ زبردستی ٹھونس دیا جائے جسے اس کی عقل و آزادانہ رائے تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔ اسلام اپنی ہمہ گیر سچائی کو سچائی کے زور سے منوانا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی غلط مسلک و عقیدہ اختیار کرتا ہے تو اسے بجبر اپنے آئین کا پابند بنانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے:۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔ اسلام میں جبر نہیں ہے جب کہ گمراہی کے مقابلہ میں ہدایت واضح ہو چکی ہے۔"

امیرالمومنین کا دور حریت فکر کا شاہکار ہے آپ نے آزادی فکر کا پرچم بلند کیا اور انسان کو اس کی بھولی بسری آزادی یاد دلاتے ہوئے فرمایا:۔ لا تکن عبد غیرک وقد جعلک اللہ حرا۔ جب اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے تو دوسروں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں میں نہ ڈالو۔ یہ آزادیٔ فکر کے بحال رکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ دورِ ثالث کے بعد جب لوگوں نے بیعت پر اصرار کیا تو آپ نے عجلت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے انہیں ایک آدھ دن نہیں بلکہ پورا ایک ہفتہ غور و فکر کرنے کے لئے دیا کہ وہ اس بیعت کے نشیب و فراز کو سوچ لیں اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ حضرت کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ عوام کے وقتی جذبات میں عقل و شعور کا دخل نہیں ہوتا اور نہ جذباتی فیصلہ پائیدار ہوتا ہے عوام آج ایک فیصلہ کرتے ہیں اور کل اس کے خلاف رائے دینے لگ جاتے ہیں لہذا جذباتی فیصلہ کے بجائے وہ فیصلہ ہونا چاہیئے جسے فکر و تدبر کا حقیقت پسندانہ نتیجہ کہا جا سکے اگرچہ ہوشیار اور شاطر سیاستدان عوام کے جذبات کی بوقلمونی کے پیش نظر ان کے وقتی جذبات سے فائدہ اٹھا لے جاتے ہیں اور ان کی آراء کو متاثر کرنے کے لئے سیاسی حربوں سے بھی کام لیتے ہیں مگر امیرالمومنین عوام کے رجحان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے انہیں سوچنے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں نہ ان کے ذہنوں پر دباؤ ڈالتے ہیں نہ ان کی فکروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ آزادانہ فضا میں غور و فکر کا موقع دیتے ہیں کیا دنیائے سیاست میں اس سے بڑھ کر حریت فکر کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

اسی طرح مذہبیات کے سلسلہ میں نہ آزادی مسلک کی راہ بند کی نہ کسی پر تبدیلی عقیدہ کے لئے جبر کیا اور نہ کسی فرد کے مذہبی معاملات میں وہ یہودی ہو یا نصرانی صابی ہو یا مجوسی دخل دیا اور اپنے عمل و کردار سے واضح کر دیا کہ دین کی بنیاد دلیل و برہان پر ہے اسے نظریاتی طور پر تو منوایا جا سکتا ہے مگر قوت و طاقت سے نہیں۔ اس لئے کہ قوت و طاقت اور جبر و اکراہ سے نہ عقائد میں انقلاب آتا ہے اور نہ ذہنوں میں

تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا حق آزادیٔ عمل ہے۔ یعنی انسان اپنے افعال و اعمال میں ایک حد تک آزاد ہے اور اسے اس کی مرضی کے خلاف نہ کسی کام پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے وہ جس میں اپنے لئے بہتری سمجھے اُسے کرے اور جس میں ضرر و نقصان دیکھے اُسے نہ کرے بشرطیکہ اس کے اعمال مفاد عامہ کے لئے مضر اور ملک و ملت کے لئے نقصان دہ نہ ہوں۔ اس لئے آزادیٔ عمل کے ساتھ بعض پابندیاں بھی ناگزیر ہیں اور ہر متمدن معاشرہ میں ایسے اقدامات پر پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے جو اخلاق کو تباہ اور ملکی امن کو برباد کرنے کا باعث ہوں۔

امیرالمومنین فکری آزادی کی طرح عملی آزادی کے بھی حامی اور اس پر سختی سے عامل تھے انہوں نے کسی فرد کو ایسے عمل پر مجبور نہیں کیا جس پر اس کا دل آمادہ اور ضمیر مطمئن نہ ہو۔ چنانچہ جب کچھ لوگوں نے آپ کی بیعت سے انکار کیا تو کسی کو بیعت پر مجبور نہیں کیا۔ اور جب طلحہ و زبیر نے بیعت شکنی کے بعد یہ کہا کہ ہم نے بادل ناخواستہ بیعت کی تھی تو فرمایا کہ تمہیں بیعت پر مجبور کس نے کیا تھا کہ تم اپنے ضمیر کے خلاف بیعت پر آمادہ ہوئے۔ اور جب انہوں نے مکہ جانے کی اجازت مانگی تو آپ نے کہا کہ میں بہتر تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم دونوں مدینہ میں رہو اور جب انہوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ میں تمہیں زبردستی روکنا نہیں چاہتا۔ حضرت عمر کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے صحابہ کی نمایاں فردوں کو اس اندیشہ کے پیش نظر کہ وُہ مرکز سے الگ ہو کر سیاسی جوڑ توڑ نہ کرنے لگ جائیں ہمیشہ مدینہ میں زیر نگرانی رکھا۔ مگر امیرالمومنین اس امر کے سمجھنے کے باوجود کہ ان دونوں کے جانے کا مقصد فتنہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں ہے ان کی آزادیٔ عمل کو سلب نہیں کیا البتہ جب انہوں نے حرب و پیکار کے لئے بصرہ کا رُخ کیا تو ان کی روک تھام ضروری ہو گئی۔ اسی طرح معاویہ نے شام میں علم بغاوت بلند کیا تو ان کے خلاف قدم اٹھایا۔ یہ اقدام اس لئے نہ تھا کہ انہوں نے بیعت سے انکار کیا تھا بلکہ اس لئے کہ وُہ مملکت کے نظم و نسق میں خلل انداز اور شام میں آپ کے احکام کے نفاذ میں سد راہ تھے حالانکہ آپ خلیفۂ وقت تھے اور معاویہ کی حیثیت ایک صوبہ کے عامل سے زیادہ نہ تھی۔ یونہی خوارج کو بھی ان کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا اور جب تک وہ قتل و غارت پر اُتر نہیں آئے نہ ان سے کوئی تعرض کیا اور نہ ان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی۔

حضرت کی نظروں میں اس شخصی آزادی کا اتنا احترام تھا کہ نازک سے نازک موقع پر بھی اس آزادی پر حرف نہیں آنے دیا اور جنگ کے موقع پر کہ جب ایک ایک آدمی پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے یہ حق آزادی برقرار رکھا کہ چاہے کوئی آپ کے لشکر میں شامل رہے یا دشمن کے لشکر سے جا کر مل جائے حالانکہ ہنگامی

حالات میں ملکی تحفظ کے لئے چند بندشیں شخصی آزادی کے منافی نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر آپ نے ان حالات میں بھی نہ کسی کے روکنے کی فکر کی اور نہ کسی کے جانے کی پرواہ چنانچہ اس موقع پر آپ کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ شام چل دیے ہیں تو آپ نے والی مدینہ سہل ابن حنیف کو تحریر کیا:۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے یہاں کے کچھ لوگ چپکے چپکے معاویہ کی طرف کھسک رہے ہیں۔ تم اس تعداد پر جو نکل گئی ہے اور اس کمک پر جو جاتی رہی ہے ذرا افسوس نہ کرو۔ یہ دنیادار ہیں جو دنیا کی طرف جھک رہے ہیں اور اسی کی طرف تیزی سے لپک رہے ہیں۔ انہوں نے عدل کو پہچانا دیکھا سنا اور محفوظ کیا اور اسے خوب سمجھ لیا کہ یہاں حق کے اعتبار سے سب برابر سمجھے جاتے ہیں لہٰذا وہ لوگ ادھر بھاگ کھڑے ہوئے جدھر جنبہ داری اور تخصیص برتی جاتی ہے"

ان چند واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے کس حد تک شخصی آزادی کو برقرار رکھا اور دوست ہو یا دشمن قوی ہو کمزور اپنا ہو یا غیر کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا۔ یہ آزادی فکر و عمل کی آزادی ہے کار و کسب کی آزادی ہے۔ معاشرتی و سماجی آزادی ہے نقل و حرکت کی آزادی ہے اور ایک حد تک مذہب و عقیدہ کی آزادی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جو ایک متمدن ملک کی رعایا حکومت سے طلب کرتی ہے اور ایک عدل پسند و انصاف پرور حکومت اپنے ہاں کے باشندوں کو دے سکتی ہے۔ اس آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کرتا پھرے اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے جب کہ کوئی بھی حکومت اخلاقی بے راہروی قانون شکنی فتنہ پردازی اور مردم آزاری کی اجازت نہیں دے سکتی۔

چوتھا حق طبقاتی مساوات ہے۔ طبقاتی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ لونی نسلی اور جغرافیائی امتیازات کو ختم کر کے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں قابلِ احترام سمجھا جائے اور سب کے معاشرتی و معیشتی حقوق ایک سطح پر رکھے جائیں خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، امیر ہو یا غریب، کالا ہو یا گورا کیونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے بندے اور ایک ہی نوع کی فرد ہیں اور رنگ و نسل کا تفاوت، قومیت و وطنیت کی تفریق خاندانی بلندی و پستی صرف دورِ جاہلیت کے امتیازات ہیں جنہیں ایک طبقہ نے اپنی بالادستی کے جواز کے لئے عوام کے ذہنوں میں راسخ کیا البتہ ایک کو دوسرے پر برتری ہو سکتی ہے تو تقویٰ و فرض شناسی کی بنا پر جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:۔

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔	اے لوگو ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے تاکہ آپس میں شناسائی ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ

پرہیزگار ہے۔"

امیرالمومنین اسلامی نظریۂ مساوات کے علمبردار اور انسانی حقوق کے نگران تھے۔ انہوں نے قریشی غیر قریشی عربی، عجمی، آزاد، غلام سب کے حقوق یکساں قرار دیئے اور قبائلی بلندی و خاندانی پستی کے اعتبار سے انسانی برادری میں افتراق و امتیاز گوارا نہیں کیا۔

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است   کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

بیت المال میں جتنا ایک آزاد کا حق تھا اتنا ہی غلام کا جو برتاؤ ایک قریشی کے ساتھ روا رکھتے وہی برتاؤ غیر قریشی کے ساتھ جیسا عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے ویسا غیروں کے ساتھ نہ غیروں کو نظرانداز کیا اور نہ عزیزوں کی پاسداری کی۔ ایک مرتبہ ایک عامل کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے کچھ مالی ہیر پھیر کیا ہے تو اُسے تحریر کیا:۔ "خدا کی قسم اگر حسن و حسین بھی وُہ کرتے جو تم نے کیا ہے تو میں ان سے بھی کوئی رعایت نہ کرتا اور نہ وُہ مجھ سے اپنی کوئی خواہش منوا سکتے"۔ یہ تھی وُہ مساوات اور حقوق میں برابر کا طرزِ عمل جو چودہ سو برس قبل فرمانروائے عرب و وارثِ مسندِ رسول نے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ آج ہر مملکت میں انسانی حقوق کے منشور کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے جسے مرتب ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر امیرالمومنین نے اسوقت انسانی حقوق کا عملاً تحفظ کیا جب حقوق عامہ کا تصور ذہنوں سے ناپید تھا۔ نہ انسانی حقوق کی تعیین ہوئی تھی اور نہ اس کی تدوین کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔

معاشی نظام

موجودہ دور میں معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت کے گرد گھومتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک آزاد معاشی نظام ہے جس میں ہر شخص کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ تمام مذہبی اخلاقی اور رسمی قیود کو نظرانداز کرکے جس قدر دولت سمیٹ سکتا ہے سمیٹے۔ نہ اس کے جمع کرنے میں کوئی اخلاقی روک ہے نہ سماجی بندش۔ اس نظام میں اجتماعی مفاد پر شخصی مفاد کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور سرمایہ دار کی نظر ذاتی منفعت اور جلب زر پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ ہوس اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ سرمایہ دار مفادِ عامہ کو کچل کر اور دوسروں کے مفاد کو ٹھکرا کر خود غرضی و مفاد پرستی کی راہ اختیار کرلیتا اور دولت کی جمع آوری ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے نہ کسی پر ظلم ڈھانے سے اس کا ہاتھ رُکتا ہے اور نہ کسی کا خون چوسنے سے اس کا دل پسیجتا ہے ان سرمایہ داروں کی بے راہروی و ناانصافی کے نتیجہ میں محنت کش طبقہ کے دلوں میں نفرت کے جذبات کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ مزدور یہ سمجھتا ہے کہ وُہ سرمایہ جو نفع کی صورت میں بچ بچا کر سرمایہ دار کی جیب میں پہنچ جاتا ہے۔ وُہ

اس کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اور سرمایہ دار یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی سوجھ بوجھ اور سرمایہ کاری کا کرشمہ ہے اور اور مزدور اس کی مشینری کا ایک پرزہ ہے جسے ناکارہ یا زنگ آلودہ ہونے کی صورت میں الگ کیا جا سکتا ہے اس معاشی استحصال اور طبقاتی اختلاف کے مفاسد کا رد عمل اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوا اشتراکیت کا مقصد انفرادی ملکیت کو ختم کرکے افراد معاشرہ میں دولت کی مساوی تقسیم ہے ان اشتراکیت پسندوں کے نزدیک ملکیت کو ختم کئے بغیر معاشی ناہمواریوں اور ان سے پیدا ہوتے دائمی خرابیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

اشتراکیت کا نظریہ دور حاضرہ یا گزشتہ صدی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ۴۰۰ ق م افلاطون نے یونان میں معیشت کی اونچ نیچ اور حکومت کے غلط رویہ سے متاثر ہوکر اس کی بنیاد رکھی اور تیسری صدی عیسوی میں قباد کے دورِ حکومت میں مزدک نامی ایک شخص نے دولت و عورت کو مشترکہ سرمایہ قرار دے کر اشتراکیت کے اصولوں کی پرچار کی اور اس کے متبعین نے اسے عملاً قبول بھی کر لیا مگر ایک محدود حلقہ کے اندر ہی اس پر عملدرآمد ہو سکا اور کچھ عرصہ کے بعد خود ہی اپنی موت مرگئی۔ پھر انیسویں صدی کے اوائل میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی اور کچھ لوگوں نے اسے رائج کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارے مگر ان کی کوششیں رائیگاں گئیں اور اسے عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ایک جرمنی نژاد یہودی کارل مارکس نے نظریہ اقتصاد کے عنوان سے اس کے اصول و ضوابط منضبط کئے اور اسے معیشتی و معاشرتی خرابیوں کا واحد حل بتایا یہ دور وہ تھا کہ روس میں ایک طرف دولت کی ریل پیل تھی اور متمول طبقہ سرمایہ کے ذریعہ سرمایہ کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف بے روزگاری و معاشی بدحالی کی وجہ سے عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ عوام کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی اور صنعت کے بڑے کارآنے سے مزدوروں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ کسان جاگیرداروں کے رحم و کرم پر تھے اور مزدور صنعتکاروں کے محتاج و دستِ نگر تھے۔ صنعتکاروں اور جاگیرداروں کی بالادستی اور معیشت کی ناہمواری نے مزدوروں کو ہڑتالوں پر اور کسانوں کو ہنگاموں پر ابھارا آخر سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھر آئے اور اشتراکیت کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ مارکس کے مرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں لینن اسے عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور روسی نوجوانوں کو مساوی تقسیم کے پرکشش نعرہ سے اپنے گرد جمع کر لیا اور مخالف آوازوں کو تشدد و سختی سے دبا دیا۔ آخر اشتراکیت کی بنیادوں پر نظام نو کے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے کچھ اور ملک بھی متاثر ہوئے اور اسے جزوی فرق کے ساتھ قبول کر لیا۔ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکی دونوں کا دائرہ فکر صرف دنیوی معاش اور اقتصادی نشوونما ہے ان میں نہ مذہبی و اخلاقی قدروں کا وجود ہے اور نہ مادہ کے ماورا اقدار سے لگاؤ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری میں معاشی آزادی اور ذاتی ملکیت کا حق ہوتا ہے مگر معاشی

تحفظ کی ضمانت نہیں ہوتی اور اشتراکی نظام میں معاشی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے مگر ذاتی حق ملکیت نہیں ہوتا۔

اسلام کا نظریۂ معیشت جو فطرت سے ہم آہنگ اور تمام معاشی مشکلات کا واحد حل ہے ان دونوں نظریوں سے مختلف ہے۔ یہ نظام نہ تجربات کا مرہون منت ہے اور نہ اقتصادی ماہروں کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے بلکہ رب العالمین کا تجویز کردہ اور پیغمبر اسلام کا پیش کردہ ہے۔ اس نظام کی اساس شخصی یا گروہی مفاد کے بجائے عمومی مفاد پر ہے۔ کیونکہ اللہ کسی خاص فرد یا خاص گروہ کا رب نہیں ہے بلکہ ھو ربنا وربکم "وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے" اور اس کی ربوبیت کا سایہ سب پر یکساں ہے اس لئے اس کے قائم کردہ نظام میں اجتماعی مفاد ہی ملحوظ ہو گا اور شخصی یا گروہی مفاد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے حقیقی مالک صرف اللہ ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کی ملکیت میں داخل ہے۔ چنانچہ اس نے مال کی نسبت اپنی ذات کی طرف دیتے ہوئے فرمایا۔

واتوھم من مال اللہ الذی اٰتکم۔ — خدا کے مال میں سے جو اس نے تمہیں دیا ہے ان کو بھی دو"

اللہ کے مال میں بنیادی طور پر تمام انسانوں کو یکساں حق تصرف حاصل ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں یکساں مجاز ہیں کیونکہ تمام چیزیں جو زمین سے نکلتی ہیں یا زمین سے پیدا ہوتی ہیں یا دنیا میں پائی جاتی ہیں سب کی سب بنی نوع انسان کی نفع رسانی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا۔ — وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے نفع کے لئے پیدا کیا ہے"

البتہ جو شخص جائز طریقوں سے ان اموال میں سے کم یا زیادہ مال حاصل کر لیتا ہے خواہ محنت و مشقت سے حاصل کیا ہو جیسے تجارت، زراعت، کاروکسب وغیرہ سے یا بغیر محنت کے اس کی طرف منتقل ہوا ہو جیسے ہبہ، وصیت اور میراث کے ذریعہ سے وہ اسی سے مختص ہو جاتا ہے لیکن فرد اور معاشرہ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اس مال میں معاشرہ کا بھی ایک حصہ مقرر کر دیا گیا ہے تاکہ فرد جماعت سے اور جماعت فرد سے وابستہ رہے اور باہمی اخوت کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

اسلام نہ اس حد تک سرمایہ داری کا حامی ہے کہ کچھ لوگوں کو دولت پر اجارہ داری دیدے اور دوسروں کو اُن کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے اور نہ اس حد تک مخالف ہے کہ اپنی پیدا کردہ املاک پر حق ملکیت نہ دے۔ بلکہ افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال اور حقیقت پسندی پر نظام معیشت قائم کیا ہے۔
اس نظام میں نہ بے قید سرمایہ داری ہے جو مذہبی و اخلاقی قیود سے آزاد ہوتی ہے اور نہ اشتراکیت ہے جو

انسان کے جائز حق ملکیت کو سلب کر کے اس کی محنت کو روٹی اور کپڑے کے عوض خرید لیتی ہے اور ایک خاص طبقہ اس کی کمائی کو اپنی صوابدید سے خرچ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اسلام نے نہ سرمایہ داری کی پشت پناہی کی ہے کہ ایک غیر عادلانہ طبقاتی نظام ظہور میں آئے اور معاشرہ غیر متوازن ہو کر رہ جائے اور نہ غیر فطری مساوات کی تعلیم دی ہے کہ حکومت تمام پیداواری وسائل کو اپنی تحویل میں لے کر قومی ملکیت قرار دے لے اور تمام افراد کی ضروریات کی یکساں طور پر کفیل ہو جائے۔ اس جبری مساوات سے کارکردگی کا جذبہ مضمحل اور سعی و طلب کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے کیونکہ ذاتی کام اور اجتماعی کام میں تفریق کئے بغیر کاروکسب میں یکساں دلچسپی لینا انسانی تقاضائے طبیعت کے خلاف ہے اور اس کا اثر جلد یا بدیر معاشرہ کی مجموعی پیداوار پر پڑنا بھی ناگزیر ہے۔ اسلام نے اس جبری و غیر فطری مساوات کے بجائے ذرائع معیشت میں مساوات رکھی ہے اور ہر شخص کے لئے یکساں معاشی مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ ہر فرد اپنی جدوجہد اور استعداد کار سے معیشت کا سروسامان کرے اور اپنی محنت و کاوش کے مطابق ثمرہ و نتیجہ حاصل کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

لیس للانسان الا ماسعیٰ۔ — انسان کو اپنی محنت ہی کا ثمرہ ملتا ہے۔"

اس نظام کے ماتحت یہ امر ناگزیر ہے کہ معیشت کے اعتبار سے افراد میں تفاوت بھی رہے کیونکہ تمام افراد میں استعداد و صلاحیت یکساں نہیں ہوتی۔ جب استعداد و قوت کار میں یکسانیت نہیں ہے تو اس کے نتائج میں یکسانیت کیونکر ہو سکتی ہے لہٰذا خارجی مساوات کو بروئے کار لانے کے بجائے اسلام نے امیر و غریب کے درمیانی فاصلے کم کرنے پر توجہ دی ہے اور انفرادی حقوق ملکیت کے ساتھ متمول طبقہ پر ایسے مالی فرائض بھی عائد کر دیئے ہیں جن کی پابندی کے بعد نہ معاشرہ غیر متوازن ہو سکتا ہے اور نہ کسی فرد کے ضروریات سے محروم رہنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اسلام نے معاشی آزادی کے ساتھ انفرادی ملکیت کا بھی حق دیا ہے۔ انفرادی ملکیت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی فطرت میں سمو دیا گیا ہے اور اسلام تمام شعبہ ہائے حیات میں فطرت کا ہمنوا ہے اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے انفرادی ملکیت کا جواز ایک مسلمہ حقیقت ہے اور قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اموال کی نسبت افراد کی طرف دے کر ان کے حق ملکیت کو واضح کیا ہے اور دوسروں کے اموال میں تصرف بے جا کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل	آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھا جاؤ اور
وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا	نہ حاکموں کو بطور رشوت دو تاکہ لوگوں کے مال
فریقا من اموال الناس بالاثم	میں سے جو کچھ ہاتھ لگے خورد برد کرنے لگ جاؤ

وانتم تعلمون۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اسلام نے صرف شخصی ملکیت کا حق ہی نہیں دیا بلکہ اس حق کے تحفظ و احترام پر بھی زور دیا ہے۔ چنانچہ غصب و خیانت اور چوری، ڈکیتی پر تہدید و سزا اسی حق ملکیت کے تحفظ و احترام کی بناء پر تجویز کی ہے کیونکہ اسلام کا عدل پسند مزاج یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کے مال کو خورد برد کیا جائے یا مالک کی رضامندی کے بغیر اس میں تصرف کیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

لا یحل مال امرء الاعن طیب نفس۔ "کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے۔"

اسلام نے اگرچہ شخصی ملکیت کا حق دیا ہے مگر وسائل معیشت پر ایسے قیود عائد کر دیتے ہیں کہ بے قید سرمایہ داری کا انسداد اور اس سے پیدا ہوتے والے مفاسد کا تدارک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تفریق قائم کر کے دولت کو متوازن حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور اندھا دھند جلب زر اور دولت کی اجارہ داری کے آگے ایک بند خود بخود بندھ جاتا ہے۔ اس بے قید سرمایہ داری کا ایک بڑا سبب سودی کاروبار ہے۔ اسلام نے سرے سے سود کو حرام قرار دے دیا ہے۔ تاکہ سرمایہ داری کو تقویت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا واضح اعلان ہے:۔

واحل البیع وحرم الربٰو۔ "اللہ نے خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

اسی طرح جوا، لاٹری سٹہ اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو حرام کیا ہے کیونکہ جوئے اور لاٹری میں دوسرے کا مال بغیر معاوضہ کے ہتھیا لیا جاتا ہے جس سے ہارنے والے کے دل میں جیتنے والے کی طرف سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو بعض اوقات فتنہ و فساد کو دعوت دے کر امن عامہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور سٹہ میں خرید کیا ہوا مال موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر موجود چیز کے مقابلہ میں صرف بازار کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان چیزوں کو عمل شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ "شراب جوا، بت اور پانسہ بڑے ناپاک شیطانی کام ہیں لہٰذا ان سے بچے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

یونہی ان چیزوں سے بھی اکتساب زر حرام قرار دیا ہے۔ جن کا مقصد لہو و لعب ہو جیسے آلات لہو و قمار وغیرہ یا جن کی غرض و غایت امر ناجائز ہو جیسے صنم تراشی و صلیب سازی وغیرہ ان چیزوں کا بنانا بیچنا

خریدنا اوران کے ذریعہ نفع کمانا حرام ہے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ اذا حرم شیئا حرم ثمنہ۔	جب اللہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کے معاوضہ میں حاصل ہونے والا مال بھی حرام کر دیتا ہے۔"

بلکہ ان ممنوعہ چیزوں کے لئے خام مال کی فروخت بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ صلیب، بُت اور آلاتِ لہو بنانے کے لئے لکڑی وغیرہ کی بیع اور شراب کشید کرنے کے لئے انگور کی فروخت بھی ممنوع ہے اور ان چیزوں کی فروخت کے لئے جگہ کرایہ پر دینا بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق سے پوچھا گیا کہ:۔

عن الرجل یواجر بیتہ فیباع فیہ الخمر قال حرام اجرتہ۔	ایک شخص اپنا مکان کرایہ پر دیتا ہے اور وہاں شراب فروخت ہوتی ہے فرمایا وہ رقم جو کرایہ کی صورت میں حاصل ہوتی ہے حرام ہے۔"

اسی طرح نفع اندوزی کے غلط اور ناروا طریقوں سے منع کیا ہے جیسے ناپ تول میں کمی کرنا۔ قرآن مجید میں ہے:۔

ویل للمطففین۔	ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی تباہی ہے۔"

یا چیزوں کی مقدار بڑھانے کے لئے ان میں ملاوٹ کرنا۔ آنحضرت کا ارشاد ہے:۔

من غش مسلما فی بیع او شراء فلیس منا و یحشر مع الیھود یوم القیامہ۔	جو شخص کسی مسلمان سے خرید و فروخت کے موقع پر کسی چیز میں آمیزش کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے بلکہ قیامت کے دن یہود کے ساتھ محشور ہو گا۔"

یا ضروریاتِ زندگی کی مخصوص چیزوں کو گرانی کی اُمید پر روک کے رکھنا۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

المحتکر ملعون۔	نفع کی غرض سے ضروری چیزوں کو روک لینے والا ملعون ہے۔"

معاشی نظام کی اصلاح میں میانہ روی کو بھی بڑا دخل ہے کیونکہ اکثر معاشی پریشانیاں مصارف کو نقطۂ اعتدال پر نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ خرچ آمدنی سے بڑھنے نہ پائے تو ذہنی و معاشی الجھنوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اسی متوازن طرزِ عمل پر زور دیا ہے کہ ضرورت کے موقع پر نہ جُزرسی سے کام لیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ اور بے محل خرچ کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا	وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے

ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما۔ | ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں"

ضرورت کے موقع پر ضرورت سے زائد صرف کرنا اسراف اور بلا ضرورت صرف کرنا تبذیر کہلاتا ہے قرآن مجید میں اسراف و تبذیر دونوں سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسراف کے بارے میں ارشاد ہے :۔

ان اللہ لا یحب المسرفین۔ | خدا اسراف کرنے والوں کو درست نہیں رکھتا"

اور تبذیر کے بارے میں ارشاد ہے :۔

وآت ذا القربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا۔ | قریبیوں کا حق دو۔ نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو بے موقع ضائع نہ کرو"

اس قرآنی حکم سے ظاہر ہے کہ اگر دولت مستحقین کی اعانت اور ادائے حقوق کے علاوہ نام و نمود ٹھاٹ بھاٹ یا غیر ضروری سامان تعیش پر صرف ہوگی۔ تو یہ ضیاع مال اور تبذیر ہے اور قرآن مجید میں ہے :۔

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ | بے موقع و بے ضرورت مال ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"

اس بے موقع و بے ضرورت صرف سے روکنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ جو غریب و نادار آس پاس بستے ہیں ان میں احساس محرومی پیدا نہ ہو اور نہ ان کے جذبات مجروح ہوں اور دوسرے وہ دولت جو غیر ضروری مصارف پر خرچ ہوتی ہے وہ عزیز و اقارب اور معاشرہ کے پسماندہ افراد کے کام آئے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دولت کے ذخائر سمیٹ کر تجوریاں بھرلی جائیں اور سونا و چاندی کے انبار جمع کر لئے جائیں یہ دولت کا اکتناز ہے اور دولت کا اکتناز اس صورت میں ہوتا ہے۔ جب ادائے حقوق سے گریز کیا جائے۔ اگر مالی واجبات ادا ہوتے رہیں تو دولت کے جمع رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس میں بڑھوتری کے بجائے کمی ہی ہوتی جائے گی اور آخر خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ سونا و چاندی سمیٹ کر رکھا جائے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ | وہ لوگ جو سونا و چاندی جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو"

اسی اکتناز دولت کے سدباب کے لئے اسلام نے سونے چاندی کے برتن اور مردوں کے لئے سونے کا استعمال ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ یہ بھی اکتناز میں شامل ہے جس سے سرمایہ منجمد اور معیشت غیر متوازن ہو

کر رہ جاتی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سونے چاندی کو منجمد صورت میں رکھنے کے بجائے گردش میں رکھا جائے تاکہ خود صاحب مال کے مال میں بھی وسعت ہو اور دوسرے بھی اس گردش زر سے فائدہ اٹھا کر بیروزگاری سے متاثر نہ ہوں۔

معاشرہ میں محنت کش طبقہ کے مفادات کا تحفظ بھی ضروری ہے اور اسے اس کی محنت کا اتنا معاوضہ ملنا چاہیئے جس سے وہ اپنی بنیادی ضروریات باحسن وجوہ پوری کر سکے۔ کیونکہ اس کی محنت و کارکردگی سے پیداواری وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ اسلام نے اگرچہ اُجرت کی حد بندی نہیں کی اور نہ حد بندی ہو سکتی ہے کیونکہ کام کی نوعیت اور کارکردگی کی رفتار یکساں نہیں ہوتی۔ مگر مالک و مزدور کو حقوق و فرائض کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا ہے کہ مزدور بغیر کام کے اُجرت کا حقدار نہیں ہے اور مالک کے لئے اُجرت میں تاخیر تک روا نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:۔

اعط الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ۔ — مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔"

جہاں بھی مالک و مزدور اور اجیر و مستاجر میں تصادم کی صورت پیدا ہوتی ہے وہ اسلام کے اسی حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ اگر مالک مزدور کے کام کے مطابق اجرت دے اور مزدور اُجرت کے مطابق کام کرے اور دونوں ایک دوسرے کا مفاد پیش نظر رکھیں تو نہ باہمی کشمکش کی صورت پیدا ہو اور نہ ایک طرف سے ہڑتال اور دوسری طرف سے تالا بندی کی نوبت آئے۔

اسلام نے غریب و پسماندہ طبقہ کو جو ذرائع معیشت سے محروم یا کاروکسب کے قابل نہیں ہوتا کسمپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑا بلکہ دولت مندوں کے اموال میں زکوٰۃ کی صورت میں ایک حصہ اس کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ تاکہ کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور جن افراد کو پیمبر سے نسبی اتصال کی بناء پر بلندی و برتری حاصل ہے ان کے لئے زکوٰۃ کے بجائے خمس میں حصہ قرار دیا ہے اس کے علاوہ عام صدقات و خیرات سے بھی محتاجوں کی خبرگیری کی پُرزور ہدایت کی ہے تاکہ معاشرہ میں کوئی بھوکا نہ رہ جائے۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:۔

الخلق کلھم عیال اللہ و احبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ۔ — تمام مخلوق اللہ کے عیال میں داخل ہے اور اللہ کو وہی زیادہ محبوب ہے جو اس کے عیال کے لئے زیادہ نفع رساں ہے۔"

ان مالی واجبات اور انفاق فی سبیل اللہ کے بعد بھی کچھ جمع جتھارہ جائے تو اسلام نے وصیت کی ہدایت کی ہے کہ مرنے سے پیشتر اپنے والدین اقرباء اور امور خیر کے لئے ایک حصہ مخصوص کر جائے یہ حصہ ترکہ کی ایک تہائی تک ہوسکتا ہے اور وارثوں کی رضامندی ہو تو اس سے بھی زائد ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف۔	تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت نظر آئے تو ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھی وصیت کرے۔ بشرطیکہ وہ کچھ مال چھوڑ جائے۔"

اس وصیت کے علاوہ شریعت نے قانون وراثت کا نفاذ کیا تاکہ دولت وارثان بازگشت میں تقسیم ہو جائے اور ایک ہاتھ سے نکل کر متعدد ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل او کثر نصیبا مفروضا۔	مردوں کے لئے حصہ ہے ان چیزوں میں جو ان کے ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے حصہ ہے ان چیزوں میں جو ان کے ماں باپ اور اقرباء چھوڑ جائیں خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ ہر شخص کا حصہ مقرر ہے۔"

یہ ہے اسلام کا وہ نظام معیشت جس میں نہ سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ سرمایہ سمٹ کر ایک جگہ جمع رہ سکتا ہے۔ اس میں نہ مزدور کی حق تلفی کی گنجائش ہے اور نہ غریب کی غربت کو نظر انداز کرنے کا جواز بلکہ معاشی جدوجہد کے ساتھ سماجی ذمہ داریوں کو بھی پوری اہمیت دی گئی ہے یہی وہ حکیمانہ نظام ہے جو دنیوی بہبود کے ساتھ اخروی فلاح کا بھی ضامن ہے جس میں کسب و معاش کے ساتھ اخلاقی اقدار کی پابندی اور تعاون و ہمدردی اور مروت و ایثار کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے معیشتی و معاشرتی خرابیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے اور اسی کے ذریعہ معاشی ناہمواریوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے نظام کے گرد طواف کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب کہ معاشرتی سود و بہبود اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے تمام ضابطے اس کے اندر موجود ہیں۔

اسلامی نظام معیشت کا یہ خاکہ اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ دورِ امیرالمومنین کے معاشی نظام پر نظر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ حضرت نے انہی اصولوں پر معیشت کا نظام قائم کیا جو اسلام کے نظریاتی تقاضوں کے عین مطابق تھا اگرچہ وہ دور اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کے لئے سازگار نہ تھا کیونکہ سابقہ

ملکی فتوحات اور خزانۂ عامرہ کے عطیات کی بدولت مسلمانوں کے اندر سرمایہ داری کا رجحان پیدا ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا جو اسلام کی سادگی و سادہ معاشرت کو خیر باد کہہ کر محلاتی زندگی کا خوگر ہو چکا تھا۔ اور انسان جس زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اس میں تبدیلی آسانی سے گوارا نہیں کرتا۔ مگر حضرت نے اس طبقہ کو خاطر میں لائے بغیر معاشی انقلاب پیدا کرنے اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بساط لپیٹ دینے کا تہیہ کر لیا تاکہ معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے پاک و صاف کر دیں جو سرمایہ داری کے نتیجہ میں گھر گھر پھیل چکی تھیں۔ چنانچہ زمام حکومت ہاتھوں میں لیتے ہی سابقہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں کو واپس لے لینے کا حکم دیا اور فرمایا:۔ "خدا کی قسم اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہوتا تو اسے بھی واپس پلٹا لیتا۔" چنانچہ حضرت عثمان کے ہاں سے تلواریں زرہیں اور صدقہ کے اونٹ اپنی تحویل میں لے لئے اور اعلان عام کیا کہ جس جس کے پاس حضرت عثمان کا دیا ہوا مال ہو وہ بیت المال میں جمع کر دے۔ اس اعلان سے امویوں اور سرمایہ داروں میں کھلبلی مچ گئی۔ اور ولید ابن عقبہ نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم آپ کی بیعت کئے لیتے ہیں بشرطیکہ وہ مال جو حضرت عثمان کی داد و دہش کے نتیجہ میں ہمیں ملا ہے وہ ہم سے چھینا نہ جائے۔ حضرت نے فرمایا:۔

اما وضعی عنکم ما اصبتم فلیس لی ان اضع حق اللہ عنکم ولا عن غیرکم۔

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲ صفحہ ۱۱۱)

"میں اس مال کو چھوڑ دوں جو تم لوگوں نے ہتھیا لیا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں اللہ کے اس حق سے دستبردار ہو جاؤں جو تمہارے اور تمہارے علاوہ دوسروں کے ذمہ ہے۔"

امیرالمومنین نظام معیشت کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ حاکم و رعایا ایک سطح پر ہوں چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "خدا نے آئمہ حق پر یہ فرض عاید کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائیں۔" آپ نے اپنا پورا دور اقتدار اسی نہج پر گزارا اور رہنے سہنے اور کھانے پہننے کا معیار وہی رکھا جو ایک غریب و نادار کا ہو سکتا ہے۔ نہ اس سے بہتر کھانا پسند کیا اور نہ اس سے اچھا لباس پہننا گوارا کیا۔ حضرت خود فرماتے ہیں:۔ "کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہا کروں۔ درآنحالیکہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں یا میں ویسا ہو جاؤں جیسا کسی شاعر نے کہا ہے:۔

وحسبك داءً ان تبیت ببطنہ وحولك اکباد تحن الی القد

تمہاری یہ بیماری کیا کم ہے کہ تم پیٹ بھر کر لمبی تان لو اور تمہارے گرد کچھ ایسے جگر ہوں

جو سوکھے چمڑے کو ترس رہے ہوں۔"

امیرالمومنین نظام معیشت کو عدل کی بنیادوں پر استوار کر کے طبقاتی تفریق کی راہ روکنا چاہتے تھے تاکہ معاشی اعتبار سے توازن و اعتدال کارفرما ہو اور معاشرہ عزت و امارت کے لحاظ سے دو طبقوں میں اس طرح نہ بٹ جائے کہ ایک طرف فلک بوس عمارتیں ہوں اور دوسری طرف شکستہ جھونپڑے۔ ایک طرف فاخرہ ملبوسات ہوں اور دوسری طرف پھٹے پرانے چیتھڑے۔ ایک طرف امراء کے کتے بھی ضرورت سے زیادہ شکم سیر ہوں اور دوسری طرف فاقوں سے دم توڑتے ہوئے انسان۔ ایک طرف ملکی سرمایہ بے دریغ لٹ رہا ہو اور دوسری طرف پیغمبر کا ایک عظیم صحابی صحرائے ربذہ میں دوا و غذا کے بغیر بے کسی کی موت مر رہا ہو۔ یہ نتیجہ ہوا کرتا ہے دولت کی جمع آوری اور غریبوں کی حق تلفی کا جیسا کہ حضرت نے فرمایا ہے:۔

ان اللہ فرض فی اموال	خداوند عالم نے دولت مندوں کے مال میں فقیروں
الاغنیاء اقوات الفقراء	کی روزی کا حصہ رکھا ہے۔ اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا
فما جاع فقیر الا بما متع بہ	ہے تو اس لئے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ
غنی واللہ تعالیٰ سائلہم عن	لیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے اس کا مواخذہ کرنے
ذٰلک۔ (نہج البلاغہ)	والا ہے۔"

حضرت اس ناہموار معیشت کے بجائے نظام معیشت اس نہج پر قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہر فرد کی ضروریات پوری ہوں اور کوئی شخص خواہ کسی گوشہ میں پڑا ہو لوازم حیات سے محروم نہ رہے۔ پیداواری وسائل اور معیشت کے جملہ شعبوں میں سب کے حقوق مساوی ہوں اور سب کو سعی و کاوش اور کار و کسب کے یکساں مواقع مہیا ہوں۔ یہی اسلامی نظریۂ مساوات ہے جو نفاذ پذیر ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور تقاضائے عدل کے مطابق بھی ہے اور مساوات بایں معنی کہ دولت سب کو برابر برابر ملے اور افراد میں معاشی اعتبار سے اونچ نیچ نہ ہو تو اس خارجی مساوات کا اسلامی نظریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ اسلام کے مالی فرائض زکوٰۃ، خمس، حج وغیرہ سے ظاہر ہے اور نہ اس قسم کی مساوات سے اجتماعی زندگی کو کسی مضبوط بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔

لا یزال الناس بخیر ما تفاوتوا فان	انسانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ان میں تفاوت
استووا ھلکوا۔ (امالی صدوق)	رہے اور اگر سب برابر ہو جائیں تو ہلاک ہو جائیں۔"

ظاہر ہے کہ جب تمام انسان معاشی اعتبار سے ایک سطح پر ہوں گے تو ایک کو دوسرے کی احتیاج و ضرورت نہ ہوگی جس کے نتیجہ میں روابط کمزور اور معاشرتی تعلقات مضمحل ہو جائیں گے اور آخر مدنیت

و اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا جو سراسر ہلاکت و تباہی ہے۔

عہد امیرالمومنین کے معاشی نظام پر نظر کی جائے تو یہ چیز بالکل روشن اور واضح ہو جاتی ہے کہ کاروباری آزادی کے ساتھ پیداواری وسائل عوام کی ملکیت تھے اور ہر شخص معیشت کے مختلف ذرائع زراعت تجارت دستکاری وغیرہ کے اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ اور ایک بہترین نظام معیشت کی بنیادی قدر یہی ہے کہ ایک طرف مکمل معاشی آزادی ہو اور دوسری طرف مکمل معاشی تحفظ ہو تاکہ ہر شخص اپنی محنت دکارکردگی کے نتیجہ سے مطمئن ہو کر جد و جہد میں لگا رہے۔ حضرت یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی شخص کار و کسب اور معاشی تگ و دو چھوڑ چھاڑ کر معاشرہ پر بار بن جائے اور اپنی کمائی کے بجائے دوسروں کی کمائی سے اپنا پیٹ پالے۔ البتہ جو شخص اپنی ضروریات کے فراہم کرنے سے عاجز ہوتا یا ضروریات سے اس کی آمدنی کم ہوتی تو بیت المال سے اس کی اعانت کی جاتی۔

حضرت زراعت اور تجارت کو معاشی فارغ البالی کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:-

من وجد ماءً وترابا ثم افتقر ابعده الله۔

"جسے زمین اور آبیاری کے لئے پانی میسر ہو اور وہ پھر نادار رہے تو اللہ اُسے دور ہی رکھے۔"

تجارت کے بارے میں فرماتے ہیں:-

تعرضوا للتجارۃ فان فیھا غنی لکم عما فی ایدی الناس۔

"تجارت کرو اس لئے کہ تجارت ہی وہ سرمایہ ہے جو تمہیں لوگوں کے مال و دولت سے مستغنی کر دے گا۔"

حضرت زراعت تجارت کی حوصلہ افزائی کے لئے خود بھی کھیتی باڑی اور کاروبار میں عملاً حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ افتادہ و بے آباد زمینوں کو آباد کرتے اور چشمے کھود کر باغوں اور نخلستانوں کی آبیاری کرتے۔ اسی طرح تجارت کی طرف رغبت دلانے کے لئے ایک مرتبہ اپنا تہبند فروخت کے لئے پیش کرتے ہوئے فرمایا:-

اشتریته بخمسة دراهم فمن اربحنی فیه درهما بعته۔

"میں نے یہ تہبند پانچ درہم میں خریدا تھا اگر کوئی ایک درہم زیادہ دے تو اس کے ہاتھ بیچ دوں گا۔"

فرصت کے اوقات میں اپنے شاگرد میثم تمار کی دکان پر بیٹھ جاتے اگر میثم اِدھر اُدھر ہوتے تو گاہکوں کے ہاتھ کھجوریں بیچتے اور اس میں ذرا سبکی محسوس نہ کرتے۔

حضرت تجار اور کاروباری طبقہ پر نظر رکھتے تھے تاکہ بلاوجہ قیمتوں میں اضافہ نہ کریں۔ چنانچہ بازاروں میں گھوم پھر کر چیزوں کے نرخ دریافت کرتے ناپ تول کا جائزہ لیتے۔ ابو الصہبا کہتے ہیں:-

رایت علیا بشط الکلا یسئل

"میں نے شط کلا (بصرہ) میں دیکھا کہ حضرت نرخ

عن الاسعاد۔ ...... پوچھتے پھرتے ہیں"۔

ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قلت اور گرانی پیدا کرنا ایک معاشرتی جرم ہے۔ حضرت نے اس کی روک تھام کے لئے عام اعلان کر دیا تھا کہ کوئی شخص گراں فروشی کے ارادہ سے ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ نہ کرے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا:۔"ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے۔ لہذا جو بھی ذخیرہ اندوزی کا مرتکب ہو اسے مناسب حد تک سزا دینا"۔

معاشی نظام میں توازن اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اسراف یعنی ضرورت سے زائد خرچ اور تبذیر یعنی بلاضرورت خرید سے پرہیز کر رہا جائے حضرت ان دونوں چیزوں کو معاشی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے چنانچہ بلاضرورت خرچ کے بارے میں فرمایا:۔

فدع الاسراف مقتصدا و	میانہ روی اختیار کرتے ہوئے فضول خرچی سے باز
اذکر فی الیوم غدا۔	آؤ آج کے دن کل کو بھول نہ جاؤ"۔

اور غیر ضروری چیزوں کو سمیٹنے کے بارے میں فرمایا:۔

اذا استغنیت عن شیئ فدعه	جس چیز کی ضرورت نہ ہو اُسے چھوڑ دو اور اسی
وخذ ما انت محتاج الیه۔	چیز کو حاصل کرو جس کی ضرورت ہو"۔

جب انسان میانہ روی کو چھوڑ کر ضرورت سے زائد خرچ کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ محتاج و دستِ نگر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ شادی بیاہ اور مختلف تقریبات پر زمین و جائیداد بیچ کر یا سودی قرضے لے کر اندھادھند خرچ کرتا ہے اور کنبہ و برادری اور محلہ و شہر میں دریا دلی کی شہرت بھی حاصل کر لیتا ہے مگر آخر کار یا ذریعہ معاش سے محروم ہو جاتا ہے یا سود در سود کے چکر میں پڑ کر اطمینان و سکون کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح بلاضرورت خرید بھی معیشت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایک چیز بلاضرورت خریدنے والے کے کام تو آتی نہیں اب کسی اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مقدور نہ ہو تو یا اس بے ضرورت چیز کو اونے پونے بیچے اور نقصان اٹھائے یا اپنی ضرورت کی چیز سے دستبردار ہو جائے اور اگر اس بلاضرورت خرید کا رجحان بڑھ جائے تو اس سے معاشرہ بھی یقیناً متاثر ہو گا اس طرح کہ جس کے پاس وہ چیز ہے وہ اس کے کام کی نہیں ہے اور جسے اس کی ضرورت ہے وہ طلب کے بڑھ جانے سے یا تو اسے مہنگے داموں خریدے یا اس سے محروم رہے اس لئے کہ بلاضرورت خرید سے طلب، رسد سے بڑھ جاتی ہے اور چیزوں کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں اور قیمتوں کے چڑھاؤ سے افراطِ زر کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

بیت المال کی تقسیم

پیغمبر اکرم زکوٰۃ و صدقات اور اموالِ غنائم کو جمع رکھنے کے بجائے اموال غنائم کو مجاہدین میں اور دوسرے اموال جس شہر اور علاقے سے وصول ہوتے وہیں کے مسلمانوں میں فوراً تقسیم کر دیتے اس لئے نہ بیت المال تشکیل دیا گیا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ آنحضرتؐ کے بعد جب فتوحات کے نتیجہ میں روم و ایران کے خزانے مدینہ میں سمٹ آئے تو بیت المال کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے نظم و انصرام کے لئے محکمۂ مالیات قائم کیا گیا اس محکمہ کے زیر نگرانی سرمایہ سمیٹ کر رکھا جاتا جس سے رفاہی امور انجام دیئے جاتے اور سالانہ وظائف کی تقسیم ہوتی۔ آنحضرتؐ کے دور میں تقسیم کی بنیاد عدل و مساوات پر تھی اور سب سے یکساں برتاؤ ہوتا تھا مگر آپ کے بعد تقسیم بالسویّہ کی پابندی ختم کر دی گئی چنانچہ حضرت عمر کے دور میں بیت المال میں سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ وظیفہ ملتا تھا۔ ازواجِ پیغمبر کو دوسری خواتین پر ترجیح دی جاتی تھی اور حضرت عائشہ کو دوسری ازواج سے دو ہزار زائد دیا جاتا تھا۔ بدریین کے وظائف ان لوگوں سے زیادہ تھے جو بدر میں شریک نہ ہوئے تھے اور مہاجرین کو انصار پر فوقیت حاصل تھی۔ حضرت عثمان کے دور میں یہ درجہ بندی بھی باقی نہ رہی اور انہوں نے کتاب و سنت اور سیرت شیخین کی پابندی کا عہد کرنے کے باوجود نہ تقسیم بالسویہ ضروری سمجھی اور نہ تقسیم بالمدارج بلکہ مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ اموی عزیزوں دوستوں اور ہوا خواہوں کی تن پروری کے لئے مخصوص کر دیا اور جسے چاہا اور جس قدر چاہا بطور عطیہ بخش دیا۔

امیرالمومنین نے جب بیت المال کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لیا تو عملِ پیغمبر کے مطابق جس شہر میں جو مال جمع ہوتا اسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اگر وہاں سے کچھ بچ کر آتا تو بیت المال میں سمیٹ کر رکھنے کے بجائے ہر جمعہ کو مستحقین میں تقسیم کر کے بیت المال خالی کر دیتے۔ جب بیت المال خالی ہو جاتا تو اپنے ہاتھ سے اس میں جھاڑو دیتے دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں جس طرح خالی ہاتھ اندر داخل ہوا تھا اسی طرح خالی ہاتھ باہر جا رہا ہوں۔ ابن عبد البر نے تحریر کیا ہے:۔

وکان لا یدع فی بیت المال
مالا یبیت فیہ حتی یقسمہ
الا ان یغلبہ شغل فیصبح
الیہ۔ (استیعاب۔ ج ۲ صفحہ ۵)

حضرت نے یہ نوبت نہیں آنے دی کہ رات گزاریں اور مال بیت المال میں پڑا رہے بلکہ رات سے پہلے اسے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی مانع ہوتا تو صبح ہونے دیتے۔

ایک دفعہ اس وقت مال آیا جب رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا۔ فرمایا کہ اس مال کو ابھی تقسیم کر دیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو رات ہو چکی ہے اسے کل پر اٹھا رکھیے۔ فرمایا کیا تمہیں یقین ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا۔ کہا کہ موت کا علم اللہ کے سوا کس کو ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ پھر دیر نہ کرو اور اسے ابھی تقسیم کر دو۔ چنانچہ چراغ روشن کئے گئے اور سارا مال راتوں رات تقسیم کر دیا گیا۔

سابقہ حکومتوں میں بیت المال کی غیر مساویہ تقسیم نے معاشی نظام کو غیر متوازن بنا دیا تھا حضرت نے اس میں تبدیلی ضروری سمجھی اور غیر مساویانہ تقسیم کے بجائے اسلامی نظریۂ مساوات کو پھر سے زندہ کیا اور چھوٹے بڑے کا امتیاز ختم کر کے سب کا حصہ یکساں قرار دیا اگرچہ یہ طرزِ عمل امتیاز پسند ذہنیتوں پر شاق گزرا اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی مگر حضرت کسی کو خاطر میں نہ لائے اور اپنے اصول سے جو عین اسلامی اصول تھا ہٹنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ عبداللہ ابن ابی رافع بیان کرتے ہیں کہ جب طلحہ اور زبیر نے یہ دیکھا کہ تقسیم مال میں ان کا امتیاز خطرہ میں ہے تو وہ حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ یا امیرالمومنین حضرت عمر ہمیں بیت المال سے اتنا اور اتنا دیا کرتے تھے آپ بھی اس کا لحاظ رکھیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے چھوڑو کہ فلاں تمہیں اتنا دیا کرتا تھا یہ بتاؤ کہ رسول اللہ تمہیں کیا دیا کرتے تھے یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو گئے۔ حضرت نے انہیں خاموش دیکھا تو فرمایا کیا رسول اللہ تقسیم بالسویہ کے اصول پر کاربند نہ تھے۔ کہا کہ ہاں وہ سب میں برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ پھر سنتِ رسول زیادہ قابل عمل ہے یا سنتِ عمر؟ کہا کہ قابل عمل تو سنتِ رسول ہے مگر ہمیں اسلام میں سبقت کا شرف حاصل ہے ہم نے اسلامی غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہمیں رسول اللہ سے قرابت بھی ہے۔ فرمایا کہ اسلام میں تمہیں سبقت حاصل ہے یا مجھے کہا کہ آپ کو۔ فرمایا تم نے جہاد میں زیادہ حصہ لیا ہے یا میں نے کہا آپ نے۔ فرمایا تمہیں رسول اللہ سے زیادہ قرابت ہے یا مجھے کہا آپ کو۔ پھر حضرت نے ایک مزدور کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس مال میں میرا اور اس مزدور کا حصہ برابر ہے۔ جب میں اپنے لئے امتیاز گوارا نہیں کرتا تو تمہارے لئے کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔

حضرت بیت المال میں اعلیٰ ادنیٰ قرشی و غیر قرشی آزاد اور غلام سب کا حق مساوی سمجھتے تھے اور رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کی بنا پر امتیاز گوارا نہ کرتے تھے اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں سب امتیازات ختم کر دوں گا۔ عقیل نے یہ سنا تو حضرت سے کہا کہ آپ مجھے اور مدینہ کے ایک حبشی غلام کو ایک سطح پر رکھیں گے۔ حضرت نے فرمایا:۔

اجلس رحمک اللہ وما فضلک ‏ ‏ ‏ بیٹھئے خدا تم پر رحم کرے اگر تم کو اس پر فضیلت

علیه الا بسابقة او تقوی۔ ہو سکتی ہے تو تقویٰ اور سبقت کی بنا پر۔"

ایک مرتبہ حضرت کے پاس دو عورتیں آئیں حضرت نے ان دونوں کو برابر برابر دیا اس پر ایک نے کہا کہ میں عربیہ ہوں اور آزاد اور یہ غیر عربیہ ہے اور کنیز۔ اور آپ نے ہم دونوں کو ایک درجہ پر سمجھ لیا ہے حالانکہ میں مرتبہ کے لحاظ سے بلند تر ہوں۔ حضرت نے زمین پر سے مٹی اٹھائی اور اس پر نظر کرنے کے بعد فرمایا:۔

ما اعلم ان الله فضل احدا من الناس علی احد الا بالطاعة والتقوی۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہو مگر اُسے جو طاعت و تقوے میں بڑھا ہوا ہو۔"

ایک دفعہ سہل ابن حنیف اپنے حبشی غلام کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یہ بیت المال سے اپنا حصہ لینے کے لئے آیا ہے آپ اسے کیا دیں گے فرمایا کہ تمہیں کیا ملا ہے کہا کہ سب کو تین تین دینار ملے ہیں اور مجھے بھی تین دینار ملے ہیں۔ فرمایا کہ پھر اسے بھی تین دینار دیئے جائیں گے۔

ایک مرتبہ آپ کی ہمشیرہ ام ہانی بنت ابی طالب آپ کے ہاں آئیں آپ نے بیت المال میں سے بیس درہم انہیں دیئے انہوں نے واپس پلٹ کر اپنی ایک عجمیہ کنیز سے دریافت کیا کہ تمہیں امیرالمومنین نے کیا دیا ہے اس نے کہا کہ بیس درہم یہ سن کر جناب ام ہانی حضرت کے پاس آئیں اور کہا کہ آپ نے جو کنیز کو دیا ہے وہی مجھے دیا ہے حالانکہ میرا حق فائق ہے۔ حضرت نے فرمایا:۔

انی والله لا اجد لبنی اسمٰعیل فی هذا الفئ فضلا علی بنی اسحٰق۔ خدا کی قسم اس مال میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسحٰق پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔"

امیرالمومنین کی بلند نفسی اس کی قطعاً روادار نہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرابت و عزیزداری کی بنا پر اپنے نظریہ تقسیم اموال میں تبدیلی پیدا کریں اور جانبداری سے کام لے کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے امتیازی برتاؤ روا رکھیں خواہ بہن ہو یا بھائی بیٹا ہو یا بیٹی۔ چنانچہ آپ سے عقیل نے فقر و افلاس کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بیت المال میں سے کچھ دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ چند دن صبر کرو جب دوسروں کو ملے گا تو تمہیں بھی مل جائے گا۔ جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے ایک شخص سے کہا کہ تم انہیں بازار میں لے جاؤ اور کسی دکان کے سامنے کھڑا کر دو اور عقیل سے کہا کہ تم اس دکان کا تالا توڑو اور جو کچھ اس کے اندر ہو سمیٹ کر گھر لے جاؤ۔ عقیل نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں چوری کروں اور چور کہلواؤں۔ فرمایا تو پھر تم مجھے چور بنانا چاہتے ہو کہ میں مسلمانوں کے مال میں سے

چوری کر کے تمہیں دوں۔

ایک دفعہ عقیل کے بچوں نے حضرت کو کھانے پر بلایا۔ جب کھانا سامنے رکھا گیا تو پوچھا کہ یہ کھانے کا سامان کہاں سے مہیا کیا ہے کہا کہ ہم چند دن اپنے حصہ کے جو بچاتے رہے ہیں اس سے یہ سامان خریدا گیا ہے۔ فرمایا بچنے کا سوال اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب تمہاری ضرورت سے زائد تھے لہذا تم جتنا روز بچاتے تھے آئندہ اتنا کم دیا جائے گا کیونکہ اس سے زیادہ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس پر عقیل بگڑ گئے حضرت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو تپایا اور ان کے جسم کے قریب لے گئے۔ عقیل ڈر کر پیچھے ہٹے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوہے کے ایک گرم ٹکڑے کو دیکھ کر چیخ اٹھے ہو اور مجھے اس آگ میں جھونکنا چاہتے ہو جسے خدا نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن جعفر نے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے بیت المال میں سے کچھ دیجئے میری حالت یہ ہے کہ میں اپنی سواری بیچے بغیر روزمرہ کا خرچ بھی نہیں چلا سکتا۔ حضرت نے فرمایا:

لا واللہ ما اجد لک شیئا الا	خدا کی قسم میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ
ان تامر عمک ان یسرق	نہیں ہے مگر یہ کہ تم اپنے چچا سے یہ کہو کہ وہ چوری
فیعطیک۔	کرے اور تمہیں دے۔"

حضرت کوئی عزیز ہو یا غیر کسی کا ادنیٰ تصرف بھی بیت المال میں گوارا نہ کرتے تھے حالانکہ اگر آپ درگزر سے کام لیتے تو کوئی آپ پر حرف گیری نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو ابن سلمہ جو حضرت کی طرف سے اصفہان کے عامل تھے گھی اور شہد کی مشکیں لے کر آئے۔ جناب ام کلثوم نے ضرورت کی بنا پر عمرو ابن سلمہ سے تھوڑا سا گھی اور شہد طلب کیا انہوں نے ایک پیالے میں گھی اور ایک پیالے میں شہد بھجوا دیا۔ دوسرے دن جب یہ مشکیں حضرت کے سامنے لائی گئیں تو آپ نے دو مشکوں کو ان کی اصلی حالت پر نہ پا کر عمرو سے وجہ دریافت کی۔ عمرو نے کہا کہ جناب ام کلثوم نے تھوڑا سا شہد اور گھی طلب کیا تھا میں نے ان مشکوں کو کھلوا کر گھی اور شہد بھیج دیا تھا۔ امیرالمومنین نے دونوں مشکیں تخمینہ لگانے والوں کے پاس بھیج دیں اور ان سے پوچھا کہ ان مشکوں میں سے کتنا گھی اور شہد کم ہوا ہے اور ان دونوں چیزوں کی قیمت کیا ہوگی۔ انہوں نے اندازہ کرنے کے بعد بتایا کہ جتنا گھی اور شہد ان میں سے نکالا گیا ہے اس کی قیمت پانچ درہم سے زیادہ نہ ہوگی آپ نے جناب ام کلثوم کو پیغام بھجوایا کہ وہ پانچ درہم بھیج دیں۔ اور اس کے بعد تمام مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک دفعہ بصرہ کے خراج میں موتیوں کا ایک قیمتی ہار آیا آپ کی صاحبزادی جناب ام کلثوم نے

خازن بیت المال ابورافع سے کہا کہ وہ ہار تین دن کے لئے عاریۃً بھجوادیں۔ ابورافع نے وہ ہار بھجوادیا۔ امیر المومنین نے وہ ہار دیکھا تو پوچھا کہ یہ ہار یہاں کیسے آیا ہے؟ ام کلثوم نے کہا کہ میں نے اسے عاریۃً منگوایا تھا۔ فرمایا کہ اگر عاریۃً نہ لیا ہوتا تو میں اس پر سزا دیتا۔ ام کلثوم نے کہا کہ بابا یہ ہار مجھے دے دیجئے۔ فرمایا جب تک میں ہر مسلمان خاتون کے گلے میں ایسا ہار نہ دیکھ لوں اس وقت تک تمہیں نہیں دیا جا سکتا۔ اور اتنے ہار آئیں کہاں سے۔ پھر حکم دیا کہ اسے فوراً بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔

امیر المومنین احساس ذمہ داری کی بنا پر حقیر و بے قیمت چیز کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی مالی اعتبار سے قیمتی چیز کو دی جاسکتی ہے۔ اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اسے بانٹ نہ دیتے۔ چنانچہ بیت المال میں ایک رسی دیکھ لی جو تقسیم کے بعد پڑی رہ گئی تھی فرمایا کہ اسے بھی لے جاؤ اور تقسیم کردو۔ اصفہان سے مال آیا تو اس میں سے ایک روٹی بھی نکل آئی۔ آپ نے قبیلہ وارانہ تقسیم کے لئے جہاں مال کے سات حصے کئے اس روٹی کے بھی سات ٹکڑے کئے اور ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ کر اور ساتوں قبیلوں کے شیوخ کو بلا کر ایک ایک حصہ ان کے حوالے کیا۔ ایک مرتبہ پارچوں کی تقسیم ہوئی۔ امام حسن نے ان پارچوں میں ایک ٹوپی دیکھ کر کہا کہ بابا یہ مجھے دے دیجئے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ جب پارچے تقسیم ہوئے تو وہ ٹوپی ایک ہمدانی کے حصہ میں آئی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ امام حسن نے اس ٹوپی کو پسند کیا تھا مگر امیر المومنین نے انہیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ہمدانی نے وہ ٹوپی امام حسن کی خدمت میں بھیج دی۔

ان چند واقعات پر عمل کرنے کے بعد بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت نے تقسیم اموال میں وہی طرز عمل اختیار کیا جو پیغمبر اکرم کا طرز عمل تھا۔ نہ بیت المال میں مال جمع کر کے رکھا اور نہ تقسیم میں رنگ و نسل کا امتیاز کیا بلکہ عدل و مساوات کے جو پیمانے وضع کئے اور حق و انصاف کے جو معیاری نمونے پیش کئے دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کیا اس کی مثال کہیں نظر آتی ہے کہ حقیقی بھائی اپنے بچوں کی پرورش کے لئے بیت المال سے چند سیر جو کا مطالبہ کرے، بہن اپنے وظیفہ میں چند درہموں کا اضافہ چاہے۔ ابن عم اور داماد روزمرہ کی ضروریات کے سلسلہ میں مدد چاہے بیٹی گھی اور شہد کا ایک پیالہ لے لے یا ایک ہار عاریۃً منگوالے اور بیٹا ایک معمولی سی ٹوپی کی خواہش کرے مگر اصول پرستی و حق پسندی کے مقابلہ میں محبت و قرابت کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور بیت المال سے عزیزوں کے ساتھ اتنی سی مراعات بھی گوارا نہ کی جائے حالانکہ حق ولایت [illegible] حضرت مسلمانوں سے اجازت لے کر یہ چند چیزیں اپنے عزیزوں کو دے سکتے تھے مگر آپ کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ مسلمانوں پر

یہ ادنیٰ سا بوجھ بھی ڈالیں یا ان کے زیر بار احسان ہوں جب کہ حضرت اپنے ذاتی مصارف کے لئے غلہ تک مدینہ سے منگواتے تھے اور اپنے حق کے باوجود بیت المال پر اپنا بوجھ ڈالنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہارون ابن عنترہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خورنق میں حضرت کو ایک پرانا کمبل اوڑھے دیکھا جو سردی سے بچاؤ کے لئے کافی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس بیت المال میں آپ کا حصہ بھی تو ہے اس میں سے کوئی نیا کمبل لے لیجئے فرمایا:۔

واللہ ما ارزأکم شیئا وماھی	خدا کی قسم میں نے تمہارے مال میں سے کوئی چیز
الاقطیفتی التی اخرجتھا من	لینا گوارا نہیں کی اور یہ چادر جو اوڑھے ہوئے ہوں
المدینۃ۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲)	مدینہ سے لے کر آیا تھا۔"

نظامِ زکوٰۃ

زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے۔ جو گیہوں، جو، خرما، کشمش، سونا، چاندی، گائے، بھینسوں، بھیڑ، بکریوں اور اونٹوں میں ہر صاحب نصاب پر مقررہ مقدار میں واجب ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں اور شرعی معنی میں بھی پاکیزگی کا اعتبار کیا گیا ہے اور زکوٰۃ سے تطہیر مال ہی مراد ہے کیونکہ جب تک زکوٰۃ ادا نہ کی جائے مال طاہر نہیں ہوتا اور ادائے زکوٰۃ کے بعد مال بھی طاہر اور انسانی ذہن بھی بخل طمع، حبِّ مال اور ان سے پیدا ہونے والی کثافتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

خذ من اموالھم صدقۃً	ان کے مال سے زکوٰۃ لو اور اس کے ذریعہ انہیں
تطھرھم وتزکیھم	پاک و صاف کردو۔"

زکوٰۃ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ضرورت مند افراد کی اعانت و دستگیری ہوتی رہے اور معاشرہ میں کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے سات مصارف کا تعلق افراد سے ہے اور ایک مصرف کا تعلق اجتماعی و رفاہی امور سے ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

انما الصدقات للفقراء و	صدقہ زکوٰۃ بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں
المساکین والعاملین علیھا	کا اور اس کے کارندوں اور اُن لوگوں کا جن کی
والمولفۃ قلوبھم وفی	تالیف قلب مقصود ہے اور غلاموں کی رہائی کے
الرقاب والغارمین وفی	لئے اور قرضداروں کے ادائے قرض کے لئے اور

سبیل اللہ وابن السبیل۔ "خدا کی راہ میں امور خیر کے لئے اور مسافروں کے لئے۔"

زکوٰۃ سے بڑی حد تک معاشی ناہمواریوں کو متوازن سطح پر لایا جا سکتا ہے کیونکہ ہر سال دولت کا ایک حصہ دولتمندوں کے ہاتھوں سے نکل کر غریبوں اور محتاجوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اگرچہ اس سے امیر و غریب کا تفاوت ختم نہیں ہوتا مگر ایک حد تک اس میں کمی ضرور ہو جاتی ہے اور اس فریضۂ مالی کا مقصد بھی یہی ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے بجائے افراد میں بٹتی رہے اور سرمایہ داری کی طرف جھکاؤ پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صدقات و خیرات کی غرض و غایت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

كي لا تكون دولة بين الاغنيا منكم۔ "تاکہ دولت ہر پھر کے تمہارے دولت مندوں ہی کے ہاتھوں میں نہ رہے۔"

بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اتنی کم ہے کہ اس سے نہ معاشی تفریق ختم کی جا سکتی ہے اور نہ امیر و غریب کے درمیانی فاصلے کم ہوتے ہیں بلکہ محتاجوں اور ناداروں کی تعداد جوں کی توں رہتی ہے نہ ان کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ ان کی احتیاج میں کمی ہوتی ہے۔ اس کا جواب تو وہی ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے دیا ہے کہ "اللہ نے دولتمندوں کے مال میں فقیروں کا اتنا ہی حق مقرر کیا ہے جو ان کی ضروریات کی کفایت کرتا ہے۔ اور اگر اللہ یہ جانتا کہ اس سے محتاجوں کی احتیاج برطرف نہیں ہو سکتی تو وہ اس کی مقدار زیادہ کر دیتا" بلکہ وہ چاہتا تو مالک کے مال میں فقیر کا حصہ مالک کے برابر یا اس سے بھی زائد قرار دے سکتا تھا مگر حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ تھا کہ صاحب مال کا حصہ وافر رکھا جائے کیونکہ یہ مال اس کی محنت و ریاضت اور کد و کاوش کا ثمرہ ہے اور غریب و نادار کا اس میں حق ہے تو مالک بھی ضرورت و احتیاج کے لحاظ سے فقیر کا شریک ہے تو جہاں اللہ نے فقیر کا اس کی غربت و احتیاج کی بناء پر حق رکھا ہے وہاں مالک کی ضرورت کے علاوہ اس کی محنت صرفہ اور حق ملکیت کی رعایت بھی ضروری تھی چنانچہ اس حکیم مطلق نے اسی حق کی بناء پر جہاں مالک کی محنت اور صرفہ کم ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی مقدار زیادہ رکھی ہے اور جہاں محنت اور صرفہ زیادہ ہوتا ہے وہاں فقیر کا حصہ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان جس چیز کے حصول میں زیادہ محنت و مشقت کرتا ہے اتنا ہی اس کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ چنانچہ گیہوں کی فصل اگر بارانی ہو تو مالک چونکہ آبپاشی کی محنت اور اس کے مصارف سے بچ جاتا ہے اس لئے فقیر کا حصہ ۱/۱۰ قرار دیا ہے اور اگر فصل آبپاشی کے ذریعہ ہو تو چونکہ مالک آبپاشی کے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے اس لئے فقیر کا حصہ ۱/۲۰ قرار دیا گیا ہے۔ یونہی ان چوپاؤں میں جن کی پرورش کا بار مالک پر ہوتا ہے فقیر

کا حق قرار نہیں دیا گیا اور جو صحراؤں اور چراگاہوں میں چر کر خود ہی اپنا پیٹ پال لیتے ہیں ان میں فقراد کا حق قرار دیا گیا ہے۔ غرض اللہ نے مالک کے صرفہ و محنت اور فقیر کی احتیاج میں ایک نسبت قائم کر کے زکوٰۃ کی مقدار مقرر کی ہے کہ ایک طرف فقیر کو بقدر کفایت ملتا رہے۔ اور دوسری طرف مالک پر اتنا ہی بار پڑے جسے وہ خوشی خوشی گوارا کر لے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مقدار کی کمی احتیاج کے باقی رہنے کا سبب نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ دولت مندوں کا ایک طبقہ سرے سے اس فریضہ کو اہمیت ہی نہیں دیتا اور جو طبقہ اس فریضہ کو فریضہ سمجھتا ہے وہ تھوڑی بہت زکوٰۃ دے کر ایک وافر حصہ حیلے بہانوں سے بچائے جانے کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ اگر دیانت و احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی ادائیگی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ طبقاتی تفریق کو کم کر کے معاشی حالات پر قابو نہ پایا جا سکے اور پھر فقراد کی اعانت زکوٰۃ ہی پر کب منحصر ہے کہ مقدار کی کمی بیشی کا سوال اٹھایا جائے۔ یہ مقدار تو زکوٰۃ واجبی کی ہے ورنہ زکوٰۃ مستحبی کے لئے نہ نصاب کی شرط ہے اور نہ مقدار کی حد بندی بلکہ جیسے حالات ہوں ان کے مطابق صدقات و خیرات سے عزیزوں ہمسایوں اور ناداروں کی خبر گیری کرنا انسانی فرائض میں داخل ہے۔

زکوٰۃ ایک فریضہ شرعی ہے لہٰذا اس میں نیت تقرب اور ادائے فرض کا تقاضا کارفرما ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کوئی احسان ہے جو فقیر و نادار پر کیا جا رہا ہے بلکہ ایک اجتماعی حق ہے جس کا حقداروں تک پہنچانا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :-

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ — ان کے اموال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کا حق ہے "

پیغمبر اکرم کے زمانہ میں زکوٰۃ کا نظام اجتماعی تھا جو کارندوں کے ذریعہ جمع کی جاتی اور پھر مصارف معیّنہ پر اسے صرف کیا جاتا ہے۔ امیرالمومنین جو پیغمبر کے بعد ولی امر اور نگران حقوق تھے انہوں نے اپنے دور میں اپنی زیر نگرانی زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا محکمہ قائم کیا اور ان تمام امور کی پابندی کی جنہیں پیغمبر اکرم ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ زکوٰۃ کی جمع آوری پر ان لوگوں کا تقرر کرتے جن کی امانت و دیانت اور راست روی پر وثوق ہوتا انہیں تقوی و پرہیزگاری کی تلقین کرتے اور تاکید فرماتے کہ وہ وصولی کے سلسلہ میں سختی و تشدد سے کام نہ لیں اگر کوئی خود سے کہے یا پوچھنے پر بتائے کہ اس کے ذمہ زکوٰۃ ہے تو اس سے زکوٰۃ لی جائے اور اگر کوئی یہ کہے کہ میرے ذمہ زکوٰۃ نہیں ہے تو اس سے دُہرا کر نہ پوچھا جائے کیونکہ یہ بے اعتمادی کا مظاہرہ ہوگا جو اسے ناگوار گزرے گا۔ اور چراگاہوں میں چرنے والے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں

سے کسی خاص جانور کے لینے پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ مالک کو یہ اختیار دینا چاہئے کہ وہ اپنا حصہ چھانٹ لے۔ البتہ جو جانور لنگ کرتا ہو یا کمر شکستہ ہو یا ناکارہ و بیمار ہو وُہ نہ لیا جائے۔

حضرت ان جانوروں کی دیکھ بھال کی بھی تاکید فرماتے تھے اور کارندوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ انہیں بے گیاہ راستوں کی طرف سے نہ لائیں بلکہ ایسے راستوں سے لائیں جہاں پانی اور سبزہ ہو۔ اور انہیں پانی پینے اور چرنے اور ستانے کا موقع دیں اونٹنی اور اس کے بچے کو الگ الگ نہ رکھیں۔ اور سارے کا سارا دودھ نہ دوہ لیا کریں کہ بچے کا حصہ کم رہ جائے۔

حضرت کی یہ ہدایات اور طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ میں جبر و تشدد کو روا نہ رکھتے تھے۔ اور نہ اس کے لئے خون ریزی و لشکر کشی کا کوئی جواز سمجھتے تھے بلکہ لوگوں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وُہ عمال کی سخت گیری اور حکومت کے دباؤ سے متاثر ہونے کے بجائے محض رضائے الٰہی و خوشنودی پروردگار کے لئے زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر اس کی ادائیگی بھی جبر کے ماتحت ہو تو فریضۂ زکوٰۃ اور حکومت کے جبری ٹیکسوں میں فرق ہی کیا رہے گا۔

امیرالمومنین مال زکوٰۃ کو انہی مصارف میں صرف کرتے تھے۔ جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اور اسے محاصل حکومت کی دوسری مدوں میں خلط ملط نہ ہونے دیتے تھے۔

نظامِ خراج

مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں سے کچھ علاقے وہ تھے جن کے مالک حرب و ضرب سے مغلوب کئے گئے اور کچھ وہ تھے جو لڑے بھڑے بغیر صلح سے مفتوح ہوئے وہ علاقے جو قہر و غلبہ سے مفتوح ہوئے ان علاقوں کی وہ زمینیں جو شور افتادہ اور پہاڑوں اور دلدلوں کے نیچے واقع ہوں یا ذرائع آبپاشی کے فقدان سے ناقابل زراعت ہوں وہ انفال میں داخل ہیں جو اللہ اور رسول سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

یسئلونك عن الانفال قل	تم سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں تم کہہ دو کہ
الانفال للّٰہ والرسول۔	انفال اللہ رسول کے لئے ہیں"

پیغمبر کے بعد امام و ولی امر کو اختیار ہے کہ وہ ان زمینوں اور زمینوں سے نکلنے والے معدنیات کو مصالح اہل اسلام یا مصالح عامہ میں جس طرح چاہے تصرف میں لائے اور ولی امر یا اس کے نائبین کی

اجازت خصوصی یا عمومی کے بغیر کسی کو ان میں حق تصرف نہیں ہے اور جو زمینیں فتح کے موقع پر زراعت کے قابل اور آباد ہوں وہ ولی امر کی اجازت سے مسلمانوں میں بانٹ دی جائیں گی تاکہ وہ ان میں کاشت کریں اور ملکی پیداوار بڑھائیں اور وہ علاقے جو معاہدہ صلح کے نتیجہ میں مفتوح ہوئے ہوں اگر وہاں کے باشندے اپنی مرضی و اختیار سے اسلام لے آئیں جیسے مدینہ بحرین اور یمن کے بیشتر حصے تو ان کا اپنی زمینوں پر قبضہ بدستور رہیگا اور وہ زمینوں کی پیداوار سے زکوٰۃ ادا کریں گے اور اگر اپنے مذہب و مسلک پر باقی رہیں تو جن شرائط پر مصالحت ہوگی ان شرائط کی پابندی کی جائے گی اگر یہ معاہدہ ہو کہ وہ اپنی زمینوں اور جائیدادوں کے بدستور مالک رہیں گے تو انہیں ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا جائیگا البتہ انہیں ذمی قرار دیکر ان پر جزیہ عائد کیا جائیگا۔ اور اگر اس شرط پر صلح ہو کہ وہ اپنی زمینوں سے دستبردار ہوکر مسلمانوں کو دیدیں تو وہ مسلمانوں میں تقسیم کردی جائیں گی۔ جس علاقہ کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا جاتا ہے اس علاقہ کی زمینیں اراضیٔ جزیہ کہلاتی ہیں اور جو زمینیں لڑکر یا شرطِ صلح کی رو سے مسلمانوں میں بٹ جاتی ہیں وہ اراضیٔ خراجیہ کہلاتی ہیں۔ انہیں اراضیٔ خراجیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُن میں کاشت کرنے والوں سے زکوٰۃ کے علاوہ کاشت کا معاوضہ بھی وصول کیا جاتا ہے۔ اگر معاوضہ غلہ کی صورت میں ہو تو مقاسمہ کہلاتا ہے اور قیمت کی صورت میں ہو تو اسے خراج کہا جاتا ہے۔ خراج کی مقدار ولی امر کی صوابدید سے وابستہ ہے وہ حالات کے مطابق خراج کی تعیین کرے گا۔

امیرالمومنین نے اپنے دور میں خراج کی تحدید اور جمع آوری کا بندوبست کیا مگر حضرت کی نظر خراج سے زیادہ زمین کی آبادی پر تھی تاکہ رعایا مالی اعتبار سے فارغ البال ہو اور خراج کے بار کے نیچے دب کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ مالک اشتر کو ہدایات دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی سے حاصل ہوتا ہے اور جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی" حضرت خراج کی وصولی کے سلسلے میں سختی برتنے کے خلاف تھے اور اپنے کارندوں کو تاکید کرتے تھے کہ وہ خراج کی وصولی میں اپنا رویہ نرم رکھیں اور کسی پر جبر و تشدد نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے بنی ثقیف کے ایک شخص کو قادسیہ اور کوفہ کے بعض علاقوں میں وصولیٔ خراج کے لئے نامزد کیا تو اس سے فرمایا:۔

ایاک ان تضرب مسلما او	خبردار خراج کے درہموں کی خاطر کسی مسلمان
یھودیا او نصرانیا فی درھم	یہودی یا نصرانی کو اذیت نہ دینا نہ درہموں کے
خراج او تبیع دابۃ عمل فی	لئے کھیتی باڑی میں کام آنے والے چوپائے

لدهم قانا امرنا ان ناخذ منهم العفو۔ | فروخت کرنا۔ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو ان کے پاس ضرورت سے زائد ہو وہ لیں۔"

(بخاری ج ۹ ص ۵۳)

حضرت نے خراج کی رقم بہت معمولی تجویز کی تھی جو کسی پر بار نہ تھی۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں تحریر کیا ہے کہ مصعب ابن یزید نے بیان کیا کہ حضرت نے میرے والد کو فرات سے سیراب ہونے والے علاقہ میں خراج کی وصولی پر مامور فرمایا جس کی شرح یہ تھی :۔ گندم کی کاشت پر اگر فصل گھنی ہو تو فی جریب (بیگھہ) ۱½ درہم اور تین سیر غلہ اگر درمیانی ہو تو ایک درہم اور اگر ادنیٰ ہو تو ½ درہم اور جو پر اس کا آدھا خراج تھا۔ باغات جن میں خرما اور دوسرے پھل دار درخت ہوں فی جریب ۱۰ درہم اور انگور کی بیلیں جب چوتھے سال میں داخل ہوں تو فی جریب ۱۰ درہم۔ اور کھیرا، سبزی، ترکاری، تل، روئی اور اکے دکے پھلدار درختوں پہ خراج نہ تھا۔

نظام جزیہ

اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے دوش بدوش یہود نصاریٰ اور مجوس کو بھی تمام شہری حقوق حاصل ہوں گے بشرطیکہ وہ رعایا بن کر رہنا پسند کریں اور مملکت کے وفادار رہیں نہ دشمنانِ اسلام کے معاون و مددگار ہوں اور نہ اسلام کے خلاف جنگی عزائم رکھتے ہوں۔ اس صورت میں اُن سے حسن معاملت سے پیش آیا جائے گا اور حکومت ان کی جان و مال اور ناموس کے تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔ وہ اپنے مذہب و عقیدہ پر باقی رہنے اور مذہبی مراسم کے بجالانے میں آزاد ہوں گے۔ البتہ جدید عبادت گاہیں تعمیر کرنے ناقوس بجانے محرمات سے نکاح کرنے شراب پینے اور خنزیر کا گوشت کھانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

اگر کسی نظریاتی ریاست میں کسی جماعت کے حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں تو اس پر کچھ فرائض بھی عائد ہوں گے۔ چنانچہ ان معاشی و معاشرتی حقوق کے عوض ملکی قوانین کی پابندی کے علاوہ ایک جزوی ٹیکس بھی عاید ہوتا ہے جس کا نام جزیہ ہے۔ یہ لفظ جزا سے ماخوذ ہے جس کے معنی بدلہ و عوض کے ہیں۔ یا فارسی لفظ گزیدہ و گزیہ کی عربی شکل ہے۔ اس جزیہ سے رفاہی و دفاعی امور انجام دیئے جاتے ہیں جس سے مسلم و غیر مسلم یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں اس اعتبار سے یہ غیر مسلم پر ناروا بار نہ ہوگا جب کہ ان کا مفاد بھی اس سے وابستہ ہے اس کی مقدار بھی خراج کی طرح معین نہیں ہے بلکہ جیسے حالات ہوں گے ولی امر ان کے مطابق جزیہ کی رقم تجویز کرے گا۔ امیر المومنین کے دورِ خلافت میں جزیہ کی شرح یہ تھی :۔ امرائے

۴۸ درہم متوسط طبقہ سے ۲۴ درہم اور عوام سے ۱۲ درہم سالانہ ۔ اور بچوں، بوڑھوں، اندھوں، دیوانوں، مفلسوں اپاہجوں، عورتوں اور راہبوں کو جزیہ کی چھوٹ تھی۔

شہریت

انسانی زندگی اجتماعیت سے وابستہ ہے اور اجتماعی زندگی میں افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایکدوسرے سے مرتبط ہوتے ہیں۔ اس ربط ووابستگی کے نتیجہ میں کنبہ خاندان اور برادری کی وحدتیں وجود میں آتی ہیں اور یہی وحدتیں مل کر بستیاں بساتی اور شہر آباد کرتی ہیں ۔ اس اجتماعی زندگی میں انسانی افتادِ طبع کی بنا پر حسد ورقابت ، بغض ونفرت اور مسابقت ومزاحمت کے جذبات کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے ۔ جس کا لازمی نتیجہ تصادم ٹکراؤ اور باہمی آویزش ہوتا ہے ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان جذبات کو متوازن سطح پر رکھنے کے لئے کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تاکہ انسان جذبات کی طغیانیوں میں بہہ کر مردم آزاری دغا وفریب اور جنگ وجدل پر نہ اُتر آئے اور ان پابندیوں کو توڑ کر اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو درہم برہم نہ کرے ۔ انہی معاشرتی حدود وقیود کا نام شہریت ہے جو معاشرتی علوم کی ایک شاخ اور اپنی اہمیت وافادیت کی بنا پر تدریسی نصاب میں جگہ حاصل کر چکی ہے ۔

اس شہریت اور اجتماعی زندگی کا اولین اصول یہ ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھا اور اُن کا احترام کیا جائے ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت اور تعاون سازی کی فضا پیدا کی جائے تاکہ اس یکجہتی وہم آہنگی سے اجتماعی مفادات حاصل کئے جا سکیں اور ایک معیاری معاشرہ تشکیل دیا جا سکے ۔ اس شہریت کا تصور اس وقت تک عملی صورت اختیار نہیں کر سکتا جب تک معاشرہ کے افراد اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس نہ کریں اور ہر فرد ملنے جلنے اور رہنے سہنے کا ڈھنگ نہ سیکھے اس طرح کہ ہمسایہ ، ہمسایہ سے ہم پیشہ ، ہم پیشہ سے ، مالک مزدور سے تاجر خریدار سے حاکم ماتحت سے کس طرح پیش آئے اور کن اخلاقی قدروں کو ملحوظ رکھے کہ وہ معاشرہ میں ایک اہم اور مثالی فرد ثابت ہو سکے ۔ ایک اچھے اور معیاری شہری کے لئے ضروری ہے کہ وُہ دوسروں کی نفع رسانی کے لئے اپنی تمام قوتیں وقف کر دے ۔ قوم وملت کی خدمت کو اپنا شعار اور حق وانصاف کو اپنا دستور بنائے ۔ مظلوم وستم زدہ کی مدد کرے اور کوئی امداد کے لئے پکارے تو اس سے پہلو بچا کر نہ نکل جائے ۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے :-

من سمع رجلا ینادی للمسلمین — کوئی شخص "اے مسلمانو" کہہ کر مدد کے لئے پکارے

فلم یجبه فلیس بمسلم۔ اور سننے والا اس کی آواز پر لبیک نہ کہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔"

اسی احساس شہریت کا نتیجہ ہے کہ جماعتی تنظیموں اور رفاہی و اصلاحی اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے تاکہ عوام کو ان سے فائدہ پہنچے۔ اور شہریت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان صرف اپنے ہی مفاد پر نظر نہ رکھے بلکہ جماعتی مصالح اور اجتماعی مفادات کو بھی اتنی ہی اہمیت دے جتنی اہمیت اپنے کاموں کو دیتا ہے پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:۔

من لم یھتم بامور المسلمین فلیس بمسلم۔ جو مسلمانوں کے معاملات کو اہمیت نہ دے، وہ مسلمان نہیں ہے۔"

عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

مختلف ممالک نے جو شہریت کے اصول وضع کئے ہیں اگرچہ عمومی مفاد سب میں قدر مشترک ہے مگر ملکی روایات اور مقامی رسم و رواج کی بناء پر محدود اور قومیت و وطنیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر اسلام جو رنگ و نسل اور ملک و قوم کی سطح سے بلند تر اور عالمی فلاح و بہبود کا پیغامبر ہے اور تمام بنی نوع انسان کو مرکز وحدت سے وابستہ کر کے ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا چاہتا ہے اس نے عالمی و آفاقی اساس پر قومیت کی بنیاد رکھی ہے جس میں نہ رنگ کا امتیاز ہے اور نہ نسل کی تفریق۔ نہ محدود قومیت کا تصور ہے اور نہ جغرافیائی حد بندی بلکہ

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اسلامی نقطہ سے شہریت کے جو اصول و قوانین بیان کئے گئے ہیں وہ کسی خاص سرزمین یا کسی خاص مملکت تک محدود نہیں ہیں بلکہ زمان و مکان کے اعتبار سے عام و ہمہ گیر ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین نے جو اسلام کی زبان اور اسلامی معارف کا سرچشمہ تھے اپنے کلمات حکیمہ میں شہریت کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے یہ ہماری غفلت یا احساس کمتری کا نتیجہ ہے کہ جب اس "حکیم عرب" کی آواز گونجی تو گراں گوش بنے رہے اور جب اس کی صدائے بازگشت مغرب سے سنی تو ہمہ تن گوش ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ مفکرین عالم نے اس سلسلہ میں جو اصول و قواعد ترتیب دیئے ہیں ان میں سے کوئی ضابطہ ایسا نہ ہو گا جس سے معاشرہ کی اصلاح وابستہ ہو اور حضرت نے اسے بیان نہ کر دیا ہو۔ ان اصول و ضوابط کی چند دفعات مشتے نمونہ از خروارے درج کی جاتی ہیں۔

(۱) معاشرتی بہبود کا بنیادی عنصر عدل و انصاف ہے جس سے کمزور و طاقت ور میں ایک متوازن

حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ طاقتور احتساب کے ڈر سے کمزور پر ظلم ڈھانے میں جری و بیباک نہ ہوگا اور کمزور کو ڈھارس ہوگی کہ اگر قوی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا تو قانون عدل اس کی سپر بن جائے گا اس لئے جس معاشرہ میں عدل کارفرما ہوگا وہاں امن سایہ فگن رہے گا اور جہاں ظلم ہوگا وہاں غیظ و غضب کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں اور جب بھڑک اٹھتی ہیں تو زلزلہ فگن دھماکوں سے پورا قصر ظلم و استبداد ہل جاتا ہے امیرالمومنین کا ارشاد ہے "عدل کی روش پر چلو اور ظلم و بے راہ روی سے کنارہ کش رہو کیونکہ بے راہ روی کے نتیجہ میں گھر بار چھوڑنا پڑے گا اور ظلم تلوار اٹھانے کی دعوت دے گا۔

(۲) شہریت کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کیا جائے اور جیسا برتاؤ اپنے لئے چاہتے ہو ویسا برتاؤ دوسروں کے ساتھ کرو۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔"جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کے لئے پسند کرو اور جس چیز کو اوروں کے لئے ناپسند کرتے ہو اس سے خود بھی پرہیز کرو۔

(۳) تفاخر اور تفوق پسندی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ فخر و غرور سے دوسروں کے دلوں میں بغض و تنفر کے جذبات ابھر آتے ہیں جو باہمی روابط و تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں، اکبر الفخران لا تفخر" سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کرو۔" اس لئے کہ فخر احساس کمتری کا نتیجہ ہوتا ہے اور بلند نفس انسان زبانی دعووں کے بجائے اپنے عمل سے بلند نفسی و عالی ظرفی کا ثبوت دیتا ہے۔

(۴) کمزور و پس ماندہ افراد سے ہمدردانہ برتاؤ کیا جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔" اپنے کمزوروں سے ہمدردی کرو یہ ہمدردی تمہارے لئے اللہ کی رحمت کا باعث ہوگی۔"

(۵) اگر کسی کے بارے میں کوئی بُری بات سنو یا دیکھو تو اس کا ڈھنڈورہ نہ پیٹو۔ حضرت فرماتے ہیں:۔ "جس نے کسی بری بات کو سنا اور اسے ظاہر کیا تو ایسا ہی ہے جیسے وُہ خود بُرائی کا مرتکب ہُوا ہو۔

(۶) کسی کی خوشحالی کے بعد معاشی بدحالی پر خوش نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔"کسی کی تباہ حالی پر خوش نہ ہو کیا معلوم کہ کل زمانہ تمہارے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرے۔"

(۷) جہاں تک ہو سکے لڑائی جھگڑا مول نہ لو۔ حضرت فرماتے ہیں:۔" جو شخص اپنی عزت و ناموس کو محفوظ رکھنا چاہے اسے لڑائی جھگڑے سے کنارہ کش رہنا چاہئے۔"

(۸) ہر موقع پر بے اعتمادی کا اظہار نہ کرو کیونکہ باہمی اعتماد ہی پر معاشرتی زندگی کا انحصار ہے:۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔" من لم یثق لم یوثق بہ۔ جو دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔"

(۹) دوستی و تعلقات کی بناء پر کسی کے حق کو نظر انداز نہ کرو۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔" باہمی روابط کی

بنا پر کسی بھائی کی حق تلفی نہ کرو۔ کیونکہ وہ پھر بھائی کہاں ہے جس کا حق تم تلف کرو۔"

(۱۰) حاجتمند سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ۔ حضرت کا ارشاد ہے "اگر کسی موقع پر لوگوں کو تمہاری احتیاج ہو تو ان سے عجز، وانکسار اور خندہ جبینی سے پیش آؤ ہو سکتا ہے کہ کل تمہیں کوئی حاجت لے کر ان کے پاس جانا پڑے تو تمہیں اپنے طرز عمل پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

(۱۱) اسلام کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ نہی عن المنکر کا ہے۔ یعنی جہاں کوئی برائی ہوتے ہوئے دیکھو اس سے چشم پوشی نہ کرو بلکہ امکانی حد تک اس سے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو بہت سی کھلم کھلا اور علانیہ برائیوں کا سدباب ہو سکتا ہے کیونکہ خود یہ خیال برائی سے مانع ہو گا کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا ہے۔ اگر کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو تو برائیوں کو نشوونما پانے کا موقع ملے گا اور معاشرہ اخلاقی اعتبار سے پستی کی آخری حدوں تک پہنچ جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "جو شخص نہ زبان سے نہ ہاتھ سے اور نہ دل سے برائی کی روک تھام کرتا ہے وہ زندوں میں چلتی پھرتی لاش ہے۔"

امیرالمومنین صرف زبانی پندوموعظت ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ عملاً ہر معاشرتی برائی کو کچلنے کے لئے آمادہ رہتے تھے کوئی گری ہوئی بات سنتے یا کہیں لڑائی جھگڑا یا اللہ کی نافرمانی ہوتے دیکھتے تو فوراً اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ اگر سرزنش کی ضرورت ہوتی تو سرزنش کرتے اور سزا کی ضرورت ہوتی تو سزا دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے شکایت کی کہ فلاں شخص مجھے یہ کہہ کر تنگ کرتا ہے کہ میں تمہاری ماں سے محتلم ہوا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ تقاضائے عدل تو یہ ہے کہ اسے دھوپ میں کھڑا کر کے اس کے سایہ پر تازیانے لگائے جائیں کیونکہ خواب سایہ کے مانند ہے مگر ہم اسے سزا دیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل نہ کرے۔ چنانچہ اُسے سزا دی گئی۔ ایک دفعہ دو آدمیوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ تم کیوں ایک دوسرے سے اُلجھ رہے ہو؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں نے اس کے ہاتھ ایک پارچہ نو درہم میں بیچا ہے۔ [illegible] اسے یہ شرط کی تھی کہ قیمت کھرے اور معیاری درہموں میں ادا کرے مگر اس نے خراب اور ٹوٹے پھوٹے درہم مجھے دینا چاہے۔ میں نے ان سکوں کے لینے سے انکار کیا تو اس نے مجھے طمانچہ دے مارا اور سر بازار میری ہتک و تذلیل کی۔ حضرت نے اس واقعہ کی تصدیق کی جب تصدیق ہو گئی تو آپ نے دوسرے شخص سے کہا کہ تم بھی اسے طمانچہ کے عوض طمانچہ مارو۔ اس نے کہا کہ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ حضرت عفو و درگزر کو دوست رکھتے تھے اس درگزر پر خوش ہوئے اور فرمایا کہ تمہیں اس کا اختیار ہے چاہے بدلہ لو چاہے چھوڑ دو۔

اس فیصلہ پر معاملہ کو ختم ہونا چاہیئے تھا کیونکہ صاحب حق نے خود اپنا حق چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس

حق کے علاوہ ایک حق اور بھی تھا اور وہ اجتماعی و معاشرتی حق تھا جس کا تقاضہ یہ تھا کہ حکومت ایسے بدا طوار لوگوں کو سزا دے تاکہ آئندہ انہیں مردم آزاری کی جرأت نہ ہو۔ حضرت کی نظروں سے یہ حق اوجھل نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ آپ نے اسے بدعہدی و ایذا رسانی کی پاداش میں پندرہ کوڑوں کی سزا دی۔

معاشرتی خرابیوں میں سے یہ خرابی عام ہو چکی ہے کہ سر بازار چوسر شطرنج پانسہ وغیرہ کھیل کھیلے جاتے ہیں اور انہیں ایک طرح کا تفریحی مشغلہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ چیزیں میسر میں داخل ہیں جنہیں قرآن نے ناپاک اور عمل شیطان کہا ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔ الشطرنج والنرد ہما المیسر "شطرنج، پانسہ میسر ہی تو ہیں"۔ جب نئی پود بڑوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھتی ہے تو وہ بھی ان کی روش پر چل نکلتی ہے اور ضیاع وقت کے ساتھ قمار بازی کی راہ پر چل کر مالی و اخلاقی تباہی کا سامان کرتی ہے۔ حضرت معاشرہ کی تطہیر کے لئے اس قسم کے کھیلوں کو بھی قابل سزا سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو شطرنج کھیلتے دیکھ لیا فرمایا یہ کیسے مہرے ہیں جن کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہو پھر بساط الٹ دی اور انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے سزا دی۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں تحریر کیا ہے کہ حضرت نے ایک مرتبہ کوفہ کے باہر چند مکانوں پر مشتمل ایک آبادی دیکھی پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے بتایا گیا کہ یہ کوفہ ہی کا ایک محلہ ہے جو زرارہ ابن یزید کے نام پر زرارہ کہلاتا ہے۔ یہاں شراب کشید کی جاتی ہے اور فروخت ہوتی ہے۔ حضرت فرات کو عبور کر کے اس بستی میں پہنچے اور حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے چنانچہ اسے جلا دیا گیا۔

معاشرتی زندگی کی اصلاح افراد کی اصلاح ہی پر منحصر ہوتی ہے۔ انہی کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے اور انہی کے بگڑنے سے بگڑتا ہے۔ افراد معاشرہ کے اجزا ہوتے ہیں اور جس طرح اعضاء سے ترکیب پا کر جسم بنتا ہے یونہی افراد کے باہمی ارتباط سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اگر اجزائے بدن میں سے ایک جزو کا بگاڑ پورے جسم کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے تو چند افراد کے بگاڑ سے قومی و اجتماعی زندگی کے خط و خال بھی بگڑ سکتے ہیں۔ پیش کردہ واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت افراد کی ذہنی و عملی تبدیلی ہی کے ذریعہ معاشرہ میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیتے سختی سے محاسبہ کرتے اور معاشرتی اصولوں کا انہیں پابند بناتے۔ بیشک نرمی و درگزر ایک عمدہ صفت ہے۔ مگر جہاں نرمی معاشرتی تخریب کا باعث ہو وہاں نرمی برتنا تخریب کاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

کاروباری طبقہ کی نگرانی

اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص اپنے زیرِ تربیت افراد کی اخلاقی نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ باپ ہو یا بزرگ خاندان، مربی ہو یا معلم وہ اپنے متعلقہ افراد کے بارے میں جواب دہ ہے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔	تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔"

جب ہر فرد اپنے کنبہ و خاندان اور زیرِ تربیت افراد کے بارے میں جواب دہ ہے تو جو امت کا نگران اور ملت کا سربراہ ہو وہ کیونکر مسئولیت سے بالاتر ہو سکتا ہے یقیناً وہ بھی ملت کی نگہبانی اور اس کی اخلاقی نگرانی کا ذمہ دار ہو گا۔ اس ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام کارندوں پر چھوڑ کر مطمئن اور آسودہ خاطر ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ براہِ راست رعایا کے عادات و اطوار کا جائزہ لے اور ان کے طریقِ کار کو دیکھے بھالے۔ یہ کام ایوانِ حکومت کے سراپردوں میں رہ کر انجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ عوام میں گھل مل کر رہا جائے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

امیرالمومنین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ خود بنفس نفیس سیدھے سادے لباس میں کبھی چھپ کر اور کبھی علانیہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چکر لگاتے، تاجروں اور دستکاروں سے چیزوں کے بھاؤ پوچھتے اور ایک معلم اخلاقیات کی حیثیت سے مناسب ہدایات دیتے دیانتداری اور خوش معاملگی کی تاکید کرتے۔ بے اعتدالی بددیانتی اور ناپ تول میں کمی بیشی سے روکتے اور انہیں جھنجھوڑنے کے لئے یہ آیت تلاوت فرماتے:۔

تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین۔	یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو دنیا میں نہ بلندی چاہتے ہیں، نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے۔"

ایک دفعہ ایک قصاب کی دکان کی طرف سے گزرے تو ایک کنیز کو دیکھا جو دوکاندار سے کہہ رہی تھی کہ کچھ تو اور دو۔ حضرت نے سنا تو فرمایا:۔ ردھا فانہ اعظم للبرکۃ، ہاں کچھ زیادہ دو یہ

یہ چیز بڑی باعثِ برکت ہے۔

ایک مرتبہ بازار سے گزرتے ہوئے ایک درزی کی دکان پر کھڑے ہوگئے اور اس سے فرمایا تاگا مضبوط استعمال کرو۔ سلائی باریک رکھو اور ٹانکا دوسرے ٹانکے سے ملا کر بھرو۔ اور سلائی کے بعد جو ٹکڑے بچ رہیں وہ مالک کے حوالے کرو۔ میں نے پیغمبر اکرمؐ کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن کپڑے میں خیانت کرنے والے کو اس طرح لایا جائے گا کہ خیانت سے حاصل کئے ہوئے پارچے اس پر لدے ہوئے ہوں گے۔

ابن اثیر نے البدایہ والنہایہ میں تحریر کیا ہے کہ ابو مطر بصری بیان کرتا ہے کہ میں مسجد کوفہ سے باہر نکل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی کہ چادر کا کنارا اُوپر اٹھا کر چلو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بادیہ نشین عرب ہاتھ میں دُرّہ لئے ایک چادر باندھے اور ایک چادر اوڑھے ہوئے آرہا ہے۔ یہ سادگی اتنی پُرعظمت تھی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ کون ہے اس نے کہا کہ تم نووارد معلوم ہوتے ہو کہا کہ ہاں میں بصرہ کا رہنے والا ہوں اور وہیں سے آرہا ہوں۔ کہا کہ اسی لئے تم نے پہچانا نہیں یہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب ہیں یہ سن کر میں لرز اُٹھا اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف ہٹا اور آپ کے عقب میں چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ آگے بڑھ کر سودا سلف بیچنے والوں کے پاس کھڑے ہوگئے اور ان سے فرمایا:۔ بیعوا ولا تحلفوا فان الیمین تنفق السلعة و تمحق البرکة۔ "بیچو مگر قسمیں کھا کر نہ بیچو کیونکہ قسم کھانے سے برکت اٹھ جاتی ہے اگرچہ مال بک جاتا ہے۔" پھر خرما فروشوں کے بازار کا رُخ کیا وہاں پر ایک کنیز کو روتے دیکھ کر ٹھہر گئے اور اس سے رونے کی وجہ پوچھی اس نے کہا کہ میں نے اس دکاندار سے ایک درہم کی کھجوریں خریدی تھیں میرے مالک نے ناپسند کیں اور کہا کہ انہیں واپس کر آؤ مگر یہ واپس نہیں لیتا۔ حضرت نے اس دکاندار سے کہا کہ یہ کنیز ہے اور مجبور، تم یہ کھجوریں واپس لے لو۔ اس نے انکار کیا تو میں نے کہا کہ اے شخص پہچانتے ہو کہ تمہیں کون کہہ رہا ہے یہ امیرالمومنین ہیں یہ سننا تھا کہ اس نے فوراً کھجوریں لے لیں اور درہم کنیز کو واپس کر دیا۔ پھر حضرت نے دکانداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔ اطعموا المساکین یربو کسبکم۔ "مسکینوں کو کھانے کے لئے دو تمہارے کاروبار میں اضافہ ہوگا۔" اس کے بعد مچھلی بیچنے والوں کے بازار میں آئے اور فرمایا خبردار حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر ایسی مچھلی فروخت نہ کرنا جو پانی کے اندر مر گئی ہو۔ پھر آگے بڑھے اور پارچہ فروشوں کے بازار میں آئے اور ایک دوکاندار سے کہا کہ تین درہم تک کا کوئی کرتہ دکھاؤ اس نے حضرت کو پہچان کر آپ کا خیر مقدم کیا مگر آپ نے اس سے کُرتہ نہ خریدا اور ایک دوسری دکان سے تین درہم میں کرتہ خرید فرمایا۔ جب حضرت واپس رحبہ میں تشریف لائے تو ایک شخص آیا اور اس نے ایک درہم پیش کیا پوچھا کہ یہ درہم

کیسا ہے؟ کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے دوکانداروں سے معلوم ہوا کہ آپ میری دکان پر تشریف لے گئے تھے اور میرے لڑکے سے کرتہ خرید کیا ہے۔ وہ آپ کو پہچان نہ سکا اور دو درہم کا کرتہ تین درہم میں آپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ وہی درہم ہے جو آپ نے زائد دیا تھا۔ حضرت نے وہ درہم واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ اس نے اپنی مرضی سے بیچا ہے اور میں نے اپنی مرضی سے خریدا ہے اب یہ درہم واپس نہیں لیا جاسکتا۔

امیرالمومنین کا بازار میں آنے کا مقصد ہو سکتا ہے کہ کرتے کی خریداری ہو مگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض نظر انداز نہیں ہونے پاتا۔ اور یہ آپ کا دینی و منصبی فریضہ تھا کہ جہاں نیکی کی کوئی صورت دیکھیں اس کی ترغیب دیں اور جہاں برائی دیکھیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اس سے روکیں چنانچہ ایک شخص کو دامن لٹکا کر چلتے دیکھا تو اسے دامن اٹھا کر چلنے کی ہدایت کی اس لئے کہ یہ انداز پوشش کبر و غرور کی علامت ہے ایک کنیز کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر یہ گوارا نہیں کرتے کہ نظر بچا کر آگے نکل جائیں بلکہ جب تک اس کے آنسو پنچھ نہیں جاتے آگے نہیں بڑھتے۔ اور دکاندار پر حکومت کا رعب بٹھانے کے بجائے اس پر اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں کہ یہ کنیز مجبور و بے بس ہے تم اس کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے بیچا ہوا مال واپس لے لو۔ پھر تاجروں کو اعانت فقرا پر ابھارتے ہیں کہ وہ راہ خدا میں خرچ کریں تاکہ ان کی تجارت پھولے پھلے اور انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ وہ حرام چیزیں فروخت کے لئے بازار میں نہ لائیں اس لئے کہ حرام چیزوں کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ جھوٹی سچی قسمیں کھا کر سودا نہ بیچیں اس لئے کہ قسم سچی بھی ہو تو یہ ایک طرح سے اپنی ذات پر بے اعتمادی کا اظہار ہے کیونکہ قسم کھانے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ قسم کے بغیر اس کی بات سچی نہیں سمجھی جاسکتی اور پھر بار بار قسم کھانے سے دوسروں کی نظروں میں بھی ناقابلِ اعتماد ہو جاتا ہے۔ ایک پہچان لینے والے سے کرتا خریدنا پسند نہیں کرتے اس خیال سے کہ اگر وہ قیمت نہ لے یا عام نرخ سے کم لے تو اسے نقصان پہنچے گا اور آپ کسی کے ادنیٰ نقصان کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ اور اس میں یہ درس بھی مضمر ہو سکتا ہے کہ عمال حکومت آپ کے طرز عمل کو دیکھ کر اپنے عہدہ و منصب سے غلط استفادہ نہ کریں اور پھر یہ تعلیم دی کہ بائع و مشتری میں معاملہ طے پاجائے تو کچھ زیادہ بھی دینا پڑ جائے تو اسے نظر انداز کیا جائے تاکہ عزت نفس برقرار رہے۔ بشرطیکہ غش و فریب سے کام نہ لیا گیا ہو۔

یتیموں بیواؤں اور ناداروں پر شفقت

اسلام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے اور اعمال صرف نماز، روزہ، حج وغیرہ کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک بھی اعمال صالحہ کا ایک اہم جزو ہے۔ اگر کوئی شخص مسکینوں اور ناداروں کو فقر و فاقہ میں چھوڑ کر تن پروری میں لگا رہتا ہے تو وہ دین کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا چنانچہ پیغمبر اکرمؐ سے دین کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

الدین التعظیم لامر اللہ و الشفقۃ علیٰ خلق اللہ

"دین نام ہے اوامر الٰہیہ کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت و مہربانی کا"

یوں تو ہر مسلمان کا اسلامی و انسانی فرض ہے کہ وہ حسب استطاعت خلق خدا اور معاشرہ کے بے بال و پر اور شکستہ حال افراد کی خبر گیری کرے مگر رئیس مملکت پر اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے افراد کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کرے ان کی ضروریات پر نظر رکھے بے سہارا لوگوں کی طرف دست تعاون بڑھائے۔ یتیموں کی کفالت کرے اور ان سے شفقت و محبت کا ویسا ہی برتاؤ کرے جیسا برتاؤ ایک شفیق باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔

امیر المومنین کا دل محبت و شفقت کے جذبات سے معمور تھا۔ جب کسی مفلوک الحال کو دیکھتے تو تڑپ اٹھتے کسی بے نوا کی صدا سنتے تو بے چین ہو جاتے اور یتیموں سے اس طرح پیش آتے کہ انہیں یتیمی کا احساس نہ ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ حلوان اور ہمدان سے انجیریں اور شہد کے مشکیزے آئے۔ حضرت نے اپنے عملہ کے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ یتیم بچوں کو جمع کر کے لائیں۔ جب بچے جمع ہو گئے تو آپ نے مشکیزوں کے منہ کھول کر ان بچوں کے ہاتھوں میں دے دیئے اور پیالوں میں شہد بھر بھر کر تقسیم کرنا شروع کیا۔ بچے شہد بھی انڈیلتے جاتے تھے اور مشکیزوں کے دہانوں پر لگا ہوا شہد بھی چاٹتے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح شہد چاٹ رہے ہیں اور امیر المومنین انہیں منع بھی نہیں کرتے۔ حضرت نے فرمایا:۔

ان الامام ابو الیتمیٰ و انما العقتھم ھٰذا برعایۃ الآباء۔

"امام یتیموں کا باپ ہوتا ہے اور میں نے اسی پدری تقاضے کی بناء پر انہیں شہد چاٹنے دیا ہے"

ایک دفعہ امیر المومنین ایک گلی میں سے ہو کر گزرے تو دیکھا کہ ایک عورت مشکیزہ کاندھے پر

اٹھائے جا رہی ہے حضرت نے ازراہِ ہمدردی مشکیزہ اس سے لے کر خود اٹھا لیا اور اس سے پوچھا کہ تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو باہر کے کام انجام دے کہا کہ امیرالمومنین نے میرے شوہر کو ایک مہم پر بھیجا تھا۔ وہ وہاں شہید ہو گیا اور میرے بچے یتیم رہ گئے۔ میں خود ہی پانی بھرتی اور مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔ حضرت مشکیزہ اس کے گھر پہنچا کر واپس آئے اور تمام رات قلق و اضطراب میں گزاری۔ جب صبح ہوئی تو خورد و نوش کا سامان لے کر اس کے ہاں پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا اس نے پوچھا کہ کون ہے۔ فرمایا کہ کل جو تمہارا مشکیزہ اٹھا کر لایا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا حضرت اندر داخل ہوئے اور کھانے پینے کا سامان اُسے دیا اور فرمایا کہ تم آٹا گوندھو گی یا بچوں کو بہلاؤ گی۔ کہا کہ میں آٹا گوندھتی ہوں اور آپ بچوں کو بہلائیں۔ جب وہ آٹا گوندھ چکی تو کہا کہ اے مرد با خدا اب آپ تنور روشن کریں۔ حضرت نے تنور میں لکڑیاں ڈالیں اور انہیں آگ لگائی جب شعلے بلند ہوئے تو حضرت نے تپش محسوس کی اور فرمایا:

ذق یا علی ھذا جزاء من ضیع الارامل والیتامیٰ۔ — اے علی یتیموں اور رانڈوں کی طرف سے بے خبر رہنے کا مزہ چکھو۔

اس اثنا میں محلہ کی ایک عورت آئی اس نے امیرالمومنین کو تنور روشن کرتے دیکھا تو اس عورت سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم امیرالمومنین سے خدمت لے رہی ہو۔ جب اس نے یہ سنا تو اس پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔ معذرت کرتے ہوئے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین میں شرمسار ہوں کہ آپ سے خدمت لیتی رہی ہوں اور آپ کو پہچان نہ سکی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں خود نادم ہوں کہ تمہارے بارے میں کوتاہی برتی اور تمہیں اتنے دن تکلیف اٹھانا پڑی ؎

ایں طریق عذر خواہی یاد گیر — توبہ ہائے بے گناہی یاد گیر

ایک دفعہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت دروازے پر کھڑی رو رہی ہے۔ حضرت نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میرا شوہر مجھ پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور زدو کوب سے باز نہیں آتا اور آج تو اس نے قسم کھائی ہے کہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ فرمایا کہ ذرا دھوپ کی تپش کم ہونے دو تو میں تمہارے شوہر کو بلا کر سمجھاؤں گا۔ کہا کہ اس وقفہ میں خدا جانے وہ کیا کر بیٹھے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ جب اس کے مکان پر پہنچے تو اسے آواز دی۔ وہ باہر نکلا تو حضرت نے اس سے کہا کہ اے بندۂ خدا اللہ سے ڈرو اور اپنے اہل خانہ پر ظلم نہ کرو وہ شخص حضرت کو پہچان نہ سکا کہا کہ آپ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں۔ اگر نہیں ستاتا تھا تو اب ستاؤں گا۔ اتنے میں چند ہمسائے بھی جمع ہو گئے انہوں نے امیرالمومنین کو دیکھا تو اس

شخص سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ گستاخانہ گفتگو کس سے کر رہے ہو۔ یہ امیرالمومنین ہیں، یہ سننا تھا کہ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا اور لرزتے کانپتے ہوئے عذر خواہ ہوا اور اقرار کیا کہ آئندہ کبھی سختی نہیں کرے گا خواہ اس کی بیوی کی طرف سے کتنی ہی زیادتی کیوں نہ ہو۔ حضرت نے اس عورت کو گھر کے اندر بھجوایا اور اسے نصیحت کی کہ وہ شوہر کی نافرمانی نہ کرے۔

اس خدمت خلق کے ساتھ ضرورت مندوں کو مالی امداد دیتے اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے دوسروں کی حاجت روائی کرتے اور کسی سائل کو اپنے ہاں سے خالی نہ پھراتے۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ایک سائل نے حضرت سے سوال کیا آپ نے امام حسن سے فرمایا کہ گھر سے ایک درہم لا کر اسے دے دو۔ امام حسن نے کہا کہ گھر میں چھ درہم ہیں جو آٹا خریدنے کے لئے ہیں فرمایا کہ مومن کو اپنے ہاں کی چیز سے اللہ کے ہاں کی چیز پر زیادہ اعتماد ہونا چاہئے۔ جاؤ اسے چھ کے چھ درہم لا کر دے دو۔ امام حسن نے وہ درہم سائل کو لا کر دے دیئے۔ ابھی حضرت اپنی جگہ سے اٹھے نہ تھے کہ ایک شخص اونٹ ہنکاتا ہوا آیا حضرت نے پوچھا کہ یہ اونٹ فروخت کے لئے ہے اس نے کہا ہاں حضرت نے وہ اونٹ ایک سو چالیس درہم میں خرید لیا اور ایک ہفتہ کے بعد قیمت ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے دو سو درہم میں وہ اونٹ خرید لیا۔ حضرت نے ایک سو چالیس درہم قرضخواہ کو دیئے اور بقیہ ساٹھ درہم لے کر گھر میں تشریف لائے۔ جناب سیدہ نے درہم دیکھے تو پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ فرمایا کہ اللہ نے چھ درہموں کے بدلے میں ساٹھ درہم دلوائے ہیں اور اس کا وعدہ سچا ہے کہ:۔

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔	جو ایک نیکی کرے اسے ویسی دس نیکیاں بدلے میں ملیں گی۔"

غلاموں سے برتاؤ

زمانۂ سابق میں دنیا کے ہر گوشہ میں غلاموں کا وجود پایا جاتا تھا اور عرب میں بھی غلامی کا عام رواج تھا۔ اس غلامی کی ابتداء یوں ہوئی کہ طاقت ور قبائل اپنی بالادستی منوانے کے لئے کمزوروں اور ناتوانوں پر حملہ آور ہوتے انہیں قتل و غارت کرتے اور بقیۃ السیف کے لئے آزادی کی راہیں بند کر کے انہیں غلام بنا لیتے اور پھر ان کی اولاد موروثی غلام قرار دے لی جاتی۔ رفتہ رفتہ انسانی معاشرہ میں غلاموں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا اور کھیتی باڑی اور دوسرے محنت طلب کاموں کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھا جانے

لگا یہاں تک کہ ارسطو و فلاطون ایسے بلند نظر مفکرین نے معاشرتی ارتقاء کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھا
اور آقاؤں کی بالادستی کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ ابتدائے دورِ غلامی سے انیسویں صدی کے وسط تک غلاموں
کا یہ طبقہ اپنے مالکوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ ان سے سخت سے سخت کام لئے جاتے۔ وزنی پتھر
ڈھوتے جنگلوں سے درخت کاٹ کر لاتے کولہو اور ہل میں بیلوں کی جگہ جوتے جاتے اور اس محنت شاقہ
کے باوجود نہ انہیں شکم سیر ہو کر کھانے کو دیا جاتا اور نہ پورا تن ڈھانکنے کے لئے لباس میسر ہوتا۔ ذرا
سی غلطی یا فروگذاشت پر کوڑوں سے پیٹتے شکنجے میں کھینچے جاتے اگر مالک کے ہاتھ سے قتل ہو جاتے۔
تو اس کی داد نہ فریاد اور نہ مالک سے کوئی بازپرس بلکہ رومن دستور میں اگر غلام کو قتل کرتے ہوئے مالک
کا ہاتھ کانپ جاتا تو اسے اخلاقی کمزوری اور انتہائی بزدلی سمجھا جاتا۔

اسلام اس غلامی کو مٹا کر انسانی حریت کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی حکمت و مصلحت بینی کا تقاضا
یہ تھا کہ غلامی کو یک لخت ختم کرنے کے بجائے رفتہ رفتہ ختم کیا جائے اور اس کے انسداد کے لئے ایسی تدابیر
عمل میں لائی جائیں کہ اسلامی معاشرہ بالتدریج اس سے پاک و صاف ہو جائے۔ چنانچہ اسلام نے پہلے تو
غلامی کو صرف ان کفار حربی میں محدود کر دیا جو جنگ و قتال کے نتیجہ میں اسیر کر لئے جاتے تھے۔ یہ ایک
ناگزیر ضرورت تھی کیونکہ جو لوگ بغاوت و سرکشی سے امن عامہ کو خطرہ میں ڈال چکے ہوں اُن سے آئندہ
بھی مطمئن نہ رہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی بکھری ہوئی طاقت کو مجتمع کر کے پھر سے حملہ آور ہوں اور امن
عامہ کو تباہ کریں۔ دنیا کی کوئی بھی حکومت ایسے باغیوں کو کھلی چھٹی نہیں دیا کرتی جو نظم و نسق مملکت
کے تباہ کرنے کے درپے ہوں بلکہ ان کے لئے قتل یا حبس دوام کی سزا تجویز کی جاتی ہے۔ اسلام نے قتل یا
حبس دوام کے بجائے سلب آزادی کی سزا تجویز کی جو حبس دوام کی ایک نرم صورت ہے۔ اس سلب
آزادی میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ دشمنان اسلام کو نسلاً بعد نسل غلامی میں جکڑے جانے کا ڈر مسلمانوں
کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے سے مانع ہو اور پھر پیغمبر اکرم نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی اور بردہ
فروشی کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے فرمایا کہ شر الناس من باع الناس۔ بدترین انسان وہ ہے جو بردہ فروشی
کرے۔" کفارہ میں غلاموں کی آزادی کو جگہ دی۔ مصارف زکوٰۃ میں سے ایک صرف غلاموں کی آزادی کو
قرار دیا۔ اگر کوئی غلام اندھا یا از کار رفتہ یا کوڑھ میں مبتلا ہو جاتا تو آزاد ہو جاتا۔ اگر کنیز صاحب اولاد
ہو جاتی تو مالک کے مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتی اور جو غلامی پر باقی رہتے ان سے نہ صرف
حسن سلوک بلکہ مساویانہ سلوک کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:۔

البسوھم مما تلبسون واطعموھم — جو خود پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ اور جو خود کھاتے

مما تاکلون۔ (مناقب) ہو وہ انہیں کھانے کو دو۔"

امیرالمومنین غلاموں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی محنت کی کمائی ان کی آزادی اور فلاح و بہبود کے لئے مخصوص کر دی اور انہیں آزادی سے بہرہ یاب کر کے اس کا موقع دیا کہ وہ ترقی کے منازل طے کر کے معاشرہ میں بلند مقام حاصل کریں اس لئے کہ ترقی کسی خاص نسل اور رنگ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک آزاد کو جتنا آگے بڑھنے کا حق ہے اتنا ایک غلام کو بھی حق حاصل ہے۔ امام جعفر صادق کا ارشاد ہے:۔

ان امیرالمومنین اعتق الف مملوک من کد یدہ۔ (وسائل الشیعہ) "امیرالمومنین نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام خرید کر آزاد کئے۔"

حضرت صرف غلاموں کی آزادی ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ایسے غلاموں کی کفالت بھی اپنے ذمہ لے لیتے تھے جو کمسنی، بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کاروکسب نہ کر سکتے تھے اور ہمیشہ ان پر نظر توجہ رکھتے تھے۔ آپ کی شفقت و مرحمت کا یہ عالم تھا کہ انہیں یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی کوتاہی یا سرتابی کی پاداش میں انہیں سزا دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک غلام کو کسی کام کیلئے آواز دی چند بار پکارنے پر جب وہ نہ آیا تو آپ نے باہر جھانکا دیکھا کہ وہ غلام دروازے پر کھڑا ہے فرمایا کہ میں نے تمہیں کتنی بار پکارا ہے کیا تم نے میری آواز نہیں سنی کہا کہ میں اس لئے خاموش رہا کہ مجھے آپ کی طرف سے یہ خطرہ نہ تھا کہ میرے جواب نہ دینے پر آپ مجھے سزا دیں گے۔ حضرت نے یہ سنا تو فرمایا:۔

الحمد للہ الذی جعلنی من تامنہ خلقہ انہض فانت حر لوجہ اللہ۔ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا قرار دیا جس (کے گزند) سے خلق خدا اپنے کو محفوظ سمجھتی ہے۔ اٹھو تم راہ خدا میں آزاد ہو۔"

حضرت کے ایک غلام قنبر مصری تھے جنہیں آپ انتہائی عزیز رکھتے تھے ایک مرتبہ انہیں لے کر بازار گئے اور فرمایا کہ مجھے ایک پیراہن خریدنا ہے اور تمہیں بھی پیراہن کی ضرورت ہے چنانچہ ایک پارچہ فروش کی دکان سے ایک سستا اور ایک اس سے زیادہ قیمت کا کپڑا خرید کیا اور قنبر سے کہا کہ سستا کپڑا میرے لئے رہنے دو اور قیمتی کپڑا تم لے لو۔ قنبر نے کہا کہ آپ میرے آقا ہیں بہتر ہے کہ اچھا کپڑا آپ پہنیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

انت شاب ولک شرۃ الشباب وانا استحی من ربی ان اتفضل "تم جوان ہو اور تم میں جوانی کا ولولہ ہے مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے کہ میں (پوشش میں)

اپنا معیار تم سے بلند رکھوں گا۔"

علیك۔ (مناقب)

شاید یہ بات نرالی اور انوکھی نہ سمجھی جائے کہ حضرت نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے ایک غلام کے لئے عمدہ لباس پسند کیا کیونکہ دنیا میں فرمانرداؤں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ شان وشکوہ کے مظاہروں کے لئے اپنے غلاموں کو آراستہ و پیراستہ رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہی درباروں میں ان کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ان کے جسموں پر زرق برق پوشاکیں سروں پر رنگین صافے کمر میں زرین پٹکے جن میں موتی ٹنکے ہوئے گلے میں سنہری کنٹھے اور ہاتھ میں طلائی یا نقرئی عصا ہوتے تھے۔ ان فاخرہ ملبوسات سے ظاہری نمود ونمائش کا سامان تو ہو جاتا ہے مگر احساس غلامی ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس خاص طرز کی وضع قطع کو غلامی کا نشان سمجھ کر غلامی کا احساس اور اُبھر آتا ہے اور ہر غلام اس سج دھج کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو گا اور اس کی تمنا یہ ہوگی کہ اسے تن ڈھانکنے کے لئے چیتھڑے ملتے مگر اس کے پیروں میں غلامی کی بوجھل زنجیریں نہ ہوتیں۔ امیرالمومنین جو انسانی نفسیات و احساسات پر نظر غائر رکھتے تھے اس خیال سے کہ قنبر کو یہ احساس نہ ہو کہ انہیں عمدہ لباس غلام نوازی کی بنا پر دیا جا رہا ہے یہ کہہ کر ان میں غلامی کا احساس ابھرنے نہیں دیا کہ تم نوجوان ہو اور عمدہ لباس بوڑھوں کے بجائے نوجوانوں کو زیب دیتا ہے اور اس طرح ان کا ذہنی رُخ موڑ کر یہ تاثر دیا کہ سن وسال کے لحاظ سے تو انسان کے طبعی تقاضوں میں فرق ہو سکتا ہے مگر انسان ہونے کے اعتبار سے سب کے احساسات یکساں ہوتے ہیں۔ یہ وہ طرزِ عمل تھا جس نے غلاموں کے قافلے کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، اور ان کے ذہنی شعور کو بیدار کر کے مخفی صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ اسی ذہنی نمود ونمود کے نتیجہ میں غلاموں میں کا ایک طبقہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی سعی وکاوش سے تخت شاہی کی بلندیوں تک پہنچا اور سلطنتوں کا بانی قرار پایا۔

قیدیوں سے برتاؤ

قید وبند کی سزا کا دستور زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور حکومتیں جنہیں مجرم قرار دے لیتی تھیں۔ انہیں قید خانوں میں ڈال دیتی تھیں۔ چنانچہ حضرت یوسف کے زندان میں بند کئے جاتے کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے :۔ فلبث فی السجن بضع سنین۔ "یوسف کئی برس تک قید خانہ میں رہے۔" پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں باغیوں اور جنگی اسیروں کو زیر حراست رکھا جاتا تھا آنحضرت کے بعد خلفاء کے دور میں بھی

لوگوں کو قید و بند کی سزا دی جاتی تھی۔ مگر کسی عمارت میں بند رکھنے کے بجائے انہیں کنوؤں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ امیرالمومنین مجرموں کو کنوؤں میں رکھنے کے بجائے قید خانہ میں رکھتے تھے اور اسلام میں سب سے پہلے آپ ہی نے قید خانہ تعمیر کرایا۔ شیخ علاؤالدین نے تحریر کیا ہے:۔

اول من بنی السجن فی الاسلام علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکان الخلفاء یحبسون فی الآبار۔ (محاضرۃ الاوائل ۔ ص ۱۴۴)	اسلام میں سب سے پہلے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قید خانہ کی بنیاد رکھی اور خلفاء (قیدیوں) کو کنوؤں میں بند کیا کرتے تھے۔"

حضرت نے پہلے سینٹھوں سے ایک احاطہ کی صورت میں محبس تیار کروایا اور پھر اسے پختہ عمارت کی صورت میں بدل دیا۔ علامہ زمخشری نے تحریر کیا ہے:۔

بنی سجنا من قصب فسماہ مانعا فنقبہ اللصوص ثم بنی سجنا من مدر فسماہ مخیسا۔ (فائق ۔ ج ۱ ۔ ص ۱۸۸)	حضرت نے سینٹھوں سے قید خانہ تعمیر کیا اور اس کا نام مانع رکھا اور جب چوروں نے اس میں نقب لگائی تو کنکروں پتھروں سے تعمیر کرایا اور اس کا نام مخیس رکھا۔"

اموی و عباسی دور میں جنہیں قید کی سزا دی جاتی تھی انہیں نہ خانوں میں بند رکھا جاتا تھا نہ کسی کو ان سے ملنے جلنے کی اجازت ہوتی تھی اور نہ انہیں باہر کی دنیا سے باخبر رکھا جاتا تھا ان پر اتنا تشدد کیا جاتا تھا کہ ان سختیوں کو جھیل کر کسی کے زندہ بچ کر نکلنے کی توقع نہ کی جاتی تھی۔

امیرالمومنین کسی کو انتقامی جذبہ کی بناء پر قید کی سزا نہ دیتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کو قید میں ڈالتے تھے جو خیانت و غصب کے مرتکب ہوتے اور یتیموں کے اموال کو خورد برد کرتے تھے۔ انہیں قید میں رکھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے ان کی آزادی کو سلب کر کے ان کی مجرمانہ ذہنیت کی اصلاح کی جائے تاکہ معاشرہ میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکیں۔ ان پر صرف اتنی ہی پابندی عائد کی جاتی تھی جتنی پابندی ان کی ذہنی اصلاح کے لئے ضروری سمجھی جاتی۔ انہیں مقررہ اوقات میں باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ نماز کے اوقات میں جیل کے دروازے عمومی طور پر کھول دیئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ اطمینان و سکون سے نماز ادا کر سکیں۔ موسم کے لحاظ سے گرمیوں میں گرمی کا اور سردیوں میں سردی کا لباس انہیں دیا جاتا۔ اگر وہ آسودہ حال ہوتے تو کھانے پینے کا خرچ انہی پر ڈالا جاتا اور غریب و نادار ہوتے تو بیت المال سے اُن کے مخارج ادا کئے جاتے۔

ذمیوں سے برتاؤ

ذمی، اسلامی مملکت کے وہ یہودی، نصرانی اور مجوسی ہیں جو حکومت کو حسب معاہدہ جزیہ ادا کرتے ہیں اور اس کے عوض حکومت ان کے تمام معاشی و معاشرتی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہے اور ان کے اموال و نفوس اسی طرح محترم قرار پا جاتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے اموال و نفوس۔ اور کسی مسلمان کو ان سے جنگ و قتال کرنے، انہیں گزند پہنچانے اور ان کے اموال چھین لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان ذمیوں کے بارے میں امیرالمومنین کا رویہ نہایت پر شفقت تھا۔ آپ نے ان کے معاشی و معاشرتی حقوق مقرر کئے اور عصبیت و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر انہیں مذہبی مراسم کے بجالانے کی پوری آزادی دی۔ نہ مذہبی اختلاف کی بناء پر ان کی تحقیر و تذلیل گوارا کرتے اور نہ اُن پر ظلم و زیادتی کے روادار ہوتے اور اپنے عمال کو بھی ہدایت فرماتے کہ وہ اُن کے حقوق کا لحاظ رکھیں انہیں کسی جائز حق سے محروم نہ کریں اور نہ ان پر تشدد و سختی کریں۔ چنانچہ مالک اشتر کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا اس میں تحریر فرمایا:۔

ولا تکن علیھم سبعا ضاریا تغتنم اکلھم فانھم صنفان اما اخ لک فی الدین او نظیر لک فی الخلق۔

"ان کے لئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ انہیں نگل جانا غنیمت سمجھتے رہو اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تمہارے دینی بھائی اور دوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا"

حضرت کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ آپ ہر انسان کو انسان ہونے کے اعتبار سے ایک سطح پر سمجھتے تھے۔ اور انسانیت کے رشتہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی اہمیت مذہبی اتحاد کو دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ عقیدہ و مذہب کے اختلاف کی بناء پر نہ کسی کی حق تلفی کی اور نہ کسی سے نفرت و بددلی کا اظہار کیا۔ اسی حسن سلوک کی بناء پر اہل ذمہ ہمیشہ آپ کے دل سے وفادار رہے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

ما اقول فی رجل تحبہ اھل الذمۃ علی تکذیبھم بالنبوۃ

(مقدمہ ابن ابی الحدید ص۸)

"میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں جسے اہل ذمہ دل و جان سے چاہتے تھے حالانکہ وہ (پیغمبر کی) نبوت کی تکذیب کرتے تھے"

ایک دفعہ امیرالمومنین کوفہ کی طرف راہ سپار تھے کہ راستے میں ایک ذمی آپ کا ہم سفر ہو گیا اس نے

حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کدھر جائیں گے۔ فرمایا کوفہ۔ کچھ دور تک دونوں ساتھ چلتے رہے۔ جب اس ذمی نے اپنی منزل کی طرف مڑنا چاہا تو حضرت بھی اس کے ساتھ چل دیئے۔ اس نے کہا کہ یہ راستہ تو کوفہ نہیں جاتا اور آپ کو کوفہ جانا ہے۔ فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ راستہ کوفہ کو نہیں جاتا مگر حسن رفاقت اور ہمسفری کا تقاضا یہ ہے کہ میں چند قدم تمہارے ساتھ جاؤں اور تمہیں رخصت کروں اور ہمارے پیغمبر نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ اس نے کہا کیا واقعاً آپ کے پیغمبر کی یہ تعلیم ہے۔ فرمایا ہاں۔ کہا وہ دین بہترین دین ہے۔ جو ایسے اعلیٰ اخلاق کا درس دیتا ہے۔ اب میں آپ کے ہمراہ کوفہ جاؤں گا۔ چنانچہ وہ حضرت کے ہمراہ کوفہ آیا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امیرالمومنین ہیں تو حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

اوقاف و تعمیرات خیریہ

انسانی اخوت و برادری کا تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف اپنا مفاد ہی پیش نظر نہ رکھے بلکہ بنی نوع انسان کی راحت رسانی کا بھی سامان کرے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لے۔ اسلام نے اسی انسانیت عامہ کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے جہاں اعمال و عبادات پر زور دیا ہے۔ وہاں رفاہ عامہ کے کاموں کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور زکوٰۃ ایسے اہم فریضہ میں ایک مصرف فی سبیل اللہ کا تجویز کیا ہے جو تمام رفاہی امور کو شامل ہے جیسے کنوئیں اور چشمے کھدوانا مسافر خانے اور عبادت گاہیں تعمیر کرنا اور اس قبیل کے دوسرے کام انجام دینا جن سے تمام انسانوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت فائدہ پہنچے۔

امیرالمومنین نے اپنے مختصر دور حکومت میں بغاوت و خانہ جنگی ایسے سنگین مسائل سے دوچار ہونے کے باوجود عوام کی فلاح و بہبود سے چشم پوشی نہیں کی اور پوری تندہی سے رفاہی امور انجام دیتے رہے ابن شہر آشوب نے مناقب میں تحریر کیا ہے کہ امیرالمومنین نے حجاج کے لئے ینبع میں سو چشمے کھودے۔ مدینہ، کوفہ اور بصرہ میں کنوئیں کھدوائے مکہ اور کوفہ کے درمیان سڑک تعمیر کی اور اس پر میلوں کے نشانات نصب کئے ان میلوں پر "ھذا میل علی" تحریر تھا اور حاجیوں کے لئے راہ میں متعدد کنوئیں کھدوائے۔ ایک کانجی ہاؤس تعمیر کروایا۔ جس میں آوارہ جانوروں کو بند کیا جاتا اور انہیں بیت المال سے اتنا چارہ دیا جاتا کہ وہ نہ کمزور اور دبلے ہونے پائیں اور نہ موٹے تازے۔ اگر کسی جانور کا مالک آتا اور ملکیت کا ثبوت مہیا کرتا تو وہ جانور اسے دے دیا جاتا ورنہ اسے وہیں بند رہنے دیا جاتا۔

حضرت نے اپنے ہاتھ سے متعدد چشمے کھودے باغات لگائے اور انہیں فقراء مسلمین پر وقف کردیا۔

چنانچہ حضرت کے ایک آزاد کردہ غلام ابو نیزر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایک مرتبہ اپنی جاگیر عین ابی نیزر اور بغیبغہ پر تشریف لائے۔ میں نے جو روکھا سوکھا کھانا پیش کیا وہ کھایا اوک سے پانی پیا اور پھاوڑہ لے کر گڑھا کھودنا شروع کیا، یہاں تک کہ پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ جب گڑھا کھودتے ہوئے چشمہ پھوٹ نکلا تو فرمایا کہ یہ صدقہ جاریہ ہے اور اپنے ہاتھ سے یہ تحریر قلمبند کی:۔

ھذا ما تصدق عبد اللہ علی	یہ وہ ہے جسے خدا کے بندے علی امیر المومنین
امیر المومنین تصدق بالضیعتین	نے صدقہ کیا ہے یہ دونوں جاگیریں عین ابی نیزر
بعین ابی نیزر و البغیبغہ علی	اور بغیبغہ فقراء مدینہ اور مسافروں کے لئے صدقہ
فقراء اھل المدینۃ و ابن السبیل	کی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اپنے چہرے کو قیامت
لیقی بھما وجھہ حر النار یوم	کے دن جہنم کی آنچ سے بچائیں ان دونوں جاگیروں
القیامۃ لا تباعا ولا توھبا حتی	کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔
یرثھا اللہ وھو خیر الوارثین	یہاں تک کہ اس کی بازگشت اللہ کی طرف ہو اور
الا ان یحتاج الیھما الحسن	وہ بہترین وارث ہے۔ البتہ اگر حسن اور حسین کو
والحسین فھما طلق لھما و	ان کی احتیاج و ضرورت ہو تو ان کے لئے کوئی
لیس لاحد غیرھما۔	بندش نہیں ہے اور ان کے علاوہ اور کسی کو یہ
(معجم البلدان۔ ج ۴ ۔ صفحہ ۱۷۶)	حق نہیں ہے۔"

یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے کہ امام حسین مقروض ہو گئے۔ تو معاویہ نے عین ابی نیزر کو دو لاکھ دینار میں خریدنا چاہا مگر امام حسین نے یہ کہہ کر بیچنے سے انکار کر دیا کہ میرے پدر بزرگوار نے اسے صدقہ کیا تھا تاکہ جہنم کی آنچ سے اللہ انہیں محفوظ رکھے میں ان دونوں جاگیروں کو کسی پر فروخت نہیں کر سکتا۔

چشمۂ ابی نیزر اور بغیبغہ کے علاوہ ینبع، ارباجا، ارینہ، رغد، رزین اور رباح بھی حضرت کی وقف کردہ جاگیریں تھیں۔

حضرت نے تعمیر مساجد کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی۔ مدینہ میں مسجد فتح تعمیر کی اور کوہِ احد کے دامن میں حضرت حمزہ کی قبر کے پاس ایک مسجد بنوائی۔ میقات میں ایک مسجد تعمیر کی اور کوفہ، بصرہ اور آبادان میں مسجدیں تعمیر کیں۔ صفین کی طرف جاتے ہوئے جب اقطار میں منزل کی تو وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔

ملکی انتشار اور اس کے وجوہ و اسباب

امیرالمومنین کی بیعت کی ابھی تکمیل بھی نہ ہوئی تھی کہ تخریبی کاروائیاں شروع ہو گئیں اور آپ کے گرد و پیش سازشوں کا ایک جال بن دیا گیا۔ ہر طرف سے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ایک فتنہ کو کچلا جاتا تو دوسرا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا اسے دبایا جاتا تو کسی اور گوشہ سے نیا فتنہ اُبھر آتا یہاں تک کہ آپ کا مختصر دور حکومت انہی الجھنوں کو سلجھانے اور نت نئے فتنوں کو فرو کرنے میں گزر گیا۔ ان فتنوں اور پیہم خانہ جنگیوں کی بنا پر کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ یہ شورش و بدنظمی سیاسی کمزوری کا نتیجہ تھی اور امیرالمومنین اصول سیاست سے ناواقف اور ملکی نظم و نسق کے قیام سے قاصر تھے۔ بے شک امیرالمومنین کا دور خانہ جنگی و ہنگامہ آرائی کی جولانگاہ بنا رہا اور باہم آویزیوں کی وجہ سے ملکی حدود میں توسیع نہ ہو سکی مگر اس انتشار و پراگندگی کی وجہ سیاسی کمزوری نہ تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا ان ناگوار حالات کا جن کی داغ بیل سابقہ حکومتوں میں پڑ چکی تھی اور اب اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ واقعات شاہد ہیں کہ دولت کی فراوانی اقتدار کی محرک ہوتی ہے چنانچہ فتوحات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے اموال غنائم نے ذہنوں کے رُخ خلافت سے ملوکیت کی طرف موڑ دیئے۔ اور ہوس جاہ و اقتدار نے پوری فضا کو مسموم کر کے رکھ دیا اور کوئی گوشہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ اگر یہی حالات کسی اور مدبر و سیاست اندیش کو پیش آتے تو وہ ان ناگزیر نتائج سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکتا جن نتائج سے حضرت دوچار ہوئے بلکہ بعید نہ تھا کہ دشمن کی ستیزہ کاریوں کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اس کی طوفانی یلغاروں کے آگے سپر انداختہ ہو جاتا۔

امیرالمومنین مسند خلافت پر اس وقت بیٹھے جب مدینہ شورشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اطراف و جوانب اور دوسرے علاقوں سے انقلاب پسند سمٹ کر مدینہ میں جمع تھے۔ سابقہ عمال، حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ معاویہ شام میں خود مختاری کے خواہاں تھے زبیر کوفہ میں اور طلحہ بصرہ میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان سب نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ لشکر کشی کر کے دعوت مبارزت دی اور جنگ کے شعلے بھڑکا کر ملکی امن کو تباہ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ امیرالمومنین کے سیاسی فہم و تدبر اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ فرائض نظم و نسق کی انجام دہی کے ساتھ ان بغاوتوں کو بھی کچلتے رہے حالانکہ جو لوگ آپ کے پرچم کے نیچے جمع تھے ان میں کی اکثریت نہ ہم رنگ و ہم آہنگ تھی اور نہ اسے حضرت سے خلوص ہی تھا۔ ان مختلف الآراء لوگوں کے خیالات و نظریات میں ہم آہنگی پیدا

کرکے انہیں ایک وحدت بنانا اور انہیں لے کر دشمن کی دل بادل فوجوں سے ٹکرا جانا آسان مرحلہ نہ تھا مگر حضرت انہی مختلف عناصر کو لے کر دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور اسے شکست دی اور شامیوں کی شکست بھی یقینی تھی اگر وہ حیلہ و فریب سے حضرت کے لشکر میں پھوٹ نہ ڈلواتے۔ ان معرکوں اور صف آرائیوں کے باوجود حضرت نے جس حد تک ملکی اصلاحات کیں نظم و انضباط قائم کیا اور رعایا کے فلاحی امور پر نظر رکھی وہ آپ کی عظیم سیاسی بصیرت اور نظم و نسق کی اہلیت کا روشن ثبوت ہے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

قد قال بعض المتکلمین من اصحابنا ان سیاسۃ علی علیہ السلام اذا تاملھا المنصف متدبرالھا بالاضافۃ الی احوال التی دفع الیھا مع اصحابہ جرت مجری المعجزات لصعوبۃ الامر و تعذرہ۔

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱۔ ص ۱۸۴)

ہماری جماعت کے بعض متکلمین کا قول ہے کہ اگر کوئی انصاف پسند علی علیہ السلام کی سیاست پر نظر غائر ڈالے اور یہ دیکھے کہ آپ اپنے اصحاب کے ہاتھوں کس صورت حال سے دوچار تھے تو معاملات کی سختی و پیچیدگی کی بناء پر آپ کی سیاست ایک معجزہ سے کم نہ ہوگی۔"

اس ذہنی تبدیلی کے علاوہ مندرجہ ذیل اسباب و عوامل بھی ملکی انتشار و پراگندگی میں کار فرما تھے:۔

پہلا امر یہ تھا کہ حضرت کی سیاست خالص اسلامی سیاست تھی اور آپ کسی صورت میں اخلاقی و اسلامی قدروں کو حکومت و اقتدار پر قربان کرنے کیلئے تیار نہ تھے چہ جائے کہ حیلہ گری و دنیا سازی سے کام لے کر اقتدار کے استحکام کی فکر کرتے یا دو رخی سیاست اور چکنی چپڑی باتوں سے اپنا مقصد نکالتے اگر حضرت بھی وہی طریق کار اختیار کرتے جو آپ کے مخالفین نے دیانت کے تقاضوں سے منہ موڑ کر اختیار کیا تھا تو جہاں آپ کو بظاہر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا وہاں آپ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے مگر اس صورت میں حضرت کی حکومت ملوکیت قرار پاتی اس خلافت کا عملی نمونہ نہ ہوتی جس میں نہ مکر و فریب کی گنجائش ہے اور نہ عوام فریبی کا دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں ایک طرف اخلاقی آئین اور دینی ضوابط کی پابندیاں راستہ روکے کھڑی ہوں اور دوسری طرف ہر قسم کے مکر و فریب اور الزام تراشی میں باک محسوس نہ کیا جاتا ہو وہاں چیخ چیخ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر فتنہ و شر کو ہوا دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مخالفین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ حضرت اپنے مسلمہ اصولوں میں لچک پیدا نہ ہونے دیں گے آپ کے خلاف ہر

طرح کے سیاسی حربوں سے کام لیا اور آپ کی صاف دلی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ احمد حسن الزیات نے تحریر کیا ہے:۔

لا یعرف الهوادة فی الدین	حضرت علی دینی معاملات میں لچک اور دنیوی
ولا المرونة فی الدنیا فکانت	امور میں زمانہ سازی سے آشنا ہی نہ تھے آپ
هذه الخلال الکریمة من	کے یہی بلند عادات و اطوار وُہ تھے جن سے معاویہ
انصار معاویة الداهیة فی	ایسے چالاک نے فضا کو آپ کے خلاف کرنے میں
الخلاف علیه۔ (ادب العربی ص۱۴۲)	مدد لی۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت خواص کی دلجوئی کے لئے عوام کے مفاد کو نظر انداز کرنا گوارا نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کے مفاد کو خواص و سر برآوردہ افراد کے مفادات پر ترجیح دیتے تھے اور اپنے عمال کو بھی یہی ہدایت فرماتے تھے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا:۔ "تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیئے جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر بنا دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جا سکتی ہے۔" یہ طرز عمل جاہ طلب و اقتدار پسند طبیعتوں پر شاق گزرا اور انہوں نے اپنا تفوق و امتیاز برقرار رکھنا چاہا اور جب انہیں معاشرہ میں اپنا مقام حاصل ہوتا نظر نہ آیا تو نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کے درپے ہو گئے اور عوام کو اپنے انقلاب آفرین نعروں سے متاثر کرکے ہنگامہ و شورش پر اتر آئے تاکہ ان کی بالا دستی اور امتیازی حیثیت برقرار رہے۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ حضرت مساویانہ تقسیم کے اصول پر کاربند تھے۔ اور اعلیٰ و ادنیٰ اور عرب و عجم کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ اس سے اگرچہ عوام اور موالی و اعجام کا طبقہ خوش ہو گیا مگر امتیاز پسند لوگوں کے دلوں میں گرہ پڑ گئی۔ وہ جس طرز عمل کے خوگر ہو چکے تھے اس کے خلاف کسی روش کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ وُہ اس پر سیخ پا ہوئے پر زور احتجاج کیا اور جب ان کی آواز موثر ثابت نہ ہوئی تو شام کا رُخ کر لیا۔ جہاں حضرت کے خلاف سازشوں کی پخت و پز ہوتی تھی۔ فضیل ابن جعدہ کہتے ہیں:۔

اکد الاسباب کان فی تقاعد	امیر المومنین سے عرب کی روگردانی
العرب عن امیر المومنین امر	کا اصل سبب مال تھا حضرت اعلیٰ کو
المال فانه لم یکن یفضل	ادنیٰ پر اور عربی کو عجمی پر ترجیح نہ دیتے

شریفا علی مشروف ولا عربیا علی	تھے اور نہ حکمرانوں کی طرح امراء و
عجمی ولا یصانع الرؤساء و امراء	سردارانِ قبائل کی آؤ بھگت کرتے
القبائل کما یصنع الملوک ولا	تھے اور نہ کسی کو اپنی طرف مائل کرتے
یستمیل احدا الی نفسه وکان معاویة	تھے اور معاویہ کی روش اس کے برعکس
بخلاف ذلک فترک الناس علیا و	تھی اس لئے لوگ علی کو چھوڑ کر معاویہ
التحقوا بمعاویة (بحار الانوار۔ ج۹۔ ص۵۳۳)	سے جا ملے"

جب امیر المومنین سے یہ کہا گیا کہ جن لوگوں سے فتنہ برپا کرنے کا اندیشہ ہے یا معاویہ سے وابستہ ہو جانے کا خطرہ ہے انہیں داد و دہش سے روک لیں تو آپ نے فرمایا۔

اتامرونی ان اطلب النصر	کیا تم مجھے اس امر کا پابند کرنا چاہتے ہو کہ بے
بالجور لا واللہ لا افعل ما	راہروی سے کچھ لوگوں کی امداد حاصل کروں تو خدا
طلعت شمس وما لاح فی	کی قسم جب تک سورج نکلتا اور ستارہ آسمان پر
السماء نجم واللہ لوکان مالہم	چمکتا رہے گا میں ایسا نہیں کروں گا اگر مسلمانوں کا
لی لواسیت بینھم وکیف و	مال میرا ذاتی مال ہوتا جب بھی میں اسے سب پر برابر
انما ھو اموالھم (مناقب۔ ج۲۔ ص۲۳)	تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال انہی کا ہے"

امیر المومنین کی اس سیرت و روش کے مقابلہ میں معاویہ کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ سیاسی مقصد براری کے لئے بے دریغ دولت لٹاتے اور خزانوں کے منہ کھول کر لوگوں کے دین و ایمان کا سودا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جاریہ ابن قدامہ، احنف ابن قیس، جون ابن قتادہ اور حتات مجاشعی معاویہ کے پاس آئے معاویہ نے حتات کو ستر ہزار اور دوسروں کو ایک ایک لاکھ درہم دیئے۔ حتات کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے معاویہ سے کہا کہ تم نے مجھے میرے قبیلہ میں رسوا کرنے کا سامان کیا ہے اوروں کو ایک ایک لاکھ اور مجھے ستر ہزار درہم دیئے ہیں۔ معاویہ نے کہا:۔

انی اشتریت من القوم دینھم۔ — میں نے ان لوگوں سے ان کا دین خرید کیا ہے"

(تاریخ کامل۔ ج۳۔ ص۲۳۱)

حتات نے کہا کہ پھر میرا دین بھی خرید لیجئے۔

اب جہاں یہ صورت ہو کہ درہم و دینار کے بدلے دین و ایمان کا کھلم کھلا سودا ہوتا ہو اور لوگ روپیہ پیسہ کے عوض دین بیچنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں یہ توقع کیونکر کی جاسکتی تھی کہ امیر المومنین کی محتاط

روش انہیں خوش رکھ سکے گی اور وہ مال ودولت کو ٹھکرا کر محض دینی جذبہ کے زیر اثر حق سے وابستہ رہیں گے۔

چوتھا سبب یہ تھا کہ وہ امور جو خلاف شرع ہوتے ہوئے شرعی صورت اختیار کر چکے تھے اور دین کا جزو سمجھے جا رہے تھے۔ حضرت اپنی منصبی ذمہ داری کی بناء پر انہیں شرعی جواز دینے کے لئے تیار نہ تھے اور عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں اُن کے ذہنوں میں اتر جاتی ہیں ان سے دستبردار ہونا گوارا نہیں کرتے اور نہ اس کے خلاف کوئی آواز سننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت نے منبر پر کچھ کہہ دیا تو عبیدۃ السلمانی نے کھڑے ہو کر کہا:۔

رایك مع الجماعة احب الینا من رایك وحدك۔	آپ ایک اکیلے کی رائے سے ہمیں آپ کی وُہ رائے زیادہ پسند ہے جو جماعت کی رائے کے موافق ہو"
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۸۴)	

اس اختلاف رائے نے بھی انتشار کے اسباب فراہم کئے اور لوگ ایسی بات کو جو ان کے پہلے طرز عمل کے خلاف ہوتی لے اڑتے اور لوگوں میں بدظنی پیدا کر کے فتنہ و شر پھیلاتے۔

پانچواں سبب یہ تھا کہ حضرت نے برسر اقتدار آتے ہی ان تمام عمال وحکام کی برطرفی کا اعلان کر دیا جو سابقہ حکومتوں کی طرف سے متعین تھے اسکا ردعمل یہ ہوا کہ ان عمال نے ان لوگوں سے جو عہدوں کے امیدوار تھے اور کامیاب نہ ہو سکے تھے گٹھ جوڑ کر کے قصاص خون عثمان کی تحریک چلائی اور حضرت کے خلاف محاذ جنگ قائم کر کے ملکی نظم ونسق کو تباہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔

ان تمام محرکات فتنہ وانتشار کے باوجود حضرت نے جس حد تک ملکی حالات کو بگڑنے سے بچایا وُہ صرف آپ کی سیاسی بصیرت معاملہ فہمی اور حسن تدبر کا نتیجہ تھا ورنہ شورش پسندوں نے تفرقہ وانتشار پھیلانے اور ملکی نظم کو درہم برہم کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔

عمال حکومت کی برطرفی اور اس کے وجوہ

جب امیرالمومنین برسر اقتدار آئے تو مملکت کے صوبوں پر سابقہ حکومت کے ان عمال وحکام کا عمل دخل تھا جنہوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ جس طرح چاہتے رعایا کو ستاتے۔ اور جو چاہتے کر گزرتے تھے نہ مرکز سے بازپرس کا اندیشہ تھا نہ پوچھ گچھ کی فکر۔ مسلمان ان کے مظالم سے تنگ

آئے ہوئے تھے اور استبدادی گرفت میں جکڑے ہوئے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ حضرت نے عنانِ حکومت ہاتھوں میں لیتے ہی انہیں برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دینی سیاست کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان لوگوں کو یک قلم معزول کر دیا جائے۔ جنہوں نے لوٹ کھسوٹ اپنا وتیرہ اور ظلم و تعدی اپنا شیوہ بنا رکھا تھا۔

اس عام معزولی کی بھنک مغیرہ ابن شعبہ کے کانوں میں پڑی تو وہ حضرت کے پاس آیا اور کہا، میں آپ کا ہمدرد و بہی خواہ ہوں اور اس ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کو یہ مشورہ دوں کہ آپ فی الحال معاویہ، عبداللہ ابن عامر اور عہد عثمانی کے دوسرے عمال کو اُن کے عہدوں پر بحال رہنے دیں اور جب وہ بیعت کر کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جائیں تو پھر جیسا چاہیں ویسا قدم اٹھائیں۔ خواہ انہیں بحال رہنے دیں خواہ انہیں برطرف کر دیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری یہ رائے دنیا سازی کے اعتبار سے موزون و مناسب ہے لیکن :-

واللہ لا اداھن فی دینی و لا اعطی الدنیة فی امری۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۶۱)	خدا کی قسم میں دین میں دو رخی نہیں برتوں گا اور نہ اپنی حکومت میں ذلت و پستی گوارا کروں گا۔

اب مغیرہ کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی منہ لٹکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور واپس چلا آیا۔ اسے اپنے مشورہ کی بے قدری کا احساس تو تھا ہی دوسرے دن پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے کل جو رائے دی وہ صائب نہ تھی۔ مزید غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہیں معزول کر دینا ہی بہتر رہے گا۔ امیرالمومنین ابھی اس "یک بام و دو ہوا" پر حیرت زدہ تھے کہ ابن عباس حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ مغیرہ کس مقصد سے آپ کے ہاں آیا تھا فرمایا کہ وہ مجھے مشورہ دینے کے لئے کل بھی آیا تھا اور آج بھی آیا ہے۔ کل اس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں سابقہ عمال کو برقرار رہنے دوں اور ان میں کوئی ردو بدل نہ کروں اور آج یہ رائے دی ہے کہ میں انہیں معزول کر دوں۔ ابن عباس نے کہا کہ اس نے جو رائے کل دی تھی اس میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اور آج کی رائے کل کی رائے کے ٹھکرائے جانے کا ردعمل اور مکر و فریب پر مبنی ہے۔ میں اس کی پہلی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ ابھی معاویہ کو ان کے عہدہ پر بحال رہنے دیں اور جب وہ بیعت کر کے اطاعت کا اقرار کر لیں تو انہیں برطرف کر دیں۔ حضرت نے فرمایا :-

ان اقررت معاویة مافی یدہ کنت متخذ المضلین عضدا۔	اگر میں معاویہ کو اس کے عہدہ پر باقی رہنے دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں گمراہ کرنے

(استیعاب۔ ج ۳۔ ص۲۵۹)   والوں کو اپنا دست و بازو بنا رہا ہوں۔

اسی طرح زیاد ابن حنظلہ تیمی نے بھی کچھ ایسا ہی مشورہ دیا مگر حضرت نے ان مشوروں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور ان مشیروں کی رائے کے خلاف اپنی اصابت رائے پر بھروسا کرتے ہوئے انہیں یک لخت معزول کرنے کا مشورہ بحال رکھا۔

بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اگر حضرت ان مشیروں کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے اور ان کے تجربہ معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے تو ان الجھنوں میں گرفتار نہ ہوتے جن الجھنوں سے انہیں دوچار ہونا پڑا اور جن خانہ جنگیوں میں ان کا دورِ خلافت گزرا اس کی نوبت نہ آتی مگر یہ صرف ناپختہ ذہنوں کی خام خیالی ہے۔ اگر حضرت ان کے مشوروں پر چلتے اور عمال کو ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیتے جب بھی الجھنوں اور پریشانیوں سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا اور مملکت کو اُن کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ رکھا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ عمال صرف معزولی کی بنا پر آمادۂ مخالفت نہ ہوئے تھے بلکہ پہلے سے مخالف چلے آرہے تھے۔ اگر انہیں عہدوں پر باقی رہنے بھی دیا جاتا جب بھی حکومت اور ان کے درمیان ذہنی تصادم اور نظریاتی ٹکراؤ رہتا اور وہ حکومت کو اپنے مادی اغراض کی راہ میں حائل سمجھ کر اس کے خلاف اندر ہی اندر سازشوں کے جال بچھاتے امورِ مملکت میں رخنہ انداز ہوتے اور حضرت کے لئے مسلسل پریشانی و دردِ سری کا باعث بنے رہتے۔ جب بحالی و برطرفی دونوں صورتوں میں پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا سامنا تھا تو آپ کی شرعی ذمہ داریوں کا تقاضا یہی تھا کہ اسی صورت کو اختیار کرتے جو دینی قدروں اور اسلامی تقاضوں سے موافقت رکھتی ہو خواہ اس کے لئے کتنی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا اور تیز آندھیوں اور طوفانوں سے ٹکرانا پڑتا۔ چنانچہ اس معزولی کے چند وجوہ یہ تھے۔ جن سے اس اقدام کے حق بجانب اور دینی سیاست سے ہم آہنگ ہونے پر ثبوت لایا جا سکتا ہے۔

اولاً یہ کہ امیرالمومنین کا مقصد اولین اسلامی حکومت کا قیام اور دینی نظام کا نفاذ تھا۔ اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ خود غرضی مفاد پرستی اور زر اندوزی کی راہیں بند کر کے معاشرہ کی تطہیر کی جائے اور جو غلط سیاست ملک پر چھائی ہوئی تھی اس کا پورا ڈھانچا بدل دیا جائے اور یہ مقصد صرف مسند خلافت کے خالی ہونے سے حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ جب تک ان عاملوں کو بھی الگ نہ کیا جاتا جو سیاسی جوڑ توڑ کا سہارا لے کر اقتدار پر چھائے ہوئے اور کنبہ پروری کے نتیجہ میں عہدوں پر قابض چلے آرہے تھے تاریخ شاہد ہے کہ ان شوریدہ پشت و شوریدہ سر عمال کی غلط کارانہ روش کے نتیجہ میں اسلامی طرزِ معاشرت کے نقوش مٹتے جارہے تھے۔ حرص و ہوس نے استحصال کا بازار گرم کر رکھا تھا اور دنیا استبدادی شکنجوں

میں جکڑی ہوئی گراہ رہی تھی۔ اگر ان لوگوں کو کلیدی عہدوں پر برقرار رہنے دیا جاتا تو اسلامی حکومت کی تشکیل ممکن ہی نہ تھی کیونکہ اسلامی حکومت دینی عناصر ہی کے ذریعہ پروان چڑھ سکتی ہے جو اسلام اور اس کے احکام سے واقف دین اور اس کے آئین کے پابند اور اسلامی و اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے عادی ہوں۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا حضرت عثمان سے یہی تو مطالبہ تھا کہ وہ ان خود سر عاملوں کو معزول کر کے ان کے بجائے انصاف پرور نیک کردار اور خوش اطوار لوگوں کو عامل مقرر کریں اور جب ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا تو انہوں نے تبدیلی حالات کے لئے انقلابی قدم اٹھایا۔ اگر حضرت ان لوگوں کی رائے کے خلاف سابقہ نظام حکومت علیٰ حالہ باقی رہنے دیتے تو پھر اسی ظلم و سفاکی اور بے راہروی کا دور شروع ہو جاتا جو اس انقلاب کا محرک تھا اور وہ انقلاب پسند جنہوں نے سابقہ حکومت کا تختہ الٹا تھا اس حکومت کی تبدیلی کے بھی درپے ہو جاتے اور نتیجہ میں خون خرابہ ہوتا جنگ کے شعلے بھڑک اٹھتے اور اس حکومت کا بھی وہی حشر ہوتا جو سابقہ حکومت کا ہو چکا تھا۔

تیسرے یہ کہ امیرالمومنین خود ان عمال کے طور طریقوں کے شاکی تھے اور ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے اور حضرت عثمان کو متعدد بار یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ معاویہ اور دوسرے خود سر عمال کو برطرف کر دیں۔ مگر حضرت عثمان حیل وحجت سے کام لیتے اور معاویہ کے بارے میں یہ عذر پیش کر دیتے کہ وہ حضرت عمر کے مقرر کردہ والیٔ شام ہیں۔ اگر حضرت برسر اقتدار آنے کے بعد ان عمال کو اُن کے عہدوں پر برقرار رہنے دیتے تو عوام اس سے یہ تاثر لیتے کہ عمال کی برطرفی کا مطالبہ مفاد عامہ کے لئے نہیں تھا بلکہ آپ اصلاح حالات کی آڑ میں حکومت کا تختہ الٹ کر خود برسرِ اقتدار آنا چاہتے تھے۔ اور جب مقصد میں کامیابی ہوگئی اور اقتدار حاصل ہو گیا تو سیاسی مصالح کی بنا پر معاویہ اور دوسرے عمال کی علیحدگی ضروری نہیں سمجھی اور محض اس خیال سے کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں انہیں عہدوں پر بحال رہنے دیا۔ یہ روش ایک اقتدار پسند و دنیا پرست کی تو ہو سکتی ہے جو غلط سیاست اور غیر اسلامی وسائل کا سہارا لے کر اپنے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنا چاہتا ہے مگر یہ اس کا کردار نہیں ہو سکتا جو اقتدار سے زیادہ اصول و دیانت کی بقا عزیز رکھتا ہو اور آئین اسلام سے سرمو انحراف گوارا نہ کرتا ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر حضرت اپنی حکومت و سیادت کے استحکام کے لئے معاویہ اور دوسرے عمال کو عہدوں پر بحال رکھتے تو یہ امر آپ کی سیاسی کمزوری پر محمول کیا جاتا اور کہنے والے یہی کہتے کہ آپ نے نظریاتی اختلاف کے باوجود ان لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کے اثر و نفوذ کو دیکھتے ہوئے انہیں برطرف کرنے

کی جرأت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دوسرے لوگ بھی اس کمزوری کو تاڑ کر جا و بیجا مطالبات پیش کرتے اور مقصد برآری کے لئے ان تمام ہتھکنڈوں کو کام میں لاتے جو کمزور حکومت کو دبانے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں اور انجام کار حکومت ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ملک میں خلفشار بڑھتا، امن عامہ تباہ ہوتا نظم ونسق کا شیرازہ بکھرتا اور اس حکومت کا حشر بھی پہلی حکومت سے مختلف نہ ہوتا۔

پانچویں یہ کہ امیرالمومنین نے خلافت کو پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ قبول کیا تھا جس کے بعد عمال سے سرزد ہونے والے مظالم سے انہیں بے تعلق نہیں سمجھا جاسکتا تھا بلکہ بڑی حد تک ان کے افعال واعمال کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی کہ انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ان عمال کو لوگوں پر مسلط رہنے دیا جو استحصال پسند اور ظلم وستمرانی کے خوگر تھے لہٰذا انہیں عہدوں پر برقرار رہنے دینا یا ان کی برطرفی میں تاخیر کرنا ان کے مظالم میں شرکت کے مترادف ہوتا اور حضرت یہ گوارا نہ کرسکتے تھے کہ ان کی غلط کاریوں کا ذمہ لے کر اپنا دامن داغدار کریں اس لئے آپ نے پہلے ہی مرحلہ پر ان غلط کار عمال سے اظہار بیزاری اور ان کے موقف سے بے تعلقی کا اعلان کرتے ہوئے ان کی معزولی کو ضروری قرار دے لیا۔

چھٹے یہ کہ حضرت علی اور معاویہ دو مختلف و متضاد گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ معاویہ اس گروہ کی فرد تھے جو دینی پابندیوں سے بے نیاز وقتی مصلحتوں کا پرستار اور مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر حیلہ وفریب کو جائز سمجھتا تھا۔ اس کے برخلاف امیرالمومنین کی سیاست مصلحت کی تہوں کے نیچے دبی ہوئی نہ تھی اور نہ ان کی سیاست کے اجزائے ترکیبی میں عیاری وفریب کاری داخل تھی۔ اس ذہنی تضاد اور نظریاتی اختلاف کی بناء پر معاویہ اپنے عہدہ کی بحالی پر مطمئن نہ رہ سکتے تھے بلکہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ حضرت علی انہیں اس منصب پر باقی رکھنا کبھی گوارا نہ کریں گے اور ایک نہ ایک دن انہیں امارت سے معزول کر دیں گے۔ اس صورت میں اگر انہیں کچھ دنوں کے لئے امارت پر برقرار رہنے دیا جاتا تو وہ یہ عرصہ مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہو کر خاموشی سے نہ گزارتے بلکہ اپنے وقتی اقتدار سے فائدہ اٹھاتے مالی وعددی طاقت بڑھاتے اور ضرورت محسوس کرتے تو ہمسایہ مملکت روم سے جنگی معاہدہ کرتے۔ اس متوقع صورت کے پیش نظر کیا یہی قرین مصلحت نہ تھا کہ انہیں مزید قوت وتوانائی کے فراہم کرنے کا موقع دیئے بغیر معزول کر دیا جاتا۔

ساتویں یہ کہ معاویہ کے پیش نظر صرف امارت شام کا تحفظ نہ تھا بلکہ تمام قلمرو اسلام پر اپنا جھنڈا لہرانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے حضرت عثمان کی زندگی ہی میں اپنے گرد اعوان وانصار کا جم غفیر جمع کر لیا تھا تاکہ جب موقع دیکھیں ان مددگاروں کا سہارا لے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ فضا حضرت عثمان کے خلاف ہو چکی ہے تو انہوں نے اس

موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور حضرت عثمان سے کہا کہ آپ میرے ہمراہ شام چلئے وہاں کے باشندے آپ کے محافظ و سینہ سپر ہوں گے اور آپ کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچ سکے گا اور اگر مدینہ میں رہے تو شورش پسند آپ کا کام تمام کر دیں گے۔ معاویہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح حضرت عثمان کو مرکز سے الگ کر کے ایک گوشہ میں بٹھا دیں اور ان کے جیتے جی مملکت کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیں تا کہ اس عارضی اقتدار کو آئندہ مستقل اقتدار کی صورت میں بے روک ٹوک منتقل کیا جا سکے مگر حضرت عثمان نے شام جانے سے انکار کر دیا اور یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ اور جب حضرت عثمان کے قتل کا حادثہ رونما ہوا تو انہوں نے اس قتل کو حصولِ اقتدار کا ذریعہ قرار دے لیا اور قصاص کے نام پر اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ اگر حضرت ان سے کوئی تعرض نہ کرتے اور انہیں امارت شام پر برقرار رہنے دیتے تو وہ امارت شام پر قناعت کر کے خاموش نہ بیٹھے رہتے بلکہ مرکز پر اپنی قوت و طاقت کا دباؤ ڈالتے جھوٹے سچے وعدوں سے لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتے اور عوام میں خوف و دہشت پھیلا کر حکومت کو ناکام بناتے اگر اس سے کام نہ چلتا تو ہنگامہ آرائی کے لئے کوئی اور عذر تلاش کرتے اور کچھ نہ سہی تو قتل عثمان کے سلسلہ میں حضرت کو موردِ الزام ٹھہراتے۔ اگر حضرت اس خون سے اپنی برأت کا ثبوت دیتے تو یہ شوشہ چھوڑتے کہ حضرت کا انتخاب غیر آئینی ہے کیونکہ یہ صرف اہل مدینہ کا انتخاب ہے اور انتخاب کا حق اہلِ مدینہ ہی کو کیوں ہو اہل شام کو کیوں نہ ہو جب کہ شام اپنی کثرت و طاقت کے لحاظ مرکزیت کا زیادہ سزاوار ہے۔ غرض انہیں منصب پر برقرار رکھنے کی صورت میں بھی ان کی الزام تراشی و حیلہ طرازی سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ جب منصب کی بحالی کی صورت میں بھی ان کی فتنہ انگیزیوں اور افترا پردازیوں سے محفوظ نہ رہا جا سکتا تھا تو انہیں منصب پر باقی رکھنے میں مصلحت ہی کیا ہو سکتی تھی کہ ان کی معزولی عمل میں نہ لائی جاتی۔

آٹھویں یہ کہ یہ عمال نظم و ضبط کی اہلیت اور عوام سے جذبۂ ہمدردی کی بناء پر منتخب نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا انتخاب خلیفۂ وقت سے وابستگی اور خاندانی قرابت کا مرہونِ منت تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان نے کوفہ سے عمار یاسر کو معزول کر کے اپنے مادری بھائی ولید ابن عقبہ کو مقرر کیا بصرہ سے ابو موسیٰ کو علیحدہ کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ ابن عامر کو متعین کیا۔ مصر سے عمرو ابن عاص کو الگ کر کے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ ابن سعد کو مقرر کیا اور اسی طرح دوسرے عمال بھی زیادہ تر انہی کے خاندان کے افراد تھے سعید ابن مسیب کہتے ہیں :۔

كان كثيرا ما يولى بنى امية ممن لم يكن له صحبة فكان يجئ	حضرت عثمان بیشتر بنی امیہ کے انہی افراد کو امارت کے لئے نامزد کرتے تھے جنہیں پیغمبر کی صحبت کا

من امر امراته ماینکره اصحاب محمد۔ (تاریخ الخلفاء ۔ ص۱۱۰)

شرف حاصل نہ ہوتا تھا اور اُن کے بارے میں ایسی خبریں آتی تھیں جنہیں اصحاب پیغمبر ناپسند کرتے تھے "

جب یہ انتخاب جنبہ داری خویش پروری اور اہل افراد کی حق تلفی کے نتیجہ میں عمل میں لایا گیا تو اسے جوں کا توں باقی رکھنا ایک غلط اقدام کی تائید کے مترادف ہوتا اور امیرالمومنین سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی امر باطل کی تائید کریں گے خواہ اس سے آپ کی مخالف جماعت میں اضافہ ہوتا۔ یا مملکت کے استحکام کو دھچکا لگتا۔

نویں یہ کہ امیرالمومنین یہ دیکھتے چلے آرہے تھے کہ سابقہ حکومتوں میں انصار و بنی ہاشم کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ جس مجلس شوریٰ کے نتیجہ میں حضرت عثمان منتخب ہوئے تھے اس میں بھی انصار کا کوئی حصہ نہ تھا اور حضرت عثمان نے بھی عہدوں کی تقسیم کا معیار اموِیت کو قرار دے لیا تھا۔ جس سے ایک طرف انصار و بنی ہاشم کو اپنے حق سے محرومی کا احساس ہو گیا تھا اور دوسری طرف گروہی عصبیت ابھر آئی تھی اگر اس گروہی و قبائلی معیار کے بجائے اہلیت واستعداد کار کو معیار قرار دیا جاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انصار اور بنی ہاشم میں سے کوئی منتخب نہ ہوتا جب کہ ان میں اہل افراد کی کوئی کمی نہ تھی۔ اب اس کا تدارک یوں ہی ہو سکتا تھا کہ سابقہ عمال کو معزول کر کے صرف اہلیت کی بنا د پر انتخاب عمل میں لایا جاتا تاکہ امارت ایک طبقہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے اور نہ اہل افراد کو حق سے محرومی کا احساس ہوتے پائے خواہ کوئی مہاجر ہو یا انصار ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی۔

دسویں یہ کہ یہ عمال باوجودیکہ حضرت عثمان کے ساختہ پرداختہ اور احسان پروردہ تھے مگر ان کے محاصرہ کے دنوں میں جو ایک مہینہ انیس دن تک رہا کسی ایک نے بھی ان سے تعاون نہ کیا حالانکہ ان کے پاس فوج بھی تھی اور سامان حرب بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے اپنے محسن و سرپرست کے ساتھ کچھ نہ کیا تو امیرالمومنین مملکت کے نظم و انصرام کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ آڑے وقت پر کام آئیں گے۔ یا کسی مہم میں ہاتھ بٹائیں گے۔ البتہ جب حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو ان میں سے چند ایک قصاص کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ انہیں اس وقت اپنے صوبوں سے نکلنا چاہئے تھا جب ان کا نکلنا مفید ثابت ہو سکتا تھا مگر اس وقت سب منقار زیر پر دبکے پڑے رہے اور اس پہلو تہی کے جواز میں کوئی معقول عذر بھی پیش نہ کر سکے یہاں تک کہ معاویہ جو سخن سازی میں مہارت رکھتے تھے اور موقع پر بات بنا لینا بھی خوب جانتے تھے وہ بھی کوئی بات نہ بنا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابوالطفیل کنانی ان کے ہاں آیا معاویہ نے اس

سے کہا کہ تم قتل عثمان کے موقع پر کہاں تھے کہا تھا تو مدینہ ہی میں مگر میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ کہا کہ تم پر ان کی نصرت وحمایت واجب تھی اور تم نے اس سے کنارہ کشی کی۔ ابو الطفیل نے کہا :۔

منحنی مامنعك اذ تربص به	جو مانع تمہارے لئے تھا وہی مانع میرے لئے تھا
ریب المنون وانت بالشام۔	تم شام میں بیٹھے رہے اور مصیبتوں کے بادل اُن کے سر پر منڈلاتے رہے"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص۶۴)

کہا کہ میری یہ نصرت و امداد کیا کم تھی کہ میں ان کے خون کے قصاص کے لئے لڑا۔ کہا کہ تمہارا اور عثمان کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا جعدی نے کہا ہے :۔

لا لفینك بعد الموت تندبنی	وفی حیاتی مازودتنی زادا
مر گیا میں تو زمانے نے بہت یاد کیا	زیست میں کوئی مرے حال کا پرساں نہ ہُوا

اب ان اجمال میں سے چند نمایاں افراد کا اجمالی تعارف درج کیا جاتا ہے تاکہ ہمارے موقف کی مزید وضاحت ہو سکے۔

معاویہ ابن ابی سفیان

معاویہ ہند بنت عتبہ کے بطن سے ابو سفیان ابن حرب کے فرزند تھے۔ ہند پہلے فاکہہ ابن مغیرہ کی زوجیت میں تھی۔ جب فاکہہ بنی جذیمہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو حفص ابن مغیرہ سے عقد کر لیا اور حفص کے مرنے کے بعد ابو سفیان کے نکاح میں آئی۔ ہند مکہ کی بدنام عورتوں میں سرفہرست اور اسلام دشمنی میں پیش پیش تھی۔ غزوۂ اُحد میں جنگی ترانہ گا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتی رہی اور عم رسول حضرت حمزہ کا کلیجہ دانتوں سے چبا کر وحشت و بربریت کی مثال قائم کی اور اکلۃ الاکباد (جگر خوارہ) کا لقب پایا۔ اسی طرح ابو سفیان بھی پیغمبر کا بدترین دشمن اور اس سازش میں شریک تھا۔ جس سازش کے نتیجہ میں پیغمبر اکرم کو گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کرنا پڑی۔ ہجرت کے بعد بھی آنحضرت کے خلاف فوجکشی کرتا رہا اور بدر اُحد اور احزاب کی جنگیں لڑیں۔ جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو اپنے بیٹے معاویہ کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تاکہ اپنا اور اپنی اولاد کا تحفظ کر سکے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر کیا ہے :۔

اسلم ھو و ابوہ یوم فتح مکة	معاویہ اپنے باپ ابو سفیان کے ساتھ فتح مکہ کے
وشھد حنینا وکان من المولفة	دن اسلام لایا اور غزوۂ حنین میں شریک ہوا اور

قلوبھم۔ (تاریخ الخلفاء۔ ص۱۳۵) اس کا شمار مولفۃ القلوب میں ہوتا ہے۔"

مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی صداقت سے متاثر ہوئے بغیر اسلامی سطوت سے مرعوب ہو کر یا جان کے ڈر سے اسلام کی آڑ لے لی تھی اور جس طرح ہر مفتوح فاتح کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے انہوں نے بھی پیغمبر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چنانچہ امیرالمومنین نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا۔ واللہ ما اسلموا ولکن استسلموا۔" خدا کی قسم یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے بلکہ سر جھکا دیئے تھے۔"

اس ظاہری اسلام کے باوجود آنحضرت نے انہیں اسلامی جماعت میں شامل کر لیا تاکہ رفتہ رفتہ اسلام سے متاثر اور اس کے تعلیمات و معارف سے آگاہ ہو سکیں بلکہ ان کی دل جوئی کے لئے عام مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ مراعات برتتے۔ چنانچہ غزوہ حنین کے مال غنیمت میں سے عام مسلمانوں سے زیادہ انہیں دیا اور ابوسفیان اور اس کے دونوں بیٹوں یزید اور معاویہ کو بھی مولفۃ القلوب والا حصہ یعنی سو سو اونٹ دیئے جب کہ عام مسلمانوں کو چار چار اونٹ دیئے گئے تھے۔ حالانکہ ابوسفیان مسلمانوں کی وقتی ہزیمت پر بغلیں بجاتا تھا اور خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

شام پر معاویہ کے تسلط و اقتدار کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ حضرت ابوبکر نے شام پر لشکر کشی کا ارادہ کیا اور عمرو ابن عاص، شرجیل ابن حسنہ، ابوعبیدہ جراح اور یزید ابن ابی سفیان کی زیر کمان چار لشکر ترتیب دیئے اور ان سرداران لشکر سے یہ معاہدہ کیا کہ فتح کے بعد ابوعبیدہ حمص پر، شرجیل ابن حسنہ اردن پر، عمرو ابن عاص اور علقمہ ابن مجزز فلسطین پر اور یزید ابن ابی سفیان دمشق پر حاکم ہوں گے۔ اس قرارداد کے بعد چاروں لشکر مختلف راستوں سے روانہ ہوئے اور مقام یرموک میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کے سامنے رومیوں کا لشکر گراں تھا جس کے مقابلہ کی طاقت اپنے اندر نہ پاتے ہوئے انہوں نے حضرت ابوبکر سے مزید کمک طلب کی حضرت ابوبکر نے خالد ابن ولید کو نو ہزار کے لشکر کے ساتھ عراق سے یرموک جانے کا حکم دیا اور لشکر کی تعداد چالیس ہزار یا زیادہ سے زیادہ چھیالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ یزید کے لشکر میں سہیل ابن عمرو اور مکہ کے چند شیوخ مشیر کی حیثیت سے شامل تھے اور علم لشکر معاویہ کے ہاتھ میں تھا۔

اس جنگ کے دوران ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ھ کو حضرت ابوبکر وفات پا گئے اور حکومت حضرت عمر کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کے دور میں ماہ رجب ۱۴ھ کو چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد دمشق فتح ہو گیا اور یزید ابن ابی سفیان دمشق کا حاکم قرار پایا۔ ۱۸ھ میں یزید طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا اور حضرت عمر نے اس کی جگہ معاویہ ابن ابی سفیان کو جو دمشق میں موجود تھے امیر مقرر کر دیا۔ حضرت عمر کے انتقال کے بعد ۲۳ھ میں جب حضرت عثمان برسر اقتدار آئے تو انہوں نے دمشق کے علاوہ اردن فلسطین لبنان حمص

اور قنسرین بھی ان کے حوالے کر دیئے اور جس اقتدار کی طرح حضرت ابو بکر نے ڈالی تھی حضرت عمر نے اسے عملی صورت دی اور حضرت عثمان نے اسے تکمیل تک پہنچایا۔

یہ امر انتہائی تعجب خیز ہے کہ وہ اکابر صحابہ جن کی اہلیت کار مسلم اور اسلامی خدمات ناقابلِ انکار ہیں۔ نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور ان لوگوں کو جو اسلام کے دشمن بنی ہاشم کے دیرینہ معاند اور پیغمبر اسلام کے مقابلہ میں صف آرا رہے اور فتح مکہ کے موقع پر مجبوری کی صورت میں اسلام لائے۔ شام ایسی وسیع مملکت کا با اختیار حاکم بنا دیا جاتا ہے گویا۔

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

حضرت عمر نے معاویہ کو صرف امارتِ شام کا عہدہ ہی سپرد نہیں کیا بلکہ ان کے اقتدار کے دوام و استحکام کی بھی تدبیر کر گئے اور لوگوں کو یہ ہدایت دے گئے کہ وہ حالات میں تبدیلی رونما ہوتے دیکھیں تو ان کے گرد جمع ہو جائیں۔ چنانچہ ابن حجر مکی تحریر کرتے ہیں :۔

ان عمر حض الناس علی اتباع معاویۃ والهجرة الیہ الی الشام اذا وقعت فرقۃ	حضرت عمر لوگوں کو معاویہ کی پیروی پر ابھارتے اور انہیں آمادہ کرتے کہ جب آپس میں پھوٹ پڑے تو ہجرت کر کے معاویہ کے پاس شام چلے جائیں۔"
(تطہیر الجنان۔ ص۱۹)	

یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے کہ بنی امیہ کے دلوں میں بنی ہاشم کی طرف سے ہمیشہ بغض و عناد کارفرما رہا اور معاویہ کے دل میں اس موروثی دشمنی کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے انتقامی جذبہ کی چنگاریاں بھی بھڑک رہی تھیں کیونکہ ان کا نانا عتبہ بھائی حنظلہ اور ماموں ولید حضرت ہی کے ہاتھوں سے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے تھے اور عرب کی افتادِ طبیعت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ وہ انتقامی جذبات سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہیں رکھ سکتے۔ اگرچہ اسلام نے اسے ختم کرنا چاہا مگر صدیوں کی رچی بسی ہوئی خو اپنا عمل مشکل ہی سے تبدیل کیا کرتی ہے۔ حضرت عمر کی دُور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ انتقامی جذبہ افتراق و انتشار اور جنگ و جدل کی صورت میں ابھر سکتا ہے کہ لوگوں کے ذہن پلٹا کھائیں اور اقتدار کا رُخ حضرت علی کی طرف مڑ جائے۔ اس صورت میں معاویہ کا اقتدار خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے لوگوں کو معاویہ کے اتباع اور شام کی طرف ہجرت کر جانے کی ہدایت کی تاکہ عوامی طاقت اُن کی پشت پر رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور حضرت کے برسرِ اقتدار آتے ہی لوگ جوق در جوق شام کی جانب چل دیئے اور معاویہ کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اگر یہ افتراق

وانتشار کی صورت انہیں نظر آ رہی تھی کہ جس کی بنا پر حق کے اتباع کا اور دار الہجرت مدینہ کی مرکزیت کو مضبوط کرنے کے بجائے شام کو دار الہجرت قرار دینے کا حکم دیا۔

حضرت عمر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ معاویہ جس طرز زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ قیصری وکسروی طرز زندگی ہے جسے اسلام اور اسلام کے سادہ طرز معاشرت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر شام آئے تو معاویہ کے تزک واحتشام اور شان وشکوہ کو دیکھ کر کہا کہ تم تو عرب کے کسریٰ ہو اور میں نے سنا ہے کہ حاجتمند تمہارے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں اور تم گھر میں پڑے رہتے ہو۔ معاویہ نے کہا کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر ہیں جہاں دشمن کے جاسوس ہماری ایک ایک بات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے مرکز کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ سطوت وشکوہ کا مظاہرہ کرکے ان پر اپنا رعب ودبدبہ قائم رکھیں۔ حضرت عمر نے یہ جواب سنا تو کہا کہ یہ ایک زیرک آدمی کی سخن طرازی ہے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر کہا کرتے تھے۔

تذکرون کسریٰ و قیصر و دھا ئھما و عندکم معاویۃ۔	تم کسریٰ وقیصر اور ان کی چالبازیوں کے تذکرے کرتے ہو حالانکہ معاویہ تمہارے درمیان موجود ہے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۴۴)

مگر اس کے باوجود ان کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی اور ان کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ وہ باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اس طرح نفسیاتی طور پر انہیں خلافت کا امیدوار بنا دیا۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے ابو عثمان جاحظ کی کتاب السفیانیہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے اصحاب شوریٰ سے کہا۔

انکم ان تعاونتم و توازرتم وتناصحتم اکلتموھا اولادکم و ان تحاسدتم و تقاعدتم وتدابرتم و تباغضتم غلبکم علی ھذا الامر معاویۃ ابن ابی سفیان۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ جزو ۱۔ ص ۳۰)	اگر تم نے باہمی تعاون دستگیری اور خیر خواہی کے جذبات سے کام لیا تو تم اور تمہاری اولادیں خلافت سے بہرہ اندوز ہوتی رہیں گی اور اگر تم نے آپس میں حسد و بغض رکھا اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے میں کوتاہی کی تو پھر معاویہ ابن ابی سفیان تمہیں مغلوب کرکے خلافت ہتھیا لے گا۔"

یہ بات معاویہ کے گوشگزار ہوئی ہوگی تو طبعاً ان کے خیالات نے کروٹ لی ہوگی اور ذہنی رخ خلافت کی طرف مڑ گیا ہوگا۔ چنانچہ ان کے حرکات وسکنات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے

حضرت عثمان کے زمانہ خلافت ہی میں اقتدار کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی اور ان کے قتل کے بعد تو اُن کی سرگرمیوں میں اور تیزی آ گئی اور ہر جائز و ناجائز طریق کار سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

جب شام پر اموی پھریرا لہرایا تو سلطنت روما کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے اس پر رومی تمدن چھایا ہوا تھا۔ حکومت کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اسلام کے بعد بھی وہاں کے لوگوں پر رومی اثرات غالب رہے اور معاویہ نے بھی اسلام کی سادہ زندگی کو چھوڑ کر وہیں کا طرزِ معاشرت اختیار کر لیا۔ اپنے تعمیر کردہ قصر خضرا میں بڑے ٹھاٹ سے رہتے دروازہ پر پولیس کا پہرہ زریں کمر غلاموں کا جھرمٹ مصاحبوں کا جمگھٹا اور دربار کا کروفر قیصری وکسروی شان کا آئینہ دار تھا۔ یہ تمکنت وشکوہ اور نگاہوں میں خیرگی پیدا کرنے والا سامان آرائش عوام کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لیکن جہاں انہیں یہ شبہ ہوتا کہ شاہی آن بان اور مادی سازوسامان کا اثر نہیں لیا جائے گا تو وہاں اور طریقہ اختیار کیا جاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو ابن عاص مصریوں کے ایک وفد کے ہمراہ دمشق آئے اور چاہا کہ وفد کی نظروں میں معاویہ کی اہمیت گرائے اور ان کے کبر و غرور کو ٹھیس لگائے۔ عمرو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب تم معاویہ کے ہاں جانا تو اُسے خلیفہ کہہ کر سلام کرنے کے بجائے عام طریقہ سے سلام کرنا اور گفتگو میں ایسا انداز اختیار کرنا کہ گویا تم ایک عام آدمی سے مخاطب ہو اور ان کے دبدبہ شاہی سے قطعاً مرعوب نہیں ہو۔ اس طرح تمہارا وقار بڑھے گا اور قدر و منزلت زیادہ ہو گی۔ معاویہ نے پہلے ہی سے تاڑ لیا تھا کہ عمرو مصریوں کی نظر میں انہیں غیر اہم ثابت کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے دربانوں کو بلا کر کہا کہ جب مصری وفد باریابی کے لئے آئے تو انہیں اس طرح جھنجھوڑنا کہ ان کے سارے کس بل نکل جائیں اور ان میں سے ہر شخص یہ سمجھنے لگے کہ اُسے موت کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب وہ دربانوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بوکھلائے ہوئے معاویہ کے سامنے آئے تو ابن خیاط نامی ایک شخص آگے بڑھا اور السلام علیك یا رسول اللہ کہہ کر انہیں سلام کیا اس کے بعد جو شخص آگے بڑھتا انہیں لفظوں میں سلام کرتا اور جب دربار سے باہر نکلے تو عمرو نے برہم ہو کر کہا:۔

لعنکم اللہ نہیتکم ان تسلموا	تم پر خدا کی پھٹکار میں نے تمہیں منع کیا تھا، کہ
علیہ بالامارۃ فسلمتم علیہ	اسے خلیفہ کہہ کر بھی سلام نہ کرنا چہ جائیکہ تم نے
بالنبوۃ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۴۴)	اسے یا رسول اللہ کہہ کر سلام کیا“

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ معاویہ اپنے بارے میں یا رسول اللہ کے الفاظ سنتے ہیں اور ان کی قوت سامعہ پر گراں نہیں گزرتے۔ حالانکہ ان لفظوں سے کسی اور کو مخاطب کیا جاتا تو اس کی روح لرز اٹھتی

اور کان کے پردے پھٹ جاتے مگر وہ چپ سادھ لیتے ہیں۔ اگر اس موقع پر خاموشی میں کوئی مصلحت تھی تو بعد میں اس کی تردید کرتے مگر وہ نہ اس کی تردید ضروری سمجھتے ہیں اور نہ کہنے والوں کو تنبیہہ و سرزنش کرتے ہیں۔ کیا بعید ہے کہ وہ ذرا سہواً وفد انہیں رب اعلیٰ کے الفاظ سے مخاطب کرتا جب بھی وہ خاموش رہتے اور اس کی تردید غیر ضروری سمجھ کر ٹال دیتے۔

جہاں ذہن کی روش اس طرح کی ہو وہاں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے اصول و ضوابط کا احترام یا اس کے اوامر و نواہی کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہوگی۔ چنانچہ ریشم جسے شریعت نے مردوں کے لئے حرام کیا ہے۔ بے کھٹکے پہنا جاتا سونے اور چاندی کے برتن کھنکتے شراب کے دور چلتے اور بے جھجک جام دوسروں کے سامنے پیش کئے جاتے۔ عبداللہ ابن بریدہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ معاویہ کے ہاں گیا ہمیں فرش پر بٹھایا گیا اور کھانے کے بعد ہمارے سامنے شراب پیش کی گئی۔ میرے والد نے شراب کو دیکھا تو کہا:۔

ما شربته منذ حرمه رسول اللہ۔ (مسند احمد ابن حنبل۔ ج ۵۔ ص ۳۴۷)	جب سے رسول اللہ نے شراب کو حرام کیا ہے میں نے اُسے منہ نہیں لگایا۔"

دین میں ان کے بدعات و اولیات کا سلسلہ بھی طویل ہے۔ چنانچہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد زیاد ابن سمیہ کو فرزند ابو سفیان قرار دے کر ارشاد نبوی الولد للفراش وللزانی الحجر (بچہ شوہر کا ہوگا اور زانی کے لئے پتھر ہے) کا مذاق اڑایا خطبات میں امیرالمومنین پر سب و شتم کو رواج دیا نماز عیدین سے قبل اذان کا اجراء کیا خطبۂ عید کو نماز پر مقدم کر دیا۔ کھڑے ہو کر خطبہ دینے کے بجائے بیٹھ کر خطبہ دینے کا اجراء کیا اور ان کے بعد بنی اُمیہ نے اسے اپنا شعار بنا لیا۔ اموی دور کے بعد جب سفاح عباسی برسرِ اقتدار آیا اور اس نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا تو مجمع نے پکار کر کہا:۔

یابن عم رسول اللہ احییت السنة احیاك اللہ۔	اے فرزند عم رسول تم نے پھر سے سنت کو زندہ کیا خدا تمہیں زندہ رکھے۔"

(محاضرة الاوائل ص ۴۴)

نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ کا پڑھنا ترک کر دیا۔ محمد ابن عقیل تحریر کرتے ہیں:۔

هو اول من ترك الجهر بالتسمية فی الصلوٰة بالمدينة حتی انكر عليه المهاجرون والانصار وقالوا	معاویہ نے مدینہ میں سب سے پہلے نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کو ترک کیا یہاں تک کہ مہاجرین و انصار نے اس کے خلاف آواز بلند

اسرقت التسمیة یامعاویة۔ کی اور کہا اے معاویہ تم نے بسم اللہ کی چوری کی ہے۔

(النصائح کافیہ۔ ص۹۷)

اسلام کے واضح احکام میں ردو بدل کے ساتھ ان تقریبات و رسوم کو فروغ دیا جو غیر مسلموں میں رائج تھے۔ کلیدی عہدے غیر مسلموں کے سپرد کئے اور مدینہ کی مرکزیت کو مضمحل کرنے کی تدبیر کی۔ چنانچہ نو روز و مہرجان کے تہوار منائے جانے اور تحائف کے نام پر رقمیں وصول کی جاتیں۔ مرکزی دفتر کا افسر ایک عیسائی سرجون رومی تھا اور حمص کے محکمہ خراج کا نگران اعلیٰ ابن اثال بھی مسیحی تھا۔ ۵۰ھ میں حج کے بعد مدینہ آئے تو منبر رسول کو شام منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اسے اٹھانے کے لئے حرکت دی تو سورج کو گہن لگ گیا۔ دیکھنے والے دہشت زدہ ہو گئے اور آخر لوگوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا اور بات یہ بنائی کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے دیمک تو نہیں لگ گئی۔

یہ واقعہ حسان ابن کلال عبدی کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے بھی یہ چاہا تھا کہ خانہ کعبہ کو مسمار کر کے اس کے پتھر یمن لے جائے مگر قدرت نے اسے ایسا جکڑا کہ وہ اپنے ارادے میں ناکام و نامراد رہا۔ اس طرح یہاں فطرت کے خشمگین تیور گہن کی صورت میں آڑے آئے اور منبر نبوی کو منتقل کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

معاویہ کے وہ افعال و اعمال جو اسلامی قدروں کو پامال اور اُمت مسلمہ کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا باعث ہوئے یوں تو ان گنت ہیں مگر ان کا اپنے بدکردار اور ناہنجار بیٹے یزید کو ولیعہد بنانے کا اقدام ایک ایسا مہلک اقدام ہے کہ وہ گروہ جو صحابہ پر جرح و نقد اور ان کی باہم آویزیوں پر تبصرہ تک کا روادار نہیں وہ بھی اس کے خلاف آواز اٹھائے بغیر نہ رہ سکا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ان کے اس اقدام نے خلافت کا رُخ ملوکیت کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسی بدعت کی داغ بیل ڈال گئے جو صدیوں تک اسلامی دنیا میں جاری و ساری رہی اور اس استبدادی و غیر آئینی کارروائی کے نتیجہ میں ہر فرمانروا جو خلیفۃ المسلمین کے نام سے مسندِ خلافت پر بیٹھا خلافت کو اپنی ملکیت و جاگیر سمجھتے ہوئے اپنے وارثوں کی طرف منتقل کرتا رہا۔

معاویہ کا یہ اقدام نہ صرف شرعی اعتبار سے غلط تھا بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی قابلِ مذمت ہے کیونکہ انہوں نے امام حسن علیہ السلام سے معاہدہ صلح میں یہ شرط تسلیم کر لی تھی کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے مگر ان کا یہ معاہدہ پادر ہوا ثابت ہوا اور انہوں نے عامۂ مسلمین کی ناپسندیدگی کے باوجود معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کی زمام قیادت یزید کے ہاتھوں میں دے دی۔

معاویہ کا مطمح نظر شروع ہی سے موروثی سلطنت کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے شرعی حدود تک نظر انداز کر دیئے تھے تو پھر وعدہ کی خلاف ورزی کو کیا اہمیت دیتے اور لوگوں کی ناپسندیدگی کو کیا خاطر میں لاتے انہیں تو بہرصورت یہ قدم اٹھانا تھا اور وہ اٹھا کر رہے اور جن لوگوں کے بارے میں انہیں یہ کھٹکا تھا کہ وہ اسے تسلیم نہیں کریں گے یا اسے عملی صورت دینے میں روڑے اٹکائیں گے اور اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر دوسروں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیں گے ان میں سے کسی سے مصلحۃً کوئی تعرض نہ کیا اور کسی کو ڈرا دھمکا کر مہر بلب کر دیا اور کسی کو زر و مال یا عہدہ دے کر ہموار کر لیا اور جو کسی صورت میں بکتے نظر نہ آئے انہیں خفیہ طور پر زہر دلوا کر راستے سے ہٹا دیا۔ چنانچہ امام حسن کو جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ زہر دلوایا۔ مسعودی نے تحریر کیا ہے:۔

قد کان معاویۃ دس الیھا ان احتلت فی قتل الحسن وجھت الیک بمائۃ الف درھم و زوجتک یزید۔

معاویہ نے اسے چپکے چپکے یہ پیغام بھیجا کہ اگر تو کسی حیلہ سے حسن کا کام تمام کر دے تو میں تجھے ایک لاکھ درہم دوں گا اور یزید سے تیرا عقد کر دوں گا"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ صفحہ ۵)

اس سازش کے ماتحت اس نے زہر دے امام حسن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے صلہ میں معاویہ نے اسے ایک لاکھ درہم بھجوا دیئے اور دوسرے وعدہ سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ مجھے یزید کی زندگی عزیز ہے۔ اسی طرح خالد ابن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو زہر دلوا کر ختم کیا۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے کہ معاویہ نے شام میں خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اے لوگو میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور موت کی ساعت قریب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لئے کوئی انتظام کر جاؤں۔ معاویہ کا خیال تو یہ تھا کہ لوگ سطوت و قوت سے متاثر ہو کر یا خوشامد درامد کی بناء پر یزید کا نام لیں گے اور وہ رائے جمہور کی آڑ میں اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دیں گے مگر لوگوں سے یزید کی بدعنوانیاں مخفی نہ تھیں اور وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ خلافت کے سلسلہ میں اس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عبدالرحمٰن ابن خالد کا نام لیا۔ معاویہ نے یزید کے بجائے عبدالرحمٰن کا نام سنا تو اس کی طرف سے ان کے دل میں گرہ پڑ گئی اور چاہا کہ یزید کے راستے سے اس سنگِ گراں کو ہٹا دیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کی بیماری کی خبر سنی تو اپنے ہاں کے ایک طبیب کو لالچ دے کر آمادہ کیا کہ:۔

ان یاتیہ فیسقیہ سقیۃ یقتلہ

وہ اس کے ہاں جائے اور دوا پلا کر اس کا کام

بہا۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص۴۰) تمام کر دے۔"

چنانچہ اسے دوا کے بہانے زہر دے دیا گیا۔

عبدالرحمٰن ابن ابی بکر بھی اسی حربہ کا شکار ہوئے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ جب معاویہ نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا تو عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے کہا:۔

اھرقلیة کلما مات قیصر کان قیصر مکانه لا نفعل واللہ ابداً (اصابہ۔ ج ۲۔ ص۴۰۰)

"کیا وہی ہرقلی نظام کہ ایک قیصر مر جائے تو دوسرا قیصر اس کی جگہ لے لے۔ خدا کی قسم ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

معاویہ نے ان کا منہ بند کرنے کے لئے ایک لاکھ درہم بھجوائے مگر انہوں نے وہ درہم واپس کر دیئے اور کہا کہ میں دنیا کے عوض دین نہیں بیچوں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ جاتے ہوئے ابھی دس میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے:۔

کان موته فجأة من نومة نامها۔ (اصابہ۔ ج ۲۔ ص۴۰۰)

"عبدالرحمٰن سوتے میں ناگہانی طور پر مر گئے۔"

عمرو ابن عاص

عمرو کا باپ عاصی ابن وائل تھا جسے قرآن نے ابتر (بے اولاد) اور دشمن رسولؐ کہا ہے۔ ماں کا نام سلمیٰ بنت حرملہ اور لقب نابغہ تھا۔ یہ عنزہ سے اسیر ہو کر آئی اور عکاظ کے بازار میں بکی فاکہہ ابن مغیرہ نے اسے خریدا اور پھر عبداللہ ابن جدعان نے خرید لی اور یوں بکتی بکاتی عاصی ابن وائل تک پہنچ گئی اور اپنی کوکھ سے عمرو کو جنم دیا۔

عمرو نے اسلام دشمنی اپنے باپ عاصی سے ورثہ میں پائی تھی۔ چنانچہ دشمنان اسلام کی صف اول میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام کی شان میں ناسزا کلمات کہتا اور آپ کے خلاف جنگ و قتال کے معرکے گرم کرتا رہا۔ جب اسلام کے غلبہ و اقتدار کے آگے اپنے کو بے بس پایا تو اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اسے فلسطین و اردن کا امیر نامزد کیا۔ اور جب یہ علاقہ معاویہ کے زیر نگین کیا تو اسے فوج دے کر مصر روانہ کر دیا۔ اس نے مصریوں سے جنگ کر کے اسے فتح کر لیا اور مرکز کی طرف سے وہاں کا حاکم قرار پایا۔ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان نے بھی اسے

کچھ عرصہ امارت پر بحال رکھا پھر ۲۶ھ میں اسے معزول کر کے اپنے دودھ شریک بھائی عبداللہ ابن سعد کو وہاں کا والی بنا دیا جو لشکر کشی کے موقعہ پر میمنہ لشکر کا سردار تھا۔ عمرو جو حضرت عثمان کا ہوا خواہ تھا اس برطرفی کی بنا پر ان کا شدید مخالف ہو گیا اور اسے مخالف ہونا ہی چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس کی دوستی مفاد و خود غرضی سے وابستہ تھی۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھی کہ اس نے محاذ قائم کر کے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں:۔

کان عمرو ابن عاص مذ عزل عن مصر یعمل حیلۃ فی التالیب والطعن علی عثمان۔ (استیعاب۔ ج ۳۔ ص ۳۲۲)۔	حضرت عثمان نے عمرو ابن عاص کو مصر کی امارت سے الگ کیا تو وہ لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے اور اُن پر زبان طعن کھولنے لگا۔"

اس نے اسی پر بس نہ کی بلکہ طیش میں آکر اپنی بیوی ام کلثوم بنت عقبہ کو جو حضرت عثمان کی مادری بہن تھی طلاق دے دی اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے سرگرم عمل ہو گیا۔ حضرت عثمان نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو اسے بلا کر کہا کہ اے نابغہ کے بیٹے تم ان حرکات سے باز آؤ اور نفاق و دورخی چھوڑ کر شریفانہ طرز عمل اختیار کرو۔ عمرو نے بھی اسی لب لہجہ میں جواب دیا اور ان پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ حضرت عثمان اس کی باتوں پر سٹپٹائے اور تنگ آکر کہا کہ تمہیں میرے کاموں پر نکتہ چینی اور میرے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں زمانہ جاہلیت میں بھی تم سے زیادہ محترم تھا اور اب بھی زیادہ باوقار ہوں۔ عمرو نے کہا کہ ہاں ہاں میں نے آپ کے باپ عفان کو دیکھا ہے وہ کسی لحاظ سے میرے باپ عاصی ابن وائل کا ہمپایہ نہ تھا۔ اس پر حضرت عثمان نے تو کچھ نہ کہا لیکن مروان پیچ و تاب کھانے لگا اور حضرت عثمان سے کہا اب آپ کی حیثیت یہ رہ گئی ہے کہ عمرو آپ کے باپ تک کو نہیں بخشتا۔

اس دو بدو تلخ کلامی کے بعد عمرو نے اپنی سرگرمیوں کو اور تیز کر دیا اور طلحہ و زبیر اور دوسرے لوگوں کو ان کے خلاف ابھارا اور جب عوام و خواص کے جذبات ان کے خلاف بھڑک اُٹھے اور ان کے گرد گھیرا ڈال دیا گیا تو مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور فلسطین میں جہاں اس کا عالیشان محل اور وسیع جاگیر تھی چلا آیا تاکہ دور رہ کر اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے دیکھے اور نتائج کی ذمہ داری سے اپنے کو بچائے جائے۔

ایک دن اپنے قصر عجلان میں سلامہ ابن روح جذامی اور اپنے دونوں بیٹوں محمد اور عبداللہ سے مصروف گفتگو تھا کہ ادھر سے ایک سوار کا گزر ہوا اسے بلا کر پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو کہا مدینہ سے کہا عثمان کا کیا حشر ہوا کہا کہ جب میں مدینہ سے نکلا تھا تو شدید محاصرہ میں تھے۔ اس کے بعد ایک اور سوار ادھر

سے گزرا اسے بھی بلا کر پوچھا اس نے کہا کہ وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ عمرو نے سنتے ہی کہا:۔

انا ابو عبد اللہ اذا حککت قرحۃ نکأتھا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۳۹۲)	میں بھی عبد اللہ کا باپ ہوں جب کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو اسے ادھورا نہیں چھوڑتا۔"

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ جب انہیں قتل عثمان کی خبر ہوئی تو یہ کہا:۔

انا ابو عبد اللہ انا قتلتہ وانا بوادی السباع ان یل ھذا الامر طلحہ فھو فتی العرب وان یل ابن ابی طالب فھو اکرہ من یلیہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۴۔ ص ۱۴۱)	میں عبد اللہ کا باپ ہوں میں نے وادی السباع (سبع) میں رہتے ہوئے عثمان کو قتل کیا ہے اگر طلحہ خلیفہ ہوئے تو وہ جود و سخا کے لحاظ سے عرب کے جوانمرد ہیں اور اگر ابن ابی طالب کو خلافت ملی تو وہ حکمرانی کے اعتبار سے ناپسندیدہ شخصیت ہیں۔"

ابھی وہ اپنی کامیابی کی سرمستیوں میں کھویا ہوا تھا کہ حضرت علی کے خلیفہ منتخب کیے جانے کی خبر سنی سنتے ہی سر پکڑ کر رہ گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ تو کچھ ڈھارس بندھی اور جنگ جمل کے نتیجہ کا منتظر رہا کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور جب حضرت علی کی فتحیابی کی خبر سنی تو رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی مگر جب یہ اطلاع آئی کہ معاویہ نے بیعت سے انکار کر دیا ہے تو یاس و حرمان کی اندھیاریوں میں امید کی کرن نظر آنے لگی۔ حکومت کی فکر تو تھی ہی کیونکہ حکومت و اقتدار کے کیف آفریں لمحوں میں ایک عرصہ گزار چکا تھا اور اب اگرچہ عمر کی آخری منزل میں پہنچ چکا تھا مگر جذبہ جاہ پسندی ایسا نہیں ہے کہ عمر کے کسی حصہ میں سرد پڑ جائے بلکہ ؎

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے — بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

چنانچہ وہ حکومت مصر کی دیرینہ آرزو لے کر معاویہ کے ہاں پہنچ گیا، اور وہاں کی حکومت کا سودا چکانے کے بعد اپنا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

عمرو ابن عاص سیاسی ہتھکنڈوں اور سازشی حربوں میں ماہر اور پھوٹ ڈلوا کر مقصد براری کے فن میں طاق تھا۔ اسی جوڑ توڑ اور سوجھ بوجھ کے نتیجہ میں کامیابی کی راہیں پیدا کرتا رہا اگرچہ کامیابی کے لئے اسے دینی و اخلاقی قدروں کی قربانی دینا پڑی مگر کشورستانی کی سیاست میں ان اقدار کو چنداں اہمیت

نہیں دی جایا کرتی جب کہ سیاست کا مقصد ہی کامیابی قرار دے لیا گیا ہے۔ خواہ وُہ کذب و افترا پردازی سے حاصل ہو یا قتل و خونریزی سے۔ اور واقعات شاہد ہیں کہ ابن عاص کو ان امور کے ارتکاب سے کوئی باک نہ تھا۔ آخر ۹۰ برس کی طویل زندگی کے بعد ۴۳ھ میں عید الفطر کے دن وفات پائی۔ اس کے فرزند عبداللہ نے پہلے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر نمازِ عید ادا کی۔

عبداللہ ابن سعد

عبداللہ حضرت عثمان کا دودھ شریک بھائی اور سعد ابن ابی سرح کا بیٹا تھا۔ سعد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو اسلام کی آڑ میں اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے اور اپنے طرزِ عمل کی بنا پر منافقین کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے :-

وابوہ سعد من المنافقین۔ — عبداللہ کا باپ سعد منافقین میں شامل تھا۔

(المعارف۔ ص۱۳۱)

عبداللہ گو صحابی رسول اور کاتب وحی تھا مگر اس کے فکر و عمل کی پشت پر اسی کے باپ کا ذہن کام کر رہا تھا جس کا ثبوت اس کا یہ طرزِ عمل ہے کہ جب پیغمبر قرآن کی آیات لکھواتے تو ان میں اپنی مرضی سے ردّ و بدل کر دیتا۔ چنانچہ الکافرین کی جگہ الظالمین اور عزیز حکیم کی جگہ علیم حکیم لکھ دیتا۔ ایک مرتبہ انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ایک آیت لکھتے ہوئے آیت کے سیاق کی مناسبت سے اس کی زبان سے فتبارک اللہ احسن الخالقین کا جملہ نکل گیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ یہ بھی اسی آیت کا ٹکڑا ہے اسے بھی لکھ لو۔ اس نے لکھنے کو تو لکھ لیا مگر شک میں پڑ گیا کہ قرآن اللہ کا نازل کردہ کلام ہے۔ یا پیغمبر کا ساختہ اور پھر اس کی تشہیر کرنے لگا، گویا کہ قرآن میں کوئی خاص ندرت اور بشری طاقت سے بالاتر جوہر بلاغت نہیں ہے ایسا کلام تو میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ اس پر یہ آیۂ قرآنی نازل ہوا۔

ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا او قال اوحی الی ولم یوح الیه شیٔ ومن قال سانزل مثل ما انزل الله۔

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے اور کہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس وحی نہیں آتی یا وُہ یہ دعویٰ کرے کہ جیسا قرآن اللہ نے اتارا ہے ویسا میں بھی نازل کئے دیتا ہوں۔

پیغمبر اکرم نے اس کی یاوہ گوئی کی بنا پر اسے مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا چنانچہ وہ اسلام سے منحرف ہو کر مکہ میں آگیا اور یہاں بھی لوگوں سے برملا کہنا شروع کیا کہ محمد خود آیتیں گھڑ لیتے ہیں اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت عثمان ایسے لوگوں کے پشت پناہ تو بن ہی جایا کرتے تھے انہوں نے آنحضرت سے سفارش کی کہ اسے مدینہ آنے کی اجازت دی جائے مگر پیغمبر نے کسی صورت میں اسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی۔ جب مکہ فتح ہوا اور آنحضرت فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو حکم دیا کہ عبداللہ ابن سعد کو قتل کر دو خواہ وہ خانہ کعبہ کے پردہ سے چمٹا ہوا کیوں نہ ہو۔ حضرت عثمان نے یہ فرمان نبوی سنا تو بہت گھبرائے اور اسے کہیں اِدھر اُدھر کر دیا۔ جب حالات پر سکون ہوئے تو اسے لے کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ عبداللہ ابن سعد بیعت کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اسے امان دی جائے اور اس سے بیعت لی جائے۔ مگر پیغمبر نے نہ بیعت لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا اور نہ زبان سے کچھ فرمایا اور دیر تک خاموش رہے۔ ادھر حضرت عثمان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پیغمبر اکرم نے اس کی جان بخشی کر دی۔ جب وہ اٹھ کر چلا گیا تو آنحضرت نے ان لوگوں سے جو وہاں موجود تھے فرمایا کہ میں اتنی دیر اس لئے چپ رہا کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اس کی گردن مار دے۔

اما کان فیکم من یقوم الی هذا الکلب قبل ان اؤمنه فیقتله۔	کیا تم میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کتے کی طرف بڑھتا اور قبل اس کے کہ میں اسے امان دیتا وہ اسے قتل کر دیتا۔"
(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۳۵۸)	

حضرت عمر نے کہا کہ یارسول اللہ آپ نے آنکھ سے اشارہ کر دیا ہوتا تو ہم اسے قتل کر دیتے۔ آنحضرت نے فرمایا:۔

انی ما اقتل باشارة لان الانبیاء لا یکون لهم خائنة الاعین۔	میں اشارہ سے قتل کا حکم نہیں دیا کرتا۔ اور نہ انبیاء آنکھ بچا کر اشارہ بازی کیا کرتے ہیں۔"
(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۳۵۸)	

حضرت عثمان نے اپنے دورِ خلافت میں اس کی بداعمالیوں سے چشم پوشی کر کے اسے مصر ایسی وسیع مملکت کا والی بنا دیا۔ گویا دین میں خیانت اور ارتداد کوئی جرم ہی نہ تھا۔ اس نے امارت مصر پر قابض ہونے کے بعد وہی طرزِ عمل اختیار کیا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ ہر طرف جبر و استحصال کے طوفان اُمڈ آئے ملکی خوشحالی نکبت و افلاس میں بدل گئی اور حضرت عثمان کے چند ہوا خواہوں کے علاوہ تمام اہل مصر اس کے مخالف ہو گئے اور عوام کے دلوں میں مرکز کی طرف سے بھی نفرت کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

آخر محمد ابن ابی حذیفہ نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ کر لوگوں کو اس کے چنگل سے نجات دلائی۔

محمد ابن ابی حذیفہ حضرت عثمان کے پروردہ تھے اور اپنے والد ابو حذیفہ کے جنگ یرموک میں مارے جانے کے بعد انہی کے زیر کفالت رہے۔ جب محمد بڑے ہوئے تو حضرت عثمان سے کہا کہ مجھے موقع دیجئے کہ اسلام کی ترویج و ترقی میں حصہ لوں اور کسی لشکر میں شریک ہو کر دشمنوں سے جہاد کروں حضرت عثمان نے انہیں عبد اللہ ابن سعد کے معاون و مددگار کی حیثیت سے مصر جانے کی اجازت دے دی اور وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ مصر آگئے۔ محمد ابن حذیفہ بڑے عابد و متورع اور پرہیزگار تھے انہوں نے والی مصر کی بے راہرویوں اور انتظامی خرابیوں کو دیکھا تو عبد اللہ ابن سعد کو سمجھایا کہ وہ اپنی روش کو بدلے مگر اس کے عادات و اطوار میں تبدیلی نہ آئی۔ جب وہ بار بار جھنجھوڑنے پر بھی نہ سنبھلا تو انہوں نے علانیہ لوگوں کو اس کے خلاف کہنا سننا شروع کر دیا اور حضرت عثمان پر بھی لے دے کی کہ انہوں نے ایک ایسے باغی انسان کو اہل مصر پر مسلط کر دیا ہے جس کا خون پیغمبرؐ نے مباح کر دیا تھا۔ اہل مصر محمد کے تقویٰ و طہارت اور محتاط طرز عمل سے متاثر تو تھے ہی ان کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ عبد اللہ ابن سعد پہلے ہی اہل مصر کی نظروں سے گرا ہوا تھا اب اس کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا اور اس کی حکومت بے وزن ہو کر رہ گئی۔ عبد اللہ ابن سعد نے یہ صورت حال دیکھی تو حضرت عثمان کو تحریر کیا کہ آپ کے پروردہ ابن ابی حذیفہ نے یہاں کی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے عوام کو حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت کرتے رہتے ہیں اگر اس کا بندوبست نہ کیا گیا تو بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک میرے بس میں تھا میں نے روک تھام کی مگر اب معاملہ میرے قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ حضرت عثمان کو کوئی اور تدبیر نہ سوجھی تو انہوں نے مال و دولت سے اس سیلاب پر بند باندھنا چاہا۔ چنانچہ چند قیمتی پارچے اور تیس ہزار درہم ابن ابی حذیفہ کو بھجوائے مگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور ابن ابی حذیفہ لالچ کا شکار نہ ہو سکے انہوں نے وہ پارچے اور درہم مسجد میں لا کر ڈھیر کر دیئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

یا معشر المسلمین الا ترون الی عثمان یخادعنی عن دینی و یرشونی علیہ۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۳۵)

"اے گروہ مسلمین تم عثمان کی اس حرکت کو نہیں دیکھتے کہ وہ دین کے معاملہ میں مجھے فریب دینا چاہتے ہیں اور یہ مال رشوت کے طور پر مجھے بھیجا ہے"۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت اور شدید ہو گئی۔ بغاوت کے جذبات ابھر آئے اور لوگوں نے علانیہ عبد اللہ ابن سعد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت عثمان کو اس کا پتا چلا تو انہوں نے ابن ابی حذیفہ کو

تحریر کیا کہ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم میرے احسانات کو یکسر فراموش کر دو گے اور خود بھی علم بغاوت بلند کرو گے اور رعایا کو بھی میرے خلاف بغاوت پر اکساؤ گے۔ مگر ابن ابی حذیفہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر عبداللہ کے خلاف تحریک چلاتے رہے۔ آخر اہلِ مصر کا ایک جتھا مدینہ روانہ ہو گیا تاکہ حضرت عثمان کو مجبور کرے کہ وہ عبداللہ ابن سعد کو اس کے عہدہ سے معزول کر کے کسی دوسرے کا تقرر کریں۔ اس جتھے میں محمد ابن ابی بکر بھی تھے جو مصر میں ابن ابی حذیفہ کے اس تحریک میں معاون تھے۔

اس وفد کے بعد عبداللہ ابن سعد نے بھی مدینہ کا رخ کر لیا اور مصر کا نظم ونسق ابن ابی حذیفہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جب عبداللہ مدینہ جاتے ہوئے مقام ایلہ پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مصریوں نے عراقیوں کے ساتھ مل کر حضرت عثمان کو محاصرہ میں لے لیا ہے اور وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے وہ وہیں سے واپس مصر کی طرف پلٹا مگر ابن ابی حذیفہ نے اسے حدودِ مصر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ جب اُسے کوئی ٹھکانا نظر نہ آیا تو فلسطین کی طرف چل دیا اور فلسطین سے متصل مصر کی آخری سرحد پر پہنچ کر ٹھہر گیا اور اس انتظار میں رہا کہ دیکھئے حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں اور اس محاصرہ کا نتیجہ کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اسی زمانۂ قیام میں ایک شخص ادھر سے گزرا اس سے دریافت کیا کہ تمہیں مدینہ کی شورش کے بارے میں کچھ علم ہے۔ اس نے کہا کہ عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سنا تو انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ اور پھر پوچھا کہ خلافت کے لئے کون منتخب ہوا ہے کہا علی ابن ابی طالب۔ یہ سن کر اس نے پھر انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ اس شخص نے کہا کہ تم حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علی کی خلافت دونوں کو ایک طرح کا المیہ سمجھتے ہو۔ پھر غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم عبداللہ ابن سعد تو نہیں ہو کہا کہ ہاں میں عبداللہ ابن سعد ہوں۔ کہا کہ پھر بھاگ کر اپنی جان بچاؤ۔ ورنہ امیرالمومنین تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیں گے یا ملک سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ وہاں سے دمشق کی طرف چل دیا اور کچھ عرصہ معاویہ کے زیرِ سایہ رہنے کے بعد ۳۶ھ یا ۳۷ھ میں عسقلان میں وفات پا گیا۔

ولید ابن عقبہ

ولید اروی بنت کریز کے بطن سے عقبہ ابن ابی معیط کا بیٹا اور حضرت عثمان کا مادری بھائی تھا عقبہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف محاذِ جنگ قائم کرنے والوں میں شامل تھا۔ مسلمانوں نے اسے اسیر کر کے آنحضرت کے پیش کیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ ولید اور اسکے بھائی

عمارہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا یہ اسلام، حق کو حق سمجھنے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک طرح کی اطاعت سرافگندگی تھی جو مجبوری کی حالت میں اختیار کی جایا کرتی ہے۔

پیغمبر اکرم نے جب زکوٰۃ وصدقات کی وصولی کے لئے مختلف افراد مختلف قبائل کی طرف بھیجے تو ولید کو بنی مصطلق کی طرف بھیجا جب وہ ان کی بستیوں کے قریب پہنچا تو انہوں نے خیر سگالی کے طور پر اس کا استقبال کرنا چاہا اس نے انہیں آگے بڑھتے دیکھا تو خوفزدہ ہو کر واپس پلٹ آیا اور پیغمبر اکرم سے کہا کہ وہ لوگ اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ آنحضرت نے اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور ان کی تادیب و سرزنش کے لئے قدم اٹھانا چاہا۔ بنی مصطلق کو خبر ہوئی تو وہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ ہمارے بارے میں جھوٹ بولا گیا ہے اور ہم پر بہتان باندھا گیا ہے۔ ہم نہ اسلام سے منحرف ہوئے اور نہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی:۔

ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ۔	اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بے خبری کی بناء پر نقصان پہنچاؤ۔"

ایک مرتبہ اس نے حضرت علی سے کہا کہ میں شمشیر زنی وصف شکنی میں آپ سے کم نہیں ہوں۔ حضرت نے فرمایا اسکت یا فاسق "اے فاسق چپ رہ۔" اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

افمن کان مومنا کمن کان فاسقا لایستوون۔	کیا جو شخص ایماندار ہو اس شخص کے برابر ہو جائے گا جو فاسق ہو یہ (دونوں) برابر نہیں ہو سکتے۔"

ابن عباس کہتے ہیں:۔

نزلت فی علی ابن ابی طالب والولید ابن عقبہ۔	یہ آیت علی ابن ابی طالب اور ولید ابن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔"

(استیعاب۔ ج ۳۔ صـ ۵۹۶)

ان دونوں آیتوں میں اسے فاسق کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہر مجلس اور ہر اجتماع میں اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ اور جب تک قرآن پڑھا جاتا رہے گا اسی نام سے یاد کیا جاتا رہے گا۔

حضرت عثمان نے سعد ابن ابی وقاص کو جنہیں حضرت عمر نے مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کیا تھا امارت کوفہ سے معزول کر کے اس فاسق کو کوفہ کی گورنری کے لئے نامزد کیا اور پروانہ حکومت دے کر ادھر بھیج دیا۔

جب یہ کوفہ پہنچا تو چلچلاتی دھوپ میں سعد کے مکان پر آیا سعد کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ برطرفی کا حکم لے کر آیا ہے۔ پوچھا کہ کیسے آنا ہوا کہا کہ مجھے عثمان نے والیٔ کوفہ بنا کر بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں تمہیں امارت سے برطرف کر کے بیت المال اور تمہارے مقرر کردہ عمال کا جائزہ لوں۔ سعد نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگ زیادہ زیرک و دانا ہو گئے ہو یا ہم حماقت و سفاہت کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ ردو بدل اور نصب و عزل کا کیا چکر ہے۔ کہا کہ اس حکومت نے کس سے وفا کی ہے جو تم سے وفا کرتی یہ صبح کو کسی کی ہوتی ہے اور شام کو کسی کی۔ لہٰذا جو چیز صبح ہے اور شام نہیں اس کے جانے پر غم نہ کیجئے آخر اسے ایک نہ ایک دن جانا ہی تھا۔ سعد نے کہا کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اس ملک کو اپنے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جاگیر قرار دے لیا ہے کہ جسے چاہا بخش دیا اور جس سے چاہا چھین لیا۔

سعد کوفہ کی امارت ولید کے سپرد کر کے مدینہ واپس آگئے۔ ولید [illegible] تے ہی اقتدار کے نشہ میں کھو گیا ناؤ نوش کی مجلسوں میں رونق آگئی علانیہ شراب کے دور چلنے لگے اور خم کے خم لنڈھائے جانے لگے۔ ابن البر نے تحریر کیا ہے:۔

کان الاصمعی و ابوعبیدہ وابن الکلبی وغیرھم یقولون کان الولید ابن عقبہ فاسقا شریب خمر۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۹۹)

اصمعی، ابو عبیدہ، ہشام ابن کلبی اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ولید ابن عقبہ فاسق اور بلا کا شرابی نوش تھا۔"

ولید کے مصاحبین میں ایک عیسائی ابوزبید طائی مصاحب خاص اور اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ ولید نے مسجد سے متصل ایک مکان لے کر اسے دے دیا تھا وہ مسجد کے صحن سے گزرگاہ کا کام لیتا۔ اور اُدھر ہی سے آتا جاتا۔ لوگ ایک عیسائی کو شراب کے نشہ میں جھومتے لڑکھڑاتے آتے جاتے دیکھتے، تو پیچ و تاب کھاتے مگر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ درباری ندیم کو روکے ٹوکے اور مسجد میں سے ہو کر گزرنے سے منع کرے۔ ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور دبی گھٹی آوازیں چیخ بن کر گونج اٹھیں۔ ہوا یہ کہ ولید نے نشہ کی ترنگ میں صبح کی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھا دی اور نمازیوں سے کہا کہ آج ہم وجد و بے خودی کے عالم میں ہیں اگر کہو تو اور پڑھا دیں۔ اور نماز میں قرأت کے بجائے یہ شعر دہراتا رہا ؎

علق القلب الربابا بعدما شابت وشابا

"دل بھی بوڑھا ہو گیا اور رباب بھی بوڑھی ہو گئی مگر دل ابھی تک اسی میں اٹکا ہوا ہے۔"

اہل کوفہ نے تنگ آکر حضرت عثمان سے شکایت کی اور ولید کی شراب نوشی پر گواہ پیش کئے۔ حضرت عثمان نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو اسے مدینہ طلب کیا اور کوڑے لگوائے اور اس کی جگہ سعید ابن عاص کو حاکم کوفہ بنا کر بھیج دیا۔ سعید نے کوفہ میں وارد ہونے کے بعد حکم دیا کہ جس منبر پہ ولید ایسا نجس و ناپاک آدمی بیٹھتا تھا اسے دھو کر پاک و صاف کیا جائے۔ اور جب تک اسے دھویا نہ گیا سعید نے اس پہ بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ جب امیرالمومنین بر سر اقتدار آئے تو ولید مدینہ کی سکونت چھوڑ کر بصرہ میں مقیم ہو گیا اور پھر وہاں سے رقہ کی طرف منتقل ہو گیا اور رقہ ہی میں وفات پائی اور وہیں پر ابوزبید طائی کے پہلو میں دفن ہوا۔

سعید ابن عاص

سعید، عاص ابن سعید کا بیٹا تھا جو جنگ بدر میں حضرت علی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ سعید نے اپنے باپ کے مارے جانے کے بعد یتیمی کا زمانہ حضرت عثمان کے زیر سایہ گزارا۔ فتح شام کے بعد معاویہ کے پاس چلا گیا۔ پھر شام سے مدینہ چلا آیا اور ۳۰ھ میں ولید کی برطرفی کے بعد کوفہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔

سعید ایک خود پسند خود سر اور متشدد قسم کا آدمی تھا۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:

کان فی سعید تجبر و غلظۃ و شدۃ سلطان۔ (استیعاب۔ ج۲ ص۲)

سعید جابر، درشت خو اور تشدد پسند تھا۔

اس کی تند خوئی و درشت مزاجی کے ثبوت میں یہ واقعہ کافی ہے کہ ایک مرتبہ عید کے چاند کے بارے میں اس نے لوگوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ تم میں سے کسی نے چاند دیکھا ہے؟ ہاشم ابن عتبہ نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے۔ اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اس پہ سعید نے کہا کہ اس کانے نے تو چاند دیکھ لیا ہے اور تم لوگ نہیں دیکھ پائے۔ ہاشم کی ایک آنکھ جنگ یرموک میں جاتی رہی تھی۔ انہیں اس انداز تخاطب پر غصہ آیا اور کہا کہ تم میری یک چشمی پر کیا طنز کرتے ہو یہ آنکھ اللہ کی راہ میں جاتی رہی ہے۔ ہاشم تو یہ کہہ کر واپس آگئے مگر چاند کی تصدیق کے لئے لوگوں کا اُن کے ہاں تانتا بندھ گیا۔ سعید کو یہ امر ناگوار گزرا اس نے چند آدمیوں کو بھیج کر انہیں بری طرح سے پٹوایا اور اُن کا گھر جلوا دیا۔ جب مدینہ میں یہ خبر پہنچی تو سعد ابن ابی وقاص نے حضرت عثمان سے کہا کہ اس ظلم و تشدد کی روک تھام ہونا چاہیئے۔ اور جب کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو انہوں نے سعید کا گھر جو مدینہ میں تھا جلا دینا چاہا مگر حضرت عائشہ کے کہنے سننے سے رُک گئے۔

سعید جتنا عرصہ برسرِاقتدار رہا۔ عوام اس کے ظلم و استحصال کا تختۂ مشق بنے رہے۔ بیت المال کو ذاتی ملکیت سمجھ کر جسے چاہتا اور جو چاہتا بطور عطائے خسروانہ بخش دیتا۔ نہ اللہ کا ڈر تھا اور نہ مرکز کی طرف سے احتساب کا خطرہ۔ اگر اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرتا تو اسے سختی سے دبا دیتا۔ اس کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک دفعہ جب کہ اعیان و اشراف کوفہ سے دربار چھلک رہا تھا برملا کہنے لگا۔

انما هذا السواد بستان قریش — عراق کی زمینیں صرف قریش (بنی اُمیہ) کی ہیں۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص)

مالک ابن حارث اشتر یہ سن کر خاموش نہ رہ سکے کہنے لگے کہ جو زمینیں ہماری تلواروں نے فتح کی ہوں وہ تمہاری اور تمہاری قوم کی جاگیر نہیں ہو سکتیں۔ اس پر پولیس کا ایک افسر عبدالرحمن ابن حبیش اسدی بول اٹھا کہ امیر سچ تو کہتے ہیں اور مالک اشتر سے الجھنے لگا اور سخت کلامی پر اتر آیا۔ جب بات بڑھی تو مالک اشتر کا ایماء پا کر بنی نخع اور اشراف کوفہ نے اس کو زدوکوب کیا اور اس قابل نہ چھوڑا کہ پیروں پر چل کر اپنے گھر جا سکے۔ اس واقعہ کے بعد نفرت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ جہاں چند لوگ جمع ہوتے سعید کو بُرا بھلا کہتے اور حضرت عثمان کو بھی کوستے جنہوں نے ایسے مطلق العنان لوگوں کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ جو ان کے اموال کو خرد برد کرنے میں ذرا باک محسوس نہ کرتے تھے۔ سعید اور تو کچھ نہ کہہ سکا۔ ان لوگوں کا اپنے ہاں آنا جانا بند کر دیا اور حضرت عثمان کو لکھا کہ فلاں اور فلاں حکومت کے خلاف آمادۂ شورش و بغاوت ہیں اگر ان کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ حضرت عثمان نے جواباً تحریر کیا کہ ان لوگوں کو شام جلاوطن کر دیا جائے اور امیر شام معاویہ کو لکھا کہ چند شرپسند اور فتنہ جو لوگ شام بھیجے جا رہے ہیں ان کو اس طرح جھنجھوڑو کہ آئندہ حکومت کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ چنانچہ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور انہیں بجبر و قہر شام روانہ کر دیا گیا۔

یہ لوگ جنہیں شرپسند اور فتنہ پرداز قرار دیا گیا کوفہ کے اعیان و اشراف قاریان قرآن حفاظ حدیث اور صحابہ و تابعین تھے جو اپنے زہد و اتقاء علم و عمل اور فضل و شرف کے اعتبار سے اسلام کا عظیم سرمایہ تھے۔ ان میں مالک ابن حارث اشتر، مالک ابن کعب ارحبی، اسود ابن یزید نخعی، علقمہ ابن قیس نخعی، صعصعہ ابن صوحان عبدی، زید ابن صوحان، حارث ابن عبداللہ اعور، ثابت ابن قیس ہمدانی، کمیل ابن زیاد نخعی، جندب ابن زہیر غامدی، جندب ابن کعب ازدی، عروہ ابن جعد اور عمرو ابن حمق خزاعی ایسے عمائد کوفہ شامل تھے۔ ان کا جرم جس کی پاداش میں انہیں دربدری و جلاوطنی کی سزا دی گئی یہ تھا کہ انہوں نے حق کے قیام کے لئے باطل کی ہمنوائی نہیں کی اور حکمران طبقہ کی بے راہرویوں پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے حریت

ضمیر کو برقرار رکھا۔ اگر انہوں نے ایک ایسی حکومت میں جسے انتخابی و جمہوری حکومت کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں آزادانہ اظہار رائے کا حق تسلیم کیا جاتا ہے حق گوئی و صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ مسلمانوں کی مشترکہ زمینوں پر ایک مخصوص گروہ کا قبضہ و تسلط غلط ہے تو کیا غلط کہا۔ اگر یہی لوگ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا شعار بنا لیتے اور سطوت و طاقت کے سامنے جھک کر ظلم کو عدل، بدی کو نیکی اور باطل کو حق کہنے لگتے تو غلط کار حکمرانوں کو ان کی غلط کاریوں پر روکنے ٹوکنے کی امید کس سے کی جاسکتی تھی یہی تو وہ لوگ تھے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ نظر انداز کر کے کبھی ظلم و عدوان سے رواداری برتنے پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ اور اگر اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ تشدد آمیز رویہ بھی اختیار کیا تو یہ ان کے دینی احساس اور اخلاقی فرض کا تقاضا اور حکومت کی بے اثری و بے وقعتی کا کرشمہ تھا۔

جب یہ لوگ جلاوطن ہو کر دمشق پہنچے تو انہیں کنیسۂ مریم میں جگہ دی گئی اور معاویہ نے سخت گیری کے بجائے سیاسی لب و لہجہ میں انہیں ہمنوا بنانے کی کوشش کی اور کہا کہ تم لوگ اسلام کی بدولت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچے ہو اور دوسری قوموں پر غلبہ و فتح مندی حاصل کی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم قریش اور عمال حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہو اور انہیں علانیہ بُرا بھلا کہتے ہو اگر قریش نہ ہوتے تو تم ذلت و گمنامی کے گوشے میں پڑے رہتے اور تمہیں کوئی بھی نہ پوچھتا۔ تمہارے حکمران تمہاری سپر ہیں اسے توڑنے کی کوشش نہ کرو۔ حکومت اب تک تمہاری ناز یبا حرکتیں برداشت کرتی رہی ہے اگر تم باز نہیں آؤ گے تو اللہ تمہیں مصیبتوں میں جکڑ لے گا اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دے گا۔ صعصعہ نے کہا کہ تم نے قریش کے تفوق و امتیاز کا ذکر کیا ہے تو قریش کسی دور میں ہم سے گنتی میں زیادہ نہ تھے اور نہ ہم سے قوی و توانا تر تھے۔ رہا تمہارا یہ قول کہ فرمانروا ہماری سپر ہیں تو اسے ٹوٹنے دیجئے ہم خود اپنی سپر بن جائیں گے۔

اسی طرح بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا اور آپس میں سوال و جواب ہوتا رہا۔ ایک مرتبہ معاویہ نے دوران گفتگو میں کہا کہ قریش سے یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ میرا باپ ابوسفیان قریش میں سب سے زیادہ معزز و باوقار تھا البتہ آنحضرت کو نبوت مل گئی جو کسی اور کو نہ مل سکی۔ اگر تمام لوگ ابوسفیان کی اولاد ہوتے تو سب کے سب زیرک و دانا ہوتے۔ صعصعہ نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ حضرت آدم جو ابوسفیان سے بہرحال بہتر تھے اللہ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ان میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو ان کے سجدہ پر مامور فرمایا۔ اور ان کی اولاد میں عقلمند بھی ہیں اور بے وقوف بھی اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ معاویہ سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور چپ سادھ لی۔ ایک اور ملاقات میں کہا کہ تمہیں اپنی بھلائی پر نظر کرنا چاہیے۔ جو تمہارے

اور تمہارے قبیلہ اور عامہ اہل اسلام کے لئے مفید ہو۔ صعصعہ نے کہا کہ یہ تم نے نیکی و ہدایت کا درس دینا کب سے شروع کیا ہے کیا اس میں کوئی فلاح و بہبود کا پہلو ہے کہ ہم اللہ کی معصیت کرتے ہوئے تمہاری اطاعت کریں۔ معاویہ نے کہا کہ میں نے یہی تو کہا ہے کہ اللہ سے ڈرو، نبی کی پیروی کرو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ پردازی سے باز آؤ۔ صعصعہ نے کہا کہ تم نے کب رسول کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی اور تفرقہ و انتشار کو ہوا نہیں دی۔ معاویہ نے کہا کہ اگر ایسا ہوا ہو تو میں توبہ کرتا ہوں اور اب تمہیں تقوی و اطاعت اور جماعت سے وابستگی کا حکم دیتا ہوں تم اپنے حکمرانوں کی عزت و توقیر کرو اور ان سے تعاون کرتے ہوئے دوستی و خیر خواہی کی فضا میں انہیں مشورے دو۔ صعصعہ نے کہا کہ پھر ہم تمہیں خلوص نیت سے یہ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ تم امارت شام کے منصب سے الگ ہو جاؤ اور جو اس منصب کا تم سے زیادہ حقدار ہے اس کے لئے جگہ خالی کرو۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ عرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کے اسلامی خدمات تم سے کہیں زیادہ ہیں کہا کہ یہ صحیح ہے مگر اس وقت بار حکومت اٹھانے کا مجھ سے زیادہ کوئی اہل نہیں ہے۔ اگر مجھ میں کوئی کمزوری ہوتی تو حضرت عمر میری پاسداری نہ کرتے اور مجھے اس عہدہ پر باقی نہ رہنے دیتے۔ لہذا امارت شام سے دستبردار ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا یہ مشورہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان کی اطاعت کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس پر صعصعہ اور دوسرے لوگ بگڑ گئے۔ اور معاویہ پر جھپٹے۔ معاویہ نے کہا کہ یہ کوفہ نہیں ہے۔ سر زمین شام ہے اگر یہاں کے لوگوں کو تمہاری اس حرکت کا علم ہو گیا تو وہ تمہیں قتل کئے بغیر نہیں رہیں گے یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور منزل پر پہنچ کر حضرت عثمان کو تحریر کیا کہ وہ لوگ جو ہمارے یہاں آئے ہیں انہیں نہ عقل و شعور سے واسطہ ہے اور نہ دین و مذہب سے لگاؤ۔ ان کا مقصد صرف فتنہ گری اور شر انگیزی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ لوگ یہاں رہے تو فتنہ و شر پھیلائیں گے اور شامیوں کو آمادہ بغاوت کریں گے لہذا مناسب ہو گا کہ انہیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ حضرت عثمان نے لکھا کہ انہیں سعید ابن عاص کے پاس کوفہ روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں واپس کوفہ بھیج دیا گیا۔ سعید سے کشیدگی تو تھی ہی یہاں آنے پر حالات رو باصلاح ہونے کے بجائے اور بگڑ گئے۔ حضرت عثمان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مالک اشتر کو تحریر کیا کہ تم لوگ کوفہ خالی کر دو اور یہاں سے حمص چلے آؤ۔ اشتر نے یہ فرمان پڑھا تو کہا:۔

اللهم اسوأنا نظر للراعية	بار الہا! ہم میں سے جو رعیت کا بدخواہ اور
واعملنا فيهم بالمعصية فعجل	ان کے حق میں معصیت کار ہو اس پر بجلد عذاب

له النقمة۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ صفحہ ۳۶۶) نازل کرے"

یہ لوگ کوفہ سے حمص چلے آئے والیٔ حمص عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید نے ان کی تذلیل و تحقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انہیں طرح طرح کے شدائد و آلام میں جکڑے رکھا۔ جب انہیں ایک مہینہ قید و بند میں سختیاں جھیلتے گزر گیا تو انہیں پھر کوفہ بھیج دیا گیا۔ اب رعایا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا لوگ عثمانی عمال کے ہاتھوں پہلے ہی نالاں تھے کہ حضرت عثمان کے اس طرز عمل سے جوان معزز و سربلند افراد کے ساتھ روا رکھا گیا ہر طرف غضب و انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے۔ نظم مملکت تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ حضرت عثمان ان بدلے ہوئے حالات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس ہمہ گیر شورش کو دبانے کے لئے ۳۴ھ میں عمال و حکام کو مدینہ میں طلب کیا۔ سعید ابن عاص بھی کوفہ سے مدینہ آیا اور جب یہاں سے فارغ ہو کر کوفہ کی طرف پلٹا تو قادسیہ کے قریب جرعہ کے مقام پر اسے روک دیا گیا اور مالک اشتر اور اُن کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ ہم تمہیں کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے تم جدھر سے آئے ہو ادھر واپس چلے جاؤ۔ سعید نے کچھ حیل حجت کی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی اور سب نے کہا کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے، کہ واپس پلٹ جاؤ اب عوام کے ریلے کو روکنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ وہ وہیں سے واپس مدینہ آ گیا۔ حضرت عثمان نے اس کی جگہ ابو موسیٰ اشعری کو بھیج دیا۔ جن کی کارگزاریوں کا تذکرہ جمل اور تحکیم کے سلسلہ میں ہو گا۔

قصاص خون عثمان

قصاص یعنی خون کے بدلے خون ایک ایسا ضابطہ ہے جسے نہ عقل غلط کہتی ہے اور نہ شرع بلکہ تمام ملل و ادیان اس کی ضرورت پر متفق ہیں مگر ہر قاعدہ و قانون میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور یہ ضابطہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی جرم کی پاداش میں قتل کر دیا جاتا ہے یا کوئی شخص اپنی جان کے بچاؤ کے لئے حملہ آور کو قتل کر دیتا ہے جب کہ جان کا تحفظ اس کے قتل پر منحصر ہو تو ان دونوں صورتوں میں اگرچہ فعل قتل کا ارتکاب ہوا ہے مگر نہ شرع قصاص کا حکم دیتی ہے اور نہ عقل۔ اسی طرح متعدد ایسے موارد شمار کئے جا سکتے ہیں جہاں قصاص کا حکم عائد نہیں ہوتا جہاں تک نفسِ قصاص کا تعلق ہے اس کی مشروعیت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے البتہ اس کے موارد میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

امیرالمومنین کے مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جب قصاص خونِ عثمان کا مسئلہ چھڑا تو یہ مسئلہ بھی اختلافی بن گیا یا بنا دیا گیا اور لوگ دو مختلف اور متضاد گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ حضرت عثمان کے قتل کو جائز قرار دیتا تھا اس کے نزدیک قصاص کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور ایک گروہ اس قتل کو ناروا سمجھتا تھا اور قصاص کا پُرزور حامی تھا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ مطالبہ صحیح تھا یا غلط جو بھی صورت ہو عملی اعتبار سے یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا کہ اس کا فوری حل نکل آتا اور ان پیچیدگیوں اور دشواریوں کو بآسانی دور کیا جاسکتا جو اس راہ میں حائل تھیں اگر امیرالمومنین اس قتل کو ناروا سمجھتے ہوئے قصاص کی طرف متوجہ ہوتے تو اس گروہ کے بگڑنے کا اندیشہ تھا جو اس قتل کو بر بنائے تاویل جائز سمجھتا تھا۔ اور قصاص کے خلاف تھا۔ اور اگر قصاص سے پہلو تہی کرتے تو وہ گروہ آمادۂ بغاوت نظر آتا تھا جو اس خون کو خونِ ناحق قرار دیتا تھا۔ اس وقت ایک طرف جھکاؤ انتہائی خطرناک تھا اور حکومت میں بھی اتنا دم خم نہ تھا کہ دونوں گروہوں کے جذبات کو متوازن سطح پر لاکر اس گتھی کو سلجھایا جاسکتا۔ ابھی نہ ملکی معاملات منضبط ہوئے تھے نہ حکومت میں استحکام پیدا ہوا تھا۔ ہر طرف کھینچا تانی اور افراتفری کا عالم تھا، نہ قصاص طلب کرنے والوں کے جذبات کو فرو کیا جاسکتا تھا اور نہ بلوائیوں کو بآسانی گرفت میں لیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جب طلحہ و زبیر اور ان کے ہم خیال لوگوں نے حضرت سے قصاص کے بارے میں کہا تو آپ نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا "جو تم جانتے ہو میں اس سے بے خبر نہیں ہوں لیکن میرے پاس اس کی قوت و طاقت کہاں ہے۔ جب کہ فوج کشی کرنے والے اپنے انتہائی زوروں پر ہیں وہ اس وقت ہم پر مسلط ہیں ہم ان پر مسلط نہیں اور عالم یہ ہے کہ تمہارے غلام بھی اُن کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور صحرائی عرب بھی اُن سے مل جل گئے ہیں اور اس وقت بھی وہ تمہارے درمیان اس حالت میں ہیں کہ جیسا چاہیں تمہیں گزند پہنچا سکتے ہیں۔ کیا تم جو چاہتے ہو اس پر قابو پانے کی کوئی صورت تمہیں نظر آتی ہے۔"

حضرت نے اس وقت کے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس وقت مدینہ پر بلوائی چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف انہی کا عمل دخل تھا۔ وہ جو چاہتے کرتے کسی کو ان کے خلاف عملی اقدام تو در کنار لب کشائی کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اگر امیرالمومنین اس وقت قصاص کے لئے قدم اٹھاتے تو ایسا نہ تھا کہ وہ چپکے سے تلوار کے آگے سر خم کر دیتے اور کوئی مزاحمت نہ کرتے بلکہ وہ پوری قوت و طاقت سے مقابلہ کرتے اور وہ خونی ہنگامہ برپا ہوتا کہ مدینہ کے کوچہ و بازار لاشوں سے پٹ جاتے۔ آخر وہ اتنے کمزور نہ تھے کہ بآسانی ان پر قابو پا لیا جاتا۔ اگر وہ اتنے ہی کمزور ہوتے تو محاصرہ کے دنوں میں ہی طالبانِ

قصاص اہلِ مدینہ کے تعاون سے انہیں روکتے قتل سے مانع ہوتے اور اگر باز نہ آتے تو ان سے جنگ کرتے مگر اس وقت تو ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور گھروں کے گوشوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اور جب حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو حضرت پر قصاص کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ان بلوائیوں کی قوت و طاقت اور ان کے مقابلہ میں اپنی کمزوری و بے بسی کے یہ خود معترف تھے۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے حضرت کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا اور حضرت عائشہ نے یہ رائے دی کہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہیئے کیونکہ قاتلانِ عثمان مدینہ ہی میں ہیں تو طلحہ و زبیر اور دوسرے لوگوں نے کہا:۔

یا ام المومنین دعی المدینة فان	اے ام المومنین مدینہ کا ارادہ ترک کیجئے اس لئے
من معنا لا یقرنون لتلک الغوغاء	کہ وہ لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان بلوائیوں کا
التی بها واشخصی معنا الی البصرة	مقابلہ نہیں کر سکتے جو مدینہ میں ہیں آپ ہمارے
(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۴۹۹)	ہمراہ بصرہ چلئے"

جب یہ لوگ سامانِ جنگ اور فوجی طاقت کے ہوتے ہوئے مدینہ میں جنگ نہیں چھیڑتے اور عذر یہ کرتے ہیں کہ بلوائیوں کے مقابلہ کی قوت و طاقت اپنے اندر نہیں پاتے اور اگر یہی عذر حضرت پیش کریں تو اس کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کیوں۔ اگر ان لوگوں کا مقصد قصاص ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قاتلین کو مدینہ میں چھوڑ کر بصرہ کا رخ کرتے ان کا مقصد تو قصاص کی آڑ میں حضرت کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا تھا تاکہ حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں ورنہ یہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ آخر قصاص کس سے لیا جائے جب کہ حضرت عثمان کے قتل کی ذمہ داری ایک یا دو چار گنے چنے افراد پر عائد نہیں ہوتی بلکہ مدینہ، مصر، بصرہ اور کوفہ کے لوگ اس میں شریک تھے اور وہ صحابہ بھی اس میں ملوث تھے جنہوں نے خطوط لکھ کر بلوائیوں کو حضرت عثمان کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اور وہ مہاجرین و انصار اور صحابہ کبار بھی شامل تھے جنہوں نے بیرونی حملہ آوروں کی پشت پناہی کی تھی۔ اگر وہ ان کی حمایت و پشت پناہی نہ کرتے تو انہیں خلیفۂ وقت کو محاصرہ میں لے کر قتل کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔

اب قصاص کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں اس میں حصہ لیا تھا تہ تیغ کر دیا جاتا خواہ کوئی صحابی ہو یا تابعی، مدنی ہو یا مصری، کوفی ہو یا بصری اور دوسری صورت یہ تھی کہ بلوائیوں کی جماعت میں سے اصلی قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا اور انہیں قصاصاً قتل کیا جاتا۔ پہلی صورت ممکن ہی نہ تھی اور نہ اس کا کوئی شرعی جواز تھا کہ ایک کے بدلے میں ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور دوسری صورت میں ضروری تھا کہ قاتلوں کی نشاندہی کی جاتی ان کے خلاف شہادتیں ہوتیں اور

ثبوت جرم کے بعد انہیں قتل کیا جاتا مگر ان کے خلاف گواہی کی نوبت تو اس وقت آتی جب کوئی موقع واردات پر موجود ہوتا۔ جو چند اموی حضرت عثمان کے گھر میں جمع تھے وہ تو حملہ کے وقت اِدھر اُدھر ہو گئے یا ام حبیبہ کے گھر میں جا چھپے اور جو رہ گئے وہ مارے گئے البتہ حضرت عثمان کی زوجہ نائلہ بنتِ فرافصہ موقع پر موجود تھیں تو وہ کسی کی نشاندہی نہ کر سکیں۔ چنانچہ امیرالمومنین نے قاتلوں کے بارے میں ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا:۔

لا ادری دخل علیہ رجلان لا اعرفہما و معہما محمد ابن ابی بکر۔ (صواعق محرقہ۔ ص ۱۱۵)	مجھے معلوم نہیں ہے البتہ محمد ابن ابی بکر کے ساتھ دو آدمی اندر گھسے تھے میں ان دونوں کو نہیں پہچانتی۔"

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قاتل زندہ موجود تھے اور ان پر قتل کا جرم بھی ثابت تھا پھر بھی اس امر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا وجوہ تھے جن کی بناء پر وہ قتل ایسے سنگین جرم پر اُتر آئے۔ یہ امر تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ قتل ہنگامی جذبات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مسلسل گفت و شنید اور باہمی مفاہمت کی ناکامی کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی۔ چنانچہ مختلف شہروں کے وفود حضرت عثمان کے ہاں آتے رہے۔ عمال کی بے عنوانیاں ان کے گوش گزار ہوتی رہیں اور وہ ہر مرتبہ رفع شکایات کے وعدے کرتے رہے۔ مگر یہ وعدے کسی منزل پر پورے نہ ہوئے جب انہیں وعدے یاد دلائے گئے اور عمال کی برطرفی پر زور دیا گیا تو یہ جواب دیا گیا:۔

ان کنت مستعملا من اردتم وعازلا من کرہتم فلست فی شیئ والامر امرکم۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۸۹)	جسے تم چاہو میں عامل مقرر کروں اور جسے تم نہ چاہو اسے معزول کروں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں کوئی چیز ہی نہیں اور حکم چلتا ہے، تو تمہارا چلتا ہے۔"

اس پر ان لوگوں کو برہم ہونا ہی تھا انہوں نے بگڑ کر کہا کہ اگر مظالم کا ازالہ اور عمال کی برطرفی آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو خلافت سے دستبردار ہو کر گھر میں بیٹھ جائیے ہم آپ سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہم آخری قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ تم کس جرم کی پاداش میں مجھے قتل کرو گے۔ قتل سزا ہے ارتداد کی یا زنائے محصنہ کی یا قتل ناحق کی اور میں ان چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی مرتکب نہیں ہوا انہوں نے کہا کہ جو زمین میں فساد پھیلائے یا باغیانہ قدم اٹھائے یا دوسروں کے حقوق میں حائل ہو کر قتال کرے ان کے لئے بھی کتاب اللہ میں قتل کا

حکم ہے اور آپ ان تمام چیزوں کے مرتکب ہوئے ہیں آپ نے حکومت کے بل پر معزز ترین صحابہ کو پٹوایا انہیں خوفزدہ کیا اور دربدر پھرایا رعایا پر مظالم ڈھائے لوگوں کے حقوق پامال کئے اور حق کا مطالبہ کرنے والوں کے سروں پر تلواریں آویزاں کیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ لوگ جو تلواریں لئے آپ کے سینہ سپر بنے ہوئے ہیں آپ کی مرضی کے خلاف لڑ بھڑ رہے ہیں تو وہ اسی لئے تو لڑ رہے ہیں کہ آپ مسند خلافت سنبھالے ہوئے ہیں اگر آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو ان کی تلواریں بھی کند ہو جائیں گی اور وہ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ حضرت عثمان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور خاموشی کے ساتھ اندر چلے گئے۔

اس گفتگو سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے آخری قدم اس وقت اٹھایا جب حضرت عثمان پر حجت تمام کر دی اور یہ سمجھ لیا کہ قرآن و سنت کی رُو سے اُن کا قتل جائز ہے اور اس جواز کو تقویت ان صحابہ کے قول و عمل سے بھی حاصل ہوئی جو اس قتل کے جواز پر متفق تھے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ طلحہ ابن عبیداللہ، زبیر ابن عوام، عمرو ابن عاص اور دوسرے اکابر صحابہ قتل کے جواز کے فتوے دے رہے تھے۔ اگر جنگ جمل میں طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے اقدام کو اجتہادی غلطی قرار دیا جاتا ہے۔ تو اس موقع پر بھی ان کے اجتہاد کو تسلیم کر کے اسے کم از کم اجتہادی غلطی قرار دینا چاہئے۔ بہر حال ان لوگوں نے قرآنی شواہد پیش کرنے کے بعد یہ اقدام کیا اور بربنائے تاویل قتل کے مرتکب ہوئے اور جو قتل تاویل کی بناء پر ہو اس میں شرعاً قصاص کا جواز ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری تحریر کرتے ہیں:۔

انما لم یقتل علی قتلۃ عثمان لانھم کانوا ابغاۃ اذا الباغی لہ منعۃ و تاویل و کانوا فی قتلہ متاولین و کان لھم منعۃ فانہم کانوا مستحلین ذلک بما نقموا من الامور والحکم فی الباغی اذا انقاد لامام العدل ان لا یواخذ بما سبق من اتلاف اھل العدل وسفک دمائھم و	حضرت علی نے عثمان کے قاتلین کو قتل نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ باغی تھے اور جو باغی ہوتا ہے وہ قوت و طاقت بھی رکھتا ہے۔ اور اپنے اقدام کے جواز کی تاویل بھی۔ وہ لوگ حضرت عثمان کے قتل میں تاویل بھی رکھتے تھے اور حکومت سے ٹکراؤ کی قوت بھی۔ اور حضرت عثمان کی ناپسندیدہ باتوں کی وجہ سے اس اقدام کو جائز و حلال سمجھتے تھے۔ اور ایسے باغیوں کا حکم شرعی یہ ہے کہ جب وہ امام عادل کے مطیع ہو جائیں تو جو کچھ وہ پہلے اہل عدل کا نقصان کر چکے ہوں ان کا خون بہا چکے ہوں اور ان کے بدنوں کو مجروح کر چکے ہوں

جرح ابدا انهم فلم يجب عليه قتلهم ولا دفعهم الى الطالب۔ (شرح فقہ اکبر۔ صـ)

ان سے ان چیزوں کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ لہذا حضرت علی کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ انہیں قتل کریں۔ یا قصاص طلب کرتے والوں کے حوالے کریں۔"

جنگِ جمل

جنگِ جمل تاریخ اسلام کی وہ بلاخیز و ہلاکت آفریں جنگ ہے جو امیرالمومنین کے اوائل عہد حکومت میں خونِ عثمان کے نام پر لڑی گئی اس خونریز جنگ کے نتائج و عواقب اور تفریق بین المسلمین کی ذمہ داری بڑی حد تک ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر پر عائد ہوتی ہے جو حضرت عثمان کے خون کا قصاص لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ یہی لوگ ان کی زندگی میں سخت مخالفت کرتے اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رسول اللہ کے نعلین اور پیراہن مبارک کو حضرت عثمان کے سامنے رکھ کر برملا کہا کرتی تھیں کہ ابھی یہ چیزیں کہنہ بھی نہیں ہونے پائیں کہ تم نے رسولِ خدا کے دین اور ان کے سنن و احکام کو سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حضرت عائشہ عوامی مزاج کے سمجھنے میں کافی درک رکھتی تھیں انہوں نے عوام کے جذبات بھڑکانے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو موثر ترین ہو سکتا تھا وہ سمجھتی تھیں کہ لوگ پیغمبر سے والہانہ عقیدت کی بناء پر آپ کے جسم مبارک سے مس ہونے والے آثار کو دیکھنے کی انتہائی تڑپ رکھتے ہیں اور جب یہ چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں گی تو ان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان چیزوں کو دیکھتے ہی لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے قصر خلافت کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اور جب ام المومنین نے یہ دیکھا کہ محاصرین کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے تو مروان ابن حکم، عبدالرحمٰن ابن عتاب اور زید ابن ثابت کے روکنے کے باوجود حضرت عثمان کو محاصرہ میں چھوڑ کر مکہ روانہ ہو گئیں اور دورانِ سفر میں بھی لوگوں کو ان کے خلاف کہتی سنتی اور برانگیختہ کرتی رہیں۔ چنانچہ جب مدینہ سے سات میل کے فاصلہ پر مقام صلصل میں پہنچیں تو ابن عباس سے جو امیرحج کی حیثیت سے مکہ جا رہے تھے پرزور الفاظ میں کہا:۔

يا ابن عباس انشدك الله فانك قد اعطيت لسانا ازعيلا ان تخذل الناس من هذا الرجل

اے عباس تم کو گویائی و چرب زبانی کا جوہر عطا ہوا ہے میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ تم لوگوں کو اس شخص (عثمان) کی مدد سے روکو۔ اور

وان تشکک فیه الناس فقد	ان کے بارے میں لوگوں کو شک وشبہ میں ڈالو۔
بانت لهم بصائرهم وانهجت	یوں بھی لوگوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔حقیقت
ورفعت لهم المنار وتجلبوا من	کی راہ ہموار اور روشنی کا مینار بلند ہو چکا ہے
البلدان لامر قد حم وقد	لوگ مختلف شہروں سے فیصلہ کن امر کے لئے جمع
رأیت طلحة ابن عبید الله قد	ہو چکے ہیں آپ جانتے ہیں کہ طلحہ ابن عبید اللہ
اتخذ علی بیوت الاموال والخزائن	بیت المال اور خزانے کی کنجیوں پر قابض ہو چکا
مفاتیح فان یل یسره بسیرة ابن	ہے اگر خلافت اس کے سپرد کی گئی تو وہ قدم بقدم
عمه ابی بکر (تاریخ طبری۔ ج ۔ص ۴۳۴)	اپنے ابن عم ابو بکر کی سیرت پر چلے گا۔“

حضرت عائشہ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی چھ سالوں تک تو ان کی خیر خواہی و ہمنوائی کرتی رہیں مگر اس کے بعد اُن سے ان بن ہو گئی اور علانیہ مخالفت پر اتر آئیں۔ اس عناد و مخالفت کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ حضرت عثمان نے ان کا وہ وظیفہ جو انہیں سابقہ حکومت کی طرف سے ملتا تھا کم کر دیا تھا۔ چنانچہ مؤرخ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

وکان بین عثمان وعائشة منافرة	حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کے درمیان نفرت
وذالك انه نقصها مما کان	کی خلیج حائل تھی اور انہوں نے وہ وظیفہ جو انہیں
یعطیها عمر ابن الخطاب وصیرها	حضرت عمر دیا کرتے تھے کم کر دیا اور رسول خدا
اسوة غیرها من نساء رسول الله	کی دوسری بیویوں کے برابر انہیں دینا شروع کر
(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۳۲)	دیا۔“

حضرت عثمان اور ان کے عمال کی آمرانہ روش کی وجہ سے فضا کچھ تو پہلے ہی ان کے خلاف تھی کہ ام المومنین کی اشتعال انگیز باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

آتشم تیز است و داماں مے زنم

اس مخالفت نے زور پکڑ لیا اور لوگ ان کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے خصوصاً طلحہ ابن عبید اللہ اور ان کا قبیلہ بنی تیم اس مخالفت میں پیش پیش تھا۔ طلحہ نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے اور ان کے قتل کے اسباب فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

لم یکن احد من اصحاب النبی	اصحاب نبی میں طلحہ سے بڑھ کر
اشد علی عثمان من طلحة۔	حضرت عثمان پر سخت گیر کوئی

(انساب الاشراف - ج ۵ - ص ۱۳۳) نہ تھا"

چنانچہ انہی نے محاصرہ کے دنوں میں لوگوں کو ان تک پانی پہنچانے سے منع کیا۔ انہی نے رات کے اندھیرے میں ان کے گھر پر تیر برسائے اور لوگوں کو ان کے خلاف مشتعل کیا اور گھیراڈالنے والوں کے سرگروہ اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے اصحابی عبدالرحمٰن ابن عدیس کو تاکید کی کہ وہ کسی کو ان کے گھر کے اندر جانے اور باہر نکلنے کی اجازت نہ دے۔ حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا:۔

اللھم اکفنی طلحۃ ابن عبید اللہ — خدایا مجھے طلحہ ابن عبیداللہ کے شر سے بچائے رکھ

فانہ حمل علیٰ ھٰؤلاء والبھم — اسی نے لوگوں کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ اور

(تاریخ طبری - ج ۳ - ص ۴۱۱) — میرے گرد گھیراڈلوایا ہے"

طلحہ کا یہ رویہ حضرت عثمان کی زندگی تک ہی نہ تھا بلکہ ان کے قتل کے بعد بھی ان کی روش میں فرق نہ آیا اور ان کی نعش پر اور تجہیز و تکفین کرنے والوں پر پتھر برسوائے اور جنۃ البقیع میں دفن ہونے سے مانع ہوئے۔

اسی طرح زبیر جن کے گھر میں حضرت عائشہ کی ہمشیرہ اسماء تھیں محاصرہ کے دنوں میں لوگوں کو یہ کہتے سنے گئے:۔

اقتلوہ فقد بدل دینکم۔ — عثمان کو قتل کر دو اس نے تو تمہارا دین ہی بدل

(شرح ابن ابی الحدید - ج ۲ - ص ۴۰۴) — ڈالا ہے"

انہی لوگوں نے حضرت عثمان کے قتل کی بنیاد رکھی اور ان کے خلاف ایسی فضا پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں وہ قتل کر دیئے گئے۔ اگر قتل عثمان جرم تھا تو ان لوگوں کو اس جرم سے بری قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اعانتِ جرم بھی جرم ہوتی ہے۔ اگرچہ ام المومنین قتل عثمان کے موقع پر مدینہ میں موجود نہ تھیں مگر انہوں نے مدینہ قتل عثمان سے صرف بیس دن پہلے چھوڑا تھا جب کہ انہیں اپنے لگائے ہوئے پودے کے بارآور ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ اس موقع پر روانگی کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ مدینہ کی شورش و ہنگامہ آرائی سے انہیں بے تعلق سمجھا جائے اور جب وہ قتل ہو جائیں تو طلحہ یا زبیر کو برسراقتدار لاکر اس مالی نقصان کو جو انہیں موجودہ حکومت سے پہنچا تھا تلافی کر لیں مگر ام المومنین اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہوسکیں اور اہلِ مدینہ نے ان کی عدم موجودگی میں حضرت علی کی خلافت کا فیصلہ کر لیا۔

طلحہ و زبیر حضرت عمر کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے نامزد رکن تھے اور اس رکنیت کی وجہ سے اپنے ذہن کو خلافت کے تصور سے خالی نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ قتل عثمان کے سلسلہ میں تگ و دو اسی مقصد

کے حصول کے لئے تھی۔ مگر جب یہ دیکھا کہ لوگ حضرت علی کی خلافت پر مصر ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور کی بیعت پر رضامند نہیں ہیں اور نہ ان کے سوا کوئی دوسرا ان کے معیار پر پورا اترتا ہے تو انہوں نے رائے عامہ کا رُخ دیکھ کر بیعت میں پیش قدمی کی اور اطاعت و سرافگندگی کا اظہار کرتے ہوئے بیعت کر لی۔ اگر انہیں برسر اقتدار آنے کی کچھ بھی گنجائش نظر آتی تو وہ ہاتھ پیر مارتے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ "مگر عصمت بی بی از بے چادری" انہیں چپ سادھنا پڑی اور چپ کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت دو گروہوں میں سے ایک گروہ کی پشت پناہی ضروری تھی اور انہیں کسی ایک گروہ کی بھی حمایت حاصل نہ تھی۔ ایک گروہ وہ جو حضرت عثمان کے عادات و اطوار اور ان کے طرزِ عمل سے نالاں تھا اور ایک وہ جو ان سے وابستگی کی بنا پر ان کا دوست و ہمنوا تھا۔ وہ گروہ جو ان کے طرزِ عمل کا شکوہ سنج تھا وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی برسر اقتدار لانا نہ چاہتا تھا اس لئے کہ ان کے طور طریقے بھی وہی تھے جن طور طریقوں کی وجہ سے لوگ حضرت عثمان کے خلاف ہو گئے تھے اور انہیں اپنا رویہ بدلنے یا خلافت سے دستبردار ہونے پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان اگر دولت کی جمع آوری کی طرف مائل تھے تو انہیں بھی زہد و قناعت سے کوئی ربط اور سادگی و سادہ معاشرت سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ دولت کے بے پناہ ذخائر کے باوجود حرص و آز کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دولت پر دولت سمیٹتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ طلحہ نے عراق و سراۃ میں کثیر جائیدادیں پیدا کیں کوفہ و بصرہ میں محلات تعمیر کئے اور بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑ گئے ابن عبدربہ نے تحریر کیا ہے:۔

لما قتل طلحة ابن عبید الله وجدوا فی ترکته ثلثمائة بهار من ذهب وفضة۔	جب طلحہ ابن عبید اللہ مارے گئے تو ان کے ترکہ میں پوری پوری کھال کے بنے ہوئے تین سو تھیلے پائے گئے جن میں سونا اور چاندی بھری ہوئی تھی۔

(عقد الفرید۔ ج ۲۔ ص ۲۰۳)

زبیر ابن عوام بھی اپنے دور میں امیر الامراء اور عظیم سرمایہ دار تھے۔ چنانچہ ذہبی نے تحریر کیا ہے:۔

کان له الف مملوك یؤدون الیه الخراج۔	ان کے ہاں ایک ہزار غلام تھے جو انہیں خراج ادا کرتے تھے۔

(تاریخ اسلام۔ ج ۲۔ ص ۱۵۴)

انہوں نے اسکندریہ مصر بصرہ اور کوفہ میں قصر تعمیر کئے اور غلاموں کنیزوں اور اونٹ گھوڑوں کے علاوہ ان کی سینت سینت کے رکھی ہوئی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وصیت کے مطابق

ایک تہائی ان کے پوتے کو دینے کے بعد:۔

صار لکل امرأة من نسائه۔	ان کی چاروں بیویوں میں سے ہر ایک کو گیارہ
وکان له اربع نسوة۔ فی ربع	گیارہ لاکھ ملا جو آٹھویں حصہ کی ایک چوتھائی
الثمن الف الف ومائة الف۔	تھا"

(عقد الفرید۔ ج ۲۔ ص۲۴)

اب رہا دوسرا گروہ جو حضرت عثمان کا ہواخواہ تھا تو وہ ان دونوں کو قتل عثمان کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کرنے کی وجہ سے مسند خلافت پر دیکھ نہ سکتا تھا۔ اگرچہ طلحہ نے حضرت عثمان کی زندگی ہی میں بیت المال کی کنجیوں پر قبضہ کرکے خلافت کی تمہید بٹھالی تھی مگر نہ انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور نہ زبیر کو۔

جب مسند اقتدار کو خالی کروانے کے باوجود انہیں مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو جزوی اقتدار کی کی طرف رخ کیا اور بیعت کے دوسرے ہی دن حضرت سے یہ مطالبہ کردیا کہ انہیں کوفہ وبصرہ کی امارت دے دی جائے اور بیعت میں پیش قدمی کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس طرح حضرت کو ممنونِ احسان کرکے حکومت میں کوئی امتیازی عہدہ حاصل کرلیں۔ مگر حضرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ مملکت کے ان علاقوں کو جو حکومت کے محاصل کا سرچشمہ تھے ان کی بڑھتی ہوئی حرص وہوس کی آماجگاہ بننے دیں۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں تمہارے معاملہ میں جو بہتر سمجھوں گا وہ کروں گا فی الحال تم دونوں کا مرکز میں میرے قریب رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ چونکہ انہیں کوفہ وبصرہ میں اثر ونفوذ حاصل ہے اور انہی کی بھاگ دوڑ سے وہاں کے لوگ مرکزی حکومت میں انقلاب لانے کے لئے جمع ہوئے تھے اس لئے حضرت ان کے اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے بلا تامل انہیں کوفہ وبصرہ کی حکومت کا پروانہ دے دیں گے اور رکن شوریٰ ہونے کی وجہ سے وہ اسے اپنا جائز حق بھی سمجھتے تھے مگر انہیں یاس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اس حکومت میں نہ انہیں من مانی کرنے کا موقع ملے گا اور نہ وہ خصوصی مراعات حاصل ہوں گی جو سابقہ حکومتوں میں حاصل تھیں۔ اب انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے غیر آئینی خطوط پر سوچنا شروع کردیا اور اپنی نگاہوں کا رُخ حضرت عائشہ کی نقل وحرکت کی طرف موڑ دیا تاکہ ان کے عزائم کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیں۔

حضرت عائشہ یہ چاہتی تھیں کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد طلحہ کو برسراقتدار لائیں اور اس طرح خلافت کو مستقل طور پر اپنے قبیلہ بنی تیم میں منتقل کردیں اس لئے وہ مکہ میں قیام کے بعد بلوائیوں کی یورش

کا نتیجہ سننے کے لئے بے چین رہتی تھیں اور ہر آنے جانے والے سے مدینہ کے حالات اور حضرت عثمان کے انجام کے بارے میں دریافت کرتی رہتی تھیں۔ اس اثنا میں مدینہ سے اخضر نامی ایک شخص مکہ آیا۔ حضرت عائشہ نے اسے بلوا کر پوچھا کہ مدینہ کی شورش انگیزی کا کیا نتیجہ ہوا اس نے کہا کہ حضرت عثمان نے مصر کے بلوائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور ہنگامہ و شورش پر قابو پا لیا ہے۔ ام المومنین تو دوسرے ہی قسم کے تصورات کی پخت و پز میں مصروف تھیں کہ اس خبر نے ان کے خیالات کا شیرازہ درہم برہم کر دیا اور انہوں نے تاسف آمیز لہجہ میں کہا:۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔	انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کیا ان لوگوں کو قتل
ایقتل قوماجاؤ وایطلبون	کر ڈالا ہے جو اپنا حق مانگنے اور ظلم کے خلاف
الحق وینکرون الظلم واللہ	آواز بلند کرنے کے لئے آئے تھے۔ خدا کی قسم ہم
لانرضی بھذا۔ (تاریخ طبری۔ ج۔ ص)	اس پر راضی نہیں ہیں۔"

ابھی وہ افسردگی و دل شکستگی کی حالت میں تھیں کہ ایک دوسرے شخص نے آکر بتایا کہ اخضر کی دی ہوئی اطلاع غلط ہے مصریوں میں سے کوئی نہیں مارا گیا۔ وہ مدینہ میں کھلے بندوں دندناتے پھر رہے ہیں بلکہ حضرت عثمان ان کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ یہ سن کر ام المومنین کو ایک گونہ اطمینان ہوا اور کہنے لگیں:۔

ابعدہ اللہ ذلک بما قدمت	خدا اسے اپنی رحمت سے دور رکھے یہ اس کی
یداہ وما اللہ بظلام للعبید۔	کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور خدا تو اپنے بندوں پر
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص)	ظلم نہیں کرتا۔"

اب مکہ میں قیام کے بجائے مدینہ جانا ان کے لئے ضروری ہو گیا تاکہ اپنے اثر و نفوذ سے مخالف رایوں کو دبا کر جسے برسر اقتدار لانا چاہتی تھیں اس کے لئے فضا سازگار بنائیں۔ چنانچہ فوراً سفر کا ساز و سامان کیا اور مدینہ روانہ ہو گئیں۔ ابھی مکہ سے چھ میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ مقام سرف پر عبید ابن ابی سلمہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ آپ نے حضرت عثمان اور مدینہ کے سیاسی اوضاع کے بارے میں اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کہا کہ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ اہل مدینہ نے حضرت علی کی بیعت کر لی ہے۔ سننے کو تو یہ سن لیا مگر زمین پیروں تلے سے کھسکتی اور آسمان دھواں بن کر اڑتا نظر آنے لگا۔ کانوں کو یقین نہ آیا تو پھر پوچھا کہ کیا علی کی بیعت ہو گئی؟ کہا کہ ہاں علی کی بیعت ہو چکی اور ان سے زیادہ اس مسند پر بیٹھنے کا سزاوار تھا بھی کون۔ اب ام المومنین کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل

ہو گیا اور بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا۔

لیت هذه انطبقت علی هذه	اگر علی کی بیعت ہو گئی ہے تو کاش یہ آسمان زمین
ان تم الامر لصاحبك ردونی	پر پھٹ جائے اب مجھے مکہ واپس جانے دو۔"

ردونی۔ (تاریخ کامل۔ ج۳۔ ص۱۰۵)

چنانچہ انہی قدموں پر مکہ کا رُخ کر لیا اور قتل عثمان پر اپنے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

قتل واللہ عثمان مظلوما واللہ	خدا کی قسم عثمان مظلوم مارے گئے ہیں خدا کی قسم
لاطلبن بدمہ۔ (تاریخ کامل۔ ج۳ ص۱۰۵)	میں اُن کے خون کا انتقام لے کر رہوں گی۔"

عبید ابن ابی سلمہ اس فوری انقلاب اور متضاد طرزِ عمل کو دیکھ کر حیرت میں کھو گیا اور آگے بڑھ کر کہا کہ آپ تو عثمان کے بارے میں علانیہ اور بار بار کہا کرتی تھیں کہ:۔

اقتلوا نعثلا فقد کفر۔	اس نعثل کو قتل کر ڈالو یہ کافر ہو گیا ہے۔"

(تاریخ کامل۔ ج۳۔ ص۱۰۵)

اور اب ایک دم آپ کی رائے میں تبدیلی کیسے آگئی؟ کہا کہ ہاں میں پہلے یہی کہا کرتی تھی اور میں کیا سب ہی یہ کہا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے آخر وقت میں توبہ کر لی تھی اب میری یہ رائے پہلی رائے سے زیادہ صائب ہے۔

حضرت عائشہ کے اس عذر کی بھی ایک ہی رہی کہ حضرت عثمان نے توبہ کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب تک ام المومنین مدینہ میں موجود رہیں اس وقت تک تو توبہ کی نہ تھی ورنہ انہیں محاصرہ میں بلوائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مکہ میں نہ آتیں۔ اور مکہ میں قتل عثمان کی خبر ملنے پر بھی اس توبہ کا علم حاصل نہ ہو سکا تھا ورنہ اس قتل پر اظہار اطمینان نہ کیا جاتا۔ پھر مکہ سے وادی سرف تک کی مختصر مسافت اور مختصر مدت میں بھی کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا۔ جس سے انہیں توبہ کا علم حاصل ہوتا۔ پھر یک لخت امیرالمومنین کی خبر خلافت سن کر حضرت عثمان کی مظلومیت بھی یاد آگئی اور توبہ کا علم بھی ہو گیا۔ آخر وہ کون سے ذرائع یا کون سے قرائن تھے جن سے انہیں توبہ کا علم ہوا جب کہ آخر وقت تک تمام معاملات جوں کے توں رہے اور ان میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لوگوں کی شکایتوں کا سلسلہ ویسے ہی رہا نہ مظلموں کو ختم کیا گیا اور نہ شکایات کا ازالہ ہوا۔ اور اگر دفع الوقتی کے لئے وعدہ کیا بھی تو وہ آخر وقت تک شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔ جب ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوئی تو توبہ کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ آخر محاصرین کا مطالبہ بھی تو یہی تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے توبہ کریں اپنی روش بدلیں مظالم کو ختم کریں یا خلافت

سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر وہ مظالم کے ختم کرنے کا اقدام کر چکے ہوتے تو ان کے قتل کی نوبت ہی کیوں آتی امر واقعہ تو یہ ہے کہ جب ام المومنین اس تبدیلی کا کوئی معقول عذر پیش نہ کر سکیں تو توبہ کی بات بنائی اور لے دے کے یہی ایک بات تو بنائی جا سکتی تھی۔ مگر وہ اس بات سے عبید ابن ابی سلمہ کو مطمئن نہ کر سکیں۔ چنانچہ عبید نے صاف صاف کہہ دیا۔

عذر واللہ ضعیف یا ام المومنین — اے ام المومنین قسم بخدا یہ بالکل بودا عذر ہے "

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱۔ ص۵۲)

ام المومنین جلد از جلد مکہ پہنچ جانا چاہتی تھیں انہوں نے عبید کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گئیں۔ جب مکہ میں وارد ہوئیں تو لوگوں نے کہا کہ اے ام المومنین ابھی تو آپ روانہ ہوئی تھیں کہ پلٹ بھی آئیں۔ کہا کہ عثمان بے گناہ مارے گئے ہیں میں ان کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گی اور اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گی جب تک ان کے خون کا انتقام نہ لے لوں لوگ ان کی موجودہ اور سابقہ روش کے تضاد پر نظر کرتے ہوئے حیران تو ہوئے مگر کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گئے۔

ام المومنین نے یہاں آتے ہی عثمان کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر حضرت علی کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ جب طلحہ و زبیر کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ مکہ میں عثمان کی مظلومیت کا پرچار کر رہی ہیں اور علی کو ان کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہیں تو انہوں نے عبداللہ ابن زبیر کو چند خطوط دے کر ام المومنین کے پاس مکہ بھیجا اور ان پر زور دیا کہ وہ لوگوں کو عثمان کے بے گناہ مارے جانے کا یقین دلا کر انتقام کی تحریک چلائیں اور جس طرح بن پڑے انہیں علی کی بیعت سے روکیں۔ ان پیغامات نے اُن کے ارادہ کو اور تقویت دی اور انہوں نے پورے زور و شور سے قصاص عثمان کے نام پر لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دی۔ سب سے پہلے عبداللہ ابن عامر حضرمی نے جو حضرت عثمان کی طرف سے والی مکہ تھا اس آواز پر لبیک کہی اور سعید ابن عاص، ولید ابن عقبہ اور دوسرے اموی اُن کے ہمنوا بن کر کھڑے ہو گئے۔

طلحہ و زبیر قصاص کی آڑ میں ہنگامہ کھڑا کر کے اپنی محرومی و ناکامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن مدینہ کی فضا اس ہنگامہ آرائی کے لئے سازگار نہ تھی کیونکہ قتل عثمان کے سلسلہ میں اہل مدینہ ان کا کردار دیکھے ہوئے تھے جس کے بعد اس کی صورت نہ تھی کہ وہ انتقام کی آواز پر انہیں اپنے گرد جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ البتہ مکہ میں یہ تحریک کامیاب ہو سکتی کیونکہ ام المومنین، سابق والی مکہ عبداللہ ابن عامر مروان ابن حکم اور مدینہ سے نکل کھڑے ہونے والے بنی امیہ یہاں پر جمع تھے اور لوگوں کو حضرت کے خلاف کرنے میں پیہم مصروف تھے اور ایک طبقہ کو اپنا ہمنوا بھی بنا چکے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے چار مہینے جوں توں کر کے

مدینہ میں گزارے اور پھر اپنی مہم کی تکمیل کے لئے مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور حضرت سے کہا کہ ہمارا ارادہ عمرہ کا ہے ہمیں مکہ جانے کی اجازت دی جائے۔ آپ ان کے تیوروں کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ وہ بیعت کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر مکہ کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

واللہ ما ارادا العمرۃ ولکنھما ارادا الغدرۃ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲ ص۱۵۵)	خدا کی قسم ان کا ارادہ عمرہ کا نہیں ہے بلکہ غدر و فریب پر اتر آئے ہیں۔

امیرالمومنین مکہ جانے کا خیال اُن کے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے تھے مگر یہ خیال اُن کے ذہنوں سے نہ نکلا اور وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر حضرت نے ان سے دوبارہ بیعت لے کر انہیں مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ ان دونوں نے مکہ پہنچ کر حضرت عثمان کے خون کی ذمہ داری حضرت پر عائد کر کے ام المومنین کے موقف کی تائید کی اور ان کی جماعت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں خیال پیدا ہو کہ جب حضرت یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مقصد بیعت توڑ کر ہنگامہ آرائی کرنا ہے تو انہیں مکہ جانے کی اجازت ہی کیوں دی اس طرح تو حضرت نے خود اپنے خلاف حریف کو صف آرائی کا موقع دیا۔ اگر انہیں اجازت نہ دی جاتی تو وہ نہ فوج کشی کر کے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کرتے نہ انتشار و بدامنی پھیلاتے اور نہ بصرہ کی خونریز جنگ کی نوبت آتی۔ مگر جب اس صورت کے علاوہ دوسری متبادل صورتوں کو دیکھا جاتا ہے تو پھر یہی ایک صورت قابل عمل اور تقاضائے وقت کے مطابق نظر آتی ہے ان متبادل صورتوں میں سے ایک صورت تو یہ تھی کہ پیش بندی کرتے ہوئے انہیں پابند مسکن کر دیتے اور کہیں آنے جانے سے روک دیتے۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ من وعن ان کا مطالبہ تسلیم کر کے انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت سپرد کر دیتے۔ مگر یہ دونوں صورتیں ناقابل عمل تھیں۔ پہلی صورت کہ حضرت انہیں محصور یا نظر بند کر دیتے تو یہ اقدام سزا قبل جرم اور فکر و عمل کی آزادی کے سلب کرنے کے مترادف ہوتا اور یہ دونوں چیزیں نہ اسلام کے مزاج سے سازگار تھیں اور نہ امیرالمومنین کی سیرت سے ہم آہنگ۔ پھر یہ کہ انہی ایام میں بنی امیہ کے وہ افراد جو کہیں آجا سکتے تھے کچھ مکہ چلے گئے اور کچھ شام روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت نے نہ ان کی نقل و حرکت پر کوئی پہرا بٹھایا اور نہ انہیں مدینہ چھوڑ کر جانے سے منع کیا۔ اب اگر ان دونوں کو روک لیتے تو یقیناً ان کے ہمنوا چیخ اٹھتے اور اس کے خلاف آواز اٹھاتے کہ حضرت نے دوسروں کو جہاں وہ جانا چاہتے تھے جانے دیا اور ان دو بزرگ صحابیوں اور مجلس شوریٰ کے ممتاز رکنوں پر جو بظاہر بے گناہ ہیں قدغن لگا دی ہے اور اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ مصلحت اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں روک کر اہل مدینہ اور ان کے ہمنواؤں کی مخالفت مول نہ

لی جاتی خصوصاً ان حالات میں کہ ابھی حکومت کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہیں ہوئی اور امیر شام ایسا ہوشیار و عیار حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی فکر میں ہے۔ بے شک ظاہری مصالح کا لحاظ اس مقام پر جہاں اسلام کے کسی حکم سے تصادم ہوتا ہو درست نہیں ہے مگر جہاں قانون اسلام کی پابندی کے ساتھ کوئی مصلحت بھی کارفرما ہو تو اسے ملحوظ رکھنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ رہی دوسری صورت کہ حضرت انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت سونپ دیتے آخر کسی نہ کسی کو وہاں کی حکومت سپرد کرنا ہی تھی مگر حضرت ان دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے سمجھ رہے تھے کہ انہیں نہ آپ کے زیر اقتدار رہنا پسند ہے اور نہ آپ کی اطاعت ہی گوارا ہے اس لئے کہ جو حکومت کا خود متوقع ہوتا ہے اسے دوسرے کی جسے بزعم خود اپنے ہی درجہ کا سمجھتا ہو اطاعت شاق گزرا ہی کرتی ہے اس صورت میں اگر انہیں بصرہ و کوفہ کی حکومت دے بھی دی جاتی جب بھی وہ اس جزوی اقتدار پر قناعت کر کے مرکزی حکومت کے تابع رہنا پسند نہ کرتے خصوصاً جب کہ زبیر کو اہل کوفہ کی اور طلحہ کو اہل بصرہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اور وہ انہیں بحیثیت خلیفہ پوری مملکت پر فرمانروا دیکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ پاؤں جمانے کے بعد مرکز سے رشتہ توڑ لیتے اور اپنے زیر اثر عوام کے تعاون سے مستقل حکومت قائم کرتے اس طرح کہ کوفہ پر زبیر کی حکومت ہوتی اور بصرہ اور اس کے مضافات پر طلحہ کا اقتدار ہوتا اور شام میں معاویہ کا پرچم پہلے ہی سے لہرا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک ہی ریاست میں قبائلی طرز کی متعدد حکومتیں قائم ہو جاتیں مرکزیت لامرکزیت میں بدل جاتی ہر طرف طوائف الملوکی پھیل جاتی اور اسلامی ریاست اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی کہ ان پاشان و پریشان ٹکڑوں کو یکجا کرنا مشکل ہو جاتا۔ اب ایک یہی صورت رہ جاتی کہ جہاں وہ جانا چاہتے تھے انہیں جانے دیا جائے اور اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ حکومت کے خلاف کوئی غلط قدم اٹھائیں تو اس کے نتائج کی ذمہ داری انہی پر عائد ہو اور ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی عمل میں آئے تو حکومت کو مورد الزام قرار نہ دیا جا سکے۔

غرض یہ لوگ ایک لگے بندھے منصوبہ کے ماتحت مکہ میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے اور بنی ہاشم اور خصوصاً حضرت علی پر قتل عثمان کا الزام عائد کر کے باقاعدہ قصاص کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم کو روبکار لانے کے لئے سرمایہ کی بھی ضرورت تھی اس کا حل یوں نکل آیا کہ بصرہ کا معزول حاکم عبداللہ ابن عامر ابن کریز بیت المال کی جمع جتھا لے کر مکہ پہنچ گیا اور یمن سے یعلی ابن امیہ چھ لاکھ درہم اور چھ سو اونٹ اپنے ساتھ لایا اور یہ تمام سرمایہ جنگی اخراجات کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ ابوالفداء نے تحریر کیا ہے:۔

خرج یعلی واخذ ما کان من — یعلی تمام پونجی سمیٹ کر نکل کھڑا ہوا اور مکہ

المال ولحق بمكة وصادمع	پہنچ کر حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے ساتھ ہو گیا
عائشہ وطلحۃ والزبیر وسلم	اور وہ مال ان کی تحویل میں دے دیا۔"
الیہم المال۔ (تاریخ ابوالفداء ج۔ ص)	

اہل مکہ سے بھی سرمایہ فراہم کیا گیا اور مالی لحاظ سے مطمئن ہو گئے۔ جب یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے تو حضرت عائشہ کی رہائش گاہ پر باہمی صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ جنگ کا مسئلہ تو طے شدہ تھا البتہ محاذ جنگ کا ابھی کوئی تصفیہ نہ ہوا تھا۔ حضرت عائشہ کی رائے تھی کہ مدینہ کو محاصرہ میں لے کر جنگ چھیڑ دی جائے مگر اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ بلوائیوں کے ہوتے ہوتے اہل مدینہ سے نمٹنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ شام جانا چاہیئے۔ اس پر ابن عامر نے کہا:۔

قد کفاکم معاویۃ الشام	شام میں معاویہ کے ہوتے ہوئے تمہاری ضرورت
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص)	نہیں ہے۔"

شام کو محاذ جنگ بنانے سے یہ امر بھی مانع تھا کہ معاویہ جنہوں نے حضرت عثمان کے ماتحت ہوتے ہوئے ان کی مدد سے گریز کیا ہو وہ ان لوگوں کی مدد پر کیوں آمادہ ہوتے اور جنہوں نے حضرت علی کی بیعت پر آمادگی ظاہر نہ کی ہو وہ ان کی کامیابی کے بعد طلحہ یا زبیر کی خلافت بلا چون و چرا کس طرح تسلیم کر لیتے۔ بے شک معاویہ ان کے ہمنوا تھے مگر اسی حد تک جس حد تک امیرالمومنین کو اقتدار سے الگ کرنے کا تعلق تھا مگر اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد طلحہ یا زبیر کی خلافت کو تسلیم کر لینا ان کی اقتدار پسند طبیعت سے ناممکن تھا۔ آخر بصرہ کے معزول حاکم عبداللہ ابن عامر کے کہنے سے بصرہ پر اتفاق رائے ہو گیا۔ بصرہ کو محاذ جنگ قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت کار فرما تھی کہ وہاں پر ان کے ہمنوا و ہم خیال کثرت سے موجود ہیں۔ جو جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے وہاں یہ فائدہ بھی نظر آ رہا تھا کہ حجاز کی ایک سمت شام واقع ہے اور دوسری سمت عراق۔ اگر بصرہ کو محاذ جنگ بنا کر عراق پر تسلط قائم کر لیا گیا تو حجاز ان دو مخالف طاقتوں میں گھر کر رہ جائے گا جس کے بعد امیرالمومنین کی سپاہ کو بآسانی شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کیا جا سکتا ہے یا ان دو طاقتوں کے زیر اثر رکھا جا سکتا ہے۔

اس تجویز سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پیش نظر خون عثمان کا قصاص نہ تھا۔ اگر ان کا مقصد قصاص ہوتا تو بصرہ پر دھاوا کرنے کے بجائے مدینہ پر حملہ آور ہوتے جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا اور جہاں اس حادثہ کے ذمہ دار افراد موجود تھے اور بصرہ میں نہ حضرت کا عثمان کا کوئی قاتل تھا اور نہ وہاں کے باشندے ان کے مقصد میں حائل تھے کہ انہیں راہ سے ہٹانا ضروری ہوتا۔ غرض محاذ جنگ کے تصفیہ کے

بعد کوچ کی تیاری شروع ہو گئی۔ یعلی نے قبیلۂ عرینہ کے ایک شخص سے چھ سو درہم میں ایک اونٹ خرید کر ام المومنین کی خدمت میں پیش کیا اور عمومی اعلان کیا کہ جس کے پاس سامان سفر ہتھیار اور سواری نہ ہو وُہ آئے اسے تمام چیزیں مہیا کی جائیں گی۔ چنانچہ امیرالمومنین نے یعلی کے بارے میں فرمایا:۔

کان یعطی الرجل الواحد الثلثین دینارا والسلاح و الفرس علیٰ ان یقاتلنی ۔	وہ میرے خلاف لڑنے کے لئے ہر شخص کو گھوڑا ہتھیار اور تیس تیس دینار دیتا تھا۔"

(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص۱۴۱)

طلحہ و زبیر نے عبداللہ ابن عمر پر بھی زور دیا کہ وہ اُن کی موافقت و ہمراہی اختیار کرے۔ مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ :۔

ان بیت عائشۃ خیر لھا من هودجها وانتما المدینۃ خیر لکما من البصرۃ ۔	عائشہ کے لئے ہودے میں بیٹھنے سے گھر میں ٹکنا اور تمہارے لئے بصرہ جانے سے مدینہ میں رہنا زیادہ بہتر ہے۔"

(الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱۔ ص۶۱)

حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ اور دوسری امہات المومنین کو جو حج کے بعد مکہ میں قیام فرما تھیں۔ اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی اور انہیں بھی اپنے ہمراہ جنگ کرنے میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ حضرت حفصہ تو بلا تامل تیار ہو گئیں مگر بقیہ ازواج پیغمبرؐ نے انکار کر دیا۔ اور آخر عبداللہ ابن عمر کے منع کرنے سے حضرت حفصہ کو بھی رُک جانا پڑا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے :۔

وکان ازواج النبی معها علیٰ قصد المدینۃ فلما تغیر رایها الی البصرۃ ترکن ذالك واجابتهم حفصۃ الی المسیر معهم فمنعها اخوها عبداللہ ابن عمر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۰۵)	ازواج رسولؐ حضرت عائشہ کے ہمراہ مدینہ جانے کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن جب حضرت عائشہ کی رائے بدل گئی اور وہ بصرہ جانے پر آمادہ ہوئیں تو ازواج نبی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور حفصہ نے حضرت عائشہ کے ہمراہ جانا قبول کر لیا مگر ان کے بھائی عبداللہ ابن عمر نے انہیں روک لیا۔"

حضرت حفصہ کی آمادگی خلاف توقع نہ تھی بلکہ انہیں آمادہ ہونا ہی چاہیئے تھا اس لئے کہ ان کے اور حضرت عائشہ کے نظریات میں بڑی حد تک وحدت و ہم آہنگی پائی جاتی تھی نہ ان کی رایوں میں تضاد

ہوسکتا تھا اور نہ ان کی طبیعتوں میں اختلاف۔ اور اسی اتحاد مذاق کی وجہ سے دونوں ایک ہی حزب و گروہ سے وابستہ سمجھی جاتی تھیں چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے تحریر کیا ہے:۔

ان نساء رسول اللہ کن حزبین فحزب فیہ عائشۃ وحفصۃ و سودۃ والحزب الآخر ام سلمۃ وسائر نساء رسول اللہ۔

ازواج پیغمبر کے دو گروہ تھے ایک گروہ میں عائشہ حفصہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروہ میں ام سلمہ اور بقیہ ازواج رسول تھیں۔"

(صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۵۹)

حضرت ام سلمہ کی تمام ہمدردیاں حضرت علی کے ساتھ تھیں۔ جب حضرت عائشہ نے انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی تو وہ حضرت کے خلاف کوئی بات سننا بھی گوارا نہ کرسکتی تھیں چہ جائیکہ حضرت کے خلاف قدم اٹھاتیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی اور انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے تحریر کیا:۔

لو علم رسول اللہ ان النساء یحتملن الجہاد عہد الیک اما علمت انہ قد نہاک عن الفراطۃ فی الدین فان عمود الدین لا یثبت بالنساء ان مال ولا یراب بہن ان انصدع جہاد النساء غض الاطراف و ضم الذیول وقصر المودۃ ما کنت قائلۃ لرسول اللہ لو عارضک ببعض ہذہ الفلوات ناصۃ قعودا عن منہل الی منہل وغدا تردین علی رسول اللہ واقسم لو قیل لی یا ام سلمۃ ادخلی

اگر رسول اللہ یہ جانتے کہ عورتیں جہاد کا بار اٹھا سکتی ہیں تو وہ تمہیں حکم دے جاتے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ تمہیں دینی معاملات میں تجاوز سے منع فرما گئے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر دین کا ستون جھک جائے تو وہ عورتوں کے ذریعہ تھم نہیں سکتا اور اگر اس میں شگاف پڑ جائے تو عورتوں کے ذریعہ اس کی درستی و اصلاح نہیں ہوسکتی۔ عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں اپنے دامن کو سمیٹیں اور تعلقات محدود رکھیں۔ اگر رسول اللہ تمہیں ان صحراؤں میں اونٹ دوڑاتے ہوئے۔ ایک چشمہ سے دوسرے چشمہ تک جاتے ہوئے دیکھ پائیں تو تم انہیں کیا جواب دو گی۔ کل تمہیں رسول اللہ کے سامنے جانا ہی ہوگا۔ خدا کی قسم اگر مجھ سے کہا گیا کہ اے ام سلمہ جنت میں داخل ہو جاؤ تو اگر

الجنة لاستحییت ان القی	اگر میں نے اس حجاب کو توڑ ڈالا ہو جس کا مجھے
رسول اللہ ھاتکۃ حجابا ضربہ	پابند بنا گئے تھے تو مجھے پیغمبر کا سامنا کرتے ہوئے
علی فاجعلیہ سترک و قاعۃ	شرم آئے گی لہذا تم پردہ کی پابند اور گھر کی چار
البیت حصنک (عقد الفرید۔ ج۳۔ ص۹۹)	دیواری میں بند رہو۔"

حضرت عائشہ نے جناب ام سلمہ کی نصیحت آموز تحریر سے اثر لینے کے بجائے یہ جواب دیا کہ میں دو متحارب گروہوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے جا رہی ہوں اور فضا کو پُر امن رکھنے کے لئے یہ اقدام ناگزیر ہے۔ ام المومنین کا یہ جواب دفع الوقتی کے لئے تھا ورنہ یہ حقیقت ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ وہ اس نزاع میں خود ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھیں اگر وہ گھر میں بیٹھی رہتیں اور لاؤ لشکر جمع کر کے بصرہ کا رُخ نہ کرتیں تو دو فریق پیدا ہی نہ ہوتے اور نہ اُن میں جنگ و قتال کی نوبت آتی اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وُہ دو مخالف گروہوں کے درمیان صلح و صفائی کا مقصد لے کر بصرہ جانے پر تیار ہوئی تھیں تو اس کے لئے سامان حرب و ضرب اور لشکر گراں کے جمع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ام المومنین سات سو کی جمیعت کے ساتھ جو اس وقت تک ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو چکی تھی بصرہ کی سمت روانہ ہوگئیں راستے میں اور لوگ بھی کچھ بے سوچے سمجھے اور کچھ ان کی باتوں سے متاثر ہو کر ساتھ ہوتے گئے۔ اور لشکر کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ جب یہ لشکر ذات عرق میں پہنچا جہاں سے بصرہ کی راہ لینا تھی تو سعید ابن عاص نے مروان اور اس کے چند مخصوص ہمنواؤں سے تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ کدھر منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں اور ہمارا اس دشت پیمائی سے مقصد و مدعا کیا ہے۔ مروان نے کہا کہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم بصرہ جا رہے ہیں اور مقصد قاتلان عثمان سے انتقام لینا ہے کہا:۔

ثارکم علی اعجاز الابل اقتلوھم	عثمان کے قاتل (طلحہ و زبیر) تمہارے ساتھ اونٹوں
ثم ارجعوا الی منازلکم لا	پر سوار ہیں انہیں قتل کر دو اور اپنے گھروں کو
تقتلوا انفسکم۔	واپس جاؤ اور ناحق ایک دوسرے کو قتل نہ
(تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۴۷۲)	کرو۔"

مروان نے کہا کہ اب گھروں کو کس منہ سے جائیں ہمیں بصرہ جانا ہی ہوگا تاکہ تمام قاتلان عثمان سے انتقام لے سکیں۔ سعید ان سے گفتگو کرنے کے بعد طلحہ و زبیر کے پاس آیا اور اُن سے پوچھا کہ اگر تم نے یہ جنگ جیت لی اور مقصد میں کامیاب ہوگئے تو مسند خلافت پر کسے بٹھاؤ گے کہا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ہم دونوں میں سے جسے لوگ منتخب کر لیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ سعید نے کہا کہ جب تم قصاص

عثمان کے لئے گھروں سے نکلے ہو تو تمہیں عثمان کے بیٹوں میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہیئے اور ان کے دونوں بیٹے ابان اور ولید لشکر میں موجود ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم خون عثمان کے قصاص کا لبادہ اوڑھ کر اپنے لئے اقتدار کی راہ ہموار کرنے کے لئے نکلے تھے۔ طلحہ و زبیر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا:-

ندع شیوخ المهاجرین و نجعلها لابنائهم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۷۲)	کیا ہم سن رسیدہ مہاجرین کو چھوڑ کر ان کے لڑکے بالوں کو خلیفہ بنائیں؟

سعید سمجھ گیا کہ یہ لوگ قصاص طلبی کے لئے نہیں نکلے بلکہ یہ سارا ہڑبونگ حکومت و اقتدار کے لئے ہے۔ چنانچہ وہ ان سے الگ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ عبداللہ ابن خالد، مغیرہ ابن شعبہ اور قبیلہ بنی ثقیف کے لوگ بھی علیحدہ ہو کر طائف کی طرف چلے گئے اور باقی لشکر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اثنائے سفر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ام المومنین کے عزم و ارادہ کو وقتی طور پر متزلزل کر دیا اور وہ یہ کہ جب لشکر ایک چشمہ پر جو ایک عورت حوأب بنت کلب ابن وبرہ کے نام پر حوأب کہلاتا تھا، شب بسری کے لئے فروکش ہوا تو حضرت عائشہ نے ایک سمت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں۔ یہ کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہ تھی مگر ام المومنین کے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوئی۔ پاس ہی ساربان کھڑا تھا۔ اس سے پوچھ لیا کہ یہ کون سا مقام ہے اس نے کہا کہ یہ حوأب ہے۔ حوأب کا نام سننا تھا کہ دہشت و خوف سے لرز اٹھیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگیں:

ردونی ردونی انا واللہ صاحبة ماء الحوأب۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۰۵)	مجھے واپس جانے دو مجھے واپس جانے دو۔ خدا کی قسم میں ہی چشمہ حوأب والی ہوں۔

طلحہ و زبیر اور ساتھ والوں کو اس ایک دم تبدیلی پر حیرت ہوئی۔ کہا کہ یہ مقام حوأب ہے تو ہوا کرے آپ اس سے پریشان کیوں ہیں اور واپسی پر اصرار کس لئے ہے؟ کہا:-

سمعت رسول اللہ یقول و عندہ نساؤہ لیت شعری ایتکن تنبحها کلاب الحوأب	ایک مرتبہ رسول اللہ کی بیویاں آپ کے گرد جمع تھیں کہ میں نے آپ کو فرماتے سنا تم میں کون ہے جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۰۵)

اب مجھے کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ اس سے میں ہی مراد تھی اور میری ہی طرف آنحضرت کا اشارہ تھا لہٰذا مجھے یہیں سے واپس چلا جانا چاہیئے۔ جب ان کے ہمراہیوں نے کام بگڑتے دیکھا تو کہا کہ ساربان نے

غلط کہا ہے یہ چشمۂ حواب نہیں ہے۔ اور عبداللہ ابن زبیر نے اڑوس پڑوس سے پچاس آدمیوں کو جمع کرکے اور انہیں کچھ دے دلاکر اس پر گواہی بھی دلوادی۔ امام شعبی کہتے ہیں :۔

ھی اول شہادۃ زور اقیمت فی الاسلام (تذکرہ خواص الامہ ص۳۹)	یہ پہلی جھوٹی گواہی تھی جو اسلام میں دی گئی ۔"

ابھی ام المومنین ذہنی کش مکش اور تذبذب کے عالم میں تھیں کہ ایک طرف سے یہ شور سنائی دیا :۔

النجاء النجاء قد ادرککم علی ابن ابی طالب ۔ (تاریخ کامل ۔ ج۳ ص۱۰۸)	جلدی کرو جلدی کرو علی ابن ابی طالب تمہارے سروں پر پہنچ گئے ہیں ۔"

اس آواز کے سنتے ہی لوگ افراتفری کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ام المومنین کے خیالات نے اس طرح پلٹا کھایا کہ نہ حواب یاد رہا اور نہ قول رسول بلکہ بجھے ہوئے جوش اور پژمردہ حوصلے میں پھر سے زندگی آگئی اور پورے جوش وخروش کے ساتھ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بصرہ کی سمت چل دیں ۔

ادھر امیرالمومنین بغاوت شام کو فرو کرنے کی فکر میں تھے اور ایک لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ طلحہ وزبیر کی بیعت شکنی اور حضرت عائشہ کی لشکر کشی کی اطلاع مدینہ میں پہنچی حضرت کو طلحہ وزبیر کی طرف سے تو یہ اندیشہ تھا کہ وہ معاویہ سے ساز باز کرکے فتنہ وشر کو ہوا دیں گے ۔ مگر حضرت عائشہ کی طرف سے یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ وہ معرکہ آرائی کے لئے فوج کشی کریں گی اور خدا ورسول کے حکم کے خلاف گھر سے نکل کھڑی ہوں گی ۔ مجبوراً آپ کو شام کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تا کہ پیش آیند صورت حال سے نمٹ سکیں ۔ حضرت نے مدینہ کے سرکردہ اشخاص کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور فرمایا کہ تمہیں طلحہ وزبیر کے باغیانہ اقدام کا علم ہو چکا ہے تم میرا ساتھ دو تا کہ ان لوگوں کو بصرہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں روک لیا جائے ۔ کچھ لوگ حضرت عائشہ اور طلحہ وزبیر ایسی بااثر شخصیتوں کے مقابلہ میں کھڑے ہونے سے ہچکچانے لگے اور کچھ لوگوں نے جن میں سعد بن ابی وقاص ، اسامہ ابن زید ، محمد ابن سلمہ اور عبداللہ ابن عمر شامل تھے صاف انکار کر دیا ۔ البتہ ہیثم ابن تیہان زیاد ابن حنظلہ ابو قتادہ انصاری وغیرہ نے حمایت حق کے جذبہ سے متاثر ہو کر بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور ابو قتادہ نے پرجوش لہجے میں کہا :۔

یا امیرالمومنین ان رسول اللہ	یا امیرالمومنین یہ تلوار مجھے رسول اللہ نے باندھی
تلدنی ھذا السیف وقد	تھی اور ایک عرصہ سے یہ نیام میں بند پڑی ہے
اغمدتہ زمانا وقد حان	اب وقت آگیا ہے کہ میں ان ظالموں کے خلاف
تجریدۃ علی ھولاء القوم	اسے بے نیام کروں جو امت کو فریب دینے سے

الظالمین الذین لایالون الامۃ   دریغ نہیں کر رہے ۔"

غشا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۳)

حضرت ام سلمہ نے اپنے فرزند عمر ابن ابی سلمہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا:۔

قد دفعتہ الیک وھو اعز علیّ من نفسی فلیشھد مشاھدک حتی یقضی اللہ ما ھو قاض فلو لا مخالفۃ رسول اللہ لخرجت معک کما خرجت عائشۃ مع طلحۃ والزبیر۔

(انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۴۳۰)

میں اسے آپ کے سپرد کرتی ہوں یہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے یہ تمام معرکوں میں آپ کے ہمرکاب رہے گا یہاں تک کہ خداوند عالم وہ فیصلہ کرے جو وہ کرنے والا ہے۔ اگر رسول اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو میں آپ کے ہمراہ جاتی جس طرح عائشہ، طلحہ و زبیر کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی ہیں۔"

امیرالمومنین نے مدینہ میں سہل ابن حنیف انصاری کو مکہ میں قثم ابن عباس کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور علی اختلاف الروایۃ چھ سو سے ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ جس میں چار سو بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ تھے شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جب مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام ربذہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آگے جا چکے ہیں اور بصرہ سے ادھر دم نہیں لیں گے اب انہیں راستے میں روک لینے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور جنگ و قتال کے بغیر ان پر قابو پانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ امیرالمومنین نے جنگ کے امکان کے پیش نظر وہاں پر پڑاؤ ڈال دیا اور چند آدمیوں کو مدینہ بھیج کر وہاں سے اسلحۂ جنگ اور سواریاں طلب کیں اور فوج کی فراہمی کے لئے محمد ابن جعفر اور محمد ابن ابی بکر کو کوفہ روانہ کیا تاکہ وہاں کے لوگوں سے عسکری امداد حاصل کریں اور جنگ کی صورت میں انہیں دشمن کے خلاف لڑنے کی دعوت دیں۔ جب وہ کوفہ پہنچے اور اہل کوفہ کو امیرالمومنین کا پیغام دیا تو والی کوفہ ابو موسیٰ اشعری بیچ میں دیوار بنکر حائل ہو گیا اور یہ کہہ کر لوگوں کو روکنا شروع کیا کہ یہ اقتدار کی جنگ ہے جو دنیا کا طالب گار ہو وہ جائے اور جو آخرت کا خواستگار ہو وہ گھر کے گوشہ میں بیٹھا رہے اور اس طرح امیرالمومنین کا مددگار و معاون ثابت ہونے کے بجائے مخالفین کی تقویت کا باعث بن گیا۔ محمد ابن جعفر اور محمد ابن ابی بکر نے اسے بہتیرا سمجھایا بجھایا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا آخر یہ دونوں بے نیل مرام واپس پلٹ آئے۔ حضرت ربذہ سے روانہ ہو کر فید، ثعلبیہ اور اساد سے ہوتے ہوئے مقام ذیقار میں جو کوفہ و واسط کے درمیان واقع ہے تشریف فرما تھے کہ ان دونوں نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر ابو موسیٰ کی رخنہ اندازیوں کی تفصیل بیان کی۔ امیرالمومنین نے ذیقار

سے ابن عباس اور مالک اشتر کو کوفہ بھیجا کہ اُسے سمجھائیں کہ وہ آنے والوں کے لئے سدِّراہ نہ ہو۔ ابھی یہ دونوں کوفہ ہی میں تھے کہ حضرت نے ان کے عقب میں اپنے فرزند امام حسن اور عمار یاسر کو روانہ کیا۔ یہ دونوں بزرگوار کوفہ میں وارد ہونے کے بعد مسجد جامع میں فروکش ہوئے اور لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت کی دعوت دی۔ ابوموسیٰ کو امام حسن کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ حاضر ہوا امام حسن نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق یہ خبریں سننے میں آرہی ہیں کہ تم لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت سے منع کرتے ہو حالانکہ ان کا مقصد فتنہ و شر کا انسداد اور اصلاح بین الناس ہے۔ کہا کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے:۔

انها ستكون فتنة القاعد	عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں بیٹھنے والا
فيها خير من القائم والقائم	کھڑا ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے
خير من الماشي والماشي خير	والے سے اور چلنے والا سوار ہونے والے سے
من الراكب۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)	بہتر ہوگا"

آخر وہ لوگ ہمارے بھائی بند ہیں نہ ان کا خون بہانا ہمارے لئے مباح ہے اور نہ ان کا مال چھیننا ہمارے لئے جائز ہے۔ اس پر عمار یاسر نے بگڑ کر کہا:۔

انت فيها قاعدا خير منك قائما۔	بے شک تمہارا گوشہ میں بیٹھا رہنا تمہارے نکل
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)	کھڑے ہونے سے بہتر ہے"

اور دونوں ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ ابوموسیٰ اسی پر اصرار کرتا رہا کہ یہ ایک فتنہ ہے اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ اِدھر یہ کشمکش جاری تھی اُدھر زید ابن صوحان نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر دو تحریریں پڑھ کر سنائیں جو حضرت عائشہ کی طرف سے ایک اُن کے نام تھی اور ایک اہلِ کوفہ کے نام۔ ان تحریروں میں درج تھا کہ "تم لوگ میری مدد کے لئے آؤ۔ اور اگر مدد کے لئے نہ آسکو تو لوگوں کو منع کرو کہ وہ علی کی مدد کو نہ آئیں۔ ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد مجمع سے مخاطب ہو کر کہا:۔

امرت ان تقر في بيتها	انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھیں۔ اور
وامرنا ان نقاتل حتى	ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جنگ و قتال کریں تاکہ فتنہ
لا تكون فتنة فامرتنا	کھڑا نہ ہو۔ لیکن جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا۔ وُہ
بما امرت به وركبت ما	ہمیں دے رہی ہیں (کہ ہم گھر میں بیٹھیں) اور جس
امرنا به	چیز کا ہمیں حکم دیا گیا (کہ جنگ کریں)، اس پر وُہ
(تاریخ طبری کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۱۱)	عمل کر رہی ہیں"

پھر ابو موسیٰ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے موسیٰ اگر تم دریا کے بہاؤ کو روک سکتے ہو تو ان لوگوں کو بھی جانے سے منع کر سکتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ جو بات تمہارے اختیار سے باہر ہے اس سے دستبردار ہو جاؤ اور لوگوں کو روکنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ گھر بیٹھ جاؤ۔ مگر اس پر کسی کی بات کا اثر نہ ہوا اور وہ برابر یہ رٹ لگاتا رہا کہ یہ ایک فتنہ ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ امام حسن نے اس کا یہ معاندانہ رویہ دیکھا تو پر غضب لہجے میں کہا:۔

اخرج من مسجدنا دامض حیث شئت۔ (اخبار الطوال ص۱۴۵)	ہماری مسجد سے باہر نکلو اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔"

اور پھر منبر پر بلند ہو کر تقریر فرمائی اور لوگوں کو امیر المومنین کی نصرت پر آمادہ کیا۔ عمار ابن یاسر اور حجر ابن عدی کندی نے بھی لوگوں کو کہنا سننا شروع کیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اہل کوفہ نے کروٹ لی اور ہر طرف سے سمعاً وطاعۃً کی آوازیں آنے لگیں۔

جب کوفہ کی فضا ساز گار ہو گئی تو مالک اشتر نے دارالامارہ کا رُخ کیا اور اندر داخل ہو کر ابو موسیٰ کے غلاموں کو مار پیٹ کر باہر نکال دیا اور قصر پر قبضہ کر لیا۔ ابو موسیٰ کے غلام بھاگم بھاگ مسجد میں آئے اور ابو موسیٰ سے فریاد کی کہ اشتر نے ڈرا دھمکا کر دارالامارہ سے باہر نکال کیا ہے اور قصر پر قبضہ کر لیا ہے۔ ابو موسیٰ دوڑتا ہوا قصر کی طرف آیا اور اندر داخل ہونا چاہا مگر مالک نے اسے روک دیا اور بلند آواز سے کہا:۔

اخرج من قصرنا لا ام لك اخرج الله نفسك فو الله انك لمن المنافقين قديماً۔	اے ابو موسیٰ تمہاری ماں مرے ہمارے قصر سے باہر نکلو۔ خدا تمہیں نکالے۔ خدا کی قسم تم ہمیشہ منافقوں میں شامل رہے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص۵۰۱)

ابو موسیٰ نے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دیجئے۔ کہا کہ تمہیں عشاء تک کی مہلت دی جاتی ہے اور رات کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے چاہا کہ دارالامارہ میں گھس کر اس کا مال و اسباب لوٹ لیں مگر مالک نے منع کیا اور کہا کہ تم اب اسے کچھ نہ کہو میں نے اسے نکل جانے کا حکم دے دیا ہے۔ لوگ اُن کے کہنے سے رُک گئے اور ابو موسیٰ رات کے اندھیرے میں قصر سے نکل کر کوفہ کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور صبح ہوتے ہی شام کی طرف چل دیا۔ ادھر اہل کوفہ گروہ در گروہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ابو موسیٰ کے روکنے اور حضرت عائشہ کے خطوط لکھنے کے باوجود بارہ ہزار شمشیر زن مقام ذیقار میں

امیرالمومنین کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔

ابو موسیٰ کی ذہنی ساخت اور اس کے طرزِ عمل پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو وہ مملکت کے ایک کلیدی عہدہ پر تا حال فائز ہے اور دوسری طرف سربراہِ مملکت کے دشمنوں اور ملکی تنظیم کے منتشر کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی صوابدید میں اصحاب جمل سے جنگ کو ناجائز سمجھتا تھا تو اسے پہلے اپنے عہدہ سے خود ہی دستبردار ہو جانا چاہیئے تھا اور پھر آزادانہ اپنی رائے اظہار کرنا چاہیئے تھا لیکن وہ مملکت کا عہدہ دار اور آئینی طور پر رئیس مملکت کے احکام کا پابند ہونے کے باوجود علانیہ سرتابی کرتا ہے اور دست تعاون بڑھانے کے بجائے امن شکنوں کی حوصلہ افزائی کا سامان کرتا ہے۔

اس طرزِ عمل کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ درپردہ حضرت کے مخالفین سے ساز باز کئے ہوئے تھا اور کھلم کھلا مخالف جماعت میں شامل ہو کر عہدہ کو اپنے ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ منصب پر باقی رہتے ہوئے فریق مخالف کی تقویت کا سامان کرتا اور اپنے منصبی تقاضوں کا کوئی پاس و لحاظ نہ کرتا اور اس پر مزید یہ کہ وہ جارحانہ اقدام کے مقابلہ میں اس دفاعی و نظامی اقدام کو فتنہ سے تعبیر کرتا ہے اور حدیث پیغمبر کو اس پر چسپاں کر کے اپنے غلط موقف کا جواز ثابت کرتا ہے۔ آخر اس پر نظر رکھنی ضرورت تھی کہ امیرالمومنین کے لئے اس کے سوا اور چارۂ کار کیا تھا۔ کیا طلحہ و زبیر اور اس کے ہمراہیوں کو من مانی کرنے دیتے اور چپ سادھے رہتے اور ملک کے نظم و نسق کو درہم و برہم ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھتے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ اگر مملکت کے خلاف سازش کرنے اور اس کے نظم و ضبط کو تباہ کرنے والوں کے خلاف دفاعی فریضہ کی انجام دہی فتنہ ہے تو پھر ہر دفاعی جنگ کو فتنہ سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اور ان جنگوں کو بھی فتنہ قرار دینا چاہیئے جو رسول اللہ کے بعد ان لوگوں سے لڑی گئیں جنہوں نے حاکم وقت کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور ادائے زکوٰۃ سے مانع ہوئے تھے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے کہ اس حدیث کا مورد صرف حضرت کے اس اقدام کو قرار دیا جائے اور سابقہ جنگوں کو فتنہ کہنے سے گریز کیا جائے۔ جب کہ قرب زمانہ کے اعتبار سے فتنہ انہی پر زیادہ صادق آتا ہے اور امیرالمومنین کی یہ جنگ تو ان جنگوں میں سے ایک ہے جن کے لڑنے کی پیغمبر اکرم نے انہیں ہدایت کی تھی اور ان مہموں میں سے ایک مہم ہے جنہیں سر کرنے پر انہیں مامور فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری کہتے ہیں:۔

امر رسول اللہ علیا بقتال الناکثین والقاسطین والمارقین۔ (مستدرک حاکم۔ ج ۳۔ ص ۱۳۹)	رسول اللہ نے حضرت علی کو حکم دیا تھا کہ وہ بیعت شکنوں (اصحاب جمل)، بے راہروؤں (اصحاب صفین) اور بے دینوں (خوارج) سے جنگ کریں۔"

اور پھر پیغمبر نے حضرت علی کے اس اقدام کو ایک مظلوم وحق پرست کا اقدام اور اس کے مقابلہ میں زبیر کی جنگ کو ظالمانہ وجارحانہ قرار دیتے ہوئے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا :۔

لتقاتلنه وانت له ظالم۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص۳۲۲)	اے زبیر تم علی سے جنگ کروگے اور تم ان کے حق میں ظالم ہوگے ۔"

اور چشمۂ حواب کے سلسلہ میں حضرت عائشہ کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا :۔

وایاك ان تكونی انت یاحمیرا۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص۱۵۷)	خبردار اے عائشہ کہیں وہ تم ہی نہ ہونا ۔"

ان ارشادات پیغمبر کے علاوہ قرآن مجید میں بھی علم بغاوت بلند کرنے والوں کے خلاف واضح طور پر جنگ وقتال کا حکم آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے :۔

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدهما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر الله۔	اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں آمادۂ جنگ وقتال ہوں تو ان میں صلح کرادو۔ اگر ان میں سے ایک دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو تم اس زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف پلٹ آئے ۔"

ان نصوص کے ہوتے ہوئے پھر اسے فتنہ سے تعبیر کرنا عمداً حق پوشی یا صریحاً کج ذہنی کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔

بہرحال جب ام المومنین کا لشکر چشمۂ حواب سے آگے بڑھ کر چاہ ابوموسیٰ پر پہنچا اور حاکم بصرہ عثمان ابن حنیف کو اس لشکر گراں کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے ابوالاسود دئلی اور عمران ابن حصین کو حضرت عائشہ کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے بصرہ میں آنے کا سبب دریافت کریں۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر ابوالاسود نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے مادر گرامی آپ کس مقصد سے یہاں تشریف لائی ہیں اور یہ فوج وسپاہ آپ کے ہمراہ کیوں ہے۔ کہا کہ میں خون عثمان کا انتقام لینا چاہتی ہوں جنہیں لوگوں نے بے جرم وخطا گھر کے اندر قتل کر ڈالا ہے۔ ابوالاسود نے کہا کہ بصرہ میں تو ان کا قاتل کوئی نہیں ہے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر میں اہل بصرہ کے تعاون سے ان کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتی ہوں جو علی کے گرد وپیش جمع ہیں۔ ابوالاسود نے کہا کہ آپ حرم رسول خدا ہیں وہ آپ کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دے گئے تھے آپ کو ان معرکہ آرائیوں سے کیا مطلب اور ان خونی ہنگاموں سے کیا سروکار یہ امر آپ کے شایان

شان نہیں کہ آپ گھر کا گوشہ چھوڑ کر میدانِ کارزار گرم کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوں۔ کہا کہ ہم سے دو دو ہو کر لڑنے کی ہمت و جرأت کس کو ہو سکتی ہے۔ ابوالاسود نے کہا کہ ہم لڑیں گے اور دنیا دیکھے گی کہ اس طرح لڑا جاتا ہے۔

ام المومنین کا یہ یقین تھا کہ ان کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کی جرأت کسی کو نہ ہو گی شائد اس بنا پر ہو کہ حضرت علی کے ہمرکاب تو وہی گنے چنے چند افراد ہوں گے جنہیں آپ مدینہ سے لے کر چلے ہوں گے اور کوفہ جہاں سے جنگجو افراد فراہم ہو سکتے ہیں ابو موسیٰ کے زیر اثر ہے اور اس کے ہوتے ہوئے وہاں سے عسکری امداد کے حاصل ہونے کا بظاہر امکان نہیں ہے۔ اس صورت میں حضرت کی مختصر سپاہ ان کے لشکر گراں کے مقابلہ میں جم نہ سکے گی اور بن لڑے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی یا اس بناء پر ہو کہ حرم رسول ہونے کی وجہ سے وہ انتہائی عزت و توقیر کی مستحق ہیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت اور عزت واحترام بھی ہے اس صورت میں کون ہو گا جو ان سے نبرد آزما اور بر سر پیکار ہو گا مگر انہوں نے جو سوچا تھا، معاملہ اس کے برعکس تھا اور اہل کوفہ جوق در جوق اٹھ کھڑے ہوئے اور امیرالمومنین کی سپاہ میں شامل ہو کر پورے لشکر پر چھا گئے اور ابو موسیٰ منہ دیکھتا رہ گیا۔ البتہ دوسرا خیال کہ ان کی عزت و حرمت مقابلہ سے مانع ہو گی تو یہ خیال ایک حد تک درست ہو سکتا تھا بشرطیکہ وہ خود اس احترام کا لحاظ رکھتیں اور گھر کا گوشہ چھوڑ کر فوج و سپاہ کے ساتھ نہ نکل کھڑی ہوتیں اور جب انہوں نے خود اپنے مقام و مرتبہ کا لحاظ نہ رکھا تو یہ توقع کیونکر رکھتی تھیں کہ جو احترام انہیں گھر کے اندر رہنے کی صورت میں حاصل تھا وہ اب بھی باقی و برقرار رہے گا۔

ابوالاسود حضرت عائشہ سے گفتگو کرنے کے بعد طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور ان سے بھی وہی سوال کیا جو ام المومنین سے کر چکے تھے۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ام المومنین دے چکی تھیں کہ ہمارے یہاں آنے کا مقصد خون عثمان کا قصاص ہے۔ ابوالاسود نے کہا کیا تم دونوں نے حضرت علی کی بیعت نہیں کی تھی کہا کی تو تھی مگر اس حالت میں کہ تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی تھی اور بیعت کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ابوالاسود ان کے انداز گفتگو سے سمجھ گئے کہ وہ فتنہ و شورش پر آمادہ اور جنگ و قتال تلے ہوئے ہیں اور ان سے مزید گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ انہوں نے پلٹ کر عثمان ابن حنیف کو ان لوگوں کے عزائم سے آگاہ کیا اور دفاعی انتظامات کو مضبوط تر کرنے کا مشورہ دیا۔ عثمان ابن حنیف نے اہل شہر کو مسجد میں جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ہتھیار مہیا رکھیں اور دفاع کے لئے مستعد رہیں۔

ام المومنین کے لشکر نے چاہ ابو موسیٰ پر کچھ توقف کرنے کے بعد حرکت کی اور حدودِ بصرہ میں

داخل ہو کر مربد (اونٹوں کی منڈی) میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اہل شہر نے حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے آنے کی خبر سنی تو چاروں طرف سے سمٹ کر مربد میں جمع ہو گئے اور اپنے اپنے میلان اور اپنے اپنے نظریئے کے مطابق تبصرے کرنے لگے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ "یہ لوگ اگر کسی خوف و دہشت کی بنا پر اپنے گھروں سے نکلے ہیں تو یہ اس شہر سے آئے ہیں جہاں پرندوں تک کو امان حاصل ہے۔ اور اگر خون عثمان کے انتقام کے لئے آئے ہیں تو ہم اُن کے قاتل نہیں ہیں۔ اے اہل بصرہ میری بات غور سے سنو اور انہیں یہیں سے واپس جانے پر مجبور کر دو۔ اس پر طلحہ و زبیر کے ہمنواؤں نے اس پر پتھر برسائے اور اُسے خاموش کر دیا۔ جاریہ ابن قدامہ نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر حضرت عائشہ سے کہا:۔

يا ام المومنين واللہ لقتل عثمان اھون علينا من خروجك من بيتك على هذا الجمل الملعون عرضة للسلاح انه قد كان لك من الله ستر و حرمة فهتكت سترك و ابحت حرمتك انه من راى قتالك يرى قتلك ان كنت اتيتنا طائعة فارجعى الى منزلك و ان كنت اتيتنا مستكرهة فاستعينى بالناس

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۸۲)

اے ام المومنین آپ کا اس ملعون اونٹ پر بیٹھ کر ہتھیاروں کا نشانہ بننے کے لئے نکل کھڑا ہونا قتل عثمان سے بڑھ کر مصیبت ہے آپ کے لئے خدا کی طرف سے حجاب و احترام تھا مگر آپ نے اس پردے کو چاک کر ڈالا ہے اور اپنا احترام کھو دیا ہے۔ جو شخص آپ سے جنگ و قتال صحیح سمجھتا ہے وہ آپ کو قتل کرنے میں بھی باک نہیں کرے گا۔ اگر آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ تو اپنے گھر واپس جائیے اور اگر آپ کو مجبور کر کے لایا گیا ہے تو اس کے خلاف لوگوں سے مدد حاصل کیجئے۔"

ام المومنین نے ان باتوں کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا چہ جائیکہ ان سے اثر لیتیں یا ان پر غور کرتیں انہوں نے تمام تر توجہ اپنی قوت بڑھانے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے پر مرکوز کر دی تاکہ پوری توانائیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کر سکیں۔ اہل بصرہ کو ہمنوا بنانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کے یہ ذہن نشین کر دیا جائے کہ ان کی انگیخت پر عثمان قتل ہوئے ہیں اور چند شورش پسندوں کے بل پر انہوں نے خلافت پر قبضہ کیا ہے انہیں اصحاب شوریٰ کا تعاون حاصل ہے اور نہ رائے عامہ کی تائید۔ چنانچہ ام المومنین اور طلحہ و زبیر نے عوام کو اس قسم کے تاثرات دینے کے لئے اس اجتماع سے خطاب کرنا چاہا اگرچہ چاروں طرف شور و غل مچا ہوا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تاہم لوگوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی گئی اور طلحہ نے

طلحہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اے لوگو ہم عثمان کی خوشنودی کے دل و جان سے خواہاں تھے مگر چند بے وقوفوں نے عقلمندوں کو مغلوب کر کے انہیں قتل کر دیا اب ہم ان کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔" ابھی یہیں تک کہنے پائے تھے کہ لوگوں نے کہا کہ اے ابو محمد (طلحہ) تمہارے خطوط تو اس کے خلاف ہمارے پاس آتے رہے ہیں۔ طلحہ کوئی جواب نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے۔ اب زبیر کی نوبت آئی اور انہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میری طرف سے تو کوئی تحریر تمہارے پاس نہیں آئی۔ پھر انہوں نے قتل عثمان کے واقعات دہرائے اور امیرالمومنین کو موردِ الزام قرار دیتے ہوئے ان پر سخت لب و لہجہ میں نکتہ چینی کی۔ اس پر قبیلۂ عبدالقیس کا ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑا ہونے پر پھر شور مچا۔ کچھ لوگوں نے اسے منع کرنا چاہا مگر اس نے شور و شغب اور مخالف آوازوں کی پروا کئے بغیر تقریر شروع کر دی۔ تمہید میں اس نے تینوں خلافتوں کا ذکر کیا اور پھر امیرالمومنین کی خلافت کے متعلق کہا کہ تم لوگوں نے ہم سے مشورہ کئے بغیر علی کی بیعت کر لی اور انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ اب کیا بات ہوئی ہے کہ تم ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہو ہمیں بتاؤ تا کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہو کر ان سے لڑیں۔ کیا انہوں نے مال غنیمت دبا لیا ہے یا کوئی خلاف شرع قدم اٹھایا ہے یا کوئی ایسا کام کیا ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ بتاؤ انہوں نے کیا کیا ہے۔ تا کہ ہم بھی تمہارا ساتھ دیں۔ اگر یہ کچھ نہیں ہے تو پھر یہ شور و ہنگامہ بے معنی ہے۔" ابھی وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ طلحہ و زبیر کے ساتھی اس کی طرف لپکے تا کہ اسے مار ڈالیں مگر اس کے قبیلہ والے آڑے آئے اور اسے بچا کر لے گئے۔ مگر دوسرے دن ام المومنین کے آدمیوں نے حملہ کر کے اسے اور اس کے ستر آدمیوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔

مورخ طبری نے لکھا ہے:۔

لما کان الغد وثبوا علیہ وعلیٰ من کان معہ فقتلوا سبعین رجلاً۔	"دوسرے دن اس پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا اور ان میں کے ستر آدمی قتل کر دیئے۔"

(تاریخ طبری ج ۵ ص ۴۹۶)

ان تقریروں کے بعد حضرت عائشہ کی باری آئی انہوں نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں حضرت عثمان کی مظلومیت و بے گناہی کا تذکرہ کیا اور لوگوں کو ان کے انتقام پر ابھارا اور دوران تقریر میں کہا کہ ان کے قاتلوں کو ایک ایک کر کے قتل کر ڈالو اور خلافت کا مسئلہ حضرت عمر کے منتخب کردہ ارکان شوریٰ کے سپرد کر دو اور جو قتل عثمان میں متہم ہو اسے شوریٰ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ ام المومنین کی یہ تجویز بڑی معنی خیز ہے۔ انہوں نے شوریٰ پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دے کر بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور

خلافت کا رُخ ادھر موڑ دیا جدھر وہ موڑنا چاہتی تھیں اس طرح کہ اس وقت شوریٰ کے صرف چار رکن باقی تھے۔ علی ابن ابی طالب، سعد ابن ابی وقاص، طلحہ اور زبیر۔ حضرت تو اُن کے نزدیک خون عثمان میں متہم تھے۔ لہٰذا انہیں شوریٰ میں شامل کئے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رہے سعد ابن ابی وقاص تو وُہ ان کے حصول مقصد میں حائل نہ ہو سکتے تھے اس لئے کہ حضرت عمر نے طریق انتخاب یہ تجویز کیا تھا کہ جدھر اکثریت ہو خلیفہ کا انتخاب اس میں سے ہو گا۔ طلحہ و زبیر میں کوئی بھی سعد کے حق میں رائے دینے کو تیار نہ تھا اس لئے کہ وہ دونوں خود خلافت کی آس لگائے بیٹھے تھے اور اسی کے لئے یہ ساری ہنگامہ آرائی تھی اب سعد ہی کو ان دو میں سے ایک کا ساتھ دینا تھا اگر وہ طلحہ کا ساتھ دیتے تو وہ خلیفہ ہوتے اور زبیر کا ساتھ دیتے تو انہیں خلافت ملتی اور ام المومنین کا مقصد دونوں طرح پورا ہوتا تھا اس لئے کہ وہ حضرت علی کو اقتدار سے الگ کر کے خلافت کو انہی دو میں منحصر دیکھنا چاہتی تھیں۔

ام المومنین کی اس تقریر کو مجمع نے بڑے سکون سے سنا مگر خاتمہ تقریر پر ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا۔ اور مختلف زبانوں سے مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ام المومنین صحیح کہتی ہیں اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف کہا۔ اور اہلِ بصرہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ طلحہ و زبیر کی حمایت پر اتر آیا اور ایک گروہ عثمان ابن حنیف کا ہمنوا ہو گیا اور ایک دوسرے پر ڈھیلے پھینکنے اور پتھر برسانے لگے البتہ ایک گروہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کس کا ساتھ دے اور کس کا ساتھ نہ دے۔ غرض ان لوگوں کی آمد سے گھر گھر میں پھوٹ اور بھائی بھائی میں تفرقہ پڑ گیا۔

اب ان لوگوں نے دائرۂ کار وسیع کرنے کے لئے مختلف جگہوں پر پیغامات بھیجے اور وہاں کے باشندوں سے تعاون کی خواستگاری کی۔ چنانچہ ام المومنین نے احنف ابن قیس کو جو قبیلۂ بنی تمیم کا سردار اور ان اطراف کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھا اپنے ہاں بلوایا اور اس سے کہا کہ تم قاتلان عثمان کے خلاف جہاد سے پہلوتہی کرتے نظر آتے ہو کل اپنی کوتاہی کا کیا عذر کرو گے اور اللہ کو کیا جواب دو گے جب کہ تمہارے قبیلہ میں نہ افراد کی کمی ہے اور نہ تمہاری کوئی بات رد کی جاتی ہے۔ احنف نے کہا اے ام المومنین ابھی کل کی بات ہے آپ ان پر لے دے کرتی تھیں اور انہیں مطعون کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور آج اُن کا قصاص لینے کے لئے میدان میں اتر آئی ہیں۔ کہا کہ لوگوں نے انہیں اس طرح دھو ڈالا جس طرح برتن کو رگڑ رگڑ کر دھویا جاتا ہے۔ اور جب وہ گناہوں سے پاک صاف ہو گئے تو انہیں قتل کر ڈالا۔ احنف نے کہا:۔

یا ام المومنین انی اخذ بامرک — اے ام المومنین میں آپ کا وہ حکم تو مان سکتا ہوں

وانت راضية وادعه وانت ساخطة۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ صفہ ۳۴۱)

جو آپ نے رضامندی کی حالت میں دیا ہو اور وہ حکم ماننے کو تیار نہیں جو آپ نے غیظ و غضب کے عالم میں دیا ہو۔"

احنف نے تو ان کی طرف داری سے دامن بچا لیا لیکن بصرہ والوں کی اکثریت ان کے ساتھ ہو گئی۔ اب انہوں نے چاہا کہ امیر المومنین کے وارد بصرہ ہونے سے پہلے بیت المال اور شہر کے نظم و نسق پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے شہر کی طرف قدم بڑھایا۔ عثمان ابن حنیف بلا کسی پس و پیش کے شہر اُن کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ انہوں نے راستوں کی ناکہ بندی کر کے جہاں تک ممکن تھا شہر کا تحفظ کر لیا۔ حملہ آور جس راستے سے بڑھتے عثمان کے ساتھی آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے اور انہیں آگے بڑھنے سے روک دیتے اور کچھ لوگ چھتوں پر سے پتھر پھینک کر انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ لیکن فوجوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو کب تک روکا جا سکتا تھا۔ ان گنتی کے آدمیوں میں نہ مسلح فوج کے مقابلہ کی طاقت تھی اور نہ مقابلہ میں کامیابی کی کوئی صورت تھی۔ عثمان نے یہ دیکھا کہ شہر کو ان لوگوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تو وہ ایک دستہ فوج کو لے کر طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ تمہارا مطالبہ کیا ہے اور یہ شورش و ہنگامہ آرائی کیوں ہے کہا کہ ہم خون عثمان کا قصاص لینا چاہتے ہیں۔ کہا قصاص لینے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم خلافت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کہا کہ اگر ایسا ہو بھی تو علی ہم سے زیادہ خلافت کے حقدار نہیں ہیں۔ آخر دونوں طرف سے بات بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھی کہ فریقین نے تلواریں نکال لیں اور خونریز جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں طرف سے اچھے خاصے آدمی مارے گئے تو حضرت عائشہ نے امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ رکوا دی اور فریقین میں یہ معاہدہ طے پایا کہ جب تک امیر المومنین تشریف نہیں لے آتے لڑائی بند کر دی جائے۔ عثمان بدستور دارالامارہ میں رہیں اور حکومت کے انتظامی امور میں کوئی رد و بدل نہ کیا جائے۔

اس معاہدہ کو طے پائے ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ ایک سرد و تاریک رات میں ان لوگوں نے عثمان پر شبخون مارا اور انہیں گرفتار کر کے چالیس کوڑے مارے اور ڈاڑھی بھووں اور پلکوں کے بال نوچ ڈالے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے :-

لم يلبث الا يومين او ثلاثة ايام حتى وثبوا على عثمان عند بيت الرزق فظفروا

ابھی دو یا تین دن گزرے ہوں گے کہ انہوں نے بیت الرزق کے نزدیک عثمان ابن حنیف پر حملہ کر دیا اور گرفتار کر کے چاہا کہ انہیں قتل کر

به واراد وا قتله ثم خشوا	دیں مگر اس خیال سے کہ کہیں انصار غضب ناک
غضب الانصار فنتفوا شعر	نہ ہو جائیں اقدام قتل سے ڈر گئے مگر ان کے سر
راسه ولحيته وحاجبيه و	ڈاڑھی اور بھوؤں کے بالوں کو اکھیڑ کر انہیں قید
حبسوه۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۱۱)	میں ڈال دیا۔"

جب عثمان ابن حنیف گرفتار کر کے قید میں ڈال دیئے گئے تو ان کے بارے میں حضرت عائشہ کا مشورہ لینا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان کے فرزند ابان کو اُن کے ہاں بھیجا گیا تاکہ ان سے دریافت کرے کہ عثمان کو قید میں رہنے دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ انہیں قتل کر دو ایک عورت نے یہ سنا تو چیخ کر کہا کہ اے ام المومنین میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں ان پر رحم کیجئے اور انہیں قتل ہونے سے بچائیے آخر وہ رسول اللہ کے صحابی ہیں کہا کہ اچھا ابان کو بلاؤ۔ ابان پلٹ کر آیا تو کہا کہ انہیں قتل نہ کرو اور قید میں رہنے دو۔ ابان نے یہ دوسرا حکم سنا تو کہا:۔

لو علمت انك تدعيني لهذا	اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس لئے بلا رہی ہیں
لم ارجع۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص۴۸۹)	تو میں پلٹ کر نہ آتا۔"

ام المومنین کے حکم سے عثمان تو اُن کی خون آشام تلواروں سے بچ گئے مگر ان کے ساتھیوں میں سے چالیس آدمی قتل کر دیئے گئے اس کشت و خون کے بعد انہوں نے بیت المال کے محافظ سپاہیوں کو جن کی تعداد پچاس تھی جکڑ باندھ لیا اور پھر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا۔ حکیم ابن جبلہ کو جو بصرہ کی ایک ممتاز شخصیت تھے اس سفاکی و خونریزی اور عثمان پر ظلم و تشدد کی اطلاع ہوئی تو وہ تڑپ اٹھے اور کہا کہ اگر میں نے اس موقع پر عثمان ابن حنیف کی مدد نہ کی تو گویا میں خوف خدا سے آشنا ہی نہیں ہوں۔ چنانچہ وہ بنی بکر اور بنی عبد القیس کے تین سو آدمیوں کو لے کر مدینۃ الرزق کی طرف بڑھے جہاں عبداللہ ابن زبیر اپنے آدمیوں میں غلہ تقسیم کر رہا تھا اس نے حکیم کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر پوچھا کہ تم کیسے آئے ہو کہا کہ اس غلہ میں سے ہمارا حصہ ہمیں دیا جائے۔ عثمان ابن حنیف کو رہا کیا جائے اور اس وقت انہیں دارالامارہ میں رہنے دیا جائے۔ جب تک امیرالمومنین یہاں تشریف فرما نہیں ہوتے۔ خدا کی قسم اگر ہمارے پاس یار و انصار ہوتے تو ہم اس خونریزی و غارت گری پر خاموش نہ رہتے اور ان لوگوں کا ضرور انتقام لیتے جنہیں تم لوگوں نے بے جرم و خطا قتل کر ڈالا ہے۔ ابن زبیر نے کہا کہ ہم نے خون عثمان کا بدلہ لیا ہے۔ کہا کہ جن لوگوں کو تم نے قتل کیا ہے کیا وہ عثمان کے قاتل تھے۔ تم لوگ اللہ کے غضب سے کیوں نہیں ڈرتے اور اس قتل و خونریزی کا سلسلہ کیوں نہیں روکتے کہا تم لاکھ چیخو چلاؤ

نہ نہیں اس میں سے کچھ دیا جائے گا اور نہ ابن حنیف کو رہا کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ علی کی بیعت توڑ دیں تو انہیں رہا کیا جا سکتا ہے۔ حکیم نے یہ صورت حال دیکھی تو کہنے لگے" بارالہا تو حاکم عادل ہے تو ان لوگوں کے ظلم و جور پر گواہ رہنا" پھر اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

لست فی شك من قتال هؤلاء — مجھے ان لوگوں سے جنگ و قتال کے جواز میں کوئی
فمن کان فی شك فلینصرف۔ — شبہہ نہیں ہے جسے شک ہو وہ واپس چلا جائے"

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ صفحہ ۴۹۱)

یہ کہہ کر حکیم نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر میدان میں اتر آئے۔ ادھر وہ لوگ بھی شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور تلواریں تلواروں سے ٹکرا کر خون برسانے لگیں۔ دوران جنگ میں ایک شخص نے حکیم کے پیر پر تلوار ماری اور اسے کاٹ دیا۔ حکیم نے وہی کٹا ہوا پیر اٹھا کر اس زور سے اس کی طرف پھینکا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ حکیم گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور اُسے نیچے دبوچ کر اس پر بیٹھ گئے اور اس وقت تک الگ نہ ہوئے جب تک اس نے دم توڑ نہ دیا۔ حکیم جہاں تک ممکن تھا لڑتے رہے مگر ایک مختصر سا فوجی دستہ کہاں تک اس لشکر گراں کا مقابلہ کرتا آخر ایک ایک کرکے سب مارے گئے اور حکیم اور ان کے فرزند اشرف اور بھائی رعل ابن جبلہ بھی اس جنگ میں کام آگئے۔ یہ جنگ جمل اصغر کے نام سے موسوم ہے جو ۲۵ ربیع الثانی ۳۶ھ میں ہوئی۔

حکیم اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بعد طلحہ و زبیر نے چاہا کہ عثمان کو بھی تہ تیغ کر دیں عثمان نے ان کے تیوروں سے بھانپ لیا کہ اب انہیں قتل کرنے کا ارادہ ہے انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگوں نے مجھے قتل کر دیا تو یاد رکھو کہ میرا بھائی سہل ابن حنیف اس وقت حاکم مدینہ ہے وہ میرے خون کے بدلے میں وہاں تمہارے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چن چن کر قتل کرے گا۔ انہوں نے یہ سنا تو اپنے عزیزوں کی جانوں کو خطرہ میں دیکھ کر انہیں چھوڑ دیا اور وہ جان بچا کر بصرہ سے نکل کھڑے ہوئے اور مقام ذیقار میں امیر المومنین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت نے عثمان ابن حنیف کی حالت زار دیکھی تو آبدیدہ ہو گئے۔ اور ان سے بصرہ کے حالات اور اصحاب جمل کے مظالم کے واقعات سنے تو غیظ و غضب سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسی وقت لشکر کی صف بندی کی میمنہ و میسرہ ترتیب دیا۔ میمنہ پر عبداللہ ابن عباس کو میسرہ پر عمر ابن ابی سلمہ کو اور مقدمہ پر ابو لیلی ابن عمر کو امیر نامزد کیا علم لشکر محمد ابن حنفیہ کے سپرد فرمایا اور بصرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں قبیلہ عبدالقیس کے ہاں کچھ دیر کے لئے قیام فرمایا۔ یہ قبیلہ حضرت کا ارادتمند تو

تھا ہی پیش آیند مہم کو دیکھ کر آپ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

جب امیرالمومنین کا لشکر نواحی بصرہ میں پہنچا تو احنف ابن قیس جو قتل عثمان کے بعد آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں دو باتیں پیش کرتا ہوں اگر حکم دیں تو میں آپ کے ہمرکاب رہ کر جنگ کروں یا چار ہزار تلواریں جو آپ کے خلاف کھنچی ہوئی ہیں۔ انہیں روک دوں۔ حضرت نے دوسری تجویز مان لی اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اب حضرت بصرہ کی شمالی سمت بڑھے اور مقام زاویہ میں منزل کی اور چند خطوط اور مختلف قاصد طلحہ، زبیر اور ام المومنین کے پاس بھیجے اور انہیں حرب و پیکار اور خانہ جنگی سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر یہ بات ان کے ذہنوں میں اُتر نہ سکی کہ یوں تو تمام جنگیں تباہ کن ہوتی ہیں مگر خانہ جنگی تمام جنگوں سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے۔ وہ سمجھانے بجھانے کے باوجود جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب امیرالمومنین کے قاصد مصالحت سے مایوس ہو کر پلٹ آئے اور یہ امر واضح ہو گیا کہ وہ جنگ کے علاوہ کسی چیز پر رضامند نہیں ہیں، تو زاویہ سے قدم آگے بڑھایا اور قصر عبیداللہ ابن زیاد کے پاس پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ امیرالمومنین کے لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی اور طلحہ و زبیر نے بنی ازد، بنی ضبہ، بنی حنظلہ، بنی سلیم وغیرہ مختلف قبائل کو اپنا ہمنوا بنا کر ان سے قصاص کے نام پر بیعت لے لی تھی اور اس طرح ان کے لشکر کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ جب دونوں طرف کے لشکر میدان میں اُتر آئے تو حضرت نے پھر انہیں جنگ کی تباہ کاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے اپنی کثرت و قوت پر بھروسا کرتے ہوئے ان باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور انجام سے آنکھیں بند کر کے یالثارات عثمان کے نعرے لگاتے ہوئے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے بھی ان کی صفوں کے بالمقابل صفیں جما دیں اور اپنے لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا "جب تک دشمن ابتدا نہ کرے تم آگے نہ بڑھنا اور جب تک وہ حملہ نہ کرے تم وار نہ کرنا کسی بھاگنے والے کا راستہ نہ روکنا نہ کسی زخمی پر ہاتھ ڈالنا کسی صاحب عزت کی پردہ دری نہ کرنا نہ کسی کے ہاتھ پیر کاٹنا نہ کسی کی لاش کی بے حرمتی کرنا اور نہ کسی عورت کو گزند پہنچانا"۔ جب لشکر کو یہ ہدایات دے چکے تو بے زرہ و سلاح گھوڑے پر سوار ہو کر صفوں سے باہر نکلے اور پکار کر کہا کہ زبیر کہاں ہے۔ زبیر پہلے تو سامنے آنے سے ہچکچائے اور پھر زرہ بکتر اور آلات حرب سے آراستہ ہو کر حضرت کے قریب آئے۔ آپ نے فرمایا اے زبیر بصرہ میں کیوں آئے ہو اور یہ خطرناک قدم کیوں اٹھایا ہے کہا خون عثمان کے قصاص کے لئے۔ فرمایا۔

اتطلب منی دم عثمان وقد   کیا مجھ سے خون عثمان کا قصاص چاہتے ہو حالانکہ

قتلته سلط الله علی اشدنا علیه الیوم مایکرہ۔
(تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۱۱)

"تم نے انہیں قتل کیا۔ خدا اس پر موت ایسی ناگوار چیز کو مسلط کرے جو ہم میں سے ان پر زیادہ سختی وتشدد کو روا رکھتا تھا۔"

زبیر اس کی تردید نہ کر سکے کہنے لگے:۔

لا اراك لهذا الامر اهلا ولا اولی به منا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۱۹)

"ہم آپ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے اور نہ آپ ہم سے زیادہ اس کے سزاوار ہیں۔"

حضرت نے فرمایا کہ آج تو تم ہمیں خلافت کا اہل نہیں سمجھتے اور ہم تو تمہیں عبدالمطلب ہی کی اولاد سمجھتے رہے ہیں یہاں تک کہ تمہارے ناہنجار بیٹے نے ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ڈلوا دی۔ اے زبیر میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہ کو یہ فرماتے نہیں سنا کہ:۔

انك تقاتلني وانت ظالم لی

"تم مجھ سے جنگ کرو گے اور میرے حق میں ظالم ہو گے۔"

(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص ۱۵۱)

زبیر نے پیغمبر اکرم کی یہ پیشین گوئی سنی تو کہا کہ ہاں رسول اللہ نے فرمایا تو تھا۔ کہا پھر کیوں آئے ہو کہا بھول گیا تھا اس بھولی بسری بات کو سن کر اور یہ دیکھ کر کہ عمار یاسر امیرالمومنین کے لشکر میں موجود ہیں، جن کے بارے میں پیغمبر نے فرمایا تھا۔ "اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور کہا کہ اب میں آپ سے نہیں لڑوں گا اور بن لڑے واپس چلا جاؤں گا۔ چنانچہ وہ مرجھائے ہوئے چہرے اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ حضرت عائشہ کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اس وقت تک جو قدم اٹھایا سوچ سمجھ کر اٹھایا۔ مگر اس جنگ میں نہ میری عقل کام کرتی ہے نہ میری بصیرت میرا ساتھ دیتی ہے لہٰذا میں علی کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ یہ کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہو۔ عبداللہ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ فرزندان عبدالمطلب کی چمکتی ہوئی تلواریں، لہراتے ہوئے پھریرے اور موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر ڈر گئے ہیں۔ کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ علی نے ایک بھولی ہوئی بات یاد دلا دی ہے۔ اب میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں اور کسی صورت سے رک نہیں سکتا۔ یہ کہا اور میدان چھوڑ کر چل دیے۔ اور بصرہ سے سات فرسخ کے فاصلہ پر وادی السباع میں عمرو ابن جرموز کے ہاتھ سے مارے گئے۔

اور امیرالمومنین کے اس قول کی تصدیق ہو گئی جو زبیر کے طلب قصاص کے جواب میں فرمایا تھا۔ زبیر کا یہ اقدام بجائے خود ایک ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے سابقہ موقف کو غلط سمجھا کیونکہ ان کا

پہلا موقف صحیح ہو تو یہ دوسرا اقدام صحیح نہیں ہو سکتا اور اگر دوسرا اقدام درست تھا تو پہلا اقدام لامحالہ غلط ہو گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ علی سے جنگ کرنا بھی صحیح ہو اور ان کے مقابلہ میں جنگ سے گریز کرنا بھی درست ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ ابن زبیر نے ابن عباس پر طعن کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں نے ام المومنین سے جنگ کی اور حواریٔ رسول زبیر سے لڑے تو انہوں نے زبیر کے اس موقف کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ حقیقت امر تو یہ ہے کہ تمہارے والد بزرگوار حضرت عائشہ کو گھر سے نکال کر میدان میں لائے اور علی کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے۔ میں تم سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ تم علی کو مومن سمجھتے ہو یا (معاذاللہ) کافر اگر مومن سمجھتے ہو تو تم ان سے جنگ لڑ کر گمراہ ہوئے اور اگر کافر سمجھتے ہو تو تمہارے والد (زبیر) گمراہ اور مستحق عذاب ٹھہرے اس لئے کہ انہوں نے ایک کافر کے مقابلہ میں جہاد سے منہ موڑا اور راہِ فرار اختیار کی اب تمہاری مرضی جسے چاہو اسے گمراہ سمجھو۔

زبیر کے بعد حضرت نے چاہا کہ طلحہ پر بھی حجت تمام کر دیں۔ چنانچہ انہیں مخاطب کر کے کہا:۔

یا طلحہ جئت بعرس رسول اللہ تقاتل بھا وخبأت عرسك فی البیت اما بایعتنی۔	اے طلحہ تم رسول اللہ کی بیوی کو جنگ و قتال کے لئے لے آئے ہو اور اپنی بیوی کو گھر کے اندر پردہ میں چھوڑ آئے ہو کیا تم نے میری بیعت نہیں کی تھی؟
(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۵۲۰)	

جب طلحہ پر اپنی بیعت کے ذریعہ اتمام حجت کر چکے تو آپ نے قرآن اپنے ہاتھوں میں لیا اور صفوں کا ایک چکر کاٹ کر بلند آواز سے کہا کہ تم میں کون ہے جو یہ قرآن لے کر صف اعداء کے سامنے جائے اور انہیں قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے اور اسی کتاب کا واسطہ دے کر انہیں فتنہ انگیزی سے منع کرے۔ مگر یہ سمجھ لے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ کوفہ کے ایک جوان مسلم ابن عبداللہ مجاشعی نے کہا کہ میں جاؤں گا۔ حضرت کے تین مرتبہ کہنے پر جب مسلم کے سوا کوئی اور تیار نہ ہوا تو آپ نے اسے دعائے خیر دی اور قرآن اس کے حوالے کیا۔ وہ مصحف ہاتھوں پر اٹھائے مخالف صفوں کے سامنے آیا اور انہیں قرآن کے اوامر و نواہی یاد دلائے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت دی مگر اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور کسی نے توجہ نہ کی۔ اتنے میں حضرت عائشہ کے ایک غلام نے تلوار سے حملہ کیا اور اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے۔ مسلم نے قرآن کو سینے سے لگا لیا اور تلوار کا وار کھا کر شہید ہو گیا۔ اور قرآن بھی تیروں کی بوچھار سے چھلنی ہو گیا۔ امیرالمومنین نے یہ اسلام سوز منظر دیکھا تو فرمایا:۔

الآن حل قتالھم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۲۲)	اب ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

مسلم مجاشعی کی اس مجاہدانہ سرفروشی کے بعد عمار ابن یاسر دشمنوں کی صفوں کے قریب آئے اور ان سے مخاطب ہوکر کہا "اے لوگو! تم نے اپنی عورتوں کو گھروں کے اندر پردے میں بٹھا رکھا ہے اور پیغمبر اکرم کی بیوی کو تلواروں تیزوں اور بھالوں کے سامنے لے آئے ہو۔ تم خون عثمان کا انتقام لینے آئے ہو حالانکہ تمہیں بخوبی علم ہے کہ عثمان کے قاتل کون تھے اور ان کے قتل کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے" عمار اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ تیروں کی بوچھار نے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ پلٹ کر حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین اب کس بات کا انتظار ہے یہ لوگ جنگ کے علاوہ کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔

امیرالمومنین کے صبر و سکوت اور صلح پسندانہ روش سے دشمن کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے آپ کی صفوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ جانباز سپاہیوں کے سینے چھلنی ہوگئے اور زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گرنے لگے۔ اس اثنا میں ایک شخص کو اٹھا کر حضرت کے سامنے لایا گیا جو تیروں سے چھلنی ہو کر جاں بحق ہو چکا تھا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو لایا گیا وہ بھی دشمن کے تیروں سے شہید ہو چکا تھا۔ پھر عبداللہ ابن بدیل اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو لائے جو تیر کھا کر دم توڑ چکا تھا۔ حضرت نے یہ کیفیت دیکھی تو پیشانی پر بل آیا تیور بدلے اور فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب میدان میں اترے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ حجت ہر طرح سے تمام ہو چکی تھی۔ صلح کے آثار ختم ہو چکے تھے اور دشمن کی طرف سے پہل ہو چکی تھی آپ نے پیغمبر خدا کی زرہ ذات الفضول طلب فرمائی اور اسے زیب تن کیا سر پر سیاہ عمامہ باندھا ذوالفقار ہاتھ میں لی میمنہ کی قیادت مالک اشتر کے اور میسرہ کی کمان عمار یاسر کے سپرد کی رسول اللہ کا سیاہ علم عقاب محمد ابن حنفیہ کو دیا۔ اور فرمایا بیٹا آگے بڑھو۔ محمد علم لے کر آگے بڑھے تو تیروں کی بوچھاڑ نے راستہ روکا۔ حضرت نے آگے بڑھ کر علم محمد کے ہاتھ سے لے لیا۔ ایک ہاتھ سے علم سنبھالا اور ایک ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا اور فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح لڑے کہ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر اور سروں کے انبار لگ گئے۔ جب لشکر کو تہ و بالا کر چکے تو پلٹ کر علم محمد ابن حنفیہ کو دیا انہوں نے بھی اس طرح مردانہ وار حملہ کیا کہ لاشیں خاک و خون میں تڑپتی نظر آنے لگیں۔

اس ہنگامہ دار و گیر میں مروان طلحہ کی تاک میں تھا کہ کسی طرح انہیں ختم کر کے خون عثمان کا انتقام لے کیونکہ قتل عثمان کی ایک حد تک ذمہ داری ان پر بھی عائد ہوتی تھی۔ اس انتقامی جذبہ کے علاوہ انہیں ٹھکانے لگانے میں ایک سیاسی مقصد بھی کارفرما تھا اور وہ یہ کہ مروان سمجھتا تھا کہ جب تک طلحہ و زبیر زندہ ہیں خلافت بنی امیہ کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی البتہ ان دونوں کو ختم کرنے کے بعد اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ زبیر تو محاذ جنگ سے جا چکے تھے۔ اگر وہ میدان میں رہ جاتے تو بعید نہ تھا کہ مروان

کے ترکش کا تیر انہیں بھی نشانہ بناتا۔ اس نے طلحہ کو ہلاک کرنے کا موقع ڈھونڈھ نکالا اور اپنے ایک غلام کی اوٹ لے کر زہر آلود تیر ان پر چلایا جو ان کی پنڈلی کو چیرتا ہوا گھوڑے کے شکم میں پیوست ہو گیا گھوڑا زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور ایک خرابہ میں جا کر رُکا اور وہیں پر طلحہ نے دم توڑ دیا۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

ان مروان ابن الحکم رمی طلحۃ یوم الجمل وھو واقف الی جنب عائشۃ بسھم فاصاب ساقہ ثم قال واللہ لا اطلب قاتل عثمان بعدک ابدا۔	جمل کے دن مروان ابن حکم نے طلحہ کو جو حضرت عائشہ کے پہلو میں کھڑے تھے تیر مارا جو اُن کی پنڈلی پر لگا۔ پھر مروان نے کہا کہ خدا کی قسم تمہارے بعد مجھے قاتل عثمان کے ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔"

طلحہ کے مارے جانے اور زبیر کے میدان خالی کر جانے سے اصحاب جمل کے نہ حوصلے پست ہوئے اور نہ ولولے سرد پڑے بلکہ استقلال و پامردی سے میدان میں جمے اور لڑنے مرنے پر تلے رہے اس لئے کہ وہ جنگ کا مرکزی کردار حضرت عائشہ کو سمجھتے تھے اور انہی سے ان کی عقیدتیں وابستہ تھیں۔ کوئی رہے یا جائے اس سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔ یہ عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کے اونٹ کی مینگنیاں اٹھا اٹھا کر ہاتھوں سے توڑتے انہیں سونگھتے اور کہتے کہ یہ ہماری مادر گرامی کے اونٹ کی مینگنیاں ہیں ان سے مشک و عنبر کی خوشبو آ رہی ہے۔ وُہ اونٹ کی حفاظت علم لشکر کی طرح کرتے اور ہمہ وقت اُس کے گرد حصار باندھے کھڑے رہتے اگرچہ مہار پکڑنے پر ہاتھ کٹتے سینے چھدتے خون بہتے مگر ثابت قدم رہتے اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتے۔ حضرت عائشہ ہودج کے اندر سے مہار پکڑنے والوں کو کٹ کٹ کر گرتے دیکھتی تھیں اور اُن کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔ اس ہمت افزائی کے نتیجہ میں جب بھی کوئی گرتا فوراً اس کی جگہ پر دوسرا آ کھڑا ہوتا اور مہار اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ ان مہار پکڑنے والوں میں زیادہ تر بنی ضبہ بنی ناجیہ بنی ازد اور قریش کے آدمی ہوتے تھے جو اپنی اپنی نوبت پر مہار پکڑتے رجزیہ اشعار پڑھتے اور بے جگری سے لڑتے ہوئے جان دے دیتے۔ یوں تو اُن مہار پکڑنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف قریش میں سے ستر آدمی مہار پکڑتے پر مارے گئے تھے مگر ان میں سے چند ایک کا ذکر تاریخ میں نمایاں ہے۔ ان میں سے ایک بصرہ کا قاضی کعب ابن سوار تھا اگرچہ وہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا مگر طلحہ و زبیر نے حضرت عائشہ سے کہا کہ وہ اسے بلا کر یا خود اس کے ہاں جا کر اسے تعاون پر آمادہ کریں اس لئے کہ اگر کعب شریک نہ ہوا تو قبیلہ بنی ازد میں سے کوئی بھی ہمارا

ساتھ نہیں دے گا۔ ام المومنین نے کسی کے ہاتھ اسے بلوا بھیجا مگر وہ ٹال گیا۔ آخر ام المومنین خود اُن کے ہاں گئیں اور اسے آواز دی مگر وُہ چپ سادھے بیٹھا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ جواب کیوں نہیں دیتے کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اس پر کعب نے دروازہ کھول دیا۔ ام المومنین نے اسے شریک جنگ ہونے کے لئے کہا اس نے کچھ دیر پس و پیش کیا اور آخر ہتھیار ڈال دیئے اور ام المومنین اسے میدان حرب و ضرب میں کھینچ لائیں۔ اس کی وجہ سے بنی ازد بھی شریک ہو گئے۔ کعب میدان جنگ میں گلے میں قرآن حمائل کئے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں مہار پکڑے کھڑا تھا کہ ایک نامعلوم سمت سے سنناتا ہوا تیر آیا جس نے اُسے وہیں پر ٹھنڈا کر دیا۔

جب عرب کے مشہور شمشیر زن عمرو ابن یثرِی نے مہار پکڑی تو امیر المومنین کے لشکر سے ہند ابن عمرو اس سے لڑنے کے لئے نکلے۔ عمرو نے مہار اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دی اور مقابلہ کے لئے سامنے آیا کچھ دیر تک دونوں زور آزمائی کرتے رہے۔ آخر ابن یثرِی غالب آیا اور ہند اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ہند کے بعد علباء ابن ہیثم اور زید ابن صوحان اس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور دونوں اس کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ عمار ابن یاسر نے یہ دیکھا تو ان کی رگوں میں خون شجاعت جوش مارنے لگا لیف خرما کی رسّی سے کمر کس کر باندھی ہتھیار سجے اور تلوار لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ عمار نوے برس کے بوڑھے تھے اور حریف کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں نظر آ رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں دیکھا تو کہا کہ ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو پہلے جانے والوں کا ہو چکا ہے۔ ابن یثرِی نے انہیں جنگ کے ارادہ سے آتے دیکھا تو اُونٹ کی مہار عمرو ابن بجرہ کے سپرد کی اور تیزی سے ان کی طرف لپکا اور قریب پہنچ کر تلوار کا بھرپور ہاتھ چلایا۔ عمار نے تلوار ڈھال پر روکی ڈھال کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ تلوار اس کی کڑیوں میں گڑ گئی اس نے جھٹکا دے کر اسے نکالنا چاہا تو عمار نے جھک کر اس کی ٹانگوں پر تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور بے بس ہو گیا۔ لوگ اسے اٹھا کر امیر المومنین کے سامنے لائے حضرت نے تینوں شہیدوں کے قصاص میں اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ عمرو ابن بجرہ نے جب دیکھا کہ ابن یثرِی مارا گیا ہے تو وہ مہار چھوڑ کر میدان میں نکل آیا ادھر سے ربیعہ عقیلی نکلے اور دونوں تلوار لے کر ایک دوسرے پر جھپٹے اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے۔

جب مہار دست بدست گردش کرتی ہوئی عوف ابن قطن ضبی کے ہاتھ میں آئی تو اس نے کہا کہ قتل عثمان کی ذمہ داری علی اور اُن کے بیٹوں پر عائد ہوتی ہے۔ میں اس خون کا انتقام انہی سے لوں گا۔ چنانچہ یہ رجز پڑھا اور میدان میں نکل آیا۔

یا ام ام خلا منی الوطن　　لا ابتغی القبر ولا ابغی الکفن

اے ماں! اے ماں! وطن مجھ سے چھوٹ گیا اب نہ مجھے قبر کی خواہش ہے نہ کفن کی تمنا۔"

من ھٰھنا یحشر عوف ابن قطن　　ان فاتنا الیوم علی فالغبن

اسی مقام سے عوف ابن قطن کا حشرونشر ہوگا۔ اگر آج علی ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے تو یہ سراسر نقصان ہے۔"

او فاتنا ابناہ حسین وحسن　　اذن امت بطول ھم وحزن

یا ان کے دونوں بیٹے حسن وحسین ہمارے ہاتھ سے بچ گئے تو میں اسی رنج وغم سے مر جاؤں گا۔"

اس رجز کے بعد حملہ آور ہوا اور کچھ دیر لڑتا رہا۔ آخر محمد ابن حنفیہ کی شمشیر شرربار اس کے سر پر چمکی اور وہ علی و فرزندان علی کو قتل کرنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

ان مہار پکڑنے والوں میں عبداللہ ابن ابزی بھی تھا اس نے پہلے مہار پکڑی اور پھر یہ رجز پڑھتا ہوا حضرت کی صفوں پر حملہ آور ہوا:۔

اضربھم ولا اری اباالحسن　　ھا ان ھٰذا حزن من الحزن

میں ان پر تلوار چلاؤں گا اور ابوالحسن کو بھی نگاہ میں نہیں لاؤں گا۔ یہ جنگ ایک المناک حزنیہ ہے۔"

امیرالمومنین نے آگے بڑھ کر اس پر نیزہ مارا اور فرمایا تمہیں ابوالحسن کو دیکھنے کی خواہش تھی کہو انہیں کیسا پایا اور نیزہ اسی کے سینہ میں گڑا رہنے دیا۔

اصحاب جمل میں کا ایک نامور سردار خباب ابن عمرو راسبی یہ رجز پڑھتا ہوا مبارز طلب ہوا۔

اضربھم ولو اری علیا　　عممتہ ابیض مشرفیا

میں ان پر تلوار چلاؤں گا اور اگر میں نے علی کو دیکھ لیا تو انہیں چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار کی لپیٹ میں لے لوں گا۔"

مالک اشتر آگے بڑھے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد عتاب ابن اسید جو اشراف قریش میں سے تھا یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا:۔

انا ابن عتاب و سیفی ولول　　والموت عند الجمل المجلل

میں عتاب کا بیٹا ہوں میری تلوار کا نام ولول ہے اور میری موت اونٹ کے گرد درپیش ہے۔

مالک اشتر نے حملہ کر کے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور یوں اس کی موت تو اونٹ کے قدموں میں ہوئی مگر اس کی تلوار جس پر اسے ناز تھا کسی کام نہ آئی۔

بصرہ کے ایک شہسوار عمرو ابن اشرف عتیکی نے ایک ہاتھ میں مہار پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اور جو اس کے قریب آتا اسے تلوار کی زد پر رکھ لیتا اور یہ رجزیہ اشعار پڑھتا۔

یا امنا یا خیر ام نعلم والام تغذ د ولدھا و ترحم

اے ہماری ماں ہمارے علم میں آپ بہترین ماں ہیں۔ ماں اپنے بچوں کو غذا دیتی اور ان پر ترس کھاتی ہے۔"

الا ترین کم شجاع یکلم وتختلی ھامتہ والمعصم!

کیا آپ دیکھتی نہیں ہیں کہ کتنے بہادر زخمی ہو رہے ہیں اور سر اور کلائیاں کٹ کٹ کر گر رہی ہیں۔"

حارث ابن زہیر ازدی اس کے مقابلہ کے لئے نکلے دونوں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ اور ایک دوسرے کی تلوار سے گھائل ہو کر گرے اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ختم ہو گئے۔ ابن اشرف کے ہمراہ اس کے گھر کے بھی تیرہ افراد کام آئے۔

عبداللہ ابن خلف خزاعی رئیس بصرہ جس کے ہاں ام المومنین وارد بصرہ ہونے کے بعد مقیم تھیں میدان میں اترا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے حضرت علی سے مبارز طلب ہوا۔

یا ابا تراب ادن منی فترا فاننی دان الیک شبرا

وان فی صدری علیک غمرا

اے ابوتراب مجھ سے کچھ قریب ہو۔ تم جتنا قریب ہو گے میں اس سے زیادہ قریب ہوں گا۔ میرے سینہ میں تمہارے خلاف غم و غصہ بھرا ہوا ہے۔"

حضرت نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر تلوار ماری اور اسے دو پارہ کر دیا۔"

عبداللہ ابن حکیم جو قریش کے دستہ کا علمبردار تھا مقابلہ کے لئے نکلا ادھر سے عدی ابن حاتم اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے بڑھے اس نے عدی پر حملہ کیا اور نیزے سے ان کی ایک آنکھ پھوڑ دی اس صورت میں حریف کو زیر کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ مالک اشتر نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ بٹایا اور دونوں نے مل کر اسے قتل کر دیا۔

ام المومنین ہر مہار پکڑنے والے سے پوچھ لیتی تھیں کہ تم کون ہو۔ اس دوران عبداللہ ابن زبیر نے

مہار پکڑی تو معمول کے مطابق پوچھا کہ تم کون ہو اس نے کہا کہ میں آپ کا بھانجا عبداللہ ہوں۔ عبداللہ کا نام سنا تو تڑپ اٹھیں اور پراندوہ لہجہ میں کہا واثکل اسماء (ہائے اسماء کی کوکھ اجڑ گئی) عبداللہ مہار پکڑے ہوئے تھا کہ سامنے سے مالک اشتر گزرے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تاکا اور تلوار تولتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹے۔ مالک نے عبداللہ کے سر پر ضرب لگائی اور اسے شدید مجروح کر دیا اور خود بھی اس کے ہاتھ سے معمولی زخمی ہو گئے۔ دونوں زخم خوردہ آپس میں گتھ گئے اور مالک عبداللہ کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ عبداللہ نے جان بچتے نہ دیکھی تو چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا اقتلونی ومالکا واقتلوا مالکا معی۔ (مجھے اور مالک دونوں کو قتل کر ڈالو) لوگوں نے اس آواز پر توجہ نہ دی کیونکہ اکثر لوگ مالک کو اشتر ہی کے نام سے جانتے پہچانتے تھے اگر عبداللہ مالک کے بجائے اشتر کہتا تو لوگ یقیناً ان پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں قتل کر دیتے۔ عبداللہ جوان اور تنومند تھا اور مالک بوڑھے تھے وہ زور کر کے ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عبداللہ نے بھاگ کر اپنی جان تو بچا لی مگر فرار کا دھبا ہمیشہ کے لئے اس کے دامن پر رہ گیا۔ اور لوگوں میں اس کا چرچا بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے عدی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری یہ آنکھ کب پھوٹی تھی عدی نے اس کے فرار کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

یوم طعنتك فی استك وانت مول۔ (عقدالفرید۔ ج۲۔ صفحہ ۳۵۴)	جب ہم نے تمہارے سرین پر نیزہ مارا تھا اور تم پیٹھ پھرائے بھاگے جا رہے تھے۔

ام المومنین عبداللہ کی طرف سے انتہائی فکر مند تھیں۔ جب انہیں یہ خبر دی گئی کہ وہ بھاگ کر اپنی جان بچا لے گیا ہے۔ تو ام المومنین نے اطمینان کی سانس لی اور خبر لانے والے کو چار ہزار درہم انعام دیئے۔

اسود ابن البختری قرشی بھی مہار پکڑنے پر مارا گیا۔ جندب ابن زہیر غامدی اور عبدالرحمٰن ابن اسید مالک کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ جب سب سے آخر میں مہار زفر ابن حارث کے ہاتھوں میں آئی تو گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ صفوں پر صفیں ٹوٹ پڑیں اور ہر طرف خون کا سیلاب امنڈ آیا۔ ام المومنین نے یہ خونی منظر دیکھا تو کچھ کنکریاں لے کر حضرت کے لشکر کی طرف پھینکیں اور کہا شاھت الوجوہ (یہ چہرے سیاہ ہوں)، یہ چربہ تھا اس معجزانہ عمل کا جو جنگ حنین میں رسول اللہ سے ظہور میں آیا تھا۔ مگر وہاں پیغمبر کا عمل کفار کے مقابلہ میں اور وحی الٰہی کے ماتحت تھا۔ اور یہاں مقابلہ میں حضرت علی اصحاب بدریین مبایعین تحت الشجرہ اخیار صحابہ اور ممتاز تابعین تھے۔ اس عمل کا اثر کیا ہوتا تھا۔ کسی نے اسے قابل

توجہ بھی نہ سمجھا بلکہ ایک بگڑے دل سپاہی نے یہ آیت ذرا سے تغیر کے ساتھ پڑھ دی:۔

مارمیت اذ رمیت ولکن اللہ	جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو تم نے نہیں پھینکیں
رمی۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱ ص۸۵)	بلکہ اللہ نے پھینکیں"

امیرالمومنین نے مالک اشتر کو میمنہ لشکر پر اور ہاشم ابن عتبہ کو میسرہ پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ تلواریں علم کئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس شدت سے حملہ کیا کہ میمنہ کے قدم لڑکھڑ گئے اور میسرہ اپنی جگہ سے ہٹ کر قلب لشکر سے مل گیا۔ سردار میمنہ ہلال ابن وکیع مالک اشتر کے ہاتھ سے قتل ہوا اور لشکر بھاگ کر حضرت عائشہ کے گرد پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ سپاہ امیرالمومنین نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا اور اونٹ کے گرد گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ بنی ازد بنی ناجیہ اور باہلہ اونٹ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اس کی حفاظت کر رہے تھے اور تیروں اور تلواروں کے وار سینہ پر روک رہے تھے۔ جنگ زوروں پر لڑی جا رہی تھی اور تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار سے میدان گونج رہا تھا۔ زمخشری نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ:۔

ماشبہت وقع السیوف علی	سروں پر تلواروں کے پڑنے سے ایسی آوازیں
الھام الا بضرب البیاذر علی	آتی تھیں جیسے کپڑا دھونے کے پٹڑے پر چوب
المواجن۔ (فائق۔ ج ۱۔ ص۳۵)	مارنے کی آواز ہوتی ہے"

امیرالمومنین نے دیکھا کہ جنگ ابھی فیصلہ کن مرحلہ میں داخل نہیں ہوئی اس لئے خود میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کے ایک دستہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ امام حسن اور امام حسین دائیں بائیں تھے اور محمد ابن حنفیہ علم لئے آگے آگے چل رہے تھے۔ آپ نے محمد ابن حنفیہ سے فرمایا کہ آگے بڑھو اور صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ کر دم لو جہاں عائشہ کا اونٹ کھڑا ہے۔ محمد علم لہراتے آگے بڑھے مگر دشمن کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی اور محمد کے قدم رک گئے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر اپنا بایاں ہاتھ محمد کے داہنے کندھے پر رکھا اور محمد کے ہاتھ سے علم لے لیا۔ بائیں ہاتھ سے علم سنبھالا اور دائیں ہاتھ میں ذوالفقار لی اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح حملہ کیا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور اس طرح تابڑ توڑ تلوار چلائی کہ اس میں خم آ گیا۔ جب دشمن کی صفوں کو درہم و برہم کر چکے تو اپنی صفوں کے قریب آئے تلوار کو گھٹنے پر رکھ کر سیدھا کیا اور دوبارہ حملہ کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد ابن حنفیہ عمار ابن یاسر عدی ابن حاتم اور امام حسن و امام حسین نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین آپ ٹھہرئیے۔ ہم میدان میں جاتے ہیں مگر آپ نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا اور نہ کسی کی بات کا

جواب دیا چہرہ غیظ و غضب سے تمتما رہا تھا آنکھ سے شرارے برس رہے تھے اور سینہ سے شیر کے غرانے کی سی آواز آ رہی تھی۔ اب کس میں جرأت تھی کہ کچھ کہے اور زبان کھولے سب خاموش ہو گئے۔ آپ نے علم محمد کے سپرد کیا اور اکیلے دشمن کی صفوں پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوئے اور صفوں کے اندر گھس کر اس طرح تلوار چلائی کہ صفیں الٹ گئیں میدان لاشوں سے پٹ گیا اور لڑتے لڑتے تلوار پھر ٹیڑھی ہو گئی۔ آپ اپنی صف کے قریب آئے اور گھوڑے سے نیچے اُتر کر تلوار سیدھی کی۔ جب آپ کے اعوان و انصار نے دیکھا کہ پھر میدان کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے آپ کو قسم دی کہ اپنی حالت پر رحم کھائیے آپ نہ لڑیں ہم لڑیں گے۔ اگر آپ پر آنچ آئی تو دین پر بن جائے گی اور اسلام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ حضرت نے ان لوگوں کے کہنے سننے سے ہاتھ روک لیا اور پلٹ کر محمد ابن حنفیہ سے کہا، کہ دیکھو بیٹا اس طرح سے جنگ کی جاتی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین کس میں دم خم ہے جو آپ کی طرح لڑے اور کس کے بازوؤں میں کس بل ہے جو اس طرح تلوار چلائے۔

اس پر زور حملہ سے اصحاب جمل پر شکست کے آثار طاری ہو چکے تھے اگرچہ ان کے سروں پر تلواریں چل رہی تھیں۔ سینوں کے اندر خنجر اتر رہے تھے اور سر بازو اور کلائیاں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں مگر اس وقت تک میدان چھوڑنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ جب تک اونٹ ان کے درمیان کھڑا تھا اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اس کی جھول اور ام المومنین کے کجاوہ میں تیر اس طرح پیوست تھے جس طرح ساہی کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں اور وہ اس خونی ہنگامہ کی تاب نہ لا کر اس طرح گھوم رہا تھا جس طرح چکی گھومتی۔ حضرت نے دیکھا کہ جب تک اونٹ میدان میں کھڑا ہے جنگ ختم ہونے میں نہیں آئے گی ادھر بصرہ والے کسی کو اونٹ کے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے اور اس پر تلے ہوئے تھے کہ جان جائے مگر اونٹ کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ حضرت نے اسے میدان سے ہٹانے کا ارادہ کیا اور قبیلۂ نخع اور ہمدان کے جوانمردوں کو لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ حضرت کو دیکھ کر فوجیں ہٹیں پرے ٹوٹے اور آپ اپنے ہمراہیوں سمیت اونٹ کے قریب پہنچ گئے اور اپنی فوج کے ایک سپاہی بجیر ابن دلجہ نخعی سے کہا کہ آگے بڑھ کر اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالو۔ بجیر نے آگے بڑھ کر اونٹ کے پیروں پر وار کیا۔ اونٹ نے ایک مہیب چیخ ماری اور پہلو کے بل زمین پر گرا۔ اونٹ کے گرتے ہی جنگ رک گئی اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی کسی کو سر و پا کا ہوش نہ رہا۔ لاشوں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کو روندتے ہوئے جدھر منہ آیا ادھر بھاگ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر سناٹا چھا گیا۔ محمد ابن ابی بکر اور عمار یاسر نے حضرت کے حکم سے اونٹ کے تسمے کاٹے اور ہودج کو اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ محمد ابن ابی بکر نے ہودج کے اندر ہاتھ

ڈالا۔ ام المومنین نے بگڑ کر پوچھا کہ کون ہو کہا کہ آپ کا ناپسندیدہ بھائی کہا کیا خثعمیہ کے بیٹے ہو کہا ہاں۔ کہ آپ کو کوئی گزند تو نہیں پہنچا کہا کہ ایک تیر بازو کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا اور کوئی خاص گزند نہیں پہنچا۔ اس کے بعد عمار ابن یاسر ہودج کے قریب آئے اور کہا کہ اے مادر گرامی آپ نے اپنے بیٹوں کی جنگ دیکھ لی اس پر ام المومنین نے بگڑ کر کہا:۔

لست لك بام۔ (تاریخ کامل۔ ج۳ ص۱۳۰) "میں تمہاری ماں نہیں ہوں"

عمار نے کہا کہ آپ ماں تو ہیں خواہ مانیں یا نہ مانیں۔

ام المومنین کا یہ انکار قرآن مجید کی رو سے درست نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے کہ آپ بنص قرآن وازواجہ امہاتھم (پیغمبر کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں)، ماں تھیں جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں اور نہ انکار ہو سکتا ہے۔ اس انکار کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ جب عمار نے ان کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ہے تو گویا انہوں نے مادری حقوق کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ بیٹے کہاں رہے اور آپ ماں کہاں رہیں۔ لیکن یہ حرب و پیکار ماں کے ماں اور بیٹے کے بیٹا ہونے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ بحیثیت حرم رسول ماں ہونا اور ہے اور ان کی اطاعت و ہمنوائی اور بات ہے۔ اگر کوئی ان کی ہمنوائی نہیں کرتا تو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بیٹا نہیں رہا اور آپ ماں نہیں رہیں۔ جہاں تک اطاعت و فرمانبرداری کا تعلق ہے وہ صرف حقیقی ماؤں تک محدود ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ازواج رسول اگر امت کی مائیں تھیں تو حقیقی ماؤں کی طرح ان کی اطاعت بھی واجب تھی اس طرح کہ ان کے حکم سے سرتابی معصیت قرار پائے۔ وہ مائیں ہیں تو اس لحاظ سے کہ پیغمبر کے گھر میں آنے کے بعد دوسرے کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتیں اور اسی طرح حرام تھیں جس طرح مائیں اولاد پر حرام ہوتی ہیں۔ چنانچہ حکم پردہ کے بعد جب کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم پیغمبر کے بعد ان کی بیویوں سے عقد کریں گے۔ تو ان کی تنبیہ و سرزنش کے لئے یہ آیت نازل ہوئی:۔

وما کان لکم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا۔	تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم رسول خدا کو اذیت دو اور یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ تم ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔

اس حرمت نکاح کے علاوہ وہ احکام جو حقیقی ماں ہونے کی حیثیت سے اولاد پر اور اولاد ہونے کی حیثیت سے ماں پر عائد ہوتے ہیں۔ یہاں ثابت نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ اولاد پر ماں کا نان و نفقہ واجب ہوتا ہے اور بیٹا ماں کا اور ماں بیٹے کی وارث ہوتی ہے اور ماں کا اولاد سے پردہ نہیں ہوتا مگر یہاں

نہ ان کا نفقہ امت پر واجب تھا اور نہ وہ اُمت کی اور نہ امت اُن کی وارث قرار پاتی ہے۔ اور نہ وہ حکم پردہ سے مستثنیٰ تھیں۔ اسی طرح حقیقی ماؤں کی طرح ان کی اطاعت و ہمنوائی بھی واجب نہ تھی صرف حرمت عقد کے سلسلہ میں انہیں ماں کا درجہ دینے سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ان پر حقیقی ماؤں کے تمام احکام بھی مترتب ہوتے ہیں۔ آخر رضاعی ماں کو بھی ماں قرار دیا گیا ہے مگر وہ ماں ہونے کے باوجود نہ وارثہ پاتی ہے نہ واجب النفقہ ہوتی ہے اور نہ اولاد پر اس کی اطاعت ہی واجب ہے اسے صرف حرمت نکاح کے اعتبار سے ماں قرار دیا گیا ہے۔ اور پھر حقیقی ماں ہو یا رضاعی ماں یہود یہ بھی ہو سکتی ہے اور نصرانیہ بھی مگر ان امور میں جو خلاف شرع اسلام ہوں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ام المومنین کی اطاعت ماں ہونے کی حیثیت سے امت پر واجب تھی تو اس مورد پر جب کہ حقیقی ماں کی بھی اطاعت نہیں ہے ان کی اطاعت کیونکر ضروری ہو سکتی ہے کیونکہ ان کا یہ اقدام امام برحق کے خلاف جارحانہ حیثیت رکھتا تھا جو آئینِ اسلام کے خلاف اور کسی طرح جائز نہ تھا اور امر ناجائز میں اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

لا طاعة فی معصیة انما الطاعة فی المعروف۔ (مشکوٰۃ۔ صہ ۳۱۹)	اطاعت گناہ میں نہیں بلکہ صرف نیک کام میں ہوتی ہے۔

شائد ام المومنین کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کا یہ اقدام جارحانہ اور سفر بصرہ سفر معصیت ہے چنانچہ ان کے اس طرز عمل کے بارے میں کہ وہ سفر میں نماز قصر نہیں کرتی تھیں۔ ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ ان کا یہ عمل صرف سفر بصرہ کے دوران تھا اور وہ اس سفر کو سفر معصیت سمجھتے ہوئے نماز پوری پڑھتی تھیں کیونکہ قصر کا حکم سفر کے مباح ہونے کی صورت میں ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی نے اس تاویل کے سلسلہ میں ایک قول یہ نقل کیا ہے:۔

انما اتمت فی سفرها الی البصرة الی قتال علی والقصر عندها انما یکون فی سفر طاعة۔ (فتح الباری۔ ج ۲ صہ ۴۷۰)	حضرت عائشہ حضرت علی سے بقصد جنگ بصرہ جاتے ہوئے نماز پوری ادا کرتی تھیں اور ان کے نزدیک قصر کا حکم صرف سفر اطاعت کی صورت میں تھا۔

بہرحال ام المومنین ابھی میدانِ جمل ہی میں تھیں کہ امیرالمومنین ہودج کے قریب آئے۔ اور اسے لکڑی سے کھٹکھٹایا اور فرمایا اے حمیرا کیا رسولِ خدا نے آپ کو یہی حکم دیا تھا کہا ملکت فاسجع (آپ غالب آئے ہیں تو حسن سلوک کیجئے) آپ نے محمد ابن ابی بکر کو حکم دیا کہ ہودج کے اوپر خیمہ نصب کر دو۔

اور اس کی نگرانی کرو تاکہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آنے پائے اور جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو انہیں عبداللہ ابن خلف کی بیوہ صفیہ بنت حارث کے ہاں پہنچا دیا۔ اور اونٹ کے بارے میں حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے اور اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے۔ چنانچہ اسے جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی۔ پھر فرمایا خدا لعنت کرے اس چوپائے پر یہ بنی اسرائیل کے گوسالہ سے کتنی مشابہت رکھتا تھا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:۔

وانظر الیٰ الٰهك الذی ظلت	اپنے معبود کو تو دیکھو جس کی عبادت پر تم جمے ہوئے
علیه عاكفا لنحرقنه ثم لننسفنه	تھے ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور پھر اُسے
فی الیم نسفا۔	پراگندہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔"

خاتمہ جنگ پر حضرت نے اپنے لشکر میں اعلان فرمایا کہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرنا کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہونا۔ جو ہتھیار اتار کر رکھ دے اور جو گھر کا دروازہ بند کر لے اس کے لئے امان ہے۔ فریق مخالف کے اموال سے کوئی تعرض نہ کرنا البتہ جو ہتھیار برتن اور سواریاں میدانِ جنگ میں تمہارے ہاتھ لگیں وہ تمہارا مال ہے اس کے علاوہ کسی چیز کو روا نہ سمجھنا۔ اور عورتوں اور کنیزوں پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کا خون بہانا تو ہمارے لئے مباح ہو اور انہیں غلام و کنیز بنانا جائز نہ ہو۔ ہمیں مردوں اور بچوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز بنانے کی اجازت ہونا چاہیئے۔ شاید یہ نظریہ اس بناء پر قائم کیا ہو کہ دورِ اول میں جب مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی گئی تو بقیۃ السیف کو غلام و کنیز بنا لیا گیا تھا۔ لہٰذا یہاں فریقِ ثانی کو غلام و کنیز بنانے میں کیا امر مانع ہے۔ مگر حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ میں نے وہی فیصلہ کیا ہے جو رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تھا اگر تم بضد ہو تو بتاؤ کہ تم میں کون ہے جو اپنی ماں عائشہ کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کہنے والوں پر سناٹا چھا گیا اور سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کہنے لگے کہ یا امیر المومنین آپ نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہی صحیح ہے ہم ہی لوگوں نے غلط نظریہ قائم کیا تھا اور ناروا مطالبہ پیش کیا تھا۔

حضرت تین دن تک میدانِ جمل میں تشریف فرما رہے اور مقتولین کو دفن کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور سیدھے مسجد جامع میں تشریف لے گئے اور نماز سے فارغ ہو کر مصلّے کی داہنی جانب دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور اہل بصرہ کو ان کی بے راہروی و کج ذہنی پر سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:۔

کنتم جند المرأة واتباع	تم ایک عورت کی سپاہ اور ایک چوپائے کے
البهیمة رغا فاجبتم وعقر	تابع تھے وہ بلبلایا تو تم لبیک کہتے ہوئے بڑھے

فھربتم اخلاقلکم دقاق عھدکم شقاق ودینکم نفاق دماءکم زعاق والمقیم بین اظھرکم مرتھن بذنبہ والشاخص عنکم متدارک برحمۃ۔

(نہج البلاغہ)

اور وہ زخمی ہوا تو تم بھاگ کھڑے ہوئے تم پست اخلاق و عہد شکن ہو تمہارے دین کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ تمہاری سرزمین کا پانی تک شور ہے تم میں اقامت کرنے والا گناہوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے اور تم میں سے نکل جانے والا اپنے پروردگار کی رحمت کو پا لینے والا ہے۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر اہل بصرہ سے بیعت لی اور انہیں فتنہ و شرانگیزی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے باہر نکلے اور ابوالاسود دئلی وغیرہ کے ہمراہ بیت المال میں تشریف لائے اور سرسری نگاہوں سے بیت المال کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ یہ تمام رقم شرکاء جنگ میں تقسیم کر دی جائے اور ہر سپاہی کو پانچ پانچ سو درہم دیئے جائیں۔ جب وہ رقم تقسیم کی گئی تو نہ ایک درہم گھٹا اور نہ ایک درہم بڑھا اور سب پر برابر تقسیم ہو گئی۔ حبۃ العرنی کہتے ہیں کہ امیر المومنین نے بھی اپنا حصہ دوسروں کے برابر لیا اور جب لے چکے تو ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ یا امیر المومنین میں جنگ میں شریک تو نہ ہو سکا مگر میرا دل آپ کے ساتھ تھا اور میری ہمدردیاں آپ سے وابستہ تھیں مجھے بھی اس مال میں سے حصہ ملنا چاہیئے۔ حضرت نے اپنے حصہ کے پانچ سو درہم اسے دے دیئے اور خالی ہاتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضرت عائشہ ابھی تک بصرہ میں مقیم تھیں۔ حضرت نے ابن عباس کو ان کے ہاں بھیجا کہ انہیں کہیں کہ وہ مدینہ واپس جانے کی تیاری کریں اب نہ یہاں ان کا کوئی کام ہے اور نہ ان کا مدینہ سے زیادہ عرصہ تک باہر رہنا مناسب ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں حضرت کا پیغام لے کر ان کے ہاں گیا اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ مگر انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے مجبوراً اجازت لئے بغیر اندر داخل ہونا پڑا اور ایک بوریا اٹھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ ام المومنین نے پردہ کے پیچھے سے دیکھا تو کہا کہ اے ابن عباس تم نے آداب شریعت کا کوئی لحاظ نہیں کیا تم بغیر اجازت کے میرے مکان میں داخل ہوئے اور بغیر اجازت کے اس بوریئے پر بیٹھ گئے۔ ابن عباس نے کہا کہ ہم بہتر سمجھتے ہیں آداب شریعت کو اور آپ نے آداب و احکام شریعت سیکھے ہیں تو ہم سے۔ یہ آپ کا گھر تو ہے نہیں کہ ہمیں آپ سے اجازت لینے کی ضرورت ہو آپ کا گھر وہ ہے جہاں رسول اللہ آپ کو چھوڑ گئے تھے۔ جب آپ اس گھر میں ہوں گی تو ہم آپ کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں گے۔ مجھے یہاں بہر صورت آنا تھا تاکہ امیر المومنین کا یہ فرمان آپ کے گوش گزار کروں کہ آپ یہاں سے جلد مدینہ روانہ ہو جائیں۔ کہا کہ

امیرالمومنین تو عمر ابن خطاب تھے کہا ہوں گے مگر میری مراد امیرالمومنین سے علی ابن ابی طالب ہیں کہا میں تو انہیں امیرالمومنین نہیں مانتی کہا کہ آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور آپ نے کب سے یہ منصب سنبھالا ہے کہ آپ امیرالمومنین مانیں تو وہ امیرالمومنین ہیں ورنہ نہیں ہیں اس پر ام المومنین رونے لگیں اور کہا کہ میں خود اس شہر کو چھوڑ کر جلد جانا چاہتی ہوں۔

فان ابغض البلدان الی بلد	اس لئے کہ وہ شہر مجھے انتہائی ناپسند ہے جس
انتم فیہ۔ (عقد الفرید۔ ج ۳۔ صہ ۱۰۱)	میں تم لوگوں کی بود و باش ہو۔

ابن عباس نے کہا کہ یہ حق شناسی کی انتہا ہے۔ کیا یہ اس کا صلہ ہے کہ ہم نے آپ کو ام المومنین بنایا اور آپ کے والد بزرگوار صدیق کہلائے۔ کہا کیا تم رسول اللہ کے ذریعہ ہم پر تفوق و احسان جتلانا چاہتے ہو۔ کہا کہ آپ پیغمبر کی نو بیویوں میں سے ایک بیوی ہی تو ہیں مگر اتنی سی بات پر آپ کا ہر حکم مانا جاتا ہے اور آپ کی آواز پر لبیک کہی جاتی ہے اور ہم تو رسول کا گوشت و پوست ہیں اور انہی کا خون ہماری رگوں میں گردش کر رہا ہے اگر یہ چیز آپ کو حاصل ہوتی تو کیا آپ ہم پر تفوق و برتری نہ جتائیں۔ اس پر ام المومنین خاموش ہو گئیں اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔ ابن عباس نے پلٹ کر یہ تمام گفتگو حضرت کے سامنے دہرائی۔ آپ سن کر خوش ہوئے اور یہ آیت پڑھی :۔

ذریۃ بعضھا من بعض واللہ	برگزیدہ کیا اللہ نے بعض کی اولاد کو بعض سے اور
سمیع علیم۔	اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ام المومنین نے جب واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو امیرالمومنین نے سواری زاد راہ اور دوسری سہولتیں اُن کے لئے مہیا کر دیں اور محمد ابن ابی بکر کو ان کے ہمراہ جانے کا حکم دیا اور انہیں بحفاظت تمام مدینہ روانہ کر دیا۔ یہ واپسی یکم رجب ۳۶ھ روز شنبہ کو ہوئی۔

امیرالمومنین نے اس جنگ میں اوّل تا آخر جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ کی امن پسندی صلح جوئی اور بلند نفسی کی زندہ مثال ہے۔ اگرچہ آپ کو خونی فتنہ کے انسداد کے لئے خونریز جنگ لڑنا پڑی مگر آپ نے اس وقت تک نہ خود ہاتھ اٹھایا اور نہ کسی کو اٹھانے دیا جب تک دوسرے فریق نے تیر باراں کر کے جنگ شروع نہ کر دی۔ حالانکہ ان لوگوں نے حضرت کے وارد بصرہ ہونے سے پہلے آپ کے سینکڑوں دوستوں اور ہمنواؤں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ والی بصرہ عثمان ابن حنیف پر شب خون مار کر عہد شکنی کی تھی۔ بیت المال اور بیت الرزق پر قبضہ کر لیا تھا اور قتل و غارت گری سے ہر طرف دہشت پھیلا دی تھی۔ ان چیزوں سے اگرچہ جنگ کا جواز پیدا ہو چکا تھا مگر آپ نے یہی کوشش کی کہ جنگ و قتال کی نوبت نہ آئے

اور افہام اور تفہیم سے معاملہ طے ہو جائے۔ چنانچہ طلحہ زبیر اور ام المومنین کو سمجھایا بجھایا اور انہیں جنگ کے ہولناک انجام سے ڈرایا اور مسلم مجاشعی کے ہاتھ قرآن بھیج کر انہیں قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی اور جب یہ تمام چیزیں بے اثر اور تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور آپ کی صلح جویانہ روش کو کمزوری پر محمول کیا جانے لگا اور پیغام صلح کا جواب تیر وسنان کی زبان میں دیا جانے لگا تو آپ نے مجبور ہو کر جنگ کی اجازت دی۔ اور جب جنگ چھڑ ہی گئی تو صفوں کے مقابلہ میں صفیں جما کر اس طرح لڑے کہ ان پر ثابت کر دیا کہ جنگ سے بچنے کی یہ تمام کوششیں کمزوری و بزدلی اور خوف و ہراس کی بنا پر نہ تھیں بلکہ اتحاد و یکجہتی کے برقرار رکھنے اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے تھیں۔

امیرالمومنین نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو جن چیزوں پر کاربند رہنے کا حکم دیا تھا کہ جنگ میں پہل نہ کریں کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کریں اور چند ایک چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔ سب نے ایک ایک بات پر عمل کیا۔ چنانچہ جب تک تیروں کی بوچھار سے لاشیں گری نہیں جنگ کے لئے قدم نہیں بڑھایا اور جب میدان میں خون برسنے لگا تو کسی زخمی پر ہاتھ نہیں ڈالا اور جب فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی تو کسی کا تعاقب نہیں کیا اور نہ اس کے چھوڑے مال واسباب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ دینوری نے تحریر کیا ہے:۔

جعلوا یمرون بالذھب و الفضۃ فی معسکرھم والمتاع فلا یعرض لہ احد الا ما کان من السلاح الذی قاتلوا بہ والدواب التی حاربوا علیھا۔	وہ میدانِ جنگ میں سونا چاندی اور دوسرا ساز وسامان دیکھتے مگر کوئی ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا سوائے فریق مخالف کے ان ہتھیاروں اور سواریوں کے جنہیں وہ لڑائی کے موقع پر کام میں لائے تھے۔

(اخبار الطوال۔ ص۱۵۱)

دنیا کی جنگوں کا دستور ہے کہ فاتح کامرانی و فتح یابی کے نشہ میں سرشار ہو کر حریف فوج کے افسروں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیتا ہے یا موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے مگر حضرت نے انتقامی جذبات سے بلند تر ہو کر اہلِ بصرہ میں سے جنہوں نے جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا کوئی باز پرس نہیں کی عبداللہ ابن زبیر، مروان ابن حکم، ولید ابن عقبہ، عبداللہ ابن عامر ایسے غارت گرانِ امن کو بیک جنبش قلم معاف کر دیا اور ام المومنین کو جنہوں نے آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ ان کے شایانِ شان حفاظتی انتظامات کے ساتھ مدینہ بھجوا دیا اور مسلمانوں سے جہاد اور کفار سے جہاد کے لطیف فرق کو اس طرح واضح

کیا کہ جو لوگ مال غنیمت میں عورتوں کو شامل کرنا چاہتے تھے انہیں بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی جواب نہ بن پڑا اور بصرہ کے بیت المال کو مرکز میں منتقل کرنے کے بجائے فوج و سپاہ پر تقسیم کر دیا۔ جس سے ایک طرف یہ تاثر دیا کہ جنگ کا مقصد مال کی جمع آوری اور دولت کی فراہمی نہیں ہے اور دوسری طرف سپاہ کو مالی لحاظ سے مطمئن کر کے پیش آئندہ جنگوں میں ان کے جوش و ولولہ کو نفسیاتی طور پر مضمحل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

ام المومنین جو عامۂ مسلمین کے نزدیک ایک عالمہ اور محدثہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سے بے خبر نہ تھیں کہ خون عثمان کے قصاص کا انہیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت وقت کا حق ہے یا اولیاء مقتول کا۔ اور حضرت عائشہ نہ مسلمانوں کے اقتدار کی مالک تھیں اور نہ حضرت عثمان کے وارثان بازگشت میں شامل تھیں۔ اس کے باوجود وہ قصاص کے نام پر حکومت وقت سے ٹکرانے کے لئے میدان میں اُتر آتی ہیں اور ایک عظیم جمعیت کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیتی ہیں۔ حالانکہ ازواج رسول اپنے گھروں میں ٹھہرے رہنے کی پابند تھیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن	اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھی رہو اور سابقہ زمانہ
تبرج الجاهلیة الاولیٰ۔	جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر نہ نکلو۔

اس حکم قرآنی کے پیش نظر ام المومنین زینب بنت جحش اور ام المومنین جناب سودہ نے مدینہ سے باہر نکلنا گوارا نہیں کیا اور زندگی بھر اس حکم کی سختی سے پابند رہیں یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے جناب سودہ سے کہا کہ آپ حج و عمرہ کے لئے مکہ کیوں نہیں جاتیں کہا کہ فریضۂ حج سے سبکدوش ہو چکی ہوں۔ اب تو مجھے اسی گھر میں رہنا ہوگا جس گھر میں مجھے رسول اللہ بٹھا گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبر کے بعد حجرہ سے قدم باہر نہیں نکالا اور یہ عورتوں کا منصب بھی نہیں ہے کہ وہ گھر کا گوشہ چھوڑ کر میدان حرب و ضرب میں پھاند پڑیں اور کشت و خون کا بازار گرم کریں۔ چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ:۔

استاذنت النبی فی الجهاد	میں نے پیغمبر اکرم سے جہاد کی اجازت چاہی تو
فقال جهادکن الحج۔	انہوں نے فرمایا کہ تم عورتوں کا جہاد فریضۂ حج کی
(صحیح بخاری۔ ج ۱ ص۱۱)	ادائیگی ہے۔

اور خود ام المومنین کا قول ہے:۔

المغزل بید المرأة احسن	عورت کے ہاتھ میں تکلا اس نیزے سے کہیں
من الرمح بید المجاهد فی	بہتر ہے جو راہ خدا میں لڑنے والے مجاہد کے ہاتھ

سبیل اللہ۔ (عقدالفرید۔ ج ۲ ص) میں ہوتا ہے۔"

مگر ان تمام چیزوں پر مطلع ہونے کے باوجود وہ ہزاروں کے مجمع کے ساتھ مکہ سے بصرہ میں آئیں اور لشکر کی قیادت کرتے ہوئے میدان میں اُتریں حالانکہ وہ دیکھ رہی تھیں کہ اس اقدام کے نتیجہ میں ہزاروں بچے یتیم رہ جائیں گے۔ ہزاروں عورتیں اپنا سہاگ کھو بیٹھیں گی اور مسلمانوں کا خون مسلمانوں کی تلواروں سے پانی کی طرح بہے گا مگر انہوں نے نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر یہ قدم اٹھایا اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی تلواروں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ بلاشبہ اس اتلاف جان کی زیادہ تر ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے اور ان کے دور میں بھی یہی تاثر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ام اوفی العبدیہ نے جن کے قبیلہ کے سینکڑوں آدمی امیرالمومنین کی حمایت میں مارے گئے تھے۔ حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے ام المومنین آپ اس عورت کے بارے میں کیا فرماتی ہیں جس نے اپنے ایک کمسن بچے کو مار ڈالا ہو کہا وہ دوزخ میں جائے گی۔ کہا پھر اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے اپنے بیس ہزار جوان سال بیٹے ایک ہی جگہ پر قتل کر دیئے ہوں۔ ام المومنین اس کے طنزیہ اشارہ پر بگڑ گئیں اور کہا:۔

خذوا بید عدوۃ اللہ۔ "اس خدا کی دشمن کو جانے نہ دینا۔"

(عقدالفرید۔ ج ۳ ص)

ابوعثمان جاحظ نے ایک لطیف پیرایہ میں یہ مطلب یوں ادا کیا ہے:۔

کانھا فی فعلھا ھرۃ تریدان تاکل اولادھا

"وہ اپنی اس کارگزاری میں اس گربۂ مسکین کے مانند تھیں جو اپنے بچوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہے۔"

بہرحال یہ اقدام کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہ تھا اور ان کے خاندان کے افراد تو اسے باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر ام المومنین نے اپنے بھتیجے ابن ابی عتیق سے کسی ضرورت کے لئے خچر طلب کیا اس نے ام المومنین کا پیغام سنا تو قاصد سے کہا کہ ام المومنین سے کہنا:۔

واللہ ما رحضنا عار یوم الجمل افتریدین ان تاتینا بیوم البغلۃ۔ (انساب الاشراف۔ ج ۱ ص ۴۲)

"خدا کی قسم ابھی تک تو ہم یوم جمل کا دھبا نہیں دھو سکے کیا اب یوم بغل (خچر) قائم کرنے کا ارادہ ہے۔"

ابن ابی عتیق نے تو طنزاً یہ بات کہی تھی مگر یوم جمل کے بعد یوم بغل بھی دنیا والوں نے دیکھ لیا۔ چنانچہ جب امام حسنؑ کی نعش مبارک کو حجرۂ رسول میں دفن کے ارادہ سے لایا گیا اور مروان ابن حکم اور ان

کے ہمراہی ہتھیار باندھ کر دفن سے مانع ہوئے تو اس موقع پر حضرت عائشہ بھی اس گروہ کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی نے تحریر کیا ہے:۔

قال ابوالفرج فامایحیی ابن الحسن صاحب کتاب النسب فانہ روی ان عائشۃ رکبت ذلک الیوم بغلا واستنفرت بنی امیۃ مروان ابن الحکم ومن کان ھناک منھم ومن حشمھم وھو قول القائل:۔	ابوالفرج کہتے ہیں کہ یحییٰ ابن حسن صاحب کتاب النسب روایت کرتے ہیں کہ اس دن حضرت عائشہ خچر پر سوار ہوئیں اور مروان ابن حکم اور بنی امیہ اور ان کے اہالی موالی کو جو وہاں موجود تھے ابھار رہی تھیں اور اسی کے متعلق کسی نے کہا ہے:"
"فیوما علی بغل ویوما علی جمل"	" گاہے اشتر پر سوار اور گاہے خچر پر سوار"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۴ ص ۲)

اس سلسلہ میں طلحہ و زبیر کا کردار بھی ام المومنین کے کردار سے کچھ کم نہیں ہے۔ انہوں نے قصاص عثمان کے نام پر بصرہ میں پہنچ کر قتل عام شروع کر دیا اور بے دیکھے بھالے کہ کون مجرم ہے سب کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ حالانکہ انہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اہل بصرہ کو قصاصاً قتل کریں۔ جب کہ اسے وارثان مقتول کا حق اور خلیفۂ وقت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے اور وہ نہ خلیفۂ وقت تھے اور نہ حضرت عثمان کے قرابت دار ہی تھے کہ انہیں بر بنائے قرابت حق قصاص پہنچتا۔ اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بیعت شکنی کو جائز اور اس جارحانہ اقدام کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے حضرت کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس سے بے خبر نہ تھے، کہ قتل عثمان کے سلسلہ میں ان کا طرز عمل کیا تھا اور حضرت کا موقف کیا تھا۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔

واللہ ان طلحۃ والزبیر وعائشہ لیعلمون انی علی الحق وانھم مبطلون۔ (استیعاب۔ ج ۲ ص ۲۱۴)	خدا کی قسم طلحہ زبیر اور عائشہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں اور وہ باطل پر ہیں۔"

اگر وہ واقعاً حضرت کو قتل عثمان میں شریک سمجھتے تھے تو بیعت سے پہلے یہ آواز اٹھاتے مگر نہ قتل عثمان کے موقع پر اور نہ اس سانحۂ قتل اور حضرت کی بیعت کے درمیانی عرصہ میں آپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور نہ آپ پر قتل یا اعانت قتل کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں:۔

ماعلمت ان علیًا اتھم فی دم عثمان حتی بویع فلما بویع اتھمہ الناس۔

(عقد الفرید - ج ۳ ص ۹۳)

مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے حضرت علی پر قتل عثمان کی تہمت لگائی ہو یہاں تک کہ اُن کی بیعت ہوئی اور جب بیعت ہو چکی تو لوگوں نے انہیں متہم کرنا شروع کردیا۔"

ان متہم کرنے والوں کے سرغنہ یہی دونوں طلحہ و زبیر تھے اور ان کی زبانیں بھی اس وقت کھلتی ہیں جب ان کے مفادات پر ضرب لگتی ہے اور امیرالمومنین انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت دینے سے انکار کر دیتے ہیں اگر اس قصاص طلبی میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ کارفرما تھا تو ان کی ہمدردیوں کو قتل کے موقع پر ظاہر ہونا چاہیئے تھا اور حضرت کی بیعت کے بجائے ان سے قصاص کا مطالبہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ اس وقت تک خاموش رہتے ہیں جب تک انہیں امارت کی توقع رہتی ہے اور جب ادھر سے مایوسی ہو جاتی ہے تو آپ پر خون کا الزام عائد کر کے قصاص کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ اس قصاص کی آڑ میں اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں۔ واقعات کی روشنی میں یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس شورش و ہنگامہ آرائی کا مقصد صرف حصول اقتدار تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیعت توڑ کر دوسروں کو بیعت شکنی پر اُبھارا اور حکیم ابن جبلہ سے دانشگاف لفظوں میں کہا گیا کہ جب تک عثمان ابن حنیف حضرت کی بیعت نہیں توڑیں گے انہیں رہا نہیں کیا جائے گا اور خود حضرت کے سامنے بھی اس کا اظہار کیا کہ وہ انہیں خلافت کا اہل نہیں سمجھتے۔ اور سعید ابن عاص کے دریافت کرنے پر صاف صاف کہہ دیا کہ ہم عثمان کے لڑکوں کو خلیفہ نہیں بنائیں گے بلکہ ہم دونوں میں سے جسے لوگ منتخب کریں گے وہی خلیفہ ہو گا۔ اسی اقتدار کی خاطر انہوں نے حضرت عثمان کے قتل کا سر و سامان کیا اور ان کے قتل کے بعد جب امیرالمومنین بر سر اقتدار آئے تو قصاص کی آڑ میں ام المومنین کی عملی تائید کے سہارے مقابلہ پر اُتر آئے۔

غرض ام المومنین ہوں یا طلحہ و زبیر ان کے اس اقدام کا نہ کوئی اخلاقی جواز ہے اور نہ شرعی۔ انکی شخصیتیں کتنی ہی اہم سہی مگر جرم بہر حال جرم ہوتا ہے خواہ وہ اس کا مرتکب کوئی ہو بلکہ شخصیت کی نمود جرم کو اور سنگین بنا دیا کرتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسا خونریز اقدام کیا جس سے نہ انکار کی کوئی گنجائش ہے۔ اور نہ کشت و خون کی ذمہ داری سے انہیں بری ثابت کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک طبقہ نے صحابیت کے تحفظ کے لئے مختلف حیلے بہانوں سے اس جرم کی سنگینی کو ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے جواز کے لئے خطائے اجتہادی کا سہارا ڈھونڈھ نکالا ہے۔ یہ خطائے اجتہادی کی کارفرمائی صرف اسی مورد کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام حربہ ہے کہ جہاں کوئی جواب بن نہیں پڑتا وہاں اس کی آڑ لے لی جاتی ہے اور

غلط سے غلط اقدام کے لئے جواز کا پہلو پیدا کر لیا جاتا ہے تاکہ وابستگانِ دامن کی عقیدتوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔ اسے لاکھ خطائے اجتہادی سے تعبیر کیا جائے۔ مگر اربابِ فکر و نظر کو یہ ذہنی خلش ضرور محسوس ہوگی کہ اگر یہ خطائے اجتہادی ہے تو خطائے منکر اور خطائے غیر اجتہادی کس چیز کا نام ہے۔ اگر اس عظیم کشت و خون کو خطائے اجتہادی کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے تو اس خطائے اجتہادی کے مرتکبین پر نقد و تبصرہ کیوں جائز نہیں ہے اور اگر ان کے خلاف رائے قائم کی جائے تو اسے خطائے اجتہادی پر محمول کر کے نظر انداز کرنے میں کیا مانع ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ اجتہاد کون سے شرعی اصول و قواعد کے ماتحت تھا اور کن دلائل سے ایک خون کے بدلے میں ہزار ہا بے گناہوں کا خون بہانا جائز ہو گیا تھا۔ کیا قرآن مجید کا کوئی حکم تھا یا پیغمبر اکرم کی کوئی حدیث تھی یا اہل حل و عقد کا اجماع تھا یا کسی مناط شرعی پر مبنی قیاس تھا اور یہی چاروں چیزیں مدعیان خطائے اجتہادی کے نزدیک اجتہاد کا ماخذ سمجھی جاتی ہیں اور جب ان میں سے کوئی چیز ثابت نہیں کی جاسکتی تو اجتہاد ہی کہاں رہا کہ اسے خطا پر محمول کر کے ان کے موقف کی صفائی پیش کی جاسکے۔

اس سلسلہ میں کچھ لوگوں نے یہ بات بنائی کہ امیر المومنین کے لشکر میں سے ان لوگوں کو جو قتلِ عثمان میں پیش پیش تھے فریقین میں صلح کے آثار نظر آئے تو انہوں نے صلح کو اپنے مقصد و مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے ابن سبا کی انگیخت پر منہ اندھیرے ام المومنین کے لشکر پر دھاوا بول دیا اور اصحاب جمل کا ردِ عمل دھار کر حضرت کے لشکر پر حملہ آور ہوئے اور ہر فریق اپنے مقام پر یہ سمجھا کہ دوسرے فریق نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور اس طرح فریقین میں غلط فہمی کی بنا پر جنگ چھڑ گئی لہذا جنگ میں پہل کرنے کی ذمہ داری فریقین میں سے کسی فریق پر عائد نہیں ہوتی اگر کسی پر عائد ہوتی ہے تو اس سازشی گروہ پر جس کا سرغنہ ابن سبا تھا اور جو دونوں فریق کو جنگ میں الجھا کر اپنا تحفظ اور مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ واقعہ ایک خود ساختہ افسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور روایت و درایت دونوں اعتبار سے مقدوح اور ناقابل اعتماد ہے۔ اس واقعہ کو پہلے پہل ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تاریخ میں درج کیا اور طبری سے قبل نہ کسی مورخ نے اسے بیان کیا اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ البتہ بعد کے مؤرخین نے طبری کے حوالہ سے اس روایت کو خوب خوب اچھالا ہے۔ اور ام المومنین اور طلحہ و زبیر کی تمام سرگرمیوں سے چشم پوشی کر کے اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری اسی مجہول شخصیت ابن سبا اور اس کے ساتھیوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ طبری نے اسے سیف ابن عمر تمیمی متوفی ۱۷۰ھ کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ اور سیف ابن عمر تمام علمائے رجال کے نزدیک مفتری و کذاب اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ چنانچہ ذہبی

نے میزان الاعتدال میں تحریر کیا ہے کہ یحییٰ کہتے ہیں فلس خیر منه (ایک کوڑی بھی اس سے بہتر ہے) ابوداؤد کہتے ہیں لیس بشیء (کوئی چیز ہی نہیں) ابوحاتم کہتے ہیں متروك (ناقابلِ روایت ہے) ابن حبان کہتے ہیں اتهم بالزندقه (بے دینی و الحاد سے متہم ہے) اور کسی ایک فرد نے بھی اس کی توثیق نہیں کی اور نہ اسے قابل روایت سمجھا ہے۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کی روایت پر جو بالاتفاق ساقط عن الاعتبار ہو اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس روایت میں اگر کچھ بھی واقعیت ہوتی تو طبری سے پہلے کا کوئی مورخ اس کا ذکر کرتا۔ بلاذری صاحب انساب الاشراف ابن سعد صاحب طبقات اور طبری کے معاصر ابن اعثم صاحب تاریخ اس کا تذکرہ کرتے اور سیف ابن عمر کے سلسلہ کے علاوہ کسی اور واسطہ سے بھی اسے نقل کیا جاتا۔ بلکہ واقعہ کی نوعیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کا عمومی چرچا ہوتا اور مختلف طبقوں میں عام طور پر اس کا ذکر آتا۔ مگر اس کا ذکر آتا ہے تو اس شخص کے سلسلۂ روایت میں جس کی کذب بیانی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ کیا ایسی روایت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لینا حقائق سے عمداً چشم پوشی کے مترادف نہیں ہے؟

اب اس روایت کو درایۃً دیکھئے اور پرکھئے کہ کہاں تک صحیح تسلیم کئے جانے کے قابل ہے۔ جس شخص کے بھی سامنے واقعات جمل کے اسباب و علل اور اصحاب جمل کے عزائم و مقاصد ہیں وہ اس سے انکار نہ کر سکے گا کہ یہ روایت واقعات میں ایک غیر متعلقہ اضافہ اور حقائق کے دامن میں ایک بے جوڑ پیوند ہے۔ جس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اس جنگ کو غلط فہمی کا نتیجہ قرار دے کر اصحاب جمل کو معذور اور حق بجانب ثابت کیا جائے۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا گیا کہ یہ جنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی مگر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ باقاعدہ جنگ کے چھڑنے سے پہلے حضرت علی اور فریق ثانی کے نمائندوں میں گفت و شنید اور افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا اور حضرت نے طلحہ و زبیر سے رُو در رُو گفتگو کی اور انہیں جنگی عزائم سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ کیا وہ اس موقع پر یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو صلح پر آمادہ تھے آپ ہی کے لشکر نے ہم پر اچانک حملہ کیا اور جنگ چھیڑ دی مگر وہ اس کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کرتے حالانکہ اس موقع پر زبان بند رکھنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ یا جنگ سے پہلے جب حضرت نے مسلم مجاشعی کو قرآن دے کر بھیجا تھا کہ وہ انہیں قرآن کے تعلیمات یاد دلائیں تو انہیں یہ کہنا چاہئے تھا کہ اب علی نے قرآن کو بیچ میں لا کر معاملہ کو نمٹانا چاہا ہے اور مصالحت کی پیش کش کی ہے حالانکہ انہی کے لشکر نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شبخون مارا ہے اور جنگ و قتال کا آغاز کیا ہے۔ مگر اس موقع پر بھی ان کی زبان سے اس قسم کی کوئی بات نہیں نکلتی۔ اسی طرح ام المومنین اس کی طرف کبھی تو اشارہ کرتیں کہ ایسا غلط

فہمی کی بنار پر ہوا ہے۔ حالانکہ جنگ کے بعد جب ان سے اس اقدام کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ خاموشی کے بجائے اس چیز کو اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کر کے پوچھنے والوں کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی تھیں۔ اور پھر اس مفروضہ شبخون سے پہلے جو کشت و خون کیا گیا تھا اور سینکڑوں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا وہ کس غلط فہمی کی بنار پر اور کس کی انگیخت پر ہوا تھا تو جو لوگ یوں بے گناہوں کو قتل و غارت کر سکتے ہیں۔ انہیں جنگ لڑنے میں کیا باک تھا کہ یہ کہا جائے کہ فریقین غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

اس سلسلہ میں جس مجہول شخصیت ابن سبا کو شبخون کا محرک قرار دیا جاتا ہے وہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جورج جرداق اور دوسرے محققین کے نزدیک کوئی تاریخی وجود ہی نہیں رکھتا اور نہ جس شخصیت کا نام قتل عثمان اور جنگ جمل میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس کا نام صفین تحکیم اور جنگ نہروان کے موقع پر بھی سنائی دیتا اور ان موقعوں پر اس کا کوئی کارنامہ نہ بھی ہوتا جب بھی اس کا نام تو کہیں نہ کہیں آتا۔ مگر جنگ جمل کے بعد وہ صفحات تاریخ سے اس طرح ناپید ہو جاتا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ شبخون مارنے کے بعد کہاں غائب ہوا اور کہاں مر کھپ گیا حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانوی شخصیت ہنگامہ آراؤں کی خونچکاں حرکتوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے وقتی طور پر گھڑی گئی اور جب اس کی ضرورت نہ رہی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

جنگ جمل وسط جمادی الثانیہ ۳۶ھ (دسمبر ۶۵۶ء) میں واقع ہوئی۔ مقتولین کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ام المومنین کے تیس ہزار کے لشکر میں سے پانچ ہزار یا ایک ہزار ستر شہید ہوئے اور یہ معارکہ ایک گروہ کی شکست اور دوسرے گروہ کی فتح پر ختم ہو گیا۔ اگرچہ یہ جنگ ایک وقتی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے دلوں میں گرہ پڑ گئی۔ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور مسلمانوں میں پیہم خونریزیوں کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ جنگ جمل کے بعد شام سے جنگ کے شعلے بھڑکے اور مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے سروں پر بے دریغ چلیں۔ اگر ام المومنین اور طلحہ و زبیر میدان جنگ میں نہ اترتے تو معاویہ کو حضرت علی کے مقابلہ میں کبھی فوج کشی کی جرأت نہ ہوتی۔ مگر ان لوگوں کے صف آرا ہونے سے نہ صرف ان کی ہمت بندھی بلکہ انہیں اتنا موقع مل گیا کہ وہ جنگ کے لئے لشکر کی فراہمی اور سامان حرب و ضرب کی تکمیل کر سکیں اور حضرت سے برسر پیکار ہونے کا جواز تو انہیں جنگ جمل سے مل ہی چکا تھا اس طرح کہ اگر ام المومنین قبیلۂ بنی تیم سے ہوتے ہوئے انتقام خون عثمان کے لئے کھڑی ہو سکتی ہیں تو وہ کیوں کھڑے نہیں ہو سکتے جب کہ وہ حضرت عثمان کے ہم قبیلہ اور عزیز بھی تھے۔ یہ ایک ایسا مضبوط سیاسی حیلہ تھا جسے معاویہ نے جنگ کے جواز میں پیش کیا اور طلحہ و زبیر ایسی اہم شخصیتوں

کے اقدام سے اپنے باغیانہ اقدام کے حق بجانب ہونے پر ثبوت مہیا کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے قصاص عثمان ہی کے نام پر لوگوں کو بھڑکا کر جنگ صفین برپا کی اور پہلے اپنے علاقائی اقتدار کا تحفظ کیا اور پھر خلافت پر قابض ہو کر خلیفۃ المسلمین بن گئے۔ پھر اس جنگ صفین کے نتیجہ میں خوارج کی جماعت ابھری۔ جس نے امیرالمومنین سے جنگ لڑنے کے بعد مدتوں تک اسلامی شہروں میں کشت و خون اور تاخت و تاراج کا بازار گرم رکھا اور ایسے ایسے خونی کھیل کھیلے کہ ریگستان عرب کے ذرات تک خون میں ڈوب گئے۔ غرض جنگ جمل سے جنگ صفین نے اور جنگ صفین سے جنگ نہروان نے جنم لیا اور ان جنگوں کے نتیجہ میں اسلام میں ایسے رخنے پڑے جو آج تک پُر نہ ہو سکے اور نہ آئندہ ان کے پُر ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

پایۂ تخت کی تبدیلی

عہد ثانی میں جب حدود ایران پر فوج کشی کے نتیجہ میں ایرانی علاقے اسلامی مقبوضات میں داخل ہوئے تو مسلمانوں نے اپنی بود و باش کے لئے عراق میں دو نئے شہروں کی بنیاد ڈالی ایک بصرہ اور دوسرا کوفہ۔ بصرہ سمندر کے ساحل پر واقع ہے اور یہ نام بس راہ کی معرب صورت ہے جو راستوں کی کثرت کی بنا پر تجویز ہوا یا اس لئے کہ بصرہ کے معنی نرم و سفید پتھر کے ہیں اور یہاں اس قسم کے پتھروں کی بہتات تھی۔ اور کوفہ حیرہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے جہاں ۱۷ھ میں سعد ابن ابی وقاص نے مدائن سے نقل مکانی کر کے گھاس پھونس اور سینٹھوں کے چھپر ڈال کر ایک لاکھ آدمی آباد کئے تھے اس عظیم اجتماع کی بنا پر اس کا نام کوفہ یا کوفان قرار پایا۔ کیونکہ کوفہ تکوف سے ماخوذ ہے جس کے معنی اجتماع کے ہیں یا اس وجہ سے کہ وہاں کی زمین ریتلی تھی جس میں سنگریزے بکھرے پڑے تھے۔ اور کوفہ یا کوفان اس سرزمین کو کہتے ہیں۔ جس میں ریت مٹی کے علاوہ پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں۔ کوفہ دریائے فرات کے قرب معتدل آب و ہوا باغات و نخلستان اور شادابی و زرعی پیداوار کی وجہ سے ریگستان حجاز کے باشندوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ انہوں نے آتش زدگی کے ایک حادثہ کے بعد اینٹ پتھر کے پختہ مکانات تعمیر کر کے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور جب امیرالمومنین کے دور خلافت میں اسلامی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور علماء و رجال اسلام کے جمع ہو جانے سے علمی دینی اور سیاسی اعتبار سے عالم اسلام کا مرکز بن گیا۔

جنگ جمل میں اہل بصرہ نے اصحاب جمل کا اور اہل کوفہ نے حضرت کا ساتھ دیا تھا۔ آپ نے خاتمۂ

جنگ پر عبداللہ ابن عباس کو بصرہ کا حاکم اور زیاد کو خراج و بیت المال کا ناظم مقرر کر کے اہل کوفہ کی دلجوئی کے لئے کوفہ کا قصد فرمایا۔ جب بصرہ کے حدود سے نکل کر مربد میں جہاں حضرت عائشہ کے لشکر نے وارد بصرہ ہونے کے بعد پڑاؤ ڈالا تھا آئے تو بصرہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:۔

الحمد لله الذی اخرجنی من شر البقاع و اسرعها خرابا و اقربها من الماء و ابعدها من السماء (اخبار الطوال ص۱۵۲)	تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے اس بدترین کرۂ زمین سے باہر کیا جو تیزی سے تباہی کی طرف بڑھنے والا (سمندر کے) پانی سے قریب اور آسمان (کی برکتوں) سے دور ہے۔

جب ۱۲ رجب ۳۶ھ کو کوفہ کے حدود میں داخل ہوئے تو وہاں کے اعیان و اشراف جنہیں فتح و کامیابی کی اطلاع پہنچ چکی تھی استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے اور حضرت کے ہمرکاب شہر میں داخل ہوئے اور عرض کیا کہ آپ دارالامارہ میں قیام فرمائیں مگر حضرت نے دارالامارہ میں قیام پسند نہ کیا اور سیدھے مسجد میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد خطبہ دیا اور اہل کوفہ کی ہمدردی و تعاون پر تحسین آمیز کلمات کہے پھر محلہ رحبہ میں تشریف لائے اور ایک متوسط درجہ کے مکان میں قیام فرما ہوئے اور وقتی طور پر مدینہ کے بجائے کوفہ کو دارالحکومت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

یہ تبدیلی حسب ذیل وجوہ کی بنا پر عمل میں لائی گئی:۔

(۱) کوفہ اسلامی مملکت کے وسط میں واقع تھا جہاں سے چاروں طرف کے علاقوں کی نگرانی ہو سکتی تھی فارس کی سرحد قریب تھی، بری و بحری سفر کی سہولتیں حاصل تھیں۔ رسل و رسائل اور آمد و رفت میں ہر طرح سے آسانی تھی مختلف شہروں کے باشندوں کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے مختلف مقامات کے حالات بآسانی معلوم ہو سکتے تھے اور مرکزی حکومت کے احکام بسہولت دوسری جگہوں پر پہنچائے اور دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں دفاعی اقدامات عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ جب شامی فوجوں نے آپ کے مقبوضہ علاقوں پر یلغار شروع کی تو جتنا کوفہ سے اس کا تدارک ہوتا رہا۔ مدینہ میں رہتے ہوئے اس سے بہتر طریق پر ممکن نہ تھا۔

(۲) امیرالمومنین کو مسند خلافت پر بیٹھے اگرچہ سات ماہ ہو چکے تھے مگر معاویہ نے ابھی تک نہ آپ کی خلافت کو تسلیم کیا تھا اور نہ بیعت پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس صورت میں ان کی ریشہ دوانیوں اور رخنہ اندازیوں سے مطمئن نہ رہا جا سکتا تھا بلکہ یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے منصب کی بحالی کے لئے جنگی اقدامات اور کشت و خون سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایک ایسی جگہ کا انتخاب ضروری تھا جہاں

سے فوجی نقل وحرکت میں آسانی ہو اور بروقت مدافعانہ قدم اٹھایا جاسکے۔ اس اعتبار سے کوفہ موزوں تر مقام تھا کیونکہ کوفہ معاویہ کے پایۂ تخت دمشق سے قریب تھا اور فوجوں کی نقل وحرکت میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اس کے برعکس مدینہ دمشق سے کافی فاصلہ پر واقع تھا۔ جہاں سے نہ فوجوں کی نقل وحرکت آسان تھی اور نہ بروقت رسد اور فوجی امداد مہیا ہو سکتی تھی۔

(۳) جنگ جمل سے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ جتنی عسکری امداد کوفہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اتنی کمک کی توقع مدینہ سے نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ والئ کوفہ ابو موسیٰ کی انتہائی مخالفت کے باوجود کوفہ کی بڑی اکثریت نے حضرت کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اور آپ کے پیغام پر بارہ ہزار شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مدینہ سے بمشکل ایک ہزار افراد نے جنگ میں حصہ لیا ہو گا۔ اس صورت میں دُور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ کوفہ کو مستقر قرار دیا جائے تاکہ بروقت اہل کوفہ سے دشمن کے مقابلہ میں مدد حاصل کی جا سکے۔

(۴) کوفہ ایک چھاؤنی اور فوجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جہاں جنگجو لوگ آباد کئے گئے تھے۔ اور ان کی اولاد بھی طبعاً جنگ و قتال کی طرف مائل اور فوجی خو بو رکھتی تھی۔ اور مدینہ کے اکثر لوگ دولت کی فراوانی کے نتیجہ میں آرام طلب و عافیت کوش ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب حضرت نے کوفہ کو دارالسلطنت قرار دیا تو اس کے خلاف اہل مدینہ نے کوئی آواز بلند نہیں کی بلکہ اس پر احتجاج کرنے کے بجائے ایک گونہ سکون محسوس کیا کہ اب وُہ گھر کا پُر امن ماحول چھوڑ کر میدانِ جنگ کی کڑیاں جھیلنے کے لئے مجبور نہیں کئے جائیں گے۔ ان حالات میں جب کہ جنگ کے امکانات قریب سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر کے جو حرب وضرب کے عادی اور معرکہ آرائی کے خوگر ہوں عافیت پسند لوگوں پر سہارا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

(۵) امیرالمومنین دیکھ چکے تھے کہ پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد گنے چنے افراد کے علاوہ اہل مدینہ نے آپ کے حق کی فوقیت کا اعتراف تو درکنار ایک طرح سے بیگانگی و سرد مہری کا برتاؤ کیا تھا اور پچیس سال کے طویل عرصہ کے بعد جب حالات سدھرتے نظر نہ آئے تو آپ کو خلافت کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور بیعت کرلی مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان میں کا ایک گروہ بیعت توڑ کر جنگ و قتال پر اُتر آیا اور جو لوگ بیعت پر قائم رہتے ہوئے اس گروہ میں شامل نہ ہوئے انہوں نے بھی بے حسی اور جذبات کی کمزوری ہی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ قریش تعاون میں سرگرم عمل نظر نہیں آتے بنی امیہ کے اکثر افراد معاویہ کے پاس شام چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بنی تیم طلحہ کو برسر اقتدار لانے کے خواہش مند تھے بنی عدی عبداللہ ابن عمر کے ہوا خواہ تھے جس نے حضرت کی بیعت سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اسی طرح مختلف اشخاص مختلف وجوہ

کی بنا پر تعاون سے گریز کرتے رہے۔ اس ماحول میں کیونکر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ آڑے وقت پر کام آئیں گے اور معاویہ سے جنگ چھڑنے کی صورت میں تعاون کریں گے۔

(۶) مدینہ اپنی حرمت و تقدیس کی وجہ سے اس حد تک خطرات میں گھرا ہوا نہ تھا جس حد تک عراق خطرات سے دوچار تھا۔ معاویہ کی نظریں عراق پر جمی ہوئی تھیں اور وُہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر میں تھے لہٰذا اس وقت تک عراق میں ٹھہرنا اور اسے مرکز قرار دے کر وہاں قیام کرنا ضروری تھا۔ جب تک پیش آمدہ خطرات ٹل نہ جاتے اور مملکت کی فضا پُرسکون نہ ہو جاتی۔ مگر نہ وہ خطرات ٹل سکے اور نہ شامیوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ ختم ہوا۔ ہر روز نت نئے فتنے اٹھتے رہے اور ان فتنوں کو فرو کرنے کے لئے آپ کو زندگی کے بقیہ ایام کوفہ ہی میں گزارنے پڑے۔

عمال مملکت کا تقرر

جب امیرالمومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں فروکش ہوئے تو ملکی انضباط کے لئے عمال کے تقرر کی ضرورت محسوس کی اگرچہ جنگ جمل سے پہلے چند ایک علاقوں پر عمال مقرر کئے جا چکے تھے مگر بیشتر مقامات پر جنگی مصروفیات کی بنا پر عمال کے متعین کئے جانے کی نوبت نہ آئی تھی چنانچہ حضرت نے اپنی قلمرو مملکت میں جس میں حجاز، مصر، عراق، یمن، ایران، آذربائیجان وغیرہ شامل تھے اپنی صوابدید سے ولاۃ و حکام متعین فرمائے اور ان میں پیش آئند حالات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ردوبدل ہوتا رہا اور ایسا ہونا رعایا و مملکت کے حالات پر نظر رکھنے کا نتیجہ ہے۔ ان عمال میں سے چند نمایاں شخصیات کے مختصر سوانح حیات درج کئے جاتے ہیں ان سوانح کے ذیل میں ان جگہوں کا بھی تذکرہ ہو جائے گا جہاں جہاں وہ مقرر کئے گئے۔

قیس ابن سعد:۔ پیغمبر اکرم کے بلند مرتبہ صحابی اور رئیس خزرج سعد ابن عبادہ کے فرزند تھے۔ علم و عمل کی بلندیوں پر فائز ہونے کے ساتھ قدآور، وجیہہ صورت، چوڑے چکلے اور بڑے کلے جبڑے کے آدمی تھے سخاوت و شجاعت اور خطابت ان کا خاص جوہر تھا اور دور اندیشی و معاملہ فہمی میں یکتائے روزگار تھے۔ اس دور میں پانچ آدمی سیاسی جوڑ توڑ میں ماہر اور چالاکی و ہوشیاری میں طاق سمجھے جاتے تھے۔ معاویہ ابن ابوسفیان، عمرو ابن عاص، مغیرہ ابن شعبہ، عبداللہ ابن بدیل اور قیس ابن سعد ان میں سے عبداللہ ابن بدیل اور قیس ابن سعد امیرالمومنین کے طرفدار تھے۔ قیس اگرچہ سیاسی حربوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتے تھے مگر دینی تقاضوں کو نظرانداز کر کے مکروفریب کی سیاست اختیار نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول ہے:۔

لولا الاسلام لمکرات مکرا لا تطیقه العرب۔ (اصابہ ج ۲، ص ۲۳۹) — اگر اسلام مانع نہ ہوتا تو میں ایسی چال چلتا جس کا توڑ عرب کے بس کی بات نہ ہوتا۔

دس برس تک پیغمبر اکرم کی خدمت میں رہے۔ انہی سے اسلام کے حقائق و معارف سیکھے۔ عہد نبویؐ کے تمام غزوات میں شریک ہو کر کارنمایاں انجام دیئے۔ بعض غزوات میں حامل لوائے پیغمبر رہے اور صدقات کی وصولی پر بھی مامور کئے گئے۔ جود و سخا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جیش عسرہ میں قرض کا بار اٹھا کر اور اپنی سواری کے اونٹوں کو ذبح کر کے لشکر کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہے۔ جب لشکر نے پلٹ کر پیغمبر اکرم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:۔

الجود من شیمة اهل ذالك البیت۔ (اصابہ، ج ۳، ص ۲۳۹) — سخاوت اس خانوادے کی عادت ہے۔

ابن کثیر نے البدایة والنہایة میں تحریر کیا ہے کہ ہیثم ابن عدی نے بیان کیا کہ خانہ کعبہ کے پاس تین آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے اُلجھ پڑے۔ ان میں سے ایک کہتا تھا کہ سب سے بڑھ کر سخی عبداللہ ابن جعفر ہیں۔ دوسرا کہتا تھا کہ قیس ابن سعد ہیں اور تیسرا کہتا تھا کہ عرابة الاوسی ہیں۔ جب اس اختلاف نے نزاعی صورت اختیار کر لی تو ایک شخص نے کہا کہ تم لوگ کیوں جھگڑتے ہو ابھی اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ تم میں سے جو جس کی برتری کا قائل ہے اس کے پاس جائے اور سائل کا روپ دھار کر اس سے سوال کرے پھر خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ سخاوت میں کس کا پایہ بلند تر ہے۔ یہ رائے پسند کی گئی اور ان میں سے ایک عبداللہ ابن جعفر کے ہاں گیا دیکھا کہ وہ سوار ہو کر اپنی جاگیر کی طرف جانے والے ہیں اور رکاب میں پیر رکھ چکے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا اے ابن عم رسول میں مسافر ہوں میرے پاس زاد ہے نہ سواری۔ یہ سننا تھا، کہ عبداللہ نے رکاب سے پیر نکالا اور نیچے اتر آئے اور کہا کہ تم اس پر سوار ہو جاؤ اور جو مال اس پر بار ہے وہ تمہارا ہے اور دیکھنا اس سامان میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کی تلواروں میں سے ایک تلوار بھی ہے اسے حفاظت سے رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ضائع ہو جائے۔ جب اس نے سامان کا جائزہ لیا تو اس میں چار ہزار دینار ریشمی چادریں اور متفرق اشیاء تھیں۔

دوسرا آدمی قیس ابن سعد کے مکان پر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں۔ گھر میں سے ایک کنیز نے پوچھ لیا کہ تم کس غرض سے آئے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو کہا میں ایک بے سروسامان مسافر ہوں اور اُن سے کچھ مدد کا طالب ہوں۔ کنیز نے کہا کہ اس معمولی سے کام کے لئے انہیں جگایا نہیں جا سکتا۔ گھر میں سات سو دینار موجود ہیں وہ لے لو اور ان کے اصطبل میں چلے جاؤ اور وہاں سے ایک اونٹنی اور

ایک غلام بھی لیتے جاؤ۔ قیس جب سو کر اُٹھے تو کنیز نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ سائل آپ کے در سے خالی ہاتھ جائے۔ قیس نے کہا کہ تم نے مجھے جگا کیوں نہ دیا۔ شاید تم نے جو اسے دیا ہے وہ اس کی ضرورت و احتیاج سے کم ہو پھر اس کنیز کی فراخ حوصلگی سے متاثر ہو کر اسے آزاد کر دیا۔

تیسرا آدمی عرابہ کے ہاں گیا۔ دیکھا کہ وہ دو غلاموں کا سہارا لے کر نماز کے لئے جا رہے ہیں اس وقت ان کی بصارت جاتی رہی تھی اور سہارے کے بغیر کہیں آ جا نہ سکتے تھے۔ اس نے قریب پہنچ کر کہا اے عرابہ میں مسافر اور بے زاد ہوں میری مدد کیجیئے۔ یہ سننا تھا کہ عرابہ نے دونوں غلاموں کے کندھوں پر سے ہاتھ اٹھایا اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا افسوس ادائے حقوق نے عرابہ کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ تم یہ دونوں غلام لے لو۔ اس نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا سہارا چھین لوں اور تمہیں ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دوں۔ عرابہ نے کہا کہ اگر تم نہیں لوگے تو میں انہیں آزاد کر دوں گا۔ اب لے لو یا انہیں آزاد کر دو۔ اس نے وہ دونوں غلام لے لئے اور عرابہ دیوار کا سہارا لے کر مسجد کی طرف چل دیئے۔

جب یہ تینوں پلٹ کر آئے اور لوگوں نے ان کی روداد سنی تو کہا کہ اگرچہ عبداللہ ابن جعفر نے سب سے زیادہ دیا ہے مگر ان کی شخصیت اور مالی حیثیت کو دیکھتے ہوئے کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ حضرت علی کی تلوار کو اپنے سے الگ کر دینا قابل ذکر ضرور ہے۔ کچھ لوگوں نے قیس کو زیادہ سراہا کہ ان کی کنیز نے ان سے پوچھے بغیر جتنی رقم گھر میں موجود تھی سب دے دی۔ اور انہوں نے کنیز کے رویہ سے خوش ہو کر اُسے آزاد کر دیا۔ آخر میں عرابہ پر سب نے اتفاق کیا کہ عرب میں وہ سب سے زیادہ سخی ہے۔ انہوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا سب دے دیا اور معذور و نابینا ہونے کے باوجود غلاموں کا سہارا باقی رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

ایک مرتبہ قیس بیمار پڑے تو مزاج پرسی کے لئے بہت کم لوگ آئے وجہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا، کہ چونکہ اکثر لوگ آپ کے مقروض ہیں۔ اس لئے وہ آتے ہوئے جھجکتے ہیں کہا خدا اس مال کو رُسوا کرے۔ جو دوستوں کے آنے سے مانع ہو۔ پھر حکم دیا کہ مدینہ میں اعلان کر دیا جائے کہ جس جس کے ذمہ ہمارا قرضہ ہے وہ ہبہ کر دیا گیا ہے اور دستاویزیں چاک کر دی گئی ہیں۔ اس اعلان کے ہوتے ہی لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور اس کثرت سے لوگ آئے کہ دروازہ کی چوکھٹ ٹوٹ گئی۔

ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ کثیر ابن صلت نے قیس سے تیس ہزار درہم کسی ضرورت کے لئے قرض لئے۔ جب وہ قرضہ واپس کرنے کے لئے آیا تو قیس نے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہیں اشتباہ ہوا ہے یہ رقم قرضہ نہ تھی بلکہ عطیہ ہے۔

جب امیرالمومنین برسرِ اقتدار آئے تو ماہ صفر ۳۶ھ میں قیس کو ان کی خاندانی وجاہت ذاتی جوہر اور سیاسی سُوجھ بُوجھ کی بنا پر مصر کی امارت کے لئے منتخب کیا اور انہیں بلا کر کہا کہ تم ایک فوج ترتیب دے کر اپنے ساتھ لے جاؤ وہاں کی رعایا سے حسن سلوک سے پیش آنا لوگوں سے نرم رویہ رکھنا اس لئے کہ نرمی و میانہ روی یمن و برکت کا باعث ہوتی ہے۔ البتہ جہاں نرمی سے کام بنتا نظر نہ آئے وہاں سختی برتنا بے جا نہ ہوگا۔ قیس نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے فوج و سپاہ کی احتیاج نہیں ہے فوج کا مرکز میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ مجھے صرف چند آدمی ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے سات آدمی منتخب کرکے اپنے ہمراہ لے لئے اور مصر کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب مصر میں وارد ہوئے تو تقرری کے سلسلہ میں امیرالمومنین کا فرمان پڑھ کر سنایا اور منبر پر خطبہ دیتے ہوئے کہا:۔

الحمد للّٰہ الذی جاء بالحق	تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے حق کو
و امات الباطل وکبت الظالمین	ظاہر کیا باطل کو کچلا اور ظالموں کو ذلیل و رسوا کیا
ایھا الناس انا قد بایعنا خیر	اے لوگو ہم نے اس ہستی کی بیعت کی ہے۔ جو
من نعلم بعد نبینا فقوموا	ہمارے نبی کے بعد ان تمام لوگوں سے بہتر ہے
ایھا الناس فبایعوہ علی کتاب	جنہیں ہم جانتے ہیں۔ اے لوگو اٹھو اور کتاب و
اللّٰہ و سنۃ رسولہ فان نحن	سنت کی شرط پر اس کی بیعت کرو اگر ہم تمہارے
لم نعمل لکم بذلک فلا بیعۃ	معاملات میں کتاب و سنت پر عمل نہ کریں تو پھر
لنا علیکم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۵۱)	تم پر اس بیعت کی کوئی پابندی نہ ہوگی۔"

پھر لوگوں سے بیعت لی اور اس بیعت میں کسی نے پس و پیش نہیں کیا سوا قبیلۂ خربتا کے باشندوں کے جو دس ہزار کی تعداد میں تھے اور سب کے سب عثمانی تھے انہوں نے بیعت سے انکار کیا اور یزید ابن حارث کنانی کے ذریعہ قیس کو پیغام بھجوایا کہ ہم کسی معاملہ میں آپ سے تعرض نہیں کریں گے یہ سرزمین آپ کی سرزمین ہے ہم باقاعدہ خراج ادا کرتے رہیں گے مگر جب تک حالات یکسو نہیں ہو جاتے ہم سے بیعت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ قیس نے انہیں کہلوا بھیجا کہ میں تمہیں بیعت پر مجبور نہیں کرتا البتہ تمہیں شور و شر اور فتنہ انگیزی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اہل خربتا نے پُرامن رہنے کا یقین دلایا اور قیس نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا مگر مسلمہ ابن مخلد جو قیس ہی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اس نے لوگوں کو خون عثمان کے انتقام پر اُبھار کر فتنہ و شر پھیلانا چاہا۔ قیس نے اسے پیغام بھجوایا کہ تم نے میرے خلاف محاذ قائم کرکے ہنگامہ آرائی کی کوشش کی ہے میں اس فتنہ کو ختم کر سکتا ہوں لیکن مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میں تمہارا خون بہاؤں خواہ مجھے

مصر سے شام تک کی حکومت دے دی جائے۔ اس نے قیس کے اس نرم رویہ سے متاثر ہو کر انہیں کہلو بھیجا کہ جب تک آپ والئ مصر ہیں میں حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ قیس کی اس سیاست و حکمت عملی سے ابھرتا ہوا فتنہ دب گیا۔ اور جتنا عرصہ مصر کی زمام حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی حالات پرسکون رہے مگر اموی سیاست نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ یکم ربیع الاول ۳۶ھ سے ۵ رجب ۳۶ھ تک چار ماہ پانچ دن امارت مصر پر فائز رہنے کے بعد انہیں امارت سے الگ ہونا پڑا۔ اس برطرفی کے وجوہ و اسباب کا تذکرہ بعد کے صفحات پر ہوگا۔

قیس نے اس مختصر سے دور میں ایک قصر مصر میں تعمیر کروایا۔ جب برطرفی کے بعد پلٹ کر واپس آئے تو کچھ لوگوں کو کہتے سنا کہ قیس کا ایک مکان مصر میں ہے پوچھا کہ کیسا مکان اور کس کا مکان لوگوں نے کہا کہ وہی جو آپ نے مصر میں تعمیر کیا ہے۔ کہا کہ میں نے وہ مکان مسلمانوں سے مدد لے کر تعمیر کیا تھا وہ مسلمانوں ہی کی ملکیت ہے اور جو بھی مصر کا حاکم ہوگا وہ اسی میں ٹھہرا کرے گا۔

۵۹ھ یا ۶۰ھ میں جب کہ حکومت معاویہ کا دورِ آخر تھا مدینہ میں وفات پائی۔

سہل ابن حنیف انصاری :۔ انصار کے قبیلہ اوس کی ایک ممتاز فرد والئ بصرہ عثمان ابن حنیف کے بھائی پیغمبر اکرم کی صحبت سے شرف یاب اور امیرالمومنین کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے اور احد میں جب کہ اکثر لوگوں کے قدم اکھڑ گئے تھے ان کے ثبات قدم میں لغزش نہیں آئی نہ پتھروں کی آڑ ڈھونڈی اور نہ راہِ فرار اختیار کی بلکہ پیغمبر کے ہاتھ پر موت کا عہد و پیمان باندھ کر لڑے۔

ابن ہشام نے تحریر کیا ہے کہ ہجرت کے بعد جب حضرت علی قبا میں آکر ٹھہرے تو آپ نے نصف شب کے بعد ایک شخص کو دیکھا جو ایک مسلمان عورت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور جب وہ باہر نکلتی ہے تو چپکے سے ایک چیز اس کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ اُسے لے کر اندر چلی جاتی ہے۔ حضرت کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کیونکہ وہ اکیلی اور بے شوہر کے تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ آدھی رات کے بعد کون ہے جو تمہارے گھر آتا ہے کہا وہ سہل ابن حنیف ہیں انہیں یہ معلوم ہے کہ میں ایک بے سہارا عورت ہوں جس کا کوئی کفیل و پرسان حال نہیں ہے۔ جب رات اندھیری ہوتی ہے تو وہ ادرگرد کے بُت خانوں پر چھاپا مارتے ہیں اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر مجھے دے جاتے ہیں تاکہ میں انہیں ایندھن کے طور پر کام میں لاؤں۔ امیرالمومنین سہل کے اس عمل سے بہت خوش ہوئے اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے جذبۂ ہمدردی و غمخواری کی تعریف کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

جب امیرالمومنین اصحاب جمل کی یورش کو دبانے کے لئے بصرہ روانہ ہوئے تو انہیں اپنی قائم مقامی میں مدینہ کا حاکم مقرر کیا اور جنگ سے فارغ ہو کر جب سپاہ شام کے مقابلہ کے لئے صفین کی طرف راہ پیما ہوئے تو انہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ صفین سے واپسی پر فارس کا عامل مقرر کیا۔ اہل فارس معاویہ کی بغاوت سے متاثر ہو کر سرکشی و خودسری پر اتر آئے اور خراج سے بچنے کے لئے سہل کو فارس سے باہر نکال دیا۔ حضرت نے جاریہ ابن قدامہ کے مشورہ سے زیاد ابن عبید کو وہاں بھیجا جس نے چالاکی و ہوشیاری سے کام لے کر انہیں آپس میں لڑوا دیا اور اس طرح ان کی طاقت کو کمزور کر کے اُن پر قابو پا لیا۔

۳۸ھ میں سہل نے کوفہ میں انتقال کیا۔ امیرالمومنین نے اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا اور نماز جنازہ پڑھائی۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

اخبرنا ابو جناب الکلبی قال سمعت عمیر ابن سعید صلی علی علیہ السلام سھل ابن حنیف فکبر علیہ خمساً۔ (طبقات۔ ج ۳ ص ۴۷۳)	ابو جناب کلبی کہتے ہیں کہ میں نے عمیر ابن سعید سے سنا کہ حضرت علی نے سہل ابن حنیف کی نماز جنازہ پڑھائی اور پانچ تکبیریں کہیں۔"

حضرت نے سہل کے جنازہ پر متعدد مرتبہ نماز پڑھائی۔ جب ایک نماز سے فارغ ہوتے تو اور لوگ آ جاتے اور کہتے کہ یا امیرالمومنین ہم نماز جنازہ میں شرکت سے محروم رہ گئے۔ حضرت ان کے شرف و امتیاز کی بنا پر پھر نماز پڑھاتے یہاں تک کہ قبر تک پہنچتے پہنچتے پانچ مرتبہ نماز پڑھائی اور ہر نماز میں پانچ تکبیریں کہیں۔ امیرالمومنین نے ان کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

کان من احب الناس الی لو احبنی جبل لتھافت۔ (تنقیح المقال)	سہل مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھے۔ اگر پہاڑ بھی مجھے محبوب رکھے گا تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔"

مالک ابن حارث اشتر، مالک نام اور اشتر لقب تھا۔ شجاعان عالم میں ممتاز اور شمشیر زنی و نبرد آزمائی میں شہرہ آفاق تھے۔ جمل و صفین میں عظیم کارنامے انجام دیئے اور اپنے حریفوں تک سے اپنی تیغ زنی کا لوہا منوایا۔ امیرالمومنین کے مخلص و معتمد اور بلند مرتبہ اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ اور حضرت سے اس درجہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مالک کا میری نظروں میں وہی مرتبہ و مقام ہے جو رسول اللہ کے نزدیک میرا مرتبہ و مقام تھا اور اپنے مقام و منزلت کے بارے میں فرمایا:۔

کانت لی منزلۃ من رسول اللہ مالم تکن لاحد من الخلائق (مسند احمد ابن حنبل ج ۱ ص ۸۵)	رسول اللہ کے نزدیک میرا وہ مقام تھا جو کائنات میں کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔"

جب حضرت ابوذر نے صحرائے ربذہ میں حکومت کے خلاف خاموش احتجاج کرتے ہوئے دم توڑا تو جن صلحائے مومنین نے ان کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا تھا ان میں اگرچہ ہلال ابن مالک مزنی احنف ابن قیس تمیمی صعصعہ ابن صوحان عبدی اسود ابن قیس تمیمی ایسے عظیم المرتبت و جلیل القدر افراد موجود تھے۔ مگر نماز جنازہ مالک اشتر نے پڑھائی جس سے ان کے علم و عدالت اور قدر و منزلت پر روشنی پڑتی ہے۔

امیرالمومنین نے مالک کو جزیرۃ العرب پر عامل مقرر کیا جو موصل نصیبین میا فارقین دار اعانات سنجار اور دوسرے شہروں پر مشتمل ایک وسیع علاقہ تھا۔ ۳۸ھ میں انہیں امارت مصر کے لئے منتخب کیا مگر مصر پہنچنے سے پہلے ایک اموی کارندے نے معاویہ کے ایما پر انہیں شہد میں زہر دے کر شہید کر دیا۔ معاویہ کو ان کے انتقال کی خبر ہوئی تو خوش ہو کر کہا:۔

ان للہ جندا من العسل۔ شہد بھی اللہ کا ایک لشکر ہے۔

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۴۰)

عبداللہ ابن عباس۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم تھے ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے امیرالمومنین کے زیر سایہ تربیت پائی انہی سے علمی استفادہ کیا اور علم و حکمت اور فقہ و تفسیر میں بلند ترین درجہ پر فائز ہوئے۔ تشنگان علوم و معارف کا ان کے ہاں ہجوم رہتا تھا اور حبرالامہ اور ترجمان القرآن کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جمل، صفین اور نہروان تینوں جنگوں میں حضرت کے ہمرکاب رہے۔ عثمان ابن حنیف کے بعد بصرہ کے حاکم مقرر کئے گئے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ۶۸ھ میں طائف میں وفات پائی۔ محمد ابن حنیفہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور سپرد لحد کیا۔

محمد ابن ابی بکر۔ اسماء بنت عمیس کے بطن سے حضرت ابوبکر کے فرزند تھے۔ حجۃ الوداع کے سال پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر کے انتقال کے بعد حضرت علی نے اسماء سے عقد کر لیا۔ تو محمد انہی کے زیر تربیت آ گئے۔ آپ نے اپنی اولاد کی طرح ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی اور انہوں نے وہی مسلک اختیار کیا جو اس تربیت کا تقاضا تھا۔ جمل و صفین کے معرکوں میں شریک رہے۔ قیس ابن سعد کی برطرفی کے بعد مصر کی امارت ان سے متعلق ہوئی۔ جب ۳۸ھ میں لشکر شام مصر پر حملہ آور ہوا تو دشمن کے ہاتھوں بڑی بے دردی سے شہید ہو گئے۔

ابوایوب انصاری:۔ ان کا نام خالد اور باپ کا نام زید تھا مگر اپنی کنیت سے شہرت حاصل کی۔ پیغمبر اکرم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں انہی کے ہاں سات ماہ قیام فرمایا تھا۔ آپ متورع و پرہیز گار ہونے کے ساتھ بہادر و نبرد آزما بھی تھے۔ اسلامی غزوات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور جمل، صفین اور نہروان میں امیرالمومنین کی صفوں میں امتیازی حیثیت سے شامل رہے۔ حضرت کی طرف سے مکہ کے والی مقرر ہوئے ۵۱ھ میں

وفات پائی اور قسطنطنیہ میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار صدیوں سے زیارت گاہِ خاص و عام چلا آ رہا ہے۔

مخنف ابن سلیم ازدی :۔ امیرالمومنین کے معتمد اصحاب میں سے تھے۔ کربلا کا مشہور وقائع نگار ابو مخنف انہی کی اولاد میں سے تھا۔ ابو مخنف کا نام لوط اور شجرہ نسب یہ ہے :۔ لوط ابن یحییٰ ابن سعید ابن مخنف ابن سلیم۔ امیرالمومنین نے مخنف ابن سلیم کو ہمدان اور اصفہان کا عامل مقرر کیا۔ جب حضرت نے صفین کی طرف حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو مخنف نے حضرت سے کوفہ آنے کی اجازت طلب کی تاکہ آپ کے ہمرکاب رہ کر شامیوں سے جہاد کریں۔ حضرت نے ان کے ولولۂ جہاد کو دیکھ کر انہیں کوفہ آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ حرث ابن ربیع کو اصفہان پر اور سعید ابن وہب کو ہمدان پر اپنا نائب مقرر کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور قبیلہ بنی ازد کا پرچم اپنے ہاتھوں میں لے کر جنگ صفین میں شریک ہوئے۔

قرظہ ابن کعب انصاری :۔ پیغمبر کے اصحاب میں سے تھے۔ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور حضرت کی طرف سے فارس کے حاکم مقرر ہوئے۔ جمل صفین اور نہروان میں امیرالمومنین کی نصرت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت نے صفین میں انصار کا علم اُن کے سپرد کیا۔ حضرت ہی کے دورِ خلافت میں وفات پائی اور آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کے ایک فرزند عمرو ابن قرظہ انصاری کربلا میں لڑ کر شہید ہوئے۔

قثم ابن عباس :۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم اور صورت و شکل میں ان سے بہت مشابہ تھے۔ آنحضرت کے دفن کے موقع پر قبر اطہر میں اُترے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ کریم و سخی تھے۔ سائلوں کو اپنے گراں قدر عطایا سے دوسروں کے آگے جھولی پھیلانے سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ ایک شاعر داؤد ابن مسلم نے ان کے بارے میں کہا ہے ؂

اعفیت من حل و من رحلۃ   یا ناق ان ادنیتنی من قثم

"اے میری اونٹنی اگر تو مجھے قثم کے پاس لے چلے تو آئے دن کے سفروں سے چھٹکارا پا جائے"

حضرت نے انہیں مکہ کا والی مقرر کیا اور ایک مکتوب میں انہیں تحریر فرمایا :۔ "صبح و شام اپنی نشست قرار دو مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بتاؤ۔ جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلۂ خیالات کرو" ان کلمات سے ان کی عدالت علمی منزلت اور اہلیت افتار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امیرالمومنین کی شہادت کے بعد سعید ابن عثمان کے ہمراہ سمرقند چلے گئے اور جام شہادت پی کر جنت کو سدھارے۔

یزید ابن قیس ارحبی :۔ قبیلہ ہمدان کی شاخ بنی ارحب کی ایک ممتاز فرد تھے۔ کوفہ میں سکونت تھی جب حفاظ کوفہ نے حضرت عثمان کی روش کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی تو

انہیں سربراہ منتخب کیا گیا۔ جنگ صفین میں اپنے بھائی سعید ابن قیس ہمدانی کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور بڑی دلیری و جرأت سے لڑے۔ امیرالمومنین نے انہیں اصفہان ہمدان اور رے کا عامل مقرر کیا۔

کمیل ابن زیاد نخعی:۔ امیرالمومنین کے مخصوصین میں سے تھے۔ نہایت عابد و پرہیزگار اور علوم و معارف آلِ محمد کے امین تھے۔ حضرت نے انہیں ایک دعا تعلیم فرمائی تھی جو" دعائے کمیل کے نام سے مشہور اور کتب ادعیہ میں موجود ہے۔ کوفہ میں سکونت رکھتے تھے۔ جنگ صفین میں حضرت کے ہمرکاب رہے۔ اور شامیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔

جب ۸۲ھ میں حجاج ابن یوسف ثقفی نے عبدالرحمٰن ابن محمد ابن اشعث کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا تو چن چن کر شیعیان امیرالمومنین کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ شیعیان کوفہ میں کمیل کی شخصیت غیر معروف نہ تھی وہ حجاج کے ظلم و تشدد اور خونریزی و سفاکی کو دیکھ کر کہیں روپوش ہو گئے۔ حجاج نے ان کے قبیلہ والوں سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی مگر کسی نے ان کا پتا بتانا گوارا نہ کیا۔ آخر حجاج نے ان سب کے وظائف روک لئے۔ جناب کمیل کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ میں بہت جی چکا ہوں اب مجھے جینے کی آرزو نہیں ہے۔ میں چند روزہ زندگی کے لئے اپنی قوم کو بھوکا مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاج کے ہاں پہنچ گئے۔ حجاج ان سے انتہائی سختی و درشتی سے پیش آیا۔ کمیل نے بھی اس کی ہر بات کا جواب اسی کے لب و لہجہ میں دیا اور کہا کہ میں اس وقت تمہارے قبضہ میں ہوں تم جو چاہو میرے ساتھ کر گزرو کل میرا اور تمہارا فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہوگا۔ مجھے موت کی پروا نہیں ہے۔ میرے سید و سردار علی ابن ابی طالب مجھے خبر دے گئے تھے کہ تم ایک ظالم و سفاک کے ہاتھ سے قتل ہو گے۔ حجاج نے کہا کہ مجھے تمہاری تلاش اسی غرض کے لئے تھی یہ کہہ کر حکم دیا کہ ان کی گردن مار دی جائے۔ چنانچہ وہ اسی مقام پر ذبح کر دیئے گئے۔ شہادت کے وقت آپ کا سن ۹۰ برس کا تھا۔ اور مزار کوفہ و نجف کے درمیان واقع ہے۔

ربیع ابن خیثم اسدی:۔ امیرالمومنین کے مقربین اور اجلہ اصحاب میں سے تھے۔ زہد و ورع اور تقویٰ و پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ حضرت کی طرف سے قزوین کے عامل مقرر ہوئے۔ جب امیرالمومنین صفین جانے کے لئے نخیلہ میں فروکش تھے تو ان کی آمد کے منتظر رہے اور جب وہ رے سے چار ہزار کا لشکر لے کر پہنچے تو صفین کی طرف حرکت کی۔ ۶۱ھ یا ۶۳ھ میں ایک لشکر میں شامل ہو کر خراسان گئے اور وہیں پر وفات پائی اور روضۂ امام رضا علیہ السلام سے چھ میل کے فاصلے پر مدفون ہیں۔ ان کا مدفن زیارت گاہ خواجہ ربیع کے نام سے مشہور ہے۔ جب امام رضا علیہ السلام طوس میں وارد ہوئے تو اکثر ان کی قبر پر تشریف فرما ہوتے

اور فرماتے کہ خراسان آنے کا ماحصل خواجہ ربیع کی زیارت ہے۔

عمر ابن ابی سلمہ :۔ جناب ام سلمہ کے بطن سے ابو سلمہ ابن عبدالاسد مخزومی کے فرزند تھے ۲ھ میں حبشہ میں پیدا ہوئے۔ وفات رسول کے وقت ان کا سن نو برس کا تھا۔ جنگ جمل میں امیرالمومنین کے میسرۂ لشکر کے سردار تھے۔ حضرت نے انہیں بحرین کا والی مقرر کیا۔ جب صفین کا ارادہ کیا تو انہیں جنگ میں شرکت کی غرض سے بحرین سے واپس بلا لیا۔ اور جنگ کے بعد فارس کے حاکم بنائے گئے ۸۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔

نعمان ابن عجلان انصاری :۔ قبیلہ انصار کے سردار اور زبان آور شاعر تھے۔ امیرالمومنین کے حامی و طرف دار اور ان کے حق کی فوقیت کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ حضرت نے عمر ابن ابی سلمہ کی جگہ انہیں بحرین و عمان کا والی مقرر کیا۔ جنگ صفین میں حضرت کی حمایت میں لڑے۔ ان کے بھائی نعیم ابن عجلان انصاری حسینی لشکر میں شامل ہو کر روز عاشورا حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ انہوں نے امام حسن کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔

عثمان ابن حنیف انصاری :۔ انصار کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ امیرالمومنین کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ حضرت نے جنگ جمل سے قبل انہیں بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ جنگ کے خاتمہ پر ان کی جگہ پر عبداللہ ابن عباس متعین ہوئے۔ آپ نے کوفہ میں سکونت اختیار کی اور معاویہ کے دور میں وفات پائی۔

سعید ابن مسعود ثقفی :۔ مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے چچا تھے۔ صفین میں اہل کوفہ کے سات دستوں میں سے ایک دستہ کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت کی طرف سے مدائن کے والی تھے۔ جب امام حسن فوج کی بغاوت کے نتیجہ میں ابن بشیر اسدی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے تو مدائن میں سعید ہی کے ہاں منزل کی اور انہی نے علاج معالجہ کا سرو سامان کیا۔

عبیداللہ ابن عباس :۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم تھے۔ امیرالمومنین نے انہیں یمن کی امارت سپرد کی۔ اور افواج یمن کی سپہ سالاری کا عہدہ سعید ابن نمران ہمدانی کو دیا۔ جب بسر ابن ابی ارطاۃ نے یمن پر حملہ کیا تو یہ اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر یمن سے نکل کھڑے ہوئے۔ جس پر امیرالمومنین نے انہیں سرزنش کی۔

حسان ابن حسان بکری :۔ امیرالمومنین کی طرف سے انبار کے والی تھے۔ جب معاویہ نے عراقی سرحدوں پر تاخت و تاراج شروع کی تو سفیان ابن عوف غامدی نے چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ انبار پر حملہ کیا اور حسان اور ان کے تیس ہمراہیوں کو شہید کر دیا۔

ضحاک ابن قیس کی تاخت

امیرالمومنین جنگ جمل میں اُلجھے ہوئے تھے کہ معاویہ نے موقع تاک کر جزیرۃ العرب کے چند شہروں حران، قرقیسا اور رقہ پر فوج کشی کر دی اور وہاں کے باشندوں سے بیعت لے کر ضحاک ابن قیس فہری کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ جب امیرالمومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں وارد ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان شہروں کے باشندوں نے جو حضرت عثمان کے ہوا خواہ تھے معاویہ کی بیعت کر لی ہے اور ضحاک ابن قیس معاویہ کی طرف سے ان اطراف کا عامل قرار پا گیا ہے۔ حضرت نے مالک اشتر کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بلاد جزیرہ کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ حضرت ان کی جنگی مہارت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر پُراعتماد تھے کہ وہ بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا لیں گے اور ضحاک کو حدود جزیرہ سے نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ مالک فوراً ایک دستہ فوج کے ساتھ بلاد جزیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب حدود جزیرہ میں داخل ہوئے اور ضحاک کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے رقہ سے جو کوفہ و بصرہ کے عثمانیوں کی پناہ گاہ تھا فوجی امداد طلب کی چنانچہ وہاں سے سماک ابن مخرمہ اسدی کی کمان میں ایک لشکر اس کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ جب مالک حران کے قریب پہنچے تو ضحاک اور سماک دونوں اپنی اپنی فوجوں کی کمان کرتے ہوئے مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور رقہ اور حران کے درمیان مقام مرج میں جنگ چھڑ گئی۔ مالک اور اُن کے ہمراہیوں کے پرزور حملوں نے حریف کا زور توڑ دیا۔ جب ضحاک نے شکست کے آثار دیکھے تو لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلعہ حران میں پناہ لے لی۔ مالک نے لشکر کا تعاقب کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ معاویہ کو اپنے لشکر کی ہزیمت اور قلعہ بند ہونے کی خبر پہنچی تو انہوں نے خالد ابن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو سواروں اور پیادوں کے لشکر گراں کے ساتھ بھیجا۔ مالک کو جب اس شامی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے محاصرہ اٹھا کر پہلے اس سے نمٹ لینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جس سمت سے لشکر آ رہا تھا ادھر بڑھے۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے تو تلواریں نیاموں سے کھینچ کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے کچھ دیر تک چھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر عبدالرحمن اور اس کے ہمراہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے بھاگ کر رقہ میں پناہ لے لی۔ مالک نے چاروں طرف سے رقہ کا محاصرہ کر لیا۔ ضحاک کو عبدالرحمٰن کے لشکر کی پسپائی کا علم ہوا تو وہ قلعہ حران سے نکل کر رقہ کی طرف بڑھا تاکہ شکست خوردہ فوج کو محاصرہ سے نکال لے جائے اس اثنا میں شامیوں کا ایک اور لشکر ایمن ابن حزیمہ کی زیر کمان پہنچ گیا اب ضحاک کی ہمت بڑھ گئی اور وہ پوری طاقت سے مالک کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ مالک اور اس کے ہمراہیوں نے ہتھیار سنبھال لئے اور خونریز جنگ شروع ہو گئی۔

شامی کچھ دیر تک جی توڑ کر لڑتے رہے۔ آخر عراقیوں کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جزیرہ شامی فوجوں سے خالی ہو گیا اور مقامی باشندے جو اموی اقتدار کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے دبک کر بیٹھ گئے۔ مالک نے ان باغیوں اور سرکشوں کی اچھی طرح گوشمالی کی اور ان سے اطاعت کا عہد و پیمان لے کر جزیرہ کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

قیس ابن سعد کی برطرفی

جنگ جمل کے بعد معاویہ کو یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ امیرالمومنین انہیں امارت شام سے الگ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں گے جسے وہ کسی صورت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ خطرہ مصر اور عراق دونوں طرف سے تھا۔ اگر ایک طرف سے قیس ابن سعد مصر کی فوجوں کے ساتھ اور دوسری طرف سے حضرت عراقیوں کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوتے تو وہ اس دوطرفہ یلغار کا مقابلہ نہ کر سکتے انہوں نے چاہا کہ کسی طرح قیس کو اپنے ساتھ ملانے یا مصر کی امارت سے الگ کرنے کی تدبیر کریں۔ چنانچہ انہوں نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے قیس کو ایک خط تحریر کیا کہ "علی نے عثمان کا خون بہا کر ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور تمہارا قبیلہ انصار بھی اس جرم میں ان کا معاون و مددگار تھا اگر تم اپنا بچاؤ چاہتے ہو تو طالبان قصاص کے گروہ میں شامل ہو کر تحریک قصاص کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ اس کے صلہ میں تمہیں عراقین کی حکومت دی جائے گی اور تمہارے گھر والوں میں سے جسے تم چاہو گے حجاز کا حاکم بنا دیا جائے گا اور اس کے علاوہ بھی جو تم چاہو گے دیا جائے گا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔" معاویہ نے یہ دانہ تو پھینکا مگر قیس آسانی سے زیر دام آنے والے نہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا مگر نہ کھل کر انکار کیا نہ اقرار۔ اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ دن انہیں امید و یاس کے دوراہے پر کھڑا رہنے دیں۔ چنانچہ انہیں تحریر کیا کہ :۔ "میں قتل عثمان کا مرتکب نہیں ہوا البتہ میرے قبیلہ کے لوگ اس سے بے تعلق نہیں رہے۔ تم نے حضرت علی کو اس خون میں شریک قرار دیا ہے تو میرے علم میں یہ چیز نہیں ہے۔ رہا تم سے وابستگی کا سوال تو اس کا فیصلہ بے سوچے سمجھے جلدی میں نہیں کیا جا سکتا تاہم میری طرف سے تمہیں مطمئن رہنا چاہیئے۔ کہ میں کوئی قدم ایسا نہیں اٹھاؤں گا جو تمہیں ناگوار گزرے۔" معاویہ نے یہ خط پڑھا تو کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ قیس اپنا ہاتھ کھینچ رہے ہیں یا دست تعاون بڑھا رہے ہیں۔ انہیں دوبارہ لکھا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ تم میرے مخالف ہو یا موافق اگر تم مجھے اندھیرے میں رکھ ٹال مٹول سے

کام لینا چاہتے ہو تو میں آسانی سے فریب میں آنے والا نہیں ہوں وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ فوجیں میرے جلو میں ہوں گی اور گھوڑوں کی باگیں میرے ہاتھ میں پھر یہ حیلے حوالے کام نہیں دیں گے۔" قیس نے یہ خط پڑھا تو سمجھ گئے کہ معاویہ کو آسانی کے ساتھ ٹالا نہیں جا سکتا اور نہ باتوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہیں صاف صاف لکھا کہ "مجھے تعجب ہے کہ تم مجھے سمجھ نہ سکے اور حکومت کا لالچ دے کر مجھے بہکانے لگے کیا تم یہ تصور بھی کر سکتے ہو کہ میں اس شخص کی امارت سے باہر ہو کر آمادۂ بغاوت ہو جاؤں گا جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی قیادت و سربراہی کا اہل ہے اور جس کی حق پسندی راست روی اور رسول اللہ سے قرابت وعزیزداری مسلم ہے۔ اور کیا تمہاری اطاعت کا جوا اپنی گردن میں ڈال لوں گا جبکہ تمہیں نہ امارت و قیادت سے کوئی واسطہ اور نہ اللہ اور اس کے رسول سے کوئی لگاؤ ہے۔ تم فریب کار گمراہ اور گمراہ کرنے والے کی اولاد اور ابلیس کے گروہ کی ایک فرد ہو۔ تم نے اپنے خط میں لشکر و سپاہ کا ذکر کیا ہے تو خدا کی قسم اگر تم میرے ہاتھ سے اپنی جان بچا لے جاؤ تو بڑے خوش نصیب ہو گے۔" معاویہ نے یہ خط پڑھا تو بہت سیخ پا ہوئے اور اسی لب لہجہ میں جواب دیا اور ادھر سے بھی ویسا ہی جواب آیا۔ آخر معاویہ قیس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ کہ انہیں نہ طمع و لالچ سے پھانسا جا سکتا ہے اور نہ خوف زدہ کر کے ہمنوا بنایا جا سکتا ہے۔ جب اس طرح کام نکلتا نظر نہ آیا تو انہوں نے تقاضائے دیانت سے منہ موڑ کر ایک چال چلی اور وہ یہ کہ قیس کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا جس میں تحریر تھا کہ:۔

"قیس ابن سعد کی طرف سے امیر شام معاویہ کے نام ہم نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کا ساتھ نہ دینا چاہیئے جن کے ہاتھ ایک پرہیزگار و نیک کردار رہنمائے اسلام کے خون سے رنگین ہیں۔ ہم اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اللہ سے اپنے دین کی سلامتی کے خواستگار ہیں۔ ہم آپ کو اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہیں اور عثمان مظلوم کے قاتلوں سے جنگ لڑنے پر تیار ہیں اور جلد ہی ہماری طرف سے فوجی و مالی امداد روانہ کر دی جائے گی۔" اس تحریری جعلسازی کے ساتھ زبانی بھی لوگوں کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ قیس کو برا نہ کہو وہ در پردہ ہمارے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ انہوں نے خربتا کے باشندوں کو ہر طرح کی سہولت و آزادی دے رکھی ہے اور تم میں سے کوئی اُن کے ہاں جاتا ہے تو اس سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔

معاویہ نے اس فرضی خط کو صرف شام ہی میں مشتہر نہیں کیا بلکہ اپنے کارندوں کے ذریعہ کوفہ میں بھی اس کی تشہیر کی تاکہ وہاں کی فضا کو قیس کے خلاف کر سکیں۔ چنانچہ کوفہ میں اس کا عام چرچا ہوا اور امیرالمومنین کے کانوں تک بھی یہ آواز پہنچ گئی آپ نے اپنے چند عزیزوں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ عبداللہ

ابن جعفر اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ قیس آپ سے برگشتہ ہو کر معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے ہیں مناسب یہی ہے کہ انہیں برطرف کر دیا جائے۔ امیرالمومنین سمجھ رہے تھے کہ یہ معاویہ کی چال ہے اور واقع میں ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمایا:۔

انی واللہ ما اصدق بھذا علی قیس۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ ص ۵۵۴)

خدا کی قسم میں قیس کے بارے میں ان باتوں کی تصدیق نہیں کر سکتا۔"

اس اثنا میں قیس کا ایک خط حضرت کے نام آیا۔ جس میں تحریر تھا کہ ان اطراف میں کچھ عثمانی آباد ہیں جو بیعت سے کنارہ کش رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے نمائندوں نے مجھ سے کہا ہے کہ جب تک حالات یکسو نہیں ہو جاتے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ میں نے فی الحال یہ مناسب سمجھا ہے کہ ان سے جنگ نہ کی جائے۔ ممکن ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں اور خود ہی راہِ راست پر آجائیں۔ عبداللہ ابن جعفر اس خط پر مطلع ہوئے تو انہوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیس دفع الوقتی کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں آپ انہیں لکھیں کہ وہ ان لوگوں سے بیعت لیں۔ اور اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو ان سے جنگ کریں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی حضرت نے کوفہ کی فضا کو دیکھتے ہوئے قیس کو تحریر کیا کہ مصر کے جن لوگوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی ہے۔ ان سے بیعت لو اگر وہ بیعت پر آمادہ ہو جائیں تو بہتر ورنہ اُن سے جنگ کرو۔ جب قیس کو حضرت کا خط ملا تو انہوں نے جواب میں تحریر کیا کہ یا امیرالمومنین اگر ان لوگوں سے جنگ لڑی گئی تو وہ آپ کے دشمنوں کے مددگار ثابت ہوں گے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور ان سے جنگ نہ چھیڑی جائے۔ قیس کے اس جواب سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ معاویہ سے وابستہ ہو چکے ہیں اور اشعث ابن قیس، عبداللہ ابن جعفر، محمد ابن حنفیہ اور کوفہ کے دوسرے سرکردہ لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں معزول کر دیا جائے اور ان کے بجائے محمد ابن ابی بکر کو والیٔ مصر مقرر کیا جائے۔ حضرت انہیں برطرف کرنے کے حق میں نہ تھے۔ مگر جب آپ کو مجبور کر دیا گیا تو آپ نے قیس کی معزولی اور محمد ابن ابی بکر کی تقرری کا حکم دے دیا۔

معاویہ نے جو داؤ کھیلا تھا وہ کامیاب رہا اور اس کا نتیجہ قیس کی معزولی کی صورت میں سامنے آ گیا۔ معاویہ نے قیس کو دم جھانسا دینا چاہا اور جب وہ اُن کے فریب میں نہ آئے تو فرضی خط کے ذریعہ ایسا فضا پیدا کر دی کہ امیرالمومنین کے اعزہ و اصحاب ان سے بدظن ہو گئے اور اس طرح معاویہ نے امیرالمومنین کے ساتھیوں ہی کے ذریعہ قیس کی معزولی کا سامان کر دیا۔ ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے:۔

قد امرہ علی علی مصر فاحتال علیه معاویة فلم ینخدع له فاحتال علی اصحاب علی حتی حسنوا له تولیة محمد ابن ابی بکر فولاہ مصر۔ (اصابہ۔ ج ۳۔ ص ۲۳۹)

حضرت علی نے قیس کو مصر کا حاکم مقرر کیا تو معاویہ نے قیس کو مختلف حیلوں سے ورغلانا چاہا مگر وہ ان کے ورغلانے میں نہ آئے۔ پھر انہوں نے حضرت کے اصحاب کو ورغلایا اور انہوں نے محمد ابن ابی بکر کے تقرر کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ حضرت نے انہیں مصر کا والی مقرر کر دیا۔"

قیس مصر کی امارت سے دستبردار ہو کر مدینہ چلے آئے اور ان لوگوں کو جو ان کے جنگی داؤ پیچ بینظیر شجاعت اور زورِ بازو سے خائف تھے اطمینان ہو گیا۔ دشمن نے مسرت کا اظہار کیا اور شماتت کرنے والوں کو شماتت کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حسان ابن ثابت جو عثمانی گروہ کی ایک فرد تھے۔ قیس کے پاس آئے اور کہا کہ تمہاری اچھی قدر افزائی ہوئی ہے کہ تمہیں امارت مصر سے معزول کر دیا گیا حالانکہ تم قتلِ عثمان میں شریک تھے۔ قیس نے بگڑ کر کہا۔

یا اعمی القلب والبصر واللہ لو لا ان القی بین رهطی ورهطك حربا لضربت عنقك اخرج عنی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۵۵۵)

اے بے بصیرت و بے بصارت یہاں سے دور ہو جاؤ۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے اور تمہارے قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی تو میں تمہاری گردن مار دیتا۔"

مروان ابن حکم اور اسود ابن البختری نے بھی ڈرایا دھمکایا اور جب انہیں قید و بند اور قتل کا خطرہ نظر آیا تو سہل ابن حنیف کے ہمراہ امیرالمومنین کے پاس کوفہ چلے آئے۔ جب معاویہ کو معلوم ہوا کہ قیس کوفہ چلے گئے ہیں۔ تو بگڑ کر مروان اور اسود کو لکھا:۔

امددتما علیا بقیس ابن سعد ورایه ومکانته فواللہ لو انکما امددتماه بمائة الف مقاتل ماکان ذلك باغیظ لی من اخراجکما قیس ابن سعد الی علی۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۵۵۶)

تم دونوں نے قیس کے علی کے پاس جانے کا سرو سامان کیا خدا کی قسم اگر تم ایک لاکھ جنگجو سپاہیوں سے علی کی مدد کرتے تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس سے ہوا ہے اس طرح تم نے قیس اور ان کی رائے و تدبیر سے علی کے بازوؤں کو مضبوط تر کر دیا ہے۔"

مصر سے برطرفی کے بعد امیرالمومنین نے انہیں آذربائیجان کا عامل مقرر کر دیا اور سفر شام کے موقع پر حضرت کے فرمان کے مطابق عبداللہ ابن شبیل احمسی کو اپنا قائم مقام بنا کر کوفہ واپس آ گئے اور جنگ صفین

میں شریک ہوکر اپنے زورِ بازو اور زورِ خطابت کی دھاک بٹھا دی۔

قیس ابن سعد کی معزولی کے سلسلہ میں عام طور پر امیرالمومنین کی سیاست کو ہدف بنایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت کا یہ اقدام مصلحت اندیشی کے خلاف تھا انہوں نے ایسے موقع شناس معاملہ فہم، اور جنگ آزما کو مصر کی امارت سے اس وقت الگ کیا جب معاویہ کے جنگی عزائم کے پیش نظر وہاں کی قیادت کو مضبوط تر کرنے کی ضرورت تھی مگر اسے قوی تر کرنے کے بجائے کمزور تر کر دیا گیا اور محمد ابن ابی بکر کو وہاں کی قیادت سونپ دی گئی جو نہ معاویہ کی دراندازیوں کو روک سکتے تھے اور نہ ملکی حدود کو دشمن کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی کمزور سیاست کے نتیجہ میں مصر حضرت کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور معاویہ کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔

بظاہر یہ اعتراض بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے مگر کسی امر کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس دور کا واقعہ ہو اس دور کے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جائے۔ یہ واقعہ اس دور کا ہے جب مواصلات کا دائرہ محدود اور انتہائی محدود تھا ایک ہی مملکت کے اندر ایک جگہ کے واقعات و حوادث سے دوسری جگہ کے لوگ بے خبر رہتے تھے اور خبر پہنچ بھی جاتی تھی تو واقعہ کی اصل نوعیت اور اس کا پس منظر واضح نہ ہوتا تھا مصر کے سیاسی حالات کے پیش نظر قیس ابن سعد کا طریق کار کتنا ہی حزم و احتیاط کا حامل کیوں نہ ہو مگر وہاں سے جو اطلاعات پہنچتی تھیں ان سے قیس کے طرز عمل کا مشکوک سمجھا جانا کوئی بعید نہ تھا انہوں نے مصر پہنچنے کے بعد خربتا کے عثمانیوں سے کوئی تعرض نہ کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ ایسے لوگ حکومت کے باغیوں میں شمار ہوتے ہیں اور باغیوں سے مراعات کا جواز کسی قاعدہ و قانون سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا جواز نکل سکتا تھا جب انہیں دبانے کی قوت و طاقت نہ ہوتی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیس دس ہزار عثمانیوں کو کچلنے کی طاقت بہم نہ پہنچا سکتے تھے۔ پھر جب معاویہ نے انہیں اپنے حزب میں شامل ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے کھل کر نہ ان کی پیش کش کو ٹھکرایا اور نہ اسے قبول کیا جس سے ان کا موقف اور مشکوک ہو گیا۔ اور جب انہوں نے کھل کر دو ٹوک جواب دیا تو معاویہ کو کیا ضرورت تھی کہ ان کے خط کا اعلان کرتے جب کہ وہ یہ تاثر دینے کی فکر میں تھے کہ قیس ان کے ہم خیال و ہمنوا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرضی خط کے ذریعہ شامیوں اور کوفیوں کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا کہ قیس انہی کے آدمی ہیں۔ ان حالات میں اگر قیس کے بارے میں شبہ یا سوءظن پیدا ہو جائے تو اسے انسان کی ذہنی روش کے خلاف نہ سمجھنا چاہئے بلکہ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا البتہ امیرالمومنین نے ان کے بارے میں اپنے اعتماد کو بحال رکھا نہ کسی موڑ پر ان کی وفاداری میں شبہ

کیا اور نہ ان کے متعلق اڑتی ہوئی خبروں کی تصدیق کرنے پر آمادہ ہوئے۔ مگر اس کے باوجود انہیں امارت مصر پر بحال رکھنا مشکل تھا اس لئے کہ اہل کوفہ جن کے مزاج کی بے ثباتی ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے وہ اس کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور مصر میں جنگ چھڑنے کی صورت میں عملی تعاون سے گریز کرتے اور کوفہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے ضرورت کے موقع پر کمک مہیا کی جا سکتی تھی۔ اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قیس مصریوں کی سپاہ کے ساتھ شامیوں کے مقابلہ سے عہدہ برآر نہ ہو سکتے۔ اہل کوفہ نے تو محمد بن ابی بکر کی جو ان کی مرضی کے ماتحت والی مصر مقرر کئے گئے تھے مدد نہ کی تو قیس کی مدد کے لئے کیا آمادہ ہوتے جب کہ وہ ان کی معزولی و برطرفی کے حامی تھے۔ چنانچہ جب لشکر شام مصر پر حملہ آور ہوا ہے۔ تو محمد کے چیخنے چلانے اور فریاد کرنے کے باوجود ان میں سے کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور جب امیرالمومنین کے جھنجھوڑنے کے بعد جانے پر آمادہ ہوئے تو اس وقت جب مصر پر شامیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر امیرالمومنین قیس کو معزول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ وہ دل سے ان کی برطرفی کے حق میں نہ تھے۔ اور پھر حضرت کے سامنے صرف مصر اور وہاں کے شوریدہ سر عثمانیوں ہی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ معاویہ سے جنگ آزما ہونے کی کٹھن مہم بھی درپیش تھی جسے سر کرنے کے لئے قیس ایسے افراد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا جن کی ہمت و جرأت اور اصابت رائے کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اسی لئے قیس کا حضرتؑ کے پاس پہنچ جانا معاویہ کے لئے ایک المیہ تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ قیس امارت سے الگ کر دیئے جانے کے بعد حضرت سے اپنی وابستگی ختم کر دیں گے اور ہمیشہ کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کر لیں گے مگر یہ چھچھوری کم ظرف اور مفاد پرست طبیعتوں کا خاصہ اور قیس کی حق پسندی اور بلند نفسی یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ منصب کے چھن جانے سے حق کا ساتھ چھوڑ دیں اور ایسے ہی موقعوں پر انسان کی بلندی کا معیار قائم ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اگرچہ معاویہ جعل و فریب کے ذریعہ قیس کو امارت مصر سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ انہیں قیس کا امارت مصر پہ باقی رہنا اتنا ناگوار نہ گزرتا جتنا جنگ صفین میں حضرت کا دست و بازو بن کر شامل ہونا ناگوار گزرا ہو گا۔ چنانچہ صفین کے آخری معرکوں میں انہیں یہ کہتے سنا گیا کہ اگر جنگ بند نہ ہوئی تو کل قیس ہمیں صفحہ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے۔

جنگ صفین

شام اموی اقتدار کا گہوارہ اور معاویہ ابن ابی سفیان کا پایۂ تخت تھا۔ جہاں وہ خلافت ثانیہ کے زمانہ سے اقتدار پر قابض تھے اور اس طویل عہد امارت کی وجہ سے انہوں نے مضبوطی سے قدم جما رکھے تھے اور ایک خود مختار حکمران کی طرح شام ایسے وسیع و زرخیز علاقہ پر اپنا پرچم لہرا رہے تھے جب امیرالمومنین مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے قلمرو مملکت کے تمام عمال کو معزول کر کے نئے عمال مقرر کیے۔ چنانچہ مصر میں قیس ابن سعد یمن میں عبیداللہ ابن عباس اور بصرہ میں عثمان ابن حنیف بھیجے گئے اور انہوں نے بغیر کسی خاص روک رکاوٹ کے عہدے سنبھال لئے کوفہ کی طرف عمارہ ابن شہاب کو اور شام کی طرف سہل ابن حنیف کو روانہ کیا گیا۔ عمارہ کوفہ جاتے ہوئے جب زبالہ کے مقام پر پہنچے تو طلحہ ابن خویلد اسدی مانع ہوا اور کہا کہ تم یہیں سے واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ چنانچہ وہ واپس چلے آئے اور سہل ابن حنیف شام جاتے ہوئے جب وادیٔ تبوک کے قریب پہنچے تو معاویہ کے مقرر کردہ ایک شامی دستہ نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو کہا کہ میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کی طرف سے شام کا عامل ہوں۔ کہا کہ ہم معاویہ کے علاوہ کسی کو شام کا حکمران تسلیم نہیں کرتے تم جدھر سے آئے ہو اُدھر واپس پلٹ جاؤ ورنہ ہماری تلواریں تمہیں آگے بڑھنے سے روکیں گی۔ سہل اس جمعیت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مجبورًا واپس چلے آئے اور حضرت کی خدمت میں پہنچ کر صورت حال بیان کی۔ امیرالمومنین پہلے ہی سے سمجھ رہے تھے کہ معاویہ شام سے بآسانی دستبردار نہ ہوں گے اور ایک دن عراقیوں اور شامیوں کے درمیان جنگ کے شرارے بھڑکیں گے مگر آپ نے اتمام حجت سے پہلے ان کے خلاف قدم اٹھانا گوارا نہ کیا اور کوشش کی کہ گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے معاملہ یکسو ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے حجاج ابن غزیہ انصاری کو ایک خط دے کر معاویہ کے پاس بھیجا اور اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ شامیوں کے وفد کے ساتھ مدینہ آئیں اور بیعت کریں۔ معاویہ نے خط پڑھا مگر اسے کوئی اہمیت نہ دی اور حجاج سے کہا کہ تم واپس چلے جاؤ میں اپنے آدمی کے ہاتھ جواب بھیج دوں گا۔ حجاج واپس چلے آئے اور معاویہ نے ایک پلندہ قبیصہ عبسی کو دے کر حضرت کے پاس بھیجا اس نے مدینہ پہنچ کر وہ پلندہ امیرالمومنین کو دیا۔ حضرت نے اسے کھولا تو اس میں فقط یہ لکھا تھا "معاویہ ابن ابی سفیان کی طرف سے علی ابن ابی طالب کے نام" حضرت نے اس سے دریافت کیا کہ اس کا مطلب کیا ہوا اس نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی جو اس موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ اور ان

سے پوچھا کہ تم میں بنی عبس کے بھی لوگ ہیں ان لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ بھی ہیں کہا کہ اب میری بات غور سے سنئے اور نتائج پر نظر کیجئے میں جامع دمشق میں پچاس ہزار شیوخ و اکابر کو عثمان کے خون بھرے پیراہن کے پیچھے روتا چھوڑ کر آیا ہوں ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں شور و شیون کی صدائیں بلند ہیں اور وہ ؟ سے عہد کئے ہوئے ہیں کہ جب تک قاتلان عثمان کے خون سے اپنی تلواریں رنگین نہیں کر لیں گے چین نہیں بیٹھیں گے اس پر خالد ابن زفر عبسی نے کہا :-

یئس لعمرک اللہ وافد الشام	خدا کی قسم تم شام کے بہت برُے سفیر ہو۔ کیا
انت اتخوف المهاجرين والانصار	مہاجرین و انصار کو شام کے لشکر اور قمیص عثمان
بجنود اهل الشام وبكائهم على	پر ان کے رونے دھونے سے خوف زدہ کرنا چاہتے
قميص عثمان فو الله ماهو	ہو خدا کی قسم عثمان کا کرتہ یوسف کی قمیص نہیں
بقميص يوسف ولا بحزن يعقوب	ہے اور نہ ان کا رنج و غم یعقوب کا حزن و
(اخبار الطوال۔ صفحہ ۱۴۲)	اندوہ ہے ۔"

حضرت نے معاویہ کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ایک فوج جمع کی اور شام جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی شام کی طرف کوچ نہ کیا تھا کہ طلحہ و زبیر کی شورش و ہنگامہ آرائی کی اطلاع پہنچی آپ نے شام جانے کے بجائے ان کا تعاقب کیا اور بصرہ میں خونریز جنگ لڑ کر اس فتنہ کو کچل دیا۔ جب اس بغاوت کو فرو کر کے کوفہ میں آئے تو معاویہ کی طرف کسی کو پیغامبر بنا کر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یمن کے معزول شدہ عامل جریر ابن عبداللہ بجلی نے اس خدمت کی انجام دہی کے لئے اپنے کو پیش کیا اور کہا کہ میں معاویہ سے اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر بیعت لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مالک اشتر نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ در پردہ اہل شام کا ہمنوا اور معاویہ کا دوست ہے یہ شخص کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑے گا۔ لہذا اسے نہ بھیجا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے فی الحال جانے دیا جائے دیکھیں یہ کیا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ اسے ایک خط دے کر شام روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "مہاجرین و انصار میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اب تمہارے لئے بیعت سے انکار کا کوئی جواز نہیں ہے تمہیں وہی طریق کار اختیار کرنا چاہیئے جو اہل مدینہ نے اختیار کیا ہے۔ رہا قصاص عثمان کا مسئلہ تو تم بیعت کے بعد اسے میرے سامنے پیش کرنا میں کتاب و سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا۔" جب جریر یہ خط لے کر معاویہ کے ہاں گیا تو انہوں نے خط پڑھ کر جریر سے کہا :-

اكتب الى على ان يجعل لى الشام	تم علی کو لکھو کہ وہ شام کا علاقہ میرے نام کر دیں

وانا ابایع لہ۔ پھر میں بیعت کر لوں گا۔"

(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹۱)

پھر کچھ سوچ بچار کے بعد کہا کہ تم کچھ دن توقف کرو تاکہ میں اہل شام سے بات چیت کر کے ان کی رائے معلوم کر دوں اور جو ان کی رائے ہو گی وہی میرا آخری فیصلہ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی عتبہ ابن ابی سفیان کو بلا کر مشورہ کیا۔ عتبہ نے کہا کہ تم عمرو ابن عاص کو اپنے ہاں بلاؤ اور اس کی سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھاؤ وہ یقیناً تمہارا معاون و دست راست ثابت ہو گا۔ بشرطیکہ جو شرط وہ منوانا چاہے اسے مان لو۔ معاویہ کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے عمرو ابن عاص کو تحریر کیا کہ "تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ علی نے طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور اب میری طرف متوجہ ہوئے ہیں اور جریر ابن عبد اللہ بجلی کو بیعت کے لئے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تم سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ لہذا جلد از جلد میرے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔" عمرو نے یہ خط پڑھا تو سمجھ گیا کہ معاویہ بیعت کے سلسلہ میں تو مشورہ کے طالب نہیں ہیں اس لئے کہ بیعت کا لازمی نتیجہ امارت شام سے دستبرداری ہے اور وہ کسی قیمت پر امارت کو اپنے ہاتھ سے دینا گوارا نہ کریں گے۔ یہ مشورہ علی کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کرنے کے سلسلہ میں ہے اور صرف مشورہ ہی نہیں ہے بلکہ عملاً مجھے شریک جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

عمرو نے ذہنی طور پر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا تاہم اس نے اپنے فیصلہ کی تائید حاصل کرنے کے لئے اپنے دونوں بیٹوں عبد اللہ اور محمد سے بھی اس کا ذکر کر کے ان کی رائے دریافت کی۔ عبد اللہ نے کہا کہ آپ خلیفہ ہونے سے تو رہے بہتر یہ ہے کہ گھر کے گوشہ میں بیٹھے رہئے اور تھوڑی سی دنیا کے لئے دین کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ محمد نے اس کے برخلاف رائے دی اور کہا کہ ایسے زریں مواقع ہر روز میسر نہیں آیا کرتے آپ جائیں اور ضرور جائیں۔ آپ عرب کی گمنام شخصیت نہیں ہیں آپ کی رائے کی قدر و قیمت ہے جدید حکومت کی تشکیل ہو رہی ہے اس میں آپ کی رائے کو شامل ہونا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ خلافت کا تصفیہ ہو جائے اور آپ کا کہیں ذکر تک نہ آئے۔ عمرو نے ان دونوں رایوں کو سنا تو کہا:۔

اما انت عبد اللہ فامرتنی بما هو خير لی واخرتی واسلم لی دينی واما انت يا محمد فامرتنی بما هو خير لی فی دنيای وشر لی فی اخرتی۔ (اخبار الطوال۔ صفحہ ۱۳۱)	اے عبد اللہ تم نے وہ بات کہی ہے جو میرے لئے آخرت کے لحاظ سے بہتر اور جس سے میرا دین بھی سلامت رہتا ہے اور اے محمد تم نے وہ بات کہی ہے جو میرے لئے دنیوی اعتبار سے بہتر اور عقبیٰ کے اعتبار سے تباہ کن ہے۔"

عبداللہ اور محمد کی رائے معلوم کرنے کے بعد اس نے اپنے غلام وردان سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا کہ آپ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف دنیا ہے اور دوسری طرف آخرت، دنیا معاویہ کے ساتھ ہے اور آخرت علی کے ساتھ۔ آپ کبھی دنیا کی طرف جھکتے ہیں اور کبھی آخرت کا خیال عناں گیر ہوتا ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہتے اور کسی کا ساتھ نہ دیتے مگر مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ آپ کا اندرونی تذبذب عارضی ہے اور انجام کار آپ آخرت کے مقابلہ میں دنیا اختیار کریں گے اور علی کے مقابلہ میں معاویہ کا ساتھ دیں گے۔ عمرو نے یہ سنا تو کہا۔

یا قاتل اللہ وردانا وقدحته ابدی لعمرک ما فی النفس وردان

"خدا ہی وردان کو اس کی باریک بینی کی داد دے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وردان نے چھپی ہوئی حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے۔"

عمرو ابن عاص کو امارت مصر کی دل سے خواہش تھی اور اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا اس سے بہتر موقع ہاتھ آنا مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے معاویہ کے ہاں جانے کا سروسامان کیا اور اپنے دونوں بیٹوں اور وردان کو لے کر دمشق پہنچ گیا۔ معاویہ منتظر تو تھے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہیں اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے اس وقت تین الجھنوں کا سامنا ہے اور ابھی تک اُن کا کوئی حل تلاش نہیں کر سکا۔ مجھے امید ہے کہ تم انہیں سلجھانے میں میری مدد کر سکو گے کہا کہ میں سنوں کہ وہ الجھنیں کیا ہیں کہا کہ ایک الجھن تو یہ ہے کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ محمد ابن ابی حذیفہ قید خانہ کا دروازہ توڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت نکل بھاگا ہے مجھے اس سے اور اس کے ساتھیوں سے خطرناک اقدام کا اندیشہ ہے۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ قیصر روم شام پر چڑھائی کا منصوبہ باندھ رہا ہے تاکہ اسے اپنے علاقہ میں شامل کرلے۔ اور تیسری الجھن یہ ہے کہ جریر ابن عبداللہ بجلی علی کا یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ میں بیعت کروں یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤں۔ عمرو نے کہا کہ اگر ابن ابی حذیفہ جیل کا دروازہ توڑ کر نکل گیا ہے تو تمہیں اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے۔ تم کچھ سوار اس کے تعاقب میں بھیج دو۔ اگر وہ گرفتار ہو گیا تو بہتر ورنہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ رہا قیصر روم کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ، تو اس کی روک تھام کے لئے یہ کرو کہ جتنے رومی تمہارے ہاں قید و بند میں ہیں انہیں رہا کر دو اور چند خوبصورت کنیزیں اور سونے چاندی کے ظروف اسے بطور تحفہ بھجوا دو اور صلح کا پیغام دو وہ ان چیزوں کو رد نہیں کرے گا اور صلح پر آمادہ ہو جائے گا۔ البتہ علی ابن ابی طالب کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ ایک تجربہ کار جرنیل اور جس منصب پر فائز ہیں اس کے اہل ہیں اور تمہارا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی

نہیں ہے۔ معاویہ نے کہا کہ مجھے ان کے فضل و شرف سے انکار نہیں مگر انہوں نے فتنہ و شر کو ہوا دی جماعت میں تفرقہ ڈالا اور قاتلان عثمان کی ہمت افزائی کی ہے۔ لہٰذا ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان سے قصاص کا مطالبہ کریں اور اسی قصاص طلبی کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ تم نے مجھے اس غرض سے بلوایا ہے کہ میں لوگوں کو بہلا پھسلا کر تمہارے پرچم کے نیچے جمع کروں اور تم نے مجھ ہی کو جل فریب دینا شروع کر دیا ہے۔ اس بات پر کون یقین کرے گا کہ تم قصاص عثمان کے لئے جنگ لڑنا چاہتے ہو جب کہ دنیا جانتی ہے کہ عثمان نے محاصرہ کے دنوں میں مدد مانگی تو تم نے عمداً پہلو تہی کی اور موت کو ان کے سر پر منڈلاتے دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی اور میں بھی انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر فلسطین چلا آیا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ تعاون کروں تو مجھ سے لاگ لپیٹ کی باتیں نہ کرو میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ صاف بات یہ ہے کہ علی کے اسلامی خدمات علمی بلندی اور ہجرت و سبقت کے شرف کو دیکھتے ہوئے مجھے ان سے لڑنے کا حوصلہ نہیں ہوتا یہ کسی بڑے دل گردے والے ہی کا کام ہے۔ معاویہ سمجھ گئے کہ یہ ایک رسمی عذر خواہی ہے اگر وہ علی سے لڑنے پر اپنے کو آمادہ نہ پاتا تھا تو اسے ضرورت ہی کیا تھی کہ میرے پیغام پر فوراً پہنچ جاتا۔ اس نے سفر اختیار کیا ہے تو حالات کا بنظر غائر جائزہ لے کر اور یہ سمجھ کر کہ علی کے خلاف معرکہ آرائی میں حصہ لینا ہوگا اور اب اس سے دبے الفاظ میں معذرت کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ معاملہ کی سنگینی و اہمیت کو واضح کر کے منہ مانگی قیمت مانگے اور اپنا مطالبہ منوائے چنانچہ یہی ہوا۔ عمرو نے کچھ پس و پیش کے بعد کہا:

ولکن مالی ان شایعتک علی امرک حتی تنال ما ترید۔ (اخبار الطوال۔ ص۱۵۸)	اگر میں تمہارے ساتھ اشتراک عمل کروں یہاں تک کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ تو میرا اس میں حصہ کیا ہو گا“

معاویہ تو جانتے ہی تھے کہ یہ سودا بازی کئے بغیر آمادہ تعاون نہیں ہو گا پوچھا کہ مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟ کہا:

اجعل لی مصر طعمة مادامت لک ولایة۔ (اخبار الطوال۔ ص۱۵۸)	جب تک تمہاری حکومت رہے مصر کی حکومت میرے نام واگزار کر دو“

معاویہ نے یہ مطالبہ سنا تو بہت سٹپٹائے۔ قیمت توقع سے کہیں زیادہ تھی نہ اقرار کرتے بنتی تھی اور نہ انکار۔ نظر بھر کر عمرو کی طرف دیکھا اور کہا کہ اگرچہ میں تم سے جھوٹا وعدہ کر سکتا ہوں مگر غلط بیانی کر کے تمہیں فریب دینا نہیں چاہتا۔ عمرو نے کہا کہ مجھے فریب دے کر بھی دیکھ لو میں تمہارے ہر داؤ پیچ کا توڑ

جانتا ہوں۔ معاویہ نے کہا تم ذرا مجھ سے قریب ہو جاؤ میں تمہارے کان میں ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ عمرو آگے بڑھا اور اپنا کان معاویہ کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ معاویہ نے شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہو کیسی رہی آگئے نا جھانسے میں۔ کہا کب اور کیسے؟ کہا کہ اسی جگہ اور اسی وقت تم ذرا سوچتے کہ اس مقام پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں ہے اور نہ اندر کی آواز باہر سنائی دی جاسکتی ہے پھر راز کی بات کہنے کے لئے تمہیں قریب کرنے اور تمہارے قریب ہونے کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں جب تم چوکنا ہونے کے باوجود فریب میں آسکتے ہو تو بعد میں بھی تمہیں بآسانی فریب دیا جاسکتا ہے۔ میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تم اپنے مطالبہ پر نظر ثانی کرو اور اگر تم اس پر مصر رہے تو لوگوں میں یہ چرچے ہوں گے کہ تم نے امارت مصر کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ لوگوں کی باتوں کو چھوڑئے اب ان حیلہ طرازیوں سے کام نہیں چلے گا اگر تمہیں یہ شرط منظور ہے تو میری تمام کوششیں تمہارے لئے وقف ہوں گی۔ ورنہ تم جانو اور تمہارا کام میں اس معاملہ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ یہ کہہ کر عمرو اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔

عتبہ ابن ابی سفیان کو معاویہ اور عمرو کی باہمی گفتگو کا علم ہوا تو اس نے معاویہ سے کہا:۔

اما ترضی ان تشتری عمرا بمصر۔ (اخبار الطوال ص۱۵۸)	کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مصر کے بدلے عمرو کو خرید لو؟

معاویہ نے کہا کہ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا آج رات اس پر غور کروں گا اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچ سکوں گا۔ چنانچہ اس نے وہ رات سوچ بچار میں گزاری اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ عمرو کی ہوشیاری و چالاکی سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس سے مصر کی حکومت کا وعدہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ عمرو کو بلا کر اس سے امارت مصر کا عہد و پیمان کیا اور رسمی طور پر ایک دستاویز تحریر کر کے دے دی۔ عمرو اس دستاویز کو لے کر خوش خوش اپنی منزل پر آیا اور اپنے ایک چچازاد بھائی سے اس دستاویز کا ذکر کیا اس نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم قریش کو کیا منہ دکھاؤ گے اور کیونکر اپنے قبیلہ میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکو گے جب کہ تم نے دین فروشی کر کے اپنی شخصیت و شہرت کو داغدار کر لیا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اگر میں علی کے ساتھ ہوتا تو میرے لئے گھر کی چار دیواری کافی تھی اور اب تو میں معاویہ کے ساتھ ہوں۔ گھر کی چار دیواری پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ کہا کہ معاویہ نے کھلے بندوں تمہارا دین خرید لیا ہے۔ اور تم دنیا کی خاطر اس کے پیچھے لگ گئے ہو۔ معاویہ کو اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے تاکہ دوسروں کو بہکانے نہ پائے۔ اس نے گرفتاری کا حکم سنا تو چپکے سے نکل کھڑا ہوا

اور جان سلامت لے کر امیرالمومنین کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کی زبانی عمرو و معاویہ کے معاہدہ کی خبر عام ہوئی اور اُن کے جنگی عزائم کھل کر سامنے آ گئے۔

اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمرو نے معاویہ کو یہ دور رس مشورہ دیا کہ ابھی خلافت کا ذکر نہ چھیڑا جائے بلکہ اہلِ شام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ عثمان کے قتل کی ذمہ داری علی پر عائد ہوتی ہے۔ انہی نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا اور جب وہ قتل کر دیئے گئے تو ان کے قاتلوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اور جب عوام کے ذہنوں میں یہ چیز اتر جائے تو ان کے تعاون سے جنگ چھیڑ دی جائے اور جنگ میں کامیابی کے بعد اقتدار کی راہ خود ہی ہموار ہو جائے گی۔ البتہ عوام کو ہمنوا بنانے کے لئے بااثر افراد کے تعاون کی ضرورت ہے اور اس وقت عبادہ ابن صامت انصاری شام میں موجود ہیں۔ جن کا اہلِ شام پر بہت اثر ہے پہلے انہیں ہمخیال بنانا چاہیئے اگر ہم انہیں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے تو شام کی ہر فرد ہمارے ساتھ اشتراک و تعاون کرے گی معاویہ نے اس تجویز کو سراہا اور ایک پیغامبر کے ذریعہ انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ جب عبادہ ا[illegible] کے ہاں آئے تو معاویہ اور عمرو ابن عاص دونوں پہلو بہ پہلو کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے عبادہ کو دیکھا تو دونوں تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ عبادہ آگے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ معاویہ نے انہیں ہموار کرنے کے لئے ان کی بڑی تعریف کی اور پھر حضرت عثمان کے محاسن و فضائل بیان کر کے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان کا خون رائیگاں نہ جائے لہٰذا قصاص کے سلسلہ میں آپ ہمارا ساتھ دیں۔ عبادہ نے کہا کہ تم لوگوں نے جو کچھ کہا ہے میں نے سن لیا ہے مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میں عام دستور کے خلاف تم دونوں کے درمیان کیوں بیٹھا ہوں کہا کہ آپ کے فضل و شرف کا یہی تقاضا تھا کہ آپ ہم دونوں کے درمیان بیٹھیں اور ہم آپ کے دائیں بائیں بیٹھیں۔ کہا کہ یہ وجہ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ کہ ہم غزوۂ تبوک میں رسول اللہ کی رکاب میں چل رہے تھے کہ انہوں نے تم دونوں کو ساتھ ساتھ چلتے اور باتیں کرتے دیکھا تو اس موقع پر فرمایا:۔

اذا رأیتموھما اجتمعا ففرقوا بینھما فانھما لا یجتمعان علیٰ خیر ابداً۔ (عقد الفرید۔ ج ۳ ص ۱۱۱)	جب ان دونوں کو یکجا بیٹھا دیکھو تو انہیں الگ الگ کر دو اس لئے کہ یہ کبھی بھلائی کے کام کے لئے جمع نہیں ہوں گے۔

لہٰذا میں تمہیں یکجا ہونے سے منع کرتا ہوں اور تم دونوں کے درمیان بیٹھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم دونوں میں کچھ فاصلہ حائل ہو جائے۔ باقی رہا تمہاری ہمنوائی کا مسئلہ تو میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔

اب معاویہ نے عمرو کے مشورہ سے شرجیل ابن سمط کندی کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے تحریر کیا کہ

"کوفہ سے جریر ابن عبداللہ بجلی بیعت کا مطالبہ لے کر آیا ہے یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ تم سے مشورہ کئے بغیر اس کا فیصلہ کر لیا جائے لہٰذا جلد از جلد میرے پاس پہنچو"۔ جب شرجیل کو یہ خط ملا تو اس نے چند نمایاں افراد سے مشورہ کیا کہ اسے جانا چاہیئے یا نہیں جانا چاہیئے۔ کچھ لوگوں نے جانے کا مشورہ دیا اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ فقیہہ شام عبدالرحمٰن ابن غنم ازدی نے کہا کہ ہم سن چکے ہیں کہ عثمان کے قتل میں علی کا ہاتھ ہے۔ اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو مہاجرین و انصار ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور یہ بیعت ہمارے لئے حجت ہے۔ اور اگر قتل عثمان میں وہ شریک نہیں ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم معاویہ کے ہاں جاؤ اور بے سوچے سمجھے ان کے ساتھ جاؤ۔ بہتر ہے کہ کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کے بجائے تم علی کے پاس جاؤ اور ان کی بیعت کرو اور انہیں اپنے قوم و قبیلہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلاؤ مگر اس نے یہ مشورہ قابل قبول نہ سمجھا اور معاویہ کے ہاں جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

معاویہ نے عمرو کے مشورہ سے ایک داؤ یہ کھیلا کہ شرجیل کے راستے میں مختلف جگہوں پر یزید ابن اسد، بسر ابن ارطاۃ، سفیان ابن عمر، مخارق ابن حارث، حمزہ ابن مالک، حابس ابن سعد اور چند رؤسائے یمن کو کھڑا کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ جب شرجیل ادھر سے گزرے تو اپنی ملاقات کو اتفاقیہ ظاہر کر کے اسے یہ تاثر دیں کہ عثمان کے قتل کی ذمہ داری علی کے علاوہ کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسے ہر منزل پر ان میں سے کوئی نہ کوئی آدمی ملتا اور باتوں باتوں میں اسے بتاتا کہ علی عثمان کے قتل میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ لوگ شرجیل کے نزدیک نہایت درجہ قابل اعتماد و وثوق تھے جو حمص سے لے کر دمشق تک برابر اس کے کان بھرتے چلے آئے جس کے بعد اسے علی کے قاتل عثمان ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ جب وہ حدود دمشق میں داخل ہوا تو معاویہ نے اکابر شام کو اس کی پیشوائی کے لئے کہا جنہوں نے آگے بڑھ کر اس کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور معاویہ کے حسب ہدایت اسے یہی تاثر دیا کہ قتل عثمان کی تمام تر ذمہ داری علی پر عاید ہوتی ہے۔ جب وہ استقبال کرنے والوں کے جھرمٹ میں معاویہ کے ہاں پہنچا تو معاویہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی گفتگو کے بعد کہا کہ علی مجھ سے بیعت کے طالب ہیں۔ مجھے ان کی بیعت سے انکار تو نہیں ہے مگر وہ عثمان کے قاتل ہیں۔ شرجیل نے کہا کہ پھر تمہاری کیا رائے ہے کہا کہ میری رائے وہی ہو سکتی ہے جو اہل شام کی رائے ہو۔ اگر وہ بیعت کے لئے کہیں گے تو بیعت کر لوں گا اور اگر بیعت سے روکیں گے تو رک جاؤں گا۔ اور تمہیں بلایا ہے تو اسی غرض سے بلایا ہے کہ تمہاری رائے دریافت کروں۔ کہا کہ مجھے تھوڑی سی مہلت دیجئے تاکہ میں یہاں گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لوں اور قاتلین عثمان کے سلسلہ میں مزید اطمینان کر لوں معاویہ نے کہا کہ یہ مناسب رائے ہے۔ چنانچہ

وہ نکل کھڑا ہوا۔ اور جس شخص سے بھی گفتگو کرتا وہ یہی کہتا کہ علی عثمان کے قاتل ہیں۔ اور اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کون کرتا جب کہ زبانوں پر جبر و استبداد کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا اور ہر طرف معاویہ کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ جن کا کام ہی یہ تھا کہ انہیں ایک ایک بات کی خبر دیتے رہیں۔ جب شرجیل ہر سمت سے یہی ایک آواز سنتا ہوا واپس آیا تو اس کے جذبات پوری طرح سے بھڑک چکے تھے۔ اس نے آتے ہی معاویہ سے تند و تیز لہجہ کہا:۔

ابی الناس الا ان ابن ابی طالب قتل عثمان واللہ لئن بایعتہ لنخرجنک من الشام (اخبار الطوال صہ ۱۵۹)	کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہے کہ ابن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا ہے اگر تم نے ان کی بیعت کی تو ہم تمہیں شام سے نکال باہر کریں گے۔

معاویہ نے جب دیکھا کہ شرجیل پر ان پر جادو چل گیا ہے اور اب اس کا یقین ڈانواں ڈول ہونے والا نہیں ہے تو اس کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہا کہ جب تمہاری یہ رائے ہے تو ہماری بھی یہی رائے ہے اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ عثمان بے گناہ مارے جائیں اور ہم ان کے قاتلوں کی بیعت کریں۔ ہمارا اولین فریضہ یہ ہے کہ ہم ان کے خون کا انتقام لیں۔ لیکن انتقام کے لئے ضروری ہے کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہو اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عوام کو یہ بتایا جائے کہ علی، عثمان کے قاتل ہیں تاکہ ان کے تعاون سے خلیفۂ مظلوم کے خون کا قصاص لیا جا سکے۔ اور یہ کام تم ہی انجام دے سکتے ہو۔ کیونکہ شام میں جتنا تمہیں اثر و نفوذ حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے ہر شخص تمہاری آواز پر لبیک کہے گا اور ایک دنیا سمٹ کر تمہارے گرد جمع ہو جائے گی۔ لہٰذا تم شام کے مختلف شہروں کا دورہ کرو۔ لوگوں کو بتاؤ کہ علی عثمان کے قاتل ہیں اور انہیں قصاص پر ابھارو۔ شرجیل کے جذبات مشتعل تو تھے ہی فوراً تیار ہو گیا اور معاویہ سے رخصت ہو کر عوام کو ہمنوا بنانے کے لئے چل دیا۔

جب اہل کوفہ کو یہ خبر ہوئی کہ معاویہ عوام کو غلط فہمی میں ڈال کر جنگ پر آمادہ کر رہے ہیں تو انہوں نے حضرت سے کہا کہ معاویہ کی جنگی تیاریوں کی تکمیل سے پہلے ہمیں شام پر حملہ کر دینا چاہیئے مگر حضرت نے فرمایا کہ جب تک جریر بیعت یا جنگ کا تصفیہ کر کے واپس نہیں آتا ہمیں حملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

جریر کو شام میں آئے چار ماہ گزر چکے تھے اور امیر المومنین اسے بار بار لکھ رہے تھے کہ تم دو ٹوک فیصلہ کر کے جلد واپس آؤ۔ مگر معاویہ اسے حیلے بہانوں سے روکے رہے تاکہ اس عرصہ میں اہل شام کو جنگ پر آمادہ کر سکیں اور اپنی قوت و طاقت کا صحیح اندازہ لگا لیں۔ چنانچہ جب اُسے شرجیل کی حمایت حاصل ہو گئی

اور حالات سازگار نظر آئے تو جریر کو بلا کر کہا:۔

الحق بصاحبك واعلمه انی و اهل الشام لا نجیبه الی البیعة۔	تم اپنے امیر کے پاس واپس جاؤ اور انہیں بتا دو کہ میں اور اہل شام ان کی بیعت نہیں کرینگے۔

(اخبار الطوال ص۱۶۰)

ادھر شرجیل نے شام میں گھوم پھر کر شہر شہر اور بستی بستی میں یہ اعلان کیا کہ علی نے عثمان کو قتل کیا ہے اور ان لوگوں کو جو قصاص کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ان کا مال و اثاثہ چھین لیا ہے ان کی زمینوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب ایک شام ہی کا علاقہ ان کی دستبرد سے بچا ہوا ہے اور یہیں کے لوگ متفق ہو کر خون ناحق کا انتقام لے سکتے ہیں۔ لہٰذا ایک دل اور ایک جان ہو کر اٹھو اور خلیفۂ مظلوم کے انتقام اور اپنی سرزمین کے حفظ کے لئے امیر شام کے پرچم کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ شرجیل شام میں با اثر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی آواز پر مختلف شہروں کے لوگ سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ البتہ اسی کے شہر کے کچھ لوگوں نے مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں اپنے گھروں اور مسجدوں سے مطلب ہے تم جانو اور تمہارا کام۔

اہل شام کے علاوہ بنی امیہ اور اُن کے ہمنوا بھی شام میں جمع ہو چکے تھے جن میں کے چند نمایاں افراد یہ تھے:۔ مغیرہ ابن شعبہ، عبداللہ ابن سعد، مروان ابن حکم، سعید ابن عاص، عبداللہ ابن عامر، ولید ابن عقبہ، عبیداللہ ابن عمر، سعید ابن عثمان، ابوہریرہ، ابو حذیفہ، ابو امامہ باہلی اور نعمان ابن بشیر۔ ان میں سب سے پہلے نعمان ابن بشیر آیا تھا اور اپنے ساتھ حضرت عثمان کا خون بھرا کرتہ اور ان کی زوجہ نائلہ بنت فرافصہ کی کٹی ہوئی انگلیاں بھی لایا تھا اور معاویہ نے اسی پیراہن اور کٹی ہوئی انگلیوں کو جامع دمشق کے منبر پر آویزاں کر کے لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا اور عثمان کی مظلومیت سے متاثر کیا تھا۔ اس جمیعت کے یکجا ہونے کے بعد جنگی سازوسامان کی تکمیل کی گئی اور یلغار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب امیرالمومنین کو سپاہ شام کے اس اقدام کا علم ہوا تو آپ نے اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے شام کی جانب لشکر کشی کا ارادہ کیا اور جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

ایھا الناس سیروا الی اعداء السنن والقران سیروا الی قتلة المهاجرین والانصار سیروا الی الجفاة الطغام الذین کان	اے لوگو قرآن و سنت کے دشمنوں کی طرف چل دو مہاجرین و انصار کے قاتلوں کی طرف نکل کھڑے ہو ان درشت خو اور کمینہ فطرت لوگوں کی طرف جنہوں نے ڈر کے مارے یا دل ناخواستہ اسلام قبول

اسلامهم تخوفا وکرها سیعذالی المولفة قلوبهم لیکفواعن المسلمین باسهم۔ (اخبارالطوال۔ ص۱۴۲)

کیا تھا اور جنہیں محض دلجوئی کے لئے مسلمانوں کی صف میں شامل کیا گیا تھا اٹھ کھڑے ہوتا کہ وہ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی سے باز آئیں۔"

قبیلۂ فزارہ کے ایک شخص اربد نامی نے یہ سنا تو اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمیں اپنے بھائی ہی کا خون بہانے کے لئے بصرہ لے گئے تھے اور ہم نے انہیں قتل کیا تھا اسی طرح اب شام پر چڑھائی کریں اور اپنے بھائیوں کے گلے پر خنجر چلائیں۔ خدا کی قسم ہم اس کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ مالک اشتر سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کا کارندہ ہے اور چاہتا ہے کہ اس طرح حضرت کے لشکر میں بددلی پیدا کر کے ان کی قوت و طاقت کو کمزور کرے۔ انہوں نے پکار کر کہا کہ اسے پکڑ لو مگر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا اور محلہ کناسہ تک پہنچا تھا کہ اُسے پکڑ لیا اور اس طرح اسے پیروں تلے روندا کہ اس نے وہیں پر دم توڑ دیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ قاتل کا پتا نہیں چل سکتا لہٰذا اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔ امیرالمومنین اس واقعہ سے کچھ متاثر تھے کہ مالک اشتر نے کہا یا امیرالمومنین آپ اس خائن و بدبخت کی بات سے بددل نہ ہوں ہم آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں عزم و ہمت سے لڑیں گے اور آپ کی نصرت سے منہ نہیں موڑیں گے۔ ہمیں یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں جو موت سے ڈرتا ہے وہ موت سے بچ کر نہیں رہتا اور جو زندگی و بقا چاہتا ہے وہ اپنی آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی استقامت و نصرت کا عہد و پیمان کیا۔

جب کوفہ کے جنگ آزما آپ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے تو آپ نے عقبہ ابن عمرو انصاری کو اپنا نائب مقرر کیا اور نخیلہ کو چھاؤنی قرار دے کر مالک ابن حبیب یربوعی کو کوفہ میں قیام کا حکم دیا تا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کو لشکر گاہ کی طرف بھیجتے رہیں اور خود کوفہ سے نکل کر نخیلہ میں لشکر سمیت پڑاؤ ڈالا اور مختلف صوبوں کے عمال کو تحریر کیا کہ وہ افواج عساکر اور سامان حرب و ضرب کے ساتھ فوراً پہنچیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس بصرہ سے مخنف ابن سلیم اصفہان سے سعید ابن وہب ہمدان سے ربیع ابن خثیم اسدی رے سے اور دوسرے عمال اپنے اپنے شہروں سے سواروں اور پیادوں کے ساتھ پہنچ گئے اور اس طرح بڑھتے بڑھتے لشکر کی تعداد چوراسی ہزار تک پہنچ گئی جن میں اصحاب بدریین اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ کی بھی ایک جمعیت تھی۔ حاکم نے تحریر کیا ہے :۔

شھد مع صفین ثمانون بدریًا وخمسون ومأتان ممن بایع

جنگ صفین میں حضرت علی کے ہمراہ اسّی بدر کے مجاہدین اور دو سو پچاس بیعت رضوان میں شریک

تحت الشجرۃ (مستدرک۔ ج ۲۔ ص ۴۴۳) ہونے والے صحابہ تھے۔"

وادیٔ نخیلہ فوجوں سے چھلک رہی تھی اور امیرالمومنین اس عظیم لشکر کی تنظیم و ترتیب میں مصروف تھے کہ ایک عامل کے ذریعہ سے یہ اطلاع پہنچی کہ شامی فوجوں نے عراقی سرحدوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ حضرت نے آٹھ ہزار کا ایک ہراول دستہ زیاد ابن نضر حارثی کی زیرِ سرکردگی اور چار ہزار کا ایک دستہ شریح ابن حارث کی زیرِ قیادت سرحدوں کی حفاظت اور فوجِ مخالف کی قوت و طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے روانہ کیا اور انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے یا دشمن ابتدا نہ کرے تم جنگ نہ کرنا۔

امیرالمومنین نے نظم و انضباط کے پیشِ نظر لشکر کو سات حصوں پر تقسیم کیا اور ہر حصہ پر ایک افسر مقرر کر دیا اور ہراول دستہ کی روانگی کے چوتھے دن ۵ شوال ۳۶ھ کو اس لشکرِ جرار کی قیادت کرتے نخیلہ سے روانہ ہو گئے۔ جب نہر فرات کو عبور کر کے حدودِ کوفہ سے باہر تشریف فرما ہوئے تو نمازِ ظہر کا اعلان کیا۔ اور فرمایا کہ جو لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرنے کے لئے آئے ہیں وہ پوری نماز پڑھیں اور جو ساتھ جانے کے ارادہ سے آئے ہیں وہ نماز قصر پڑھیں اور حضرت نے بھی نماز قصر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر آگے بڑھے اور کوفہ سے چھ میل کے فاصلہ پر دیر ابوموسیٰ میں پہنچ کر عصر کی نماز پڑھی اور یہاں سے روانہ ہو کر کوفہ و حلہ کے درمیان مقام برس میں مغرب کی نماز ادا کی اور رات وہیں گزاری اور نمازِ صبح کے بعد نہر قبین کو پار کر کے مقام بیجہ میں قیام فرمایا تاکہ لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہاں سے روانہ ہو کر سرزمین بابل پر قدم رکھا تو شہر کے کھنڈر دیکھ کر اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دو اور انہیں تیز چلاؤ تاکہ اس نامبارک سرزمین سے جلد نکل جائیں کیونکہ یہ شہر موردِ عتاب رہا ہے۔ اور کئی بار زمین میں دھنس چکا ہے۔ چنانچہ آپ نے باگیں ڈھیلی چھوڑ کر مہمیز لگائی اور دوسرے لوگوں نے بھی گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور نہر صراۃ کو کشتیوں کے پُل کے ذریعہ عبور کیا اور نہر کی دوسری سمت اُتر کر نمازِ عصر باجماعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر سوار ہوئے اور دیر کعب سے ہوتے ہوئے سرزمین کربلا پر وارد ہوئے۔ اس زمین کو دیکھ کر چہرے پر غم و حزن کے آثار نمایاں ہوئے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو حادثۂ فاجعہ کربلا کی خبر دی اور ان جگہوں کی نشاندہی کی جو سید الشہداء امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار کے خون سے رنگین ہونے والی تھیں۔ یہاں سے روانہ ہو کر ساباط میں منزل کی اور رات کو وہیں پر قیام فرمایا۔ اہلِ ساباط نے فوج کے لئے رسد اور چوپایوں کے لئے چارہ کی پیش کش کی۔ مگر حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تم لوگوں پر یہ بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ ساباط کے قریب دجلہ کے کنارے شہر مدائن تھا۔ مدائن کے لوگ ابھی تک حضرت کے لشکر میں شامل نہ ہوئے تھے آپ

نے حارث ابن عبداللہ اعور کو حکم دیا کہ وہ مدائن والوں سے کہیں کہ ان میں کے جوانمرد و جنگجو افراد نماز عصر میں شریک ہوں۔ جب وہ لوگ آئے تو فرمایا کہ مجھے تعجب ہے کہ تم ہمارے لشکر سے علیحدگی اختیار کئے ہو۔ حالانکہ دشمن کی فوجیں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے حکم کے منتظر تھے ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے۔ آپ نے عدی ابن حاتم اور اُن کے فرزند زید کو مامور فرمایا کہ وہ مدائن سے لشکر کی فراہمی کریں۔ عدی نے تین دن کے قیام میں آٹھ سو اور زید ابن عدی نے چار سو افراد جمع کئے اور انہیں لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ امیرالمومنین نے مدائن سے تین ہزار کا ایک لشکر معقل ابن قیس کی ماتحتی میں آگے روانہ کیا اور ان سے کہا کہ میں رقہ جا رہا ہوں تم موصل (جو اس وقت صرف قافلوں کی فرودگاہ تھا) اور نصیبین سے ہوتے ہوئے میرے پاس رقہ پہنچ جاؤ۔ امیرالمومنین مدائن سے روانہ ہو کر بہر سیر میں قیام فرما ہوئے۔ یہ جگہ شاہانِ عجم کی سیرگاہ تھی جہاں کبھی سایہ دار درختوں دلکش باغوں اور بلند و بالا عمارتوں کی بہتات تھی مگر دستبرد زمانہ سے باغات اجڑ چکے تھے اور عمارتوں کی جگہ خاک کے تودے باقی رہ گئے تھے۔ حریز ابن سہم نے ان کھنڈروں اور اُجڑے باغوں کو دیکھا تو ابن یعقوب تمیمی کا یہ شعر پڑھا:۔

جرت الریاح علی مکان دیارھم فکانما کانوا علیٰ میعاد

"جہاں ان کے گھر بار تھے وہاں پروائی ہوائیں چل رہی ہیں گویا وہ ایک معینہ مدت کے لئے آباد کئے گئے تھے۔"

حضرت نے یہ شعر سنا تو فرمایا کہ اس کے بجائے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھو:۔

کم ترکوا من جنات وعیون و زروع ومقام کریم و نعمۃ کانوا فیھا فاکھین و اورثناھا قوما اخرین فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین۔

"وہ لوگ کتنے باغات چشمے کھیت عمدہ مکان اور نعمتوں کا ساز و سامان جن میں خوش خوش گزر بسر کرتے تھے چھوڑ گئے۔ ایسا ہی ہے اور ہم نے ان تمام چیزوں کا دوسروں کو مالک بنا دیا ان لوگوں پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔"

بہر سیر سے روانہ ہو کر انبار میں منزل کی یہاں کے عجمی باشندوں نے خوش خوش حضرت کو لشکر کے ہمراہ دیکھا تو اچھلنے کودنے اور دوڑنے لگے۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں حکمرانوں کی تعظیم و تکریم کے اظہار کا یہی طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اس سے نہ تمہارے حکمرانوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بے نتیجہ مشقت کو ختم کرو۔ اس رسمی استقبال کے بعد انہوں نے

گھوڑے خچر اور چارہ کی پیش کش کی اور فوج کے کھانے کا انتظام کرنا چاہا مگر حضرت نے ان کے ہاں کا کھانا منظور نہ کیا۔ البتہ گھوڑوں اور خچروں کو اس شرط پر قبول کر لیا کہ انہیں خراج میں محسوب کر لیا جائے گا۔ انبار میں دو دن قیام کرنے کے بعد ہیت کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں سے چل کر اقطار میں قیام فرمایا اور پھر دریائے فرات عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہوئے۔ یہاں نمر ابن قاسط نے قبیلۂ بنی تغلب کے ساتھ پرجوش استقبال کیا۔ جب یہاں سے آگے بڑھے اور قرقیسا کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی جنہیں آپ نے نخیلہ سے بطور ہراول دستہ بھیجا تھا اپنے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا ہراول دستہ ہے جو آگے بڑھنے کے بجائے ہمارے عقب سے آرہا ہے۔ زیادہ اور شریح نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نخیلہ سے روانہ ہوئے تو دریائے فرات کے کنارے عانات پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ آپ دریا عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہو چکے ہیں ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اگر معاویہ کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی تو ہمارا مختصر سا فوجی دستہ اس کے لشکر گراں کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور دریا کے حائل ہونے کی وجہ سے آپ کی طرف سے بروقت کمک پہنچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ہم نے چاہا کہ عانات سے دریا عبور کر کے پار اتر جائیں مگر اہل عانات نے ہمیں دیکھ کر کشتیوں کا پل اتار دیا اور قلعہ بند ہو کر محفوظ و مطمئن ہو گئے۔ ہمیں مجبوراً پیچھے پلٹنا پڑا اور مقام ہیت سے دریا عبور کر کے ادھر نکل آئے ہیں۔ حضرت نے ان کے عذر کو صحیح سمجھا اور انہیں ساتھ لے کر آگے روانہ ہو گئے۔ جب شہر رقہ کے قریب پہنچے تو نہر بلیخ کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ معقل ابن قیس جنہیں امیرالمومنین نے تین ہزار کے لشکر کے ساتھ مدائن سے نصیبین کے راستے روانہ کیا تھا وہ بھی رقہ پہنچ گئے۔ رقہ دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر واقع تھا اور لشکر کو دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اترنا تھا مگر رقہ کی آبادی عثمانیوں پر مشتمل تھی اور سماک ابن مخرمہ اسدی جو اپنے قبیلہ کے آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں مقیم تھا اہل رقہ کی طرح اہل شام کا ہم مسلک تھا۔ یہ لوگ معاویہ کے ہاں جانے کے لئے کوفہ سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور ان سے ساز باز کر کے حضرت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دریا پر سے پل اتار دیا اور گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ امیرالمومنین نے ان کی اس حرکت کے باوجود ان سے الجھنا گوارا نہ کیا اور لشکر کو لے کر دریا کے کنارے کنارے آگے چل دیئے تاکہ مقام منبج پر پہنچ کر وہاں سے پل کے ذریعہ دریا پار کریں۔ مالک اشتر کو اسدیوں کی یہ معاندانہ روش نہایت ناگوار گزری۔ جب امیرالمومنین آگے نکل گئے تو انہوں نے اسدیوں کو للکارا اور انہیں ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ اگر تم کشتیوں کو جوڑ کر پل نہ باندھا تو میں پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔ اور تم میں سے کوئی بھی اپنی جان کو بچا کر نہ لے جا سکے گا۔ مالک

کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور وہ ڈرے سہمے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے اور کشتیوں کو جوڑ کر پل باندھنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت لشکر سمیت واپس پلٹے اور دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اُتر گئے۔

امیرالمومنین نے یہاں سے پھر زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی کو بطور ہراول شام کی جانب روانہ کیا تاکہ پیش آمدہ حالات سے حضرت کو آگاہ کرتے رہیں۔ جب یہ دونوں منزلیں طے کرتے ہوئے سور روم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ابوالاعور سلمی پچیس ہزار شامیوں کے ساتھ چھاؤنی ڈالے پڑا ہے ان دونوں نے فوراً حارث ابن جمہان کو ایک خط دے کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور انہیں اطلاع دی کہ ابوالاعور سور روم کے قریب ایک لشکر گراں کے ساتھ فروکش ہے۔ حضرت نے صورت حال پر مطلع ہونے کے بعد مالک اشتر کو تین ہزار کے لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا اور اُن سے فرمایا کہ تم وہاں پہنچ کر لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لینا اور جب تک دشمن پہل نہ کرے تم ابتدا نہ کرنا اور اُن پر حجت تمام کرنے سے پہلے ہاتھ نہ اٹھانا اور جنگ چھڑ جائے تو تم قلب لشکر میں اپنی جگہ بنانا اور میمنہ زیاد کے اور میسرہ شریح کے سپرد کرنا۔ اور دشمن سے اتنا قریب نہ ہونا کہ وہ سمجھے کہ تم جنگ چھیڑنا چاہتے ہو اور نہ اتنا دور رہنا کہ وہ خیال کرے کہ تم جنگ سے خائف و ترساں ہو اور میں بھی بقیہ لشکر کو لے کر تمہارے عقب میں آیا چاہتا ہوں۔

مالک فوراً روانہ ہو گئے اور زیاد اور شریح کے لشکر کو ساتھ ملا کر سپاہ شام سے کچھ فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اگرچہ دونوں لشکر آمنے سامنے تھے مگر مالک اور اُن کے ہمراہیوں نے امیرالمومنین کی ہدایت کو پیش نظر رکھا اور جنگجویانہ انداز اختیار نہ کیا۔ ابوالاعور نے بھی کچھ ایسا ہی تاثر دیا کہ وہ جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا۔ جب دن گزرا اور رات ہوئی تو مالک اور ان کا لشکر دشمن کی طرف سے مطمئن ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا ابھی ایک آدھ جھپکی لی ہوگی کہ ابوالاعور نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر شبخون مارا۔ مالک اور ان کے ہمراہی کھڑ بڑا کر اٹھے تلواروں کے قبضے پر ہاتھ ڈالا اور جوابی حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

دشمن کی طرف سے پہل تو ہو ہی چکی تھی۔ صبح ہوتے ہی مالک اشتر اور ہاشم ابن عتبہ مرقال سواروں اور پیادوں کو لے کر میدان میں نکل آئے۔ ادھر سے ابوالاعور بھی سوار اور پیادے لے کر مقابلہ پر آ گیا۔ جنگ چھڑ گئی اور سواروں نے سواروں پر اور پیادوں نے پیادوں پر حملہ کر دیا۔ کچھ دیر تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے آخر شامیوں کا مشہور شہسوار عبداللہ ابن منذر تنوخی اپنے چند سواروں سمیت مارا گیا اور ابوالاعور ہزیمت اٹھا کر پیچھے ہٹا اور ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ مالک نے چاہا کہ ابوالاعور سے دو دو ہاتھ کر لیں اور اسے اصول جنگ کی خلاف ورزی کا مزہ چکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان

سنان ابن مالک نخعی سے کہا کہ تم ابوالاعور کے پاس جاؤ اور اسے مقابلہ میں آنے کی دعوت دو۔ سنان نے کہا کہ اپنے مقابلہ کے لئے یا آپ کے مقابلہ کے لئے؟ مالک نے اُسے حیرت و استعجاب سے دیکھا اور کہا کہ اگر میں تمہیں اس کے مقابلہ کے لئے کہوں تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں، تو میں صفوں کو چیر کر اور تلواروں کے حصار کو توڑ کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور اُسے تہ تیغ کئے بغیر دم نہ لوں۔ مالک مسکرائے اور اس کی ہمت و جرأت کی تعریف کی اور کہا کہ تم اگرچہ عزت و شرف کے لحاظ سے کم نہیں ہو مگر ابھی نوجوان ہو اور وُہ کسی نوجوان کے مقابلہ میں آنا اپنی توہین سمجھے گا۔ تم میری طرف سے اسے مقابلہ کی دعوت دو۔ سنان اٹھ کھڑا ہوا اور شامیوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر کہا کہ میں پیغامبر ہوں مجھے امان دی جائے۔ شامیوں نے اسے امان دی اور وہ ابوالاعور کے پاس آیا اور مالک کا پیغام دیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہا پھر کہا کہ مالک وہی تو ہیں جنہوں نے عثمان کے گھر پر حملہ کیا اور اُن کے قتل میں شریک ہوئے۔ وہ فتنہ انگیز ہیں اور یہ تمام فتنے انہی کے جگائے ہوئے ہیں۔ سنان نے کہا کہ پھر اس کا جواب بھی سن لو کہا کہ میں تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ تمہارے لائے ہوئے پیغام کا کوئی جواب دوں گا۔ اس پر سنان نے کچھ کہنا چاہا تو شامی اس پر برس پڑے اور اسے وہاں سے باہر دھکیل دیا۔ مالک کی اس دعوت مبارزت سے ابوالاعور کے دل پر ایسا خوف بیٹھا کہ اسے ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو لشکر سمیت میدان چھوڑ کر چلا گیا اور مقام اقیع میں جہاں معاویہ اور اُن کا لشکر خیمہ زن تھا پہنچ گیا۔

معاویہ نے جب عراقی فوجوں کی آمد اور جھڑپوں کا حال سنا تو ابوالاعور اور سفیان ابن عمر سے کہا کہ تم دونوں آگے بڑھ کر جنگ کا کوئی میدان تلاش کرو اور مجھے فوراً اطلاع دو۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرات کی غربی سمت رقہ اور بالس کے درمیان مقام صفین کا انتخاب کیا اور جنگ کے لئے ایک مناسب جگہ منتخب کر کے پڑاؤ ڈال دیا۔ معاویہ بھی ان کے عقب میں لشکر کی کمان کرتے ہوئے پہنچ گئے اور آتے ہی ابوالاعور کو حکم دیا کہ:۔

ان یقف فی عشرۃ آلاف من	وہ دس ہزار شامیوں کو لے کر گھاٹ کے راستے پر
اھل الشام علی طریق الشریعۃ	کھڑا ہو جائے اور عراقیوں میں سے جو پانی لینے
فیمنع من اراد السلوك الی المأ	کے لئے آئے اسے روک دے؛
من اھل العراق۔ (اخبار الطوال)	

مالک اشتر بھی فوج کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور جب صفین میں پہنچے تو شامیوں کی

انبوہ در انبوہ فوجوں کو دیکھ کر ٹھٹکے اور ان سے تھوڑے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ دوسرے دن امیرالمومنین بھی افواج وعساکر کے ساتھ پہنچ گئے۔ آپ نے دیکھا کہ شامیوں نے ایک ہموار میدان میں پڑاؤ ڈال کر گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس پر کڑا پہرہ بٹھا دیا ہے اور عراقیوں میں سے کوئی پانی لینے کے لئے جاتا ہے تو اسے سختی سے روک دیا جاتا ہے۔ آپ نے اس پر الجھنے کے بجائے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ کوئی دوسرا گھاٹ تلاش کریں مگر تگ و دو کے باوجود آس پاس کوئی گھاٹ نظر نہ آیا۔ اگر تھا تو وہاں تک پہنچنا انتہائی دشوار تھا کیونکہ فرات کے کنارے کنارے دھسان اور دلدل تھی جس میں گھنی اور خاردار جھاڑیوں کا پھیلاؤ چھ سات میل تک چلا گیا تھا۔ جہاں ایک طرف زمین میں پیر دھنس جاتے تھے اور دوسری طرف جھاڑیوں کے اندر کوئی پگڈنڈی یا راستہ نہ تھا کہ اسے طے کر کے دوسرے گھاٹ تک پہنچا جا سکے جب پانی کے حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نظر نہ آیا تو حضرت نے صعصعہ ابن صوحان کے ہاتھ معاویہ کو پیغام بھیجا کہ ہم حجت تمام کرتے سے پہلے جنگ کرنا پسند نہیں کرتے تم سواروں اور پیادوں کو لے کر جنگ کیلئے نکل کھڑے ہوئے ہو اور گھاٹ پر قبضہ کر کے ہمیں پانی سے روک دیا ہے بہتر ہے کہ تم پانی پر سے پہرا اٹھا لو اور جو چیز ہم میں وجہ نزاع ہے اس پر بات چیت کرو اگر تم یہ چاہتے ہو کہ مصالحت کی گفتگو چھوڑ کر پانی پر جنگ کی جائے تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں مگر یاد رکھو کہ پھر جو غالب ہو گا وہی پانی پی سکے گا۔ معاویہ نے یہ پیغام سنا تو مشورہ لینے کے لئے اپنے مشیروں کو جمع کیا۔ ولید ابن عقبہ نے کہا:۔

امنعهم الماء كما منعوه امير المومنين عثمان اقتلهم عطشا قتلهم الله۔ (اخبار الطوال۔ ص۱۶۸)

ان پر پانی بند رہنے دو اور انہیں پیاسا مارو خدا انہیں مارے آخر انہوں نے امیرالمومنین عثمان کے ساتھ بھی تو یہی برتاؤ کیا تھا۔"

عبداللہ ابن ابی سرح نے کہا:۔

امنعهم الماء الى الليل فانهم ان لم يقدروا عليه رجعوا وكان رجوعهم هزيمة امنعهم الماء منعهم الله اياه يوم القيامة۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۴۵)

رات تک ان پر پانی بند رہنے دو، جب یہ پانی کے حاصل کرنے میں ناکام ہو جائیں گے تو واپس پلٹ جائیں گے اور یہ پلٹنا ان کی شکست و ہزیمت ہو گا ان پر پانی بند کر دو، خدا انہیں قیامت کے دن پیاسا رکھے۔"

اس پر صعصعہ ابن صوحان نے بگڑ کر کہا:۔

انما يمنعه الله الفجرة وشربة

خداوند عالم تو فاجروں اور شراب خواروں کو سیرابی

الخمر لعنك الله ولعن هذا الفاسق۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص۱۴۵)

سے محروم کرے گا تجھ پر خدا کی پھٹکار اور اس فاسق (ولید) پر بھی خدا کی لعنت۔"

عمرو ابن عاص نے کہا کہ اے معاویہ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ علی اور ان کے ہمراہی جب کہ ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں اور لچکتے ہوئے نیزے ہیں کبھی پیاسے نہیں رہیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ تم انہیں پانی سے نہ روکو اور خود سے پہرا اٹھالو ورنہ وہ تمہیں پہرا اٹھا لینے پر مجبور کر دیں گے۔ معاویہ نے کہا:۔

لا واللہ او یموتوا عطشا کما مات عثمان۔ (مروج الذہب ج ۲ ص۳)

خدا کی قسم انہیں پانی نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ پیاسے مرجائیں گے جس طرح عثمان پیاسے سدھارے تھے۔"

بندش آب کا فیصلہ اگرچہ اہل شام کے لئے بڑا خوش آئند تھا کیونکہ سیر و سراب فوج کی نسبت پیاسی فوج کو شکست دینا آسان ہوتا ہے مگر اخلاقی اعتبار سے یہ حرکت اتنی غیر انسانی اور وحشیانہ تھی کہ خود سپاہ شام کے چند آدمیوں نے اس کی برملا مذمت کی۔ چنانچہ لشکر شام میں سے ایک شخص معری ابن اقبل ہمدانی نے اس اقدام پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے معاویہ سے کہا کہ اے امیر ہم نے پیش قدمی کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اگر وہ ہم سے پہلے پہنچ جاتے اور دریا پر قابض ہو جاتے تو کبھی ہمیں پانی سے منع نہ کرتے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لشکر میں غلام مزدور سن رسیدہ ضعیف و کمزور اور بیگناہ افراد بھی ہیں ان پر پانی بند کرنا سراسر ظلم و زیادتی ہے لہذا اپنا فیصلہ واپس لیجیئے اور انہیں پانی لینے کی اجازت دیجیئے۔ معاویہ نے یہ الفاظ سنے تو اسے سختی سے جھڑکا اور عمرو ابن عاص نے بھی اسے سخت سست کہا۔ اس مرد ہمدانی نے ان کا یہ طرز عمل دیکھا تو رات کے اندھیرے میں نکل کھڑا ہوا اور حضرت کی فوج میں آکر شامل ہو گیا۔ اور اپنے جذبات کا اظہار ان اشعار میں کیا:۔

الا للہ درک یا بن ہند لقد ذہب الحیاء فلا حیاء

"اے ہند کے بیٹے تمہاری خوبیوں کا کیا کہنا جب شرم و حیا جاتی رہے تو پھر حیا کہاں۔"

اتحمون الفرات علی رجال وفی ایدیہم الاسل الظماء

"کیا ان جوانمردوں کو فرات سے روکنا چاہتے ہو جن کے ہاتھوں میں لچکتے ہوئے پیاسے نیزے ہیں۔"

وفی الاعناق اسیاف حداد کان القوم عندکم نساء

"اور ان کی گردنوں میں تیز دھار تلواریں لٹک رہی ہیں تم نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ مرد

نہیں عورتیں ہیں۔"

فترجوا ان یجاورکم علی　　بلا ماء و للاحزاب ماء

"کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ علی تمہارے قرب میں پیاسے رہیں گے اور دوسرے لوگ پانی پئیں گے۔"

فرات شامیوں کے قبضہ میں تھا اور عراقی دور سے فرات کی روانیوں کو دیکھ کر کلیجہ مسوس کر رہ جاتے تھے۔ اُدھر غرور و انانیت سے گردنیں اکڑی ہوئی اور سینے تنے ہوئے تھے اور ادھر جذبۂ امن پسندی جوشِ شجاعت کو روکے ہوئے تھا۔ آخر جب ایک شبانہ روز پانی نہ ملا تو سپاہِ عراق کے تیور بدلے اور دشمن کی اس کمینہ حرکت پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم کب تک شامیوں کو سیراب ہوتے دیکھیں گے اور خود پانی کے لئے تڑپتے رہیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ اب پانی کے لئے جنگ ناگزیر ہے لہٰذا اٹھو اور تلوار کے زور سے پانی حاصل کرو۔ جب حضرت کی طرف سے اجازت مل گئی تو مالک اشتر اور اشعث ابن قیس نے لشکر میں اعلان کیا کہ گھاٹ پر سے دشمن کو ہٹانے کے لئے تیار ہو جاؤ اس آواز پر بارہ ہزار سپاہی جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور کندھوں پر کمانیں تھیں آگے بڑھے۔ مالک اشتر نے علم جنگ حارث ابن ہمام نخعی کے سپرد کیا اور اشعث نے لوائے جنگ معاویہ ابن حارث کو دیا اور دونوں سپہ سالار اپنے اپنے دستوں کی قیادت کرتے اور گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے شامیوں کی صفوں کے قریب پہنچ گئے اور انہیں گھاٹ پر سے پہرا اٹھانے کے لئے کہا انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک گھاٹ نہیں چھوڑیں گے جب تک تمہارے خون سے اپنی تلواروں کی پیاس نہ بجھا لیں گے۔ ادھر بھی تھڑ دلے اور جنگ سے جی چرانے والے نہ تھے کہ اہلِ شام کی خون آشام تلواروں سے مرعوب ہو جاتے۔ مالک للکارتے ہوئے بے دھڑک آگے بڑھے۔ شامیوں نے ہتھیار سنبھالے نیزے تانے اور راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان میں کا ایک سوار صالح ابن فیروز مقابلہ کے لئے بڑھا مالک نے اس کے سینہ پر نیزہ مارا اور اسے وہیں پر ٹھنڈا کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے مالک ابن ادہم، ریاح ابن عتیک، ابراہیم ابن وضاح جمحی، زامل ابن عبید خزاعی، اجلح ابن منصور کندی اور محمد ابن روضہ جمحی مقابلہ کے لئے نکلے اور مالک نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان مقتولین کے بعد جب کسی اور کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی تو مالک اپنے ہمراہیوں کو لے کر دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور لشکر کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا ادھر سے بھی کمانیں کڑکیں اور تیر رہا ہوئے مگر دلیروں کے قدم نہ رُکے اور تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ جب شامیوں کے سروں پر تلواریں برسنے لگیں تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے اور پناہ لینے کے لئے ادھر اُدھر دوڑ پڑے۔ راستہ صاف ہو

گیا اور عراقیوں نے آگے بڑھ کر گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔

جب گھاٹ امیرالمومنین کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا تو معاویہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ ہو جو سلوک انہوں نے عراقیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ عمرو ابن عاص نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کیا علی تم پر اور تمہاری فوج پر پانی بند نہ کر دیں گے اور جس طرح انہوں نے لڑ کر فرات لے لیا ہے تم بھی اسی طرح لڑ کر لے سکو گے۔ معاویہ نے بگڑ کر کہا کہ یہ وقت ان طنز آمیز باتوں کا نہیں ہے تم سنجیدگی سے بتاؤ کہ کیا علی بھی ہم سے وہی سلوک کریں گے جو ہم نے کیا تھا یا ہمیں پانی لینے کی اجازت دیں گے۔ عمرو نے کہا:۔

ظنی انه لا یستحل منك ما استحللت منه لانه اتاك فی غیر امر الماء۔ (اخبار الطوال۔ ص۱۶۹)

میرا خیال غالب یہ ہے کہ جس چیز کو تم نے ان کے لئے روا رکھا تھا وہ تمہارے لئے اُسے روا نہیں رکھیں گے اس لئے کہ اُن کے آنے کا مقصد پانی نہیں ہے کچھ اور ہے۔"

عراقیوں کے دلوں میں معاویہ کی طرف سے غم و غصہ تو تھا ہی انہوں نے دریا پر قبضہ کرتے ہی کہہ دیا کہ ہم کسی شامی کو پانی لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اور جس طرح انہوں نے گھاٹ پر قبضہ کر کے ہمیں پانی سے روکا تھا اسی طرح ہم بھی انہیں پانی لینے سے روک دیں گے۔ امیرالمومنین کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو فرمایا کہ اگر اہل شام نے جاہلانہ قدم اٹھایا تھا تو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ دینی و اخلاقی قدروں کو کچل کر پانی بند کر دو اور اسی وقت معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ اگرچہ فرات پر ہمارا قبضہ ہے مگر تم اور تمہاری فوج جب چاہے اور جتنا چاہے پانی لے سکتی ہے ہماری طرف سے کوئی بندش نہیں ہے۔ اس عمومی اجازت کے بعد شامی بغیر روک ٹوک کے گھاٹ پر آتے خود سیراب ہوتے جانوروں کو سیراب کرتے اور حسب ضرورت پانی لے جاتے۔

امیرالمومنین کے لشکر نے دریا کے قریب پڑاؤ ڈال دیا اور دلجمعی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس اثناء میں ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جس پر تحریر تھا کہ میں تمہارا ہمدرد و خیرخواہ ہوں اور اس خیرخواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ معاویہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دریا کا بند توڑ کر پانی کا رخ تمہاری طرف موڑ دے تاکہ تم سب کو بہا لے جائے۔ یہ تیر کوفہ کے ایک شخص کے ہاتھ جا لگا اس نے یہ تحریر پڑھی تو تیر دوسرے کے حوالے کر دیا۔ دوسرے نے تیسرے کو دیا اور یونہی دست بدست گردش کرتا ہوا امیرالمومنین تک پہنچ گیا۔ حضرت فوراً سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کی سجھائی ہوئی چال ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ عراقی ڈر

کے مارے یہ جگہ خالی کر دیں اور شامی فوجیں اس مقام پر آجائیں۔ مگر عراقیوں میں کھلبلی مچ گئی لوگ پریشان وسراسیمہ ہوگئے اور اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ تمہیں اس جگہ سے ہٹانے کا پُرفریب حیلہ ہے تم اپنی جگہ نہ چھوڑو اور سکون واطمینان سے بیٹھے رہو۔ کچھ لوگ مطمئن ہوگئے اور کچھ لوگ چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ معاویہ کا عملہ بیلچے اور پھاوڑے لے کر پہنچ گیا ہے۔ اور انہوں نے بند کاٹنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ہم نے نقل مکانی میں تاخیر کی تو سب کے سب بہہ جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم اطمینان رکھو معاویہ کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ وہ دریا کا رُخ تمہاری طرف موڑدے۔ مگر فوج میں کم حوصلہ وہمت لوگ بھی تھے وہ پیچھے ہٹے تو ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی جگہ چھوڑ دی اور حضرت کے سمجھانے بجھانے کے باوجود میدان خالی کر کے پیچھے پلٹ آئے۔ معاویہ نے میدان خالی دیکھا تو شامیوں کو لے کر اس مقام پر آگئے۔ جب عراقیوں نے سپاہِ شام کو اس جگہ پر آتے دیکھا تو جنہوں نے معاویہ کے دھوکے کو نہ سمجھا تھا وہ بھی سمجھ گئے کہ یہ جگہ خالی کرانے کا ایک حیلہ تھا۔ اب انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے جگہ چھوڑ کر غلط قدم اٹھایا ہے اور وہی لوگ جو جگہ چھوڑنے پر اصرار کر رہے تھے۔ نادم وپشیمان ہو کر حضرت کے پاس آئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے جس بے تدبیری کا مظاہرہ کیا ہے اس کا تدارک کریں گے اور جس طرح بن پڑے گا شامیوں کو ہٹا کر اس جگہ کو واپس لیں گے۔ چنانچہ اشعث ابن قیس بنی کندہ کے پیادوں اور مالک اشتر سواروں کو لے کر شامیوں پر حملہ آور ہوئے اور انہیں بزورِ شمشیر خیمہ وخرگاہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا اور پھر واپس اپنے مقام پر آگئے۔

فرات کی مہم سر ہو چکی۔ اہلِ عراق کو دریا پر قبضہ کئے دو دن گزر گئے مگر ان دونوں میں نہ کوئی گفت و شنید ہوئی اور نہ نامہ و پیام کی نوبت آئی۔ عراقی اپنی فتح یابی پر خوش اور دشمن سے بھڑنے کے لئے بے چین تھے مگر امیرالمومنین کی خاموشی انہیں الجھن میں ڈالے ہوئے تھی اور وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کیا امیرالمومنین جنگ سے بچنا چاہتے ہیں یا ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں انہیں شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اس کی وجہ نہ جنگ سے جی چرانا ہے اور نہ اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ ہے۔ بلکہ اس ڈھیل دینے کا مقصد یہ ہے کہ شاید اس وقفہ میں کوئی ضلالت وگمراہی کی تاریکی سے نکل کر رشد و ہدایت کی روشنی میں آجائے۔ یا کم از کم ہماری طرف سے ان پر حجت تمام ہو جائے۔ آخر اس توقف کے بعد یکم ذی الحجہ ۳۶ھ کو اتمام حجت کے لئے بشیر ابن عمرو انصاری، سعید ابن قیس ہمدانی اور شبث ابن ربعی تمیمی کو بلا کر کہا کہ تم معاویہ کے پاس جاؤ اور اسے سمجھاؤ کہ وہ اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ نہ کرے افتراق وانتشار سے باز آئے اور میری خلافت کو تسلیم کر کے بیعت کرے۔ بشیر ابن عمرو نے کہا کہ ہمیں توقع

نہیں ہے کہ وہ ہماری بات پر کان دھرے اور بیعت پر آمادہ ہو جائے۔ فرمایا کہ تم جاؤ اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور معاویہ کے ہاں پہنچے۔ بشیر ابن عمرو نے گفتگو کا آغاز کیا اور معاویہ سے مخاطب ہو کر کہا "اے فرزند ابوسفیان اس دنیا نے ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ اور تمہارا بھی ہمیشہ ساتھ نہیں دے گی۔ تمہیں ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں تمہارے اعمال کا محاسبہ ہو گا اور پھر جیسے اچھے بُرے اعمال ہوں گے ویسا بدلہ ملے گا۔ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم فتنہ و شر سے باز آؤ اور اپنے منفی طرز عمل سے امت میں تفرقہ پیدا نہ کرو" معاویہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ تم یہ نصیحت علی کو کیوں نہیں کرتے۔ بشیر نے کہا کہ وہ کہاں اور تم کہاں۔ وہ سابق الاسلام پیغمبر کے قریبی عزیز اور عظمت و فضیلت کے تاجدار ہیں نہ اُن کا کوئی ہم پایہ ہے اور نہ ان سے زیادہ کوئی خلافت کا اہل ہے۔ معاویہ نے کہا کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ کہا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم حق کو پہچانو اس کا ساتھ دو اور اُس سے منہ نہ موڑو اس طرح تم دنیا میں بھی سرخرو ہو گے اور آخرت میں بھی۔ معاویہ نے کہا:-

و نترك دم ابن عفان لا واللہ لا افعل ذلك ابدا۔	کیا ہم فرزند عفان کے قصاص سے دستبردار ہو جائیں۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو گا"

(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۴۶)

پھر شبث ابن ربعی نے معاویہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے معاویہ ہم سے تمہارا اصل مقصد پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس لوگوں کو بہکانے اور ان کے جذبات کو بھڑکانے کا لے دے کر یہی تو ایک حربہ ہے کہ تم ان سے یہ کہو کہ اے لوگو! تمہارا امام مظلوم مارا گیا ہے اور میں اُن کے خون کا قصاص لینا چاہتا ہوں تم نے اس آواز پر چند جاہل اور خود سر لوگ اپنے گرد جمع کر لئے ہیں حالانکہ تم وہی ہو جس نے عثمان کی نصرت سے عمداً پہلو تہی کی اور یہ چاہا کہ وہ قتل کر دیئے جائیں تاکہ ان کے قصاص کے نام پر جنگ چھیڑ کر اقتدار کی راہ ہموار کرو۔ یاد رکھو کہ دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جو کسی چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں مگر اللہ ان کی خواہشوں میں انہیں کامیاب نہیں ہونے دیتا اور کچھ لوگ وہ ہیں جو اپنی توقع سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے کامیابی و ناکامی دونوں صورتوں میں فلاح و بہبود نہیں ہے۔ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو عرب میں تم سے زیادہ کوئی بدبخت و پراگندہ حال نہ ہو گا اور اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی روسیاہی اور جہنم کے سوا کیا رکھا ہے۔ اے معاویہ اللہ سے ڈرو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑو و تمرد و سرکشی سے باز آؤ جو خلافت کا صحیح حقدار ہے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرو۔ معاویہ شبث کی بے باکانہ گفتگو سے بوکھلا اٹھے اور کسی بات کی تردید کرنے کے

بجائے تلخ کلامی پر اتر آئے اور پُر غضب لہجہ میں کہا:۔

انصرفوا من عندی فلیس بینی وبینکم الا السیف۔	تم میرے پاس سے چلے جاؤ اب ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳ صفحہ ۱۴۶)

اس پر سعید ابن قیس ہمدانی نے کہا:۔

اتھول بالسیف اقسم باللہ لنعجلنھا الیک۔ (تاریخ کامل ج ۳ صفحہ ۱۴۶)	کیا ہمیں تلواروں سے ڈراتے ہو خدا کی قسم ہم جلد ہی تلواریں لے کر تمہاری طرف بڑھیں گے۔

اس وفد کی واپسی کے بعد چند قرار و حفاظ معاویہ کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ تم چاہتے کیا ہو اور یہ لاؤ لشکر کیوں جمع کیا ہے؟ کہا کہ میرا مقصد قصاص خون عثمان ہے۔ کہا یہ قصاص کس سے لینا چاہتے ہو؟ کہا علی سے۔ کہا کیا علی نے انہیں قتل کیا ہے؟ کہا ہاں وہی تو قاتل ہیں۔ ان لوگوں نے پلٹ کر حضرت سے کہا کہ معاویہ آپ پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ آپ نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ فرمایا یہ سراسر افتراء و بہتان ہے۔ میں ہرگز قاتل نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے معاویہ سے یہ جواب نقل کیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ہاتھ سے تو قتل نہیں کیا بلکہ دوسروں کو اُن کے قتل پر اُبھارا ہے۔ ان لوگوں نے حضرت سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بھی غلط ہے۔ انہوں نے معاویہ سے حضرت کا یہ جواب نقل کیا۔ معاویہ نے کہا کہ اگر علی سچ کہتے ہیں تو اُن کے قاتل ہمارے حوالے کریں جو ان کے لشکر میں موجود اور اُن کے قوت بازو بنے ہوئے ہیں ان لوگوں نے پلٹ کر حضرت سے اس کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے انہیں قتل کیا ہے وہ قرآن سے اُن کے قتل کے جواز پر دلیل لاتے ہیں اور جو قتل تاویلاً ہو اس کا قصاص نہیں ہے۔ جب معاویہ سے اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو علی کو یہ حق کہاں سے پہنچا ہے کہ وہ ہمارے مشورہ کے بغیر مسند خلافت پر بیٹھ جائیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مہاجرین و انصار جو اہل حل وعقد ہیں ان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے اور دوسرے مسلمان انہی کے فیصلہ کے پابند ہیں۔ معاویہ نے کہا کہ جو مہاجرین و انصار ہمارے ہاں ہیں انہوں نے نہ بیعت کی ہے اور نہ اس پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ غرض وہ اس طرح کے حیلے حوالوں سے کام لیتے رہے اور بیعت سے کنارہ کشی کی کوئی معقول توجیہہ نہ کر سکے وہ سمجھتے تھے کہ اگر بیعت کر لیں گے تو پھر حضرت پر خون عثمان میں شرکت یا قاتلین کی اعانت کا الزام عائد نہ کر سکیں گے۔ اور ان کے پاس لے دے کر یہی ایک حربہ تھا جس سے جنگ کا جواز ثابت کر سکتے تھے۔

اس سلسلہ میں ابو امامہ باہلی اور ابو الدرداء نے بھی معاویہ سے بات چیت کی اور ان سے کہا کہ تم

کیوں علی سے برسرپیکار ہو جب کہ وہ تم سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ کہا کہ میں خون عثمان کے قصاص کے لئے لڑ رہا ہوں۔ ان دونوں نے کہا کہ کیا علی ان کے قاتل ہیں؟ کہا انہوں نے خود تو قتل نہیں کیا لیکن ان کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں تو میں سب سے پہلے ان کی بیعت کروں گا۔ یہ بات ان کے دل کو لگی اور وہ اٹھ کر امیرالمومنین کے پاس آئے اور معاویہ کی بات دہرائی حضرت سمجھ گئے کہ وہ ایک ناممکن چیز کا مطالبہ کر کے انہیں فریب دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے جال میں پھنسے رہیں آپ ان دونوں کو لے کر اپنے لشکر کی صفوں کے پاس آئے اور پوچھا کہ تم میں کون کون قاتل عثمان ہے لشکر میں سے بیس ہزار افراد نے باآواز بلند کہا:۔

نحن جمیعًا قتلنا عثمان۔ ہم سب نے عثمان کو قتل کیا ہے۔

(اخبار الطوال۔ صفحہ ۱۷۱)

ابوالامامہ اور ابوالدرداء نے سوچا کہ ایک فرد کے خون کے بدلے بیس ہزار افراد کا خون تو مباح ہو نہیں سکتا اور نہ ان لوگوں کو معاویہ کے حوالے کرنے کا کوئی جواز ہے وہ معاویہ کے ہاں جانے کے بجائے بعض ساحلی مقامات کی طرف چلے گئے اور فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا۔

امیرالمومنین کی برابر یہ کوشش رہی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور معاملہ افہام و تفہیم اور گفت و شنید سے طے ہو جائے مگر معاویہ سمجھتے تھے کہ صلح کا آخری نتیجہ بیعت اور اطاعت و فرمانبرداری ہے اور یہ ان کے لئے سراسر ہزیمت و شکست تھی اس لئے وہ مصالحت کی ہر گفتگو سے پہلو بچالے جاتے اور امیرالمومنین کی صلح پسندانہ روش کو جنگ سے گریز پر محمول کر کے دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ان اشتعال انگیزیوں کے نتیجہ میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور ابتدائی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اس طرح کہ دونوں طرف سے جنگ آزما میدان میں اتر کر حریف کو للکارتے کچھ دیر جنگ کے شعلے بھڑکاتے اور اپنی صفوں میں واپس چلے جاتے۔ شامیوں کی طرف سے عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید، ابوالاعور، حبیب ابن مسلمہ فہری، ابن ذی الکلاع حمیری، عبیداللہ ابن عمر، شرجیل ابن سمط کندی اور حمزہ ابن مالک باری باری فوجی دستوں کو لے کر میدان میں آتے۔ اور عراقیوں کی طرف سے مالک اشتر، حجر ابن عدی، شبث ابن ربعی، خالد ابن معمر، زیاد ابن نضر حارثی، زیاد ابن خصفہ تیمی، سعید ابن قیس ہمدانی، معقل ابن قیس ریاحی اور قیس ابن سعد انصاری اپنی اپنی نوبت پر مقابلہ کے لئے نکلتے اور دشمن کو نیزوں اور تلواروں کی زد پہ رکھ کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے۔ یوں تو یہ سب کے سب مانے ہوئے جنگجو اور نبرد آزما تھے مگر مالک اشتر سے اچھے اچھے شہزور پناہ مانگتے تھے اور انہیں میدان میں دیکھ کر ان کے چہروں کا رنگ اڑ جایا کرتا تھا۔

چنانچہ انہی جنگ کے ابتدائی ایام میں سہم ابن ابی العیزار فوج مخالف سے باہر نکل کر مبارز طلب ہوا۔ یہ سپاہ شام کا مانا ہوا شور ما غیر معمولی قد و قامت اور بڑے ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اس کوہ پیکر کو دیکھ کر بڑے بڑے ساونت پہلو کترا کر نکل جاتے تھے۔ مالک اشتر نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ کیا اور صفوں سے نکل کر آگے بڑھے لوگوں نے انہیں روکا کہ آپ نہ جائیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی جسامت اور قد و قامت کی وجہ سے آپ پر چھا جائے۔ مالک نے سنی ان سنی کر دی اور بے خوف و خطر آگے بڑھ کر اُسے للکارا۔ اسے اپنی قوت و طاقت پر گھمنڈ تو تھا ہی فوراً گھوڑا کدا کر سامنے آیا اور تلوار لے کر مالک پر جھپٹا مالک نے اس کا وار خالی دے کر ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ سنبھل نہ سکا زخمی ہو کر زمین پر گرا اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ سپاہ شام میں سے ایک ازدی نے اسے گرتے دیکھا تو کہا کہ میں اس کے بدلے میں مالک کو قتل کروں گا۔ چنانچہ اس نے مالک کو مقابلہ کی دعوت دی۔ مالک نے اس پر تلوار کا وار کیا جس سے وہ بے بس ہو کر گھوڑے کے سموں میں گرا مالک نے چاہا کہ دوسرا وار کر کے اُسے ختم کریں کہ شامی ہجوم کر کے آگے بڑھے اور اسے چھڑا لے گئے۔ غرض ذی الحجہ کا مہینہ انہی جھڑپوں میں گزرا ہر روز ایک یا دو جھڑپیں ہو جاتیں اور فیصلہ کن جنگ کی نوبت نہ آ سکی۔

جب محرم ۳۷ھ کا آغاز ہوا تو اس مہینہ کی حرمت کی وجہ سے جنگ روک دی گئی۔ امیرالمومنین نے اس وقتی التوائے جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر سمجھوتے کی کوشش کی اور نامہ و پیام اور سفارتوں کا سلسلہ شروع کیا اور عدی ابن حاتم، یزید ابن قیس اور شبث ابن ربعی اور زیاد ابن حصفہ کو معاویہ کے پاس بھیجا تاکہ انہیں سمجھائیں بجھائیں۔ چنانچہ یہ لوگ معاویہ کے پاس آئے عدی ابن حاتم نے گفتگو شروع کی اور معاویہ سے کہا کہ ہم تمہارے پاس مصالحت کا پیغام لے کر آئے ہیں اگر تم ہماری آواز پر لبیک کہو تو یہ جنگ و خونریزی بند ہو سکتی ہے افتراق ختم کیا جا سکتا ہے اور امن بحال ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ حضرت علی کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی زمام قیادت ہے سبقت و فضیلت اور اسلامی خدمات میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے علاوہ تمام اسلامی ممالک ان کی خلافت تسلیم کر چکے ہیں۔ تم ہٹ دھرمی سے باز آؤ اور اس معاندانہ طرز عمل کو چھوڑ دو ورنہ تم بھی ان مصائب و آلام کا شکار ہو سکتے ہو جن کا سامنا اصحاب جمل کو کرنا پڑا تھا۔ معاویہ نے کہا کہ تم مجھے ڈرانا دھمکانا اور مرعوب کرنا چاہتے ہو میں حرب کا بیٹا ہوں ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم تم عثمان کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے والے اور ان کے قاتلوں کے زمرہ میں شامل ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی پاداش میں تم قتل کئے جاؤ گے۔ اس پر شبث ابن ربعی اور زیاد ابن خصفہ نے کہا کہ ان باتوں کو چھوڑو ان سے نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ہمیں۔ وہ بات کہو جو دونوں فریق کے لئے فائدہ رساں ہو اور ہم ایک دوسرے سے دور

ہونے کے بجائے قریب ہو سکیں۔ یزید ابن قیس نے کہا کہ ہم پیغامبر ہیں۔ ہمارا کام پیغام پہنچانا تھا وُہ ہم نے پہنچا دیا ہے۔ اب تم جو کہو گے وہ ہم امیرالمومنین تک پہنچا دیں گے۔ البتہ تم پر ہم اتمام حجت کریں گے۔ اور تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دیں گے۔ جس سے امت مسلمہ میں تفرقہ کے بجائے یک جہتی و ہم آہنگی پیدا ہو۔ رہا علی کا فضل و شرف تو وہ نہ تم سے مخفی ہے اور نہ مسلمانوں سے۔ اور تمہاری اور ان کی برابری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور ان کے خلاف جنگی اقدامات سے باز آؤ۔ خدا کی قسم ہم نے زہد و تقوٰے اور اوصاف و کمالات میں ان سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ معاویہ نے کہا کہ تم لوگوں نے مجھے جماعت سے وابستگی کی دعوت دی ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جسے تم جماعت کہتے ہو وہ میرے ساتھ ہے۔ میں جماعت سے اور جماعت مجھ سے وابستہ ہے۔ رہی تمہارے امیر کی اطاعت تو یہ مجھے منظور نہیں ہے اس لئے کہ انہوں نے عثمان کو قتل کیا۔ جماعت میں تفرقہ ڈالا اور اُن کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اگر میں یہ تسلیم بھی کر لوں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے عثمان کو قتل نہیں کیا لیکن اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قاتلین عثمان اُن کے لشکر میں ہیں۔ وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں تا کہ ہم انہیں قصاصاً قتل کریں پھر ہم اطاعت بھی کریں گے اور جنگ سے دستبردار بھی ہو جائیں گے۔ شبث ابن ربعی نے کہا کہ اے معاویہ اگر عمار ابن یاسر کو تمہارے حوالے کر دیا جائے تو کیا تم گوارا کر دگے کہ انہیں قتل کر دو؟ کہا کہ میرے لئے مانع ہی کیا ہے۔ خدا کی قسم عثمان تو عثمان میں اُن کے آزاد کردہ غلام ناتل کے عوض بھی انہیں قتل کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ شبث نے کہا زمین و آسمان کے مالک کی قسم تم بہت اونچی اڑان اڑنے لگے ہو اور ان بلندیوں کو چھونے کی کوشش کر رہے ہو جو تمہاری پہنچ سے بالا تر ہیں۔ تم عمار پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکتے جب تک میدان لاشوں سے پٹ نہ جائے اور سروں کے انبار نہ لگ جائیں۔ آخر جب گفتگو کسی نتیجہ پر پہنچتی نظر نہ آئی تو یہ چاروں مایوس ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابھی آدھا راستہ طے کرنے پائے ہوں گے کہ معاویہ نے ایک شخص کو بھیج کر زیاد ابن خصفہ کو بلایا اور اُن سے کہا کہ میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے بلوایا ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ علی نے عثمان کو قتل کرایا ہے اور ان کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر تم میری بات مانو تو قصاص کے سلسلہ میں میرا ہاتھ بٹاؤ اور اپنے قبیلہ سمیت میرا ساتھ دو۔ میں اللہ کو گواہ کر کے تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے کامیابی حاصل ہوئی تو میں کوفہ و بصرہ میں سے جس جگہ کی حکومت تم چاہو گے تمہیں دوں گا۔ جب معاویہ اپنی بات ختم کر چکے اور پُر امید نظریں زیاد کی طرف اٹھائیں تو زیاد نے کہا:۔

انی علی بینة من ربی وما انعم   میں اپنے پروردگار کی جانب سے اپنے موقف

اللہ علی فلن اکون ظہیر للمجرمین
(تاریخ کامل ج ۳۔ صفحہ ۱۴۸)

کی صداقت پر دلیل و برہان رکھتا ہوں۔ اور یہ مجھ پر اللہ کا انعام و احسان ہے میں کبھی مجرموں کا پشت پناہ بننا گوارا نہیں کر سکتا۔"

معاویہ نے یہ جواب سنا تو سر نیچے ڈال دیا اور عمرو ابن عاص سے کہا کہ خدا ان لوگوں کو غارت کرے ان سب کے دلوں کی دھڑکن اور لبوں کی جنبش یکساں ہے۔

ان سفارتوں کے جانے اور ناکام پلٹنے سے یہ تاثر لیا جا سکتا تھا کہ حضرت تو بات چیت کے ذریعہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں مگر معاویہ گفتگو کے بجائے جنگ کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں لہذا معاویہ نے اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے ان سفارتوں کے جواب میں حبیب ابن مسلمہ فہری، شرجیل ابن سمط کندی اور معن ابن یزید اسلمی کو حضرت کے پاس گفتگو کے لئے بھیجا۔ جب یہ تینوں حضرت کے ہاں آئے تو حبیب ابن مسلمہ نے کہا کہ اے علی حضرت عثمان خلیفہ راشد متقی و پرہیز گار اور قرآنی تعلیمات کے پابند تھے مگر تم لوگوں کو ان کا جینا گوارا نہ ہوا اور ہجوم کر کے انہیں بے جرم و خطا قتل کر ڈالا۔ ان کے قاتل ہمارے حوالے کیجئے تاکہ ہم انہیں قصاص میں قتل کریں۔ اور خلافت کو شوریٰ کے سپرد کر کے علیحدہ ہو جایئے تاکہ ہم اتفاق رائے سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں۔ حضرت نے اس کا یہ طرزِ تخاطب دیکھا تو فرمایا:۔

وما انت لا ام لك والعزل وهذا الامر فانك لست هناك ولا باهل
(تاریخ طبری ج ۴ ص ۳)

تو خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کرنے والا کون ہوتا ہے جب کہ تو اس معاملہ میں دخل دینے کا اہل ہی نہیں ہے۔"

حبیب پیچ و تاب کھاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ جب میرا اور تمہارا سامنا ہو گا تو پھر دیکھ لیجئے گا کہ میں کس طرح پیش آتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ تو سواروں اور پیادوں کے لشکر جرار کو لے کر بھی مجھ پر ٹوٹ پڑے تو میں تیری حقیقت کچھ نہیں سمجھتا جا جو بن پڑے کر۔ شرجیل نے کہا کہ میں بھی وہی کہنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھی نے کہا ہے اور کیا مجھے بھی وہی جواب دیا جائے گا جو اُسے دیا گیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں نے اُسے جو جواب دیا ہے وُہ اسی کا اہل تھا البتہ تمہیں دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے اس کے بعد حضرت نے رسول کی بعثت اور پہلے اور دوسرے دَور کا ذکر کیا پھر فرمایا کہ جب عثمان خلیفہ ہوئے تو اُن سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جنہیں لوگوں نے بُرا سمجھا اُن پر نکتہ چینی کی اور انہیں سمجھایا بجھایا۔ اور جب کہنے سننے کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے گرد گھیرا ڈالا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر لوگ جمع ہو کر میرے پاس آئے اور مجھ سے بیعت کے طالب ہوئے میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ انکار کر دوں۔ چنانچہ

میں نے واضح الفاظ میں انکار کر دیا مگر انہوں نے اصرار کیا اور اصرار کی حد کر دی اور کہنے لگے کہ لوگ آپ کے علاوہ کسی کی بیعت پر رضا مند نہیں ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے بیعت کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا تو لوگوں میں پھوٹ پڑ جائے گی امن عامہ تباہ ہو جائے گا۔ اور اسلام کو خطرناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان حالات میں مجھے بیعت کے لئے مجبور ہونا پڑا اور جب بیعت ہو چکی تو دو شخص (طلحہ و زبیر) تمرد و سرکشی پر اُتر آئے حالانکہ وہ دونوں بخوشی میری بیعت کر چکے تھے۔ پھر معاویہ نے علم بغاوت بلند کیا حالانکہ اسے نہ دین میں کوئی سبقت اور نہ اسلام میں کوئی درجہ حاصل ہے۔ وہ آزاد کردہ اور آزاد کردہ کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ اور وہ خود ہمیشہ اللہ اور اس کے رسُول کے دشمن رہے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تو مجبوری کی صورت میں۔ مجھے تعجب ہے کہ تم نے اہلبیت رسول سے روگردانی اختیار کر لی ہے اور معاویہ کے دامن سے وابستہ ہو کر اس کے اشاروں پر چلنے لگے ہو حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم آل نبی کا ساتھ دیتے اور کسی کو ان کے مقابلہ میں نہ لاتے۔ میں تمہیں اللہ کی کتاب اور رسُول کی سنت کو زندہ کرنے دین کے آثار کو باقی رکھنے اور باطل کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ شرجیل نے اس آوازِ حق کو سُنا مگر اس سے کوئی اثر نہ لیا اور کہنے لگا کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے ہیں فرمایا کہ میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم تھے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم تھے۔ اس پر شرجیل اور معن ابن یزید بھڑک اٹھے اور کہا کہ جو یہ عقیدہ نہ رکھے کہ عثمان مظلوم مارے گئے تھے۔ ہم اس سے بیزار ہیں اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور واپس چلے گئے۔ حضرت کو ان لوگوں کے متاثر ہونے کی پہلے ہی سے کوئی توقع نہ تھی تاہم ان پر حجت تمام کر دی اور جب انہیں جاتے دیکھا تو یہ آیت پڑھی:-

انک لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین وما انت بھادی العمی عن ضلالتھم ان تسمع الا من یؤمن بآیاتنا فھم مسلمون	تم نہ مردوں کو اپنی بات سنا سکتے ہو اور نہ بہروں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے راہِ راست پر لا سکتے ہو۔ تم انہی لوگوں سے اپنی بات منوا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور یہی لوگ تو ماننے والے ہیں۔"

اس کے بعد حضرت اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:-

لا یکن ھؤلاء اولی بالجد فی ضلالھم منکم بالجد فی	ایسا نہ ہو کہ ضلالت و گمراہی میں ان لوگوں کی کوششیں تمہاری کوششوں سے بڑھ جائیں جب

حقکم وطاعة ربکم۔ | کہ تمہاری کوششیں حق اور اپنے پروردگار کی اطاعت کے سلسلہ میں ہیں۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۵)

جب محرم کا آخری دن گزرا اور افق پر صفر کا چاند دکھائی دیا تو امیرالمومنین نے صلح کی ہر کوشش سے مایوس ہو کر مرثد ابن حارث جشمی کو فریق مخالف کی طرف بھیجا جنہوں نے سپاہِ شام کے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کیا:۔

الا ان امیرالمومنین یقول لکم انی قد استدمتکم لتراجعوا الحق وتنیبوا الیه واحتجت علیکم بکتاب الله عزوجل فدعوتکم الیه فلم تناهوا عن طغیان ولم تجیبوا الی حق انی قد نبذت الیکم علی سواء ان الله لا یحب الخائنین۔

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۶)

اے اہلِ شام امیرالمومنین تم سے فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں مہلت دی تاکہ حق کو دیکھو بھالو اور اس کی طرف رجوع کرو میں نے تم پر خدائے بزرگ و برتر کی کتاب سے حجت تمام کر دی اور اس کی پیروی کی تمہیں دعوت دی مگر تم تمرد و سرکشی سے باز نہیں آئے اور نہ حق کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوئے اب میں نے تمام تعلقات اور گفت و شنید کا سلسلہ قطع کر دیا ہے بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس اعلان کے ہوتے ہی جنگ کی تیاری شروع ہو گئی آگ کے آلاؤ روشن کئے گئے مشعلیں جلائی گئیں اور راتوں رات پرے بندھ گئے صفیں جم گئیں اور عراقیوں اور شامیوں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ امیرالمومنین نے اپنے لشکر کو ترتیب دیا۔ سواروں پر عمار ابن یاسر کو اور پیادوں پر عبداللہ ابن بدیل خزاعی کو افسر مقرر کیا اور کوفہ کے سواروں پر مالک اشتر کو اور بصرہ کے سواروں پر سہل ابن حنیف کو اور اہلِ بصرہ کے پیادوں پر قیس ابن سعد کو سالار متعین کیا۔ میمنہ اشعث ابن قیس کے اور میسرہ عبداللہ ابن عباس کے زیر نگین کیا۔ میمنہ کے پیادوں کو سلیمان ابن صرد کے اور میسرہ کے پیادوں کو حارث ابن مرہ عبدی کی ماتحتی میں دیا اور ہر قبیلہ پر اسی قبیلہ کا ایک ایک سردار نامزد کیا اور رایت جنگ ہاشم ابن عتبہ مرقال کے سپرد کیا اور لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: "جب تک وہ پہل نہ کریں تم ان سے نہ لڑنا کیونکہ تم بحمداللہ دلیل و حجت رکھتے ہو اور تمہارا انہیں چھوڑ دینا کہ وہ پہل کریں۔ یہ ان پر دوسری حجت ہوگی۔ خبردار جب دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو تو کسی پیٹھ پھرانے والے کو قتل نہ کرنا کسی بے دست و پا پر ہاتھ نہ بڑھانا کسی زخمی کی جان نہ لینا اور عورتوں کو اذیت نہ پہنچانا چاہے وہ تمہیں برا بھلا کہیں اور تمہارے افسروں کو

گالیاں دیں"۔

معاویہ نے میمنہ پر عبید اللہ ابن عمر کو اور میسرہ پر حبیب ابن مسلمہ کو مقرر کیا۔ سواروں پر عمرو ابن عاص اور پیادوں پر مسلم ابن عقبہ مری کو امیر بنایا اور مختلف شہروں اور قبیلوں کے انہی میں سے سردار نامزد کئے اور علم جنگ عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید کو دیا۔

یکم صفر روز چہار شنبہ صبح ہی صبح دونوں طرف کے فوجی دستے نئے ولولے اور نئے حوصلے کے ساتھ صفیں باندھ کر کھڑے ہوگئے اور باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہوگیا۔ عراقی دستہ کی کمان مالک اشتر کے ہاتھ میں تھی اور شامی دستہ حبیب ابن مسلمہ کی ماتحتی میں تھا۔ دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کی قوت طاقت کا جائزہ لیا اور پھر تلواریں لے کر فریق مخالف پر ٹوٹ پڑے۔ دن بھر تلواریں تلواروں سے ٹکراتی رہیں اور شام کے جھٹپٹے تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ جب فضا تاریک ہوگئی تو دونوں لشکر اپنی اپنی قیامگاہوں کی طرف پلٹ آئے۔

دوسرے دن حضرت کی سپاہ میں سے ہاشم مرقال سواروں اور پیادوں کے دستے لے کر میدان میں آکھڑے ہوئے ادھر سے ابوالاعور سلمی سواروں اور پیادوں کے جم غفیر کے ساتھ نکلا دونوں فریق نے تلواریں علم کیں اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے دن بھر سخت رن پڑا سروں پر تلواریں چمکتی رہیں اور سینوں میں نیزے اترتے رہے۔

تیسرے دن عمرو ابن عاص ایک نیزے پر کالا پھریرا لٹکائے دستہ فوج کے ساتھ نکلا اس سیاہ پھریرے کو دیکھ کر سرگوشیاں شروع ہوگئیں اور کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ وہی پارچہ ہے جو پیغمبر اکرم نے چوب علم پر آویزاں کرکے عمرو کو دیا تھا اور اسے علمبرداری کا شرف بخشا تھا۔ امیرالمومنین نے سنا تو فرمایا اے لوگو اس جھنڈے کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت نے علم اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس جھنڈے کو اٹھائے اور اس کا حق ادا کرے۔ عمرو ابن عاص نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ شرائط کیا ہیں جن سے ان کا حق ادا ہوتا ہے فرمایا کہ اسے لے کر کسی کافر کے مقابلہ سے نہ بھاگے اور کسی مسلمان سے جنگ نہ کرے مگر اس نے یہ حق یوں ادا کیا کہ:۔

قد فربه من الکافرین فی حیاة	رسول اللہ کی زندگی میں اسے لے کر کافروں کے
رسول اللہ وقد قاتل به المسلمین	سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا اور آج اسی جھنڈے کو
الیوم۔ (اخبار الطوال۔ صد ۱۲۴)	لے کر مسلمانوں سے جنگ و قتال کر رہا ہے"۔

عمرو ابن عاص کا مقصد تو یہ تھا کہ اس علم کی نمائش کرکے دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر رعب

بٹھائے اور انہیں یہ تاثر دے کہ وُہ زمانہ رسول میں اُن کے ہاتھوں سے علم لے چکا ہے اور یہ وہی علم ہے جسے آج میدان میں لے کر آیا ہے اور اس طرح اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کا ڈھنڈورا پیٹے مگر امیرالمومنین نے کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کا ازالہ کر دیا اور یہ بتایا کہ صرف رسول اللہ کے ہاتھ سے علم لے لینا فضیلت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ جب تک علمبرداری کے تقاضوں کو پُورا نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد اگر کسی ذہن میں کچھ الجھن تھی تو وہ جاتی رہی اور لوگوں نے اس ہیر پھیر کی نمائش کو ایک افسوں گری سے زیادہ اہمیت نہ دی۔

جب عمرو میدان میں اترا تو زیاد ابن نضر سواروں کا دستہ لے کر اور عمار ابن یاسر پیادوں کو لے کر جن میں مہاجرین و انصار اور اصحاب بدر شامل تھے مقابلہ کے لئے نکلے۔ عمار دشمن کی صفوں کو تہ و بالا کرتے ہوئے آگے بڑھے تو اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

یا اهل العراق اتریدون ان تنظروا الی من عادی اللہ و رسولہ وجاھدھما وبغی علی المسلمین وظاھر المشرکین فلما رأی اللہ یعز دینه ویظھر رسولہ اتی النبی فاسلم وھو فیما نری راھب غیر راغب ثم قبض اللہ عزوجل رسولہ فو اللہ ان زال بعدہ معروفا بعداوۃ المسلم و ھوادۃ المجرم فاثبتوا له وقاتلوہ فانه یطفیٔ نور اللہ ویظاھر اعداء اللہ۔

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۳)

اے اہل عراق کیا تم اس شخص (معاویہ) کو دیکھنا چاہتے ہو جس نے اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کی اور ان سے جنگیں لڑیں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کو ہوا دی، اور مشرکوں کی پشت پناہی کی اور جب یہ دیکھا کہ اللہ نے اپنے دین کو استحکام بخشا ہے اور اپنے رسول کو غلبہ دیا ہے، تو پیغمبر کے پاس آیا اور مسلمان ہو گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ڈر کے مارے مسلمان ہوا تھا اور اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب اللہ نے اپنے رسول کو دنیا سے اٹھا لیا تو خدا کی قسم یہ مسلمانوں کا دشمن اور کافروں کا دوست ہی رہا۔ لہذا اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور اس سے جنگ و قتال کرو کیونکہ یہ اللہ کے نور کو بجھانا اور دشمنان خدا کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے۔"

پھر اپنے ہمراہیوں کو لے کر اس شدت سے حملہ کیا کہ شامیوں کے قدم اکھڑ گئے اور عمرو جو بڑی آن بان سے سیاہ علم لہراتا ہوا میدان میں آیا تھا اپنی جگہ چھوڑ کر پچھلی صفوں میں روپوش ہو گیا۔

زیاد ابن نضر اپنے سواروں کے ساتھ شامی سواروں پر حملہ آور تھے کہ ایک سوار اُن کے مقابلہ کے لئے بڑھا زیاد نے پوچھا کہ تم کون ہو اس نے کہا کہ میں معاویہ ابن عمرو عقیلی ہوں۔ زیاد یہ نام سن کر حملہ کرنے میں متردد ہوئے کیونکہ وہ ان کا مادری بھائی تھا۔ ان دونوں کی ماں قبیلۂ زبید کی ایک عورت ہند تھی انہوں نے لڑنا مناسب نہ سمجھا اور امیرالمومنین سے اجازت لے کر واپس چلے آئے۔

چوتھے دن محمد ابن حنفیہ فوج وسپاہ کے ساتھ میدان میں آئے ادھر سے عبیداللہ ابن عمر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ نکلا اور دونوں نے ایک دوسرے کے بالمقابل صفیں جمائیں۔ نیزوں کی طرف ہاتھ بڑھے تلواریں نیاموں سے نکل آئیں اور جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ عبیداللہ ابن عمر نے ابن حنفیہ کو مقابلہ کی دعوت دی۔ محمد ابن حنفیہ اس کی آواز پر تڑپ کر باہر نکلے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔ امیرالمومنین نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے بتایا گیا کہ ابن حنفیہ ہیں جو عبیداللہ ابن عمر کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں۔ حضرت نے یہ سنا تو محبت کا جوش رُک نہ سکا فوراً گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا اور ابن حنفیہ کے قریب پہنچ کر نیچے اُترے اور فرمایا کہ تم میری سواری کی باگ تھامے رہو۔ میں ابھی پلٹ کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ابن عمر کے قریب آئے اس نے ابن حنفیہ کے بجائے امیرالمومنین کو دیکھا تو چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ کہنے لگا میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا اور یہ کہہ کر پچھلی صفوں میں چلا گیا۔ حضرت واپس ہوئے اور جب اپنی سواری کے پاس پہنچے تو ابن حنفیہ نے کہا کہ بابا آپ نے مجھے کیوں روک دیا اگر مجھے جانے دیتے تو میں اسے قتل کئے بغیر نہ پلٹتا۔ فرمایا مجھے تم سے یہی امید تھی مگر میں پوری طرح مطمئن نہ تھا کہ تم اسے مار گراؤ گے اس لئے مجھے خود جانا پڑا۔ کہا کہ بابا میں آپ کو روکنے کی جرأت نہ کر سکا ورنہ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ آپ اس ذلیل وکمینہ فطرت کے مقابلہ میں جاتے۔

پانچویں دن عبداللہ ابن عباس سواروں اور پیادوں کے دستے لے کر نکلے اور ادھر سے ولید ابن عقبہ اپنے سواروں اور پیادوں کی قیادت کرتا ہوا نکلا۔ اس نے جب ابن عباس کو دیکھا تو اپنی بدفطری و بدطینتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنی عبدالمطلب پر زبان درازی شروع کر دی اور ابن عباس سے کہا:۔

یا ابن عباس قطعتم ارحامکم	اے ابن عباس تم لوگوں نے قطع رحم کیا، اپنے
وقتلتم امامکم فلم تدرکوا ما	امام (عثمان) کو قتل کر ڈالا اور اپنی آرزوں میں
املتم۔ (اخبار الطوال ص۱۶۵)	بھی ناکام رہے۔

ابن عباس نے کہا کہ بس الزام تراشی و یاوہ گوئی کو چھوڑ دو اور میرے مقابلہ کے لئے آگے بڑھو۔ مگر اسے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اور جو گرجتے ہیں سو برستے نہیں کچھ دیر چیخا چلایا اور پھر دبک کر بیٹھ گیا۔ ابن

عباس اپنے ہمراہیوں کو لے کر شامیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ظہر تک معرکہ کارزار گرم رہا۔

اسی دن سمرہ ابن ابرہہ حمیری قراء وحفاظ کی ایک معتد بہ جماعت کے ساتھ شامیوں سے الگ ہو کر امیرالمومنین کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ جس سے معاویہ کو اچھا خاصا دھچکا لگا کیونکہ یہ ان کے موقف کے خلاف انہی کی جماعت کی عملی شہادت تھی۔

چھٹے دن عراقیوں کی صف سے قیس ابن سعد انصاری اور شامیوں کے لشکر سے ابن ذی الکلاع حمیری میدان میں اُترے ظہر تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اپنی اپنی صفوں میں واپس آ گئے۔

ساتویں دن سپاہ امیرالمومنین کی طرف سے مالک اشتر اور ادھر سے حبیب ابن مسلمہ ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے۔ سپاہ شام سے حجر الشر کندی گھوڑے پر سوار ہو کر مبارز طلب ہوا اس کے مقابلہ میں اس کے ہم نام اور ہم قبیلہ حجر ابن عدی جو حجر الخیر کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے نکلے۔ دونوں نیزے تان کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اس اثنا میں لشکر شام کا ایک سپاہی خزیمہ ابن ثابت اسدی بیچ میں کود پڑا اور حجر الخیر پر حملہ آور ہو کر ان کا نیزہ توڑ ڈالا چند عراقی سپاہیوں نے یہ دیکھا تو آگے بڑھ کر خزیمہ اسدی کو قتل کر دیا اور حجر الشر جان بچا کر نکل گیا مگر کچھ دیر کے بعد پھر للکارتا ہوا میدان میں آیا۔ حکم ابن ازہر اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے کچھ دیر اس سے جنگ کی۔ آخر حجر الشر کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حکم کے ابن عم رفاعہ ابن ظالم حمیری نے حکم ابن ازہر کو گرتے دیکھا تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے صفوں سے باہر نکلے اور حجر الشر پر حملہ کر کے اُسے تہ تیغ کر دیا۔ امیرالمومنین نے دیکھا، تو فرمایا خدا کا شکر ہے کہ حکم ابن ازہر کا قاتل مارا گیا۔

میدان میں تلواریں چل رہی تھیں اور عراقی و شامی ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے کہ عراقی دستہ کا ایک سپاہی ابو ایوب شامیوں پر حملہ کر کے صفوں سے باہر نکلا دیکھا کہ ایک شامی عراقیوں کی صف پر حملہ کر کے پلٹ رہا ہے جب دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو تلواریں کھینچ لیں اور حملہ کر دیا ابو ایوب نے اس کی گردن پر اس طرح چابکدستی سے تلوار ماری کہ گردن کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی اور سر جوں کا توں اس کے دھڑ پر رکھا رہ گیا۔ دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ وار خالی گیا ہے مگر جب اس کے گھوڑے نے حرکت کی تو سر دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا لوگوں نے یہ دیکھا تو نعرہ لگایا اور دل کھول کر ابو ایوب کی تیغ زنی کی داد دی اور جب وہ پلٹ کر امیرالمومنین کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا کہ شاعر کا یہ شعر تمہارے حسب حال ہے ؎

وعلمنا الضرب اٰباؤنا — ونحن نعلم ابناءنا بیننا

"ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں تیغ زنی کی تعلیم دی ہے اور ہم بھی اپنے بیٹوں کو یہ تعلیم دیں گے۔"

ان خونی ہنگاموں میں بھی حضرت کی یہ کوشش رہی کہ یہ جنگ و خونریزی بند ہو اور صلح و آشتی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اگرچہ امیر شام کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے اس کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی پھر بھی مزید اتمام حجت کے لئے آپ نے مصحف ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنے لشکر والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس مصحف کو لے کر شامیوں کے پاس جائے اور انہیں قرآن مجید کے فیصلہ پر عمل کرنے کی دعوت دے ایک نوجوان صفوں سے باہر نکل کر حضرت کے سامنے آیا اور کہا کہ میں اس کے لئے حاضر ہوں حضرت نے دوبارہ دریافت کیا مگر اس نوجوان کے علاوہ کوئی تیار نہ ہُوا۔ آخر حضرت نے اسی کو مصحف دے کر روانہ کیا اس نے مخالف صفوں کے قریب پہنچ کر کہا کہ اے لوگو امیرالمومنین تمہیں قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں آؤ ہم اس کے فیصلہ پر اپنے جھگڑے نمٹائیں اور قتل و خونریزی سے ہاتھ اٹھائیں مگر کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو میدانِ جمل میں مسلم مجاشعی کا ہُوا تھا اور چند شامیوں نے ہجوم کر کے اُسے قتل کر دیا۔

امیرالمومنین نے یہ دیکھ کر کہ دونوں طرف کے لشکر جان لڑائے ہوئے ہیں اگر یہ جنگ و خون ریزی جاری رہی تو عرب کا بہت بڑا حصہ فنا ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا دوسروں کو جنگ کے شعلوں میں جھونکنے کے بجائے مجھے معاویہ کو مقابلہ کی دعوت دینا چاہیئے تاکہ ہم آپس میں نمٹ لیں۔ چنانچہ حضرت نے دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز سے پوچھا کہ معاویہ کہاں ہے۔ معاویہ نے سنا تو کہا کہ پوچھو کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ اُسے کہو کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے سامنے آئے۔ میں اس سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ معاویہ عمرو ابن عاص کو لے کر صفوں سے باہر نکلے اور حضرت کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے معاویہ تم لوگوں کا خون ناحق بہار ہے ہو آؤ ہم دونوں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ہم میں سے جو غالب آئے وہ منصب خلافت سنبھال لے۔ عمرو ابن عاص نے کہا کہ علی نے سچ کہا ہے۔ یہی دونوں نزاع کا مرکز و محور ہیں انہیں آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ معاویہ نے عمرو سے مخاطب ہو کر کہا:۔

ما انصفت وانك لتعلم انه لم يبارزه رجل قط الا قتله	"تم نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ ان کے مقابلہ میں جو نکلا انہوں نے اسے قتل کئے بغیر نہیں چھوڑا۔"
(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۲۹)	

عمرو نے کہا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مقابلہ سے روگردانی کر کے اپنے کو لوگوں کی نظروں سے گراؤ معاویہ

نے کہا کہ کیا میں تمہارے طیش دلانے سے اپنی جان سے ہاتھ دھولوں تم تو یہ چاہتے ہی ہو کہ میں مارا جاؤں اور تم راج پاٹ سنبھال لو۔ اور یہ کہہ کر پیچھے کی طرف مڑے اور دھیرے دھیرے لشکر کی آخری صف میں پہنچ گئے۔ معاویہ کو عمرو کی اس حرکت پر غصہ تو تھا ہی اُسے بلا کر سخت سست کہا اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ عمرو نے اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا کہ اگر تم لڑنا نہیں چاہتے ہو تو میں علی سے لڑوں گا۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کی ٹھان لی اور ایک موقع پر گرجتا برستا ہوا میدان میں نکلا اور حضرت کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ حضرت نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے سر پر پہنچ گئے۔ جب تلوار بلند کی تو اس نے اپنے کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور ایک ٹانگ اٹھا دی۔ جس سے اس کی شرمگاہ کھل گئی۔ حضرت نے اس کی یہ ذلیل حرکت دیکھی تو منہ پھیر لیا۔ عمرو گرد جھاڑتا ہوا اُٹھا اور اپنے لشکر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ نے یہ واقعہ سنا تو عمرو سے کہا :۔

احمد اللہ و سوداء استک یا عمرو ؎۔ (اخبار الطوال ص)	اے عمرو اللہ کا شکر کرو کہ تم اپنی شرمگاہ کی بدولت بچ گئے۔

سپاہِ شام کے ایک سپہ سالار ابرہہ ابن صباح حمیری نے بھی جنگ کی تباہ کاری سے متاثر ہو کر یہی بات کہی تھی کہ علی اور معاویہ آپس میں لڑ بھڑ کر فیصلہ کر لیں۔ چنانچہ اس نے اپنے قبیلہ والوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے اہلِ یمن ہم کب تک تیروں اور تلواروں کا نشانہ بنتے رہیں گے اس جنگ کو رکوانے کی کوئی تدبیر کرو اور علی اور معاویہ پر زور دو کہ وہ آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ان دونوں میں سے جو غالب آئے گا ہم اس کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے۔ امیرالمومنین تک یہ بات پہنچی تو فرمایا کہ خدا کی قسم میرے لئے اس سے زیادہ خوش آئند کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ دونوں لشکر ایک طرف ہو جائیں اور ہم آپس میں نمٹ لیں۔ جب معاویہ نے ابرہہ کی یہ تجویز سُنی تو بہت سٹپٹائے اور قدم بقدم پیچھے ہٹتے ہوئے آخری صفوں میں پہنچ گئے اور اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ کی عقل جاتی رہی ہے لوگوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے وہ زیرک و دانا اور با فہم ہے اور شجاعت و دلیری کے اعتبار سے بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم علی سے دو بدو ہو کر لڑنے سے گھبراتے ہو۔ معاویہ تو خاموش رہے البتہ عروہ ابن داؤد کو جوش آیا اور کہنے لگا کہ اگر امیر لڑنا نہیں چاہتے تو میں علی سے دو دو ہاتھ کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں صفوں میں کھڑا ہو کر للکارنے لگا اور حضرت کو دعوت مبارزت دی آپ نے اس کی سرکوبی کے لئے قدم بڑھایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین آپ اس دنی و ذلیل کے مقابلہ کے لئے نہ جائیں ہم میں سے کسی کو حکم دیں وہ اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ مگر حضرت نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کے سر پر اس طرح تلوار

ماری کہ اس کا آدھا دھڑ ایک طرف اور آدھا دھڑ دوسری طرف گرا۔ لوگ حضرت کے زورِ بازو اور تلوار کی کاٹ پر لرز اُٹھے اور دیکھنے والوں پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ جب عروہ دو ٹکڑے ہو کر گرا تو اس کے ایک ابن عم نے جذبۂ انتقام سے مشتعل ہو کر حضرت پر حملہ کیا۔ حضرت نے اس کا وار خالی دے کر اس پر نیزہ مارا۔ نیزہ اس کے سینہ میں گڑ گیا اور اس نے زمین پر گر کر دم توڑ دیا۔

معاویہ نے اپنے دو آدمیوں کو قتل ہوتے دیکھا تو پیچ و تاب کھا کر کہا کہ تم میں کون ہے جو عروہ اور اس کے ابن عم کے قاتل علی سے دوبدو ہو کر لڑے یا موقع پا کر انہیں قتل کرے۔ ولید ابن عقبہ نے کہا کہ مناسب تو یہ تھا کہ تم خود اُن کے مقابلہ کے لئے نکلتے کہا کہ وہ پہلے بھی مجھے للکار چکے ہیں۔ مگر یہ لشکر کاہے کے لئے ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے میدان میں نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عقبہ ابن ابی سفیان نے کہا تمہاری رائے صائب ہے وہ للکاریں بھی تو تم ٹال جاؤ۔ جب معاویہ کے بار بار کہنے پر بھی کسی نے حضرت کے مقابلہ میں نکلنے کی جرأت نہ کی تو انہوں نے بسر ابن ابی ارطاۃ سے کہا کیا تم ان سے لڑوگے کہا کہ بہتر تو یہ تھا کہ تم ہی اُن سے دوبدو ہو کر لڑتے اور اگر تم یہی چاہتے ہو کہ میں لڑوں تو مجھے انکار نہیں ہے۔ بسر کے ایک قریبی عزیز نے یہ سنا تو بسر سے کہا کہ معاویہ مرگئے تو ان کا کوئی بھائی بند تخت و تاج کا وارث ہو گا تم اپنے کو کیوں خطرہ میں ڈالتے ہو۔ کہا کہ میں زبان سے کہہ چکا ہوں۔ اب تو مجھے نکلنا ہی پڑے گا۔ اس شخص نے یہ سُنا تو بسر کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے :۔

تنازلہ یا بسران کنت مثلہ — والافان اللیث للشاء اکل

"اگر تم ان کے پایہ کے ہوتے تو بے شک ان سے لڑتے ورنہ یاد رکھو کہ شیر بکریوں کو کھا جایا کرتا ہے۔"

کانک یا بسر ابن ارطاۃ جاھل — بآثارہ فی الحرب او متجاھل

"اے بسر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم علی کے جنگی کارناموں سے بے خبر ہو یا جان بوجھ کر بے خبر بن رہے ہو۔"

بسر نے کہا کہ آخر ایک دن مرنا ہے پھر کیوں بزدلوں کی موت مرا جائے میں ان کا مقابلہ کروں گا اور ضرور کروں گا۔ چنانچہ وہ لڑنے کے لئے میدان کی طرف بڑھا۔ امیرالمومنین مالک اشتر کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ کسی ٹیلے کی تلاش میں بڑھ رہے تھے کہ بسر زرہ بکتر پہنے سر پر خود رکھے آپ کے قریب آکر مبارز طلب ہوا۔ آپ بڑے اطمینان سے پلٹے اور قریب پہنچ کر نیزے کی انی اس کی زرہ میں گڑو کر اسے نیچے گرایا اور چاہا کہ نیزہ اس کے سینہ میں اتاریں۔ بسر نے جب جان بچتی نہ دیکھی تو اپنے ستر کو عریاں کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت

نے منہ موڑ لیا اور پیچھے ہٹ آئے۔ مالک اشتر نے اسے پہچان کر کہا کہ یا امیرالمومنین یہ دشمن خدا بسر ابن ابی ارطاۃ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس پر خدا کی پھٹکار اس حرکت کے بعد اسے کیا کہا جائے چھوڑو اسے جانے دو۔ بسر جلدی سے اٹھا اور ستر ڈھانکتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ نے اس کے کارنامہ پر مطلع ہونے کے بعد اس سے کہا کہ شرملنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ عمرو ابن عاص نے بھی تو اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔

معاویہ اس خیال سے میدان میں کم نکلتے تھے کہ اگر حضرت کا سامنا ہو گیا تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر نکلتے بھی تو اس سمت کا رُخ نہ کرتے جدھر حضرت کے موجود ہونے کا شبہ ہوتا۔ ایک مرتبہ لڑنے کے لئے نکلے اور میسرہ پر حملہ کر دیا۔ حضرت میسرہ کے اندر موجود تھے اور صفوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ حضرت نے انہیں دیکھا تو اس خیال سے کہ وہ آپ کو دیکھ کر بھاگ نہ کھڑے ہوں اپنا گھوڑا اور اپنی زرہ دوسرے کے گھوڑے اور زرہ سے تبدیل کی اور صف سے باہر نکلے۔ معاویہ حملہ کے ارادہ سے بڑھے تھے کہ پہچان لیا کہ مقابلہ میں امیرالمومنین ہیں۔ انہوں نے فوراً رُخ موڑ کر گھوڑے کو مہمیز لگائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ امیرالمومنین نے کچھ دیر تک پیچھا کیا مگر وہ تیزی سے اپنی صفوں میں روپوش ہو گئے اور جان بچا لے جانے میں کامیاب ہو گئے

معاویہ عموماً اپنے ایک آزاد کردہ غلام حریث کو اپنا بھیس بدلوا کر میدان میں بھیجتے تھے تاکہ دوسروں کو یہ تاثر دیں کہ وہ خود بھی عملاً شریک جنگ ہیں۔ چنانچہ جب وہ معاویہ کی زرہ پہن کر اور ہتھیار سج کر نکلتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ معاویہ جنگ آزما ہیں۔ معاویہ نے اسے یہ تاکید کر دی تھی کہ مجھے تمہاری جان عزیز ہے تم لاکھ طاقت ور اور جنگجو سہی مگر علی کا مقابلہ نہ کرنا ورنہ تمہیں اپنی جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں عمرو ابن عاص نے اسے بہکایا اور کہا کہ معاویہ تمہیں علی کے مقابلہ سے اس لئے منع کرتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں اُن سے دو بدو ہو کر لڑنے کا امتیاز اور قریش کے مقابلہ میں سربلندی حاصل ہو۔ اگر تم قریشی ہوتے تو وہ تمہیں ان کے مقابلہ سے کبھی منع نہ کرتے۔ حریث عمرو کے بہکانے سے طیش میں آگیا اور کہا کہ میں علی سے لڑے بغیر نہیں رہوں گا۔ چنانچہ اُس نے آگے بڑھ کر انہیں مقابلہ کے لئے للکارا آپ ایک دستہ فوج کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ حریث کی صدائے مبارز طلبی سنی۔ آپ نے تلوار کے قبضہ پہ ہاتھ ڈالا اور اُسے مہلت دیئے بغیر اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ معاویہ کو حریث کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو انہیں انتہائی رنج و غم ہوا اور عمرو ابن عاص کو برا بھلا کہا کہ اُس کے بہکانے سے حریث کی جان گئی اور لوگوں پر یہ بات بھی کُھل گئی کہ معاویہ کے بھیس میں حریث نکلا کرتا تھا۔

معاویہ کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنا بھیس بدلوا کر میدان میں بھیجتے اور امیرالمومنین، عباس

ابن ربیعہ یا کسی اور کا بھیس بدل کر میدان میں آتے تا کہ حریف انہیں مقابلہ میں دیکھ کر بھاگ نہ کھڑا ہو چنانچہ ایک مرتبہ عباس ابن ربیعہ خود زرہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر صف سے باہر نکلے۔ عرار ابن ادہم نے انہیں دیکھا تو جنگ کی دعوت دی۔ عباس نے کہا کہ میں گھوڑے سے نیچے اترا آتا ہوں اور تم بھی نیچے اُتر آؤ تا کہ ہم میں سے کوئی میدان چھوڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ دونوں پیادہ ہو گئے اور تلوار لے کر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ وار پر وار ہوتے مگر تلواریں ڈھالوں اور آہنی خودوں سے ٹکرا کر رہ جاتیں۔ ہر ایک اپنے حریف کو زیر کرنے کے لئے داؤں پیچ دکھاتا مگر کوئی مغلوب ہوتا نظر نہ آتا۔ اتنے میں عباس کو عرار کی زرہ کا ایک حلقہ ڈھیلا نظر آیا۔ انہوں نے ہاتھ کی صفائی سے اس حلقہ کو تلوار کی نوک میں پرو لیا اور جھٹکا دے کر زرہ کے حلقے چیر ڈالے اور پھر تاک کر ایسا وار کیا کہ تلوار ہڈیوں کو توڑتی ہوئی سینہ میں اُتر گئی عرار پیٹھ کے بل زمین پر گرا اور گرتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔ عراقیوں نے عباس کی مہارت و چابکدستی پر اس زور سے تکبیر کا نعرہ بلند کیا کہ پوری فضا گونج اٹھی۔ امیرالمومنین نے تکبیر کی آواز سنی تو پوچھا کہ یہ کون تھا جس نے دشمن کو مار گرایا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عباس ابن ربیعہ تھے۔ حضرت کے تیور بگڑے اور عباس کو بلا کر کہا کہ تمہیں حکم دیا تھا کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو اور اسے خالی نہ چھوڑو کہا کہ یا امیرالمومنین یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے مقابلہ کے لئے للکارا جائے اور میں خاموش رہوں۔ کہا کہ دشمن کا مقابلہ اتنا ضروری نہیں ہے، جتنا امام کے حکم کی پابندی ضروری ہے۔ پھر خود ہی فرمایا خداوندا عباس کو اس کارنامہ کی جزائے خیر دے۔ میں نے اس سے درگزر کیا تو بھی اس سے درگذر فرما۔

معاویہ کو عرار کے مارے جانے کا علم ہوا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور لشکر والوں سے کہا کہ تم میں کوئی ہے جو عباس کو قتل کر کے عرار کے خون کا بدلہ لے اس آواز پر قبیلۂ لخم کے دو شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے اور عباس کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ عباس نے اُن کی للکار سنی تو ان کی رگوں میں خون شجاعت جوش مارنے لگا امیرالمومنین کی اجازت کے بغیر اپنی جگہ بھی نہ چھوڑ سکتے تھے کہا کہ کچھ دیر توقف کرو میں اپنے امیر سے اجازت لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت کی خدمت میں آئے اور اُن سے لڑنے کی اجازت مانگی۔ حضرت نے فرمایا کہ خدا کی قسم معاویہ یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے کوئی متنفس روئے زمین پر زندہ نہ رہے تا کہ رشد و ہدایت کی شمعیں گل ہو جائیں اور اسے ضلالت و گمراہی کے پھیلانے کا موقع ملے مگر اللہ اس کے علی الرغم اپنے نور کو درخشندہ و تابندہ رکھے گا۔ پھر عباس سے فرمایا کہ تم اپنے ہتھیار اتار کر مجھے دو۔ حضرت نے عباس کی زرہ اور بکتر پہنا سر پر خود رکھا اور انہی کے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آئے۔ حضرت کو دیکھ کر دونوں لخمی یہ سمجھے کہ عباس مقابلہ کے لئے آئے ہیں کیونکہ گھوڑا اور ہتھیار انہی کے تھے اور خود و مغفر سے چہرہ نظر

نہ آتا تھا۔ کہا کہ کیا تم اپنے امیر سے اجازت لے آئے ہو۔ حضرت نے جواب میں اس آیت کی تلاوت کی۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔

جن (مسلمانوں) کے خلاف (کافر) لڑا کرتے ہیں اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔"

اب ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر تلوار سے حملہ کیا۔ حضرت نے اس کا وار خالی دے کر جوابی حملہ کیا اور تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا جوشِ غضب میں حملہ آور ہوا حضرت نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور پلٹ کر عباس کو ان کے ہتھیار دیئے اور فرمایا کہ اگر کوئی تمہیں مقابلہ کے لئے للکارے تو مجھے خبر دو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔

امیرالمومنین نے دیکھا کہ شامیوں کی طغیانی و سرکشی بڑھتی جا رہی ہے اور جب تک مجموعی قوت سے ان کی طاغوتی طاقتوں کو کچلا نہیں جائے گا۔ لڑائی رکنے میں نہیں آئے گی۔ چنانچہ آپ نے غروب آفتاب کے قریب اپنے لشکر میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

الا انکم لاقوا القوم غدا فاطیلوا اللیلۃ القیام واکثروا تلاوۃ القرآن واسئلوا اللہ النصر والصبر والقوھم بالجد والحزم وکونوا صادقین۔

دیکھو کل تمہیں دشمن سے جنگ کرنا ہے۔ لہٰذا آج کی رات نماز اور تلاوتِ قرآن میں گزارو اور اللہ سے نصرت اور صبر و استقامت کی دعا مانگو اور پوری تندہی و ہوش مندی سے دشمن سے ٹکرا جاؤ۔ اور صحیح معنی میں راستباز ثابت ہو۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۵۱)

امیرالمومنین نے تمام رات جاگ کر جنگ کی تیاری اور فوجوں کی صف بندی میں گذاری میمنہ و میسرہ ترتیب دیئے رسالے اور دستے مرتب کئے اور لشکر والوں نے بھی ہتھیاروں کو جانچا پرکھا۔ تلواروں پر صیقل کی تیروں کے بھال اور نیزوں کے پھل درست کئے اور صبح ہوتے تک دشمن پر آخری حملہ کے لئے پوری طرح تیار ہو گئے۔

حضرت علی کے اس اعلان سے معاویہ پر خوف و ہراس چھا گیا۔ انہوں نے سپہ سالارانِ لشکر کو لشکر ترتیب دے کر فوراً پیش ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ابوالاعور سلمی اہل حمص کے لشکر کے ساتھ، ابن عمرو سلمی اہلِ اردن کے ساتھ، زفر ابن حارث اہلِ قنسرین کے ساتھ اور ضحاک ابن قیس فہری دمشق کے دستہ کے ہمراہ پیش ہوا اور اسی طرح دستوں پر دستے آتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے شامیوں کے غول چاروں طرف پھیل گئے اور

امیر شام کو پوری جوانمردی اور ثبات قدمی سے لڑنے کا یقین دلایا۔

شب کی تاریکی کے چھٹتے ہی عراقی وشامی پرے جما کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے میمنہ کی کمان عبداللہ ابن بدیل کے اور میسرہ کی کمان عبداللہ ابن عباس کے سپرد کی اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہو کر ایک مشکیں گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا اور گھوڑے کی باگ اٹھاتے ہی ایڑ لگائی اور دم کے دم میں دشمن کی صفوں کے قریب پہنچ گئے اور عبداللہ ابن بدیل کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ابن بدیل دُہری زرہ پہنے اور دو تلواریں لٹکائے میمنہ لشکر کو لے کر میسرہ شام پر حملہ آور ہوئے اور تابڑ توڑ حملوں سے صفوں پر صفیں الٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ میسرۂ شام کے قدم اُکھڑ گئے اور صفیں پراگندہ ہو گئیں۔ ابن بدیل نے میسرہ کو پسپا ہوتے دیکھا تو قلب لشکر کا رُخ کیا جہاں معاویہ پورے حفاظتی سروسامان کے ساتھ مقیم تھے۔ اگرچہ ان کے گرد پانچ محافظ دستے آہنی دیوار کی طرح حصار باندھے کھڑے تھے مگر فوج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوف و دہشت سے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹے ان کے ساتھ قلب لشکر بھی پیچھے ہٹا اور پیچھے ہٹ کر پھر سے صفیں جمائیں اتنے میں میسرہ شام پسپائی کے بعد آگے بڑھا اور قلب لشکر کے ساتھ مل کر میمنۂ عراق پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میمنۂ عراق کے قدم اکھڑ گئے اور جدھر جس کا منہ اٹھا اُدھر چل دیا۔ ابن بدیل کے ہمراہ صرف گنے چنے دو تین سو آدمی رہ گئے جو پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمن کے مقابلہ میں جمے رہے۔ ابن بدیل انہی گنتی کے چند آدمیوں کو لے کر معاویہ کے خیمہ کی طرف بڑھے تاکہ انہیں ٹھکانے لگائیں ادھر سے کمانیں کڑکیں چلے کھنچے اور تیروں کی بوچھار شروع ہو گئی مگر ان جانبازوں کے قدم نہ رُکے اور دشمن کی صفوں میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ چاروں طرف سے دشمن کے نرغہ میں گھر گئے۔

امیرالمومنین نے جب اپنے میمنہ کو بکھرتے اور ابن بدیل کے ہمراہیوں کو منتشر ہوتے دیکھا تو انہیں موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ آپ نے سہل ابن حنیف سے فرمایا کہ آگے بڑھ کر میمنہ کی مدد کرو مگر شامی سواروں نے حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر میمنہ کے منتشر ہونے سے قلب لشکر جس میں خود امیرالمومنین تشریف فرما تھے متاثر ہوا اور لوگ متفرق و پراگندہ ہو گئے۔ حضرت نے قلب لشکر کی یہ حالت دیکھی تو میسرہ لشکر کا رُخ کیا اس حالت میں کہ نہ بدن پر زرہ تھی اور نہ سر پر خود اور ہاتھ میں صرف ایک نیزہ تھا۔ امام حسن امام حسین اور محمد ابن حنفیہ آپ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ داہنے بائیں اور سر کے اُوپر سے تیر سنسناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مگر چمکتی ہوئی تلواریں لچکتے ہوئے نیزے اور برستے ہوئے تیر آپ کے قدموں کو روک نہ سکے اس اثناء میں بنی اُمیہ کا ایک آزاد کردہ غلام احمر سامنے آیا یہ تلوار کا دھنی اور مانا ہوا شہزور تھا۔ حضرت

نے اس کی طرف بڑھنا چاہا کہ آپ کا ایک غلام کیسان اس کی طرف لپکا کچھ دیر مقابلہ کیا اور آخر اس کے ہاتھ سے شہید ہو گیا۔ اب اس نے امیرالمومنین پر حملہ کرنا چاہا آپ نے اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر اس کی زرہ کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور زور کر کے گھوڑے کے اوپر سے اسے اٹھا لیا اور اتنی زور سے زمین پر مارا کہ اس کی ہڈیاں پس کر سُرمہ ہو گئیں۔

حضرت دشمن کی کثرت اور گرد و پیش کے خطرات سے بے نیاز ہو کر تیزی سے آگے بڑھے امام حسن نے دشمن کی بڑھتی ہوئی یلغار کو دیکھ کر کہا کہ بابا کیا یہ بہتر نہ تھا کہ آپ دشمن کی طرف بڑھنے کی بجائے اپنی صفوں کی طرف چلے جاتے۔ حضرت نے فرمایا:۔

ان اباك واللہ لا يبالی اوقع علی الموت ام وقع الموت عليہ	بیٹا! خدا کی قسم تمہارے باپ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ موت کی طرف بڑھے یا موت اس کی طرف بڑھے"۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳ صـ۱۵۲)

جب امیرالمومنین میسرہ کے قریب پہنچے تو لہراتے ہوئے پھریروں کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کن کے نشانات ہیں لوگوں نے کہا کہ یہ قبیلۂ ربیعہ کے پرچم ہیں فرمایا کہ یہ اللہ کی جماعت کے پرچم ہیں جس کے قدموں میں لغزش نہیں آئی اور جنگ کی سختیوں کے باوجود ثابت قدم رہی ہے۔ پھر ایک نوجوان حضین ابن منذر کو جو سرخ پرچم اٹھائے ہوئے تھا اپنے قریب بلایا اور فرمایا کہ تم اس علم کو لے کر ایک ہاتھ آگے نہیں بڑھتے اس نے کہا ضرور ایک ہاتھ کیا دس ہاتھ۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا حضرت نے اسے ضرورت سے زیادہ آگے بڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ بس یہیں رُک جاؤ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ قبیلۂ ربیعہ نے حضرت کو اپنی صفوں میں دیکھ کر کہا کہ اے لوگو تم میں سے ایک شخص کے زندہ ہوتے ہوئے اگر امیرالمومنین کو کوئی گزند پہنچا تو تم تمام عرب میں ذلیل و رسوا ہو جاؤ گے۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شامیوں کی صفوں کے مقابلہ میں صفیں جما دیں۔

حضرت میمنہ لشکر کے پسپا اور قلب لشکر کے منتشر ہونے کے بعد میسرہ میں تشریف فرما تھے کہ مالک اشتر کو میسرہ کی جانب آتے دیکھا۔ جب وہ قریب آئے تو فرمایا اے مالک تم میدان چھوڑ کر جانے والوں کو آواز دو اور انہیں کہو کہ اگر حیاتِ فانی کے دن ختم ہو چکے ہیں تو یہ فرار تمہیں موت سے نہیں بچا سکتا مالک نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو آواز دی کہ اے لوگو! میں مالک اشتر ہوں تم میدان چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو۔ دشمن صرف دین کی بناء پر تم سے برسرِ پیکار ہے وہ چاہتا ہے کہ سنت کے آثار ختم کرے۔ جاہلیت کا دور پلٹائے اور تمہیں اسی مذہب و مسلک کا پابند بنائے جسے تم حسن بصیرت و حسن توفیق سے چھوڑ چکے

ہو۔اے لوگو دین کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دینے کے لئے آؤ۔ یاد رکھو کہ فرار دنیا کی روسیاہی اور آخرت کی تباہی کا باعث ہے۔ مالک کی اس آواز پر قبیلۂ بنی مذحج پلٹا اور کہا کہ ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم اس پر عمل کریں گے۔ مالک نے کہا کہ تم نے میدان چھوڑ کر اپنے کو رسوا کیا ہے اب اس کی تلافی کرو اور مجھے امیرالمومنین کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دو۔ یہ لوگ مالک کی سرکردگی میں میمنہ کی جانب بڑھے جو دشمن کے حملوں کی تاب نہ لاکر پوری طرح بکھر چکا تھا۔ اگرچہ میمنہ میں سبھی کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ مگر قبیلۂ ہمدان نے سب سے آخر میں میدان چھوڑا تھا۔ ان کے آٹھ سو جانباز سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں جمے رہے اور جب ان میں سے ۱۸۰ آدمی کام آگئے اور ۱۱ علمبردار یکے بعد دیگرے شہید ہوگئے اور ان کے قدم بھی اکھڑ گئے ان علمبرداروں میں کریب ابن شریح، شرجیل ابن شریح، مرثد ابن شریح، ہبیرہ ابن شریح اور سمیر ابن شریح چھ حقیقی بھائیوں نے باری باری علم اٹھایا اور جاں نثاری کا حق ادا کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ پھر سفیان ابن زید، اور کریب ابن زید نے علم بلند کیا اور یہ تینوں بھائی دادِ شجاعت دیتے ہوئے کام آگئے۔ ان کے بعد عمیرہ ابن بشر نے علم اٹھایا اور یہ دونوں بھائی بھی شہید ہوگئے۔ ان کے بعد جب وہب ابن کریب نے علم اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کے قبیلہ کے ایک آدمی نے کہا کہ اس علم کے نیچے بڑی کثرت سے لوگ مارے جا چکے ہیں تم اس علم کو لے کر میدان سے ہٹ جاؤ اور اپنی اور اپنے قبیلہ کی جانیں بچاؤ ورنہ تم میں ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے دیکھا کہ مختصر جمعیت کے ساتھ شام کی طوفانی یلغاروں کو روکا نہیں جاسکتا مجبوراً پیچھے ہٹا اور اس کے ساتھ بچے کھچے لوگ بھی پیچھے ہٹے اور کہنے لگے کہ اگر ہمیں ایک ایسا گروہ مل جائے جو ہم سے یہ معاہدہ کرے کہ ایک ایک کرکے قتل ہو جائیں گے اور میدان نہیں چھوڑیں گے تو ہم آگے بڑھ کر لڑیں گے یہاں تک کہ قتل ہو جائیں یا دشمن کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ جب یہ لوگ مالک اشتر کے قریب سے گزرے تو انہوں نے ان کی بات سن کر کہا کہ آؤ ہم تم سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ جیتے جی میدان نہیں چھوڑیں گے یا ہم قتل ہو جائیں گے یا دشمن کو ٹھکانے لگائیں گے اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد وہ مالک کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ مالک نے از سر نو میمنہ کی صف بندی کی فوج میں جوش و ولولہ کی نئی روح بھری اور انہیں لے کر بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی سپاہ پر حملہ آور ہوئے۔

مالک مصروف جنگ تھے کہ چند آدمیوں کو دیکھا کہ وہ ایک سپاہی کو ہاتھوں پر اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کون ہے بتایا کہ یہ زیاد ابن نضر حارثی ہیں جو عبداللہ ابن بدیل کے لشکر میں شامل تھے۔ جب ابن بدیل نرغہ میں گھر گئے تو انہوں نے علم بلند کیا اور لڑتے ہوئے زخموں سے چور چور ہوگئے ہیں۔ پھر دیکھا کہ ایک اور زخمی کو اٹھا کر لایا جا رہا ہے۔ پوچھا کہ یہ کون ہے ؟ بتایا گیا کہ یہ یزید ابن قیس

ارحبی ہیں جنہوں نے زیاد ابن نضر کے بعد علم اٹھایا اور لڑتے ہوئے زخموں سے نڈھال ہوگئے ہیں۔ مالک نے کہا کہ خدا کی قسم یہ ہے ان جانبازوں کا صبر و استقلال اور ان کی جانفروشی کا زندہ ثبوت۔ انسان کو شرم آنا چاہیئے کہ وہ جان لئے یا جان دیئے بغیر میدان سے منہ موڑے۔ یہ کہ کر آگے بڑھے اور صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں عبداللہ ابن بدیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ زخموں سے بے حال پڑے تھے۔ جب ابن بدیل اور ان کے ہمراہیوں نے اپنے آدمیوں کو دیکھا تو ڈھارس بندھی اور ایک تازہ دم فوج کے مانند حملہ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور معاویہ کی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ مالک نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وُہ نہ رُکے اور قدم آگے بڑھائے۔ شامیوں کے لشکر سدِراہ ہوئے مگر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکے ان میں سے جو سامنے آتا ابن بدیل اسے تہ تیغ کر دیتے یہاں تک کہ سات آدمیوں کو قتل کر کے سیدھے معاویہ کے خیمہ کی طرف بڑھے۔ معاویہ نے انہیں دیکھا تو لشکر والوں سے چلا کر کہا کہ اگر تم تیروں، تلواروں اور نیزوں سے انہیں نہیں روک سکتے تو ان پر پتھر برساؤ چنانچہ چاروں طرف سے پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ابن بدیل اور اُن کے ساتھی زخموں سے نڈھال ہو گئے۔ شامیوں نے سنگِ باراں کر کے انہیں بے حال کر دیا تو تلواریں لے کر بڑھے انہوں نے بھی ہتھیار سنبھال لئے۔ مگر شامیوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کو چند محصور اور زخمی نہ روک سکے۔ عبداللہ ابن بدیل اور ان کے ہمراہیوں میں سے کچھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور کچھ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ شامیوں نے ان بھاگنے والوں کا پیچھا کیا مگر مالک اشتر نے ابن جمہان جعفی کو ایک دستہ فوج کیساتھ بھیجا جنہوں نے شامیوں پر حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور یہ لوگ مالک کے لشکر میں آکر شامل ہو گئے۔

مالک اشتر دوسری سمت سے حملہ آور تھے اور اُن کے پرچم کے نیچے بنی مذحج اور قبیلہ ہمدان دشمن کے سروں پر تلواریں برسا رہے تھے۔ جب انہوں نے مل کر حملہ کیا تو شامی اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ جس طرح بھیڑیئے کو دیکھ کر بھیڑ بکریوں کے غول بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور عصر کے بعد ان صفوں میں جا کر شامل ہو گئے جو معاویہ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔ مالک پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ان گھیرا ڈالنے والی صفوں پر حملہ کر کے انہیں منتشر کرنا شروع کیا۔ جب پانچ حفاظتی حلقوں میں سے صرف ایک حلقہ منتشر ہونے سے رہ گیا تو معاویہ نے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ دیئے اور میدان چھوڑ کر نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر پھر سنبھلے اور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جب قبیلۂ ربیعہ کے افراد میدان میں پرچم لہراتے ہوئے آئے تو شامیوں کی طرف سے ذوالکلاع حمیری قبیلہ حمیر کے ساتھ اور عبیداللہ ابن عمر چار ہزار قاریان شام کی جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوئے یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کمزور دل لوگوں کے قدم اکھڑ گئے اور جو ثابت قدم رہے وہ جی توڑ کر لڑتے تو رہے مگر دشمن

کے مقابلہ میں کمزور پڑ گئے۔ زیاد ابن خصفہ نے جب دیکھا کہ شامی قبیلۂ ربیعہ پہ چھائے جا رہے ہیں تو انہوں نے قبیلۂ عبد القیس سے کہا کہ ذوالکلاع اور عبید اللہ ابن عمر قبیلۂ ربیعہ کو ختم کئے دے رہے ہیں۔ اٹھو اور ان کی مدد کرو ورنہ وہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ قبیلۂ عبد القیس نے ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ربیعہ کی مدد کے لئے بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر اس طرح چھا گئے جس طرح چلتی گھٹائیں اُفق پر چھائی جاتی ہیں۔ قبیلۂ عبد القیس کے آنے سے قبیلہ ربیعہ کی قوت و طاقت بڑھ گئی اور وہ پوری پامردی سے دشمن کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ ذوالکلاع اور عبید اللہ جو بڑے جوش و خروش سے لڑ رہے تھے ٹھنڈے پڑ گئے اور قبیلۂ حمیر میں بھی دم خم نہ رہا۔

اس ہنگامۂ کارزار میں امیرالمومنین کے لشکر میں سے ابو شجاع حمیری نے قبیلۂ حمیر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے گروہ حمیر خدا تمہیں ذلیل و روسیاہ کرے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک طاغی و باغی کی حمایت میں علی سے برسرِ پیکار ہو اور یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ معاویہ علی سے بہتر و افضل ہے اور پھر ذوالکلاع سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے ذوالکلاع ہم تمہارے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ تم دینی جذبات رکھتے ہو کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ معاویہ علی سے افضل اور اُن کے مقابلہ میں حق بجانب ہے کہا کہ میں معاویہ کو علی سے افضل تو نہیں سمجھتا مگر خون عثمان کے سلسلہ میں مجھے ان سے لڑنا پڑ گیا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ عثمان کا خون رائیگاں جائے۔ ذوالکلاع حضرت علی افضلیت کا تو اقرار کرتا ہے مگر قصاص کے جنون نے اسے فہم و فراست سے اس حد تک دور کر دیا تھا کہ لشکر شام کی ضلالت و کجروی کے بارے میں حدیث نبویؐ سن کر بھی اس کی بصیرت نے کام نہ دیا۔ چنانچہ اس نے عمرو ابن عاص سے جنگ کے دوران اور اس سے قبل پیغمبر اسلام کی یہ حدیث سنی تھی کہ عمار کا قاتل ایک باغی گروہ ہو گا۔ اس حدیث کی وجہ سے وہ کچھ دیر شش و پنج میں رہا اور چاہا کہ وہ اس جنگ میں عمار کا موقف معلوم کرے۔ چنانچہ وہ حضرت کی صفوں میں اپنے قبیلہ کی ایک فرد ابو نوح حمیری کی تلاش میں آیا تا کہ اس سے عمار کے بارے میں دریافت کرے۔ جب اس سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں گو تم لشکر مخالف کی ایک فرد ہو مگر تمہاری صدق بیانی و راست گوئی پر مجھے اعتماد ہے۔ کہا کہ پوچھو میں صحیح صحیح بات کہوں گا اور غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا۔ کہا کہ عمرو ابن عاص نے حضرت عمر کے دورِ خلافت میں یہ حدیث بیان کی تھی کہ شام اور عراق کے دو گروہ آپس میں ٹکرائیں گے اور وہ گروہ حق بجانب ہو گا جس میں عمار یاسر ہوں گے۔ کیا عمار یاسر تمہاری صفوں میں موجود ہیں کہا کہ خدا کی قسم وہ ہمارے لشکر میں موجود ہیں اور تم میں سے ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتارنے کی فکر میں ہیں۔ کہا کہ پھر تھوڑا وقت نکال کر میرے ساتھ عمرو ابن عاص کے خیمہ تک

چلو اور اسے بتاؤ کہ عمار یاسر تمہارے لشکر میں موجود ہیں شائد اس کے نتیجہ میں جنگ رک جائے، صلح کی کوئی صورت نکل آئے اور ہم ہلاکت و تباہی سے بچ جائیں۔ کہا کہ میں جانے کو تو جا سکتا ہوں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہارے غدر و فریب کا شکار نہ ہو جاؤں۔ ذوالکلاع نے کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو درمیان میں لا کر تم سے عہد کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ نہ تمہیں قتل کیا جائے گا۔ نہ تمہارے ہتھیار چھینے جائیں گے اور نہ تمہیں بیعت پر مجبور کیا جائے گا تم صرف عمرو ابن عاص کے سامنے اتنا کہہ دو کہ عمار تمہارے لشکر میں موجود ہیں۔ اس عہد و پیمان کے بعد دونوں عمرو ابن عاص کی قیامگاہ پر پہنچے۔ عمرو نے ذوالکلاع کے ہمراہ ایک اجنبی کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون ہے مجھے تو یہ ابوترابی معلوم ہوتا ہے ابو نوح نے کہا کہ میرے چہرے سے پیغمبر اور دوستداران پیغمبر کی عظمت و قدوسیت کے آثار نمایاں ہیں اور تمہارے اندر مجھے ابوجہل اور فرعون کے عادات و اطوار کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ اس پر ابوالاعور سلمی نے تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ یہ ذلیل اور جھوٹا ہمارے منہ پر ہمیں گالیاں دیتا ہے ہم اس بدزبانی کا اسے مزا چکھائیں گے۔ ذوالکلاع نے کہا کہ یہ میرا ابن عم ہے اور میں نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اگر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں تمہاری ناک توڑ دوں گا۔ میں اسے اس غرض سے لایا ہوں کہ یہ تمہیں عمار کے بارے میں بتائے۔ عمرو ابن عاص نے پوچھا کہ کیا عمار علی کے لشکر میں شامل ہیں۔ ابو نوح نے کہا کہ تم ان کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو؟ کہا کہ میں نے رسول کو فرماتے سنا تھا۔ ان عمارا تقتله الفئة الباغية۔ عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا" کہا کہ خدا کی قسم عمار ہمارے لشکر میں موجود ہیں اور وہ تمہیں اور تمہاری سپاہ کو نیست و نابود کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ذوالکلاع کو جب عمار کی موجودگی اور حدیث پیغمبر کی تصدیق ہو گئی تو کہا کہ پھر وہ باغی گروہ تو ہم ہوئے عمرو نے کہا کہ وہ علی کے ساتھ ہیں تو کیا ہوا آخر میں وہ ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔

یہ جواب صرف ایک طفل تسلی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے سطحی ذہنوں سے تو کھیلا جا سکتا ہے۔ مگر کسی بابصیرت شخص کے لئے اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ کون سے قرائن تھے جن کے پیش نظر یہ دعویٰ کیا گیا کہ عمار امیرالمومنین سے کٹ کر سپاہ شام میں شامل ہو جائیں گے۔ کیا ان سے رسل و رسائل کا رابطہ تھا یا ان سے در پردہ کوئی بات چیت ہو رہی تھی یا ان کے طور طریقوں سے اس کا اندازہ لگایا تھا؟ جب یہ کچھ نہ تھا تو یہ جواب ایک فریب کے سوا کیا ہو سکتا ہے جسے اس لئے گھڑ لیا گیا تا کہ سننے والوں کو اپنے دام میں جکڑے رکھیں۔ خدا جانے یہ جواب ذوالکلاع کو مطمئن کر سکا یا نہیں مگر وہ عملاً سپاہ شام ہی سے منسلک رہا۔ حالانکہ لشکر ہی کی ایک فرد عبداللہ ابن عمر عنسی نے اس گفتگو کو سن کر ذوالکلاع کو رائے

دی کہ وہ باغی گروہ کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جائے مگر وہ نہ مانا۔ شائد اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہوگی کہ عمار ان کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ البتہ عبداللہ ابن عمر عنسی لشکر شام سے الگ ہو کر امیرالمومنین کے لشکر میں شامل ہو گیا اور اس موقع پر چند اشعار کہے جن میں سے دو شعر یہ ہیں:۔

لا لا اقاتل عمارا علی طمع　　　بعد الروایة حتی ینفخ الصور

"اس روایت کے بعد میں کسی طمع و لالچ کی بنا پر صور کے پھونکنے تک عمار سے جنگ و قتال نہیں کروں گا"

ترکت عمرا و اشیاعا له نکدا　　　انی بترکهم یا صاح معذور

"میں نے ابن عاص اور اس کے باغی گروہ کو چھوڑ دیا ہے اور اے دوست میں انہیں چھوڑ دینے میں معذور ہوں"

معاویہ کو اس واقعہ کا جب علم ہوا تو وہ عمرو ابن عاص پر بہت بگڑے۔ عمرو نے کہا کہ میں نے تو حدیث رسول بیان کی تھی اب کوئی چلا جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

ذوالکلاع عمار یاسر کی راہ تکتا رہ گیا اور میدان جنگ میں لڑتا ہوا قبیلہ بکر ابن وائل کی ایک فرد خندف بکری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ذوالکلاع کے بیٹے کو جب باپ کے مارے جانے کا علم ہوا تو ایک شخص کے ذریعہ اشعث ابن قیس کو کہلوا بھیجا کہ اسے باپ کا لاشہ اٹھالانے کی اجازت دی جائے۔ اشعث نے جواب میں کہا کہ اگر میں نے اجازت دے دی تو امیرالمومنین مجھے مشکوک نظروں سے دیکھیں گے۔ اور میں پہلے ہی کون ساثقہ و معتمد ہوں۔ تم سعید ابن قیس ہمدانی سے جو میمنہ لشکر میں موجود ہیں دریافت کرو۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو پھر تمہیں کوئی روک نہیں سکتا۔ ابن ذی الکلاع نے سعید کے پاس آدمی بھیجا اور ان سے اجازت طلب کی۔ سعید نے کہا کہ امیرالمومنین کی اس پر نظر نہیں ہے کہ تم میں سے کون آتا ہے اور کون جاتا ہے تم بے کھٹکے آؤ اور اپنے باپ کا مُردہ اٹھالے جاؤ۔ ابن ذی الکلاع حضرت کے میمنۂ لشکر میں آیا اور باپ کا لاشہ اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر کہیں نظر نہ آیا۔ پھر میسرہ لشکر کا رُخ کیا وہاں بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی نظر ایک خیمہ پر پڑی دیکھا کہ ذوالکلاع کا لاشہ خیمہ کی طنابوں سے جکڑا پڑا ہے۔ اس نے خیمہ والوں سے کہا کہ مجھے اپنے باپ کی میت اٹھالے جانے کی اجازت دو۔ انہوں نے کہا کہ ہماری طرف سے اجازت ہے اور ہم تم سے معذرت خواہ ہیں اور اللہ سے بھی عذر خواہ ہیں۔ اگر تمہارا باپ امیرالمومنین کا باغی نہ ہوتا تو اس حالت میں نہ پڑا رہتا۔ ابن ذی الکلاع اور اس کے ایک حبشی غلام نے چاہا کہ اسے اٹھائیں مگر اس پہاڑ کا اٹھانا آسان کام نہ تھا ہمت ہار کر بیٹھ گئے

اور اہل خیمہ سے کہا کہ تم میں کوئی ہے جو اس کے اٹھانے میں ہمارا ہاتھ بٹائے؟ خندف بکری نے کہا کہ تم دونوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ کہا کہ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے تو تم اکیلے اسے کیونکر اٹھا سکو گے۔ کہا کہ جس نے اُسے اس حالت تک پہنچایا ہے وُہ اُسے اٹھا بھی سکتا ہے۔ چنانچہ خندف نے اسے اٹھا کر خچر پر لادا اور رسیوں سے جکڑ دیا۔

ذوالکلاع کے مارے جانے سے حمیریوں کا جوش انتقام بڑھ گیا اور وُہ عبیداللہ ابن عمر کی صفوں میں آکر شامل ہو گئے۔ اس موقع پر عبیداللہ نے ایک دام فریب بچھایا اور امام حسن کو پیغام بھجوایا کہ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اسے سن لیجئے۔ امام حسن کو یہ پیغام ملا تو آپ صفوں سے نکل کر اس کے سامنے آئے اور فرمایا کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ کہا کہ میں جو بات کہنے والا ہوں اس سے آپ ہی کا مفاد وابستہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ قریش کو علی سے انتہائی صدمات پہنچ چکے ہیں وہ آپ کی امارت تو گوارا کر سکتے ہیں مگر ان کا اقتدار کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ انہیں اقتدار سے الگ کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان کی برطرفی کے بعد خلافت آپ کے سپرد کر دیں گے۔ امام حسن نے یہ بات سنی تو نفرت وحقارت سے پیشانی پر بل ڈالا اور فرمایا کہ اے عبیداللہ تم آج نہیں تو کل مارے جاؤ گے۔ تمہیں شیطان نے بہکا کر اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہلاکت اور تباہی ہی تباہی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں امیرالمومنین کے خلاف کسی سازش میں حصہ لوں۔ تم نے یہ کہہ کر اپنی کم ظرفی اور عقل سے تہی دامانی کا ثبوت دیا ہے۔ عبیداللہ نے یہ جواب سُنا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اب اس نے پلٹ کر صف بندی کی اور عقبی جانب سے حضرت کے میسرہ پر حملہ کیا۔ میسرہ میں قبیلۂ ربیعہ کے جانباز پہلے ہی سے مستعد تھے انہوں نے تلواریں کھینچ لیں اور دشمن کی صفوں میں گھس کر تہلکہ مچا دیا۔ ظہر سے لے کر مغرب تک پیہم تلواریں چلتی رہیں اور خون کے سیلاب بہتے رہے۔ آخر میسرۂ عراق نے اس شدت سے حملہ کیا کہ میمنۂ شام منتشر ہو گیا۔ مگر رات کے اندھیرے میں پھر سمٹ کر جمع ہوا۔ قبیلۂ ربیعہ نے حملہ کر کے پھر اسے منتشر کیا یہاں تک کہ شامیوں کے جھنڈے کے گرد صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے جنہوں نے از سرِ نو اپنی صفیں درست کیں اور جان توڑ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ ادھر قبیلہ ربیعہ بھی جان لڑائے ہوئے تھا آگے بڑھ کر شامیوں سے گتھ گیا۔ شب بھر تلواروں پر تلواریں چلتی رہیں اور لاشوں کے ڈھیر لگتے رہے۔ اس خونی ہنگامہ میں نماز کا وقت آتا اور گزر جاتا۔ اور اتنا موقع ہی نہ ملتا تھا کہ نماز ادا کی جا سکے۔ اوقات نماز میں صرف تکبیروں پر اکتفا کی جاتی تھی۔ جب اس بھیانک رات نے اپنا دامن سمیٹا اور افق پر صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو حضرت کے لشکر میں اذان کی آواز بلند ہوئی۔ حضرت نے صدائے اذان سُن کر فرمایا:۔

یا مرحباً بالقائلین عدلا — و بالصلوٰۃ مرحبا و اھلا

اس معرکہ میں عبیداللہ ابن عمر، ہانی ابن خطاب یا محرز ابن صحصح یا حریث ابن جابر حنفی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ شامیوں کی طرف سے عبیداللہ کا لاشہ حاصل کرنے کے لئے دس ہزار درہم کی پیشکش کی گئی مگر حضرت نے ان کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا:۔

انما جیفتہ جیفۃ کلب لا یحل بیعھا۔ (مروج الذہب۔ ج ۲ ص ۲۳) — یہ ایک سگِ مردہ کی لوتھ ہے اس کی بیع جائز نہیں ہے۔

آخر اس کی دونوں بیویاں بحریہ بنت ہانی اور اسماء بنت عطارد اس کی میت لینے کے لئے آئیں کچھ لوگوں نے کہا کہ تم تو ان کی میت اٹھانے سے رہیں اگر چاہو تو ہم اس کا لاشہ خچر کی دم سے باندھے دیتے ہیں۔ اور اسے ہنکاتے ہوئے تمہارے خیمہ تک پہنچائے دیتے ہیں۔ اتنے میں زیاد ابن خصفہ خیمہ سے باہر نکلے تو بحریہ بنت ہانی نے ان سے میت لے جانے کے لئے کہا۔ انہوں نے لاشہ ایک خچر پر لدوا دیا اور وہ اسے اپنے ہمراہ لے گئیں اس طرح کہ اس کے ہاتھ پیر زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے۔

ذوالکلاع اور عبیداللہ کے مارے جانے سے معاویہ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ انہوں نے عمرو ابن عاص سے کہا کہ خدا جانے اب یہ عراقی کیا قدم اٹھانے والے ہیں۔ عمرو نے کہا کہ تم قبیلہ ربیعہ کے حملوں کو تو دیکھ ہی چکے ہو اگر انہوں نے علی کے گرد جمع ہو کر حملہ کیا تو ان کے مقابلہ میں شامیوں کے قدم مشکل ہی سے جم سکیں گے۔ معاویہ نے کہا کہ تم مجھے حوصلہ دلانے کے بجائے اور ہراساں کر رہے ہو۔ کہا کہ جو مجھے نظر آ رہا ہے میں نے وہی کہا ہے۔ معاویہ کو جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے خالد ابن معمر کو جو سپاہِ ربیعہ کی کمان سنبھالے ہوئے لڑ رہا تھا یہ پیغام بھجوایا کہ اگر تم میدان سے پیچھے ہٹ جاؤ گے تو میں کامیابی کے بعد تمہیں خراسان کی امارت دوں گا جس پر تم میری زندگی تک فائز رہو گے۔ چنانچہ جب ربیعہ کی پرجوش فوجیں شامیوں کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اس نے اپنے قدم روک لئے اور فوجوں کو منتشر کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ خالد نے ہوسِ اقتدار سے مغلوب ہو کر آخرت سے منہ موڑا مگر اسے دنیا بھی نصیب نہ ہو سکی۔ چنانچہ جب معاویہ نے اس غداری کے صلہ میں اسے امارت خراسان کا پروانہ بھیجا تو وہ خراسان پہنچنے سے پہلے مر گیا اور دنیا و آخرت دونوں سے محروم رہا۔

اس حرب و ضرب کی گرم بازاری میں لشکر شام کا ایک تیغ زن کریب ابن صباح حمیری صفوں سے باہر نکل کر للکارا۔ سپاہِ عراق میں سے مرتفع ابن وضاح زبیدی اس کے مقابلہ کے لئے نکلے مگر تابِ مقاومت کھو کر اس کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ اس نے دوسری مرتبہ للکارا۔ اب حارث ابن جلاح اس کے مقابلہ

کے لئے بڑھے مگر وُہ بھی اسے زیر نہ کر سکے اور تلوار کا وار کھا کر دم توڑ دیا۔ اس کے تیسری مرتبہ پکارنے پر عائذ ابن مسروق ہمدانی میدان میں آئے اور وُہ بھی اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ان تین آدمیوں کو شہید کرنے کے بعد کریب کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے تینوں لاشوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھا اور ان پر چڑھ کر للکارنے لگا۔ امیرالمومنین نے اس کی یہ وحشیانہ حرکت دیکھی تو اس خیال سے کہ دیکھنے والے اس کی تیغ زنی سے مرعوب نہ ہوں کسی اور کو بھیجنے کے بجائے خود اس کے مقابلے کے لئے بڑھے اور اس کے قریب پہنچ کر فرمایا اے کریب یاد رکھ کہ ہند جگر خوار کا بیٹا تجھے جہنم کے شعلوں میں جھونک دے گا میں تجھے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہم اس قسم کی باتیں بہت سنتے چلے آرہے ہیں آپ میری تلوار کی کاٹ تو دیکھ ہی چکے ہیں اگر حوصلہ ہے تو مجھ سے لڑ لیجیئے۔ حضرت کے تیور بدلے اور آگے بڑھ کر اس پر تلوار کا وار کیا وہ زخمی ہو کر زمین پر گرا اور کچھ دیر خاک و خون میں لوٹنے اور ایڑیاں رگڑنے کے بعد خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد حضرت نے دوسرا مبارز طلب کیا۔ فوج مخالف سے حارث ابن وداعہ حمیری میدان میں آیا حضرت نے اسے بھی زمین پر پچھاڑ دیا۔ پھر تیسری مرتبہ للکارنے پر مطاع ابن المطلب عبسی مقابلہ کے لئے نکلا۔ حضرت نے اسے بھی تہ تیغ کر دیا۔ اور شامیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر تم ابتداء نہ کرتے تو ہم بھی پہل نہ کرتے اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی :۔

الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا الله واعلموا ان الله مع المتقین۔

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مساوی ہے اور حرمت والی چیزوں میں برابر کا بدلہ ہے لہذا جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے کی ہے ویسی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور اس بات کو جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس واقعہ پر نظر کرنے سے حق و عدالت کی ایسی تصویر نظروں کے سامنے آتی ہے جس کی مثال تاریخ حرب وضرب میں نظر نہیں آتی۔ آپ نے اس موقع پر تین جنگ آزماؤں کو تہ تیغ کرنے کے بعد اپنا ہاتھ روک لیا حالانکہ ایسے موقع پر جب تین جوانمرد قتل ہو چکے ہوں۔ تو شجاعت کا ولولہ ابھر آتا ہے۔ اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے جس طرح کریب کا حوصلہ دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ اگر آپ اس کے بعد بھی للکارتے اور دشمن کی صفوں سے نکلنے والے سورماؤں کو قتل کرتے رہتے تو شامیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ٹھکانے لگ سکتی تھی کیونکہ تلوار "شیرِ خدا" کے ہاتھ میں تھی مگر آپ نے حق وانصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنے ہی افراد قتل کئے جتنے اس موقع پر دشمن کے ہاتھ سے مارے گئے تھے

اور جتنی کریب کے ہاتھوں سے خونریزی ہوئی تھی اس سے زیادہ خونریزی گوارا نہ کی۔

تیغ بہر عزت دین است و بس　　　مقصد او حفظ آئین است و بس

اس محاربہ حق و باطل میں عمار ابن یاسر خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہ رہ سکتے تھے وہ جنگ آزما تلوار کے دھنی اور مانے ہوئے مرد میدان تھے۔ بدر، اُحد، خندق اور دوسرے غزوات میں شریک ہو کر اپنی شجاعت کا لوہا منوا چکے تھے۔ اگرچہ اب ہاتھوں میں رعشہ چہرے پر جھریاں اور کمر میں جھکاؤ آگیا تھا اور عمر کی ترانویں منزلیں طے کر چکے تھے مگر انحطاط عمر کے باوجود جوانوں سے آگے نظر آتے تھے۔ رنگ گندم گوں سینہ چوڑا چکلا آنکھیں بڑی قد لانبا ریش سفید اور تیور شجاعانہ تھے۔ جب سے پیغمبر اکرم کی زبان مبارک سے اپنی شہادت کی خبر سنی تھی جذبۂ جہاد سے مخمور اور شوقِ شہادت میں سرشار رہتے تھے۔ شام کے باغیوں کو دیکھ کر پیغمبر کی صدائے حق یا عمار تقتلك الفئة الباغیہ " اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا" کانوں میں گونجنے لگی۔ خمیدہ کمر میں پٹکا باندھا لٹکی ہوئی بھووں کو اوپر اٹھایا۔ کانپتے ہاتھوں میں تلوار لی اور امیر المومنین کے سامنے آکر اجازت طلب ہوئے۔ حضرت نے نظر بھر کر عمار کو دیکھا اور فرمایا مھلا رحمك الله " ٹھہرو خدا تم پر رحم کرے" عمار نے حضرت کو اذنِ جہاد دینے میں متردد دیکھا تو کہا کہ پیغمبر اکرم مجھے شہادت کی خبر دے گئے تھے۔ اب میں عمر کی آخری منزل میں ہوں اور شہادت گاہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ لہٰذا مجھے اجازت دیجیے۔ حضرت نے عمار کے تیور دیکھے تو انہیں بادل نخواستہ اجازت دی۔ عمار نے زرہ پہنی ہتھیار سجے گھوڑے پر پڑی جمائی اور سر آسمان کی طرف بلند کر کے کہا:۔

اللهم انك تعلم انی لو اعلم ان رضاك فی ان اقذف بنفسی فی هذا البحر لفعلته اللهم انك تعلم انی لو اعلم ان رضاك فی ان اضع ظبة سیفی فی صدری ثم انحنی علیها حتی تخرج من ظهری لفعلته و انی لا اعلم الیوم هو ارضی لك من جهاد هولاء الفاسقین ولو اعلم ان عملا من الاعمال	بارِ الٰہا! تو خوب جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ تیری رضا اس میں ہے کہ میں دریا میں پھاند جاؤں تو میں ایسا کر گزرتا۔ اے خدا تو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تیری خوشنودی اس میں ہے کہ میں تلوار کی نوک اپنے سینہ پر رکھوں اور اتنا جھکوں کہ تلوار میرا سینہ چیر کر پشت کے پار ہو جائے تو مجھے اس میں بھی دریغ نہ ہوتا۔ میں آج کے دن تیری خوشنودی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں سمجھتا کہ ان فاسقوں سے جہاد کروں اگر مجھے علم ہوتا کہ اس عمل سے بڑھ

هو ارضی لك لفعلته۔ کر کوئی عمل تجھے خوش کرنے والا ہے تو میں اس میں بھی کوتاہی نہ کرتا۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۲۶)

امیرالمومنین نے ایک دستۂ فوج عمار کی زیر کمان ترتیب دیا۔ علم لشکر ہاشم ابن عتبہ مرقال کے سپرد کیا اور اُن سے مسکراتے ہوئے فرمایا اے ہاشم تم کب تک روٹیاں توڑتے رہو گے۔ اٹھو اور دشمنان دین سے جنگ کرو۔ ہاشم نے جو جواب دیا اس کی ترجمانی سعدی کا یہ شعر کرتا ہے ؎

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من ایں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرم

ہاشم نے علم لینے کے بعد معاویہ کے لشکر کی طرف نظر دوڑائی اور ایک دستہ فوج کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں بتایا گیا کہ یہ ذوالکلاع کا قبیلہ ہے۔ پھر ایک اور دستہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں بتایا گیا کہ یہ قریش اور اہل مدینہ کا ملا جلا مجمع ہے۔ پھر دوسری سمت اشارہ کر کے پوچھا کہ اس گنبد نما خیمہ کے گرد و پیش کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ معاویہ اور ان کے حفاظتی دستے ہیں۔ کہا کہ خیمہ کی ادھر بھی کچھ لوگوں کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ بتایا گیا کہ یہ عمرو ابن عاص اس کے بیٹے اور اہالی موالی ہیں۔ جب فوجیں صف بستہ و تیار ہو گئیں تو عمار یاسر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے، کہا اے جانبازو اٹھو اور ان فتنہ پردازوں سے جنگ کرو جنہوں نے خون عثمان کے قصاص پر یہ جنگ چھیڑی ہے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے کہتے ہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور ہم ان کے قصاص کے طالب ہیں۔ انہیں قصاص سے کیا مطلب انہیں تو جنگ چھیڑنے کے لئے کوئی بہانہ چاہیئے تھا اور یہ بہانہ ان کے ہاتھ لگ گیا جس سے وہ عوام کو ورغلا کر میدان میں لے آئے ہیں۔ اس جنگ و قتال کا مقصد صرف اقتدار حاصل کرنا ہے۔ انہیں نہ دین سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ حق سے کوئی واسطہ وہ نہیں چاہتے کہ دین و مذہب کی پابندیاں اُن کے مادی لذائذ اور دنیوی تعیشات میں حائل ہوں۔ اس تقریر کے بعد ہاشم نے علم کو جنبش دی لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور ہاشم اور عمار دونوں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور فوجوں کے جلو میں دشمن کی صفوں کی طرف بڑھے۔ عمار جس طرف سے ہو کر گزرتے صحابہ ہجوم کر کے ساتھ ہو جاتے۔ معاویہ نے جب اس جم غفیر کو بڑھتے دیکھا تو ابوالاعور سلمی کی قیادت میں تازہ دم فوجوں کو میدان میں اتارا۔ عمار یاسر نے سپاہ شام میں عمرو ابن عاص کو دیکھا تو اُسے مخاطب کر کے کہا "تف ہے تیری اوقات پر تو نے مصر کی چند روزہ حکومت کی خاطر اپنا دین تک بیچ ڈالا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے تو نے ہمیشہ اسلام کیخلاف بغاوت کر کے اپنی کجروی کا ثبوت دیا ہے۔" عمرو نے کہا کہ ہم خون عثمان کا بدلہ لے رہے ہیں۔ کہا کہ تو نے یہ قدم اللہ کو خوش کرنے کے لئے نہیں اٹھایا۔ میں اس سے پہلے بھی تین

مرتبہ پیغمبر اکرم کے لشکر میں شامل ہو کر تجھ سے لڑ چکا ہوں اور جس نظریہ کی بنا پر پہلے لڑا تھا آج بھی اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر لڑ رہا ہوں۔ اے عمرو کیا تو پیغمبر کا یہ ارشاد بھول گیا کہ ۔" اے عمار تمہیں اے ایک باغی گروہ قتل کرے گا تم اسے جنت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تمہیں دوزخ کی طرف دعوت دے گا" مجھے دیکھ اور پہچان میں عمار ہوں ۔عمرو کے پاس ان باتوں کا جواب ہی کیا تھا سن کر چپ ہو رہا۔

جب دونوں طرف کے لشکر بالمقابل کھڑے ہوئے تو تلواریں اور نیزے لے کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور تلواریں تلواروں سے ٹکرانے لگیں۔ اس گھمسان کی جنگ میں ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ عمار اور ہاشم بھی اس ریلے میں بہہ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ عمار پیری و ضعیفی کے باوجود کانپتے ہاتھوں سے تلوار چلاتے اور دشمن کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے رہے لڑتے لڑتے نظریں اٹھیں تو دیکھا کہ ہاشم کھڑے ہیں۔ کہا اے ہاشم کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں میں گھس کر حملہ کرو آج جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور جنت تیغ و سنان کے سایہ میں ہے۔ اگر یہ لوگ ہمیں پسپا کر کے بحرین کے نخلستان تک دھکیل لے جائیں جب بھی ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں ہاشم نے علم لہرایا اور برق خاطف کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ سروں پر تلواریں چمکیں، سینوں میں نیزے اترے اور لاشوں پر لاشے گرنے لگے۔ عمرو ابن عاص نے دیکھا تو کہا کہ اگر یہ سیاہ جھنڈے والا یونہی لڑتا رہا تو عرب کا صفایا کر دے گا۔ ہاشم اور عمار کے پے در پے حملوں سے شامیوں کی پانچ صفوں میں سے تین صفیں منتشر ہو گئیں۔ جب چوتھی صف پر حملہ آور ہونے کی نوبت آئی تو وہ جان توڑ کر مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں سے قبیلہ ازد اور بجیلہ نے قبیلہ ہمدان کے جوانوں پر بھرپور حملہ کیا جس سے وقتی طور پر ان کے قدم اکھڑ گئے اور ایک ٹیلے پر چڑھ کر پناہ لینے کے لئے پیچھے ہٹے مگر بجیلہ اور ازد نے تعاقب کر کے انہیں میدان میں اتار لیا۔ اب ہمدان کے جوانمردوں نے جم کر جو حملہ کیا تو ان کے تین ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر کے بقیۃ السیف کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ عمار یاسر اپنے ہمراہیوں کو لیکر آگے بڑھے اور ان جتھوں کے قریب پہنچ گئے جو معاویہ کے گرد حصار باندھے کھڑے تھے۔ معاویہ نے انہیں آگے بڑھتے دیکھا تو حفاظتی دستوں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر ان کا راستہ روکیں۔ چنانچہ وہ شمشیر بکف آگے بڑھے۔ ان لوگوں میں عمرو ابن عاص کا بیٹا عبداللہ بھی تھا۔ جو ایک تلوار کمر میں لٹکائے اور ایک تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ جب عمار نے اس سمت کا رخ کیا جدھر عبداللہ تھا تو عمرو اپنے بیٹے کو دیکھ کر چلایا کہ ہائے میرا بیٹا۔ معاویہ نے کہا کہ حوصلہ سے کام لو کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ کہا یہ میرا بیٹا ہے اگر تمہارا بیٹا یزید ہوتا تو میں دیکھتا کہ تم کس طرح صبر کرتے ہو۔ آخر عمرو کے چیخنے چلانے

کی وجہ سے چند شامی آگے بڑھے اور عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو صفوں سے باہر نکال لائے۔

عمار یاسر حملوں پر حملے کر رہے تھے کہ ایک شخص کے ہاتھ سے زخمی ہو گئے۔ قوت و طاقت نے جواب دے دیا اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی زخموں نے نڈھال اور پیاس کی شدت نے بے حال کر دیا۔ آپ کے ایک غلام راشد نے دودھ میں پانی ملا کر پیش کیا آپ نے اس میں سے کچھ پیا اور کہا :-

صدق اللہ ورسولہ الیوم القی الاحبۃ محمدا وحزبہ قال رسول اللہ ان اخر رزقی من الدنیا ضیحۃ لبن۔ (تاریخ ابوالفداء ج ا ص۱۸۱)

اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات سچ ہے۔ میں آج اپنے دوستوں سے ملاقات کروں گا۔ محمد مصطفیٰ اور ان کے گروہ سے۔ رسول اللہ فرما گئے تھے کہ اس دنیا میں میرا آخری رزق پانی میں ملا ہوا دودھ ہوگا"

دودھ پینے سے جسم لاغر میں کچھ توانائی آئی اور پھر حملہ کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے دل میں جان دینے اور مرمٹنے کا جذبہ تھا دنیا کی زندگی سے جی اچاٹ ہو چکا تھا اور ہر قدم طلب شہادت میں اٹھ رہا تھا۔ آپ مصروف جہاد تھے کہ باغی گروہ کی ایک فرد ابوالغادیہ فزاری نے آپ پر نیزہ مارا اور ابن جون سکسکی نے آگے بڑھ کر تلوار سے سر قلم کر دیا۔

امیرالمومنین کو عمار کی شہادت کی خبر ہوئی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ان کی میت پر آئے اور لاش کو دیکھ کر یہ دو شعر پڑھے :-

الا ایھا الموت الذی ھو قاصدی ارحنی فقد افنیت کل خلیلی

"اے موت آ اور مجھے سکون و راحت سے ہمکنار کر تو نے میرے تمام دوستوں کو فنا کر ڈالا ہے اور مجھے بھی چھوڑنے والی نہیں ہے۔"

اراک بصیرا بالذین احبھم کانک تنحو نحوھم بدلیل

"مجھے یوں نظر آتا ہے کہ تو میرے دوستوں میں سے ایک ایک کو پہچانتی ہے گویا کوئی بتانے والا تجھے ان کی نشاندہی کر رہا ہے۔"

پھر انا اللہ وانا الیہ راجعون کے بعد فرمایا کہ جو شخص عمار کی موت سے رنجیدہ خاطر نہیں ہے وہ اسلام سے بہرہ یاب نہیں ہے۔ اس کے بعد نماز جنازہ ادا کی اور انہی کپڑوں میں اسی سرزمین پر انہیں دفن کر دیا۔

عمار کی شہادت سے شامیوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوا اور ان کا باغیانہ موقف بے نقاب ہو

گیا کیونکہ ان میں سے ایک طبقہ نے پیغمبر اکرم کا یہ ارشاد سن رکھا تھا:۔

تقتله الفئة الباغية الناكبة عن الطريق وان اخر رزقه ضياح من لبن۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۵۸)

انہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا جو سیدھی راہ سے منحرف ہوگا اور ان کا آخری رزق دودھ ہوگا جس میں پانی ملا ہوا ہوگا۔

اسی حدیث کی بنا پر ذوالکلاع حمیری کو ذہنی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ مگر عمرو ابن عاص نے یہ کہہ کر اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ عمار ہماری طرف پلٹ آئیں گے۔ اب وہ زندہ ہوتا تو عمرو سے پوچھتا کہ تمہارا وُہ دعویٰ کیا ہوا اور ممکن تھا کہ وُہ اس واضح حقیقت کو دیکھ کر عمرو کے فریب کا پردہ چاک کرتا اور اپنے قبیلہ سمیت باغیوں کے گروہ سے علیحدہ ہو جاتا۔ چنانچہ عمرو نے عمار کی شہادت پر اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

ما ادری بقتل ايهما انا اشد فرحا بقتل عمار او بقتل ذی الكلاع والله لو بقی ذوالكلاع بعد قتل عمار لمال بعامة اهل الشام الی علی۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۵۸)

مجھے نہیں معلوم کہ میں عمار کے قتل سے زیادہ خوش ہوں یا ذوالکلاع کے مارے جانے سے۔ خدا کی قسم اگر ذوالکلاع کے جیتے جی عمار قتل ہو جاتے تو وہ شامیوں کو لے کر علی کے لشکر میں شامل ہو جاتا۔

خزیمہ ابن ثابت انصاری بھی عمار کی شہادت سے پہلے متردد اور حق و باطل کی تمیز سے قاصر رہے اور اس وقت تک تلوار اٹھانا گوارا نہیں کیا جب تک عمار شہید نہ ہو گئے۔ اور جب وُہ شہید ہو گئے تو کہا کہ اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا کہ باغی گروہ وُہ ہے جس کا سرغنہ معاویہ ہے۔ یہ کہہ کر جہاد کے لئے میدان میں اُتر آئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عمرو ابن عاص کے بیٹے عبداللہ کے دل میں بھی کھٹک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے باپ عمرو سے کہا کہ آج ہم نے اس شخص کو قتل کیا ہے جس کے چہرے سے پیغمبر اکرم نے اپنے ہاتھ سے گرد جھاڑتے ہوئے فرمایا تھا:۔

ويحك يا ابن سمية الناس ينقلون لبنة لبنة وانت تنقل لبنتين لبنتين رغبة فی الاجر وانت مع ذلك تقتلك الفئة الباغية۔

اے سمیہ کے بیٹے لوگ تو ایک ایک اینٹ اٹھا رہے ہیں اور تم اجر و ثواب کی خاطر دو دو اینٹیں اٹھاتے ہو۔ تمہیں ایک باغی گروہ

قتل کرے گا۔"   (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۵۸)

ابن عاص نے معاویہ سے کہا کہ تم نے سنا ہے عبداللہ کیا کہتا ہے۔ معاویہ نے عبداللہ اور دوسرے عوام کی پریشاں ذہنی پر قابو پانے کے لئے فوراً کہا:۔

انحن قتلناہ انما قتلہ من جاء بہ۔   "کیا ہم نے قتل کیا ہے قتل تو اس نے کیا ہے جو انہیں لے کر آیا ہے۔"   (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۵۸)

معاویہ کا کہنا تھا کہ شامیوں میں سے ہر شخص یہ کہتا سنا گیا انما قتل عمارا من جاء بہ "عمار کا قاتل وہ ہے جو انہیں لے کر آیا ہے۔" حضرت علی نے یہ پُر فریب تاویل سنی تو فرمایا کہ پھر حمزہ کے قاتل رسولؐ اللہ تھے جو انہیں میدانِ اُحد میں لے کر آئے تھے۔

ہاشم ابن عتبہ میدان میں اترے ہوئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو دم لینے کے لئے رُکتے دیکھا تو انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ تم میں سے جو اللہ کی خوشنودی اور عقبیٰ کی سرخروئی چاہتا ہے وہ دشمن سے ٹکرانے کے لئے آگے بڑھے۔ لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور نیزے تان کر آگے بڑھے جس سمت سے بڑھتے شامی فوجیں راستہ روک کر کھڑی ہو جاتیں اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگتیں۔ اسی اثنا میں شامی فوجوں میں سے ایک غسانی نوجوان صفوں سے باہر نکلا اور یہ شعر پڑھا ؂

انی اتانی خبر فاشجان   ان علیا قتل ابن عفان

"میں نے یہ اندوہناک خبر سنی ہے کہ علی نے ابن عفان کو قتل کر ڈالا ہے۔"

پھر امیرالمومنین کو برا کہتا ہوا حملہ کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ ہاشم نے اس کے تیوروں سے سمجھ لیا کہ یہ نوجوان فریب خوردہ اور قتل عثمان کے پس منظر سے بے خبر ہے۔ آپ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اس سے کہا کہ اے شخص اپنے موقف پر نظر کر، اور اللہ سے ڈر۔ کل تجھے اللہ کے رُو برُو اس کا جواب دینا ہو گا۔ کہا کہ میں تم لوگوں سے جنگ کرنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں اس لئے کہ نہ تم نماز پڑھتے ہو اور نہ تمہارا امیر نماز پڑھتا ہے اور تمہارے امیر ہی نے تم لوگوں کے تعاون سے عثمان کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ ہاشم نے کہا کہ تجھے عثمان سے کیا واسطہ انہیں صحابہ، صحابہ زادوں تابعین اور حفاظ قرآن نے قتل کیا ہے جو شریعت کے احکام بھی جانتے ہیں اور دین میں بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تو نہ دین کے بارے میں سُوجھ بُوجھ رکھتا ہے اور نہ اُمت کے اچھے بُرے کو سمجھنے کی صلاحیت۔ کہا کہ میں جھوٹ کو بُرا سمجھتا ہوں۔ تم نے جو بات کہی ہے وہ درست ہے کہا کہ پھر جس چیز کا تجھے علم نہیں ہے اسے جاننے والوں ہی تک محدود رکھ اور اندھیرے میں غلط قدم اٹھانے سے بچ کر رہ۔ تو نے جو یہ کہا ہے کہ ہمارا امیر نماز

نہیں پڑھتا تو دنیا جانتی ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اور روئے زمین پر اُن سے بڑھ کر کون ہے جو اسرار دین کا سمجھنے والا اور احکام شرع کی پابندی کرنے والا ہو۔ انہیں رسول اللہ سے قرب و قرابت کا وہ شرف حاصل ہے جو کسی ایک کو بھی حاصل نہیں ہے۔ تو نے ہم پر یہ الزام عاید کیا ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تو کیا تجھ کو نظر نہیں آتا کہ ہمارے آدمی راتوں کو اٹھ اُٹھ کر مصلے بچھاتے نمازیں پڑھتے اور تلاوت قرآن کرتے ہیں۔ تجھے چند شوریدہ سر لوگوں نے بہکا دیا ہے جس کے نتیجہ میں تم نے حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھ لیا ہے اور کورانہ اطاعت کرتے ہوئے ضلالت و گمراہی کی راہ پر چل پڑا ہے اس نوجوان نے یہ باتیں سنیں تو اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور کہا کہ تم مجھے راست گو اور نیک کردار انسان نظر آتے ہو۔ اگر میں توبہ کروں تو کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟ کہا کہ ہاں اللہ توبہ کا قبول کرنے والا اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہے۔ یہ سن کر وہ نوجوان جنگ سے دستبردار ہو کر واپسی کے ارادہ سے پلٹا۔ ایک شامی نے اسے کہا کہ اس عراقی نے تمہیں فریب دیا ہے کہا کہ فریب اور ہے اور حق کی کشش اور ہے۔ اس نے مجھے باطل کی حمایت سے بچا کر ہمدردی و خیر خواہی کا ثبوت دیا ہے۔

ہاشم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں کھڑے تھے کہ شامیوں کی طرف سے قبیلہ تنوخ کا ایک دستہ آگے بڑھا۔ ہاشم اپنے لشکر کو لے کر ان پر حملہ آور ہوئے۔ کچھ دیر تک تلواریں چلتی رہیں نو یا دس تنوخی ہاشم کے ہاتھ سے تہ تیغ ہوئے۔ اسی لڑائی کے دوران حارث ابن منذر تنوخی نے آپ کے پیٹ پر نیزہ مارا آپ بے حال ہو کر زمین پر گر پڑے۔ لشکر کی پیش قدمی رُک گئی اور ایک عام بے دلی سی پھیل گئی۔ امیر المومنین نے بڑھتے ہوئے لشکر کو رکتے دیکھا۔ تو ایک شخص کے ذریعہ ہاشم کو پیغام بھجوایا کہ علم لے کر آگے بڑھو۔ ہاشم نے پیغامبر سے کہا کہ ذرا میرے پیٹ کی طرف دیکھو۔ دیکھا کہ پیٹ چاک ہو چکا ہے اور خون کا فوارہ اُبل رہا ہے۔ کچھ دیر موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد دم توڑ دیا اور خلد بریں کی راہ لی۔ ہاشم کے ہمراہ قبیلہ اسلم کے حفاظ کی ایک جماعت بھی شہید ہو گئی۔ جب پیغامبر نے پلٹ کر امیرالمومنین کو ہاشم کی شہادت کی خبر دی تو آپ ہاشم اور دوسرے شہداء کے لاشوں پر آئے اور یہ دو شعر پڑھے ؎

جزى الله خيرا عصبة اسلمية   صباح الوجوه صرعوا حول هاشم

"خدا اس اسلمی جماعت کو جزائے خیر دے جو روشن چہروں والے اور ہاشم کے گرد و پیش لڑتے ہوئے مارے گئے ہیں۔"

بريد وعبد الله منهم ومنقذ   وعروة ابنا مالك فى الاكارم

"اس جماعت میں برید، عبداللہ اور مالک کے دونوں بیٹے عروہ اور منقذ شامل ہیں یہ وہ تھے جن کا شمار شرفائے عرب میں ہوتا تھا۔"

اس اثنار میں امیرالمومنین نے شامیوں کے پرچم کے نیچے ایک جتھا دیکھا پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں ۔ بتایا گیا کہ یہ قبیلۂ غسان ہے ۔ فرمایا کہ یہ ابھی تک میدان میں جمے ہوئے ہیں۔ جب تک ان کے سروں پر تلواروں کے بھرپور وار نہ ہوں گے اور نیزے ان کے سینوں میں نہ اتریں گے یہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے ۔ پھر اپنی صفوں کی طرف نظر کی اور پکار کر کہا کہ تم میں کون ہے جو ثواب آخرت پر نظر رکھ کر صبر و استقامت سے لڑے اس آواز پر فوج کا ایک دستہ آگے بڑھا۔ حضرت نے محمد ابن حنفیہ کو بلا کر کہا کہ تم اس دستہ فوج کو لے کر آہستگی کے ساتھ آگے بڑھو اور نیزے تان کر دشمن کی صفوں کے آگے کھڑے ہو جاؤ اور میرے حکم کا انتظار کرو ۔ محمد ابن حنفیہ کے روانہ ہونے کے بعد مالک اشتر کو ایک دستہ فوج کے ساتھ ان کی کمک کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ اب حملہ کر دو۔ محمد ابن حنفیہ اور مالک اشتر نے مل کر حملہ کیا۔ جب ایک ساتھ نیزے اور تلواریں لے کر دشمن کی فوج پر جا پڑے تو غسانیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ اور اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے ۔

اس جنگ کی گرم بازاری میں عراقیوں کے ایک ہزار سوار اپنے لشکر سے کٹ کر شامیوں کے گھیرے میں آگئے ۔ یہ محاصرہ اتنا شدید تھا کہ فوج بے دست و پا ہو کر رہ گئی ۔ امیرالمومنین نے دشمن کو گھیرا ڈالے دیکھا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم میں کون ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈالے ۔ عبدالعزیز ابن حارث جعفی نے کہا کہ آپ حکم دیں میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا ۔ فرمایا کہ اللہ تمہارا مددگار ہو تم شامیوں کا حصار توڑ کر اپنے لشکر والوں کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ وہ ادھر سے اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں اور ادھر سے ہم نعرۂ تکبیر لگائیں اور ایک ساتھ گھیرا ڈالنے والوں پر حملہ کر دیں ۔ عبدالعزیز جعفی نے ہتھیار سجے گھوڑے پر پڑی جمائی باگیں اٹھائیں اور دم کے دم میں دشمن کی صفوں تک پہنچ گئے اور نیزے سے محاصرین کے سینے چھیدتے اور صفیں توڑتے ہوئے عراقیوں کے لشکر تک پہنچ گئے ۔ لشکر نے انہیں دیکھا تو والہانہ انداز سے ان کی طرف بڑھا بے بسی و ناتوانی کا احساس جاتا رہا ۔ پوچھا کہ امیرالمومنین کس حالت میں ہیں ؟ کہا کہ وہ صحیح و سالم ہیں اور تمہیں حکم دیا ہے کہ ادھر سے تم نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے حملہ کرو اور ادھر سے ہم نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے حملہ کرتے ہیں ۔ چنانچہ نعروں کی گونج میں حملہ ہوا ۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچ گیا حصار ٹوٹ گیا اور شامیوں کے سات سو سوار لقمۂ اجل ہو گئے ۔ امیرالمومنین نے عبدالعزیز جعفی کے جرأت مندانہ اقدام کو بہت سراہا اور تحسین آفرین کے کلمات سے ان کی عزت افزائی کی ۔

امیرالمومنین شامی صفوں کے مقابلہ میں پرا جمائے کھڑے تھے کہ شامیوں کا ایک سردار زرہ بکتر پہنے صفوں سے باہر نکلا اور پکار کر کہا کہ ابوالحسن کہاں ہیں ۔ حضرت اس کے سامنے آئے تو اس نے

فرزند ابوطالب آپ ایمان میں سابق ہجرت میں سابق اور اسلامی غزوات میں بھی آپ پیش پیش رہے ہیں اس خونریزی کو بھی روک دیں۔ ہم عراق آپ کے لئے چھوڑے دیتے ہیں اور آپ شام کا علاقہ ہمارے لئے چھوڑ دیں۔ حضرت نے فرمایا۔

یا ھذا انی قد ضربت انف ھذا الامر وعینیہ فلم اجد ہ یسعنی الا القتال او الکفر بما انزل اللہ علی محمدؐ ان اللہ لا یرضی من اولیائہ ان یعصی فی الارض وھم سکوت لا یامرون بالمعروف ولا ینھون عن المنکر فوجدت القتال اھون من معالجۃ الاغلال فی جھنم۔	اے شخص میں نے اس چیز کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے میرے لئے جنگ کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے یا ان چیزوں کا انکار کردوں جو اللہ نے پیغمبر اکرمؐ پر نازل کی ہیں۔ اللہ اپنے دوستوں سے یہ امر پسند نہیں کرتا کہ زمین میں اس کے احکام کی خلاف ورزی ہو اور وہ چپ سادھے بیٹھے رہیں نہ نیکی کا حکم دیں اور نہ برائی سے منع کریں۔ اس بنا پر جہنم میں پا بجولاں ہونے سے جنگ کی سختیاں مجھے سہل نظر آئیں۔"

(اخبار الطوال۔ صہ ۱۸۸)

میدان کارزار میں تلواریں چل رہی تھیں اور مختلف فوجی دستے آپس میں گتھے ہوئے تھے کہ حضرت نے حکم دیا کہ فوج کا ہر حصہ اپنے مقابل والے دستہ پر حملہ کردے۔ چنانچہ تمام لشکر میدان میں اُمنڈ آیا اور ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ قعقاع ابن ابرو کا بیان ہے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بجلیاں کوند رہی ہیں پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور زمین زلزلوں کی لپیٹ میں ہے۔ امیرالمومنین دشمن کی صفوں میں ڈوب کر اُبھرے تو سر اور چہرہ خون سے رنگین تھا اور تلوار لہو میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس گھمسان کی جنگ میں علمبرداروں کے قدم اکھڑ گئے اور صفیں درہم و برہم ہوگئیں۔ عدی ابن حاتم جب لڑتے ہوئے ان صفوں کے قریب آئے جہاں حضرت کو چھوڑ گئے تھے تو آپ کو وہاں پر موجود نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ اس سمت ہیں جدھر جنگ ہو رہی ہے۔ عدی وہاں پر آئے حضرت کو دیکھا تو کہا:۔

یا امیرالمومنین اما اذا کنت حیاً فالامر امم واعلم انی ما مشیت الیک الا علی اشلاء القتلی وما ابقی لنا ھذا الیوم ولا لہم عمیدا۔ (اخبار الطوال صہ ۱۸۹)	یا امیرالمومنین آپ زندہ ہیں تو ہر مصیبت آسان ہے۔ میں کشتوں کے کٹے ہوئے اعضاء کو روندتا ہوا آپ تک پہنچا ہوں آج تو نہ ہمارا سردار باقی رہا ہے اور نہ ان کا کوئی سردار بچا ہے۔"

سعید ابن قیس ہمدانی نے میدان جنگ سے حضرت کو پیغام بھجوایا کہ یا امیرالمومنین ہم اس وقت دشمن پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں اگر کسی دستہ کو ہماری امداد کی ضرورت ہو تو ہم اس کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ حضرت نے ان کی صفوں کے قریب قبیلہ ربیعہ اور ہمدان سے کہا کہ تم میرے لئے بمنزلۂ نیزہ اور زرہ کے ہو اُٹھو اور دشمن سے میدان خالی کروا دو۔ اس آواز پر بارہ ہزار شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت نے رسول اللہ کا سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور انہی کے گھوڑے پر جس کا نام مرتجز تھا سوار ہوئے۔ میمنہ مالک اشتر کے اور میسرہ ابن عباس کے سپرد کیا اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہوئے اور ربیعہ اور ہمدان کے جوانوں کو لے کر اس طرح حملہ کیا کہ دشمن کے پرے ٹوٹ گئے۔ اور اس طرح تلوار چلائی کہ سروں کے انبار لگ گئے۔ جب لڑتے لڑتے تلوار دوہری ہو گئی تو صفوں سے نکلے تلوار کو سیدھا کیا اور فرمایا کہ اگر تلوار دوہری نہ ہو جاتی تو لشکر سے الگ نہ ہوتا۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور فوجوں کے دل میں گھس کر حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور صفوں کو چیرتے اور دشمن کو تہ تیغ کرتے ہوئے معاویہ کے خیمہ قریب پہنچ گئے اور فرمایا :-

اضربهم ولا ادی معاویة　　الجاحظ العين العظيم الحاوية

"میں ان دشمنوں پر تلوار چلاؤں گا اور معاویہ کو بھی نہیں چھوڑوں گا جو اُبھری ہوئی آنکھوں اور بڑے پیٹ والا ہے"

معاویہ نے یہ صورت دیکھی تو گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ دیئے اور میدان چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر ایک شخص کے للکارنے پر جب شامی فوجیں پلٹیں تو انہوں نے نکل بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب شامی فوجوں نے مل کر حملہ کیا مگر قبیلۂ ربیعہ و ہمدان کے جوانمرد خون کے سیلاب بہاتے صفوں کو روندتے اور لاشوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ امیرالمومنین نے انکی پیش قدمی کو سراہتے ہوئے فرمایا ہے :-

یقودهم حامی الحقيقة ماجد　　سعید ابن قیس والکریم یحامی

"انہیں آگے بڑھائے لئے جا رہے تھے سعید ابن قیس جو معزز اور قومی وقار کے پاسبان ہیں اور شریف انسان عزت و آبرو کی حفاظت کیا ہی کرتا ہے"

یہ پنجشنبہ کا دن اور جنگ کا نواں روز تھا۔ جب دن کا اجالا سمٹا اور لرزتا ہوا آفتاب اس خونی منظر کو دیکھتا ہوا غروب کی منزل کے قریب پہنچا تو وہ ہولناک اور دہشت انگیز رات آئی جو تاریخ میں لیلۃ الہریر کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ہر طرف ایک حشر برپا تھا تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی بوچھار سے دل دہلے اور نعروں کی گونج اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے ہر سمت تڑپتے لاشے

اور کٹے پھٹے اعضا اُڑتے نظر آرہے تھے۔ امیرالمومنین کبھی قلب لشکر میں ہوتے کبھی میمنہ کی طرف بڑھتے کبھی میسرہ کی طرف لپکتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ میدانِ جنگ میں ہر مورچے پر موجود ہیں۔ جس طرف دشمن کا زور بڑھتا فوراً ادھر کا رُخ کرتے اور تلواروں نیزوں اور بھالوں کے اندر کود پڑتے اور اس طرح حملہ کرتے کہ صفوں پر صفیں چڑھ جاتیں اور لاشوں پر لاشیں گرنے لگتیں۔ آخر اس معرکہ حرب و پیکار میں نیزے ٹوٹ گئے تلواریں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں اور ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنے تک کی نوبت آگئی۔ اس رات میں پانچ سو تئیس مرتبہ حضرت کی صدائے تکبیر کو شمار کیا گیا اور صبح کو ان کے مقتولین کو دیکھا گیا تو ان کی تعداد بھی پانچ سو تئیس تھی اور ایک روایت یہ ہے کہ اس رات میں نو سو سے زائد شامی آپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور مجموعی طور پر فریقین کے مقتولین کی تعداد تیس ہزار یا تینتیس ہزار تھی۔

جب رات کا اندھیرا چھٹا تو جنگ آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ امیرالمومنین کی فوجیں مالک اشتر اور ابن عباس کی کمان میں برابر لڑ رہی تھیں۔ حضرت قلب لشکر میں رونق افروز تھے اور چاروں طرف جنگ کے شعلے شامیوں کو بھسم کر رہے تھے۔ مالک اشتر تلوار لہراتے میمنہ لشکر کے جلو میں آگے بڑھے۔ جب تلوار کو جھکاتے تو یہ معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے اور اُسے اُونچا کرتے تو اس کی چمک سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی۔ آپ نے پرچم حیان ابن ہوذہ نخعی کے سپرد کیا اور فوج لے کر شامیوں پر ٹوٹ پڑے اور صفوں کو منتشر کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چند ہمراہیوں کے قدم رکے تو پکار کر کہا کہ یہ مردوں کا کام نہیں ہے کہ وہ بکریوں کا دودھ دوہتے رہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں مردانہ وار آگے بڑھو۔ سست قدموں میں تیزی آئی اور تازہ دم فوج کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ شامی ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے پیچھے ہٹے۔ امیرالمومنین نے اپنی فوجوں کو فتحیابی کے قریب دیکھا تو ان کی کمک کے لئے ایک اور دستہ بھیجا اور سب نے مل کر شامیوں کا رہا سہا زور ختم کر دیا۔ ادھر شامیوں کا لشکر پس رہا تھا ادھر امیرالمومنین کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ ہاں اے جوانمردو تم فتح کی منزل کے قریب پہنچ چکے ہو دشمن دم توڑ رہا ہے اب اسے ختم کئے بغیر دم نہ لینا۔

معاویہ کے لئے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ عراقی آگے بڑھتے چلے آرہے تھے اور اب یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ شامی ان کی پیش قدمی کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاویہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سر پر مایوسیوں اور ناامیدیوں کے بادل منڈلا رہے تھے انھوں نے گھبرا کر عمرو ابن عاص کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے میں نے اس موقع کے لئے پہلے ہی سے ایک تدبیر سوچ رکھی ہے۔ کہا کہ وہ تدبیر کیا ہے کہا کہ قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کر کے

اسے ثالث بنانے کی تجویز اُن کے سامنے رکھی جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عراقیوں کا ایک گروہ ہمارا ہمنوا ہو کر جنگ رکوانا چاہے گا اور ایک گروہ جنگ کے جاری رکھنے پر زور دے گا اور اس طرح ہم ان میں پھوٹ ڈلوا کر جنگ کے ملتوی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاویہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع تو پہنچ ہی چکی تھی کہ اشعث ابن قیس جنگ کو کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے رکوانا چاہتا ہے اور وہ اپنے قبیلہ والوں سے برملا کہہ رہا ہے:۔

قد رأیتم ما کان فی الیوم الماضی من الحرب المبیرۃ واللہ ان التقینا غدا انہ لبوار العرب وضیعۃ الحرمات (اخبار الطوال ۱۷۷)	تم نے روز گزشتہ دیکھ ہی لیا ہے کہ کتنی مہلک و تباہ کن جنگ ہوئی ہے۔ خدا کی قسم اگر ہم کل پھر لڑے تو عرب کی ہلاکت اور عزت و ناموس کی پامالی یقینی ہے۔"

اب معاویہ نے بھی اشعث کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے کہا کہ اشعث سچ کہتا ہے اگر یہ جنگ جاری رہی تو فارس والے عراق پر چڑھائی کریں گے اور روم والے شام پر حملہ آور ہوں گے اور ہماری عزت و ناموس کو پامال کر دیں گے۔ لہٰذا اس تدبیر کو بروئے کار لا کر جلد جنگ کو رکوایا جائے اور قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے اسے ثالث قرار دیئے جانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ شامیوں کی صف اوّل میں پانچ آدمیوں نے دمشق کا مصحف اعظم پانچ نیزوں پر بلند کیا اور اس کے علاوہ جتنے قرآن مہیا ہو سکے۔ نیزوں پر اٹھائے گئے اور کچھ لوگوں نے اینٹوں پر جزدان لپیٹ کر انہیں قرآن کی صورت میں نیزوں پر آویزاں کیا۔ جب معاویہ کی طرف سے قرآن بلند ہوئے تو اشعث ابن قیس جو اس سازش میں شریک تھا امیرالمومنین کے پاس آیا اور کہا کہ شامیوں نے قرآن کو حکم قرار دیا ہے اور لوگ قرآن کے علاوہ کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں معاویہ سے اس سلسلہ میں بات چیت کروں۔ حضرت نے فرمایا کہ بات چیت کر کے دیکھ لو۔ اشعث معاویہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ یہ قرآن نیزوں پر کیوں بلند کئے گئے ہیں۔ کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک حَکَم ہماری طرف سے ہو، اور ایک حَکَم تمہاری طرف سے اور وہ دونوں مل کر قرآن سے فیصلہ کریں۔ ان دونوں میں ملی بھگت تو تھی ہی کہا کہ یہ بات درست اور قابل تسلیم ہے۔ اس نے پلٹ کر حضرت کو معاویہ کی تجویز سے آگاہ کیا اور خود بھی قرآن لے کر دونوں صفوں کے درمیان آ کھڑا ہوا اور قرآن کو حَکَم مان لینے پر زور دینے لگا۔ عراقیوں نے معاویہ کے ساختہ پرداختہ لوگوں کی شہ پا کر کہنا شروع کیا کہ ہم قرآن کے فیصلہ پر راضی ہیں اور اُسے حَکَم ماننے کے لئے تیار ہیں۔ امیرالمومنین نے جب قرآن کے سایہ میں مکر و فریب کے جال بچھتے دیکھے تو فرمایا:۔

عباد اللہ امضوا علی حقکم و صدقکم وقتال عدوکم فان معاویۃ وعمرا و ابن ابی معیط وحبیبا وابن ابی سرح والضحاک لیسوا باصحاب دین ولا قرآن انا اعرف بھم منکم قد صحبتھم اطفالا ثم رجالا فکانوا شر اطفال وشر رجال ویحکم واللہ ما رفعوھا الا خدیعۃ ووھنا ومکیدہ۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص۱۶۱)

اے خدا کے بندو تم حق وصداقت کی جس روش پر چل رہے ہو اس پر چلتے رہو اور اپنے دشمن سے جنگ جاری رکھو۔ معاویہ ہو یا عمرو، ابن ابی معیط ہو یا حبیب ابن مسلمہ، ابن ابی سرح ہو یا ضحاک یہ لوگ نہ دین والے ہیں اور نہ قرآن پر عمل کرنے والے۔ میں تم لوگوں سے زیادہ ان لوگوں کو جانتا پہچانتا ہوں۔ بچپن اور جوانی دونوں میں میرا ان کا ساتھ رہ چکا ہے۔ یہ بچپن میں بھی بُرے اور جوانی میں بھی بُرے تھے۔ خدا کی قسم انہوں نے قرآن مکر وفریب کی بنا پر اور اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے اٹھایا ہے۔"

امیرالمومنین نے لشکر کو سمجھانے بجھانے کی بہتیری کوششیں کی مگر اشعث ابن قیس اور اس کے ہمنواؤں کا جو درپردہ معاویہ سے سازباز کئے ہوئے تھے داؤ چل چکا تھا وہ سمجھنے سوچنے کے بجائے بغاوت وسرکشی پر اُتر آئے اور مسعر ابن فدکی تمیمی اور زید ابن حصین طائی بیس ہزار آدمیوں کو لے کر آگے بڑھے اور حضرت سے کہا کہ اے علی اگر آپ نے قرآن کو حکم ماننے سے انکار کیا تو ہم آپ سے جنگ لڑیں گے۔ آپ فوراً جنگ کے رکوانے کا حکم دیں اور مالک کو پیغام بھیجیں کہ وہ میدانِ جنگ سے واپس آئیں۔ حضرت نے جب دیکھا کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور لوگ شروفساد پر آمادہ ہیں تو یزید ابن ہانی کے ہاتھ مالک اشتر کو پیغام بھجوایا کہ جس حالت میں ہو فوراً واپس چلے آؤ۔ مالک نے یہ پیغام سنا تو حیرت میں کھو گئے اور کہا کہ امیرالمومنین سے کہئے کہ دشمن ایک آدھ لمحہ میں ہتھیار ڈال دے گا میں ابھی فتح کی خوشخبری لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ یزید نے پلٹ کر مالک کا جواب عرض کیا تو لشکر والوں نے شور مچایا اور کہا کہ آپ نے درپردہ مالک کو جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے تمہارے سامنے کہا ہے اس کا موقع ہی کہاں تھا کہ میں چوری چھپے کوئی بات کہتا۔ کہا کہ آپ یزید کو دوبارہ بھیجیں اور مالک کو فوراً واپس بلوائیں۔ اگر مالک نے پلٹنے میں تاخیر کی تو پھر شامیوں پر چلنے والی تلواریں آپ پر چلیں گی۔ حضرت نے یزید ابن ہانی کو دوبارہ بھیجا۔ انہوں نے مالک سے کہا کہ اگر تمہیں امیرالمومنین کی جان عزیز ہے تو فوراً جنگ سے ہاتھ اٹھا کر اُن کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ مالک افسردہ دلی کے ساتھ حضرت کے پاس چلے آئے اور اس ہڑبونگ

کو دیکھ کر لوگوں کو بُرا بھلا کہا۔ مگر جو قدم اکھڑ چکے تھے۔ اب انہیں دوبارہ جمایا نہ جا سکتا تھا۔ امیرالمومنین نے دیکھا کہ اگر جنگ کے التوا کا فیصلہ نہ کیا گیا تو آپس میں تلوار چلنے لگے گی آپ نے بادلِ ناخواستہ جنگ کے التوا کا حکم دے دیا اور مجبوراً تحکیم پر آمادہ ہو گئے۔

اس التوائے جنگ کے بعد عمرو ابن عاص نے معاویہ کو یہ مشورہ دیا کہ تمام جنگی قیدیوں کو جوان کی تحویل میں ہیں قتل کر دیا جائے۔ ان قیدیوں میں سے عمرو ابن اوس اودی نے یہ سنا تو اس نے معاویہ کو کہلوایا کہ اگر قتل کی نوبت آئے تو مجھے قتل نہ کیا جائے اس لئے کہ میں اُن کا بھانجا ہوں اور وہ میرے ماموں ہیں اس کے قبیلہ بنی اود کے کچھ لوگوں نے بھی اس کی سفارش کی کہ ہمارے قبیلہ کے آدمی کو چھوڑ دیا جائے۔ معاویہ نے کہا کہ وہ کہتا ہے کہ میں اُس کا ماموں ہوں اگر وہ سچا ثابت ہُوا تو تمہاری سفارش کے بغیر اُسے چھوڑ دیا جائے گا اور اگر جھوٹا ثابت ہوا تو تمہاری سفارش درکار ہوگی۔ چنانچہ معاویہ نے اُسے بلا کر پوچھا کہ میں کیسے تمہارا ماموں ہوں کہا کہ اگر میں اس کا ثبوت دوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا؟ کہا کہ ہاں۔ کہا کیا زوجۂ رسولؐ ام حبیبہ بنت ابی سفیان تمہاری بہن نہیں ہیں کہا کہ ہاں وہ میری بہن ہیں کہا کہ پھر میں اُن کا بیٹا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ تمہارے علاوہ یہ بات کسی کو نہیں سُوجھی تم نے صحیح کہا ہے اور اسے چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں وہ شامی جو عراقیوں کی قید و بند میں تھے سب واپس آگئے۔ معاویہ نے انہیں دیکھا تو عمرو سے کہا کہ اگر میں تمہارے مشورہ پر عمل کرتا تو ان اسیروں میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ آتا۔ اور تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔

یہ جنگ یکم صفر ۳۷ھ کو شروع ہوئی اور دس صفر ۳۷ھ کو روز جمعہ ختم ہو گئی۔ مقام صفین میں فوجوں کا قیام ایک سو دس دن رہا اور نوّے معرکے پیش آئے۔ امیرالمومنین کے لشکر میں سے پچیس ہزار افراد شہید ہوئے جن میں اسی اصحاب بدریین اور تریسٹھ بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ تھے۔ اور معاویہ کے لشکر میں سے پینتالیس ہزار آدمی کام آئے۔

یہ خونی ہنگامہ معاویہ اور عمرو ابن عاص کے ذوقِ سربلندی اور ہوسِ اقتدار کی پیداوار تھا۔ معاویہ حضرت عمر کے دَور سے شام پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے اور عمرو مصر کا گورنر رہ چکا تھا۔ معاویہ اپنے اقتدار کو ہر قیمت پر بحال رکھنا چاہتے تھے اور عمرو مصر کے اقتدار رفتہ کو پھر سے حاصل کرنے کی فکر میں تھا اور یہ اقتدار پسند افراد کا طبعی خاصہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ حکومت و امارت سے روشناس ہونے کے بعد ہر حیلہ و تدبیر سے اسے باقی و برقرار رکھنا چاہتے ہیں خواہ اخلاق و دیانت کی قدروں کو کچل کر اور حق و انصاف کے تقاضوں سے منہ موڑ کر جنگ و خونریزی پر اترنا پڑے یا حیلہ و فریب کی راہ اختیار کرنا پڑے۔ چنانچہ

معاویہ نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے قصاص کا شاخسانہ کھڑا کیا اور عوام کو مشتعل کر کے جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا اور عمرو ابن عاص نے امارت مصر کی خاطر ہر چیز داؤ پر لگا دی اور حق کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود باطل کی ہمنوائی پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی دنیا کی طلبی کا واشگاف لفظوں میں اعتراف کرتے ہوئے معاویہ سے کہا:۔

ام واللہ ان قاتلنا معک نطلب بدم الخلیفۃ عثمان ان فی النفس ما فیھا حیث تقاتل من تعلم سابقتہ وفضلہ وقرابتہ ولکنا انما اردنا ھذہ الدنیا۔ (الامامہ و السیاسہ ج۱ ص۹۲)

خدا کی قسم اگرچہ ہم تمہارے ساتھ ہو کر قصاص خون عثمان کے سلسلہ میں جنگ کر رہے ہیں مگر دل کے اندر جو ہے سو ہے جب کہ تم اس شخص سے بر سر پیکار ہو جس کی سبقت فضیلت اور رسول اللہؐ سے قرابت کا تمہیں علم ہے لیکن ہم تو فقط اس دنیا کے درپے ہیں۔

معاویہ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے خون عثمان کو ذریعہ قرار دیا اور فضا کو ہمنوا بنانے کے لئے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ قتل عثمان نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے اور جب تک وہ قصاص نہیں لیں گے انہیں چین نہیں آئے گا حالانکہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ حضرت عثمان نے محاصرہ کے دنوں میں ان سے بار بار مدد مانگی۔ مگر انہوں نے تعاون سے گریز کیا۔ البتہ ایک مختصر سی فوج بھیجی۔ مگر اسے یہ تاکید کر دی کہ وہ حدودِ مدینہ سے باہر رہے اور عملاً کوئی قدم نہ اٹھائے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ دوسروں کو یہ تاثر دیں کہ انہوں نے خیل و سپاہ سے مدد کی مگر مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے وہ سمجھتے تھے کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے جائیں تاکہ وہ قصاص کے نام پر جنگ چھیڑ کر مستقل اقتدار کی راہ ہموار کریں۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص سے حکومت مصر کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور امیر المومنین پر خونِ عثمان کا الزام عائد کر کے ان سے قاتلین عثمان کا مطالبہ شروع کر دیا حالانکہ یہ چیز ان سے مخفی نہ تھی کہ قاتلین عثمان کا دائرہ حجاز اور مصر عراق تک پھیلا ہوا ہے۔ جنہوں نے مدینہ پر ہجوم کر کے انہیں محاصرہ میں لے لیا اور اڑوس پڑوس کی دیواریں پھاند کر انہیں قتل کر دیا تھا۔ ان کے محاصرین کے انبوہِ کثیر میں سے قاتلوں کی نشاندہی کی کوئی صورت ہی نہ تھی بلکہ جو موقع واردات پر موجود تھے انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس صورت میں کسی ایک کو قاتل قرار دینا مشکل تھا اور اس کا نہ کوئی امکان تھا اور نہ کوئی جواز کہ تمام محاصرہ کرنے والوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا جاتا تاکہ وہ ایک فرد کے بدلے میں ہزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ چنانچہ قرآن مجید میں قانونِ قصاص کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا	جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم نے بے شک
لولیہ سلطانا فلا یسرف فی	اس کے ولی کو حق قصاص دیا ہے مگر قتل میں مقررہ
القتل۔	حدود سے تجاوز نہ کرے۔"

معاویہ حضرت عثمان کے ابن عم تھے مگر ان کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی قاعدہ و قانون سے ان کے ولی نہ تھے کہ انہیں طلب قصاص کا حق ہوتا کیونکہ یہ اولیاء مقتول کا حق ہے یا حکومت وقت کا۔ اور معاویہ نہ اولیاء مقتول میں شامل تھے اور نہ مسلمانوں کے حکمران۔ وہ صرف رعایا کا ایک فرد تھے یا زیادہ سے زیادہ سابقہ حکومت کی طرف سے ایک صوبہ کے عامل۔ انہیں چاہئے تو یہ تھا کہ پہلے حضرت کو ولی امر مانتے ان کی حکومت تسلیم کرتے اور ان کے اقامۂ حدود کے حق کا اعتراف کرتے اور پھر ان سے مطالبہ کرتے کہ وہ آئینی طور پر حکم قصاص کا اجرا کریں۔ اسی اصول کی بناء پر حضرت نے معاویہ کو تحریر کیا تھا کہ پہلے بیعت کرو اور پھر قاتلین عثمان کا معاملہ میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں کتاب و سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کروں مگر وہ ایک طرف تو بیعت سے انکار کرتے رہے اور دوسری طرف قصاص پر زور دیتے رہے۔ یہ مطالبۂ قصاص صرف انکار بیعت کا ایک بہانہ تھا تاکہ اس طرح حضرت پر دباؤ ڈال کر امارت شام کی دستاویز حاصل کر لیں۔ چنانچہ جریر ابن عبداللہ بجلی سے صاف لفظوں میں کہا کہ اگر مجھے حکومت شام پر باقی رہنے دیا جائے تو میں بیعت کر لوں گا اس کے بعد اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں رہتا کہ بیعت سے کنارہ کشی کا مقصد امارت شام کا تحفظ تھا اور وہ امارت کے تحفظ کا یقین حاصل کر لینے کے بعد مطالبۂ قصاص سے دستبردار ہو جاتے اگر انہیں قصاص سے کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو وہ اُم المومنین عائشہ اور طلحہ و زبیر کی جب کہ وہ قصاص ہی کا نام لے کر کھڑے ہوئے تھے مدد کرتے ان کی کمک کے لئے شام سے فوجیں بھیجتے یا طلحہ و زبیر کے مارے جانے پر اظہار اطمینان کرتے کیونکہ وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ انہی لوگوں نے حضرت عثمان کے قتل پر بیرونی اور مقامی باشندوں کو بھڑکایا تھا مگر وہ چپ سادھے فریقین کی جنگ کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کا مقصد بھی تو یونہی پورا ہوتا تھا کہ علی اور طلحہ و زبیر آپس میں بھڑ جائیں اور ان میں سے جو فریق ہار جائے گا اس سے چھٹکارا مل جائے گا اور جو جیتے گا اس کی طاقت اتنی کمزور ہو چکی ہو گی۔ کہ وہ جنگ اقتدار میں ان سے ٹکر نہ لے سکے گا اور اس طرح وہ اپنے حریفوں کی قوت و طاقت کو مضمحل کر کے کامیابی و کامرانی کی راہ پیدا کر لیں گے۔

اگر قصاص ان کے پیش نظر ہوتا تو جب وہ امیر المومنین کی شہادت کے بعد ایک بڑی طاقت کے مالک بن چکے تھے عملاً نہ سہی زبانی ہی لب کشائی کرتے مگر انہوں نے ایسی چپ سادھی کہ گویا کوئی حادثہ

ہوا ہی نہ تھا حالانکہ جنہیں قاتل کہا جاتا تھا وُہ اسی طرح دندناتے پھر رہے تھے اور حضرت عثمان کی بیٹی عائشہ نے انہیں قصاص کی طرف متوجہ بھی کیا تھا۔ مگر اس سے پہلو بچا لے گئے۔ چنانچہ ابن عبدربہ الاندلسی نے عقد الفرید میں تحریر کیا ہے کہ عام الجماعہ کے بعد جب معاویہ مدینہ میں آئے تو حضرت عثمان کی بیٹی عائشہ کے ہاں گئے اس نے معاویہ کو دیکھا تو باپ کا نام لے کر گریہ زاری شروع کر دی اور اُن سے شکوہ کیا کہ تم نے میرے باپ کے قصاص کو نظر انداز کر دیا ہے۔ معاویہ نے کہا کہ اب وہ لوگ ہمارے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکے ہیں اور ہم نے ان سے امان کا وعدہ کر لیا ہے۔ اگر ہم نے عہد شکنی کرتے ہوئے۔ انہیں چھیڑا تو وُہ ہماری طرف سے دلوں میں کینہ تو رکھتے ہی ہیں فوراً بھڑک اٹھیں گے اور بیعت توڑ کر مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوں گے پھر خدا معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو۔ اگر حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو تمہاری حیثیت ہی کیا رہے گی۔ اور اب تو تم ایک خلیفہ کی بیٹی اور ایک خلیفہ کی بھتیجی ہو۔ اگر حرف بحرف یہی عذر امیرالمومنین کی طرف سے پیش کیا جائے کہ وہ لوگ آپ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکے تھے اور اگر انہیں چھیڑتے تو وہ حرب و پیکار پر اُتر آتے اور خدا جانے اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوتا تو پھر ان کے خلاف جنگ برپا کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

معاویہ نے قصاص کے نام پر ایک بھاری ہجوم اپنے گرد جمع کر کے جنگ چھیڑ دی مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ کہ اس کا نتیجہ عروج یا زوال تخت یا تختہ ہے اس لئے انہوں نے جنگ جیتنے کے لیے کوئی حربہ اٹھا نہ رکھا خواہ اس سے شرافت پر حرف آتا ہو یا انسانیت داغدار ہوتی ہو۔ چنانچہ صفین میں وارد ہوتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرات پر پہرہ بٹھایا اور اس کے جواز میں یہ کہا کہ آخر ان لوگوں نے بھی تو عثمان پر پانی بند کیا تھا حالانکہ اگر انہیں پانی بند کرنے کا مشورہ دیا بھی جاتا تو انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ علی پر پانی بند نہ کیا جائے کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں حضرت عثمان کے ہاں کسی نے پانی پہنچایا تھا تو وہ علی تھے اس کے برعکس جب امیرالمومنین کی فوجوں نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور معاویہ کے طرزِ عمل کا جواب ویسے ہی طرزِ عمل سے دینا چاہا تو حضرت نے فرمایا کہ غلط روش کا جواب غلط روش نہیں ہے فوراً گھاٹ کو خالی کر دیا جائے اور کسی کو پانی سے نہ روکا جائے حالانکہ حضرت پانی روک کر اس کے جواز میں کہہ سکتے تھے کہ پہلے ان لوگوں نے پانی بند کیا۔ پھر ہم نے جواباً پانی روکا ہے تو معاویہ کی من گھڑت وجہ جواز سے یہ وجۂ جواز زیادہ قوی ہوتی مگر حضرت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ایسا اقدام کریں جس سے ان کی بلند نفسی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی مجروح ہو۔ اسی طرح جب عمار ابن یاسر کی شہادت سے ان کا باغیانہ موقف بے نقاب ہوا تو انہوں نے فوراً بات بنائی کہ عمار کے قاتل علی ہیں جو انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ اتنی کھلی خلافِ حقیقت بات تھی، کہ

اسے فریب و دغل بھی تو نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ فریب کاری میں حقیقت کے چہرے پر ایسے دبیز پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کے خط و خال ظاہری نظروں سے چھپ جاتے ہیں مگر یہاں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ایک واضح حقیقت کو جھٹلایا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اہل شام اس پوچ اور لچر تاویل پر کیونکر مطمئن ہو گئے اگر ان میں کچھ بھی عقل و شعور ہوتا تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا جنگ کا رخ پلٹ جاتا اور جو تلواریں ان کی حمایت میں چل رہی تھیں وہ اُن پر اور اُن کے خصوصی مشیروں کے سروں پر چلنے لگتیں اس لئے کہ ان کا اور ان کے گروہ کا بنص رسول باغی گروہ ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکا تھا باطل کے دھندلکے چھٹ چکے تھے اور حق پوری تابانیوں کے ساتھ چمک اٹھا تھا مگر شامیوں کی کج ذہنی و کج فکری نے ان کی آنکھوں سے نور بصارت چھین کر انہیں گھور اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا اور وہ باغی گروہ کو پہچاننے کے بعد بھی اسی باغی گروہ سے چمٹے رہے۔ اگر اس تاویل کو ان کے دل و دماغ نے قبول کر لیا تھا تو اس تاویل کی رُو سے انہیں چاہیئے تھا کہ اپنی تلواروں کا رُخ معاویہ کی طرف موڑ دیتے اس لئے کہ شامیوں میں سے جتنے آدمی مارے گئے تھے انہی کی پیش کردہ تاویل کی بنا پر وہ ان سب کے قاتل تھے وہی انہیں میدان میں لے کر آئے تھے اور انہیں نیزوں اور تلواروں کے سامنے کھڑا کیا تھا جب حضرت عثمان کے قصاص میں ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا جاسکتا ہے تو ان ہزاروں قتل ہونے والوں کا قصاص ایک فرد سے کیوں نہیں لیا جاسکتا۔

جب اس قسم کے حربوں کے باوجود شکست ناگزیر نظر آئی تو ایسی پُر فریب چال چلی گئی کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور عین اس وقت جب کہ شامیوں کی شکست یقینی ہو چکی تھی میدان لاشوں سے پٹ چکا تھا۔ اور بچے کھچے لوگ راہِ فرار ڈھونڈ رہے تھے کہ ان میں کے چند افراد قرآن لے کر نکل آئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرآن ہے آؤ اپنے جھگڑے اس کی روشنی میں نمٹائیں اور جنگ ختم کریں یہ حربہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے اور چلتی ہوئی تلواریں رُک گئیں۔ امیرالمومنین نے عراقیوں کو دشمن کے مکر و فریب سے آگاہ کیا مگر وہ اپنی بات پر اڑ گئے۔ ان میں کچھ تو وہ تھے جو معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے تھے اور کچھ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ واقعاً قرآن کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔ اور اگر انہوں نے اس آواز پر لبیک نہ کہی تو منکرین قرآن کی صف میں شمار ہونے لگیں گے مگر انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ اگر یہ قرآن کی طرف دعوت دینے والے قرآن پر عمل کرنے والے ہوتے تو جنگ شروع ہونے سے پہلے دعوت دیتے جس طرح امیرالمومنین نے جنگ جمل میں آغاز جنگ سے پہلے قرآن کی دعوت دی تھی یا جنگ کے دوران قرآن کے فیصلہ پر آمادگی ظاہر کرتے مگر انہیں قرآن اس وقت یاد آتا ہے جب شکست کے بادل اُن کے سروں پر منڈلانے لگتے ہیں اور حریف کی تلواروں سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

معاویہ کی اس کامیابی میں جو عناصر کارفرما تھے ان میں زور و فریب کے علاوہ اہلِ شام کی اطاعت و سرافگندگی کا بھی بڑا دخل ہے۔ انہوں نے نہ جنگ میں تامل کیا اور نہ جنگ سے دستبرداری میں چون و چرا سے کام لیا۔ اور رعایا کی اطاعت کا یہی جذبہ حکمران کی قوت و طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اہلِ شام اپنی رائے پر اعتماد کرنے کے بجائے معاویہ کی چشم و ابرو کی گردش کو دیکھتے تھے اور جو ادھر سے اشارہ ہوتا تھا بے سوچے سمجھے اس پر چلنے لگتے تھے۔ ان کی اندھا دھند پیروی کا یہ عالم تھا کہ جب معاویہ نے صفین کی طرف جاتے ہوئے بدھ کے دن نماز جمعہ پڑھادی تو نہ کسی نے انہیں روکا اور نہ کوئی اس پر معترض ہوا۔ مسعودی نے تحریر کیا ہے:۔

لقد بلغ من امرهم فی طاعتهم	وہ معاویہ کے یہاں تک مطیع و فرمانبردار تھے کہ
له انه صلی بهم عند مسیرهم	انہوں نے صفین کی طرف جاتے ہوئے بدھ کے
الی صفین الجمعة فی یوم الاربعا.	دن نماز جمعہ پڑھادی"۔

(مروج الذہب، ج ۲۔ ص۷۲)

اہلِ شام کی اسلامی معاشرہ سے بیگانگی اور دین و مذہب سے بے خبری کی وجہ یہ ہے کہ جب اسلام کی شعاعیں عرب کے گوشہ گوشہ کو منور کر چکی تھیں سوادِ شام پر کفر کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور جب حضرت عمر کے اوائل دورِ حکومت میں اسلام کے مفتوحہ علاقوں میں داخل ہوا تو اسلام سے روشناس ہونے کے بعد انہوں نے فرزندانِ ابوسفیان یزید اور معاویہ کو اسلامی نمائندہ کی حیثیت سے مسندِ امارت پر دیکھا۔ یزید تو تھوڑے ہی دنوں بعد چل بسا اور معاویہ اپنے بیس سالہ دورِ اقتدار میں انہیں اسلام کے آداب و احکام سے کیا روشناس کرتے جب کہ وہ خود ہی اسلامی اوامر و نواہی کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں بے خبر رکھنے میں یہ سیاسی مصلحت بھی کارفرما تھی کہ اگر ان میں اسلامی شعور بیدار ہوگیا تو وہ حق و باطل اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرنے لگ جائیں گے اور پھر اُن کی بے شعوری و بے خبری سے جو فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس سے محروم ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اگر انہیں دین و مذہب سے لگاؤ ہوتا تو وہ غلط اور صحیح اقدام میں فرق کرتے علی کے مقابلہ میں آنے سے ہچکچاتے اور ان کی عظمت و منزلت کو سمجھتے مگر انہیں تو جان بوجھ کر علی اور خاندانِ نبوت کے دوسرے افراد سے اندھیرے میں رکھا گیا تھا تاکہ معاویہ اور ان کے خاندان کے علاوہ کسی اور کی طرف ان کی نظریں اٹھنے ہی نہ پائیں یہی وجہ ہے کہ وہ نہ علی کو جانتے پہچانتے تھے نہ ان کی علمی و عملی منزلت سے واقف تھے اور نہ اُن کے زہد و اتقاء کی بلندی سے آگاہ تھے۔ چنانچہ صفین میں ایک شامی نے برملا کہا کہ ہم علی سے اس لئے برسرپیکار ہیں کہ نہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ اُن کے ساتھی نماز گزار ہیں۔ اس نے تو جو معاویہ اور ان کے حواریوں سے سنا تھا وہی کہا

مگر جب ہاشم ابن عتبہ نے اسے توجہ دلائی تو اس کی غلط فہمی دور ہوئی اور شامیوں کی صف سے کٹ کر الگ ہو گیا۔ اس دینی بے حسی و بے خبری کے ساتھ حکومت کی زر پاشیوں نے بھی انہیں معاویہ کا گرویدہ بنا رکھا تھا جس کے نتیجہ میں وہ بے سوچے سمجھے باطل کے برسر اقتدار آنے کا ذریعہ بن گئے۔

امیر المومنین کے لشکر میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو کسی مصلحت یا قبائلی دباؤ کے زیر اثر شریک جنگ تو ہو گئے تھے مگر نہ ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی اور نہ اطاعت و انقیاد کا جذبہ اور پھر اشعث ابن قیس اور خالد ابن معمر ایسے افراد معاویہ کے ہاتھ بکے ہوئے تھے۔ انہیں قرآن کی آڑ میں شورش انگیزی کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے جنگ کا نقشہ الٹ دینے میں شامیوں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ اشعث ابن قیس باوجودیکہ امیر المومنین اسے متنبہ کرتے ہیں کہ یہ دھوکا ہے فریب ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور قرآن لے کر صفوں میں آکھڑا ہوتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اے لوگو علی کو مجبور کر دو کہ وہ قرآن کو حکم تسلیم کریں اور اس خونریزی کو روکیں۔ حیرت ہے کہ جب حضرت کی فوجیں فتحیابی کے قریب پہنچ جاتی ہیں تو مسلمانوں کی باہمی خونریزی کو دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اگر اس کا دل اس خون خرابہ سے اتنا ہی متاثر تھا تو اس کا اظہار اس وقت بھی کیا ہوتا جب تلواریں ایک سطح پر چل رہی تھیں اور ایک فریق دوسرے فریق پر غالب ہوتا نظر نہ آرہا تھا مگر اس کا دل دکھتا ہے تو حضرت کی فتح و کامرانی کے موقع پر کیونکہ اس فتحیابی میں اسے کوئی فائدہ نظر نہ آرہا تھا اور حضرت کو ناکام بنا کر ایک لاکھ کا انعام تو کہیں گیا نہ تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے صلہ میں کسی صوبہ کی گورنری کی توقع بھی لئے ہوئے ہو۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ معاویہ کا یہ اقدام خلیفۂ برحق کے خلاف ایک جارحانہ و باغیانہ حیثیت رکھتا تھا مگر جہاں اصحاب جمل طلحہ و زبیر کے اقدام پر خطائے اجتہادی کا پردہ ڈالا گیا ہے۔ وہاں معاویہ کے اس عظیم کشت و خون کو بھی خطائے اجتہادی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ پیغمبر اکرم جس اقدام کو بغاوت سے تعبیر فرمائیں اس پر اجر و ثواب کا استحقاق ثابت کیا جائے۔ کیا پیغمبر کا یہ ارشاد ان کے گوش گزار نہ ہوا تھا۔

ویح عمار تقتله الفئة الباغية	عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ عمار انہیں
عمار يدعوهم الى الله ويدعونه	اللہ کی طرف دعوت دیں گے اور وہ انہیں جہنم کی
الى النار۔ (صحیح بخاری۔ ج ۲۔ ص ۹۲)	طرف بلائے گا۔

پیغمبر کے اس ارشاد کے بعد اسے خطائے اجتہادی سے تعبیر کرنا اور اس کے مرتکب کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اجتہاد نام ہے اس کے ماخذ و مدرک سے حکم شرعی کے استنباط

کا پھر کس ماخذ سے اس جنگ کا جواز اخذ کیا گیا تھا جب کہ بغاوت کے معنی ظلم و فساد کے ہیں اور ظلم و طغیان کو اجتہاد سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مگر جن لوگوں نے حضرت علی کے قتل تک کو خطائے اجتہادی کہہ دیا ہو وہ اُن سے جنگ و جدال کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کریں تو کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے۔ چنانچہ ابن حزم اور اس کے ہمنواؤں نے عبدالرحمٰن ابن ملجم کے اقدام قتل کو خطائے اجتہادی قرار دے دیا ہے۔ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں:۔

وبالغ ابن حزم فقال لاخلاف بين احد من الائمة فی ان ابن ملجم قتل عليا متاولا مجتهدا مقدرا انه علی الصواب۔ (التلخیص الجبیر ص۳۴۳)	ابن حزم نے یہ کہہ کر مبالغہ سے کام لیا ہے کہ آئمہ میں سے کسی ایک نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا کہ ابن ملجم نے علی کو اجتہاد کرتے ہوئے تاویلاً قتل کیا اور وہ اس قتل میں اپنے کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

حالانکہ پیغمبر نے ابن ملجم کے بارے میں اشقی هذه الامة (اس امت کا شقی ترین فرد) فرمایا تھا۔ اسی طرح یہ گروہ عمار ابن یاسر کے قاتل ابوالغادیہ فزاری کو بھی خطائے اجتہادی کا مرتکب قرار دیتا ہے۔ حالانکہ پیغمبر کا ارشاد ہے کہ قاتل عمار وسالبه فی النار (عمار کا قاتل اور ان کا سامان جنگ چھین لینے والا دوزخ میں جائے گا)، تعجب ہے کہ حضرت علی اور عمار یاسر کے قاتلوں کو مجتہد مخطی تجویز کر کے انہیں مستحق اجر و ثواب قرار دیا جاتا ہے اور حضرت عثمان کے قاتلین و محاصرین کو ابن حزم اور ان کے ہم مسلک افراد صحابیت کی تمام قدروں کو نظر انداز کر کے باغی، ظالم، فاسق، مفتری، کاذب اور ملعون وغیرہ کی لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور ان کے لئے خطائے اجتہادی کا ادنیٰ احتمال بھی گوارا نہیں کیا، حالانکہ ان میں افاضل صحابہ اکابر مجتہدین اور صلحاء امت شامل تھے۔

اس اجتہاد کی کارفرمائی کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ معاویہ اس موقع پر قیصر روم کو ہدایا و تحائف پیش کر کے صلح کا پیغام دیتے ہیں اور جن کے ہاتھوں پر انصار و مہاجرین نے بالاتفاق بیعت کر لی تھی۔ ان کے خلاف محاذ جنگ قائم کرتے ہیں۔ کیا اجتہاد اسی کا نام ہے کہ ایک کافر سے دوستی کی طرح ڈالی جائے اور علی، اصحاب بدر یین، شرکاء بیعت رضوان اور انصار و مہاجرین اوّلین سے دو چار مؤلفۃ القلوب قسم کے صحابیوں اور بساط اسلام پر تازہ وارد ہونے والے شامیوں کو لے کر جنگ کی جائے غرض یہ دعوائے اجتہاد دنیا کی ایک نرالی اپج ہے۔ مولانا جامی کہتے ہیں:۔

اختلافے کہ داشت با حیدر   در خلافت صحابیؑ دیگر!

حق درآنجا بدست حیدر بود جنگ با او خطائے منکر بود

مرزا غالب دہلوی بھی اس اجتہاد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ گئے ہیں ؎

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

قرارداد تحکیم

جب تحکیم کی قرارداد طے پا گئی تو عراق و شام کے قاریوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دو حکم مقرر کیے جائیں۔ ایک اہل شام نامزد کریں اور ایک اہل عراق، اور وہ دونوں قرآن و سنت کی روشنی میں جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لیے قابل تسلیم ہوگا۔ شامیوں نے عمرو ابن عاص کو اپنا نمائندہ مقرر کیا اور عراقیوں کی طرف سے اشعث بن قیس، مسعر ابن فدکی، یزید ابن حصین اور اُن کے ہم خیال لوگوں نے ابو موسیٰ اشعری کا نام پیش کر دیا۔ جو شام ہی کے علاقہ میں مقام عرض میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امیرالمومنین نے ابو موسیٰ کا نام سنا تو فرمایا:۔

لست اثق برای ابی موسیٰ ولا بحزمہ ولکن اجعل ذلک لعبد اللہ ابن عباس۔ (اخبار الطوال، صفحہ ۱۹۲)

مجھے ابو موسیٰ کی رائے اور اس کی سوجھ بوجھ پر اعتماد نہیں ہے میں یہ حق نمائندگی عبداللہ ابن عباس کو دینا چاہتا ہوں۔

اس پر ہلڑ مچا اور انہی لوگوں نے ابن عباس کے انتخاب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ اور ابن عباس ایک ہی ہیں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو حَکَم قرار دیا جائے۔ ہم ایسے شخص کو حکم قرار دینا چاہتے ہیں جو غیر جانبدار ہو اور دونوں فریق میں سے کسی فریق سے وابستہ نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تم لوگوں نے عمرو ابن عاص کے انتخاب پر کیوں اعتراض نہیں کیا وہ تو معاویہ کا خاص آدمی ہے۔ کہا کہ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں ان کے معاملہ میں دخل نہیں دے سکتے۔ فرمایا اگر تمہیں ابن عباس پر اعتراض ہے تو میں مالک اشتر کا نام پیش کرتا ہوں۔ کہا کہ وہی تو جنگ کے شعلے بھڑکانے والے ہیں وہ تو یہی چاہیں گے کہ تحکیم ناکام ہو۔ تاکہ انہیں جنگ و خونریزی کا پھر موقع مل سکے۔ فرمایا کہ اگر تم ابو موسیٰ ہی کو حکم بنانے پر مصر ہو تو پھر تم جانو اور تمہارا کام جو چاہو کرو اور جسے چاہے منتخب کر لو۔ احنف ابن قیس نے کہا کہ اے لوگو! اگر عبداللہ ابن عباس اور مالک اشتر کا نام تمہیں پسند نہیں ہے تو مجھے حَکَم مقرر کر دو میں عمرو کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتا ہوں وہ مجھے فریب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر تم مجھے نہیں چاہتے تو کسی اور کو منتخب کر لو مگر ابو موسیٰ کو کسی صورت میں یہ موقع نہ دو وہ کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑ دے گا مگر وہاں تو ایک

سازش کے ماتحت پہلے ہی سے ابو موسیٰ کا نام طے کیا جا چکا تھا۔ اس شور و ہنگامہ میں کسی نے کوئی بات نہ سنی اور آخر امیر المومنین کی رائے کے خلاف ابو موسیٰ کا انتخاب ہو گیا۔

انتخاب حکمین کے بعد جب عبداللہ ابن ابی رافع شرائط معاہدہ قلمبند کرنے لگے تو انہوں نے معاہدۂ صلح کے شروع میں یہ جملہ لکھا:۔ هذا ما تقاضى عليه على امير المومنين ومعاويه ابن ابى سفيان "یہ امیر المومنین علی اور معاویہ ابن ابی سفیان نے یہ فیصلہ کیا ہے" عمرو ابن عاص نے لفظ "امیر المومنین" پر اعتراض کیا۔ اور کہا کہ وہ دوسروں کے امیر ہوں گے ہمارے امیر نہیں ہیں۔ لہٰذا لفظ امیر المومنین کاٹ دی جائے اور اس کے بجائے علی اور اُن کے والد کا نام لکھا جائے۔ احنف ابن قیس نے حضرت سے کہا کہ آپ لفظ امیر المومنین کے کاٹنے کی ہرگز اجازت نہ دیں خواہ اس کے نتیجہ میں کشت و خون کی نوبت کیوں نہ آئے۔ آج یہ لفظ کاٹ دی گئی تو پھر امارت پلٹ کر کبھی آپ کی طرف نہیں آئے گی۔ اشعث ابن قیس اور اس کے حواری مصر تھے کہ اسے کاٹ دیا جائے۔ امیر المومنین ان سب باتوں سے بے نیاز چپ سادھے ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے ہوئے تھے اور صلح حدیبیہ کا عکس حال کے آئینہ میں دیکھ رہے تھے۔ آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ کہ میں نے جب حدیبیہ کے دن صلح نامہ لکھا اور آنحضرتؐ کے اسم گرامی کیساتھ لفظ رسول اللہ تحریر کی تو نمائندہ قریش سہیل نے کہا تھا کہ ہم انہیں اللہ کا رسول کب مانتے ہیں لہٰذا لفظ رسول اللہ مٹا دی جائے اور اس کے بجائے محمد ابن عبداللہ لکھا جائے۔ میں نے لفظ رسول اللہ پر خط کھینچنے میں تامل کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

اكتب فان لك مثلها تعطيها وانت مضطهد۔	"یہی لکھ دو۔ اور ایک دن تمہیں بھی ایسا واقعہ پیش آئے گا اور تم بے بس و مجبور ہو گے"

(سیرت حلبیہ۔ ج ۲۔ ص ۳۴۳)

اس پر عمرو نے بگڑ کر کہا کہ آپ ہمیں بھی ویسا ہی کافر سمجھتے ہیں جیسے وہ تھے فرمایا:۔

يا ابن النابغة ومتى لم تكن للفاسقين وليا وللمسلمين عدوا وهل تشبه الا امك التى وضعت بك۔	"اے نابغہ کے بیٹے تم کب فاسقوں کے دوست اور مسلمانوں کے دشمن نہیں رہے تم اپنی جننے والی ماں ہی کے مشابہ ہو"

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۳۵)

ابن عاص نے کہا کہ بس آج کے بعد نہ ہم ایک جگہ مل کر بیٹھیں گے اور نہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار ہوں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خداوند عالم میری مجلس کو تم سے اور تم

ایسے لوگوں سے پاک و صاف رکھے۔

جب لفظ امیرالمومنین کاٹ دی گئی اور از سرِ نو تحریر لکھی جانے لگی تو حضرت سے کہا گیا کہ آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ معاویہ اور اہلِ شام مسلمان ہیں حضرت نے فرمایا:۔

ما اقر لمعاویة ولا لاصحابه انهم مومنون ولا مسلمون و لکن یکتب معاویة ما شاء بما شاء و یقر ما شاء بما شاء لنفسه واصحابه ویسمی نفسه بما شاء واصحابه۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱ ص ۱۱)

"میں معاویہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ مومن و مسلم ہیں لیکن معاویہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں جو چاہے لکھے جس چیز کا چاہے اقرار کرے اور جو نام چاہے تجویز کرے"۔

آخر صلحنامہ قلمبند کیا گیا جو حسب ذیل دفعات پر مشتمل تھا۔

(۱) دونوں طرف کے حَکَم اس کے پابند ہوں گے کہ وہ قرآن مجید کی رُو سے فیصلہ کریں۔ اگر کتاب اللہ سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں تو متفقہ سنت رسول کی روشنی میں تصفیہ کریں۔

(۲) حکمین جو فیصلہ کریں گے دونوں فریق اس کے پابند ہوں گے۔ بشرطیکہ فیصلہ کتاب و سنت کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔

(۳) حکمین کو اس ماہِ رمضان کے آخر تک فیصلہ کر دینا چاہئیے اور اگر مدت میں توسیع کی ضرورت محسوس کریں تو وہ خود ہی اتفاق رائے سے مقررہ مدت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

(۴) اگر فیصلہ کے لئے شہادتوں کی ضرورت پیش آئے تو وہ مہیا کی جائیں گی۔

(۵) تصفیۂ تحکیم تک جنگ بند رہے گی دونوں فریق حکمین کی جان و مال کی حفاظت کریں گے۔ اور فریقین میں سے کسی فرد پر کہیں آنے جانے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی جائے گی۔

(۶) اگر فیصلہ سے قبل کسی حکم کا انتقال ہو جائے تو اس کی جماعت اس کی جگہ پر دوسرا حکم منتخب کرے گی۔

(۷) یہ اجتماع ایسے مقام پر ہو گا جو عراق و شام کے درمیان واقع ہو۔

ان دفعات میں سے بیشتر دفعات کا تعلق طریق کار اور انتظامی ضوابط سے ہے اور بنیادی دفعہ صرف ایک ہے کہ حکمین کتاب و سنت کی بنا پر فیصلہ کریں گے اور انہیں اپنی ذاتی رائے یا ذاتی رجحان پر فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہ ہو گا۔ اب اگر وہ اس شرط کی پابندی نہ کریں یا اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فیصلہ

کریں تو ظاہر ہے کہ نہ ان کی ثالثی حیثیت باقی رہ سکتی ہے اور نہ اُن کے فیصلہ کی پابندی کی جاسکتی ہے واقعات پیش آئندہ اس کے شاہد ہیں کہ جس طرح قصاص کی آواز اٹھانا اور نیزوں پر قرآن بلند کرنا دھوکا اور فریب تھا اسی طرح تحکیم میں بھی فریب ہی فریب کارفرما تھا۔ نہ کسی نے کتاب اللہ کو دیکھا اور نہ کسی نے سنتِ رسولؐ پر نظر کی اور ایک حریف نے دوسرے حریف کو سیاسی پٹخنیاں دے کر چت کر دینا ہی اپنا کارنامہ سمجھا۔

تحکیم کے خلاف خوارج کا ہنگامہ

عراق و شام کی فوجیں ابھی صفین ہی میں موجود تھیں کہ معاہدہ تحکیم کے ضبط تحریر میں لائے جانے کے بعد عراقیوں نے تحکیم کے خلاف سرگوشیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جب اشعث ابن قیس نے مختلف قبائل کے جھنڈوں کے پاس جاکر قرارداد تحکیم کی عبارت پڑھ کر سنائی تو تحکیم کے خلاف نفرت کے جذبات پوری شدت سے بھڑک اٹھے اور وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے تحکیم کے ماننے پر زور دے رہے تھے۔ تحکیم کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کرنے لگے۔ بنی عنزہ نے معاہدہ تحکیم کی تحریر سنی تو اُن میں سے دو حقیقی بھائیوں جعد اور معدان نے لاحکم الا للہ (حکم اللہ کے لئے مخصوص ہے) کا نعرہ لگایا اور تلواریں لے کر میدان میں نکل آئے اور لڑتے بھڑتے ہوئے قتل ہوگئے۔ بنی مراد نے یہ تحریر سنی تو صالح ابن شقیق نے کہا:۔ لاحکم الا للہ ولو کرہ المشرکون۔ (حکم اللہ کے لئے مخصوص ہے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے)۔ بنی راسب کو یہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی تو انہوں نے تحکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:۔ لا یحکم الرجال فی دین اللہ (اللہ کے دین میں لوگوں کو حکم قرار نہیں دیا جاسکتا) اس تحکیم کی مخالفت کرنے والوں میں اکثریت بنی تمیم کی تھی جب انہوں نے یہ تحریر سنی تو عروہ ابن ادیہ تمیمی نے اشعث سے کہا:۔

اتحکمون الرجال فی دین اللہ	کیا تم نے دین میں لوگوں کو حکم قرار دے لیا ہے
فاین قتلانا یا اشعث۔	اے اشعث اگر یہی ہونا تھا تو ہمارے مقتولین
(اخبار الطوال ص۱۹۶)	کیوں قتل ہوئے؟"

پھر تلوار لے کر اشعث پر حملہ آور ہوا۔ اشعث نے تیزی سے سواری کا رُخ موڑا تلوار سواری کے پُٹھے پر پڑی اور وہ اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔

اس جنگ بندی اور معاہدۂ تحکیم کے نتیجہ میں عراقیوں کی یکجہتی ختم ہوگئی ہر طرف فتنہ و شر اُٹھ کھڑا

ہوا محرز ابن خنیس نے فضا کو بگڑتے ہوئے دیکھا تو امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا امیر المومنین کیا اس معاہدہ کو ختم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک عظیم فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا اور آپ کو تنگی و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت نے فرمایا:-

ایعد ان کتبناہ ننقضہ؟ ھذا — کیا معاہدہ تحریر کرنے کے بعد ہم عہد شکنی کریں

لا یحل۔ (اخبار الطوال ص۱۹۱) — یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے "

جب امیرالمومنین نے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے ہتھیار رکھ دینے کے بعد ہتھیار اٹھانا گوارا نہ کیا تو نفاق کے جراثیم بغاوت و سرکشی کی صورت میں اُبھر آئے اور علویہ و عثمانیہ کے علاوہ ایک تیسرے گروہ کی بنیاد پڑ گئی ان لوگوں کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اس نئی تحریک کے پیچھے لگ گئے جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو جنگ کے جاری رکھنے پر مصر تھے اور وہ بھی جو تحکیم کے منوانے میں پیش پیش تھے اور یہ نعرہ جو وقتی ہیجان کے نتیجہ میں دو نوجوانوں اور عروہ ابن ادیہ کی زبان سے نکلا تھا اس گروہ کا جماعتی نعرہ بن گیا جب دونوں طرف کے لشکروں کی واپسی ہوئی اور امیرالمومنین اپنے لشکر کے ہمراہ کوفہ کی جانب روانہ ہوئے تو ہر ایک کے تیور چڑھے ہوئے پیشانیوں پر بل اور آنکھیں غیظ و غضب سے اُبلی پڑتی تھیں۔ کچھ لوگوں کو یہ صدمہ ہوا کہ جیتی ہوئی جنگ اپنے ہاتھوں سے ہار دی اور کچھ لوگوں کو یہ غم کہ تحکیم کو کیوں مانا گیا اور مانا گیا تو اسے وہیں پر کیوں نہ مسترد کر دیا گیا۔ جماعت میں پھوٹ تو پڑ ہی چکی تھی آپس میں الجھتے اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے جب کوفہ کے قریب پہنچے تو بارہ ہزار افراد نے حدود شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور جماعت سے کٹ کر کوفہ کے قریب مقام حروراء میں اُتر پڑے اور لاحکم الا للہ کی بنیاد پر ایک مستقل اور خطرناک محاذ قائم کر لیا۔ یہ جماعت خوارج اور حروریہ کے نام سے موسوم ہوئی اور جماعتی تنظیم کے پیش نظر انہوں نے شبث ابن ربعی کو امیر جنگ اور عبداللہ ابن کوا یشکری کو امام جماعت مقرر کر لیا۔

امیرالمومنین نے ان کی نافرمانی و سرکشی کے باوجود ان پر کسی قسم کی سختی گوارا نہ کی کیونکہ آپ انسانی تقاضائے طبیعت کو سمجھتے تھے کہ ایک باغی و سرکش جماعت کی کج فکری و کج ذہنی میں سختی و تشدد سے اضافہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی ذہنی و فکری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ البتہ جب نرمی و ملاطفت سے کام نہ نکلے اور سرکش جماعت کی کج ذہنی امن عامہ میں خلل کا باعث ہونے لگے تو پھر سختی و تشدد کا جواز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے انہیں افہام و تفہیم اور دلیل و برہان سے قائل کرنے کا لائحہ ترتیب دیا اور خود ان کے ہاں جا کر انہیں راہ راست پر لانے کا فیصلہ کیا اور جانے سے پہلے ابن عباس کو ان کے ہاں جانے کا حکم دیا اور ان

سے فرمایا کہ تم خوارج کے ہاں پہنچ کر میرا انتظار کرنا اور میرے آنے سے پہلے ان سے اختلافی موضوع پہ کوئی بات چیت نہ کرنا۔ اس گفتگو پر بندش لگانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ خوارج ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوں یا ان کے طرزِ گفتگو اور طریقِ استدلال پر بھڑک اٹھیں اور ذہنی طور پر آپ کی بات پر بھی کان نہ دھریں۔ جب ابن عباس ان کے ہاں پہنچے تو انہوں نے تحکیم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ شرع میں زنا کی سزا سو تازیانے اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان میں کسی کو ردّوبدل کا اختیار نہیں ہے تو پھر دو آدمیوں کو حکم قرار دینا کہ وہ ایک دینی معاملہ کا فیصلہ کریں کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ ابن عباس ضبط نہ کر سکے اور کہا کہ خداوند عالم نے حالتِ احرام میں جو شکار کیا جائے، اس کے بارے میں فرمایا ہے:۔

یا ایها الذین امنوا لا تقتلوا الصید و انتم حرم و من قتله متعمداً فجزاء مثل ما قتل من النعم یحکم به ذوا عدل منکم۔	ایمان والو جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارو اور جو کوئی تم میں سے جان بوجھ کر مار ڈالے تو چوپاؤں میں سے جس جانور کو مارا ہے ویسا ہی اس کا بدلہ دینا ہو گا جو تم میں سے دو منصف آدمی تجویز کریں۔

خوارج نے کہا کہ اس صورت کو مسلمانوں کی خونریزی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور پھر عمرو ابن عاص عادل کب ہے۔ کل تو ہم اسے غیر عادل سمجھ کر اس سے لڑ رہے تھے اور آج وہ عادل کیسے ہو گیا۔ تم لوگوں نے اللہ کے کام میں دو آدمیوں کو حکم ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ جب معاویہ اور اس کے ساتھیوں نے بغاوت کی تھی۔ تو ان کے بارے میں خدا کا حکم یہ تھا کہ یا انہیں قتل کیا جائے یا اُن سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے۔ مگر انہیں قتل کرتے یا اُن سے توبہ کا مطالبہ کرنے کے بجائے تم لوگوں نے اُن سے صلح کر لی۔ حالانکہ سورۂ برأت کے نازل ہونے کے بعد اہلِ حرب سے صلح کا جواز اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ جزیہ دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

اس اثنا میں امیرالمومنین تشریف لے آئے اور ابن عباس کو مصروفِ گفتگو دیکھ کر فرمایا کہ میں نے تمہیں بحث و مباحثہ سے منع کیا تھا پھر خوارج سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں بغاوت کی ہے ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں تحکیم سے اختلاف ہے۔ فرمایا تمہیں یاد ہو گا کہ جب شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کئے تھے تو میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ لوگ نہ دین سے کوئی واسطہ رکھتے ہیں اور نہ قرآن سے یہ شکست کی روسیاہی سے بچنے کے لئے قرآن کو بیچ میں لے آئے ہیں مگر تم لوگوں نے کہا کہ ہم قرآن

کے فیصلہ پر راضی ہیں اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں جنگ روک کر تحکیم کو تسلیم کر لوں حالانکہ میں اسے ناپسند کرتا تھا۔ جب تمہاری ضد سے مجبور ہو کر مجھے تحکیم ماننا ہی پڑی تو میں نے فریقین کے نمائندوں پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ کتاب وسنت کی بنیاد پر فیصلہ کریں اور اگر انہوں نے اس شرط کی پابندی نہ کی تو ہم ان کے فیصلہ کو ٹھکرا دیں گے۔ خوارج نے کہا کہ یہ تمام باتیں صحیح ہیں مگر آپ ہماری رائے پر عمل نہ کرتے اور تحکیم کو ٹھکرا دیتے۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے تحکیم کو مان کر کفر کا ارتکاب کیا تھا مگر اب کفر سے تائب ہو چکے ہیں۔ لہٰذا جس طرح ہم نے کفر کا اقرار کیا ہے اسی طرح آپ بھی کفر کا اقرار کر کے توبہ کریں پھر ہم آپ کی بیعت بھی کریں گے اور حلقۂ اطاعت میں بھی داخل ہو جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تحکیم کو مان کر کافر کیسے ہو گیا جب کہ خداوند عالم نے حکم قرار دینے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ زن و مرد کے اختلاف کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا	اگر تمہیں میاں بی بی کے درمیان تفرقہ کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبہ میں سے اور ایک ثالث عورت کے کنبہ میں سے مقرر کر دو۔

تو کیا اللہ کے نزدیک امت کے اختلاف وافتراق کی اہمیت میاں بی بی کے تفرقہ سے بھی کم ہے۔ کہا کہ آپ کو چاہیئے تھا کہ قرآن کو حکم قرار دیتے مگر آپ نے قرآن کو حکم قرار دینے کے بجائے لوگوں کو حکم قرار دے لیا۔ فرمایا:۔

انا لسنا حکمنا الرجال انما حکمنا القرآن وھذا القرآن انما ھو خط مسطور بین دفتین لا ینطق انما یتکلم بہ الرجال۔	ہم نے آدمیوں کو نہیں بلکہ قرآن کو حکم قرار دیا تھا چونکہ یہ قرآن دو دفتیوں کے درمیان لکھی ہوئی کتاب ہے کہ جو بولا نہیں کرتی اور وہ آدمی ہی ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کیا کرتے ہیں۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۶۹)

خوارج سے جب اس کا کوئی جواب بن نہ پڑا تو کہنے لگے کہ آپ نے عمرو ابن عاص کے کہنے سے لفظ امیر المومنین پر خط کھینچ دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ امارت وخلافت سے دستبردار ہو گئے فرمایا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام نے لفظ رسول اللہ پر خط کھینچ دیا تھا تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رسالت سے اپنی برطرفی کا اعلان کر رہے تھے۔ میرا طرز عمل وہی تھا جو رسول اللہ کا طرز عمل تھا اور وہ مجھے خبر دے گئے تھے کہ اے علی تمہیں بھی ایک دن اسی قسم کے معاملہ سے دوچار ہونا پڑے گا اور تمہیں بھی وہی کرنا ہو گا

جو میں نے کیا ہے۔ کہا کہ آپ نے فیصلہ کے لئے انہیں ڈھیل کیوں دی فرمایا تا کہ حقیقتِ حال سے بے خبر آگاہ ہو جائے اور با خبر اپنے موقف پر مضبوطی سے جم جائے اور اس طرح مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس پر وہ لوگ خاموش ہو گئے تو حضرت نے فرمایا خدا تم لوگوں پر رحم کرے اٹھو اور اپنے گھروں کو واپس چلو۔ خوارج آپ کی باتوں سے وقتی طور پر متاثر ہوئے۔ اور ظہر کی نماز آپ کی اقتداء میں پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شہر میں چلے آئے۔

یہ لوگ کوفہ میں داخل ہونے کو تو ہو گئے مگر اپنی کج فکری کے نتیجہ میں جو نظریہ قائم کر چکے تھے۔ اس سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہ کر سکے۔ چنانچہ جب ان سے موقف کی تبدیلی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارا موقف جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے اور کوفہ میں چلے آنے کے بارے میں یہ بات بنائی کہ جب حضرت نے ہم سے یہ کہا کہ تم لوگوں نے تحکیم پر اصرار کیا تھا تو ہم نے کہا کہ ہم نے تحکیم کو مان کر کفر کا ارتکاب کیا تھا اور اب توبہ کر لی ہے آپ بھی کفر کا اعتراف کر کے توبہ کر لیں تو ہم آپ کی اطاعت کرنے پر تیار ہیں۔ حضرت نے ہماری بات مان لی ہے اور ہم سے وعدہ کیا ہے کہ چھ ماہ توقف کرو اس عرصہ میں جنگی مصارف کے لئے مال بھی فراہم ہو جائے گا اور جانور بھی فربہ ہو جائیں گے پھر ہم شامیوں کے مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ خوارج نے یہ بات صرف اپنی ندامت کو چھپانے کے لئے گھڑلی تھی ورنہ اس میں قطعاً کوئی صداقت نہ تھی۔ چنانچہ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے کہ:۔

قد کذب الخوارج فیما زعموا — خوارج نے اپنے زعم باطل میں جو کچھ کہا ہے سراسر جھوٹ ہے"

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۶۶)

اگرچہ خوارج کی یہ بات جھوٹی اور حقیقت کے خلاف تھی مگر زبانوں پر گردش کرتی ہوئی عام ہو گئی اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ حضرت نے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کر لی ہے اور حکمین کے فیصلہ سے پہلے شام پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا ہے۔ اشعث ابن قیس نے فتنہ و شر کو ہوا دینے کے لئے حضرت سے کہا کہ یا امیر المومنین لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ تحکیم کو ضلالت اور اس پر اصرار کو کفر سمجھتے ہیں۔ حضرت نے اس کی تردید ضروری سمجھی اور منبر پر کھڑے ہو کر مجمع عام میں اعلان کیا کہ جو شخص میری طرف یہ نسبت دیتا ہے کہ میں تحکیم کے معاہدہ سے منحرف ہو گیا ہوں وہ جھوٹ کہتا ہے۔ حضرت کے اس اعلان پر خوارج پھر بھڑک اُٹھے۔ ان کا پول کھل گیا اور جھوٹ بے نقاب ہو گیا۔ انہوں نے احتجاجاً لا حکم الا للہ کا نعرہ لگایا۔ اور پھر اس نعرہ کی گونج مسجد کے ہر کونے سے سنائی دینے لگی اور ایک شخص نے حضرت کو مخاطب کر کے یہ آیت پڑھی:۔

لئن اشرکت لیحبطن عملک و لتکون من الخاسرین۔ — اگر تم شرک کروگے تو تمہارے تمام اعمال اکارت جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگے۔"

امیرالمومنین نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی:۔

فاصبر ان وعد اللہ حق لا یستخفنک الذین لا یوقنون۔ — صبر سے کام لے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور یہ بے یقین لوگ تمہیں مغالطہ میں نہ ڈالیں۔"

اب جوں جوں حکمین کے اجتماع کا وقت قریب آنے لگا ان لوگوں کی شر انگیزی و دریدہ دہنی زور پکڑنے لگی۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ اب وہ افہام و تفہیم کے حدود سے گزر کر تیغ و سنان کے ذریعہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب ابو موسیٰ کے روانہ ہونے کا وقت قریب تھا تو وہ جنگ کا بہانہ تلاش کرنے کے لئے شوخ چشمی و اشتعال انگیزی پر اُتر آئے اور ان کے دو نمائندے زرعہ ابن برُج طائی اور حرقوص ابن زہیر اسدی حضرت کے پاس آئے اور حسب معمول لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگایا اور پھر حرقوص نے حضرت سے گستاخانہ لہجہ میں کہا کہ آپ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اس سے توبہ کیجئے اور تحکیم سے دستبردار ہو کر شام چلئے اور دشمن سے جنگ کیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تم جنگ کے رکوانے پر مصر تھے تو میں نے جنگ کے جاری رکھنے پر زور دیا تھا مگر تم لوگوں نے میری مخالفت کی اور اپنی ضد پر اڑے رہے اور اب جب کہ عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ ہمارے لئے اس معاہدہ کی پابندی ضروری ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ' کا ارشاد ہے:۔

واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم۔ — جب آپس میں قول و قرار کر لو تو اللہ کے عہد و پیمان کو پُورا کرو۔"

حرقوص نے کہا کہ وہ معاہدہ سرے سے گناہ تھا اور خلاف شرع معاہدہ کی پابندی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ فرمایا کہ معاہدۂ تحکیم گناہ نہیں تھا بلکہ تم لوگوں کی فکر و رائے کی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ میں نے تحکیم سے تمہیں منع کیا تھا مگر تم نے میری بات نہ مانی اور جنگ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس پر زرعہ ابن برج نے کہا کہ اے علی اگر آپ نے معاہدۂ تحکیم کو ختم نہ کیا تو ہم اللہ کی خوشنودی کی خاطر آپ سے جنگ کریں گے۔ حضرت نے فرمایا:۔

بوسا لک ما اشقاک کانی بک قتیلا تسفی علیک الریح۔ — تیرا بُرا ہو تو کتنا بد بخت ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تو قتل کیا جا چکا ہے اور باد صرصر تجھ پر خاک ڈال رہی ہے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۵۳)

اس نے کہا کہ میں تو یہی چاہتا ہوں یہ کہہ کر دونوں لاحکم الا للہ کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اب خوارج نے مسجد کو شورش و ہنگامہ آرائی کا مرکز بنا لیا اور جب بھی حضرت خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو ہر سمت سے نعروں کا شور بلند ہونے لگتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے نعرہ لگایا تو حضرت نے فرمایا اللہ اکبر! بات سچی ہے مگر ان کا مقصد غلط ہے۔ اگر یہ خاموش رہے تو ہم ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہیں گے اگر یہ ہمارے خلاف بولیں گے تو انہیں دلائل سے چپ کریں گے انہوں نے ہم پر خروج کیا تو ہم ان سے لڑیں گے۔ اس پر ایک خارجی یزید ابن عاصم محاربی تملا کر اُٹھا اور کہنے لگا کہ اے علی آپ ہمیں قتل سے کیا ڈراتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہم عنقریب آپ پر تلواریں برسائیں گے۔ ہم دین کے معاملہ میں ذلت گوارا نہیں کر سکتے کیونکہ دین میں ذلت کو گوارا کرنا غضبِ خدا کو دعوت دینا ہے ایکدن خطبہ دیتے ہوئے مسجد کے ہر کونے سے نعروں کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو حضرت نے فرمایا:۔

اللہ اکبر! کلمۃ حق یلتمس	اللہ اکبر! کلمہ حق ہے مگر مقصد باطل ہے۔ دیکھو
بھا باطل اما ان لکم عندنا	جب تک تم ہمارے ساتھ رہو گے تمہارے تین حق
ثلاثا ما صحبتمونا لا نمنعکم	ہمارے ذمہ ہوں گے ہم تمہیں مساجد میں اللہ کا
مساجد اللہ ان تذکروا فیھا	ذکر کرنے سے منع نہیں کریں گے۔ جہاد میں ہمارے
اسمہ ولا نمنعکم الفئ ما	ساتھ تعاون کرو گے تو تمہیں مالِ غنیمت سے محروم
دامت ایدیکم مع ایدینا ولا	نہیں کریں گے اور اس وقت تک تم سے جنگ
نقاتلکم حتی تبدؤنا۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۳)	نہیں کریں گے جب تک تم پہل نہ کرو گے"۔

امیرالمومنین کے حلم وضبط اور نرم روی سے اثر لینے کے بجائے خوارج تمرد و سرکشی پر اُتر آئے۔ اور حضرت کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن وہب راسبی کے گھر میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے لئے جمع ہوئے اور اپنے محاذ کو مضبوط تر کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ عبداللہ ابن وہب نے کہا کہ ہمیں اس شہر سے نکل کر پہاڑی علاقوں یا دُور افتادہ بستیوں کی طرف چل دینا چاہئے، تا کہ یہاں کے ظالم باشندوں کے علی الرغم اللہ کی نافرمانیوں اور گمراہ کن بدعتوں کا انسداد کر سکیں۔ حرقوص ابن زہیر نے اس کی تائید کی اور حمزہ ابن سنان نے اس تجویز سے موافقت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام جماعتی تنظیم کے ماتحت ہی انجام دیا جا سکتا ہے لہذا:۔

ولوا امرکم رجلا منکم فانہ	اپنے لوگوں میں سے کسی کو ولی امر منتخب کرلو اس

لابد لکم من قائد وسائس ۔ لئے کہ تمہارے لئے ایک قائد و سربراہ کا ہونا ضروری ہے۔" (اخبار الطوال۔ ص۲۰۲)

اس پر بھی اتفاق رائے ہوا اور انہوں نے یزید ابن حصین طائی کو امارت کی پیش کش کی مگر اس نے امارت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے حرقوص ابن زہیر، حمزہ ابن سنان اور شریح ابن اوفی عبسی کو قیادت کی پیش کش کی گئی مگر ان تینوں نے معذرت کی اور اس ذمہ داری سے پہلو بچائے گئے۔ آخر میں عبداللہ ابن وہب سے کہا گیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں امارت قبول کروں تو اس لئے نہیں کہ میں دنیوی نام و نمود کا خواہشمند ہوں اور اگر قبول نہ کروں تو اس لئے نہیں کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ جب امیر کا تقرر ضروری ہے تو مجھے بہر حال اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑے گا۔

اس انتخاب کے بعد شریح ابن اوفی کے مکان پر مزید صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ عبداللہ ابن وہب نے کہا کہ جب ہمیں کوفہ چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر اس شہر کا رُخ کرنا چاہیئے جہاں ہم بغیر کسی روک ٹوک کے اللہ کے احکام کا نفاذ کر سکیں۔ شریح نے کہا کہ اس مقصد کے لئے مدائن سے بہتر اور موزوں تر کوئی جگہ نہیں ہے ہم وہاں کے باشندوں کو باہر نکال کر شہر پر قبضہ کر لیں گے اور بصرہ میں جو ہمارے ہم خیال بھائی بند ہیں انہیں بھی مدائن چلے آنے کی دعوت دیں گے۔ وہ یقیناً ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور اس طرح ہم قوت و طاقت میں معتد بہ اضافہ کر سکیں گے۔ یزید ابن حصین نے کہا کہ اگر ہم نے مدائن کا رُخ کیا تو وہاں کے لوگ پوری طاقت سے ہمارا مقابلہ کریں گے اور شہر میں داخل ہونے سے مانع ہوں گے۔ لہذا ہمیں مدائن کے بجائے نہروان کی طرف جانا چاہیئے۔ اس تجویز پر اتفاق رائے کے بعد یہ طے پایا کہ ایک ساتھ نکلنے کے بجائے ایک ایک یا دو دو کر کے نکلیں تاکہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی روک نہ لئے جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ مختلف راستوں سے اکیلے دکیلے نکل کھڑے ہوئے اور چھپتے چھپاتے نہروان کی طرف چل دیئے۔ اہل بصرہ کو اپنے عزائم سے آگاہ کرنے کے لئے عبداللہ ابن سعد عبسی کو بصرہ بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ جلد از جلد نہروان پہنچ جائیں۔ بصرہ والوں نے جواب دیا کہ ہم تم لوگوں کی رائے سے پوری طرح متفق ہیں اور جلد پہنچا چاہتے ہیں۔

ان خروج کرنے والوں میں عدی ابن حاتم کا بیٹا طرفہ بھی تھا وہ مقام سیب میں پہنچ کر یزید ابن حصین کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ عدی کو اپنے بیٹے کے خروج کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور اس کے تعاقب میں مدائن پہنچے مگر وہاں خوارج میں سے کوئی نظر نہ آیا تو کوفہ کے ارادہ سے پلٹے۔ جب مدائن سے نکل کر ساباط میں وارد ہوئے تو عبداللہ ابن وہب سے جو دیر عاقول سے دریا عبور کر کے نہروان جا رہا

تھا مڈ بھیڑ ہو گئی۔ عبداللہ ابن وہب نے عدی کو اکیلا پا کر انہیں قتل کر دینا چاہا مگر عمرو ابن مالک نبہانی اور بشر ابن یزید بولانی ان کے قتل سے مانع ہوئے اور ان کی جان بچ گئی۔ عدی نے خوارج کے اس جتھے کو دیکھ کر حاکم مدائن سعد ابن مسعود کو پیغام بھجوایا کہ خوارج کا ایک دستہ آگے بڑھ رہا ہے وہ اسے روکنے کا انتظام کریں۔ سعد نے اپنے بھتیجے مختار ابن ابی عبید کو مدائن میں اپنا نائب مقرر کیا اور پانچ سو سواروں کا دستہ لے کر خوارج کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ عبداللہ ابن وہب کے ہمراہ صرف تیس سوار تھے اسے سعد اور ان کے ہمراہیوں کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے راستہ بدل دیا اور بغداد کا رُخ کر لیا۔ سعد نے اس کا پیچھا کیا اور غروب آفتاب کے وقت اُسے کرخ میں جا لیا۔ کچھ دیر تک دونوں فریق لڑتے رہے آخر سعد کے ساتھیوں نے کہا کہ انہیں چھوڑ دینا چاہیئے اس لئے کہ ہمیں امیرالمومنین نے ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ البتہ امیرالمومنین کو اس کی اطلاع دے دینا چاہیئے۔ اگر وہ فرمائیں گے تو ان کا پیچھا کیا جائے گا ورنہ جہاں یہ جانا چاہتے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔ مگر سعد نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں ان سے لڑنا چاہیئے۔ ادھر رات ہو چکی تھی اور جنگ چھیڑی نہ جا سکتی تھی۔ صبح کے انتظار میں خوارج کے قریب پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔ عبداللہ ابن وہب اور اس کے ساتھیوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا اور راتوں رات دریا عبور کر کے جوخی پہنچ گئے اور وہاں سے نہروان کی طرف نکل گئے۔ خوارج نہروان کے پُل کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑے تھے اور عبداللہ ابن وہب اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کرنے کے بعد یہ چاہتے تھے کہ حرقوص ابن زہیر یا یزید ابن حصین کو امیر منتخب کریں کہ یہ لوگ پہنچ گئے۔ اہلِ کوفہ میں سے قعقاع ابن قیس طائی، عبداللہ ابن حکیم، سالم ابن ربیعہ عبسی اور چند افراد خوارج کی جماعت میں شامل ہونے کے لئے نہروان جانا چاہتے تھے مگر ان لوگوں کو ان کے گھر والوں نے روک دیا اور انہیں مجبوراً رُک جانا پڑا اور سالم ابنِ ربیعہ کو امیرالمومنین نے بُلا کر منع کر دیا۔

بصرہ سے مسعر ابن فدکی تمیمی کی قیادت میں پانچ سو خوارج نہروان کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے جب حاکم بصرہ ابن عباس کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ابوالاسود دئلی کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ انہیں سمجھا بجھا کر واپس لائیں۔ ابوالاسود جب خوارج تک پہنچے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ خوارج انہیں دیکھ کر جسر کے قریب ٹھہر گئے اور یہ تاثر دیا کہ وہ رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ ابوالاسود بھی رات کے اندھیرے میں کوئی قدم نہ اٹھا سکتے تھے وہ بھی صبح کے انتظار میں ٹھہر گئے مگر خوارج رات کی تاریکی میں چپکے سے نکل کھڑے ہوئے اور ان کی گرفت سے نکل کر نہروان پہنچ گئے اور کوفہ و بصرہ اور اطراف و جوانب کے خوارج نے جمع ہو کر نہروان کو ہنگامہ و شورش کا آماجگاہ بنا لیا۔

خوارج کی اس جتھا بندی کے پیشِ نظر امیرالمومنین کے مخلص اصحاب نے چاہا کہ حضرت کو اپنی دوستی وجان نثاری کا یقین دلا کر تجدید بیعت کریں۔ چنانچہ وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم اس معاہدہ پر آپ کی بیعت کرتے ہیں کہ جو آپ کا دوست ہوگا۔ ہم اسے دوست رکھیں گے اور جو آپ کا دشمن ہوگا ہم اسے دشمن رکھیں گے۔ حضرت نے ان لوگوں سے بیعت لی اور ربیعہ ابن ابی شداد خثعمی سے جو جمل و صفین میں آپ کے ہمرکاب رہ کر جنگ کر چکا تھا فرمایا کہ تم بھی کتاب و سنت کے اتباع کی بنیاد پر بیعت کرو۔ اس نے کہا کہ میں سنت ابوبکر و عمر کی پیروی کی شرط پر بیعت کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا تمہیں اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے انکار ہے۔ اگر ابوبکر و عمر کی سنت کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ قابلِ عمل ہی نہیں ہے پھر اس شرط کے پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پھر حضرت نے تیور بدل کر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا :-

اما واللہ لکانی بک وقد نفرت	خدا کی قسم میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا
مع ھذہ الخوارج فقتلت	ہوں کہ تم خوارج کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہو
وکانی بک وقد وطئتک الخیل	اور گھوڑے اپنے سموں سے تمہیں روندرہے ہیں''

بحوافرھا۔ (تاریخ کامل ج ۳۔ ص۱۶۱)

اگر یہ صحیح ہے کہ عمل تضاد ذہنی انتشار کا نتیجہ ہوتا ہے تو بلا شبہ خوارج ذہنی و فکری انتشار کا شکار تھے۔ انہوں نے نہ صرف تحکیم کو مانا بلکہ امیرالمومنین کو بھی تحکیم کے ماننے پر مجبور کر دیا۔ اور جب آپ نے تحکیم کی اجازت دے دی تو لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے تحکیم کی مخالفت کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے

" ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا "

خوارج نے اپنے نعرہ کا استخراج آیت قرآنی ان الحکم الا اللہ سے کیا ہے جو ابتداء میں صرف تحکیم کی مخالفت میں بلند ہوا اور پھر اس آیت کے ظاہر پر نظر کرتے ہوئے ان لوگوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ حکومت بھی اللہ کے لئے ہے اور بیعت بھی اللہ کے لئے اور اس کے علاوہ کوئی حاکم و فرمانروا نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح یہ نعرہ ایک جدید نظریۂ حکومت کی بنیاد قرار پا گیا۔ اور خوارج اس آیت کی آڑ میں کہنے لگے کہ ہم حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتے ہیں کیونکہ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے۔ مگر انہوں نے اس پر غور نہ کیا کہ حکومتِ الٰہیہ کے معنی ابطال امارت کے نہیں ہیں بلکہ حکومتِ الٰہیہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے احکام کا نفاذ الٰہی نمائندوں کے ذریعہ ہو اور ان نمائندوں کے مقابلہ میں کسی کو رائے زنی و قیاس آرائی کا حق حاصل نہ ہو لہٰذا آیت ان الحکم الا اللہ کا یہ مفہوم قرار دینا کہ حکومت و فرمانروائی اللہ کے علاوہ کسی کی

نہیں ہوسکتی اور دینی و دنیوی تنظیم کے لئے کسی امیر کی احتیاج نہیں ہے ایک غلط نظریہ ہے اور قرآنی آیت کا اس سے کوئی ربط نہیں ہے ۔ یہ آیت حضرت یعقوب کے واقعات کے سلسلہ میں ہے اور پوری آیت اس طرح ہے :۔

وقال یا بنی لاتدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ وما اغنی عنکم من اللہ من شیء ان الحکم الا اللہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون ۔	اور (یعقوب نے) کہا اے بیٹو تم سب کے سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اس مصیبت کو جو خدا کی طرف سے آئے ٹال نہیں سکتا حکم تو دراصل خدا ہی کے واسطے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے ۔

اس آیت میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ جب حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو مصر روانہ کیا تو ان سے کہا کہ تم الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا تاکہ نظر بد سے بچے رہو اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر تم متفرق دروازوں سے داخل ہوگے تو ضرور بچے ہی رہوگے اس لئے کہ حکم چلتا ہے تو اللہ کا چلتا ہے ۔ اور وہ جس کام کا ارادہ کر لیتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اس کے برخلاف دوسروں کے ارادے کبھی پورے ہوتے ہیں اور کبھی پورے نہیں ہوتے مگر پھر بھی اپنی طرف سے تدبیر و احتیاط ضروری ہے ۔ یہ تھا اس آیت کا واضح مطلب ۔ مگر خوارج نے نہ آیت کے مورد و محل کو دیکھا نہ اس کے معنی و مفہوم پر نظر کی اور اس کا مطلب یہ قرار دے لیا کہ سرے سے کوئی حاکم ہو ہی نہیں سکتا ۔ امیرالمومنین نے خوارج کی اس من گھڑت تاویل کی رد میں فرمایا ہے " بات درست ہے مگر ان کی مراد باطل ہے ۔ بے شک حکم اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے مگر یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی حالانکہ لوگوں کے لئے ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے ۔" چنانچہ خوارج کا یہ نظریہ نظریئے ہی کی حد میں رہا اور کسی دور میں اسے عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا ۔ بلکہ خود خوارج بھی اس پر عملدرآمد نہ کر سکے اور کشود و بست کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا امیر و سربراہ منتخب کرتے رہے ۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیاسی و انتظامی نقطۂ نظر سے حکومت کا قیام لازمی اور ایک سربراہ مملکت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ حکومت ہی شخصی و اجتماعی مفادات کی حفاظت کرتی اور معاشی و معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرتی ہے ۔ اگر حکومت نہ ہو تو نہ ریاست کی تنظیم ممکن ہے نہ اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے نہ نظم و نسق باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن و امان برقرار رکھا جاسکتا ہے ۔ اگر خوارج کا یہ نعرہ دیانت و نیک نیتی کے زیر اثر ہوتا تو وہ تحکیم کے جواز کی نفی

کرنے کے بجائے یہ کہہ سکتے تھے کہ حکم قرار دینا تو جائز ہے جیسا کہ پیغمبر اکرم نے بنی قریظہ کے بارے میں سعد ابن معاذ کو حکم مقرر کیا تھا مگر اس موقع پر جب کہ دشمن اس کے ذریعہ فریب دینا چاہتا ہے تحکیم ناروا اور خلاف مصلحت ہے تو اسے ایک حد تک ایک صحیح جذبہ کے تحت لایا جا سکتا تھا مگر انہوں نے تو شورش و ہنگامہ آرائی کا جواز پیدا کرنے کے لئے یہ نعرہ لگایا تھا تاکہ حکومت الٰہیہ کے پردے میں قبائلی عصبیت کو زندہ اور لاحکومت کا نعرہ لگا کر طوائف الملوکی کا اعادہ کر سکیں ورنہ حکومت الٰہیہ کا قیام ہی ان کے پیش نظر ہوتا تو امیر المومنین سے تعاون کرتے اس لئے کہ ان سے بہتر کون ہو سکتا تھا جو حکومتِ الٰہیہ کو الٰہی احکام و قوانین کی بنیادوں پر استوار کرتا اور دنیا کو انہی درخشاں خطوط پر چلاتا جنہیں پیغمبر اکرم نے وحی ربانی کی روشنی میں ترتیب دیا تھا۔

خوارج پر ایک نظر

خارجیت کے جراثیم پیغمبر اکرم کے زمانہ ہی میں پیدا ہو چکے تھے جو اندر ہی اندر بڑھتے اور پھیلتے رہے یہ لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام ہی کے خلاف سازشیں کرتے تخریبی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ان کی گستاخی و شوخ چشمی کا یہ عالم تھا کہ پیغمبر اکرم کی عدالت و دیانت پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ چنانچہ جب آنحضرت نے غزوۂ حنین کا مال غنیمت وادئ جعرانہ میں تقسیم فرمایا۔ اور تازہ مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے اپنے حصۂ خمس میں سے انہیں اوروں کی نسبت زیادہ دیا تو اس گروہ کی ایک فرد ذوالخویصرہ تمیمی نے گستاخانہ لہجہ میں آنحضرت سے کہا کہ آپ عدل و انصاف کریں جس پر آنحضرت نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو پھر کون ہے جو عدل کرے گا۔ حضرت عمر بھی اس پر بگڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ کیا ہم اسے قتل نہ کر دیں آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

دعه فان له اصحابا یحقر احدکم صلاته مع صلاته وصیامه مع صیامه یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة۔

(صحیح بخاری۔ ج ۴ ص ۱۳۴)

"چھوڑو اسے اس جیسے اور بھی اس کے ساتھی ہیں اگر تم میں سے کوئی ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں اپنے روزوں کو دیکھے گا تو اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر و پست سمجھے گا۔ یہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے۔"

یہ لوگ بظاہر شعائر اسلام اور احکام دین کے پابند اور نماز و روزہ اور تلاوتِ قرآن کے دلدادہ

تھے مگر اسلام کی روح سے ناآشنا اور دین کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے :۔

تفترق امتی علی فرقتین تمرق بینہما فرقہ محلقون رؤوسہم محفون شواربہم ازرہم الی انصاف سوقہم یقرؤن القرآن لایتجاوز تراقیہم یقتلہم احبہم الی واحبہم الی اللہ تعالی۔

(تاریخ بغداد۔ ج ۱ صفحہ ۱۶۰)

میری اُمت دو فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان دو میں سے ایک اور فرقہ نکل کھڑا ہو گا اس فرقہ کے لوگ سر منڈوائے مونچھیں باریک کٹوائے۔ اور آدھی پنڈلیوں تک تہمد باندھے ہوں گے، وُہ قرآن کی تلاوت کریں گے۔ مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا انہیں وُہ شخص قتل کرے گا جو مجھے اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

ان کی اس ظاہری وضع قطع عبادت میں انہماک نمازوں میں خضوع خشوع اور پیشانیوں پر پڑے ہوئے گھٹوں کو دیکھ کر اکثر لوگ ان کے فریب کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان کی نمازوں کی یہ کیفیت تھی کہ صحابہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت نے ذوالخویصرہ کو سجدہ میں دیکھا آپ نماز پڑھ کر فارغ ہو گئے مگر وُہ اسی طرح سجدہ میں پڑا تھا۔ آنحضرتؐ نے پلٹ کر حضرت ابوبکر سے کہا کہ تم جاؤ اور ذوالخویصرہ کو قتل کر دو۔ حضرت ابوبکر نے اُسے بڑے خضوع و خشوع سے نماز پڑھتے دیکھا تو اُسے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس پلٹ آئے۔ پھر پیغمبر نے حضرت عمر کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ وہ بھی اُسے نماز پڑھتے دیکھ کر واپس چلے آئے اور آنحضرت سے کہا کہ وُہ تو نمازی ہے میرا دل نہیں مانا کہ اُسے قتل کروں۔ آخر آنحضرت نے حضرت علی کو بھیجا مگر امیرالمومنین کے پہنچنے سے پہلے وہ وہاں سے چلا گیا۔ آپ نے پلٹ کر پیغمبر سے عرض کیا کہ وہ جا چکا ہے۔ فرمایا وُہ آج قتل ہو جاتا تو فتنہ دب جاتا۔ وہ اس گروہ کا ایک فرد تھا جو دین سے اس طرح نکل جائے گا جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

خوارج عرب کے صحرائی و بدوی باشندے تھے جن پر بدویت ہی کا رنگ غالب تھا اور طبعاً شورش پسند فتنہ جو اور قتل و غارت کے خوگر تھے۔ پیغمبر اکرم کے بعد انہیں مختلف جنگوں میں ڈھکیلا جاتا رہا اور وہ جنگ و قتال کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اور کچھ نہ ہوتا تو آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ ان جنگی مصروفیات نے انہیں اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور اور اس کے اخلاق و آداب سے اثر پذیر ہوتے۔ فتح عراق کے بعد جب سرحدوں کی حفاظت کے لئے کوفہ و بصرہ کی بنیادیں رکھی گئیں تو ان چھاؤنیوں کی آبادکاری کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو طبعاً جنگجو اور جنگی خو بو رکھتے

ہوں۔ چنانچہ ان لوگوں کو یہاں آباد کیا گیا اور یہ لوگ بہتر مستقبل کی امید میں یہاں بس گئے۔ مگر شہری زندگی اختیار کرنے کے باوجود اجتماعی زندگی سے مانوس نہ ہو سکے اور انفرادیت اور قبائلی عصبیت جو بدوی زندگی کا خاصہ ہے ان میں رچی بسی رہی۔ جب امیرالمومنین کو دشمن کے مقابلہ میں فوج کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ لوگ سابقہ حکومتوں میں جنگی خدمات بجالانے کے عادی تو تھے ہی حضرت کی آواز پر بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے مخالفین سے جنگوں میں حصہ لیا۔ یہ حق کی تائید اور دین کی حمایت کے جذبہ کے زیر اثر نہ تھا بلکہ اس میں عصبیت جنگ پسندی اور مادی مقاصد کار فرما تھے۔

خوارج میں زیادہ تر بنی تمیم اور عرب کے موالی شامل تھے اور اُن کے سردار بھی عموماً بنی تمیم کے افراد تھے چنانچہ عبداللہ ابن اباض، عروہ ابن ادیہ، مستورد ابن سعد، ابو بلال مرداس ابن ادیہ، مسعر ابن فدکی وغیرہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قبل اسلام بنی تمیم مجوسی تھے اور فقر و افلاس کی بناء پر لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ چنانچہ قیس ابن عاصم تمیمی جب اسلام لایا تو پیغمبر سے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے زمانہ جاہلیت میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کی بہیمیت و دنائت طبع میں فرق نہ آیا اور دور جاہلیت کی تخریب پسندی اور مجوسیت کی خو بو ورثہ میں ساتھ لائے۔ طرماح نے ان کے عادات و اطوار پر نظر کرتے ہوئے صحیح کہا ہے ؎

تمیم بطرق اللوم اھدی من القطا　　　ولو سلکت سبل المکارم ضلت

"بنی تمیم پستی و دنائت کی راہوں کو نہیں بھولتے جس طرح قطا پرندہ اپنا راستہ نہیں بھولتا اگر انہیں بزرگی و شرافت کی راہوں پر چلنا پڑے تو بھٹک جائیں۔"

جب بنی تمیم وفد کی صورت میں مدینہ آئے اور پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لانا چاہا تو اُن میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا یا محمدؐ اخرج الینا (اے محمدؐ باہر نکلو) اس انداز تخاطب پر بنی تمیم کو تنبیہہ کرنے اور اُن کی سفاہت و کم عقلی پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ آیت اُتری:۔

ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون۔	وہ لوگ جو تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اُن میں سے اکثر بے عقل ہیں۔

پیغمبر اکرم کے بعد ان کی اکثریت اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گئی اور مشہور مدعیہ نبوت سجاح بنت حارث بھی اسی قبیلہ سے تھی جس نے اسلام میں رخنہ اندازی کر کے انتشار و اختلاف کو ہوا دی۔ بنی تمیم کے اس قومی مزاج کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دلوں میں قطعاً اسلام راسخ نہ ہوا تھا اور ان کا باطنی نفاق کبھی ارتداد کی صورت میں اور کبھی خروج کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا اور آخر ان کی خودسری و شورہ پشتی

نے انہیں امیرالمومنین کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا۔

ایک گروہ نے خوارج کو شیعہ قرار دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شیعوں نے حضرت کی کامیابی کو ناکامی میں بدل کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئے اور اسے امیرالمومنین کی سیاسی کمزوری کے ثبوت میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ اپنے ہی لوگوں پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ بے شک یہ لوگ امیرالمومنین کے لشکر میں شامل رہے تھے مگر انہیں شیعۂ امیرالمومنین قرار دے کر شیعیت کو موردِ الزام قرار دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت کی صفوں میں ایک ہی مسلک و عقیدہ کے لوگ نہ تھے۔ ان میں ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جو ان کی امامت کو منصوص سمجھتا تھا اور جانشینِ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت کو ضروری اور نافرمانی کو حرام جانتا تھا۔ یہ لوگ نہ کسی وقت بدلے اور نہ کسی حالت میں آپ کا ساتھ چھوڑا۔ اور ایک گروہ جو اکثریت میں تھا آپ کی خلافت کو جمہور کی آرا سے وابستہ سمجھا تھا اور جس حیثیت سے پہلے خلفاء کو مانتا چلا آرہا تھا اسی حیثیت سے حضرت کو بھی چوتھے درجہ پر قرار دے کر ان کے ساتھ ہو گیا تھا یہ لوگ امیرالمومنین کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے دوسروں سے منسلک رہے اور حضرت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد معاویہ کے مقابلہ میں ان کے ساتھ ہو گئے اور انہی میں ایک گروہ نے جب امیرالمومنین کو اپنی طبیعت و مزاج کے موافق نہ پایا تو تحکیم کا حیلہ تراش کر حضرت سے کٹ گیا اور جو لوگ موقع و وقت دیکھ کر ہاتھ ہو جاتے ہیں وہ موقع و وقت دیکھ کر ساتھ چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ یہ نہ اس وقت امیرالمومنین کے مخلص تھے جب اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور نہ اس وقت شیعیانِ علی میں شامل تھے۔ جب بیعت توڑ کر الگ ہوئے تھے۔ یہ لوگ تو سرے سے امیرالمومنین کی خلافت چاہتے ہی نہ تھے بلکہ کوفہ والے چاہتے تھے کہ زبیر خلیفہ ہوں اور بصرہ والے چاہتے تھے کہ طلحہ برسرِ اقتدار آئے۔ اور جب طلحہ و زبیر کی خلافت کی صورت پیدا نہ ہو سکی تو انہوں نے اہلِ مدینہ کے انتخاب سے موافقت کرتے ہوئے حضرت کی خلافت پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بہرحال جس فوج میں ایسے عناصر شامل ہوں اُسے اتنے عرصہ تک دشمن کی صفوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھنا امیرالمومنین کے حسنِ تدبر ہی کا کرشمہ ہو سکتا ہے ورنہ جہاں اندر ہی اندر بددلی پھیلائی جا رہی ہو عہدوں پر بک جاتے ہوں اور روپیہ پیسہ کے لالچ میں اپنا موقف چھوڑ دیتے ہوں وہاں اس کے علاوہ اور توقع ہی کیا کی جا سکتی تھی کہ وہ عین فتح کے وقت ہتھیار رکھ کر فتح کو شکست سے بدل دیں۔

حکمین کا فیصلہ

۱۳ ماہِ صفر ۳۷ھ میں تحکیم کی قرارداد منظور ہوئی اور ماہِ شعبان ۳۸ھ میں دونوں حکم ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص معان اور وادیٔ موسیٰ کے درمیان مقام اذرح میں جمع ہوئے اور حسب قرارداد دونوں جماعتوں کے چار چار سو آدمی بھی پہنچ گئے۔ شامی وفد کا قائد ابوالاعور سلمی تھا اور عراقی وفد کے سربراہ عبداللہ ابن عباس اور شریح ابن ہانی تھے۔ امامت نماز کا فریضہ ابن عباس سے متعلق تھا اور شریح وفد کی قیادت کے علاوہ عمرو ابن عاص کے نام حضرت کا ایک پیغام لے کر بھی آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص سے ملاقات کی اور اس سے کہا کہ امیرالمومنین علی نے تمہیں پیغام دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک بہترین انسان وُہ ہے، جو باطل کی راہ سے منہ موڑ کر حق کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ اگرچہ باطل سے فائدہ اور حق سے نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ لہذا تم جان بُوجھ کر حق سے آنکھ بند نہ کرنا اور نہ دنیوی اقتدار کی خاطر اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی مول لینا۔ اس دنیا سے جو کچھ تمہیں حاصل ہو گا وہ آخر تم سے چھن جائے گا۔ وہ دن دُور نہیں ہے جب تم بسترِ مرگ پر کروٹیں لیتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹو گے اور یہ کہو گے کہ کاش میں نے ظالموں سے تعاون کر کے کسی مردِ مسلم کی عداوت مُول نہ لی ہوتی اور رشوت کی پیش کش قبول کر کے غلط فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ عمرو نے یہ پیغام سُنا تو کہا:۔

متی کنت اقبل مشورۃ علی او انتھی الی امرہ او اعتد برایہ۔	ایسا موقع کب آیا ہے کہ میں نے علی کا مشورہ قبول کیا ہو یا اُن کی رائے پر عمل کیا ہو یا اُن کی رائے کو کوئی وزن دیا ہو۔"
(تاریخ کامل، ج ۳، ص ۱۶۷)	

شریح نے کہا کہ اے نابغہ کے بیٹے اگر تم امیرالمومنین کے مشورہ کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے تو حضرت ابوبکر وحضرت عمر تک ان سے مشورے لیتے رہے ہیں جو بہر حال تم سے بہتر تھے۔ عمرو نے کہا کہ مجھ ایسا آدمی تم سے گفتگو کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ شریح نے کہا کہ یہ غرور و تمکنت عاصی ابن وائل کی طرف نسبت کی بناء پر ہے یا ماں کی شہرت کی بناء پر اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور واپس چلے آئے۔

اس اجتماع سے قبل معاویہ نے عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر، ابوالجہم ابن حذیفہ اور عبدالرحمٰن ابن عبدیغوث کو تحریر کیا تھا کہ تم لوگ جنگ صفین میں تو شریک نہیں ہو سکے لیکن تمہیں ایک مبصر کی حیثیت سے اذرح میں پہنچنا چاہیے تاکہ تحکیم کی کارروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ چنانچہ یہ لوگ کارروائی کے شروع

ہونے سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ عبدالرحمٰن ابن ابی بکر، سعد ابن ابی وقاص اور مغیرہ ابن شعبہ بھی تحکیم کا جائزہ لینے کے لئے چلے گئے۔ مغیرہ نے اذرح میں پہنچ کر ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی اور ان کا عندیہ معلوم کیا اور پھر معاویہ کے ہاں دمشق پہنچ گیا۔ معاویہ نے پوچھا کہ تم نے حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا ہوگا تمہارا کیا خیال ہے کہ حکمین کس کے حق میں فیصلہ کریں گے کہا کہ میں نے ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص سے الگ الگ ملاقات کی تھی۔ ابو موسیٰ کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ علی کو خلافت سے علیحدہ کر کے کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو جنگ سے کنارہ کش رہا ہو اس لئے کہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ وہی لوگ قوم وملت کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں جنہوں نے فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا ہو اور نہ اُن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جھکاؤ عبداللہ ابن عمر کی طرف ہے۔ اور عمرو ابن عاص کی افتادِ طبیعت سے تم بخوبی واقف ہو اس کا نظریہ ابو موسیٰ کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے وہ جنگ میں غیر جانبدار رہنے والوں کو غلط کار سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ خود خلیفہ بنے یا اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ بنائے کیونکہ وہ اپنے اور اپنے بیٹے کے مقابلہ میں کسی کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتا۔ معاویہ نے یہ سنا تو پریشان ہو گئے۔ عمرو سے رابطہ قائم کیا تو اس نے نامہ و پیام سے ان کو تسلی کر دی۔

فیصلہ صادر کرنے سے پہلے حکمین کا کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ تبادلۂ خیالات کے لئے ایک مقام پر جمع ہوئے اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عمرو ابن عاص نے ابو موسیٰ سے کہا کہ تمہارا عثمان کے بارے میں کیا خیال ہے کیا وہ مظلوم نہیں مارے گئے کہا کہ ہاں وہ مظلوم مارے گئے اور ان کا قتل ناروا تھا۔ کہا کہ معاویہ اُن کے ولی و وارث ہیں اور قرآن مجید میں ہے:۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا۔ — "جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم نے اس کے ولی کو حقِ قصاص دیا ہے۔"

اس کے علاوہ معاویہ کو جو خاندانی عظمت و بلندی حاصل ہے وہ نہ تم سے پوشیدہ ہے اور نہ کسی اور سے مخفی ہے۔ وہ پیغمبر کے صحابی دربارِ نبوت کے کاتب اور ام المومنین ام حبیبہ کے بھائی ہیں۔ لہٰذا ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ہمیں ان کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس امر کا بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آ گئے تو جو فوائد ان سے حاصل ہو سکتے ہیں اُن کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی۔ ابو موسیٰ نے عمرو کی باتوں کے جواب میں کہا کہ تم نے جو یہ کہا ہے کہ معاویہ عثمان کا ولی ہے تو ان کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وہ ولی کیسے ہو گئے۔ عثمان کا ولی اُن کا بیٹا عمرو ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے

کہ ہم مہاجرین اولین کو نظر انداز کر کے اس شخص کو خلافت کے لئے منتخب کریں کہ جسے نہ اسلام میں سبقت حاصل ہے اور نہ کوئی فضیلت۔ اور جس خاندانی بلندی کا تم نے ذکر کیا ہے تو اگر ہم اُسے ہی معیارِ خلافت قرار دے لیں تو پھر ابرہہ ابن صباح کی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہئے اس لئے کہ وہ ان بادشاہوں کی نسل میں سے ہوگا جو شرق و غرب عالم پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ باقی رہا مفاد کا سوال تو میں رشوت لے کر بک نہیں سکتا۔ میری رائے میں اس وقت موزوں ترین شخصیت عبداللہ ابن عمر کی ہے۔ ہم اسے برسرِ اقتدار لا کر حضرت عمر کا نام زندہ کر سکیں گے۔ عمرو نے کہا کہ پھر میرا بیٹا عبداللہ کیا بُرا ہے وہ صاحب علم و فضل بھی ہے اور صالح بھی ہے اور اسے صحبت رسُول اور ہجرت کا شرف بھی حاصل ہے کہا کہ یہ درست ہے مگر اس کے ہاتھ خون سے رنگین ہیں اور وہ تمہارے ساتھ شریک جنگ رہ چکا ہے۔ میں عبداللہ ابن عمر ہی کو ترجیح دوں گا۔ اس لئے کہ وہ جنگ سے علیحدہ اور غیر جانبدار رہا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اقتدار تو اسی کو سونپا جا سکتا ہے جو صرف اپنا پیٹ بھرنا ہی نہ جانتا ہو بلکہ دوسروں کے پیٹ کا بھی خیال رکھے۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ مسلمانوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد یہ معاملہ ہمارے سپرد کیا ہے ہمیں فکر و تامل سے اسے سلجھانا چاہئے اور کوئی نیا شاخسانہ کھڑا نہ کرنا چاہئے۔ کہا کہ میرے ذہن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیا جائے اور مسلمانوں کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ شوریٰ کے ذریعہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ عمرو نے کہا کہ یہ تجویز بُری نہیں ہے میں اس سے متفق ہوں۔ چنانچہ دونوں ثالثوں نے اس تجویز پر اتفاق رائے کے بعد اس کے اعلان کا فیصلہ کر لیا۔

اس تصفیہ کے بعد جب دونوں الگ الگ ہوئے تو ابن عباس نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو فیصلہ متفقہ طور پر تمہارے درمیان ہوا ہے۔ عمرو اس کا پابند نہیں رہے گا۔ وہ ہوشیار و چالاک ہے ضرور تمہیں فریب دے گا۔ لہذا جب اعلان کا موقع آئے تو پہلے اسے اعلان کرنے دینا اور بعد میں تم اعلان کرنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ وُہ ایسا چکمہ دے گا کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ ہم جس امر پر متفق ہوئے ہیں اس میں کسی فریب یا ہیر پھیر کی گنجائش نہیں ہے۔ جب اس تصفیہ کے دوسرے دن شام و عراق کے نمائندے مبصرین اور دونوں ثالث مسجد جامع میں جمع ہوئے تو عمرو نے ابوموسیٰ سے کہا کہ آپ اعلان کریں۔ عمرو نے پہلے سے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ وُہ ہر بات میں ابوسیٰ کو مقدم کرتا اور اُسے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ چونکہ وہ بزرگ اور پہلے کا صحابی ہے لہذا اس پر سبقت کرنا ایک طرح سوءِ ادب اور ناقابل تلافی جرم ہے۔ اور ابوموسیٰ بھی اپنی روایتی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ آؤ بھگت اس کے مرتبہ و مقام کی وجہ سے ہے

اس نے ابن عباس کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور بڑی تمکنت سے اٹھا اور فرازِ منبر پر بلند ہو کر حمد و ثنا پر مشتمل خطبہ پڑھا اور پھر مجمع سے مخاطب ہو کر کہا اے لوگو ہم نے اُمت کی فلاح و یکجہتی کے پیشِ نظر بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم دونوں علی اور معاویہ کو معزول کر دیں اور امرِ خلافت شوریٰ کے حوالے کر دیں۔ لہٰذا میں علی اور معاویہ دونوں کو برطرف کرتا ہوں۔ اب تم جسے چاہو اسے سربراہِ مملکت منتخب کر لو۔

یہ اعلان عراقیوں کیلئے بڑا حوصلہ شکن تھا مگر وہ بڑے ضبط و صبر سے بیٹھے رہے تاکہ عمرو ابن عاص کی زبان سے بھی یہ فیصلہ سن لیں۔ عمرو ابن عاص نے منبر پر کھڑے ہو کر حمد و ثناء کے بعد کہا اے لوگو ابو موسیٰ نے جو کچھ کہا ہے وہ تم نے سن لیا ہے وہ علی کے مقرر کردہ نمائندے ہیں انہوں نے علی کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی انہیں اسی طرح معزول کرتا ہوں جس طرح انہوں نے معزول کیا ہے لیکن معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں۔ کیونکہ وہ عثمان کے ولی ان کے قصاص کے خواہاں اور اُن کی نیابت و جانشینی کے اہل ہیں۔ اس اعلان پر شامیوں نے نعرے لگائے، عراقیوں نے حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس پُر فریب اعلان پر بگڑے چیخے چلائے مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا فریب اپنا کام کر گیا۔ ابو موسیٰ جو اس غلط فیصلہ کا بڑی حد تک ذمہ دار تھا وہ بھی عمرو کی بدعہدی و فریب کاری پر سٹپٹایا اور اس سے کہا کہ اے ابن عاص خدا تجھ سے اپنی توفیقات کو سلب کرے تو نے مجھے اندھیرے میں رکھا اور آخر میں دھوکا دیا تمہاری مثال کتے کی سی ہے وہ ہانپے گا اور زبان نکالے گا چاہے اس پر حملہ کرو چاہے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ عمرو نے بھی اس کی بزرگی و صحابیت کی بساط لپیٹ دی اور بگڑ کر کہا:۔

ومثلك كمثل الحمار يحمل	تمہاری مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں
اسفاراً۔ (اخبار الطوال۔ صـ۲)	لاد دی گئی ہوں۔"

شریح ابن ہانی اس مکارانہ کاروائی پر ضبط نہ کر سکے اور آگے بڑھ کر عمرو پر کوڑا برسایا۔ اس نے بھی کوڑا اٹھا لیا۔ کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر انہیں چھڑایا۔ شریح اس کے بعد کہا کرتے تھے:۔

ما ندمت على شيئ ندامتي	میں کسی بات پر اتنا نہیں پچھتایا جتنا اس بات
على ضرب عمرو بالسوط ولم	پر پچھتاتا ہوں کہ میں نے کوڑے کے بجائے عمرو
اضربه بالسيف۔ (تاریخ کامل ج۳۔ صـ۶۸)	پر تلوار کیوں نہ چلائی۔"

ابن عباس نے بھی پیچ و تاب کھاتے ہوئے ابو موسیٰ سے کہا کہ تم نے میری بات پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا اور اس میں تمہارا قصور نہیں ہے تم سے اسی کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس میں قصور ہے تو ان لوگوں کا

جنہوں نے تمہیں نااہل ہونے کے باوجود ثالث بنایا۔ عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے کہا:-

لومات الاشعری قبل هذا	ابو موسیٰ کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ اس دن سے
الیوم لکان خیراً له۔	پہلے ہی مر کھپ گیا ہوتا۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۶۸)

غرض اس طرح اور لوگوں نے بھی اس کی سادہ لوحی فریب خوردگی کا رونا رویا اور اسے برا بھلا کہا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب کون دیکھتا تھا کہ فیصلہ کیا ہوا تھا اور اعلان کیا ہوا۔ شامی فتح و کامرانی کے نعرے لگاتے ہوئے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر معاویہ کو خلافت کی مبارکباد دی اور عراقی رنجیدہ و دل شکستہ کوفہ کی طرف واپس ہوئے اور ابو موسیٰ بھی اس کارنامہ کے بعد منہ چھپا کر مکہ کی طرف نکل گیا۔

ابو موسیٰ اور عمرو ابن عاص کو اس امر کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ قرآن مجید کی روشنی میں فیصلہ کریں اور اگر قرآن سے فیصلہ اخذ نہ کرسکیں تو سنتِ رسول کی رُو سے تصفیہ کریں۔ مگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی آخر کس قرآنی آیت یا سنت کی بنا پر ایک اپنے بیٹے عبداللہ کا نام خلافت کے لئے لیتا ہے اور دوسرا عبداللہ ابن عمر کا نام پیش کرتا ہے اور پھر مہاجرین اولین کے ہوتے ہوئے ان میں کون سی امتیازی فضیلت تھی کہ مسلمانوں کی قیادت ان کے سپرد کی جاتی۔ فرزند ابن عاص وہ ہے جو ابتدا میں معاویہ سے وابستگی کو دنیا پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے باپ کو اُن کے ہاں جانے سے منع کرتا ہے اور پھر خود ان کی صفوں میں شامل ہوکر حضرت علی کے خلاف جنگ میں حصہ لیتا ہے۔ اور عبداللہ ابن عمر وہ ہے جسے خود اُس کے باپ حضرت عمر نے مسئلہ طلاق سے بے خبر ہونے کی بنا پر خلافت کا اہل نہ سمجھا تھا اور جن چھ آدمیوں کا شوریٰ ترتیب دیا تھا اس میں اس کا نام تک تجویز نہ کیا۔ پھر حکمین کو اس کا اختیار ہی کب تھا کہ وہ کسی کو خلیفہ نامزد کریں یا امیرالمومنین کو خلافت سے معزول کرکے خلافت معاویہ کے حوالے کردیں۔ معاویہ کے گرد جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ قصاص کے لئے جمع ہوئے تھے اور اسی قصاص کے لئے انہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا کیونکہ معاویہ نے یہ چیز ان کے ذہن نشین کردی تھی کہ حضرت عثمان کے قتل کی ذمہ داری حضرت علی پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے معاویہ کو مسند خلافت پر بٹھانے کے لئے جنگ نہیں چھیڑی تھی مگر ان دونوں ثالثوں نے قصاص کو نظرانداز کرکے خلافت کو محل بحث بنا لیا حالانکہ خلافت نہ محل نزاع تھی اور نہ اس کا تحکیم سے کوئی واسطہ تھا۔ انہیں قاتلین عثمان کو زیرِ بحث لانا چاہیئے تھا اور پھر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے تھا کہ حق قصاص معاویہ

کو حاصل ہے یا یہ مرکزی حکومت کا حق ہے مگر اذرح کی پوری کاروائی کو دیکھ جایئے کسی کی زبان پر بھولے سے بھی قاتلین عثمان کا نام نہیں آتا اور نہ قصاص کا کوئی تذکرہ ہوتا ہے۔ البتہ عمرو ابن عاص نے اتنا کہا کہ عثمان مظلوم قتل کئے گئے اور معاویہ ان کے ولی اور طالب قصاص ہیں مگر ان کی تان بھی خلافت پر ٹوٹتی ہے اور اسے معاویہ کے استحقاقِ خلافت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ابن حجر مکی اور ان کے ہم خیال لوگوں نے معاویہ کے دل و دماغ کو ہوسِ خلافت سے خالی ثابت کرنے کے لئے اس نظریہ پر زور دیا ہے کہ وہ خلافت کے لئے برسرِ پیکار نہ تھے بلکہ ان کا مقصد قصاص خونِ عثمان تھا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

و من اعتقاد اهل السنة و الجماعة ان ماجرى بين معاوية و على رضى الله عنهما من الحروب فلم يكن لمنازعة معاوية لعلى فى الخلافة للاجماع على حقيتها لعلى۔ (صواعق محرقہ ص۲۱۹)	اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ معاویہ اور علی کے درمیان جو جنگیں ہوئیں وہ اس وجہ سے نہ تھیں کہ معاویہ علی سے خلافت کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے اس لئے کہ علی کی خلافت کے حق ہونے پر اجماع ہو چکا تھا۔“

اگر ابن حجر کی مراد یہ ہے کہ معاویہ حضرت علی کی خلافت پر معترض نہ تھے اور ان کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے تو صرف یہ ایک دعوی ہی دعوی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر وہ حضرت کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے تو پھر بیعت سے انکار کیوں جب کہ انکارِ بیعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ انہیں خلافت سے انکار تھا اور اگر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے لئے خلافت کے خواہاں نہ تھے تو یہ بھی واقعات کے سراسر خلاف ہے اس لئے کہ اگر خلافت ان کے پیشِ نظر نہ تھی تو عمرو ابن عاص سے امارتِ مصر کا وعدہ کس بنا پر کیا تھا اور امیر المومنین کی فوج کے ایک سردار زیاد ابن خصفہ کو بصرہ یا کوفہ کی پیشکش کس برتے پر کی تھی اور خالد ابن معمر سے خراسان کا اور قیس ابن سعد سے حکومت عراقین کا وعدہ کس امید پر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ وعدے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ہی پورے کئے جا سکتے ہیں اور یہ سارے جھگڑے جھیلے اسی لئے تو تھے کہ خلافت کو اپنے پائے نام کر کے اموی حکومت کی بنیاد رکھ دیں۔

معاویہ کی خلافت متفقہ فیصلہ کی خلاف ورزی اور عمرو ابن عاص کی بدعہدی کے نتیجہ میں قرار پائی دونوں ثالثوں میں یہ طے پایا تھا کہ علی اور معاویہ دونوں کی برطرفی کا اعلان کیا جائے مگر عمرو نے عہد شکنی کرتے ہوئے علی کی برطرفی کو بحال رکھا اور معاویہ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس علانیہ فریب کاری کے نتیجہ میں تشکیل پانے والی خلافت کی شرعی و اخلاقی حیثیت اس خلافت کے مقابلہ میں جس کی صحت

پر انصار و مہاجرین اولین کا اجماع قائم ہو چکا ہو کیا باقی رہ جاتی ہے اور علماء اہلسنت کے نزدیک ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے دوسرے مدعی خلافت کی بیعت سراسر ناجائز اور غلط ہے بلکہ اس سلسلہ میں پیغمبر اکرم کی متعدد حدیثیں بھی کتب احادیث میں موجود ہیں کہ:-

اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منهما۔ (جامع الاصول۔ ج ۴ ص ۴۴۲)

جب دو خلیفوں کی بیعت کی نوبت آئے تو اُن میں جو دوسرا ہو اسے قتل کر دو"

تحکیم کے سلسلہ میں ابو موسیٰ نے جو کردار ادا کیا اس کی توقع کسی بھی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے نہیں کی جا سکتی۔ اس نے پہلے تو علی اور معاویہ کو ایک سطح پر لانے کے لئے دونوں کی معزولی کا فیصلہ کیا گویا یہ دونوں برابر کے دعویداران خلافت تھے اور اس کا تصفیہ اس کے سپرد کیا گیا ہے حالانکہ معاویہ کی معزولی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں کیونکہ نہ کسی نے خلافت کے سلسلہ میں اُن کا نام لیا تھا اور نہ کسی نے انہیں امیدوار نامزد کیا تھا اور امیرالمومنین کی خلافت کو شام کے علاوہ حجاز، مصر، یمن، خراسان تمام صوبوں کے باشندے تسلیم کر چکے تھے اور ان کا انتخاب بھی صحابہ کبار کی رائے سے عمل میں آیا تھا اس کے بعد خلافت کے سلسلہ میں دونوں کا یکساں نام لینا اموی سازش کا کرشمہ نہ تھا تو کیا تھا امیرالمومنین اس چیز کو سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے نمائندوں کے انتخاب کے موقع پر ابو موسیٰ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا اور جنگ جمل کے موقع پر اس کے کردار کو دیکھنے کے بعد اس پر اعتماد کیا بھی کیسے جا سکتا تھا۔ اس غلط انتخاب کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہو گی جو اس کے انتخاب پر زور دیتے رہے تھے حالانکہ وُہ اس امر سے بے خبر نہ تھے کہ ابو موسیٰ حضرت سے بغض و عناد کی بنا پر اُن کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

ابو موسیٰ یہ بھی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کے کامیاب ہونے کی صورت میں اُسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا البتہ معاویہ کی حمایت کا صلہ کسی عہدہ کی صورت میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد سر پر ایک لانبی ٹوپی رکھے ان کے ہاں پہنچ گیا۔ اور بصد احترام السلام علیك یا امین الله کہہ کر انہیں فرشی سلام کیا۔ معاویہ سمجھ گئے کہ یہ اپنی کارگزاری کا صلہ مانگنے آیا ہے جب وہ ادھر ادھر ہوا تو معاویہ نے درباریوں سے کہا:-

قدم الشیخ لا ولیه ولا والله لا اولیه۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۲۴۵)

یہ بزرگ اس لئے آئے ہیں کہ میں انہیں کسی صوبہ کا حاکم بنا دوں گا مگر خدا کی قسم میں انہیں کوئی عہدہ نہیں دوں گا"

اس تحکیم اور اس کے بے ضابطہ فیصلہ کے نتیجہ میں اختلافات ویسے کے ویسے باقی رہے بلکہ امیرالمومنین کے خلاف دوطرفہ محاذ قائم ہوگیا۔ ایک طرف خوارج تھے اور دوسری طرف اہل شام اور اب ان دونوں سے نمٹنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

جنگِ نہروان

ابوموسیٰ نے امیرالمومنین کی برطرفی اور عمرو ابن عاص نے اس برطرفی کے ساتھ معاویہ کے تقرر کا جو کھیل کھیلا اور جس طرح قرآن وسنت کے تقاضوں کو نظر انداز کیا اور عہد و پیمان کی دھجیاں اڑائیں۔ وہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ لوگ جو امیرالمومنین کو میدان حرب وضرب میں شکست نہ دے سکے وہ مکروفریب کے میدان میں بازی لے گئے۔ اور حق و دیانت سے منہ موڑ کر معاویہ کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن گئے۔

امیرالمومنین کے لئے حکمین کا فیصلہ خلاف توقع نہ تھا بلکہ تحکیم کی قرارداد کو بروئے کار لانے والے افراد کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ یہ دونوں معاویہ کی جنبہ داری اور اُن کے اقتدار کا تحفظ کریں گے اگرچہ خوارج فیصلہ تحکیم سے پہلے آپ کو جنگی قدم اٹھانے پر مجبور کرتے رہے مگر آپ نے معاہدہ کی خلاف ورزی گوارا نہ کی۔ اور جب حکمین نے اپنے حدود کار سے تجاوز کرکے قاتلان عثمان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے بجائے خلافت کا فیصلہ کر دیا اور اس سلسلہ میں نہ قرآن کی طرف رجوع کیا اور نہ سنت رسول کو پیش نظر رکھا حالانکہ یہ دونوں چیزیں قرارداد میں بنیادی حیثیت سے شامل تھیں تو آپ نے اہل شام سے دوبارہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اس لئے کہ امیرالمومنین کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو باطل کے آگے سر جھکا دیں یا شام پر دوبارہ چڑھائی کر دیں۔ پہلی صورت ممکن ہی نہ تھی کہ حق کو پامال ہوتے دیکھیں اور خاموش رہیں اور دنیا کو یہ تاثر دیں کہ حکمین نے فیصلہ کیا ہے وہ صحیح اور مطابق کتاب وسنت ہے۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف قدم بڑھائیں تاکہ معاویہ کی فریب کاری اور حکمین کی عہدشکنی عالم آشکار ہو جائے۔

جب امیرالمومنین نے شام پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا تو چاہا کہ خوارج کو بھی جو شام پر حملہ آور ہونے کے لئے بے چین تھے شریک جنگ ہونے کی دعوت دیں۔ چنانچہ آپ نے عبداللہ ابن وہب اور یزید ابن حصین کو تحریر کیا کہ "ہم نے جن دو آدمیوں کو حکم تسلیم کیا تھا انہوں نے کتاب خدا کی خلاف ورزی

کی ہے اور نفسانی خواہشات کی رو میں بہہ گئے ہیں انہوں نے نہ قرآن پر عمل کیا اور نہ سنت رسولؐ پر اب ہمارا موقف وہی ہے جو تحکیم سے پہلے تھا لہٰذا تم ہم سے تعاون کرو تا کہ اپنے مشترکہ دشمن کی طرف قدم بڑھائیں اور اُن سے جنگ کریں یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" خوارج نے جواب میں تحریر کیا کہ اب آپ خدا کی خوشنودی کی خاطر جنگ کے لئے کھڑے نہیں ہوئے بلکہ اپنے نفس کی خاطر جنگ لڑنا چاہتے ہیں اگر آپ اپنے کفر کا اعتراف کر کے توبہ کریں تو پھر ہم غور کریں گے کہ ہمیں آپ کا ساتھ دینا چاہیئے یا نہیں اور اگر آپ نے اقرار کفر کے بعد توبہ نہ کی تو ہم آپ سے لڑینگے اور اللہ خیانت کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب امیرالمومنین نے دیکھا کہ خوارج ساتھ دینے پر تیار نہیں ہیں تو انہیں نظر انداز کر کے فوج کی فراہمی میں مصروف ہو گئے اور اہل کوفہ کے ایک اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا اہل کوفہ یاد رکھو کہ جو جہاد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے وہ تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتا اٹھو اور ان لوگوں کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جاؤ جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہیں اور خُدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں یہ ظالم جفا کار اور راہ حق سے برگشتہ ہیں۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ دین میں سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہ خلافت کے اہل ہیں۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ برسر اقتدار آگئے تو اسلامی قدروں کو پامال کر کے ہرقلی و کسرٰی نظام قائم کریں گے اُٹھو اور ان دشمنانِ دین سے جنگ کرو۔ ہم نے بصرہ سے بھی فوجی مدد طلب کی ہے اس کے آتے ہی ہم شام کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔

حضرت نے عامل بصرہ ابن عباس کو تحریر فرمایا کہ ہم شامیوں سے لڑنے کے لئے جا رہے ہیں تم بصرہ سے فوجی کمک لے کر نخیلہ پہنچو جسے ہم نے فراہمی لشکر کے لئے چھاؤنی قرار دیا ہے۔ حضرت کے اس پیغام پر ابن عباس اور احنف ابن قیس نے اہل بصرہ کو حضرت کے حکم سے آگاہ کیا گیا انہیں جلد از جلد تیاری کی ہدایت کی اس آواز پر پندرہ سو آدمی جنگ کے لئے آمادہ ہوئے۔ ابن عباس نے اس قلیل جماعت کو دیکھا تو اہلِ بصرہ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اے لوگو میں تمہیں امیرالمومنین کے حکم سے آگاہ کر چکا ہوں انہوں نے تمہیں دشمن سے لڑنے کے لئے بلایا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے شہر سے جہاں ساٹھ ہزار جنگجو افراد موجود ہیں صرف پندرہ سو آدمی جنگ کے لئے آمادہ ہوئے ہیں اگر تم جنگ سے پہلو تہی کرتے ہوئے گھروں میں بیٹھے رہے تو یاد رکھو کہ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ میں نے جاریہ ابن قدامہ سعدی کو فراہمی لشکر کے لئے مامور کیا ہے تم فوراً ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ اس کہنے سننے اور جھنجھوڑنے سے مزید سترہ سو آدمی تیار ہوئے اور یہ تین ہزار دو افراد کا لشکر کوفہ کی سمت روانہ ہو گیا۔

اس لشکر کے وارد نخیلہ ہونے کے بعد رؤسائے کوفہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے

ان سے فرمایا کہ اہلِ بصرہ نے جس حد تک تعاون کیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے تم لوگ میرے اعوان و انصار اور بازوئے شمشیر زن ہو تم میں سے ہر سردار قبیلہ کو چاہئے کہ وُہ اپنے قبیلہ والوں کو جہاد کی ترغیب دے اور جو بھی لڑنے کے قابل ہو اسے لشکر میں شامل ہونے کی دعوت دے اس پر سعید ابن قیس ہمدانی، معقل ابن قیس، عدی ابن حاتم، زیاد ابن خصفہ، حجر ابن عدی اور دوسرے سردارانِ قبائل نے کہا کہ ہم بسر و چشم آپ کا ہر حکم بجا لائیں گے اور افواج و عساکر کی فراہمی میں تعاون کریں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کی تحریک پر مختلف قبائل سے پینسٹھ ہزار شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہوئے امیرالمومنین نے سعد ابن مسعود عامل مدائن کو بھی لشکر کی فراہمی کے لئے تحریر فرمایا اور اس طرح کوفہ بصرہ اور مدائن سے آنے والے ستر ہزار افراد آپ کے پرچم نیچے جمع ہو گئے۔

جب فوجیں منظم اور جنگی تیاریاں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمیں پہلے خوارج سے نمٹ لینا چاہیئے اور اس کے بعد شام کا رُخ کرنا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا کہ فی الحال خوارج کو اُن کے حال پر چھوڑ دو اور شام کی سمت بڑھو، اگر تم ادھر جنگ میں مصروف ہو گئے تو معاویہ کو مزید قوت و طاقت کے بہم پہنچانے کا موقع مل جائے گا۔ مناسب یہی ہے کہ اسے موقع دیئے بغیر اس سے جنگ چھیڑ دی جائے۔ لوگوں نے کہا یا امیرالمومنین آپ جو مناسب سمجھیں وُہ کریں ہم بہرصورت آپ کے ساتھ ہیں صیفی ابن نسیل شیبانی نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے گروہ میں شامل اور آپ کے دست و بازو ہیں ہم اس کے دوست ہیں جو آپ کا دوست ہو اور اس کے دشمن ہیں جو آپ کا دشمن ہو وُہ جو بھی ہو اور جہاں بھی ہو۔ آپ انشاء اللہ مددگاروں میں کمی اور ہمارے ارادوں میں سستی محسوس نہ کریں گے محرز ابن شہاب تمیمی نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے مطیع و فرمانبردار اور آپ کی نصرت پر یکدلی سے جمع ہیں آپ خوارج کی طرف بڑھیں یا اہل شام کی طرف ہم آپ کے دشمنوں سے لڑنے میں حیل حجت نہیں کریں گے جبکہ ہمیں علم ہے کہ آپ کی اطاعت فرض اور آپ کے دشمنوں سے جہاد باعث ثواب عظیم ہے۔

اس اثناء میں خوارج کی شوریدہ سری و شورہ پشتی نے قتل و غارت گری کی صورت اختیار کر لی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ راستے میں انہیں جو شخص ملتا اس سے تحکیم کے بارے میں پوچھتے اگر وُہ اس سے اظہار بیزاری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے ورنہ اسے قتل کر دیتے البتہ غیر مسلم کو ذمی ہونے کی بناء پر چھوڑ دیتے اور مسلم کے لئے اُن سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا بلکہ خنزیر پر ہاتھ اٹھانا گناہ اور مسلمان کو قتل کرنا کارِ ثواب سمجھتے۔ مبرد نے کامل میں لکھا ہے کہ خوارج نے نہروان کے راستے میں ایک نصرانی اور ایک مسلمان کو دیکھا۔ مسلمان کو انہوں نے قتل کر دیا اور نصرانی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ہمارے نبی نے نصرانیوں کو اہل ذمہ

میں سے قرار دیا تھا لہٰذا ان پر ہاتھ اٹھانا گناہ اور پیغمبر کے معاہدہ کی توہین ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے اگر کوئی اپنی جان بچانا چاہتا تھا تو اس کے لئے یہی ایک صورت تھی کہ وُہ اپنے کو ذمی یا مشرک ظاہر کرے اور تو اور واصل ابن عطا نے بھی اپنے کو مشرک کہہ کر اُن سے اپنی جان چھڑائی۔ واقعہ یہ ہُوا کہ واصل اور اس کے چند رؤسا کی خوارج سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ خوارج نے پوچھا کہ تم کون ہو واصل نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ خوارج ہیں تم خاموش رہو میں تمہاری طرف سے گفتگو کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر خوارج کے قریب آئے اور کہا کہ ہم لوگ مشرک ہیں اور تم لوگوں سے پناہ کے طالب ہیں تاکہ تم سے قرآن کے اوامر و نواہی سیکھیں اور ان پر عمل کریں۔ واصل کہتا ہے کہ انہوں نے ہماری بات کو صحیح سمجھا اور ہمیں قرآن کے احکام سکھاتے اور اس کی تاویل بتاتے رہے اور ہم ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ جب ہم نے ان کی تمام باتیں بے کم و کاست تسلیم کر لیں تو انہوں نے کہا کہ اب تم ہمارے بھائی ہو جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ واصل نے کہا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔

وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه مامنه۔	اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وُہ اللہ کا کلام سن لے پھر اُسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو۔"

لہٰذا ہمیں اپنی حفاظت میں ہمارے گھروں تک پہنچاؤ۔ خوارج نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کہ قرآن کی رُو سے ان کا مطالبہ جائز ہے لہٰذا ہمیں ان لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچانا چاہیے۔ چنانچہ انہیں ان کے گھروں تک چھوڑ گئے اور اس طرح واصل نے تقیہ کا سہارا لے کر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا تحفظ کیا۔

اسی طرح صحابی رسُول خباب بن ارت کے فرزند عبداللہ گلے میں قرآن حمائل کئے ان کے قریب سے گزرے تو انہیں روک لیا اور پوچھا کہ تم کون ہو کہا کہ میں صحابیٔ رسول خباب کا بیٹا عبداللہ ہوں کہا کہ اگر تم ہمیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے ہو تو اپنے دل سے خوف و ہراس نکال ڈالو ہم چاہتے ہیں کہ تم سے وہ حدیث سنیں جو تم نے اپنے باپ سے روایت کی ہو کہا کہ میرے باپ نے رسول اللہ کو فرماتے سُنا:۔

تكون فتنة يموت فيها قلب الرجل كما يموت فيه بدنه يمسى فيها مومنا و يصبح كافرا	ایک فتنہ کھڑا ہو گا جس میں انسان کا دل مُردہ ہو جائے گا جس طرح اس کا بدن مُردہ ہو جاتا ہے۔ وُہ شام کو مومن ہو گا اور صبح ہوتے کافر ہو

دیصبح کافرا ویمسی مومناً۔ (تاریخ کامل ۔ ج ۳ ص۱۲۲) | جائے گا اور صبح کافر ہو گا اور شام ہوتے مومن ہو جائے گا۔"

خوارج نے کہا کہ ہم تمہاری زبان سے یہی حدیث سننا چاہتے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ علی کے بارے میں جب کہ انہوں نے نظریۂ تحکیم تسلیم کر لیا کیا کہتے ہو کہا:۔

انه اعلم باللہ منکم واشد توقیا علی دینه وانفذ بصیرۃ (تاریخ کامل ج ۳ ص۱۲۲) | وہ تم لوگوں سے زیادہ اللہ کو پہچانتے ہیں اور دین میں انتہائی محتاط اور کامل بصیرت رکھتے ہیں۔"

کہا کہ تم شخصیت پرست ہو اور کام کے بجائے نام سے متاثر ہو خدا کی قسم ہم تمہیں ہوائے نفس کی پیروی کی سزا دیں گے اور اس طرح قتل کریں گے کہ کسی اور کو یوں قتل نہ کیا ہو گا۔ یہ کہہ کر ان کی مشکیں باندھ لیں اور انہیں اور اُن کی بیوی کو جو حاملہ تھیں ایک درخت خرما کے قریب لے آئے۔ اس درخت پر سے کھجور کا ایک دانہ زمین پر گرا جسے ایک خارجی نے اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ لوگوں نے شور مچا دیا حرام حرام۔ اس نے فوراً خرما منہ سے پھینک دیا۔ اتنے میں ایک خنزیر ادھر سے گزرا ایک خارجی نے اسے مار ڈالا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ فساد فی الارض ہے اور اس وقت تک انہوں نے چین نہ لیا جب تک اس کے مالک کو بلا کر راضی نہ کر لیا۔ عبداللہ نے ان کا یہ طرز عمل دیکھا تو کہا کہ جب تم لوگ ذرا ذرا سی بات میں اتنی احتیاط برتتے ہو تو مجھے تم لوگوں سے کوئی خطرہ نہ ہونا چاہئے جب کہ میں مسلمان بھی ہوں اور کسی ایسے جرم کا مرتکب بھی نہیں ہوا جس کی سزا قتل ہو۔ مگر انہوں نے کوئی بات نہ سنی اور انہیں زمین پر پچھاڑ کر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کا پیٹ چاک کر کے اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور بنی طے کی تین عورتوں اور ام سنان صیداویہ کو بھی ذبح کر ڈالا۔ اس بہیمانہ وسفاکانہ قتل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک عیسائی سے ایک درخت خرما کا پھل خریدنا چاہا اس نے کہا کہ مجھے قیمت نہیں چاہیئے تم یونہی لے لو۔ کہا کہ ہم ایک ذمی کا مال قیمت ادا کئے بغیر نہیں لیں گے۔ اس نصرانی نے حیرت سے کہا کہ تم ابن خباب ایسے شخص کو بے گناہ مار ڈالتے ہو اور ایک درخت کا پھل بے قیمت لینا گوارا نہیں کرتے۔

ان وحشت و بربریت کے مظاہروں کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا مملکت کے لئے انتہائی خطرناک تھا کیونکہ امیرالمومنین دارالحکومت کوفہ کو خالی چھوڑ کر شام پر چڑھائی کے ارادہ سے نکلنے والے تھے اور کوفہ خوارج کے مرکز سے قریب تھا اور خود کوفہ میں بھی ان کے ہم خیال لوگ موجود تھے۔ ان حالات میں

یہ قوی اندیشہ تھا کہ وہ حضرت کی عدم موجودگی میں بلا مزاحمت دارالحکومت پر قبضہ کر لیں اور اپنے مخالفین کا قتل عام شروع کر دیں۔ حضرت کے لشکر میں اکثریت اہل کوفہ کی تھی ان کے اہل و عیال اور املاک و اموال خوارج کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پہلے ان سے نمٹ لیا جائے اور پھر شام کا رُخ کیا جائے۔ چنانچہ لشکر والوں نے حضرت سے اس خیال کا اظہار کیا آپ نے خوارج کا جائزہ لینے کے لئے حارث ابن مرہ عبدی کو ان کے ہاں بھیجا مگر خوارج نے انہیں بھی قتل کر دیا۔ اب کوئی چارہ نہ تھا کہ پہلے خوارج سے نمٹا جائے۔ اور پھر شام کی جانب کوچ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت نے شام جانے کے بجائے نہروان جانے کا حکم دے دیا۔ جب لشکر روانہ ہونے لگا تو مسافر ابن عفیف ازدی نے کہا کہ یا امیر المومنین میں ستاروں کی گردش کو پہچانتا ہوں یہ نیک ساعت نہیں ہے۔ جب تین گھڑی دن گزر جائے اس وقت سفر کا آغاز کیا جائے ورنہ لشکر کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم بتا سکتے ہو کہ میری گھوڑی کے پیٹ میں کیا ہے؟ کہا کہ میں حساب لگا کر بتا سکتا ہوں۔ فرمایا جو تمہاری اس بات پر یقین کرے گا وہ قرآن مجید کے جھٹلانے کا مرتکب ہو گا۔ قرآن یہ کہتا ہے:۔

ان اللہ عندہ علم الساعۃ و	اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے وہی مینہ برساتا ہے
ینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام۔	اور وہی جانتا ہے کہ شکموں کے اندر کیا ہے۔

پھر اس منجم کو تہدید و سرزنش کی اور لشکر والوں سے فرمایا کہ ان چیزوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اور اللہ پر بھروسا کر کے چل کھڑے ہو۔

جب لشکر نے نہروان کی راہ لی تو آگے بڑھ کر متعدد آدمیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ خوارج حلوان و بغداد کے درمیان نہر طبرستان کو عبور کر کے پار اُتر گئے ہیں۔ امیرالمومنین کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا وہ ابھی اسی طرف ہیں اور دریا کے ادھر ہی رمیلہ کی سرزمین پر قتل کئے جائیں گے۔ اتنے میں مقدمۃ الجیش کا ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں پل کے ذریعہ پار اترتے دیکھا ہے۔ حضرت نے تین مرتبہ اُس سے دریافت کیا اس نے ہر مرتبہ قسم کھا کر یہی کہا کہ وہ دریا کے اُدھر جا چکے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

واللہ ما عبروہ وان مصارعہم	خدا کی قسم انہوں نے نہر کو عبور نہیں کیا ان کے قتل
لدون الجسر واللہ لا یقتل منکم	ہو کر گرنے کی جگہ پل کے ادھر ہے۔ خدا کی قسم تم میں
عشرۃ ولا یسلم منھم عشرۃ۔	سے دس آدمی بھی قتل نہیں ہوں گے اور اُن میں
(تاریخ کامل۔ ج ۳ صفحہ ۱۷۴)	سے دس بھی نہیں بچیں گے۔

ایک طرف پے در پے یہ خبریں آرہی تھیں کہ خوارج پار اُتر گئے ہیں اور ادھر امیرالمومنین برابر یہ فرمارہے تھے کہ وہ نہر کے ادھر ہی ہلاک ہوں گے اس سے بعض لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہوئے اور ایک نوجوان نے تیور چڑھا کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خوارج نے دریا عبور کر لیا ہوگا تو میں حضرت پر نیزہ تان کر کھڑا ہو جاؤں گا کہ اب آپ عالم غیب کی خبریں بھی دینے لگ گئے ہیں۔ امیرالمومنین نے کچھ لوگوں کی یہ ذہنی کیفیت دیکھی تو گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے نہر کی طرف بڑھے، جب نہر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خوارج نہر کے ادھر ہی پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور اسے عبور نہیں کیا ہے۔ اتنے میں لشکر بھی پہنچ گیا اس نے خوارج کو نہر کے ادھر دیکھا تو اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرت نے لشکر سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

واللہ ما کذبت ولا کذبت	خدا کی قسم نہ میں نے جھوٹ کہا ہے اور نہ مجھے
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۷۲)	جھوٹی خبر دی گئی تھی۔

امیرالمومنین نے خوارج سے تین میل کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ خارجیوں نے لشکر کو دیکھا تو لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگایا اور حضرت کو پیغام بھجوایا کہ اب بھی آپ تائب ہو جائیں تو ہم آپ کی بیعت کریں گے ورنہ خلافت سے علیحدہ ہو جائیے تاکہ ہم اپنا کوئی امام منتخب کریں۔ حضرت نے انہیں کہلوایا کہ ہمارے دوستوں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم ان سے قصاص لیں اور اس کے بعد جب تک ہم شام کی جنگ سے فارغ نہیں ہو جاتے تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے اور تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے شاید اس عرصہ میں اللہ تمہیں سوچنے سمجھنے اور حق کی طرف پلٹ آنے کی توفیق دے دے۔ خوارج نے جواب میں کہا کہ ہم سب نے آپ کے بھائی بندوں کو قتل کیا ہے اور ہم سب آپ کا اور ان کا خون بہانا جائز و مباح سمجھتے ہیں۔

امیرالمومنین نے خوارج کے اس جواب پر مشتعل ہونے کے بجائے انہیں پھر سمجھانے کی کوشش کی اور قیس ابن سعد انصاری کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں فتنہ انگیزی سے روکیں انہوں نے خوارج کے ہاں پہنچ کر ان سے کہا کہ اے لوگو تم گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے ہو، ہمیں بلاوجہ کافر قرار دیتے ہو تم قتل ناحق سے باز آؤ اور ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے جہاد کرو۔ اس پر عبداللہ ابن شجرہ سلمی نے کہا کہ اب ہماری آنکھوں سے پردہ اٹھ چکا ہے باطل کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور حق کے اُجالے ہر سمت پھیل چکے ہیں۔ اب ہم کسی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ قیس نے کہا کہ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں تم فتنوں میں نہ پڑو اور اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان نہ کرو۔ اس کے بعد ابو ایوب انصاری ان کے ہاں گئے،

اور انہیں افتراق انگیزی اور فتنہ پردازی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنائے مخاصمت کیا ہے اور تم کیوں جنگ و قتال پر اتر آئے ہو۔ اگر لڑنے بھڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اٹھو اور ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرو۔ خوارج نے کہا کہ اگر ہم ساتھ دیں تو کل پھر ہم پر تحکیم مسلط کر دو گے۔ ابوایوب نے کہا کہ پہلے حال کی خبر لو پھر مستقبل کی بھی فکر کر لینا مگر خوارج ان سفارتوں اور پند و موعظت کی باتوں سے راہِ راست پر آنے والے نہ تھے۔ سمجھانے والے سمجھا کر ہار گئے اور جھنجھوڑنے والے جھنجھوڑ کر تھک گئے مگر انہوں نے کروٹ نہ بدلی۔ آخر خود امیرالمومنین اُن کے ہاں تشریف لے گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "اے لوگو تم نافہمی و بد اندیشی کی وجہ سے جماعت سے کٹ گئے ہو اور نفسانیت کی بناء پر حق سے بے راہ ہو گئے ہو میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ تم اس وادی اور اس وادی کے موڑوں میں قتل کئے جاؤ گے اُمّت تم پر نفرین کرے گی اور ہر طرف سے تم پر پھٹکار پڑے گی اس لئے کہ تمہارا موقف سراسر غلط اور تمہارا عناد بلا وجہ ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تمہیں تحکیم کے ماننے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ مکر و فریب ہے۔ اس فریب میں نہ آؤ مگر تم نے میری بات تک نہ سنی اور جنگ سے ہاتھ اٹھالئے میں نے تحکیم کو مانا تو تمہاری ضد سے مجبور ہو کر پھر بھی آنکھ بند کر کے تحکیم کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حکمین سے یہ عہد لے لیا کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلہ کریں۔ مگر انہوں نے کتاب و سنت کے خلاف فیصلہ کیا لہٰذا ہم اُن کا فیصلہ ٹھکرا دینے میں حق بجانب ہیں۔ خوارج نے کہا کہ بیشک ہم نے تحکیم کو مانا جس کے نتیجہ میں ہم کافر ہو گئے مگر ہم نے توبہ کر لی ہے آپ بھی اپنے کفر کا اعتراف کر کے توبہ کریں پھر ہم آپ کی بیعت بھی کریں گے اور آپ کے ساتھ ہو کر دشمن سے جنگ بھی لڑیں گے۔ فرمایا کیا اللہ کے رسول پر ایمان لانے ان کے ساتھ ہجرت کرنے اور اسلامی غزوات میں شریک ہونے کے بعد میں اپنے بارے میں کفر کی شہادت دوں یہ کیونکر ممکن ہے۔ اس پر خوارج نے شور مچایا اور کہا کہ اگر آپ کفر کا اقرار نہیں کرتے تو ہم آپ سے کوئی بات چیت نہیں کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہلڑ ہنگامے میں نہ کوئی بات منوائی جا سکتی ہے اور نہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ آؤ یوں فیصلہ کریں کہ تم اپنا ایک نمائندہ منتخب کرو جو مجھ سے گفتگو کرے اگر اس نے مجھے قائل کر دیا تو میں اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کر لوں گا اور اگر میں نے اسے مطمئن کر دیا تو پھر تمہیں اس معاندانہ رویہ کو ترک کرنا پڑے گا۔ خوارج نے پہلے تو اس میں پس و پیش کیا اور پھر تیار ہو گئے اور عبداللہ ابن کوا کو اپنا نمائندہ بنا کر پیش کیا۔ حضرت نے ابن کوا سے کہا کہ تم کس بات پر برہم و رنجیدہ ہو جب کہ تم میری امارت پر راضی اور میرے فرمانبردار تھے اور جنگ جمل میں میرے مخالفین سے لڑ بھی چکے ہو کہا کہ اس موقع پر تحکیم کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی۔ فرمایا اے

ابن کوا۔ میرا فیصلہ زیادہ صحیح ہونا چاہیئے یا رسول اللہ کا؟ کہا رسول اللہ کا۔ فرمایا کہ تم نے اللہ کا یہ ارشاد تو سنا ہوگا :۔

فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم	کہو آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں
ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم	کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو ہم
ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی	اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو پھر گڑگڑائیں
الکاذبین۔	اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں"

کیا اللہ نے اس لئے اپنے پیغمبر کو مباہلہ کا حکم دیا تھا کہ اسے پیغمبر کے سچا اور نصاریٰ کے جھوٹا ہونے میں شبہ تھا اور وہ اس مباہلہ کے ذریعہ اپنا شبہ برطرف کرنا چاہتا تھا؟ کہا کہ نہ اللہ کو شبہ تھا اور نہ اس کے رسول کو یہ نصاریٰ کے مقابلہ میں ایک احتجاج تھا۔ فرمایا کہ پھر تحکیم بھی تو ایک طرح سے احتجاج تھی کہا کہ حکم مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس امر میں شک ہوا کہ آپ حق پر ہیں یا نہیں حالانکہ جنگ اس بنیاد پر لڑی جا رہی تھی کہ آپ حق پر ہیں اور اہل شام باطل پر۔ چنانچہ آپ نے معاویہ سے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر کتاب خدا ہمارے حق میں فیصلہ کرے تو تم ہماری پیروی کرنا اور کتاب خدا تمہارے حق میں فیصلہ کرے تو ہم تمہارا اتباع کریں گے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ آپ کو خود اپنے حق بجانب ہونے میں شبہ ہوا اور جب آپ خود اپنے متعلق شک میں پڑ گئے تو ہمارے لئے زیادہ گنجائش ہے کہ ہم آپ کے حق بجانب ہونے میں شبہ کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ اتباع مشروط تھا اور مشروط اتباع کے اقرار سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہمیں اپنے موقف کی صداقت میں شبہ تھا اور ایسے مشروط اتباع کی پیش کش رسول اللہ نے بھی کی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :۔

قل فاتوا بکتاب من عند اللہ	کہو کہ اللہ کی طرف سے کوئی نوشتہ لاؤ جو (توراۃ
ھو اھدی منھما اتبعہ ان کنتم	و قرآن سے) زیادہ ہدایت انسانی کے لئے بہتر ہوتا
صادقین۔	کہ میں اس کی پیروی کروں اگر تم سچے ثابت ہوئے"

ابن کوا نے کہا کہ یہ بات درست ہے مگر آپ نے حکمین مقرر کر کے اللہ کا کام دوسروں کے سپرد کر دیا اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے صرف ابو موسیٰ کو حکم مقرر کیا تھا۔ کہا کہ ابو موسیٰ کافر ہے۔ فرمایا کہ وہ کب سے کافر ہوا جب اسے تحکیم کے لئے منتخب کیا گیا یا جب اس نے فیصلہ صادر کیا؟ کہا کہ جس وقت اس نے فیصلہ کیا۔ فرمایا تو پھر تم نے تسلیم کر لیا کہ جب اسے حکم مقرر کیا گیا تھا وہ مسلمان تھا اور تمہیں یہ امید تھی کہ وہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرے گا لہذا اسے حکم مقرر

کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ ابن کوا نے کہا کہ جب اس نے فیصلہ کیا اس وقت تو وہ کافر ہو گیا۔ فرمایا کہ اگر رسول اللہ کسی مسلمان کو کفار کی طرف بھیجیں کہ وُہ انہیں اسلام کی دعوت دے اور وہ اسلام کے بجائے ضلالت و گمراہی کی تعلیم دینے لگے تو کیا رسول اللہ پر اس کی ذمہ داری عائد ہو گی؟ ابن کوا نے کہا نہیں فرمایا کہ پھر ابوموسیٰ کافر ہو گیا تو اس کا الزام مجھ پر کیوں عائد کرتے ہو اور تمہارے لئے یہ جواز کیونکر پیدا ہو گیا کہ تم تلواریں کندھوں پر رکھے مسلمانوں کو قتل و غارت کرتے پھرو۔ رہا دوسرا حَکَم عمرو ابن عاص تو اسے نامزد کرنے والا معاویہ تھا میں اسے کیونکر حَکَم قرار دے سکتا تھا۔ جب کہ اس کا بس چلتا تو میرے قتل کا فیصلہ کرتا۔ کہا کہ پھر آپ ایک مسلمان اور ایک کافر کی تحکیم پر کیوں رضامند ہُوئے؟ فرمایا خداوند عالم نے زن و مرد کے اختلاف کی صورت میں حکم قرار دینے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وان خفتم شقاق بینهما	اگر تمہیں میاں بی بی کے درمیان تفرقہ کا اندیشہ
فابعثوا حکما من اهله و	ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبہ میں سے اور ایک
حکما من اهلها۔	ثالث عورت کے کنبہ میں سے مقرر کر دو"

اب اگر کوئی مسلمان کسی یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح کر لیتا ہے اور پھر دونوں میں مناقشہ رونما ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ مرد کے کنبہ کا ثالث مسلمان ہو گا اور عورت کے کنبہ کا ثالث یہودی ہو گا یا عیسائی۔ تو کیا از روئے قرآن ایک مسلمان اور ایک کافر کے حکم قرار دیئے جانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا؟

خوارج نے جب دیکھا کہ ابن کوا سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو اسے کہلوا بھیجا کہ گفتگو ختم کر کے واپس چلے آؤ۔ چنانچہ وہ بات چیت کو ادھورا چھوڑ کر واپس اپنی صفوں میں چلا گیا۔ امیرالمومنین نے باوجودیکہ ان پر حجت تمام کر دی مگر ان کی متمردانہ روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ اب جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ حضرت نے لشکر کو صف بندی کا حکم دیا اور میمنہ و میسرہ ترتیب دیئے۔ میمنہ کی کمان حجر ابن عدی کے اور میسرہ کی کمان شبث ابن ربعی کے سپرد کی اور سواروں پر ابوایوب انصاری کو اور پیادوں پر ابوقتادہ انصاری کو افسر مقرر کیا اور اہل مدینہ کی قیادت جن کی تعداد سات سو یا آٹھ سو تھی۔ قیس ابن سعد انصاری سے متعلق کی اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہوئے۔ خوارج نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا کہ میمنہ پر یزید ابن حصین کو اور میسرہ پر شریح ابن اوفی عبسی کو سالار مقرر کیا۔ سواروں پر حمزہ ابن سنان اسدی کو اور پیادوں پر حرقوص ابن زہیر کو امیر قرار دیا۔ جب صفوں کے مقابلہ میں صفیں جم گئیں تو حضرت نے ابوایوب انصاری کو ایک سفید پرچم

دے کر دو ہزار کی جمیعت کے ساتھ خوارج کی طرف بھیجا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ اے لوگو! امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ تم میں سے جو شخص اس علم کے نیچے چلا آئے یا کوفہ یا مدائن واپس چلا جائے یا اس جماعت کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائے اس کے لئے امان ہے۔ اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ فروہ ابن نوفل انجعی نے جو رؤسائے خوارج میں سے تھا اپنے قبیلہ والوں سے کہنے لگا کہ خدا کی قسم ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس بناء پر علی کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے ہیں۔ نہ ہمارے پاس اس محاربہ کے جواز کی کوئی دلیل ہے اور نہ اس خروج کی کوئی معقول وجہ۔ ہمیں ان لوگوں سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد ہم سوچیں گے کہ ہمیں علی کی اطاعت کرنا چاہیئے یا ان سے جنگ کرنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر وہ پانچ سو آدمیوں کے ساتھ خوارج سے الگ ہو کر بندنجین چلا گیا اور ایک گروہ کوفہ روانہ ہو گیا اور سو آدمی ابوایوب کے پرچم کے نیچے آ کر حضرت کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ یہ حضرت کے موقف کی صحت، استدلال کی قوت اور مصالحانہ روش کا نتیجہ تھا۔

امیرالمومنین نے بقیہ خوارج کو جنگ کے ہولناک نتائج سے متنبہ کیا مگر وہ جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب جنگ کے شروع ہونے میں خوارج کے حملہ کا انتظار تھا کیونکہ حضرت نے اپنی فوج کو پابند کر دیا تھا کہ جب تک ادھر سے حملہ نہ ہو وہ حملہ نہ کرے آخر ایک خارجی اپنی صفوں سے نکلا اور حملہ کر کے حضرت کی سپاہ میں سے تین آدمیوں کو شہید کر دیا۔ حضرت طیش میں آگے بڑھے اور تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ جب تلوار اس پر پڑی تو کہنے لگا کہ جنت میں جانا کتنا گوارا اور شیریں ہے۔ عبداللہ ابن وہب نے یہ الفاظ سُنے تو کہا کہ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تو جنت کی طرف جا رہا ہے یا دوزخ کی طرف۔ بنی سعد کے ایک خارجی نے یہ سنا تو کہا کہ میں عبداللہ ابن وہب کے ورغلانے سے یہاں چلا آیا اور اسے ابھی تک یہ علم نہیں کہ اس کا موقف صحیح ہے یا غلط اور اس کی جماعت کو جنت میں جانا ہے یا دوزخ میں اور یہ کہہ کر اپنی جماعت سمیت خوارج کی صفوں سے علیحدہ ہو گیا۔ خوارج ایک ایک کر کے لڑنے کے بجائے جلد ہی مجموعی حملہ پر اُتر آئے۔ چنانچہ انہوں نے تلواروں کی نیامیں توڑ ڈالیں۔ کمانوں میں تیر جوڑ لئے نیزے تانے اور "لا حکم الا اللہ" کا نعرہ لگا کر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ سواروں کے قدم اکھڑ گئے۔ مگر پیچھے ہٹ کر سنبھلے اور نیزوں اور تلواروں کے آگے سینے تان کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے پکار کر کہا ہاں اے جوانمردو! آگے بڑھ کر شیرانہ حملہ کرو۔ یہ کہہ کر حضرت بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب جو فوج نے آپ کی کمان میں ایک ساتھ حملہ کیا تو ہر طرف خون برسنے لگا اور لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں۔ اس پُرزور حملہ سے دشمن کے پرے ٹوٹ گئے اور صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ حضرت کی تلوار

ہیں لڑتے لڑتے خم آگیا آپ نے اسے زانو پر رکھ کر سیدھا کیا اور پھر پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوئے ادھر لشکر والے خوارج کے سروں پر تلواریں چلاتے اور پیچھے ہٹنے والوں پر تیر برساتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ انہیں چاروں طرف سے نرغہ میں لے لیا اور راہِ فرار اُن پر بند کر دی اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ تلواریں شعلے برسانے لگیں اور زندگی کی لو دم توڑتی نظر آنے لگی اور بقول شخصے اس طرح وُہ گر گر کر مرنے لگے گویا کسی نے ان سے کہہ دیا ہو کہ "مرجاؤ" اور وُہ مر گئے۔ چار سو خوارج زخمی ہو کر جنگ کے قابل نہ رہے اور نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی جن میں سے دو عمان کی طرف دو سجستان کی طرف دو کرمان کی طرف اور دو جزیرہ کی طرف بھاگ گئے اور ایک یمن میں تل موزن میں پہنچ گیا اور باقی سب کے سب قتل ہو گئے۔ سردارانِ خوارج میں سے عبداللہ ابن وہب کو زیاد ابن خصفہ نے یزید ابن حصین طائی کو ابوایوب انصاری نے حرقوص ابن زہیر کو جیش ابن ربیعہ کنانی نے عبداللہ ابن شجرہ سلمی کو عبداللہ ابن زحر خولانی نے اور شریح ابن اوفی کو قیس ابن معاویہ نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور امیرالمومنین کے لشکر میں سے صرف آٹھ آدمی شہید ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ رویبہ ابن وبر بجلی، سعید ابن خالد سبیعی، عبداللہ ابن حماد ارحبی، فیاض ابن خلیل ازدی، کیسوم ابن سلمہ جہنی، عبید ابن عبید خولانی، جمیع ابن جشم کندی، حبیب ابن عاصم اسدی۔

امیرالمومنین کے ہمراہیوں نے جب دیکھا کہ خوارج سب کے سب قتل ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اب صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا:۔

کلا واللہ انھم نطف فی اصلاب الرجال وقرارات النساء کلما نجم منھم قرن قطع حتی یکون اخرھم لصوصا سلابین۔ (نہج البلاغہ)	ہرگز نہیں۔ ابھی تو وُہ مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے شکموں میں موجود ہیں۔ جب بھی ان میں کا کوئی گروہ اُبھرے گا تو اسے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کی آخری فردیں چور اور ڈاکو ہو کر رہ جائیں گی۔"

جب جنگ ختم ہو گئی تو خوارج کی ایک فرد ذوالثدیہ کے لاشہ کی تلاش شروع ہوئی کیونکہ امیرالمومنین ان کے خروج سے پہلے فرمایا کرتے تھے:۔

ان قوما یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ علامتھم رجل مخدج الید۔	ایک قوم دین سے اس طرح نکل جائے گی جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک شخص ناقص

ہاتھ والا ہو گا۔" (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۷۵)

کچھ لوگوں نے اسے ادھر ادھر لاشوں میں تلاش کیا مگر اس کی لاش نہ مل سکی۔ انہوں نے پلٹ کر حضرت سے کہا کہ ہم نے تمام لاشیں دیکھ ڈالی ہیں مگر اس کی لاش کہیں نظر نہیں آئی۔ فرمایا خدا کی قسم اس کی لاش انہی لاشوں میں موجود ہے۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان ابن ثمامہ حنفی اور ریان ابن صبرہ کو ساتھ لے کر تلاش کے لئے کھڑے ہوئے۔ جب لاشوں کو دیکھتے بھالتے ہوئے نہر کے کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک گڑھے میں چالیس پچاس لاشیں پڑی ہیں۔ جب ان لاشوں کو ہٹا کر دیکھا گیا تو ان کے نیچے ذوالثدیہ کی لاش بھی پڑی تھی۔ حضرت نے اپنے ہمراہیوں سے فرمایا:۔

اللہ اکبر! واللہ ماکذبت و لاکذبت اما واللہ لولا ان تنکلوا عن العمل لاخبرتکم بما قضی اللہ علی لسان نبیہ لمن قاتلھم مستبصرا فی قتالھم عارفا للحق الذی نحن علیہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص۶۶)	اللہ اکبر! نہ میں نے جھوٹ کہا اور نہ مجھے جھوٹی خبر دی گئی۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم عمل سے روگرداں ہو جاؤ گے تو میں ان خوارج سے بصیرت کے ساتھ جنگ کرنے والوں اور جس حق پر ہم ہیں اس حق کے پہچاننے والوں کے لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کی زبان سے جس اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اس سے تمہیں آگاہ کرتا۔"

جب پلٹ کر خوارج کی لاشوں کی طرف سے ہو کر گزرے تو فرمایا تم پر افسوس ہے جس نے تمہیں فریب دیا اس نے تمہیں نقصان پہنچایا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا امیرالمومنین انہیں کس نے فریب دیا فرمایا کہ شیطان اور نفس امارہ نے ان دونوں نے فریب کا جال بچھایا امیدوں کے ذریعہ انہیں ورغلایا گناہوں کو سج کر ان کے سامنے پیش کیا اور یہ چیز ان کے ذہنوں میں بٹھا دی کہ وہ غالب و کامران رہیں گے۔

اس جنگ میں کامیابی کے بعد امیرالمومنین نے اپنے ہمراہیوں کو منجم کی وہ بات یاد دلاتے ہوئے جو اس نے ساعت کے بد ہونے کے متعلق کہی تھی، فرمایا:۔

لو سرنا فی الساعۃ التی امر بھا المنجم لقال الجھال الذین لایعلمون شیئا سار فی الساعۃ التی امر بھا المنجم فظفر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص۱۷۳)	اگر ہم اس گھڑی میں نکلتے جس میں نکلنے کا مشورہ نجومی نے دیا تھا تو جاہل و بے خبر لوگ یہ کہتے کہ یہ فتح اس گھڑی میں نکلنے کا نتیجہ ہے جس کی ہدایت اس نجومی نے کی تھی۔"

خوارج کا طرزِ عمل انتہائی تعجب انگیز ہے۔ انہوں نے صفین میں عین فتح کے موقع پر تلواریں روک کر اپنے سروں پر تلواروں کے چلنے کا سامان کیا۔ خود ہی تحکیم پر زور دیا اور خود ہی اس کے مخالف ہو گئے۔ اتفاق و اتحاد کو پارہ پارہ کیا اور نت نئے فتنے اٹھائے۔ امیرالمومنین جن کا ہر قول و عمل سراپا ایمان تھا ان سے برائت کا نام ایمان رکھا اور ان سے وابستگی کو کفر سے تعبیر کیا اور برابر اس پر اصرار کرتے رہے کہ آپ کفر کا اقرار کر کے توبہ کریں اور تحکیم کا معاہدہ توڑ کر جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر یہ لوگ واقعاً تحکیم کے مخالف اور معاویہ سے جنگ کرنا چاہتے تھے تو تحکیم کے فیصلہ کے بعد اس کا موقع تھا کہ وہ معاویہ سے جنگ کرتے مگر معاویہ سے لڑنے کے بجائے وہ حضرت کے مقابلہ میں صف آراء ہو گئے اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ سے جنگ و قتال ان کے نزدیک اتنا ضروری نہ تھا جتنا حضرت کی زبان سے کفر کا اعتراف اہم تھا ورنہ معاویہ بھی تو ان کے نزدیک کافر تھا پہلے اس سے نمٹ لیتے جب کہ اس سے نمٹنے کا موقع فراہم ہو گیا تھا اور پھر حضرت علی سے جنہیں بزعم خود کافر سمجھتے تھے نمٹتے۔ بلکہ وہ اپنے نعرہ لاحکم الا اللہ۔ میں مخلص ہوتے تو انہیں پہلے معاویہ ہی کے مقابلہ میں اترنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ وجہ کفر تو تحکیم تھی اور معاویہ اس تحکیم کا بانی و تجویز کنندہ تھا اور حضرت علی نے اسے مانا تھا تو مجبوری کی صورت میں، پھر معاویہ کو نظر انداز کر کے حضرت سے اقرار کفر کے مطالبہ کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت کو کفر و عہد شکنی کا مرتکب قرار دے کر دوسروں کی نظروں سے گرائیں اور معاویہ سے لڑنے کا ولولہ ان کے دلوں میں ہوتا تو فتح سے دستبردار ہو کر جنگ بندی پر اصرار ہی کیوں کرتے۔

خوارج کی غرض صرف امیرالمومنین کی مخالفت تھی۔ انہوں نے آپ کے خلاف فتنہ و بغاوت کو ہوا دی طرح طرح کے الزام تراشے اور حق و صداقت کے مقابلہ میں ضلالت و گمراہی پر جمے رہے، حضرت نے انہیں سمجھانے بجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ نہ ان پر سختی روا رکھی اور نہ ان کے معاشی وظائف میں کمی کی۔ اور جب ان کی طغیانی و سرکشی اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے بے دریغ مسلمانوں کو حق گوئی کے جرم میں قتل کرنا شروع کر دیا اور عورتوں تک کو ذبح کر ڈالا تو بحالت مجبوری ان کی طرف قدم اٹھایا اور میدانِ جنگ میں بھی انہیں دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور جب دلائل کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو عمومی امان کا اعلان اور جنہوں نے اس امان سے فائدہ اٹھایا انہیں کسی باز پرس کے بغیر جدھر وہ جانا چاہتے تھے جانے دیا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود جب وہ جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر اس کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا کہ انہیں قرار واقعی سزا دی جائے اور جنگ لڑ کر ان کے کس بل نکال دیئے جائیں۔

اس جنگ سے قبل اور اس کے دوران امیرالمومنین نے متعدد پیشینگوئیاں فرمائیں اور ہر پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ یہ پیشینگوئیاں کہانت و ستارہ شناسی پر مبنی نہ تھیں ورنہ ایک ماہر منجم کی پیشینگوئی کو ٹھکرانے کے بجائے اس کی صحت و سقم پر غور کرتے اور اپنے مقررہ قواعد پر جانچتے پرکھتے مگر آپ نے اسے تکذیب قرآن کے مترادف سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا بلکہ یہ تمام امور وہ تھے جن کا علم پیغمبر اکرم کے ذریعہ اُن کے سینہ میں ودیعت تھا جس کے بعد نہ ان کی صحت میں کوئی شک و شبہ ہو سکتا تھا اور نہ خلاف واقع ہونے کا وہم و گمان اس لئے کہ ہر مورد پر آپ نے جو خبر دی یقین و وثوق کے ساتھ۔ گویا آپ کی آنکھیں غیب کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کے صفحہ پر ابھرنے والے نقوش کو دیکھ رہی ہیں۔ ذیل میں چند پیشینگوئیاں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) آپ نے زرعہ ابن برج طائی سے کہا تھا کہ تم قتل کئے جاؤ گے اور ربیعہ ابن شداد خثعمی سے کہا تھا کہ تمہاری نعش گھوڑوں کے سموں میں پامال ہوگی۔ چنانچہ یہ دونوں اس جنگ میں قتل کئے گئے اور ربیعہ کی لاش گھوڑوں کے سموں میں پامال ہو گئی۔ قبیصہ کہتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ گھوڑوں کے سموں سے ربیعہ کا چہرہ اور سر کچلا گیا ہے اور جسم کے ٹکڑے ہو گئے ہیں تو

فذکرت قول علی و قلت للّٰہ	مجھے حضرت علی کی بات یاد آئی اور میں نے کہا کہ
درّ ابی الحسن ماحرک شفتیہ	ابوالحسن کی خوبیوں کا کیا کہنا انہوں نے جب بھی
قط بشیٔ الا کان کذلک۔	کوئی بات کہی وہ اسی طرح ہو کر رہی۔"

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ۔ صفحہ ۱۵۳)

(۲) خوارج کے بارے میں فرمایا کہ وہ پل کے ادھر قتل ہوں گے اور نہر عبور کر کے پار نہیں اتریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ نہر کے ادھر اس قطعہ زمین پر مارے گئے جسے رمیلہ کہا جاتا تھا۔

(۳) آپ نے خبر دی کہ آپ کے لشکر میں سے دس آدمی بھی مارے نہیں جائیں گے اور خوارج میں سے دس بھی نہیں بچیں گے۔ چنانچہ آپ کے لشکر میں سے آٹھ آدمی شہید ہوئے اور خوارج میں سے نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی۔

(۴) ذوالثدیہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ یقیناً مارا گیا ہے اور اس کی نعش مقتولین میں موجود ہے چنانچہ اس کی نعش لاشوں کے ڈھیر میں سے برآمد ہوئی۔

(۵) آپ نے خوارج کے مارے جانے کے بعد فرمایا کہ وہ ختم نہیں ہوئے ابھی صلبوں اور شکموں میں موجود ہیں اور جب بھی سر اٹھائیں گے کچل دیئے جائیں گے۔ چنانچہ جنگ نہروان کے بعد وہ چھوٹے بڑے

جتھوں کی صورت میں علم و بغاوت بلند کرتے رہے اور حضرت کی فوج کے ہاتھوں مارے جاتے رہے اور پھر اموی و عباسی دور میں ہر حکومت سے ٹکرانے کے لئے اُٹھے اور مہلب ابن ابی صفرہ بارہ برس تک ان سے نبرد آزما رہا اور آخر ان میں پھوٹ ڈلوا کر اور انہیں آپس میں لڑوا کر انتہائی کمزور کر دیا اور عباسیوں نے انہیں اس طرح کچلا کہ ان اطراف میں ان کے لئے جینا مشکل ہو گیا اور تتر بتر ہو کر عمان و افریقہ کی طرف نکل گئے اور اب بھی مسقط و زنجبار میں جماعتی صورت میں موجود ہیں۔

(۶) آپ نے فرمایا کہ ان کی آخری فردیں رہزنوں اور قزاقوں کی صورت میں ابھرتی رہیں گی۔ چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا۔ جہاں موقع ملتا دھاوا بولتے اور جو ہاتھ لگتا لوٹ لے جاتے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

وصح اخباره ایضًا انه سیکون اخرهم لصوصا سلابین فان دعوة الخوارج اضمحلت و رجالها فنیت حتی افضی الامر الی ان صار خلفهم قطاع طریق متظاهرین بالفسوق والفساد فی الارض (شرح ابن ابی الحدید ج۲ ص۲۷۴)

امیرالمومنین کی یہ پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی کہ خوارج رہزن و قزاق ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ خارجیوں کی دعوت کمزور پڑ گئی اور اُن کے جوانمرد فنا ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کے بعد آنے والے رہزن ہو گئے جو علانیہ فسق و فجور کے مرتکب ہوتے اور زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے"

محاربات خوارج

جنگ نہروان سے فارغ ہو کر امیرالمومنین ؑ شام جانے کا ارادہ تو رکھتے ہی تھے آپ نے اپنے لشکر سے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں خوارج کے مقابلہ میں فتح و کامرانی دی ہے اب شام جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہو اور دشمن سے لڑ کر سرخروئی حاصل کرو۔ اشعث ابن قیس اور دوسرے چند آدمیوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہمارے لئے تیر ختم ہو چکے ہیں تلواریں کند ہو گئی ہیں اور نیزوں کی انیاں ناکارہ ہو چکی ہیں کچھ دنوں کے لئے کوفہ تشریف لے چلئے تاکہ ہم سستا بھی لیں اور تلواروں پر صیقل اور ہتھیاروں کی اصلاح و درستی بھی کر لیں۔ پھر تازہ دم ہو کر دشمن سے لڑیں گے۔ حضرت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہماری اصل منزل شام ہے اب اس میں مزید تاخیر کرنا خلاف مصلحت ہے۔ حضرت نے بہت کچھ کہا سُنا مگر وہ لوگ نہ مانتے اور

آپ کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ امیرالمومنین کوفہ کی جانب واپس تو ہوئے مگر شہر میں داخل ہونے کے بجائے نخیلہ میں قیام فرما ہوئے اور لشکر والوں کو بھی وہیں پر ٹھہرنے کا حکم دیا تاکہ وہ گھروں میں پہنچ کر دوسرے جھمیلوں میں نہ پڑ جائیں۔ یہ لوگ کچھ دن تو ٹھہرے رہے پھر کچھ حیلے بہانے کر کے اور کچھ چپکے چپکے کھسکنے لگے یہاں تک کہ چند گنے چنے آدمیوں کے علاوہ سب ہی چلے گئے۔ اب نخیلہ میں ٹھہرنا بیکار تھا حضرت بھی وہاں سے اُٹھ کر کوفہ میں چلے آئے۔

جب کوفہ میں تشریف فرما ہوئے تو اور فتنے اُٹھ کھڑے ان میں ایک فتنۂ خوارج بھی تھا۔ اگرچہ جنگ نہروان میں ان کی ایک بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا مگر پوری طرح ان کا قلع و قمع نہ ہوا تھا۔ بہت سے ان کے ہم مسلک و ہم عقیدہ کوفہ میں موجود تھے جو کسی مصلحت کی بناء پر جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ اب انہوں نے پر پرزے نکالے اور جتھا بندی کر کے مملکت کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امیرالمومنین اس فتنۂ خوارج اور دوسری شورشوں کے دبانے میں مصروف ہو گئے اور شام پر لشکر کشی میں التوا ناگزیر ہو گیا۔

ان باغی گروہوں میں سے ایک گروہ خریت ابن ارشد کا تھا جو بنی ناجیہ کے خوارج کا سرغنہ اور کوفہ ہی میں مقیم تھا۔ یہ ایک دن تیس آدمیوں کے ہمراہ امیرالمومنین کے پاس آیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں نہ آپ کا کوئی حکم مانوں گا نہ آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور کل سے آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کس بات پر اتنے برہم ہو کہا کہ آپ نے تحکیم کو مان کر اسلام کے حکم سے کھلّم کھلّا انحراف کیا ہے فرمایا کہ تم نے یہ بات بے سوچے سمجھے کہی ہے اگر تم سمجھنا چاہو تو تمہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہا کہ آج تو میں جاتا ہوں کل کسی وقت آؤں گا اور اس سلسلہ میں بات چیت کروں گا۔ فرمایا کہ شیطان کے بہکانے میں نہ آنا اور غلط قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اگر میری باتوں سے تمہاری تسلی نہ ہوئی تو پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرنا۔ جب وہ پلٹ کر اپنی منزل پر آیا تو قبیلۂ ناجیہ سے کہا کہ میں نے علی سے کل ملنے کا وعدہ کیا ہے مگر مجھے ان کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں جو قدم اٹھانا ہے اٹھا لینا چاہیئے اور یہاں سے چل دینا چاہیئے۔ حضرت نے دوسرے دن اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو عبداللہ ابن قعین ازدی کو اس کے پاس بھیجا۔ عبداللہ نے پلٹ کر بتایا کہ وہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ کوفہ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ حضرت نے یہ سُنا تو فرمایا "انہیں قوم ثمود کی طرح خدا کی رحمت سے دوری ہو دیکھنا جب نیزوں کے رُخ ان کی طرف سیدھے ہوں گے اور تلواروں کے وار اُن کی کھوپڑیوں پر پڑیں گے تو اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔" زیاد ابن خصفہ نے کہا کہ ہمیں اُن کے چلے جانے پر رنج و افسوس

نہ ہونا چاہیئے۔ نہ ان کے رہنے سے ہمیں کوئی فائدہ تھا اور نہ ان کے چلے جانے سے کمی کا احساس ہو گا۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو آپ کی اطاعت میں ہیں بہکائیں گے اور امن عامہ میں خلل انداز ہوں گے اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں واپس لانے کی کوشش کروں۔ فرمایا تمہیں کیا معلوم کہ وہ کس طرف گئے ہیں کہا کہ دریافت کرنے پر معلوم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ میرے عمال ان کی نقل وحرکت کے بارے میں مجھے ضرور تحریر کریں گے تم جاؤ اور دیر ابی موسیٰ میں پہنچ کر میرے حکم کا انتظار کرو زیاد اپنی منزل پر آئے اور اپنے قبیلۂ بکر ابن وائل کو جمع کیا اور تمام واقعہ ان سے بیان کر کے کہا کہ تم امیرالمومنین کے انصار و اعوان ہو اس مہم میں میرا ساتھ دو تا کہ دشمن کو آگے بڑھنے سے روک سکیں اور انہیں واپس لائیں۔ اس آواز پر ایک سو تیس آدمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ زیاد نے کہا کہ دشمن پر قابو پانے کے لئے اتنے آدمی بہت ہیں اور انہیں لے کر دیر ابی موسیٰ میں پہنچے اور امیرالمومنین کے حکم کے انتظار میں ٹھہر گئے۔

اس اثنا میں حضرت کے ایک عامل قرظہ ابن کعب انصاری نے حضرت کو اطلاع دی کہ بنی ناجیہ کا لشکر مقام نفر کی طرف نکل گیا ہے اور اُس نے راستے میں ایک مسلمان زاذان فروخ کو اس جرم میں قتل کر دیا ہے۔ کہ اس نے آپ کے بارے میں عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کیا اور ایک ذمی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ اس کے قتل کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب حضرت کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے ایک نوجوان عبداللہ ابن وال کے ذریعہ زیاد ابن خصفہ کو تحریراً اطلاع دی کہ خریت اور اس کے ہمراہی نفر کی طرف جا چکے ہیں انہوں نے ایک مرد مسلمان کو قتل کر ڈالا ہے۔ تم ان کا پیچھا کرو اور انہیں واپس لانے کی کوشش کرو اگر وہ واپس آنے پر تیار نہ ہوں تو اُن سے جنگ کرو کیونکہ اُن کی امن سوز حرکات نے جنگ کا جواز پیدا کر دیا ہے۔ عبداللہ ابن وال خط لے کر چند قدم چلے ہوں گے کہ پلٹ کر حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین کیا میں بھی زیاد ابن خصفہ کے لشکر میں شامل ہو سکتا ہوں؟ حضرت نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا اور فرمایا کہ ہاں تم بھی شریکِ لشکر ہو جانا مجھے اُمید ہے کہ تم حق کے معاون اور ظالموں کے مقابلہ میں میرے ناصر و مددگار ثابت ہو گے۔ عبداللہ ابن وال کہتے ہیں کہ:۔

فواللہ ما احب ان لی بمقالۃ علی تلک حمر النعم۔	خدا کی قسم حضرت نے جن الفاظ سے مجھ یاد کیا ہے میں ان لفظوں کے بدلے میں سُرخ بالوں والے اونٹوں کا لینا بھی گوارا نہ کروں گا۔“
(تاریخ طبری۔ ج ۴ صفحہ ۹۰)	

جب عبداللہ نے دیر ابی موسیٰ میں پہنچ کر زیاد ابن خصفہ کو حضرت کا پیغام دیا تو زیاد نے عبداللہ

ابن دال کی سواری، ہتھیار اور شجاعانہ تیور دیکھ کر کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ تم میرے ساتھ رہو۔ عبداللہ نے کہا کہ میری بھی دلی خواہش یہی ہے اور میں امیرالمومنین سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ چنانچہ وہ زیاد کے دستہ میں شامل ہوگئے اور بنی ناجیہ کے تعاقب میں نفر کی طرف چل دیئے۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ جرجرایا کی طرف چلے گئے ہیں۔ زیاد نے ان کا تعاقب کیا اور بصرہ و واسط کے درمیان مقام مذار میں انہیں جا لیا اور ان کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ خریت ان کے پڑاؤ کے پاس آیا اور پوچھا کہ تم کس مقصد سے آئے ہو کہا کہ ابھی ہمیں دم لینے دو کچھ دیر سستا لیں تو پھر تمہیں مقصد بھی بتا دیں گے۔ زیاد کچھ دیر سستانے اور گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد خریت کے پاس گئے اور کہا کہ تم کوفہ چھوڑ کر کیوں نکل کھڑے ہوتے ہو؟ کہا کہ مجھے علی کے طور طریقے ناپسند ہیں اور ان کی امارت کھٹکتی ہے۔ اب میں ان لوگوں کا ساتھ دوں گا۔ جو شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ کہا کیا انتخاب کے ذریعہ ایسا شخص مل سکتا ہے جو اسلام میں سابق کتاب و سنت کا سب سے بڑھ کر عالم اور رسول کا قرابت دار ہو کہا کہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہا کہ تم نے ایک مرد مسلمان کو قتل کر دیا ہے تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے۔ کہا کہ میں نے قتل نہیں کیا میرے ہمراہیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہوگا۔ کہا کہ ان قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم اُن سے قصاص لیں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہا کہ پھر تم بھی شریک جرم ہو۔ اب دونوں نے اپنے اپنے دستوں کی صف بندی کی اور نیزے تان کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ظہر کے وقت ہتھیار حرکت میں آئے اور جنگ کا آغاز ہوگیا۔ نیزے سینوں میں گڑنے لگے اور تلواریں سینوں پر چلنے لگیں۔ جب رات کا اندھیرا پھیلا تو خوارج اپنے پانچ لاشے میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ زیاد کے دستہ میں سے دو آدمی سوید اور واقد ابن بکر شہید ہوگئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ زیاد جو خود بھی زخمی ہو چکے تھے بصرہ میں چلے آئے اور امیرالمومنین کو تحریر کیا کہ مقام مذار میں خریت سے مقابلہ ہوا ہے اس کے پانچ آدمی مارے گئے ہیں اور وہ اپنے کشتوں کو چھوڑ کر اہواز کی جانب چلا گیا ہے اور اس کی جمعیت دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ ہمارے کچھ آدمی زخمی ہوگئے ہیں میں ان کے علاج معالجہ کے لئے بصرہ میں ٹھہر گیا ہوں اور آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔

امیرالمومنین نے زیاد کو واپس بلوا لیا اور معقل ابن قیس ریاحی کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ اہواز کی جانب روانہ کیا اور ابن عباس عامل بصرہ کو تحریر فرمایا کہ معقل کی کمک کے لئے دو ہزار جوانمرد اہواز کی جانب روانہ کر دو۔ جب معقل لشکر کی کمان کرتے ہوئے اہواز میں وارد ہوئے تو بصرہ کی سپاہ کے انتظار میں ٹھہر گئے۔ ادھر خریت نے اہواز کے کافروں قزاقوں اور اپنے ہم مسلک عربوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک

کثیر جمعیت بہم پہنچا لی اور انہیں ساتھ لیکر رامہرمز کی پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ معقل نے مزید انتظار غیر ضروری سمجھا اور خریت کے تعاقب میں چل دیئے۔ ابھی ایک دن کی مسافت طے کی ہو گی ۔ کہ بصرہ کا لشکر خالد ابن معدان طائی کی زیر قیادت پہنچ گیا اور دونوں لشکر ایک ہو کر آگے چل دیئے۔ جب رامہرمز کی پہاڑیوں کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خریت اپنے لشکر سمیت پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ معقل نے اپنے لشکر کی صف بندی کی میمنہ پر یزید ابن معقل کو اور میسرہ پر منجاب ابن راشد ضبی کو افسر بنایا۔ خریت کا میمنہ عربوں پر اور میسرہ کافروں اور کردوں پر مشتمل تھا۔ جب صفیں آراستہ ہو گئیں تو دونوں نے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ معقل کے لشکر نے خوارج کو تلواروں کی باڑ پر رکھ لیا اور جب خریت کی فوج کے تین سو ستر آدمی مارے گئے تو اس کے قدم اکھڑ گئے اور ساحل بحر کی طرف جہاں اس کے قوم و قبیلہ کے کچھ لوگ آباد تھے چلا گیا۔ یہاں بھی لوگوں کو حضرت کے خلاف بہکانا شروع کیا اور بہلا پھسلا کر ایک کثیر جماعت کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔

خریت کے پسپا ہوتے کے بعد معقل نے امیرالمومنین کو تحریر کیا کہ خریت کے ہمراہیوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہو چکی ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ امیرالمومنین نے چند سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے واقعہ بیان کیا۔ سب نے رائے دی کہ آپ معقل کو تحریر فرمائیں کہ وہ خریت کا تعاقب کر کے اسے قتل کریں یا حدودِ مملکت سے باہر نکال دیں ورنہ وہ فتنہ انگیزی سے باز نہیں آئے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین نے انہیں تحریر کیا کہ وہ اس وقت تک اس کا پیچھا کریں جب تک اس کی جماعت کا قلع قمع نہیں ہو جاتا۔ معقل کو جب یہ حکم پہنچا تو وہ لشکر کو لے کر ساحل بحر کی طرف چل دیئے۔ خریت کو اس تعاقب کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنی جمعیت بڑھانے کے لئے خوارج کے گروہ سے کہا کہ میں تمہارا ہم عقیدہ ہوں علی حکم قرار دینے کے مجاز نہ تھے، اور کوفہ والوں سے کہا کہ علی کو انہی کے نمائندہ (ابو موسیٰ) نے معزول کر دیا تو انہیں حق امارت کہاں رہا۔ اور عثمانیوں سے کہا کہ میں تمہارا ہم خیال ہوں عثمان قطعاً مظلوم مارے گئے تھے اور خراج و صدقات روک لینے والوں سے کہا کہ تم یہ صدقات حکومت کے کارندوں کو دینے کے بجائے اپنے عزیز و اقارب پر صرف کرو اور اس طرح مختلف الخیال لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے گرد جمع کئے رہا۔ اس گروہ میں نومسلموں کی بھی ایک جماعت شامل تھی جو عیسائیوں سے مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے جب خریت کے گروہ میں مختلف خیالات و نظریات کے لوگ دیکھے تو کہنے لگے کہ ان لوگوں کے دین سے تو ہمارا پہلا دین ہی اچھا تھا۔ یہ لوگ ایک امت اور ایک مذہب و مسلک پر ہوتے ہوئے ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ خریت نے سنا تو کہا کہ تم لوگ دوبارہ عیسائی ہو کر اپنی جانیں نہیں بچا سکتے اس لئے کہ

اسلام لانے کے بعد جو شخص اسلام سے منحرف ہو جاتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا ہے اب تلواروں سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ تم ڈٹ کر مقابلہ کرو اور چلتی ہوئی تلواروں کو تلواروں سے روکو ورنہ یہ لوگ تمہارے بال بچوں کو قتل کر دیں گے۔ اور تمہاری عورتوں کو کنیزیں بنائیں گے۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ ساری مصیبت تمہاری لائی ہوئی ہے ہم آگے بڑھتے ہیں جب موت ہے اور پیچھے ہٹتے ہیں جب موت ہے۔

معقل نے ان لوگوں کے پڑاؤ کے قریب جھنڈا گاڑ دیا اور اعلان کیا کہ جو لوگ اس جماعت میں تازہ شامل ہوئے ہیں وہ الگ ہو جائیں اُن سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ بنی ناجیہ کے علاوہ دوسرے لوگ چھنٹ گئے بنی ناجیہ میں ایک گروہ عیسائیوں کا تھا اور ایک گروہ وہ تھا، جو بعض مصالح کی بنا پر مسلمان ہو گیا تھا اور ایک گروہ وہ تھا جو خراج دینا نہ چاہتا تھا۔ خریت نے ان مختلف عناصر کو منظم کر کے صف بندی کی اور مقابلہ پر اُتر آیا۔ معقل نے بھی اپنی صفیں ترتیب دیں اور ایک مختصر تقریر سے لشکر کا جوش بڑھایا اور پھر ایک دم حملہ کر دیا۔ نعمان ابن صہبان راسبی نے خریت پر [illegible] وار کیا۔ خریت گھوڑے سے زمین پر گرا اور پھر سنبھل کر تلوار سے حملہ آور ہوا۔ نعمان نے اس کا وار خالی دے کر جو حملہ کیا تو اُسے مار گرایا۔ خریت کے گرتے ہی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اس کی فوج کے ایک سو ستر آدمی مارے جا چکے تھے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔

معقل نے ان کے مردوں بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے جو مسلمان تھے ان سے بیعت لے کر انہیں رہا کر دیا اور جو مرتد ہو گئے تھے انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت دی۔ ایک بوڑھے رماحس ابن منصور نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اتنی بڑی غلطی کبھی نہیں کی جتنی ایک اچھے دین کو چھوڑ کر بُرے دین کو اختیار کرنے میں کی ہے۔ میں اب اپنے سابقہ مذہب عیسائیت ہی پر باقی رہوں گا۔ چنانچہ اس بوڑھے کے علاوہ دوسرے لوگوں نے اسلام قبول کر کے اپنی جانوں کا تحفظ کر لیا اور اس بوڑھے عیسائی کو ارتداد کے جرم میں قتل کر دیا گیا باقی جن عیسائیوں نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا انہیں اور اُن کی عورتوں کو اسیر کر لیا گیا ان اسیروں کی تعداد پانچ سو تھی۔ جب معقل ان اسیروں کو لے کر اردشیر خرہ پہنچے تو ان قیدیوں نے وہاں کے حاکم مصقلہ ابن ہبیرہ شیبانی کے سامنے چیخنا چلانا شروع کیا اور کہا کہ ہم پر احسان کیجئے اور ہمیں خرید کر آزاد کر دیجئے۔ مصقلہ نے ذہل ابن حارث کے ذریعہ معقل کو پیغام بھجوایا کہ ان اسیروں کو میرے ہاتھ بیچ ڈالئے۔ معقل نے پانچ لاکھ درہم میں وہ قیدی مصقلہ کے ہاتھ بیچ ڈالے اور کہا کہ یہ رقم فوراً امیرالمومنین کو بھیج دی جائے۔ مصقلہ نے کہا کہ میں کچھ رقم ابھی بھیجے دیتا ہوں اور بقیہ رقم بالاقساط ادا کر دوں گا۔ جب معقل امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور تمام واقعہ بیان کیا۔ حضرت نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کچھ دنوں تک رقم کا انتظار کرتے رہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ مصقلہ نے اسیروں کو چھوڑ دیا ہے اور ان پر کوئی بار نہیں ڈالا تو فکر ہوئی کہ وُہ اکیلا کیونکر اتنی خطیر رقم ادا کر سکے گا آپ نے ابو حرہ حنفی کے ذریعہ مصقلہ کو پیغام بھیجا کہ یا قیمت بھجواؤ یا خود آؤ۔ مصقلہ کوفہ آیا اور دو لاکھ درہم ادا کر دیئے۔ ابھی وُہ کوفہ ہی میں تھا کہ اس نے ذہل ابن حارث کو اپنے ہاں بُلایا اور کہا کہ امیرالمومنین بقایا رقم کا تقاضا کر رہے ہیں اور میں اس کے ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ کہا کہ اگر تم چاہو تو ایک ہفتہ میں اتنی رقم فراہم کر سکتے ہو۔ کہا کہ میں کسی پر بوجھ ڈالنا پسند نہیں۔ خدا کی قسم اگر اس موقع پر معاویہ ہوتے تو مجھ سے کبھی مطالبہ نہ کرتے اور اگر حضرت عثمان ہوتے تو وہ بھی درگزر سے کام لیتے۔ آخر وہ اشعث ابن قیس کو آذربائیجان کے خراج میں سے ایک لاکھ درہم سالانہ دیا ہی کرتے تھے۔ ذہل نے کہا کہ یہ علی ہیں یہ مسلمانوں کے مال میں ایک درہم بھی چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ یہ سن کر وہ راتوں رات نکل کھڑا ہُوا اور معاویہ کے ہاں پہنچ گیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اگر وہ ٹھہرا رہتا تو ہم مطالبہ میں سختی نہ کرتے اس نے کام تو شریفوں کا سا کیا تھا مگر غلاموں کی طرح بھاگ نکلا۔ معاویہ نے مصقلہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے طبرستان کا حاکم بنا دیا۔ اس نے اپنے بھائی نعیم ابن ہبیرہ کو ایک عیسائی حلوان کے ہاتھ تحریری پیغام بھیجا کہ میں نے معاویہ سے تمہارے بارے میں بات چیت کی ہے انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم یہاں چلے آؤ گے تو تمہیں کوئی نہ کوئی عہدہ دے دیا جائے گا لہذا فوراً پہنچو۔ مالک ابن کعب ارحبی نے یہ خط پکڑ لیا اور اس عیسائی کو حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے اس غداری کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جب اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے قبیلہ بنی تغلب کو حلوان کے مارے جانے کا علم ہوا تو انہوں نے مصقلہ کو گھیر لیا اور کہا کہ تم اس کی موت کا باعث ہوئے ہو اسے زندہ کر دو یا اس کی دیت دو۔ اس نے دیت ادا کر کے چھٹکارا حاصل کیا۔

خریت کے علاوہ اور چند جتھے مختلف اوقات میں تخریبی کاروائیوں کے لئے کھڑے ہوئے مگر عراقی دستوں نے انہیں شکست دے کر پراگندہ و منتشر کر دیا۔

ربیع الثانی ۳۸ھ میں اشرس ابن عوف شیبانی نے مقام دسکرہ میں علم بغاوت بلند کیا اور دو سو کی جمعیت کے ساتھ انبار کا رُخ کیا۔ امیرالمومنین نے ابرش ابن حسان کو تین سو کے لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا جس نے آگے بڑھ کر خوارج کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا۔ اشرس مارا گیا اور اس کی جماعت کے بچے کھچے لوگ منتشر ہو گئے۔

جمادی الاولیٰ ۳۸ھ میں ہلال ابن علقمہ اور اس کے بھائی مجاہد نے دو سو کی جمیعت کے ساتھ خروج کیا امیرالمومنین نے ان کے تعاقب میں معقل ابن قیس کو روانہ کیا جنہوں نے مقام ماسبذان میں خونریز جنگ لڑ کر ہلال اور مجاہد اور ان کے ہمراہیوں کو قتل کر کے شورش کو کچل دیا۔

جمادی الآخرہ ۳۸ھ میں اشہب ابن بشر نے ایک سو اسی آدمیوں کے ساتھ خروج کیا پہلے ماسبذان میں آیا جہاں ہلال ابن علقمہ اور اس کے ساتھی مارے گئے تھے اس نے مقتولین کی میتوں پر نماز جنازہ پڑھی اور جتنی لاشوں کو دفن کر سکتا تھا انہیں دفن کیا پھر فتنہ و شورش کے لئے نکل کھڑا ہوا امیرالمومنین نے اس کے مقابلہ کے لئے جاریہ بن قدامہ کو بھیجا جنہوں نے جوخی کے اطراف میں مقام جرجرایا میں انہیں جا لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تلواریں سونت لیں جنگ کی شعلے بھڑک اٹھے اور اشہب اور اس کے تمام ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

ماہ رجب ۳۸ھ میں سعید ابن قفل تیمی نے بندنیجین میں علم بغاوت بلند کیا اور دو سو کی جمیعت کے ساتھ مقام درزنجان میں مار دھاڑ کرتا ہوا آیا۔ حاکم مدائن سعد ابن مسعود نے اس کا مقابلہ کیا اور سب کو تہ تیغ کر دیا۔

ماہ رمضان ۳۸ھ میں ابو مریم سعدی تیمی نے شہر زور میں خروج کیا اس کے ہمراہ دو سو یا چار سو آدمی تھے جن میں زیادہ تر غیر عرب موالی تھے اور عرب صرف چھ تھے۔ اس نے کوفہ سے پانچ فرسخ کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالا اور شہر کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے پر تولنے لگا۔ امیرالمومنین کو علم ہوا تو آپ نے ایک شخص کو اُن کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں اس خروج و بغاوت کے انجام سے ڈرا کر بیعت پر آمادہ کرے اور سمجھا بجھا کر کوفہ میں لے آئے۔ مگر انہوں نے حضرت کے سفیر کو یہ جواب دیا کہ ہم لڑنے کے لئے آئے ہیں بیعت کے لئے نہیں آئے۔ جب سفیر واپس پلٹ آیا تو آپ نے ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے سات سو کا ایک دستہ شریح ابن ہانی کی زیر قیادت بھیجا۔ ابھی یہ دستہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ خوارج نے ایک دم حملہ کر دیا یہ حملہ اتنا شدید اور ناگہانی تھا کہ شریح کے پانچ سو آدمی میدان چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور ان کے ہمراہ صرف دو سو آدمی رہ گئے جنہوں نے پاس ہی ایک آبادی میں پناہ لے لی۔ میدان چھوڑ کر جانے والوں میں کچھ تو کوفہ چلے گئے اور کچھ شریح کے پاس پلٹ آئے۔ امیرالمومنین کو فوج کے منتشر ہونے کی خبر ہوئی تو جاریہ ابن قدامہ کو خوارج کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں ڈرا دھمکا کر اطاعت پر آمادہ کریں۔ جاریہ کے عقب میں خود امیرالمومنین بھی تشریف لے آئے اور انہیں سمجھایا بجھایا اور سرکشی و بغاوت کے نتائج سے آگاہ کیا مگر ان پر کسی بات کا اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے باغیانہ موقف پر

جمے رہے۔ حضرت نے جب اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو اپنے آدمیوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تلواریں نیاموں سے نکال لیں اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ خوارج کی اکثریت قتل ہو گئی صرف پچاس آدمی بچے جنہوں نے امان طلب کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ ان پچاس آدمیوں میں چالیس افراد زخمی تھے۔ جنہیں کوفہ میں لایا گیا اور ان کا علاج معالجہ کیا گیا۔ یہ خوارج کی سب سے زیادہ جری اور سرکش جماعت تھی جسے کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا۔

سقوطِ مصر

قیس ابن سعد کے حالات میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جب تک وہ مصر میں حکمران رہے انہوں نے نظم و نسق برقرار رکھا اور عثمانیوں کو شورش و ہنگامہ آرائی کا موقع نہ تھا۔ جب ان کی برطرفی کے بعد محمد ابن ابی بکر اس عہدہ پر فائز ہو کر مصر میں آئے تو وہ اٹھائیس سالہ پُرجوش نوجوان تھے انہوں نے مصر کی امارت سنبھالنے کے بعد ایک مہینہ تو خاموشی سے گزارا اور اس کے بعد خربتا کے عثمانیوں کو کہلوا بھیجا کہ وہ بیعت کر کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں اور وفادار بن کر رہیں ورنہ اس مملکت سے نکل کر کسی اور جگہ آباد ہو جائیں مگر انہوں نے نہ اپنا علاقہ خالی کرنا گوارا کیا اور نہ بیعت پر آمادہ ہوئے اور کہا کہ جب تک حالات یکسو نہیں ہوتے ہم بیعت نہیں کریں گے۔ پھر اسی پر بس نہ کی بلکہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ اور جب تحکیم کی قرارداد کا انہیں علم ہوا تو کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے اور حکومت کا نظم درہم و برہم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد نے ان کی شرانگیزیوں کو دیکھ کر یزید ابن حارث کنانی اور ابن جہمان کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں فتنہ و شر سے روکیں مگر انہوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ محمد نے پھر ابن مضاہم کلبی کو بھیجا اور وہ بھی ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ معاویہ ابن حدیج کندی جو اب تک خاموش رہا تھا فضا کو سازگار پا کر فتنہ انگیزی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور قصاص خون عثمان پر لوگوں کو ابھارنا شروع کیا اہلِ خربتا تو اس کے ساتھ تھے ہی دوسرے لوگ بھی اس کے ہمنوا ہو گئے۔ ملکی حالات بگڑ گئے نظم و نسق کا شیرازہ بکھر گیا اور محمد کے لئے اس بغاوت و بدامنی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

جب امیرالمومنین کو مصر کے انتشار و بدنظمی کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ مصر کے بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا قیس ابن سعد کا کام ہے یا مالک اشتر کا مگر قیس ابن سعد کو فیصلۂ تحکیم تک اپنے ہاں روکنا چاہتے تھے اور اس کے بعد انہیں آذربائیجان کا والی نامزد کر چکے تھے اور مالک نصیبین میں عامل تھے آخر نظرِ انتخاب مالک پر پڑی اور آپ نے انہیں تحریر کیا کہ میں نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم مقرر کیا تھا

مگر لوگوں نے ان کے خلاف بغاوت کر دی ہے وہ نوجوان اور جنگ و قتال میں نا آزمودہ کار ہے تم شبیب ابن عامر ازدی کو اپنا نائب مقرر کر کے فوراً میرے پاس پہنچو۔ مالک نے اسی وقت رختِ سفر باندھا۔ اور حضرت کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں مصر کے اوضاع سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ تم مصر پہنچ کر حکومت سنبھال لو اور حالات کا جائزہ لے کر اپنی صواب دید پر عمل کرو۔

جب معاویہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ مالک اشتر کو مصر کا عامل مقرر کر کے بھیجا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے کیونکہ وہ عمرو ابن عاص سے امارتِ مصر کا وعدہ کئے ہوئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ محمد ابن ابی بکر کو بڑی آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے مگر مالک اشتر سے نمٹنا آسان کام نہیں ہے انہوں نے چاہا کہ مالک کے مصر پہنچنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے علاقہ قلزم کے ایک باجگزار جایستار کو پیغام بھجوایا کہ:۔

ان الاشتر قد ولی مصر فان کفیتنیه لم اخذ منك خراجا مابقیت و بقیت۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳ صـ ۱۸۱)

"مالک اشتر مصر کا حاکم مقرر ہوا ہے اگر تم اُسے میرے راستے سے ہٹا دو گے تو جب تک میری اور تمہاری زندگی باقی ہے تم سے خراج نہیں لوں گا۔"

یہاں یہ سوال بالکل بیکار ہے کہ اس اقدام کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں شرعی حدود کا پاس و لحاظ کیا جاتا ہو اور جہاں جاہ و اقتدار قائم رکھنا ہی منتہائے مقصد ہو وہاں اخلاقی احکام اور شرعی اوامر کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جایستار معاویہ کے حکم کی بجا آوری کے لئے قلزم پہنچ گیا۔ جب مالک اشتر مصر جاتے ہوئے وہاں پہنچے تو اس نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا اور آدابِ میزبانی بجا لانے کے بعد شہد کا شربت پیش کیا جس میں زہر کی آمیزش تھی۔ آپ نے شربت کا جام لے کر پی لیا مگر پیتے ہی حالت غیر ہو گئی اور کرب و بے چینی کی کروٹیں بدلنے کے بعد دم توڑ دیا۔ جب معاویہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:۔

کانت لعلی یمینان قطعت احداهما بصفین۔ یعنی عمار ابن یاسر۔ وقطعت الاخریٰ الیوم۔ یعنی الاشتر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳ صـ ۱۸۱)

"علی کے دو ہاتھ تھے ایک صفین میں قطع ہو گیا۔ یعنی عمار ابن یاسر اور ایک آج قطع ہو گیا یعنی مالک اشتر۔"

جب امیرالمومنین نے مالک کی خبرِ شہادت سنی انا للہ و انا الیہ راجعون کے بعد فرمایا کہ مالک کا

کیا کہنا وہ آپ اپنی مثال تھا اللہ اس پر رحمت نازل کرے اس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور اپنے پروردگار کے حضور پہنچ گیا۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مصیبت رسول اللہ کا سانحہ ارتحال تھا اور اس کے بعد تو ہم ہر مصیبت پر صبر کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔

محمد ابن ابی بکر اپنی برطرفی سے رنجیدہ و افسردہ خاطر تھے۔ جب امیرالمومنین کو ان کی افسردگی کی خبر ہوئی تو انہیں تحریر فرمایا کہ میں نے یہ تبدیلی اس لئے نہیں کی تھی کہ تمہیں کام میں سست اور ادائے فرض میں کمزور پایا ہو۔ میں چاہتا تھا کہ تمہیں ایسی جگہ پر مقرر کروں جہاں تمہیں زحمت کم اٹھانا پڑے۔ میں نے جسے تمہاری جگہ پر والئ مصر بنا کر بھیجا تھا وہ ہمارا دوست و خیر خواہ اور دشمنوں کے لئے شمشیر قاطع تھا خدا اس پر رحمت کرے اس کی زندگی ختم ہو گئی اور وہ اس جہانِ فانی سے جوارِ پروردگار میں پہنچ گیا۔ ہم اس سے راضی تھے خدا اس سے راضی و خوشنود ہو۔ تم دشمن کے ریلے کو روکنے کے لئے تیار رہو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ محمد نے جواب میں لکھا کہ میں آپ کی خوشنودئ خاطر کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا ہوں آپ جو حکم دیں گے میں بسر و چشم اس پر عمل کروں گا اور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ دشمن سے لڑوں گا۔

معاویہ نے مالک کا رشتہ حیات قطع کرنے کے بعد اپنے مشیران کار عمرو ابن عاص حبیب ابن مسلمہ بسر ابن ابی ارطاۃ، ضحاک ابن قیس، عبدالرحمٰن ابن خالد، ابوالاعور سلمی اور شرجیل ابن سمط کندی کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس مقصد کے لئے تمہیں طلب کیا ہے انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ ہی جانیں کہ کیوں بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اس وقت بلانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ آپ مصر کے بارے میں ہماری رائے دریافت کریں۔ معاویہ نے کہا کہ ہاں اسی مقصد کے لئے بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ ہماری رائے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مصر کی فتح ہو گیا تو آپ کا اور ہم سب کا وقار بڑھ جائے گا اور ہم اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سرنگوں کر کے اپنا پرچم بلند کر سکیں گے۔ معاویہ نے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے سب نے کہا کہ ہمیں عمرو ابن عاص کی رائے سے اتفاق ہے۔ معاویہ نے کہا کہ مصر میں ہمارے دوست و ہمنوا موجود ہیں۔ انہیں طمع و لالچ دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ اور مخالفوں کو ڈرا دھمکا کر پست حوصلہ کر دینا چاہیئے تاکہ وہ لڑنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں اور کیا اچھا ہو کہ یہ مرحلہ جنگ کے بغیر سر ہو جائے۔ عمرو نے کہا کہ جنگ ناگزیر ہے اور اس کے علاوہ کامیابی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اس گفت و شنید کے بعد معاویہ نے مسلمہ ابن مخلد انصاری اور معاویہ ابن حدیج سکونی کے نام ایک خط لکھ کر اپنے غلام سبیع کو دیا اور اسے مصر روانہ کیا۔ اس خط میں ان دونوں کی کوششوں کو سراہتے

ہوئے انہیں مزید سرگرم عمل ہونے کی تاکید کی اور انہیں حکومت میں شریک کیے جانے کا لالچ دیا۔ مسلمہ ابن مخلد نے اپنی طرف سے اور ابن حدیج کی طرف سے جواب دیا کہ ہم عاقبت سنوارنے کے لئے یہ قدم اٹھانا چاہتے ہیں ہمیں نہ منصب کی ضرورت ہے اور نہ اقتدار کی۔ تم سواروں اور پیادوں کے لشکر جلد بھیج دو۔ ہمارے مخالف ہمت ہارے بیٹھے ہیں اگر مدد پہنچ گئی۔ تو اللہ ہمیں فتح دے گا۔ معاویہ کو یہ خط فلسطین میں ملا اس نے وہیں سے چھ ہزار کا لشکر عمرو ابن عاص کی قیادت میں مصر روانہ کر دیا۔ جب عمرو سرزمین مصر کے قریب پہنچا تو مصر کے عثمانی بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عمرو نے معاویہ کا ایک خط جو محمد ابن ابی بکر کے نام تھا انہیں بھیجا جس میں تحریر تھا کہ تم عثمان کے گرد گھیرا ڈالنے والوں میں شامل تھے تمہیں اس جرم کی پاداش میں سزا دی جائے گی اور خود عمرو نے بھی انہیں تحریر کیا کہ مصر کا علاقہ تمہارے خلاف ہو چکا ہے اور کوئی شخص بھی تمہارا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے لہذا تم اپنی جان بچاؤ اور سرزمین مصر سے نکل جاؤ۔ محمد نے یہ دونوں تحریریں امیرالمومنین کو بھجوا دیں اور انہیں لکھا کہ عمرو ابن عاص مصر کے باہر چھاؤنی ڈالے پڑا ہے میں اپنے آدمیوں میں ولولہ و جوش نہیں پاتا لہذا آپ فوراً کمک روانہ کریں تاکہ دشمن کی فوج سے مقابلہ کیا جا سکے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ تم جتنی فوج مہیا کر سکتے ہو مہیا کرو اور اسے تسلی دو کہ وہ صبر و استقلال سے ثابت قدم رہے میں یہاں سے فوج مرتب کر کے بھیجا چاہتا ہوں۔ محمد ابن ابی بکر نے چار ہزار کی فوج جمع کی اور اسے دو حصوں پر تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ پر کنانہ ابن بشر کو افسر مقرر کر کے آگے روانہ کیا اور ایک حصہ اپنی کمان میں رکھا۔ جب کنانہ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھے تو عمرو نے ان کے مقابلہ کے لئے ایک کے بعد دوسرا دستہ بھیجنا شروع کیا مگر جو دستہ آگے بڑھتا کنانہ اس کا راستہ روک کر اُسے پیچھے ڈھکیل دیتے۔ آخر عمرو نے چھ ہزار کی فوج کو ناکافی سمجھتے ہوئے معاویہ ابن حدیج سے کمک طلب کی۔ ابن حدیج اپنے آدمیوں کو لے کر آیا اور شامیوں کے ساتھ مل کر کنانہ اور اس کے لشکر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جب کنانہ نے دیکھا کہ ان کی فوج گھیرے میں آ چکی ہے تو وہ گھوڑے سے نیچے اُتر آئے۔ اور اُن کے ساتھی بھی پیادہ ہو گئے اور تلواریں لے کر دشمن کی طرف لپکے مگر حصار توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ محمد نے کنانہ کی فوج کو محاصرہ میں دیکھا تو لشکر کو لے کر آگے بڑھے تاکہ حصار کو توڑ کر اپنے ساتھیوں کو نکال لے جائیں مگر محمد کے ساتھیوں نے کنانہ کی فوج کا حشر دیکھا تو اُن کا ساتھ چھوڑ کر چل دیئے۔ ادھر محاصرہ میں گھری ہوئی فوج پر دشمن نے یکبارگی حملہ کر کے سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اب محمد کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ چھپ چھپا کر کہیں نکل جائیں اور اپنی جان بچائیں۔ چنانچہ وہ نکل کھڑے ہوئے اور ایک خرابے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ معاویہ ابن حدیج کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمد بچ کر نکل گئے

ہیں تو وُہ خود تلاش کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ایک مقام پر چند آدمیوں کو دیکھا تو ان سے پوچھا کہ تم نے ادھر
سے کسی کو گزرتے دیکھا ہے اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں نے ایک شخص کو اس خرابے میں دیکھا ہے۔ ابن
حدیج نے کہا کہ پھر وہی ہو گا۔ چنانچہ اُس نے خرابے میں جھانک کر دیکھا تو وُہ محمد ہی تھے انہیں کشاں کشاں
باہر نکالا اور جکڑ باندھ کر اپنے ساتھ لے لیا۔ جب عبدالرحمٰن ابن ابی بکر کو جو شامیوں کی سپاہ میں شامل تھا
محمد کی گرفتاری کا علم ہوا تو اس نے عمرو ابن عاص سے کہا کہ تم ابن حدیج کو مجبور کرو کہ وہ میرے بھائی کو قتل
نہ کرے۔ عمرو نے ابن حدیج کو پیغام بھجوایا کہ محمد کو میرے پاس بھیج دو۔ ابن حدیج نے کہا کہ تم لوگوں نے میرے
ابن عم کنانہ ابن بشر کو تو بے دریغ قتل کر دیا ہے اور محمد کو بچا لے جانا چاہتے ہو اب وہ میرے ہاتھ سے
بچ نہیں سکتا۔ محمد نے موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا تو کہا کہ میں بہت پیاسا ہوں مجھے تھوڑا سا پانی
پلا دو۔ ابن حدیج نے پانی پلانے سے انکار کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے عثمان کو پیاسا مارا تھا۔ خدا مجھے سیراب
نہ کرے۔ اگر میں تمہیں ایک قطرہ پانی دوں۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ اور اللہ تمہیں جہنم کے کھولتے
ہوئے پانی اور پیپ سے سیراب کرے گا۔ محمد نے کہا کہ اے یہودیہ کے بیٹے یہ نہ تیرے بس کی بات ہے اور
نہ عثمان کے بس کی اللہ اپنے دوستوں کو سیراب کرے گا اور تجھ ایسے لوگوں کو پیاسا ہی رکھے گا۔ خدا کی
قسم اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو تیری یہ جرأت نہ تھی کہ مجھے اس آسانی سے گرفتار کر لیتا۔ ابن حدیج
نے کہا کہ اب تو تم میرے قبضہ میں ہو میں پہلے تمہیں قتل کروں گا اور پھر تمہاری لاش گدھے کے پیٹ میں
رکھ کر جلا دوں گا۔ محمد نے کہا کہ اگر تُو نے ایسا کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہو گی تم لوگ ہمیشہ سے دوستانِ خدا
کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے چلے آئے ہو۔ میں اللہ سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گا جس
طرح ابراہیم خلیل اللہ پر ٹھنڈا کیا تھا اور تیرے دوست معاویہ اور عمرو ابن عاص کو جہنم کی دہکتی ہوئی
آگ میں جھونکے گا اور جب اس کی آنچ مدہم ہونے لگے گی تو اسے اور بھڑکا دے گا۔ اس پر ابن خدیج
نے غضبناک ہو کر تلوار ماری اور محمد خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ ابھی رمقِ جان باقی تھی کہ انہیں مردہ گدھے
کے پیٹ میں رکھ کر جلا دیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ کو محمد کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو وہ بے ساختہ
رونے لگیں اور مرتے دم تک ہر نماز کے بعد ان کے قاتلوں پر نفرین کرتیں۔

امیرالمومنین نے محمد کے کمک طلب کرنے پر انہیں تحریر کیا تھا کہ میں فوجی دستوں کی روانگی کا سر و سامان
کر رہا ہوں۔ چنانچہ جب عبداللہ ابن قعین اور کعب ابن عبداللہ محمد کا پیغام لے کر آئے تو آپ نے اہلِ
کوفہ کو مصر جانے کے لئے کہا اور فرمایا کہ وُہ کل کوفہ و حیرہ کے درمیان مقام جرعہ میں جمع ہو جائیں۔ دوسرے
دن امیرالمومنین خود بھی وہاں پہنچ گئے اور صبح سے دوپہر تک منتظر رہے مگر اس عرصہ میں آنے والوں کی تعداد

ایک سو تک بھی نہ پہنچ سکی۔ حضرت بددل ہو کر واپس پلٹ آئے اور شب کو اعیان و اشراف کوفہ کو جمع کر کے فرمایا کہ میں تمہیں کوئی حکم دیتا ہوں کہ تم منہ پھیر لیتے ہو۔ اب تو تمہاری صحبت سے بیزار ہو چکا ہوں۔ نہ تمہارے اندر ملی حمیت ہے نہ دینی جذبہ۔ معاویہ لوگوں کو پکارتا ہے تو لوگ اندھا دھند اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور میں تمہیں پکارتا ہوں تو تمہاری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں حالانکہ تم دانا و ہوشمند ہو۔ کعب ابن مالک ارحبی نے کہا کہ یا امیر المومنین میں اس مہم پر جانے کے لئے حاضر ہوں اور اہل کوفہ سے کہا کہ اے لوگو اللہ سے ڈرو اپنے امام کی آواز پر لبیک کہو اور دشمن سے لڑنے کے لئے نکل کھڑے ہو۔ جب کعب اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہوئے تو حضرت نے اپنے غلام سعد کو حکم دیا کہ وہ اعلان عام کرے کہ تمام لوگ کعب کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں اور فوراً محمد کی مدد کے لئے پہنچیں مگر ان لوگوں نے ایک مہینہ جمع ہونے میں گزار دیا اور جب کعب دو ہزار کا لشکر لے کر مصر روانہ ہوئے تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے اُمید نہیں کہ تم بروقت پہنچ سکو اور کسی کام آسکو۔

اس لشکر کو روانہ ہوئے دو چار دن ہوئے تھے کہ حجاج ابن غزیہ انصاری جو محمد ابن ابی بکر کے لشکر میں شامل تھے بچ بچا کر کوفہ آئے اور مصر کے سقوط اور محمد بن ابی بکر کے قتل کی خبر دی اور عبدالرحمن ابن شبیب فزاری نے شام سے پلٹ کر بتایا کہ میں نے اہل شام کو اتنا خوش ہوتے کبھی نہیں دیکھا جتنا فتح مصر اور محمد کے قتل پر خوش ہوتے دیکھا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ جتنی انہیں محمد کے مارے جانے پر خوشی ہوئی ہے ہمیں اس سے کئی گنا زائد رنج ہوا ہے۔ حضرت کو رنجیدہ و غمناک دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یا امیر المومنین آپ ان کے مارے جانے پر اتنے غمگین کیوں ہیں۔ فرمایا:۔

ما یمنعنی انہ کان لی ربیبا و	کیوں رنجیدہ نہ ہوں وہ میرا پروردہ میرے بیٹوں
کان لبنی اخا و کنت لہ والدا	کا بھائی اور میں اس کا باپ تھا اور اسے اپنا
اعدہ ولدا۔ (شرح ابن ابی الحدید	بیٹا شمار کرتا تھا۔"

ج ۶ ص ۳۰۲)

اب مصر جانے والے لشکر کا کوئی مصرف نہ رہا۔ حضرت نے عبدالرحمن ابن شریح کو کعب ابن مالک کے عقب میں روانہ کیا کہ وہ لشکر سمیت واپس پلٹ آئیں۔ چنانچہ وہ واپس آ گئے اور مصر پر معاویہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

معاویہ جہاں شام پر اپنا تسلط و اقتدار برقرار رکھنا چاہتے تھے وہاں مصر پر بھی قبضہ کرنا چاہتے تھے اور اسی بناء پر انہوں نے عمرو ابن عاص سے امارت مصر کا وعدہ کیا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک طرف

سے اہلِ مصر اور دوسری طرف سے اہلِ عراق ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو شام کا علاقہ چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ جائے گا اس لئے شام کا تحفظ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مصر کو اپنی مقبوضہ میں شامل نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ مصر ایک شاداب و زرخیز علاقہ تھا اور وہاں کے خراج کی آمدنی بھی اور صوبوں سے زیادہ تھی۔ معاویہ کی نظر اس کے خراج پر ہو یا نہ ہو مگر وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ حضرت علی کو اس آمدنی سے محروم کر کے مالی طاقت کے لحاظ سے کمزور کر دیں تاکہ وہ کسی وقت اس مادی طاقت کا سہارا لے کر اُن کے خلاف فوجی کاروائی نہ کر سکیں۔

مصر کی صورت حال یہ تھی کہ وہاں اگرچہ حضرت عثمان کے حامی بھی تھے مگر وہ زیادہ سے زیادہ دس ہزار تھے جو ایک بستی خربتا میں آباد تھے اور عمومی طور پر اہلِ مصر حضرت عثمان کے حامیوں کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ محمد ابن حذیفہ کی تحریک پر سب سے بڑی جماعت یہیں سے کھڑی ہوئی جس نے حضرت عثمان کے گرد گھیرا ڈالا تھا۔ ان حالات میں سقوطِ مصر کمزور قیادت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور معاویہ نے مصر پر حملہ آور ہونے سے پہلے اس قیادت ہی کو کمزور کرنے کی تدبیریں کیں اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کوئی حیلہ و حربہ اٹھا نہ رکھا۔ چنانچہ محمد ابن حذیفہ کو جو عبداللہ ابن ابی سرح کو امارت مصر سے الگ کر کے مصر پر قابض ہو گئے تھے دھوکا دے کر قتل کر دیا۔ پھر قیس ابن سعد کو حکومت کا لالچ دے کر اپنا ہمنوا بنانا چاہا اور جب وہ ان باتوں میں نہ آئے تو ان کی طرف سے جعلی خطوط بنا ڈالے اور اس طرح دام فریب بچھا کر مصر سے اُن کی برطرفی کا ساماں کیا۔ اور پھر تمام اخلاقی و شرعی حدود توڑ کر مالک اشترؒ ایسے جلیل القدر بزرگ کا زہر سے خاتمہ کروایا تاکہ مصر کو مضبوط قیادت میسر نہ آسکے۔

محمد ابن ابی بکر اگرچہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے مگر انہوں نے جنگی تدابیر کو بروئے کار لانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ انہوں نے نصف فوج دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے آگے بھیج دی اور نصف فوج اپنے ہمراہ رکھی کہ اگر دشمن پیش قدمی میں کامیاب ہو جائے تو ایک دستہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود رہے اور جب آپ کے ہمراہیوں ہی نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تو پھر کوئی گوشہ ڈھونڈنے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔ اس شکست کا ذمہ بلاشبہ جہاں محمد کے ہمراہیوں کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ وہاں اہلِ کوفہ کے کردار کی کمزوری بھی اس کا ایک اہم سبب ہے۔ اگر وہ بروقت پہنچ جاتے تو پھر نتیجہ اس سے مختلف ہوتا۔

بصرہ میں ابن عامر کی آمد

جب معاویہ نے مصر پر قبضہ و اقتدار حاصل کر لیا تو چاہا کہ بصرہ پر تاخت و تاراج کر کے اسے بھی اپنے مقبوضہ علاقوں میں شامل کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ ابن عامر حضرمی کو بلا کر کہا کہ بصرہ والوں میں ابھی تک خونِ عثمان کے قصاص کا جذبہ موجود ہے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی آگے بڑھے اور وہ اس کے ساتھ ہو کر قاتلانِ عثمان سے جنگ کریں۔ میں اُن کی قیادت کے لئے تمہیں موزوں سمجھتا ہوں لہذا تم بصرہ جاؤ اور بنی تمیم کے ہاں قیام کرو۔ لیکن قبیلہ ربیعہ سے چوکنا اور ہوشیار رہنا کیونکہ وہ ترابیہ یعنی شیعیانِ ابو تراب ہیں ابن عامر نے اس پر خندہ پیشانی سے اظہارِ آمادگی کیا۔ معاویہ نے اسے آمادہ پایا تو عمرو ابن عاص کو تحریر کیا کہ میں ابن عامر کو بصرہ بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ وہ تحریکِ قصاص کو پھر سے زندہ کرے تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ عمرو نے اس رائے سے اتفاق کیا اور معاویہ نے ابن عامر کو بصرہ روانہ کر دیا۔

جب ابن عامر بصرہ میں وارد ہوا تو حسب ہدایت بنی تمیم کے ہاں جا کر ٹھہرا۔ اہلِ بصرہ کی ایک جمعیت بھی اس کے گرد جمع ہو گئی جس میں زیادہ تر اس کے ہم خیال لوگ تھے۔ اس نے ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور اس کی ذمہ داری علی پر عائد ہوتی ہے۔ تم نے عثمان کے قصاص کے سلسلہ میں تعاون کیا تھا خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے۔ تمہارے ہاں کے چیدہ و برگزیدہ افراد قصاص طلب کرتے ہوئے مارے گئے۔ اٹھو اور اپنے قاتلوں سے انتقام لو ہم ہر حالت میں تمہاری مدد کے لئے موجود رہیں گے۔ ضحاک ابن عبداللہ نے یہ سُنا تو ابن عامر سے کہا کہ خدا تمہارا بُرا کرے تم پھر سوئے ہوئے فتنہ کو جگانے کے لئے آ گئے ہو۔ یہی فتنہ تو طلحہ و زبیر نے کھڑا کیا تھا۔ اور ہمیں امیرالمومنین کے خلاف بھڑکایا تھا حالانکہ ہم ان کی بیعت کر چکے تھے ہم سب یکدل و یک آواز تھے مگر ان دونوں نے یہاں پہنچ کر گھر گھر میں پھوٹ ڈلوادی اور ہمیں آپس میں لڑوا دیا۔ ہم ابھی تک اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں کہ تم پھر اسی ہلاکت و تباہی کا پیغام لے کر آ پہنچے ہو۔ ہم اس مردِ صالح کی بیعت کر چکے ہیں۔ جس نے ہماری خطاؤں سے چشم پوشی کی مجرموں سے درگزر کیا اور دشمنوں تک کو معاف کر دیا۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تلواریں لے کر میدان میں اُتر آئیں اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹیں تاکہ تمہیں معاویہ کے دورِ اقتدار میں کوئی عہدہ مل جائے۔ خدا کی قسم علی کا ایک دن معاویہ و آلِ معاویہ کی صد سالہ زندگیوں سے بہتر ہے۔ اس پر عبداللہ ابن خازم سلمی نے کہا کہ خاموش رہو تم اس کے اہل نہیں ہو کہ ان امور

میں دخل دو۔ اور ابن عامر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہم تمہارے یاور و انصار ہیں اور قصاص کے سلسلہ میں پُورا پُورا تعاون کریں گے۔ ضحاک نے کہا کہ اے زن حبشیہ کے بیٹے تم ہو کیا اور تمہاری بساط کیا ہے۔ خدا کی قسم جس کا تم ایسا حمایتی ہو وہ بے یار و مددگار ہے اور جس کا تم ایسا مخالف ہو اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر دونوں آپس میں اُلجھ پڑے اور گالم گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ عبدالرحمٰن ابن عمیر تیمی نے کہا کہ ہم اس لئے جمع نہیں ہوئے کہ آپس میں لڑیں جھگڑیں ہمیں اپنے اندر اتفاق و یکجہتی پیدا کرنا چاہیئے۔ میری رائے یہ ہے کہ پہلے امیر شام کا تحریری پیغام سنو اور اگر وُہ مفید مطلب ہو تو اس پر عمل کرو چنانچہ معاویہ کا خط پڑھا گیا جس میں تحریر تھا کہ اے اہل بصرہ تم نے عثمان ابن عفان کے طرز عمل کو دیکھا بھالا ہے وہ امن کوش عافیت پسند مظلوم کے حامی اور کمزور کی سپر تھے۔ چند ظالموں نے انہیں گھیرے میں لے کر بھوکا پیاسا ذبح کر ڈالا ہم تمہیں اس خون ناحق کے قصاص کی دعوت دیتے ہیں اور اس امر کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلے کتاب و سنت کی روشنی میں کریں گے اور سال میں دُو مرتبہ معیّنہ وظائف ادا کیئے جائیں گے۔ جب یہ خط پڑھا جا چکا تو حاضرین میں سے اکثر لوگوں نے اس کی تائید کی اور نصرت و حمایت کا یقین دلایا۔ احنف ابن قیس خاموش بیٹھے رہے اور کہا کہ ہمیں ان باتوں سے کوئی مطلب و سروکار نہیں ہے۔ البتہ قبیلۂ عبدالقیس کے ایک فرد عمرو ابن مرحوم نے کہا کہ اے لوگو تم اپنی سابقہ بیعت پر باقی رہو اور بیعت شکنی کر کے جماعت میں انتشار و افتراق پیدا نہ کرو۔ اگر تم بیعت توڑ کر اس شخص کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہُوئے تو یاد رکھو کہ ہلاکت و تباہی سے دوچار ہُوئے بغیر نہیں رہو گے۔ عباس ابن صحار عبدی جو اپنے قبیلہ عبدالقیس کی روش کے برخلاف امیرالمومنین سے پرخاش رکھتا تھا کہنے لگا کہ ہم قولاً اور عملاً اس کا ساتھ دیں گے اور نصرت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے۔ مثنیٰ ابن مخزبہ عبدی نے یہ سُنا تو ابن عامر سے کہا کہ تم ابن صحار کی باتوں میں نہ آ جانا۔ بہتر ہے کہ تم جدھر سے آئے ہو اُدھر واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تلواروں تیروں اور نیزوں سے تمہیں واپس پلٹ جانے پر مجبور کر دیں گے۔ کیا ہم ابن عم رسول کی اطاعت سے منہ موڑ کر ایک باغی و طاغی کی بیعت کریں۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو گا۔ ابن عامر نے جب اپنے مخالفین کی باتیں سنیں تو خطرہ کے پیش نظر صبرہ ابن شیمان ازدی سے کہا کہ اے صبرہ تم بھی تو ہمارے ہمخیال ہو اور عرب کی عظیم شخصیت اور اپنے قبیلہ کے سردار ہو میری مدد کرو اور پناہ دینے کا وعدہ کرو۔ صبرہ نے کہا کہ اگر تم بنی تمیم کے ہاں سے اُٹھ کر ہمارے ہاں چلے آؤ اور میرے گھر میں ٹھہرو تو ہم مدد بھی کریں گے اور پناہ بھی دیں گے۔ کہا کہ ہمیں یہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبرہ نے یہ سنا تو پیشانی پر بل ڈال کر چل دیا۔

بصرہ کے حاکم عبداللہ ابن عباس تھے مگر وُہ محمد ابن ابی بکر کی تعزیت کے سلسلہ میں کوفہ جاچکے تھے اور بصرہ کی امارت زیاد ابن عبید کے سپرد کر گئے تھے۔ زیاد، ابن عامر کی آمد پر ہراساں ہوگیا۔ کیونکہ بنی تمیم اور دوسرے قصاص طلب اس کی پشت پر تھے۔ اس نے حضین ابن منذر اور مالک ابن مسمع کو دارالامارہ میں بلوایا اور اُن سے کہا کہ اے گروہ بکر ابن وائل تم امیرالمومنین کے حامیوں میں شمار ہوتے ہو میں دشمن کی چیرہ دستی و فتنہ انگیزی سے مامون نہیں ہوں۔ جب تک امیرالمومنین کی طرف سے کوئی حکم نہیں آتا مجھے اپنے ہاں پناہ دو۔ حضین ابن منذر نے کہا کہ تم پناہ کے طالب ہو تو میں تمہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہوں مگر مالک نے کہا کہ میں اپنے آدمیوں سے پوچھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب زیاد نے مالک کو پناہ دینے سے پہلو بچاتے دیکھا تو اپنا ارادہ بدل دیا اور صبرہ ابن شیمان ازدی کو کہلوا بھیجا کہ مجھے پناہ دو اور بیت المال کی حفاظت کا انتظام کرو۔ صبرہ نے کہا کہ تم ہمارے ہاں چلے آؤ اور بیت المال بھی یہاں منتقل کردو ہم تمہیں بھی پناہ دیں گے اور بیت المال کی بھی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ زیاد راتوں رات ان کے ہاں چلا گیا اور بیت المال اور منبر بھی ادھر منتقل کر دیا۔

جب زیاد کے جانے کے بعد دارالامارہ خالی ہوگیا تو بنی تمیم اور ان کے ہمنواؤں نے چاہا کہ ابن عامر کو دارالامارہ میں لے جاکر اتاریں۔ چنانچہ بنی تمیم ابن عامر کو لے کر دارالامارہ کی طرف بڑھے۔ بنی ازد نے دیکھا تو وہ بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر آگئے اور کہا کہ ہم ایک ناپسندیدہ شخصیت کو دارالامارہ میں اترنے نہیں دیں گے۔ جب ادھر سے اصرار بڑھا اور تصادم کا خطرہ پیدا ہُوا تو احنف ابن قیس بیچ میں پڑے اور ابن عامر کے ہمراہیوں سے کہا کہ دارالامارہ پر تمہارا حق دوسروں سے فائق نہیں ہے اور نہ تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ دوسروں پر ایک ایسے شخص کو مسلط کرو جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔ احنف کے کہنے سننے سے وہ لوگ واپس پلٹ گئے اور بنی ازد نے بھی اپنے گھروں کی راہ لی۔

زیاد نے عبداللہ ابن عباس کو تحریر کیا کہ معاویہ کی طرف سے ابن عامر حضرمی یہاں وارد ہُوا ہے اور بنی تمیم کے ہاں مقیم ہے اس نے لوگوں کو خونِ عثمان کے قصاص پر اُبھارا ہے اور اکثر اہل بصرہ اس کے ساتھ ہوگئے ہیں۔ میں نے صبرہ ابن شیمان ازدی کے ہاں پناہ لے لی ہے اور بیت المال بھی بنی ازد کے ہاں منتقل کر دیا ہے۔ شیعیان امیرالمومنین کا میرے ہاں آنا جانا ہے۔ شیعیان عثمان، ابن عامر کے ہاں جمع ہیں اور دارالامارہ خالی پڑا ہے۔ آپ امیرالمومنین سے صورتِ حال بیان کریں اور وُہ جو حکم دیں اس سے مجھے آگاہ کریں۔

زیاد بنی ازد کے ہاں پہنچ کر ایک دن تو چھپا رہا اور شائد کچھ اور دن چھپا رہتا لیکن بنی ازد

نے کہا کہ اب چھلنے سے کام نہیں چلے گا تمہیں نماز جمعہ بھی پڑھانا ہوگی اور خطبہ دینا ہوگا۔ چنانچہ زیاد نے نماز جمعہ کھلے بندوں پڑھائی اور خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر میں بنی تمیم کے ہاں پناہ لیتا اور ابن عامر تمہارے زیر حمایت ہوتا تو میں ابن عامر پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اور جب کہ میں تمہاری پناہ میں ہوں۔ ابن عامر مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا اور نہ ہند جگر خوارہ کا بیٹا معاویہ امیرالمومنین اور انصار و مہاجرین پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اے بنی ازد میں نے جمل کے موقع پر تمہاری دلیری و شجاعت دیکھی ہے اگر اس دن باطل کی حمایت میں صبر و ثبات دکھایا تھا تو آج حق کی حمایت میں جرأت و پامردی کے جوہر دکھاؤ۔ اس پر صبرہ کے باپ شیمان نے کہا کہ اے گروہ بنی ازد جنگ جمل کے نتیجہ میں تمہیں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اگر میں اس موقع پر موجود ہوتا تو تمہیں کبھی لڑنے کی اجازت نہ دیتا۔ اگر تم کل علی کے خلاف تھے تو آج ان کی حمایت کر کے خلاف ورزی کے بدنما دھبوں کو دھو ڈالو۔ اگر بنی تمیم اپنے سردار کو لے کر میدان میں آئیں تو تم بھی اپنے سردار کو لے کر مقابلہ کرو اگر وہ معاویہ سے کمک مانگیں تو تم بھی علی سے مدد طلب کرو اگر وہ مصالحت چاہیں تو تم بھی مصالحت پر آمادہ ہو جاؤ۔ پھر اس کا بیٹا صبرہ کھڑا ہوا اور کہا کہ ہمیں علی سے اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا معاویہ سے خطرہ ہے۔ لہٰذا اب شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہو اور پناہ دہی کا حق ادا کر دو۔ بنی ازد نے کہا کہ ہم تمہارے تابع فرمان ہیں ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے۔ زیاد نے کہا کہ اے صبرہ تمہیں یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ تم بنی تمیم کا مقابلہ نہ کر سکو گے کہا کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر وہ احنف کو لے کر آئیں گے تو ہم اس کے مقابلہ میں ابو صبرہ کو پیش کریں گے۔ اگر وہ حبات کو لائیں گے تو میں اس سے دو دو ہاتھ کروں گا اور اگر وہ جوانوں کو لے کر آئیں گے تو ہمارے ہاں بھی جوانمردوں کی کمی نہیں ہے۔ بنی تمیم نے جب دیکھا کہ بنی ازد زیاد کے پشت پناہ بن کر لڑنے کے لئے آمادہ ہیں تو انہیں پیغام بھجوایا کہ ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں ہے تم زیاد کو باہر نکالو اور ہم ابن عامر کو باہر نکالتے ہیں تاکہ وہ دونوں آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ہم ان میں سے جو غالب ہوگا اس کی اطاعت تسلیم کر لیں گے۔ ابو صبرہ نے جواب میں کہا کہ یہ مطالبہ اس صورت میں تو مانا جا سکتا تھا۔ جب ہم نے زیاد کو پناہ نہ دی ہوتی اور اب تو انہیں مقابلہ کے لئے باہر نکالنا اور قتل کر ڈالنا دونوں برابر ہیں۔

جب امیرالمومنین بصرہ کے بگڑے ہوئے حالات پر مطلع ہوئے تو آپ نے کوفہ کے بنی تمیم سے کہا کہ وہ بصرہ جا کر اپنے قوم و قبیلہ کے لوگوں کو سمجھائیں اور انہیں فتنہ و شرانگیزی سے روکیں مگر کوئی جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں اپنے قبیلہ کے مقابلہ میں جانے سے کیا امر مانع ہے آخر وہ لوگ بھی

مسلمان تھے جو رسول اللہ کے ساتھ ہو کر اپنے باپ بیٹوں بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے تم اپنے بھائیوں کو نیکی و ہدایت کی دعوت دو اگر وہ ہدایت سے روگردانی کریں تو ان سے جنگ کرو۔ اس پر اعین ابن ضبیعہ تمیمی کھڑے ہوئے اور کہا کہ یا امیرالمومنین میں اس کام کے لئے حاضر ہوں یا تو ابن عامر کو قتل کر کے اس قصہ کو ختم کر دوں گا یا اسے حدود بصرہ سے نکال باہر کروں گا۔ حضرت نے انہیں بصرہ روانہ کیا اور زیاد کو لکھا کہ میں اعین ابن ضبیعہ کو بھیج رہا ہوں تاکہ وہ اپنی قوم کے بپھروں کو سمجھا بجھا کر منتشر کریں اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو ہم یہی چاہتے ہیں اور اگر بنی تمیم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں تو پھر تم اپنے آدمیوں کو لے کر ان سرکشوں اور باغیوں سے جہاد کرو اگر تمہیں غلبہ حاصل ہو تو بہتر اور اگر غلبہ کے آثار نظر نہ آئیں تو انہیں ڈھیل دیتے جاؤ یہاں تک کہ لشکر اسلام انہیں کچلنے کے لئے پہنچ جائے۔ جب ابن ضبیعہ بصرہ میں وارد ہوئے تو بنی ازد کے ہاں پہنچ کر زیاد کو امیرالمومنین کا خط دیا۔ اور کہا کہ مجھے توقع ہے کہ انشاءاللہ حالات رو باصلاح ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بنی تمیم کو جمع کر کے ان سے کہا کہ اے میری قوم کی فردو تم ان شورش پسندوں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ ہو کر کیوں اپنی جانیں تلف کرتے ہو۔ خدا کی قسم تمہاری سرکوبی کے لئے لشکر ترتیب دیا جا چکا ہے اگر تم سیدھی راہ پر آ جاؤ گے تو وہ لشکر آگے نہیں بڑھے گا اور اگر تم بغاوت و سرکشی پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ تمہاری ہلاکت و تباہی یقینی ہے۔ ابن ضبیعہ دن بھر انہیں سمجھاتے بجھاتے اور بیعت شکنی کے تباہ کن نتائج سے ڈراتے رہے۔ آخر ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات مانتے ہیں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کریں گے۔ جب ابن ضبیعہ مطمئن ہو کر شام کے وقت اپنی منزل کی طرف پلٹے تو دس آدمی اُن کے پیچھے لگ گئے۔ ابھی وُہ راستے میں تھے کہ وہ تلواریں لے کر اُن پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہا مگر ان لوگوں نے انہیں پکڑ کر بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا۔

زیاد نے ابن ضبیعہ کی مخلصانہ سعی اور اُن کے مارے جانے کی اطلاع امیرالمومنین کو دی۔ حضرت نے جاریہ ابن قدامہ سعدی کو بنی تمیم کے پچاس آدمیوں کے ہمراہ بصرہ بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ دشمن کی طرف سے ہوشیار رہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح ابن ضبیعہ کو بے خبری میں مار ڈالا ہے اسی طرح تمہیں بھی فریب دے کر قتل کر دیں۔ جاریہ نے بصرہ میں وارد ہونے کے بعد پہلے زیاد سے بات چیت کی اور پھر بنی ازد کے ہاں آئے اور امیرالمومنین کا خط جو اہل بصرہ کے نام تھا پڑھ کر سنایا۔ اس میں تحریر تھا کہ اے اہل بصرہ تم بغاوت و سرکشی کی بنا پر اس کے مستحق تو نہ تھے کہ تم سے کوئی مراعات برتی جاتی مگر میں نے تمہارے ہاں کے مجرموں کو معاف کر دیا۔ ہتھیار رکھ دینے والوں سے اپنی تلوار روک لی اور عذر خواہوں کے عذر

کو قبول کر لیا۔ تم نے برضاؤ رغبت میری بیعت کی تھی اگر تم بیعت پر قائم رہو گے اور اطاعت کو اپنا شعار بناؤ گے تو میں تمہارے بارے میں کتاب وسنت کے تقاضوں پر عمل کروں گا اور اگر تم نے کم عقلی وبے راہروی کا ثبوت دیا اور اپنے معاندانہ رویہ سے مجھے نقل وحرکت پر مجبور کر دیا تو پھر یاد رکھو کہ تمہیں ایسی جنگ سے دوچار ہونا پڑے گا کہ اس کے سامنے جنگ جمل کی سختیوں کو بھول جاؤ گے مجھے توقع ہے کہ تم اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت وتباہی کا سامان نہیں کرو گے۔" جب یہ خط پڑھا جا چکا تو صبرہ ابن شیبان نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم امیرالمومنین کی ہر بات سنیں گے اور ہر امر میں ان کی اطاعت کریں گے جس سے وہ جنگ کریں گے اس سے ہم لڑیں گے اور جس سے وہ صلح کریں گے اس سے ہم صلح کریں گے۔ اے جاریہ اگر تم اپنے آدمیوں کو لے کر دشمن سے نمٹ سکتے ہو تو بہتر ورنہ ہم ہر طرح تمہاری نصرت کے لئے تیار ہیں۔ پھر یکے بعد دیگرے اور لوگوں نے بھی تعاون کا یقین دلایا۔ یہاں سے فارغ ہو کر جاریہ اپنے گنے چنے ساتھیوں کے ہمراہ بنی تمیم کے ہاں آئے اور انہیں نشیب وفراز سمجھا کر راہِ راست پر لانا چاہا مگر کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرا بلکہ گالی گفتار اور فساد پر اتر آئے۔ جاریہ نے یہ صورت دیکھی تو زیاد اور بنی ازد سے مدد مانگی زیاد نے بنی ازد سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے بنی ازد جو کل دوست تھے وہ آج دشمن ہیں اور جو کل دشمن تھے۔ وہ آج دوست ہیں جاریہ کو ہماری کمک کی ضرورت ہے لہٰذا اُٹھو اور دشمن کے مقابلہ میں ان کی مدد کرو چنانچہ بنی ازد ہتھیار سج کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شریک ابن عمار حارثی جو امیرالمومنین کے شیعہ اور جاریہ کے دوست تھے وُہ بھی شریکِ لشکر ہو گئے۔ اِدھر ابن عامر نے عبداللہ ابن خازم سلمی کو سواروں کا افسر مقرر کیا اور اپنی فوج کو لے کر میدان میں اُتر آیا کچھ دیر تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے آخر ابن عامر اور اس کے ساتھی اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور قصرِ سنبیل میں جس کے گرد خندق کھدی ہوئی تھی پناہ لے لی۔ ان پناہ لینے والوں میں عبداللہ ابن خازم بھی تھا جب اس کی ماں عجلی کو خبر ہوئی کہ اس کا بیٹا قصر میں محصور ہو گیا ہے تو وہ دوڑتی بھاگتی آئی اور ابن خازم کو آواز دی اس نے اُوپر سے جھانک کر ماں کو دیکھا تو پوچھا کہ تم کیوں آئی ہو کہا کہ تم نیچے اُترو اور میرے ساتھ گھر چلو اس نے نیچے اترنے سے انکار کیا عجلی نے جو ایک کالی کلوٹی حبشیہ عورت تھی سر سے چادر اتار دی اور کہا کہ اگر تم باہر نہیں آؤ گے تو میں مجمع عام میں عریاں ہو جاؤں گی۔ ابن خازم مجبور ہو کر نیچے اُترا اور ماں کے ساتھ چلا گیا۔ ابن خازم کے جانے کے بعد جاریہ اور زیاد نے قصر کو محاصرہ میں لے لیا اور جب اُسے خالی کرانے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو جاریہ نے اس میں آگ لگا دی اور ابن عامر اپنے ستر آدمیوں سمیت ہلاک ہو گیا۔ کچھ آگ میں جل گئے کچھ دیوار کے نیچے دب کر مر گئے اور کچھ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے مارے گئے۔ ان ہلاک ہونے

والوں میں عبدالرحمٰن ابن عمیر تمیمی اور دارع ابن بدر بھی شامل تھا۔

زیاد نے ظبیان ابن عمیر کو خط دے کر امیرالمومنین کی خدمت میں بھیجا اور انہیں تحریر کیا کہ ہمیں فتح و کامیابی حاصل ہوئی ہے اور جاریہ کے ہاتھوں دشمن کا صفایا ہو گیا ہے۔ حضرت نے اس بغاوت کے فرو ہونے پر اظہار اطمینان کیا اور ظبیان سے پوچھا کہ بصرہ میں تمہارا مکان کس جگہ پر واقع ہے اس نے جگہ کی نشاندہی کی۔ فرمایا کہ تم بصرہ کے اطراف میں مکان بنوا کر وہاں منتقل ہو جاؤ۔ یہ بصرہ ہمیشہ آگ اور پانی کی زد میں رہے گا اور اس طرح غرق ہو گا کہ مسجد کے کنگروں کے علاوہ کوئی عمارت نظر نہ آئے گی۔ چنانچہ بصرہ دو دفعہ غرق ہوا اور ایک دفعہ قادر باللہ کے دور میں اور ایک دفعہ قائم بامراللہ کے عہد حکومت میں اور بالکل یہی صورت پیش آئی۔ کہ جامع مسجد کے کنگروں کے علاوہ کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔

معاویہ کا یہ اقدام سینہ زوری امن دشمنی اور ہوس ملک گیری کا نتیجہ تھا جس کا خمیازہ انہیں بدترین شکست کی صورت میں بھگتنا پڑا اور جس قبیلۂ بنی ازد پر انہیں وثوق و اعتماد تھا کہ وہ ساتھ دے گا وہی قبیلہ زیاد کی پناہ گاہ اور جاریہ کا بازوئے شمشیر زن ثابت ہوا اور آخر دشمن کو اس طرح کچلا کہ صفحۂ ہستی پر اس کا نام و نشان تک نہ چھوڑا۔ معاویہ کا اقدام بے سوچے سمجھے یا وقتی اشتعال کے زیر اثر نہ تھا۔ بلکہ سوچ بچار اور صلاح و مشورہ کے بعد عمل میں لایا گیا تھا جس میں حسب ذیل وجوہ و مقاصد کارفرما تھے:۔

(۱) معاویہ نے فتح مصر سے یہ اندازہ لگایا کہ عراق میں حضرت علی کی عسکری قوت کمزور پڑ چکی ہے ورنہ کوفہ سے محمد ابن ابی بکر کی مدد کے لئے فوج بھیجتے۔ اور جب مرکز میں فوجی طاقت نہیں ہے تو بصرہ میں کہاں ہو گی جو مزاحم ہو سکے۔

(۲) عبداللہ ابن عباس جو حضرت کے عزیز اور دست و بازو ہیں وہ ان دنوں بصرہ میں موجود نہیں ہیں اور ان کا نائب زیاد جس کا اقتدار وقتی حیثیت رکھتا ہے وہ شہر کے بچاؤ کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہیں ڈالے گا اور بے لڑے ہتھیار ڈال دے گا۔

(۳) بصرہ جنگ جمل کا میدان رہ چکا ہے اور وہیں کے لوگوں نے قصاص خون عثمان کے سلسلہ میں طلحہ و زبیر کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہ ہو گی جنہیں قصاص کے نام پر برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور وہ بہرحال تعاون کریں گے اور اگر تعاون نہ بھی کریں جب بھی فریق مخالف کا ساتھ نہ دیں گے۔

(۴) اہل بصرہ کے ان گنت افراد علی اور ان کے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور مقتولین کے وارثوں اور ان کے قبیلہ والوں کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہو گی اور وہ اس انتقامی جذبہ کے زیر اثر

علی کی فوج کے مقابلہ میں اُن کے آدمیوں سے تعاون کریں گے۔

(۵) بصرہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے فارس کے علاقہ سے متصل ہے اگر بصرہ فتح ہو جائے تو یہ فتح مزید فتوحات کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اور بڑی آسانی سے فارس پر جو علی کے مقبوضہ علاقوں میں شامل ہے قبضہ کیا جاسکتا ہے۔

شامیوں کے جارحانہ حملے

بصرہ کی ہزیمت کے بعد معاویہ کو اندازہ ہو گیا کہ عراق کے شہروں پر حملہ کر کے کامیابی حاصل کرنا مشکل ہے البتہ مضافاتی آبادیوں اور دُور افتادہ بستیوں میں قتل و غارت سے دہشت پھیلائی جاسکتی ہے چنانچہ انہوں نے امیرالمومنین کے سرحدی قصبوں اور فوجی بارکوں پر تاخت و تاراج اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پر رونق و شاداب بستیاں ویرانوں میں بدل گئیں اور بے گناہوں کے خون کا سیلاب ہر طرف اُمنڈ آیا۔ ان غارت گریوں کا مقصد یہ تھا کہ حضرت کے قلمرو مملکت میں انتشار و بدامنی پھیلا کر اسے کمزور سے کمزور تر کر دیا جائے اور آپ کو انہی شورشوں اور ہنگاموں کے فرو کرنے میں الجھائے رکھا جائے تاکہ وہ کسی وقت اپنی بکھری طاقت کو یکجا کر کے ان کے مقابلہ میں کھڑے نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ۳۹ھ میں نعمان ابن بشیر کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ عین التمر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا یہاں امیرالمومنین کا ایک اسلحہ خانہ تھا جس کے نگران مالک ابن کعب ارحبی تھے اور ان کی ماتحتی میں ایک ہزار کی جمیعت ہمیشہ یہاں موجود رہتی تھی مالک کو جب نعمان کی پیش قدمی کا علم ہُوا تو اس وقت اُن کے پاس صرف ایک سو آدمی تھے اور باقی اجازت لے کر کوفہ جاچکے تھے انہوں نے امیرالمومنین کو تحریر کیا کہ دو ہزار شامیوں کا لشکر حملہ کے ارادہ سے بڑھ رہا ہے اور یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ اس یلغار کو روکنے کے لئے ناکافی ہیں لہذا فوراً ایک دستہ سپاہ روانہ کریں۔ امیرالمومنین نے صورتِ حال پر مطلع ہوتے ہی حارث ہمدانی سے فرمایا کہ وہ کوفہ میں اعلان کریں کہ تمام لوگ رحبہ میں جمع ہوں۔ حضرت دوسرے دن نماز صبح سے فارغ ہو کر رحبہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ تین سو کے لگ بھگ آدمی جمع ہیں۔ آپ نے اہل کوفہ کی جنگ سے بے دلی دیکھی تو فرمایا اے اہل کوفہ میں نے تمہیں تمہارے بھائیوں ہی کی مدد کے لئے بلایا تھا مگر جب بھی شامیوں کے لشکر تمہارے سروں پر منڈلاتے ہیں تو تم جنگ سے جی

چرانے لگتے ہو اور دروازے بند کر کے گھر کے گوشوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہو۔ عدی ابن حاتم نے آپ کو افسردہ خاطر دیکھا تو کہا کہ یا امیرالمومنین میرے قبیلہ بنی طے میں ایک ہزار افراد جنگجو موجود ہیں اگر آپ حکم دیں تو میں انہیں لے کر دشمن کی سرکوبی کے لئے جاؤں فرمایا کہ مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دشمن کے مقابلہ میں ایک ہی قبیلہ کے لوگ جائیں اور اسے یہ تاثر دیں کہ دوسرے قبائل تعاون سے گریزاں اور ہماری نصرت سے روگرداں ہیں تم نخیلہ میں جاکر دوسرے لوگوں کو بھی جہاد کی دعوت دو۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں سے کہا سنا اور بنی طے کے علاوہ ایک ہزار افراد اور جمع ہو گئے۔ عدی ابن حاتم لشکر ترتیب دے کر کوچ کرنا چاہتے تھے کہ مالک ابن کعب کا پیغام آیا کہ ہم نے دشمن کو اپنی سرحد سے نکال باہر کیا ہے اب فوجی کمک کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ مالک نے بایں خیال کہ شاید حضرت کی طرف سے مدد کے آنے میں تاخیر ہو جائے۔ حسن تدبر سے کام لیتے ہوئے عبداللہ ابن حوزہ ازدی کو قرظہ ابن کعب اور مخنف ابن سلیم کے ہاں بھیج دیا اور موجودہ صورت حال سے نپٹنے کے لئے ان سے مدد طلب کی۔ قرظہ نے کہا کہ میں خراج کی جمع آوری پر متعین ہوں میرے ماتحت ایسے لوگ نہیں ہیں۔ جنہیں میں بھیج سکوں البتہ مخنف ابن سلیم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کی قیادت میں پچاس آدمیوں کا ایک مختصر دستہ بھیج دیا۔ جب عصر کے وقت یہ دستہ عین التمر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ مالک اور اُن کے ساتھی دیوار سے پشت لگائے کھڑے اور تلواروں کے نیام توڑ کر مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ نعمان نے اس دستہ کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ مقدمۃ الجیش ہے اور اس کے عقب میں فوج آ رہی ہے اس نے فوراً واپسی کے ارادہ سے رُخ موڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مالک نے پیچھا کر کے اس کے تین آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا اور دشمن انہیں کوئی صدمہ نہ پہنچا سکا۔

اسی ۳۹ھ میں معاویہ نے سفیان ابن عوف غامدی کو چھ ہزار کی جمعیت کے ساتھ ہیت انبار اور مدائن پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ حضرت کے فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ و برباد کر دے۔ سفیان نے حسب ہدایت پہلے ہیت کا رُخ کیا۔ ہیت کے عامل کمیل ابن زیاد نخعی تھے وہ یہ سن کر کہ قرقیسیا میں سپاہِ شام کے کچھ لوگ جمع ہیں جو ہیت پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ شہر کو خالی چھوڑ کر اُن کے تعاقب میں چلے گئے۔ حالانکہ انہیں امیرالمومنین کی طرف سے یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اپنا مرکز چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سفیان کا لشکر ہیت پہنچا تو دیکھا کہ شہر خالی پڑا ہے اور اس کی پیش قدمی کو روکنے والا کوئی نہیں ہے وہ بلا مزاحمت ہیت سے گزر کر انبار کی طرف بڑھا۔ یہاں پانچ سو آدمیوں کا ایک دستہ شہر کی حفاظت کے لئے متعین تھا۔ مگر

اس وقت صرف دو سو آدمی موجود تھے اور باقی اِدھر اُدھر جا چکے تھے۔ سفیان نے فوج کا اندازہ کرنے کے لئے وہاں کے چند نوجوانوں کو پکڑ کر ان سے دریافت کیا کہ یہاں فوج کے کتنے آدمی ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ اس وقت دو سو کے لگ بھگ ہیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ فوج کی تعداد انتہائی کم ہے تو اس کی ہمت بڑھی اور اپنے لشکر کی صف بندی کر کے آگے بڑھا۔ ادھر سے اشرس ابن حسان بکری جو فوجی دستہ کے افسر اعلیٰ تھے۔ اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر مقابلہ کے لئے نکل آئے۔ جب ان کے ہمراہیوں نے دشمن کو کثرت وقوت کو دیکھا تو ان دو سو میں سے بھی آدھے لوگ منتشر ہو گئے اور باقی ماندہ گلی کوچوں میں کبھی دشمن سے دو بدو ہو کر لڑتے اور کبھی جھکائی دے کر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ اشرس نے جب دیکھا کہ اس طرح دشمن کو جھکائیاں دے کر جانیں بچالے جانا مشکل ہے تو انہوں نے باہر نکل کر لڑنے کی ٹھان لی اور پکار کر کہا کہ جو اللہ کی راہ میں جان دینا چاہتا ہے اور اس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہے۔ وہ باہر میدان میں نکل آئے۔ اس آواز پر تیس آدمی نکلے جنہوں نے جانثاری وجانبازی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور لڑتے بھڑتے سب کے سب شہید ہو گئے۔ اب شامیوں کی چیرہ دستیوں کو روکنے والا کوئی نہ تھا انہوں نے ایک ایک گھر کو لوٹا عورتوں کے زیورات تک اتروالئے اور جو ہاتھ لگا کر سمیٹ کر چلتے بنے۔

جب امیرالمومنین کو دشمن کی غارت گری وتباہ کاری کا علم ہوا تو آپ نے کمیل ابن زیاد کو تہدید آمیز خط لکھا اور شہر کو حفاظتی دستہ کے بغیر چھوڑتے پر سرزنش کی اور منبر پر خطبہ دیتے ہوئے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی اور دشمن کے تعاقب میں جانے کے لئے کہا مگر کسی سمت سے لبیک کی آواز بلند نہ ہوئی۔ حضرت نے انہیں خاموش اور جنگ سے پہلو تہی کرتے دیکھا تو غم وغصہ میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور تن تنہا دشمن کو کچلنے کے ارادہ سے چل دیئے۔ اب لوگوں کو بھی غیرت آئی اور وہ حضرت کے پیچھے ہو لئے جب وادیٔ نخیلہ میں پہنچے تو کہا کہ یا امیرالمومنین آپ واپس تشریف لے جائیں ہم دشمن سے نمٹنے کے لئے کافی ہیں۔ جب ان لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ کوفہ واپس آ گئے اور سعید ابن قیس کی قیادت میں آٹھ ہزار کا لشکر دشمن کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ جب یہ لشکر فرات کی جانب سے عانات پہنچا تو سعید نے ہانی ابن خطاب ہمدانی کو دشمن کا کھوج لگانے کے لئے آگے روانہ کیا وہ کھوج لگاتے ہوئے حدود قنسرین تک گئے مگر سفیان کا لشکر آگے جا چکا تھا اور یہ تعاقب نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔

جب سعید ابن قیس واپس پلٹے تو حضرت نے جہاد کی اہمیت کے بارے میں خطبہ دیا اور جنگ سے جی چرانے والوں کو دشمن کی سرکوبی پر ابھارا اس پر جندب ابن عفیف ازدی کھڑا ہوا اور کہا

کہ یا امیرالمومنین میں اپنی ذات اور اپنے بھتیجے عبدالرحمٰن ابن عبداللہ پر اختیار رکھتا ہوں آپ ہم دونوں کو جو حکم دیں گے ہم اسے بسروچشم بجالائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں جو چاہتا ہوں وہ تم دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے ہیت اور انبار میں غارت گری کی تھی انہیں اس طرح کچلا جائے کہ آئندہ انہیں عراقی سرحدوں پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوسکے۔ آپ نے سعید کی واپسی کے بعد چند دن توقف فرمایا اور پھر اہل کوفہ کو جمع کرکے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اے لوگو تم انصار مدینہ سے تعداد میں کہیں زیادہ ہو انہوں نے کم ہونے کے باوجود پیغمبر اور مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دی انہوں نے کڑیاں جھیلیں مصیبتیں برداشت کیں مگر اسلام و اہل اسلام کی نصرت و حمایت سے ہاتھ نہ اٹھایا یہاں تک کہ اسلام کا پرچم فضائے عرب پر لہرانے لگا اس پر ایک دریدہ دہن شوخ چشم اور دراز قامت شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ آپ نہ محمد اور نہ ہم انصار ہم پر اتنا ہی بوجھ ڈالئے جتنا ہم اٹھا سکیں حضرت نے فرمایا کہ بات کو سمجھو اور سوچ کر بولو۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں محمد ہوں اور تم انصار ہو میں نے تو یہ مثال کے طور پر کہا ہے تاکہ تم بھی انصار کی راہ و روش پر چل کر اپنے اندر ان کا سا جذبہ پیدا کرو اور حوزۂ اسلام کے تحفظ کے لئے آئے دن کی غارت گریوں کو روکو۔ اس پر ایک اور شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ آج امیرالمومنین کو اصحاب نہروان کی ضرورت کا احساس ہوا ہوگا۔ جنہیں خود اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ پھر ہر طرف سے مختلف آوازیں آنے لگیں کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ اور ایک ہڑبونگ سا مچ گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ آج مالک اشتر زندہ ہوتے تو ان لوگوں کو ہلڑ مچانے کی جرأت نہ ہوتی اور ہر شخص سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکالتا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم پر حیف ہے۔ اشتر کا حق تو اتنا ہی تھا جتنا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر ہوتا ہے اور میرے حقوق تو کہیں زیادہ ہیں جن کی نگہداشت تمہارے لئے واجب و لازم ہے۔ آخر سعید ابن قیس اور حجر ابن عدی نے کہا کہ آپ ہمیں جو حکم دیں گے ہم اس سے سرتابی نہیں کریں گے خواہ اس کی بجاآوری میں ہمارا مال و متاع چھن جائے اور عزیز و اقربا قتل کر دیئے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دشمن کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے ہو اور انہیں قرار واقعی سزا دے کر ہمیشہ کے لئے کچل دو۔ یہ کہہ کر منبر سے نیچے اُتر آئے۔ اور بیت الشرف میں تشریف لائے آپ کے عقب میں چند مخلص اصحاب بھی آپ کے ہاں پہنچ گئے آپ نے ان سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری نظروں میں ایسا شخص کون ہے جو خود بھی چاق چوبند اور اہلِ عراق کو بھی جنگ پر مستعد کرسکے تاکہ اس کی سرکردگی میں لشکر کی روانگی کا سروسامان کیا جائے سعید ابن قیس نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس مہم کو سر کرنے کے لئے معقل ابن قیس تیمی سے موزوں تر کوئی

دوسرا نہیں ہے وہ آپ کے مخلص دوست اور جری و شجاع ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں وہ اس کام کے لئے مناسب ہیں اور پھر معقل کو طلب کر کے اس مہم پر بھیج دیا۔

اسی سال معاویہ نے عبداللہ ابن مسعدہ فزاری کو سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیمار کی جانب روانہ کیا اور اُسے حکم دیا کہ وُہ مکہ و مدینہ تک بڑھتا چلا جائے اور راستے میں جو بستیاں آئیں وہاں کے باشندوں سے زکوٰۃ و صدقات جمع کرے اور جو انکار کرے اُسے بے دریغ قتل کر دے۔ چنانچہ وُہ چل دیا اور اس کے قوم و قبیلہ کے لوگ بھی اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔ حضرت کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے مسیب ابن نجبہ فزاری کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ جب ابن مسعدہ مار دھاڑ کرتا ہوا تیماً میں پہنچا تو حضرت کا لشکر بھی پہنچ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تلواریں سونت لیں اور جنگ چھڑ گئی جو صبح سے ظہر تک جاری رہی۔ مسیب نے ابن مسعدہ پر جو اسی کے قبیلہ میں سے تھا تلوار کا وار تو کیا مگر اس کا بچاؤ کرتے ہوئے اور چپکے سے کہا کہ بھاگ کر اپنی جان بچاؤ چنانچہ وہ فوج کے ایک دستہ کو لے کر ایک قلعہ میں قلعہ بند ہو گیا اور بقیہ لشکر شام کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ابن مسعدہ اور اس کے ساتھیوں نے زکوٰۃ و صدقات کے نام پر جو اونٹ لوگوں سے زبردستی چھینے تھے وہ وہاں کے بادیہ نشین عربوں نے چھین لئے۔ جب ابن مسعدہ کو قلعہ بند ہوئے تین دن گذر گئے تو قلعہ کو آگ لگا دینے کی تجویز ہوئی۔ چنانچہ دروازہ پر لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا دی گئی۔ ابن مسعدہ نے دیکھا تو کہا اے مسیب تم اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں کو جلائے دیتے ہو۔ مسیب نے حکم دیا کہ آگ بجھا دی جائے چنانچہ آگ بجھا دی گئی۔ آگ بجھانے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی ہے کہ شام کا ایک لشکر ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ سن کر سب لوگ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ابن مسعدہ کو موقع مل گیا اور وہ رات کے اندھیرے میں اپنے لشکر سمیت شام کی طرف نکل بھاگا۔ جب اس کے نکل بھاگنے کا پتہ چلا تو عبدالرحمٰن ابن شبیب نے کہا کہ ہمیں ابن مسعدہ کا تعاقب کرنا چاہئے مگر مسیب نہ مانا۔ جس پر عبدالرحمٰن نے کہا کہ تم نے امیرالمومنین کے خلاف دشمن سے ساز باز کر رکھی ہے اور تمہارا رویہ سراسر منافقانہ ہے۔

اسی سنہ ۳۹ھ میں معاویہ نے ضحاک ابن قیس فہری کو حیرہ کی طرف چار ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیجا اور اُسے حکم دیا کہ ان بادیہ نشین عربوں کو جو علی کی اطاعت قبول کر چکے ہوں قتل کرے اور ان کا مال و اسباب لُوٹ لے۔ چنانچہ وہ آبادیوں کو روندتا اور بستیوں کو ویران کرتا ہوا ثعلبیہ تک پہنچ گیا اور حاجیوں کے ایک قافلہ پر حملہ کر کے ان کا سارا مال و اثاثہ چھین لیا اور پھر واقصہ اور شراف کی طرف سے ہوتا ہوا

قسطنطانہ کی طرف بڑھا اور یہاں عمرو ابن عمیس ابن مسعود اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ امیر المومنین کو جب ان غارت گریوں کی اطلاع ہوئی تو آپ نے لوگوں کو اُن کے تعاقب میں جانے کے لئے کہا مگر انہوں نے بے حسی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت نے اُن کے رویہ پر غم و غصہ کا اظہار کیا اور اُن کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑا۔ آخر چار ہزار کا لشکر حجر ابن عدی کی قیادت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے سماوہ میں پہنچا۔ یہاں حجر نے حرم سید الشہداء جناب رباب کے والد امرأ القیس ابن عدی سے ملاقات کی اور ان کے قبیلہ بنی کلب کے چند افراد راستہ دکھانے اور چشموں کی نشاندہی کرنے کے لئے ساتھ ہو گئے۔ جب حجر تیزی سے مسافت طے کرتے ہوئے تدمر کے اطراف میں پہنچے تو دیکھا کہ ضحاک کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ جب آمنا سامنا ہوا تو دونوں فریق نے تلواریں کھینچ لیں اور جنگ چھیڑ دی۔ اس معرکہ میں ضحاک کی فوج کے انیس آدمی مارے گئے اور حجر کے لشکر میں سے دو آدمی شہید ہوئے۔ اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو ضحاک اپنے لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور حجر کوفہ واپس پلٹ آئے۔

اسی سال معاویہ نے یزید ابن شجرہ رہاوی کو حج کے ایام میں مکہ بھیجا تاکہ وہ امارت حج کے فرائض انجام دے اور امیر المومنین کے مقرر کردہ عمال کو وہاں سے نکال کر معاویہ کے لئے بیعت لے۔ چنانچہ وہ تین ہزار سواروں کے جلو میں مکہ روانہ ہو گیا۔ جب عامل مکہ قثم ابن عباس کو اس لشکر کی آمد کی اطلاع ہوتی تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا کہ اے اہل مکہ شامیوں کا لشکر سرزمین حرم پر خون ریزی کے ارادہ سے نکل چکا ہے تم اپنے ہتھیار سنبھال لو اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دو مگر شیبہ ابن عثمان عبدری کے علاوہ سب نے ان کی بات بے توجہی و بے رُخی سے سنی اور کسی نے اُن کی آواز پر لبیک نہ کہی۔ جب قثم ابن عباس نے اہل مکہ کو تعاون سے پہلو تہی کرتے دیکھا تو چاہا کہ مکہ سے باہر نکل کر کسی گھاٹی میں پناہ لے لیں۔ اور امیر المومنین کو حالات سے آگاہ کر کے اُن سے فوجی کمک طلب کریں اور جب انکی طرف سے فوجی کمک آجائے تو پناہ گاہ سے نکل کر دشمن سے لڑیں۔ ابو سعید خدری کو جب یہ معلوم ہوا کہ قثم مکہ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے اس کی مخالفت کی اور قثم سے کہا کہ سپاہ شام کی آمد کا انتظار کیجئے اگر آپ دیکھیں کہ اس کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو مقابلہ کریں ورنہ مکہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ قثم اس پر رضامند ہو گئے اور امیر المومنین کو مدد کے لئے تحریر کیا۔ امیر المومنین نے یکم ذی الحجہ کو ایک دستہ سپاہ جس میں ابو الطفیل اور ریان ابن ضمرہ بھی شامل تھے روانہ کر دیا۔ یزید ابن شجرہ یوم ترویہ سے دو دن پہلے اپنے لشکر سمیت مکہ پہنچ گیا اور ابو سعید خدری کو بلا کر کہا کہ قثم ابن عباس سے کہئے کہ وہ امامت نماز اور امارت حج سے الگ ہو جائیں اور میں بھی الگ ہو جاتا ہوں۔ اور لوگوں کو اختیار دے دیں کہ وہ جسے چاہیں اُسے

منتخب کریں۔ قثم ابن عباس نے کچھ پس و پیش کیا اور پھر کمزوری اور دشمن کی کثرت و قوت کو دیکھتے ہوئے تیار ہو گئے اور لوگوں نے امامت نماز اور امارتِ حج کے لئے شیبہ ابن عثمان کو منتخب کر لیا۔ جب حج تمام ہو گیا تو ابن شجرہ شام کی طرف چل دیا۔ اس اثنا میں حضرت کا بھیجا ہوا لشکر بھی پہنچ گیا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ شامیوں کا لشکر یہاں سے چل دیا ہے تو معقل ابن قیس نے لشکر کی کمان اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا تعاقب کیا اور وادی القریٰ سے نکل کر اُسے جا لیا۔ شامیوں نے بچ کر نکل جانا چاہا مگر معقل کے سپاہیوں نے پیچھا کر کے اُن کے چند آدمیوں کو اسیر کر لیا اور کوفہ واپس پلٹ آئے۔

جب یزید ابن شجرہ شام پہنچا تو معاویہ کو اپنے چند آدمیوں اسیر ہونے کی اطلاع دی۔ معاویہ نے حرث ابن نمر تنوخی کو جزیرہ کی طرف بھیجا تا کہ ان لوگوں میں سے جو حضرت کی بیعت کر چکے ہیں چند ایک کو اسیر کر کے لائے۔ چنانچہ اس نے جزیرہ میں پہنچ کر بنی تغلب کے سات آدمی گرفتار کر لئے۔ جب یہ اسیر معاویہ کے ہاں پہنچے تو بنی تغلب کی ایک جماعت نے جو امیرالمومنین سے کٹ کر معاویہ کے زیرِ سایہ آ بسی تھی، معاویہ سے کہا کہ ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے مگر معاویہ نے قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا جس پر بنی تغلب کبیدہ خاطر ہو کر معاویہ سے علیحدہ ہو گئے۔ معاویہ نے امیرالمومنین کو لکھا معقل نے یزید ابن شجرہ کی فوج میں سے جو قیدی بنائے تھے ان اسیروں کے بدلے میں بنی تغلب کے اسیروں کا تبادلہ کر لیا جائے حضرت نے اسے منظور کیا اور قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ ہو گیا۔

اسی سال معاویہ نے عبدالرحمٰن ابن قباث کو بلادِ جزیرہ پر چڑھائی کے لئے بھیجا۔ جب جزیرہ کے عامل شبیب ابن عامر کو خبر ہوئی تو انہوں نے کمیل ابن زیاد کو جو ہیت میں والی تھے، دشمن کے حملہ آور ہونے کی اطلاع دی اور اُن سے فوجی مدد طلب کی۔ کمیل چھ سو سواروں کا ایک دستہ لے کر ان کی مدد کو چل دیئے۔ جب اطرافِ جزیرہ میں پہنچے تو دشمن کی سپاہ سے جو عبدالرحمٰن ابن قباث اور معن ابن یزید سلمی کی کمان میں تھی مڈبھیڑ ہو گئی۔ کمیل انہی چھ سو سواروں کو لے کر ان سے ٹکرا گئے اور ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کو تہ تیغ کر دیا اور آپ کے ہمراہیوں میں سے دو آدمی شہید ہوئے۔ اب دشمن کے قدم جم نہ سکے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ بھاگنے والوں کا پیچھا نہ کیا جائے۔ اور نہ زخمیوں کو جان سے مارا جائے۔ شامیوں کو تتر بتر کرنے کے بعد امیرالمومنین کو اپنی فتح و کامیابی کی خبر دی حضرت ان کے کارنامے سے بہت خوش ہوئے اور ہیت کو خالی چھوڑ کر جانے کی جو غلطی اُن سے ہوئی تھی اس کی تلافی ہو گئی۔ جب نصیبین سے شبیب ابن عامر لشکر لے کر آئے تو دیکھا کہ کمیل نے دشمن کو پسپا کر دیا ہے انہوں نے اس کامیابی پر کمیل کو مبارک باد اور واپس جانے کے بجائے دشمن کے تعاقب میں

چل دیئے اور دریائے فرات کو عبور کر کے بعلبک تک پہنچ گئے۔ معاویہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے حبیب ابن مسلمہ کو ایک دستہ فوج کے ساتھ مقابلہ کے لئے بھیجا مگر وہ شبیب کے لشکر کو نہ پا سکا۔ شبیب نے اب تعاقب جاری رکھنے کے بجائے رقہ پر جو اموی ہوا خواہوں کا مرکز تھا حملہ کیا اور ہتھیار گھوڑے چھین لئے اور مویشی بھی ہنکا کر اپنے ساتھ لے لئے۔ جب پلٹ کر واپس آئے تو امیرالمومنین کو تمام روداد تحریر کی حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ وہ گھوڑے اور ہتھیار جن سے دشمن میدانِ جنگ میں کام لیتا ہے وہ تو تمہیں لے لینے کا حق تھا مگر مال مویشی کے چھیننے کا کوئی حق نہ تھا۔ اور اس کے ساتھ اُن کی جرأت و حوصلہ مندی کی داد دیتے ہوئے فرمایا :۔

رحم اللہ شبیبا لقد ابعد الغارۃ و عجل الانتصار۔ — خدا شبیب پر رحم کرے اس نے دُور تک حملہ کیا اور بدلہ اٹھا نہیں رکھا۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳ صـ۱۹۱)

اسی سال معاویہ نے زہیر ابن مکحول عامری کو حضرت کے مقبوضہ شہر سماوہ کی جانب زکوٰۃ و صدقات کی وصولی کے لئے روانہ کیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ نے جعفر ابن عبداللہ اشجعی، عروہ ابن عشبہ کلبی اور جلاس ابن عمیر کلبی کو قبیلہ بنی کلب و بکر ابن وائل سے صدقات کی جمع آوری کیلئے بھیجا۔ جب یہ تینوں آدمی پہنچے تو معاویہ کے آدمیوں سے تصادم ہو گیا۔ جعفر ابن عبداللہ قتل ہو گئے ابن عشبہ کو زہیر نے سواری کے لئے گھوڑا دیا اور وہ جان بچا کر واپس آ گیا۔ اس سے حضرت کی نگاہوں میں اس کی شخصیت مشکوک ہو گئی۔ آپ نے اس پر دُرّہ اٹھایا اور ڈانٹا ڈپٹا آخر وہ بھاگ کر معاویہ کے پاس چلا گیا۔ جلاس بھی چپکے سے بھاگ نکلا اور راستے میں ایک چرواہے کو اپنا قیمتی جُبّہ دے کر اس کا پھٹا پرانا جبہ لے کر اوڑھ لیا تاکہ اُسے کوئی شناخت نہ کر سکے اور اس طرح بچتا بچاتا کوفہ چلا آیا۔

انہی دنوں میں معاویہ نے مسلم ابن عقبہ مری کو دومۃ الجندل بھیجا۔ یہاں کے لوگوں نے نہ حضرت علی کی بیعت کی تھی اور نہ معاویہ کی۔ حضرت کو جب مسلم ابن عقبہ کی نقل و حرکت کا علم ہُوا تو آپ نے مالک ابن کعب ہمدانی کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بھیجا۔ جب دونوں فریق کا آمنا سامنا ہوا تو جنگ چھڑ گئی جو دن بھر جاری رہی آخر ابن عقبہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے جانے کے بعد مالک نے وہاں کے باشندوں سے حضرت کی بیعت کے لئے کہا مگر وُہ بیعت پر آمادہ نہ ہوئے اور کہا کہ جب تک لوگ ایک خلیفہ پر اتفاق نہ کر لیں گے ہم کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کوفہ میں جہاں امیرالمومنین کے مخلص شیعہ اور جاں نثار تھے

وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو خارجیانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بات بات پر الجھتے انتشار و بددلی پھیلاتے اور سلطنت کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی فکر میں کھوئے رہتے۔ ایک طرف ان لوگوں کی دورخی اور بے راہروی داخلی انتشار کی صورت اختیار کئے ہوئے تھی اور دوسری طرف شامیوں کے جارحانہ حملے آپ کے لئے مستقل پریشانی و دردسری کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اس دوطرفہ خلفشار اور ہنگامہ آرائیوں میں آپ نے جس حد تک حالات پر قابو رکھا وہ آپ کی اعلیٰ سیاست اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر ان صبر آزما حالات سے کسی اور کو دوچار ہونا پڑتا اور وہ نظم و ضبط مملکت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا تو پھر اس کے سیاسی تدبّر کا ڈھنڈورہ پیٹنا زیب دے سکتا تھا۔ مگر نہ کسی کو ان جیسے دشوار حالات سے گزرنا پڑا اور نہ ان جیسے لوگوں سے سابقہ پڑا جن کی بے حسی اور سرد مہری ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

بسر ابن ابی ارطاۃ کی تباہ کاریاں

یمن جو امیرالمومنین کے قلمرو مملکت میں شامل تھا وہاں پر عثمانیوں کی بھی ایک خاصی جمعیت تھی جنہوں نے بظاہر حضرت کی بیعت کر لی تھی اور پُرامن رعایا کی طرح رہتے سہتے تھے مگر باطن میں مملکت کے بدخواہ اور حضرت سے عناد رکھتے تھے اور والئ یمن عبیداللہ ابن عباس سے بھی ان کا رویہ معاندانہ تھا۔ جب مصر میں محمد ابن ابی بکر قتل کر دیئے گئے اور شامیوں کے تابڑ توڑ حملوں کے نتیجہ میں عراق بھی انتشار کی زد میں آ گیا تو انہوں نے پر پُرزے نکالے اور خون عثمان کے قصاص پر لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ عبیداللہ ابن عباس کو ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا علم ہوا تو انہوں نے چند سربرآوردہ لوگوں کو بلا کر کہا کہ میں تم لوگوں کے بارے میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے جو سُنا ہے صحیح ہے ہم قتل عثمان کو شروع ہی سے ایک المیہ سمجھتے رہے ہیں اور جنہوں نے اُن کے قتل کے اسباب فراہم کئے ان کے خلاف قدم اٹھانا ہمارا فریضہ ہے۔ عبیداللہ ابن عباس نے فتنہ کو ابھرتے ہوئے دیکھا تو انہیں نظر بند کر دیا تاکہ ملکی فضا مکدر نہ ہونے پائے مگر یہ اقدام موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے فوج کے ان سپاہیوں کو جو اُن کے ہم خیال تھے، یہ پیغام بھجوایا کہ ہنگامہ کھڑا کر کے فوج کے افسر اعلیٰ سعید ابن نمران کو عہدہ سے الگ کر دو۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کر کے فوجی کمان اُن کے ہاتھ سے لے لی اور فوج کا شیرازہ درہم و برہم ہو کر رہ گیا عسکری قوت کے کمزور ہو جانے سے وہ لوگ جو اب تک دبے ہوئے تھے کھل کر سامنے آ گئے۔

اور وُہ لوگ جو اُن کے ہم خیال تو نہ تھے مگر خراج و زکوٰۃ سے بچنا چاہتے تھے وُہ بھی اُن میں آ کر شامل ہو گئے اور حکومت کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا گیا۔

عبیداللہ ابن عباس سعید ابن نمران اور شیعیان علی نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ ہمیں امیرالمومنین کو ان حالات سے آگاہ کرنا چاہیئے اور جو وُہ فرمائیں اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اگر ہم نے از خود ان عثمانیوں سے جنگ چھیڑ دی تو خدا جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔ چنانچہ امیرالمومنین کو تمام حالات تحریر کئے گئے اور مستقبل کے اقدام کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا۔ حضرت نے یہ تحریر پڑھی تو پیشانی پر بل آیا اور عبیداللہ اور سعید کو تحریر فرمایا کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے وہ تمہاری کمزور سیاست کا نتیجہ ہے ورنہ وُہ اس قابل کب تھے کہ انہیں اہمیت دی جاتی۔ نہ وہ گنتی میں زیادہ تھے اور نہ قوت و طاقت میں۔ تم انہیں سمجھاؤ بجھاؤ اور تقویٰ و خوفِ الٰہی کی دعوت دو اگر وُہ راہِ راست پر آجائیں تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر جنگ ہی پر اُتر آئے ہوں تو ہم بھی لڑنے پر تیار ہیں۔ اس کے ساتھ عثمانیوں کو بھی قبیلۂ ہمدان کے ایک شخص کے ہاتھ یہ تحریری پیغام بھجوایا کہ مجھے تمہاری بغاوت و سرکشی کی اطلاع ملی ہے تم لوگ بغاوت سے دستکش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاؤ۔ اگر تم نے اس میں کچھ پس و پیش کیا تو یاد رکھو کہ تمہاری سرکوبی کے لیئے ایسا لشکر آرہا ہے جو تمہیں پیس کر رکھ دے گا۔ مگر ان لوگوں نے اس دھمکی کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے موقف پر بدستور جمے رہے۔ امیرالمومنین کے قاصد نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا کہ امیرالمومنین یزید ابن قیس ارحبی کو ایک لشکر گراں کے ساتھ بھیجنے والے ہیں وہ فقط میرے جواب کے منتظر ہیں۔ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو لشکر حرکت میں آجائے گا اور پھر تمہارے رکے نہ رُکے گا۔ جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ خالی دھمکی نہیں ہے بلکہ ایسا ہو کر رہے گا تو انہوں نے کہا کہ اگر عبیداللہ ابن عباس اور سعید ابن نمران کو یہاں سے برطرف کر دیا جائے تو ہم حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بات صرف دفع الوقتی کے لئے تھی۔ ورنہ یہ لوگ عمال کی تبدیلی پر اکتفا کر کے خاموش رہنے والے نہ تھے وہ معاویہ کو پہلے ہی پیغام بھیج چکے تھے کہ وہ یمن کے شیعوں سے نمٹنے کے لئے فوج بھیج دیں ہم اس تعاون کر کے حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔

معاویہ جو عراق کے مختلف شہروں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کئے ہوئے تھے یمنیوں کی اس تحریک پر خاموش نہ رہ سکتے تھے انہوں نے فوراً بسر ابن ابی ارطاۃ کو جو انتہائی ظالم و سفاک اور درندہ صفت انسان تھا تین ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیج دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ مدینہ اور مکہ سے ہوتا ہُوا یمن جائے اور راستے میں جن جن بستیوں سے اُس کا گزر ہو وہاں کے باشندوں کو ڈرا دھمکا کر بیعت لے اور شیعیانِ علی

ہیں سے جو بیعت سے انکار کرے اسے تہ تیغ کر دے اور اس کا گھر بار لوٹ لے۔ چنانچہ وہ لشکر کی کمان کرتا ہوا مدینہ کی طرف چل دیا اور راستے میں جہاں کوئی چشمہ آتا وہاں اتر پڑتا اور لوگوں کے اونٹ ہنکا کر ساتھ لے لیتا۔ جب اس طرح لوٹ مار کرتا ہوا مدینہ کے قریب پہنچا تو بنی قضاعہ نے اُسے خوش آمدید کہا اور اونٹوں کو نحر کرکے تمام لشکر کے کھانے کا انتظام کیا۔ جب یہاں سے فارغ ہو کر حدودِ مدینہ میں داخل ہوا تو ابوایوب انصاری جو امیرالمومنین کی طرف سے والیٔ مدینہ تھے، سپاہ شام کی کثرت و قوت سے ہراساں ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور کوفہ کی طرف چل دیئے۔ اب کوئی مزاحمت کرنے والا نہ تھا۔ بسر سیدھا مسجد میں آیا اور لوگوں کو جمع کرکے انہیں ڈرایا دھمکایا سب وشتم کا نشانہ بنایا اور اس قدر ہراساں کیا کہ سب کو موت کا یقین ہو گیا کچھ لوگوں نے حویطب ابن عبدالعزیٰ سے جس کے گھر میں بسر کی ماں تھی کہا کہ وہ ان کی جانوں کے تحفظ کی کوئی تدبیر کرے۔ اس نے بسر سے کہا کہ اے بسر یہ لوگ رسول اللہ کے انصار ہیں نہ یہ عثمان کے قاتل ہیں اور نہ ان کے قتل سے انہیں کوئی تعلق ہے ان سے درگزر کرو۔ بسر نہ مانا۔ اور جب ان لوگوں نے معاویہ کی بیعت پر آمادگی ظاہر کی تو اُن سے بیعت لے کر انہیں گھروں میں واپس جانے کی اجازت دے دی۔ البتہ جن کے بارے میں اُسے شبہ تھا کہ وُہ معاویہ کی بیعت نہیں کریں گے ان کے گھروں کو جلا دیا اِن گھروں میں ابوایوب انصاری، عبداللہ ابن سعد، رفاعہ ابن رافع زرقی اور زرارہ ابن حرون کے مکانات بھی شامل تھے۔

بسر کی آمد پر بہت سے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے ان میں جابر ابن عبداللہ انصاری بھی شامل تھے وہ اپنے گھر سے نکل کر دوسری جگہ رُوپوش ہو گئے۔ بسر کو جب جابر نظر نہ آئے تو اس نے انصار کی ایک شاخ بنی سلمہ سے کہا کہ جب تک تم جابر کو حاضر نہیں کرو گے تمہیں جان و مال کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ جب جابر کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے قبیلہ والوں کی جانیں خطرہ میں ہیں تو وُہ رات کے اندھیرے میں چھپتے چھپاتے ام المومنین ام سلمہ کے ہاں آئے اور کہا کہ میں اس وقت اس غرض سے آیا ہوں کہ آپ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ اب اسکے سوا کیا چارہ ہے کہ معاویہ کی بیعت کرکے اپنی اور اپنے قبیلہ والوں کی جانیں بچاؤ۔ اگرچہ یہ بیعت سراسر ضلالت و گمراہی ہے اور میں نے اپنے بیٹے عمر ابن ابی سلمہ اور اپنے داماد عبداللہ ابن زمعہ سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ بیعت کرکے اپنے کو ہلاکت سے بچائیں۔ چنانچہ جابر نے مجبوری کی بنا پر بیعت کرکے اپنی اور اپنے قبیلہ والوں کی جانوں کا بچاؤ کیا۔ بسر جتنے دن مدینہ میں ٹھہرا مدینہ پر خوف و ہراس کے بادل چھائے رہے جبر و استبداد کے سامنے عوام کی ہمتیں پست اور قوتیں مضمحل ہو گئیں اور جان کے اندیشہ سے بیعت

کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بسر نے انہیں جان کی معافی دینے کے بعد کہا کہ اے اہل مدینہ تم اس قابل تو نہ تھے کہ تم میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ چھوڑا جاتا اس لئے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے عثمان قتل کر دیئے گئے۔ اور تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اگرچہ میں تمہیں اس دنیا میں معاف کئے دیتا ہوں مگر مجھے امید ہے کہ آخرت میں تم اللہ کی رحمت سے محروم رہو گے۔ میں حکومت شام کی طرف سے ابوہریرہ کو تم پر حاکم مقرر کئے دیتا ہوں خبردار اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ اس کے بعد مکہ کی جانب روانہ ہو گیا اور جب خوف و دہشت پھیلاتا قتل و غارت کرتا اور بے گناہوں کا خون بہاتا ہوا مکہ کے قریب پہنچا تو حاکم مکہ قثم ابن عباس مکہ سے نکل گئے اور اکثر اہل مکہ بھی گھر بار چھوڑ کر ادھر اُدھر چل دیئے ان لوگوں میں ابوموسیٰ اشعری بھی شامل تھا۔ بسر کو جب یہ بتایا گیا کہ ابوموسیٰ بھی ڈر کے مارے بھاگ گیا ہے تو اس نے کہا کہ اُسے کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے تھا جس نے علی کا نمائندہ ہوتے ہوئے انہیں خلافت سے معزول کر دیا ہو اُسے قتل نہیں کیا جا سکتا تھا بسر نے اہل مکہ کو ڈرایا دھمکایا اور انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں غلبہ دیا اور ہمارے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کیا۔ ابن ابی طالب ہی کو دیکھو کہ عراق کے ایک گوشہ میں اس طرح پڑے ہیں کہ خود اُن کی مملکت کی وسعتیں اُن پر تنگ ہو گئی ہیں۔ اللہ نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں انہیں مصیبتوں میں جکڑ رکھا ہے اور ان کے ساتھی بھی اُن سے بگڑ کر علیحدہ ہو چکے ہیں اس وقت مسلمانوں کے سربراہ معاویہ ہیں جو حضرت عثمان کے ولی اور اُن کے قصاص کے علمبردار ہیں۔ لہذا ان کی بیعت کرو۔ اور ان کی اطاعت سے منہ موڑ کر اپنی جانوں کو خطرہ میں نہ ڈالو۔ لوگ خائف و ہراساں تو تھے ہی خون آشام تلواروں کو دیکھ کر بیعت پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ان سے بیعت لی اور شیبہ ابن عثمان کو مکہ کا اقتدار سونپ کر طائف کی طرف چل دیا۔

جب بسر کچھ فاصلہ پر پہنچا تو ایک قرشی کو تبالہ کی طرف روانہ کیا اور اسے کہا کہ وہاں پر شیعوں کی بڑی جمعیت موجود ہے تم انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ چنانچہ اس نے تبالہ پہنچ کر شیعیان علی کو حراست میں لے لیا۔ ان لوگوں نے اس قرشی سے کہا کہ ہم لوگ تمہارے ہی قوم قبیلہ کے افراد ہیں ہمیں اتنی مہلت دو کہ ہم میں سے کوئی آدمی بسر کے پاس جائے اور اس سے امان کے لئے کہے اگر اس نے تحریراً امان دیدی تو بہتر ورنہ ہمیں قتل کر دینا۔ اس نے اجازت دے دی اور منیع باہلی طائف میں آیا جہاں بسر اس قرشی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منیع نے بسر سے امان کی خواہش کی اور طائف کے چند سرکردہ افراد نے بھی اس پر زور دیا ان لوگوں کے کہنے سننے سے اُس نے امان کا وعدہ کر لیا مگر امان نامہ لکھ کر دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ اور جب یہ سمجھ لیا کہ اس کے آدمی نے سب کو قتل کر لیا ہو گا یا منیع کے واپس پہنچنے تک موت کے گھاٹ

اتار دئیے جائیں گے تو امان نامہ لکھ کر دے دیا۔ منیع فوراً واپسی کے ارادہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جب اپنا سامان سفر لینے کے لئے اس خاتون کے مکان پر آیا جس کے ہاں بطور امانت رکھا تھا تو دیکھا کہ وہ موجود نہیں ہے اس نے انتظار گوارا نہ کیا اور اونٹنی پر ایک چادر ڈال کر سوار ہو گیا اور اُسے سرپٹ دوڑاتا ہوا تبالہ کی طرف چل دیا۔ ادھر وہ لوگ منیع کی واپسی سے مایوس ہو چکے تھے اور قرشی اور اس کے ہمراہی انہیں قتل کرنے کے لئے میدان میں جمع کر چکے تھے بلکہ ان میں سے ایک پر تلوار اٹھ بھی چکی تھی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ تلوار نے کام نہ کیا اور ٹوٹ گئی۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ تلواروں میں لچک پیدا کرنے کے لئے انہیں ہلاؤ جلاؤ چنانچہ انہوں نے تلواروں کو دھوپ میں ہلانا جلانا شروع کیا۔ جب منیع ایک دن اور ایک رات لگاتار پشت ناقہ پر گزارنے کے بعد بستی کے قریب پہنچا تو تلواروں کو چمکتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھا کہ تلواریں چل رہی ہیں اس نے سواری کو تیزی سے ہنکایا اور چادر ہلا ہلا کر انہیں اپنی آمد سے آگاہ کیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ان تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ جس پر تلوار اٹھائی گئی تھی وہ اسی کا بھائی تھا۔ اُس نے بڑھ کر امان نامہ دکھایا اور محنت شاقہ کے بعد اُن کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

بسر طائف سے نکل کر بنی کنانہ کی بستیوں کی طرف بڑھا جہاں عبیداللہ ابن عباس کے دو کمسن بچے قثم اور عبدالرحمٰن اور ان بچوں کی ماں ام حکیم جویریہ بنت قارظ کنانیہ مقیم تھیں۔ بسر نے ان بچوں کو تلاش کرنے کے لئے آدمی دوڑایا تاکہ انہیں قتل کرے۔ عبیداللہ ابن عباس ان بچوں کو ایک کنانی کی زیر نگرانی چھوڑ گئے تھے اس نے جب یہ دیکھا کہ بسر ان بچوں کو قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کی حمیت و غیرت نے گوارا نہ کیا، کہ خاموشی سے ان بچوں کو موت کے منہ میں جانے دے اس نے تلوار کھینچ لی اور مرنے مارنے پر اُتر آیا۔ بسر نے اس سے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں ہے اور نہ تمہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ ہے تم الگ رہو اور ان بچوں کے معاملہ میں دخل نہ دو۔ اس نے کہا کہ حق جوار کی پاسداری مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے یہ کہہ کر تن تنہا دشمن پر ٹوٹ پڑا اور لڑتا ہوا قتل ہو گیا۔ بسر نے قثم و عبدالرحمٰن کو تلاش کر کے انتہائی سفاکی و بے دردی سے قتل کر دیا۔ بنی کنانہ کی عورتوں نے سنا تو وہ گھروں سے باہر نکل آئیں اور ایک خاتون نے کہا کہ آج تک مردوں کو تو قتل کیا جاتا رہا ہے مگر اسلام تو اسلام دورِ جاہلیت میں بھی بچوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ وہ حکومت کبھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی اساس ظلم و جور پر ہو اور جس میں بچوں اور بوڑھوں پر بھی ترس نہ کھایا جاتا ہو۔ بسر نے کہا کہ خدا کی قسم میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان تمام عورتوں کو بھی تہ تیغ کر دوں کہا کہ خدا شاہد ہے کہ اگر تم ایسا کر گزرو تو ہمارے دل کی بے چینی کا مداوا ہو جائے۔ ام حکیم نے اپنے جگر پاروں کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور والہانہ طور پر اس طرح گھومتی پھرتی رہتیں گویا اپنے بچوں کو

تلاش کر رہی ہیں اور حج کے دنوں میں اپنے دردناک اشعار سے سننے والوں کے کلیجے ہلا دیتیں۔

جب امیرالمومنین کو ان بچوں کے قتل کیے جانے کی خبر ہوئی تو آپ بہت غمگین و افسردہ خاطر ہوئے۔ اور بسر کے حق میں بددعا کرتے ہوئے کہا:۔

اللّٰھم اسلبہ دینہ وعقلہ۔ خدایا اس سے دین اور عقل چھین لے۔

(تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۳)

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ وقت آیا کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ مگر اس بدحواسی کے عالم میں بھی یہ کہتا کہ مجھے تلوار دو۔ آخر لکڑی کی ایک تلوار اسے دے دی گئی اور مشک میں ہوا بھر کر اس کے سامنے رکھ دی گئی وہ اس مشک پر تلوار چلاتا اور جذبۂ خوں آشامی کی تسکین کا سامان کرتا۔ آخر اسی دیوانگی کے عالم میں مرکھپ گیا۔

غرض اسی طرح درندگی و خونخواری کا مظاہرہ کرتا ہُوا نجران میں وارد ہوا اور عبداللہ ابن عبدالمدان حارثی اور ان کے فرزند مالک کو قتل کیا۔ اہل نجران کو ہراساں کرنے کے بعد ارحب میں آیا اور ابوکرب کا خون بہایا جو امیرالمومنین کے مخلص شیعہ اور قبیلۂ ہمدان کے سردار تھے اس کے بعد یمن کے صدر مقام صنعاء کا رخ کیا۔ عمرو ابن اراکہ ثقفی نے جنہیں عبیداللہ ابن عباس اپنا قائم مقام بنا گئے تھے بچی کھچی فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور آخر اس خونریز تصادم کے نتیجہ میں مارے گئے۔ بسر نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کیا اور سینکڑوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس طوفانی دورہ میں اس نے بستیوں کو اجاڑا لوگوں کا مال و اسباب لُوٹا گھروں کو جلایا اور تیس ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے بربریت و بہیمیت کو انتہا پر پہنچا دیا۔

امیرالمومنین نے بسر کی تباہ کاریوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے اہل کوفہ سے کہا مگر انہوں نے بے حسی کا ثبوت دیا اور دشمن کے تعاقب سے پہلو بچانے لگے۔ حضرت کے بار بار جھنجھوڑنے پر ابوبردہ ابن عوف ازدی نے کہا کہ اگر آپ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ہمارے ساتھ چلیں تو ہم چلنے کے لئے تیار ہیں فرمایا تمہاری یہ رائے درست نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ میں مرکز کا نظم و نسق دوسروں پر چھوڑ کر چند رہزنوں کے پیچھے بھاگتا پھروں۔ جاریہ ابن قدامہ سعدی نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں دشمن کے تعاقب میں جانے کے لئے حاضر ہوں۔ فرمایا کہ تم بصرہ سے دو ہزار کا لشکر لے کر حجاز اور پھر یمن تک اس کا تعاقب کرو اور اسے قرار واقعی سزا دو۔ وہب ابن مسعود ثقفی نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں کوفہ سے دو ہزار کا لشکر فراہم کر کے دشمن کی سرکوبی کے لئے جاتا ہوں۔ حضرت نے اُسے بھی اجازت دی اور یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان دونوں کے روانہ ہونے کے بعد اہل کوفہ کو احساس ہوا کہ انہوں نے

حضرت کی آواز پر گرم جوشی سے لبیک نہیں کہی۔ چنانچہ چند سرکردہ افراد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین ہم نادم و شرمسار ہیں کہ ہم نے دشمن کے مقابلہ سے پہلو تہی کی اور یہ ہماری کوتاہی اور کمزوری ہی کا نتیجہ ہے کہ دشمن کو ہمارے شہروں پر حملہ آور ہونے کی جراٴت ہوئی ہے۔ ہمیں حکم دیجئے کہ ہم لشکر ترتیب دے کر دشمن کا پیچھا کریں اور اسے کیفر دار تک پہنچائیں۔ فرمایا کہ میں نے اس شخص کو بھیجا ہے جو دشمن کو حدودِ مملکت سے نکالے بغیر نہیں پلٹے گا۔ البتہ تم ان جھڑپوں کے بجائے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کرو تا کہ ان آئے دن کے حملوں کا سدِ باب ہو سکے۔ اٹھو اور معاویہ ابن ابی سفیان کے مقابلہ میں صف بندی کرو اور اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔ سعید ابن قیس ہمدانی نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم بسر و چشم حاضر ہیں میں اور میرا قبیلہ آپ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرے گا۔ ہم حدودِ مملکت کے اندر رہ کر بھی اور حدودِ مملکت سے باہر نکل کر بھی دشمن سے ٹکرائیں گے اور جان پر کھیل کر ضلالت و گمراہی کے بتوں کو پاش پاش کر دیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے۔ پھر زیاد ابن خصفہ نے اسی قسم کے الفاظ کہہ کر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ امیرالمومنین نے اہلِ کوفہ کے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اہلِ کوفہ میں شامیوں سے لڑنے کے لئے لشکر ترتیب دے رہا ہوں تم میں سے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے وہ لشکر میں شامل ہو جائے۔ اہلِ کوفہ تلواروں کو صیقل اور ہتھیاروں کو درست کر کے جوق در جوق اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ حضرت نے دس ہزار کی سپاہ پر اپنے فرزند امام حسین کو اور دس ہزار کی فوج پر قیس ابن سعد کو اور دس ہزار کے لشکر پر ابو ایوب انصاری کو افسر مقرر کیا اور اسی طرح مختلف دستوں پر مختلف افسروں کو نامزد کیا۔ آپ اس لشکر کو لے کر ایک ہفتہ کے بعد صفین کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ ایک خارجی ابن ملجم مرادی نے آپ کے سرِ اقدس پر ضرب لگا کر آپ کو شہید کر دیا۔ اس سانحۂ عظمیٰ کے رونما ہونے سے حالات دگرگوں ہو گئے افواج و عساکر کا شیرازہ درہم و برہم ہو گیا اور ایک استبدادی حکومت کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس سانحہ کے دور رس نتائج پر نظر کرنے کے بعد ایک درد دل رکھنے والا انسان اشک بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عین اس وقت جب کہ طاغوتی طاقت کو کچلنے کا سر و سامان ہو چکا تھا ایک شقی ازلی کی تلوار اس کے آگے دیوار کھڑی کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں اس تاریک دور کا آغاز ہوا جو قہر و استیلاء اور ظلم و استبداد کا مثالیہ ہے جس میں اسلام کے خد و خال مسخ ہوئے دین کی قدریں ختم ہوئیں اور روحِ حریت پژمردہ ہو کر رہ گئی۔

ادھر جاریہ ابن قدامہ بصرہ سے لشکر لے کر یمن میں آئے۔ جب عثمانیوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف نکل گئے مگر جاریہ کے لشکر نے ان کا پیچھا کر کے انہیں گھیرے میں لے لیا اور

ان میں سے چند آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ جاریہ نے بسر کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بنی تمیم کی بستیوں کی طرف چلا گیا ہے۔ جاریہ نے اس کا تعاقب کیا۔ ظالم و خونخوار بزدل تو ہوتا ہی ہے۔ اسے عراقی لشکر کے تعاقب کا پتہ چلا تو وہ یمامہ کی طرف نکل گیا۔ اور پھر وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا اور کبھی کسی سمت نکل جاتا اور کبھی کسی سمت۔ لوگ اس کی خونخواریوں سے واقف تو ہو ہی چکے تھے جدھر سے گزرتا لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے اور بنی تمیم نے تو اس کا تھوڑا بہت مال و اسباب بھی لوٹ لیا۔ جاریہ تعاقب کرتے ہوئے مقام حرمین میں پہنچے تو خستہ و درماندہ لشکر نے تقریباً ایک مہینہ یہاں قیام کیا اور پھر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مکہ پہنچ کر جاریہ نے اہل مکہ سے پوچھا کہ کیا تم نے معاویہ کی بیعت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیعت کی تو تھی مگر اس صورت میں جب بیعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہا کہ اب بیعت کرو۔ کہا کس کی بیعت کریں۔ امیرالمومنین تو دنیا سے چل بسے۔ کہا کہ پھر اصحاب علی نے جس کی بیعت کی ہے تم بھی اس کی بیعت کرو۔ چنانچہ اہل مکہ نے امام حسن کی بیعت کی اور جاریہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں ابوہریرہ امامت نماز کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ جب اس نے جاریہ کی آمد کی خبر سنی تو روپوش ہو گیا۔ جاریہ نے اس کے بھاگ نکلنے کی اطلاع ہوئی تو کہا:۔

واللّٰہ لو اخذت ابا سنور لضربت عنقہ (تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۱۰۷)	خدا کی قسم اگر ابوہریرہ میرے ہاتھ لگ جاتا تو اس کی گردن اڑا دیتا۔

پھر اہل مدینہ سے کہا کہ وہ امام حسنؑ کی بیعت کریں تمام لوگوں نے بیعت کی اور جاریہ لشکر سمیت کوفہ کی طرف سے روانہ ہو گئے۔ بسر بھی جان بچا کر شام پہنچ گیا اور اپنے سیاہ کارناموں پر معاویہ سے داد طلب ہوا۔

معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنی مملکت کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے امیرالمومنین کے مقبوضہ شہروں پر پیہم تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری کیا اور ضحاک فہری و بسر ابن ابی ارطاۃ ایسے درندہ صفت انسانوں کی قیادت میں شامیوں کے غول بھیج کر امن عامہ کو تباہ کیا گھروں کو پھونکا بستیوں کو لوٹا بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور لوگوں سے زبردستی بیعت لی۔ اگرچہ یہ سب کچھ قصاص خون عثمان کی آڑ میں کیا جا رہا تھا مگر حقیقتہً یہ جارحانہ اقدامات ہوس ملک گیری کا نتیجہ تھے جنہیں قصاص سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسی توسیع مملکت کے لئے عمارتوں کو کھنڈر بستیوں کو ویران اور بچوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ سرزمین حرم اور دارالہجرۃ مدینہ کی حرمت و عظمت کو نظر انداز کر کے فضا میں خوف و ہراس پھیلایا گیا۔ حالانکہ مکہ وہ مقام امن ہے جہاں نہ خوف و ہراس پھیلانے کا جواز ہے اور نہ قتل خونریزی

کا یہاں تک کہ پیغمبر اکرم نے فتح مکہ کے موقع پر امن عام کا حکم دے کر خون کے پیاسوں تک کو معاف کر دیا اور اس سلسلہ میں فرمایا :-

لا یحل لامرء یومن باللہ و الیوم الاخر ان یسفك بها دما ولا یعضد بها شجرة۔ (صحیح بخاری۔ ج ۳ ص ۱۶۷)	جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ میں خون بہائے اور درخت کاٹے۔

اسی طرح مدینہ بھی حرم ہے اور اہل مدینہ کو خوف زدہ کرنا ان میں خوف و دہشت پھیلانا جرم اور انتہائی سنگین جرم ہے اور پیغمبر اکرم نے مدینہ میں دہشت و ہراس پھیلانے اور وہاں کے باشندوں کو خوف زدہ کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے :-

من اخاف اهل المدینة ظلما اخافه الله وعلیه لعنة الله والملئكة والناس اجمعین لا یقبل الله منه صرفا ولا عدلا۔ (وفا الوفا۔ ج ۱ ص ۳۲)	جو شخص از روئے ظلم اہل مدینہ کو خوف زدہ کرے اللہ اُسے خوف و ہراس میں مبتلا کرے گا اور اس پر اللہ کی اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو اور خدا ایسے شخص کے نہ کسی فریضہ کو قبول کرے گا اور نہ کسی نافلہ کو۔

شہادت

سنہ ۴۰ھ میں جنگ نہروان کے چند بچے کھچے خوارج نے مکہ میں اجتماع کیا اور نہروان کے کشتوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے بھائی بندوں کے خون کی ذمہ داری علی معاویہ اور عمرو ابن عاص پر عائد ہوتی ہے لہذا ان تینوں کو قتل کر کے ہمیں اپنے کشتوں کا انتقام لینا چاہیئے۔ ان خوارج کی رگوں میں انتقامی خون تو کھول ہی رہا تھا سب نے اس پر اتفاق کیا اور برک ابن عبداللہ صریمی نے معاویہ کو عمرو ابن بکر تمیمی نے عمرو ابن عاص کو اور عبدالرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علی کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور یہ طے کیا کہ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت حملہ ہونا چاہیئے تاکہ ان میں سے ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہونے پائے ورنہ ایک کے قتل کی خبر دوسروں کو چوکنا و ہوشیار کر دے گی اور وہ حفاظتی تدابیر عمل میں لا کر اس تجویز کو ناکام بنا دیں گے۔ چنانچہ دن اور وقت کی تعیین کر کے برک ابن عبداللہ دمشق کی

طرف، عمرو ابن بکر مصر کی طرف اور عبدالرحمٰن ابن ملجم کوفہ کی طرف چل دیا۔

اس خطرناک کام کے لئے ماہِ رمضان کی انیسویں شب اور نماز صبح کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ برک ابن عبداللہ مقررہ تاریخ پر جامع دمشق آیا اور جب صبح کی جماعت کھڑی ہوئی تو وہ پہلی صف میں معاویہ کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ جب معاویہ رکوع کے لئے جھکے تو اس نے تلوار کا وار کیا جو اُن کے عقبی حصہ پر پڑا گھاؤ معمولی تھا چند دنوں میں بھر گیا اور حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔ عمرو ابن بکر انیسویں شب کو جامع مصر میں آکر ٹھہرا تاکہ صبح کی نماز میں ابن عاص کو قتل کرے مگر اتفاق ایسا ہوا کہ عمرو ابن عاص قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اپنی جگہ خارجہ ابن حذافہ سہمی کو نماز پڑھانے کے لئے بھیج دیا عمرو ابن بکر اندھیرے میں پہچان نہ سکا اور اس نے خارجہ کو عمرو ابن عاص سمجھ کر قتل کر دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور جکڑ باندھ کر عمرو ابن عاص کے پاس لائے۔ جب اسے معلوم ہُوا کہ ابن عاص کے بجائے خارجہ اس کے ہاتھ سے قتل ہُوا ہے تو اسے اپنی ناکامی پر افسوس ہُوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا وُہ ہو چکا تھا۔ عمرو ابن عاص نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا مگر تیرِ قضا کا رُخ خارجہ کی طرف مڑ گیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر خارجہ کے خون کے عوض اسے قتل کر دیا گیا۔

عبدالرحمٰن ابن ملجم آخر ماہِ شعبان میں کوفہ آیا اور محلہ بنی کندہ میں خوارج کے ہاں قیام کیا مگر کسی کو اپنے خطرناک ارادہ سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ اپنے طرزِ عمل سے اپنے موقف کو مشکوک ہونے دیا۔ اس اثنائ میں اس کی ملاقات ایک خارجیہ عورت قطام بنت اخضر تیمیہ سے ہوئی وُہ اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وُہ بے شوہر کے ہے تو اس سے نکاح کی خواہش کی۔ قطام کا باپ اور بھائی جنگ نہروان میں مارے گئے تھے اور وُہ حضرت علی سے انتقام لینا چاہتی تھی مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس خواستگاری سے اس کے دل میں انتقام کی افسردہ آگ پھر سے بھڑک اٹھی اور اسے کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں راضی ہوں مگر میرا مہر تین ہزار درہم ایک غلام ایک کنیز اور علی ابن ابی طالب کا قتل ہے۔ ابن ملجم اس جرم کے ارتکاب پر تلا ہوا تھا ایک تو وہ اسی مقصد سے آیا تھا اور دوسرے اس مقصد کے پیچھے ایک اور قوی محرک کارفرما ہو چکا تھا مگر بظاہر اس پر حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ علی کو قتل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ قطام نے کہا کہ تم اچانک حملہ کر کے ان کا کام تمام کر سکتے ہو اگر تم کامیاب ہو گئے تو بہتر ورنہ وہ ثواب آخرت تو کہیں نہیں گیا جس کے تم بہرحال مستحق ہو گے۔ ابن ملجم نے جب دیکھا کہ قطام اس کے خیالات و نظریات سے پوری

طرح ہم آہنگ ہے تو کہا کہ میں اسی ارادہ سے یہاں آیا ہوں اور علی کو قتل کر کے نہروان کے کشتوں کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ قطام نے کہا کہ پھر ہمت و جرأت سے کام لو اور میں اپنے قبیلہ کے قابل اعتماد لوگوں سے کہوں گی کہ وہ اس سلسلہ میں تمہاری مدد کریں۔ چنانچہ اس نے وردان ابن مجاہد کو اس کی مدد کے لئے آمادہ کیا اور ابن ملجم نے شبیب ابن بجرہ اشجعی کو اپنا معاون اور اشعث ابن قیس کو اپنا ہمراز بنا لیا اور حملہ کے لئے دن اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

امیرالمومنین اس ماہ رمضان میں باری باری اپنی اولاد اور عبداللہ ابن جعفر کے ہاں روزہ افطار فرماتے غذا بہت کم ہو چکی تھی لقموں پر اکتفار کرتے اور پوچھا جاتا تو فرماتے:۔

احب ان یاتینی امر اللہ وانا خمیص۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص۱۹۵)

میں چاہتا ہوں کہ جب میری موت آئے تو میں خالی شکم ہوں"

انیسویں شب کو حضرت اپنی دختر جناب ام کلثوم کے ہاں تشریف فرما تھے انہوں نے جو کی دو روٹیاں ایک پیالہ دودھ کا اور ایک طشتری میں نمک رکھ کر پیش کیا۔ آپ نے اس کھانے کو دیکھا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کی پیروی میں کبھی گوارا نہیں کیا کہ ایک وقت میں دسترخوان پر دو قسم کی چیزیں ہوں۔ اے بیٹی دنیا کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عقاب۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا باپ دیر تک موقف حساب میں کھڑا رہے۔ ان دو چیزوں میں سے ایک چیز اٹھا لو جناب ام کلثوم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اور آپ نے چند لقمے نمک کے ساتھ تناول فرمائے۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول مصلائے عبادت پر کھڑے ہو گئے مگر آج بار بار صحن میں نکلتے آسمان پر نظر کرتے اور ڈوبتے اور جھلملاتے ستاروں کو دیکھتے اور فرماتے:۔

واللہ ماکذبت ولاکذبت و انہا اللیلۃ التی وعدت بہا۔ (صواعق محرقہ ص۱۳۴)

خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا اور نہ مجھے غلط بتایا گیا ہے یہی وہ رات ہے جس کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے"

آپ کرب و اضطراب کی حالت میں کبھی سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے کبھی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور کبھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھتے اور کبھی کہتے اللھم بارک لی فی الموت۔ خدایا موت کو میرے لئے بابرکت قرار دے" ام کلثوم نے یہ کیفیت دیکھی تو عرض کیا کہ بابا آج آپ اتنے پریشان حال کیوں ہیں فرمایا کہ بیٹی آخرت کی منزل درپیش ہے اور میں اللہ کی بارگاہ میں جانے والا ہوں۔ ام کلثوم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ بابا آج آپ مسجد میں تشریف نہ لے جائیں جعدہ ابن ہبیرہ

موجود ہیں انہیں حکم دیجئے کہ وہ نماز پڑھا دیں۔ فرمایا لامفر من قضاء اللہ قضائے الٰہی سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے" ابھی کچھ رات باقی تھی کہ ابن نباج مؤذن نے حاضر ہو کر نماز کے لیے عرض کیا۔ حضرت مسجد کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب صحن خانہ میں آئے تو گھر میں پلی ہوئی بطوں نے پر پھڑ پھڑائے اور چیخنے چلانے لگیں۔ کسی نے ان بطوں کو ہٹانا چاہا تو فرمایا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ابھی کچھ دیر کے بعد نوحہ و بکا اور نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوں گی۔ امام حسنؑ یا ام کلثوم نے عرض کیا کہ بابا آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں فرمایا کلمہ حق تھا جو میری زبان پر جاری ہو گیا ہے۔ پھر حضرت نے ام کلثوم سے فرمایا کہ بیٹی یہ بے زبان جانور ہیں ان کے آب و دانہ کا خیال رکھنا اور اگر ایسا نہ کر سکو تو انہیں رہا کر دینا تاکہ یہ زمین میں چل پھر کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ جب دروازہ کے قریب پہنچے تو پٹکا کمر میں کس کر باندھا اور احیحہ انصاری کے یہ دو شعر پڑھے ؎

اشدد حیازیمک للموت فان الموت لاقیکا

"موت کے لئے کمر کس لو کہ موت تمہارے سامنے آنے والی ہے۔"

ولا تجزع من الموت اذا حل بوادیکا

"جب موت تمہارے ہاں ڈیرے ڈالے تو اس پر بے تابی کا مظاہرہ نہ کرو"

اُم کلثوم نے آنسو بہاتے ہوئے باپ کو الوداع کہا۔ امام حسنؑ نے چاہا کہ مسجد تک حضرت کے ہمرکاب جائیں مگر آپ نے منع کر دیا۔ جب مسجد میں تشریف لائے تو مسجد تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی آپ نے اندھیرے میں چند رکعات نماز پڑھی اور تعقیبات سے فارغ ہوئے تو خونریز سحر نمودار ہو چکی تھی آپ گلدستۂ اذان پر تشریف لے گئے اور صبح کی اذان دی یہ آپ کی آخری اذان تھی جو مسجد سے بلند ہوئی اور کوفہ کے ہر گھر میں سنی گئی۔ اذان کے بعد الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہہ کر لوگوں کو نماز صبح کے لئے بیدار کرنے لگے انہی لوگوں میں ابن ملجم بھی تھا۔ آپ نے اُسے اوندھا لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ شیطان کے سونے کا انداز ہے۔ داہنی کروٹ سو جو مومنین کا شعار ہے یا بائیں کروٹ لیٹ جو حکماً کا طریقہ ہے یا پیٹھ کے بل سو جو انبیا کا طرز عمل ہے۔ اٹھ نماز پڑھ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تو کس ارادہ سے آیا ہے اور کیا چیز زیر دامن چھپائے ہوئے ہے۔

حضرت لوگوں کو بیدار کرنے کے بعد محراب عبادت میں کھڑے ہو گئے اور جب نافلۂ صبح کی پہلی رکعت کے سجدہ سے سر اٹھایا تو شبیب ابن بجرہ نے تلوار سے حملہ کیا مگر تلوار ستون مسجد سے ٹکرائی اور اس کا وار ناکام رہا۔ پھر ابن ملجم نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سر پر ماری جس سے فرق مبارک شگافتہ ہو گیا آپ نے بیساختہ فرمایا

بسم اللہ وعلیٰ ملة رسول اللہ فزت ورب الکعبة "ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا ہوں"
لوگو مجھے یہودیہ کے بیٹے ابن ملجم نے قتل کر ڈالا ہے۔ امام بمنزلۂ روحِ کائنات اور جانِ عالم ہوتا ہے۔ جب
جان پر بنتی ہے تو اعضا متاثر و مضمحل ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ اس موقع پر آسمان کانپا زمین لرزی
مسجد کے دروازے آپس میں ٹکرائے اور زمین و آسمان کے درمیان یہ آواز گونجی تهدمت واللہ ارکان
الهدیٰ قتل ابن عم المصطفیٰ قتل الوصی المجتبیٰ قتل علی المرتضیٰ۔ خدا کی قسم رُکن ہدایت گر گئے
ابن عم رسول قتل کر دیئے گئے وصی پیغمبر مارے گئے علی مرتضیٰ شہید کر دیئے گئے"۔ اس آواز نے کوفہ کی آبادی
کو لرزا دیا تمام شہر کانپ اٹھا لوگ جوق در جوق گھروں سے باہر نکل آئے۔ امام حسن اور امام حسین علیہما
السلام سراسیمہ و پریشان حال مسجد کی طرف دوڑے جہاں لوگ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور چیخ چیخ
کر کہہ رہے تھے کہ امیرالمومنین شہید کر دیئے گئے۔ فرزندانِ رسول نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ محرابِ مسجد لہو
سے تر ہے اور حضرت خاک و خون میں پڑے لوٹ رہے ہیں اور مٹی اٹھا اٹھا کر فرق مبارک پر ڈالتے اور
اس آیت کی تلاوت فرماتے جاتے ہیں:۔

منها خلقناكم وفيها نعيدكم — "ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور زمین کی طرف
ومنها نخرجكم تارة اخرى۔ — پلٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ نکالیں گے"۔

امیرالمومنین کے چہرہ و سر کو خون میں رنگین دیکھ کر امام حسن نے گلوگیر آواز میں کہا کہ بابا آپ کا خون
کس نے بہایا ہے۔ حضرت نے سر اٹھا کر حسن کو دیکھا اور فرمایا بیٹا پہلے نماز ادا کرو۔ چنانچہ امام حسنؑ نے
نماز پڑھائی اور خود حضرت نے بیٹھ کر نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت کو محرابِ مسجد سے صحن میں
لایا گیا۔ اس متوحش خبر کو سن کر لوگ سمٹ کر مسجد میں جمع ہو چکے تھے ہر چشم اشکبار اور ہر دل غم سے فگار
تھا۔ امام حسنؑ نے قاتل کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا مجھے ابن ملجم مرادی نے قتل کیا ہے اور باب کندہ
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی اس دروازہ سے اسے لایا چاہتے ہیں۔ اتنے میں باب کندہ کی طرف سے
شور اُٹھا اور ابن ملجم گرفتار کر کے لایا گیا۔ مجمع غم و غصہ سے بے قابو ہو رہا تھا آنکھوں سے غیظ و غضب
کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ہر شخص اس پر لعنت بھیج رہا تھا۔ جب اُسے امام حسنؑ کے سامنے لایا
گیا تو آپ نے اس سے کہا کہ اے بدبخت و لعین تُو نے امیرالمومنین کو قتل کر دیا ہے کیا یہ ان احسانات
کا بدلہ ہے جو انہوں نے ہمیشہ تم پر کئے۔ ابن ملجم سر جھکائے خاموش کھڑا رہا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔
امیرالمومنین نے غشی سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور فرمایا کہ اے ابن ملجم کیا میں تیرا اچھا امام نہ تھا
اور کیا میرے احسانات بھلا دیئے جانے کے قابل تھے۔ اس پر ابن ملجم نے کہا:۔ افانت تنقذ من فی النار"

کیا آپ اسے چھڑائیں گے جو دوزخ کا سامان کر چکا ہو؟ اس کے بعد آپ نے امام حسن کی طرف رُخ کیا اور فرمایا کہ اے فرزند اگر میں بچ رہا تو مجھے اختیار ہوگا کہ اسے سزا دوں یا معاف کردوں۔ اور اگر اس ضربت کے نتیجہ میں چل بسا تو تم اسے قصاصاً قتل کردینا اور ایک ضربت کے بدلے ایک ضربت لگانا اور اور قتل کے بعد اس کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا کیونکہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے ایاکم والمثلۃ ولو بالکلب العقور۔ "خبردار کسی کو مثلہ نہ کرنا اگرچہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو" اور اس کے ایام اسیری میں جو خود کھانا وہ اسے کھانے کے لئے دینا اور جو خود پیتا وہ اسے پینے کے لئے دینا۔

اب لوگ حضرت کو ہاتھوں پر اٹھا کر گھر میں لائے گھر کے باہر کہرام بپا تھا امام حسنؑ گریہ وزاری کی آوازیں سُن کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ اے لوگو امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ تم اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ لوگ منتشر ہوگئے مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں حضرت کو دیکھے بغیر واپس جاؤں وہیں پر کھڑا رہا اور جب امام حسن دوبارہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا کہ فرزند رسولؐ میں امیرالمومنین کو دیکھے بغیر جانا نہیں چاہتا مجھے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ امام حسنؑ اندر تشریف لیگئے اور کچھ دیر کے بعد باہر نکلے اور مجھے اپنے ہمراہ اندر لے گئے میں نے دیکھا کہ حضرت کے سر پہ زرد رنگ کی پٹی بندھی ہوئی اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ میں پٹی اور چہرے کی رنگت میں تمیز نہ کرسکا اور بے ساختہ رونے لگا۔ حضرت نے مجھے روتے دیکھا تو فرمایا کہ اے اصبغ روؤ نہیں میں جنت کی طرف جارہا ہوں۔ میں نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے معلوم ہے کہ آپ جنت میں جائیں گے مگر میں تو آپ کی مفارقت پر روتا ہوں اب ہمارا کون پُرسانِ حال ہوگا اور یتیموں اور بیواؤں کی کون دستگیری کرے گا یہ کہہ کر اصبغ اُٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت پر نقاہت طاری ہوگئی اور غشی کے دورے پڑنے لگے کبھی ہوش میں آجاتے اور کبھی بے ہوش ہوجاتے۔ امام حسنؑ نے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا آپ نے کچھ پیا اور فرمایا کہ ابن ملجم کو بھی دودھ کا شربت دیا جائے۔ اس عرصہ میں کوفہ کے طبیب جمع ہوگئے۔ ان میں مشہور جراح اور ماہر طبیب اثیر ابن عمرو سکونی بھی تھا اس نے زخم کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ اس کاری ضرب سے جانبر ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ زہر آلود تلوار سے مغزِ سر بھی متاثر ہوا ہے اور جسم میں بھی زہر پھیل چکا ہے۔ یہ سن کر سب کو حضرت کی زندگی سے ناامیدی ہوگئی۔ سینوں میں دل بیٹھنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت نے انیسویں اور بیسویں رات انتہائی کرب و تکلیف میں گزاری اور جب اکیسویں رات کا دو تہائی حصہ گزرا تو حالت دگرگوں ہوگئی۔ پیشانی پر موت کا پسینہ آیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر جان، جان آفرین کے سپرد کردی اور روح طیب عالم قدس کی طرف پرواز کرگئی۔ تقوی و راستبازی کا

چراغ گل ہوگیا علم وعمل کا آفتاب گہنا گیا دُنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ افسوس جس کی زیست کا ہر لمحہ حق کی نصرت اور باطل کے خلاف جہاد میں گزرا ایک شقی ازلی کی تلوار سے مجروح ہو کر دُنیا سے چل بسا اور جس کی زندگی کی راتیں محراب عبادت میں جاگ کر گزریں لحد کا گوشہ آباد کرنے کیلئے ابدی نیند سو گیا۔

قتل ایک جرم ہے مگر قتل کی نوعیت مقتول کی حیثیت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کے اعتبار سے اس کی سنگینی اور سزا کے درجوں میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک عام فرد کا قتل جرم اور بڑا جرم ہے مگر قتل مومن اس سے بھی بڑھ کر جرم ہے۔ جس کی سزا نص قرآن کی رُو سے دوزخ کا دائمی عذاب ہے اور امیرالمومنین کا قتل تو ہر اعتبار سے سنگین جرم اور عظیم حادثہ تھا جس نے دینی حدوں کو پامال اور اسلامی قدروں کو مجروح کر دیا اس لحاظ سے قاتل دنیا و آخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق ہو گا۔ یہ ایک عابد شب زندہ دار کا قتل تھا جو محراب مسجد میں اور سجدہ کی حالت میں واقع ہُوا۔ قاتل نے نہ مسجد کی تقدیس کا خیال کیا نہ نماز کا احترام ملحوظ رکھا نہ سجدہ کی حالت پر نظر کی اور اس نمازی کا خون بہایا جو اسلام کا پاسبان ثانی قرآن اور سراپا ایمان تھا۔ اس سانحہ کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ حادثہ اس وقت رونما ہوا جب حضرت لشکر و سپاہ جمع کر چکے تھے اور دو چار دن کے بعد شام کی طرف کوچ کرنے والے تھے تاکہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑ کر ضلالت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں مگر ایسا نہ ہو سکا اور اس قتل کے نتیجہ میں غیر شرعی اقتدار کے قدم گڑ گئے اور افق اسلام پر ضلالت و گمراہی کی گھٹائیں چھا گئیں۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کی تہ میں کوئی سازش کار فرما ہو۔ اگر ایک باجگزار کے ذریعہ مالک اشتر کو اور جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ امام حسنؑ کو زہر دے کر راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے تو امیرالمومنین کی زندگی ختم کرنیکا منصوبہ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ اقدام کسی خاص تحریک کا نتیجہ ہو یا انتقامی جذبہ کا قاتل کی شقاوت و محسن کشی تاریخ کا ایک مثالیہ ہے اور پیغمبر اکرم نے بھی اپنے ارشادات میں حضرت کے قاتل کو شقی ترین امت اور عاقر ناقہ صالح کے مانند قرار دیا ہے۔ چنانچہ جابر ابن سمرہ کہتے ہیں :۔

قال رسول اللہ لعلی من اشقی الاولین قال عاقر الناقۃ قال فمن اشقی الآخرین قال اللہ و رسولہ اعلم قال قاتلک۔	رسول اللہ نے حضرت علی سے کہا کہ پہلے لوگوں میں شقی ترین مردم کون ہے کہا اونٹنی کو پے کرنے والا۔ فرمایا بعد والوں میں زیادہ شقی کون ہے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے فرمایا، وہ تمہارا قاتل ہے۔"
(تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۱ ص ۱۳۵)	

ناقہ صالح حضرت صالح کا معجزہ تھا اور علی ابن ابی طالب پیغمبر اسلام کا معجزہ تھے۔

"یکے از معجزات او، علی بود"

اگر ناقۂ صالح کا پے کرنے والا جہنم کا مستحق قرار پا چکا ہے تو حضرت علی کا قاتل دوزخ کے عذاب سے کیونکر بچ سکتا ہے جب کہ دونوں نے یکساں نبوت کے معجزہ کو ختم کیا اور آیتِ الٰہیہ کو مٹایا اس کے بعد ابن حزم وغیرہ کی اس رائے کو کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا کہ یہ قتل خطائے اجتہادی کا نتیجہ تھا اور نہ اس طرح جرم کی سنگینی کو ہلکا کر کے قاتل کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

تجہیز و تکفین

اکیسویں رات کے چند لمحے باقی ہیں چاند کی پھیکی پھیکی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ستارے تھرتھرا رہے ہیں اور کاشانۂ امامت میں خاموشی چھائی ہوئی ہے ایک طرف اعزہ کا مجمع ہے اور ایک جانب چند اصحاب حسرت و اندوہ کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ اور آنسوؤں اور آہوں میں غسل و کفن کا سر و سامان کیا جا رہا ہے۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام نے غسل دیا اس طرح کہ امام حسینؑ پانی ڈالتے تھے اور امام حسنؑ غسل دیتے تھے اور ایک روایت کی بنا پر محمد ابن حنفیہ پانی ڈالتے تھے اور حسنین علیہما السلام غسل دیتے جاتے تھے۔ غسل کے بعد اس کافور سے جو پیغمبر اکرمؐ کے غسل سے بچ رہا تھا حنوط کیا گیا۔ غسل و حنوط کے بعد سفید پارچوں کا کفن دیا گیا اور امیر المومنین کے حسب وصیت فرزندانِ امیر المومنین نے راتوں رات جنازہ اٹھایا اور دفن کے لئے کوفہ کی غربی جانب حیرہ کی طرف چل دیئے۔ جب حیرہ کے قریب سرزمین نجف پہنچے تو جنازہ زمین پر رکھ دیا اور امام حسنؑ نے سات تکبیروں یا پانچ تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ با جماعت ادا کی۔ دینوری نے تحریر کیا ہے:-

دفن علی رضی اللہ عنہ وصلی علیہ الحسن وکبر خمساً۔

"علی رضی اللہ عنہ مدفون ہوئے اور حسنؑ نے نماز جنازہ پڑھی اور پانچ تکبیریں کہیں۔"

(اخبار الطوال۔ صہ ۲۱۶)

نماز جنازہ کے بعد سفید پہاڑیوں کے درمیان ایک مقام سے مٹی ہٹائی تو قبر اور لحد تیار ملی حسنین علیہما السلام محمد ابن حنفیہ اور عبد اللہ ابن جعفر قبر میں اترے اور نعشِ اقدس کو لحد میں اتارا اور لحد کو اینٹوں سے بند کر کے مٹی ڈالی اور قبر زمین کے برابر کر دی۔

صلی الالہ علی جسم تضمنہ قبر فاصبح فیہ العدل مدفونا

نجف کے ریگزار میں نعش اطہر کو خاموشی کے ساتھ سپرد لحد کر دیا گیا اور لوگوں کو دفن کا علم اس وقت ہوا جب حسنین علیہما السلام اور دوسرے اعزہ و اصحاب پلٹ کر کوفہ واپس آئے۔ اب عوام میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ کسی نے کہا کہ آپ دارالامارہ میں دفن کئے گئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ مسجد کوفہ میں کسی نے کہا کہ رحبۂ کوفہ میں اور کسی نے کہا کہ بغداد کے محلہ کرخ میں مگر قبر کے محل و وقوع کا صحیح علم امیرالمومنین کی اولاد اور ان مخصوص اصحاب کے علاوہ جو شریک جنازہ تھے کسی کو نہ تھا۔ قبر کے مخفی رکھنے میں یہ مصلحت کارفرما تھی کہ خوارج اور اموی حکمران اس وحشیانہ طرز عمل کا اعادہ نہ کر سکیں۔ جس کا مظاہرہ اُحد میں شہداء کے اعضاء و جوارح کاٹنے کی صورت میں ہو چکا تھا۔ جب اموی دور ختم ہو گیا اور وقتی طور پر فضا پُرسکون ہوئی تو ابوالعباس السفاح کے دور میں امام جعفر صادق عراق میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے اصحاب میں سے ابوبصیر، عبداللہ ابن طلحہ، معلی ابن خنیس، یونس ابن ظبیان اور زرارہ وغیرہ کو قبر کے محل وقوع سے مطلع کیا جس کے بعد خواص شیعہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امام جعفر صادق اور دوسرے آئمہ اہلبیت کے اتفاق اور فرقۂ امامیہ کے اجماع کے بعد یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ امیرالمومنین کا مدفن نجف اشرف میں ہے جو سلطنت عباسیہ کے اوائل سے لے کر اب تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے اور علمائے اہلسنت نے بھی اپنی کتابوں میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں :۔

والاصح ان قبرہ ھو الموضع الذی یزار و یتبرک بہ۔
(تاریخ کامل۔ ج ۳ صہ ۱۹۹)

”صحیح تر قول یہی ہے کہ آپ کی قبر وہی ہے جس کی زیارت کی جاتی ہے اور برکت کے حصول کا ذریعہ ہے۔“

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ ابوالغنائم محمد ابن علی متوفی ۵۱۰ھ کہا کرتے تھے کہ :۔

مات بالکوفۃ ثلثمائۃ صحابی لیس قبر احد منھم معروفا الا قبر امیرالمومنین و ھو ھذا القبر الذی یزورہ الناس الآن۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱ صہ ۴۵)

”کوفہ میں تین سو صحابیوں نے وفات پائی۔ مگر امیرالمومنین کی قبر کے علاوہ کسی کی قبر کا پتہ نہیں ہے اور حضرت کی قبر وہی ہے جس کی لوگ اب زیارت کرتے ہیں۔“

چند تاثرات

امیرالمومنین کی شہادت عالم اسلام کا ایک عظیم سانحہ تھی جس نے ہر اُس فرد کو جو انسانی اقدار سے آشنا تھا متاثر کیا خصوصاً کوفہ میں جہاں یہ روح فرسا المیہ رونما ہوا ہر شخص غمگین وافسردہ خاطر تھا حضرت کے عزیز واقارب کی نظروں میں تو دُنیا تاریک ہو ہی چکی تھی دوستوں کے ولولے بھی سرد پڑ گئے اور غم و رنج نے ان کا ذہنی سکون تہ و بالا کر دیا بلکہ دشمن بھی حضرت کی شخصیت اور کردار کی بلندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُن کی زبانوں پر ایسے کلمات آ گئے ہیں جن سے آپ کی عظمت کا واضح اعتراف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند تاثرات درج کئے جاتے ہیں جنہیں صفحاتِ تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے:۔

لقد قتلتم الليلة رجلا فى ليلة فيها نزل القرآن وفيها رفع عيسى وفيها قتل يوشع ابن نون والله ماسبقه احد كان قبله ولا يدركه احد يكون بعده (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۰۱)

تم نے ایک بزرگ کو اس رات میں قتل کیا جس میں قرآن نازل ہوا، عیسیٰ آسمان پر اٹھائے گئے اور یوشع ابن نون قتل ہوئے۔ خدا کی قسم اگلے لوگوں میں سے کوئی ان پر سبقت نہ لے سکا اور بعد والوں میں سے کوئی ان کے مرتبہ و مقام کو نہ پا سکے گا“

عبداللہ ابن عباس نے کہا:۔

والله لقد كانت الدنيا اهون عليه من شسع نعله ليث فى اللوغا بحر فى المجالس حكيم فى الحكما هيهات قد مضى الى الدرجات العلى۔

خدا کی قسم دنیا ان کی نظروں میں جوتی کے تسمے سے بھی زیادہ بے ارزش تھی وہ رزم میں شیر بزم میں دریا اور صفِ حکما میں حکیم و دانا تھے۔ افسوس وہ چل بسے اور درجاتِ عالیہ پر فائز ہو گئے“

صعصعہ ابن صوحان عبدی نے قبر مطہر پہ ہاتھ رکھ کر کہا:۔

اسئل الله ان يمن علينا باقتفاء اثرك والعمل بسيرتك والموالاة لاوليائك والمعاداة لاعدائك وان يحشرنا فى زمرة اوليائك فقد نلت مالم ينله احد وادركت مالم يدركه احد۔ (بحارالانوار)

میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وُہ ہم پر یہ احسان فرمائے کہ ہم آپ کے نقش قدم پر چلیں آپ کی سیرت پر عمل کریں آپ کے دوستوں سے دوستی اور آپ کے دشمنوں سے دشمنی رکھیں اور اللہ ہمیں آپ کے دوستوں کی جماعت میں محشور کرے۔ جو مرتبہ آپ نے پایا وہ کوئی پا نہ سکا اور جو مقام آپ نے حاصل کیا وُہ کوئی حاصل نہ کر سکا“

معاویہ نے حضرت کی خبر شہادت سُن کر کہا۔

ذھب الفقھہ والعلم بموت ابن ابی طالب۔ (استیعاب ج ۲ ص۴۵)

ابن ابی طالب کی موت سے فقہ و علم کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت عائشہ نے خبر شہادت سنی تو کہا۔

لتصنع العرب ماشاءت فلیس لھا احد ینھاھا۔ (ریاض النضرہ ص۲۳)

اب اہل عرب جو چاہیں کریں اب کوئی نہیں ہے جو انہیں روکے ٹوکے۔

ابنِ ملجم اور اس کے ساتھیوں کا انجام

امیرالمومنین کے قتل میں چار افراد عبدالرحمٰن ابن ملجم، قطام بنت اخضر، شبیب ابن بجرہ اور وردان ابن مجالد شریک تھے۔ جب حادثہ قتل کے بعد مسجد میں شور بلند ہوا اور لوگ محراب کی طرف بڑھے تو وردان بھاگ کر اپنے گھر میں آ گیا۔ اس کے ایک عزیز کو اس کے شریک قتل ہونے کا علم ہوا تو اس نے تلوار سے اُس کا کام تمام کر دیا۔ ابن ملجم حملہ کرنے کے بعد بھاگ نکلا تھا لوگوں نے اُسے بھاگتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا۔ اس نے تعاقب کرنے والوں کو قتل کی دھمکی دی مگر قبیلہ ہمدان کا ایک شخص اور مغیرہ ابن نوفل اُسے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ امیرالمومنین کے سپردِ لحد کئے جانے تک اُسے حراست میں رکھا گیا اور جب امام حسنؑ دفن سے فارغ ہو کر کوفہ میں آئے تو اُسے طلب کیا اور اس سے کہا کہ اے دشمن خدا تم نے کس جرم کی پاداش میں امیرالمومنین کو قتل کیا ہے کیا انہوں نے تم سے کوئی برا سلوک کیا تھا۔ کہا کہ میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ انہیں قتل کروں گا۔ چنانچہ میں نے انہیں قتل کر کے اپنا عہد پورا کر دیا ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے قصاص لیں چاہے معاف کر دیں۔ اگر آپ امان دیں گے تو میں معاویہ کو قتل کر کے آپ کو ہمیشہ کے لئے مطمئن کر دوں گا۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ تم اسی کے سزاوار ہو کہ تمہیں کیفر دار تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ ہیثم بنت اسود نخعیہ نے کہا کہ اس کا لاشہ میرے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کا لاشہ اُسے دے دیا گیا اور اس نے آگ روشن کر کے اسے جلا دیا اس کے بعد بپھرے ہوئے ہجوم نے قطام کے گھر کا رُخ کیا۔ اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذرِ آتش کر دیا اور اس کا گھر بار لوٹ لیا۔

شبیب ابن بجرہ لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر بچ رہا تھا جب معاویہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد کوفہ میں آئے تو شبیب ان کے پاس آیا اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کہا کہ میں علی کو قتل کرنے میں ابن ملجم کا شریک کار تھا معاویہ نے یہ سنا تو گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے قبیلہ والوں کو پیغام بھجوایا کہ اگر میں نے پھر شبیب کو یہاں

دیکھا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ لہٰذا اسے کوفہ سے باہر نکال دو۔ اس نے یہ سنا تو رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور جب مغیرہ ابنِ شعبہ کوفہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس کے لشکر کے مقابلہ میں اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔

نجف کی آباد کاری

نجف کوفہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر مغرب کی سمت واقع ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں پانی کا ذخیرہ جمع تھا جو ان یانے کے نام سے موسوم تھا۔ جب پانی زمین کی گہرائیوں میں جذب ہو گیا تو ان جف یانے جف کہا جانے لگا۔ یعنی ان یانے خشک ہو گیا پھر کثرت استعمال سے نجف کہلانے لگا۔ نجف سے متصل ایک قدیم آبادی تھی جو کوفہ سے تین میل کے فاصلہ پر حیرہ کے نام سے موسوم تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع ریگزار تھا جو ملطاط کہلاتا تھا۔ حیرہ کی بنیاد کلدانیوں کے فرمانروا بخت نصر نے رکھی۔ اور سکندر مقدونی نے اس کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حیرہ کی آبادی انبار کی طرف منتقل ہو گئی اور حیرہ ویران ہو گیا۔ آبادیاں اجڑتی بستی رہتی ہیں۔ چنانچہ ویرانی کے بعد اس کی آبادی کی پھر صورت نکل آئی اور مالک ابن فہم جو یمن کے غرق آب ہونے کا خطرہ محسوس کر کے وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا اس نے عراق میں طرح اقامت ڈالی اور وہاں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اس کے بعد اس کا بیٹا جذیمہ ابرش بر سر اقتدار آیا اور جب وہ زباء ملکہ جزیرہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجا عمرو ابن عدی ۲۴۰ء میں شاہ پور اول کے دور میں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ عمرو نے زمام حکومت ہاتھوں میں لینے کے بعد حیرہ کو اپنی منزل قرار دیا جس کے بعد فرمانروایان عراق کا مستقلاً پائے تخت قرار پا گیا۔ گھنے باغوں اور نخلستانوں سے اس کی رونق بڑھی اور خورنق و سدیر ایسی فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہاں کے باشندوں کا ذریعہ معیشت کاشتکاری و باغبانی تھا مگر ایران کے زیر اثر اور اس کی سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے ایرانی سرحدوں اور تجارتی قافلوں کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیتے اور ایران سے اس کا معاوضہ لیتے اور خوشحال زندگی بسر کرتے۔ جب فتح عراق کے بعد کوفہ کی بنیاد رکھی گئی تو یہاں کی آبادی کوفہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور اس کی عمارتوں کے اینٹ پتھر بھی کوفہ کی بعض عمارتوں کے کام میں آئے اور حیرہ جو سرسبز و شاداب مقام پر تھا۔ ویران اور ریت کا میدان ہو کر رہ گیا اور جب حیرہ کے جوار میں امیرالمومنین مدفون ہوئے، تو پھر آبادی کا رُخ ادھر ہو گیا اور دوسری صدی ہجری کے وسط سے مختلف دیار و امصار کے لوگ ترک وطن کر کے یہاں آباد ہونے لگے اور یہ آبادی نجف مشہد اور غری کے نام سے یاد کی جانے لگی اور حیرہ کا نام صرف صفحات تاریخ پر باقی رہ گیا بلکہ کوفہ بھی اپنے پھیلاؤ کے باوجود اس کی ایک ملحقہ

آبادی ہو کر رہ گیا۔ غری کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جذیمہ ابرش نے نجف کے قریب اپنے دو ندیموں مالک اور عقیل کی قبروں پر دو بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ جنہیں غریین کہا جاتا تھا رفتہ رفتہ غریین کے بجائے زبانوں پر غری آنے لگا اور پھر سرزمین نجف کو قرب کی بنا پر غری کہا جانے لگا۔

جب شیعیان امیرالمومنین نے یہاں مجاورت اختیار کی تو انہوں نے مرقد امیرالمومنین کے گرد و پیش حجرے اور جھونپڑیاں تعمیر کر لیں آبادی روز بروز بڑھتی گئی اور آبادی کے ساتھ تعمیرات میں اضافہ ہوتا گیا اور جہاں خاک اڑتی تھی وہاں شہر بس گیا۔ نجف سے شام تک خشکی کی راہ تھی اور بادیہ نشین عربوں سے لوٹ مار کا خطرہ رہتا تھا اس خطرہ کے پیش نظر امراء و سلاطین شیعہ نے شہر کے گرد چار دیواری کی ضرورت محسوس کی۔

چنانچہ سب سے پہلے عضدالدولہ فناخسرو نے ۳۶۷ھ اور ۳۷۲ھ کے درمیانی عرصہ میں مرقد امیرالمومنین کی تعمیر شروع کی تو شہر کے گرد چار دیواری کی تعمیر کا بھی اہتمام کیا جس میں حسب ضرورت توسیع و ترمیم ہوتی رہی چنانچہ ۴۰۰ھ میں سلطان الدولہ دیلمی کے وزیر ابو محمد ابن سہلان نے پہلی فصیل کو منہدم کر کے اس سے وسیع تر فصیل بنوائی۔ ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے:۔

مرض ابو محمد ابن سهلان فاشتد مرضه فنذران عوفى بنى سورا على مشهد امير المومنين عليه السلام فعوفى فامر ببناء سور عليه فبنى فى هذه السنة۔	ابو محمد ابن سہلان بیمار ہو گئے۔ جب بیماری نے شدت اختیار کی تو انہوں نے منت مانی کہ اگر انہیں شفا ہوئی تو وہ امیرالمومنین علی علیہ السلام کے مشہد کے گرد فصیل تعمیر کریں گے۔ چنانچہ انہیں صحت ہو گئی اور انہوں نے فصیل کی تعمیر کا حکم دیا اور وہ اسی سال (۴۰۰ھ) میں تعمیر کر دی گئی۔"
(تاریخ کامل، ج ۹، ص ۲۲۲)	

آخری فصیل فتح علی شاہ قاچار متوفی ۱۲۵۰ھ کے وزیر نظام الدولہ اصفہانی نے تعمیر کی مگر شہر کے پھیلاؤ کی بنا پر اس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے۔

نجف کی آبادی خالص شیعہ افراد پر مشتمل ہے جن میں ایک بڑی تعداد ان طلبۂ علوم دینیہ کی ہے جو مختلف ممالک سے سمٹ کر ہر دور میں یہاں مقیم رہتے ہیں اور اس مرکز افادہ و فیضان اور سرچشمۂ علم و عرفان سے اپنی تشنگی دور کرتے ہیں اگرچہ نجف بہت پہلے سے ایک معہد علمی قرار پا چکا تھا مگر ۴۴۸ھ میں جب شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی بغداد کے آئے دن کے جھگڑوں اور شورشوں سے تنگ آ کر نجف میں چلے آئے۔ تو باقاعدہ جامعۂ نجف کی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ باب مدینۃ العلم کے برکات کا کرشمہ ہے کہ نجف ہمیشہ مرکز علم رہا اور آج بھی دنیائے اسلام کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز ہے۔

مرقدِ علوی کی تعمیر

مرقد امیرالمومنین کے محل و مقام کا علم آئمہ اہلِ بیت اور مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ اور علم ہوتا بھی تو کیونکر جب کہ قبر ایک ویران ٹیلے پر خاک کے اندر پنہاں تھی نہ نشان قبر تھا اور نہ لوح مزار۔ اس کا عمومی انکشاف اس وقت ہوا جب ہارون رشید عباسی ۱۷۰ھ میں برسراقتدار آنے کے بعد کوفہ کے اطراف میں آیا۔ یہاں آنے کا مقصد سیر و شکار تھا۔ چنانچہ اس نے چند ہرن دیکھے تو ان کے پیچھے باز اور شکاری کتے چھوڑے مگر یہ دیکھ کر حیرت میں کھو گیا کہ جب باز اور شکاری کتے ہرنوں کا پیچھا کرتے ہیں تو وہ ایک ٹیلے پر چڑھ جاتے ہیں پھر نہ باز جھپٹتے ہیں اور نہ شکاری کتے آگے بڑھتے ہیں۔ اس نے حیرہ کے ایک شخص کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اس نے بتایا کہ یہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کا مدفن ہے۔ ہارون نے اسے انعام دے کر رخصت کیا اور قبر کی زیارت کرنے کے بعد

ان هارون امر فبنی علیہ قبة واخذ الناس فی زیارته والدفن لموتاهم حوله۔ (عمدة الطالب۔ ص۴۳)	حکم دیا کہ یہاں روضہ تعمیر کیا جائے چنانچہ ایک قبہ تعمیر کیا گیا اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آنے اور اس کے گرد و پیش اپنے مردے دفن کرنے لگے۔“

یہ عمارت ایک سُرخ گنبد کی صورت میں تھی جس کے چاروں طرف چار دروازے تھے۔ اور قبر کی دیواریں سفید اینٹوں سے اٹھائی گئی تھیں۔

محمد ابن زید حسنی والیٔ طبرستان نے معتضد باللہ عباسی کے دور میں قبہ چار دیواری اور قلعہ نما روضہ تعمیر کیا جس میں ستر طاق تھے۔ معتضد باللہ کا دورِ حکومت ۲۷۹ھ سے ۲۸۹ھ تک ہے۔

جب ۳۶۷ھ میں عضد الدولہ فنا خسرو ابن رکن الدولہ برسراقتدار آیا تو اس نے بصرف کثیر روضہ کی پُرشکوہ عمارت بنوائی دیواروں پر ساج کی لکڑی کے تختے جڑے اور سفید رنگ کا گنبد تعمیر کیا۔ حسین ابن حجاج بغدادی متوفی ۳۹۱ھ نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں کہا ہے :-

یا صاحب القبة البیضا علی النجف   من زار قبرك واستشفی لدیك شفی

اے سرزمین نجف میں سفید گنبد کے مکین جو شخص آپ کی قبر کی زیارت کرے اور شفا چاہے وہ شفایاب ہو گا۔“

اس تعمیر کے موقع پر عضد الدولہ نے وصیت کی تھی کہ اسے نجف میں حضرت کے جوار میں دفن کیا جائے

چنانچہ ابن خلقان نے تحریر کیا ہے :-

بنی علیہ المشھد الذی ھناک	عضد الدولہ نے صرف کثیر سے وہاں زیارت گاہ
وعزم علیہ شیئا کثیرا واوصی	تعمیر کی اور وصیت کی کہ اسے بھی وہیں پر دفن
بدفنہ فیہ (وفیات الاعیان ج ۱ ص ۴۱۸)	کیا جائے "

چنانچہ جب اس نے ۸ رشوال ۳۷۲ھ میں انتقال کیا تو اُسے روضۂ اطہر کی غربی جانب دفن کیا گیا۔
۷۵۵ھ میں آتشزدگی کا حادثہ رونما ہوا اور عمارت کا بیشتر حصہ منہدم ہو گیا مگر ۷۶۰ھ میں اُسے پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔

۹۱۴ھ میں شاہ اسمٰعیل صفوی متوفی ۹۳۰ھ نے فولادی ضریح بنوائی اور حرم میں طلائی قندیلیں آویزاں کیں۔

۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس کبیر متوفی ۱۰۳۸ھ نے روضہ اقدس کی تعمیر کی اور صحن کو وسعت دی۔

۱۰۴۷ھ میں شاہ صفی صفوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے روضہ کی تعمیر شروع اور اس کی تکمیل اس کے بیٹے شاہ عباس ثانی متوفی ۱۰۷۷ھ نے کی۔

۱۱۵۴ھ یا ۱۱۵۶ھ میں نادر شاہ افشاری نے فتح ہند کے بعد کاشی کی اینٹوں سے روضہ کی مرمت کی اور گنبد اور میناروں پر سونا چڑھایا۔

۱۲۰۷ھ میں محمد خاں قاچار نے ۱۲۳۲ھ میں فتح علی شاہ قاچار نے اور ۱۲۸۸ھ میں ناصر الدین شاہ قاچار نے روضہ کی تعمیر و تزیین میں حصہ لیا۔

۱۳۶۱ھ میں ملا طاہر سیف الدین رئیس جماعت بواہیر نے ایک خوشنما گنگا جمنی ضریح نصب کی۔
غرض ہر دور میں خصوصاً سلاطین دیالمہ جلائریہ ایلخانیہ حمدانیہ صفویہ اور قاچاریہ کے عہد میں روضۂ انور کی تعمیر و تزئین میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور اس چودھویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایرانی تاجر نے خالص سونے کے دروازے لگوائے اور شاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی طرف سے آئینہ کاری کی گئی اور انہی کی طرف سے روضہ کے اندر یہ رباعی آویزاں ہے :-

گر در حرمت آئینہ کاری کردم — کارے نہ سزائے شہریاری کردم
تا جلوۂ حق بہ بینم از طلعت تو — در پیش رخت آئینہ کاری کردم

تم المجلد الاول من السیرۃ العلویۃ علیٰ صاحبہا افضل الصلوٰۃ واتم التحیۃ •

ملنے کا پتہ :-
العصر اسلامک بک سنٹر
۳۵۔حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور